جلد چہارم

سُورۃ الصّٰفّٰت تا سُورۃ النّاس

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی بیان فرمودہ تفسیر قرآن کریم کی آٹھویں جلد، جو اِس سلسلہ کی آخری جلد ہے طبع ہوگئی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السّلام نے جب ۲۰ جولائی ۱۹۰۰ء کو اپنے مخالفین کو تفسیر نویسی کا چیلنج دیا تو آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ

"قرآن شریف سے یہ ثابت ہے کہ جو لوگ درحقیقت خدا تعالیٰ کے راستباز بندے ہیں ان کے ساتھ تین طور سے خدا کی تائید ہوتی ہے۔

(ان میں سے ایک یہ ہے) کہ ان کو علمِ معارفِ قرآن دیا جاتا ہے اور غیر کو نہیں دیا جاتا جیسا کہ آیت لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ اس کی شاہد ہے۔"

معارفِ قرآن کا یہ علم حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کی اُردو، عربی اور فارسی کی اسّی سے زائد تصانیف اور ملفوظات میں جابجا مذکور ہے۔ ۱۹۶۷ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث، مرزا ناصر احمد، رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام رُوح پرور قرآنی معارف اور تفسیری نکات کو یکجا جمع کرنے کا ارشاد فرمایا چنانچہ مولوی سلطان احمد صاحب فاضل (پیر کوٹی) نے بہت تھوڑے سے وقت میں انتہائی محنت اور عرقریزی کے ساتھ یہ کام مکمّل کر کے جنوری ۱۹۶۸ء میں مسودہ حضور کی خدمت میں پیش کر دیا۔

جون ۱۹۶۹ء میں اِس سلسلہ کی پہلی جِلد شائع ہوئی تھی اور صَد سالہ جشنِ تشکّر کے موقعہ پر اسکی آخری جِلد پیش ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے ۲ مارچ ۱۹۸۰ء کو تحریک فرمائی تھی کہ ہر احمدی گھرانہ میں اِس تفسیر کا سیٹ ضرور موجود ہونا چاہیئے۔

طالبِ دُعا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّىْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

فہرست آیات جن کی تفسیر بیان ہوئی ہے

سُورۃ الصّٰفّٰت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ۝

جبکہ ایک مومن سب باتوں پر خدا تعالیٰ کو مقدم کر لیتا ہے تب اس کا خدا کی طرف رفع ہوتا ہے۔ وہ اسی زندگی میں خدا تعالیٰ کی طرف اُٹھایا جاتا ہے اور ایک خاص نور سے منوّر کیا جاتا ہے۔ اس رفع میں وہ شیطان کی زد سے ایسا بلند ہو جاتا ہے کہ پھر شیطان کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہر ایک چیز کا خدا تعالیٰ نے اِس دُنیا میں بھی ایک نمونہ رکھا ہے اور یہ اِس امر کی طرف اشارہ ہے کہ شیطان جب آسمان کی طرف چڑھنے لگتا ہے تو ایک شہابِ ثاقب اسکے پیچھے پڑتا ہے جو اس کو نیچے گرا دیتا ہے۔ ثاقب روشن ستارے کو کہتے ہیں۔ اس چیز کو بھی ثاقب کہتے ہیں جو سوراخ کر دیتی ہے اور اس چیز کو بھی ثاقب کہتے ہیں جو بہت اُونچی چلی جاتی ہو۔ اس میں حالتِ انسانی کے واسطے ایک مثال بیان کی گئی ہے جو اپنے اندر ایک نہ صرف ظاہری بلکہ ایک مخفی حقیقت بھی رکھتی ہے۔ جب ایک انسان کو خدا تعالیٰ پر پکا ایمان حاصل ہو جاتا ہے تو اس کا خدا تعالیٰ کی طرف رفع ہو جاتا ہے اور اس کو ایک خاص قوت اور طاقت اور روشنی عطا کی جاتی ہے جس کے ذریعہ سے وہ شیطان کو نیچے گرا دیتا ہے۔ ثاقب مارنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ ہر ایک مومن کے واسطے لازم ہے کہ وہ اپنے شیطان کو مارنے کی کوشش کرے اور اسے ہلاک کر ڈالے جو لوگ رُوحانیت کی سائنس سے ناواقف ہیں وہ ایسی باتوں پر ہنسی کرتے ہیں مگر دراصل وہ خود ہنسی کے لائق ہیں ایک قانونِ قدرت ظاہری ہے ایسا ہی ایک قانونِ قدرت باطنی بھی ہے۔ ظاہری قانون باطنی کے واسطے بطور ایک نشان کے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی اپنی وحی میں فرمایا ہے کہ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ الثَّاقِبِ یعنی تو مجھ سے بمنزلہ ثاقب ہے۔ اِس کے یہ معنے ہیں کہ مَیں نے تجھے شیطان کے مارنے کے واسطے پیدا کیا ہے۔ تیرے ہاتھ سے

شیطان ہلاک ہو جائے گا شیطان بلند نہیں جاسکتا۔ اگر مومن بلندی پر چڑھ جائے تو شیطان پھر اس پر غالب نہیں آسکتا مومن کو چاہیئے کہ وہ خدا تعالیٰ سے دعا کرے کہ اس کو ایک ایسی طاقت مل جائے جس سے وہ شیطان کو ہلاک کر سکے۔ جتنے بُرے خیالات پیدا ہوتے ہیں ان سب کا دُور کرنا شیطان کو ہلاک کرنے پر منحصر ہے۔ مومن کو چاہیئے کہ استقلال سے کام لے ہمت نہ ہارے شیطان کو مارنے کے پیچھے پڑا رہے آخر وہ ایک دن کامیاب ہو جائے گا۔ خدا تعالیٰ رحیم و کریم ہے جو لوگ اس کی راہ میں کوشش کرتے ہیں وہ آخر ان کو کامیابی کا مُونہہ دکھا دیتا ہے۔ بڑا درجہ انسان کا اسی میں ہے کہ وہ اپنے شیطان کو ہلاک کرے۔ (بدر جلد ۷ عدد ۲ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۶، ۷)

إِنَّهُمْ كَانُوٓا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا ٱللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ

قرآن کی تعلیم کا اصل مقصد یہی ہے کہ خدا جیسا کہ واحد لاشریک ہے ایسا ہی اپنی محبت کی رُو سے اس کو واحد لاشریک ٹھہراؤ جیسا کہ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ جو ہر وقت مسلمانوں کو وردِ زبان رہتا ہے اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ اِلٰه ۔ ولاہ سے مشتق ہے اور اس کے معنے ہیں ایسا محبوب اور معشوق جس کی پرستش کی جائے۔ یہ کلمہ نہ تو توریت نے سکھلایا اور نہ انجیل نے صرف قرآن نے سکھلایا اور یہ کلمہ اسلام سے ایسا تعلق رکھتا ہے کہ گویا اسلام کا تمغہ ہے۔ یہی کلمہ پانچ وقت مساجد کے مناروں میں بلند آواز سے کہا جاتا ہے جس سے عیسائی اور ہندو سب چڑتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو محبت کے ساتھ یاد کرنا ان کے نزدیک گناہ ہے۔ یہ اسلام ہی کا خاصہ ہے کہ صبح ہوتے ہی اسلامی مؤذن بلند آواز سے کہتا ہے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی مَیں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی ہمارا پیارا اور محبوب اور معبود بجز اللہ کے نہیں۔ پھر دوپہر کے بعد یہی آواز اسلامی مساجد سے آتی ہے۔ پھر عصر کو بھی یہی آواز پھر مغرب کو بھی یہی آواز اور پھر عشاء کو بھی یہی آواز گونجتی ہوئی آسمان کی طرف چڑھ جاتی ہے۔ کیا دُنیا میں کسی اور مذہب میں بھی یہ نظارہ دکھائی دیتا ہے؟!! (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۱۴، ۱۳)

قَالَ هَلْ أَنتُم مُّطَّلِعُونَ ۝ فَٱطَّلَعَ فَرَءَاهُ فِى سَوَآءِ ٱلْجَحِيمِ ۝ قَالَ تَٱللَّهِ إِن كِدتَّ لَتُرْدِينِ ۝ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّى لَكُنتُ مِنَ ٱلْمُحْضَرِينَ ۝

وَقَصَّ عَلَيْنَا قِصَّةَ رَجُلٍ مَاتَ وَدَخَلَ الْجَنَّةَ وَكَانَ لَهٗ صَاحِبٌ فِي الدُّنْيَا فَاسِقٌ فَمَاتَ

صَاحِبُهٗ اَيْضًا وَدَخَلَ النَّارَ فَذَكَرَ الَّذِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ قِصَّةَ صَاحِبِهٖ عِنْدَ اَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَقَالَ: هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ. فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ. قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ. وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ. وَاَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذِهِ الْقِصَّةَ تَدُلُّ بِدَلَالَةٍ صَرِيْحَةٍ عَلٰى اَنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بَعْدَ مَوْتِهِمْ مِنْ غَيْرِ مُكْثٍ ثُمَّ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَيَتَنَعَّمُوْنَ فِيْهَا خَالِدِيْنَ۔ (حمامۃ البشریٰ صٓ۵۳)

خدا تعالیٰ کی کتاب میں نیک و بد کی جزاء کے لئے دو مقام پائے جاتے ہیں ایک عالمِ برزخ جس میں مخفی طور پر ہر ایک شخص اپنی جزا پائے گا۔ بُرے لوگ مرنے کے بعد ہی جہنّم میں داخل ہوں گے۔ نیک لوگ مرنے کے بعد ہی جنت میں آرام پائیں گے۔ چنانچہ اِس قسم کی آیتیں قرآن شریف میں بکثرت ہیں کہ بمجرد موت کے ہر ایک انسان اپنے اعمال کی جزا دیکھ لیتا ہے جیسا کہ خدائے تعالیٰ ایک بہشتی کے بارے میں خبر دیتا ہے اور فرماتا ہے:

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ

یعنی اس کو کہا گیا کہ تُو بہشت میں داخل ہو۔ اور ایسا ہی ایک دوزخی کے متعلق فرماتا ہے:

فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ

ترجمہ از مرتب:۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس شخص کا حال بتایا ہے جو مرگیا تھا اور جنّت میں داخل ہوگیا تھا۔ اس کا دُنیا میں ایک فاسق دوست تھا سو اس کا وہ دوست بھی مَر گیا اور جہنّم میں داخل ہوگیا۔ جنّتی نے اپنے اس دوست کا قصہ اپنے جنّتی دوستوں کے پاس بیان کیا اور کہا هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ۔ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ۔ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ۔ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ[1] اور تُو جانتا ہے کہ یہ قصہ صریح طور پر دلالت کرتا ہے کہ مومن اپنی موت کے بعد بلا توقف جنّت میں داخل کئے جائیں گے اور پھر اس سے باہر نہیں نکالے جائیں گے اور اس کی نعمتوں سے ہمیشہ متمتع ہوتے رہیں گے۔ (حمامۃ البشریٰ صٓ۵۳)

حاشیہ [1] ترجمہ آیت:۔ کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو جھانک کر دیکھے کہ اس شخص کا کیا حال ہے۔ پھر وہ آپ ہی حال معلوم کرنے کی کوشش کرے گا اور اپنے دُنیوی ساتھی کو جہنّم میں پڑا ہوُا دیکھے گا۔ پھر اس سے کہے گا کہ خدا کی قسم تُو تو مجھے بھی ہلاک کرنے لگا تھا اور اگر میرے رب کا فضل نہ ہوتا تو مَیں بھی آج دوزخ کے سامنے حاضر کئے جانے والوں میں سے ہوتا۔

یعنی ایک بہشتی کا ایک دوست دوزخی تھا جب وہ دونوں مر گئے تو بہشتی حیران تھا کہ میرا دوست کہاں ہے۔ پس اس کو دکھلایا گیا کہ وہ جہنم کے درمیان ہے۔ سو جزا سزا کی کارروائی تو بلاتوقف شروع ہو جاتی ہے اور دوزخی دوزخ میں اور بہشتی بہشت میں جاتے ہیں مگر اس کے بعد ایک اور تجلیٔ اعلیٰ کا دن ہے جو خدا کی بڑی حکمت نے اس دن کے ظاہر کرنے کا تقاضا کیا ہے کیونکہ اس نے انسان کو پیدا کیا تا وہ اپنی خالقیت کے ساتھ شناخت کیا جائے اور پھر وہ سب کو ہلاک کرے گا تا کہ وہ اپنی قہاریت کے ساتھ شناخت کیا جائے اور پھر ایک دن سب کو کامل زندگی بخش کر ایک میدان میں جمع کرے گا تا کہ وہ اپنی قادریت کے ساتھ پہچانا جائے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹۳، ۹۴)

الصّٰفّٰت: أَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ۝ إِلَّا مَوْتَتَنَا الْأُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝

إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

اَلَا تَرٰى اَنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى قَالَ فِي الْكِتَابِ الْمُحْكَمِ حِكَايَةً عَنْ مُؤْمِنٍ مُغْبِطًا نَفْسَهٗ بِمَا اَعْطَاهُ اللّٰهُ مِنَ الْخُلْدِ فِي الْجَنَّةِ وَالْاِقَامَةِ فِيْ دَارِ الْكَرَامَةِ بِلَا مَوْتٍ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ فَانْظُرْ اَيُّهَا الْعَزِيْزُ كَيْفَ اَشَارَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَى امْتِنَاعِ الْمَوْتِ الثَّانِيْ بَعْدَ الْمَوْتَةِ الْاُوْلٰى وَبَشَّرَنَا بِالْخُلُوْدِ فِي الْعَالَمِ الثَّانِيْ بَعْدَ الْمَوْتِ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُنْكِرِيْنَ۔ وَاَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ الْهَمْزَةَ فِيْ جُمْلَةِ: اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ لِلْاِسْتِفْهَامِ التَّقْرِيْرِيِّ وَفِيْهَا مَعْنَى التَّعَجُّبِ وَالْفَاءُ هٰهُنَا لِلْعَطْفِ عَلٰى مَحْذُوْفٍ اَيْ اَنَحْنُ مُخَلَّدُوْنَ مُنَعَّمُوْنَ مَعَ قِلَّةِ اَعْمَالِنَا

ترجمہ از مرتب:۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی کتاب محکم میں ایک ایسے مومن کی بات حکایتاً بیان کی ہے جو اپنے نفس کو اس لحاظ سے قابلِ رشک قرار دے رہا تھا کہ اللہ نے اسے دائمی جنت عطا کی اور اسے عزت کی جگہ میں بلاموت ٹھہرنا نصیب کیا۔ وہ کہتا تھا اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ۔ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ اے عزیز! دیکھ اللہ تعالیٰ نے اِس حکایتاً بیان میں کس طرح پہلی موت کے بعد دوسری موت نہ ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہمیں پہلی موت کے بعد عالمِ ثانی میں ہمیشہ رہنے کی بشارت دی ہے پس تُو انکار کرنے والوں سے نہ بن نیز تُو جانتا ہے کہ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ کے جملہ میں ہمزہ استفہامِ تقریری کے لئے ہے اور اس میں تعجب کے معنے پائے جاتے ہیں اور فاء یہاں ایک محذوف پر عطف کے لئے استعمال ہوا ہے اور اِس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ کیا ہم اپنے تھوڑے سے اعمال

وَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ؟ وَاعْلَمْ اَنَّ هٰذَا سُؤَالٌ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ حِيْنَ يَسْمَعُوْنَ قَوْلَ اللّٰهِ تَعَالٰى: "كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ"[ؕ۵] كَمَا رُوِيَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِيْ تَفْسِيْرِ قَوْلِهٖ تَعَالٰى هَنِيْٓـًٔا فَعِنْدَ ذٰلِكَ يَقُوْلُوْنَ" اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ۔ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى" وَاعْلَمْ اَنَّ قَوْلَهُمْ هٰذَا يَكُوْنُ عَلٰى طَرِيْقَةِ الْاِبْتِهَاجِ وَالسُّرُوْرِ ثُمَّ اعْلَمْ اَنَّ الْاِسْتِثْنَاءَ هٰهُنَا مُفَرَّغٌ وَقِيْلَ مُنْقَطِعٌ بِمَعْنٰى لٰكِنْ وَفِيْ كُلِّ حَالٍ يَثْبُتُ مِنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ اَنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ يُبَشَّرُوْنَ بِالدَّوَامِ وَالْخُلْدِ وَيُبَشَّرُوْنَ بِاَنَّ لَهُمْ لَا مَوْتَ اِلَّا مَوْتَتَهُمُ الْاُوْلٰى وَهٰذَا دَلِيْلٌ صَرِيْحٌ عَلٰى اَنَّ اللّٰهَ مَا جَعَلَ لِاَهْلِ الْجَنَّةِ مَوْتَتَيْنِ بَلْ بَشَّرَهُمْ بِالْحَيَاةِ الْاَبَدِيَّةِ بَعْدَ الْمَوْتِ الَّذِيْ قَدْ قُدِّرَ لِكُلِّ رَجُلٍ وَقَالَ فِيْ اٰخِرِ هٰذِهِ الْاٰيَةِ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ فَاَشَارَ اِلٰى اَنَّ دَوَامَ الْحَيَاةِ وَعَدَمَ الْمَوْتِ مَعَ نَعِيْمٍ وَسُرُوْرٍ وَحُبُوْرٍ مِنَ التَّفَضُّلَاتِ الْعَظِيْمَةِ فَاِذْ تَقَرَّرَ هٰذَا فَكَيْفَ يُتَصَوَّرُ وَيُظَنُّ اَنَّ نَبِيًّا كَمِثْلِ عِيْسٰى مَعَ كَوْنِهٖ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ مَحْرُوْمٌ مِنْ هٰذَا التَّفَضُّلِ

کے باوجود جنت کی نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے اور ہمیں موت نہیں آئے گی اور تجھے یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ یہ اہلِ جنت کا اس وقت کا سوال ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول سُنیں گے کُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یعنی تم دل کو بھانے والے میوے کھاؤ اور اچھا پانی پیو یہ تمہارے عملوں کی جزا ہے جیسا کہ حضرت ابنِ عباس سے اللہ تعالیٰ کے قول هَنِيْٓـًٔا کی تفسیر میں مروی ہے۔ پس اس موقع پر جنتی کہیں گے اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى۔ اور جان لے ان کا یہ قول خوشی اور سرور کے طور پر ہوگا۔ پھر تمہیں یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیئے کہ یہاں استثناء مفرغ ہے اور بعض کے نزدیک استثناء منقطع بمعنی لیکن ہے اور دونوں صورتوں میں اِس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ جنت، جنت میں ہمیشہ رہنے کی بشارت پائیں گے اور یہ کہ ان پر سوائے پہلی موت کے اَور موت واقع نہیں ہوگی۔ اور یہ اِس بات پر صریح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے لئے دو موتیں نہیں بنائیں بلکہ اس نے انہیں اس موت کے بعد جو ہر شخص کے لئے مقدر ہے اَبدی حیات کی بشارت دی ہے۔ پھر اِس آیت کے آخر میں فرمایا اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ اِس حصۂ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اِس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ نعمتوں اور خوشیوں کے ساتھ بلا موت ہمیشہ کی زندگی اللہ تعالیٰ کے بڑے فضلوں میں سے ہے۔ اور جب یہ بات ثابت ہوگئی تو پھر یہ تصور کیسے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسا ایک نبی مقربِ الٰہی ہونے کے باوجود اس فضلِ عظیم سے محروم ہو۔ اور یہ تصور کیسے کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خلافِ وعدہ کرے اور اُسے دُنیا کی طرف اور اس کے

---

۵ سورۃ الطور: ۲۰

الْعَظِيْمِ وَكَيْفَ يُتَصَوَّرُ اَنَّ اللّٰهَ يُخْلِفُ وَعْدَهٗ وَيَرُدُّهٗ اِلَى الدُّنْيَا وَاٰلَامِهَا وَاٰفَاتِهَا وَمَصَائِبِهَا وَشَدَائِدِهَا وَمَرَارَاتِهَا ثُمَّ يُمِيْتُهٗ مَرَّةً ثَانِيَةً. سُبْحَانَهٗ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ وَمَا كَانَ لِاَحَدٍ اَنْ يَّعُوْدَ لِمِثْلِهٖ بَعْدَ مَا اطَّلَعَ عَلٰى خَطَائِهٖ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ....

.....وَقَدِ اسْتَدَلَّ بِهٖ الْخَلِيْفَةُ الْاَوَّلُ اَبُوْبَكْرٍ الصِّدِّيْقُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اِذَا تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاخْتَلَفَ النَّاسُ فِيْ وَفَاتِهٖ وَقَالَ عُمَرُ مَا مَاتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَوْتٍ حَقِيْقِيٍّ بَلْ يَاْتِيْ مَرَّةً ثَانِيَةً فِي الدُّنْيَا وَيَقْطَعُ اُنُوْفَ الْمُنَافِقِيْنَ وَاَيْدِيَهُمْ وَاٰذَانَهُمْ فَاَنْكَرَهُ الصِّدِّيْقُ وَمَنَعَهٗ مِنْ ذٰلِكَ ثُمَّ بَادَرَ اِلٰى بَيْتِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا وَاَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ مَيِّتًا عَلَى الْفِرَاشِ فَنَزَعَ عَنْ وَجْهِهِ الرِّدَاءِ وَقَبَّلَهٗ وَبَكٰى وَقَالَ اِنَّكَ طَيِّبٌ حَيًّا وَّمَيِّتًا لَنْ يَّجْمَعَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْمَوْتَتَيْنِ اِلَّا مَوْتَتَكَ الْاُوْلٰى فَرَدَّ بِذٰلِكَ الْقَوْلِ قَوْلَ عُمَرَ وَكَانَ مَاْخَذُ قَوْلِهٖ تَعَالٰى: اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَكَانَتْ لِاَبِيْ بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مُنَاسَبَةٌ عَجِيْبَةٌ بِدَقَائِقِ الْقُرْاٰنِ وَرُمُوْزِهٖ وَاَسْرَارِهٖ وَمَعَارِفِهٖ وَكَانَ لَهٗ مَلَكَةٌ كَامِلَةٌ فِي اسْتِنْبَاطِ الْمَسَائِلِ مِنَ الْقُرْاٰنِ الْكَرِيْمِ فَبِذٰلِكَ

دکھوں، آفتوں، مصیبتوں اور تلخیوں کی طرف لوٹا دے پھر اسے دوسری دفعہ موت دے۔ یہ بہت بڑا بہتان ہے اور اللہ کی ذات اس سے پاک ہے۔ اور کسی مومن کے لئے یہ جائز نہیں کہ اپنی غلطی پہ اطلاع پانے کے بعد دوبارہ اس کا اعادہ کرے۔

حضرت خلیفہ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اِس آیت سے اُس وقت اِستدلال کیا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور صحابہؓ نے آپؐ کی وفات کے بارہ میں اختلاف کیا۔ اور حضرت عمرؓ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حقیقی موت وارد نہیں ہوئی بلکہ آپؐ دوبارہ دُنیا میں تشریف لائیں گے اور منافقوں کے ناک، ہاتھ اور کان کاٹیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اِس بات سے انکار کیا اور ان کو ایسا کہنے سے منع کیا۔ پھر آپؓ جلدی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر گئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعش مبارک بستر پر تھی انہوں نے آنحضرتؐ کے چہرہ مبارک سے چادر ہٹائی آپؐ کا بوسہ لیا اور رو پڑے اور کہا یا رسول اللہ آپؐ زندگی اور موت دونوں حالتوں میں پاک ہیں اللہ تعالیٰ آپؐ پر سوائے آپؐ کی پہلی موت کے دُو موتیں جمع نہیں کرے گا۔ اور اِس طرح آپ نے حضرت عمرؓ کے قول کی تردید کی اور آپ کے استدلال کا مأخذ یہی آیت اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى ہی تھی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قرآن کریم کے دقائق، رموز، اسرار اور معارف سے عجیب مناسبت تھی اور قرآن کریم سے مسائل مستنبط کرنے میں کامل ملکہ حاصل تھا پس اِس وجہ سے آپ کا دِل حق کی طرف ہدایت پا گیا اور آپ سمجھ گئے کہ دُنیا کی

هُدِیَ قَلْبُهٗ اِلَی الْحَقِّ وَفَهِمَ اَنَّ الرُّجُوْعَ اِلَی الدُّنْیَا مَوْتَةٌ ثَانِیَةٌ وَهِیَ لَا یَجُوْزُ عَلٰی اَهْلِ الْجَنَّةِ بِدَلِیْلِ قَوْلِهٖ تَعَالٰی حِکَایَةً عَنْ اَهْلِهَا: اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰی وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ فَاِنَّ رُجُوْعَ اَهْلِ الْجَنَّةِ اِلَی الدُّنْیَا ثُمَّ مَوْتَهُمْ وَوُرُوْدَ اٰلَامِ السَّکَرَاتِ وَالْاَمْرَاضِ عَلَیْهِمْ نَوْعٌ مِّنَ التَّعْذِیْبِ وَقَدْ نَجَّا اللّٰهُ اِیَّاهُمْ مِنْ کُلِّ عَذَابٍ وَاٰوَاهُمْ عِنْدَهٗ بِاِعْطَاءِ کُلِّ حُبُوْرٍ وَّسُرُوْرٍ مِّنْ یَّوْمِ انْتِقَالِهِمْ اِلَی الدَّارِ الْاٰخِرَةِ فَکَیْفَ یُمْکِنُ اَنْ یَّرْجِعُوْا اِلٰی دَارِ التَّعْذِیْبَاتِ مَرَّةً ثَانِیَةً ؟ فَهٰذَا مَعْنٰی قَوْلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ : وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۴۸ تا ۵۰)

الصّٰفّٰت

اَذٰلِکَ خَیْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿۶۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِیْنَ ﴿۶۳﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْٓ اَصْلِ الْجَحِیْمِ ﴿۶۴﴾ طَلْعُهَا کَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ ○

جیسا کہ قرآن شریف نے عالَمِ آخرت میں ایمان کے پاک درختوں کو انگور اور انار اور عمدہ عمدہ میووں سے مشابہت دی ہے اور بیان فرمایا ہے کہ اس روز وہ ان میووں کی صورت میں متمثّل ہوں گے اور دکھائی دیں گے ایسا ہی بے ایمانی کے خبیث درخت کا نام عالَمِ آخرت میں زقّوم رکھا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے کہ اَذٰلِکَ خَیْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ الخ تم بتلاؤ کہ بہشت کے باغ اچھے ہیں یا زقّوم کا درخت جو ظالموں کے لئے ایک بلا ہے۔ وہ ایک درخت ہے جو جہنّم کی جڑھ میں سے نکلتا ہے یعنی تکبّر اور خود بینی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی دوزخ کی جڑھ ہے اس کا شگوفہ

طرف رجوع کرنا دوسری موت ہے اور جنّتیوں کے لئے یہ جائز نہیں، اور آپ نے دلیل اس آیت سے پکڑی جو اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنّت سے حکایت کرتے ہوئے بیان کی ہے یعنی اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰی وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ کیونکہ اہلِ جنّت کا دُنیا کی طرف واپس آنا، پھر ان پر موت کا دوبارہ واقع ہونا اور ان پر سکرات موت اور امراض کا وارد ہونا عذاب ہی کی ایک قسم ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر عذاب سے نجات دے دی ہے اور دارِ آخرت کی طرف منتقل کر کے اور ہر ایک خوشی اور سرور عطا کر کے اپنے پاس پناہ دی ہے پس یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس دُنیا دارالعذاب کی طرف دوبارہ واپس آئیں پس اہلِ جنّت کے قول وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ کے یہی معنے ہیں۔

(حمامۃ البشریٰ صفحہ ۴۸ تا ۵۰)

ایسا ہے جیسا کہ شیطان کا سر شیطان کے معنے ہیں ہلاک ہونے والا۔ یہ لفظ شیط سے نکلا ہے۔ پس حاصل کلام یہ ہے کہ اس کا کھانا ہلاک ہونا ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۷۸)

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۝

میری نصیحت بار بار یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنے نفسوں کا بار بار مطالعہ کرو۔ بدی کا چھوڑ دینا یہ بھی ایک نشان ہے اور خدا (تعالیٰ) ہی سے چاہو کہ وہ تمہیں توفیق دے کیونکہ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ قویٰ بھی اس نے ہی پیدا کئے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۰)

بدیوں کو چھوڑ دینا کسی کے اختیار میں نہیں اس واسطے راتوں کو اٹھ اٹھ کر تہجد میں خدا کے حضور دعائیں کرو۔ وہی تمہارا پیدا کرنے والا ہے۔ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ پس اور کون ہے جو ان بدیوں کو دور کر کے نیکیوں کی توفیق تم کو دے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۲ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۲)

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ۝

صوفیوں نے لکھا ہے کہ اوائل سلوک میں جو رؤیا یا وحی ہو اس پر توجہ نہیں کرنی چاہیئے وہ اکثر اوقات اس راہ میں روک ہو جاتی ہے۔ انسان کی اپنی خوبی اس میں تو کوئی نہیں کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جو وہ کسی کو کوئی اچھی خواب دکھاوے یا کوئی الہام کرے اس نے کیا کیا؟ دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہت وحی ہؤا کرتی تھی لیکن اس کا کہیں ذکر بھی نہیں کیا گیا کہ اس کو یہ الہام ہؤا یہ وحی ہوئی بلکہ ذکر کیا گیا ہے تو اس بات کا اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى وہ ابراہیم جس نے وفاداری کا کامل نمونہ دکھایا یا یہ کہ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ یہ بات ہے جو انسان کو حاصل کرنی چاہیئے اگر یہ پیدا نہ ہو تو پھر رؤیا و الہام سے کیا فائدہ؟ مومن کی نظر ہمیشہ اعمالِ صالحہ پر ہوتی ہے اگر اعمالِ صالحہ پر نظر نہ ہو تو اندیشہ ہے کہ وہ مکر اللہ کے نیچے آجائے گا۔ ہم کو تو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کو راضی کریں اور اس کے لئے ضرورت ہے اخلاص کی، صدق و وفا کی۔ نہ یہ کہ قیل و قال تک ہی ہماری ہمت و کوشش محدود ہو۔ جب ہم اللہ تعالیٰ کو راضی کرتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ بھی برکت دیتا ہے اور اپنے فیوض و برکات کے دروازے کھول دیتا ہے اور رؤیا اور وحی کو القاء شیطانی سے پاک کر دیتا ہے اور اضغاث احلام سے بچا لیتا ہے پس اس بات کو کبھی بھولنا نہیں چاہیئے کہ رؤیا اور الہام پر مدارِ صلاحیت نہیں رکھنا چاہیئے۔ بہت سے آدمی دیکھے گئے ہیں کہ ان کو

رؤیا اور الہام ہوتے رہے لیکن انجام اچھا نہیں ہؤا جو اعمالِ صالحہ کی صلاحیت پر موقوف ہے۔ اِس تنگ دروازہ سے جو صدق و وفا کا دروازہ ہے گذرنا آسان نہیں۔ ہم کبھی ان باتوں سے فخر نہیں کر سکتے کہ رؤیا یا الہام ہونے لگے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہیں اور مجاہدات سے دستکش ہو رہیں اللہ تعالیٰ اس کو پسند نہیں کرتا۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۸، ۱۹ مورخہ ۸/۱۶، مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۰)

۱۰۸ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ۝

انبیاء اور رسل کو جو بڑے بڑے مقام ملتے ہیں وہ ایسی معمولی باتوں سے نہیں مل جاتے جو نرمی سے اور آسانی سے پوری ہو جائیں بلکہ ان پر بھاری ابتلاء اور امتحان وارد ہوئے جن میں وہ صبر اور اِستقلال کے ساتھ کامیاب ہوئے تب خدا تعالیٰ کی طرف سے ان کو بڑے بڑے درجات نصیب ہوئے۔ دیکھو حضرت ابراہیمؑ پر کیسا بڑا ابتلاء آیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں چھری لی کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرے اور اس چھری کو اپنے بیٹے کی گردن پر اپنی طرف سے پھیر دیا مگر آگے بکرا تھا۔ ابراہیمؑ امتحان میں پاس ہؤا اور خدا نے بیٹے کو بھی بچا لیا۔ تب خدا تعالیٰ ابراہیمؑ پر خوش ہؤا کہ اُس نے اپنی طرف سے کوئی فرق نہ رکھا۔ یہ خدا تعالیٰ کا فضل تھا کہ بیٹا بچ گیا ورنہ ابراہیمؑ نے اس کو ذبح کر دیا تھا۔ اس واسطے اس کو صادق کا خطاب ملا۔ اور توریت میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا اے ابراہیمؑ تو آسمان کے ستاروں کی طرف نظر کر کیا تو ان کو گن سکتا ہے۔ اِسی طرح تیری اولاد بھی نہ گنی جائے گی۔ تھوڑے سے وقت کی تکلیف تھی وہ تو گذر گئی اسکے نتیجہ میں کس قدر اِنعام ملا۔ آج تمام سادات اور قریش اور یہود اور دیگر اقوام اپنے آپ کو ابراہیمؑ کا فرزند کہتے ہیں۔ گھڑی دو گھڑی کی بات تھی وہ تو ختم ہو گئی اور اِتنا بڑا اِنعام ان کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملا۔

(البدر جلد ۷ نمبر ۲ مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

۱۵۰ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ۝

عیسائیوں کو جواب دیتے وقت بعض اَوقات سخت الفاظ اِستعمال کئے جاتے ہیں تو یہ بات بالکل صاف ہے جب ہمارا دل بہت دُکھایا جاتا ہے اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر طرح طرح کے ناجائز حملے کئے جاتے ہیں تو صرف متنبہ کرنے کی خاطر انہیں کی مسلمہ کتابوں سے الزامی جواب دیئے جاتے ہیں۔

ان لوگوں کو چاہیئے کہ ہماری کوئی بات ایسی نکالیں جو حضرت عیسٰیؑ کے متعلق ہم نے بطور الزامی جواب کے لکھی ہو اور وہ انجیل میں موجود نہ ہو۔ آخر یہ تو ہم سے نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین سُنکر چپ رہیں اور اس

قسم کے جواب تو خود قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں جیسے لکھا ہے اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثٰى[1]۔ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ وہ لوگ فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا تمہارے بیٹے اور ہماری بیٹیاں؟

غرض الزامی رنگ کے جواب دینا تو طریق مناظرہ ہے ورنہ ہم حضرت عیسیٰؑ کو خدا تعالیٰ کا رسول اور ایک مقبول اور برگزیدہ انسان سمجھتے ہیں اور جن لوگوں کا دل صاف نہیں اُن کا فیصلہ ہم خدا پر چھوڑتے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۷؍ نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۙ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۚ

ایک یہ اعتراض ہے کہ قرآن کریم کے بعض اشارات اور ایسا ہی بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایام میں جبرائیل کے اُترنے میں کسی قدر توقف بھی وقوع میں آئی ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایامِ بعثت میں یہ بھی اتفاق ہوا ہے کہ بعض اوقات کئی دن تک جبرائیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل نہیں ہوا۔ اگر حضرت جبرائیل ہمیشہ اور ہر وقت قرین دائمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور رُوح القدس کا اثر ہمیشہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود پر جاری وساری تھا تو پھر توقف نزول کے کیا معنی ہیں۔ اما الجواب۔ پس واضح ہو کہ ایسا خیال کرنا کہ رُوح القدس کبھی انبیاء کو خالی چھوڑ کر آسمان پر چڑھ جاتا ہے صرف ایک دھوکہ ہے کہ جو بوجہ غلط فہمی نزول اور صعود کے معنوں کے دلوں میں متمکن ہو گیا ہے پوشیدہ نہ رہے کہ نزول کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ کوئی فرشتہ آسمان سے اپنا مقام اور مقر چھوڑ کر زمین پر نازل ہو جاتا ہے ایسے معنے تو صریح نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ کے مخالف ہیں چنانچہ فتح البیان میں ابن جریر سے بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ حدیث مروی ہے قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا فِي السَّمَآءِ مَوْضِعُ قَدَمٍ اِلَّا عَلَيْهِ مَلَكٌ سَاجِدٌ اَوْ قَائِمٌ وَذٰلِكَ قَوْلُ الْمَلٰٓئِكَةِ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آسمان پر ایک قدم کی بھی ایسی جگہ خالی نہیں جس میں کوئی فرشتہ ساجد یا قائم نہ ہو اور یہی معنے اس آیت کے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک شخص ایک مقامِ معلوم یعنی ثابت شدہ رکھتا ہے جس سے ایک قدم اُوپر یا نیچے نہیں آسکتا۔ اب دیکھو اس حدیث سے صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ فرشتے اپنے مقامات کو نہیں چھوڑتے اور کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوتا کہ ایک قدم کی جگہ بھی آسمان پر خالی نظر آوے ..... یہ بات نہایت احتیاط سے اپنے حافظہ میں رکھ لینی چاہئے کہ مقربوں کا رُوح القدس کی تاثیر

---

[1] سورۃ النجم : ۲۲

سے علیحدہ ہونا ایک دَم کے لئے بھی ممکن نہیں کیونکہ ان کی نئی زندگی کی رُوح یہی رُوح القدس ہے پھر وہ اپنی رُوح سے کیونکر علیحدہ ہو سکتے ہیں اور جس علیحدگی کا ذکر احادیث اور بعض اشارات قرآن کریم میں پایا جاتا ہے اس سے مُراد صرف ایک قسم کی تجلّی ہے کہ بعض اَوقات بوجہ مصالح الٰہی اُس قسم کی تجلّی میں کبھی دیر ہو گئی ہے اور اصطلاح قرآن کریم میں اکثر نزول سے مراد وہی تجلّی ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۸۸ تا ۹۱ حاشیہ)

حال کے اکثر مُلّا..... اِس بات کے وہ ہرگز قائل نہیں ہیں کہ ہر ایک انسان کو دو قرین دئے گئے ہیں۔ ایک داعی الی الخیر جو رُوح القدس ہے اور ایک داعی اِلی الشر جو شیطان ہے بلکہ ان کا تو یہ قول ہے کہ صرف ایک ہی قرین دیا گیا ہے جو داعی الی الشر ہے اور انسان کی ایمانی بیخکنی کے لئے ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے اور خدا تعالیٰ کو یہ بات بہت پیاری معلوم ہوئی کہ انسان کا شیطان کو دن رات کا مصاحب بنا کر اور انسان کے خون اور رگ و ریشہ میں شیطان کو دخل بخش کر بہت جلد انسان کو تباہی میں ڈال دیوے اور جبرائیل کو جس کا دوسرا نام رُوح القدس بھی ہے ہرگز عام اِنسانوں کے لئے بلکہ اَولیاء کے لئے بھی داعی اِلی الخیر مقرر نہیں کیا۔ وہ سب لوگ صرف شیطان کے پنجہ میں چھوڑے گئے۔ ہاں انبیاء پر رُوح القدس نازل ہوتا ہے مگر وہ بھی صرف ایک دَم یا بہت ہی تھوڑے عرصہ کے لئے اور پھر آسمان پر جبرائیل چڑھ جاتا ہے اور اُن کو خالی چھوڑ دیتا ہے بلکہ بسا اَوقات چالیس چالیس روز بلکہ اس سے بھی زیادہ رُوح القدس یا یوں کہو کہ جبرائیل کی ملاقات سے انبیاء محروم رہتے ہیں مگر دوسرا قرین جو شیطان ہے وہ تو نعوذ باللہ اُن کا ساتھ ایک دَم بھی نہیں جھ[illegible] کو مسلمان ہی ہو جائے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ محجوب اور حقائق قرآن کریم سے غافل اور بے نصیب ہیں اور کُھلے طور پر ان کا یہ عقیدہ بھی نہیں بلکہ نادانی اور قلّتِ تدبّر اور پھر اس عاجز کے ساتھ بخل اور کینہ ورزی کی وجہ سے اِس بَلا میں پڑ گئے ہیں کیونکہ اِس عاجز کے مقابل پر جن راہوں پر یہ لوگ چلے اُن راہوں میں یہ آفات موجود تھیں اِس لئے نادانستہ اُن میں پھنس گئے جیسا کہ ایک پرندہ نادانستہ کسی دانہ کی طمع سے ایک جال میں پھنس جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب اِن لوگوں نے اِس بات پر اصرار کیا کہ ضرور جبرائیل اور ملک الموت اور دوسرے فرشتے اپنے اصلی وجود کے ساتھ ہی زمین پر نازل ہوتے ہیں اور پھر تھوڑی دیر رہ کر آسمان پہ چلے جاتے ہیں۔ جب آسمان سے اُترتے ہیں تو آسمان اُن کے وجود سے خالی رہ جاتا ہے اور پھر جب زمین سے آسمان کی طرف پرواز کرتے ہیں تو زمین اُن کے وجود سے خالی رہ جاتی ہے تو صدہا اعتراض قرآن اور حدیث اور عقل کے اُن پر وارد ہوئے۔ چنانچہ منجملہ اُن بَلاؤں کے جو اِن کے اس عقیدہ کے لازم حال ہو گئیں ایک یہ بھی بَلا ہے جو خدا تعالیٰ کے رُوحانی انتظام کا عدل اور رحم جاتا رہا اور کفار اور تمام مخالفین کو اسلام پر یہ اعتراض کرنے کے لئے موقع ملا کہ یہ کیسی سخت دلی اور خلافِ رحم بات ہے کہ خدا تعالیٰ شیطان اور اس کی ذریّت کو انسان کے اغوا کے لئے ہمیشہ اور ہر دَم کے لئے اُس کا قرین اور مصاحب مقرر کرے تا وہ اس کے ایمان کی بیخکنی کے فکر میں رہیں

اور ہر وقت اُس کے خون اور اُس کے دل اور دماغ اور رگ و ریشہ میں اور آنکھوں اور کانوں میں گھس کر طرح طرح کے وساوس ڈالتے رہیں اور ہدایت کرنے کا ایسا قرین جو ہر دم انسان کے ساتھ رہ سکے ایک بھی انسان کو نہ دیا جائے۔ یہ اعتراض درحقیقت اُن کے عقیدہ مذکورہ بالا سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ ایک طرف تو یہ لوگ بموجب آیت وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَہٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت جبرائیل اور عزرائیل یعنی ملک الموت کا مقام آسمان پر مقرر ہے جس مقام سے وہ نہ ایک بالشت نیچے اُتر سکتے ہیں نہ ایک بالشت اُوپر چڑھ سکتے ہیں اور پھر باوجود اس کے ان کا زمین پر اپنے اصلی وجود کے ساتھ آنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں اور ایسا ہی پھر آسمان پر ان کا اپنے اصلی وجود کے ساتھ چڑھ جانا بھی اپنے زُعم میں یقینی اعتقاد رکھتے ہیں اور اگر کوئی اُصلی وجود کے ساتھ اُترنے یا چڑھنے سے اِنکار کرے تو وہ اُن کے نزدیک کافر ہے۔ ان عجیب مسلمانوں کے عقیدہ کو یہ بَلا لازم پڑی ہوئی ہے کہ وہ اعتدالی نظام جس کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں یعنی بَد قرین کے مقابل پر نیک قرین کا دائمی طور پر انسان کے ساتھ رہنا ایسے اعتقاد سے بالکل درہم برہم ہو جاتا ہے اور صرف شیطان ہی دائمی مصاحب اِنسان کا رہ جاتا ہے کیونکہ اگر فرشتہ رُوح القدس کسی پر مسافر کی طرح نازل بھی ہوا تو بموجب ان کے عقیدہ کے ایک دَم یا کسی اَور بہت تھوڑے سے عرصہ کے لئے آیا اور پھر اپنے اصلی وطن آسمان کی طرف پرواز کر گیا اور انسان کو گو وہ کیسا ہی نیک ہو شیطان کی صحبت میں چھوڑ گیا کیا یہ ایسا اِعتقاد نہیں جس سے اِسلام کو سخت دھبہ لگے کیا خداوند کریم و رحیم کی نسبت یہ تجویز کرنا جائز ہے کہ وہ انسان کی تباہی کو بہ نسبت اس کے ہدایت پانے کے زیادہ چاہتا ہے نعوذ باللہ ہرگز نہیں۔ نابینا آدمی قرآن کریم کی تعلیم کو سمجھتا نہیں اِس لئے اپنی نادانی کا اِلزام اس پر لگا دیتا ہے۔ یہ تمام بَلائیں جن سے نکلنا کسی طور سے ان علماء کے لئے ممکن نہیں اِسی وجہ سے ان کو پیش آگئیں کہ انہوں نے یہ خیال کیا کہ ملائک اپنے اصلی وجود کے ساتھ زمین پر نازل ہوتے ہیں اور پھر یہ بھی ضروری عقیدہ تھا کہ وہ بِلا توقف آسمان پر چڑھ بھی جاتے ہیں۔ اِن دونوں غلط عقیدوں کے لحاظ سے یہ لوگ اس شکنجہ میں آگئے کہ اپنے لئے یہ تیسرا عقیدہ بھی تراش لیا کہ بُس القرین کے مقابل پر کوئی ایسا نعم القرین انسان کو نہیں دیا گیا جو ہر وقت اُس کے ساتھ ہی رہے۔ پس اِس عقیدہ کے تراشنے سے قرآنی تعلیم پر انہوں نے سخت تہمت لگائی اور بَداندیش مخالفوں کو حملہ کرنے کا موقع دے دیا۔ اگر یہ لوگ اِس بات کو قبول کر لیتے کہ کوئی فرشتہ بذاتِ خود ہرگز نازل نہیں ہوتا بلکہ اپنے ظِلّی وجود سے نازل ہوتا ہے جس کے تمثّل کی اُس کو طاقت دی گئی ہے جیسا کہ دحیہ کلبی کی شکل پر حضرت جبرائیل متمثل ہو کر ظاہر ہوتے تھے اور جیسا کہ حضرت مریم کے لئے فرشتہ متمثل ہوا تو کوئی اعتراض پَیدا نہ ہوتا اور دوام نعم القرین پر کوئی شخص جرح نہ کر سکتا۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ ایسا خیال کرنے میں قرآن کریم اور احادیثِ صحیحہ سے بالکل یہ لوگ مخالف ہیں۔ قرآن کریم ایک طرف تو ملائک کے قرار اور ثبات کی جگہ آسمان کو قرار دے رہا ہے اور ایک طرف یہ بھی بڑے زور سے بیان فرما رہا ہے کہ رُوح القدس کامل مومنوں کو تائید کے لئے دائمی طور پر عطا کیا جاتا ہے اور اُن سے الگ نہیں ہوتا گو ہر یک شخص اپنے فطرتی نور کی وجہ سے کچھ نہ کچھ رُوح القدس کی چمک

اپنے اندر رکھتا ہے مگر وہ چمک عام لوگوں میں شیطانی ظلمت کے نیچے آجاتی ہے اور ایسی دب جاتی ہے کہ گویا اُس کا کچھ بھی وجود نہیں۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۹۰ تا ۹۷)

محققین اہلِ اسلام ہرگز اِس بات کے قائل نہیں کہ ملائک اپنے شخصی وجود کے ساتھ انسانوں کی طرح پَیروں سے چل کر زمین پر اُترتے ہیں اور یہ خیال بہ بداہت باطل بھی ہے کیونکہ اگر یہی ضرور ہوتا کہ ملائک اپنی اپنی خدمات کی بجاآوری کے لئے اپنے اصل وجود کے ساتھ زمین پر اُترا کرتے تو پھر اُن سے کوئی کام انجام پذیر ہونا بغایت درجہ محال تھا مثلاً فرشتہ ملک الموت جو ایک سیکنڈ میں ہزارہا ایسے لوگوں کی جانیں نکالتا ہے جو مختلف بلاد و امصار میں ایک دوسرے سے ہزاروں کوسوں کے فاصلہ پر رہتے ہیں اگر ہر یک کے لئے اِس بات کا محتاج ہو کر اوّل پَیروں سے چل کر اُس کے ملک اور شہر اور گھر میں جاوے اور پھر اتنی مشقت کے بعد جان نکالنے کا اس کو موقع ملے تو ایک سیکنڈ کیا اتنی بڑی کارگذاری کے لئے تو کئی مہینے کی مُہلت بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص انسانوں کی طرح حرکت کر کے ایک طرفۃ العین کے یا اُس کے کم عرصہ میں تمام جہان گھوم کر چلا آوے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ فرشتے اپنے اصلی مقامات سے جو اُن کے لئے خدائے تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں ایک ذرہ کے برابر بھی آگے پیچھے نہیں ہوتے جیسا کہ خدائے تعالیٰ اُن کی طرف سے قرآن شریف میں فرماتا ہے وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَہٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ۔ پس اصل بات یہ ہے کہ جس طرح آفتاب اپنے مقام پر ہے اور اس کی گرمی و روشنی زمین پر پھیل کر اپنے خواص کے موافق زمین کی ہر یک چیز کو فائدہ پہنچاتی ہے اسی طرح روحانیاتِ سماویہ خواہ اُن کو یونانیوں کے خیال کے موافق نفوسِ فلکیہ کہیں یا دساتیر اور وید کی اصطلاحات کے موافق اَرواحِ کواکب سے اُن کو نامزد کریں یا نہایت سیدھے اور موحدانہ طریق سے ملائک اللہ کا اُن کو لقب دیں۔ درحقیقت یہ عجیب مخلوقات اپنے اپنے مقام میں مستقر اور قرارگیر ہے اور بہ حکمتِ کاملہ خداوند تعالیٰ زمین کی ہر یک مستعد چیز کو اس کے کمالِ مطلوب تک پہنچانے کے لئے یہ رُوحانیات خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ ظاہری خدمات بھی بجالاتے ہیں اور باطنی بھی جیسے ہمارے اجسام اور ہماری تمام ظاہری قوتوں پر آفتاب اور ماہتاب اور دیگر سیاروں کا اثر ہے ایسا ہی ہمارے دل اور دماغ اور ہماری تمام رُوحانی قوتوں پر یہ سب ملائک ہماری مختلف استعدادوں کے موافق اپنا اپنا اثر ڈال رہے ہیں۔ جو چیز کسی عمدہ جوہر بننے کی اپنے اندر قابلیت رکھتی ہے وہ اگرچہ خاک کا ایک ٹکڑا ہے یا پانی کا وہ قطرہ جو صدف میں داخل ہوتا ہے یا پانی کا وہ قطرہ جو رحِم میں پڑتا ہے وہ ان ملائک اللہ کی رُوحانی تربیت سے لعل اور الماس اور یاقوت اور نیلم وغیرہ یا نہایت درجہ کا آبدار اور وزنی موتی یا اعلیٰ درجہ کے دل اور دماغ کا انسان بن جاتا ہے۔ (توضیح مرام صفحہ ۳۸ تا ۴۴)

وَمَقَامَاتُ الْمَلٰٓئِكَةِ فِی السَّمٰوٰتِ ثَابِتَةٌ لَا رَيْبَ فِيْهَا كَمَا قَالَ عَزَّ وَجَلَّ حِكَايَةً عَنْهُمْ: وَمَامِنَّآ

ترجمہ از مرتب:۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ آسمانوں میں فرشتوں کے مقامات ثابت ہیں جیسا کہ اللہ عزّ وجلّ انکی

إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ وَمَا نَرٰى فِي الْقُرْاٰنِ اٰيَةً تُشِيْرُ اِلٰى اَنَّهُمْ يَتْرُكُوْنَ مَقَامَاتِهِمْ فِيْ وَقْتٍ مِّنَ الْاَوْقَاتِ بَلِ الْقُرْاٰنُ يُشِيْرُ اِلٰى اَنَّهُمْ لَا يَتْرُكُوْنَ مَقَامَاتِهِمُ الَّتِيْ ثَبَّتَهُمُ اللّٰهُ عَلَيْهَا وَمَعَ ذٰلِكَ يَنْزِلُوْنَ اِلَى الْاَرْضِ وَيُدْرِكُوْنَ اَهْلَهَا بِاِذْنِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَيَتَبَرَّزُوْنَ فِيْ بَرَزَاتٍ كَثِيْرَةٍ فَتَارَةً يَتَمَثَّلُوْنَ لِلْاَنْبِيَآءِ فِيْ صُوَرِ بَنِيْ اٰدَمَ وَمَرَّةً يَتَرَاءَوْنَ كَالنُّوْرِ وَكَرَّةً يَرَاهُمْ اَهْلُ الْكَشْفِ كَالْاَطْفَالِ وَاُخْرٰى كَالْاَمَارِدِ وَيَخْلُقُ لَهُمُ اللّٰهُ فِي الْاَرْضِ اَجْسَادًا جَدِيْدَةً غَيْرَ اَجْسَادِهِمُ الْاَصْلِيَّةِ بِقُدْرَتِهِ اللَّطِيْفَةِ الْمُحِيْطَةِ وَمَعَ ذٰلِكَ تَكُوْنُ لَهُمْ اَجْسَادٌ فِي السَّمَآءِ وَهُمْ لَا يُفَارِقُوْنَ اَجْسَادَهُمُ السَّمَاوِيَّةَ وَلَا يَبْرَحُوْنَ مَقَامَاتِهِمْ وَيَجِيْئُوْنَ الْاَنْبِيَآءَ وَكُلَّ مَنْ اُرْسِلُوْا اِلَيْهِ مَعَ اَنَّهُمْ لَا يَتْرُكُوْنَ الْمَقَامَاتِ وَهٰذَا سِرٌّ مِّنْ اَسْرَارِ اللّٰهِ فَلَا تَعْجَبْ مِنْهُ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُكَذِّبِيْنَ۔

(حمامة البشرٰی ص۶۵)

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝

طرف سے حکایتاً بیان فرمایا ہے وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ اور ہم قرآن کریم میں ایک آیت بھی ایسی نہیں پاتے جو اِس بات کی طرف اشارہ کرتی ہو کہ فرشتے اپنے مقامات کو کسی وقت چھوڑ دیتے ہیں بلکہ قرآن کریم اِس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ ان مقامات کو جن پر اللہ تعالیٰ نے ان کو قائم کیا ہے نہیں چھوڑتے اور اِس کے باوجود وہ زمین پر اُترتے ہیں اور اللہ تعالےٰ کے اِذن سے زمین والوں سے ملاقات کرتے ہیں اور مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ کبھی تو وہ انبیاء کے لئے بنی آدم کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی وہ نور کی طرح نظر آتے ہیں اور کبھی ان کو اہلِ کشف بچّوں اور بے ریش نوجوانوں کی شکل میں دیکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے لئے زمین میں ان کے اصلی وجودوں کے علاوہ نئے وجود اپنی لطیف اور محیط قدرت سے پیدا کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی آسمانوں میں بھی ان کے اجسام ہوتے ہیں اور وہ ان سماوی اجسام سے علیحدہ نہیں ہوتے اور اپنے مقامات سے نہیں ہٹتے اور انبیاء پر اور دوسرے سب لوگوں کی طرف جن کی طرف وہ بھیجے جاتے ہیں، نازل ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے اصل مقامات کو نہیں چھوڑتے اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے تو اس سے تعجب نہ کر۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ ہر امر پر قادر ہے۔ پس تو جھٹلانے والوں میں سے نہ بن۔

(حمامۃ البشریٰ صفحہ ۶۵)

وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ وَّاَبْصِرْهُمْ

فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ۝

اور رسولوں کے حق میں پہلے سے ہماری یہ بات قرار پا چکی ہے کہ ہمیشہ نصرت اور فتح انہیں کے شامل حال رہے گی اور ہمیشہ ہمارا ہی لشکر غالب رہے گا۔ سو اُس وقت تک کہ وہ وعدہ پُورا ہو اُن سے مونہہ پھیرے رہ اور انکو وہ راہ دِکھلا۔ پس عنقریب وہ آپ دیکھ لیں گے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۳۱، ۲۳۲ حاشیہ)

○

سُورۃ صٓ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَہُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡہُمۡ ۫ وَ قَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ ہٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ۚ﴿ۖ۵﴾

انہوں نے اِس بات سے تعجب کیا کہ انہیں میں سے ایک شخص ان کی طرف بھیجا گیا اور بے ایمانوں نے کہا کہ یہ تو جادوگر کذّاب ہے۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور اُن کے جوابات صفحہ ۱۰)
(مکتوباتِ احمدیہ جلد ۳ صفحہ ۳۸)

وَ انۡطَلَقَ الۡمَلَاُ مِنۡہُمۡ اَنِ امۡشُوۡا وَ اصۡبِرُوۡا عَلٰۤی اٰلِہَتِکُمۡ ۚۖ اِنَّ ہٰذَا لَشَیۡءٌ یُّرَادُ ۚ﴿ۖ۷﴾

کہتے ہیں کہ یہ ایک منصوبہ ہے جو روپیہ جمع کرنے کے لئے بنایا گیا ہے اور اس کے معاون تنخواہ پاتے ہیں۔ اَب وہ شخص جو دل میں کچھ خدا تعالیٰ کا خوف رکھتا ہے سوچ لے کہ کیا یہ وہی بدظنی نہیں جو قدیم سے دلوں کے اندھے انبیاء علیہم السلام پر کرتے آئے ہیں۔ فرعون نے حضرت موسٰیؑ پر بھی بدظنی کی اور اپنے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اس شخص کا اصل مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کو زمین سے بیدخل کر کے خود قابض ہو جائے ایسا ہی یہودیوں نے حضرت عیسٰیؑ کی نسبت بھی رائے قائم کی کہ یہ شخص مکّار ہے اور نبوّت کے بہانہ سے ہم لوگوں

پر حکومت کرنا چاہتا ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کفارِ قریش نے بھی یہی بدظنی کی ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ان کا مقولہ یہ لکھا ہے اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ یعنی اِس دعویٰ میں تو کوئی نفسانی مطلب ہے سو ایسے اعتراض کرنے والوں پر ہم کیا افسوس کریں وہ پہلے منکرین کی عادت دکھلا رہے ہیں۔ طالبِ حق کی یہ عادت ہونی چاہیئے کہ وہ دعویٰ کو غور سے دیکھے اور دلائل پر دِلی انصاف سے نظر ڈالے اور وہ بات مُنہ پر لاوے جو عقل اور خدا ترسی اور انصاف کا مقتضا ہے نہ یہ کہ قبل از تحقیق یہ کہنا شروع کر دے کہ یہ سب کچھ مال کمانے کے لئے ایک مکر بنایا گیا ہے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۹۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اس وقت کافر یہی رائے لگاتے تھے اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ میاں یہ تو دوکانداری ہے مخالف جس کو صحبت نصیب نہیں ہوتی اس کو صحیح رائے نہیں ملتی اور دُور سے رائے لگانا صحیح نہیں کیونکہ جب تک وہ پاس نہیں آتا اور حالات پر اطلاع نہیں پاتا کیونکر صحیح رائے حاصل کر سکتا ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

انسان کو ہلاک کرنے والی چیزوں میں سے ایک بد صحبت بھی ہے۔ دیکھو ابوجہل خود تو ہلاک ہؤا مگر اَور بھی بہت سے لوگوں کو لے مرا جو اس کے پاس جا کر بیٹھا کرتے تھے اس کی صحبت اور مجلس میں بجز استہزاء اور ہنسی ٹھٹھے کے اَور کوئی ذکر ہی نہ تھا یہی کہتے تھے اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ــــ میاں یہ دکانداری ہے۔

اب دیکھو اور بتلاؤ کہ وہ جس کو دکاندار اور ٹھگ کہا جاتا تھا۔ ساری دُنیا میں اسی کا نور ہے یا کسی اَور کا بھی۔ ابوجہل مُر گیا اور اس پر لعنت کے سوا کچھ نہ رہا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ بلند کو دیکھو کہ شب و روز بلکہ ہر وقت درود پڑھا جاتا ہے اور ۹۹ کروڑ مسلمان اس کے خادم موجود ہیں مگر اَب ابوجہل پھر آتا تو آ کر دیکھتا کہ جس کو اکیلا مکہ کی گلیوں میں پھرتا دیکھتا تھا جس کی ایذاء دہی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھتا تھا اس کے ساتھ جب ۹۹ کروڑ اِنسانوں کے مجمع کو دیکھتا حیران رہ جاتا اور یہ نظارہ ہی اس کو ہلاک کر دیتا۔ یہ ہے ثبوت آپؐ کی رسالت کی سچائی کا۔ اگر اللہ تعالیٰ ساتھ نہ ہوتا تو یہ کامیابی نہ ہوتی۔ کس قدر کوششیں اور منصوبے آپؐ کی عداوت اور مخالفت کے لئے کئے مگر آخر ناکام اور نامراد ہونا پڑا۔ اِس ابتدائی حالت میں جب چند آدمی آپؐ کے ساتھ تھے کون دیکھ سکتا تھا کہ یہ عظیم الشان انسان دُنیا میں ہوگا اور ان مخالفوں کی سازشوں سے صحیح وسلامت بچ کر کامیاب ہو جائے گا۔ مگر یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی عادت اسی طرح پر ہے کہ انجام خدا کے بندوں کا ہی ہوتا ہے قتل کی سازشیں، کفر کے فتوے مختلف قسم کی ایذائیں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۲، ۳)

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ امر مشکل ہے کہ دُنیا کا ایک ہی مذہب ہو جاوے کیونکہ خدا تعالیٰ نے یہ بھی ایک قانون مقرر فرما دیا ہے کہ قیامت تک دُنیا میں تفرقہ ضرور رہے گا چنانچہ قرآن شریف میں یہ امر بڑی صراحت کیساتھ

موجود ہے۔قرآن کریم سے بڑھ کر اور کوئی تعلیم کامل کیا ہو گی۔اس میں سب سے بڑھ کر آیات اور برکات رکھے ہوئے ہیں جو ہر زمانہ میں تازہ اور زندہ ہیں۔پھر اگر یہ قانونِ الٰہی نہ ہوتا تو چاہیئے تھا کہ دُنیا کی کُل قومیں اس کو قبول کر لیتیں مگر خاص زمانۂ رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی دوسرا فرقہ موجود تھا۔جیسا نبی کامل تھا ویسی ہی کتاب کامل تھی لیکن ابوجہل اور ابولہب وغیرہ نے کچھ فائدہ نہ اُٹھایا اور وہ یہی کہتے رہے کہ اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ میاں یہ تو دکانداری ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۶)

انسان ہمیشہ تجارب سے نتیجہ نکالتا ہے اور عقلِ انسانی بھی بذریعہ تجارب کے ترقی کرتی رہتی ہے مثلاً انسان جانتا ہے کہ آم کے درخت کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور بعض درخت کے پھل کڑوے ہوتے ہیں تو اس تجربہ کثیر سے ایک فہم حاصل ہو جائے گا کہ آم کے پھل شیریں ہوتے ہیں اسی طرح چونکہ تجربہ آجکل یہی ہوتا ہے کہ دُنیا میں فسق و فجور اور مکر و فریب کا سلسلہ بڑھا ہوا ہے اِسی لئے اس کا خیال بندھ جاتا ہے کہ ہر ایک فریبی اور مکار ہی ہے بالغ تجارب اُسے تعلیم دیتے ہیں کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے اِسی وجہ سے حُسنِ عقیدت کی جگہ بدعقیدگی پیدا ہوتی ہے اور اسی لئے لوگ انبیاء پر بھی سوءِ ظن رکھتے آئے ہیں۔موسٰیؑ کی وفات کو دو ہزار برس گذر چکے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور اس زمانہ میں بہت سے جھوٹے معجزے دکھانے والے اور دعوے کرنے والے پیدا ہوئے تھے۔لوگوں کو اُن کا تجربہ تھا اور اس حالت میں یک لخت ایک صادق بھی آگیا آخر ان کو اس صادق کو بھی وہی کہنا پڑا جو ان جھوٹے مدعیوں کے حق میں کہتے تھے یعنی اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ کہ یہ تو دکانداری ہے۔غرضیکہ انسان تجارب کے ذریعہ سے مجبول رہے ہیں۔خدا (تعالیٰ) کے بندوں کی معرفت کا ہونا یہ خدا (تعالیٰ) کا خاص فضل ہے۔وہی معرفت دے تو پتہ لگتا ہے۔دُعا بہت کرے دُعا کے سوا چارہ نہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۸ مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

۸ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِى الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۖۚ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۖۚ

اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ۔یہ تو ایک بناوٹ ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۰۷ حاشیہ در حاشیہ)

یہ تو تمام افتراء ہے۔ (انجامِ آتھم صفحہ ۵۵)

اور کہتے ہیں کہ یہ بناوٹ ہے۔ (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۳)

کہیں گے کہ یہ تو افتراء ہے۔ (اربعین نمبر ۲ صفحہ ۱۸)

کہتے ہیں کہ یہ ایک بناوٹ ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۵)

کہتے ہیں کہ یہ تو صرف ایک بناوٹ ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۴۵)

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ○

(محترم اکمل صاحب کے اِس استفسار پر کہ اگر مذکورہ آیت کے وہ معنی کئے جائیں جو عام مفسّروں نے کئے ہیں تو شرع میں حیلوں کا باب کھل جائے گا حضور نے فرمایا)

چونکہ حضرت ایوب کی بیوی بڑی نیک، خدمتگذار تھی اور آپ بھی متقی صابر تھے اِس لئے اللہ تعالیٰ نے تخفیف کر دی اور ایسی تدبیر سمجھا دی جس سے قسم بھی پوری ہو جائے اور ضرر بھی نہ پہنچے۔ اگر کوئی حیلہ اللہ تعالیٰ سمجھائے تو وہ شرع میں جائز ہے کیونکہ وہ بھی اسی راہ سے آیا جس سے شرع آئی۔ اِس لئے کوئی ہرج کی بات نہیں۔

(بدر جلد ۶ ۹ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ○

خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف عقل ہی کے عطیہ سے مشرف نہیں فرمایا بلکہ الہام کی روشنی اور نور بھی اس کے ساتھ مرحمت فرمایا ہے انہیں ان راہوں پر نہیں چلنا چاہیئے جو خشک منطقی اور فلاسفر چلانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر لسانی قوت غالب ہوتی ہے اور رُوحانی قویٰ بہت ضعیف ہوتے ہیں۔ دیکھو قرآن شریف میں خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی تعریف میں اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ فرماتا ہے کہیں اُولِي الْاَلْسِنَةِ نہیں فرمایا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کو وہی لوگ پسند ہیں جو بصر اور بصیرت سے خدا کے کام اور کلام کو دیکھتے ہیں اور پھر اُس پر عمل کرتے ہیں اور یہ ساری باتیں بجز تزکیۂ نفس اور تطہیر قویٰ باطنیہ کے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتیں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۳)

اگرچہ فیصلہ دعاؤں سے ہی ہونے والا ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ دلائل کو چھوڑ دیا جاوے۔ نہیں دلائل کا سلسلہ بھی برابر رکھنا چاہیئے اور قلم کو روکنا نہیں چاہیئے۔ نبیوں کو خدا تعالیٰ نے اِسی لئے اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ کہا ہے کیونکہ وہ ہاتھوں سے کام لیتے ہیں پس چاہیئے کہ تمہارے ہاتھ اور قلم نہ رُکیں اس سے ثواب ہوتا ہے۔ جہاں تک بیان اور لسان سے کام لے سکو کام لئے جاؤ اور جو جو باتیں تائیدِ دین کے لئے سمجھ میں آتی جاویں انہیں پیش کئے جاؤ وہ کسی نہ کسی کو فائدہ پہنچائیں گی۔ (الحکم جلد ۸ ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

انبیاء علیہم السلام کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ کلام کرنے والے اور دیکھ بھال کر ان راہوں کی طرف بلاتے تھے جن پر خدا تعالیٰ نے انہیں قائم کیا تھا اور وہ تصورات کے پیچھے لگنے والے اور خیالی آدمی نہ تھے وہ عملی آدمی تھے اور علیٰ وجہ البصیرت حق کی طرف بلاتے تھے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۴ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۹،۸)

ص ۵۱،۵۰

هٰذَا ذِكْرٌ ۚ وَ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ۙ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ۚ

رفع تمام انبیاء اور رسل اور مومنوں میں عام ہے اور مرنے کے بعد ہر ایک مومن کا رفع ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت (مذکورہ بالا) میں اس رفع کی طرف اشارہ ہے یعنی کافر کا رفع نہیں ہوتا چنانچہ آیت لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۲۰)

مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ یعنی مومنوں کے لئے آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۸)

حضرت عیسیٰؑ کے رفع کو رفع جسمانی ٹھہرانا سراسر ہٹ دھرمی اور حماقت ہے بلکہ یہ وہی رفع ہے جو ہر ایک مومن کے لئے وعدہ الٰہی کے موافق موت کے بعد ہونا ضروری ہے اور کافر کے لئے حکم ہے کہ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ یعنی ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے یعنی ان کا رفع نہیں ہوگا جیسا کہ دوسری جگہ فرماتا ہے مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ پس سیدھی بات کو اُلٹا دینا تقویٰ اور طہارت کے برخلاف اور ایک طور سے تحریف کلامِ الٰہی ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۴۴)

پاک لوگ دوسرے جسم کے ساتھ آسمان پر جا سکتے ہیں جیسا کہ تمام نبیوں اور رسولوں اور مومنوں کی روحیں وفات کے بعد آسمان پر جاتی ہیں اور انہیں کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ یعنی مومنوں کے لئے آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے۔ یاد رہے کہ اگر صرف روحیں ہوتیں تو ان کے لئے لَهُمْ کی ضمیر نہ آتی۔ پس یہ قرینہ قویہ اس بات پر ہے کہ بعد موت جو مومنوں کا رفع ہوتا ہے وہ مع جسم ہوتا ہے مگر یہ جسم خاکی نہیں ہے بلکہ مومن کی روح کو ایک اور جسم ملتا ہے جو پاک اور نورانی ہوتا ہے اور اس دکھ اور عیب سے محفوظ ہوتا ہے جو عنصری جسم کے لوازم میں سے ہے یعنی وہ ارضی غذاؤں کا محتاج نہیں ہوتا اور نہ زمینی پانی کا حاجت مند ہوتا ہے اور وہ تمام لوگ جن کو خدا تعالیٰ کی ہمسائیگی میں جگہ دی جاتی ہے ایسا ہی جسم پاتے ہیں اور ہم ایمان رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے بھی وفات کے بعد ایسا ہی جسم پایا تھا اور اسی جسم کے ساتھ وہ خدا

تعالیٰ کی طرف اُٹھائے گئے تھے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۲۵)

اگر مسیح کے صعود الی السماء سے یہ غرض تھی کہ وہ اس لعنت سے بچ رہیں تو اس رفع کے لئے ضروری ہے کہ پہلے موت ہو کیونکہ یہ رفع وہ ہے جو قُربِ الٰہی کا مفہوم ہے اور بعد موت ملتا ہے اِسی لئے اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ[1] کہا گیا اور یہ وہی رفع ہے جو اِرْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً[2] میں خدا نے بیان فرمایا ہے اور مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ سے پایا جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۱ مورخہ ۳۱ ر اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

یہ خوب یاد رہے کہ ہم حضرت عیسٰی علیہ السلام کو آسمان پر رُوح بِلا جسم ہرگز نہیں مانتے۔ ہم مانتے ہیں کہ وہ وہاں جسم ہی کے ساتھ ہیں۔ ہاں فرق اِتنا ہے کہ یہ لوگ جسمِ عنصری کہتے ہیں اور مَیں کہتا ہوں کہ وہ جسم وہی جسم ہے جو دوسرے رسولوں کو دیا گیا۔ دوزخیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ یعنی کافروں کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاویں گے اور مومنوں کے لئے فرماتا ہے مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ۔ اب اِن آیات میں لَهُمْ کا لفظ اجسام کو چاہتا ہے تو کیا یہ سب کے سب پھر اسی جسمِ عنصری کے ساتھ جاتے ہیں؟ نہیں۔ ایسا نہیں۔ جسم تو ہوتے ہیں مگر وہ وہ جسم ہیں جو مَرنے کے بعد دیئے جاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ ر اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹،۸)

سچی بات یہی ہے کہ مسلمانوں اور یہود کا متفقہ اور مسلّم اعتقاد اِس پر ہے کہ خدا کے نیک بندوں کا بعد وفات رفع رُوحانی ہؤا کرتا ہے اور یہی قابلِ بڑائی بات ہے رفع جسمانی کے یہ نہ قائل ہیں اور نہ کوئی اس میں فضیلت مدِّنظر ہے چنانچہ قرآن شریف بھی اسی اصول کو یُوں بیان فرماتا ہے کہ مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ یعنی جو خدا کے نزدیک متقی اور برگزیدہ اِنسان ہوتے ہیں خدا ان کے لئے آسمانی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے اور ان کا رفع رُوحانی بعد الموت کیا جاتا ہے اور ان کے مقابل میں جو لوگ بدکار اور خدا (تعالیٰ) سے دُور ہوتے ہیں اور ان کو خدا (تعالیٰ) سے کوئی تعلق صدق واخلاص نہیں ہوتا ان کے واسطے آسمانی دروازے نہیں کھولے جاتے جیسا کہ فرمایا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ۔[3]

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۰ مورخہ ۲۲ ر مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

۶۳ وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ

ہمیں کیا ہو گیا کہ دوزخ میں ہمیں وہ لوگ نظر نہیں آتے جنہیں ہم شریر سمجھتے تھے۔ دُنیا نے ہمیشہ خدا

---

[1] آلِ عمران: ۵۶ [2] سورۃ الفجر: ۲۹ [3] سورۃ الاعراف: ۴۱

کے ماموروں سے دشمنی کی کیونکہ دُنیا سے پیار کرنا اور خدا کے مرسلوں سے پیار کرنا ہرگز ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتا۔

(لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۲۱)

دوزخی یا بہشتی ہونے کی اصل حقیقت تو مرنے کے بعد ہر یک کو معلوم ہوگی جس وقت بعض بصد حسرت دوزخ میں پڑے ہوئے کہیں گے مَالَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا کُنَّا نَعُدُّھُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۲۹۱)

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ○ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ○ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ○

تَفَكَّرْ فِیْ اٰیَةِ " فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ " وَتَدَبَّرْ كَاُولِی النُّهٰی وَ تَفَكَّرْ فِیْ لَفْظِ " خَلَقْتُ بِيَدَیَّ " وَ لَفْظِ " سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ " وَ اَلْفَاظٍ اُخْرٰی لِيَظْهَرَ عَلَيْكَ جَلَالَةُ اٰدَمَ وَشَانُهُ الْاَعْلٰی۔ فَاِنَّ مَنْطُوْقَ الْاٰيَةِ يَدُلُّ عَلٰی اَنَّ رُوْحَ اللّٰهِ نَزَلَ فِیْ اٰدَمَ بِنُزُوْلٍ اَجْلٰی حَتّٰی جَعَلَهٗ مَسْجُوْدَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَمَظْهَرَ تَجَلِّيَاتٍ وَ اَقْرَبَ اِلَی اللّٰهِ الْاَغْنٰی وَاَعْلَمَ وَ اَفْضَلَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اَجْمَعِيْنَ وَخَلِيْفَةَ اللّٰهِ عَلَی الْاَرْضِيْنَ۔

(نور الحق حصہ اول صفحہ ۱۰۲، ۱۰۳)

یاد کرو وہ وقت کہ جب تیرے خدا نے (جس کا تو مظہر اتم ہے) فرشتوں کو کہا کہ میں مٹی سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں سو جب میں اُس کو کمال اعتدال پر پیدا کر لوں اور اپنی رُوح میں سے اُس میں پھونک دوں تو تم اُس کے لئے سجدہ میں گرو یعنی کمال انکسار سے اُس کی خدمت میں مشغول ہو جاؤ اور ایسی خدمت گذاری میں

ترجمہ از اصل :- سو عقلمندوں کی طرح لفظ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ میں غور کر اور پھر اس لفظ میں غور کر جو خَلَقْتُ بِيَدَیَّ اور سَوَّيْتُهٗ اور نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ ہے اور دوسرے لفظوں کو بھی سوچ تاکہ تیرے پر حضرت آدمؑ کی شانِ اعلیٰ ظاہر ہو کیونکہ منطوق آیت کا دلالت کرتا ہے کہ رُوح اللہ آدم میں اُترا تھا اور وہ اُترنا بہت روشن تھا یہاں تک کہ آدم ملائکہ کا سجدہ گاہ ٹھہرا اور تجلیاتِ عظمیٰ کا مظہر بنا اور خدائے غنی سے بہت قریب ہوا اور افضل ٹھہرا اور خدا تعالیٰ کا خلیفہ بنا۔

(نور الحق حصہ اول صفحہ ۱۰۲، ۱۰۳)

جُھک جاؤ کہ گویا تم اُسے سجدہ کر رہے ہو پس سارے کے سارے فرشتے انسانِ مکمل کے آگے سجدہ میں گر پڑے مگر شیطان جو اس سعادت سے محروم رہ گیا۔ جاننا چاہیئے کہ یہ سجدہ کا حکم اُس وقت سے متعلق نہیں ہے کہ جب حضرت آدم پیدا کئے گئے مگر یہ علیحدہ ملائک کو حکم کیا گیا کہ جب کوئی انسان اپنے حقیقی انسانیت کے مرتبہ تک پہنچے اور اعتدالِ انسانی اس کو حاصل ہو جائے اور خدائے تعالیٰ کی رُوح اُس میں سکونت اختیار کرے تو تم اُس کامل کے آگے سجدہ میں گرا کرو یعنی آسمانی انوار کے ساتھ اُس پر اُترو اور اس پر صلوٰۃ بھیجو۔ سو یہ اُس قدیم قانون کی طرف اشارہ ہے جو خدائے تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کے ساتھ ہمیشہ جاری رکھتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی زمانہ میں اعتدالِ رُوحانی حاصل کر لیتا ہے اور خدائے تعالیٰ کی رُوح اس کے اندر آباد ہوتی ہے یعنی اپنے نفس سے فانی ہو کر بقاء باللہ کا درجہ حاصل کرتا ہے تو ایک خاص طور پر نزول ملائکہ کا اس پر شروع ہو جاتا ہے۔ اگرچہ سلوک کی ابتدائی حالت میں بھی ملائک اس کی نصرت اور خدمت میں لگے ہوئے ہوتے ہیں لیکن یہ نزول ایسا اتم اور اکمل ہوتا ہے کہ سجدہ کا حکم رکھتا ہے اور سجدہ کے لفظ سے خدائے تعالیٰ نے یہ ظاہر کر دیا کہ ملائکہ انسانِ کامل سے افضل نہیں ہیں بلکہ وہ شاہی خادموں کی طرح سجداتِ تعظیم انسانِ کامل کے آگے بجا لا رہے ہیں۔

(توضیح مرام صفحہ ۴۹، ۵۰)

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِيْنَ۔

یعنی جب میں نے اس کا قالب بنایا اور تجلیات کے تمام مظاہر درست کر لئے اور اپنی رُوح اس میں پھونک دی تو تم سب لوگ اس کے لئے زمین پر سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤ سو اس آیت میں بھی یہی اشارہ ہے کہ جب اعمال کا پورا قالب تیار ہو جاتا ہے تو اس قالب میں وہ رُوح چمک اُٹھتی ہے جس کو خدائے تعالیٰ اپنی ذات کی طرف منسوب کرتا ہے کیونکہ دنیوی زندگی کے فنا کے بعد وہ قالب تیار ہوتا ہے اِس لئے الٰہی روشنی جو پہلے دھیمی تھی یک دفعہ بھڑک اُٹھتی ہے اور واجب ہوتا ہے کہ خدا کی ایسی شان کو دیکھ کر ہر ایک سجدہ کرے اور اس کی طرف کھنچا جائے۔ سو ہر ایک اس نور کو دیکھ کر سجدہ کرتا ہے اور طبعاً اس طرف آتا ہے بجز ابلیس کے جو تاریکی سے دوستی رکھتا ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۸)

۷۶ قَالَ يٰٓإِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ

أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ○

خدا نے آدم کو جمعہ کے دِن عصر کے وقت بنایا کیونکہ اس کو منظور تھا کہ آدم کو جلال اور جمال کا جامع بنا دے

جیسا کہ اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے کہ خَلَقْتُ بِیَدَیَّ یعنی آدم کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کے ہاتھ انسان کی طرح نہیں ہیں پس دونوں ہاتھ سے مراد جمالی اور جلالی تجلّی ہے۔ پس اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آدم کو جلالی اور جمالی تجلّی کا جامع پیدا کیا گیا۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۱ حاشیہ)

ایک علوّ تو اس رنگ میں ہوتا ہے جیسے کہ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اور ایک علوّ شیطان کا ہوتا ہے جیسے اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ اور اس کے بارے میں ہے اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ یہ اس سے سوال ہے کہ تیرا علوّ تکبّر کے رنگ میں ہے یا واقعی ہے۔ خدا تعالیٰ کے بندوں کے واسطے بھی اعلیٰ کا لفظ آیا اور ہمیشہ آتا ہے جیسے اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى مگر یہ تو انکسار سے ہوتا ہے اور وہ تکبّر سے ملا ہوا ہوتا ہے۔

(البدر جلد اوّل ۱ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

۱۳ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ○

یاد رکھو تکبّر شیطان سے آیا ہے اور شیطان بنا دیتا ہے جب تک انسان اس سے دُور نہ ہو یہ قبولِ حق اور فیضانِ الوہیّت کی راہ میں روک ہو جاتا ہے کسی طرح سے بھی تکبّر نہیں کرنا چاہیئے نہ علم کے لحاظ سے نہ دولت کے لحاظ سے نہ وجاہت کے لحاظ سے نہ ذات اور خاندان اور حسب و نسب کی وجہ سے کیونکہ زیادہ تر ان ہی باتوں سے تکبّر پیدا ہوتا ہے اور جب تک انسان ان گھمنڈوں سے اپنے آپ کو پاک وصاف نہ کرے گا اس وقت وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک برگزیدہ نہیں ہو سکتا اور وہ معرفت جو جذبات کے موادِ ردیّہ کو جلا دیتی ہے اس کو عطا نہیں ہوتی کیونکہ یہ شیطان کا حصّہ ہے اس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا شیطان نے بھی تکبّر کیا تھا اور آدم سے اپنے آپ کو بہتر سمجھا اور کہہ دیا اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ اس کا نتیجہ ہوا کہ یہ خدا تعالیٰ کے حضور سے مردود ہو گیا اور آدم لغزش پر (چونکہ اسے معرفت دی گئی تھی) اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے لگا اور خدا تعالیٰ کے فضل کا وارث ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ خدا تعالیٰ کے فضل کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اس لئے دعا کی رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ یہی وہ سِر ہے جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کو کہا گیا کہ اے نیک استاد، تو انہوں نے کہا تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲ تا ۴)

۱۹ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَ مِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○

شیطان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ میں جہنّم کو تجھ سے اور اُن لوگوں سے جو تیری پیروی کریں بھر دوں گا۔

دیکھئے اِس آیت سے صاف طور پر کھل گیا اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء نہیں ہے کہ خواہ نخواہ لوگوں کو جبر کے طور پر جہنم میں ڈالے بلکہ جو لوگ اپنی بد اعمالیوں سے جہنم کے لائق ٹھہریں اُن کو جہنم میں گرایا جاوے گا۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۱۵۱)

۸۷ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ۝

اُولیاء اللہ کی بھی ایسی ہی حالت ہوتی ہے کہ اُن میں تکلفات نہیں ہوتے۔ وہ بہت ہی سادہ اور صاف دل لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے لباس اور دوسرے امور میں کسی قسم کی بناوٹ اور تصنّع نہیں ہوتا مگر اس وقت اگر پیرزادوں اور مشائخوں کو دیکھا جاوے تو ان میں بڑے بڑے تکلفات پائے جاتے ہیں ان کا کوئی قول اور فعل ایسا نہ پاؤ گے جو تکلّف سے خالی ہو گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُمتِ محمدیہ ہی میں سے نہیں ہیں ان کی کوئی اَور ہی شریعت ہے ان کی پوشاک دیکھو تو اس میں خاص قسم کا تکلّف ہوگا یہاں تک کہ لوگوں سے ملنے جُلنے اور کلام میں بھی ایک تکلّف ہوتا ہے۔ ان کی خاموشی محض تکلّف سے ہوتی ہے گویا ہر قسم کی تاثیرات کو وہ تکلّف ہی سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان ہے وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ اور ایسا ہی دوسرے تمام انبیاء و رسل جو وقتاً فوقتاً آئے وہ نہایت سادگی سے کلام کرتے اور اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کے قول و فعل میں کوئی تکلّف اور بناوٹ نہ ہوتی تھی مگر اِن کے چلنے پھرنے اور بولنے میں تکلّف ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اپنی شریعت جُدا ہے جو اسلام سے الگ اور مخالف ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۷ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

سُورۃ الزُّمر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۴ أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ ۚ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ۝

بُت پرست قدیم سے یہ بھی خیال کرتے تھے کہ خدا کی اصولی صفات یعنی جو اصل جڑ تمام صفات کی ہیں وہ صرف چار ہیں۔ پیدا کرنا پھر مناسبِ حال سامان عطا کرنا۔ پھر ترقی کے لئے عمل کرنے والوں کی مدد کرنا۔ پھر آخر میں جزاء سزا دینا۔ اور وہ اِن چار صفات کو چار دیوتاؤں کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اسی بناء پر نوح کی قوم کے بھی چار ہی دیوتا تھے اور انہیں صفات کے لحاظ سے عرب کے بُت پرستوں نے بھی لات، منات و عزّیٰ اور ہبل بنا رکھے تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ چار دیوتا بالارادہ دُنیا میں اپنے اپنے رنگوں میں پرورش کر رہے ہیں اور ہمارے شفیع ہیں اور ہمیں خدا تک بھی یہی پہنچاتے ہیں چنانچہ یہ مطلب آیت لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی سے ظاہر ہے۔

(نسیمِ دعوت صفحہ ۹۱ حاشیہ)

۷ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنْزَلَ

لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○

فرقانِ مجید میں خالقیت باری تعالیٰ پر بمادہ قیاس استثنائی قائم کی گئی ہے اور قیاس استثنائی اُس قیاس کو کہتے ہیں کہ جس میں عین نتیجہ یا نقیض اس کی بالفعل موجود ہو اور دو مقدموں سے مرکب ہو یعنی ایک شرطیہ اور دوسرے وضعیہ سے۔ چنانچہ آیت شریف جو اس قیاس پر متضمن ہے یہ ہے دیکھو سورۃ الزمرع يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ یعنی وہ تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین اندھیرے پردوں میں پیدا کرتا ہے۔ اس حکمتِ کاملہ سے کہ ایک پیدائش اَور قسم کی اور ایک اَور قسم کی بناتا ہے یعنی ہر عضو کو صورتِ مختلف اور خاصیتیں اور طاقتیں الگ الگ بخشتا ہے یہاں تک کہ قالبِ بے جان میں جان ڈال دیتا ہے نہ اس کو اندھیرا کام کرنے سے روکتا ہے اور نہ مختلف قسموں اور خاصیتوں کے اعضاء بنانا اس پر مشکل ہوتا ہے۔ اور نہ سلسلہ پیدائش کے ہمیشہ جاری رکھنے میں اس کو کچھ دِقت اور حرج واقع ہوتا ہے ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ وہی جو ہمیشہ اس سلسلہ قدرت کو برپا اور قائم رکھتا ہے وہی تمہارا رب ہے یعنی اسی قدرتِ تامہ سے اس کی ربوبیتِ تامہ جو عدم سے وجود اور وجود سے کمال وجود بخشنے کو کہتے ہیں ثابت ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ رب الاشیاء نہ ہوتا اور اپنی ذات میں ربوبیتِ تامہ نہ رکھتا اور صرف مثل ایک بڑھئی یا کاریگر کے اِدھر اُدھر سے لے کر گذارہ کرتا تو اُس کو قدرتِ تام ہرگز حاصل نہ ہوتی اور ہمیشہ اور ہر وقت کامیاب نہ ہوسکتا بلکہ کبھی نہ کبھی ضرور ٹوٹ آجاتی اور پیدا کرنے سے عاجز رہ جاتا۔ خلاصہ آیت کا یہ کہ جس شخص کا فعل ربوبیتِ تامہ سے نہ ہو یعنی از خود پیدا کنندہ نہ ہو اس کو قدرتِ تامہ بھی حاصل نہیں ہوسکتی لیکن خدا کو قدرتِ تامہ حاصل ہے کیونکہ قسم قسم کی پیدائش بنانا اور ایک بعد دوسرے کے بلاتخلّف ظہور میں لانا اور کام کو ہمیشہ برابر چلانا قدرتِ تامہ کی کامل نشانی ہے۔ پس اِس سے ثابت ہوا کہ خدائے تعالیٰ کو ربوبیتِ تامہ حاصل ہے اور درحقیقت وہ رب الاشیاء ہے نہ صرف بڑھئی اور معمار اشیاء کا۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ کارخانہ دُنیا کا ہمیشہ بلاحرج چلتا رہتا بلکہ دُنیا اور اس کے کارخانہ کا کبھی کا خاتمہ ہوجاتا کیونکہ جس کا فعل اختیار تام سے نہیں وہ ہمیشہ اور ہر وقت اور ہر تعداد پر ہرگز قادر نہیں ہوسکتا۔

اور شکل اس قیاس کی جو آیت شریف میں درج ہے بقاعدہ منطقیہ اس طرح پر ہے کہ جس شخص کا فعل کسی وجود

کے پیدا کرنے میں بطور قدرتِ تامہ ضروری ہو اس کے لئے صفت ربوبیّتِ تامہ کی یعنی عدم سے ہست کرنا بھی ضروری ہے لیکن خدا کا فعل مخلوقات کے پیدا کرنے میں بطور قدرتِ تامہ ضروری ہے پس نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے لئے صفت ربوبیّتِ تامہ کی بھی ضروری ہے۔

ثبوت صغریٰ کا یعنی اِس بات کا کہ جس صانع کے لئے قدرتِ تامہ ضروری ہے اُس کے لئے صفت ربوبیّتِ تامہ کی بھی ضروری ہے اس طرح پر ہے کہ عقل اِس بات کی ضرورت کو واجب ٹھہراتی ہے کہ جب کوئی ایسا صانع کہ جس کی نسبت ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ اس کو اپنی کسی صنعت کے بنانے میں حرج واقع نہیں ہوتا کسی چیز کا بنانا شروع کرے تو سب اسبابِ تکمیل صنعت کے اس کے پاس موجود ہونے چاہئیں اور ہر وقت اور ہر تعداد تک میسّر کرنا اُن چیزوں کا جو وجود مصنوع کے لئے ضروری ہیں اُس کے اختیار میں ہونا چاہیئے اور ایسا اختیار تام بجز اس صورت کے اَور کسی صورت میں متحمل نہیں کہ صانع اس مصنوع کا اس کے اجزاء پیدا کرنے پر قادر ہو کیونکہ ہر وقت اور ہر تعداد تک ان چیزوں کا میسّر ہو جانا کہ جن کا موجود کرنا صانع کے اختیارِ تام میں نہیں عند العقل ممکن التخلف ہے اور عدمِ تخلف پر کوئی بُرہان فلسفی قائم نہیں ہوتی اور اگر ہو سکتی ہے تو کوئی صاحب پیش کرے۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کہ مفہوم اِس عبارت کا کہ فلاں امر کا کرنا زید کے اختیارِ تام میں نہیں۔ اس عبارت کے مفہوم سے مساوی ہے کہ ممکن ہے کہ کسی وقت وہ کام زید سے نہ ہو سکے۔ پس ثابت ہوا کہ صانع تام کا بجز اس کے ہرگز کام نہیں چل سکتا کہ جب تک اس کی قدرت بھی تام نہ ہو۔ اِسی واسطے کوئی مخلوق اہلِ حرفہ میں سے اپنے حرفہ میں صانع تام ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بلکہ کُل اہلِ صنائع کا دستور ہے کہ جب کوئی بار بار اُن کی دُکان پر جا کر اُن کو دِق کرے کہ فلاں چیز ابھی مجھے بنا دو تو آخر اس کے تقاضے سے تنگ آکر اکثر بول اُٹھتے ہیں کہ "میاں مَیں کچھ خدا نہیں ہوں کہ صرف حکم سے کام کر دوں۔ فلاں فلاں چیز ملے گی تو پھر بنا دوں گا۔"

غرض سب جانتے ہیں کہ صانع تمام کے لئے قدرتِ تام اور ربوبیّت شرط ہے۔ یہ بات نہیں کہ جب تک زید نہ مرے بکر کے گھر لڑکا پیدا نہ ہو یا جب تک خالد فوت نہ ہو ولید کے قالب میں جو ابھی پیٹ میں ہے جان نہ پڑ سکے پس بالضرورت صغریٰ ثابت ہوا۔

اور کُبریٰ شکل کا یعنی یہ کہ خدا مخلوقات کے پیدا کرنے میں بطور قدرتِ تامہ کے ضروری ہے خود ثبوت صغریٰ سے ثابت ہوتا ہے اور نیز ظاہر ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ میں قدرت ضروریہ تامہ نہ ہو تو پھر قدرت اس کی بعض اتفاقی امور کے حصول پر موقوف ہو گی اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں عقل تجویز کر سکتی ہے کہ اتفاقی امور وقت پر خدائے تعالیٰ کو میسّر نہ ہو سکیں کیونکہ وہ اتفاقی ہیں ضروری نہیں۔ حالانکہ تعلق پکڑنا رُوح کا جنین کے جسم سے بروقت طیاری جسم اس کے کے لازم وملزوم ہے۔ پس ثابت ہوا کہ فعل خدائے تعالیٰ کا بطور قدرتِ تامہ کے ضروری ہے اور نیز اس دلیل سے ضرورت قدرت

تامّہ کی خدائے تعالیٰ کے لئے واجب ٹھہرتی ہے کہ بموجب اصول متقررہ فلسفہ کے ہم کو اختیار ہے کہ یہ فرض کریں کہ مثلاً ایک مدّت تک تمام ارواح موجودہ ابدان متناسبہ اپنے سے متعلق ہیں۔ پس جب ہم نے یہ امر فرض کیا تو یہ فرض ہمارا اس دوسرے فرض کو بھی مستلزم ہوگا کہ اب تا انقضائے اس مدّت کے ان جنینوں میں جو رحموں میں طیار ہوئے ہیں کوئی رُوح داخل نہیں ہوگا حالانکہ جنینوں کا بغیر تعلق رُوح کے معطّل پڑے رہنا بہ بداہت عقل باطل ہے۔ پس جو امر مستلزم باطل ہے وہ بھی باطل پس ثبوت مقدمین سے یہ نتیجہ ثابت ہو گیا کہ خدائے تعالیٰ کے لئے صفت ربوبیّت تامّہ کی ضروری ہے اور یہی مطلب تھا۔ (پُرانی تحریریں صفحہ ۱۳ تا ۱۶)

وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ..... اور تمہارے لئے چار پائے اُتارے ..... ظاہر ہے کہ اُترنے کا لفظ آسمان سے اُترنے پر ہرگز دلالت نہیں کرتا اور اُترنے کے ساتھ آسمان کا لفظ زیادہ کر لینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی بھوکے سے پُوچھا جائے کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو وہ جواب دے کہ چار روٹیاں۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۲۸۴ حاشیہ)

فَانْظُرُوْا اِلَى الْقُرْاٰنِ الْكَرِيْمِ كَيْفَ يُبَيِّنُ مَعْنَى التَّنْزُوْلِ فِيْ اٰيَاتِهِ الْعُظْمٰى وَ تَدَبَّرُوْا فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ وَ فِيْ قَوْلِهٖ عَزَّ اسْمُهٗ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا وَ فِيْ قَوْلِهٖ جَلَّ شَانُهٗ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ..... وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ هٰذِهِ الْاَشْيَاءَ لَا تَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ بَلْ تَحْدُثُ وَ تَوَلَّدُ فِي الْاَرْضِ وَ فِيْ طَبَقَاتِ الثَّرٰى۔ وَ اِنْ اَمْعَنْتُمُ النَّظَرَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَيَكْشِفُ عَلَيْكُمْ اَنَّ حَقِيْقَةَ نُزُوْلِ الْمَسِيْحِ مِنْ هٰذِهِ الْاَقْسَامِ الَّذِيْ ذَكَرْنَاهُ هٰهُنَا فَتَدَبَّرُوْا فِيْ قَوْلِنَا وَ اَمْعِنُوْا نَظَرًا۔ وَمَا يَنْبَغِيْ اَنْ يَّكُوْنَ الْاِخْتِلَافُ فِيْ كَلَامِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَلَنْ تَجِدُوْا فِيْ مَعَارِفِهٖ تَنَاقُضًا۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۴۴۱، ۴۴۲)

خدا نے تم لوگوں کو ایک وجود سے پَیدا کیا پھر اُس وجود سے اس کا جوڑا بنایا ..... وہی تم کو تین اندھیروں میں

(ترجمہ از مرتّب) تم قرآن کریم پر غور کرو اور دیکھو کہ کس طرح وہ اپنی جلیل القدر آیات میں لفظ نزول کے معنے بیان کرتا ہے اور تم اللہ تعالیٰ کے قول اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ اور اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا اور اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ پر تدبّر کرو .... تم جانتے ہو کہ یہ چیزیں آسمان سے نہیں اُترتیں بلکہ زمین میں سے ظاہر ہوتی اور اس میں سے پَیدا ہوتی ہیں اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی کتاب کو بنظرِ غور دیکھو تو تم پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ نزولِ مسیح کی حقیقت بھی انہی قسموں میں سے ہے جن کا ہم نے یہاں ذکر کیا ہے۔ پس تم ہمارے قول میں تدبّر کرو اور گہری نظر ڈالو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں اختلاف ہو اور اس کے معارف میں تم ہرگز کوئی تناقض نہیں پاؤ گے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۴۱، ۴۴۲)

تمہاری ماؤں کے پیٹ میں پیدا کرتا ہے۔ ایک قسم کی پیدائش کے بعد دوسری پیدائش۔ سو اِس آیت میں تو کہیں پسلی اور ہڈی وغیرہ کا ذکر نہیں صرف اسی قدر لکھا ہے کہ ایک اِنسان سے دوسرے اِنسان کو پیدا کیا۔ ہاں یہ ذکر پایا جاتا ہے کہ خدا نے اپنا پہلا قانون بدلا دیا کیونکہ پہلے اِنسان نطفہ سے پیدا نہیں ہُوا تھا بلکہ ایک وجود سے دوسرا وجود پیدا کیا گیا تھا تا نوعیت میں فرق نہ آوے اور پھر بعد میں یہ دوسرا قانونِ قدرت شروع ہُوا کہ اِنسان نطفہ سے پیدا ہونے لگے اور یہ محلِ اعتراض نہیں کہ خدا نے پہلا قانونِ قدرت کیوں منسوخ کر دیا کیونکہ خدا اپنے قانون کو اِس لئے منسوخ کرتا ہے کہ تا اُس کے انواع واقسام کی قدرتیں ظاہر ہوں۔

ممدوحہ بالا آیت کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ کئی قسم کی پیدائش کے بعد رحم کے اندر پُورا اِنسان بنتا ہے اور تین اندھیر میں اس کی پیدائش ہوتی ہے (۱) پیٹ (۲) رحم (۳) جھلّی جس کے اندر بچّہ پیدا ہوتا ہے۔

اور یاد رہے کہ پسلی اور ہڈی سے خدا کی کتابوں میں قریبی رشتہ بھی مُراد لئے گئے ہیں جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدم اور حوّا کا رشتہ نہایت قریب تھا مگر چونکہ ہم خدا تعالیٰ کو ہر ایک چیز پر قادر سمجھتے ہیں اِس لئے ہم اِس امر کو بھی کچھ بعید نہیں سمجھتے کہ حوّا آدم کی پسلی سے یا آدم حوّا کی پسلی سے پیدا ہو گیا ہو۔ خدا کا کلام اِس جگہ نہایت وسیع معنوں پر مشتمل ہے۔ آیت کے معنے وسیع طور پر یہ ہیں کہ ایک سے ہم نے دوسرے کو پیدا کیا۔ اگر کسی کو یہ اعتراض ہو کہ پسلی سے پیدا کرنا قانونِ قدرت کے خلاف ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نطفہ سے پیدا ہونا بھی اُس قانونِ قدرت کے برخلاف ہے جو بموجب اصول آریہ کے پہلے ظہور میں آیا پس جس نے ایک قانونِ قدرت بدلا کر دوسرا قانونِ قدرت پیدائش کے لئے مقرر کیا تو پھر کیا اس کی شان سے کچھ تعجب کی جگہ ہے کہ جس طرح اس نے بموجب اصول آریہ کے پہلی پیدائش میں کھمبوں کی طرح انسانوں کو پیدا کیا ایسا ہی اس نے بموجب اصول اسلام کے پہلی پیدائش میں ایک انسان کی پسلی سے دوسرا انسان پیدا کر دیا کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۲۱۵، ۲۱۶)

ہم نے چارپائے گھوڑے گدھے وغیرہ اُتارے۔ کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ یہ سب آسمان سے ہی اُترے تھے۔ کیا کوئی حدیث صحیح مرفوع مل سکتی ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ سب درحقیقت آسمان سے ہی اُترے ہیں۔

(الحق دہلی صفحہ ۳۵)

۲۱۔ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ۝

جس پیشگوئی میں وعدہ ہو یعنی کسی انعام اکرام کی نسبت پیشگوئی ہو وہ کسی طرح ٹل نہیں سکتی۔ خدا تعالیٰ نے

یہ فرمایا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ مگر کسی جگہ یہ نہیں فرمایا کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْوَعِیْدَ۔ پس اِس میں راز یہی ہے کہ وعید کی پیشگوئی خوف اور دُعا اور صدقہ خیرات سے ٹل سکتی ہے۔ تمام پیغمبروں کا اِس پر اتفاق ہے کہ صدقہ اور دُعا اور خوف اور خشوع سے وہ بَلا جو خدا کے علم میں ہے جو کسی شخص پر آئے گی وہ رَدّ ہو سکتی ہے۔

(تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۴۲)

نمبر۹ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَہٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ ثُمَّ یُخْرِجُ بِہٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُہٗ ثُمَّ یَہِیْجُ فَتَرٰىہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَجْعَلُہٗ حُطَامًا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ۝

اِن آیات میں بھی مثال کے طور پر یہ ظاہر کیا ہے کہ انسان کھیتی کی طرح رفتہ رفتہ اپنی عمر کو پُورا کر لیتا ہے اور پھر مَر جاتا ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۱۲)

نمبر۱۰ اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِہًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْہُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّہُمْ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُہُمْ وَقُلُوْبُہُمْ اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ ذٰلِکَ ھُدَی اللّٰہِ یَہْدِیْ بِہٖ مَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ ھَادٍ۝

یَعْنِیْ ذَالِکَ الْکِتَابُ کِتَابٌ مُّتَشَابِہٌ یُشْبِہُ بَعْضُہٗ بَعْضًا لَیْسَ فِیْہِ تَنَاقُضٌ وَّلَا اخْتِلَافٌ مَثْنِیٌّ فِیْہِ کُلُّ ذِکْرٍ لِیَکُوْنَ بَعْضُ الذِّکْرِ تَفْسِیْرًا لِّبَعْضِہٖ تَقْشَعِرُّ مِنْہُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّہُمْ یَعْنِیْ

(ترجمہ از ایڈیٹر "الحق") یعنی یہ کتاب متشابہ ہے جس کی آیتیں اور مضامین ایک دوسرے سے ملتے جُلتے ہیں۔ ان میں کوئی تناقض اور اختلاف نہیں۔ ہر ذکر اور وعظ اس میں دوہرا دوہرا کر بیان کئے گئے ہیں جس سے غرض یہ ہے کہ ایک

يَسْتَوْلِیْ جَلَالُهٗ وَهَيْبَتُهٗ عَلٰی قُلُوْبِ الْعُشَّاقِ لِتَقْشَعِرَّ جُلُوْدُ هُمْ مِنْ كَمَالِ الْخَشْيَةِ وَالْخَوْفِ يُجَاهِدُوْنَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ لَيْلًا وَّنَهَارًا بِتَحْرِيْكِ تَاْثِيْرَاتٍ جَلَالِيَّةٍ وَّتَنْبِيْهَاتٍ قَهْرِيَّةٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ ثُمَّ يُبَدِّلُ اللّٰهُ حَالَتَهُمْ مِنَ التَّاَلُّمِ اِلَی التَّلَذُّذِ فَيَصِيْرُ الطَّاعَةُ جُزْوَ طَبِيْعَتِهِمْ وَخَاصَّةَ فِطْرَتِهِمْ فَتَلِيْنُ جُلُوْدُ هُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ يَعْنِیْ لِيَسِيْلَ الذِّكْرُ فِیْ قُلُوْبِهِمْ كَسَيَلَانِ الْمَاءِ وَيَصْدُرُ مِنْهُمْ كُلُّ اَمْرٍ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ بِكَمَالِ السُّهُوْلَةِ وَالصَّفَاءِ لَيْسَ فِيْهِ ثِقْلٌ وَّلَا تَكَلُّفٌ وَّلَا ضَيْقٌ فِیْ صُدُوْرِهِمْ بَلْ يَتَلَذَّذُوْنَ بِاِمْتِثَالِ اَمْرِ اِلٰهِهِمْ وَيَجِدُوْنَ لَذَّةً وَّحَلَاوَةً فِیْ طَاعَةِ مَوْلٰهُمْ وَهٰذَا هُوَ الْمُنْتَهٰی الَّذِیْ يَنْتَهِیْ اِلَيْهِ اَمْرُ الْعَابِدِيْنَ وَالْمُطِيْعِيْنَ فَيُبَدِّلُ اللّٰهُ اٰلَامَهُمْ بِاللَّذَّاتِ۔

(الحق لدھیانہ ص ۳۵، ۳۶)

قرآن کریم اخلاقی تعلیم میں قانونِ قدرت کے قدم بہ قدم چلا ہے۔ رحم کی جگہ جہاں تک قانونِ قدرت اجازت دیتا ہے رحم ہے اور قہر اور سزا کی جگہ اس اصول کے لحاظ سے قہر اور سزا اور اپنی اندرونی اور بیرونی تعلیم میں ہر یک پہلو سے کامل ہے اور اس کی تعلیمات نہایت درجہ کے اعتدال پر واقع ہیں جو انسانیت کے سارے درخت کی آبپاشی کرتی ہیں نہ کسی ایک شاخ کی اور تمام قویٰ کی مربّی ہیں نہ کسی ایک قوت کی۔ اور درحقیقت اسی اعتدال اور موزونیت کی طرف اشارہ ہے کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا۔ پھر بعد اس کے مَثَانِیْ کے لفظ میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات معقولی اور رُوحانی دونوں طور کی روشنی اپنے اندر رکھتی ہیں۔ پھر بعد اس کے فرمایا کہ قرآن میں اس قدر

مقام کا ذکر دوسرے مقام کے ذکر کی تفسیر ہوجائے۔ اس کے پڑھنے سے ان لوگوں کی کھالوں پر جو اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں یعنی اس کا جلال اور اس کی ہیبت عاشقوں کے دِلوں پر غالب ہوجاتی ہے اِس لئے کہ ان کی کھالوں پر کمال خوف اور دہشت سے رونگٹے کھڑے ہوجائیں۔ وہ قرآن کی قہری تنبیہات اور جلالی تاثیرات کی تحریک سے رات دن اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں بہ دل و جان کوشش کرتے رہتے ہیں۔ پھر ان کی یہ حالت ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس حالت کو جو پہلے دُکھ درد کی حالت ہوتی ہے لذّت اور سرور سے بدل ڈالتا ہے چنانچہ اس وقت طاعتِ الٰہی ان کی جزوِ بدن اور خاصہ فطرت ہوجاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ان کے دِلوں اور بدنوں پر رِقّت طاری ہوتی ہے یعنی ذکر ان کے دِلوں میں پانی کی طرح بہنا شروع ہوجاتا ہے اور ہر بات طاعتِ الٰہی کی ان لوگوں سے نہایت سہولت اور صفائی سے صادر ہوتی ہے نہ یہ کہ اس میں کوئی بوجھ ہو یا ان کے سینوں میں اس سے کوئی تنگی واقع ہو بلکہ وہ تو اپنے معبود کے امر کی فرمانبرداری میں لذّت حاصل کرتے ہیں اور اپنے مولیٰ کی طاعت میں انہیں حلاوت آتی ہے پس عابدوں اور مطیعوں کی غایت کار اور معراج یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دُکھوں کو لذّتوں سے بدل ڈالے۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۳۵، ۳۶)

عظمت حق کی بھری ہوئی ہے کہ خدا تعالیٰ کی آیتوں کے سُننے سے اُن کے دلوں پر قشعریرہ پڑ جاتا ہے اور پھر اُن کی جِلدیں اور اُن کے دِل یادِ الٰہی کے لئے نرم ہو جاتے ہیں۔ (کرامات الصادقین صفحہ ۱۶، ۱۷)

اس سے خدا خوف بندوں کی جِلدیں کانپتی ہیں پھر ان کی جِلدیں اور ان کے دِل ذکرِ الٰہی کے لئے نرم ہو جاتے ہیں۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور اُن کے جوابات صفحہ ۸ حاشیہ)

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ ۝

خدا تعالیٰ کی عادت نہیں ہے کہ دوبارہ دُنیا میں لوگوں کو بھیجا کرے ورنہ ہمیں تو عیسٰی کی نسبت حضرت سیّدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کے دوبارہ دُنیا میں آنے کی زیادہ ضرورت تھی اور اسی میں ہماری خوشی تھی مگر خدا تعالیٰ نے اِنَّكَ مَيِّتٌ کہہ کر اس امید سے محروم کر دیا۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۲۰)

أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۖ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝

أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ کیا خدا اپنے بندہ کو کافی نہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۱۶ حاشیہ درحاشیہ)

میرے والد صاحب میرزا غلام مرتضیٰ مرحوم کی وفات کا جب وقت قریب آیا اور صرف چند پہر باقی رہ گئے تو خدا تعالیٰ نے اُن کی وفات سے مجھے ان الفاظ عزا پرسی کے ساتھ خبر دی وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ یعنی قسم ہے آسمان کی اور قسم ہے اُس حادثہ کی جو آفتاب کے غروب کے بعد ظہور میں آئے گا اور چونکہ ان کی زندگی سے بہت سے وجوہ معاشی ہمارے وابستہ تھے اِس لئے بشریت کے تقاضا سے یہ خیال دِل میں گذرا کہ اُن کی وفات ہمارے لئے بہت سے مصائب کا موجب ہوگی کیونکہ وہ رقم کثیر آمدنی کی ضبط ہو جائے گی جو اُن کی زندگی سے وابستہ تھی۔ اِس خیال کے آنے کے ساتھ ہی یہ الہام ہوا أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ یعنی کیا خدا اپنے بندے کو کافی نہیں ہے۔ تب وہ خیال یُوں اُڑ گیا جیسا کہ روشنی کے نکلنے سے تاریکی اُڑ جاتی ہے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۳۴)

کیا خدا اپنے بندے کو کافی نہیں ہے۔ (کتاب البریّہ صفحہ ۱۷۶ حاشیہ، حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۱۰)

وہ خود اپنے بندے کے لئے کافی ہے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۹۶)

وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ کافر تجھے خدا کے سوا اَور چیزوں سے ڈراتے ہیں۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۶ حاشیہ)

(پارہ ۱۲) قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ○

کہہ اے میری قوم تم بجائے خود کام کرو اور میں بجائے خود کام کرتا ہوں۔ سو تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کس پر اس دنیا میں عذاب نازل ہوتا ہے کہ جو اس کو رسوا کرے اور کس پر جاودانی عذاب نزول کرتا ہے یعنی آخرت کا عذاب۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۹ حاشیہ)

(پارہ ۲۴) اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِىْ لَمْ تَمُتْ فِىْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِىْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ○

فوت شدہ تو دوبارہ دنیا میں نہیں آسکتا..... اور نہ خدا تعالیٰ انبیاء پر دو موتیں وارد کرتا ہے اور اس کا حکم یہی ہے کہ جو شخص اِس دنیا سے گیا وہ گیا جیسا کہ وہ فرماتا ہے فَيُمْسِكُ الَّتِىْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ یعنی جس پر موت وارد کی گئی وہ پھر کبھی دنیا میں آ نہیں سکتا۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۴۶۱)

یہ قدرت کہ جس کو ایک دفعہ مار دیا پھر خواہ نخواہ دو موتوں کا عذاب اس پر نازل کرے ہرگز اس کے منشاء کے موافق نہیں جیسا کہ وہ خود اِس بارہ میں فرماتا ہے فَيُمْسِكُ الَّتِىْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ یعنی جس کو ایک دفعہ مار دیا پھر اس کو دنیا میں نہیں بھیجے گا۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۵۳۴)

آیت فَيُمْسِكُ الَّتِىْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ بیّنات محکمات میں سے ہے اور نہ صرف ایک آیت بلکہ اِس قسم کی بہت سی آیات قرآن شریف میں موجود ہیں کہ جو مر گیا وہ ہرگز پھر دنیا میں واپس نہیں آئے گا۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۶۴۰)

جس پر موت وارد ہو گئی خدا تعالیٰ دنیا میں آنے سے اُسے روک دیتا ہے۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۹۴۲ حاشیہ)

اِنَّ اٰيَاتِ الْقُرْاٰنِ كُلَّهَا تَدُلُّ عَلٰى اَنَّ الْمَيِّتَ لَا يَرْجِعُ اِلَى الدُّنْيَا اَصْلًا سَوَاءٌ كَانَ فِى الْجَنَّةِ

اَوْ فِیْ جَھَنَّمَ اَوْ خَارِجًا مِنْھُمَا وَقَدْ قَرَأْنَا عَلَیْكَ اٰنِفًا اٰیَةً: فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ ـ وَ اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ۔ وَلَا شَكَّ اَنَّ ھٰذِہِ الْاٰیَاتِ تَدُلُّ بِدَلَالَةٍ صَرِیْحَةٍ عَلٰی اَنَّ الذَّاھِبِیْنَ مِنْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا لَا یَرْجِعُوْنَ اِلَیْھَا اَبَدًا بِالرُّجُوْعِ الْحَقِیْقِیِّ وَ اَعْنِیْ مِنَ الرُّجُوْعِ الْحَقِیْقِیِّ رُجُوْعَ الْمَوْتٰی اِلَی الدُّنْیَا بِجَمِیْعِ شَھَوَاتِھَا وَلَوَازِمِھَا وَمَعَ کَسْبِ الْاَعْمَالِ مِنْ خَیْرٍ وَّ شَرٍّ وَّمَعَ اِسْتِحْقَاقِ الْاَجْرِ عَلٰی مَا کَسَبُوْا وَمَعَ ذٰلِكَ اَعْنِیْ مِنَ الرُّجُوْعِ الْحَقِیْقِیِّ لُحُوْقَ الْمَوْتٰی بِالَّذِیْنَ فَارَقُوْھُمْ مِنَ الْاٰبَاءِ وَ الْاَبْنَاءِ وَ الْاِخْوَانِ وَ الْاَزْوَاجِ وَ الْعَشِیْرَةِ الَّذِیْنَ ھُمْ مَوْجُوْدُوْنَ فِی الدُّنْیَا وَکَذٰلِكَ رُجُوْعُھُمْ اِلٰی اَمْوَالِھِمُ الَّتِیْ کَانُوا اقْتَرَفُوْھَا وَمَسَاکِنِھِمُ الَّتِیْ کَانُوْا بَنَوْھَا وَزُرُوْعِھِمُ الَّتِیْ کَانُوْا زَرَعُوْھَا وَخَزَائِنِھِمُ الَّتِیْ کَانُوْا جَمَعُوْھَا۔ ثُمَّ مِنْ شَرَائِطِ الرُّجُوْعِ الْحَقِیْقِیِّ اَنْ یَّعِیْشُوْا فِی الدُّنْیَا کَمَا کَانُوْا یَعِیْشُوْنَ مِنْ قَبْلُ۔ وَیَتَزَوَّجُوْا اِنْ کَانُوْا اِلَی النِّکَاحِ مُحْتَاجِیْنَ وَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِهٖ

(ترجمہ از مرتب) قرآن مجید کی مذکورہ بالا تمام آیات اِس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ فوت شدہ دُنیا کی طرف کبھی نہیں لَوٹے گا خواہ وہ جنت میں ہو یا جہنم میں یا ان دونوں سے باہر ہو۔ اور ابھی ابھی ہم نے تمہارے سامنے یہ آیت بیان کی ہے فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ اور اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ[1] بے شک یہ آیات اِس بات پر صریح دلالت کرتی ہیں کہ اِس دُنیا سے جانے والے اس کی طرف حقیقی طور پر کبھی بھی واپس نہیں آئیں گے اور رجوعِ حقیقی سے میری مراد مُردوں کا اِس دُنیا میں اپنی تمام شہوات اور ان کے لوازم اور اچھے اور بُرے اعمال کرنے اور اپنے اعمال پر اجر کے استحقاق کے ساتھ واپس آنا ہے اور اس کے ساتھ ہی میں رجوعِ موتٰی سے یہ مراد بھی لیتا ہوں کہ وہ واپس آکر ان لوگوں سے ملیں جن سے وہ جُدا ہوئے یعنی اپنے باپوں اور بیٹوں سے نیز اپنے بھائیوں، بیویوں یا خاوندوں اور اپنے قبیلہ کے دوسرے لوگوں سے جو اِس دُنیا میں موجود ہیں، اسی طرح وہ دوبارہ اپنے ان اموال پر قبضہ کریں جو انہوں نے کمائے اور اپنے ان گھروں پر قبضہ کریں جن کو انہوں نے بنایا تھا اور اپنے ان کھیتوں پر قبضہ کریں جو انہوں نے بوئے۔ اور اپنے ان خزانوں کو لے لیں جو انہوں نے جمع کئے۔ پھر رجوعِ حقیقی کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ وہ دُنیا میں ویسے ہی زندگی بسر کریں جیسے پہلے کرتے تھے۔ اگر وہ شادی کی ضرورت محسوس کریں تو شادی بھی کریں اور یہ کہ اگر وہ اللہ اور رسول پر ایمان لائیں تو ان کا ایمان قبول کیا جائے اور ان کے اس کفر کا خیال نہ کیا جائے جس پر وہ مرے تھے بلکہ دُنیا میں واپس آنے کے بعد ان کا ایمان لانا اور مومنوں میں شامل ہونا ان کو فائدہ دے۔

---

[1] سورۃ الانبیاء: ۹۶

فَيَقْبَلَ اِيْمَانُهُمْ وَلَا يَنْظُرَ اِلٰى كُفْرِهِمُ الَّذِىْ مَاتُوْا عَلَيْهِ بَلْ يَنْفَعُهُمْ بَعْدَ رُجُوْعِهِمْ اِلَى الدُّنْيَا وَكَوْنِهِمْ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ. وَلٰكِنَّا لَا نَجِدُ فِى الْقُرْاٰنِ شَيْئًا مِنْ هٰذِهِ الْمَوَاعِيْدِ وَلَا سُوْرَةٌ ذُكِرَتْ فِيْهَا هٰذِهِ الْمَسَائِلُ بَلْ نَجِدُ مَا يُخَالِفُهٗ." (حمامة البشرٰى ص۵۰، ۵۱)

اِنَّ اللّٰهَ مَا وَعَدَ بِحَشْرِ الْمَوْتٰى فِى الْقُرْاٰنِ اِلَّا وَعْدًا وَاحِدًا وَهُوَ الَّذِىْ يَظْهَرُ عِنْدَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَاَخْبَرَ عَنْ عَدَمِ رُجُوْعِ الْمَوْتٰى قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَنَحْنُ نُؤْمِنُ بِمَا اَخْبَرَ وَنُنَزِّهُ الْقُرْاٰنَ عَنِ الْاِخْتِلَافَاتِ وَالتَّنَاقُضَاتِ وَنُؤْمِنُ بِاٰيَةِ فَيُمْسِكُ الَّتِىْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ.

(حمامة البشرٰى ص۵۲)

قرآن شریف کے رُو سے مُردہ کا زندہ ہوکر دُنیا میں آباد ہونا بالکل ممتنع ہے اور آیت وَيُمْسِكُ الَّتِىْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ اس دوبارہ رُوح کے آنے سے مانع ہے۔ (کتاب البریہ صفحہ ۲۲۱ حاشیہ)

ہم بموجب نصِ صریح قرآن شریف کے جو آیت فَيُمْسِكُ الَّتِىْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ سے ظاہر ہوتی ہے اِس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ جو لوگ اِس دُنیا سے گذر جاتے ہیں پھر وہ دُنیا میں دوبارہ آباد ہونے کے لئے نہیں بھیجے جاتے۔ اِس لئے خدا نے بھی اُن کے لئے قرآن شریف میں مسائل نہیں لکھے کہ دوبارہ آکر مال تقسیم شدہ ان کا کیونکر ان کو ملے۔ (ایام الصلح صفحہ ۸۸)

جو شخص حقیقی طور پر مَر جاتا ہے اور اِس دُنیا سے گذر جاتا ہے اور مَلک الموت اس کی رُوح کو قبض کر لیتا ہے وہ ہرگز واپس نہیں آتا۔ دیکھو اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے فَيُمْسِكُ الَّتِىْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۲۹)

خدا جانوں کو جب اُن کی موت کا وقت آتا ہے اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے یعنی وہ جانیں بے خود ہو کر الٰہی تصرف

لیکن ہم قرآن مجید میں ان وعدوں میں سے کسی کا ذکر نہیں پاتے اور نہ کوئی سُورت قرآن کریم کی ایسی پاتے ہیں جس میں ان مسائل کا ذکر ہو بلکہ ان امور کے خلاف ہی ذکر دیکھتے ہیں۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۵۰، ۵۱)

(ترجمہ از مرتب) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مُردوں کے حشر کا ایک ہی وعدہ کیا ہے اور وہ وہی وعدہ ہے جس کا ظہور قیامت کے روز ہوگا۔ اور اس نے قیامت سے قبل مُردوں کے واپس نہ آنے کی خبر ہمیں دی ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے فیصلہ پر ایمان رکھتے ہیں اور ہم قرآن کریم کو اختلافات اور تناقضات سے پاک سمجھتے ہیں اور ہم اِس آیت پر ایمان لاتے ہیں کہ فَيُمْسِكُ الَّتِىْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ (یعنی جس نفس پر اللہ موت کا حکم دے دیتا ہے اس کو واپس آنے نہیں دیتا)۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۵۲)

اور قبضہ میں اپنی موت کے وقت آجاتی ہیں اور زندگی کی خود اختیاری اور خودشناسی اُن سے جاتی رہتی ہے اور موت ان پر وارد ہو جاتی ہے یعنی بکلی وہ رُوحیں نیست کی طرح ہو جاتی ہیں اور صفاتِ حیات زائل ہو جاتی ہیں اور ایسی رُوح جو درحقیقت مرتی نہیں مگر مَرنے کے مشابہہ ہوتی ہے وہ رُوح کی وہ حالت ہے کہ جب انسان سوتا ہے تب وہ حالت پیدا ہوتی ہے اور ایسی حالت میں بھی رُوح خدا تعالیٰ کے قبضہ اور تصرف میں آجاتی ہے اور ایسا تغیر اس پر وارد ہو جاتا ہے کہ کچھ بھی اس کی دنیوی شعور اور ادراک کی حالت اس کے اندر باقی نہیں رہتی۔ غرض موت اور خواب دونوں حالتوں میں خدا کا قبضہ اور تصرف رُوح پر ایسا ہو جاتا ہے کہ زندگی کی علامت جو خود اختیاری اور خودشناسی ہے بکلی جاتی رہتی ہے پھر خدا ایسی رُوح کو جس پر درحقیقت موت وارد کر دی ہے واپس جانے سے روک رکھتا ہے اور وہ رُوح جس پر اس نے درحقیقت موت وارد نہیں کی اُس کو پھر ایک مقررہ وقت تک دُنیا کی طرف واپس کر دیتا ہے۔ اس ہمارے کاروبار میں اُن لوگوں کے لئے نشان ہیں جو فکر اور سوچ کرنے والے ہیں۔ یہ ہے ترجمہ مع شرح آیت ممدوحہ بالا کا اور یہ آیت موصوفہ بالا دلالت کر رہی ہے کہ جیسی جسم پر موت ہے رُوحوں پر بھی موت ہے لیکن قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ ابرار اور اخیار اور برگزیدوں کی رُوحیں چند روز کے بعد پھر زندہ کی جاتی ہیں کوئی تین دن کے بعد کوئی ہفتہ کے بعد کوئی چالیس دن کے بعد اور یہ حیاتِ ثانی نہایت آرام اور آسائش اور لذت کی ان کو ملتی ہے یہی حیات ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے نیک بندے اپنی پوری قوت اور پوری کوشش اور پورے صدق و صفا کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف جھکتے ہیں اور نفسانی تاریکیوں سے باہر آنے کیلئے پورا زور لگاتے ہیں اور خدا کی رضاجوئی کے لئے تلخ زندگی اختیار کرتے ہیں گویا مَر ہی جاتے ہیں۔ غرض جیسا کہ آیۃ موصوفہ بالا بیان فرما رہی ہے رُوح کو بھی موت ہے جیسا کہ جسم کو۔ اگرچہ اُس عالَم کی نہایت مخفی کیفیتیں اِس تاریک دُنیا میں ظاہر نہیں ہوتیں لیکن بلاشبہ عالَمِ رؤیا یعنی خواب کا عالَم اُس عالَم کے لئے ایک نمونہ ہے اور جو موت اِس عالَم میں رُوح پر وارد ہوتی ہے اس موت کا نمونہ عالَمِ خواب میں بھی پایا جاتا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ معاً آنکھ بند ہونے کے ساتھ ہی ہماری رُوح کی تمام صفات اُلٹ پلٹ ہو جاتی ہیں اور اس بیداری کا تمام سلسلہ فراموش ہو جاتا ہے اور تمام رُوحانی صفات اور تمام علوم جو ہماری رُوح میں تھے کالعدم ہو جاتے ہیں اور حالتِ خواب میں وہ نظارے رُوح کے ہمارے پیشِ نظر آجاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اب وہ ہماری رُوح کچھ اَور ہی ہے اور تمام صفات اُس کے جو بیداری میں تھے کھوئے گئے ہیں اور یہ ایک ایسی حالت ہے جو موت سے مشابہہ بلکہ ایک قسم کی موت ہے اور یہ قطعی اور یقینی دلیل اِس بات پر ہے کہ وہ موت جو جسم کی موت کے ساتھ رُوح پر وارد ہوتی ہے وہ ایسی موت کے ساتھ مشابہہ ہے جو نیند کی حالت میں رُوح پر وارد ہوتی ہے مگر وہ موت اس موت کی نسبت بہت بھاری ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۵۴ تا ۱۵۶)

فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ جس نفس پر موت کا حکم دے دیتا ہے اُس کو واپس آنے نہیں دیتا۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

یہ مسئلہ ہی غلط ہے جو کہے کہ فلاں شخص زندہ کرتا ہے۔ اگر زندہ کرنے کا مفہوم اور مطلب اَور نہ ہوتا تو خدا تعالیٰ کیوں فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ فرماتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ محاورہ ہی اَور ہے ورنہ اس سے تو تناقض لازم آتا ہے کہ ایک طرف کہے کہ زندہ نہیں ہوتا اور دوسری طرف کہہ دے کہ زندہ ہو جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ ر اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۶، ۷)

ہم خدا تعالیٰ کے اُسی قانونِ قدرت کو مانتے ہیں جو قرآن شریف میں بیان ہوا ہے۔ جو مُردہ ایسے ہیں کہ قبر میں رکھے جاتے ہیں اور ان کے پاس ملائکہ آتے ہیں۔ اُن کی نسبت قرآن شریف کا یہی فتویٰ ہے فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ مگر بہ رنگِ دیگر غیر حقیقی موت میں احیاء بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اِس قسم کے واقعات خود ہمارے ساتھ بھی پیش آئے ہیں .... اس قسم کی موتیں فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ سے نہیں اور وہ یہ احیاء ہے جس پر ہم ایمان لاتے ہیں کہ مُردہ جی اُٹھتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ ر جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

ہم اس کو خارق عادت نہیں مان سکتے جو قرآن شریف کے بیان کردہ قانونِ قدرت کے خلاف ہو مثلاً ہم احیاء موتیٰ حقیقی کا کیوں انکار کرتے ہیں اِس لئے کہ قرآن شریف نے یہ فیصلہ کر دیا ہے فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

ہمارا یہ عقیدہ نہیں کہ اعجازی طور پر بھی احیاء موتیٰ نہیں ہوتا بلکہ یہ عقیدہ ہے کہ وہ شخص دوبارہ دُنیا کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ مبارک احمد کی حیات اعجازی ہے۔ اس میں کوئی بحث نہیں کہ جس شخص کی باقاعدہ طور پر فرشتہ جان قبض کرے اور زمین میں بھی دفن کیا جائے وہ پھر کبھی زندہ نہیں ہوتا ..... خدا تعالیٰ نے بھی فرمایا فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ ر اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

کیا یہ سچ نہیں ہے کہ قرآن شریف نے صاف طور پر فرما دیا ہے کہ حقیقی مُردے واپس نہیں آتے فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ کے کیا معنے ہیں۔ پھر اگر مَیں نے کہا ہے کہ وہ مُردے جو حضرت مسیحؑ نے زندہ کئے وہ حقیقی مُردے نہ تھے جو آیت فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ کے موافق واپس نہیں آتے تو کیا بُرا کیا؟ اِس سے معجزات کا اِنکار کیونکر ثابت ہوا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷ ر نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

ہم قطعی طور سے اِنکار کرتے ہیں کہ کوئی حقیقی مُردے بھی زندہ کر سکتا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں آیا ہے فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ الخ

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۰ ر اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

پادری عیسیٰ کے خدا ہونے کی دلیل بیان کرتے ہیں کہ وہ مُردے زندہ کرتا تھا حالانکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ۔ اب خدا تعالیٰ کے کلام میں تناقض نہیں کہ ایک آیت میں کہے مُردے دوبارہ دُنیا میں نہیں آتے اور دوسری میں کہے کہ مُردہ زندہ ہوتے ہیں۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اُس کے ہاتھ پر مُردے زندہ ہوتے ہیں لِمَا يُحْيِيْكُمْ[1] اور سب کو معلوم ہے کہ اس سے مراد رُوحانی مُردوں کا زندہ ہونا ہے۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۲۴ رمئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝

ان کو کہہ دے کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر اسراف کیا (یعنی ارتکاب کبائر کیا) تم خدا کی رحمت سے نومید مت ہو وہ تمہارے سب گناہ بخش دے گا۔ اب ظاہر ہے کہ بنی آدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تو بندے نہیں ہیں بلکہ سب نبی وغیرنبی خدائے تعالیٰ کے بندے ہیں لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مولیٰ کریم سے قُربِ اتم یعنی تیسرے درجہ کا قُرب حاصل تھا سو یہ سخن بھی مقامِ جمع سے سرزد ہُوا۔
(سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۲۸، ۲۲۹ حاشیہ)

کہہ اے میرے غلامو جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہے کہ تم رحمتِ الٰہی سے نا امید مت ہو خدا تعالیٰ سارے گناہ بخش دے گا۔ اب اِس آیت میں بجائے قُلْ يَا عِبَادَ اللّٰهِ کے جس کے یہ معنے ہیں کہ کہہ اے خدا تعالیٰ کے بندو۔ یہ فرمایا کہ قُلْ يٰعِبَادِيَ یعنی کہہ کہ اے میرے غلامو۔ اس طرز کے اختیار کرنے میں بھید یہی ہے کہ یہ آیت اِس لئے نازل ہوئی ہے کہ تا خدا تعالیٰ بے انتہا رحمتوں کی بشارت دیوے اور جو لوگ کثرت گناہوں سے دِل شکستہ ہیں ان کو تسکین بخشے۔ سو اللہ جلّ شانہٗ نے اِس آیت میں چاہا کہ اپنی رحمتوں کا ایک نمونہ پیش کرے اور بندہ کو دکھلاوے کہ مَیں کہاں تک اپنے وفادار بندوں کو انعاماتِ خاصّہ سے مشرّف کرتا ہوں سو اس نے قُلْ يٰعِبَادِيَ کے لفظ سے یہ ظاہر کیا کہ دیکھو یہ میرا پیارا رسول دیکھو یہ برگزیدہ بندہ کہ کمال طاعت سے کس درجہ

---

[1] سُورۃ الانفال: ۲۵

تک پہنچا کہ اب جو کچھ میرا ہے وہ اس کا ہے۔ جو شخص نجات چاہتا ہے وہ اس کا غلام ہو جائے یعنی ایسا اس کی طاعت میں محو ہو جاوے کہ گویا اس کا غلام ہے تب وہ گو کیسا ہی پہلے گنہ گار تھا بخشا جائے گا۔ جاننا چاہیئے کہ عبد کا لفظ لغتِ عرب میں غلام کے معنوں پر بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ[1] اور اِس آیت میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص اپنی نجات چاہتا ہے وہ اس نبی سے غلامی کی نسبت پیدا کرے یعنی اس کے حکم سے باہر نہ جائے اور اُس کے دامنِ طاعت سے اپنے تئیں وابستہ جانے جیسا کہ غلام جانتا ہے تب وہ نجات پائے گا۔ اِس مقام میں اُن کور باطن نام کے موحدوں پر افسوس آتا ہے کہ جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہاں تک بُغض رکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ نام کہ غلام نبی، غلام رسول، غلام مصطفیٰ، غلام احمد، غلام محمد شرک میں داخل ہیں اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ مدارِ نجات یہی نام ہیں اور چونکہ عبد کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ ہر ایک آزادگی اور خود روی سے باہر آجائے اور پورا متبع اپنے مولیٰ کا ہو اِس لئے حق کے طالبوں کو یہ رغبت دی گئی کہ اگر نجات چاہتے ہیں تو یہ مفہوم اپنے اندر پیدا کریں۔ اور درحقیقت یہ آیت اور یہ دوسری آیت قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ[2] ازروئے مفہوم کے ایک ہی ہیں کیونکہ کمال اتباع اُس محویّت اور اطاعت تامّہ کو مستلزم ہے جو عبد کے مفہوم میں پائی جاتی ہے یہی سِرّ ہے کہ جیسے پہلی آیت میں مغفرت کا وعدہ بلکہ محبوبِ الٰہی بننے کی خوشخبری ہے گویا یہ آیت کہ قُلْ يٰعِبَادِيَ دوسرے لفظوں میں اس طرح پر ہے کہ قُلْ يَا مُتَّبِعِيَ یعنی اے میری پیروی کرنے والو۔ جو بکثرت گناہوں میں مُبتلا ہو رہے ہو رحمتِ الٰہی سے نومید مت ہو کہ اللہ جلّ شانہٗ بہ برکت میری پیروی کے تمام گناہ بخش دے گا۔ اور اگر عباد سے صرف اللہ تعالیٰ کے بندے ہی مراد لئے جائیں تو معنے خراب ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ ہرگز درست نہیں کہ خدا تعالےٰ بغیر تحقق شرط ایمان اور بغیر تحقق شرط پیروی تمام مُشرکوں اور کافروں کو یونہی بخش دیوے۔ ایسے معنے تو نصوص بیّنہ قرآن سے صریح مخالف ہیں۔

اِس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ ماحصل اِس آیت کا یہ ہے کہ جو لوگ دل و جان سے تیرے یا رسول اللہ غلام بن جائیں گے ان کو وہ نورِ ایمان اور محبت اور عشق بخشا جائے گا کہ جو اُن کو غیر اللہ سے رہائی دے دے گا اور وہ گناہوں سے نجات پا جائیں گے اور اِسی دُنیا میں ایک پاک زندگی اُن کو عطا کی جائے گی اور نفسانی جذبات کی تنگ و تاریک قبروں سے وہ نکالے جائیں گے۔ اِسی کی طرف یہ حدیث اشارہ کرتی ہے اَنَا الْحَاشِرُ الَّذِيْ يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰى قَدَمِيْ یعنی مَیں وہ مُردوں کو اُٹھانے والا ہوں جس کے قدموں پر لوگ اُٹھائے جاتے

---

[1] سورۃ البقرہ: ۲۲۲ [2] سورۃ آل عمران: ۳۲

ہیں۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۹۰ تا ۱۹۴)

اے وہ لوگو جنہوں نے اسراف کیا یعنی گناہ کیا تم خدا کی رحمت سے نوامیدمت ہو وہ تمہارے سارے گناہ بخش دے گا۔ یعنی وہ اِس بات سے مجبور اور عاجز نہیں کہ گنہ گار کو بغیر سزا دینے کے چھوڑ دے کیونکہ وہ اس کا مالک ہے اور مالک کو ہر ایک اختیار ہے۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۱۸)

جب انسان خدا تعالیٰ کی محبت میں ایسا محو ہوتا ہے جو کچھ بھی نہیں رہتا تب اس فنا کی حالت میں ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں کیونکہ اس حالت میں اُن کا وجود درمیان نہیں ہوتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا یعنی ان لوگوں کو کہہ کہ اے میرے بندو خدا کی رحمت سے نومیدمت ہو خدا تمام گناہ بخش دے گا۔ اب دیکھو اِس جگہ يٰعِبَادَ اللّٰهِ کی جگہ يٰعِبَادِيَ کہہ دیا گیا حالانکہ لوگ خدا کے بندے ہیں نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بندے مگر یہ استعارہ کے رنگ میں بولا گیا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۶۴)

مفصلہ ذیل آیت سے یہ ثابت ہو گا کہ شرک وغیرہ سب گناہ بغیر توبہ کے بخشے جائیں گے اور وہ آیت یہ ہے قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴۱ حاشیہ)

اِنسان تو دراصل بندہ یعنی غلام ہے۔ غلام کا کام یہ ہوتا ہے کہ مالک جو حکم کرے اُسے قبول کرے۔ اسی طرح اگر تم چاہتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض حاصل کرو تو ضرور ہے کہ اس کے غلام ہو جاؤ۔ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اِس جگہ بندوں سے مُراد غلام ہی ہیں نہ کہ مخلوق۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بندہ ہونے کے واسطے ضروری ہے کہ آپؐ پر درُود پڑھو اور آپؐ کے کسی حکم کی نافرمانی نہ کرو سب حکموں پر کاربند رہو۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۴ مورخہ ۲۴ راپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۹)

ایسے الفاظ جو انبیاء کے حق میں خدا تعالیٰ نے بولے ہیں ان میں سب سے زیادہ اور سب سے بڑا عزت کا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا قُلْ يٰعِبَادِيَ جس کے معنے ہیں کہ اے میرے بندو۔ اب ظاہر ہے کہ وہ لوگ خدا تعالیٰ کے بندے تھے نہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بندے۔ اِس فقرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ کا اطلاق استعارہ کے رنگ میں کہاں تک وسیع ہے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۴۵ مورخہ ۷ رنومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ

الزمر: ۶۱

مُسْوَدَّةٌ اَلَیْسَ فِیْ جَھَنَّمَ مَثْوًی لِّلْمُتَکَبِّرِیْنَ○ وَیُنَجِّی اللّٰہُ

الَّذِیْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِھِمْ لَا یَمَسُّھُمُ السُّوْٓءُ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ○

قیامت کے دن تُو دیکھے گا کہ جنہوں نے خدا تعالیٰ پر جھوٹ بولا اُن کے مُنہ کالے ہیں (اور کیوں کالے نہ ہوں) کیا یہ لائق نہیں کہ متکبّر لوگ جہنّم میں ہی گرائے جائیں اور اللہ تعالیٰ متقیوں کو نجات دے گا اِس طور سے کہ ان کو ان کی مرادات تک پہنچائے گا۔ اُن کو بُرائی نہیں لگے گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اب یہ آیت اُس پہلی آیت کی گویا تفسیر کرتی ہے کیونکہ اس میں نجات دینے کی حقیقت یہ کھولی ہے کہ وہ اپنی مرادات کو پہنچ جائیں گے اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ وہ اُس دن بُرائی کی مَس سے بالکل محفوظ ہوں گے ایک ذرہ تکلیف اُن کو چھوئے گی بھی نہیں اور غم اُن کے نزدیک نہیں آئے گا۔

اور اِس آیت وَاِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا[1] کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ دراصل مخاطب وہی لوگ ہوں کہ جو عذابِ دوزخ میں گرفتار ہوں اور پھر بعض ان میں سے کچھ حصّہ تقویٰ کا رکھتے ہیں اُس عذاب سے نجات پاویں اور دوسرے دوزخ میں ہی گرے رہیں اور یہ معنے اُس حالت میں ہوں گے کہ جب اِس خطاب سے ابرار اور اخیار اور تمام مقدس اور مقرب لوگ باہر رکھے جائیں لیکن حق بات یہ ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ کی کلام کا منشاء وہی معنی معلوم ہوتے ہیں جو ابھی ہم لکھ چکے ہیں۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَاِلَیْہِ الْمَرْجِعُ وَالْمَاٰبُ۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۵۶، ۱۵۷)

وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِہٖ ۔ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ○

وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ الخ دُنیا کے فنا کرنے کے وقت خدا تعالیٰ آسمانوں کو اپنے داہنے ہاتھ سے لپیٹ

---

[1] سورۃ مریم: ۷۲

لے گا۔ اب دیکھو کہ اگر شَقُّ السَّمٰوٰتِ سے درحقیقت پھاڑنا مراد لیا جائے تو مَطْوِیّٰتٌ کا لفظ اُس سے مغائر اور منافی ماننا پڑے گا کیونکہ اس میں پھاڑنے کا کہیں ذکر نہیں صرف لپیٹنے کا ذکر ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۵۲ حاشیہ در حاشیہ)

۴۳ وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِیْهِ اُخْرٰی فَاِذَا هُمْ قِیَامٌ یَّنْظُرُوْنَ۝

نفخ حقیقت میں دو قسم پر ہے ایک نفخ اِضلال اور ایک نفخ ہدایت۔ جیسا کہ اِس آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِیْهِ اُخْرٰی فَاِذَا هُمْ قِیَامٌ یَّنْظُرُوْنَ۔ یہ آیتیں ذوالوجوہ ہیں قیامت سے بھی تعلق رکھتی ہیں اور اِس عالَم سے بھی۔ جیسا کہ آیت اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا[1] اور جیسا کہ آیت فَسَالَتْ اَوْدِیَةٌۢ بِقَدَرِهَا[2] اور اس عالَم کے لحاظ سے اِن آیتوں کے یہ معنی ہیں کہ آخری دنوں میں دو زمانے آئیں گے ایک ضلالت کا زمانہ اور اس زمانہ میں ہر ایک زمینی اور آسمانی یعنی شقی اور سعید پر غفلت سی طاری ہوگی مگر جس کو خدا محفوظ رکھے۔ اور پھر دوسرا زمانہ ہدایت کا آئے گا پس ناگاہ لوگ کھڑے ہو جائیں گے اور دیکھتے ہوں گے یعنی غفلت دُور ہو جائے گی اور دلوں میں معرفت داخل ہو جائے گی اور شقی اپنی شقاوت پر متنبہ ہو جائیں گے گو ایمان نہ لاویں۔ (شہادت القرآن صفحہ ۲۵)

۴۴ وَسِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَی الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتّٰٓی اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ۝

---

[1] سورۃ الحدید: ۱۸ [2] سورۃ الرعد: ۱۸

سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ تم پر سلامتی ہے تم پاک نفس ہو۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۷)
تم پر سلام تم پاک ہو۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۹۴)

○

سُورَۃُ المؤمن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۳،۴ غَافِرِ الذَّنۡۢبِ وَ قَابِلِ التَّوۡبِ شَدِیۡدِ الۡعِقَابِ ذِی الطَّوۡلِ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ اِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ۝

خدا تعالیٰ کا توبہ سے گناہ بخشنا اس آیت سے ثابت ہے۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۱۲۸)

۱۷ یَوۡمَ ہُمۡ بٰرِزُوۡنَ ۚ۬ لَا یَخۡفٰی عَلَی اللّٰہِ مِنۡہُمۡ شَیۡءٌ ؕ لِمَنِ الۡمُلۡکُ الۡیَوۡمَ ؕ لِلّٰہِ الۡوَاحِدِ الۡقَہَّارِ۝

کامل جزاء بجز تجلی مالکیت تامہ کے کہ جو ہدم بنیان اسباب کو مستلزم ہے ظہور میں نہیں آسکتی چنانچہ اسی کی طرف دوسری جگہ بھی اشارہ فرما کر کہا ہے لِمَنِ الۡمُلۡکُ الۡیَوۡمَ ؕ لِلّٰہِ الۡوَاحِدِ الۡقَہَّارِ یعنی اس دن ربوبیتِ الٰہیہ بغیر توسط اسباب عادیہ کے اپنی تجلی آپ دکھائے گی اور یہی مشہود اور محسوس ہوگا کہ بجز قوتِ عظمٰی اور قدرتِ کاملہ حضرت باری تعالیٰ کے اور سب ہیچ ہیں تب سارا آرام و سرور اور سب جزاء اور پاداش بنظرِ صاف و صریح خدا ہی کی طرف سے دکھلائی دے گا اور کوئی پردہ اور حجاب درمیان میں نہیں رہے گا اور کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں رہے گی تب جنہوں نے اس کے لئے اپنے تئیں منقطع کر لیا تھا وہ اپنے تئیں ایک کامل سعادت میں دیکھیں گے کہ جو ان کے جسم اور جان اور ظاہر اور باطن پر محیط ہو جائے گی اور کوئی حصہ وجود ان کے کا ایسا نہیں ہوگا کہ جو

اس سعادتِ عظمیٰ کے پانے سے بے نصیب رہا ہو۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۸۰ حاشیہ)

خدا تعالیٰ اپنی قہری تجلّی سے ہر یک چیز کو معدوم کرکے اپنی وحدانیت اور یگانگت دکھلائے گا۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۵۴ حاشیہ)

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ○

خدا تعالیٰ ایک مفتری کی پیشگوئی کہ جو ایک جھوٹے دعویٰ کے لئے بطور شاہد صدق بیان کی گئی ہرگز سچی نہیں کرسکتا۔ وجہ یہ کہ اس میں خلق اللہ کو دھوکہ لگتا ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ خود مدعی صادق کے لئے یہ علامت قرار دے کر فرماتا ہے وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ .... خدا تعالیٰ صاف فرماتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ سوچ کر دیکھو کہ اس کے یہی معنی ہیں جو شخص اپنے دعویٰ میں کاذب ہو اس کی پیشگوئی ہرگز پوری نہیں ہوتی۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۳۲۲)

اگر یہ صحیح ہے کہ خدا صادق کا حامی ہوتا ہے اور اپنے وعدوں کو پورا کرتا ہے نہ افتراؤں کو، تو اس اصول کو ماننا ایک منصف کے لئے ضروری ہوگا کہ جو پیشگوئی خدا کے نام پر کی جائے اور وہ پوری ہوجائے تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر اس اصول کو نہ مانا جائے تو خدا کی ساری کتابیں بے دلیل رہ جائیں گی اور ان کی سچائی پر یقین کرنے کی راہیں بند ہوجائیں گی۔ اسی کی طرف خدا تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے اور کہتا ہے وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ یعنی صادق کی یہ نشانی ہے کہ اس کی بعض پیشگوئیاں پوری ہوجاتی ہیں بعض کی شرط اِس لئے لگا دی کہ وعید کی پیشگوئیوں میں رجوع اور توبہ کی حالت میں عذاب کا تخلف جائز ہے گو کوئی بھی شرط نہ ہو پس ممکن ہے عذاب کی پیشگوئیاں ملتوی رکھی جائیں اور اپنی میعاد کے اندر پوری نہ ہوں جیسا کہ یونسؑ

کی قوم کے لئے ہؤا۔ غرض خدا کے نام پر جو پیشگوئی پوری ہو جائے اس کی نسبت شک کرنا اور اس کو اتفاق پر محمول کر دینا گویا خدا تعالیٰ کے دینی انتظام پر ایک حملہ ہے اور نبوت کی تمام عمارت کو گرانے کا ارادہ ہے۔

(استفتاء صفحہ ۴)

اگر یہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اس پر پڑے گا اور اگر یہ سچا ہے تو تم اس کی ان بعض پیشگوئیوں سے بچ نہیں سکتے جو تمہاری نسبت وہ وعدہ کرے۔ خدا ایسے شخص کو فتح اور کامیابی کی راہ نہیں دکھلاتا جو فضول گو اور کذّاب ہو۔ (انجامِ آتھم صفحہ ۶۴)

اگر یہ نبی جھوٹا ہے تو اپنے جھوٹ سے ہلاک ہو جائے گا اور اگر سچا ہے تو ضرور ہے کہ کچھ عذاب تم بھی چکھو کیونکہ زیادتی کرنے والے خواہ افتراء کریں خواہ تکذیب کریں خدا سے مدد نہیں پائیں گے۔ اب دیکھو اس سے زیادہ تصریح کیا ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں بار بار فرماتا ہے کہ مُفتری اِسی دُنیا میں ہلاک ہو گا بلکہ خدا کے سچے نبیوں اور مامورین کے لئے سب سے پہلی یہی دلیل ہے کہ وہ اپنے کام کی تکمیل کر کے مرتے ہیں اور ان کو اشاعتِ دین کے لئے مُہلت دی جاتی ہے۔ (اربعین ۴ صفحہ ۴، ۵)

اگر یہ جھوٹا ہو گا تو تمہارے دیکھتے دیکھتے تباہ ہو جائے گا اور اس کا جھوٹ ہی اس کو ہلاک کر دے گا لیکن اگر سچا ہے تو پھر بعض تم میں سے اس کی پیشگوئیوں کا نشانہ بنیں گے اور اس کے دیکھتے دیکھتے اس دار الفناء سے کوچ کریں گے۔ (تحفۃ الندوہ صفحہ ۴)

قرآن شریف نے بعض کے لفظ سے جتلا دیا کہ وعید کی پیشگوئی کے لئے بعض کا نمونہ کافی ہے۔

(تحفۃ الندوہ صفحہ ۶)

اگر یہ رسول سچا ہے تو اس کی بعض پیشگوئیاں جو تمہارے حق میں ہیں پوری ہوں گی یعنی پیشگوئیوں کا پُورا ہونا سچائی کی نشانی ہے۔ (نشانِ آسمانی صفحہ ۳۲ حاشیہ)

اگر یہ رسول جھوٹا ہے تو خود تباہ ہو جائے گا لیکن اگر سچا ہے تو تمہاری نسبت جو عذاب کے بعض وعدے کئے گئے ہیں وہ پورے ہوں گے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵۶)

بعض کا لفظ اِس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ وعید کی پیشگوئیوں میں یہ ضروری نہیں کہ وہ سب کی سب پوری ہو جائیں بلکہ بعض کا انجام معافی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵۶ حاشیہ)

اگر یہ نبی جھُوٹا ہے تو خود تباہ ہو جائے گا کیونکہ خدا کذّاب کے کام کو انجام تک نہیں پہنچاتا وجہ یہ کہ اِس سے صادق اور کاذب کا معاملہ باہم مشتبہ ہو جائے گا۔ اور اگر یہ رسول سچا ہے تو اس کی بعض وعید کی پیشگوئیاں ضرور وقوع میں آئیں گی۔ پس اِس آیت میں جو بعض کا لفظ ہے صریح طور پر اس میں یہ اشارہ ہے کہ سچا رسول

جو وعید کی پیشگوئیاں یعنی عذاب کی پیشگوئیاں کرتا ہے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سب کی سب ظہور میں آ جائیں ہاں یہ ضروری ہے کہ بعض ان میں سے ظہور میں آجائیں جیسا کہ یہ آیت فرما رہی ہے یُصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۹۰)

یہ مسئلہ مسلم ہے کہ وعید یعنی عذاب کی پیشگوئیوں میں کسی شرط کی بھی ضرورت نہیں وہ ٹل سکتی ہیں کیونکہ وہ مجرم کے لئے ایک عذاب دینے کا وعدہ ہے اور خدا حقیقی بادشاہ ہے وہ کسی کی توبہ استغفار سے اپنے عذاب کو معاف کر سکتا ہے جیسا کہ یونسؑ نبی کی قوم کو معاف کر دیا۔ اس پر تمام نبیوں کا اتفاق ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ آپ فرماتا ہے اِنْ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیْہِ کَذِبُہٗ وَاِنْ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ یعنی اگر یہ نبی جھوٹا ہے تو جھوٹ بولنے کا عذاب اس پر نازل ہوگا اور اگر سچا ہے تو بعض عذاب جن کا وہ وعدہ دیتا ہے تم پر وارد ہو جائیں گے۔

اب دیکھو خدا نے بعض کا لفظ اس جگہ استعمال کیا نہ کُل کا جس کے یہ معنی ہیں کہ جس قدر عذاب کی اس نبی نے پیشگوئیاں کی ہیں اُن میں بعض تو ضرور پوری ہو جائیں گی گو بعض معرض التواء میں رہ جائیں گی۔ پس نصِ قرآنی سے یہ ثابت ہے کہ عذاب کی پیشگوئی کا پورا ہونا ضروری نہیں۔ ہاں اس آیت سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مفتری کسی طرح عذاب سے بچ نہیں سکتا کیونکہ اس کے لئے یہ قطعی حکم ہے کہ اِنْ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیْہِ کَذِبُہٗ پس اگر مفتری کے لئے کوئی عذاب کی پیشگوئی ہو تو وہ ٹل نہیں سکتی۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۳۰، ۱۳۱)

اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے وَاِنْ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیْہِ کَذِبُہٗ وَاِنْ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ یعنی اگر یہ نبی کاذب ہے تو خود تباہ ہو جائے گا اور اگر صادق ہے تو بعض پیشگوئیاں وعید کی اس کی تم پر پوری ہو جائیں گی۔ اس جگہ یہ نہیں فرمایا کہ کُل پوری ہو جائیں گی۔ پس اس جگہ صاف طور پر خدا نے فرما دیا ہے کہ وعید کی تمام پیشگوئیوں کا پورا ہونا ضروری نہیں بلکہ بعض ٹل بھی سکتی ہیں اور اگر ایسا ارادہ نہ ہوتا تو خدا تعالیٰ یہ فرماتا وَاِنْ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبْکُمْ کُلُّ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ مگر ایسا نہیں فرمایا۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۸۸ حاشیہ)

یقیناً سمجھو کہ خدا تعالیٰ کے مُرسل ان نشانات اور تائیدات سے شناخت کئے جاتے ہیں جو خدا تعالیٰ ان کے لئے دکھاتا اور اُن کی نصرت کرتا ہے۔ مَیں اپنے قول میں سچا ہوں اور خدا تعالیٰ جو دلوں کو دیکھتا ہے وہ میرے دل کے حالات سے واقف اور خبردار ہے۔ کیا تم اتنا بھی نہیں کہہ سکتے جو آلِ فرعون کے ایک آدمی نے کہا تھا اِنْ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیْہِ کَذِبُہٗ وَاِنْ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ کیا تم یہ یقین نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ جھوٹوں کا سب سے زیادہ دشمن ہے تم سب مل کر جو مجھ پر حملہ کرو خدا تعالیٰ کا غضب اس سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے پھر اس کے غضب سے کون بچا سکتا ہے۔ اور یہ آیت جو

مَیں نے پڑھی ہے اس میں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وعید کی پیشگوئیاں بعض پوری کردے گا کُل نہیں کہا۔ اِس میں حکمت کیا ہے؟ حکمت یہی ہے کہ وعید کی پیشگوئیاں مشروط ہوتی ہیں۔ وہ توبہ، استغفار اور رجوع اِلی الحق سے ٹل جایا کرتی ہیں۔

پیشگوئی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وعدہ کی جیسے فرمایا وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ[1]۔ اہلِ سُنّت مانتے ہیں کہ اِس قسم کی پیشگوئیوں میں تخلف نہیں ہوتا کیونکہ خدا تعالیٰ کریم ہے لیکن وعید کی پیشگوئیوں میں وہ ڈرا کر بخش بھی دیتا ہے اِس لئے کہ وہ رحیم ہے۔ بڑا نادان اور اسلام سے دُور پڑا ہؤا ہے وہ شخص جو کہتا ہے وعید کی سب پیشگوئیاں پوری ہوتی ہیں۔ وہ قرآن کریم کو چھوڑتا ہے اِس لئے کہ قرآن کریم تو کہتا ہے یُصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ۔

افسوس ہے بہت سے لوگ مولوی کہلاتے ہیں مگر انہیں نہ قرآن کی خبر ہے نہ حدیث کی نہ سُنّتِ انبیاء کی۔ صرف بُغض کی جھاگ ہوتی ہے اِس لئے وہ دھوکا دیتے ہیں۔ یاد رکھو اَلْکَرِیْمُ اِذَا وَعَدَ وَفٰی رحیم کا تقاضا یہی ہے کہ قابلِ سزا ٹھہرا کر معاف کر دیتا ہے اور یہ تو انسان کی بھی فطرت میں ہے کہ وہ معاف کر دیتا ہے۔ ایک مرتبہ میرے سامنے ایک شخص نے بناوٹی شہادت دی۔ اُس پر جُرم ثابت تھا۔ وہ مقدمہ ایک انگریز کے پاس تھا اُسے اِتفاقاً چِٹھی آگئی کہ کِسی دُور دراز جگہ پر اس کی تبدیلی ہوگئی ہے۔ وہ غمگین ہؤا۔ جو مُجرم تھا وہ بُوڑھا آدمی تھا منشی نے کہا کہ یہ تو قیدخانہ میں ہی مَر جاوے گا۔ اُس نے بھی کہا کہ حضور بال بچّہ دار ہے۔ اس پر وہ انگریز بولا کہ اب مِسْل مرتب ہوچکی ہے اب کیا ہوسکتا ہے۔ پھر کہا کہ اچھا اِس مِسْل کو چاک کردو۔ اب غور کرو کہ انگریز کو تو رحم آسکتا ہے خدا تعالیٰ کو نہیں آتا؟

پھر اِس بات پر بھی غور کرو کہ صدقہ اور خیرات کیوں جاری ہے اور ہر قوم میں اس کا رواج ہے فطرتاً انسان مصیبت اور بلا کے وقت صدقہ دینا چاہتا ہے اور خیرات کرتا ہے اور کہتے ہیں کہ بکرے دو۔ کپڑے دو۔ یہ دو۔ وہ دو۔ اگر اس کے ذریعہ سے ردِّ بلاء نہیں ہوتا تو پھر اضطراراً انسان کیوں ایسا کرتا ہے؟ نہیں رَدِّ بلا ہوتا ہے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر کے اتفاق سے یہ بات ثابت ہے اور مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ یہ صرف مسلمانوں ہی کا مذہب نہیں بلکہ یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کا بھی یہ مذہب ہے اور میری سمجھ میں رُوئے زمین پر کوئی اس امر کا منکر ہی نہیں جبکہ یہ بات ہے تو صاف کُھل گیا کہ وہ ارادۂ الٰہی ٹل جاتا ہے۔

پیشگوئی اور ارادۂ الٰہی میں صرف یہ فرق ہوتا ہے کہ پیشگوئی کی اطلاع نبی کو دی جاتی ہے اور ارادۂ الٰہی

---

[1] سورۃ النور: ۵۶

پر کسی کو اطلاع نہیں ہوتی اور وہ مخفی رہتا ہے۔ اگر وہی ارادۂ الٰہی نبی کی معرفت ظاہر کر دیا جاتا تو وہ پیشگوئی ہوتی اگر پیشگوئی نہیں ٹل سکتی تو پھر ارادۂ الٰہی بھی صدقہ وخیرات سے نہیں ٹل سکتا لیکن یہ بالکل غلط بات ہے۔ چونکہ وعید کی پیشگوئیاں ٹل جاتی ہیں اِس لئے فرمایا وَاِنْ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ اب اللہ تعالیٰ خود گواہی دیتا ہے کہ بعض پیشگوئیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی ٹل گئیں۔ اگر میری کسی پیشگوئی پر ایسا اعتراض کیا جاتا ہے تو مجھے اس کا جواب دو۔ اگر اِس امر میں میری تکذیب کروگے تو میری نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تکذیب کرنے والے ٹھہرو گے۔ مَیں بڑے وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ کُل اہلِ سُنّت جماعت اور کُل دُنیا کا مسلّم مسئلہ ہے کہ تضرّع سے عذاب کا وعدہ ٹل جایا کرتا ہے۔ کیا حضرت یونس علیہ السلام کی نظیر بھی تمہیں بھول گئی ہے؟ حضرت یونسؑ کی قوم سے جو عذاب ٹل گیا تھا اس کی وجہ کیا تھی؟ دُرِّ منثور وغیرہ کو دیکھو اور بائیبل میں یُونہ نبی کی کتاب موجود ہے اس عذاب کا قطعی وعدہ تھا مگر یونسؑ کی قوم نے عذاب کے آثار دیکھ کر توبہ کی اور اُس کی طرف رجوع کیا خدا تعالیٰ نے اس کو بخش دیا اور عذاب ٹل گیا۔ ادھر حضرت یونسؑ یوم مقررہ پر عذاب کے منتظر تھے۔ لوگوں سے خبریں پُوچھتے تھے۔ ایک زمیندار سے پوچھا کہ نینوہ کا کیا حال ہے؟ اُس نے کہا کہ اچھا حال ہے۔ تو حضرت یونسؑ پر بہت غم طاری ہوا اور انہوں نے کہا لَنْ اَرْجِعَ اِلٰی قَوْمِیْ کَذَّابًا یعنی مَیں اپنی قوم کی طرف کذاب کہلا کر نہیں جاؤں گا۔ اب اِس نظیر کے ہوتے ہوئے اور قرآن شریف کی زبردست شہادت کی موجودگی میں میری کسی ایسی پیشگوئی پر جو پہلے ہی سے شرطی تھی اعتراض کرنا تقویٰ کے خلاف ہے۔ متقی کی یہ نشانی نہیں کہ بغیر سوچے سمجھے مُنہ سے بات نکال دے اور تکذیب کو آمادہ ہو جاوے۔

حضرت یونسؑ کا قِصّہ نہایت دردناک اور عبرت بخش ہے اور وہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے اسے غور سے پڑھو۔ یہاں تک کہ وہ دریا میں گرائے گئے اور مچھلی کے پیٹ میں گئے تب توبہ منظور ہوئی۔ یہ سزا اور عتاب حضرت یونسؑ پر کیوں ہوا؟ اِس لئے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو قادر نہ سمجھا کہ وہ وعید کو ٹال دیتا ہے پھر تم لوگ کیوں میرے متعلق جلدی کرتے ہو؟ اور میری تکذیب کے لئے ساری نبوّتوں کو جھٹلاتے ہو۔

(لیکچر لدھیانہ صفحہ ۲۸ تا ۳۱)

خدا تعالیٰ کے راستبازوں اور ماموروں کے مقابلہ میں ہر قسم کی کوششیں ان کو کمزور کرنے کے لئے کی جاتی ہیں لیکن خدا ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ ساری کوششیں خاک میں مِل جاتی ہیں۔ ایسے موقع پر بعض شریف الطبع اور سعید لوگ بھی ہوتے ہیں جو کہہ دیتے ہیں اِنْ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیْہِ کَذِبُہٗ وَاِنْ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ۔

صادقوں کا صدق خود اس کے لئے زبردست ثبوت اور دلیل ہوتا ہے اور کاذب کا کذب ہی اس کو ہلاک

کر دیتا ہے پس ان لوگوں کو میری مخالفت سے پہلے کم از کم اتنا ہی سوچ لینا چاہیئے تھا کہ خدا تعالیٰ کی کتاب میں یہ ایک راہ راست باز کی شناخت کی رکھی ہے مگر افسوس تو یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترتا۔ (الحکم جلد ۸ ۱۱ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

جو کام نفاقِ طبعی اور دُنیا کی گندی زندگی کے ساتھ ہوں گے وہ خود ہی اس زہر سے ہلاک ہو جائیں گے۔ کاذب کبھی کامیاب ہو سکتا ہے؟ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ۔ کذاب کی ہلاکت کے واسطے اس کا کذب ہی کافی ہے لیکن جو کام اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کے رسولؐ کی برکات کے اظہار اور ثبوت کے لئے ہوں اور خود اللہ تعالیٰ کے اپنے ہی ہاتھ کا لگایا ہوا پودا ہو۔ پھر اس کی حفاظت تو خود فرشتے کرتے ہیں۔ کون ہے؟ جو اس کو تلف کر سکے؟ (الحکم جلد ۹ ۲۵ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۱)

۵۲ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْھَادُ ۙ

ہمارا قانونِ قدرت یہی ہے کہ ہم اپنے پیغمبروں اور ایمان داروں کو دُنیا اور آخرت میں مدد دیا کرتے ہیں۔
(براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۶ حاشیہ)

اللہ تعالیٰ کا وعدہ کہ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ایک یقینی اور حتمی وعدہ ہے مَیں کہتا ہوں کہ بھلا اگر خدا کسی کے دِل میں مدد کا خیال نہ ڈالے تو کوئی کیونکر مدد کر سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حقیقی معاون و ناصر وہی پاک ذات ہے جس کی شان ہے نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ وَنِعْمَ النَّصِیْرُ۔
(ریویو جلد ۳ ۱ صفحہ ۸ الحکم جلد ۳ ۱۳ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۷)

۵۸ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَکْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ○

حدیثوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل دجّال شیطان کا نام ہے پھر جس گروہ سے شیطان اپنا کام لے گا اُس گروہ کا نام بھی استعارہ کے طور پر دجّال رکھا گیا کیونکہ وہ اُس کے اعضاء کی طرح ہے قرآن شریف میں جو یہ آیت ہے لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَکْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ یعنی انسانوں کی صنعتوں سے خدا

کی صنعتیں بہت بڑھی ہیں یہ اشارہ اُن لوگوں کی طرف ہے جن کی نسبت لکھا گیا تھا کہ وہ آخری زمانہ میں بڑی بڑی صنعتیں ایجاد کریں گے اور خدائی کاموں میں ہاتھ ڈالیں گے اور مفسّرین نے لکھا ہے کہ اِس جگہ انسانوں سے مراد دجّال ہے اور یہ قول دلیل اِس بات پر ہے کہ دجّال معہود ایک شخص نہیں ہے ورنہ ناس کا نام اُس پر اطلاق نہ پاتا اور اس میں کیا شک ہے کہ ناس کا لفظ صرف گروہ پر بولا جاتا ہے۔ سو جو گروہ شیطان کے وساوس کے نیچے چلتا ہے وہ دجّال کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ اِسی کی طرف قرآن شریف کی اس ترتیب کا اشارہ ہے کہ وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ[1] سے شروع کیا گیا اور اِس آیت پر ختم کیا گیا ہے اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّۃِ وَ النَّاسِ[2]۔ پس لفظ ناس سے مراد اِس جگہ بھی دجّال ہے۔ (ایام الصلح صفحہ ۶۱، ۶۲)

واضح رہے کہ قرآن شریف میں اَلنَّاس کا لفظ بمعنی دجّال معہود بھی آتا ہے اور جس جگہ ان معنوں کو قرینہ قویّہ متعین کرے تو پھر اَور معنے کرنا معصیت ہے چنانچہ قرآن شریف کے ایک اَور مقام میں اَلنَّاس کے معنے دجّال ہی لکھا ہے اور وہ یہ ہے لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَکْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ یعنی جو کچھ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں اسرار اور عجائبات پُر ہیں دجّال معہود کی طبائع کی بناوٹ اس کے برابر نہیں یعنی گو وہ لوگ اسرار زمین و آسمان کے معلوم کرنے میں کتنی ہی جانکاہی کریں اور کیسی ہی طبع وقّاد لاویں پھر بھی ان کی طبیعتیں ان اسرار کے انتہاء تک پہنچ نہیں سکتیں۔ یاد رہے کہ اِس جگہ بھی مفسّرین نے اَلنَّاس سے مراد دجّال معہود ہی لیا ہے دیکھو تفسیر معالم وغیرہ۔ اور قرینہ قویّہ اس پر یہ ہے کہ لکھا ہے کہ دجّال معہود اپنی ایجادوں اور صنعتوں سے خدا تعالیٰ کے کاموں پر ہاتھ ڈالے گا اور اس طرح پر خدائی کا دعویٰ کرے گا اور اِس بات کا سخت حریص ہوگا کہ خدائی باتیں جیسے بارش برسانا اور پھل لگانا اور انسان وغیرہ حیوانات کی نسل جاری رکھنا اور سفر اور حضر اور صحت کے سامان فوق العادت طور پر انسان کے لئے مہیا کرنا ان تمام باتوں میں قادرِ مطلق کی طرح کارروائیاں کرے اور سب کچھ اس کے قبضۂ قدرت میں ہو جائے اور کوئی بات اس کے آگے انہونی نہ رہے اور اسی کی طرف اِس آیت میں اشارہ ہے اور خلاصہ مطلب آیت یہ ہے کہ زمین آسمان میں جس قدر اسرار رکھے گئے ہیں جن کو دجّال بذریعہ علم طبعی اپنی قدرت میں کرنا چاہتا ہے وہ اسرار اُس کے اندازۂ جودت طبع اور مبلغ علم سے بڑھ کر ہیں اور جیسا کہ آیت ممدوحہ میں اَلنَّاس کے لفظ سے دجّال مراد ہے ایسا ہی آیت اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ[3] میں بھی اَلنَّاس کے لفظ سے دجّال ہی مراد ہے کیونکہ تقابل کے قرینہ سے اِس آیت کے یہ معنے معلوم ہوتے ہیں کہ کُنْتُمْ خَیْرَ النَّاسِ اُخْرِجَتْ لِشَرِّ النَّاسِ اور شَرِّ النَّاسِ سے بلاشبہ گروہِ دجّال مراد ہے کیونکہ حدیثِ نبویؐ سے ثابت ہے کہ آدم سے قیامت تک شرانگیزی میں دجّال کی مانند نہ کوئی ہوا

---

[1] سورۃ الفاتحہ : ۲ [2] سورۃ النّاس : ۶، ۷ [3] سورۃ آل عمران : ۱۱۱

اور نہ ہوگا اور یہ ایک ایسی محکم اور قطعی دلیل ہے کہ جس کے دونوں حصے یقینی اور قطعی اور عقائد مسلّمہ میں سے ہیں یعنی جیساکہ کسی مسلمان کو اِس بات سے انکار نہیں کہ یہ اُمّت خیر الامم ہے اِسی طرح اِس بات سے بھی انکار نہیں کہ گروہِ دجّال شَرُّ النَّاس ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۱)

۶۰ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ○

استجابتِ دُعا کا مسئلہ درحقیقت دُعا کے مسئلہ کی ایک فرع ہے اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس شخص نے اصل کو سمجھا ہُوا نہیں ہوتا اُس کو فرع کے سمجھنے میں پیچیدگیاں واقع ہوتی ہیں اور دھوکے لگتے ہیں ..... دُعا کی ماہیت یہ ہے کہ ایک سعید بندہ اور اُس کے رَبّ میں ایک تعلقِ جاذبہ ہے یعنی پہلے خدا تعالیٰ کی رحمانیت بندہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے پھر بندہ کے صدق کی کششوں سے خدا تعالیٰ اُس سے نزدیک ہو جاتا ہے اور دُعا کی حالت میں وہ تعلق ایک خاص مقام پر پہنچ کر اپنے خواصِ عجیبہ پَیدا کرتا ہے۔ سو جس وقت بندہ کسی سخت مشکل میں مبتلا ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف کامل یقین اور کامل امید اور کامل محبت اور کامل وفاداری اور کامل ہمّت کے ساتھ جُھکتا ہے اور نہایت درجہ کا بیدار ہو کر غفلت کے پردوں کو چیرتا ہُوا فنا کے میدانوں میں آگے سے آگے نکل جاتا ہے پھر آگے کیا دیکھتا ہے کہ بارگاہِ الوہیت ہے اور اُس کے ساتھ کوئی شریک نہیں تب اس کی رُوح اُس آستانہ پر سر رکھ دیتی ہے اور قوتِ جذب جو اُس کے اندر رکھی گئی ہے وہ خدا تعالیٰ کی عنایات کو اپنی طرف کھینچتی ہے تب اللہ جلّ شانہٗ اُس کام کے پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس دُعا کا اثر ان تمام مبادی اسباب پر ڈالتا ہے جن سے ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں جو اس مطلب کے حاصل ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً اگر بارش کے لئے دُعا ہے تو بعد استجابت دعا کے وہ اسبابِ طبعیہ جو بارش کے لئے ضروری ہوتے ہیں اس دعا کے اثر سے پَیدا کئے جاتے ہیں اور اگر قحط کیلئے بَد دعا ہے تو قادرِ مطلق مخالفانہ اسباب کو پَیدا کر دیتا ہے۔ اِسی وجہ سے یہ بات اربابِ کشف اور کمال کے نزدیک بڑے بڑے تجارب سے ثابت ہو چکی ہے کہ کامل کی دعا میں ایک قوتِ تکوین پیدا ہو جاتی ہے یعنی باذنہٖ تعالیٰ وہ دعا عالمِ سفلی اور علوی میں تصرف کرتی ہے اور عناصر اور اجرامِ فلکی اور انسانوں کے دلوں کو اُس طرف لے آتی ہے جو طرف مؤیدِ مطلوب ہے۔ خدا تعالیٰ کی پاک کتابوں میں اس کی نظیریں کچھ کم نہیں ہیں بلکہ اعجاز کی بعض اقسام کی حقیقت بھی دراصل استجابتِ دعا ہی ہے اور جس قدر ہزاروں معجزات انبیاء سے ظہور میں آئے ہیں یا جو کچھ کہ اولیاء ان دنوں تک عجائب کرامات دکھلاتے رہے اس کا اصل اور منبع یہی دعا ہے اور اکثر دعاؤں کے اثر سے ہی طرح طرح کے

خوارق قدرتِ قادر کا تماشا دکھلا رہے ہیں۔ وہ جو عرب کے بیابانی ملک میں ایک عجیب ماجرا گذرا کہ لاکھوں مُردے تھوڑے دنوں میں زندہ ہو گئے اور پُشتوں کے بگڑے ہوئے الٰہی رنگ پکڑ گئے اور آنکھوں کے اندھے بینا ہوئے اور گونگوں کی زبان پر الٰہی معارف جاری ہوئے اور دُنیا میں یک دفعہ ایک ایسا انقلاب پَیدا ہؤا کہ نہ پہلے اس سے کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سُنا۔ کچھ جانتے ہو کہ وہ کیا تھا؟ وہ ایک فانی فی اللہ کی اندھیری راتوں کی دعائیں ہی تھیں جنہوں نے دُنیا میں شور مچا دیا اور وہ عجائب باتیں دکھلائیں کہ جو اس اُمّی بیکس سے محالات کی طرح نظر آتی تھیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ بِعَدَدِ ھَمِّہٖ وَغَمِّہٖ وَحُزْنِہٖ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ وَاَنْزِلْ عَلَیْہِ اَنْوَارَ رَحْمَتِكَ اِلَی الْاَبَدِ۔ اور مَیں اپنے ذاتی تجربہ سے بھی دیکھ رہا ہوں کہ دعاؤں کی تاثیر آب و آتش کی تاثیر سے بڑھ کر ہے بلکہ اسبابِ طبعیہ کے سلسلہ میں کوئی چیز ایسی عظیم التاثیر نہیں جیسی کہ دعا ہے۔

اور اگر یہ شبہ ہو کہ بعض دعائیں خطا جاتی ہیں اور ان کا کچھ اثر معلوم نہیں ہوتا تو مَیں کہتا ہوں کہ یہی حال دواؤں کا بھی ہے۔ کیا دواؤں نے موت کا دروازہ بند کر دیا ہے یا اُن کا خطا جانا غیر ممکن ہے؟ مگر کیا باوجود اِس بات کے کوئی ان کی تاثیر سے انکار کر سکتا ہے؟ یہ سچ ہے کہ ہر ایک امر پر تقدیر محیط ہو رہی ہے مگر تقدیر نے علوم کو ضائع اور بے حرمت نہیں کیا اور نہ اسباب کو بے اعتبار کر کے دکھلایا بلکہ اگر غور کر کے دیکھو تو یہ جسمانی اور رُوحانی اسباب بھی تقدیر سے باہر نہیں ہیں مثلاً اگر ایک بیمار کی تقدیر نیک ہو تو اسبابِ تقدیر پورے طور پر میسّر آجاتے ہیں اور جسم کی حالت بھی ایسے درجہ پر ہوتی ہے کہ وہ اُن سے نفع اُٹھانے کے لئے مستعد ہوتا ہے تب دوا نشانہ کی طرح جا کر اثر کرتی ہے یہی قاعدہ دعا کا بھی ہے یعنی دعا کے لئے بھی تمام اسباب و شرائط قبولیت اسی جگہ جمع ہوتے ہیں جہاں ارادۂ الٰہی اُس کے قبول کرنے کا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے نظامِ جسمانی اور رُوحانی کو ایک ہی سلسلہ مؤثرات اور متاثرات میں باندھ رکھا ہے ..... یہ دعا جو آیت اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں بطور امر کے بجالانے کے لئے فرمائی گئی ہے اس سے مراد معمولی دعائیں نہیں ہیں بلکہ وہ عبادت ہے جو انسان پر فرض کی گئی ہے کیونکہ امر کا صیغہ یہاں فرضیّت پر دلالت کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ کُل دُعائیں فرض میں داخل نہیں ہیں بلکہ بعض جگہ اللہ جلّ شانہ نے صابرین کی تعریف کی ہے جو اِنَّا لِلّٰہِ پر کفایت کرتے ہیں اور اس دعا کی فرضیت پر بڑا قرینہ یہ ہے کہ صرف امر پر ہی کفایت نہیں کی گئی بلکہ اس کو عبادت کے لفظ سے یاد کر کے بحالتِ نافرمانی عذابِ جہنّم کی وعید اس کے ساتھ لگا دی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ دوسری دعاؤں میں یہ وعید نہیں بلکہ بعض اوقات انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسلام کو دعا مانگنے پر زجر و توبیخ کی گئی ہے چنانچہ اِنِّیْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ[1] اس پر شاہد ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ہر دعا عبادت ہوتی تو حضرت نوح

---

[1] سورۃ ہود: ۴۷

علیہ السلام کو لَا تَسْئَلْنِ کا تازیانہ کیوں لگایا جاتا ہے اور بعض اوقات اولیاء اور انبیاء دعا کرنے کو سُوءِ ادب سمجھتے رہے ہیں اور صلحاء نے ایسی دعاؤں میں استفتاءِ قلب پر عمل کیا ہے یعنی اگر مصیبت کے وقت دِل نے دعا کرنے کا فتویٰ دیا تو دعا کی طرف متوجہ ہوئے اور اگر صبر کے لئے فتویٰ دیا تو پھر صبر کیا اور دُعا سے مُنہ پھیر لیا۔ ماسوا اس کے اللہ تعالیٰ نے دوسری دعاؤں میں قبول کرنے کا وعدہ نہیں کیا بلکہ صاف فرما دیا ہے کہ چاہوں تو قبول کروں اور چاہوں تو رَدّ کروں جیسا کہ یہ آیت قرآن کی صاف بتلا رہی ہے اور وہ یہ ہے بَلْ اِیَّاہُ تَدْعُوْنَ فَیَکْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْہِ اِنْ شَآءَ[1] (سورۃ الانعام الجزو ۷) اور اگر ہم تنزلاً مان بھی لیں کہ اِس مقام میں لفظ اُدْعُوْا سے عام طور پر دعا ہی مراد ہے تو ہم اِس بات کے ماننے سے چارہ نہیں دیکھتے کہ یہاں دعا سے وہ دعا مراد ہے جو جمیع شرائط ہو اور تمام شرائط کو جمع کر لینا انسان کے اختیار میں نہیں۔ جب تک توفیقِ ازلی یاور نہ ہو۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ دعا کرنے میں صرف تضرع کافی نہیں ہے بلکہ تقویٰ اور طہارت اور راست گوئی اور کامل یقین اور کامل محبت اور کامل توجہ اور یہ کہ جو شخص اپنے لئے دعا کرتا ہے یا جس کے لئے دعا کی گئی ہے اُس کی دُنیا اور آخرت کے لئے اِس بات کا حاصل ہونا خلافِ مصلحتِ الٰہی بھی نہ ہو کیونکہ بسا اوقات دعا میں اَور شرائط تو سب جمع ہو جاتے ہیں مگر جس چیز کو مانگا گیا ہے وہ عند اللہ سائل کے لئے خلافِ مصلحتِ الٰہی ہوتی ہے اور اس کے پورا کرنے میں خیر نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کِسی ماں کا پیارا بچہ بہت الحاح اور رونے سے یہ چاہے کہ وہ آگ کا ٹکڑا یا سانپ کا بچہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دے یا ایک زہر جو بظاہر خوبصورت معلوم ہوتی ہے اس کو کھلا دے تو یہ سوال اس بچہ کا ہرگز اُس کی ماں پُورا نہ کرے گی اور اگر پُورا کر دیوے اور اتفاقاً بچہ کی جان بچ جاوے لیکن کوئی عضو اس کا بیکار ہو جاوے تو بلوغ کے بعد وہ بچہ اپنی اس احمق والدہ کا سخت شاکی ہو گا اور بجز اس کے اَور بھی کئی شرائط ہیں کہ جب تک وہ تمام جمع نہ ہوں اُس وقت تک دعا کو دعا نہیں کہہ سکتے اور جب تک کسی دعا میں پُوری رُوحانیت داخل نہ ہو اور جس کے لئے دعا کی گئی ہے اور جو دعا کرتا ہے ان میں استعدادِ قریبہ پیدا نہ ہو تب تک توقّع اثرِ دعا امیدِ موہوم ہے اور جب تک ارادۂ الٰہی قبولیتِ دعا کے متعلق نہیں ہوتا تب تک یہ تمام شرائط جمع نہیں ہوتیں اور ہمتیں پوری توجہ سے قاصر رہتی ہیں ..... بلا شبہ ایک مومن کی دعائیں اپنے اندر اثر رکھتی ہیں اور آفات کے دُور ہونے اور مُرادات کے حاصل ہونے کا موجب ہو جاتی ہیں کیونکہ اگر موجب نہیں ہو سکتیں تو پھر کیا وجہ کہ قیامت میں موجب ہو جائیں گی۔ سوچو اور خوب سوچو کہ اگر درحقیقت دعا ایک بے تاثیر چیز ہے اور دُنیا میں کسی آفت کے دُور ہونے کا موجب نہیں ہو سکتی تو کیا وجہ کہ قیامت کو موجب ہو جائے گی؟ یہ بات تو نہایت صاف ہے کہ اگر ہماری دعاؤں میں آفات سے بچنے کے لئے درحقیقت کوئی تاثیر

---

[1] سورۃ الانعام : ۴۲

ہے تو وہ تاثیر اس دُنیا میں بھی ظاہر ہونی چاہیئے تا ہمارا یقین بڑھے اور امید بڑھے اور تا آخرت کی نجات کے لئے ہم زیادہ سرگرمی سے دعائیں کریں اور اگر درحقیقت دعا کچھ چیز نہیں صرف پیشانی کا نوشتہ پیش آتا ہے تو جیسا کہ دُنیا کی آفات کے لئے ..... دعا عبث ہے اسی طرح آخرت کے لئے بھی عبث ہوگی اور اس پر امید رکھنا طمع خام ..... دعا منجملہ اسباب عادیہ کے ہے جس پر ایک لاکھ سے زیادہ نبی اور کئی کروڑ ولی گواہی دیتا چلا آیا ہے اور نبیوں کے ہاتھ میں بجز دعا کے اَور کیا تھا۔ (برکات الدعا صفحہ ۹ تا ۱۵)

چوتھا وسیلہ خدائے تعالیٰ نے اصل مقصود کو پانے کے لئے دعا کو ٹھہرایا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ یعنی تم دعا کرو میں قبول کروں گا اور بار بار دعا کے لئے رغبت دلائی ہے تا انسان اپنی طاقت سے نہیں بلکہ خدا کی طاقت سے پاوے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۰۴)

تجربہ گواہی دے رہا ہے کہ جس جگہ خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ اتفاق ہو جائے کہ بہمہ شرائط دعا ظہور میں آوے وہ کام ضرور ہو جاتا ہے۔ اِسی کی طرف قرآن شریف کی یہ آیت اشارہ فرمارہی ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ یعنی تم میرے حضور میں دعا کرتے رہو آخر میں قبول کرلوں گا۔ تعجب کہ جس حالت میں باوجود قضا و قدر کے مسئلہ پر یقین رکھنے کے تمام لوگ بیماریوں میں ڈاکٹروں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو پھر دعا کا بھی کیوں دوا پر قیاس نہیں کرتے۔

(ایام الصلح صفحہ ۲ حاشیہ)

دعا اور اِستجابت میں ایک رشتہ ہے کہ ابتداء سے اور جب سے کہ انسان پیدا ہوا برابر چلا آتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ کا ارادہ کسی بات کے کرنے کے لئے توجہ فرماتا ہے تو سُنّت اللہ یہ ہے کہ اُس کا کوئی مخلص بندہ اضطرار اور کرب اور قلق کے ساتھ دعا کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے اور اپنی تمام ہمّت اور تمام توجہ اِس امر کے ہو جانے کیلئے مصروف کرتا ہے تب اُس مرد فانی کی دعائیں فیوضِ الٰہی کو آسمان سے کھینچتی ہیں اور خدا تعالیٰ ایسے نئے اسباب پیدا کر دیتا ہے جن سے کام بن جائے۔ یہ دعا اگرچہ بعالَمِ ظاہر انسان کے ہاتھوں سے ہوتی ہے مگر درحقیقت وہ انسان خدا میں فانی ہوتا ہے اور دعا کرنے کے وقت میں حضرتِ احدیّت وجلال میں ایسے فنا کے قدم سے آتا ہے کہ اُس وقت وہ ہاتھ اُس کا ہاتھ نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہی دعا ہے جس سے خدا پہچانا جاتا ہے اور اُس ذوالجلال کی ہستی کا پتہ لگتا ہے جو ہزاروں پردوں میں مخفی ہے۔ دعا کرنے والوں کے لئے آسمان زمین سے نزدیک آجاتا ہے اور دعا قبول ہو کر مشکل کشائی کے لئے نئے اسباب پیدا کئے جاتے ہیں اور اُن کا علم پیش از وقت دیا جاتا ہے اور کم سے کم یہ کہ میخِ آہنی کی طرح قبولیّتِ دعا کا یقین غیب سے دِل میں بیٹھ جاتا ہے۔ سچ یہی ہے کہ اگر یہ دعا نہ ہوتی تو کوئی انسان خداشناسی کے بارے میں حق الیقین تک نہ پہنچ سکتا۔ دعا سے الہام ملتا ہے۔ دعا سے ہم خدا تعالیٰ کے ساتھ کلام کرتے ہیں۔ جب انسان اخلاص اور توحید اور محبت اور صدق اور صفا کے قدم سے دعا

کرتا کرتا فنا کی حالت تک پہنچ جاتا ہے تب وہ زندہ خدا اُس پر ظاہر ہوتا ہے جو لوگوں سے پوشیدہ ہے۔ دعا کی ضرورت نہ صرف اِس وجہ سے ہے کہ ہم اپنے دنیوی مطالب کو پاویں بلکہ کوئی انسان بغیر ان قدرتی نشانوں کے ظاہر ہونے کے جو دعا کے بعد ظاہر ہوتے ہیں اُس سچے ذوالجلال خدا کو پا ہی نہیں سکتا جس سے بہت سے دِل دُور پڑے ہوئے ہیں۔ نادان خیال کرتا ہے کہ دعا ایک لغو اور بے ہودہ امر ہے مگر اُسے معلوم نہیں کہ صرف ایک دعا ہی ہے جس سے خداوندِ ذوالجلال ڈھونڈنے والوں پر تجلی کرتا اور اَنَا الْقَادِرُ کا اِلہام اُن کے دلوں پر ڈالتا ہے۔ ہر ایک یقین کا بُھوکا اور پیاسا یاد رکھے کہ اِس زندگی میں رُوحانی روشنی کے طالب کے لئے صرف دعا ہی ایک ذریعہ ہے جو خدا تعالیٰ کی ہستی پر یقین بخشتا اور تمام شکوک و شبہات دُور کر دیتا ہے کیونکہ جو مقاصد بغیر دعا کے کسی کو حاصل ہوں وہ نہیں جانتا کہ کیونکر اور کہاں سے اس کو حاصل ہوئے بلکہ صرف تدبیروں پر زور مارنے والا اور دعا سے غافل رہنے والا یہ خیال نہیں کر سکتا کہ یقیناً وحقاً خدا تعالیٰ کے ہاتھ نے اُس کے مقاصد کو اُس کے دامن میں ڈالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص دعا کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ سے الہام پا کر کسی کامیابی کی بشارت دیا جاتا ہے وہ اس کام کے ہو جانے پر خدا تعالیٰ کی شناخت اور معرفت اور محبت میں آگے قدم بڑھاتا ہے اور اس قبولیتِ دعا کو اپنے حق میں ایک عظیم الشان نشان دیکھتا ہے اور اِس طرح وقتاً فوقتاً یقین سے پُر ہو کر جذباتِ نفسانی اور ہر ایک قسم کے گناہ سے ایسا مجتنب ہو جاتا ہے کہ گویا صرف ایک رُوح رہ جاتا ہے لیکن جو شخص دعا کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کے رحمت آمیز نشانوں کو نہیں دیکھتا وہ باوجود تمام عمر کی کامیابیوں اور بے شمار دولت اور مال اور اسبابِ تنعم کے دولتِ حق الیقین سے بے بہرہ ہوتا ہے اور وہ کامیابیاں اس کے دِل پر کوئی نیک اثر نہیں ڈالتیں بلکہ جیسے جیسے دولت اور اقبال پاتا ہے غرور اور تکبر میں بڑھتا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ پر اگر اس کو کچھ ایمان بھی ہو تو ایسا مُردہ ایمان ہوتا ہے جو اُس کو نفسانی جذبات سے روک نہیں سکتا اور حقیقی پاکیزگی بخش نہیں سکتا۔ (ایّام الصلح صفحہ ۱۰ تا ۱۲)

مقبولوں کی اوّل علامت مستجاب الدعوات ہونا ہے خاص کر اس حالت میں جب کہ اُن کا دردِ دل نہایت تک پہنچ جائے۔ پھر اِس بات کو سوچیں کہ کیونکر ممکن ہے کہ باوجودیکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے مارے غم کے بیجان اور ناتواں ہو کر ایک باغ میں جو پھل لانے کی جگہ ہے بکمال درد ساری رات دعا کی اور کہا کہ اے میرے باپ اگر ممکن ہو تو یہ پیالہ مجھ سے ٹال دیا جائے مگر پھر بھی با این ہمہ سوز و گداز اپنی دعا کا پھل دیکھنے سے نامراد رہا۔ یہ بات عارفوں اور ایمانداروں کے نزدیک ایسی جھوٹ ہے جیسا کہ دن کو کہا جائے کہ رات ہے یا اُجالے کو کہا جائے کہ اندھیرا ہے یا چشمۂ شیریں کو کہا جائے کہ تلخ اور شور ہے۔ جس دعا میں رات کے چار پہر برابر سوز و گداز اور گریہ و زاری اور سجدات اور جانکاہی میں گذریں کبھی ممکن نہیں کہ خدائے کریم و رحیم ایسی دعا کو نامنظور کرے خاص کر وہ دعا جو ایک مقبول کے مُنہ سے نکلی ہو۔ (تریاق القلوب صفحہ ۵۱)

خدا کسی کام میں عاجز نہیں آتا۔ ہاں خدا کی کتاب نے دعا کے بارہ میں یہ قانون پیش کیا ہے کہ وہ نہایت رحم سے نیک انسان کے ساتھ دوستوں کی طرح معاملہ کرتا ہے یعنی کبھی تو اپنی مرضی کو چھوڑ کر اُس کی دعا سُنتا ہے جیسا کہ خود فرمایا اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اور کبھی کبھی اپنی مرضی ہی منوانا چاہتا ہے جیسا کہ فرمایا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ[1] ایسا اس لئے کہ تا کبھی انسان کی دعا کے موافق اس سے معاملہ کر کے یقین اور معرفت میں اس کو ترقی دے اور کبھی اپنی مرضی کے موافق کر کے اپنی رضا کی اس کو خلعت بخشے اور اس کا مرتبہ بڑھاوے اور اُس سے محبت کر کے ہدایت کی راہوں میں اُس کو ترقی دیوے۔ (کشتی نوح صفحہ ۱۹ حاشیہ)

اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ دعا کرو میں قبول کروں گا۔ (لیکچر لدھیانہ صفحہ ۶)

جا بجا قرآن شریف میں دعا کی ترغیب دی ہے اور مجاہدہ کی طرف رغبت دلائی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ یعنی دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۱۳)

یہ خیال کہ مقبولین کی ہر ایک دعا قبول ہو جاتی ہے یہ سراسر غلط ہے بلکہ حق بات یہ ہے کہ مقبولین کے ساتھ خدا تعالیٰ کا دوستانہ معاملہ ہے کبھی وہ اُن کی دعائیں قبول کر لیتا ہے اور کبھی وہ اپنی مشیّت اُن سے منوانا چاہتا ہے جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ دوستی میں ایسا ہی ہوتا ہے بعض وقت ایک دوست اپنے دوست کی بات کو مانتا ہے اور اسکی مرضی کے موافق کام کرتا ہے اور پھر دوسرا وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اپنی بات اس سے منوانا چاہتا ہے اِسی کی طرف اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے جیسا کہ ایک جگہ قرآن شریف میں مومنوں کی استجابتِ دعا کا وعدہ کرتا ہے اور فرماتا ہے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ یعنی تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا اور دوسری جگہ اپنی نازل کردہ قضا و قدر پر خوش اور راضی رہنے کی تعلیم کرتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ الخ

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۹)

یاد رکھو کہ غیر اللہ کی طرف جُھکنا خدا سے کاٹنا ہے۔ نماز اور توحید کچھ ہی ہو کیونکہ توحید کے عملی اقرار کا نام ہی نماز ہے اس وقت بے برکت اور بے سُود ہوتی ہے جب اس میں نیستی اور تذلّل کی رُوح اور حنیف دل نہ ہو۔ سُنو وہ دعا جس کے لئے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ فرمایا ہے اس کے لئے بھی سچی رُوح مطلوب ہے۔ اگر اس تضرّع اور خشوع میں حقیقت کی رُوح نہیں تو وہ ٹیں ٹیں سے کم نہیں ہے۔

پھر کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسباب کی رعایت ضروری نہیں ہے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ شریعت نے اسباب کو منع نہیں کیا ہے اور سچ پوچھو تو کیا دعا اسباب نہیں؟ یا اسباب دعا نہیں؟ تلاش اسباب بجائے خود ایک دعا

---

[1] سورۃ البقرہ : ۱۵۶

ہے اور دعا بجائے خود عظیم الشان اسباب کا چشمہ انسان کی ظاہری بناوٹ اس کے دو ہاتھ دو پاؤں کی ساخت ایک دوسرے کی امداد کا ایک قدرتی راہنما ہے۔ جب یہ نظارہ خود انسان میں موجود ہے پھر کس قدر حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى[1] کے معنے سمجھنے میں مشکلات کو دیکھے۔ ہاں میں یہ کہتا ہوں کہ تلاش اسباب بھی بذریعہ دعا کرو میں نہیں سمجھتا کہ جب میں تمہارے جسم کے اندر اللہ تعالیٰ کا ایک قائم کردہ سلسلہ اور کامل راہنما سلسلہ دکھاتا ہوں تو اس سے انکار کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اِس بات کو اور بھی صاف کرنے اور وضاحت سے دُنیا پر کھول دینے کے لئے انبیاء علیہم السلام کا ایک سلسلہ دُنیا میں قائم کیا۔ اللہ تعالیٰ اِس بات پر قادر تھا اور قادر ہے کہ اگر وہ چاہے تو کسی قسم کی امداد کی ضرورت ان رسولوں کو باقی نہ رہنے دے مگر پھر بھی ایک وقت ان پر آتا ہے کہ وہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ[2] کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کیا وہ ایک ٹکڑ گدا فقیر کی طرح بولتے ہیں؟ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ کہنے کی بھی ایک شان ہوتی ہے وہ دُنیا کو ایک رعایت اسباب سکھانا چاہتے ہیں جو دعا کا ایک شعبہ ہے ورنہ اللہ تعالیٰ پر ان کو کامل ایمان اس کے وعدوں پر پورا یقین ہوتا ہے ..... دُنیا اور دُنیا کی مددیں ان لوگوں کے سامنے کالمیت ہوتی ہیں اور مُردہ کیڑے کے برابر بھی حقیقت نہیں رکھتی ہیں لیکن دُنیا کو دعا کا ایک موٹا طریق بتلانے کے لئے وہ یہ راہ بھی اختیار کرتے ہیں۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ ۱ صفحہ ۸،۷)

قبولیتِ دعا کے تین ہی ذریعے ہیں اوّل اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ[3] دوم يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا[4] تیسرا موہبتِ الٰہی۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ ۱ صفحہ ۱۵)

تدبیر کے پیدا ہونے سے پہلا مرتبہ دعا کا ہے جس کو قانونِ قدرت نے ہر ایک بشر کے لئے ایک امرِ لابدی اور ضروری ٹھہرا رکھا ہے اور ہر ایک طالبِ مقصود کو طبعًا اس پُل پر سے گذرنا پڑتا ہے پھر جائے شرم ہے کہ کوئی ایسا خیال کرے کہ دعا اور تدبیر میں کوئی تناقض ہے۔ دعا کرنے سے کیا مطلب ہوتا ہے یہی تو ہوتا ہے کہ وہ عالم الغیب جس کو دقیق در دقیق تدبیریں معلوم ہیں کوئی احسن تدبیر دل میں ڈالے یا بوجہ خالقیت اور قدرت اپنی طرف سے پیدا کرے پھر دعا اور تدبیر میں تناقض کیونکر ہوتا۔

علاوہ اس کے جیسا کہ تدبیر اور دعا کا باہمی رشتہ قانونِ قدرت کی شہادت سے ثابت ہوتا ہے ایسا ہی صحیفۂ فطرت کی گواہی سے بھی یہی ثبوت ملتا ہے جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ انسانی طبائع کسی مصیبت کے وقت جس طرح تدبیر اور علاج کی طرف مشغول ہوتی ہیں ایسا ہی طبعی جوش سے دعا اور صدقہ اور خیرات کی طرف جُھک جاتی ہیں۔ اگر دُنیا کی تمام قوموں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کسی قوم کا کانشنس اس متفق علیہا مسئلہ

---

[1] سورۃ المائدہ: ۳ [2] سورۃ الصّف: ۱۵ [3] سورۃ آلِ عمران: ۳۲ [4] سورۃ الاحزاب: ۵۷

کے برخلاف ثابت نہیں ہؤا۔ پس یہی ایک رُوحانی دلیل اِس بات پر ہے کہ انسان کی شریعتِ باطنی نے بھی قدیم سے تمام قوموں کو یہی فتویٰ دیا ہے کہ وہ دُعا کو اسباب اور تدابیر سے الگ نہ کریں بلکہ دعا کے ذریعہ سے تدابیر کو تلاش کریں۔ غرض دعا اور تدبیر انسانی طبیعت کے دو طبعی تقاضے ہیں کہ جو قدیم سے اور جب سے کہ انسان پیدا ہؤا ہے دو حقیقی بھائیوں کی طرح انسانی فطرت کے خادم چلے آئے ہیں اور تدبیر دعا کے لئے بطور نتیجہ ضروریہ کے اور دعا تدبیر کے لئے بطور محرّک اور جاذب کے ہے اور انسان کی سعادت اسی میں ہے کہ وہ تدبیر کرنے سے پہلے دعا کے ساتھ مبدءِ فیض سے مدد طلب کرے تا اُس چشمۂ لازوال سے روشنی پا کر عمدہ تدبیریں میسر آ سکیں۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ نمبر ۲ صفحہ ۴۲، ۴۳)

بعض لوگ جلدی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم دعا سے منع نہیں کرتے مگر دعا سے مطلب صرف عبادت ہے جس پر ثواب مترتب ہوتا ہے مگر افسوس کہ یہ لوگ نہیں سوچتے کہ ہر ایک عبادت جس کے اندر خدا تعالیٰ کی طرف سے روحانیت پیدا نہیں ہوتی اور ہر ایک ثواب میں جس کی محض خیال کے طور پر کسی آئندہ زمانہ پر امید رکھی جاتی ہے وہ سب خیال باطل ہے حقیقی عبادت اور حقیقی ثواب وہی ہے جس کے اسی دُنیا میں انوار اور برکات محسوس بھی ہوں ہماری پرستش کی قبولیت کے آثار یہی ہیں کہ ہم عین دعا کے وقت میں اپنے دِل کی آنکھ سے مشاہدہ کریں کہ ایک تریاقی نور خدا سے اُترتا اور ہمارے دل کے زہریلے مواد کو کھوتا اور ہمارے پر ایک شعلہ کی طرح گرتا اور فی الفور ہمیں ایک پاک کیفیت انشراحِ صدر اور یقین اور محبت اور لذت اور اُنس اور ذوق سے پُر کر دیتا ہے۔ اگر یہ امر نہیں ہوتا تو پھر دعا اور عبادت بھی ایک رسم اور عادت ہے۔ ہر ایک دعا گو ہماری دُنیوی مشکل کشائی کے لئے ہو مگر ہماری ایمانی حالت اور عرفانی مرتبت پر گذر کر آتی ہے یعنی اول ہمیں ایمان اور عرفان میں ترقی بخشتی ہے اور ایک پاک سکینت اور انشراحِ صدر اور اطمینان اور حقیقی خوشحالی ہمیں عطا کر کے پھر ہماری دُنیوی مکروہات پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور جس پہلو سے مناسب ہے اس پہلو سے ہمارے غم کو دُور کر دیتی ہے پس اس تمام تحقیقات سے ثابت ہے کہ دعا اسی حالت میں دعا کہلا سکتی ہے کہ جب درحقیقت اس میں ایک قوتِ کشش ہو اور واقعی طور پر دعا کرنے کے بعد آسمان سے ایک نور اُترے جو ہماری گھبراہٹ کو دُور کرے اور ہمیں انشراحِ صدر بخشے اور سکینت اور اطمینان عطا کرے۔ ہاں حکیم مُطلق ہماری دعاؤں کے بعد دو طور سے نصرت اور امداد کو نازل کرتا ہے (۱) ایک یہ کہ اس بَلا کو دُور کر دیتا ہے جس کے نیچے ہم دب کر مَرنے کو تیار ہیں (۲) دوسرے یہ کہ بَلا کی برداشت کے لئے ہمیں فوق العادت قوت عنایت کرتا ہے بلکہ اس میں لذت بخشتا ہے اور انشراحِ صدر عنایت فرماتا ہے۔ پس اِن دونوں طریقوں سے ثابت ہے کہ دعا سے ضرور نصرتِ الٰہی نازل ہوتی ہے۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ نمبر ۲ صفحہ ۴۸)

دُعا جو خدا تعالیٰ کی پاک کلام نے مسلمانوں پر فرض کی ہے اس کی فرضیت کے چار سبب ہیں (۱) ایک یہ کہ تا ہر ایک وقت اور ہر ایک حالت میں خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر توحید پر پختگی حاصل ہو کیونکہ خدا سے مانگنا اِس بات کا اِقرار کرنا ہے کہ مرادوں کا دینے والا صرف خدا ہے (۲) دوسرے یہ کہ تا دعا کے قبول ہونے اور مُراد کے ملنے پر ایمان قوی ہو (۳) تیسرے یہ کہ اگر کسی اَور رنگ میں عنایتِ الٰہی شامِل حال ہو تو علم اور حکمت زیادت پکڑے (۴) چوتھے یہ کہ اگر دُعا کی قبولیت کا اِلہام اور رؤیا کے ساتھ وعدہ دیا جائے اور اسی طرح ظہور میں آوے تو معرفتِ الٰہی ترقی کرے اور معرفت سے یقین اور یقین سے محبت اور محبت سے ہر ایک گناہ اور غیر اللہ سے اِنقطاع حاصل ہو جو حقیقی نجات کا ثمرہ ہے لیکن اگر کسی کو بطور خود مُرادیں ملتی جائیں اور خدا تعالیٰ سے دُوری اور مجوبی ہو تو وہ تمام مُرادیں انجام کار حسرتیں ہیں اور وہ تمام مقاصد جن پر فخر کیا جاتا ہے آخر الامر جائے افسوس اور تاسّف ہیں۔ دُنیا کے تمام عیش آخر رنج سے بدل جائیں گے اور تمام راحتیں دُکھ اور دَرد دکھائی دیں گی مگر وہ بصیرت اور معرفت جو انسان کو دعا سے حاصل ہوتی ہے اور وہ نعمت جو دعا کے وقت آسمانی خزانہ سے ملتی ہے وہ کبھی کم نہ ہوگی اور نہ اس پر زوال آئے گا بلکہ روز بروز معرفت اور محبتِ الٰہی میں ترقی ہو کر انسان اس زینہ کے ذریعہ سے جو دعا ہے فردوسِ اعلیٰ کی طرف چڑھتا جائے گا۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ ۲ صفحہ ۵۰، ۵۱)

دعاؤں میں اثر ہوتے ہیں مگر صبر سے ان کا ظہور ہوتا ہے۔ میرے نزدیک نہایت ہی خوش قسمت وہ شخص ہے جو ہمیشہ اپنے تئیں دعا کے سلسلہ کے نزدیک رکھتا ہے۔ اگر تمام جہان اس قول کے برخلاف ہو جائے تب بھی وہ سب غلطی پر ہیں۔ دعا سے بڑے بڑے اِنقلاب پیدا ہو جاتے ہیں۔ دعا زمین سے لے کر آسمان تک اپنا اثر رکھتی ہے۔ عجب کرشمے دکھاتی ہے۔ ہاں پورے طور پر اس زندہ دعا کا ظہور میں آجانا اور ہو جانا یہ بھی خدا تعالیٰ کے فضل پر موقوف ہے۔ (مکتوباتِ احمدیہ جلد ۵ حصہ اوّل صفحہ ۲۰ مکتوب ۵۳ بنام حضرت سیٹھ عبد الرحمٰن صاحب مدراسی)

میرے خدائے کریم و قدیر کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے ارادوں کو جو دعاؤں کی قبولیت کے بعد ظاہر کرنا چاہتا ہے اکثر دیرا اور آہستگی سے ظاہر کرتا ہے تا جو بدبخت اور شتاب کار ہیں وہ بھاگ جائیں اور اس خاص طور کے فضل کا اُنہیں کو حصہ ملے جو خدا تعالیٰ عزّ وجلّ کے دفتر میں سعید لکھے گئے ہیں۔

(مکتوباتِ احمدیہ جلد ۵ حصہ اوّل صفحہ ۴۳ مکتوب ۸۲ بنام حضرت سیٹھ عبد الرحمٰن صاحب مدراسی)

بعض اوقات انسان کسی دعا میں ناکام رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے دعا رَدّ کر دی حالانکہ خدائے تعالیٰ اُس کی دعا کو سُن لیتا ہے اور وہ اجابت بصورت رَدّ ہی ہوتی ہے کیونکہ اُس کے لئے در پردہ اور حقیقت میں بہتری اور بھلائی اس کے رَدّ ہی میں ہوتی ہے۔ انسان چونکہ کوتاہ بین اور دُور اندیش نہیں بلکہ ظاہر پرست

ہے اِس لئے اس کو مناسب ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا کرے اور وہ بظاہر اس کے مفید مطلب نتیجہ خیز نہ ہو تو خدا پر بدظن نہ ہو کہ اُس نے میری دعا نہیں سُنی۔ وہ تو ہر ایک کی دُعا سُنتا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ فرماتا ہے۔ راز اور بھید یہی ہوتا ہے کہ داعی کے لئے خیر اور بھلائی ردِّ دعا ہی میں ہوتی ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۳۱)

ہماری دعا کا جو تعلق خدائے تعالیٰ سے ہے مَیں چاہتا ہوں کہ اُسے بھی بیان کروں۔ ایک بچہ جب بھوک سے بیتاب ہو کر دُودھ کے لئے چلاتا اور چیختا ہے تو ماں کے پستان میں دُودھ جوش مار کر آجاتا ہے۔ بچہ دعا کا نام بھی نہیں جانتا لیکن اس کی چیخیں دُودھ کو کیونکر کھینچ لاتی ہیں؟ اس کا ہر ایک کو تجربہ ہے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ مائیں دُودھ کو محسوس بھی نہیں کرتیں مگر بچہ کی چلاّہٹ ہے کہ دُودھ کو کھینچ لاتی ہے۔ تو کیا ہماری چیخیں جب اللہ تعالیٰ کے حضور ہوں تو وہ کچھ بھی نہیں کھینچ کر لا سکتیں؟ آتا ہے اور سب کچھ آتا ہے مگر آنکھوں کے اندھے جو فاضل اور فلاسفر بنے بیٹھے ہیں وہ دیکھ نہیں سکتے۔ بچہ کو جو مناسبت ماں سے ہے اس تعلق اور رشتہ کو انسان اپنے ذہن میں رکھ کر اگر دعا کی فلاسفی پر غور کرے تو وہ بہت آسان اور سہل معلوم ہوتی ہے۔ دوسری قسم کا رحم یہ تعلیم دیتا ہے کہ ایک رحم مانگنے کے بعد پیدا ہوتا ہے مانگتے جاؤ گے ملتا جاوے گا۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ کوئی لفاظی نہیں بلکہ یہ انسانی سرشت کا ایک لازمہ ہے۔ مانگنا انسان کا خاصہ ہے اور استجابت اللہ تعالیٰ کا۔ جو نہیں سمجھتا اور نہیں مانتا وہ جھوٹا ہے۔ بچہ کی جو مثال مَیں نے بیان کی ہے وہ دعا کی فلاسفی خوب حل کرکے دکھاتی ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۹، ۱۵۰)

قضائے معلّق اور مُبرم کا ماخذ اور پتہ قرآن کریم سے ملتا ہے۔ یہ الفاظ گو نہیں مثلاً قرآن کریم میں آیا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ ترجمہ "دعا مانگو مَیں قبول کروں گا۔" اب یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا قبول ہو سکتی ہے اور دعا سے عذاب ٹل جاتا ہے اور ہزارہا کیا کُل کام دعا سے نکلتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کُل چیزوں پر قادرانہ تصرّف ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اس کے پوشیدہ تصرّفات کی لوگوں کو خواہ خبر ہو یا نہ ہو مگر صدہا تجربہ کاروں کے وسیع تجربے اور ہزارہا دردمندوں کی دعا کے صریح نتیجے بتلا رہے ہیں کہ اس کا ایک پوشیدہ اور مخفی تصرّف ہے وہ جو چاہتا ہے محو کرتا ہے اور جو چاہتا ہے اثبات کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۳)

خدا تعالیٰ نے جو اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ فرمایا یہ نری لفاظی نہیں ہے بلکہ انسانی شرف اس کا متقاضی ہے مانگنا انسانی خاصہ ہے اور استجابت اللہ تعالیٰ کا۔ جو نہیں مانتا وہ ظالم ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۲ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ بڑا ہی کریم ورحیم اور بامروت ہے۔ جب کوئی شخص اس کی رضا کو مقدم کر لیتا ہے اور اس کی مرضی پر راضی ہوجاتا ہے تو وہ اس کو اس کا بدلہ دئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ غرض یہ تو وہ مقام اور مرحلہ ہے جہاں وہ اپنی بات منوانی چاہتا ہے۔ دوسرا مقام اور مرحلہ وہ ہے جو اس نے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ میں فرمایا ہے۔ یہاں وہ اس کی بات ماننے کا وعدہ فرماتا ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۸ مورخہ ۲۴ رمئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

قرآن شریف پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعاؤں کو سُنتا ہے اور وہ بہت ہی قریب ہے لیکن اگر خدا تعالیٰ کی صفات اور اسماء کا لحاظ نہ کیا جائے اور دعا کی جائے تو وہ کچھ بھی اثر نہیں رکھتی۔ صرف اِس ایک راز کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ معلوم نہ کرنے کی وجہ سے دُنیا ہلاک ہو رہی ہے۔ مَیں نے بہت لوگوں کو کہتے سُنا ہے کہ ہم نے بہت دعائیں کیں اور ان کا نتیجہ کچھ نہیں ہُوا اور اس نتیجہ نے ان کو دہریہ بنا دیا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہر امر کے لئے کچھ قواعد اور قوانین ہوتے ہیں ایسا ہی دعا کے واسطے قواعد و قوانین مقرر ہیں۔ یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوئی اس کا باعث یہی ہے کہ وہ ان قواعد اور مراتب کا لحاظ نہیں رکھتے جو قبولیتِ دعا کے واسطے ضروری ہیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

بنی نوعِ انسان کے ساتھ ہمدردی میں میرا یہ مذہب ہے کہ جب تک دشمن کے لئے دعا نہ کی جاوے پورے طور پر سینہ صاف نہیں ہوتا ہے۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ میں اللہ تعالیٰ نے قید نہیں لگائی کہ دشمن کے لئے دُعا کرو تو قبول نہیں کروں گا بلکہ میرا تو یہ مذہب ہے کہ دشمن کے لئے کرنا یہ بھی سُنّتِ نبوی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی سے مسلمان ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے لئے اکثر دعا کیا کرتے تھے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ راگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۵، ۶)

بولنے والا خدا صرف ایک ہی ہے جو اسلام کا خدا ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے جس نے کہا اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ تم مجھے پکارو تم کو جواب دوں گا اور یہ بالکل سچی بات ہے۔ کوئی ہو جو ایک عرصہ تک سچی نیت اور صفائی قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہو۔ وہ مجاہدہ کرے اور دُعاؤں میں لگا رہے آخر اس کی دعاؤں کا جواب اُسے ضرور دیا جاوے گا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۵ مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

ہمارا خدا تعالیٰ پر کیا حق ہے کہ ہم جو کہیں وہ وہی کر دے یہ سُوءِ ادب ہے اور ایسا خدا خدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ اس کا فضل ہے کہ اُس نے ہم کو امید اور حوصلہ دلایا کہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ یہ نہیں کہا کہ تم جو مانگو گے وہی دیا جاوے گا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن شریف دہریوں کی طرح تمام امور کو اسبابِ طبیعیہ تک محدود رکھنا نہیں چاہتا بلکہ خالص توحید تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگوں نے دُعا کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور نہ قضا و قدر

کے تعلقات کو جو دُعا کے ساتھ ہیں تدبر کی نگاہ سے دیکھا ہے جو لوگ دُعا سے کام لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے لئے راہ کھول دیتا ہے۔ وہ دُعا کو رَدّ نہیں کرتا۔ ایک طرف دُعا ہے دوسری طرف قضا و قدر۔ خدا نے ہر ایک کے لئے اپنے رنگ میں اَوقات مقرر کر دیئے ہیں اور ربوبیت کے حصّہ کو عبودیت میں دیا گیا ہے اور فرمایا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ مجھے پکارو میں جواب دوں گا..... قضا و قدر کا دُعا کے ساتھ بہت بڑا تعلق ہے۔ دُعا کے ساتھ معلق تقدیر ٹل جاتی ہے۔ جب مشکلات پیدا ہوتے ہیں تو دُعا ضرور اثر کرتی ہے۔ جو لوگ دُعا سے منکر ہیں اُن کو ایک دھوکا لگا ہوا ہے۔ قرآن شریف نے دُعا کے دو پہلو بیان کئے ہیں ایک پہلو میں اللہ تعالیٰ اپنی منوانا چاہتا ہے اور دوسرے پہلو میں بندے کی مان لیتا ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ[1] میں تو اپنا حق رکھ کر منوانا چاہتا ہے۔ نونِ ثقیلہ کے ذریعہ جو اظہارِ تاکید کیا ہے اس سے اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہے کہ قضائے مُبرم کو ظاہر کریں گے تو اس کا علاج اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ہی ہے اور دوسرا وقت خدا تعالیٰ کے فضل و کرم کی امواج کے جوش کا ہے وہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں ظاہر کیا ہے۔

پس مومن کو ان دونو مقامات کا پورا علم ہونا چاہیئے۔ صوفی کہتے ہیں کہ فقر کامل نہیں ہوتا جب تک محل اور موقع کی شناخت حاصل نہ ہو بلکہ کہتے ہیں کہ صوفی دُعا نہیں کرتا جب تک کہ وقت کو شناخت نہ کرے۔

سید عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دُعا کے ساتھ شقی سعید کیا جاتا ہے بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ شدید الاختفاء امورِ مُشبّہ بالمبرم بھی دُور کئے جاتے ہیں۔

الغرض دُعا کی اِس تقسیم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کبھی اللہ تعالیٰ اپنی منوانا چاہتا ہے اور کبھی وہ مان لیتا ہے۔ یہ معاملہ گویا دوستانہ معاملہ ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جیسی عظیم الشان قبولیت دعاؤں کی ہے اس کے مقابل رضا اور تسلیم کے بھی آپ اعلیٰ درجہ کے مقام پر ہیں۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۳،۴)

میرے نزدیک خدا تعالیٰ کا خوف اور خشیت ایسی چیز ہے جو انسان کی گناہ کی زندگی پر موت وارد کرتی ہے۔ جب سچا خوف دل میں پیدا ہوتا ہے تو پھر دُعا کے لئے تحریک ہوتی ہے اور دُعا وہ چیز ہے جو انسان کی کمزوریوں کا جبر نقصان کرتی ہے۔ اِس لئے دُعا کرنی چاہیئے۔ خدا تعالیٰ کا وعدہ بھی ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ بعض وقت انسان کو ایک دھوکا لگتا ہے کہ وہ عرصہ دراز تک ایک مطلب کے لئے دُعا کرتا ہے اور وہ مطلب

---

[1] سورۃ البقرہ: ۱۵۶

پورا نہیں ہوتا تب وہ گھبرا جاتا ہے حالانکہ گھبرانا نہ چاہیئے بلکہ طلب گار باید صبور وحمول۔ دُعا تو قبول ہو جاتی ہے لیکن انسان کو بعض دفعہ پتہ نہیں لگتا کیونکہ وہ اپنی دُعا کے انجام اور نتائج سے آگاہ نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب ہے اس کے لئے وہ کرتا ہے جو مفید ہوتا ہے اِس لئے نادان انسان یہ خیال کر لیتا ہے کہ میری دُعا قبول نہیں ہوئی حالانکہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے علم میں یہی مفید تھا کہ وہ دُعا اس طرح پر قبول نہ ہو بلکہ کسی اَور رنگ میں ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک بچہ اپنی ماں سے آگ کا سُرخ انگارہ دیکھ کر مانگے تو کیا دانشمند ماں اُسے دے دے گی؟ کبھی نہیں۔ اسی طرح پر دُعا کے متعلق کبھی ہوتا ہے۔ غرض دعائیں کرنے سے کبھی تھکنا نہیں چاہیئے۔ دُعا ہی ایسی چیز ہے جو خدا کی طرف سے ایک قوّت اور نور عطا کرتی ہے جس سے اِنسان بدی پر غالب آجاتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ ۳۱ مورخہ ۳۱ ۔ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

دعاؤں میں استقلال اور صبر ایک الگ چیز ہے اور اکڑ کر مانگنا اَور بات ہے۔ یہ کہنا کہ میرا فلاں کام اگر نہ ہُوا تو مَیں انکار کر دوں گا یا یہ کہہ دوں گا یہ بڑی نادانی اور شرک ہے اور آداب الدّعا سے ناواقفیت ہے۔ ایسے لوگ دعا کی فلاسفی سے ناواقف ہیں۔ قرآن شریف میں یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ ہر ایک دُعا تمہاری مرضی کے موافق مَیں قبول کروں گا۔ بیشک یہ ہم مانتے ہیں کہ قرآن شریف میں لکھا ہُوا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ لیکن ہمارا یہ بھی ایمان ہے کہ اسی قرآن شریف میں یہ بھی لکھا ہوا ہے وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ[1] الآیہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ میں اگر تمہاری مانتا ہے تو لَنَبْلُوَنَّکُمْ میں اپنی منوانی چاہتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا احسان اور اسی کا کرم ہے کہ وہ اپنے بندہ کی بھی مان لیتا ہے ورنہ اس کی الوہیّت اور ربوبیّت کی شان کے یہ ہرگز خلاف نہیں کہ اپنی ہی منوا لے۔

(الحکم جلد ۶ ۳۶ مورخہ ۱۰ ۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۳)

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ[2] میں اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اور لَنَبْلُوَنَّکُمْ کو ملایا ہے۔ نَعْبُدُ تو یہی ہے کہ بھلائی اور بُرائی کا خیال نہ رہے بسلب امید دامانی ہو۔ اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں دُعا کی تعلیم ہے۔

(الحکم جلد ۶ ۳۶ مورخہ ۱۰ ۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۴)

دُعا کرنا اور کرانا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ دُعا کے لئے جب دَرد سے دل بھر جاتا ہے اور سارے حجابوں کو توڑ دیتا ہے اس وقت سمجھنا چاہیئے کہ دُعا قبول ہو گئی۔ یہ اسمِ اعظم ہے۔ اس کے سامنے کوئی اَن ہونی چیز نہیں ہے۔ ایک خبیث کے لئے جب دعا کے ایسے اسباب میسّر آجائیں تو یقیناً وہ صالح ہو جاوے اور بغیر دعا کے وہ اپنی توبہ پر بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ بیمار اور محجوب اپنی دستگیری آپ نہیں کر سکتا۔ سُنّت اللہ کے موافق یہی

---

[1] سورۃ البقرہ : ۱۵۶

[2] سورۃ الفاتحہ : ۵

ہوتاہے کہ جب دُعائیں انتہا تک پہنچتی ہیں تو ایک شعلہ نور کا اس کے دل پر گرتا ہے جو اس کی خباثتوں کو جلا کر تاریکی دُور کر دیتا ہے اور اندر ایک روشنی پیدا کر دیتا ہے یہ طریق استجابت دُعا کا رکھتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ر فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۵، ۶)

خدا تعالیٰ نے تو انسان سے نہایت تنزل کے رنگ میں دوستانہ برتاؤ کیا ہے۔ دوستانہ تعلق کیا ہوتا ہے یہی کہ کبھی ایک دوست دوسرے دوست کی بات مان لیتا ہے اور کبھی دوسرے سے اپنی بات منوانا چاہتا ہے چنانچہ خدا تعالیٰ بھی ایسا ہی کرتا ہے چنانچہ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اور اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ[1] الآیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان کی بات مان لیتا ہے اور اس کی دُعا کو قبول فرماتا ہے اور دوسری فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ الآیہ اور وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات منوانا چاہتا ہے۔

بعض لوگ اللہ تعالیٰ پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ ہماری دُعا کو قبول نہیں کرتا یا اولیاء لوگوں پر طعن کرتے ہیں کہ اُن کی فلاں دُعا قبول نہیں ہوئی۔ اصل میں وہ نادان اس قانونِ الٰہی سے ناآشنا محض ہوتے ہیں جس انسان کو خدا سے ایسا معاملہ پڑا ہوگا وہ خوب اس قاعدہ سے آگاہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے مان لینے کے اور منوانے کے دو نمونے پیش کئے ہیں انہی کو مان لینا ایمان ہے۔ تم ایسے نہ بنو کہ ایک ہی پہلو پر زور دو۔ ایسا نہ ہو کہ تم خدا کی مخالفت کرکے اس کے مقررہ قانون کو توڑنے کی کوشش کرنے والے بنو۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ر مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

جس حالت میں اب اِسلام ہے اس کا علاج اب سوائے دُعا کے اَور کیا ہو سکتا ہے۔ لوگ جہاد جہاد کہتے ہیں مگر اس وقت تو جہاد حرام ہے۔ اِس لئے خدا نے مجھے دعاؤں میں وہ جوش دیا ہے جیسے سمندر میں ایک جوش ہوتا ہے۔ چونکہ توحید کے لئے دُعا کا جوش دل میں ڈالا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ارادہ الٰہی بھی یہی ہے جیساکہ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اس کا وعدہ ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۱ مورخہ ۳ر اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۱)

ہر ایک شیٔ کی ایک اُمّ ہوتی ہے۔ مَیں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ کے جو انعامات ہیں اُن کی اُمّ کیا ہے؟ خدا تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا کہ ان کی اُمّ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ہے۔ کوئی انسان بدی سے بچ نہیں سکتا جب تک خدا تعالیٰ کا فضل نہ ہو پس اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ فرما کر یہ جتلا دیا کہ عاصم وہی ہے اسی کی طرف تم رجوع کرو۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۹ر جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۶۹)

---

[1] سورۃ البقرہ: ۱۸۷

انسان کو چاہیئے کہ اپنے عیبوں کو شمار کرے اور دُعا کرے پھر اللہ تعالیٰ بچاوے تو بچ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مجھ سے دُعا کرو میں مانوں گا۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔

(البدر جلد ۲ ۲۸ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۱۷)

اس سے بڑھ کر انسان کے لئے فخر نہیں کہ وہ خدا کا ہو کر رہے۔ جو اس سے تعلق رکھتے ہیں وہ ان سے مساوات بنا لیتا ہے۔ کبھی ان کی مانتا ہے اور کبھی اپنی منواتا ہے۔ ایک طرف فرماتا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ دوسری طرف فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ[1]۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک مقام دعا کا نہیں ہوتا۔ نَبْلُوَنَّکُمْ کے موقع پر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کہنا پڑے گا۔ یہ مقام صبر اور رضا کے ہوتے ہیں۔ لوگ ایسے موقع پر دھوکا کھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دُعا کیوں قبول نہیں ہوتی۔ ان کا خیال ہے کہ خدا ہماری مُٹھی میں ہے جب چاہیں گے منوالیں گے بھلا امام حسین علیہ السلام پر جو ابتلاء آیا تو کیا انہوں نے دُعا نہ مانگی ہوگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قدر بچے فوت ہوئے تو کیا آپؐ نے دعا نہ کی ہوگی۔ بات یہ ہے کہ یہ مقام صبر اور رضا کے ہوتے ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۱، ۴۲ مورخہ ۲۹ اکتوبر و ۸ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۲۱، ۳۲۲)

تقویٰ کا مرحلہ بڑا مشکل ہے اُسے وہی طے کر سکتا ہے جو بالکل خدا تعالیٰ کی مرضی پہ چلے۔ جو وہ چاہے وہ کرے اپنی مرضی نہ کرے۔ بناوٹ سے کوئی حاصل کرنا چاہے تو ہرگز نہ ہوگا۔ اِس لئے خدا کے فضل کی ضرورت ہے اور وہ اسی طرح سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو دعا کرے اور ایک طرف کوشش کرتا رہے۔ خدا تعالیٰ نے دُعا اور کوشش دونو کی تاکید فرمائی ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ میں تو دعا کی تاکید فرمائی ہے اور وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا[2] میں کوشش کی۔ (البدر جلد ۳ ۲ مورخہ ۸ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

دوستی کا اصول یہ ہے کہ کبھی اپنی اس سے منوائے اور کبھی اس کی آپ مانے اور یہی طریق خدا نے بھی بتلایا ہے۔ ایک جگہ تو فرماتا ہے کہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ کہ تم مانگو تو میں تمہیں دوں گا یعنی تمہاری بات مانوں گا اور دوسری جگہ اپنی منواتا ہے اور فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ الخ۔

(البدر جلد ۳ ۲ مورخہ ۸ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

اِس میں شک نہیں ہے کہ انسان بعض اوقات تدبیر سے فائدہ اُٹھاتا ہے لیکن تدبیر پر کُلّی بھروسہ کرنا سخت نادانی اور جہالت ہے۔ جب تک تدبیر کے ساتھ دعا نہ ہو کچھ نہیں اور دُعا کے ساتھ تدبیر نہ ہو تو کچھ فائدہ نہیں۔ جس کھڑکی کی راہ سے معصیت آتی ہے پہلے ضروری ہے کہ اس کھڑکی کو بند کیا جاوے پھر نفس کی کشاکش کے لئے دُعا

---

[1] سورۃ البقرہ: ۱۵۶ [2] سورۃ العنکبوت: ۷۰

کرتا ہے۔ اِسی کے واسطے کہا ہے وَالَّذِیۡنَ جَاھَدُوۡا فِیۡنَا لَنَھۡدِیَنَّھُمۡ سُبُلَنَا[1] اِس میں کس قدر ہدایت تدابیر کو عمل میں لانے کے واسطے کی گئی ہے تدابیر میں خدا کو نہ چھوڑے۔ دوسری طرف فرماتا ہے اُدۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ۔ پس اگر انسان پورے تقویٰ کا طالب ہے تو تدبیر کرے اور دعا کرے۔ دونو کو جو بجالانے کا حق ہے بجالائے تو ایسی حالت میں خدا اس پر رحم کرے گا لیکن اگر ایک کرے گا اور دوسری کو چھوڑے گا تو محروم رہے گا۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

جَاھَدُوۡا فِیۡنَا کے یہی معنے ہیں کہ حصولِ تقویٰ کے لئے حتی الوسع تدابیر کو عمل میں لاوے اور پھر دوسری جگہ اُدۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ کہہ کر بتلا دیا کہ جب تدابیر کر چکو تو پھر خدا سے دعا مانگو وہ قبول ہوگی۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۹ مورخہ یکم مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

کامل ایمان ہو تو دُعائیں بھی قبول ہوتی ہیں اور اُدۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے جو خلاف نہیں ہوتا۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

انسان اپنی شتاب کاری اور جلد بازی کی وجہ سے محروم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ بالکل سچا ہے اُدۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ پس تم اس سے مانگو اور پھر مانگو اور پھر مانگو۔ جو مانگتے ہیں ان کو دیا جاتا ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ دعا ہو نری بک بک نہ ہو اور زبان کی لاف زنی اور چرب زبانی ہی نہ ہو۔ ایسے لوگ جنہوں نے دُعا کے لئے استقامت اور استقلال سے کام نہیں لیا اور آدابِ دُعا کو ملحوظ نہیں رکھا جب ان کو کچھ ہاتھ نہ آیا تو آخر وہ دُعا اور اس کے اثر سے منکر ہو گئے اور پھر رفتہ رفتہ خدا تعالیٰ سے بھی منکر ہو بیٹھے کہ اگر خدا ہوتا تو ہماری دُعا کو کیوں نہ سُنتا۔ اِن احمقوں کو اِتنا معلوم نہیں کہ خدا تو ہے مگر تمہاری دعائیں بھی دعائیں ہوتیں۔ پنجابی زبان میں ایک ضرب المثل ہے جو دُعا کے مضمون کو خوب ادا کرتی ہے اور وہ یہ ہے:

جو منگے سو مَر رہے مَرے سو منگن جا

یعنی جو مانگنا چاہتا ہے اس کو ضروری ہے کہ ایک موت اپنے اُوپر وارد کرے اور مانگنے کا حق اسی کا ہے جو اوّل اس موت کو حاصل کرے۔ حقیقت میں اس موت کے نیچے دُعا کی حقیقت ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ دعا کے اندر قبولیت کا اثر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ انتہائی درجہ کے اضطرار تک پہنچ جاتی ہے۔ جب انتہائی درجہ اضطرار کا پیدا ہو جاتا ہے اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی قبولیت کے آثار اور سامان بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ پہلے سامان آسمان پر کئے جاتے ہیں اس کے بعد وہ زمین پر اثر

---

[1] سُورۃ العنکبوت: ۷۰

دکھاتے ہیں۔ یہ چھوٹی سی بات نہیں بلکہ ایک عظیم الشان حقیقت ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جس کو خدائی کا جلوہ دیکھنا ہو اُسے چاہیئے کہ دعا کرے۔

اِن آنکھوں سے وہ نظر نہیں آتا بلکہ دُعا کی آنکھوں سے نظر آتا ہے کیونکہ اگر دُعا کے قبول کرنے والے کا پتہ نہ لگے تو جیسے لکڑی کو گھن لگ کر وہ نکمی ہو جاتی ہے ویسے ہی انسان پکار پکار کر تھک کر آخر دہریہ ہو جاتا ہے۔ ایسی دُعا چاہیئے کہ اس کے ذریعہ ثابت ہو جاوے کہ اس کی ہستی برحق ہے۔ جب اس کو یہ پتہ لگ جاوے گا تو اس وقت وہ اصل میں صاف ہو گا۔ یہ بات اگرچہ بہت مشکل نظر آتی ہے لیکن اصل میں مشکل بھی نہیں ہے بشرطیکہ تدبیر اور دعا دونوں سے کام لیوے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۱ مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۸)

اَدنیٰ اور اعلیٰ سب حاجتیں بغیر شرم کے خدا سے مانگو کہ اصل معطی وہی ہے۔ بہت نیک وہی ہے جو بہت دعا کرتا ہے کیونکہ اگر کسی بخیل کے دروازہ پر سوالی ہر روز جا کر سوال کرے گا تو آخر ایک دن اس کو بھی شرم آجاوے گی۔ پھر خدا تعالیٰ سے مانگنے والا جو بیمثل کریم ہے کیوں نہ پائے؟ پس مانگنے والا کبھی نہ کبھی ضرور پا لیتا ہے۔ نماز کا دوسرا نام دُعا بھی ہے جیسے فرمایا اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸،۳۹ مورخہ ۱۰،۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

دوسرا طریق حقیقی پاکیزگی کے حاصل کرنے اور خاتمہ بالخیر کے لئے جو خدا تعالیٰ نے سکھایا ہے وہ دُعا ہے اِسلئے جس قدر ہو سکے دُعا کرو۔ یہ طریق بھی اعلیٰ درجہ کا مجرب اور مفید ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے خود وعدہ فرمایا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ تم مجھ سے دُعا کرو میں تمہارے لئے قبول کروں گا۔ دُعا ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کو فخر کرنا چاہیئے۔ دوسری قوموں کو دعا کی کوئی قدر نہیں اور نہ انہیں اِس پاک طریق پر کوئی فخر اور ناز ہو سکتا ہے بلکہ یہ فخر اور ناز صرف اِسلام ہی کو ہے دوسرے مذاہب اِس سے بکلّی بے بہرہ ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۲)

مَیں یقیناً کہتا ہوں اور اپنے تجربہ سے کہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام کو اطمینان جب نصیب ہُوا ہے تو اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ پر عمل کرنے سے ہی ہُوا ہے۔ مجاہدات عجیب اکسیر ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

اِس میں شک نہیں کہ جب انسان خدا تعالیٰ سے دُعا کرتا ہے تو اکثر خدا تعالیٰ اپنے بندے کی دُعا قبول کرتا ہے لیکن بعض دفعہ خدا تعالیٰ اپنی بات منواتا ہے۔ دو دوستوں کی آپس میں دوستی کے قائم رہنے کی یہی نشانی ہوتی ہے کہ کبھی اس نے اُس کی بات مان لی اور کبھی اُس نے اس کی بات مان لی۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہمیشہ ایک ہی دوسرے کی بات مانتا رہے اور وہ اپنی بات کبھی نہ منوائے۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ ہمیشہ اس کی دعا قبول ہوتی رہے اور اس کی خواہش پوری ہوتی رہے وہ بڑی غلطی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ سے قرآن شریف میں دو

آیتیں نازل فرمائی ہیں ایک میں فرمایا اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ تم دعا مانگو میں جواب دوں گا۔ دوسری آیت میں فرمایا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ الخ یعنی ضرور ہے کہ تم پر قسما قسم کے اِبتلاء پڑیں اور امتحان آئیں اور آزمائشیں کی جاویں تاکہ تم انعام حاصل کرنے کے مستحق ٹھہرو۔ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائشیں کرتا ہے لیکن جو لوگ استقامت اختیار کرتے ہیں خدا تعالیٰ اُن کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ دعا کے بعد کامیابی اپنی خواہش کے مطابق ہو یا مصلحت الٰہی کوئی دوسری صورت پیدا کر دے ہر حال میں دعا کا جواب ضرور خدا تعالیٰ کی طرف سے مل جاتا ہے ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ دُعا کے واسطے اس کی حد تک جو ضروری ہے تضرع کی جاوے اور پھر جواب نہ ملے۔

(بدر جلد ۲ نمبر ۳۲ مورخہ ۹ ؍اگست ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

ہماری جماعت کو چاہیئے کہ راتوں کو رو رو کر دُعائیں کریں۔ اُس کا وعدہ ہے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ دعا سے مُراد دُنیا کی دعا ہے۔ وہ دُنیا کے کیڑے ہیں اِس لئے اس سے پَرے نہیں جا سکتے اصل دعا دین ہی کی دعا ہے لیکن یہ مت سمجھو کہ ہم گنہ گار ہیں یہ دعا کیا ہوگی اور ہماری تبدیلی کیسے ہو سکے گی یہ غلطی ہے بعض وقت اِنسان خطاؤں کے ساتھ ہی ان پر غالب آسکتا ہے اِس لئے کہ اصل فطرت میں پاکیزگی ہے دیکھو پانی خواہ کیسا ہی گرم ہو لیکن جب وہ آگ پر ڈالا جاتا ہے تو وہ بہر حال آگ کو بُجھا دیتا ہے اِس لئے کہ فطرتاً برودت اس میں ہے۔ ٹھیک اسی طرح پر انسان کی فطرت میں پاکیزگی ہے۔ ہر ایک میں یہ مادہ موجود ہے۔ وہ پاکیزگی کہیں نہیں گئی۔ اسی طرح تمہاری طبیعتوں میں خواہ کیسے ہی جذبات ہوں رو کر دُعا کرو گے تو اللہ تعالیٰ دُور کر دے گا۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ ؍جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۵)

انسان خدا کے امتحان میں بہت جلد ترقی کر لیتا ہے اور وہ مدارج حاصل کر لیتا ہے جو اپنی محنت اور کوشش سے کبھی حاصل نہیں کر سکتا اِسی واسطے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ میں اللہ تعالیٰ نے کوئی بشارت نہیں دی مگر وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ الآیۃ میں بڑی بڑی بشارتیں دی ہیں اور فرمایا ہے کہ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی بڑی برکتیں اور رحمتیں ہوں گی اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ غرض یہی طریق ہے جس سے انسان خدا کو راضی کر سکتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ؍ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ ۔۔۔

لہ سورۃ البقرۃ : ۱۵۶

دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ

لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ان کو کہہ دے کہ میری راہ یہ ہے کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ اپنا تمام وجود خدا تعالیٰ کو سونپ دوں اور اپنے تئیں رب العٰلمین کے لئے خالص کر لوں یعنی اس میں فنا ہو کر جیسا کہ وہ رب العالمین ہے مَیں خادم العالمین بنوں اور ہمہ تن اُسی کا اور اُسی کی راہ کا ہو جاؤں۔ سو مَیں نے اپنا تمام وجود اور جو کچھ میرا تھا خدا تعالیٰ کا کر دیا ہے اب کچھ بھی میرا نہیں۔ جو کچھ میرا ہے وہ سب اُس کا ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۶۵)

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ

نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ○

انصاف کی آنکھ سے دیکھنا چاہیئے کہ جس طرح حضرت مسیح کے حق میں اللہ جلّ شانہٗ نے قرآن کریم میں اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ فرمایا ہے اسی طرح ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمایا ہے فَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ یعنی دونوں جگہ مسیح کے حق میں اور ہمارے سیّد و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں توفّی کا لفظ موجود ہے پھر کس قدر ناانصافی کی بات ہے کہ ہمارے سیّد و مولیٰ کی نسبت جو توفّی کا لفظ آیا ہے تو اس جگہ تو ہم وفات کے ہی معنے کریں اور اُسی لفظ کو حضرت عیسٰیؑ کی نسبت اپنے اصلی اور شائع متعارف معنوں سے پھیر کر اور اُن متفق علیہ معنے سے جو اوّل سے آخر تک قرآن شریف سے ظاہر ہو رہے ہیں اِنحراف کر کے اپنے دل سے کچھ اَور کے اَور معنے تراش لیں۔ اگر یہ الحاد اور تحریف نہیں تو پھر الحاد اور تحریف کس کو کہتے ہیں؟ (ازالہ اوہام صفحہ ۳۴۱)

پوری ترقی دین کی کسی نبی کی عینِ حیات میں نہیں ہوتی بلکہ انبیاء کا یہ کام تھا کہ انہوں نے ترقی کا کسی قدر نمونہ دکھلا دیا اور پھر بعد ان کے ترقیاں ظہور میں آئیں جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام دُنیا کے لئے اور ہر ایک اَسود اور احمر کے لئے مبعوث ہوئے تھے مگر آپؐ کی حیات میں احمر یعنی یورپ کی قوم کو تو اسلام سے کچھ بھی حصّہ نہ ملا ایک بھی مسلمان نہیں ہوا۔ اور جو اَسود تھے ان میں سے صرف جزیرۂ عرب میں اسلام

پھیلا اور مکہ کی فتح کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۹۲)
یہ مسلمان کہلاتے ہیں۔ موحد کہلاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل الانبیاء اور خیر البشر تسلیم کرتے ہیں لیکن جب وہی لفظ توفی کا آپ پر آتا ہے تو اس کے معنے موت کرتے ہیں اور جب مسیح پر آتا ہے تو زندہ مع جسم آسمان پر اٹھائے جاتے ہیں۔ ان کی غیرت کو کیا ہوا۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی ہتک کیوں روا رکھتے ہیں کیا قرآن شریف میں نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہیں آیا اور وہی لفظ مسیح کیلئے مُتَوَفِّيْكَ[1] اور فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ[2] میں آیا ہے پھر یہ کیا ہو گیا کہ ایک جگہ کچھ اور معنے اور ایک جگہ کچھ اور۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی کمزور نبی سمجھا ہے!!! جو انہیں زمین میں دفن کرتے ہیں اور مسیح کو آسمان پر چڑھاتے ہیں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہوتی اور آپ کے جلال اور شوکت کے لئے غیرت ہے تو کیوں نہیں کہہ دیتے کہ وہ بھی زندہ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں تب میں بھی سمجھ لیتا کہ یہ مسیح کی خصوصیت نہیں ٹھہراتے مگر موجودہ حالت میں میرا دل گوارا نہیں کرسکتا کہ میں قرآن شریف کے ایسے معنے کروں جو خود قرآن شریف اور لغت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر کے خلاف ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتکِ شان کا باعث ہوں۔
میں سچ کہتا ہوں کہ جس شخص نے یہ لکھا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ نہیں وہ کافر ہے وہ سچ کہتا ہے۔
اِس خصوصیت کے پیدا کرنے کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ ۳۰ لاکھ مرتد ہو گیا۔
خدا کے واسطے اس قدر ظلم نہ کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور رتبہ کو گھٹایا جاوے جو اِس عقیدہ سے برابر گھٹتی ہے کہ وہ تو زمین میں دفن کئے گئے اور مسیح آسمان پر اٹھایا گیا۔ مسیح ہرگز زندہ نہیں رہا وہ مر گیا جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ[3] اور خود مسیح نے اقرار کر لیا فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ[4]۔
(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۳ مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)
تَوَفِّیْ کے معنے موت بھی قرآن مجید ہی سے ثابت ہے کیونکہ یہی لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی آیا ہے جیسا کہ فرمایا فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ کہا ہے جس کے معنی موت ہی ہیں۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۳ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)
تَوَفِّیْ کا لفظ کوئی نرالا اور نیا لفظ نہ تھا اس کے معنے تمام لغتِ عرب میں خواہ وہ کسی نے لکھی ہوں موت کے

---

[1] سورۃ آل عمران : ۵۶
[2] سورۃ المائدہ : ۱۱۸
[3] سورۃ آل عمران : ۵۶
[4] سورۃ المائدہ : ۱۱۸

کئے ہیں۔ پھر انہوں نے مع جسم آسمان پر اُٹھانے کے معنے آپ ہی کیوں بنا لئے ہم کو افسوس نہ ہوتا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی اِس لفظ کے یہی معنے کر لیتے کیونکہ یہی لفظ آپؐ کے لئے بھی تو قرآن شریف میں آیا ہے جیساکہ فرمایا ہے فَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ اب بتاؤ کہ اگر اِس لفظ کے معنے مع جسم آسمان پر اُٹھانا ہی ہیں تو کیا ہمارا حق نہیں کہ آپؐ کے لئے بھی یہی معنے کریں۔ کیا وجہ ہے کہ وہ نبی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہزارہا درجہ کم تر ہے اس کے لئے جب یہ لفظ بولا جاوے تو اس کے مَن گھڑت معنے کرکے زندہ آسمان پر لے جاویں لیکن جب سیّد الاوّلین والآخرینؐ کے لئے یہ لفظ آوے تو اس کے معنے بجز موت کے اَور کچھ نہ کریں حالانکہ آپؐ کی زندگی ایسی ثابت ہے کہ کسی اَور نبی کی ثابت نہیں اور اِس لئے ہم زور اور دعویٰ سے یہ بات پیش کرتے ہیں کہ اگر کوئی نبی زندہ ہے تو وہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۶ مورخہ ۱۷؍فروری ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

خدا کی شہادت سب سے زیادہ معتبر ہے۔ خدا کا پاک کلام قرآن شریف ہمارے پاس موجود ہے۔ مسائل مختلفہ میں فیصلہ کرنے اور حق پانے کے واسطے مسلمانوں کو اوّل قرآن شریف ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی حیاتِ ابدی کی کوئی دلیل اگر اُن کے پاس ہے تو اُن کو چاہیئے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت پیش کریں مگر قرآن شریف میں جب ہم اس غرض کے لئے غور کرتے ہیں تو ہمیں تو ان کے حق میں خدا تعالیٰ کا یہی کلام ملتا ہے کہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ۔ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ اب جائے غور ہے کہ آیا یہ لفظ قرآن شریف میں کسی اَور نبی کے حق میں بھی آیا ہے یا کہ نہیں؟ سو ہم صاف بتاتے ہیں کہ اَور انبیاء اور ہمارے سیّد و مولیٰ محمد مجتبیٰ احمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی یہی لفظ تَوَفِّی کا استعمال ہوا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں بھی یہی لفظ نظر آتا ہے تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ[1]۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ ہمیں کوئی اِس خصوصیت کی وجہ تو بتادے کہ کیوں یہ لفظ اَور انبیاء پر تو موت کے معنوں میں وارد ہوتا ہے اور کیوں حضرت عیسٰیؑ کے حق میں آوے تو لفظ کی یہ خاصیت بدل جاتی ہے اور یہ لفظ موت کے معنے نہیں دیتا۔ ان کو چاہیئے کہ تعصب کو الگ کرکے ایک گھڑی بھر کے لئے حق جُو ہو کر اس میں غور کریں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۶ مورخہ ۶؍اگست ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

تَوَفِّی کا لفظ بجز وفات کے جسمِ عنصری سے آسمان پر چڑھ جانے کے ہرگز قرآن شریف سے کوئی ثابت نہ کرسکے گا۔ دیکھو یہی لفظ تَوَفِّی کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں قرآن شریف نے بولا ہے۔ فَاِمَّا نُرِیَنَّکَ

---

[1] سورۃ یوسف : ۱۰۲

بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُ ھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں بھی یہی لفظ تَوَفِّی ہی آیا ہے تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ..... اب جائے غور ہے کہ اَوروں کے واسطے تو یہی لفظ موت پر دلالت کرے مگر حضرت عیسٰیؑ کے حق میں اگر آجاوے تو اس میں کچھ ایسی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کے معنے بجائے موت کے جسم عنصری سے آسمان پر چڑھ جانے کے ہو جاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۴ رمئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں صاف یہ لفظ ہیں اِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ پھر حضرت یوسفؑ کے متعلق بھی قرآن شریف میں یہی تَوَفِّی کا لفظ وارد ہے اور اس کے معنے بجز موت اَور ہرگز نہیں ہیں۔ دیکھو تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ۔ یہ حضرت یوسفؑ کی دُعا ہے تو کیا اسکے بھی یہی معنی ہیں کہ اے خدا مجھے زندہ مع جسم عنصری آسمان پر اُٹھالے اور پہلے صلحاء کے ساتھ شامل کر دے جو کہ زندہ آسمان پر موجود ہیں۔ تَعَالَی اللّٰہُ عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۶ مورخہ ۱۴ راگست ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

تَوَفِّی کے معنے موت ایسی بدیہی بات ہے کہ اس کا انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ لفظ قرآن مجید میں اَور انبیاء کے لئے بھی آیا ہے مثلاً حضرت یوسفؑ نے کہا وَتَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اَوْنَتَوَفَّیَنَّکَ دونو باب تفعّل سے ہیں کسی لُغت کی کتاب میں بھی اس کے خلاف معنے نہ پاؤ گے۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۲۴ رمئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴، ۵)

قرآن شریف میں صرف لفظ تَوَفِّی ہی کو لے کر اس کو دیکھ لو کہ بھلا کسی مقام پر اس کے معنی بجز موت کے کچھ اَور بھی ہیں یا مع جسم عنصری کے آسمان پر اُٹھائے جانے کے ہیں؟ یہی تَوَفِّی کا لفظ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ آیتِ کریمہ اِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ پر غور کر کے دیکھ لو۔ پھر یہی تَوَفِّی کا لفظ ہے جو حضرت یوسفؑ کے حق میں وارد ہے۔ پھر ہمیں سمجھ نہیں آتا کہ برخلاف نصِ قرآنی کے اَور تمام انبیاء کے کیوں حضرت عیسٰیؑ کو یہ خصوصیت دی جاتی ہے۔ کتب احادیث میں قریباً تین سَو مرتبہ یہی لفظ تَوَفِّی کا آیا ہے مگر کہیں بھی بجسدِ عنصری آسمان پر اُٹھا کر جانے کے معنی نہیں ہیں جہاں دیکھو یہ لفظ موت کے معنی میں وارد ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۸ رجولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ [1]

---

[1] سورۃ یوسف : ۱۰۲

وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۗ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ

بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ

هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝

جس قدر دُنیا میں نبی گزرے ہیں بعض کا ان میں سے ہم نے قرآن شریف میں ذکر کیا ہے اور بعض کا ذکر نہیں کیا۔ اِس قول سے مطلب یہ ہے کہ تا مسلمان حُسن ظن سے کام لیں اور دُنیا کے ہر یک حصّہ کے نبی کو جو گذر چکے ہیں عزت اور تعظیم سے دیکھیں اور بار بار قرآن شریف میں یہی ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مقصود مسلمانوں کو یہ سبق دینا ہے کہ وہ دُنیا کے کسی حصّہ کے ایسے نبی کی کسرِ شان نہ کریں جو ایک کثیر قوم نے اس کو قبول کر لیا تھا۔ یہ اصول نہایت ہی پیارا اور دلکش اصول ہے اور مسلمان اس کے ساتھ جس قدر فخر کریں وہ بجا ہے کیونکہ دوسری قومیں بوجہ اس کے کہ اس اصول کی پابند نہیں دُنیا کے اُور انبیاء کی نسبت جو گذر چکے ہیں جن کی قبولیت کروڑ ہا لوگوں میں پھیل چکی ہے ادنیٰ ادنیٰ اختلاف کی وجہ سے زبان درازی کے لئے طیار ہو جاتی ہیں خاص کر ہمارے مقدس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تو گندی گالیاں دیتے ہیں وہ صرف زبان سے تو صلح صلح کرتے ہیں مگر اسی زبان کو تلوار کی طرح کھینچ کر ہمارے اُس پیارے نبی پر چلاتے ہیں جس کے قدموں کے نیچے ہماری جانیں ہیں۔ ہم لوگ عجیب مظلوم ہیں کہ ہم تو قرآن شریف کی تعلیم کے موافق دُنیا کے ہر ایک نبی کو جو مقبول الانام گذرے ہیں عزت اور تعظیم کی راہ سے دیکھتے ہیں اور ان پر ایمان لاتے ہیں مگر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت جو کچھ ہمارے مخالف کہتے ہیں اور لکھتے ہیں اس کو تمام زمانہ جانتا ہے۔ ہم اِس بات کا اِعلان کرنا اور اپنے اس اقرار کو تمام دُنیا میں شائع کرنا اپنی ایک سعادت سمجھتے ہیں کہ حضرت موسٰی علیہ السلام اور حضرت عیسٰی علیہ السلام اور دوسرے نبی سب کے سب پاک اور بزرگ اور خدا کے برگزیدہ تھے۔ ایسا ہی خدا نے جن بزرگوں کے ذریعہ سے پاک ہدایتیں آریہ ورت میں نازل کیں اور نیز بعد میں آنے والے جو آریوں کے مقدس بزرگ تھے جیسا کہ راجہ رام چندر اور کرشن یہ سب کے سب مقدس لوگ تھے اور اُن میں سے تھے جن پر خدا کا فضل ہوتا ہے مگر ہم اس شکایت کے لئے کس کے آگے روویں اور کس سے ہم اِس بات کا انصاف طلب کریں کہ دوسری قومیں ہم سے یہ معاملہ نہیں کرتیں۔

دیکھو یہ کیسی پیاری تعلیم ہے جو دُنیا میں صلح کی بنیاد ڈالتی ہے اور تمام قوموں کو ایک قوم کی طرح بنانا چاہتی ہے یعنی یہ کہ دوسری قوموں کے بزرگوں کو عزت سے یاد کرو اور اِس بات کو کون نہیں جانتا کہ سخت دشمنی کی

جڑھ ان نبیوں اور رسولوں کی تحقیر ہے جن کو بہ ایک قوم کے کروڑہا انسانوں نے قبول کر لیا ہے۔ جو شخص کسی نبی کی تحقیر کرتا ہے یا تحقیر کرنے والے کا دوست اور حامی ہے اور پھر وہ اس قوم سے صلح چاہتا ہے جو اُس نبی پر دل و جان سے قربان ہے۔ وہ ایسا مُورکھ اور نادان ہے کہ جہالت اور نادانی میں دُنیا میں کوئی اس کی نظیر نہیں۔ ایک شخص جو کسی کے باپ کو گندی گالیاں دیتا ہے اور پھر چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا اس سے خوش ہو یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

(تتمہ چشمۂ معرفت صفحہ ۱۲،۱۱)

زردشت نبی تھا یا نہیں؟ اس کے جواب میں فرمایا:

ہم تو یہی کہیں گے اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ خدا تعالیٰ کے کُل رسولوں پر ہمارا ایمان ہے مگر اللہ کریم نے ان سب کے نام اور حالات سے ہمیں آگاہی نہیں دی جیسے فرمایا وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؏ اتنے کروڑ مخلوقات پیدا ہوتی رہی اور کروڑہا لوگ مختلف ممالک میں آباد رہے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ خدا تعالیٰ نے ان کو یونہی چھوڑ دیا ہو اور کسی نبی کے ذریعہ سے ان پر اتمامِ حجت نہ کی ہو آخر ان میں رسول آتے ہی رہے ہیں ممکن ہے کہ یہ بھی انہیں میں سے ایک رسول ہوں مگر ان کی تعلیم کا صحیح صحیح پتہ اب نہیں لگ سکتا کیونکہ زمانہ دراز گذر جانے سے تحریف لفظی اور معنوی کے سبب بعض باتیں کچھ کا کچھ بن گئی ہیں حقیقی طور پر محفوظ رہنے کا وعدہ تو صرف قرآن مجید کے لئے ہی ہے۔ مومن کو سُوءِ ظن کی نسبت نیک ظن کی طرف زیادہ جانا چاہیئے۔ قرآن مجید میں وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ [1] لکھا ہے اِس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ایک رسول ہوں۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۲۹ مورخہ ۲۱ ر اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

ہر ایک قوم میں نبی آئے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان کے نام ہمیں معلوم نہ ہوں۔ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ لمبے زمانے گذر جانے کی وجہ سے لوگ ان کی تعلیمات کو بھول کر کچھ اَور کا اَور ہی ان کی طرف منسوب کرنے لگ جاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۷ مورخہ ۶ ر مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

سُورۃ نور میں بھی ذکر فرمایا گیا ہے کہ سلسلہ محمدیہ موسویہ سلسلہ کا مثیل ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیانی انبیاء کا ذکر قرآن شریف نے نہیں کیا لَمْ نَقْصُصْ کہہ دیا۔ یہاں بھی سلسلہ محمدیہ میں درمیانی خلفاء کا نام نہیں لیا۔ جیسے وہاں ابتداء اور انتہا بتائی یہاں بھی یہ بتا دیا کہ ابتداء مثیلِ موسیٰ سے ہو گی اور انتہاء مثیلِ عیسیٰ پر۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ ر اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۶)

○

---

[1] سورۃ فاطر: ۲۵

سورۃ حٰمٓ السجدۃ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ وَھِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَھَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْھًا ؕ قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ ○ فَقَضٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا ؕ وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ ۖ وَحِفْظًا ؕ ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ○

فَھٰذِہِ الْاٰیَاتُ کُلُّھَا تَدُلُّ عَلٰی اَنَّ اللّٰہَ الْحَکِیْمَ الْعَلِیْمَ الرَّحِیْمَ الْکَرِیْمَ الْمُتَفَضِّلَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَاقْتَضَتْ حِکْمَتُہٗ اَنْ یَّجْمَعَھُمَا مِنْ حَیْثُ الْفِعْلِ وَالْاِنْفِعَالِ

ترجمہ از مرتب :- یہ سب آیات اِس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خدا تعالیٰ جو حکیم، علیم، رحیم، کریم اور فضل کرنے والا ہے اس نے آسمانوں اور زمین کو نر و مادہ کی مانند پیدا کیا ہے اور اس کی حکمت نے تقاضا کیا کہ ان دونوں کو موثر اور متاثر حیثیت سے جمع کرے اور ان میں سے بعض کو بعض میں اثر کرنے والا بنائے

وَيَجْعَلَ بَعْضَهُمَا مُؤَثِّرًا فِي بَعْضٍ وَهٰذَا مَعْنٰى قَوْلِهٖ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا۔

(حمامۃ البشریٰ ص۳۷)

(اِن آیات میں) اِس بات کی تصریح ہے کہ خدا نے جمعرات اور جمعہ کے دن سات آسمان بنائے اور ہرایک آسمان کے ساکن کو جو اس آسمان میں رہتا تھا اس آسمان کے متعلق جو امر تھا وہ اس کو سمجھا دیا اور ورلے آسمان کو ستاروں کی قندیلوں سے سجایا اور نیز اُن ستاروں کو اِس لئے پَیدا کیا کہ بہت سے امور حفاظتِ دُنیا کے ان پر موقوف تھے۔ یہ اندازے اُس خدا کے باندھے ہوئے ہیں جو زبردست اور دانا ہے ...... اِن آیات سے معلوم ہُوا کہ آسمانوں کو سات بنانا اور ان کے درمیانی امور کا اِنتظام کرنا یہ تمام امور باقیماندہ دو روز میں وقوع میں آئے یعنی جمعرات اور جمعہ میں۔ اور پہلی آیات جن کو ابھی ہم لکھ چکے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ آدم کا پَیدا کرنا آسمانوں کے سات طبقے بنانے کے بعد اور ہرایک زمینی آسمانی اِنتظام کے بعد غرض کُل مجموعۂ عالَم کی تیاری کے بعد ظہور میں آیا۔ اور چونکہ یہ تمام کاروبار صرف جمعرات کو ختم نہیں ہُوا بلکہ کچھ حصہ جمعہ کا بھی اُس نے لیا جیسا کہ آیت فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ سے ظاہر ہے یعنی خدا نے اِس آیت میں فِيْ يَوْمٍ نہیں فرمایا بلکہ يَوْمَيْنِ فرمایا۔ اِس سے یقینی طور پر سمجھا گیا ہے کہ جمعہ کا پہلا حصہ آسمانوں کے بنانے اور ان کے اندرونی اِنتظام میں صَرف ہُوا۔ لہٰذا بنصِ صریح اِس بات کا فیصلہ ہوگیا کہ آدم جمعہ کے آخری حصے میں پَیدا کیا گیا اور اگر یہ شُبہ دامنگیر ہو کہ ممکن ہے کہ آدم ساتویں دن پَیدا کیا گیا ہو تو اس شُبہ کو یہ آیت دُور فرماتی ہے جو سورہ حدید کی چوتھی آیت ہے وہ یہ ہے هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ[1] ...... ترجمہ اِس آیت کا یہ ہے کہ خدا وہ ہے جس نے تمام زمین اور آسمانوں کو چھ دن میں پَیدا کیا پھر عرش پر اُس نے استوار کیا یعنی کُل مخلوق کو چھ دن میں پَیدا کرکے پھر صفات عدل اور رحم کو ظہور میں لانے لگا پھر خدا کا الوہیت کے تخت پر بیٹھنا اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مخلوق بنانے کے بعد ہرایک مخلوق سے بمقتضائے عدل اور رحم اور سیاست کارروائی شروع کی۔ یہ محاورہ اس سے لیا گیا ہے کہ جب کُل اہلِ مقدمہ اور ارکانِ دولت اور لشکر باشوکت حاضر ہو جاتے ہیں اور کچہری گرم ہوجاتی ہے اور ہرایک حقدار اپنے حق کو عدلِ شاہی سے مانگتا ہے اور عظمت اور جبروت کے تمام سامان مہیا ہو جاتے ہیں تب بادشاہ

اور اللہ تعالیٰ کے قول فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا کے یہی معنی ہیں۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۴۷)

---

[1] سورۃ الحدید: ۵ (بسم اللہ شامل کرکے آیت کا نمبر ۵ ہے)

سب کے بعد آتا ہے اور تختِ عدالت کو اپنے وجود باجود سے زینت بخشتا ہے۔ غرض اِن آیات سے ثابت ہُوا کہ آدم جمعہ کے اخیر حصّے میں پَیدا کیا گیا کیونکہ روزِ ششم کے بعد سلسلہ پَیدائش کا بند کیا گیا۔ وجہ یہ کہ روزِ ہفتم تختِ شاہی پر بیٹھنے کا دِن ہے نہ پَیدائش کا۔ یہودیوں نے ساتویں دِن کو آرام کا دِن رکھا ہے مگر یہ اُنکی غلط فہمی ہے۔ بلکہ یہ ایک محاورہ ہے کہ جب اِنسان ایک عظیم کام سے فراغت پالیتا ہے تو پھر گویا اُس وقت اس کے آرام کا وقت ہوتا ہے۔ سو ایسی عبارتیں توریت میں بطور مجاز ہیں نہ یہ کہ درحقیقت خداتعالیٰ تھک گیا اور بوجہ خستہ درماندہ ہونے کے اس کو آرام کرنا پڑا۔

اور اِن آیات کے متعلق ایک یہ بھی امر ہے کہ فرشتوں کا جنابِ الٰہی میں عرض کرنا کہ کیا تُو ایک مُفسد کو خلیفہ بنانے لگا ہے اِس کے کیا معنے ہیں پس واضح ہو کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جب خداتعالیٰ نے چھٹے دِن آسمانوں کے سات طبقے بنائے اور ہر ایک آسمان کے قضاو قدر کا اِنتظام فرمایا اور چھٹا دن جو ستارہ سعد اکبر کا دِن ہے یعنی مُشتری کا دِن قریب الاختتام ہوگیا اور فرشتے جن کو حسب منطوق آیت وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا سعد و نحس کا علم دیا گیا تھا اور ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ سعد اکبر مُشتری ہے اور انہوں نے دیکھا کہ بظاہر اس دن کا حصّہ آدم کو نہیں ملا کیونکہ دن میں سے بہت ہی تھوڑا وقت باقی ہے سو یہ خیال گذرا کہ اب پَیدائش آدم کی زحل کے وقت میں ہوگی۔ اس کی سرشت میں زُحلی تاثیریں جو قہر اور عذاب وغیرہ ہے رکھی جائیں گی اِس لئے اس کا وجود بڑے فتنوں کا موجب ہوگا۔ سو نیا اِعتراض ایک ظنّی امر تھا نہ یقینی۔ اِس لئے ظنّی پیرایہ میں انہوں نے انکار کیا اور عرض کیا کہ کیا تُو ایسے شخص کو پَیدا کرتا ہے جو مفسد اور خوں ریز ہوگا اور خیال کیا کہ ہم زاہد اور عابد اور تقدیس کرنے والے اور ہر ایک بدی سے پاک ہیں اور نیز ہماری پَیدائش مُشتری کے وقت میں ہے جو سعد اکبر ہے تب ان کو جواب ملا کہ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ[1] یعنی تمہیں خبر نہیں کہ مَیں آدم کو کس وقت بناؤں گا۔ مَیں مُشتری کے وقت کے اُس حصّے میں اس کو بناؤں گا جو اُس دن کے تمام حصّوں میں سے زیادہ مبارک ہے اور اگرچہ جمعہ کا دن سعد اکبر ہے لیکن اس کے عصر کے وقت کی گھڑی ہر ایک اس کی گھڑی سے سعادت اور برکت میں سبقت لے گئی ہے سو آدم جمعہ کی اخیر گھڑی میں بنایا گیا یعنی عصر کے وقت پَیدا کیا گیا۔ اِسی وجہ سے احادیث میں ترغیب دی گئی ہے کہ جمعہ کی عصر اور مغرب کے درمیان بہت دُعا کرو کہ اس میں ایک گھڑی ہے جس میں دُعا قبول ہوتی ہے یہ وہی گھڑی ہے جس کی فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی۔ اس گھڑی میں جو پَیدا ہو وہ آسمان پر آدم کہلاتا ہے اور ایک بڑے سلسلہ کی اس سے بنیاد پڑتی ہے سو آدم اسی گھڑی میں پَیدا کیا گیا اِس لئے آدم ثانی یعنی اِس عاجز کو یہی گھڑی

---

[1] سورۃ البقرہ: ۳۱

عطا کی گئی۔ اِسی کی طرف براہین احمدیہ کے اِس الہام میں اشارہ ہے کہ یَنْقَطِعُ اٰبَآؤُكَ وَیُبْدَءُ مِنْكَ دیکھو براہین احمدیہ صفحہ ۴۹۰۔ اور یہ اتفاقاتِ عجیبہ میں سے ہے کہ یہ عاجز نہ صرف ہزار ششم کے آخری حصہ میں پیدا ہوا جو مشتری سے وہی تعلق رکھتا ہے جو آدم کا روزِ ششم یعنی اس کا آخری حصہ تعلق رکھتا تھا بلکہ یہ عاجز بروز جمعہ چاند کی چودھویں تاریخ میں پیدا ہوا ہے۔ اِس جگہ ایک اَور بات بیان کرنے کے لائق ہے کہ اگر یہ سوال ہو کہ جمعہ کی آخری گھڑی جو عصر کے وقت کی ہے جس میں آدم پیدا کیا گیا کیوں ایسی مبارک ہے اور کیوں آدم کی پیدائش کے لئے وہ خاص کی گئی؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے تاثیرِ کواکب کا نظام ایسا رکھا ہے کہ ایک ستارہ اپنے عمل کے آخری حصہ میں دوسرے ستارے کا کچھ اثر لے لیتا ہے جو اس حصے سے ملحق ہو اور اس کے بعد میں آنیوالا ہو۔ اب چونکہ عصر کے وقت سے جب آدم پیدا کیا گیا رات قریب تھی لہٰذا وہ وقت زحل کی تاثیر سے بھی کچھ حصہ رکھتا تھا اور مشتری سے بھی فیضیاب تھا جو جمالی رنگ کی تاثیرات اپنے اندر رکھتا ہے سو خدا نے آدم کو جمعہ کے دن عصر کے وقت بنایا کیونکہ اس کو منظور تھا کہ آدم کو جلال اور جمال کا جامع بنا دے جیساکہ اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے کہ خَلَقْتُ بِیَدَیَّ یعنی آدم کو میں نے اپنے دونوں ہاتھ سے پیدا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کے ہاتھ اِنسان کی طرح نہیں ہیں پس دونوں ہاتھ سے مراد جمالی اور جلالی تجلّی ہے۔ پس اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آدم کو جلالی اور جمالی تجلّی کا جامع پیدا کیا گیا۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ عِلمی سِلسلہ کو ضائع کرنا نہیں چاہتا اِس لئے اُس نے آدم کی پیدائش کے وقت ان ستاروں کی تاثیرات سے بھی کام لیا ہے جن کو اس نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ اور یہ ستارے فقط زینت کے لئے نہیں ہیں جیساکہ عوام خیال کرتے ہیں بلکہ اِن میں تاثیرات ہیں جیساکہ آیت وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَحِفْظًا سے یعنی حِفْظًا کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے یعنی نظامِ دُنیا کی محافظت میں ان ستاروں کو دخل ہے اُسی قسم کا دخل جیساکہ اِنسانی صحت میں دوا اور غذا کو ہوتا ہے جس کو الوہیت کے اقتدار میں کچھ دخل نہیں بلکہ جبروتِ ایزدی کے آگے یہ تمام چیزیں بطور مُردہ ہیں۔ یہ چیزیں بجز اِذنِ الٰہی کچھ نہیں کرسکتیں۔ ان کی تاثیرات خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ پس واقعی اور صحیح امر یہی ہے کہ ستاروں میں تاثیرات ہیں جن کا زمین پر اثر ہوتا ہے لہٰذا اس انسان سے زیادہ تر کوئی دُنیا میں جاہل نہیں کہ جو بنفشہ اور نیلوفر اور تربد اور سقمونیا اور خیارشنبر کی تاثیرات کا تو قائل ہے مگر ان ستاروں کی تاثیرات کا منکر ہے جو قدرت کے ہاتھ کے اوّل درجہ پر تجلّی گاہ اور مظہر العجائب ہیں جن کی نسبت خود خدا تعالیٰ نے حِفْظًا کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ لوگ جو سراپا جہالت میں غرق ہیں اِس علمی سلسلہ کو شرک میں داخل کرتے ہیں۔ نہیں جانتے جو دُنیا میں خدا تعالیٰ کا قانونِ قدرت یہی ہے جو کوئی چیز اس نے لغو اور بے فائدہ اور بے تاثیر پیدا نہیں کی جبکہ وہ فرماتا ہے کہ ہر ایک چیز انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے تو اب بتلاؤ کہ سماء الدُّنیا کو لاکھوں ستاروں سے پُر کر دینا انسان کو اس سے کیا فائدہ ہے؟ اور خدا کا یہ کہنا کہ یہ سب چیزیں انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں ضرور ہمیں

اِس طرف توجہ دلاتا ہے کہ ان چیزوں کے اندر خاص وہ تاثیرات ہیں جو انسانی زندگی اور انسانی تمدّن پر اپنا اثر ڈالتی ہیں جیسا کہ متقدمین حکماء نے لکھا ہے کہ زمین ابتداء میں بہت ناہموار تھی خدا نے ستاروں کی تاثیرات کے ساتھ اس کو درست کیا ہے اور یہ ستارے جیسا کہ یہ جاہل لوگ سمجھتے ہیں آسمانِ دُنیا پر ہی نہیں ہیں بلکہ بعض بعض سے بڑے بڑے بُعد پر واقع ہیں اسی آسمان میں مُشتری نظر آتا ہے جو چھٹے آسمان پر ہے ایسا ہی زُحل بھی دکھائی دیتا ہے جو ہفتم آسمان پر ہے اور اسی وجہ سے اِس کا نام زحل ہے جو اس کا بُعد تمام ستاروں سے زیادہ ہے کیونکہ لُغت میں زُحل بہت دُور ہونے والے کو بھی کہتے ہیں اور آسمان سے مراد وہ طبقاتِ لطیفہ ہیں جو بعض بعض سے اپنے خواص کے ساتھ متمیّز ہیں۔ یہ کہنا بھی جہالت ہے کہ آسمان کچھ چیز نہیں کیونکہ جہاں تک عالَمِ بالا کی طرف سَیر کی جائے محض خلا کا حِصّہ کسی جگہ نظر نہیں آئے گا۔ پس کامل استقراء جو مجہولات کی اصلیّت دریافت کرنے کے لئے اوّل درجہ پر ہے صریح اور صاف طور پر یہ سمجھاتا ہے کہ محض خلا کسی جگہ نہیں ہے اور جیسا کہ پہلا آدم جمالی اور جلالی رنگ میں مشتری اور زحل کی دونوں تاثیریں لے کر پَیدا ہُوا اِسی طرح وہ آدم جو ہزار ششم کے آخر میں پَیدا ہُوا وہ بھی یہ دونوں تاثیریں اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کے پہلے قدم پر مُردوں کا زندہ ہونا ہے اور دوسرے قدم پر زندوں کا مرنا ہے یعنی قیامت میں خدا نے اس کے وقت میں رحمت کی نشانیاں بھی رکھی ہیں اور قہر کی بھی تا دونوں رنگ جمالی اور جلالی ثابت ہو جائیں آخری زمانہ کی نسبت خدا تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ آفتاب اور ماہتاب ایک ہی وقت میں تاریک ہو جائیں گے۔ زمین پر جا بجا خسف واقع ہوگا۔ پہاڑ اُڑائے جائیں گے۔ یہ سب قہری اور جلالی نشانیاں ہیں۔ عیسائیت کے غلبہ کے زمانہ کی نسبت بھی اِسی قسم کے اشارات قرآن شریف میں پائے جاتے ہیں کیونکہ لکھا ہے کہ قریب ہے کہ اس دین کے غلبہ کے وقت آسمان پھٹ جائیں اور زمین میں بذریعہ خسف وغیرہ ہلاکتیں واقع ہوں۔ غرض وجود آدمِ ثانی بھی جامع جلال وجمال ہے اور اسی وجہ سے آخر ہزار ششم میں پَیدا کیا گیا اور ہزار ششم کے حساب سے دُنیا کے دنوں کا یہ جمعہ ہے اور جمعہ میں سے یہ عصر کا وقت ہے جس میں یہ آدم پَیدا ہُوا اور سُورۃ فاتحہ میں اس مقام کے متعلق ایک لطیف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ چونکہ سورۃ فاتحہ ایک ایسی سُورت ہے جس میں مبداء اور معاد کا ذکر ہے یعنی خدا کی ربوبیّت سے لیکر یَومِ الدِّین تک سِلسلہ صفاتِ الٰہیّہ کو پہنچایا ہے۔ اسی مناسبت کے لحاظ سے حکیم اَزلی نے اِس سُورت کو سات آیتوں پر تقسیم کیا ہے تا دُنیا کی عمر میں سات ہزار کی طرف اشارہ ہو اور چھٹی آیت اِس سُورت کی اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ہے گویا یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ چھٹے ہزار کی تاریکی آسمانی ہدایت کو چاہے گی اور انسانی سلیم فطرتیں خدا کی جناب سے ایک ہادی کو طلب کریں گی یعنی مسیح موعود کو اور ضَآلِّیۡن پر اِس سُورت کو ختم کیا ہے یعنی ساتویں آیت پر جو ضَآلِّیۡن کے لفظ پر ختم ہوتی ہے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ضَآلِّیۡن پر قیامت آئے گی۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۸ تا ۱۱۲ حاشیہ)

ترجمہ: وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرْدٰكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ۝

اِنسان کو چاہیئے کہ خدا تعالیٰ پر بدظنی کرنے سے بچے کیونکہ اس کا انجام آخر میں تباہی ہُوا کرتا ہے جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرْدٰكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ اِس لئے سمجھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ پر بدظنی کرنا اصل میں بے ایمانی کا بیج بونا ہے جس کا نتیجہ آخر کار ہلاکت ہُوا کرتا ہے۔ جب کبھی خدا تعالیٰ کسی کو اپنا رسول بنا کر بھیجتا ہے تو جو اس کی مخالفت کرتا ہے وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۵ مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

ترجمہ: وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۝

اور کافروں نے کہا کہ اس قرآن کو مت سُنو اور جب تم کو سُنایا جائے تو تم بک بک کرنے سے اس میں ایک شور ڈال دیا کرو شاید اسی طرح تم کو غلبہ ہو۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۳ حاشیہ)

کافروں نے یہ کہا کہ اس قرآن کو مت سُنو اور جب تمہارے سامنے پڑھا جاوے تو تم شور ڈال دیا کرو تا شاید اِسی طرح غالب آجاؤ۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۹۳)

ترجمہ: فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝

سو ہم ان کو ایک سخت عذاب چکھائیں گے اور جیسے ان کے بُرے اور بدتر عمل ہیں ویسا ہی ان کو بدلہ ملے گا۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۴ حاشیہ)

ترجمہ: إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ

اَلْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ

کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ○

حدیثوں اور قرآن کریم سے ثابت ہے کہ جو شخص کامل انقطاع اور کامل توکل کا مرتبہ پیدا کر لیتا ہے تو فرشتے اس کے خادم کئے جاتے ہیں اور ہر یک فرشتہ اپنے منصب کے موافق اس کی خدمت کرتا ہے وَقَالَ اللّٰہُ تعالیٰ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۹۸)

جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ جل شانہٗ ہے پھر اپنی ثابت قدمی دکھلاتے ہیں کہ کسی مصیبت اور آفت اور زلزلہ اور امتحان سے اُن کے صدق میں ذرہ فرق نہیں آتا اُن پر فرشتے اُترتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم ذرا خوف نہ کرو اور نہ غمگین ہو اور اُس بہشت کے تصور سے شاداں اور فرحاں رہو جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا ہے ہم تمہارے متولی اور تمہارے پاس ہر وقت حاضر اور قریب ہیں کیا دُنیا میں اور کیا آخرت میں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۹۸)

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر استقامت اختیار کی اُن کی یہ نشانی ہے کہ اُن پر فرشتے اُترتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم مت ڈرو اور کچھ غم نہ کرو اور خوشخبری سُنو اُس بہشت کی جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا تھا ہم تمہارے دوست اور متولی اِس دُنیا کی زندگی میں ہیں اور نیز آخرت میں۔ اور تمہارے لئے اِس بہشت میں وہ سب کچھ دیا گیا جو تم مانگو۔ یہ مہمانی ہے غفور رحیم سے۔

اب دیکھئے اِس آیت میں مکالمہ الٰہیہ اور قبولیت اور خدا تعالیٰ کا متولی اور متکفل ہونا اور اسی دُنیا میں بہشتی زندگی کی بنا ڈالنا اور ان کا حامی اور ناصر ہونا بطور نشان کے بیان فرمایا گیا۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۶۳، ۶۴)

وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور باطل خداؤں سے الگ ہو گئے پھر استقامت اختیار کی یعنی طرح طرح کی آزمائشوں اور بَلا کے وقت ثابت قدم رہے۔ اُن پر فرشتے اُترتے ہیں کہ تم مت ڈرو اور مت غمگین ہو اور خوش ہو اور خوشی میں بھر جاؤ کہ تم اس خوشی کے وارث ہو گئے جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا ہے۔ ہم اس دُنیوی زندگی میں اور آخرت میں تمہارے دوست ہیں۔ اِس جگہ ان کلمات سے یہ اشارہ فرمایا کہ اس استقامت سے خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ یہ سچ بات ہے کہ استقامت فوق الکرامت ہے۔ کمال استقامت یہ ہے کہ چاروں طرف بَلاؤں کو محیط دیکھیں اور خدا کی راہ میں جان اور عزت اور آبرو کو معرضِ خطر میں پاویں اور

کوئی تسلی دینے والی بات موجود نہ ہو یہاں تک کہ خدا تعالیٰ بھی امتحان کے طور پر تسلی دینے والے کشف یا خواب یا الہام کو بند کر دے اور ہولناک خوفوں میں چھوڑ دے۔ اس وقت نامردی نہ دکھلاویں اور بُزدلوں کی طرح پیچھے نہ ہٹیں اور وفاداری کی صفت میں کوئی خلل پیدا نہ کریں۔ صدق اور ثبات میں کوئی رخنہ نہ ڈالیں۔ ذلّت پر خوش ہو جائیں۔ موت پر راضی ہو جائیں اور ثابت قدمی کے لئے کسی دوست کا اِنتظار نہ کریں کہ وہ سہارا دے۔ نہ اس وقت خدا کی بشارتوں کے طالب ہوں کہ وقت نازک ہے اور باوجود سراسر بے کس اور کمزور ہونے کے اور کسی تسلّی کے نہ پانے کے سیدھے کھڑے ہو جائیں اور ہرچہ بادا باد کہہ کر گردن کو آگے کر دیں اور قضاء و قدر کے آگے دَم نہ ماریں اور ہرگز بے قراری اور جزع فزع نہ دکھلاویں جب تک کہ آزمائش کا حق پورا ہو جائے۔ یہی استقامت ہے جس سے خدا ملتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی رسولوں اور نبیوں اور صدّیقوں اور شہیدوں کی خاک سے اَب تک خوشبو آ رہی ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۰۶،۱۰۵)

جو لوگ خدا پر ایمان لا کر پوری پوری استقامت اختیار کرتے ہیں اُن پر خدائے تعالیٰ کے فرشتے اُترتے ہیں اور یہ الہام ان کو کرتے ہیں کہ تم کچھ خوف اور غم نہ کرو تمہارے لئے وہ بہشت ہے جس کے بارے میں تمہیں وعدہ دیا گیا ہے۔ سو اِس آیت میں بھی صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ خدائے تعالیٰ کے نیک بندے غم اور خوف کے وقت خدا سے الہام پاتے ہیں اور فرشتے اُتر کر اُن کی تسلّی کرتے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن اِس جگہ یاد رہے کہ الہام کے لفظ سے اِس جگہ یہ مراد نہیں ہے کہ سوچ اور فکر کی کوئی بات دل میں پڑ جائے جیسا کہ جب شاعر شعر کے بنانے میں کوشش کرتا ہے یا ایک مصرع بنا کر دوسرا سوچتا رہتا ہے تو دوسرا مصرع دِل میں پڑتا ہے۔ سو یہ دل میں پڑ جانا اِلہام نہیں ہے بلکہ یہ خدا کے قانونِ قدرت کے موافق اپنے فکر اور سوچ کا ایک نتیجہ ہے۔ جو شخص اچھی باتیں سوچتا ہے یا بُری باتوں کے لئے فکر کرتا ہے اس کی تلاش کے موافق کوئی بات ضرور اُس کے دِل میں پڑ جاتی ہے۔ ایک شخص مثلاً نیک اور راستباز آدمی ہے جو سچائی کی حمایت میں چند شعر بناتا ہے اور دوسرا شخص جو ایک گندہ اور پلید آدمی ہے اپنے شعروں میں جھوٹ کی حمایت کرتا ہے اور راست بازوں کو گالیاں نکالتا ہے تو بلاشبہ یہ دونوں کچھ نہ کچھ شعر بنالیں گے بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ وہ راست بازوں کا دشمن جو جھوٹ کی حمایت کرتا ہے بباعث دائمی مشق کے اس کا شعر عمدہ ہو۔ سو اگر صرف دِل میں پڑ جانے کا نام الہام ہے تو پھر ایک بدمعاش شاعر جو راست بازی اور راست بازوں کا دشمن اور ہمیشہ حق کی مخالفت کے لئے قلم اُٹھاتا اور افتراؤں سے کام لیتا ہے خدا کا مُلہم کہلائے گا۔ دُنیا میں ناولوں وغیرہ میں جادو بیانیاں پائی جاتی ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ اِس طرح سراسر باطل مگر مسلسل مضمون لوگوں کے دلوں میں پڑتے ہیں کیا ہم ان کو الہام کہہ سکتے ہیں بلکہ اگر الہام صرف دِل میں بعض باتیں پڑ جانے کا نام ہے تو ایک چور بھی مُلہم کہلا سکتا ہے کیونکہ وہ بسا اوقات فکر کر کے

اچھے اچھے طریق نقب زنی کے نکال لیتا ہے اور عمدہ عمدہ تدبیریں ڈاکہ مارنے اور خونِ ناحق کرنے کی اس کے دل میں گذر جاتی ہیں تو کیا لائق ہے کہ ہم ان تمام ناپاک طریقوں کا نام الہام رکھ دیں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ اُن لوگوں کا خیال ہے جن کو اب تک اس سچے خدا کی خبر نہیں جو آپ خاص مکالمہ سے دلوں کو تسلی دیتا اور ناواقفوں کو رُوحانی علوم سے معرفت بخشتا ہے۔

الہام کیا چیز ہے؟ وہ پاک اور قادر خدا کا ایک برگزیدہ بندہ کے ساتھ یا اس کے ساتھ جس کو برگزیدہ کرنا چاہتا ہے ایک زندہ اور باقدرت کلام کے ساتھ مکالمہ اور مخاطبہ ہے۔ سو جب یہ مکالمہ اور مخاطبہ کافی اور تسلی بخش سلسلہ کے ساتھ شروع ہو جائے اور اس میں خیالاتِ فاسدہ کی تاریکی نہ ہو اور نہ غیر مکتفی اور چند بے سروپا لفظ ہوں اور کلام لذیذ اور پُرحکمت اور پُرشوکت ہو تو وہ خدا کا کلام ہے جس سے وہ اپنے بندے کو تسلی دینا چاہتا ہے اور اپنے تئیں اس پر ظاہر کرتا ہے۔ ہاں کبھی ایک کلام محض امتحان کے طور پر ہوتا ہے اور پورا اور بابرکت سامان ساتھ نہیں رکھتا۔ اس میں خدائے تعالیٰ کے بندہ کو اس کی ابتدائی حالت میں آزمایا جاتا ہے تا وہ ایک ذرہ الہام کا مزہ چکھ کر پھر واقعی طور پر اپنا حال وقال سچے ملہموں کی طرح بناوے یا ٹھوکر کھا دے۔ پس اگر وہ حقیقی راست بازی صدیقوں کی طرح اختیار نہیں کرتا تو اس نعمت کے کمال سے محروم رہ جاتا ہے اور صرف بیہودہ لاف زنی اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کروڑہا نیک بندوں کو الہام ہوتا رہا ہے مگر ان کا مرتبہ خدا کے نزدیک ایک درجہ کا نہیں بلکہ خدا کے پاک نبی جو پہلے درجہ پر کمال صفائی سے خدا کا الہام پانے والے ہیں وہ بھی مرتبہ میں برابر نہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۵)

جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور پھر استقامت اختیار کرتے ہیں فرشتے ان کو بشارت کے الہامات سُناتے رہتے ہیں اور ان کو تسلی دیتے رہتے ہیں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو بذریعہ الہام تسلی دی گئی لیکن قرآن ظاہر کر رہا ہے کہ اس قسم کے الہامات یا خوابیں عام مومنوں کے لئے ایک رُوحانی نعمت ہے خواہ وہ مرد ہوں یا عورت ہوں اور ان الہامات کے پانے سے وہ لوگ امامِ وقت سے مستغنی نہیں ہو سکتے اور اکثر یہ الہامات ان کے ذاتیات کے متعلق ہوتے ہیں اور علوم کا افاضہ ان کے ذریعہ نہیں ہوتا اور نہ کسی عظیم الشان تحدی کے لائق ہوتے ہیں اور بہت سے بھروسے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ بعض وقت ٹھوکر کھانے کا موجب ہو جاتے ہیں اور جب تک امام کی دستگیری افاضہ علوم نہ کرے تب تک ہرگز ہرگز خطرات سے امن نہیں ہوتا۔ اِس امر کی شہادت صدرِ اسلام میں ہی موجود ہے کیونکہ ایک شخص جو قرآن شریف کا کاتب تھا اُس کو بسا اوقات نورِ نبوت کے قُرب کی وجہ سے قرآنی آیات کا اُس وقت میں الہام ہو جاتا تھا جبکہ امام یعنی نبی علیہ السلام وہ آیت لکھوانا چاہتے تھے۔ ایک دن اُس نے خیال کیا کہ مجھ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کیا فرق ہے مجھے بھی الہام ہوتا ہے اِسی خیال سے وہ ہلاک کیا گیا اور لکھا ہے کہ قبر نے بھی

اُس کو باہر پھینک دیا جیسا کہ بلعم ہلاک کیا گیا۔ (ضرورت الامام صفحہ ۳)

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا خدا وہ خدا ہے جو جامع صفاتِ کاملہ ہے جس کی ذات اور صفات میں اَور کوئی شریک نہیں اور یہ کہہ کر پھر وہ استقامت اختیار کرتے ہیں اور کتنے ہی زلزلے آویں اور بلائیں نازل ہوں اور موت کا سامنا ہو ان کے ایمان اور صدق میں فرق نہیں آتا اُن پر فرشتے اُترتے ہیں اور خدا اُن سے ہمکلام ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ تم بلاؤں سے اور خوفناک دشمنوں سے مت ڈرو اور نہ گذشتہ مصیبتوں سے غمگین ہو میں تمہارے ساتھ ہوں اور میں اِسی دُنیا میں تمہیں بہشت دیتا ہوں جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا تھا پس تم اس سے خوش ہو۔ اب واضح ہو کہ یہ باتیں بغیر شہادت کے نہیں اور یہ ایسے وعدے نہیں کہ جو پورے نہیں ہوئے بلکہ ہزاروں اہل دِل مذہب اسلام میں اس روحانی جنت کا مزہ چکھ چکے ہیں۔ درحقیقت اِسلام وہ مذہب ہے جس کے سچے پَیروؤں کو خدا تعالیٰ نے تمام گذشتہ راستبازوں کا وارث ٹھہرایا ہے اور ان کی متفرق نعمتیں اس اُمتِ مرحومہ کو عطا کر دی ہیں۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۱۵)

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے نیچے آ گئے اور اس کے اِسمِ اعظم استقامت کے نیچے جب بیضہ بشریت رکھا گیا پھر اس میں اس قسم کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ ملائکہ کا نزول اس پر ہوتا ہے اور کسی قسم کا خوف و حُزن ان کو نہیں رہتا۔ میں نے کہا ہے کہ استقامت بڑی چیز ہے۔ استقامت سے کیا مراد ہے؟ ہر ایک چیز جب اپنے عین محل اور مقام پر ہو وہ حکمت اور استقامت سے تعبیر پاتی ہے مثلاً دُوربین کے اجزاء کو اگر جُدا جُدا کر کے اُن کو اصل مقامات سے ہٹا کر دوسرے مقام پر رکھ دیں وہ کام نہ دے گی۔ غرض وَضْعُ الشَّيْءِ فِي مَحَلِّهٖ کا نام استقامت ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہو کہ ہیئتِ طبعی کا نام استقامت ہے پس جب تک اِنسانی بناوٹ کو ٹھیک اس حالت پر نہ رہنے دیں اور اسے مستقیم حالت میں نہ رکھیں وہ اپنے اندر کمالات پیدا نہیں کر سکتی۔ دُعا کا طریق یہی ہے کہ دونوں اسم اعظم جمع ہوں اور یہ خدا کی طرف جاوے کسی غیر کی طرف رجوع نہ کرے جو وہ اس کی ہوا و ہوس ہی کا بُت کیوں نہ ہو؟ جب یہ حالت ہو جائے تو اس وقت اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ[1] کا مزا آ جاتا ہے۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ نمبر ۱ صفحہ ۱۳، ۱۴)

مرض کسل اور حُزن ..... اگر اسبابِ رُوحانی سے ہو تو اس سے بہتر کوئی علاج نہیں جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ .... غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ۔ سو خدا تعالیٰ کو اپنا متولی اور متکفل سمجھنا اور پھر لازمی اِمتحانوں اور آزمائشوں سے متزلزل نہ ہونا اور مستقیم الاحوال رہنا بھی خوف اور حُزن کا علاج ہے۔

(مکتوبات جلد ۵ نمبر ۲ صفحہ ۱۸ مکتوب ۱۸)

---

[1] سورۃ المومن: ۶۱

جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا رَبّ اللہ ہے اور استقامت دکھلاتے ہیں الخ یعنی ابتلاء کے وقت ایسا شخص دکھلا دیتا ہے کہ جو میں نے مُنہ سے وعدہ کیا تھا وہ عملی طور سے پُورا کرتا ہوں کیونکہ ابتلاء ضروری ہے جیسے یہ آیت اشارہ کرتی ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ هُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ[1] اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رَبّ اللہ ہے اور استقامت کی اُن پر فرشتے اُترتے ہیں۔ مفسروں کی غلطی ہے کہ فرشتوں کا اُترنا نزع میں ہے یہ غلط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دلوں کو صاف کرتے ہیں اور نجاست اور گندگی سے جو اللہ سے دُور رکھتی ہے اپنے نفس کو دُور رکھتے ہیں۔ اُن میں سلسلہ الہام کے لئے ایک مناسبت پَیدا ہو جاتی ہے سلسلہ الہام شروع ہو جاتا ہے ..... پھر فرمایا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ یعنی تم اس جنت کے لئے خوش ہو جس کا تم کو وعدہ ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۶)

جنہوں نے کہا کہ رَبّ ہمارا اللہ ہے اور استقامت دکھلائی اور ہر طرف سے مُنہ پھیر کر اللہ کو ڈھونڈھا مطلب یہ کہ کامیابی استقامت پر موقوف ہے اور وہ اللہ کو پہچاننا اور کسی ابتلاء اور زلازل اور امتحان سے نہ ڈرنا ہے ضرور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مورد مخاطبہ ومکالمہ الٰہی انبیاء کی طرح ہوگا۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۲)

سچے مذہب کی یہی نشانی ہے کہ اس مذہب کی تعلیم سے ایسے راستباز پَیدا ہوتے ہیں جو محدّث کے درجہ تک پہنچ جائیں جن سے خدا تعالیٰ آمنے سامنے کلام کرے اور اسلام کی حقیقت اور حقانیت کی اول نشانی یہی ہے کہ اس میں ہمیشہ ایسے راستباز جن سے خدا تعالیٰ ہمکلام ہو پَیدا ہوتے ہیں۔ تَتَنَزَّلُ عَلَیۡهِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا سو یہی معیار حقیقی سچے اور زندہ اور مقبول مذہب کی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ نور صرف اسلام میں ہے دوسرے مذاہب اس روشنی سے بے نصیب ہیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ رمئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

جو اللہ تعالیٰ کی طرف آجاتے ہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہی راستہ پر نہیں آتے بلکہ اس صراطِ مستقیم پر استقامت بھی دکھلاتے ہیں نتیجہ کیا ہوتا ہے کہ تطہیر و تنویرِ قلوب کی منزلیں طے کر لیتے ہیں اور بعد انشراحِ صدر کے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کو حاصل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو اپنی خاص نعمتوں سے متمتع فرماتا ہے۔ محبت و ذوقِ الٰہی ان کی غذا ہو جاتی ہے۔ مکالمہ الٰہی، وحی، الہام وکشف وغیرہ انعاماتِ الٰہی سے مشرّف و بہرہ مند کئے جاتے ہیں۔ درگاہِ رَبُّ العزّت سے طمانیت وسکینت اُن پر اُترتی ہے۔ حُزن ومایوسی اُن کے نزدیک تک نہیں پھٹکتی۔ ہر وقت جذبۂ محبت و ولولۂ عشقِ الٰہی میں سرشار رہتے ہیں گویا لَاخَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ[2] کے پُورے مصداق ہو جاتے ہیں۔ مَادَرَّ مَنۡ قَالَ ؎

---

[1] سورۃ العنکبوت: ۳ [2] سورۃ الاحقاف: ۱۴

کلید ایں ہمہ دولت محبت است ووفا ﴿ خوشا کسیکہ چنیں دولتش عطا باشد

غرض استقامت بڑی چیز ہے۔ استقامت ہی کی بدولت تمام گروہ انبیاء ہمیشہ مظفر و منصور و بامراد ہوتا چلا آیا ہے۔

(البدر جلد ۲ ۴۵ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۵۳)

اِلہام یعنی وحیُ الٰہی ایسی شئے ہے کہ جب تک خدا تعالیٰ سے پُوری صلح نہ ہو اور اس کی اطاعت کے لئے اس نے گردن نہ رکھ دی ہو تب تک وہ کسی کو حاصل نہیں ہوسکتی۔ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ یہ اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔ نزول وحی کا صرف ان کے ساتھ وابستہ ہے جو کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں مستقیم ہیں اور وہ صرف مسلمان ہی ہیں۔ (البدر جلد ۴ ۸ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

جن لوگوں نے اپنے قول اور فعل سے بتا دیا کہ ہمارا رَبّ اللہ ہے اور پھر انہوں نے استقامت دکھائی ان پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اب یہ تو نہیں ہوسکتا کہ فرشتوں کا نزول ہو اور مخاطبہ نہ ہو نہیں وہ انہیں بشارتیں دیتے ہیں۔ یہی تو اسلام کی خوبی اور کمال ہے جو دوسرے مذاہب کو حاصل نہیں ہے۔ استقامت بہت مشکل چیز ہے یعنی خواہ ان پر زلزلے آئیں۔ فتنے آئیں۔ وہ ہر قسم کی مصیبت اور دُکھ میں ڈالے جاویں مگر ان کی استقامت میں فرق نہیں آتا۔ اُن کا اخلاص اور وفاداری پہلے سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اِس قابل ہوتے ہیں کہ اُن پر خدا تعالیٰ کے فرشتے اُتریں اور انہیں بشارت دیں کہ تم کوئی غم نہ کرو۔ (الحکم جلد ۱۰ ۳ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رَبّ ہے اور پھر انہوں نے سچی استقامت دکھائی یعنی ہر قسم کے مصائب اور مشکلات عُسر یُسر میں انہوں نے قدم آگے ہی بڑھایا اور ہر قسم کے امتحانوں میں وہ پاس ہوگئے تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے جو اُن کو خوش خبریاں دیتے ہیں کہ ہم تمہارے ولی ہیں اِس حیاتِ دُنیا میں تمہیں کوئی غم اور حُزن نہ ہوگا۔ (الحکم جلد ۱۰ ۴۲ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس پر انہوں نے استقامت دکھائی اور کوئی مُشکل اور مصیبت انہیں اس اقرار سے پھرا نہیں سکی ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ یہ بڑا بھاری طریق ہے خدا کو پہچاننے کا۔ اس سے وہ یقین پیدا ہوتا ہے جو انسان کو نجات کا وارث بنا دیتا ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے وجود پر کامل یقین پیدا ہو جاوے تو انسان کی زندگی میں ایک مُعجزنما تبدیلی ہوتی ہے وہ گناہ آلود زندگی سے نکل آتا ہے اور پاکیزگی اور طہارت کا جامہ پہن لیتا ہے اور یہی نجات ہے جو اس کو گناہ سے بچا لیتی ہے۔ اس کے ثمرات اور برکات خدا تعالیٰ پر کامل یقین اَور توکل پیدا ہونے لگتے ہیں اور معجزات اور نشانات مشاہدہ کرائے جاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۱ ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

اِس سے بھی مُراد متقی ہیں ثُمَّ اسْتَقَامُوْا یعنی ان پر زلزلے آئے۔ ابتلاء آئے۔ آندھیاں چلیں مگر ایک عہد جو اس سے کر چکے اس سے نہ پھرے۔ پھر آگے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب انہوں نے ایسا کیا اور صدق اور وفا دکھلائی تو اس کا اجر یہ ملا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ یعنی ان پر فرشتے اُترے اور کہا کہ خوف اور حزن مت کرو تمہارا خدا متولّی ہے وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ اور بشارت دی کہ تم خوش ہو اس جنّت سے۔ اور اس جنّت سے یہاں مُراد دُنیا کی جنّت ہے جیسے قرآن مجید میں ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ[1] پھر آگے ہے نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِی الْاٰخِرَةِ دُنیا اور آخرت میں ہم تمہارے ولی اور متکفّل ہیں۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۷ مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۱)

سچے مذہب کی یہی نشانی ہے کہ اس مذہب کی تعلیم سے ایسے راستباز پَیدا ہوتے ہیں جو محدّث کے مرتبہ تک پہنچ جائیں جن سے خدا تعالیٰ آمنے سامنے کلام کرے اور اسلام کی حقیقت اور حقانیت کی اوّل نشانی یہی ہے کہ اس میں ہمیشہ ایسے راستباز جن سے خدا تعالیٰ ہمکلام ہو پَیدا ہوتے ہیں تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا سو یہی معیارِ حقیقی سچے اور زندہ اور مقبول مذہب کی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ نور صرف اسلام میں ہے عیسائی مذہب اس سے بے نصیب ہے۔ (حجۃ الاسلام صفحہ ۲)

۳۲-۳۳ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ؕ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝

اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا کہ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کہ ہم اِس دُنیا میں بھی اور آئندہ بھی متقی کے ولی ہیں۔ سو یہ آیت بھی تکذیب میں ان نادانوں کے ہے جنہوں نے اس زندگی میں نزولِ ملائکہ سے انکار کیا۔ اگر نزع میں نزولِ ملائکہ تھا تو حیات الدُّنیا میں خدا تعالیٰ کیسے ولی ہُوا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۷، ۳۸)

وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے پھر انہوں نے اِستقامت اختیار کی یعنی اپنی بات سے نہ پھرے

---

[1] سورۃ الرحمٰن: ۴۷

اور طرح طرح کے زلازل اُن پر آئے مگر انہوں نے ثابت قدمی کو ہاتھ سے نہ دیا۔ ان پر فرشتے اُترتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم کچھ خوف نہ کرو اور نہ کچھ حُزن اور اس بہشت سے خوش ہو جس کا تم وعدہ دئے گئے تھے یعنی اب وہ بہشت تمہیں مِل گیا اور بہشتی زندگی اب شروع ہوگئی۔ کس طرح شروع ہوگئی نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ الخ اِس طرح کہ ہم تمہارے متولّی اور متکفّل ہوگئے اِس دُنیا میں اور آخرت میں اور تمہارے لئے اِس بہشتی زندگی میں جو کچھ تم مانگو وہی موجود ہے۔ یہ غفور رحیم کی طرف سے مہمانی ہے۔ مہمانی کے لفظ سے اس پھل کی طرف اشارہ کیا ہے جو آیۃ تُؤْتِیٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍ[1] فرمایا گیا تھا۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۴۴)

جو لوگ (جلّ شانہٗ) کے دوست ہیں ..... اُن کی یہ نشانی ہے کہ انہیں (بذریعہ مکالمہ الٰہیّہ و رؤیائے صالحہ) بشارتیں ملتی رہتی ہیں اِس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی خدائے تعالیٰ کا اُن کی نسبت یہ عہد ہے جو ٹل نہیں سکتا اور یہی پیارا درجہ ہے جو انہیں ملا ہوا ہے یعنی مکالمہ الٰہیّہ اور رؤیائے صالحہ سے خدائے تعالیٰ کے مخصوص بندوں کو جو اس کے ولی ہیں ضرور حصہ ملتا ہے اور اُن کی ولایت کا بھاری نشان یہی ہے کہ مکالمات و مخاطباتِ الٰہیّہ سے مشرف ہوں (یہی قانونِ قدرت اللہ جلّ شانہٗ کا ہے) کہ جو لوگ اربابِ متفرقہ سے مُنہ پھیر کر اللہ جلّ شانہٗ کو اپنا سب کچھ سمجھ لیں اور کہیں کہ ہمارا تو ایک اللہ ہی رَبّ ہے (یعنی اَور کسی کی ربوبیّت پر ہماری نظر نہیں) اور پھر آزمائشوں کے وقت میں مستقیم رہیں (کیسے ہی زلزلے آویں۔ آندھیاں چلیں۔ تاریکیاں پھیلیں۔ اُن میں ذرّہ تزلزل اور تغیّر اور اضطراب پیدا نہ ہو۔ پوری پوری استقامت پر رہیں) تو اُن پر فرشتے اُترتے ہیں (یعنی الہام یا رؤیائے صالحہ کے ذریعہ سے انہیں بشارتیں ملتی ہیں) کہ دُنیا اور آخرت میں ہم تمہارے دوست اور متولّی اور متکفّل ہیں اور آخرت میں جو کچھ تمہارے جی چاہیں گے وہ سب تمہیں ملے گا یعنی اگر دُنیا میں کچھ مکروہات بھی پیش آویں تو کوئی اندیشہ کی بات نہیں کیونکہ آخرت میں تمام غم دُور ہو جائیں گے اور سب مرادیں حاصل ہوں گی۔ اگر کوئی کہے کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ آخرت میں جو کچھ انسان کا نفس چاہے اُس کو ملے مَیں کہتا ہوں کہ یہ ہونا نہایت ضروری ہے اور اسی بات کا نام نجات ہے ورنہ اگر انسان نجات پا کر بعض چیزوں کو چاہتا رہا اور اُن کے غم میں کباب ہوتا اور جلتا رہا مگر وہ چیزیں اُس کو نہ ملیں تو پھر نجات کاہے کی ہوئی۔ ایک قسم کا عذاب تو ساتھ ہی رہا۔ لہٰذا ضرور ہے کہ جنّت یا بہشت یا مُکتی خانہ یا سُرگ جو نام اُس مقام کا رکھا جائے جو انتہا سعادت پانے کا گھر ہے وہ ایسا گھر چاہیئے کہ انسان کو مِن کُلّ الوجوہ اُس میں مصفّا خوشی حاصل ہو اور کوئی ظاہری یا باطنی رنج کی بات درمیان نہ ہو اور کسی ناکامی کی سوزش دِل پر غالب نہ ہو۔ ہاں یہ بات سچ ہے کہ بہشت میں نالائق و نامناسب باتیں نہیں ہوں گی مگر مقدّس دِلوں میں ان کی خواہش بھی پیدا نہ ہوگی بلکہ اُن مقدّس

---

[1] سورۃ ابراہیم: ۲۶

اور مطہر دلوں میں جو شیطانی خیالات سے پاک کئے گئے ہیں انسان کی پاک فطرت اور خالق کی پاک مرضی کے موافق پاک خواہشیں پیدا ہوں گی تا انسان اپنی ظاہری اور باطنی اور بدنی اور رُوحانی سعادت کو پورے پورے طور پر پالیوے اور اپنے جمیع قویٰ کے کامل ظہور سے کامل انسان کہلاوے کیونکہ بہشت میں داخل کرنا انسانی نقش کے مٹا دینے کی غرض سے نہیں جیسا کہ ہمارے مخالف عیسائی و آریہ یہ خیال کرتے ہیں بلکہ اِس غرض سے ہے کہ تا انسانی فطرت کے نقوش ظاہراً و باطناً بطور کامل چمکیں اور سب بے اعتدالیاں دُور ہو کر ٹھیک ٹھیک وہ امور جلوہ نما ہو جائیں جو انسان کیلئے بلحاظ ظاہری و باطنی خِلقت اس کی کے ضروری ہیں۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور اُن کے جوابات صفحہ ۴۶، ۴۷ حاشیہ)

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝

جو شخص شرارت سے کچھ یاوہ گوئی کرے تو تم نیک طریق سے صلح کاری کا اس کو جواب دو تب اس خصلت سے دشمن بھی دوست ہو جائے گا۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۳۵)

اگر کوئی تجھ سے نیکی کرے تو تُو اس سے زیادہ نیکی کر اور اگر تُو ایسا کرے گا تو مابین تمہارے اگر کوئی عداوت بھی ہو گی تو وہ ایسی دوستی سے بدل جائے گی کہ گویا وہ شخص ایک دوست بھی ہے اور رشتہ دار بھی۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۱)

یہ تعلیم اِس لئے تھی کہ اگر دشمن بھی ہو تو وہ اس نرمی اور حُسنِ سلوک سے دوست بن جاوے اور ان باتوں کو آرام اور سکون کے ساتھ سُن لے۔ (لیکچر لدھیانہ صفحہ ۲۷)

تقویٰ کے بہت سے اجزاء ہیں عُجب۔ خود پسندی۔ مالِ حرام سے پرہیز اور بداخلاقی سے بچنا بھی تقویٰ ہے جو شخص اچھے اخلاق ظاہر کرتا ہے اس کے دشمن بھی دوست ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔

اَب خیال فرمایئے یہ ہدایت کیا تعلیم دیتی ہے۔ اِس ہدایت میں اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہے کہ اگر مخالف گالی دے تو اس کا جواب گالی سے نہ دو بلکہ صبر کرو۔ اِس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ تمہاری فضیلت کا قائل ہو کر خود ہی نادم اور شرمندہ ہو گا اور یہ سزا اس سزا سے کہیں بڑھ کر ہو گی جو اِنتقامی طور پر تم اُس کو دے سکتے ہو یُوں تو ایک ذرا سا آدمی اقدامِ قتل تک نوبت پہنچا سکتا ہے لیکن انسانیت کا تقاضا اور تقویٰ کا منشاء یہ نہیں۔ خوش اخلاقی ایک ایسا جوہر ہے کہ مُوذی سے مُوذی انسان پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ کیا اچھا

کہا ہے کہ ؏

لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ صفحہ ۸۳)

تیرا دشمن جو تجھ سے بدی کرتا ہے اس کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کر۔ اگر تُو نے ایسا کیا تو وہ تیرا ایسا دوست ہو جائیگا کہ گویا رشتہ دار بھی ہے۔ (لیکچر چشمہ معرفت صفحہ ۲۴)

بدی کے مقابلہ میں نیکی کرنا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوست بن جاتا ہے اور دوست بھی ایسا کہ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۵ مورخہ ۱۱ ؍اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ تم سورج اور چاند کو بھی مت سجدہ کرو اور اُس خدا کو سجدہ کرو جس نے ان سب چیزوں کو پیدا کیا۔ اگر حقیقی طور پر خدا کے پرستار ہو تو اسی خالق کی پرستش کرو نہ مخلوق کی۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۳۸ حاشیہ)

تم نہ سورج کی پرستش کرو اور نہ چاند کی بلکہ فقط اس ذاتِ قدیم کی پرستش کرو جس نے ان تمام علوی وسفلی چیزوں کو وجود بخشا ہے۔ (شحنہ حق صفحہ ۳۵)

نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو بلکہ اُس خدا کو سجدہ کرو جس نے یہ تمام چیزیں سورج۔ چاند۔ آسمان۔ آگ۔ پانی وغیرہ پیدا کی ہیں۔ چاند اور سورج کا ذکر کرکے پھر بعد اس کے جمع کا صیغہ بیان کرنا اس غرض سے ہے کہ کُل چیزیں جن کی غیر قومیں پرستش کرتی ہیں تم ہرگز ان کی پرستش مت کرو۔ (نسیم دعوت صفحہ ۵۲)

نہ سورج کی پرستش کرو اور نہ چاند کی اور نہ کسی اَور مخلوق کی۔ اور اس کی پرستش کرو جس نے تمہیں پیدا کیا۔ (پیغام صلح صفحہ ۲۵)

نہ تم سورج کی پرستش کرو اور نہ چاند کی بلکہ اُس ذات کی پرستش کرو کہ جو ان سب چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے اگر وید میں اِس آیت کے ہم معنی کوئی شُرتی ہوتی تو کروڑہا آدمی مخلوق پرستی سے ہلاک نہ ہوتے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۷۰)

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا اَفَمَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْۤ اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ

جب اِنسان بہت تعلق خدا تعالیٰ کے ساتھ پیدا کرتا ہے اور سب طرح سے اسی کا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِعْمَلْ مَا شِئْتَ فَاِنِّیْ غَفَرْتُ لَکَ یعنی جو تیری مرضی ہو کئے جا میں نے تجھے سب کچھ بخش دیا۔ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کی طرف جھانک کر دیکھا اور فرمایا اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ جو چاہو سو کئے جاؤ۔ پس یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تو بڑا مہربان اور رحیم ہے اور بہت رحم سے معاملہ کرتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۹ مورخہ ۷ ۔ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۲۵)

سید عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ موت انسان پر وارد ہو جاتی ہے تو سب عبادتیں ساقط ہو جاتی ہیں اور پھر خود ہی سوال کرتے ہیں کہ کیا انسان اباحتی ہو جاتا ہے اور سب کچھ اس کے لئے جائز ہو جاتا ہے۔ پھر آپ ہی جواب دیا ہے کہ یہ بات نہیں کہ وہ اباحتی ہو جاتا ہے بلکہ بات اصل یہ ہے کہ عبادت کے اثقال اُس سے دُور ہو جاتے ہیں اور پھر تکلف اور تصنع سے کوئی عبادت وہ نہیں کرتا بلکہ عبادت ایک شیریں اور لذیذ غذا کی طرح ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی نافرمانی اور مخالفت اس سے ہو سکتی ہی نہیں اور خدا تعالیٰ کا ذکر اس کے لئے لذّت بخش اور آرام دِہ ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کہا جاتا ہے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ نواہی کی اجازت ہو جاتی ہے بہیں بلکہ وہ خود ہی نہیں کر سکتا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ کوئی خصّی ہو اور اس کو کہا جاوے کہ تُو جو مرضی ہے کر تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ اس سے فسق و فجور مراد لینا کمال درجہ کی بے حیائی اور حماقت ہے۔ یہ تو اعلیٰ درجہ کا مقام ہے جہاں کشف حقائق ہوتا ہے۔ صوفی کہتے ہیں اسی کے کمال پر الہام ہوتا ہے۔ اس کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا ہو جاتی ہے۔ اس وقت اسے یہ حکم ملتا ہے۔

پس اثقال عبادت اس سے دُور ہو کر عبادت اس کے لئے غذا شیریں کا کام دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ[1] فرمایا گیا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۱ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۴)

---

[1] سورۃ البقرۃ: ۲۶

صوفی کہتے ہیں جب تک محبت ذاتی نہ ہو جاوے ایسی محبت کہ بہشت اور دوزخ پر بھی نظر نہ ہو اس وقت تک کامل نہیں ہوتا اس سے پہلے اس کا خدا بہشت اور دوزخ ہوتے ہیں لیکن جب وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کیلئے اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ کا حکم ہوتا ہے کیونکہ ان کی رضا خدا کی رضا ہوتی ہے۔ جب تک یہ حال نہ ہو اندیشہ ہوتا ہے کہ نیکی ضائع نہ ہو جائے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۴، ۱۵ مورخہ ۳۰ اپریل، ۱۰ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

آیت ۴۲، ۴۳

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۙ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۚ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ الخ اور وہ ایک ایسی کتاب ہے کہ جو ہمیشہ باطل کی آمیزش سے منزہ رہے گی اور کوئی باطل اس کا مقابلہ نہیں کر سکا اور نہ آئندہ کسی زمانہ میں مقابلہ کرے گا یعنی اس کی کامل صداقتیں کہ جو ہر ایک باطل سے منزہ ہیں تمام باطل پرستوں کو کہ جو پہلے اس سے پیدا ہوئے یا آئندہ کبھی پیدا ہوں ملزم اور لاجواب کرتی رہینگی اور کوئی مخالفانہ خیال اس کے سامنے تابِ مقاومت نہیں لائے گا۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۳ حاشیہ)

ایک ذرہ باطل کا اس میں دخل نہیں نہ آگے سے اور نہ پیچھے سے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۵۶)

آیت ۴۷

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

جو شخص اچھا کام کرے سو اس کے لئے اور جو بُرا کرے وہ اس کے لئے۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۱۴۹)

آیت ۵۴

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۗ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝

عنقریب ہم ان کو معمورۂ عالم کے کناروں تک نشان دکھلائیں گے اور خود انہیں میں ہمارے نشان ظاہر ہوں گے یہاں تک کہ حق ان پر کھل جائے گا۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۱ حاشیہ)

ہم عنقریب اُن کو اپنے نشان دکھلائیں گے ان کے ملک کے اِردگرد میں اور خود اُن میں بھی یہاں تک کہ اُن پر کھل جائے گا کہ یہ نبی سچا ہے۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۱۸)

سُورۃ الشُّوریٰ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرۡنَ مِنۡ فَوۡقِهِنَّ وَالۡمَلٰٓـئِكَةُ يُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ وَيَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ اَلَاۤ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ

يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ یعنی خدا کے فرشتے کل اہلِ زمین کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ اب اگر استغفار کے لئے گناہ کا ہونا ضروری ہے تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ حضرت مسیح بھی بے گناہ نہ تھے کیونکہ وہ بھی اہلِ زمین میں شامل ہیں جن کے لئے فرشتے استغفار کرتے ہیں۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۲۴۶)

وَكَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰى وَمَنۡ حَوۡلَهَا وَتُنۡذِرَ يَوۡمَ الۡجَمۡعِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ‌ؕ فَرِيۡقٌ فِى الۡجَـنَّةِ وَفَرِيۡقٌ فِى السَّعِيۡرِ

جن لوگوں میں تقویٰ اور ادب ہے اور جنہوں نے لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ پر قدم مارا ہے وہ سمجھ

سکتے ہیں کہ وجودی نے جو قدم مارا ہے وہ حد ادب سے بڑھ کر ہے۔ بیسیوں کتابیں ان لوگوں نے لکھی ہیں مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا کوئی وجودی اس بات کا جواب دے سکتا ہے کہ واقعی وجودی میں خدا ہے یا تصور ہے؟ اگر خدا ہی ہے تو کیا یہ ضعف اور کمزوریاں جو آئے دن عائد حال رہتی ہیں یہ خدا تعالیٰ کی صفات ہیں۔ ذرا بچہ یا بیوی بیمار ہو جاوے تو کچھ نہیں بنتا اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جاوے؟ مگر خدا تعالیٰ چاہے تو شفا دے سکتا ہے حالانکہ وجودی کے اختیار میں یہ امر نہیں ہے۔ بعض وقت مالی ضعف اور افلاس ستاتا ہے بعض وقت گناہ اور فسق و فجور بے ذوقی او ربے شوقی کا موجب ہو جاتا ہے تو کیا خدا تعالیٰ کے شامل حال بھی یہ امور ہوتے ہیں؟ اگر خدا ہے تو پھر اس کے سارے کام کُنْ فَيَكُوْنُ[1] سے ہونے چاہئیں حالانکہ یہ قدم قدم پر عاجز اور محتاج ٹھوکریں کھاتا ہے۔ افسوس وجودی کی حالت پر خدا بھی بنا پھر اس سے کچھ نہ ہوا۔ پھر عجب تر یہ ہے کہ یہ خدائی اس کو دوزخ سے نہیں بچا سکتی کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ[2] پس جب کوئی گناہ کیا تو اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے جہنم میں جانا پڑا اور ساری خدائی باطل ہو گئی۔ وجودی بھی اس بات کے قائل ہیں کہ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ۔ جبکہ وہاں بھی انسانیت کے تجسّم بنے رہے تو پھر ایسی فضول بات کی حاجت ہی کیا ہے جس کا کوئی نتیجہ اور اثر ظاہر نہ ہوا؟

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۵ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

اگر کوئی کہے کہ دُنیا ہمیشہ رہے گی اور یہاں ہی دوزخ بہشت ہوگا ہم نہیں مان سکتے۔ اس کی صفت مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے خلاف ہے اور اس کے خلاف جا ٹھہرتا ہے فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

"قیامت کی خبر سُننا" کی تعبیر بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

اس سے مراد ہے کہ دینداروں کی فتح ہوگی اور دشمنوں کو ذلت۔ کیونکہ قیامت کو بھی یہی ہونا ہے۔ قرآن شریف میں ہے کہ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ یہ اسی دن ہوگا۔ دُنیا کی رنگا رنگ کی وبائیں بھی قیامت ہی ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳ مورخہ ۶ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۸)

مامور کا زمانہ بھی ایک قیامت ہے۔ جیسے لوگ یوم جزا کے دن دو فریقوں میں تقسیم ہو جائیں گے یعنی فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ایسے ہی مامور کی بعثت کے وقت بھی دو فرق ہو جاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى ہم نے قرآن کو عربی زبان میں بھیجا تا تُو اس شہر کو ڈراوے جو تمام آبادیوں

---

[1] سورۃ البقرہ: ۱۱۸ [2] سورۃ الزلزال: ۹

کی ماں ہے اور ان آبادیوں کو جو اس کے گرد ہیں یعنی تمام دُنیا کو۔

اِنَّ فِيْهَا مَدْحَ الْقُرْاٰنِ وَعَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ فَتَدَبَّرْهَا كَالْعَاقِلِيْنَ وَلَا تَمُرَّ بِهَا مُرُوْرَ الْغَافِلِيْنَ وَاعْلَمْ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ تُعَظِّمُ الْقُرْاٰنَ وَالْعَرَبِيَّةَ وَمَكَّةَ وَفِيْهَا نُوْرٌ مَزَّقَ الْاَعْدَاءَ وَبَكَّتَ۔ فَاقْرَءْهَا بِتَمَامِهَا وَانْظُرْ اِلٰى نِظَامِهَا وَفَتِّشْ كَالْمُسْتَبْصِرِيْنَ۔ وَاِنِّيْ تَدَبَّرْتُهَا فَوَجَدْتُ فِيْهَا اَسْرَارًا۔ ثُمَّ اَمْعَنْتُ فَرَاَيْتُ اَنْوَارًا۔ ثُمَّ عَمَّقْتُ فَشَاهَدْتُ مُنَزِّلًا قَهَّارًا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ۔ وَكُشِفَ عَلَيَّ اَنَّ الْاٰيَةَ الْمَوْصُوْفَةَ وَالْاِشَارَاتِ الْمَلْفُوْفَةَ تَهْدِيْ اِلٰى فَضَائِلِ الْعَرَبِيَّةِ وَتُشِيْرُ اِلٰى اَنَّهَا اُمُّ الْاَلْسِنَةِ وَاَنَّ الْقُرْاٰنَ اُمُّ الْكُتُبِ السَّابِقَةِ وَاِنَّ مَكَّةَ اُمُّ الْاَرَضِيْنَ۔ فَاقْتَادَنِيْ بُرُوْقُ هٰذِهِ الْاٰيَةِ اِلٰى اَنْوَاعِ التَّنَطُّسِ وَالدِّرَايَةِ۔ وَفَهِمْتُ سِرَّ نُزُوْلِ الْقُرْاٰنِ فِيْ هٰذِهِ اللِّسَانِ۔ وَسِرَّ خَتْمِ النُّبُوَّةِ عَلٰى خَيْرِ الْبَرِيَّةِ وَخَتْمِ الْمُرْسَلِيْنَ۔ ثُمَّ ظَهَرَتْ عَلَيَّ اٰيَاتٌ اُخْرٰى وَاَيَّدَ بَعْضُهَا بَعْضًا تَتْرٰى حَتّٰى جَرَّنِيْ رَبِّيْ اِلٰى حَقِّ الْيَقِيْنِ۔ وَاَدْخَلَنِيْ فِي الْمُسْتَيْقِنِيْنَ۔ وَظَهَرَ عَلَيَّ اَنَّ الْقُرْاٰنَ هُوَ اُمُّ الْكُتُبِ الْاُوْلٰى۔ وَالْعَرَبِيَّةَ اُمُّ الْاَلْسِنَةِ مِنَ اللّٰهِ الْاَعْلٰى۔ وَاَمَّا الْبَاقِيَةُ مِنَ اللُّغَاتِ فَهِيَ لَهَا كَالْبَنِيْنَ اَوِ الْبَنَاتِ۔ (منن الرحمٰن صفحہ ۳۹،۴۰)

ترجمہ از اصل :۔ اِس میں قرآن کی مدح اور عربی کی مدح ہے پس عقلمندوں کی طرح تدبّر کر اور غافلوں کی طرح ان پر سے مت گذر اور جان کہ یہ آیت قرآن اور عربی اور مکّہ کی عظمت ظاہر کرتی ہے اور اس میں ایک نور ہے جس نے دشمنوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور لاجواب کر دیا پس تمام آیت کو پڑھ اور اس کے نظام کی طرف دیکھ اور دانشمندوں کی طرح تحقیق کر اور میں نے اِن آیتوں میں تدبّر کیا پس کئی بھید ان میں پائے پھر ایک گہری غور کی تو کئی نور ان میں پائے پھر ایک بہت ہی عمیق نظر سے دیکھا تو اُتارنے والے قہّار کا مجھے مشاہدہ ہوا جو ربّ العالمین ہے اور میرے پر کھولا گیا کہ آیت موصوفہ اور اشارات ملفوفہ عربی کے فضائل کی طرف ہدایت کرتی ہیں اور اِس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ وہ اُمّ الالسنہ ہے اور قرآن پہلی کتابوں کا اُمّ یعنی اصل ہے اور مکّہ تمام زمین کا اُمّ ہے سو مجھے اِس آیت کی روشنی نے طرح طرح کے فہم اور درایت کی طرف کھینچا اور مجھے یہ بھید سمجھ آ گیا کہ قرآن کیوں عربی زبان میں نازل ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو نبوت ختم ہوئی اس میں بھید کیا ہے۔ پھر میرے پر اَور آیتیں ظاہر ہوئیں اور بعض نے بعض کی متواتر مدد کی یہاں تک کہ میرے خدا نے حق الیقین تک مجھے کھینچ لیا اور یقین کرنے والوں میں مجھے داخل کیا اور میرے پر ظاہر ہو گیا کہ قرآن ہی پہلی کتابوں کی ماں ہے اور ایسا ہی عربی تمام زبانوں کی ماں اور خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور باقی زبانیں اس کے بیٹے بیٹیوں کی طرح ہیں۔

(منن الرحمٰن صفحہ ۳۹،۴۰)

وَ اَنَّ اللّٰهَ اَوْمٰی فِیْ مَقَامَاتٍ مِنَ الْفُرْقَانِ اِلٰی اَنَّ الْعَرَبِیَّةَ هِیَ اُمُّ الْاَلْسِنَةِ وَ وَحْیُ الرَّحْمَانِ وَ لِاَجْلِ ذٰلِكَ سَمّٰی مَكَّةَ مَكَّةَ وَ اُمَّ الْقُرٰی فَاِنَّ النَّاسَ اُرْضِعُوْا مِنْهَا لِبَانَ اللِّسَانِ وَ الْهُدٰی فَهٰذِهٖ اِشَارَةٌ اِلٰی اَنَّهَا هِیَ مَنْبَعُ النُّطْقِ وَ النُّهٰی فَفَكِّرْ فِیْ قَوْلِ رَبِّ الْوَرٰی قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَ فِیْ ذٰلِكَ اٰیَةٌ لِّلَّذِیْ یَتَّقِی اللّٰهَ وَ یَخْشٰی وَ یَطْلُبُ الْحَقَّ وَ لَا یَاْبٰی وَ لَا یَتَّبِعُ سُبُلَ الْمُعْرِضِیْنَ۔ (منن الرحمٰن ص۶۳)

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ مِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ یَذْرَؤُكُمْ فِیْهِ ؕ لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ۚ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ○

لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ۔

کوئی چیز اس کی مانند نہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۲۵ حاشیہ در حاشیہ)

اس کی مانند کوئی بھی چیز نہیں۔ (شحنۂ حق صفحہ ۵۴)

خداشناسی کے بارے میں وسط کی شناخت یہ ہے کہ خدا کی صفات بیان کرنے میں نہ تو نفی صفات کے پہلو کی طرف جھک جائے اور نہ خدا کو جسمانی چیزوں کا مشابہ قرار دے۔ یہی طریق قرآن شریف نے صفاتِ باری تعالیٰ میں اختیار کیا ہے۔ چنانچہ وہ یہ بھی فرماتا ہے کہ خدا دیکھتا، سنتا، جانتا، بولتا، کلام کرتا ہے اور پھر مخلوق کی مشابہت سے بچانے کے لئے یہ بھی فرماتا ہے لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ..... یعنی خدا کی ذات اور صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۶۲، ۶۳)

ترجمہ از اصل :- خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کے کئی مقامات میں اِس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ زبانوں کی ماں اور خدا کی وحی صرف عربی ہے اور اسی واسطے اُس نے مکّہ کا نام مکّہ اور اُمّ القریٰ رکھا کیونکہ لوگوں نے اس سے ہدایت اور زبان کا دُودھ پیا۔ پس یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف عربی زبان ہی نطق اور عقل کی منبع ہے پس خدا تعالیٰ کے اِس قول میں فکر کر کہ یہ قرآن عربی ہے تا تُو مکّہ کو کہ جو تمام آبادیوں کی ماں ہے ڈرا وے اور اس میں اس شخص کے لئے نشان ہے جو خدا سے ڈرے اور حق کو ڈھونڈے اور انکار نہ کرے اور کنارہ کش لوگوں کا پَیرو نہ ہو۔ (منن الرحمٰن صفحہ ۶۳)

خدا کی ذات اور صفات کی مانند کوئی چیز نہیں۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۳۸)
کوئی چیز اپنی ذات اور صفات میں خدا کی شریک نہیں اور وہ سُننے والا اور دیکھنے والا ہے۔
(چشمہ معرفت صفحہ ۲۶۱)

ازل سے اور قدیم سے خدا میں دو صفتیں ہیں ایک صفت تشبیہی دوسری صفت تنزیہی اور چونکہ خدا کے کلام میں دونوں صفات کا بیان کرنا ضروری تھا یعنی ایک تشبیہی صفت اور دوسری تنزیہی صفت اس لئے خدا نے تشبیہی صفات کے اظہار کے لئے اپنے ہاتھ آنکھ محبت غضب وغیرہ صفات قرآن شریف میں بیان فرمائے اور پھر جبکہ احتمال تشبیہ کا پیدا ہوا تو بعض جگہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ کہہ دیا اور بعض جگہ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کہہ دیا۔
(چشمہ معرفت صفحہ ۲۶۵)

۱۴ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ.... خدا جس کو چاہتا ہے اس کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور جو اس کی طرف جھکتا ہے اس کو وہ راہ دکھاتا ہے۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۶)

۱۸ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ۝

خدا وہ ہے جس نے کتاب یعنی قرآن شریف کو حق اور میزان کے ساتھ اُتارا یعنی وہ ایسی کتاب ہے جو حق اور باطل کے پرکھنے کے لئے بطور میزان کے ہے۔
(جنگِ مقدس صفحہ ۴)

اَللّٰہُ لَطِیْفٌۢ بِعِبَادِہٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ وَھُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ○

اللہ باریک نظر سے اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۴)

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا فَاِنْ یَّشَاِ اللّٰہُ یَخْتِمْ

عَلٰی قَلْبِکَ وَیَمْحُ اللّٰہُ الْبَاطِلَ وَیُحِقُّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ اِنَّہٗ عَلِیْمٌۢ

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○

کیا یہ منکر لوگ کہتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام نہیں اور خدا پر جھوٹ باندھا ہے اگر خدا چاہے تو اس کا اُترنا بند کر دے پر وہ بند نہیں کرتا کیونکہ اس کی عادت اسی پر جاری ہے کہ وہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل اپنے کلمات سے کرتا ہے اور یہ منصب اُسی کو پہنچتا ہے کیونکہ امراض رُوحانی پر اُسی کو اطلاع ہے اور ازالۂ مرض او استردادِ صحت پر وہی قادر ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۵۳)

وَھُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ

وَیَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ○

تمہارا خدا وہ خدا ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اُن کی بدیاں اُن کو معاف کر دیتا ہے۔ کسی کو یہ دھوکا نہ لگے کہ قرآن شریف میں یہ آیت بھی ہے وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ یعنی جو شخص ایک ذرہ بھی شرارت کرے گا وہ اُس کی سزا پائے گا پس یاد رہے کہ اس میں اور دوسری آیات میں کچھ تناقض نہیں کیونکہ اس شر سے وہ شر مراد ہے جس پر انسان اصرار کرے اور اُس کے ارتکاب سے باز نہ آوے اور توبہ نہ کرے اسی غرض سے اِس جگہ شر کا لفظ استعمال کیا ہے نہ ذنب کا تا معلوم ہو کہ اس جگہ کوئی شرارت کا فعل مُراد ہے جس سے شریر آدمی باز آنا نہیں چاہتا ورنہ سارا قرآن شریف اِس بارہ میں بھرا پڑا ہے کہ ندامت اور توبہ اور ترک اصرار اور استغفار سے گناہ بخشے جاتے ہیں بلکہ خدا تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے پیار کرتا ہے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۱۶)

وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۭ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ۝

اللہ وہ ذات کامل الرحمت ہے کہ اُس کا قدیم سے یہی قانونِ قدرت ہے کہ اُس تنگ حالت میں وہ ضرور مینہ برساتا ہے کہ جب لوگ نا امید ہو چکتے ہیں پھر زمین پر اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے اور وہی کارسازِ حقیقی اور ظاہراً و باطناً قابلِ تعریف ہے یعنی جب سختی اپنی نہایت کو پہنچ جاتی ہے اور کوئی صورت مخلصی کی نظر نہیں آتی تو اِس صورت میں اُس کا یہی قانونِ قدیم ہے کہ وہ ضرور عاجز بندوں کی خبر لیتا ہے اور اُن کو ہلاکت سے بچاتا ہے اور جیسے وہ جسمانی سختی کے وقت رحم فرماتا ہے اسی طرح جب رُوحانی سختی یعنی ضلالت اور گمراہی اپنی حد کو پہنچ جاتی ہے اور لوگ راہِ راست پر قائم نہیں رہتے تو اس حالت میں بھی وہ ضرور اپنی طرف سے کسی کو مشرف بوحی کرکے اور اپنے نورِ خاص کی روشنی عطا فرما کر ضلالت کی مُہلک تاریکی کو اس کے ذریعہ سے اُٹھاتا ہے اور چونکہ جسمانی رحمتیں عام لوگوں کی نگاہ میں ایک واضح امر ہے اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے آیت ممدوحہ میں اوّل ضرورت فرقانِ مجید کی نازل ہونے کی بیان کرکے پھر بطور توضیح جسمانی قانون کا حوالہ دیا تا دانشمند آدمی جسمانی قانون کو دیکھ کر کہ ایک واضحہ اور بدیہی امر ہے خدائے تعالیٰ کے رُوحانی قانون کو بآسانی سمجھ سکے اور اِس جگہ یہ بھی واضح رہے کہ جو لوگ بعض کتابوں کا منزل من اللہ ہونا مانتے ہیں اُن کو تو خود اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ کتابیں ایسے وقتوں میں نازل ہوئی ہیں کہ جب اُن کے نزول کی ضرورت تھی۔ پس اس اقرار کے ضمن میں اُن کو یہ دوسرا اقرار کرنا بھی لازم آیا کہ ضرورت کے وقتوں میں کتابوں کا نازل کرنا خدائے تعالیٰ کی عادت ہے لیکن ایسے لوگ کہ جو ضرورتِ کتبِ الٰہیہ سے مُنکر ہیں جیسے برہمو سماج والے سو اُن کے ملزم کرنے کے لئے اگرچہ بہت کچھ ہم لکھ چکے ہیں لیکن اگر ان میں ایک ذرا انصاف ہو تو اُن کو وہی ایک دلیل کافی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے آیاتِ گذشتہ بالا میں آپ بیان فرمائی ہے کیونکہ جس حالت میں وہ لوگ مانتے ہیں کہ حیاتِ ظاہری کا تمام انتظام خدائے تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہی اپنی آسمانی روشنی اور بارانی پانی کے ذریعہ سے دُنیا کو تاریکی اور ہلاکت سے بچاتا ہے تو پھر وہ اِس اقرار سے کہاں بھاگ سکتے ہیں کہ حیاتِ باطنی کے وسائل بھی آسمان ہی سے نازل ہوتے ہیں اور خود یہ نہایت کوتہ اندیشی اور قلتِ معرفت ہے کہ ناپائیدار حیات کا اہتمام تصرف خاص الٰہی سے تسلیم کر لیا جاوے لیکن جو حقیقی حیات اور لازوال زندگی ہے یعنی معرفتِ الٰہی اور نورِ باطنی یہ صرف اپنی ہی عقلوں کا نتیجہ قرار دیا جائے کیا وہ خدا جس نے جسمانی سلسلہ کے برپا رکھنے کے لئے اپنی الوہیت کی قوی طاقتوں کو ظاہر کیا ہے اور بغیر وسیلہ

انسانی ہاتھوں کے زبردست قدرتیں دکھائی ہیں وہ رُوحانی طور پر اپنی طاقت ظاہر کرنے کے وقت ضعیف اور کمزور خیال کیا جا سکتا ہے۔ کیا ایسا کرنے سے وہ کامل رہ سکتا ہے یا اس کی رُوحانی طاقتوں کا ثبوت میسر آ سکتا ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۵۴ تا ۵۵۸)

خدا وہ خدا ہے جو بارش کو اس وقت اُتارتا ہے جبکہ لوگ مینہ سے نومید ہو جاتے ہیں تب نومیدی کے بعد اپنی رحمت پھیلاتا ہے اور جس بندہ کو اپنے بندوں میں سے چاہتا ہے رسالت اور نبوت کے لئے چن لیتا ہے

(براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۴۷)

۳۱۔ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ۝

اِنسان کسی اپنی ذاتی لیاقت اور ہُنر کی وجہ سے خدا تعالیٰ سے انصاف کا مطالبہ ہرگز نہیں کر سکتا۔ قرآن شریف کی رُو سے خدا کے کام سب مالکانہ ہیں جس طرح کبھی وہ گناہ کی سزا دیتا ہے ایسا ہی وہ کبھی گناہ کو بخش بھی دیتا ہے یعنی دونوں پہلوؤں پر اُس کی قدرت نافذ ہے جیسا کہ مقتضائے مالکیت ہونا چاہیئے اور اگر وہ ہمیشہ گناہ کی سزا دے تو پھر انسان کا کیا ٹھکانہ ہے بلکہ اکثر وہ گناہ بخش دیتا ہے اور تنبیہ کی غرض سے کسی گناہ کی سزا بھی دیتا ہے تا غافل انسان متنبہ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو جیسا کہ قرآن شریف میں یہ آیت ہے مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ.... (ترجمہ) جو کچھ تمہیں کچھ مصیبت پہنچتی ہے پس تمہاری بداعمالی کے سبب سے ہے اور خدا بہت سے گناہ بخش دیتا ہے اور کسی گناہ کی سزا دیتا ہے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۱۵، ۱۶)

دوسری قسم دُکھ کی وہ ہے جس میں یہی نہیں کہ دُکھ ہوتا ہے بلکہ اس میں صبر و ثبات کھو یا جاتا ہے اس میں نہ اِنسان مرتا ہے نہ جیتا ہے اور سخت مصیبت اور بَلا میں ہوتا ہے۔ یہ شامتِ اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جس کی طرف اِس آیت میں اشارہ ہے مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ اور اس قسم کے دُکھوں سے بچنے کا یہی طریق اور علاج ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے کیونکہ دُنیا کی زندگی چند روزہ ہے اور اس زندگی میں شیطان اس کی تاک میں لگا رہتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کو خدا سے دُور پھینک دے اور نفس اس کو دھوکا دیتا رہتا ہے کہ ابھی بہت عرصہ تک زندہ رہنا ہے لیکن یہ بڑی بھاری غلطی ہے اگر انسان اس دھوکے میں آکر خدا تعالیٰ سے دُور جا پڑے اور نیکیوں سے دستکش ہو جاوے۔ (الحکم جلد ۸ ۱۱ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

۴۱۔ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى

اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ

بدی کی جزا اسی قدر بدی ہے جو کی گئی ہو لیکن جو شخص گناہ کو بخش دے اور ایسے موقع پر بخش دے کہ اس سے کوئی اصلاح ہوتی ہو کوئی شر پیدا نہ ہوتا ہو یعنی عین عفو کے محل پر ہو نہ غیر محل پر تو اس کا وہ بدلہ پائے گا۔

اِس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم یہ نہیں کہ خواہ نخواہ اور ہر جگہ شر کا مقابلہ نہ کیا جائے اور شریروں اور ظالموں کو سزا نہ دی جائے بلکہ یہ تعلیم ہے کہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ محل اور موقع گناہ بخشنے کا ہے یا سزا دینے کا۔ پس مجرم کے حق میں اور نیز عامہ خلائق کے حق میں جو کچھ فی الواقع بہتر ہو وہی صورت اختیار کی جائے۔ بعض وقت ایک مجرم گناہ بخشنے سے توبہ کرتا ہے اور بعض وقت ایک مجرم گناہ بخشنے سے اَور بھی دلیر ہو جاتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اندھوں کی طرح گناہ بخشنے کی عادت مت ڈالو بلکہ غور سے دیکھ لیا کرو کہ حقیقی نیکی کس بات میں ہے آیا بخشنے میں یا سزا دینے میں۔ پس جو امر محل اور موقع کے مناسب ہو وہی کرو۔ افرادِ انسانی کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ جیسے بعض لوگ کینہ کشی پر بہت حریص ہوتے ہیں یہاں تک کہ دادوں پڑدادوں کے کینوں کو یاد رکھتے ہیں۔ ایسا ہی بعض لوگ عفو اور درگذر کی عادت کو انتہا تک پہنچا دیتے ہیں اور بسا اوقات اس عادت کے افراط سے دیوثی تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور ایسے قابلِ شرم حلم اور عفو اور درگذر اُن سے صادر ہوتے ہیں جو سراسر حمیّت اور غیرت اور عفّت کے برخلاف ہوتے ہیں بلکہ نیک چلنی پر داغ لگاتے ہیں اور ایسے عفو اور درگذر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ توبہ توبہ کر اُٹھتے ہیں۔ انہیں خرابیوں کے لحاظ سے قرآن کریم میں ہر ایک خُلق کے لئے محل اور موقع کی شرط لگا دی ہے اور ایسے خلق کو منظور نہیں کیا جو بے محل صادر ہو۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۳۷، ۳۸)

قرآن شریف میں ایک جگہ تو ہے کہ دانت کے بدلے دانت آنکھ کے بدلے آنکھ۔ یہ تو تفصیل ہے اور دوسری جگہ یہ اجمالی عبارت ہے کہ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ پس جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اجمالی عبارت توسیع قانون کے لئے بیان فرمائی گئی ہے کیونکہ بعض صورتیں ایسی ہیں کہ ان میں یہ قانون جاری نہیں ہو سکتا مثلاً ایک ایسا شخص کسی کا دانت توڑے کہ اس کے مُنہ میں دانت نہیں اور بباعث کبر سنی یا کسی اَور سبب سے اس کے دانت نکل گئے ہوں تو دندان شکنی کی سزا میں ہم اس کا دانت توڑ نہیں سکتے کیونکہ اُس کے تو مُنہ میں دانت ہی نہیں۔ ایسا ہی اگر ایک اندھا کسی کی آنکھ پھوڑ دے تو ہم اس کی آنکھ نہیں پھوڑ سکتے کیونکہ اس کی تو آنکھیں ہی نہیں۔ خلاصہ مطلب یہ کہ قرآن شریف نے ایسی صورتوں کو احکام میں داخل کرنے کے لئے اس قسم کے قواعد کلیہ بیان فرمائے ہیں پس اس کے احکام اور قوانین پر کیونکر اعتراض ہو سکے اور اُس نے صرف یہی نہیں کہا بلکہ ایسے قواعد کلیہ بیان فرما کر ہر ایک کو اجتہاد اور استخراج اور استنباط کی ترغیب دی ہے۔ (کتاب البریہ صفحہ ۶۳، ۶۴)

فَانْظُرْ اِلٰی هٰذِهِ الدَّقِیْقَةِ الرُّوْحَانِیَّةِ فَاِنَّهٗ اَمَرَ بِالْعَفْوِ عَنِ الْجَرِیْمَةِ بِشَرْطِ اَنْ یَّتَحَقَّقَ فِیْهِ اِصْلَاحٌ لِنَفْسٍ وَاِلَّا فَجَزَاءُ السَّیِّئَةِ بِالسَّیِّئَةِ۔ (خطبہ الہامیہ حاشیہ صفحہ ج)

بدی کی پاداش میں اصولِ انصاف تو یہی ہے کہ بدکن آدمی اسی قدر بدی کا سزاوار ہے جس قدر اس نے بدی کی ہے پر جو شخص عفو کر کے کوئی اصلاح کا کام بجالائے یعنی ایسا عفو نہ ہو جس کا نتیجہ کوئی خرابی ہو سو اس کا اجر خدا پر ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۳۶۳، ۳۶۴ حاشیہ در حاشیہ)

اصولِ انصاف یہی ہے کہ جس کو دُکھ پہنچایا گیا ہے وہ اُسی قدر دُکھ پہنچانے کا حق رکھتا ہے لیکن اگر کوئی معاف کر دے اور معاف کرنا بے محل نہ ہو بلکہ اس سے اصلاح پیدا ہوتی ہو تو ایسا شخص خدا سے اجر پائے گا۔
(تحفہ قیصریہ صفحہ ۳۰)

قانونِ انصاف کی رُو سے ہر ایک بدی کی سزا اُسی قدر بدی ہے لیکن اگر کوئی شخص اپنے گنہ گار کو معاف کر دے بشرطیکہ اُس معاف کرنے میں شخصِ مجرم کی اصلاح ہو نہ یہ کہ معاف کرنے سے اَور بھی زیادہ دلیر ہو اور بیباک ہو جائے تو ایسا شخص خدا تعالیٰ سے بڑا اجر پائے گا۔ (تریاق القلوب صفحہ ۱۹)

بدی کا بدلہ اُسی قدر بدی ہے جو کی گئی لیکن جو شخص عفو کرے اور گناہ بخش دے اور اس عفو سے کوئی اِصلاح پیدا ہوتی ہو نہ کوئی خرابی تو خدا اس سے راضی ہے اور اسے اس کا بدلہ دے گا۔ پس قرآن کے رُو سے نہ ہر ایک جگہ انتقام محمود ہے اور نہ ہر ایک جگہ عفو قابلِ تعریف ہے بلکہ محل شناسی کرنی چاہیئے اور چاہیئے کہ انتقام اور عفو کی سیرت بپابندی محل اور مصلحت ہو نہ بے قیدی کے رنگ میں۔ یہی قرآن کا مطلب ہے۔ (کشتی نوح صفحہ ۲۷)

اگر کوئی تمہیں دُکھ دے مثلاً دانت توڑ دے یا آنکھ پھوڑ دے تو اس کی سزا اسی قدر بدی ہے جو اس نے کی لیکن اگر تم ایسی صورت میں گناہ معاف کر دو کہ اس معافی کا کوئی نیک نتیجہ پیدا ہو اور اس سے کوئی اِصلاح ہو سکے یعنی مثلاً مجرم آئندہ اس عادت سے باز آ جائے تو اس صورت میں معاف کرنا ہی بہتر ہے اور اس معاف کرنے کا خدا سے اجر ملے گا۔

اب دیکھو اِس آیت میں دونوں پہلو کی رعایت رکھی گئی ہے اور عفو اور انتقام کو مصلحتِ وقت سے وابستہ کر دیا گیا ہے سو یہی حکیمانہ مسلک ہے جس پر نظامِ عالم کا چل رہا ہے۔ رعایتِ محل اور وقت سے گرم اور سرد دونوں کا استعمال کرنا یہی عقلمندی ہے۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ ہم ایک ہی قسم کی غذا پر ہمیشہ زور نہیں ڈال سکتے بلکہ حسبِ موقع

ترجمہ از مرتب:۔ اس باریک رُوحانی نکتہ پر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے مُجرم کو معاف کرنے کا اِس شرط پر حکم دیا ہے کہ اس سے مجرم کے نفس میں اصلاح پیدا ہو ورنہ بدی کا بدلہ اتنی ہی بدی ہے۔ (حاشیہ متعلقہ خطبہ الہامیہ صفحہ ج)

گرم اور سرد غذائیں بدلتے رہتے ہیں اور جاڑے اور گرمی کے وقتوں میں کپڑے بھی مناسب حال بدلتے رہتے ہیں۔ پس اسی طرح ہماری اخلاقی حالت بھی حسب موقع تبدیلی کو چاہتی ہے۔ ایک وقت رُعب دکھلانے کا مقام ہوتا ہے وہاں نرمی اور درگذر سے کام بگڑتا ہے اور دوسرے وقت میں نرمی اور تواضع کا وقت ہوتا ہے اور وہاں رُعب دکھلانا سفلہ پن سمجھا جاتا ہے۔ غرض ہر ایک وقت اور ہر ایک مقام ایک بات کو چاہتا ہے پس جو شخص رعایت مصالح اَوقات نہیں چاہتا وہ حیوان ہے نہ انسان اور وہ وحشی ہے نہ مہذب۔ (نسیم دعوت صفحہ ۷۰)

بدی کا بدلہ اسی قدر بدی ہے۔ دانت کے عوض دانت اور آنکھ کے عوض آنکھ۔ گال کے عوض گال۔ اور جو شخص معاف کر دے مگر ایسا معاف کرنا جس کا نتیجہ کوئی اصلاح ہو نہ کوئی خرابی یعنی جس کو معاف کیا گیا ہے وہ کچھ سُدھر جائے اور بدی سے باز آجائے تو اس شرط سے معاف کرنا انتقام سے بہتر ہوگا اور معاف کرنے والے کو اس کا بدلہ ملے گا یہ نہیں کہ ہر ایک محل بے محل میں ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسری بھی پھیر دی جائے یہ تو دُور از حکمت ہے اور بعض اَوقات بدوں سے نیکی کرنا ایسا مُضر ہوتا ہے کہ گویا نیکوں سے بدی کی ہے۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۱۱)

بدی کی سزا اسی قدر بدی ہے اور جو معاف کر دے مگر ایسے محل اور مقام پر کہ وہ عفو اصلاح کا موجب ہو۔ اسلام نے عفو خطا کی تعلیم دی لیکن یہ نہیں کہ اس سے شر بڑھے۔ (لیکچر لدھیانہ صفحہ ۳۵)

جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُھَا۔ الآیة ۔ اِس میں عفو کے لئے یہ شرط رکھی ہے کہ اس میں اصلاح ہو۔ یہودیوں کے مذہب نے یہ کہا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ اُن میں انتقامی قوت اِس قدر بڑھ گئی تھی اور یہاں تک یہ عادت اُن میں پختہ ہو گئی تھی کہ اگر باپ نے بدلہ نہیں لیا تو بیٹے اور اس کے پوتے تک کے فرائض میں یہ امر ہوتا تھا کہ وہ بدلہ لے۔ اِس وجہ سے اُن میں کینہ توزی کی عادت بڑھ گئی تھی اور وہ بہت سنگدل اور بے درد ہو چکے تھے۔ عیسائیوں نے اس تعلیم کے مقابل یہ تعلیم دی کہ ایک گال پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسری بھی پھیر دو۔ ایک کوس بیگار لے جاوے تو دو کوس چلے جاؤ وغیرہ۔ اِس تعلیم میں جو نقص ہے وہ ظاہر ہے کہ اس پر عمل درآمد ہی نہیں ہو سکتا اور عیسائی گورنمنٹوں نے عملی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ تعلیم ناقص ہے۔ کیا یہ کسی عیسائی کی جرأت ہو سکتی ہے کہ کوئی خبیث طمانچہ مار کر دانت نکال دے تو وہ دوسری گال پھیر دے کہ ہاں اب دوسرا دانت بھی نکال دو۔ وہ خبیث تو اَور بھی دلیر ہو جائیگا اور اس سے امن عامہ میں خلل واقع ہوگا پھر کیونکر ہم تسلیم کریں کہ یہ تعلیم عمدہ ہے یا خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہو سکتی ہے۔ اگر اس پر عمل ہو تو کسی ملک کا بھی انتظام نہ ہو سکے۔ ایک ملک ایک دشمن چھین لے تو دوسرا خود حوالے کرنا پڑے ایک افسر گرفتار ہو جاوے تو دس اَور دئے جاویں۔ یہ نقص ہیں جو ان تعلیموں میں ہیں اور یہ صحیح نہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یہ احکام بطور قانون مختص الزمان تھے۔ جب وہ زمانہ گذر گیا تو دوسرے لوگوں کے حسب حال وہ تعلیم نہ رہی یہودیوں کا وہ زمانہ تھا کہ وہ چار سَو برس تک غلامی میں رہے اور اس غلامی کی زندگی کی وجہ سے ان میں قساوتِ

قلبی بڑھ گئی تھی اور وہ کینہ کش ہوگئے اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس بادشاہ کے زمانہ میں کوئی ہوتا ہے اُس کے اخلاق بھی اس قسم کے ہو جاتے ہیں۔ سکھوں کے زمانہ میں اکثر لوگ ڈاکو ہو گئے تھے۔ انگریزوں کے زمانہ میں تہذیب اور تعلیم پھیلتی جاتی ہے اور ہر شخص اس طرف کوشش کر رہا ہے۔ غرض بنی اسرائیل نے فرعون کی ماتحتی کی تھی اسی وجہ سے ان میں ظلم بڑھ گیا تھا اِس لئے توریت کے زمانہ میں عدل کی ضرورت مقدم تھی کیونکہ وہ لوگ اس سے بے خبر تھے اور جابرانہ عادت رکھتے تھے اور انہوں نے یقین کر لیا تھا کہ دانت کے بدلے دانت کا توڑنا ضروری ہے اور یہ ہمارا فرض ہے اِس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو سکھایا کہ عدل تک ہی بات نہیں رہتی بلکہ اِحسان بھی ضروری ہے اِسی سبب سے مسیح کے ذریعہ انہیں یہ تعلیم دی گئی کہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسری پھیر دو اور جب اسی پر سارا زور دیا گیا تو آخر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس تعلیم کو اس نکتہ پر پہنچا دیا اور وہ یہی تعلیم تھی کہ بدی کا بدلہ اُسی قدر بدی ہے لیکن جو شخص معاف کر دے اور معاف کرنے سے اِصلاح ہوتی ہو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور اجر ہے۔ عفو کی تعلیم دی ہے مگر ساتھ قید لگائی کہ اِصلاح ہو بے محل عفو نقصان پہنچاتا ہے۔ پس اس مقام پر غور کرنا چاہیئے کہ جب توقع اِصلاح کی ہو تو عفو ہی کرنا چاہیئے۔ جیسے دو خدمت گار ہوں ایک بڑا شریف الاصل اور فرماں بردار اور خیر خواہ ہو لیکن اِتفاقاً اس سے کوئی غلطی ہو جائے اس موقع پر اُسے معاف کرنا ہی مناسب ہے اگر سزا دی جاوے تو ٹھیک نہیں لیکن ایک بدمعاش اور شریر ہے ہر روز نقصان کرتا ہے اور شرارتوں سے باز نہیں آتا اگر اُسے چھوڑ دیا جائے تو وہ اَور بھی [illegible] ہو جائے گا اُس کو سزا ہی دینی چاہیئے۔ غرض اس طرح پر محل اور موقع شناسی سے کام لو۔ یہ تعلیم ہے جو اسلام نے دی ہے اور جو کامل تعلیم ہے اور اس کے بعد اَور کوئی نئی تعلیم یا شریعت نہیں آسکتی۔

(لیکچر لدھیانہ صفحہ ۳۶، ۳۷)

بدی کی سزا اسی قدر بدی ہے جس قدر بدی کی گئی مگر جو کوئی عفو کرے اور اس عفو میں کوئی اِصلاح مقصود ہو تو اس کا اجر خدا کے پاس ہے۔ یہ تو قرآن شریف کی تعلیم ہے مگر انجیل میں بغیر کسی شرط کے ہر ایک جگہ عفو اور درگذر کی ترغیب دی گئی ہے اور انسانی دوسرے مصالح کو جن پر تمام سلسلہ تمدن کا چل رہا ہے پامال کر دیا ہے اور انسانی قویٰ کے درخت کی تمام شاخوں میں سے صرف ایک شاخ کے بڑھنے پر زور دیا ہے اور باقی شاخوں کی رعایت قطعاً ترک کر دی گئی ہے پھر تعجب ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام نے خود اخلاقی تعلیم پر عمل نہیں کیا۔ انجیر کے درخت کو بغیر پھل کے دیکھ کر اُس پر بددعا کی اور دوسروں کو دعا کرنا سکھلایا اور دوسروں کو یہ بھی حکم دیا کہ تم کسی کو احمق مت کہو مگر خود اس قدر بدزبانی میں بڑھ گئے کہ یہودی بزرگوں کو ولد الحرام تک کہہ دیا اور ہر ایک وعظ میں یہودی علماء کو سخت سخت گالیاں دیں اور بُرے بُرے ان کے نام رکھے۔ اخلاقی معلّم کا فرض یہ ہے کہ پہلے آپ اخلاق کریمہ دکھلاوے پس کیا ایسی تعلیم ناقص جس پر انہوں نے آپ بھی عمل نہ کیا خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو سکتی ہے۔ پاک اور کامل تعلیم قرآن شریف کی ہے جو انسانی درخت

کی ہرایک شاخ کی پرورش کرتی ہے اور قرآن شریف صرف ایک پہلو پر زور نہیں ڈالتا بلکہ کبھی تو عفو اور درگذر کی تعلیم دیتا ہے مگر شرط سے کہ عفو کرنا قرین مصلحت ہو اور کبھی مناسب محل اور وقت کے مجرم کو سزا دینے کے لئے فرماتا ہے پس درحقیقت قرآن شریف خدا تعالیٰ کے اس قانونِ قدرت کی تصویر ہے جو ہمیشہ ہماری نظر کے سامنے ہے۔

(چشمہ مسیحی صفحہ ۱۱، ۱۲)

قرآن شریف نے بے فائدہ عفو اور درگذر کو جائز نہیں رکھا کیونکہ اس سے انسانی اخلاق بگڑتے ہیں اور شیرازہ نظام درہم برہم ہو جاتا ہے بلکہ اس عفو کی اجازت دی ہے جس سے کوئی اصلاح ہو سکے۔

(چشمہ مسیحی صفحہ ۱۱ حاشیہ)

اصل بات تو یہ ہے کہ بدی کا عوض تو اسی قدر بدی ہے جو پہنچ گئی ہے لیکن جو شخص عفو کرے اور عفو کا نتیجہ کوئی اصلاح ہو نہ کہ کوئی فساد یعنی عفو اپنے محل پر ہو نہ غیر محل پر پس اجر اس کا اللہ پر ہے یعنی یہ نہایت احسن طریق ہے اب دیکھئے اس سے بہتر اور کونسی تعلیم ہوگی کہ عفو کو عفو کی جگہ اور انتقام کو انتقام کی جگہ رکھا۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۴۱)

بدی کا بدلہ بدی ہے جو کی جائے جیسا کہ توریت کی تعلیم ہے مگر جو شخص عفو کرے جیسا کہ انجیل کی تعلیم ہے تو اس صورت میں وہ عفو مستحسن اور جائز ہوگی جب کہ کوئی نیک اس کا مرتب ہو اور جس کو معاف کیا گیا کوئی اصلاح اس کی اس عفو سے متصور ہو ورنہ قانون یہی ہے جو توریت میں مذکور ہے۔ (پیغامِ صلح صفحہ ۴۶)

بدی کی سزا اسی قدر بدی ہے لیکن جو شخص عفو کرے اور ایسی عفو ہو کہ اس سے کوئی اصلاح مقصود ہو تو وہ خدا سے اپنا اجر پائے گا یعنی بے محل اور بے موقع عفو نہ ہو جس سے کوئی نتیجہ نکلے اور کوئی فساد پیدا ہو بلکہ ایسے موقع پر عفو ہو جس سے کسی کی صلاحیت کی امید ہو اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بنی آدم کی طبیعتیں یکساں واقع نہیں ہوئیں اور گناہ کرنے والوں کی عادتیں اور استعدادیں ایک طور کی نہیں ہوا کرتیں بلکہ بعض تو سزا کے لائق ہوتے ہیں اور بغیر سزا کے اُن کی اصلاح ممکن نہیں اور بعض عفو درگذر سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور سزا دینے سے چڑ کر اور بھی بدی میں مستحکم ہو جاتے ہیں۔ (تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد پنجم صفحہ ۲، ۷۴)

فریقِ ظالم کو اس بدی کی مانند سزا ہوگی جو اُس نے اپنے فعل سے فریقِ مظلوم کو پہنچائی۔

(تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ہفتم صفحہ ۶۷، ۶۸)

جس قسم کی فریقِ مظلوم کو بدی پہنچائی گئی ہے اسی قسم کی فریقِ ظالم کو جزا پہنچے گی۔

(تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ہشتم صفحہ ۲)

جس فریقِ ظالم کی طرف سے فریقِ مظلوم کو کوئی بدی پہنچی ہے اُسی قسم کی بدی فریقِ ظالم کو

پہنچے گی۔ (تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ہشتم صفحہ ۱۱)

بدی کی سزا ذلت ہے مگر اس ذلت کی مانند اور مشابہ جو فریق ظالم نے فریق مظلوم کو پہنچائی ہے۔

(تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ہشتم صفحہ ۲۵)

جس قسم کی ذلت ان لوگوں نے پہنچائی اُسی قسم کی ذلت ان کو پہنچے گی۔

(تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ہشتم صفحہ ۱۲۸)

بدی کی جزا اس قدر بدی ہے لیکن اگر کوئی عفو کرے مگر وہ عفو بے محل نہ ہو بلکہ اس عفو سے اِصلاح مقصود ہو تو اس کا اجر اللہ کے ذمّہ ہے مثلاً اگر چور کو چھوڑ دیا جاوے تو وہ دلیر ہو کر ڈاکہ زنی کرے گا اُس کو سزا ہی دینی چاہیئے لیکن اگر دو نوکر ہوں اور ایک اُن میں سے ایسا ہو کہ ذرا سی چشم نمائی ہی اُس کو شرمندہ کر دیتی اور اس کی اصلاح کا موجب ہوتی ہو تو اس کو سخت سزا مناسب نہیں مگر دوسرا عمداً شرارت کرتا ہے اُس کو عفو کریں تو بگڑتا ہے اُس کو سزا ہی دی جاوے۔ تو بتاؤ مناسب حکم وہ ہے جو قرآن کریم نے دیا ہے یا وہ جو انجیل پیش کرتی ہے۔ قانونِ قدرت کیا چاہتا ہے؟ وہ تقسیم ورؤیت محل چاہتا ہے۔ یہ تعلیم کہ عفو سے اِصلاح مدِ نظر ہو ایسی تعلیم ہے جس کی نظیر نہیں اور اسی پر آخر متمدن انسان کو چلنا پڑتا ہے اور یہی تعلیم ہے جس پر عمل کرنے سے اِنسان میں قوت اجتہاد اور تدبّر اور فراست بڑھتی ہے گویا یوں کہا گیا ہے کہ ہر طرح کی شہادت سے دیکھو اور فراست سے غور کرو اگر عفو سے فائدہ ہو تو معاف کرو لیکن اگر خبیث اور شریر ہے تو پھر جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا پر عمل کرو۔ اِسی طرح پر اِسلام کی دوسری پاک تعلیمات ہیں جو ہر زمانہ میں روزِ روشن کی طرح ظاہر ہیں۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۰ء صفحہ ۵/۶)

توریت ..... ایک بے جا سختی پر زور دے رہی تھی اور انتقامی قوت کو بڑھاتی تھی اور انجیل بالمقابل بیہودہ عفو پر زور مارتی تھی۔ قرآن شریف نے ان دونوں کو چھوڑ کر حقیقی تعلیم دی جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ یعنی بدی کی جزا اسی قدر بدی ہے لیکن جو شخص معاف کر دے اور اس معاف کرنے میں اِصلاح مقصود ہو اس کا اجر اس کے رَبّ کے پاس ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

اِسلام نے سب سے اوّل یہ بتایا ہے کہ کوئی قوت اور طاقت جو انسان کو دی گئی ہے فی نفسہ وہ بُری نہیں ہے بلکہ اس کی افراط یا تفریط اور بُرا اِستعمال اسے اخلاقِ ذمیمہ میں داخل کرتا ہے اور اس کا برمحل اور اعتدال پر استعمال ہی اخلاق ہے یہی وہ اصول ہے جو دوسری قوموں نے نہیں سمجھا اور قرآن نے جس کو بیان کیا ہے اب اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر وہ کہتا ہے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ الآیۃ یعنی بدی کی سزا

تو اسی قدر بدی ہے لیکن جس نے عفو کیا اور اس عفو میں اصلاح بھی ہو۔ عفو کو تو ضرور رکھا ہے مگر یہ نہیں کہ اس عفو سے شریر اپنی شرارت میں بڑھے یا تمدن اور سیاست کے اصولوں اور انتظام میں کوئی خلل واقع ہو بلکہ ایسے موقع پر سزا ضروری ہے۔ عفو اصلاح ہی کی حالت میں روا رکھا گیا ہے اب بتاؤ کہ کیا یہ تعلیم انسانی اخلاق کی متمم اور مکمل ہو سکتی ہے یا نرے طمانچے کھانے۔ قانونِ قدرت بھی پکار کر اسی کی تائید کرتا ہے اور عملی طور پر بھی اس کی ہی تائید ہوتی ہے۔ انجیل پر عمل کرنا ہے تو پھر آج ساری عدالتیں بند کر دو اور دو دن کے لئے پولیس اور پہرہ اٹھا دو تو دیکھو انجیل کے ماننے سے کس قدر خون کے دریا بہتے ہیں اور انجیل کی تعلیم اگر ناقص اور ادھوری نہ ہوتی تو سلاطین کو جدید قوانین کیوں بنانے پڑتے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۵ مورخہ ۷۔فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

اِنسان تب ہی بنتا ہے کہ وہ سارے قویٰ کو استعمال کرے مگر انجیل کہتی ہے کہ سارے قویٰ کو بیکار چھوڑ دو اور ایک ہی قوت پر زور دیئے جاؤ بالمقابل قرآن شریف تمام قوتوں کا مربی ہے اور برمحل ہر قوت کے استعمال کی تعلیم دیتا ہے جیسا کہ مسیح کی اسی تعلیم کی بجائے قرآن شریف فرماتا ہے جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثۡلُہَا ۚ فَمَنۡ عَفَا وَ اَصۡلَحَ یعنی بدی کی سزا تو اسی قدر بدی ہے مگر عفو بھی کرو تو ایسا عفو کہ اس کے نتیجہ میں اصلاح ہو وہ عفو بے محل نہ ہو مثلاً ایک فرماں بردار خادم ہے اور کبھی کوئی خیانت اور غفلت اپنے فرض کے ادا کرنے میں نہیں کرتا مگر ایک دن اتفاقاً اس کے ہاتھ سے گرم چائے کی پیالی گر جاوے اور نہ صرف پیالی ہی ٹوٹ جاوے بلکہ کسی قدر گرم چائے سر پر بھی پڑ جاوے تو اس وقت یہ ضروری نہیں کہ آقا اس کو سزا دے بلکہ اس کے حسبِ حال سزا یہی ہے کہ اس کو معاف کر دیا جاوے ایسے وقت پر موقع شناس آقا تو خود شرمندہ ہو جاتا ہے کہ اس بیچارے نوکر کو شرمندہ ہونا پڑا لیکن کوئی شریر نوکر اس قسم کا ہے کہ وہ ہر روز نقصان کرتا ہے اگر اس کو عفو کر دیا جائے تو وہ اَور بھی بگڑے گا اس کو تنبیہ ضروری ہے۔ غرض اِسلام انسانی قویٰ کو اپنے اپنے موقع اور محل پر استعمال کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور انجیل اندھا دُھند ایک ہی قوت پر زور دیتی چلی جاتی ہے مگر حفظِ مراتب نہ گنی زندیقی۔ غرض حفظِ مراتب کا مقام قرآن شریف نے رکھا ہے کہ وہ عدل کی طرف لے جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۴، ۵)

بدی کی سزا اسی قدر بدی ہے لیکن اگر کوئی معاف کر دے اور اس عفو میں اِصلاح مدِّنظر ہو بگاڑ نہ ہو تو ایسے شخص کو خدا سے اجر ملے گا۔ دیکھو قرآن شریف نے انجیل کی طرح ایک پہلو پر زور نہیں دیا بلکہ محل اور موقع کے موافق عفو یا سزا کی کارروائی کرنے کا حکم دیا ہے۔ عفو غیر محل نہ ہو۔ ایسا عفو نہ ہو کہ اس کی وجہ سے کسی مجرم کو زیادہ جرأت ہو اور دلیری بڑھ جاوے اور وہ اَور بھی گناہ اور شرارت میں ترقی کرے۔ غرض دونو پہلوؤں کو مدِّنظر رکھا ہے۔ اگر عفو سے اس کی عادتِ بد جاتی رہے تو عفو کی تعلیم ہے اور اگر اصلاح سزا میں ہو تو سزا دینی چاہیئے اور پھر اگر قرآن شریف کی اور باقی تعلیموں کو بھی زمانہ کے ساتھ مطابق کرنا چاہیں تو اَور کوئی تعلیم اس کا مقابلہ نہ

کرسکے گی۔ (الحکم جلد ۷، ۱۵ مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

بدی کا بدلہ تو اسی قدر بدی ہے لیکن جو شخص اپنے قصوروار کا گناہ بخشے اور اس گناہ کے بخشنے میں وہ شخص جس نے گناہ کیا ہے اصلاح پذیر ہوسکے اور آئندہ اپنی بدی سے باز آسکے تو معاف کرنا بدلہ لینے سے بہتر ہوگا ورنہ سزا دینا بہتر ہوگا کیونکہ طبائع مختلف ہیں۔ بعض ایسی ہی ہیں کہ گناہ معاف کرنے سے پھر اس گناہ کا نام نہیں لیتے اور باز آجاتے ہیں۔ ہاں بعض ایسے بھی ہیں کہ قید سے بھی رہائی پاکر پھر بھی وہی گناہ کرتے ہیں۔ سو چونکہ انسانوں کی طبیعتیں مختلف ہیں اس لئے یہی تعلیم ان کے مناسب حال ہے جو قرآن شریف نے پیش کی ہے۔

(لیکچر چشمہ معرفت صفحہ ۴۳، ۴۴)

اِسلام میں اِنتقامی حدود میں جو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے کوئی دوسرا مذہب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور وہ یہ ہے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ الآیۃ یعنی بدی کی سزا اسی قدر بدی ہے اور جو معاف کردے مگر ایسے محل اور مقام پر کہ وہ عفو وِاصلاح کا موجب ہو۔ اِسلام نے عفو خطا کی تعلیم دی لیکن یہ نہیں کہ اس سے شر بڑھے۔ (الحکم جلد ۱۰، ۳۷ مورخہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

کامل تعلیم وہ ہے جو اسلام نے پیش کی اور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہم کو ملی اور وہ یہ ہے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ یعنی بدی کی جزا اسی قدر بدی ہے جو کی گئی ہو لیکن جو شخص گناہ کو بخش دے اور ایسے موقع پر بخش دے کہ اس سے کوئی اصلاح ہوتی ہو۔ کوئی شر پیدا نہ ہوتا ہو تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اِس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا ہرگز یہ منشاء نہیں کہ خواہ نخواہ ضرور ہر مقام پر شر کا مقابلہ نہ کیا جاوے اور انتقام نہ لیا جاوے بلکہ منشاء الٰہی یہ ہے کہ محل اور موقع کو دیکھنا چاہیئے کہ آیا وہ موقع گناہ کے بخش دینے اور معاف کر دینے کا ہے یا سزا دینے کا۔ اگر اس وقت سزا دینا ہی مصلحت ہو تو اس قدر سزا دی جاوے جو سزاوار ہے اور اگر عفو کا محل ہے تو سزا کا خیال چھوڑ دو۔ یہ خوبی ہے اس تعلیم میں کیونکہ وہ ہر پہلو کا لحاظ رکھتی ہے۔ اگر انجیل پر عمل کرکے ہر شریر اور بدمعاش کو چھوڑ دیا جاوے تو دُنیا میں اندھیر مچ جاوے۔ (الحکم جلد ۱۰، ۲۱ مورخہ ۱۷ر جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

انجیل میں لکھا ہے کہ تو بدی کا مقابلہ نہ کر۔ غرض انجیل کی تعلیم تفریط کی طرف جُھکی ہوئی ہے اور بجز خاص حالات کے ماتحت ہونے کے اِنسان اس پر عمل کر ہی نہیں سکتا۔ دوسری طرف توریت کی تعلیم کو دیکھا جاوے تو وہ افراط کی طرف جُھکی ہوئی ہے اور اس میں بھی صرف ایک ہی پہلو پر زور دیا گیا ہے کہ جان کے بدلے جان۔ آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت توڑ دیا جاوے اس میں عفو اور درگذر کا نام تک بھی نہیں لیا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ کتابیں مختص الزمان اور مختص القوم ہی تھیں مگر قرآن شریف نے ہمیں کیا پاک راہ بتائی

ہے جو افراط اور تفریط سے پاک اور عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہے مثلاً مثال کے طور پر قرآن شریف میں فرمایا ہے جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا ج فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ یعنی جتنی بدی کی گئی ہو اسی قدر بدی کرنی جائز ہے لیکن اگر کوئی معاف کردے اور اس معافی میں اصلاح مدِّ نظر ہو۔ بے محل اور بے موقع عفو نہ ہو بلکہ برمحل ہو تو ایسے معاف کرنے والے کے واسطے اس کا اجر ہے جو اُسے خدا سے ملے گا۔

دیکھو کیسی پاک تعلیم ہے نہ افراط نہ تفریط۔ انتقام کی اجازت ہے مگر معافی کی تحریص بھی موجود ہے بشرط اصلاح یہ ایک تیسرا مسلک ہے جو قرآن شریف نے دُنیا کے سامنے رکھا ہے۔ اب ایک سلیم الفطرت انسان کا فرض ہے کہ ان میں خود موازنہ اور مقابلہ کرکے دیکھ لے کہ کونسی تعلیم فطرتِ انسانی کے مطابق ہے اور کونسی تعلیم ایسی ہے کہ فطرتِ صحیح اور کانشنس اسے دھکے دیتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۴؍جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۶،۷)

۴۲ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَیْھِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ ۝

جو شخص مظلوم ہونے کے بعد انتقام لے اس پر کوئی الزام نہیں۔ (نور الحق حصہ ۲ ٹائیٹل پیج)

۵۲ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ

حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ اِنَّہٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌ ۝

قبل اس کے کہ اِس آیت کے حل کی طرف ہم متوجہ ہوں ہم عملاً دیکھتے ہیں کہ تین ہی طریقے ہیں خدا تعالیٰ کے کلام کرنے کے چوتھا کوئی نہیں (۱) رؤیا (۲) مکاشفہ (۳) وحی ..... مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ سے مراد رؤیا کا ذریعہ ہے مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ کے معنی یہ ہیں کہ اس پر استعارے غالب رہتے ہیں جو حجاب کا رنگ رکھتے ہیں اور یہی رؤیا کی ہیئت ہے۔

یُرْسِلَ رَسُوْلًا سے مراد مکاشفہ ہے۔ رسول کا تمثل بھی مکاشفہ میں ہی ہوتا ہے اور مکاشفہ کی حقیقت یہی ہے کہ وہ تمثلات ہی کا سلسلہ ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۱۰)

(فارسی متن) کلامِ الٰہی بر سہ قسم است۔ وحی۔ رؤیا۔ کشف۔ وحی آنکہ بلا واسطۂ شخصے برقلبِ مطہرۂ نبوی فرود آید۔

(ترجمہ از مرتب) کلامِ الٰہی کی تین قسمیں ہیں وحی۔ رؤیا۔ کشف۔ وحی وہ ہے جو کسی واسطہ کے بغیر نبی کے پاک اور

وآں کلام اجلیٰ وروشن مے باشد۔نظیرش بیان فرمودند کہ مثلاً حافظ صاحب نابینا کہ پیشِ ما نشستہ اند۔ در سماعِ کلامِ ما ہرگز غلطی نمے خورند۔ ونمے دانند کہ آوازِ مسموع کلامِ غیرِ ما باشد۔ اگرچہ از چشمِ ظاہر ما را نمی بینند۔ دیگر رؤیا و منام ست کہ آں کلام رنگین ولطیف وکنایہ دارد۔ وذوی الوجوہ است چوں دیدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوارین در دستِ مبارکِ خویش یا معائنہ فرمودن یکے زوجہ مطہرہ خود را طویل یدین و دیدن بقرہ وغیرہ ایں چنیں کلامِ الٰہی تعبیر طلب است سوم کشف است وآں تمثل است خواہ بصورت جبریل باشد یا فرشتہ یا دیگر اشیاء۔ پس آیۃ شریف خواندند لَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْمِنْ وَّرَآیِٔ حِجَابٍ اَوْیُرْسِلَ رَسُوْلًا ارشاد شد کہ سوائے امورِ ثلاثہ مذکورہ کلامِ الٰہی را طریقے نیست۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴؍ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۶)

وحی ورار الحجاب کی خدا تعالیٰ کی کلام میں ہزاروں مثالیں ہیں اس سے اِنکار کرنا منصف کا کام نہیں۔ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دو جھوٹے نبیوں کو دو کڑوں کی شکل میں دیکھنا اس قسم کی وحی تھی۔گائیں ذبح ہوتے دیکھنا بھی اسی قسم کی وحی تھی۔لمبے ہاتھوں والی بیوی کا سب بیویوں سے پہلے فوت ہونا دیکھنا بھی اسی قسم کی وحی تھی اور ملاکی نبی کی وحی میں یہ ظاہر کیا جانا کہ ایلیاء نبی دوبارہ آئے گا اور یہود کی بستیوں میں سے فلاں مقام پر نازل ہو گا یہ بھی اسی قسم کی وحی تھی اور مدینہ کی وباء کا عورت پراگندہ شکل کے طور پر نظر آنا یہ بھی اسی قسم کی وحی تھی۔اسی طرح دجّال بھی جو ایک دجل کرنے والا گروہ ہے ایک شخص مقرر کی طرح نظر آیا یہ بھی اسی قسم کی وحی ہے۔نبیوں کی وحیوں میں ہزاروں ایسے نمونے ہیں جن میں رُوحانی امور جسمانی رنگ میں نظر آئے یا ایک جماعت ایک شخص کی صورت میں نظر آئی۔تمام نوعِ انسان کے لئے جس میں انبیاء علیہم السلام بھی داخل ہیں خدا تعالیٰ کی یہ سُنّت ہے کہ الہام اور وحی اور رؤیا اور کشف پر اکثر استعارات غالب ہوتے ہیں مثلاً دو چار سو آدمی جمع کر کے اُن کی خوابیں سُنو تو اکثر اُن میں استعارات ہوں گے کسی نے سانپ

مطہر دِل پر نازل ہوا اور یہ کلام زیادہ صاف اور روشن ہوتا ہے۔اِس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ مثلاً یہ حافظ صاحب نابینا جو ہمارے سامنے بیٹھے ہیں وہ ہمارے کلام کے سُننے میں ہرگز کوئی غلطی نہیں کرتے اور نہیں جانتے کہ سُنی ہوئی آواز ہمارے غیر کی آواز ہوسکتی ہے۔اگرچہ وہ ظاہری آنکھ سے ہمیں نہیں دیکھ رہے۔ دوسری قسم رؤیا اور خواب ہے کہ یہ کلام رنگین اور لطیف ہوتا ہے اور اس میں کنایہ ہوتا ہے اور وہ ذوالوجوہ ہوتا ہے جیساکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے دونوں مبارک ہاتھوں میں دو کنگنوں کا دیکھنا یا اپنی ایک بیوی کے سب سے زیادہ لمبے ہاتھ دیکھنا یا گائے وغیرہ کو دیکھنا۔اِس قسم کا کلام تعبیر طلب ہوتا ہے۔تیسری قسم کلام کی کشف ہے اور یہ تمثل کی صورت میں ہوتا ہے چاہے وہ بصورت جبرائیل علیہ السلام ہو یا کسی اَور فرشتہ یا کسی دوسری چیز کی صُورت میں ہو..... پس آیت لَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْمِنْ وَّرَآیِٔ حِجَابٍ اَوْیُرْسِلَ رَسُوْلًا میں سوائے مذکورہ بالا تین طریقوں کے کلامِ الٰہی کا اَور کوئی طریق نہیں بتایا گیا۔

دیکھا ہوگا کسی نے بھیڑیا اور کسی نے سیلاب اور کسی نے باغ اور کسی نے پھل اور کسی نے آگ اور تمام یہ امور قابلِ تاویل ہوں گے۔ حدیثوں میں ہے کہ قبر میں عمل صالح اور غیر صالح انسان کی صورت پر دکھائی دیتے ہیں سو یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس سے تمام تناقض دُور ہوتے ہیں اور حقیقت کھلتی ہے مبارک وہ جو اس میں غور کریں۔

(ایام الصلح صفحہ ۴۵، ۴۶)

جابجا مفسروں نے وحی کے لفظ کو الہام ہی سے تعبیر کیا ہے۔ کئی احادیث میں بھی یہی معنے ملتے ہیں ... سوادِ اعظم علماء کا الہام کو وحی کا مترادف قرار دینے میں متفق ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو استعمال کیا ہے تو پھر اس سے اِنحراف کرنا صریح تحکم ہے ..... علمِ شریعت میں اسی طرح صدہا عرفی الفاظ ہیں جن کے مفہوم کو لغوی معنوں میں محدود کرنا ایک ضلالت ہے۔ خود وحی کے لفظ کو دیکھئے کہ اس کے وہ معنے جن کی رُو سے خدا کی کتابیں وحیٔ رسالت کہلاتی ہیں کہاں لُغت سے ثابت ہوتے ہیں اور کس کتاب لُغت میں وہ کیفیتِ نزولِ وحی لکھی ہے جس کیفیت سے خدا اپنے مُرسلوں سے کلام کرتا ہے اور ان پر اپنے احکام نازل کرتا ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۰، ۲۲۱ حاشیہ درحاشیہ)

الہام ایک القاء غیبی ہے کہ جس کا حصول کسی طرح کی سوچ اور تردّد اور تفکر اور تدبر پر موقوف نہیں ہوتا اور ایک واضح اور منکشف احساس ہے کہ جیسے سامع کو متکلم سے یا مضروب کو ضارب سے یا ملموس کو لاس سے ہو محسوس ہوتا ہے اور اس سے نفس کو مثل حرکات فکریہ کے کوئی الم رُوحانی نہیں پہنچتا بلکہ جیسے عاشق اپنے معشوق کی رؤیت سے بلا تکلف اِنشراح اور اِنبساط پاتا ہے ویسا ہی رُوح کو الہام سے ایک ازلی اور قدیمی رابطہ ہے کہ جس سے رُوح لذت اُٹھاتا ہے۔ غرض یہ منجانب اللہ اعلام لذیذ ہے کہ جس کو نفث فی الروع اور وحی بھی کہتے ہیں۔

(پُرانی تحریریں صفحہ ۱۸)

اِلہام کیا چیز ہے؟ وہ پاک اور قادر خدا کا ایک برگزیدہ بندہ کے ساتھ یا اس کے ساتھ جس کو برگزیدہ کرنا چاہتا ہے ایک زندہ اور باقدرت کلام کے ساتھ مکالمہ اور مخاطبہ ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۲۲)

اِلہام کے تو صرف یہ معنی ہیں کہ جو کچھ دِل میں ڈالا جاوے نیک ہو یا بَد وہ اِلہام ہے اور اس میں یہ بھی ضروری نہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے الفاظ ہوں مگر اِس جگہ ہماری مراد الہام سے وحی الٰہی ہے اور وحی اس کو کہتے ہیں کہ خدا کا کلام مع الفاظ کسی پر نازل ہو۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۶۶ حاشیہ)

وحی کی مثال اگر دُنیا کی چیزوں میں سے کسی چیز کے ساتھ دی جائے تو شاید کسی قدر تار برقی سے مشابہ ہے جو اپنے ہر ایک تغیّر کی آپ خبر دیتا ہے۔ (برکات الدعا صفحہ ۲۶)

کلام اور الہام میں فرق یہ ہے کہ الہام کا چشمہ تو گویا ہر وقت مترتب لوگوں میں بہتا ہے اور وہ رُوح القدس

کے بلائے بولتے اور رُوح القدس کے دکھائے دیکھتے اور رُوح القدس کے سُنائے سُنتے اور اُن کے تمام ارادے رُوح القدس کے نفخ سے ہی پَیدا ہوتے ہیں اور یہ بات سچ اور بالکل سچ ہے..... کہ وہ ظلّی طور پر اس آیت کے مصداق ہوتے ہیں وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی اِنۡ ھُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی[1] لیکن مکالمہ الٰہیہ ایک الگ امر ہے اور وہ یہ ہے کہ وحی متلو کی طرح خدا تعالیٰ کا کلام ان پر نازل ہوتا ہے اور وہ اپنے سوالات کا خدائے تعالیٰ سے ایسا جواب پاتے ہیں کہ جیسا ایک دوست دوست کو جواب دیتا ہے اور اس کلام کی اگر ہم تعریف کریں تو صرف اس قدر کر سکتے ہیں کہ وہ اللہ جلّ شانہٗ کی ایک تجلّی خاص کا نام ہے جو بذریعہ اس کے مقرّب فرشتہ کے ظہور میں آتی ہے اور اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ تا دعا کے قبول ہونے سے اطلاع دی جائے یا کوئی نئی اور مخفی بات بتائی جائے یا آئندہ کی خبروں پر آگاہی دی جائے یا کسی امر میں خدائے تعالیٰ کی مرضی اور عدم مرضی پر مطلع کیا جائے یا کسی اَور قسم کے واقعات میں یقین اور معرفت کے مرتبہ تک پہنچایا جائے۔ بہر حال یہ وحی ایک الٰہی آواز ہے جو معرفت اور اطمینان سے رنگین کرنے کے لئے منجانب اللہ پیرایہ مکالمہ و مخاطبہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے اور اس سے بڑھ کر اُس کی کیفیت بیان کرنا غیر ممکن ہے کہ وہ صرف الٰہی تحریک اور ربّانی نفخ سے بغیر کسی قسم کے فکر اور تدبّر اور خوض اور غور اور اپنے نفس کے دخل کے خدائے تعالیٰ کی طرف سے ایک قدرتی ندا ہے جو لذیذ اور پُر برکت الفاظ میں محسوس ہوتی ہے اور اپنے اندر ایک ربّانی تجلّی اور الٰہی صولت رکھتی ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۲۳۱ تا ۲۳۳)

جب سماع کے ذریعہ سے کوئی خبر دی جاتی ہے تو اسے وحی کہتے ہیں اور جب رویت کے ذریعہ سے کچھ بتلایا جاوے تو اسے کشف کہتے ہیں۔ اِس طرح مَیں نے دیکھا ہے کہ بعض وقت ایک ایسا امر ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق صرف قوّتِ شامہ سے ہوتا ہے مگر اس کا نام نہیں رکھ سکتے جیسے یوسفؑ کی نسبت حضرت یعقوبؑ کو خوشبو آئی تھی اِنِّیۡ لَاَجِدُ رِیۡحَ یُوۡسُفَ لَوۡلَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ[2] اور کبھی ایک امر ایسا ہوتا ہے کہ جسم اسے محسوس کرتا ہے گویا کہ حواسِ خمسہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اپنی باتیں اظہار کرتا ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۴)

کشف کیا ہے یہ رؤیا کا ایک اعلیٰ مقام اور مرتبہ ہے۔ اس کی ابتدائی حالت کہ جس میں غیبتِ حِس ہوتی ہے صرف اس کو خواب (رؤیا) کہتے ہیں جسم بالکل معطل بیکار ہوتا ہے اور حواس کا ظاہری فعل بالکل ساکت ہوتا ہے لیکن کشف میں دوسرے حواس کی غیبت نہیں ہوتی۔ بیداری کے عالَم میں انسان وہ کچھ دیکھتا ہے جو کہ وہ نیند کی حالت میں حواس کے معطل ہونے کے عالَم میں دیکھتا تھا۔ کشف اسے کہتے ہیں کہ اِنسان پر بیداری کے عالَم میں ایک ایسی ربودگی طاری ہو کہ وہ سب کچھ جانتا بھی ہو اور حواسِ خمسہ اس کے کام بھی کر رہے ہوں اور ایک ایسی ہَوا چلے

---

[1] سورۃ النجم: ۴، ۵ [2] سورۃ یوسف: ۹۵

کہ نئے حواس اُسے مِل جاویں جن سے وہ عالمِ غیب کے نظارے دیکھ لے۔ وہ حواس مختلف طور سے ملتے ہیں کبھی بصر میں، کبھی شامہ (سُونگھنے) میں، کبھی سمع میں۔ شامہ میں اسی طرح جیسے کہ حضرت یوسفؑ کے والد نے کہا اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (کہ مجھے یوسفؑ کی خوشبو آتی ہے اگر تم یہ نہ کہو کہ بوڑھا بہک گیا) اس سے مراد وہی نئے حواس ہیں جو کہ یعقوبؑ کو اس وقت حاصل ہوئے اور انہوں نے معلوم کیا کہ یوسفؑ زندہ موجود ہے اور ملنے والا ہے۔ اس خوشبو کو دوسرے پاس والے نہ سُونگھ سکے کیونکہ ان کو وہ حواس نہ ملے تھے جو کہ یعقوبؑ کو ملے جیسے گُڑ سے شکر بنتی ہے اور شکر سے کھانڈ اور کھانڈ سے اَور دوسری شیرینیاں لطیف در لطیف بنتی ہیں ایسے ہی رؤیا کی حالت ترقی کرتی کرتی کشف کا رنگ اختیار کرتی ہے اور جب وہ بہت صفائی پر آجاوے تو اس کا نام کشف ہوتا ہے۔

لیکن وحی ایسی شئی ہے جو کہ اس سے بدرجہا بڑھ کر صاف ہے اور اس کے حاصل ہونے کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے۔ کشف تو ایک ہندو کو بھی ہو سکتا ہے بلکہ ایک دہریہ بھی جو خدا تعالیٰ کو نہ مانتا ہو وہ بھی اس میں کچھ نہ کچھ کمال حاصل کرلیتا ہے لیکن وحی سوائے مسلمان کے دوسرے کو نہیں ہو سکتی یہ اسی اُمّت کا حصّہ ہے کیونکہ کشف تو ایک فطرتی خاصہ انسان کا ہے اور ریاضت سے یہ حاصل ہو سکتا ہے خواہ کوئی کرے۔ کیونکہ فطرتی امر ہے جیسے جیسے کوئی اس میں مشق اور محنت کرے گا ویسے ویسے اس پر اس کی حالتیں طاری ہوں گی اور ہر ایک نیک و بَد کو رؤیا کا ہونا اس امر پر دلیل ہے۔ دیکھا ہوگا کہ سچّی خوابیں بعض فاسق فاجر لوگوں کو بھی آجاتی ہیں پس جیسے اُن کو سچّی خوابیں آتی ہیں ویسے ہی زیادہ مشق سے کشف بھی ان کو ہو سکتے ہیں حتّٰی کہ حیوان بھی صاحبِ کشف ہو سکتا ہے لیکن الہام یعنی وحی الٰہی ایسی شئے ہے کہ جب تک خدا تعالیٰ سے پوری صلح نہ ہو اور اس کی اطاعت کے لئے اس نے گردن نہ رکھ دی ہو تب تک وہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ[۱] یہ اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔ نزول وحی کا اُن کے ساتھ وابستہ ہے جو کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں مستقیم ہیں اور وہ صرف مسلمان ہی ہیں۔ وحی ہی وہ شئی ہے کہ جس سے اَنَا الموجود کی آواز کان میں آکر ہر ایک شک و شُبہ سے ایمان کو نجات دیتی ہے اور بغیر جس کے مرتبہ یقین کامل انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا لیکن کشف میں یہ آواز کبھی نہیں سُنائی دیتی اور یہی وجہ ہے کہ صاحبِ کشف ایک دہریہ بھی ہو سکتا ہے لیکن صاحبِ وحی کبھی دہریہ نہیں ہوگا۔

(البدر جلد ۴ نمبر ۸ مورخہ ۱۳؍ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

---

[۱] سُورۃ حٰمٓ السّجدۃ: ۳۱

جس جگہ صفوت وعصمت و تبتّل و محبت کامل و تام حُزن و درد و شوق و خوف ہے اُس جگہ انوارِ وحی کے کامل تجلیات بغیر آمیزش کسی نوع کی ظلمت کے وارد ہوتے رہتے ہیں اور آفتاب کی طرح چمکتے ہوئے نظر آتے رہتے ہیں اور جس جگہ یہ مرتبہ کمالِ تام کا نہیں اُس جگہ وحی بھی اُس عالی مرتبہ سے متنزل ہوتی ہے۔ غرض وحیِ الٰہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں خدائے تعالیٰ کی صفاتِ عالیہ کا چہرہ حسب صفائی باطن نبی منزل علیہ کے نظر آتا ہے اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پاک باطنی وانشراح صدری وعصمت وحیا وصدق وصفا و توکّل و وفا اور عشقِ الٰہی کے تمام لوازم میں سب انبیاء سے بڑھ کر اور سب سے افضل و اعلیٰ و اکمل و اَرفع و اجلیٰ و اصفا تھے اِس لئے خدائے جلّ شانہٗ نے اُن کو عطرِ کمالاتِ خاصّہ سے سب سے زیادہ معطر کیا اور وہ سینہ اور دل جو تمام اوّلین و آخرین کے سینہ و دل سے فراخ تر و پاک تر و معصوم تر و روشن تر و عاشق تر تھا وہ اسی لائق ٹھہرا کہ اُس پر ایسی وحی نازل ہو کہ جو تمام اوّلین و آخرین کی وحیوں سے اقویٰ و اکمل و اَرفع و اتم ہو کر صفاتِ الٰہیّہ کے دکھلانے کے لئے ایک نہایت صاف اور کشادہ اور وسیع آئینہ ہو۔

(سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۷، ۱۸ حاشیہ)

عقلِ انسانی اگر ایک ثابت شدہ صداقت کو اپنے فہم اور ادراک سے بالاتر نہ سمجھے تو وہ صداقت صرف اِس وجہ سے رَدّ کرنے کے لائق نہیں ٹھہرے گی کہ عقل اس کی حقیقت تک نہیں پہنچتی۔ دُنیا میں بہتیرے ایسے خواص نباتات وجمادات وحیوانات میں پائے جاتے ہیں کہ وہ تجارب صحیحہ کے ذریعہ سے ثابت ہیں مگر عقلِ انسان کے مافوق ہیں یعنی عقل اُن کی حقیقت تک پہنچ نہیں سکتی اور ان کی حقیقت بتلا نہیں سکتی پس ایسا ہی وہ وحی ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی اور پاک دِلوں تک وہ علوم پہنچاتی ہے جو بشری طاقتوں سے بلند تر ہیں پھر جبکہ یہ حال ہے کہ عقل بجائے خود کوئی چیز نہیں بلکہ ثابت شدہ صداقتوں کے ذریعہ سے قدر و منزلت پیدا کرتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وحیِ سماوی ایک ثابت شدہ صداقت ہے جو اپنے اندر اعجازی قوت رکھتی ہے اور علومِ غیبیہ پر مشتمل ہوتی ہے اور ہم اِس دعویٰ کے ثابت کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۲۳۸، ۲۳۹ حاشیہ)

خدا کے اِلہام میں یہ ضروری ہے کہ جس طرح ایک دوست دوسرے دوست سے مِل کر باہم ہمکلام ہوتا ہے اسی طرح رَبّ اور اس کے بندے میں ہمکلامی واقع ہو اور جب یہ کسی امر میں سوال کرے تو اس کے جواب میں ایک کلامِ لذیذ فصیح خدائے تعالیٰ کی طرف سے سُنے جس میں اپنے نفس اور فکر اور غور کا کچھ بھی دخل نہ ہو اور وہ مکالمہ اور مخاطبہ اس کے لئے موہبت ہو جائے تو وہ خدا کا کلام ہے اور ایسا بندہ خدا کی جناب میں عزیز ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۲۵، ۱۲۶)

کبھی نبی کی وحی خبرِ واحد کی طرح ہوتی ہے اور مع ذالک مجمل ہوتی ہے اور کبھی وحی ایک امر میں کثرت سے اور واضح ہوتی ہے پس اگر مجمل وحی میں اِجتہاد کے رنگ میں کوئی غلطی بھی ہو جائے تو بیّنات محکمات کو اس سے کچھ صدمہ

نہیں پہنچتا۔ پس مَیں اِس سے اِنکار نہیں کر سکتا کہ کبھی میری وحی بھی خبرِ واحد کی طرح ہو اور مجمل ہو اور اس کے سمجھنے میں اجتہادی رنگ کی غلطی ہو۔ اِس بات میں تمام انبیاء شریک ہیں۔ (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۵۵، ۵۶)

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَدْ یُوْحِیْ اِلٰی اَنْبِیَائِہٖ وَرُسُلِہٖ فِیْ حُلَلِ الْمَجَازَاتِ وَالْاِسْتِعَارَاتِ وَالتَّمْثِیْلَاتِ وَنَظَائِرُہٗ کَثِیْرَۃٌ فِیْ وَحْیِ خَیْرِ الرُّسُلِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، مِنْھَا مَاجَاءَ فِیْ حَدِیْثِ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: رَاَیْتُ ذَاتَ لَیْلَۃٍ فِیْمَا یَرَی النَّائِمُ کَاَنَّا فِیْ دَارِ عُقْبَۃَ بْنِ رَافِعٍ فَاُتِیْنَا بِرُطَبٍ مِّنْ رُطَبِ ابْنِ طَابَ، فَاَوَّلْتُ اَنَّ الرِّفْعَۃَ لَنَا فِی الدُّنْیَا وَالْعَافِیَۃَ فِی الْاٰخِرَۃِ وَاَنَّ دِیْنَنَا قَدْ طَابَ ..... فَانْظُرْ کَیْفَ رَاٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْکَیْفِیَّاتِ الرُّوْحَانِیَّۃَ فِی الصُّوَرِ الْجِسْمَانِیَّۃِ، وَلَا یَخْفٰی عَلَیْکَ اَنَّ رُؤْیَا الْاَنْبِیَاءِ وَحْیٌ، فَثَبَتَ مِنْ ھٰھُنَا اَنَّ وَحْیَ الْاَنْبِیَاءِ قَدْ یَکُوْنُ مِنْ نَوْعِ الْمَجَازِ وَالْاِسْتِعَارَۃِ، وَقَدْ اَوَّلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِثْلَ ذٰلِکَ الْوَحْیِ۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۷۲ حاشیہ)

اِلہام خدا تعالیٰ کا فعل ہے۔ بندہ کی اِلہام میں فضیلت نہیں بلکہ اعمالِ صالحہ کی فضیلت ہے اور اس میں کہ خدا تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے سو نیک کاموں میں کوشش چاہیئے تاکہ موجب نجات ہو۔

(بدر جلد ۲ نمبر ۲۳ مورخہ ۷ رجون ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

اگر چاہتے ہو کہ اس (خدا تعالیٰ) کا کلام سُنو تو اس کا قُرب حاصل کرو مگر یہ یاد رکھو کہ اصل مقصود تمہارا یہ نہ ہو ورنہ میرا اپنا یہی مذہب ہے کہ یہ بھی ایک قسم کا شرک ہوگا کیونکہ خدا تعالیٰ کی رضا جوئی اور اس کی محبت کی غرض اصل تو یہ ہوئی کہ الہام ہوں یا کشوف ہوں اور پھر باریک طور پر اس کے ساتھ نفسانی غرض یہ ملی ہوئی ہوتی ہے کہ اس سے ہماری شہرت ہو۔ لوگوں میں ہم ممتاز ہوں۔ ہماری طرف رجوع ہو۔ یہ باتیں صافی تعلقات میں ایک روک ہو جاتی ہیں اور اکثر اوقات شیطان اپنے وقت پر قابو پا لیتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۳، ۴)

خوب یاد رکھو کہ ان خوابوں اور الہامات ہی پر نہ رہو بلکہ اعمالِ صالحہ میں لگے رہو۔ بہت سے الہامات اور خواب

ترجمہ از مرتب:۔ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء اور مُرسلوں کو کبھی کبھی مجاز، اِستعارہ اور تمثیل کے رنگ میں وحی کرتا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی میں اس کی بہت سی نظائر موجود ہیں منجملہ ان کے ایک مثال حضرت انسؓ کی حدیث میں آئی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مَیں نے ایک رات ایک ایسا ہی خواب دیکھا جیسا ایک سونے والا دیکھتا ہے کہ گویا ہم عقبہ بن رافع کی حویلی میں ہیں اور ابن طاب کی کھجوروں میں سے کچھ کھجوریں ہمارے پاس لائی گئی ہیں مَیں نے اسکی تعبیر کی کہ ہمارے لئے دُنیا میں رفعت اور آخرت میں عافیت ہے اور ہمارا دین مقبول ہو رہا ہے ..... سو دیکھو کہ کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روحانی کیفیات جسمانی صورتوں میں دیکھیں اور یہ بات آپ پر مخفی نہیں کہ انبیاء کی خوابیں وحی ہوتی ہیں اور اس سے یہ ثابت ہؤا کہ انبیاء کی وحی بعض اوقات مجاز اور استعارہ کی قسم سے ہوتی ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی وحی کی تاویل کی ہے۔

سنیر و بُپل کی طرح ہوتے ہیں جو کچھ دنوں کے بعد گر جاتے ہیں اور پھر کچھ باقی نہیں رہتا ہے۔ اصل مقصد اور غرض اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچا اور بے ریا تعلق، اخلاص اور وفاداری ہے جو نرے خوابوں سے پُوری نہیں ہو سکتی مگر اللہ تعالےٰ سے کبھی بے خوف نہیں ہونا چاہیئے۔ جہاں تک ہو سکے صدق و اخلاص و ترکِ ریا و ترکِ منہیات میں ترقی کرنی چاہیئے اور مطالعہ کرتے رہو کہ ان باتوں پر کس حد تک قائم ہو۔ اگر یہ باتیں نہیں ہیں تو پھر خوابیں اور الہامات بھی کچھ فائدہ نہ دیں گے بلکہ صوفیوں نے لکھا ہے کہ اوائل سلوک میں جو رؤیا یا وحی ہو اس پر توجہ نہیں کرنی چاہیئے وہ اکثر اوقات اس راہ میں رُوک ہو جاتی ہے۔ اِنسان کی اپنی خوبی اس میں تو کوئی نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جو وہ کسی کو کوئی اچھی خواب دکھائے یا کوئی الہام کرے۔ اس نے کیا کیا؟ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۸، ۱۹ مورخہ ۸ و ۱۶ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۰)

خدائے تعالیٰ نے اِنسان کو اس کے کمالاتِ مطلوبہ تک پہنچانے کے لئے صرف جوہرِ عقل ہی عطا نہیں کیا بلکہ کشف اور الہام پانے کی قوت بھی اُس کی فطرت میں رکھی ہے۔ (سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۱)

اللہ تعالیٰ نے وحی اور الہام کا مادہ ہر شخص میں رکھ دیا ہے کیونکہ اگر یہ مادہ نہ رکھا ہوتا تو پھر حجت پوری نہ ہو سکتی اِس لئے جو نبی آتا ہے اس کی نبوت اور وحی و الہام کے سمجھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی فطرت میں ایک ودیعت رکھی ہوئی ہے اور وہ ودیعت خواب ہے اگر کسی کو کوئی خواب سچی کبھی نہ آئی ہو تو وہ کیونکر مان سکتا ہے کہ الہام اور وحی بھی کوئی چیز ہے اور چونکہ خدا تعالیٰ کی یہ صفت ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا[1] اِسلئے یہ مادہ اس نے سب میں رکھ دیا ہے۔ میرا یہ مذہب ہے کہ ایک بدکار اور فاسق فاجر کو بھی بعض وقت سچی رؤیا آ جاتی ہے اور کبھی کبھی الہام بھی ہو جاتا ہے گو وہ شخص اس کیفیت سے کوئی فائدہ اُٹھاوے یا نہ اُٹھاوے جبکہ کافر اور مومن دونوں کو سچی رؤیا آ جاتی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ عظیم الشان فرق تو یہ ہے کہ کافر کی رؤیا بہت کم سچی نکلتی ہے اور مومن کی کثرت سے سچی نکلتی ہے گویا پہلا فرق کثرت اور قلت کا ہے دوسرے مومن کے لئے بشارت کا حصہ زیادہ ہے جو کافر کی رؤیا میں نہیں ہوتا۔ سوم مومن کی رؤیا مصفا اور روشن ہوتی ہے بحالیکہ کافر کی رؤیا مصفا نہیں ہوتی چہارم مومن کی رؤیا اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔

(الحکم جلد ۶ ۳۱ مورخہ ۳۱ ۔ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

وحی کئی قسم کی ہے۔ عادت اللہ ہے کہ جب وہ سماع پر موقوف ہو تو اُسے وحی کہتے ہیں۔ رویت کے متعلق ہو تو اس کو کشف کہتے ہیں ایک قوت شامہ سے ہوتی ہے جیسے اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ۔ کبھی قوتِ حاسہ سے بھی ہوتی ہے۔ غرض تمام حواس خمسہ سے وحی ہوتی ہے اور ملہم کو قبل از وقت بذریعہ وحی ان باتوں کی اطلاع دی جاتی

---

[1] سورۃ البقرۃ : ۲۸۷

ہے مثنوی رومی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک دفعہ چند قیدی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پابجولاں آئے ان قیدیوں نے خیال کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے آپ نے فرمایا کہ نہیں یہ خیال تمہارا غلط ہے جس وقت تم لوگ گھوڑوں پر سوار اور ناز و نعمت میں بآرام چلتے تھے میں تو اس وقت تمہیں پا بہ زنجیر دیکھ رہا تھا اب مجھے تمہارے دیکھنے کی کیا خوشی ہے؟ پھر مطلب یہ کہ الہام کے ساتھ عموماً کشوف بھی ہوا کرتے ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

عقل رُوح کی صفائی سے پیدا ہوتی ہے جس جس قدر انسان رُوح کی صفائی کرتا ہے اُسی اُسی قدر عقل میں تیزی پیدا ہوتی ہے اور فرشتہ سامنے کھڑا ہو کر اس کی مدد کرتا ہے مگر فاسقانہ زندگی والے کے دماغ میں روشنی نہیں آسکتی۔ تقویٰ اختیار کرو کہ خدا تمہارے ساتھ ہو۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

مکاشفات اور الہامات کے ابواب کھلنے کے واسطے جلدی نہ کرنی چاہیئے۔ اگر تمام عمر بھی کشوف اور الہامات نہ ہوں تو گھبرانا نہ چاہیئے۔ اگر یہ معلوم کر لو کہ تم میں ایک عاشقِ صادق کی سی محبت ہے جس طرح وہ اس کے ہجر میں اسکے فراق میں بھوکا مرتا ہے پیاس سہتا ہے نہ کھانے کا ہوش ہے نہ پانی کی پرواہ۔ نہ اپنے تن بدن کی کچھ خبر۔ اسی طرح تم بھی خدا کی محبت میں ایسے محو ہو جاؤ کہ تمہارا وجود ہی درمیان سے گم ہو جاوے۔ پھر اگر ایسے تعلق میں انسان مر بھی جاوے تو بڑا ہی خوش قسمت ہے۔ ہمیں تو ذاتی محبت سے کام ہے نہ کشوف سے غرض نہ الہام کی پرواہ۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

ہر یک وحی نبی منزل علیہ کی فطرت کے موافق نازل ہوتی ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزاج میں جلال اور غضب تھا۔ توریت بھی موسوی فطرت کے موافق ایک جلالی شریعت نازل ہوئی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے مزاج میں حلم اور نرمی تھی سو انجیل کی تعلیم بھی حلم اور نرمی پر مشتمل ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج بغایت درجہ وضع استقامت پر واقع تھا۔ نہ ہر جگہ حلم پسند تھا اور نہ ہر مقام غضب مرغوب خاطر تھا بلکہ حکیمانہ طور پر رعایت محل اور موقع کی ملحوظ طبیعت مبارک تھی۔ سو قرآن شریف بھی اسی طرز موزوں و معتدل پر نازل ہوا کہ جامع شدت و رحمت و ہیبت و شفقت و نرمی و درشتی ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۹۷ احاشیہ)

جبکہ خدا نے ظاہری چیزوں کے معلوم کرنے کے لئے ظاہری حواس عطا فرمائے ہیں اور علوم معقولہ کے دریافت کرنے کے لئے جو امور باطنیہ ہیں حواسِ خمسہ باطنی عطا کئے ہیں پس اس صورت میں صاف طور پر سمجھ آسکتا ہے کہ ایسے امور جو عقل سے بالاتر ہیں ان کے دریافت کرنے کے لئے بھی خدا نے کوئی ذریعہ رکھا ہوگا سو وہ ذریعہ وحی اور کشف ہے اور جیسا کہ انسانی فطرت کے لئے یہ دائمی عطیہ ہے کہ بجز ان لوگوں کے جو بہرے اور اندھے یا دیوانے ہوں ہر ایک انسان کو حواسِ خمسہ ظاہری اور باطنی اب بھی حسب تفاوت مراتب عطا ہوتے ہیں یہ نہیں کہ صرف پہلے عطا ہوتے تھے اور

اب نہیں۔ ایسا ہی خدا کا قانونِ قدرت رُوحانی حواس کے لئے بھی اسی کے مطابق ہے کہ اَب بھی وحی اور کشف کے حواس حسبِ مراتب ملتے ہیں اور جو اعلیٰ درجہ کی استعداد رکھتے ہیں وہ ان رُوحانی حواس میں سب سے بڑھ جاتے ہیں اور جو کتاب انسانوں کو یہ تعلیم دے کہ وہ رُوحانی حواس اب نہیں ملتے بلکہ پہلے کسی زمانہ میں مل چکے وہ کتاب خدا کی طرف سے نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ نہ صرف قانونِ قدرت کے برخلاف بلکہ مشاہدہ اور تجربہ کے بھی برخلاف ہے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۳۰۲)

ہر شخص کا کلام اس کی ہمت کے موافق ہوتا ہے جس قدر اس کی ہمت اور عزم اور مقاصد عالی ہوں گے اسی پایہ کا وہ کلام ہوگا۔ سو وحیِ الٰہی میں بھی وہی رنگ ہوگا جس شخص کی طرف اس کی وحی آئی ہے جس قدر ہمت بلند رکھنے والا وہ ہوگا اسی پایہ کا کلام اسے ملے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمت و استعداد اور عزم کا دائرہ چونکہ بہت ہی وسیع تھا اس لئے آپؐ کو جو کلام ملا وہ بھی اس پایہ اور رُتبہ کا ہے کہ دوسرا کوئی شخص اس ہمت اور حوصلہ کا کبھی پیدا نہ ہوگا کیونکہ آپؐ کی دعوت کسی محدود وقت یا مخصوص قوم کے لئے نہ تھی جیسے آپؐ سے پہلے نبیوں کی ہوتی تھی۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

اگر کسی کے دل میں یہ وہم گذرے کہ اب جنگلی آدمیوں کو جو بے زبانی کی حالت میں محض اشارات سے گذارہ کرتے ہیں کیونکر بذریعہ الہام کے کسی بولی سے مطلع نہیں کیا جاتا اور کیوں کوئی بچہ نوزاد جنگل میں رکھنے سے خدا کی طرف سے کوئی الہام نہیں پاتا تو یہ خدا کی صفات کی ایک غلط فہمی ہے کیونکہ القاء اور الہام ایسا امر نہیں ہے کہ جو ہر جگہ جا بے جا بلا لحاظ مادۂ قابلہ کے ہوجایا کرے بلکہ القاء اور الہام کے لئے مادۂ قابلہ کا ہونا نہایت ضروری شرط ہے اور دوسری شرط یہ بھی ہے کہ اس الہام کے لئے ضرورتِ حقہ بھی پائی جائے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۳۵۸ تا ۳۶۱)

وحیِ الٰہی کے انوار قبول کرنے کے لئے فطرتِ قابلہ شرط ہے جس میں وہ انوار منعکس ہوسکیں جو خدائے تعالیٰ کسی وقت اپنے خاص ارادہ سے نازل کرے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۲۳۷ حاشیہ)

یہ عجیب بات ہے کہ بعض اَوقات بعض فقروں میں خدا تعالیٰ کی وحی انسانوں کی بنائی ہوئی صرفی نحوی قواعد کی بظاہر اتباع نہیں کرتی مگر اَدنیٰ توجہ سے تطبیق ہوسکتی ہے اِسی وجہ سے بعض نادانوں نے قرآن شریف پر بھی اپنی مصنوعی نحو کو پیشِ نظر رکھ کر اعتراض کئے ہیں مگر یہ تمام اعتراض بیہودہ ہیں۔ زبان کا علم وسیع خدا کو ہے نہ کسی اَور کو اور زبان جیسا کہ تغیّرِ مکانی سے کسی قدر بدلتی ہے ایسا ہی تغیّرِ زمانی سے بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں آجکل کی عربی زبان کا اگر محاورہ دیکھا جائے جو مصر اور مکہ اور مدینہ اور دیارِ شام وغیرہ میں بولی جاتی ہے تو گویا وہ محاورہ صَرف و نحو کے تمام قواعد کی بیخکنی کر رہا ہے اور ممکن ہے کہ اسی قسم کا محاورہ کسی زمانہ میں پہلے بھی گذر چکا ہو پس خدا تعالیٰ کی وحی کو اِس بات سے کوئی روک نہیں ہے کہ بعض فقرات سے گذشتہ محاورہ یا موجودہ محاورہ کے موافق بیان کرے۔ (نزول المسیح صفحہ ۵۸)

مکالمات اور مخاطبات الٰہیہ سے اِس قسم کے کلمات مراد نہیں ہیں جن کی نسبت خود مُلہم متردد ہو کہ آیا وہ شیطانی ہیں یا رحمانی۔ ایسے بے برکت کلمات جن میں شیطان بھی شریک ہو سکتا ہے شیطانی ہی سمجھنے چاہئیں کیونکہ خدائے تعالیٰ کے روشن اور بابرکت اور لذیذ کلمات شیطان کے کلمات سے مشابہ نہیں ہو سکتے اور جن دلوں میں بباعث طہارت کاملہ شیطان کا کچھ حصّہ نہیں رہتا ان کی وحی میں بھی شیطان کا کچھ حصّہ نہیں رہتا اور شیطان انہیں نجس دلوں پر اُترتا ہے جو شیطان کی طرح اپنے اندر ناپاکی رکھتے ہیں۔ پاک نفسوں پر پاک کا کلام نازل ہوتا ہے اور پلید نفسوں پر پلید کا۔

اور اگر ایک اِنسان اپنے الہام میں متحیّر ہے اور نہیں جانتا کہ وہ شیطان کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے۔ ایسے شخص کا الہام اُس کے لئے آفتِ جان ہے کیونکہ ممکن ہے کہ وہ اس الہام کی بناء پر کسی نیک کو بَد قرار دے حالانکہ وہ الہام شیطان کی طرف سے ہو اور ممکن ہے کہ کسی بَد کو نیک قرار دے حالانکہ وہ سراسر شیطانی تعلیم ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک امر کو جو الہام کے ذریعہ سے اس کو معلوم ہوا ہے خدا کا امر سمجھ کر بجا لاوے حالانکہ وہ شیطان نے حکم دیا ہو اور اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک حکم شیطان کا حکم سمجھ کر ترک کر دے حالانکہ وہ خدا تعالیٰ کا حکم ہو۔

صاف ظاہر ہے کہ بجز ایک قطعی فیصلہ کے یعنی بجز اِس امر کے کہ دِل اِس یقین سے پُر ہو کہ درحقیقت یہ خدا کا کلام ہے اس کے کرنے کے لئے پوری استقامت حاصل نہیں ہو سکتی خصوصاً بعض امور ایسے ہوتے ہیں کہ ظاہر شرع کو ان پر کچھ اعتراض بھی ہوتا ہے جیسا کہ خضر کے کام پر ظاہر شرع کو سراپا اعتراض تھا نبیوں کی تمام شریعتوں میں سے کسی شریعت میں یہ حکم نہیں کہ ایک بے گناہ بچہ کو قتل کر دو پس اگر خضر کو یہ یقین نہ ہوتا کہ یہ وحی خدا کی طرف سے ہے تو وہ کبھی قتل نہ کرتا اور اگر موسیٰؑ کی ماں کو یقین نہ ہوتا کہ اُس کی وحی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے تو کبھی اپنے بچہ کو دریا میں نہ ڈالتی۔

اب ظاہر ہے کہ ایسا الہام کس طرح فخر کے لائق ہو سکتا اور کس طرح اس کے ضرر سے انسان امن میں رہ سکتا ہے جس کی نسبت کبھی تو اُس کا یہ خیال ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور کبھی یہ خیال ہے کہ شیطان کی طرف سے ہے۔ ایسا الہام تو آفتِ جان اور آفتِ ایمان ہے بلکہ ایک بَلا ہے جس سے کبھی نہ کبھی وہ ہلاک ہو سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ اپنے ان بندوں کو جو تعلقاتِ نفسِ امّارہ سے الگ ہو کر محض اُس کے ہو جاتے ہیں اور اس کی محبت کی آگ سے تمام ماسوا اللہ کو جلا دیتے ہیں وہ اپنے ایسے بندوں کو شیطان کے پنجہ میں گرفتار کرے اور سچ تو یہ ہے کہ جس طرح روشنی اور تاریکی میں فرق ہے اسی طرح شیطانی وساوس اور خدا تعالیٰ کی پاک وحی میں فرق ہے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۱۴۱، ۱۴۲)

الہام کچھ شئے نہیں جب تک کہ انسان اپنے تئیں شیطان کے دخل سے پاک نہ کرلے اور بے جا تعصبوں اور کینوں اور حسدوں سے اور ہر ایک خدا کو ناراض کرنے والی بات سے اپنے آپ کو صاف نہ کرلے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۸ مورخہ ۱۷ رمئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۳)

اِس بات کو کبھی بھولنا نہیں چاہیئے کہ رؤیا اور الہام پر مدار صلاحیت نہیں رکھنا چاہیئے۔ بہت سے آدمی دیکھے گئے ہیں کہ ان کو رؤیا اور الہام ہوتے رہے لیکن انجام اچھا نہیں ہؤا جو اعمالِ صالحہ کی صلاحیت پر موقوف ہے۔ اس تنگ دروازہ سے جو صدق ووفا کا دروازہ ہے گذرنا آسان نہیں۔ ہم کبھی ان باتوں سے فخر نہیں کرسکتے کہ رؤیا یا الہام ہونے لگے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہیں اور مجاہدات سے کشش ہو رہیں اللہ تعالیٰ اس کو پسند نہیں کرتا۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۸، ۱۹ مورخہ ۸؍ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۰)

محض الہام جب تک اس کے ساتھ فعلی شہادت نہ ہو ہرگز کسی کام کا نہیں۔ دیکھو جب کفار کی طرف سے اعتراض ہؤا لَسْتَ مُرْسَلًا[1] تو جواب دیا گیا کَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ[2] یعنی عنقریب خدا تعالیٰ کی فعلی شہادت میری صداقت کو ثابت کر دے گی پس الہام کے ساتھ فعلی شہادت بھی چاہیئے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۵؍ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

اِنسان کو چاہیئے کہ اپنا فرض ادا کرے اور اعمالِ صالحہ میں ترقی کرے۔ الہام کرنا اور رؤیا دکھانا یہ تو خدا تعالیٰ کا فعل ہے اس پر ناز نہیں کرنا چاہیئے۔ اپنے اعمال کو درست کرنا چاہیئے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۷؍ نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۳)

الہام وحی تو خدا تعالیٰ کا فعل ہے کوئی انسانی عمل نہیں۔ خدا تعالیٰ کے فعل پر اپنا فخر جاننا اور خوش ہونا جاہل کا کام ہے۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو کہ آپ بعض دفعہ رات کو اِس قدر عبادت میں کھڑے ہوتے تھے کہ پاؤں پر ورم ہو جاتا تھا ساتھی نے عرض کی کہ آپؐ تو گناہوں سے پاک ہیں اِس قدر محنت پھر کس لئے۔ فرمایا اَفَلَآ اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا کیا میں شکرگزار نہ بنوں۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۲ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

جب تک اِنسان اپنے نفسانی جذبات اور خودی سے فنا نہ ہو جاوے تب تک خواہ الہام بھی ہو اور کشوف بھی دکھائے جائیں مگر کسی کام کے نہیں ہیں کیونکہ بجز اِس کے کہ خدا میں اپنے آپ کو فنا کر دیا جاوے۔ یہ امور عارضی ہوتے ہیں اور دیرپا نہیں ہوتے اور ان کی کچھ بھی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۳ مورخہ ۲۶؍ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

یہ دعویٰ ہمارا بالکل صحیح اور نہایت صفائی سے ثابت ہے کہ صراطِ مستقیم پر چلنے سے طالبِ صادق الہامِ الٰہی پاسکتا ہے کیونکہ اوّل تو اس پر تجربہ ذاتی شاہد ہے۔ ماسوائے اس کے ہر یک عاقل سمجھ سکتا ہے کہ اِس دُنیا میں اِس سے بڑھ کر اَور کوئی معرفتِ الٰہی کا اعلیٰ رتبہ نہیں ہے کہ انسان اپنے ربّ کریم جلّ شانہٗ سے ہم کلام ہو جائے یہی رتبہ

---

[1] [2] سورۃ الرعد: ۴۴

ہے جس سے رُوحیں تسلّی پاتی ہیں اور سب شکوک و شبہات دُور ہو جاتے ہیں اور اس درجہ صافیہ پر پہنچ کر انسان اس دقیقہ معرفت کو پالیتا ہے جس کی تحصیل کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے اور دراصل نجات کی کُنجی اور ہستی موہوم کا عُقدہ کُشا یہی درجہ ہے جس سے ثابت ہوتا ہے اور کُھل جاتا ہے کہ خالقِ حقیقی کو اپنی مخلوقِ ضعیف سے کس قدر قُرب واقع ہے۔ اس درجہ تک پہنچنے کی خبر ہمیں اس نور نے دی ہے جس کا نام قرآن ہے۔ وہ نور صاف عام طور پر بشارت دیتا ہے کہ الہام کا چشمہ کبھی بند نہیں ہو سکتا۔ جب کوئی مشرق کا رہنے والا یا مغرب کا باشندہ دِلی صفائی سے خدائے تعالےٰ کو ڈھونڈے گا اور اس سے پوری پوری صلح کرے گا اور درمیان کے حجاب اُٹھائے گا تو ضرور اُسے پائے گا اور جب واقعی اور سچے اور کامل طور پر پائے گا تو ضرور خدا اُس سے ہم کلام ہوگا۔ (سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۹۱، ۱۹۲)

بے شک یہ بات سب کے فہم میں آسکتی ہے کہ انسان اپنی اِس غافلانہ زندگی میں جو ہردم تحت الثریٰ کی طرف کھینچ رہی ہے اور علاوہ اس کے تعلقات زن و فرزند اور ننگ و ناموس کے بوجھل اور بھاری پتھر کی طرح ہر لحظہ نیچے کی طرف لے جا رہے ہیں ایک بالائی طاقت کا ضرور محتاج ہے جو اس کو سچی بینائی اور سچا کشف بخش کر خدا تعالےٰ کے جمال باکمال کا مشتاق بنا دیوے۔ سو جاننا چاہیئے کہ وہ بالائی طاقت الہامِ ربّانی ہے جو عین دُکھ کے وقت میں سرور پہنچاتا ہے اور مصائب کے ٹیلوں اور پہاڑوں کے نیچے بڑے آرام اور لذت کے ساتھ کھڑا کر دیتا ہے وہ دقیق در دقیق وجود جس نے عقلی طاقتوں کو خیرہ کر رکھا ہے اور تمام حکیموں کی عقل اور دانش کو سکتہ میں ڈال دیا ہے وہ الہام ہی کے ذریعہ سے کچھ اپنا پتہ دیتا ہے اور اَنَا الموجود کہہ کر سالکوں کے دلوں کو تسلّی بخشتا ہے اور سکینت نازل کرتا ہے اور انتہائی وصول کی ٹھنڈی ہوا سے جانِ پژمُردہ کو تازگی بخشتا ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۴۲۹، ۴۳۰)

خدا نے اپنے بدیہی کاموں کو نظری کاموں کے کھولنے کے لئے بطور گواہ کے پیش کیا ہے گویا وہ فرماتا ہے کہ اگر تم ان خواص سے شک میں ہو جو نفسِ ناطقہ انسانی میں پائے جاتے ہیں تو چاند اور سُورج وغیرہ میں غور کرو کہ ان میں بدیہی طور پر یہ خواص موجود ہیں اور تم جانتے ہو کہ انسان ایک عالمِ صغیر ہے جس کے نفس میں تمام عالَم کا نقشہ اجمالی طور پر مرکوز ہے۔ پھر جب یہ ثابت ہے کہ عالمِ کبیر کے بڑے بڑے اجرام یہ خواص اپنے اندر رکھتے ہیں اور اسی طرح پر مخلوقات کو فیض پہنچا رہے ہیں تو انسان جو ان سب سے بڑا کہلاتا ہے اور بڑے درجہ کا پیدا کیا گیا ہے وہ کیونکر ان خواص سے خالی اور بے نصیب ہوگا۔ نہیں۔ بلکہ اس میں بھی سُورج کی طرح ایک علمی اور عقلی روشنی ہے جس کے ذریعہ سے وہ تمام دُنیا کو منوّر کر سکتا ہے اور چاند کی طرح وہ حضرتِ اعلیٰ سے کشف اور الہام اور وحی کا نور پاتا ہے اور دوسروں تک جنہوں نے انسانی کمال ابھی تک حاصل نہیں کیا اس نور کو پہنچاتا ہے پھر کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ نبوت باطل ہے اور تمام رسالتیں اور شریعتیں اور کتابیں انسان کی مکاری اور خود غرضی ہے۔ یہ بھی دیکھتے ہو کہ کیونکر دن کے روشن ہونے سے تمام راہیں روشن ہو جاتی ہیں۔ تمام نشیب و فراز نظر آجاتے ہیں۔ سو کامل انسان رُوحانی

روشنی کا دن ہے اس کے چڑھنے سے ہر ایک راہ نمایاں ہوجاتی ہے۔ وہ سچی راہ کو دکھلا دیتا ہے کہ کہاں اور کدھر ہے کیونکہ راستی اور سچائی کا وہی روزِ روشن ہے۔ ایسا ہی یہ بھی مشاہدہ کر رہے ہیں کہ رات کیسی تھکوں ماندوں کو جگہ دیتی ہے۔ تمام دن کے شکستہ کوفتہ مزدور رات کے کنارِ عاطفت میں بخوشی سوتے ہیں اور محنتوں سے آرام پاتے ہیں اور رات ہر ایک کے لئے پَردہ پوش بھی ہے۔ ایسا ہی خدا کے کامل بندے دُنیا کو آرام دینے کے لئے آتے ہیں خدا سے وحی اور الہام پانے والے تمام عقلمندوں کو جانکاہی سے آرام دیتے ہیں۔ ان کے طفیل سے بڑے بڑے معارف آسانی کے ساتھ حل ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی خدا کی وحی انسانی عقل کی پَردہ پوشی کرتی ہے جیسا کہ رات پردہ پوشی کرتی ہے اس کی ناپاک خطاؤں کو دُنیا پر ظاہر ہونے نہیں دیتی کیونکہ عقلمند وحی کی روشنی پاکر اندر ہی اندر اپنی غلطیوں کی اصلاح کر لیتے ہیں اور خدا کے پاک الہام کی برکت سے اپنے تئیں پَردہ دری سے بچالیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افلاطون کی طرح اِسلام کے کسی فلاسفر نے کسی بُت پر مُرغ کی قربانی نہ چڑھائی۔ چونکہ افلاطون الہام کی روشنی سے بے نصیب تھا اِسلئے دھوکا کھا گیا اور ایسا فلاسفر کہلا کر یہ مکروہ اور احمقانہ حرکت اس سے صادر ہوئی مگر اسلام کے حکماء کو ایسے ایسے ناپاک اور احمقانہ حرکتوں سے ہمارے سیدومولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پَیروی نے بچا لیا۔ اب دیکھو کیسا ثابت ہُوا کہ الہام عقلمندوں کا رات کی طرح پَردہ پوش ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۱۲ تا ۱۱۴)

وہ نور جس سے اِنسان کی آنکھ کُھل کر اس کو ایقانِ تام حاصل ہو جاوے وہ صرف الہام ہی پر منحصر ہے۔ الہام سے انسان کو ایک نور ملتا ہے جس سے وہ ہر تاریکی سے مبّرا ہو جاتا ہے اور ایک قسم کا اطمینان اور تسلّی اسے ملتی ہے۔ اس کا نفس اس دن سے خدا میں آرام پانے لگتا ہے اور ہر گناہ و فسق و فجور سے اس کا دِل ٹھنڈا ہوتا جاتا ہے۔ اس کا دِل امّید اور بیم سے بھر جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی حقیقی معرفت کی وجہ سے وہ ہر وقت ترساں لرزاں رہتا ہے اور زندگی کو ناپائیدار جانتا اور سفلی لذّات کی ہَوس اور خواہش کو ترک کر کے خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول میں لگ جاتا ہے اور درحقیقت وہ اسی وقت گناہ کی آلودگی سے علیحدہ ہوتا ہے۔

جب تک تازہ نور انسان کو آسمان پر سے نہ ملے اور خدا تعالیٰ کا مشاہدہ نہ ہو جاوے تب تک پورا ایمان نہیں ہوتا۔ جب تک ایمان کمال درجہ تک نہ پہنچا ہو تب تک گناہ کی قید سے رہائی ناممکن ہے۔ بجز الہام کے ایمان کی تصویر لوگوں کے پاس ہوتی ہے اس کی ماہیت سے لوگ بے بہرہ اور خالی محض ہوتے ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

اس مسلمان سے کون زیادہ بدنصیب ہے جس کو خدا تعالیٰ وعدہ دیتا ہے کہ مَیں اپنے کلام سے مشرّف کروں گا مگر وہ اس کی طرف توجہ نہ کرے۔ یہ خدا تعالیٰ کا بڑا فضل ہے اور اسلام سے خاص ہے کسی آریہ سے پوچھو کہ تم وعدہ ہی دکھاؤ وہ یہ بھی نہیں دکھا سکتے۔ ماتم زدہ اور مُردہ وہ مذہب ہے جس کے الہام پر مُہر لگ گئی اور ویران اور اُجڑا ہوُا

وہ باغ ہے جس پر خزاں کا قبضہ ہو چکا لیکن ربیع کا اثر اس پر نہیں ہو سکتا۔

کیسے افسوس اور تعجب کا مقام ہے کہ انسانی فطرت پر تو مُہر نہ لگی۔ اس میں تو معرفتِ حقیقی کی وہی بھوک پیاس موجود ہے لیکن الہام پر مُہر لگا دی گئی جو معرفتِ الٰہی کا سرچشمہ تھا۔ افسوس بھوک میں غذا پھینک دی گئی اور پیاس کی حالت میں پانی لے لیا گیا۔ (الحکم جلد ۱۱ ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۷)

کوئی قانون عاصم ہمارے پاس ایسا نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ سے ہم قطعاً غلطی سے بچ سکیں اور یہی باعث ہے کہ جن حکیموں نے قواعد منطق کے بنائے اور مسائل مناظرہ کے ایجاد کئے اور دلائل فلسفہ کے گھڑے وہ بھی غلطیوں میں ڈوبتے رہے اور صدہا طور کے باطل خیال اور جھوٹا فلسفہ اور نکمی باتیں اپنی نادانی کے یادگار میں چھوڑ گئے۔ پس اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ اپنی ہی تحقیقات سے جمیع امورِ حقّہ اور عقائدِ صحیحہ پر پہنچ جانا اور کہیں غلطی نہ کرنا ایک محال عادی ہے کیونکہ آج تک ہم نے کوئی فردِ بشر ایسا نہیں دیکھا اور نہ سُنا اور نہ کسی تاریخی کتاب میں لکھا ہوا پایا کہ جو اپنی تمام نظر اور فکر میں سہو اور خطا سے معصوم ہو۔ پس بذریعہ قیاس استقرائی کے یہ صحیح اور سچا نتیجہ نکلتا ہے کہ وجود ایسے اشخاص کا کہ جنہوں نے صرف قانونِ قدرت میں فکر اور غور کر کے اور اپنے ذخیرۂ کانشنس کو واقعاتِ عالَم سے مطابقت دے کر اپنی تحقیقات کو ایسے اعلیٰ پایۂ صداقت پر پہنچا دیا ہو کہ جس میں غلطی کا نکلنا غیر ممکن ہو۔ خود عادتاً غیر ممکن ہے..... صاف ظاہر ہے کہ جس حالت میں نہ خود انسان اپنے علم اور واقفیت سے غلطی سے بچ سکے اور نہ خدا (جو رحیم اور کریم اور ہر ایک سہو و خطا سے مبرّا اور ہر امر کی اصل حقیقت پر واقف ہے) بذریعہ اپنے سچّے الہام کے اپنے بندوں کی مدد کرے تو پھر ہم عاجز بندے کیونکر ظلماتِ جہل اور خطا سے باہر آویں اور کیونکر آفاتِ شک و شبہ سے نجات پائیں۔ للہذا مَیں مستحکم رائے سے یہ بات ظاہر کرتا ہوں کہ مقتضاء حکمت اور رحمت اور بندہ پروری اُس قادرِ مطلق کا یہی ہے کہ وقتاً فوقتاً جب مصلحت دیکھے ایسے لوگوں کو پیدا کرتا رہے کہ عقائدِ حقّہ کے جاننے اور اخلاقِ صحیحہ کے معلوم کرنے میں خدا کی طرف سے الہام پائیں اور تفہیم تعلیم کا ملکہ وہبی رکھیں تا کہ نفوسِ بشریہ کہ سچی ہدایت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اپنی سعادتِ مطلوبہ سے محروم نہ رہیں۔ (پُرانی تحریریں صفحہ ۱۸، ۱۹)

اِنسان ہمیشہ چشم دید ماجرا اور ذاتی بصیرت کا محتاج ہے۔ مذہب اسی زمانہ تک علم کے رنگ میں رہ سکتا ہے جب تک خدا تعالیٰ کی صفات ہمیشہ تازہ بتازہ تجلّی فرماتی رہیں ورنہ کہانیوں کی صورت میں ہو کر جلد مر جاتا ہے کیا ایسی ناکامی کو کوئی انسانی کانشنس قبول کر سکتا ہے جیسا کہ ہم اپنے اندر اِس بات کا احساس پاتے ہیں کہ ہم اس معرفتِ تامہ کے محتاج ہیں جو کسی طرح بغیر مکالمہ الٰہیہ اور بڑے بڑے نشانوں کے پوری نہیں ہو سکتی تو کس طرح خدا تعالیٰ کی رحمت ہم پر الہامات کا دروازہ بند کر سکتی ہے۔ کیا اس زمانہ میں ہمارے دِل اَور ہو گئے ہیں یا خدا اَور ہو گیا ہے۔ یہ تو ہم نے مانا اور قبول کیا کہ ایک زمانہ میں ایک کا الہام لاکھوں کی معرفت کو تازہ کر سکتا ہے اور فرد فرد

میں ہونا ضروری نہیں لیکن یہ ہم قبول نہیں کرسکتے کہ الہام کی سرے سے صَف ہی اُلٹ دی جائے اور ہمارے ہاتھ میں صرف ایسے قصے ہوں جن کو ہم نے بچشمِ خود دیکھا نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک امر صدہا سال سے قصے کی صورت میں ہی چلا جائے اور اس کی تصدیق کے لئے کوئی تازہ نمونہ پیدا نہ ہو تو اکثر طبیعتیں جو فلسفی رنگ اپنے اندر رکھتی ہیں اس قصے کو بغیر قوی دلیل کے قبول نہیں کرسکتیں خاص کر جبکہ قصے ایسی باتوں پر دلالت کریں کہ جو ہمارے زمانہ میں خلافِ قیاس معلوم ہوں یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ہمیشہ فلسفی طبع آدمی ایسی کرامتوں پر ٹھٹھا کرتے آئے ہیں اور شُبہ کی حد تک بھی نہیں ٹھہرتے اور یہ ان کا حق بھی ہوتا ہے کیونکہ ان کے دل میں گذرتا ہے کہ جب کہ وہی خدا ہے اور وہی صفات اور وہی ضرورتیں ہمیں پیش ہیں تو پھر الہام کا سلسلہ کیوں بند ہے حالانکہ تمام رُوحیں شور ڈال رہی ہیں کہ ہم بھی تازہ معرفت کے محتاج ہیں اِسی وجہ سے ہندوؤں میں لاکھوں انسان دہریّہ ہوگئے کیونکہ بار بار پنڈتوں نے ان کو یہی تعلیم دی کہ کروڑہا سال سے الہام اور کلام کا سلسلہ بند ہے۔ اب ان کو یہ شبہات دِل میں گذرے کہ وید کے زمانہ کی نسبت ہمارا زمانہ پرمیشر کے تازہ الہامات کا بہت محتاج تھا۔ پھر اگر الہام ایک حقیقتِ حقہ ہے تو وید کے بعد اس کا سلسلہ کیوں قائم نہ رہا اِسی وجہ سے آریہ ورت میں دہریّت پھیل گئی۔ (ضرورت الامام صفحہ ۲۰)

بنی نوع انسان کا ایمان تازہ رکھنے کے لئے تازہ الہامات کی ہمیشہ ضرورت ہے اور وہ الہامات اِقتداری قوت سے شناخت کئے جاتے ہیں کیونکہ خدا کے سوا کسی شیطان جِنّ بھوت میں اقتداری قوت نہیں ہے اور امام الزمان کے الہام سے باقی الہامات کی صحت ثابت ہوتی ہے۔ (ضرورت الامام صفحہ ۲۲)

وہ خدا جو اس دُنیا کا بنانے والا اور آئندہ زندگی کی جاودانی امیدیں اور بشارتیں دینے والا ہے اس کا قدیم سے یہ قانونِ قدرت ہے کہ غافل لوگوں کی معرفت زیادہ کرنے کے لئے بعض اپنے بندوں کو اپنی طرف سے الہام بخشتا ہے اور ان سے کلام کرتا ہے اور اپنے آسمانی نشان اُن پر ظاہر کرتا ہے اور اس طرح وہ خدا کو رُوحانی آنکھوں سے دیکھ کر اور یقین اور محبت سے معمور ہو کر اِس لائق ہو جاتے ہیں کہ وہ دوسروں کو بھی اُس زندگی کے چشمہ کی طرف کھینچیں جس سے وہ پیتے ہیں تا غافل لوگ خدا سے پیار کرکے اَبدی نجات کے مالک ہوں اور ہر ایک وقت میں جب دُنیا میں خدا کی محبت ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور غفلت کی وجہ سے حقیقی پاک باطنی میں فتور آتا ہے تو خدا کسی کو اپنے بندوں میں سے اِلہام دے کر دلوں کو صاف کرنے کے لئے کھڑا کر دیتا ہے۔ سو اس زمانہ میں اس کام کے لئے جس شخص کو اُس نے اپنے ہاتھ سے صاف کرکے کھڑا کیا ہے وہ یہی عاجز ہے۔ (کشف الغطاء صفحہ ۱۰، ۱۱)

ہر ایک آدمی چونکہ عقل سے مدارجِ یقین پر نہیں پہنچ سکتا اِس لئے اِلہام کی ضرورت پڑتی ہے جو تاریکی میں عقل کے لئے ایک روشن چراغ ہو کر مدد دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے فلاسفر بھی محض عقل پر بھروسہ کرکے حقیقی خدا کو نہ پاسکے۔ چنانچہ افلاطون جیسا فلاسفر بھی مرتے وقت کہنے لگا کہ میں ڈرتا ہوں ایک بُت پر میرے لئے ایک مُرغا

ذبح کرو۔ اِس سے بڑھ کر اَور کیا بات ہوگی۔ افلاطون کی فلاسفی۔ اس کی دانائی اور دانشمندی اُس کو وہ سچی سکینت اور اطمینان نہ دے سکے جو مومنوں کو حاصل ہے۔ یہ خوب یاد رکھو کہ الہام کی ضرورت قلبی اطمینان اور دلی استقامت کیلئے اشد ضروری ہے میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے عقل سے کام لو اور یہ یاد رکھو کہ جو عقل سے کام لے گا اِسلام کا خدا اسے ضرور ہی نظر آجائے گا کیونکہ درختوں کے پتے پتے پر اور آسمان کے اجرام پر اس کا نام بڑے جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے لیکن بالکل عقل ہی کے تابع نہ بن جاؤ تاکہ الہامِ الٰہی کی وقعت کو نہ کھو بیٹھو جس کے بغیر نہ حقیقی تسلّی اور نہ اخلاقِ فاضلہ نصیب ہو سکتے ہیں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۷۲)

ایک شہر میں پہنچ کر انسان پھر بھی کسی خاص جگہ پر پہنچنے کے واسطے کسی راہبر کا محتاج ہوتا ہے تو کیا دین کی راہ معلوم کرنے اور خدا کی مرضی پانے کے واسطے اِنسانی ڈھکوسلے کام آسکتے ہیں؟ اور کیا سفلی عقل کافی ہو سکتی ہے؟ ہرگز ہرگز نہیں۔ جب تک اللہ تعالیٰ خود اپنی راہ کو نہ بتاوے اور اپنی مرضی کے وسائل کے حصول کے ذریعہ سے مطلع نہ کرے تب تک انسان کچھ کر نہیں سکتا۔ دیکھو جب تک آسمان سے پانی نازل نہ ہو زمین بھی اپنا سبزہ نہیں نکالتی گو بیج اس میں موجود ہی کیوں نہ ہو بلکہ زمین کا پانی بھی دُور چلا جاتا ہے تو کیا رُوحانی بارش کے بغیر ہی رُوحانی زمین سرسبز ہو جاتی اور بار آور ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ خدا کے الہام کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳)

خدا تعالیٰ ابتداء زمانہ میں بولا کہ مَیں تیرا خدا ہوں ایسا ہی اخیر زمانہ میں بھی اس نے فرمایا اَنَا الموجود یاد رکھو کہ وہ "ہادی" ہے اگر چھوڑ دے تو سب دہریہ بن جائیں۔ پس وہ اپنی ہستی کا ثبوت دیتا رہتا ہے اور یہ زمانہ تو بالخصوص اِس بات کا محتاج ہے۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۶ مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۰۸ء صفحہ ۵/۴)

یہ اِنسان میں ایک فطرتی خاصیت ہے کہ اگر اپنے وجود کے تمام زور اور تمام قوت سے ایک چیز کو ڈھونڈنے اور طلب کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے اور پھر بھی وہ چیز میسّر نہ آوے تو اس چیز کے وجود کی نسبت اس کا اعتقاد قائم نہیں رہتا بالخصوص اگر کسی ایسے شخص کو ڈھونڈتا ہو جس کی نسبت اس کا یہ اعتقاد بھی ہو کہ وہ میری اس کوشش اور اضطراب سے واقف ہے اور میری اس بیقراری پر مطلع ہے تو پھر اگر اس کی طرف سے کوئی پیغام نہ پہنچے تو بلاشبہ انکار اور نومیدی کا موجب ہو گا۔ پس اِس تحقیق کی رُو سے یہ ثابت شدہ امر ہے کہ خدا تعالیٰ پر سچا یقین بغیر ذریعہ وحی اور الہام کے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ (ستؔ بچن صفحہ ۱۵۲)

عقلمند لوگ خدائے تعالیٰ کے فیاض مطلق ہونے پر ایمان لا کر الہامی دروازوں کو ہمیشہ کُھلا سمجھتے ہیں اور کِسی ولائت اور مُلک سے اُس کو مخصوص نہیں رکھتے ہاں اس صراطِ مُستقیم سے مخصوص رکھتے ہیں جس پر ٹھیک ٹھیک چلنے سے یہ برکات حاصل ہوتے ہیں کیونکہ ہر یک چیز کے حصول کے لئے یہ لازم پڑا ہوا ہے کہ انہیں قواعد اور

طریقوں پر عمل کیا جائے جن کی پابندی سے وہ چیز مل سکتی ہے۔ (سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۲۸ حاشیہ)

اے غافلو اس اُمّتِ مرحومہ میں وحی کی نالیاں قیامت تک جاری ہیں مگر حسبِ مراتب۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۴۲۲)

اِسلام کے زندہ ہونے کا ثبوت اور نبوت کی یقینی حقیقت جو ہمیشہ ہر ایک زمانہ میں منکرینِ وحی کو ساکت کر سکے اُسی حالت میں قائم رہ سکتی ہے کہ سلسلہ وحی برنگ محدثیت ہمیشہ کے لئے جاری رہے سو اس نے ایسا ہی کیا۔

(برکات الدعا صفحہ ۲۳)

یقیناً سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا اپنے بندوں پر بڑا احسان یہی ہے کہ وہ اِسلام کو مُردہ مذہب رکھنا نہیں چاہتا بلکہ ہمیشہ یقین اور معرفت اور الزام خصم کے طریقوں کو کُھلا رکھنا چاہتا ہے۔ بھلا تم آپ ہی سوچو کہ اگر کوئی وحیٔ نبوت کا منکر ہو اور یہ کہے کہ ایسا خیال تمہارا سراسر وہم ہے تو اس کے مونہہ بند کرنے والی بجز اس کے نمونہ دکھلانے کے اَور کونسی دلیل ہو سکتی ہے؟ کیا یہ خوش خبری ہے یا بدخبری کہ آسمانی برکتیں صرف چند سال اِسلام میں رہیں اور پھر وہ خشک اور مُردہ مذہب ہو گیا؟ اور کیا ایک سچے مذہب کے لئے یہی علامتیں ہونی چاہئیں۔

(برکات الدعا صفحہ ۲۵)

فَتَدَبَّرْ اَيُّهَا الْمُنْصِفُ الْعَاقِلُ. كَيْفَ لَا يَجُوْزُ مُكَالَمَاتُ اللّٰهِ بِبَعْضِ رِجَالِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الَّتِيْ هِيَ خَيْرُ الْاُمَمِ وَقَدْ كَلَّمَ اللّٰهُ نِسَاءَ قَوْمٍ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَقَدْ اٰتَاكُمْ مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ۔

(حمامة البشرٰی صفحہ ۷۹)

یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے کہ خدا کا کلام کرنا آگے نہیں بلکہ پیچھے رہ گیا ہے نہ ہم اس کے کلام اور مخاطبات پر کسی زمانہ تک مُہر لگاتے ہیں۔ بیشک وہ اب بھی ڈھونڈنے والوں کو الہامی چشمہ سے مالا مال کرنے کو تیار ہے جیسا کہ پہلے تھا اور اب بھی اس کے فیضان کے ایسے دروازے کُھلے ہیں جیسے کہ پہلے تھے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵۲، ۵۳)

مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ میری جماعت میں اس قسم کے مُلہم اس قدر ہیں کہ بعض کے الہامات کی ایک کتاب بنتی ہے سید امیر علی شاہ ہر ایک ہفتہ کے بعد الہامات کا ایک ورق بھیجتے ہیں اور بعض عورتیں میری مصدق ہیں جنہوں نے ایک حرف عربی کا نہیں پڑھا اور عربی میں الہام ہوتا ہے۔ (ضرورت الامام صفحہ ۳۰)

ترجمہ از مرتب:۔ اے عقلمند اور منصف مزاج تُو غور کر کہ اس بہترین اُمّت کے بعض مَردوں کے ساتھ خدا تعالےٰ کے مکالمات کیوں جائز نہیں بحالیکہ اللہ تعالیٰ نے پہلی قوموں کی بعض عورتوں سے بھی کلام کیا اور تمہارے پاس پہلوں کی مثالیں موجود ہیں۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۷۹)

اگر ایک شخص اپنی نابینائی سے میری وحی سے منکر ہے تاہم اگر وہ مسلمان کہلاتا ہے اور پوشیدہ دہریہ نہیں تو اسکے ایمان میں یہ بات داخل ہونی چاہیئے کہ یقینی قطعی مکالمہ الٰہیہ ہوسکتا ہے اور جیسا کہ خدا تعالیٰ کی وحی یقینی پہلی امتوں میں اکثر مردوں اور عورتوں کو ہوتی رہی ہے اور وہ نبی بھی نہ تھے اِس اُمت میں بھی اس یقینی اور قطعی وحی کا وجود ضروری ہے تا یہ اُمت بجائے افضل الامم ہونے کے اخر الامم نہ ٹھہر جائے۔ (نزول المسیح صفحہ ۸۹)

کوئی چیز اپنی صفاتِ ذاتیہ سے الگ نہیں ہوسکتی پھر خدا کا کلام جو زندہ کلام ہے کیونکر الگ ہوسکے۔ پس کیا تم کہہ سکتے ہو کہ آفتابِ وحی اگرچہ پہلے زمانوں میں یقینی رنگ میں طلوع کرتا رہا ہے مگر اب وہ صفائی اس کو نصیب نہیں گویا یقینی معرفت تک پہنچنے کا کوئی سامان آگے نہیں رہا بلکہ پیچھے رہ گیا ہے اور گویا خدا کی سلطنت اور حکومت اور فیض رسانی کچھ تھوڑی مدت تک رہ کر ختم ہوچکی ہے لیکن خدا کا کلام اس کے برخلاف گواہی دیتا ہے کیونکہ وہ یہ دُعا سکھلاتا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ[1] (نزول المسیح صفحہ ۱۰۹)

قرآن شریف پر شریعت ختم ہوگئی مگر وحی ختم نہیں ہوئی کیونکہ وہ سچے دین کی جان ہے۔ جس دین میں وحیٔ الٰہی کا سلسلہ جاری نہیں وہ دین مُردہ ہے اور خدا اس کے ساتھ نہیں۔ (کشتی نوح صفحہ ۲۲ حاشیہ)

یہ خیال مت کرو کہ خدا کی وحی آگے نہیں بلکہ پیچھے رہ گئی ہے اور رُوح القدس اَب اُتر نہیں سکتا بلکہ پہلے زمانوں میں ہی اُتر چکا اور مَیں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ ہر ایک دروازہ بند ہوجاتا ہے مگر رُوح القدس کے اُترنے کا کبھی دروازہ بند نہیں ہوتا تم اپنے دِلوں کے دروازے کھول دو تا وہ ان میں داخل ہو۔ تم اس آفتاب سے خود اپنے تئیں دُور ڈالتے ہو جبکہ اس شعاع کے داخل ہونے کی کھڑکی کو بند کرتے ہو۔ اے نادان اُٹھ اور اس کھڑکی کو کھول دے تب آفتاب خود بخود تیرے اندر داخل ہوجائے گا جبکہ خدا نے دُنیا کے فیضوں کی راہیں اس زمانہ میں تم پر بند نہیں کیں بلکہ زیادہ کیں تو کیا تمہارا ظن ہے کہ آسمان کے فیوض کی راہیں جن کی اس وقت تمہیں بہت ضرورت تھی وہ تم پر اُس نے بند کر دی ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ بہت صفائی سے وہ دروازہ کھولا گیا ہے۔ (کشتی نوح صفحہ ۲۲، ۲۳)

تم صدق اور راستی اور تقویٰ اور محبتِ ذاتیہ الٰہیہ میں ترقی کرو اور اپنا کام یہی سمجھو جب تک زندگی ہے پھر خدا تم میں سے جس کی نسبت چاہے گا اُس کو اپنے مکالمہ مخاطبہ سے بھی مشرف کرے گا تمہیں ایسی تمنا بھی نہیں چاہیئے تا نفسانی تمنا کی وجہ سے سلسلہ شیطانیہ شروع نہ ہوجائے جس سے کئی لوگ ہلاک ہوجاتے ہیں۔ (کشتی نوح صفحہ ۲۶)

متابعتِ نبویؐ سے نعمتِ وحی حاصل کرنے کے لئے قیامت تک دروازے کُھلے ہیں۔ وہ وحی جو اتباع کا نتیجہ ہے کبھی منقطع نہیں ہوگی مگر نبوتِ شریعت والی یا نبوتِ مستقلہ منقطع ہوچکی ہے۔ (ریویو مباحثہ بٹالوی وچکڑالوی صفحہ ۶)

---

[1] سُورۃ الفاتحہ: ۶، ۷

جبکہ خدا تعالیٰ کا جسمانی قانون ہمارے لئے اَب بھی وہی موجود ہے جو پہلے تھا تو پھر رُوحانی قانونِ قدرت اس زمانہ میں کیوں بدل گیا؟ نہیں ہرگز نہیں بدلا پس وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ وحیٔ الٰہی پر آئندہ کے لئے مُہر لگ گئی ہے وہ سخت غلطی پر ہیں۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۷۲)

یاد رکھو خدا تعالیٰ ہرگز ایسے شخص کو ضائع نہیں کرتا جو اس کی جُستجو میں قدم رکھتا ہے وہ یقیناً ہے اور جیسے ہمیشہ سے اس نے اَنَا الْمَوْجُوْدُ کہا ہے اَب بھی کہتا ہے۔ جس طرح حضرت مسیح پر وحی ہوتی تھی اسی طرح اب بھی ہوتی ہے۔ مَیں سچ کہتا ہوں یہ نرا دعوٰی نہیں اس کے ساتھ روشن دلائل ہیں کہ پہلے کیا تھا جو اَب نہیں۔ اَب بھی وہی خدا ہے جو سدا سے کام کرتا چلا آیا ہے۔ اس نے اب بھی دُنیا کو اپنے کلام سے منوّر کیا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

سچی معرفت بغیر مخاطباتِ الٰہیہ کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ بات اِس اُمّت کو حاصل نہیں تو خیرِ اُمّت کس طرح سے بن گئی۔ اللہ تعالیٰ نے مخاطبات کا دروازہ بند نہیں کیا ورنہ نجات کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہتا۔

(بدر جلد ۱ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۶ر نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

یہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے وحی اور الہام کے دروازہ کو بند نہیں کیا۔ جو لوگ اِس اُمّت کو الہام و وحی کے انعامات سے بے بہرہ ٹھہراتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں اور قرآن شریف کے اصل مقصد کو انہوں نے سمجھا ہی نہیں۔ ان کے نزدیک یہ اُمّت وحشیوں کی طرح ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاثیرات اور برکات کا معاذ اللہ خاتمہ ہو چکا اور وہ خدا جو ہمیشہ سے متکلم رہا ہے اب اِس زمانہ میں آکر خاموش ہو گیا۔ وہ نہیں جانتے کہ اگر مکالمہ مخاطبہ نہیں تو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کا مطلب ہی کیا ہوا؟ بغیر مکالمہ مخاطبہ کے تو اس کی ہستی پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

سب صوفی اِس بات کے بھی قائل ہوتے ہیں کہ وحی کا سلسلہ بند نہیں ہوتا بلکہ ظلّی طور پر انسان نبی بن سکتا ہے مگر کمزوری کے ساتھ وحیٔ دل کہہ دیتے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

کبھی نبی کی اِس قسم کی وحی جس کو دوسرے لفظوں میں اجتہاد بھی کہتے ہیں مسِّ شیطانی سے مخلوط ہو جاتی ہے اور یہ اُس وقت ہوتا ہے کہ جب نبی کوئی تمنّا کرتا ہے کہ یُوں ہو جائے تب ایسا ہی خیال اُس کے دل میں گذرتا ہے جس پر نبی مستقل رائے قائم کرنے کے لئے ارادہ کر لیتا ہے تب فی الفور وحیِ اکبر جو کلامِ الٰہی اور وحیِ متلوّ اور مہیمن ہے نبی کو اس غلطی پر متنبہ کر دیتی ہے اور وحیِ متلوّ شیطان کے دخل سے بکلّی منزہ ہوتی ہے کیونکہ وہ ایک سخت ہیبت اور شوکت اور روشنی اپنے اندر رکھتی ہے اور قولِ ثقیل اور شدید النزول بھی ہوتا ہے اور اس کی تیز شعاعیں شیطان کو جلاتی ہیں اِسی لئے شیطان اُس کے نام سے دُور بھاگتا ہے اور نزدیک نہیں آسکتا اور نیز ملائک کی کامل محافظت

اُس کے اِردگرد ہوتی ہے لیکن وحیٔ غیر متلو جس میں نبی کا اجتہاد بھی داخل ہے یہ قوت نہیں رکھتی اِس لئے تمنا کے وقت جو کبھی شاذونادر اور اجتہاد کے سلسلہ میں پیدا ہو جاتی ہے شیطان نبی یا رسول کے اجتہاد میں دخل دیتا ہے پھر وحیِ متلو اس دخل کو اُٹھا دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء کے بعض اجتہادات میں غلطی بھی ہوگئی ہے جو بعد میں رفع کی گئی۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۳۵۲)

قرآن کریم وحیِ متلو ہے اور اس کے جمع کرنے اور محفوظ رکھنے میں وہ اہتمام بلیغ کیا گیا ہے کہ احادیث کے اہتمام کو اس سے کچھ بھی نسبت نہیں۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۱۰)

ہر ایک مُلہم من اللہ کو تین قسم کے الہام ہوتے ہیں ایک واجب التبلیغ دوسرے وہ الہام جن کے اظہار اور عدم اظہار میں مُلہم لوگ اختیار دئے جاتے ہیں اگر مصلحت اظہار کی سمجھیں تو اظہار کر دیں ورنہ پوشیدہ رکھیں تیسری قسم الہامِ الٰہی کی وہ ہے جن کے اظہار سے مُلہم لوگ منع کئے جاتے ہیں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۳۱۶ حاشیہ)

الہام رحمانی بھی ہوتا ہے اور شیطانی بھی۔ اور جب انسان اپنے نفس اور خیال کو دخل دے کر کسی بات کے انکشاف کے لئے بطور استخارہ یا استخبارہ وغیرہ کے توجہ کرتا ہے خاص کر اس حالت میں کہ جب اس کے دِل میں یہ تمنا مخفی ہوتی ہے کہ میری مرضی کے موافق کسی کی نسبت کوئی بُرا یا بھلا کلمہ بطور الہام مجھے معلوم ہو جائے تو شیطان اس وقت اُس کی آرزو میں دخل دیتا ہے اور کوئی کلمہ اس کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے اور دراصل وہ شیطانی کلمہ ہوتا ہے۔ یہ دخل کبھی انبیاء اور رسولوں کی وحی میں بھی ہو جاتا ہے مگر وہ بلا توقف نکالا جاتا ہے۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۶۲۸)

اِنَّ الْوَحْيَ كَمَا يَنْزِلُ عَلَى الْاَنْبِيَآءِ كَذٰلِكَ يَنْزِلُ عَلَى الْاَوْلِيَآءِ وَلَا فَرْقَ فِيْ نُزُوْلِ الْوَحْيِ بَيْنَ اَنْ يَّكُوْنَ اِلٰى نَبِيٍّ اَوْ وَلِيٍّ وَلِكُلٍّ حَظٌّ مِنْ مُكَالَمَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَمُخَاطَبَاتِهٖ عَلٰى حَسَبِ الْمَدَارِجِ. نَعَمْ لِوَحْيِ الْاَنْبِيَآءِ شَاْنٌ اَتَمُّ وَاَكْمَلُ وَاَقْوٰى اَقْسَامِ الْوَحْيِ وَحْيُ رَسُوْلِنَا خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ۔

(تحفہ بغداد صفحہ ۲۰، ۲۱ حاشیہ)

ترجمہ از مرتب:۔ وحی جیسے انبیاء پر نازل ہوتی ہے ویسے ہی وہ اَولیاء پر نازل ہوتی ہے اور نبی اور ولی پر وحی کے نزول میں کوئی فرق نہیں ہوتا ان میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کے مکالمات اور مخاطبات سے علیٰ حسب المدارج حصہ ملتا ہے ہاں انبیاء کی وحی کو ایک شان اتم اور اکمل حاصل ہوتی ہے اور وحی کی اقسام میں سے زیادہ قوی وہ وحی ہے جو ہمارے نبی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ (تحفہ بغداد صفحہ ۲۰، ۲۱ حاشیہ)

اگر الہامات میں کسی ناواقف اور ناخواندہ کے الہامی فقروں میں نحوی اور صرفی غلطی ہو جاوے تو نفسِ الہام قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا..... یہ اَدنیٰ درجہ کا الہام کہلاتا ہے جو خدا تعالیٰ کے نور کی پوری تجلّی سے رنگ پذیر نہیں ہوتا کیونکہ الہام تین طبقوں کا ہوتا ہے اَدنیٰ اور اَوسط اور اعلیٰ۔ (ضرورت الامام صفحہ ۲۸)

اگر ایک کلام انسان سُنے یعنی ایک آواز اُس کے دل پر پہنچے اور اس کی زبان پر جاری ہو اور اس کو شُبہ باقی رہ جاوے کہ شاید یہ شیطانی آواز ہے یا حدیث النفس ہے تو درحقیقت وہ شیطانی آواز ہوگی یا حدیث النفس ہوگی کیونکہ خدا کا کلام جس قوت اور روشنی اور تاثیر اور لذت اور خدائی طاقت اور چمکتے ہوئے چہرہ کے ساتھ دل پر نازل ہوتا ہے خود یقین دلا دیتا ہے کہ مَیں خدا کی طرف سے ہوں۔ (نزول المسیح صفحہ ۸۶)

تمام برکات اور یقین کے حصول کا ذریعہ خدا کا مکالمہ اور مخاطبہ ہے اور انسان کی یہ زندگی جو شکوک اور شبہات سے بھری ہوئی ہے بجز مکالماتِ الٰہیہ کے سرچشمہ صافیہ کے یقین تک ہرگز نہیں پہنچ سکتی مگر خدا تعالیٰ کا وہ مکالمہ یقین تک پہنچاتا ہے جو یقینی اور قطعی ہو جس پر ایک مُلہم قسم کھا کر کہہ سکتا ہے کہ وہ اُسی رنگ کا مکالمہ ہے جس رنگ کا مکالمہ آدمؑ سے ہوا اور پھر شیث سے ہوا اور پھر نوحؑ سے ہوا اور پھر ابراہیمؑ سے اور پھر اسحاقؑ سے اور پھر اسمٰعیلؑ سے اور پھر یعقوبؑ سے ہوا اور پھر یوسفؑ سے اور پھر چار سو برس کے بعد موسیٰؑ سے اور پھر یشوع بن نون سے ہوا پھر داؤدؑ سے ہوا اور سلیمانؑ سے اور الیسع نبی سے اور دانیال سے اور اسرائیلی سلسلہ کے آخر میں عیسیٰؑ بن مریمؑ سے ہوا اور سب سے اتم اور اکمل طور پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا لیکن اگر کوئی کلام یقین کے مرتبہ سے کم تر ہو تو وہ شیطانی کلام ہے نہ ربّانی۔ (نزول المسیح صفحہ ۱۰۸)

یہ نکتہ خوب یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جو الہامات ایسے کمزور اور ضعیف الاثر ہوں جو مُلہم پر مشتبہ رہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے ہیں یا شیطان کی طرف سے وہ درحقیقت شیطان کی طرف سے ہی ہوتے ہیں یا شیطان کی آمیزش سے۔ اور گمراہ ہے وہ شخص جو ان پر بھروسہ کرتا ہے اور بدبخت ہے وہ شخص جو اس خطرناک اِبتلاء میں ماخوذ ہے کیونکہ شیطان اُس سے بازی کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کو ہلاک کرے۔ (نزول المسیح صفحہ ۱۱۴)

وحی دو قسم کی ہے وحی الابتلاء اور وحی الاصطفاء۔ وحی الابتلاء بعض اَوقات موجبِ ہلاکت ہو جاتی ہے جیسا کہ بلعم اسی وجہ سے ہلاک ہوا مگر صاحبِ وحی الاصطفاء کبھی ہلاک نہیں ہوتا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۹)

وحی کے اقسامِ ثلاثہ میں اکمل اور اتم وہ وحی ہے جو علم کی تیسری قسم میں داخل ہے جس کا پانے والا انوارِ سبحانی میں سراپا غرق ہوتا ہے اور وہ تیسری قسم حق الیقین کے نام سے موسوم ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۴۷)

رحمانی الہام اور وحی کے لئے اوّل شرط یہ ہے کہ انسان محض خدا کا ہو جائے اور شیطان کا کوئی حصہ اُس میں نہ رہے کیونکہ جہاں مُردار ہے ضرور ہے کہ وہاں کُتّے بھی جمع ہو جائیں۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۳۸)

الہام کشف یا رؤیا تین قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔ اوّل وہ جو خدا کی طرف سے ہوتے ہیں اور وہ ایسے شخصوں پر نازل ہوتے ہیں جن کا تزکیۂ نفس کامل طور پر ہو چکا ہوتا ہے اور وہ بہت سی موتوں اور محویتِ نفس کے بعد حاصل ہؤا کرتا ہے اور ایسا شخص جذباتِ نفسیہ سے بکلّی الگ ہوتا ہے اور اس پر ایک ایسی موت وارد ہو جاتی ہے جو اس کی تمام اندرونی آلائشوں کو جلا دیتی ہے جس کے ذریعہ سے وہ خدا تعالیٰ سے قریب اور شیطان سے دُور ہو جاتا ہے کیونکہ جو شخص جس کے نزدیک ہوتا ہے اسی کی آواز سُنتا ہے۔

۲۔ دوسرے حدیث النفس ہوتا ہے جس میں انسان کی اپنی تمنّا ہوتی ہے اور انسان کے اپنے خیالات اور آرزوؤں کا اس میں بہت دخل ہوتا ہے اور جیسے مثل مشہور ہے بلّی کو چھیچھڑوں کے خواب میں وہی باتیں دکھائی دیتی ہیں جن کا انسان اپنے دِل میں پہلے ہی سے خیال رکھتا ہے اور جیسے بچے جو دن کو کتابیں پڑھتے ہیں تو رات کو بعض اَوقات وہی کلمات ان کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں یہی حال حدیث النفس کا ہے۔

۳۔ تیسرے شیطانی الہام ہوتے ہیں۔ ان میں شیطان عجیب عجیب طرح کے دھوکے دیتا ہے کبھی سُنہری تخت دکھاتا ہے اور کبھی عجیب و غریب نظارے دکھا کر طرح طرح کے خوش کُن وعدے دیتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۲)

جس پر کوئی کلام نازل ہو جب تک تین علامتیں اس میں نہ پائی جائیں اس کو خدا کا کلام کہنا اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

اوّل۔ وہ کلام قرآن سے مخالف اور معارض نہ ہو مگر یہ علامت بغیر تیسری علامت کے جو ذیل میں لکھی جائیگی ناقص ہے بلکہ اگر تیسری علامت نہ ہو تو محض اس علامت سے کچھ بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔

دوم۔ وہ کلام ایسے شخص پر نازل ہو جس کا تزکیۂ نفس بخوبی ہو چکا ہو اور وہ اُن فانیوں کی جماعت میں داخل ہو جو بکلّی جذبات نفسانیہ سے الگ ہو گئے ہیں اور اُن کے نفس پر ایک ایسی موت وارد ہو گئی ہے جس کے ذریعہ سے وہ خدا سے قریب اور شیطان سے دُور جا پڑتے ہیں کیونکہ جو شخص جس کے قریب ہے اُسی کی آواز سُنتا ہے پس جو شیطان کے قریب ہے وہ شیطان کی آواز سُنتا ہے اور جو خدا سے قریب ہے وہ خدا کی آواز سُنتا ہے اور انتہائی کوشش انسان کی تزکیۂ نفس ہے اور اُس پر تمام سلوک ختم ہو جاتا ہے اور دوسرے لفظوں میں یہ ایک موت ہے جو تمام اندرونی آلائشوں کو جلا دیتی ہے۔ پھر جب اِنسان اپنا سلوک ختم کر چکتا ہے تو تصرفاتِ الٰہیّہ کی نوبت آتی ہے تب خدا اپنے اس بندہ کو جو سلب جذباتِ نفسانیہ سے فنا کے درجہ تک پہنچ چکا ہے معرفت اور محبت کی زندگی سے دوبارہ زندہ کرتا ہے اور اپنے فوق العادت نشانوں سے عجائباتِ رُوحانیہ کی اُس کو سیر

کرتا ہے اور محبتِ ذاتیہ کی ورلو اور کشش اس کے دل میں بھر دیتا ہے جس کو دُنیا سمجھ نہیں سکتی۔ اس حالت میں کہا جاتا ہے کہ اُس کو نئی حیات مِل گئی جس کے بعد موت نہیں۔

پس یہ نئی حیات کامل معرفت اور کامل محبت سے ملتی ہے اور کامل معرفت خدا کے فوق العادت نشانوں سے حاصل ہوتی ہے اور جب انسان اِس حد تک پہنچ جاتا ہے تب اُس کو خدا کا سچا مکالمہ مخاطبہ نصیب ہوتا ہے مگر یہ علامت بھی بغیر تیسرے درجہ کی علامت کے قابلِ اطمینان نہیں کیونکہ کامل تزکیہ ایک امر پوشیدہ ہے اِس لئے ہر ایک فضول گو ایسا دعویٰ کر سکتا ہے۔

تیسری علامت ملہم صادق کی یہ ہے کہ جس کلام کو وہ خدا کی طرف منسوب کرتا ہے خدا کے متواتر افعال اُس پر گواہی دیں یعنی اس قدر اس کی تائید میں نشانات ظاہر ہوں کہ عقلِ سلیم اِس بات کو ممتنع سمجھے کہ باوجود اِس قدر نشانوں کے پھر بھی وہ خدا کا کلام نہیں اور یہ علامت درحقیقت تمام علامتوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ایک کلام جو کسی کی زبان پر جاری ہو یا کسی نے باِدّعائے الہام پیش کیا ہو وہ اپنے معنوں کی رُو سے قرآن شریف کے بیان سے مخالف نہ ہو بلکہ مطابق ہو مگر پھر بھی وہ کسی مُفتری کا اِفترا ہو کیونکہ ایک عقلمند جو مسلمان ہے مگر مفتری ہے ضرور اِس بات کا لحاظ رکھے گا کہ قرآن شریف کے مخالف کوئی کلام بدعویٰ الہام پیش نہ کرے ورنہ خواہ نخواہ لوگوں کے اعتراضات کا نشانہ ہو جائے گا اور نیز یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کلام حدیث النفس ہو یعنی نفس کی طرف سے ایک کلمہ زبان پر جاری ہو جیسے اکثر بچے جو دن کو کتابیں پڑھتے ہیں رات کو بعض اَوقات وہی کلمات ان کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔ غرض کسی کلمہ کا جو بدعویٰ الہام پیش کیا گیا ہے قرآن شریف سے مطابق ہونا اِس بات پر قطعی دلیل نہیں ہے کہ وہ ضرور خدا کا کلام ہے۔ کیا ممکن نہیں کہ ایک کلام اپنے معنوں کی رُو سے خدا کے کلام کے مخالف بھی نہ ہو اور پھر وہ کسی مفتری کا اِفترا بھی ہو کیونکہ ایک مفتری بڑی آسانی سے یہ کارروائی کر سکتا ہے کہ وہ قرآن شریف کی تعلیم کے موافق ایک کلام پیش کرے اور کہے کہ یہ خدا کا کلام ہے جو میرے پر نازل ہوا ہے اور یا ایسا کلام حدیث النفس ٹھہر سکتا ہے یا شیطانی کلام ہو سکتا ہے۔

ایسا ہی یہ دوسری شرط بھی یعنی یہ کہ جو الہام کا دعویٰ کرے وہ صاحبِ تزکیۂ نفس ہو قابلِ اطمینان نہیں بلکہ ایک پوشیدہ امر ہے اور بہتیرے ناپاک طبع لوگ اِس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہمارا نفس تزکیہ یافتہ ہے اور ہم خدا سے سچی محبت رکھتے ہیں۔ پس یہ امر بھی کوئی سہل امر نہیں کہ اس میں جلد تر صادق اور کاذب میں فیصلہ کیا جاوے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی خبیث النفس لوگوں نے اُن برگزیدوں پر جو صاحبِ تزکیۂ نفس تھے ناپاک تہمتیں لگائی ہیں جیسا کہ آجکل کے پادری ہمارے سیّد و مولیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمتیں لگاتے ہیں اور نعوذ باللہ کہتے ہیں کہ آپ نفسانی شہوات کا اِتباع کرتے تھے جیسا کہ ان کے ہزاروں رسالوں اور اخباروں اور کتابوں میں

ایسی تہمتیں پاؤ گے۔ ایسا ہی یہودی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے ہیں چنانچہ تھوڑی مدت ہوئی ہے کہ میں نے ایک یہودی کی کتاب دیکھی جس میں نہ صرف یہ ناپاک اعتراض تھا کہ نعوذ باللہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ناجائز طور پر ہے بلکہ آپ کے چال وچلن پر بھی نہایت گندے اعتراض کئے تھے اور جو آپ کی خدمت میں بعض عورتیں رہتی تھیں بہت بُرے پیرایہ میں اُن کا ذکر کیا تھا۔ پس جبکہ پلید طبع دشمنوں نے ایسے پاک فطرت اور مقدس لوگوں کو شہوت پرست لوگ قرار دیا اور تزکیۂ نفس سے محض خالی سمجھا تو اس سے ہر ایک شخص معصوم کہ سکتا ہے کہ تزکیۂ نفس کا مرتبہ دشمنوں پر ظاہر ہو جانا کس قدر مشکل ہے چنانچہ آریہ لوگ خدا تعالیٰ کے تمام نبیوں کو محض مکّار اور شہوت پرست قرار دیتے ہیں اور اُن کا دَور مکر و فریب کا دَور ٹھہراتے ہیں۔

لیکن یہ تیسری علامت کہ الہام اور وحی کے ساتھ جو ایک قول ہے اس کے ساتھ خدا کا ایک فعل بھی ہو۔ یہ ایسی کامل علامت ہے جو کوئی اس کو توڑ نہیں سکتا۔ یہی علامت ہے جس سے خدا کے سچے نبی جھوٹوں پر غالب آتے رہے ہیں کیونکہ جو شخص دعویٰ کرے کہ میرے پر خدا کا کلام نازل ہوتا ہے پھر اس کے ساتھ صدہا نشان ظاہر ہوں اور ہزاروں قسم کی تائید اور نصرتِ الٰہی شاملِ حال ہو اور اس کے دشمنوں پر خدا کے کُھلے کُھلے حملے ہوں پھر کس کی مجال ہے کہ ایسے شخص کو جھوٹا کہہ سکے مگر افسوس کہ دُنیا میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں کہ اس بَلا میں پھنس جاتے ہیں کہ کوئی حدیث النفس یا شیطانی وسوسہ اُن کو پیش آجاتا ہے تو اس کو خدا تعالیٰ کا کلام سمجھ لیتے ہیں اور فعلی شہادت کی کچھ بھی پرواہ نہیں رکھتے۔

ہاں یہ بھی ممکن ہے کہ کسی کو کبھی شاذ و نادر کے طور پر کوئی سچی خواب آجائے یا سچا الہام ہو جائے مگر وہ صرف اس قدر سے مامور من اللہ نہیں کہلا سکتا اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ نفسانی تاریکیوں سے پاک ہے بلکہ اس قدر رؤیا اور الہام میں قریباً تمام دُنیا شریک ہے اور یہ کچھ بھی چیز نہیں اور یہ مادہ کبھی کبھی خواب یا الہام ہونے کا محض اس لئے اِنسانوں کی فطرت میں رکھا گیا ہے تا ایک عقلمند انسان خدا کے برگزیدہ رسولوں پر بدظنی نہ کر سکے اور سمجھ سکے کہ وحی اور الہام کا ہر ایک انسان کی فطرت میں تخم داخل ہے پھر اس کی کامل ترقی سے انکار کرنا حماقت ہے۔

لیکن وہ لوگ جو خدا کے نزدیک مُلہم اور مکلّم کہلاتے ہیں اور مکالمہ اور مخاطبہ کا شرف رکھتے ہیں اور دعوتِ خلق کے لئے مبعوث ہوتے ہیں ان کی تائید میں خدا تعالیٰ کے نشان بارش کی طرح برستے ہیں اور دُنیا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور فعلِ الٰہی اپنی کثرت کے ساتھ گواہی دیتا ہے کہ جو کلام وہ پیش کرتے ہیں وہ کلامِ الٰہی ہے اگر الہام کا دعویٰ کرنے والے اِس علامت کو مدِّنظر رکھتے تو وہ اِس فتنہ سے بچ جاتے۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۹۹ تا ۱۰۲)

سچی وحی کا خدا تعالیٰ نے یہی نشان دیا ہے کہ جب وہ نازل ہوتی ہے تو ملائک بھی اس کے ساتھ ضرور اُترتے ہیں اور دُنیا دن بدن راستی کی طرف پلٹا کھاتی جاتی ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۵۰)

وَمَنْ تَفَوَّهَ بِكَلِمَةٍ لَيْسَ لَهُ أَصْلٌ صَحِيحٌ فِي الشَّرْعِ مُلْهَمًا كَانَ أَوْ مُجْتَهِدًا فَبِهِ الشَّيَاطِيْنُ مُتَلَاعِبَةٌ۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۲۱)

سچا الہام جو خالص خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے مندرجہ ذیل علامتیں اپنے ساتھ رکھتا ہے :۔

(۱) وہ اِس حالت میں ہوتا ہے کہ جب کہ انسان کا دِل آتشِ درد سے گداز ہو کر مصفّا پانی کی طرح خدا تعالیٰ کی طرف بہتا ہے۔ اسی طرف حدیث کا اشارہ ہے کہ قرآن غم کی حالت میں نازل ہُوا لہٰذا تم بھی اس کو غم ناک دِل کے ساتھ پڑھو۔

(۲) سچا الہام اپنے ساتھ ایک لذّت اور سرور کی خاصیت لاتا ہے اور نامعلوم وجہ سے یقین بخشتا ہے اور ایک فولادی میخ کی طرح دِل کے اندر دھنس جاتا ہے اور اس کی عبارت فصیح اور غلطی سے پاک ہوتی ہے۔

(۳) سچے الہام میں ایک شوکت اور بلندی ہوتی ہے اور دل پر اس سے مضبوط ٹھوکر لگتی ہے اور قوت اور رُعبناک آواز کے ساتھ دِل پر نازل ہوتا ہے مگر جھوٹے اِلہام میں چوروں اور مخنثوں اور عورتوں کی سی دھیمی آواز ہوتی ہے کیونکہ شیطان چور اور مخنث اور عورت ہے۔

(۴) سچا الہام خدا تعالیٰ کی طاقتوں کا اثر اپنے اندر رکھتا ہے اور ضرور ہے کہ اس میں پیشگوئیاں بھی ہوں اور وہ پوری بھی ہو جائیں۔

(۵) سچا الہام انسان کو دن بدن نیک بناتا جاتا ہے اور اندرونی کثافتیں اور غلاظتیں پاک کرتا ہے اور اخلاقی حالتوں کو ترقی دیتا ہے۔

(۶) سچے الہام پر انسان کی تمام اندرونی قوتیں گواہ ہو جاتی ہیں اور ہر ایک قوت پر ایک نئی اور پاک روشنی پڑتی ہے اور انسان اپنے اندر ایک تبدیلی پاتا ہے اور اس کی پہلی زندگی مَر جاتی ہے اور نئی زندگی شروع ہوتی ہے اور وہ بنی نوع کی ایک عام ہمدردی کا ذریعہ ہوتا ہے۔

(۷) سچا الہام ایک ہی آواز پر ختم نہیں ہوتا کیونکہ خدا کی آواز ایک سلسلہ رکھتی ہے۔ وہ نہایت ہی حلیم ہے جس کی طرف توجّہ کرتا ہے اس سے مکالمت کرتا ہے اور سوالات کا جواب دیتا ہے اور ایک ہی مکان اور ایک

ترجمہ از مرتب :۔ جو شخص بھی ایسا کلمہ مُنہ سے نکالتا ہے جس کی حقیقی بنیاد شریعت پر نہ ہو خواہ وہ مُلہم ہو یا مُجتہد اس کے ساتھ شیاطین کھیل رہے ہوتے ہیں۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۲۱)

ہی وقت میں اپنے معروضات کا جواب پاسکتا ہے گو اس مکالمہ پر کسی فترت کا زمانہ بھی آجاتا ہے۔

(۸) سچے الہام کا انسان کبھی بُزدل نہیں ہوتا اور کسی مدعیٔ الہام کے مقابلہ سے اگرچہ وہ کیسا ہی مخالف ہو نہیں ڈرتا۔ جانتا ہے کہ میرے ساتھ خدا ہے اور وہ اس کو ذلّت کے ساتھ شکست دے گا۔

(۹) سچا الہام اکثر علوم اور معارف کے جاننے کا ذریعہ ہوتا ہے کیونکہ خدا اپنے ملہم کو بے علم اور جاہل رکھنا نہیں چاہتا۔

(۱۰) سچے الہام کے ساتھ اَور بھی بہت سی برکتیں ہوتی ہیں اور کلیم اللہ کو غیب سے عزت دی جاتی ہے اور رعب عطا کیا جاتا ہے۔ (ضرورۃ الامام صفحہ ۱۸، ۱۹)

خدا کا الہام غلطی سے پاک ہوتا ہے مگر انسان کا کلام غلطی کا اِحتمال رکھتا ہے کیونکہ سہو و نسیان لازمۂ بشریّت ہے۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۴)

جو لوگ شیطان سے الہام پاتے ہیں ان کے الہاموں کے ساتھ کوئی قادرانہ غیب گوئی کی روشنی نہیں ہوتی جس میں الوہیّت کی قدرت اور عظمت اور ہیبت بھری ہوئی ہو۔ (ضمیمہ تریاق القلوب نمبرہ صفحہ ۲)

خدا کا کلام جس قوت اور برکت اور روشنی اور تاثیر اور لذت اور خدائی طاقت اور چمکتے ہوئے چہرہ کے ساتھ دِل پر نازل ہوتا ہے خود یقین دلا دیتا ہے کہ مَیں خدا کی طرف سے ہوں اور ہرگز مُردہ آوازوں سے مشابہت نہیں رکھتا بلکہ اس کے اندر ایک جان ہوتی ہے اور اس کے اندر ایک طاقت ہوتی ہے اور اس کے اندر ایک کشش ہوتی ہے اور اس کے اندر یقین بخشنے کی ایک خاصیت ہوتی ہے اور اُس کے اندر ایک لذت ہوتی ہے اور اس کے اندر ایک روشنی ہوتی ہے اور اس کے اندر ایک خارق عادت تجلّی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ذرہ ذرہ وجود پر تصرّف کرنے والے ملایک ہوتے ہیں اور علاوہ اس کے اس کے ساتھ خدائی صفات کے اَور بہت سے خوارق ہوتے ہیں۔ (نزول المسیح صفحہ ۸۶)

جس دِل پر درحقیقت آفتابِ وحی تجلّی فرماتا ہے اس کے ساتھ ظن اور شک کی تاریکی ہرگز نہیں رہتی۔ کیا خالص نور کے ساتھ ظلمت رہ سکتی ہے۔ (نزول المسیح صفحہ ۸۹)

اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ پھر رحمانی الہام کی نشانی کیا ہے۔ اِس کا جواب یہی ہے کہ اِس کی کئی نشانیاں ہیں۔

(۱) اوّل یہ کہ الٰہی طاقت اور برکت اس کے ساتھ ایسی ہوتی ہے کہ اگرچہ اَور دلائل ابھی ظاہر نہ ہوں وہ طاقت بڑے جوش اور زور سے بتلاتی ہے کہ مَیں خدا کی طرف سے ہوں اور مُلہم کے دِل کو ایسا اپنا مسخر بنا لیتی ہے کہ اگر اس کو آگ میں کھڑا کر دیا جائے یا ایک بجلی اُس پر پڑنے لگے وہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ الہام شیطانی ہے

یا حدیث النفس ہے یا شکّی ہے یا ظنّی ہے بلکہ ہر دَم اس کی رُوح بولتی ہے کہ یہ یقینی ہے اور خدا کا کلام ہے ۔
(۲) دوسرے خدا کے الہام میں ایک خارق عادت شوکت ہوتی ہے (۳) تیسری وہ پُرزور آواز اور قوت سے نازل ہوتا ہے (۴) چوتھی اس میں ایک لذت ہوتی ہے (۵) اکثر اس میں سلسلہ سوال وجواب پیدا ہو جاتا ہے۔ بندہ سوال کرتا ہے خدا جواب دیتا ہے اور پھر بندہ سوال کرتا ہے خدا جواب دیتا ہے۔ خدا کا جواب پانے کے وقت بندہ پر ایک غنودگی طاری ہوتی ہے لیکن صرف غنودگی کی حالت میں کوئی کلام زبان پر جاری ہونا وحیٔ الٰہی کی قطعی دلیل نہیں کیونکہ اس طرح پر شیطانی الہام بھی ہوسکتا ہے (۶) چھٹی وہ الہام کبھی ایسی زبانوں میں بھی ہوجاتا ہے جن کا ملہم کو کچھ بھی علم نہیں (۷) خدائی الہام میں ایک خدائی کشش ہوتی ہے۔ اول وہ کشش ملہم کو عالمِ تفرید اور انقطاع کی طرف کھینچ لے جاتی ہے اور آخر اس کا اثر بڑھتا بڑھتا طبائع سلیمہ مبائعین پر جا پڑتا ہے تب ایک دُنیا اس کی طرف کھینچی جاتی ہے اور بہت سی رُوحیں اس کے رنگ میں بقدر استعداد آجاتی ہیں (۸) آٹھویں سچا الہام غلطیوں سے نجات دیتا اور بطور حَکَم کے کام کرتا ہے اور قرآن شریف کے کسی بیان میں مخالف نہیں ہوتا۔
(۹) سچے اِلہام کی پیشگوئی فی حدِ ذاتہٖ سچی ہوتی ہے گو اس کے سمجھنے میں لوگوں کو دھوکا ہو (۱۰) دسویں سچا اِلہام تقویٰ کو بڑھاتا اور اخلاقی قوتوں کو زیادہ کرتا اور دُنیا سے دل برداشتہ کرتا اور معاصی سے متنفر کر دیتا ہے (۱۱) سچا اِلہام چونکہ خدا کا قول ہے اِس لئے وہ اپنی تائید کے لئے خدا کے فعل کو ساتھ لاتا ہے اور اکثر بزرگ پیشگوئیوں پر مشتمل ہوتا ہے جو سچی نکلتی ہیں اور قول اور فعل دونوں کی آمیزش سے یقین کے دریا جاری ہو جاتے ہیں اور انسان سفلی زندگی سے منقطع ہو کر ملکوتی صفات بن جاتا ہے۔ (نزول المسیح صفحہ ۱۱۴، ۱۱۵)

وَ اِذَا جَاءَنِی الْوَحْیُ بِکَمَالِہٖ وَکَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ۔ قُلْتُ یَا وَحْیَ رَبِّیْ اَھْلًا وَّ سَھْلًا رَحُبَ وَادِیْکَ وَعَزَّ نَادِیْکَ۔ اَنْتَ الَّذِیْ یَھَبُ لِلْعُمْیِ الْعُیُوْنَ وَ لِلصُّمِّ الْکَلَامَ الْمَوْزُوْنَ۔ وَیُحْیِ الْاَمْوَاتَ وَیُرِی الْاٰیَاتِ ..... اَنْتَ الَّذِیْ یُصْبِی الْقُلُوْبَ وَیُزِیْلُ الْکُرُوْبَ وَیُنْزِلُ السَّکِیْنَۃَ وَیُشَابِہُ السَّفِیْنَۃَ۔

(مواھب الرحمٰن صفحہ ۵۰)

(ترجمہ از مرتب) جب وحی میرے پاس اپنے پورے کمال کے ساتھ آئی اور اس نے اپنے جمال کے ساتھ ہر قسم کی تاریکی کو دُور کر دیا تو مَیں نے کہا اے میرے رب کی وحی تجھے خوش آمدید کہتا ہوں۔ تیرے فیضان کی وادی وسیع ہو اور تیری مجلس باعزت ہو۔ تُو وہ ہے جو اندھوں کو آنکھیں بخشتی اور بہروں کو کلامِ موزوں عطا کرتی ہے اور مُردوں کو زندہ کرتی اور نشانات دکھاتی ہے ..... تُو وہ ہے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے گھبراہٹوں کو دُور کرتی اور دلوں پر سکینت نازل کرتی ہے اور کشتی کے مشابہ ہے۔ (مواھب الرحمٰن صفحہ ۵۰)

کسی الہام کے خدا کی طرف سے ہونے اور دخلِ شیطان سے پاک ہونے کا..... معیار یہی ہے کہ اسکے ساتھ نصرتِ الٰہی ہو اور اقتداری علمِ غیب اور قاہر پیشگوئی اس کے ساتھ ہو ورنہ وہ فضول باتیں ہیں جو نافع الناس نہیں ہو سکتیں۔ (الحکم جلد ۳ ۲۴ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۸۹۹ء صفحہ ۴)

خدا کی طرف سے جو بات آتی ہے وہ پُرشوکت اور لذیذ ہوتی ہے۔ دِل پر ایک ٹھوکر مارنے والی ہوتی ہے وہ خدا کی اُنگلیوں سے نکلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے ہم وزن کوئی نہیں وہ فولاد کی طرح گرنے والی ہوتی ہے۔

(الحکم جلد ۵ ۱۲ مورخہ ۳۱ر مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۹)

جو متقی ہے اس کے الہامات بھی صحیح ہیں اور اگر تقویٰ نہیں تو الہامات بھی قابلِ اعتبار نہیں اُن میں شیطان کا حصّہ ہو سکتا ہے۔ کسی کے تقویٰ کو اس کے مُلہم ہونے سے نہ پہچانو بلکہ اس کے الہاموں کو اس کی حالتِ تقویٰ سے جانچو اور اندازہ کرو۔ (الحکم جلد ۵ ۲۳ مورخہ ۲۴ر جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۰)

ہم ہر آواز کو خدا تعالیٰ کی آواز قرار نہیں دے سکتے جب تک اس کے ساتھ وہ انوار اور برکات نہ ہوں جو اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کے ساتھ ہوتے ہیں۔ (الحکم جلد ۶ ۱۲ مورخہ ۳۱ر مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

اِلہام میں دخلِ شیطانی بھی ہوتا ہے جیسے کہ قرآن شریف سے بھی ظاہر ہے مگر جو شخص شیطان کے اثر کے نیچے ہوا سے نصرت نہیں ملا کرتی نصرت اسے ہی ملا کرتی ہے جو رحمان کے زیرِ سایہ ہو۔

(البدر جلد ۴ ۶ مورخہ ۱۸ر فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

الہامِ الٰہی کی عبارت عموماً مقفّٰی ہوتی ہے اور اس میں ایک شوکت ہوتی ہے اور اس میں سے کلامِ الٰہی کی ایک خوشبو آتی ہے۔ (بدر جلد ۲ ۲۳ مورخہ ۷ر جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

میرا مذہب تو یہ ہے کہ جب تک درخشاں نشان اس کے ساتھ بار بار نہ لگائے جاویں تب تک الہامات کا نام لینا بھی سخت گناہ اور حرام ہے۔ پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ قرآن مجید اور میرے الہامات کے خلاف تو نہیں۔ اگر ہے تو یقیناً خدا کا نہیں بلکہ شیطانی القاء ہے۔ (بدر جلد ۶ ۸ مورخہ ۱۴ر فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

جب تک کسی الہام پر خدا تعالیٰ کی مُہر نہ ہو وہ ماننے کے لائق نہیں ہوتا۔ دیکھو قرآن شریف کو عربوں جیسے اشد کافر کب مان سکتے تھے اگر خدا تعالیٰ کی مُہر اس پر نہ ہوتی۔ ہمیں بھی اگر کوئی کشف، رؤیا یا الہام ہوتا ہے تو ہمارا دستور ہے کہ اُسے قرآن مجید پر عرض کرتے ہیں اور اس کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی یاد رکھو کہ اگر کوئی الہام قرآن مجید کے مطابق بھی ہو لیکن کوئی نشان ساتھ نہ ہو تو وہ قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ قابلِ قبول الہام وہی ہوتا ہے جو قرآن مجید کے مطابق بھی ہو اور ساتھ ہی اس کی تائید میں نشان بھی ہوں۔

(الحکم جلد ۱۱ ۴۱ مورخہ ۱۷ر نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۲)

قرآن مجید میں صاف لکھا ہے کہ شیطان کی طرف سے بھی وحی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے بھی ہوتی ہے۔ جو وحی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس میں ایک تاجِ عزت پہنایا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کے بڑے بڑے نشان اس کی تائید میں گواہ بن کر آتے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۱ ۴۱ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۳)

یاد رکھو ایسی باتیں ہرگز زبان پر نہ لاؤ جو قال اللہ اور قال الرسولؐ کے برخلاف ہوں۔ اس قسم کے الہامات کچھ چیز نہیں۔ دیکھو بارش کا پانی سب کو خوش کرتا ہے مگر پرنالہ کا پانی لڑائی ڈالتا ہے اور فساد پیدا کرتا ہے۔ جن الہامات کی تائید میں خدا تعالیٰ کا فعل نہیں ہوتا اور نشاناتِ الٰہیہ گواہی نہیں دیتے وہ ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے پرنالہ کا پانی۔ (الحکم جلد ۱۱ ۴۱ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۳)

نورِ وحی کے نازل ہونے کا یہی فلسفہ ہے کہ وہ نور پر ہی وارد ہوتا ہے تاریکی پر وارد نہیں ہوتا کیونکہ فیضان کے لئے مناسب شرط ہے اور تاریکی کو نور سے کچھ مناسبت نہیں بلکہ نور کو نور سے مناسبت ہے اور حکیمِ مطلق بغیر رعائت مناسبت کوئی کام نہیں کرتا ایسا ہی فیضانِ نور میں بھی اُس کا یہی قانون ہے کہ جس کے پاس کچھ نور ہے اُسی کو اَور نور بھی دیا جاتا ہے اور جس کے پاس کچھ نہیں اس کو کچھ نہیں دیا جاتا۔ جو شخص آنکھوں کا نور رکھتا ہے وہی آفتاب کا نور پاتا ہے اور جس کے پاس آنکھوں کا نور نہیں وہ آفتاب کے نور سے بھی بے بہرہ رہتا ہے اور جس کو فطرتی نور کم ملا ہے اس کو دوسرا نور بھی کم ہی ملتا ہے اور جس کو فطرتی نور زیادہ ملا ہے اس کو دوسرا نور بھی زیادہ ہی ملتا ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۱۸۰ حاشیہ)

رحمانِ مطلق جیسا جسم کی غذا کو اس کی حاجت کے وقت عطا فرماتا ہے ایسا ہی وہ اپنی رحمتِ کاملہ کے تقاضا سے رُوحانی غذا کو بھی ضرورتِ حقّہ کے وقت مہیا کر دیتا ہے ہاں یہ بات درست ہے کہ خدا کا کلام انہیں برگزیدہ لوگوں پر نازل ہوتا ہے جن سے خدا راضی ہے اور انہیں سے وہ مکالمات اور مخاطبات کرتا ہے جن سے وہ خوش ہے مگر یہ بات ہرگز درست نہیں کہ جس سے خدا راضی اور خوش ہو اس پر خواہ نخواہ بغیر کسی ضرورتِ حقّہ کے کتابِ آسمانی نازل ہو جایا کرے یا خدائے تعالیٰ یونہی بلا ضرورتِ حقّہ کسی کی طہارتِ لازمی کی وجہ سے لازمی اور دائمی طور پر اس سے ہر وقت باتیں کرتا رہے بلکہ خدا کی کتاب اُسی وقت نازل ہوتی ہے جب فی الحقیقت اس کے نزول کی ضرورت پیش آجائے۔ اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ وحی اللہ کے نزول کا اصل موجب خدائے تعالیٰ کی رحمانیت ہے کسی عامل کا عمل نہیں اور یہ ایک بزرگ صداقت ہے جس سے ہمارے مخالف برہمو وغیرہ بے خبر ہیں۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۳۵۲ حاشیہ)

ذریعہ وحی اور الہام ..... اِس غرض سے اِنسان کو دیا گیا ہے تا انسان کو ان معارف اور حقائق تک پہنچادے کہ جن تک مجرد عقل پہنچا نہیں سکتی اور وہ اسرارِ دقیقہ اُس پر کھولے جو عقل کے ذریعہ سے کُھل نہیں

سکتے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۳۰)

اصل حقیقت وحی کی یہ ہے جو نزول وحی کا بغیر کسی موجب کے جو مستدعی نزولِ وحی ہو ہرگز نہیں ہوتا بلکہ ضرورت کے پیش آجانے کے بعد ہوتا ہے اور جیسی جیسی ضرورتیں پیش آتی ہیں بمطابق ان کے وحی بھی نازل ہوتی ہے کیونکہ وحی کے باب میں یہی عادت اللہ جاری ہے کہ جب تک باعثِ محرک وحی پیدا نہ ہوئے تب تک وحی نازل نہیں ہوتی اور خود ظاہر بھی ہے جو بغیر موجودگی کسی باعث کے جو تحریک وحی کی کرتا ہو یونہی بلا موجب وحی کا نازل ہو جانا ایک بے فائدہ کام ہے جو خداوند تعالیٰ کی طرف جو حکیمِ مطلق ہے اور ہر یک کام برعایت حکمت اور مصلحت اور مقتضاء وقت کے کرتا ہے منسوب نہیں ہو سکتا۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۸۷ حاشیہ)

بعض دفعہ وحی اِس طرح پر نازل ہوتی ہے کہ کوئی کاغذ یا پتھر وغیرہ دکھایا جاتا ہے جس پر کچھ لکھا ہوُا ہوتا ہے۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۲۳ مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

بخاری نے اپنی صحیح میں اور ایسا ہی ابوداؤد اور ترمذی اور ابنِ ماجہ نے اور ایسا ہی مسلم نے بھی اس پر اتفاق کیا ہے کہ نزول جبرائیل کا وحی کے ساتھ انبیاء پر وقتاً فوقتاً آسمان سے ہوتا ہے..... اور اس کی تائید میں ابنِ جریر اور ابنِ کثیر نے یہ حدیث بھی لکھی ہے........ نواس بن سمعان سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس وقت خدا تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے کہ کوئی امر وحی اپنی طرف سے نازل کرے تو بطور وحی متکلم ہوتا ہے یعنی ایسا کلام کرتا ہے جو ابھی اجمال پر مشتمل ہوتا ہے اور ایک چادر پوشیدگی کی اس پر ہوتی ہے تب اس محجوب المفہوم کلام سے ایک لرزہ آسمانوں پر پڑ جاتا ہے جس سے وہ ہولناک کلام تمام آسمانوں میں پھر جاتا ہے اور کوئی نہیں سمجھتا کہ اسکے کیا معنے ہیں اور خوفِ الٰہی سے ہر ایک فرشتہ کانپنے لگتا ہے کہ خدا جانے کیا ہونے والا ہے اور اس ہولناک آواز کو سُنکر ہر یک فرشتہ پر غشی طاری ہو جاتی ہے اور وہ سجدہ میں گر جاتے ہیں۔ پھر سب سے پہلے جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام سجدہ سے سر اُٹھاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس وحی کی تمام تفصیلات اُس کو سمجھا دیتا ہے اور اپنی مراد اور منشاء سے مطلع کر دیتا ہے تب جبرائیل اس وحی کو لے کر تمام فرشتوں کے پاس جاتا ہے جو مختلف آسمانوں میں ہیں اور ہر یک فرشتہ اُس سے پوچھتا ہے کہ یہ آواز ہولناک کیسی تھی اور اس سے کیا مراد تھی تب جبرائیل اُن کو یہ جواب دیتا ہے کہ یہ ایک امرِ حق ہے اور خدا تعالیٰ بلند اور نہایت بزرگ ہے یعنی یہ وحی اُن حقائق میں سے ہے جن کا ظاہر کرنا اُس العلیّ الکبیر نے قرینِ مصلحت سمجھا ہے تب وہ سب اُس کے ہم کلام ہو جاتے ہیں۔ پھر جبرائیل اُسی وحی کو اُسی جگہ پہنچا دیتا ہے جس جگہ پہنچانے کے لئے اُس کو حکم تھا خواہ آسمان یا زمین۔

اب اِس حدیث سے معلوم ہوُا کہ نزولِ وحی کے وقت جبرائیل آسمان پر ہی ہوتا ہے اور پھر جیسا کہ خدا تعالیٰ نے اس آواز میں قوت اور قدرت بخشی ہے اپنے محل میں اُس وحی کو پہنچا دیتا ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۰۶ تا ۱۰۹)

جب باری تعالیٰ کا ارادہ اس طرف متوجہ ہوتا ہے کہ اپنا کلام اپنے کسی مُلہم کے دل تک پہنچاوے تو اس کی اس متکلمانہ حرکت سے معاً جبریلی نور میں القاء کے لئے ایک روشنی کی موج یا ہوا کی موج یا مُلہم کی تحریک لسان کے لئے ایک حرارت کی موج پَیدا ہو جاتی ہے اور اس میں تموّج یا اس حرارت سے بلا توقف وہ کلام مُلہم کی آنکھوں کے سامنے لکھا ہؤا دکھائی دیتا ہے یا کانوں تک اس کی آواز پہنچتی ہے یا زبان پر وہ الہامی الفاظ جاری ہوتے ہیں اور رُوحانی حواس اور رُوحانی روشنی جو قبل از الہام ایک قوت کی طرح ملتی ہے۔ یہ دونوں قوتیں اِس لئے عطا کی جاتی ہیں کہ تا قبل از نزول الہام الہام کے قبول کرنے کی استعداد پَیدا ہو جائے کیونکہ اگر الہام ایسی حالت میں نازل کیا جاتا کہ مُلہم کا دِل حواسِ رُوحانی سے محروم ہوتا یا رُوح القدس کی روشنی دِل کی آنکھ کو پہنچی نہ ہوتی تو وہ الہامِ الٰہی کو کن آنکھوں کی پاک روشنی سے دیکھ سکتا۔ سو اسی ضرورت کی وجہ سے یہ دونوں پہلے ہی سے مُلہمین کو عطا کی گئیں۔

(توضیح مرام صفحہ ۸۱، ۸۲)

مجھے اس اللہ جلّشانہٗ کی قسم ہے کہ یہ بات واقعی صحیح ہے کہ وحی آسمان سے دل پر ایسی گرتی ہے جیسے کہ آفتاب کی شعاع دیوار پر۔ مَیں ہر روز دیکھتا ہوں کہ جب مکالمۂ الٰہیہ کا وقت آتا ہے تو اوّل ایک دفعہ مجھ پر ایک ربودگی طاری ہوتی ہے تب مَیں ایک تبدیل یافتہ چیز کی مانند ہو جاتا ہوں اور میری حِس اور میرا ادراک اور ہوش گو بگفتن باقی ہوتا ہے مگر اُس وقت مَیں پاتا ہوں کہ گویا ایک وجود شدید الطاقت نے میرے تمام وجود کو اپنی مُٹھی میں لے لیا ہے اور اُس وقت احساس کرتا ہوں کہ میری ہستی کی تمام رگیں اُس کے ہاتھ میں ہیں اور جو کچھ میرا ہے اَب وہ میرا نہیں بلکہ اُس کا ہے۔ جب یہ حالت ہو جاتی ہے تو اُس وقت سب سے پہلے خدا تعالیٰ دِل کے اُن خیالات کو میری نظر کے سامنے پیش کرتا ہے جن پر اپنے کلام کی شعاع ڈالنا اس کو منظور ہوتا ہے تب ایک عجیب کیفیت سے وہ خیالات یکے بعد دیگرے نظر کے سامنے آتے ہیں اور ایسا ہوتا ہے کہ جب ایک خیال مثلاً زید کی نسبت دل میں آیا کہ وہ فلاں مرض سے صحتیاب ہوگا یا نہ ہوگا تو جھٹ اس پر ایک ٹکڑا کلامِ الٰہی کا ایک شعاع کی طرح گرتا ہے اور بسا اوقات اس کے گرنے کے ساتھ تمام بدن ہل جاتا ہے۔ پھر وہ مقدمہ طے ہو کر دوسرا خیال سامنے آتا ہے ادھر وہ خیال نظر کے سامنے کھڑا ہؤا اور ادھر ساتھ ہی ایک ٹکڑا الہام کا اس پر گرا جیسا کہ ایک تیر انداز ہر ایک شکار کے نکلنے پر تیر مارتا ہے اور عین اسی وقت میں محسوس ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ خیالات کا ہماری ملکۂ فطرت سے پَیدا ہوتا ہے اور کلام جو اس پر گرتا ہے وہ اُوپر سے نازل ہوتا ہے۔ اگرچہ شعراء وغیرہ کو بھی سوچنے کے بعد القاء ہوتا ہے مگر اس وحی کو اس سے مناسبت دینا سخت بے تمیزی ہے کیونکہ وہ القاء خوض اور فکر کا ایک نتیجہ ہے اور ہوش و حواس کی قائمی اور انسانیت کی حد میں ہونے کی حالت میں ظہور کرتا ہے لیکن یہ القاء صرف اس وقت ہوتا ہے کہ جب انسان اپنے تمام وجود کے ساتھ خدا تعالیٰ کے تصرف میں آ جاتا ہے اور اپنا ہوش اور اپنا خوض کسی طور سے اُس میں دخل نہیں

رکھتا۔ اُس وقت زبان ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا یہ اپنی زبان نہیں اور ایک دوسری زبردست طاقت اس سے کام لے رہی ہے۔ (برکات الدعا صفحہ ۲۲، ۲۳ حاشیہ)

مَیں نے دیکھا ہے کہ اُس وحی کے وقت جو برنگِ وحی ولایت میرے پر نازل ہوتی ہے ایک خارجی اور شدید الاثر تصرّف کا اِحساس ہوتا ہے اور بعض دفعہ یہ تصرّف ایسا قوی ہوتا ہے کہ مجھ کو اپنے انوار میں ایسا دبا لیتا ہے کہ مَیں دیکھتا ہوں کہ مَیں اُس کی طرف ایسا کھینچا گیا ہوں کہ میری کوئی قوّت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اس تصرّف میں کھلا اور روشن کلام سُنتا ہوں۔ بعض دفعہ ملائکہ کو دیکھتا ہوں اور سچائی میں جو اثر اور ہیبت ہوتی ہے مشاہدہ کرتا ہوں اور وہ کلام بسااوقات غیب کی باتوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ایسا تصرّف اور اخذ خارجی ہوتا ہے جس سے خدا تعالیٰ کا ثبوت ملتا ہے اب اس سے انکار کرنا بھی ایک کُھلی کُھلی صَداقت کا خون کرنا ہے۔ (برکات الدعا صفحہ ۲۶)

وحیٔ الٰہی کے نزول کے وقت کی غنودگی بھی ایک خارق عادت امر ہے۔ یہ جسم کے طبعی اسباب سے پَیدا نہیں ہوتی بلکہ جہاں تک ضرورتوں کا سامان پیش ہو ہر ایک ضرورت اور دعا کے وقت محض قدرت سے غنودگی پَیدا ہو جاتی ہے مادّی اَسباب کا کچھ بھی اس میں دخل نہیں ہوتا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۶۸ حاشیہ)

الہام کے بارے میں ہمارا تجربہ ہے کہ تھوڑی سی غنودگی ہوکر اور بعض اَوقات بغیر غنودگی کے خدا کا کلام ٹکڑہ ٹکڑہ ہوکر زبان پر جاری ہوتا ہے جب ایک ٹکڑہ ختم ہوچکتا ہے تو حالتِ غنودگی جاتی رہتی ہے پھر ملہم کے کسی سوال سے یا خود بخود خدا تعالیٰ کی طرف سے دوسرا ٹکڑہ الہام ہوتا ہے اور وہ بھی اسی طرح کہ تھوڑی غنودگی وارد ہوکر زبان پر جاری ہوجاتا ہے۔ اِسی طرح بسااَوقات ایک ہی وقت میں تسبیح کے دانوں کی طرح نہایت بلیغ فصیح لذیذ فقرے غنودگی کی حالت میں زبان پر جاری ہوتے جاتے ہیں اور ہر ایک فقرہ کے بعد غنودگی دُور ہوجاتی ہے اور وہ فقرے یا تو قرآن شریف کی بعض آیات ہوتی ہیں یا اس کے مشابہ ہوتے ہیں اور اکثر علومِ غیبیہ پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان میں ایک شوکت ہوتی ہے اور دِل پر اثر آتے ہیں اور ایک لذت محسوس ہوتی ہے اس وقت دل نور میں غرق ہوتا ہے گویا خدا اس میں نازل ہوتا ہے اور دراصل اس کو الہام نہیں کہنا چاہیئے بلکہ یہ خدا کا کلام ہے۔

(چشمۂ معرفت صفحہ ۲۰۰ حاشیہ)

وحی کا قاعدہ ہے کہ اجمالی رنگ میں نازل ہُوا کرتی ہے اور اس کے ساتھ ایک تفہیم ہوتی ہے مثلاً جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھنے کا حکم ہُوا تو ساتھ کشفی رنگ میں نماز کا طریق، اس کی رکعات کی تعداد، اوقات نماز وغیرہ بتا دیا گیا تھا۔ علیٰ ھٰذا القیاس۔

جو اصطلاح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کی تفصیل اور تشریح کشفی رنگ میں ساتھ ہوتی ہے جن لوگوں کو وہ اس وحی کے منشاء سے آگاہ کرتا ہے اس کو دوسرے کے دلوں میں داخل کرتا ہے۔ جب سے دُنیا ہے وحی کا یہی طرز

چلا آیا ہے اور کُل انبیاء کی وحی اسی رنگ کی تھی۔ وحی کشفی تصویروں یا تفہیم کے سوا کبھی نہیں ہوئی اور نہ وہ اجمال بجز اس کے کسی کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ ۱۸ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

طبیبوں نے نیند کے لئے طبعی اسباب مقرر کئے ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے کہ ہم سے کلام کرے اُس وقت پوری بیداری میں ہوتے ہیں اور یکدم ربودگی اور غنودگی وارد کر دیتا ہے اور اس جسمانی عالم سے قطعاً باہر لے جاتا ہے اِس لئے کہ اُس عالم سے پوری مناسبت ہو جائے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ جب ایک مرتبہ کلام کر چکتا ہے پھر ہوش وحواس واپس دے دیتا ہے اِس لئے کہ مُلہم اس کو محفوظ کرے۔ اس کے بعد پھر ربودگی طاری کرتا ہے پھر یاد کرنے کے لئے بیدار کر دیتا ہے۔ غرض اِسی طرح کبھی پچاس دفعہ تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ وہ ایک تصرفِ الٰہی ہوتا ہے اس طبعی نیند سے اس کو کوئی تعلق نہیں اور اطباء اور ڈاکٹر اس کی ماہیت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ (الحکم جلد ۴ ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۰ء صفحہ ۱۰)

اِس سوال کے جواب میں کہ وحی کس طرح سے ہوتی ہے؟ فرمایا:

کئی طریق ہیں بعض دفعہ دل میں ایک گونج پیدا ہوتی ہے۔ کوئی آواز نہیں ہوتی۔ پھر اس کے ساتھ ایک شگفتگی پیدا ہوتی ہے اور بعض دفعہ تیزی اور شوکت کے ساتھ ایک لذیذ کلام زبان پر جاری ہوتا ہے جو کسی فکر، تدبر اور وہم وخیال کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ (بدر جلد ۱ ۳۳ مورخہ ۹ر نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

بعض دفعہ الہامِ الٰہی ایسی سُرعت کے ساتھ ہوتا ہے جیسا ایک پرندہ پاس سے نکل جاتا ہے اور اگر اسی وقت لکھ نہ لیا جاوے یا اچھی طرح سے یاد نہ کر لیا جاوے تو بھول جانے کا خوف ہوتا ہے۔

(بدر جلد ۶ ۵ مورخہ ۲۱ر فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

بجز ایک قطعی فیصلہ کے یعنی بجز اِس امر کے کہ دِل اِس یقین سے پُر ہو کہ درحقیقت یہ خدا کا حکم ہے اس کے کرنے کے لئے پوری استقامت حاصل نہیں ہو سکتی خصوصاً بعض امور ایسے ہوتے ہیں کہ ظاہر شرع کو ان پر کچھ اعتراض بھی ہوتا ہے جیسا کہ خضر کے کام پر ظاہر شرع کو سراپا اعتراض تھا۔ نبیوں کی تمام شریعتوں میں سے کسی شریعت میں یہ حکم نہیں کہ ایک بے گناہ بچہ کو قتل کر دو۔ پس اگر خضر کو یہ یقین نہ ہوتا کہ یہ وحی خدا کی طرف سے ہے تو وہ کبھی قتل نہ کرتا اور اگر موسیٰؑ کی ماں کو یقین نہ ہوتا کہ اُس کی وحی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے تو کبھی اپنے بچہ کو دریا میں نہ ڈالتی۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۴۲)

ہم کو تو خدا تعالیٰ کے اس کلام پر جو ہم پر وحی کے ذریعہ نازل ہوتا ہے اس قدر یقین اور علیٰ وجہ البصیرت یقین ہے کہ بیت اللہ میں کھڑا کر کے جس قسم کی چاہو قسم دے دو۔ بلکہ میرا تو یقین یہاں تک ہے کہ اگر میں اِس بات کا اِنکار کروں یا وہم بھی کروں کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں تو معاً کافر

ہو جاؤں۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۴۴ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

میرا تو خدا تعالیٰ کی وحی پر ایسا ہی ایمان ہے جیسے اس کی کتابوں پر ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۸، ۱۹ مورخہ ۸/۱۶ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

مَیں تو اپنی وحی پر ویسے ہی ایمان لاتا ہوں جیسے کہ قرآن شریف اور توریت کے کلامِ الٰہی ہونے پر۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲۲، ۲۳ مورخہ ۸/۱۶ جون ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

ہم تو جو کچھ خدا سے پاتے ہیں خواہ اس کو عقل اور فلسفہ مانے یا نہ مانے ہم اس کو ضرور مانتے اور اس پر ایمان لاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۲۳، ۲۴ مورخہ ۱۰/۲۴ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۶)

مکہ معظمہ میں داخل ہو کر اگر خدا تعالیٰ کی قسم دی جاوے تو مَیں کہوں گا کہ میرے اِلہام خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں جس شخص نے خیالی طور پر دعویٰ کیا ہو وہ ہرگز جرأت نہیں کر سکتا کبھی وہ شخص جو کامل یقین رکھتا ہو اور وہ جو مشکوک ہے برابر ہو سکتے ہیں۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۱۰/۱۷ جون ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

خدا تعالیٰ کا وہ کلام جو مجھ پر اُترتا ہے مَیں اس پر اسی طرح ایمان لاتا ہوں جیسے قرآن شریف پر یعنی جیسے قرآن شریف خدا تعالیٰ ہی کا کلام ہے وہ وحی بھی اسی کی طرف سے ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۵ مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۲)

یہ اِعتقاد کہ وحیٔ نبوت بجز اپنے ہی فطرت کے ملکہ کے اَور کچھ چیز نہیں اور اس میں اور خدا تعالیٰ میں ملائکہ کا واسطہ نہیں کس قدر خدا تعالیٰ کے قانونِ قدرت کے مخالف ہے۔ ہم صریح دیکھتے ہیں کہ ہم اپنے جسمانی قویٰ کی تکمیل کے لئے آسمانی توسط کے محتاج ہیں۔ ہمارے اِس بَدنی سلسلہ کے قیام اور اغراضِ مطلوبہ تک پہنچانے کے لئے خدا تعالیٰ نے آفتاب اور ماہتاب اور ستاروں اور عناصر کو ہمارے لئے مسخر کیا ہے اور کئی وسائط کے پَیرایہ میں ہو کر اس عِلّت العلل کا فیض ہم تک پہنچتا ہے اور بے واسطہ ہرگز نہیں پہنچتا۔

(برکات الدعا صفحہ ۲۵)

نبیوں کے سوا غیر انبیاء سے بھی اللہ تعالیٰ بذریعہ فرشتہ کلام کیا کرتا ہے چنانچہ حضرت ہاجرہؑ سے دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کا مکالمہ ہوا۔ (رسالہ الانذار صفحہ ۷۲)

بعض الہامات کے وقت اگرچہ فرشتہ نظر نہیں آتا تاہم الفاظ کے معانی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام فرشتے کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے مثلاً الہامات میں ایسے الفاظ کہ قَالَ رَبُّكَ اور مَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۴۸ مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

انبیاء اور مُلہمین صرف وحی کی سچائی کے ذمہ دار ہوتے ہیں اپنے اِجتہاد کے کذب اور خلافِ واقعہ نکلنے

سے وہ ماخوذ نہیں ہوسکتے کیونکہ وہ ان کی اپنی رائے ہے نہ خدا کا کلام۔ (اعجاز احمدی صفحہ ۸)

جس کے ساتھ خدا تعالیٰ کا معاملہ وحی اور الہام کے ساتھ ہو وہ خوب جانتا ہے کہ ملہمین کو کبھی اجتہادی طور پر بھی اپنے الہام کے معنے کرنے پڑتے ہیں۔ اِس طرح کے الہام بہت ہیں جو مجھے کئی دفعہ ہوئے ہیں اور بعض وقت ایسا الہام ہوتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس کے کیا معنے ہیں اور ایک مدت کے بعد اس کے معنے کھلتے ہیں۔

(تریاق القلوب صفحہ ۳۲۰ حاشیہ (ایڈیشن ۱۹۷۹ء)

قضاء و قدر کے اسرار چونکہ عمیق در عمیق ہوتے ہیں اِس لئے بعض وقت الہامات اور رؤیا کی تفہیم میں انسان کو غلطی لگ جاتی ہے۔ (البدر جلد ۴ ۲/۶ مورخہ ۱۸ر فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

شاید ہی کوئی ایسی رات گذرتی ہوگی جس میں کوئی نظارہ آئندہ کے متعلق مجھے نہ دکھایا جاتا ہو لیکن بہت سی باتیں صبح تک بھول جاتی ہیں اور توفیق ہی نہیں ہوتی کہ ان کو ایسے وقت میں لکھ لیا جاوے کہ پھر نہ بھولیں۔ اِس میں حکمتِ الٰہی یہ ہے وہ جس بات کو چاہے یاد رکھواتا ہے اور جس کو چاہے بھلوا دیتا ہے۔

(البدر جلد ۶ ۴۷ مورخہ ۲۱ر نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۰)

یہ بات توخود ہر ایک عاقل پر روشن ہے کہ ہر ایک نفس اپنی استعداد اور قابلیت کے موافق انوارِ الٰہیہ کو قبول کرتا ہے اُس سے زیادہ نہیں۔ اس کے سمجھنے کے لئے آفتاب نہایت روشن مثال ہے کیونکہ ہرچند آفتاب اپنی کرنیں چاروں طرف چھوڑ رہا ہے لیکن اس کی روشنی قبول کرنے میں ہر ایک مکان برابر نہیں جس مکان کے دروازے بند ہیں اُس میں کچھ روشنی نہیں پڑسکتی اور جس میں بمقابل آفتاب ایک چھوٹا سا روزنہ ہے اُس میں روشنی تو پڑتی ہے مگر تھوڑی جو بکلی ظلمت کو نہیں اُٹھا سکتی۔ لیکن وہ مکان جس کے دروازے بمقابل آفتاب سب کے سب کھلے ہیں اور دیواریں بھی کسی کثیف شئ سے نہیں بلکہ نہایت مصفّٰی اور روشن شیشہ سے ہیں۔ اُس میں صرف یہی خوبی نہیں ہوگی کہ کامل طور پر روشنی قبول کرے گا بلکہ اپنی روشنی چاروں طرف پھیلا دے گا اور دوسروں تک پہنچا دے گا۔ یہی مثال مؤخر الذکر نفوسِ صافیہ انبیاء کے مطابقِ حال ہے یعنی جن نفوسِ مقدسہ کو خدا اپنی رسالت کے لئے چُن لیتا ہے وہ بھی رفع حُجب اور مکمل صفوت میں اُس شیش محل کی طرح ہوتے ہیں جس میں نہ کوئی کثافت ہے اور نہ کوئی حجاب باقی ہے۔ پس ظاہر ہے کہ جن افرادِ بشریہ میں وہ کمالِ تام موجود نہیں ایسے لوگ کسی حالت میں مرتبۂ رسالتِ الٰہی نہیں پاسکتے بلکہ یہ مرتبہ قسامِ ازل سے انہیں کو ملا ہے جن کے نفوسِ مقدسہ حُجبِ ظلمانی سے بالکل پاک ہیں جن کو اغشیۂ جسمانی سے بغائت درجہ آزادگی ہے جن کا تقدس و تنزہ اُس درجہ پر ہے جس کے آگے خیال کرنے کی گنجائش نہیں۔ وہی نفوسِ تامہ کاملہ وسیلۂ ہدایت جمیع مخلوقات ہیں اور جیسے حیات کا فیضانِ عام تمام اعضاء کو قلب کے ذریعہ سے ہوتا ہے ایسا ہی حکیم مطلق نے ہدایت کا فیضان انہیں کے ذریعہ سے مقرر کیا ہے کیونکہ وہ کامل مناسبت

جو فیض اور مستفیض میں چاہیئے وہ صرف انہیں کو عنایت کی گئی ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۷، حاشیہ)

الہام کا مسئلہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ انسان کو اپنے اعمال صاف کرنا چاہیئے۔ الہام کا مہبط صاف ہونا چاہیئے۔ اب جو خدا تعالیٰ کی چلائی ہوئی ہوا چل رہی ہے یہی ہوا بعض انسانوں کے جسموں کے لئے مفید اور بعض کے لئے مفسد ہوگی۔ اگر کسی کا اندر غلیظ ہو معدہ گندہ ہو اور بیمار ہو تو اس کو اچھی غذا مضر ہوگی ایسا ہی خدا کا کلام ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

اولیاء اللہ کے ملہم من اللہ ہونے سے انکار کرنا ہر ایک مسلمان سے بعید ہے اور مولوی صاحبوں سے بعید تر۔ کیا مولوی صاحب کو معلوم نہیں کہ حضرت موسیٰ کی والدہ سے بطور الہام خدا کا کلام کرنا۔ مریمؑ سے بطور الہام خدا کا کلام کرنا۔ حواریوں سے بطور الہام خدا کا کلام کرنا خود قرآن شریف میں مندرج اور مرقوم ہے حالانکہ ان میں سے نہ کوئی نبی تھا اور نہ کوئی رسول تھا۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۱۹ حاشیہ)

یہ الزام کہ صحابہ کرامؓ سے ایسے الہامات ثابت نہیں ہوئے بالکل بیجا اور غلط ہے کیونکہ احادیثِ صحیحہ کے رُو سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے الہامات اور خوارق بکثرت ثابت ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ساریہ کے لشکر کی خطرناک حالت سے باعلامِ الٰہی مطلع ہو جانا جس کو بیہقی نے ابنِ عمرؓ سے روایت کیا ہے اگر الہام نہیں تھا تو اَور کیا تھا اور پھر ان کی یہ آواز کہ یَا سَارِيَةُ اَلْجَبَلَ اَلْجَبَلَ مدینہ میں بیٹھے ہوئے مونہہ سے نکلنا اور وہی آواز قدرتِ غیبی سے ساریہ اور اس کے لشکر کو دُور دراز مسافت سے سُنائی دینا اگر خارق عادت نہیں تو اَور کیا چیز تھی۔ اِسی طرح جنابِ علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کے بعض الہامات و کشوف مشہور و معروف ہیں۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۴۷ حاشیہ در حاشیہ)

صاحبِ وحی، محدثیت اپنے نبی متبوع کا پورا ہمرنگ ہوتا ہے اور بغیر نبوت اور تجدیدِ احکام کے وہ سب باتیں اُس کو دی جاتی ہیں جو نبی کو دی جاتی ہیں اور اُس پر یقینی طور پر سچی تعلیم ظاہر کی جاتی ہے اور نہ صرف اسی قدر بلکہ اُس پر وہ سب امور بطور انعام و اکرام کے وارد ہو جاتے ہیں جو نبی متبوع پر وارد ہوتے ہیں سو ان کا بیان محض اٹکلیں نہیں ہوتیں بلکہ وہ دیکھ کر کہتا ہے اور سُن کر بولتا ہے اور یہ راہ اس اُمت کے لئے کُھلی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وارثِ حقیقی کوئی نہ رہے۔ (برکات الدعا صفحہ ۲۰)

محدث وہ لوگ ہیں جو شرفِ مکالمہ الٰہی سے مشرف ہوتے ہیں اور اُن کا جوہرِ نفس انبیاء کے جوہرِ نفس سے اشد مشابہت رکھتا ہے اور وہ خواص عجیبہ نبوت کے لئے بطور آیاتِ باقیہ کے ہوتے ہیں تا یہ دقیق مسئلہ نزولِ وحی کا کِسی زمانہ میں بے ثبوت ہو کر صرف بطور قصہ کے نہ ہو جائے۔ (برکات الدعا صفحہ ۲۳، ۲۴)

الہامِ محدث کا شیطانی دخل سے منزہ کیا جاتا ہے۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۲۲)

جس طرح نبی اور رسُول کی وحی محفوظ ہوتی ہے اسی طرح محدّث کی وحی بھی محفوظ ہوتی ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

کیا عام لفظوں میں کسی حدیث میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بعض گذشتہ رسولوں میں سے پھر اس اُمت میں آئیں گے جیسا کہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے مثیل آئیں گے اور امثل آئیں گے جو فطرتاً انبیاء سے بہت اقرب ہیں سو جن کے آنے کا صاف طور پر بلا تعارض وعدہ دیا گیا ہے اُن سے مُنہ مت پھیرو اور اُن کے اِلہام سے بھی شہادت کا فائدہ اُٹھاؤ کیونکہ اُن کی گواہی اِس بات کو کھولتی ہے جو تم اپنی عقلوں سے نہیں کھول سکتے۔ آسمانی گواہی کے رَدّ کرنے میں جرأت نہ کرو کیونکہ یہ بھی اُسی پاک چشمہ سے نکلی ہے جس سے وحیٔ نبوت نکلی ہے سو یہ وحی کے معنے کی شارح اور صراطِ مستقیم کو دکھلانے والی ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۵۲۲)

اِلہامِ ولایت یا اِلہامِ عامہ مومنین بجز موافقت و مطابقت قرآن کریم کے حُجّت بھی نہیں۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۶۲۹)

اِلہام اور کشف کا مسئلہ اسلام میں ایسا ضعیف نہیں سمجھا گیا کہ جس کا نورانی شعلہ صرف عوام النّاس کے مُنہ کی پھونکوں سے منطفی ہو سکے۔ یہی ایک صداقت تو اِسلام کے لئے وہ اعلیٰ درجہ کا نشان ہے جو قیامت تک بے نظیر شان و شوکت اِسلام کی ظاہر کر رہا ہے یہی تو وہ خاص برکتیں ہیں جو غیر مذہب والوں میں پائی نہیں جاتیں۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۱۵۳)

مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر رُوحوں میں سچی تلاش پَیدا ہو اور دلوں میں سچی پیاس لگ جائے تو لوگ اس طریق کو ڈھونڈیں اور اُس راہ کی تلاش میں لگیں مگر یہ راہ کس طریق سے کھُلے گی اور حجاب کس دوا سے اُٹھے گا مَیں سب طالبوں کو یقین دلاتا ہوں کہ صرف اِسلام ہی ہے جو اس راہ کی خوشخبری دیتا ہے اور دوسری قومیں تو خدا کے الہام پر مدّت سے مُہر لگا چکی ہیں۔ (اِسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۸۵ (ایڈیشن ستمبر ۱۹۶۷ء))

یہ یقیناً یاد رکھو کہ وحی اور الہام کے سِلسلہ کے متعلق خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں اکثر جگہ وعدے کئے ہیں اور یہ اسلام ہی سے مخصوص ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

خواص اور عام کی خوابیں اور وہ مکاشفات اپنی کیفیت اور کمیت اتّصالی و انفصالی کے طور پر نعمتِ غیبی کا حصّہ لیتے ہیں۔ دُنیا ان نعمتوں میں جو انہیں عطا کی جاتی ہیں صرف ایسے طور کی شریک ہے جیسے شاہِ وقت کے خزانہ کے ساتھ ایک گدا دریُوزہ گر ایک درم کے حاصل رکھنے کی وجہ سے شریک خیال کیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ اِس اَدنیٰ مشارکت کی وجہ سے نہ بادشاہ کی شان میں کچھ شکست آسکتی ہے اور نہ اس گدا کی کچھ شان بڑھ سکتی ہے۔

(توضیح مرام صفحہ ۸۷)

وَكَانَ يَكْفِيكُمْ مِنْ فَخْرٍ اَنَّ اللّٰهَ افْتَتَحَ وَحْيَهٗ مِنْ اٰدَمَ وَخَتَمَ عَلٰى نَبِيٍّ كَانَ مِنْكُمْ وَمِنْ اَرْضِكُمْ وَطَنًا وَمَاوًى وَمَوْلِدًا۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۲۰)

اگر یہ کہا جائے کہ انہیں احادیث کی کتابوں میں بعض امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجتہادی غلطی کا بھی ذکر ہے۔ اگر کل قول و فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وحی تھا تو پھر وہ غلطی کیوں ہوئی۔ گو آنحضرتؐ اس پر قائم نہیں رکھے گئے تو اس کا یہ جواب ہے کہ وہ اجتہادی غلطی بھی وحی کی روشنی سے دُور نہیں تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے قبضہ سے ایک دم جُدا نہیں ہوتے تھے۔ پس اس اجتہادی غلطی کی ایسی ہی مثال ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں چند دفعہ سہو واقع ہؤا تا اُس سے دین کے مسائل پَیدا ہوں۔ سو اِسی طرح بعض اوقات اجتہادی غلطی ہوئی تا اس سے بھی تکمیلِ دین ہو اور بعض باریک مسائل اس کے ذریعہ سے پَیدا ہوں اور وہ سہوِ بشریّت بھی تمام لوگوں کی طرح سہو نہ تھا بلکہ دراصل ہم رنگ وحی تھا کیونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص تصرّف تھا جو نبی کے وجود پر حاوی ہو کر اس کو کبھی ایسی طرف مائل کر دیتا تھا جس میں خدا تعالیٰ کے بہت مصالح تھے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۱۳ تا ۱۱۵)

قرآن شریف جو تمام کتابوں اور علوم کا خاتمہ کرتا ہے اِس لئے وہ بڑی اقویٰ وحی ہے اور شدّت کے ساتھ اس کا نزول تھا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۸ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر ایک الہام کے لئے وہ سُنّت اللہ بطور امام اور مُہیمن اور پیش رَو کے ہے جو قرآن کریم میں وارد ہو چکی ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی الہام اس سُنّت کو توڑ کر ظہور میں آوے کیونکہ اس سے پاک نوشتوں کا باطل ہونا لازم آتا ہے۔ (ضمیمہ انوار الاسلام صفحہ ۹۱۔ ایڈیشن ۱۹۶۱ء)

اِنَّهٗ مُعْجِزَةٌ لَا يَأْتِيْ بِمِثْلِهٖ اَحَدٌ مِنَ الْاِنْسِ وَالْجَانِّ۔ وَاِنَّهٗ جَمَعَ مَعَارِفَ وَمَحَاسِنَ لَا يَجْمَعُهَا عِلْمُ الْاِنْسَانِ بَلْ اِنَّهٗ وَحْيٌ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ غَيْرُهٗ وَاِنْ كَانَ بَعْدَهٗ وَحْيًا اٰخَرَ مِنَ الرَّحْمَانِ فَاِنَّ لِلّٰهِ تَجَلِّيَاتٍ

ترجمہ از مرتب: فخر کے لحاظ سے تمہیں یہ بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کیا اور ایک ایسے عظیم الشان نبی پر اُسے ختم کیا جو تم میں سے تھا اور تمہاری زمین اس کا وطن، ماویٰ اور جائے پَیدائش تھی۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۲۰)

ترجمہ از اصل:۔ قرآن کریم معجزہ ہے جس کی مثل کوئی اِنس وجِنّ نہیں لاسکتا اور اس میں وہ معارف اور خوبیاں جمع ہیں جنہیں اِنسانی علم جمع نہیں کرسکتا بلکہ وہ ایسی وحی ہے کہ اس کی مثل اَور کوئی وحی بھی نہیں اگرچہ رحمٰن کی طرف سے اس کے بعد اَور کوئی وحی بھی ہو اِس لئے کہ وحی رسانی میں خدا کی تجلیات

فِیْ اِبْحَانِہٖ وَاِنَّہٗ مَا تَجَلّٰی مِنْ قَبْلُ وَلَا یَتَجَلّٰی مِنْ بَعْدُ کَمِثْلِ تَجَلِّیْہِ لِخَاتَمِ الْاَنْبِیَآءِ وَلَیْسَ شَانُ وَحْیِ الْاَوْلِیَآءِ کَمِثْلِ شَانِ وَحْیِ الْفُرْقَانِ وَاِنْ اُوْحِیَ اِلَیْھِمْ کَلِمَۃٌ کَمِثْلِ کَلِمَاتِ الْقُرْاٰنِ۔ فَاِنَّ دَائِرَۃَ مَعَارِفِ الْقُرْاٰنِ اَکْبَرُ الدَّوَائِرِ وَاِنَّھَا اَحَاطَ الْعُلُوْمَ کُلَّھَا وَجَمَعَ فِیْ نَفْسِھَا اَنْوَاعَ السَّرَائِرِ وَبَلَغَتْ دَقَائِقُھَا اِلَی الْمَقَامِ الْعَمِیْقِ الْغَائِرِ وَسَبَقَ الْکُلَّ بَیَانًا وَبُرْھَانًا وَزَادَ عِرْفَانًا۔ وَاِنَّہٗ کَلَامُ اللّٰہِ الْمُعْجِزُ مَا قَرَعَ مِثْلُہٗ اٰذَانًا وَلَا یَبْلُغُہٗ قَوْلُ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ شَانًا۔ (الھُدٰی صفحہ ۳۲، ۳۳)

اللہ تعالیٰ کا منشاء ہے کہ قرآن شریف کو حل کیا جائے اِس واسطے اکثر الہامات جو قرآن شریف کے الفاظ میں ہوتے ہیں ان کی ایک عملی تفسیر ہو جاتی ہے۔ اس سے خدا تعالیٰ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ یہی زندہ اور بابرکت زبان ہے اور تا کہ ثابت ہو جائے کہ تیرہ سَو سال اس سے قبل ہی اسی طرح پہ خدا کا کلام نازل ہؤا۔

(الحکم جلد ۶ ۱۵ مورخہ ۲۴ ؍اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اِتباع کے سوا اگر ہم کسی اَور راستہ پہ چلتے تو ہماری کثرتِ الہام کسی دوسری زبان میں ہوتی مگر جب کہ اسی خدا، اسی کی کتاب اور اسی نبی کے اتباع پر ہم چلانا چاہتے ہیں تو پھر ہم کیوں عربی زبان میں مثل لانے کی تحدّی نہ کریں۔ (الحکم جلد ۷ ۱۶ مورخہ ۳۰ ؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

وَمَعَ ذٰلِکَ کُنْتُ حَرَّجْتُ عَلٰی نَفْسِیْ اَنْ لَّا اَتَّبِعَ اِلْھَامًا اَوْ کُرِّرَ مِنَ اللّٰہِ اِعْلَامًا وَّیُوَافِقَ الْقُرْاٰنَ وَالْحَدِیْثَ مَرَامًا وَّیَنْطَبِقَ انْطِبَاقًا تَامًّا ثُمَّ کَانَ شَرْطٌ مِّنِّیْ لِھٰذَا الْاِیْعَازِ اَنْ لَّا اَقْبَلَہٗ مِنْ غَیْرِ اَنْ اَنْظُرَ اِلَی الْاَحْیَازِ وَمِنْ غَیْرِ اَنْ اُشَاھِدَ بَدَائِعَ الْاِعْجَازِ فَوَاللّٰہِ رَاَیْتُ فِیْ اِلْھَامِیْ جَمِیْعَ ھٰذِہٖ

ہیں اور یہ یقینی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کی تجلّی جیسی کہ خاتم الانبیاء پر ہوئی ایسی کسی پر نہ پہلے ہوئی اور نہ کبھی پیچھے ہوگی اور جو شان قرآن کی وحی کی ہے وہ اولیاء کی وحی کی شان نہیں اگرچہ قرآن کے کلمات کی مانند کوئی کلمہ انہیں وحی کیا جائے۔ اِس لئے کہ قرآن کے معارف کا دائرہ سب دائروں سے بڑا ہے اور اس میں سارے علوم اور ہر طرح کی عجیب اور پوشیدہ باتیں جمع ہیں اور اس کی دقیق باتیں بڑے اعلیٰ درجہ کے گہرے مقام تک پہنچی ہوئی ہیں اور وہ بیان اور بُرہان میں سب سے بڑھ کر اور اس میں سب سے زیادہ عرفان ہے اور وہ خدا کا معجز کلام ہے جس کی مثل کانوں نے نہیں سُنا اور اس کی شان کو جن و انس کا کلام نہیں پہنچ سکتا۔ (الھُدٰی صفحہ ۳۲، ۳۳)

ترجمہ از ناشر :۔ باوجود اِس کے کہ مَیں نے اپنے نفس پر یہ تنگی کر رکھی تھی کہ مَیں کسی الہام کی پیروی نہ کروں مگر بعد اس کے کہ بار بار خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کا اعلام ہو اور قرآن اور حدیث سے بکلّی موافق ہو اور پوری پوری مطابقت ہو۔ پھر اس کارروائی کے لئے ایک یہ شرط بھی میری طرف سے تھی کہ مَیں الہام کے بارے میں اس کے کناروں تک نظر

الْاَشْرَاطِ وَوَجَدْتُهٗ حَدِیْقَةَ الْحَقِّ لَا کَالْحِمَاطِ۔ (نجم الھدٰی صفحہ ۱۱)

وَقَدْ ذَکَرْتُ اَنَّ اِلْهَامَاتِیْ مَمْلُوَّۃٌ مِّنْ اَنْبَاءِ الْغَیْبِ۔ وَاِنَّ غَیْبَ الْبَحْتِ قَدْ خُصَّ بِذَاتِ اللّٰهِ مِنْ غَیْرِ الشَّکِّ وَالرَّیْبِ۔ وَلَا یُمْکِنُ اَنْ یُّظْهِرَ اللّٰهُ عَلٰی غَیْبِهٖ رَجُلًا فَاسِدَ الرَّوِیَّةِ وَخَاطِبَ الدُّنْیَا الدَّنِیَّةِ۔ اَیُحِبُّ اللّٰهُ اِمْرَأً بَسَطَ مَکِیْدَۃً ۔ شِبَاکَ الرَّدٰی وَاَضَلَّ النَّاسَ وَمَا هَدٰی وَاَضَرَّ الْمِلَّةَ کَالْعِدَا۔ وَمَا جَلّٰی مَطْلَعَهَا بِنُوْرِ صِدْقِهٖ وَمَا رَاحَ بِهَمِّهَا وَمَا غَدَا۔ بَلْ زَادَ بِکِذْبِهٖ صَدَاءَ الْاَذْهَانِ۔ وَنَشَرَ بِمُفْتَرِیَاتِهٖ هَبَاءَ الْاِفْتِتَانِ۔ کَلَّا بَلْ اِنَّهٗ یُخْزِی الْمُفْتَرِیْنَ وَیَقْطَعُ دَابِرَ الدَّجَّالِیْنَ۔ وَیُلْحِقُهُمْ بِالْمَلْعُوْنِیْنَ السَّابِقِیْنَ۔

(نجم الھدٰی صفحہ ۱۲)

۳۲ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍۙ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر دو عظیم الشان نبی گزرے ہیں ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ مگر ان دونوں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اُن میں کسی کی نسبت نبیٔ اُمّی ہونے کا دعویٰ

ڈالوں اور بغیر مشاہدہ خوارق کے قبول نہ کروں پس بخدا کہ مَیں نے اپنے الہام میں ان تمام شرطوں کو پایا اور مَیں نے اس کو سچائی کا باغ دیکھا نہ اس خشک گھاس کی طرح جس میں سانپ ہو۔ (نجم الہدٰی صفحہ ۱۱)

ترجمہ از اصل :- میرے الہام غیب کی پیشگوئیوں سے بھرے ہوئے ہیں اور غیب اللہ جلّ شانہٗ کی ذات سے خاص ہے اور ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے غیب پر اس شخص کو پورا غلبہ بخشے جو فاسد الخیال اور دُنیا کا چاہنے والا ہے۔ کیا خدا ایسے آدمی کو دوست پکڑ سکتا ہے جس نے ہلاکت کی دام محض فریب کی راہ سے بچھائی اور لوگوں کو گمراہ کیا اور ہدایت نہ کی اور دینِ اسلام کو دشمنوں کی طرح ضرر پہنچایا اور نورِ صدق سے اس کے مطلع کو روشن نہ کیا اور اس کی غم خواری میں نہ کبھی صبح کی اور نہ شام اور اس کی اصلاح کے لئے کچھ تگ و دَو نہ کی بلکہ اپنے جھوٹوں کے ساتھ ذہنوں کا زنگ بڑھایا اور اپنے افتراء کی باتوں کے ساتھ اُمت میں فتنہ کی گرد و غبار پیدا کر دی نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ مفتریوں کو رُسوا کرتا اور ان کی جڑ کاٹ کر ان کے ساتھ ان کو ملا دیتا ہے جو اُن سے پہلے لعنت کئے گئے ہیں۔ (نجم الہدٰی صفحہ ۱۲)

نہیں کیا گیا یہ تحدی اور دعوی ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا چنانچہ فرمایا ہے مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ الخ

(الحکم جلد ۴ ۱۳ مورخہ ۷ اپریل ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

یاد رکھو کہ ہر ایک نبی کو جب تک وحی نہ ہو وہ کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ ہر ایک چیز کی اصل حقیقت تو وحی الٰہی سے ہی کھلتی ہے یہی وجہ تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ یعنی تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا چیز ہے؟ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی وحی آپ پر ہوئی تو پھر قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ[1] آپ کو کہنا پڑا۔ اسی طرح آپ کے زمانۂ وحی سے پیشتر مکّہ میں بُت پرستی اور شرک فسق و فجور ہوتا تھا لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ وحی الٰہی کے آنے سے پہلے بھی آپ نے بُتوں کے خلاف وعظ کیا اور تبلیغ کی تھی لیکن جب فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ[2] کا حکم ہوا تو پھر ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہیں کی اور ہزاروں مشکلات اور مصائب کی بھی پرواہ نہیں کی۔ بات یہی ہے کہ جب کسی امر کے متعلق وحی الٰہی آجاتی ہے تو پھر مامور اس کے پہنچانے میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے اور اس کا چھپانا اسی طرح شرک سمجھتے ہیں جس طرح وحی الٰہی کے اعلان پانے کے بغیر کسی امر کی اشاعت شرک سمجھتے ہیں۔ (الحکم جلد ۷ ۳۱ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

اور اسی طرح ہم نے اپنے امر سے تیری طرف ایک رُوح نازل کی ہے۔ تجھے معلوم نہ تھا کہ کتاب اور ایمان کسے کہتے ہیں پر ہم نے اُس کو ایک نور بنایا ہے جس کو ہم چاہتے ہیں بذریعہ اُس کے ہدایت دیتے ہیں اور بہ تحقیق سیدھے راستہ کی طرف تو ہدایت دیتا ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۷۷)

○

[1] سورۃ الانعام: ۱۵ [2] سورۃ الحجر: ۹۵

سُورۃ الزّخرف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ○

قرآن کریم کی محکمات اور بیّنات علم ہے اور مخالف قرآن کے جو کچھ ہے وہ ظن ہے اور جو شخص علم ہوتے ہوئے ظن کا اِتباع کرے وہ اِس آیت کے نیچے داخل ہے مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۔

(الحق لدھیانہ صفحہ ۹۲)

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ○ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ○

کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن مکہ اور طائف کے بڑے بڑے مالداروں اور رئیسوں میں سے کسی بھاری رئیس اور

دولت مند پر کیوں نازل نہ ہوا تا اس کی رئیسانہ شان کے شایاں ہوتا اور نیز اس کے رُعب اور ریاست اور مال خرچ کرنے سے جلد تر دین پھیل جاتا۔ ایک غریب آدمی جس کے پاس دُنیا کی جائیداد میں سے کچھ بھی نہیں کیوں اس عہدے سے ممتاز کیا گیا) پھر آگے بطور جواب فرمایا) اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ کیا قسامِ ازل کی رحمتوں کا تقسیم کرنا اُن کا اختیار ہے یعنی یہ خداوند حکیم مطلق کا فعل ہے کہ بعضوں کی استعدادیں اور ہمتیں پست رکھیں اور وہ زخارفِ دُنیا میں پھنسے رہے اور رئیس اور امیر اور دولت مند کہلانے پر پھولتے رہے اور اصل مقصود کو بھول گئے اور بعض کو فضائل روحانیت اور کمالاتِ قدسیہ عنایت فرمائے اور وہ اس محبوبِ حقیقی کی محبت میں محو ہو کر مقرب بن گئے اور مقبولانِ حضرت احدیت ہو گئے۔ پھر بعد اس کے اس حکمت کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو اس اختلافِ استعدادات اور تباینِ خیالات میں مخفی ہے نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ الخ یعنی ہم نے اِس لئے بعض کو دولت مند اور بعض کو درویش اور بعض کو لطیف طبع اور بعض کو کثیف طبع اور بعض طبیعتوں کو کسی پیشہ کی طرف مائل اور بعض کو کسی پیشہ کی طرف مائل رکھا ہے تا اُن کو یہ آسانی پیدا ہو جائے کہ بعض کے لئے بعض کاربرار اور خادم ہوں اور صرف ایک پر بھار نہ پڑے اور اِس طور پر مہماتِ بنی آدم بآسانی تمام چلتے رہیں۔ اور پھر فرمایا کہ اِس سلسلہ میں دُنیا کے مال و متاع کی نسبت خدا کی کتاب کا وجود زیادہ تر نفع رساں ہے۔ یہ ایک لطیف اشارہ ہے جو ضرورتِ الہام کی طرف فرمایا۔ تفصیل اِس کی یہ ہے کہ اِنسان مدنی الطبع ہے اور بجز ایک دوسرے کی مدد کے کوئی امر اس کا انجام پذیر نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک روٹی کو دیکھئے جس پر زندگانی کا مدار ہے اُس کے طیار ہونے کے لئے کس قدر تمدن و تعاون درکار ہے۔ زراعت کے تردد سے لیکر اُس وقت تک کہ روٹی پک کر کھانے کے لائق ہو جائے بیسیوں پیشہ وروں کی اعانت کی ضرورت ہے۔ پس اِس سے ظاہر ہے کہ عام امورِ معاشرت میں کس قدر تعاون اور باہمی مدد کی ضرورت ہوگی۔ اِسی ضرورت کے اِنصرام کیلئے حکیمِ مطلق نے بنی آدم کو مختلف طبیعتوں اور استعدادوں پر پیدا کیا تا ہر ایک شخص اپنی استعداد اور میلِ طبع کے موافق کسی کام میں بہ طیبِ خاطر مصروف ہو۔ کوئی کھیتی کرے۔ کوئی آلاتِ زراعت بناوے۔ کوئی آٹا پیسے۔ کوئی پانی لادے۔ کوئی روٹی پکاوے۔ کوئی سُوت کاتے۔ کوئی کپڑا بُنے۔ کوئی دوکان کھولے۔ کوئی تجارت کا اسباب لاوے۔ کوئی نوکری کرے۔ اور اِس طرح پر ایک دوسرے کے معاون بن جائیں اور بعض کو بعض مدد پہنچاتے رہیں۔ پس جب ایک دوسرے کی معاونت ضروری ہوئی تو اُن کا ایک دوسرے سے معاملہ پڑنا بھی ضروری ہو گیا۔ اور جب معاملہ اور معاوضہ میں پڑ گئے اور اس پر غفلت بھی جو استغراقِ امورِ دُنیا کا خاصہ ہے عائد حال ہو گئی تو اُن کے لئے ایک ایسے قانونِ عدل کی ضرورت پڑی جو اُن کو ظلم اور تعدی اور بُغض اور فساد اور غفلت من اللہ سے روکتا رہے تا نظامِ عالم میں اَبتری واقع نہ ہو کیونکہ معاش و معاد کا تمام مدار انصاف و خداشناسی پر ہے اور التزامِ انصاف و خداترسی ایک قانون پر موقوف ہے جس میں دقائقِ معدلت و حقائقِ معرفتِ الٰہی بدرستی تمام درج ہوں اور سہواً یا عمداً کسی نوع کا ظلم یا کسی نوع کی غلطی نہ پائی

جاوے۔ اور ایسا قانون اُسی کی طرف سے صادر ہو سکتا ہے جس کی ذات سہو و خطا و ظلم و تعدّی سے بکلّی پاک ہو اور نیز اپنی ذات میں واجب الانقیاد اور واجب التعظیم بھی ہو۔ کیونکہ گو کوئی قانون عمدہ ہو مگر قانون کا جاری کرنے والا اگر ایسا نہ ہو جس کو باعتبار مرتبہ اپنے کے سب پر فوقیت اور حکمرانی کا حق ہو۔ یا اگر ایسا نہ ہو جس کا وجود لوگوں کی نظر میں ہر ایک طور کے ظلم و خبث اور خطا اور غلطی سے پاک ہو تو ایسا قانون اوّل تو چل ہی نہیں سکتا اور اگر کچھ دن چلے بھی تو چند ہی روز میں طرح طرح کے مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں اور بجائے خیر کے شر کا موجب ہو جاتا ہے۔ اِن تمام وجوہ سے کتابِ الٰہی کی حاجت ہوئی کیونکہ ساری نیک صفتیں اور ہر ایک طور کی کمالیت و خوبی صرف خدا ہی کی کتاب میں پائی جاتی ہے وبس۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۸۸ تا ۹۰ حاشیہ)

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ ہم نے تمہارے کھانے پینے اور دوسری حاجات کی چیزیں تم میں تقسیم کر دی ہیں کسی کو تھوڑی اور کسی کو بہت دی ہیں اور بعض کا بعض سے مرتبہ زیادہ کر دیا ہے۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۲)

۳۶ وَزُخْرُفًا ۚ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ○

ابتداءً انبیاء علیہم السلام اور ماموروں کی مخالفت اور اُن کی تعلیم سے بے پروائی ظاہر کی جاتی ہے۔ آخر ایک وقت آجاتا ہے کہ اس نیکی کے بروز اور کمال کی طرف توجہ ہو جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

قدیم سے برگزیدہ لوگوں کے ساتھ سُنّت اللہ ہے کہ وہ ورطۂ عظیمہ میں ڈالے جاتے ہیں لیکن نہ اِس لئے کہ غرق کئے جاویں بلکہ اِس لئے کہ اُن موتیوں کے وارث ہوں جو دریائے وحدت کی تہ میں ہیں۔ وہ آگ میں ڈالے جاتے ہیں نہ اِس لئے کہ جلائے جائیں بلکہ اِس غرض کے لئے کہ خدا تعالیٰ کی قدرت کا تماشا دکھایا جاوے۔ غرض ان سے ٹھٹھا کیا جاتا ہے اور ہنسی کی جاتی ہے۔ اُن پر لعنت کرنا ثواب کا کام سمجھا جاتا ہے یہاں تک کہ خدا تعالیٰ اپنا جلوہ دکھاتا ہے اور اپنی نصرت کی چمکار دکھاتا ہے۔ اس وقت دُنیا کو ثابت ہو جاتا ہے اور غیرتِ الٰہی اس غریب کے لئے جوش مارتی ہے اور ایک ہی تجلّی میں اعداء کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ سو اوّل نوبت دشمنوں کی ہوتی ہے اور آخر میں اُس کی باری آتی ہے۔ اس کی طرف خدا تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ پھر خدا تعالیٰ کے ماموریں پر مصائب اور مشکلات کے آنے کا ایک یہ بھی سِرّ ہوتا ہے تا اُن کے اَخلاق کے نمونے دُنیا کو دکھائے

جاویں اور اس عظیم الشان بات کو دکھائے جو ایک معجزہ کے طور پر اُن میں ہوتی ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۴، ۲۵ مورخہ ۳۰ جون و ۱۰ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

آیت ۳۷ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ○

جو شخص قرآن کریم سے اعراض کرے اور جو اس کے صریح مخالف ہے اس کی طرف مائل ہو ہم اس پر شیطان مسلط کر دیتے ہیں کہ ہر وقت اس کے دل میں وساوس ڈالتا ہے اور حق سے اس کو پھیرتا ہے اور نابینائی کو اس کی نظر میں آراستہ کرتا ہے اور ایک دَم اس سے جُدا نہیں ہوتا۔ اب اگر ہم کسی ایسی حدیث کو قبول کر لیں جو صریح قرآن کی مخالف ہے تو گویا ہم چاہتے ہیں کہ شیطان ہمارا دن رات کا رفیق ہو جائے اور اپنے وساوس میں ہمیں گرفتار کرے اور ہم پر نابینائی طاری ہو اور ہم حق سے بے نصیب رہ جائیں۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۳۵)

آیت ۴۴، ۴۵ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ○

قرآن کریم کو ہر ایک امر میں دستاویز پکڑو۔ تم سب کا اِسی میں شرف ہے کہ تم قرآن کو دستاویز پکڑو اور اس کو مقدم رکھو۔ اب اگر ہم مخالفتِ قرآن اور حدیث کے وقت میں قرآن کو دستاویز نہ پکڑیں تو گویا ہماری یہ مرضی ہوگی کہ جس شرف کا ہم کو وعدہ دیا گیا ہے اس شرف سے محروم رہیں۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۳۵)

آیت ۵۱ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ○

اگر وہ اس سُنّت اللہ سے خبر رکھتے جس کو قرآن کریم نے پیش کیا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (سورۃ الزخرف) تو جلدی کر کے اپنے تئیں ندامت کے گڑھے میں نہ ڈالتے مگر ضرور تھا کہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے اِس زمانہ کے لئے پہلے سے فرمایا تھا وہ سب پورا ہوتا۔ (انوار الاسلام صفحہ ۹۰)

آیت ۶۰ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۶۲﴾

اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ کے یہ معنے ہیں کہ یہودیوں کے اِدبار اور ذلّت کی نشانی مسیح کے آنے کا وقت تھا اور جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بھی اسی کی تصدیق کرتا ہے۔ ساعة کے معنی آخرت کے بھی ہیں۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۳ مورخہ ۱۴؍ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۸)

اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا۔ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ اِس آیت کو پیش کر کے قیامت کے منکرین کو ملزم کرنا چاہتا ہے کہ تم اِس نشان کو دیکھ کر پھر مُردوں کے جی اُٹھنے سے کیوں شک میں پڑے ہو۔ سو اِس آیت پر غور کر کے ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اس کو حضرت عیسیٰؑ کے نزول سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ آیت تو یہ بتلا رہی ہے کہ وہ نشان مُردوں کے جی اُٹھنے کا اَب موجود ہے اور منکرین کو ملزم کر رہی ہے کہ اَب بھی تم کیوں شک کرتے ہو۔ اب ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کا اِس آیت میں یہ مطلب ہے کہ جب حضرت مسیحؑ آسمان سے نازل ہوں گے تب اُن کا آسمان سے نازل ہونا مُردوں کے جی اُٹھنے کے لئے بطور دلیل یا علامت کے ہوگا تو پھر اس دلیل کے ظہور سے پہلے خدا تعالیٰ لوگوں کو کیونکر ملزم کر سکتا ہے۔ کیا اِس طرح اتمامِ حجت ہو سکتا ہے؟ کہ دلیل تو ابھی ظاہر نہیں ہوئی اور کوئی نام ونشان اس کا پَیدا نہیں ہُوا اور پہلے سے ہی منکرین کو کہا جاتا ہے کہ اب بھی تم کیوں یقین نہیں کرتے۔ کیا اُن کی طرف سے یہ عذر صحیح طور پر نہیں ہو سکتا کہ یا الٰہی ابھی دلیل یا نشان قیامت کا کہاں ظہور میں آیا جس کی وجہ سے فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا کی دھمکی ہمیں دی جاتی ہے۔ کیا یہ اتمامِ حجت کا طریق ہے؟ کہ دلیل تو ابھی پردۂ غیب میں ہو اور یہ سمجھا جائے کہ الزام پورا ہو گیا ہے ایسے معنے قرآن شریف کی طرف منسوب کرنا گویا اس کی بلاغت اور پُرحکمت بیان پر دھبہ لگانا ہے۔ سچ ہے کہ بعض نے یہی معنے کئے ہیں مگر انہوں نے سخت غلطی کھائی بلکہ حق بات یہ ہے کہ اِنَّهٗ کا ضمیر قرآن شریف کی طرف پھرتا ہے اور آیت کے یہ معنے ہیں کہ قرآن شریف مُردوں کے جی اُٹھنے کے لئے نشان ہے کیونکہ اس سے مُردہ دِل زندہ ہو رہے ہیں۔ قبروں میں گلے سڑے ہوئے باہر نکلتے آتے ہیں اور خشک ہڈیوں میں جان پڑتی جاتی ہے چنانچہ قرآن شریف خود اپنے تئیں قیامت کا نمونہ ظاہر کرتا ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا لِّنُحْیِیَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا[۱] سورۃ الفرقان الجزء ۱۹ یعنی ہم نے آسمان سے پاک پانی

---

[۱] سورۃ الفرقان: ۴۹، ۵۰

اتارا (یعنی قرآن) تاکہ ہم اس کے ساتھ مُردہ زمین کو زندہ کریں پھر فرماتا ہے وَ اَحْیَیْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا کَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ[1] (سُورۃ ق الجزو نمبر ۲۶) یعنی قرآن کے ساتھ ہم نے زمینِ مُردہ کو زندہ کیا۔ ایسا ہی حشر اجساد بھی ہو گا..... درحقیقت جب ہم ایک منصفانہ نگاہ سے عرب کی آبادیوں پر نظر ڈالیں کہ اپنی رُوحانی حالت کی رُو سے وہ کیسے قبرستان کے حکم میں ہو گئے تھے اور کس درجہ تک سچائی اور خداترسی کی رُوح اُن کے اندر سے نکل گئی تھی اور کیسی وہ طرح طرح کی خرابیوں کی وجہ سے جو اُن کے اخلاق اور اعمال اور عقائد پر اثر کر گئی تھی سڑ گل گئے تھے تو بلا اختیار ہمارے اندر سے یہ شہادت نکلتی ہے کہ اُن کا زندہ کرنا جسمانی طور پر مُردوں کے جی اُٹھنے سے بمراتب عجیب تر ہے جس کی عظمت نے بے شمار عقلمندوں کی نگاہوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔

اب خلاصہ کلام یہ کہ آیتِ موصوفہ بالا کے حقیقی معنے یہ ہیں جو ہم نے ذکر کئے ہیں یعنی خدائے تعالیٰ جسمانی طور پر مُردوں کے جی اُٹھنے پر رُوحانی طور پر مُردوں کا جی اُٹھنا بطور بدیہی نشان کے پیش کرتا ہے جو درحقیقت دلوں پر نہایت مؤثر ہؤا اور بے شمار کفّار اس نشان کے قائل ہو گئے اور ہوتے جاتے ہیں اور ایک جماعت محققین کی بھی یہی معنے آیت موصوفہ بالا کے لیتی ہے چنانچہ تفسیر معالم میں زیرِ تفسیر اس آیت کے یہ معنے لکھے ہیں جیساکہ تفسیر کی عبارت یہ ہے : وَ قَالَ الْحَسَنُ وَجَمَاعَةٌ وَاِنَّهٗ یَعْنِیْ وَاِنَّ الْقُرْاٰنَ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ یُعْلِمُکُمْ قِیَامَهَا وَیُخْبِرُکُمْ بِاَحْوَالِهَا وَاَهْوَالِهَا فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا یَعْنِیْ فَلَا تَشُکُّنَّ فِیْهَا بَعْدَ الْقُرْاٰنِ یعنی حسن اور ایک جماعت نے اِس آیت کے یہی معنے کئے ہیں کہ قرآن قیامت کے لئے نشان ہے اور زبان قال اور حال سے خبر دے رہا ہے کہ قیامت اور اس کے حالات اور اس کے ہولناک نشان واقع ہونے والے ہیں سو بعد اس کے کہ قرآن قیامت کے آنے پر اپنے اعجازی بیانات اور تاثیرات احیاءِ موتٰی سے دلیلِ محکم قائم کر رہا ہے تم شک مت کرو۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۴۲۳ تا ۴۲۶)

اِس آیت کو حضرت مسیح کے دوبارہ نزول سے کسی طور پر بھی کچھ تعلق نہیں۔ بات یہ ہے کہ حضرت مسیح کے وقت میں یہودیوں میں ایک فرقہ صدوقی نام تھا جو قیامت سے منکر تھے۔ پہلی کتابوں میں بطور پیشین گوئی کے لکھا گیا تھا کہ اُنکو سمجھانے کے لئے مسیح کی ولادت بغیر باپ کے ہوگی اور یہ اُن کے لئے ایک نشان قرار دیا گیا تھا جیساکہ اللہ جلّ شانہٗ دوسری آیت میں فرماتا ہے وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰیَةً لِّلنَّاسِ[2]۔ اِس جگہ النّاس سے مراد یہی صدوقی فرقہ ہے جو اس زمانہ میں بکثرت موجود تھا۔ چونکہ توریت میں قیامت کا ذکر بظاہر کسی جگہ معلوم نہیں ہوتا اِس لئے یہ فرقہ مُردوں کے جی اُٹھنے سے بکلّی منکر ہو گیا تھا۔ اب تک بائیبل کے بعض صحیفوں میں موجود ہے کہ مسیح اپنی ولادت کے رُو سے بطور عِلم السّاعۃ کے اُن کے لئے آیا تھا۔ اب دیکھئے اِس آیت کو نزولِ مسیح سے تعلق کیا ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ مفسّرین نے کس قدر

---

[1] سُورۃ قٓ : ۱۲ [2] سُورۃ مریم : ۲۲

جُداجُدا طور پر اس کے معنے لکھے ہیں۔ ایک جماعت نے قرآن کریم کی طرف ضمیر اِنَّہٗ کی پھیر دی ہے کیونکہ قرآن کریم سے رُوحانی طور پر مُردے زندہ ہوتے ہیں اور اگر خواہ نخواہ تحکّم کے طور پر اس جگہ نزولِ مسیح مراد لیا جائے اور وہی نزول اُن لوگوں کے لئے جو آنحضرت صلعم کے عہد میں تھے نشان قیامت ٹھہرایا جائے تو یہ اِستدلال وجود قیامت تک ہنسی کے لائق ہوگا اور جن کو یہ خطاب کیا گیا کہ مسیح آخری زمانہ میں نزول کرکے قیامت کا نشان ٹھہرے گا۔ تم باوجود اتنے بڑے نشان کے قیامت سے کیوں انکاری ہوئے۔ وہ عُذر پیش کرسکتے ہیں کہ دلیل تو ابھی موجود نہیں پھر یہ کہنا کس قدر عبث ہے کہ اب قیامت کے وجود پر ایمان لے آؤ۔ شک مت کرو۔ ہم نے دلیل قیامت کے آنے کی بیان کردی۔

(الحق دہلی صفحہ ۳۹،۳۸)

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ تَعَالٰی قَالَ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ وَمَا قَالَ اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ عِلْمًا لِّلسَّاعَةِ. فَالْاٰيَةُ تَدُلُّ عَلٰى اَنَّهٗ عِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ مِنْ وَجْهٍ كَانَ حَاصِلًا لَّهٗ بِالْفِعْلِ لَا اَنْ يَّكُوْنَ مِنْ بَعْدُ فِيْ وَقْتٍ مِّنَ الْاَوْقَاتِ وَالْوَجْهُ الْحَاصِلُ هُوَ تَوَلُّدُهٗ مِنْ غَيْرِ اَبٍ وَالتَّفْصِيْلُ فِيْ ذٰلِكَ اَنَّ فِرْقَةً مِّنَ الْيَهُوْدِ اَعْنِي الصَّدُوْقِيِّيْنَ كَانُوْا كَافِرِيْنَ بِوُجُوْدِ الْقِيَامَةِ فَاَخْبَرَهُمُ اللّٰهُ عَلٰى لِسَانِ بَعْضِ اَنْبِيَائِهٖ اَنَّ ابْنًا مِّنْ قَوْمِهِمْ يُوْلَدُ مِنْ غَيْرِ اَبٍ وَهٰذَا يَكُوْنُ اٰيَةً لَّهُمْ عَلٰى وُجُوْدِ الْقِيَامَةِ فَاِلٰى هٰذَا اَشَارَ فِيْ اٰيَةِ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ وَكَذٰلِكَ فِيْ اٰيَةِ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ اَيْ لِلصَّدُوْقِيِّيْنَ وَقَالَ بَعْضُ الْمُفَسِّرِيْنَ اِنَّهٗ ضَمِيْرُ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ يَرْجِعُ اِلَى الْقُرْاٰنِ فَاِنَّ الْقُرْاٰنَ اَحْيَا خَلْقًا كَثِيْرًا وَبَعَثَهُمْ مِنَ الْقُبُوْرِ فَهٰذَا الْبَعْثُ الرُّوْحَانِيُّ دَلِيْلٌ عَلَى الْبَعْثِ الْجِسْمَانِيِّ يَعْنِيْ عَلَى السَّاعَةِ كَمَا فِيْ مَعَالِمِ التَّنْزِيْلِ

ترجمہ از مرتب :۔ جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے مسیح کے متعلق وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ کہا ہے یہ نہیں کہا اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ عِلْمًا لِّلسَّاعَةِ۔ پس یہ آیت اِس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ عِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ ایک ایسی وجہ سے تھا جو اُسے بالفعل حاصل تھی بعد میں کسی وقت بھی اسے حاصل نہیں ہوگی اور جو وجہ اسے حاصل تھی وہ اس کا بغیر باپ کے پیدا ہونا تھا اور اسکی تفصیل یہ ہے کہ یہود کا ایک فرقہ جو صدوقی کہلاتا تھا وہ قیامت سے منکر تھے پس اللہ تعالیٰ نے انہیں بعض انبیاء کی زبان سے خبر دی کہ ان کی قوم میں ایک لڑکا بغیر باپ کے پیدا ہوگا اور وہ ان کے لئے قیامت کے وجود پر ایک نشان ہوگا اِسی کی طرف آیت وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ میں اشارہ کیا گیا ہے اور اِسی طرح آیت وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً میں بھی اِس طرف اشارہ ہے کہ ہم اسے صدوقی فرقہ کے لوگوں کے لئے ایک نشان بنائیں گے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ میں اِنَّهٗ کی ضمیر قرآن کریم کی طرف راجع ہے کیونکہ قرآن کریم نے خلقِ کثیر کو زندہ کیا اور انہیں قبروں سے نکالا۔ پس یہ بعثِ رُوحانی بعثِ جسمانی یعنی قیامت پر ایک دلیل ہے جیسا کہ تفسیر معالم التنزیل وغیرہ کتب میں مذکور ہے۔ پس حاصل کلام یہ ہے کہ آیت اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ نزول

وَغَيْرِهٖ فَالْحَاصِلُ اَنَّ اٰيَةَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ لَا يَدُلُّ عَلٰى نُزُوْلِ الْمَسِيْحِ قَطُّ بَلْ يُفْحِمُ الْمُنْكِرِيْنَ بِدَلِيْلٍ مَوْجُوْدٍ ثَابِتٍ عَلَيْهِمْ لِذَا قَالَ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَلَا يُقَالُ مِثْلُ هٰذَا الْقَوْلِ لِاٰيَةٍ مَا ثَبَتَ وُجُوْدُهَا بَعْدُ وَمَا رَاٰهَا اَحَدٌ مِّنَ الْمُخَالِفِيْنَ۔ (حمامة البشریٰ صفحہ ۹۰، ۹۱)

کہتے ہیں کہ عیسیٰؑ کی نسبت ہے اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ جن لوگوں کی یہ قرآن دانی ہے اُن سے ڈرنا چاہیئے کہ نیم مُلّا خطرۂ ایمان۔ اے بھلے مانسو! کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ نہیں ہیں جو فرماتے ہیں کہ بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ[1] یہ کیسی بدبو دار نادانی ہے جو اس جگہ لفظ سَاعَة سے قیامت سمجھتے ہیں۔ اب مجھ سے سمجھو کہ ساعة سے مراد اس جگہ وہ عذاب ہے جو حضرت عیسیٰؑ کے بعد طیطوس رومی کے ہاتھ سے یہودیوں پر نازل ہوا تھا اور خود خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں سورہ بنی اسرائیل میں اس سَاعة کی خبر دی ہے اسی آیت کی تشریح اِس آیت میں ہے کہ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ یعنی عیسیٰ کے وقت سخت عذاب سے قیامت کا نمونہ یہودیوں کو دیا گیا اور اُن کے لئے وہ ساعت ہو گئی۔ قرآنی محاورہ کی رُو سے ساعة عذاب ہی کو کہتے ہیں۔ سو خبر دی گئی تھی کہ یہ ساعة حضرت عیسیٰؑ کے انکار سے یہودیوں پر نازل ہو گی پس وہ نشان ظہور میں آگیا اور وہ ساعة یہودیوں پر نازل ہو گئی اور نیز اس زمانہ میں طاعون بھی اُن پر سخت پڑی اور درحقیقت اُن کے لئے وہ واقعہ قیامت تھا جس کے وقت لاکھوں یہودی نیست و نابود ہو گئے اور ہزارہا طاعون سے مر گئے اور باقیماندہ بہت ذلت کے ساتھ متفرق ہو گئے۔ قیامتِ کُبریٰ تو تمام لوگوں کے لئے قیامت ہو گی مگر یہ خاص یہودیوں کے لئے قیامت تھی۔ اس پر ایک اور قرینہ قرآن شریف میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا یعنی اے یہودیو عیسیٰ کے ساتھ تمہیں پتہ لگ جائے گا کہ قیامت کیا چیز ہے۔ اُس کے مثل تمہیں دی جائے گی یعنی مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وہ قیامت تمہارے پر آئے گی اس میں شک نہ کرو۔ صاف ظاہر ہے کہ قیامتِ حقیقی جو اَب تک نہیں آئی اُس کی نسبت غیر موزوں تھا کہ خدا کہتا کہ اس قیامت میں شک نہ کرو اور تم اس کو دیکھو گے۔ اُس زمانہ کے یہودی تو سب مَر گئے اور آنے والی قیامت انہوں نے نہیں دیکھی۔ کیا خدا نے جھوٹ بولا۔ ہاں طیطوس والی قیامت دیکھی۔ سو قیامت سے مراد وہی قیامت ہے

مسیح پر قطعًا دلالت نہیں کرتی بلکہ منکرین کا منہ ایک ٹھوس اور ثابت شدہ دلیل سے بند کر دیتی ہے پس اسی لئے فرمایا فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا کہ تم اس میں شک نہ کرو۔ اور ایسا قول کسی ایسے نشان کے بارے میں نہیں بولا جاتا جس کا وجود ہی ابھی تک ثابت نہ ہوا اور نہ ہی مخالفین میں سے کسی نے اسے دیکھا ہو۔ (حمامة البشریٰ صفحہ ۹۰، ۹۱)

---

[1] سُورۃ القمر: ۲

جو حضرت مسیح کے زمانہ میں طیطوس رُومی کے ہاتھ سے یہودیوں کو دیکھنی پڑی اور پھر طاعون کے ذریعہ سے اُس کو دیکھ لیا۔ یہ خدا کی کتابوں میں پُرانا وعدہ عذاب کا چلا آتا تھا جس کا بائبل میں جا بجا ذکر پایا جاتا ہے۔ قرآن شریف میں اس کے لئے خاص آیت نازل ہوئی ورنہ دُور کی قیامت سے کون ڈرتا ہے۔ کیا اس وقت کے مولوی اس قیامت سے ڈرتے ہیں ہرگز نہیں۔ اور جیسا کہ ابھی مَیں نے بیان کیا ہے یہ لفظ سَاعَةً کا کچھ قیامت سے خاص نہیں اور نہ قرآن نے اِس کو قیامت سے خاص رکھا ہے۔ افسوس کہ نیم مُلّا جن کی عاقبت خراب ہے اپنی جہالت سے ایسے ایسے معنے کر لیتے ہیں جن سے اصل مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ آخری قیامت سے یہودیوں کو کیا خوف تھا۔ مگر قریب کے عذاب کی پیشگوئی بیشک اُن کے دلوں پر اثر ڈالتی تھی۔

افسوس کہ سادہ لوح حجرہ نشین مولویوں کی نظر محدود ہے اُن کو معلوم نہیں کہ پہلی کتابوں میں اِسی سَاعت کا وعدہ تھا جو طیطوس کے وقت یہودیوں پر وارد ہوئی اور قرآن شریف صاف کہتا ہے کہ عیسٰی کی زبان پر اُن پر لعنت پڑی اور عذابِ عظیم کے واقعہ کو سَاعَة کے لفظ سے بیان کرنا نہ صرف قرآن شریف کا محاورہ ہے بلکہ یہی محاورہ پہلی آسمانی کتابوں میں پایا جاتا ہے اور بکثرت پایا جاتا ہے پس نہ معلوم ان سادہ لوح مولویوں نے کہاں سے اور کس سے سُن لیا کہ سَاعَة کا لفظ ہمیشہ قیامت پر ہی بولا جاتا ہے۔ (اعجاز احمدی صفحہ ۲۰ تا ۲۲)

يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ أَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝

اے میرے بندو آج کے دن کچھ تم کو خوف نہیں اور نہ کوئی غم تمہیں ہو سکتا ہے لیکن جو شخص دُنیا میں صراطِ مستقیم پر نہیں چلا وہ اس وقت بھی چل نہیں سکے گا اور دوزخ میں گرے گا اور جہنم کی آگ کا ہیمہ بن جائے گا۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۴۸)

قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ۝

ان کو کہہ دے کہ اگر خدا کا کوئی فرزند ہوتا تو مَیں سب سے پہلے اس کی پرستش کرتا۔

(اشتہار دعوتِ حق (مشمولہ حقیقۃ الوحی) صفحہ ۵)

وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ إِلٰهٌ وَّفِي الْأَرْضِ إِلٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝

وہی آسمان میں خدا ہے اور وہی زمین میں خدا۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۳۴ حاشیہ در حاشیہ)
وہ آسمان میں ہے یعنی دُور ہے اور زمین میں ہے یعنی نزدیک ہے۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۸)
وہی خدا زمین میں ہے اور وہی خدا آسمان میں۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۱۲)
زمین میں وہی خدا ہے اور وہی آسمان میں خدا۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۸۹)

۸۶ وَتَبٰرَكَ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

یہ بات واقعی ہے اور قرآن پاک سے بھی ثابت ہے کہ سَاعَةٌ سے اِس جگہ مراد یہودیوں کی تباہی کا زمانہ ہے وہ وہی زمانہ تھا اور جس ساعت کے یہ لوگ منتظر ہیں اس کا تو ابھی تک کہیں پتہ بھی نہیں ہے۔ایک پہلو سے اول مسیح کے وقت یہودیوں نے بدبختی لے لی اور دوسرے وقت میں نصارٰی نے بدبختی کا حصہ لے لیا مسلمانوں نے بھی پوری مشابہت یہود سے کر لی۔ اگر ان کی سلطنت یا اختیار رہتا تو ہمارے ساتھ بھی مسیح والا معاملہ کرتے۔

(البدر جلد ۱ ؁ مورخہ ۷ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

اصل قیامت کا علم تو سوائے خدا کے کسی کو بھی نہیں حتّٰی کہ فرشتوں کو بھی نہیں اور وہاں سَاعَة کا لفظ ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ عورتوں کے حمل کی میعاد نو ماہ دس دن ہوتی ہے جب نو ماہ پورے ہو جائیں تو اَب باقی دس دنوں میں کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ کونسے دن وضع حمل ہوگا۔ گھر کا ہر ایک آدمی بچہ جننے کی گھڑی کا منتظر رہتا ہے۔اِسی لئے قیامت کا نام سَاعَة رکھا ہے کہ اس سَاعَة کی خبر نہیں۔ خدا کی کتابوں میں جو اس کی علامات ہیں ممکن ہے کہ اُن سے کوئی آدمی قریب قریب اس زمانہ کا پتہ بھی دے دے مگر اس سَاعَة کی کسی کو خبر نہیں ہے جیسے وضع حمل کی ساعت کی کسی کو خبر نہیں۔ ایک ڈاکٹر سے بھی پوچھو تو وہ بھی کہے گا نو ماہ اور دس دن۔ مگر جونہی ۹ ماہ گذریں پھر فکر رہتی ہے کہ دیکھیں کونسے دن ہو۔ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ ہزار سال کے بعد قیامت قریب ہے اب چھ ہزار سال تو گذر گئے ہیں قیامت تو قریب ہوگی مگر اس گھڑی کی خبر نہیں۔

(البدر جلد ۱ ؁ مورخہ ۲۱ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۷)

○

سُورۃ الدّخان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

حٰمٓ۝ وَالۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ۝ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ اِنَّا کُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ۝ فِیۡہَا یُفۡرَقُ کُلُّ اَمۡرٍ حَکِیۡمٍ۝ اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا ؕ اِنَّا کُنَّا مُرۡسِلِیۡنَ۝ رَحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ۝

نائبِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزول کے وقت جو لیلۃ القدر مقرر کی گئی ہے وہ درحقیقت اس لیلۃ القدر کی ایک شاخ ہے یا یُوں کہو کہ اس کا ایک ظِل ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس لیلۃ القدر کی نہایت درجہ کی شان بلند کی ہے جیساکہ اس کے حق میں یہ آیتِ کریمہ ہے کہ فِیۡہَا یُفۡرَقُ کُلُّ اَمۡرٍ حَکِیۡمٍ یعنی اس لیلۃ القدر کے زمانہ میں جو قیامت تک ممتد ہے ہر ایک حکمت اور معرفت کی باتیں دُنیا میں شائع کر دی جائینگی اور انواع و اقسام کے علومِ غریبہ وفنونِ نادرہ وصناعاتِ عجیبہ صفحۂ عالَم میں پھیلا دئے جائیں گے اور انسانی قویٰ میں موافق ان کی مختلف اِستعدادوں اور مختلف قسم کے امکان بسطتِ علم اور عقل کے جو کچھ لیاقتیں مخفی ہیں یا جہاں تک وہ ترقی کر سکتے ہیں سب کچھ منصّۂ شہود ظہور لایا جائے گا لیکن یہ سب کچھ ان دنوں میں پُرزور تحریکوں سے ہوتا رہے گا کہ جب کوئی نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں پیدا ہوگا۔ درحقیقت اِسی آیت کو سورۃ الزلزال میں مفصّل طور پر بیان کیا گیا ہے کیونکہ سورۃ الزلزال سے پہلے سورۃ القدر نازل کر کے یہ ظاہر فرمایا گیا ہے کہ سنّۃ اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ خدائے تعالیٰ کا کلام لیلۃ القدر میں ہی نازل ہوتا ہے اور

اس کا نبی لیلۃ القدر میں ہی دُنیا میں نزول فرماتا ہے اور لیلۃ القدر میں ہی وہ فرشتے اُترتے ہیں جن کے ذریعہ سے دُنیا میں نیکی کی طرف تحریکیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ ضلالت کی پُرظلمت رات سے شروع کر کے طلوع صبح صداقت تک اسی کام میں لگے رہتے ہیں کہ مستعد دلوں کو سچائی کی طرف کھینچتے ہیں۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۱۰۸ تا ۱۱۱)

ہم نے قرآن کو ایک ایسی بابرکت رات میں اُتارا ہے جس میں ہر ایک امر پُرحکمت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اِس سے مطلب یہ ہے کہ جیسے ایک رات بڑی ظلمت کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔ اسی کے مقابل پر اس کتاب میں انوارِ عظیمہ رکھے گئے ہیں جو ہر ایک قسم کے شک اور شبہ کی ظلمت کو ہٹاتے ہیں اور ہر ایک بات کا فیصلہ کرتے ہیں اور ہر ایک قسم کی حکمت کی تعلیم کرتے ہیں۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۵)

وَفِیْ ھٰذَا اِشَارَۃٌ مِنْ رَّبٍّ عَلِیْمٍ اِلٰی اَنَّ کُلَّ مَا یُفْرَقُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ مِنْ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ فَھُوَ مَکْتُوْبٌ فِی الْقُرْاٰنِ کِتَابِ اللّٰہِ ذِیْ کُلِّ عَظْمَۃٍ وَجَلَالٍ فَاِنَّہٗ نَزَلَ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ بِنُزُوْلٍ تَامٍّ فَبُوْرِکَ مِنْہُ اللَّیْلُ بِاِذْنِ رَبٍّ عَلَّامٍ فَکُلُّ مَا یُوْجَدُ مِنَ الْعَجَائِبِ فِیْ ھٰذِہِ اللَّیْلَۃِ یُوْجَدُ مِنْ بَرَکَاتِ نُزُوْلِ ھٰذِہِ الصُّحُفِ الْمُبَارَکَۃِ فَالْقُرْاٰنُ اَحَقُّ وَاَوْلٰی بِھٰذِہِ الصِّفَاتِ فَاِنَّہٗ مَبْدَءٌ اَوَّلُ لِھٰذِہِ الْبَرَکَاتِ وَمَا بُوْرِکَتِ اللَّیْلَۃُ اِلَّا بِہٖ مِنْ رَّبِّ الْکَائِنَاتِ وَلِاَجْلِ ذٰلِکَ یَصِفُ الْقُرْاٰنُ نَفْسَہٗ بِاَوْصَافٍ تُوْجَدُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ بَلِ اللَّیْلَۃُ کَالْھِلَالِ وَھُوَ کَالْبَدْرِ وَذٰلِکَ مَقَامُ الشُّکْرِ وَالْفَخْرِ لِلْمُسْلِمِیْنَ۔

(سرّ الخلافہ صفحہ ۴۳ حاشیہ)

اِس روشن اور کھلی کھلی کتاب کی قسم ہے کہ ہم نے اِس قرآن کریم کو ایک مبارک رات میں اُتارا ہے کیونکہ ہمیں منظور تھا کہ نافرمانی کے نتائج سے ڈراویں۔ وہ رات ایک ایسی بابرکت رات ہے کہ تمام حکمت کی باتیں اس میں کھولی جاتی ہیں اور ایسا ہی ہم نے چاہا ہے اور تیرے ربّ نے رحمت کی راہ سے ایسا ہی ارادہ کیا ہے کہ کُل معارف و دقائق الٰہیہ کا

ترجمہ از مرتب :۔ اِس میں ربّ علیم کی طرف سے اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لیلۃ القدر میں جو ہر اہم کام تقسیم کیا جاتا ہے وہ خدائے عزّوجلّ کی عظیم الشان کتاب قرآن مجید میں لکھا ہوا موجود ہے کیونکہ یہ (قرآن مجید) مکمل طور پر لیلۃ القدر میں نازل ہوا ہے پس اس کے اُترنے کی وجہ سے ربّ علیم کے اِذن سے یہ رات بابرکت ہوگئی پس ہر عجیب بات جو اس رات میں ظاہر ہوئی ہے وہ دراصل قرآن کریم کے نزول کی برکت ہے پس قرآن کریم ان صفات کا زیادہ حقدار ہے کیونکہ وہ ان برکات کا سرچشمہ ہے اور اس رات کو بھی صرف اِس کی وجہ سے ربّ کائنات نے برکت دی ہے اِسی لئے قرآن کریم اپنے آپ کو ان اوصاف سے متّصف قرار دیتا ہے جو لیلۃ القدر میں پائے جاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ رات ہلال کی مانند ہے اور قرآن کریم بدر کی مانند۔ اور یہ مسلمانوں کے لئے شُکر اور فخر کا مقام ہے۔ (سرّ الخلافہ صفحہ ۴۴ حاشیہ)

تیری بعثتِ مبارکہ پر ہی خاتمہ ہوا اور وہی کلام کُل معارفِ حکمیہ کا جامع ہو جو تجھ پر نازل ہُوا ہے ..... اور اس برکت والی رات سے مراد ایک تو وہی معنے ہیں جو مشہور ہیں اور دوسرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ بعثت کی رات ہے اور اس کا دامن قیامت کے دن تک پھیلا ہُوا ہے اور آیت فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ تمام زمانہ جو قیامت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ رسالت کے تحت میں ہے فیوضِ قرآن کریم سے بہت فائدہ اُٹھائے گا اور وہ تمام معارفِ الٰہیہ جو دُنیا میں مخفی چلے آتے ہیں اس زمانہ میں وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہوتے رہیں گے اور نیز آیت فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اس زمانۂ بابرکت کے خواص میں سے یہ بھی ہو گا کہ معاش اور معاد کے کُل علومِ حکمیہ اپنے اعلیٰ درجہ کے کمالات کے ساتھ ظہور پذیر ہوں گے اور کوئی امرِ حکمت ایسا نہیں رہے گا جس کی تفصیل نہ کی جائے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۵۱۱ تا ۵۱۳)

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ مُوقِنِينَ ○ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ○ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ يَلْعَبُونَ ○

خدا وہ خدا ہے جس نے زمین و آسمان کو بنایا اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب اُسی نے پیدا کیا تا تم اُسی صانع حقیقی پر یقین لاؤ اور شک کرنے کی کوئی وجہ نہ رہے۔ کوئی معبود اس کے سوا نہیں۔ وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ تمہارا رب ہے اور تمہارے باپ دادوں کا جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ بلکہ وہ تو شکوک و شبہات میں پڑے ہوئے ہیں ان دلائل کی طرف انہیں کہاں نظر ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۵۱۳)

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُبِينٍ ○ يَغْشَى النَّاسَ ۖ هٰذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ○

پس تُو اس دن کا امیدوار رہ جس دن آسمان ایک کُھلا کُھلا دھواں لائے گا جس کو دیکھ کر کہیں گے کہ یہ عذاب دردناک ہے..... اس جگہ دُخان سے مراد قحطِ عظیم و شدید ہے جو سات برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارکہ میں پڑا یہاں تک کہ لوگوں نے مُردے اور ہڈیاں کھائی تھیں جیسا کہ ابنِ مسعود کی حدیث میں مفصل اس کا بیان ہے

لیکن آخری زمانہ کے لئے بھی جو ہمارا زمانہ ہے اس دُخانِ مبین کا وعدہ تھا۔ اس طرح پر کہ قبل از ظہور مسیح نہایت درجہ کی شدت سے اس کا ظہور ہوگا۔ اب سمجھنا چاہیئے کہ یہ آخری زمانہ کا قحط جسمانی اور رُوحانی دونوں طور سے وقوع میں آیا جسمانی طور سے اس طرح کہ اگر اب سے پچاس برس گذشتہ پر نظر ڈالی جاوے تو معلوم ہوگا کہ جیسے اب غلہ اور ہر ایک چیز کا نرخ عام طور پر ہمیشہ کم رہتا ہے اس کی نظیر پہلے زمانوں میں کہیں نہیں پائی جاتی کبھی خواب وخیال کی طرح چند روز گرانی غلہ ہوتی تھی اور پھر وہ دن گزر جاتے تھے لیکن اب تو یہ گرانی لازم غیر منفک کی طرح ہے اور قحط کی شدت اندر ہی اندر ایک عالم کو تباہ کر رہی ہے۔

اور رُوحانی طور پر صداقت اور امانت اور دیانت کا قحط ہوگیا اور مکر اور فریب اور علوم وفنون مظلمہ دُخان کی طرح دُنیا میں پھیل گئی ہیں اور روز بروز ترقی پر ہیں۔ اس زمانہ کے مفاسد کی صورت پہلے زمانوں کے مفاسد سے بالکل مختلف ہے۔ پہلے زمانوں میں اکثر نادانی اور امیت رہزن تھی۔ اس زمانہ میں تحصیل علوم رہزن ہو رہی ہے۔ ہمارے زمانہ کی نئی روشنی جس کو دوسرے لفظوں میں دُخان سے موسوم کرنا چاہیئے عجیب طور پر ایمان اور دیانت اور اندرونی سادگی کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ سوفسطائی تقریروں کے غبار نے صداقت کے آفتاب کو چُھپا دیا ہے اور فلسفی مغالطات نے سادہ لوحوں کو طرح طرح کے شبہات میں ڈال دیا ہے۔ خیالاتِ باطلہ کی تعظیم کی جاتی ہے اور حقیقی صداقتیں اکثر لوگوں کی نظر میں کچھ حقیر سی معلوم ہوتی ہیں۔ سو خدا تعالیٰ نے چاہا کہ عقل کے رہزدوں کو عقل سے درست کرے اور فلسفہ کے سرگشتوں کو آسمانی فلسفہ کے زور سے راہ پر لاوے۔ سو یہ کامل درجہ کا دُخانِ مبین ہے جو اس زمانہ میں ظاہر ہوا ہے۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۵۱۳ تا ۵۱۵)

الدخان: ۱۳ تا ۱۶

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ۝ أَنَّىٰ لَهُمُ الذِّكْرَىٰ وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ۝ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ ۝ إِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيلًا ۚ إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ۝

کہیں گے اے ہمارے خدا یہ عذاب ہم سے اُٹھا ہم ایمان لائے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۵۱۳)

وہ وقت ایسا ہوگا کہ یہ بَلاء رُوئے زمین پر عام ہوگی کوئی شہر یا بستی اِلّا ماشاء اللہ اس سے خالی نہ رہے گی بلکہ دریاؤں اور جنگلوں میں بھی طاعون ہوگا۔ اس وقت لوگ بھاگنے کی جگہ ڈھونڈیں گے مگر نہ پاویں گے۔

(اعلان حق مشمولہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۳)

اے رَبّ ہم سے عذاب کھول دے کہ ہم ایمان لائے اور پھر اس کے جواب میں فرماتا ہے اِنَّا کَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِیْلًا اِنَّکُمْ عَآئِدُوْنَ ..... یعنی ہم تھوڑی مدت تک عذاب کھول دیتے ہیں اور پھر تم عَود کرد گے اور کافرہن جاؤگے یہ آیت اِس بات پر صریح نص ہے کہ خدا تعالیٰ ایک شخص کی تضرّع کو قبول کرکے عذاب ٹال دیتا ہے اور جانتا ہے کہ پھر یہ کفراور فسق کی طرف رجوع کرے گا اور تضرّع یا استغفار سے عذاب ٹالنا قدیم عادت اللہ ہے اِس سے کون انکار کرسکتا ہے بجز ایسے شخص کے جو کمال تعصب سے اندھا ہوگیا ہو۔ ماسوا اس کے یہ مسلّم اور مشہود امر ہے کہ جب ہیبت الٰہی اپنا جلوہ دکھاتی ہے تو اس وقت فاسق انسان کی اَور صورت ہوتی ہے اور جب ہیبت کا وقت نکل جاتا ہے تو پھر اپنی شقاوتِ فطرتی سے اصلی صورت کی طرف عَود کر آتا ہے۔ ایسے لوگ بہتیرے تم نے دیکھے ہوں گے کہ جب ان پر کوئی مقدمہ دائر ہو جس سے سخت قید یا پھانسی یا سزا موت کا خطرہ ہو۔ گو یہ بھی گمان ہو کہ شاید رہا ہو جائیں تو وہ ایسی ہیبت کو مشاہدہ کرکے اپنی فاسقانہ چال چلن کو بدلا لیتے ہیں نماز پڑھتے ہیں اور توبہ کرتے اور لمبی لمبی دعائیں کرتے ہیں اور پھر جب ان کی اس تضرّع کی حالت پر خدا تعالیٰ رحم کرکے ان کو اس بَلا سے خلاصی دیتا ہے تو فی الفور ان کے دل میں یہ خیال گذرتا ہے کہ یہ رہائی خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں اِتفاقی امر ہے تب وہ اپنے فسق میں پہلے سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں اور چند روز میں ہی اپنی پہلی عادات کی طرف رجوع کر آتے ہیں۔ (انوار الاسلام صفحہ ۱۴)

اللہ جلّ شانہٗ کفار کا قول ذکر کرکے فرماتا ہے رَبَّنَا اکْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ...... اور پھر جواب میں فرماتا ہے اِنَّا کَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِیْلًا اِنَّکُمْ عَآئِدُوْنَ ..... یعنی کافر عذاب کے وقت کہیں گے کہ اَے خدا ہم سے عذاب دفع کر کہ ہم ایمان لائے اور ہم تھوڑا سا یا تھوڑی مدت تک عذاب دُور کر دیں گے مگر تم اے کافرو پھر کُفر کی طرف عَود کروگے۔ پس اِن آیات سے اور ایسا ہی اُن آیتوں سے جن میں قریب الغرق کشتیوں کا ذکر ہے صریح منطوق قرآنی سے ثابت ہوتا ہے کہ عذابِ دُنیوی ایسے کافروں کے سر پر سے ٹل جاتا ہے جو خوف کے دنوں اور وقتوں میں حق اور توحید کی طرف رجوع کریں گو امن پاکر پھر بے ایمان ہو جائیں۔ (انوار الاسلام صفحہ ۸۵)

یہ قدیم سے سُنّت اللہ ہے کہ جو شخص خوف کی حالت میں رجوع کرکے اور پھر امن پاکر برگشتہ ہو جائے خدا اس کو تھوڑی مُہلت دے کر پھر پکڑ لیتا ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے اِنَّا کَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِیْلًا اِنَّکُمْ عَآئِدُوْنَ یعنی ہم رجوع کے بعد کچھ تھوڑی مدت عذاب کو موقوف رکھیں گے اور پھر پکڑ لیں گے اور تھوڑی مدت اِس لئے کہ پھر تم انکار کی طرف رجوع کروگے سو ایسا ہی ہوُا۔ یہ بات مسلمانوں کو بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ گو ایک شخص کا انجام خدائے تعالیٰ کے علم میں کفر ہو مگر عادت اللہ قدیم سے یہی ہے کہ اس کی تضرّع اور خوف کے وقت عذاب کو دوسرے وقت پر ڈال دیا جاتا ہے اِسی وجہ سے اہلِ سُنّت کا عقیدہ ہے کہ وعید میں خدا کے ارادہ عذاب کا تخلّف جائز ہے مگر بشارت میں جائز نہیں۔ (انجامِ آتھم صفحہ، حاشیہ)

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ○

جس دن پکڑیں گے ہم پکڑنا سخت تحقیق ہم بدلہ لینے والے ہیں۔ (اعلانِ حق ص۱ (مشمولہ حقیقۃ الوحی) صفحہ۱۰)

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۙ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۛ ۖ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۙ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ○

ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ○

زقوم کا درخت ان دوزخیوں کا کھانا ہے جو عمداً گناہ کو اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ کھانا ایسا ہے جیسا کہ تانبا گلا ہوا کھولتے ہوئے پانی کی طرح پیٹ میں جوش مارنے والا۔ پھر دوزخی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ اِس درخت کو چکھ تو عزّت والا اور بزرگ ہے۔ یہ کلمہ نہایت غضب کا ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر تو تکبّر نہ کرتا اور اپنی بزرگی اور عزّت کا پاس کر کے حق سے مُنہ نہ پھیرتا تو آج یہ تلخیاں تجھے اُٹھانی نہ پڑتیں۔ یہ آیت اِس بات کی طرف بھی اِشارہ کرتی ہے کہ دراصل یہ لفظ زقوم کا ذُق اور اَمْ سے مرکّب ہے اور اَمْ۔ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ کا ملخّص ہے جس میں ایک حرف پہلے کا اور ایک حرف آخر کا موجود ہے اور کثرتِ استعمال نے ذآل کو زآ کے ساتھ بدل دیا ہے۔ اَب حاصل کلام یہ ہے کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اِس دُنیا کے ایمانی کلمات کو بہشت کے ساتھ مشابہت دی ہے ایسا ہی اِس دُنیا کے بے ایمانی کے کلمات کو زقوم کے ساتھ مشابہت دی اور اس کو دوزخ کا درخت ٹھہرایا اور ظاہر فرمایا کہ بہشت اور دوزخ کی جڑھ اِسی دُنیا سے شروع ہوتی ہے۔ (اِسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۷۸، ۷۹)

بہشتی زندگی والا انسان خدا تعالیٰ کی یاد سے ہر وقت لذّت پاتا ہے اور جو بدبخت دوزخی زندگی والا ہے تو وہ ہر وقت اس دُنیا میں زقوم ہی کھا رہا ہے اس کی زندگی تلخ ہوتی ہے۔ مَعِيْشَةً ضَنْكًا بھی اسی کا نام ہے جو قیامت کے دن زقوم کی صورت پر متمثّل ہو جائے گی۔ غرض دونوں صورتوں میں باہم رشتے قائم ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۷؍اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ۙ ○

متقی امن کے مقام میں آ گئے۔ (سَت بچن صفحہ ۱۰۵)

۲۳ لَا يَذُوقُوْنَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۚ وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۙ

بہشتیوں پر دوسری موت نہیں آئے گی ایک موت جو آچکی سو آچکی۔ اَب جو لوگ کہتے ہیں کہ مسیح جو مر گیا کیا خدا تعالیٰ قادر نہیں کہ اس کو پھر زندہ کر کے بھیجے۔ گویا ان کے نزدیک مسیح بہشتی نہیں جو اس کے لئے دو موتیں تجویز کرتے ہیں۔ حضرات اپنی بات کی ضِد کے لئے مسیح کو بار بار کیوں مارنا چاہتے ہیں۔ اس کا کونسا گناہ ہے جو اس پر دو موتیں آویں اور پھر ان دو موتوں کا حدیث اور قرآن کی رُو سے ثبوت کیا ہے ؟ (ازالہ اوہام صفحہ ۴۶۱)

جیسا کہ صرف ایک موت کی طرف اشارہ کر کے فرماتا ہے لَا يَذُوقُوْنَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ سو یہ بات اس کے سچے وعدہ کے برخلاف ہے کہ مُردوں کو پھر دُنیا میں بھیجنا شروع کر دیوے اور کیونکر ممکن تھا کہ خاتم النّبیین کے بعد کوئی اَور نبی اس مفہومِ تام اور کامل کے ساتھ جو نبوّتِ تامّہ کی شرائط میں سے ہے آسکتا۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ ایسے نبی کی نبوّتِ تامّہ کے لوازم جو وحی اور نزول جبرائیل ہے اس کے وجود کے ساتھ لازم ہونی چاہیئے کیونکہ حسب تصریح قرآن کریم رسول اُسی کو کہتے ہیں جس نے احکام وعقائدِ دین جبرئیل کے ذریعہ سے حاصل کئے ہوں لیکن وحیٔ نبوّت پر تو تیرہ سو برس سے مُہر لگ گئی ہے کیا یہ مُہر اُس وقت ٹوٹ جائے گی۔ اور اگر کہو کہ مسیح ابنِ مریم نبوّتِ تامّہ سے معزول کر کے بھیجا جائے گا تو اس سزا کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیئے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بے استحقاق معبود قرار دیا گیا تھا۔ سو خدائے تعالیٰ نے چاہا کہ اس کی سزا میں نبوّت سے اس کو الگ کر دیا جائے اور وہ زمین پر آکر دوسروں کے پَیرو بنیں۔ اَوروں کے پیچھے نماز پڑھیں اور امامِ اعظم کی طرح صرف اِجتہاد سے کام لیں اور حنفی الطریق ہو کر حنفی مذہب کی تائید کریں لیکن یہ جواب معقول نہیں ہے خدائے تعالیٰ نے قرآن کریم میں اِس الزام سے اُن کو بَری کر دیا ہے اور ان کی نبوّت کو ایک دائمی نبوّت قرار دیا ہے۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۵۳۴، ۵۳۵)

متقی امن کے مقام میں آگئے وہ بجز پہلی موت کے جو اُن پر وارد ہو گئی پھر موت کا مزہ نہیں چکھیں گے اور خدا اُن کو جہنم کے عذاب سے بچائے گا۔ اِس میں بھید یہ ہے کہ مومن متقی کا مرنا چار پائیوں اور مویشی کی طرح نہیں ہوتا بلکہ مومن خدا کے لئے ہی جیتے ہیں اور خدا کے لئے مرتے ہیں اِس لئے جو چیزیں وہ خدا کے لئے کھوتے ہیں اُن کو وہ واپس دی جاتی ہیں۔ (سَت بچن صفحہ ۱۰۵)

سورة الجاثیة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

۷ تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ○

فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ سو ایسی کونسی حدیث ہے جس پر تم اللہ اور اس کی آیات کو چھوڑ کر ایمان لاؤ گے۔ یعنی اگر کوئی حدیث قرآن کریم سے مخالف ہو تو ہرگز نہیں ماننی چاہیئے بلکہ رَدّ کر دینی چاہیئے ہاں اگر کوئی حدیث بذریعہ تاویل قرآن کریم کے بیان سے مطابق آ سکے مان لینا چاہیئے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۵۶)

خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کس حدیث پر ایمان لائیں گے۔ اِس جگہ حدیث کے لفظ کی تنکیر جو فائدہ عموم کا دیتی ہے صاف بتلا رہی ہے کہ جو حدیث قرآن کے معارض اور مخالف پڑے اور کوئی راہ تطبیق کی پیدا نہ ہو اُس کو رَدّ کر دو۔ اور اِس حدیث میں ایک پیشگوئی بھی ہے جو بطور اشارۃ النص اِس آیت سے مترشح ہے اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ آیۃ ممدوحہ میں اِس بات کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ ایک ایسا زمانہ بھی اِس اُمّت پر آنے والا ہے کہ جب بعض افراد اِس اُمّت کے قرآن شریف کو چھوڑ کر ایسی حدیثوں پر بھی عمل کریں گے جن کے بیان کردہ بیان قرآن شریف کے بیانات سے مخالف اور معارض ہوں گے۔

(ریویو بر مباحثہ بٹالوی و چکڑالوی صفحہ ۲)

تم بعد اللہ اور اس کی آیات کے کس حدیث پر ایمان لاؤ گے۔ اِس آیت میں صریح اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر قرآن کریم کسی امر کی نسبت قطعی اور یقینی فیصلہ دیوے یہاں تک کہ اس فیصلہ میں کسی طور سے شک

باقی نہ رہ جاوے اور منشاء اچھی طرح سے کھل جائے تو پھر بعد اس کے کسی ایسی حدیث پر ایمان لانا جو صریح اس کے مخالف پڑی ہو مومن کا کام نہیں ہے۔ پھر فرماتا ہے فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ ان دونوں آیتوں کے ایک ہی معنی ہیں اس لئے اِس جگہ تصریح کی ضرورت نہیں۔ سو آیات متذکرہ بالا کے رُو سے ہر ایک مومن کا یہی مذہب ہونا چاہیئے کہ کتاب اللہ کو بلاشرط اور حدیث کو شرطی طور پر حُجّتِ شرعی قرار دیوے اور یہی میرا مذہب ہے۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۱۰)

بعد اللہ جل شانہٗ کی آیات کے کس حدیث پر ایمان لاؤ گے؟ اس آیت میں صریح اِس بات کی طرف ترغیب ہے کہ ہر ایک قول اور حدیث کتاب اللہ پر عرض کر لینا چاہیئے۔ اگر کتاب اللہ نے ایک امر کی نسبت ایک فیصلہ ناطق اور مؤید دے دیا ہے جو قابلِ تغیر اور تبدیل نہیں تو پھر ایسی حدیث دائرۂ صحت سے خارج ہو گی جو اس کے مخالف ہے لیکن اگر کتاب اللہ فیصلہ مؤیدہ اور ناقابلِ تبدیل نہیں دیتی تو پھر اگر وہ حدیث قانونِ روایت کے رُو سے صحیح ثابت ہو تو ماننے کے لائق ہے۔ غرض قرآن ایسی مجمل کتاب نہیں جو کبھی اور کسی صورت میں معیار کا کام نہ دے سکے جس کا ایسا خیال ہے بے شک وہ نادان ہے بلکہ ایمان اس کا خطرہ کی حالت میں ہے۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۱۰۶)

یہ ایک قسم کی پیشگوئی ہے جو..... وہابیوں کے متعلق ہے۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۶،۵ مورخہ ۲۸ نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۶)

۸ تا ۹ وَیْلٌ لِّکُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ ۝ یَّسْمَعُ اٰیٰتِ اللّٰہِ تُتْلٰی عَلَیْہِ ثُمَّ یُصِرُّ مُسْتَکْبِرًا کَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْہَا ۚ فَبَشِّرْہُ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝

لعنت ہے مفتری گنہ گار پر جو خدا کی آیتوں کو سُنتا ہے پھر تکبر کی راہ سے انکار پر اصرار کرتا ہے گویا کچھ بھی نہیں سُنا۔ پس اس کو تُو دردناک عذاب کی بشارت دے۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۵۵)

۱۷ تا ۱۸ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ وَرَزَقْنٰہُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰہُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۚ وَاٰتَیْنٰہُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَہُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْیًۢا بَیْنَہُمْ ۭ اِنَّ رَبَّکَ یَقْضِیْ

بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

فَانْظُرْ كَيْفَ ذَكَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى هٰهُنَا سِلْسِلَتَيْنِ مُتَقَابِلَتَيْنِ۔ سِلْسِلَةُ مُوْسٰى اِلٰى عِيْسٰى۔ وَسِلْسِلَةُ نَبِيِّنَا خَيْرِ الْوَرٰى اِلَى الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ الَّذِيْ جَاءَ فِيْ زَمَنِكُمْ هٰذَا۔ وَاِنَّهٗ مَا جَاءَ مِنَ الْقُرَيْشِ كَمَا اَنَّ عِيْسٰى مَاجَاءَ مِنْ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ۔ وَاِنَّهٗ عِلْمٌ لِّسَاعَةِ كَافَّةِ النَّاسِ كَمَا كَانَ عِيْسٰى عِلْمًا لِّسَاعَةِ الْيَهُوْدِ۔ هٰذَا مَا اُشِيْرَ اِلَيْهِ فِي الْفَاتِحَةِ۔ وَمَا كَانَ حَدِيْثٌ يُّفْتَرٰى۔ وَقَدْ شَهِدَتِ السَّمَاءُ بِاٰيَاتِهَا وَقَالَتِ الْاَرْضُ۔ اَلْوَقْتُ هٰذَا الْوَقْتُ۔ فَاتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تَايْئَسْ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى۔ فَحَاصِلُ الْكَلَامِ اَنَّ الْقُرْاٰنَ مَمْلُوٌّ۔ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اِخْتَارَ مُوْسٰى بَعْدَ مَا اَهْلَكَ الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى وَاٰتَاهُ التَّوْرَاةَ وَاَرْسَلَ لِتَاْئِيْدِهِ النَّبِيِّيْنَ تَتْرًا۔ ثُمَّ قَفَّا عَلٰى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسٰى۔ وَاخْتَارَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ مَا اَهْلَكَ الْيَهُوْدَ وَاَرْدٰى۔ وَلَا شَكَّ وَلَا رَيْبَ اَنَّ السِّلْسِلَةَ الْمُوْسَوِيَّةَ وَالْمُحَمَّدِيَّةَ قَدْ تَقَابَلَتَا وَكَذٰلِكَ

ترجمہ ازمرتب :۔ دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے یہاں دو متقابل سلسلوں کا ذکر کیا ہے یعنی ایک سلسلہ موسیٰ علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک اور ایک سلسلہ ہمارے نبی خیر الوریٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس مسیح موعود تک ہے جو تمہارے اس زمانہ میں آیا ہے اور وہ قریش کے قبیلہ میں سے نہیں آیا جس طرح عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے نہیں آئے تھے۔ اور مسیح موعود تمام لوگوں کے لئے عِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ ہیں جس طرح کہ عیسیٰ علیہ السلام یہود کے لئے عِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ تھے یہ وہ بات ہے جس کی طرف سُورۃ فاتحہ میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جو اپنی طرف سے گھڑلی گئی ہو۔ آسمان نے اِس امر کی صداقت کے لئے اپنے نشانوں کے ساتھ گواہی دی اور زمین نے کہا یہ وقت مسیح موعود کی آمد کا وقت ہے اِس لئے تو اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کر اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اور اس پر اللہ کی سلامتی نازل ہو جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی پیروی کرے۔ پس حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن کریم اِس بات کے ذکر سے بھرا پڑا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بعد اس کے کہ اس نے تمام قوموں کو ہلاک کر دیا چُنا اور ان کو تورات دی اور ان کی تائید کے لئے متواتر کئی رسول بھیجے پھر ان کے پیچھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ اِسی طرح یہود کو ہلاک اور تباہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب کیا اور بلا شک اور بلا ریب سلسلہ محمدیہ اور سلسلہ موسویہ دونوں متقابل سلسلے ہیں اور اِس امر کا اللہ تعالیٰ نے اسی طرح

ارادہ اللہ وقضٰی۔ (خطبہ الہامیہ "الاعلان" صفحہ ب،ج)

۲۰ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ○

جس شخص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پاس نہیں وہ بے ایمان ہے۔ خدا تعالیٰ تو ایک مومن کا بھی پاس کرتا ہے جیسے فرمایا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ (الحکم جلد ۱۱ ۴۱ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

۲۱ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ○

بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ یہ خدا کے کام دین کی سچائی کے لئے حجت ہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۶۰ حاشیہ)

۲۵ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ○

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس قوم میں آئے وہ تو کسی بات کے بھی قائل نہ تھے۔ نہ ان میں کوئی شریعت تھی اور نہ وہ کسی کتاب کے قائل اور پابند بلکہ اکثر تو خدا تعالیٰ کے بھی قائل نہ تھے کہتے تھے:

مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ

وہ جو کچھ سمجھتے تھے اِسی دُنیا کو سمجھتے تھے کہ آگے جا کر کسی نے کیا دیکھا ہے۔ یہی دُنیا ہی دُنیا ہے۔ اِس آیت میں دَھر کا لفظ اسی لئے بیان کیا ہے تاکہ ظاہر کیا جاوے کہ وہ دہریہ تھے اور مَیں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس وقت عرب میں قریباً تمام بیہودہ اور باطل مذہب جمع ہوئے تھے۔ وہ گویا ایک چھوٹا سا نقشہ تھا جو گندے اور افراط تفریط کے طریق تھے وہ عملی طور پر اس میں دکھائے گئے تھے جیسے کسی مُلک کا نقشہ ہو۔ اس میں سب مقام موٹے موٹے دکھائے جاتے ہیں اسی طرح وہاں کی حالت تھی۔ یہ کیسی بڑی روشن دلیل آپ کی سچائی کی ہے کہ ایسی قوم اور ایسے ملک میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا جو انسانیت کے دائرہ سے نکل چکا تھا۔

ارادہ اور فیصلہ فرمایا تھا۔ (خطبہ الہامیہ "الاعلان" صفحہ ب،ج)

میں بڑے زور سے کہتا ہوں کہ خواہ کیسا پکا دشمن ہو اور خواہ وہ عیسائی ہو یا آریہ جب وہ ان حالات کو دیکھے گا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب کے تھے اور پھر اس تبدیلی پر نظر کرے گا جو آپ کی تعلیم اور تاثیر سے پیدا ہوئی تو اُسے بے اختیار آپ کی حقانیت کی شہادت دینی پڑے گی۔ موٹی سی بات ہے کہ قرآن مجید نے اُن کی پہلی حالت کا تو یہ نقشہ کھینچا ہے یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ[1] یہ تو ان کی کُفر کی حالت تھی پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تاثیرات نے ان میں تبدیلی پیدا کی تو ان کی یہ حالت ہو گئی یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا[2] یعنی وہ اپنے رَبّ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے راتیں کاٹ دیتے ہیں۔ جو تبدیلی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے وحشیوں میں کی اور جس گڑھے سے نکال کر جس بلندی اور مقام تک انہیں پہنچایا اس ساری حالت کے نقشہ کو دیکھنے سے بے اختیار ہو کر انسان رو پڑتا ہے کہ کیا عظیم الشان انقلاب ہے جو آپ نے کیا۔ دُنیا کی کسی تاریخ اور کسی قوم میں اس کی نظیر نہیں مِل سکتی۔ یہ نری کہانی نہیں یہ واقعات ہیں جن کی سچائی کا ایک زمانہ کو اعتراف کرنا پڑا ہے۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

---

[1] سورۃ محمد: ۱۳ [2] سورۃ الفرقان: ۶۵

سُورۃ الاحقاف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ○

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جن لوگوں کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا معبود ٹھہرا رہے ہو انہوں نے زمین میں کیا پیدا کیا اور یا اُن کو آسمان کی پیدائش میں کوئی شراکت ہے۔ اگر اس کا ثبوت تمہارے پاس ہے اور کوئی ایسی کتاب ہے جس میں یہ لکھا ہو کہ فلاں فلاں چیز تمہارے معبود نے پیدا کی تو لاؤ وہ کتاب پیش کرو اگر تم سچے ہو یعنی یہ تو ہو نہیں سکتا کہ یونہی کوئی شخص قادرِ مطلق کا نام رکھا لے اور قدرت کا کوئی نمونہ پیش نہ کرے۔ اور خالق کہلائے اور خالقیت کا کوئی نمونہ ظاہر نہ کرے۔

اور پھر فرماتا ہے کہ اس شخص سے زیادہ تر گمراہ کون شخص ہے کہ ایسے شخص کو خدا کر کے پکارتا ہے جو اُس کو

قیامت تک جواب نہیں دے سکتا بلکہ اس کے پکارنے سے بھی غافل ہے چہ جائیکہ اُس کو جواب دے سکے۔
(جنگِ مقدس صفحہ ۵۵)

۹۔ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَیْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِیْ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ ؕ كَفٰى بِهٖ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۝

محض اِلہام جب تک اس کے ساتھ فعلی شہادت نہ ہو ہرگز کسی کام کا نہیں۔ دیکھو جب کفار کی طرف سے اِعتراض ہوُا لَسْتَ مُرْسَلًا[1] تو جواب دیا گیا کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ[2] یعنی عنقریب خدا تعالیٰ کی فعلی شہادت میری صداقت کو ثابت کر دے گی پس الہام کے ساتھ فعلی شہادت بھی چاہیئے۔ دیکھو گورنمنٹ جب کسی کو ملازمت عطا کرتی ہے تو اس کے وجاہت کے سامان بھی مہیا کر دیتی ہے چنانچہ جو لوگ اس کا مقابلہ کرتے ہیں وہ توہینِ عدالت کے جُرم میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اِسی طرح جو ماموران الٰہی کے مقابلہ پر آتے ہیں وہ ہلاک ہو جاتے ہیں آجکل پچاس کے قریب ایسے ہیں جو اِس مرض میں گرفتار ہیں یعنی اپنے قولی اِلہام پر بھروسہ رکھتے ہیں وہ سب غلطی پر ہیں شیطان اِنسان کا بڑا دشمن ہے مگر خود مفتری بھی ایک شیطان ہے پس وہ اپنا آپ دشمن ہے اِس لئے جلد ہلاک ہو جاتا ہے۔ کیسے ناعاقبت اندیش ہیں وہ لوگ جو ایسوں کے دامِ تزویر میں پھنس جاتے ہیں جس کے دعویٰ کے ساتھ عظمت و جلالِ ربّانی کی چمک نہ ہو تو ایسے شخص کو تسلیم کرنا اپنے تئیں آگ میں ڈالنا ہے۔
(بدر جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

۱۱۔ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ كَفَرْتُمْ بِهٖ وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَ اسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۝

---

[1]، [2] سُورۃ الرعد: ۴۴

پہلی کتابوں ..... سے اجتہاد کرنا حرام نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ ..... جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کے لئے ان کو پیش کرتا ہے تو ہمارا ان سے اجتہاد کرنا کیوں حرام ہو گیا؟ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۴۱ مورخہ ۳۰ر نومبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

۱۶ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ۭ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّىْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○

اور ہم نے اِنسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی تاکید کی ہے۔ یہ اِس وجہ سے کہ مشکل سے اس کی ماں نے اپنے پیٹ میں اس کو رکھا اور مشکل ہی سے اس کو جَنا اور یہ مشکلات اس دُور دراز مدت تک رہتی ہیں کہ اُس کا پیٹ میں رہنا اور اُس کے دُودھ کا چھوٹنا تیس مہینہ میں جا کر تمام ہوتا ہے یہاں تک کہ جب ایک نیک اِنسان اپنی پوری قوت کو پہنچتا ہے تو دُعا کرتا ہے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو اِس بات کی توفیق دے کہ تُو نے جو مجھ اور میرے ماں باپ پر اِحسانات کئے ہیں تیرے ان احسانات کا شکریہ ادا کرتا رہوں اور مجھے اِس بات کی بھی توفیق دے کہ مَیں کوئی ایسا نیک عمل کروں جس سے تُو راضی ہو جائے۔ اور میرے پر یہ بھی احسان کر کہ میری اولاد نیک بخت ہو اور میرے لئے خوشی کا موجب ہو اور مَیں اولاد پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ ہر ایک حاجت کے وقت تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور مَیں ان میں سے ہوں جو تیرے آگے اپنی گردن رکھ دیتے ہیں نہ کسی اَور کے آگے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۲۰۰ حاشیہ)

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں یہ دُعا سکھلائی ہے کہ اَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ میرے بیوی بچوں کی بھی اِصلاح فرما۔ سو اپنی حالت کی پاک تبدیلی اور دُعاؤں کے ساتھ ساتھ اپنی اولاد اور بیوی کے واسطے بھی دُعا کرتے رہنا چاہیئے کیونکہ اکثر فتنے اولاد کی وجہ سے اِنسان پر پڑ جاتے ہیں اور اکثر بیوی کی وجہ سے۔ دیکھو پہلا فتنہ حضرت آدم پر بھی

عورت ہی کی وجہ سے آیا تھا حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں بلعم کا ایمان جو حبط کیا گیا اصل میں اس کی وجہ بھی توریت سے یہی معلوم ہوتی ہے کہ بلعم کی عورت کو اس بادشاہ نے بعض زیورات دکھا کر طمع دے دیا تھا اور پھر عورت نے بلعم کو حضرت موسیٰ پر بد دُعا کرنے کے واسطے اُکسایا تھا۔ غرض اُن کی وجہ سے بھی اکثر انسان پر مصائب شدائد آجایا کرتے ہیں تو اُن کی اِصلاح کی طرف بھی پوری توجہ کرنی چاہیئے اور ان کے واسطے بھی دُعائیں کرتے رہنا چاہیئے۔

(الحکم جلد ۱۲ ۱۶/۱۷ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

۳۳ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۚ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

اور جو شخص اس کے قبول کرنے سے اِنکار کرے وہ خدا کو اپنا غلبہ ظاہر کرنے سے روک نہیں سکے گا اور خدا کے مقابلہ پر اس کا کوئی حمایتی نہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۳ حاشیہ)

۳۶ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۚ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۚ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ .... سو اولوالعزم نبیوں کی طرح صبر کر۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۵۷ حاشیہ)

اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ ہمیشہ اس کا عتاب ان لوگوں پر ہوتا ہے جن پر اس کے فضل اور عطایات بیشمار ہوں اور جنہیں وہ اپنے نشان دکھا چکا ہوتا ہے وہ ان لوگوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتا کہ انہیں عتاب یا خطاب یا ملامت کرے جن کے خلاف اس کا آخری فیصلہ نافذ ہونا ہوتا ہے چنانچہ ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ اور فرماتا ہے وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ[1] اور

---

[1] سورۃ القلم: ۴۹

فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ[1] الآیۃ یہ محبت آمیز عتاب اس بات پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت جلد فیصلہ کفار کے حق میں چاہتے تھے مگر خدا تعالیٰ اپنے مصالح اور سُنن کے لحاظ سے بڑے توقف اور حلم کے ساتھ کام کرتا ہے لیکن آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو ایسا کُچلا اور پیسا کہ ان کا نام ونشان مٹا دیا۔ اسی طرح پر ممکن ہے کہ ہماری جماعت کے بعض لوگ طرح طرح کی گالیاں، اِفترا پردازیاں اور بدزبانیاں خدا تعالیٰ کے سچے سلسلے کی نسبت سُنکر اِضطراب اور استعجال میں پڑیں مگر انہیں خدا تعالیٰ کی اس سُنّت کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برتی گئی ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیئے اِس لئے مَیں پھر اور بار بار بتاکید حکم کرتا ہوں کہ جنگ وجدال کے مجمعوں اور تحریکوں اور تقریبوں سے کنارہ کشی کرو۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

جلد بازی اور تقویٰ کبھی دونو اکٹھے نہیں ہوسکتے۔ نبیوں کو اللہ تعالیٰ نے یہی کہا فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ پھر عام لوگوں کو کس قدر ضرورت تھی کہ وہ تقویٰ سے کام لیتے اور خدا سے ڈرتے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

پس تجھے صبر کرنا چاہیئے جیسا کہ اولوالعزم نبی صبر کرتے رہے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ششم صفحہ ۵۴)

---

[1] سُورۃ الانعام : ۳۶

سورۃ محمد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

۳. وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ۝

جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجا لائے اور وہ کلام جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اُس پر ایمان لائے اور وہی حق ہے ایسے لوگوں کے خدا گناہ بخش دے گا اور اُن کے دِلوں کی اصلاح کرے گا۔ اَب دیکھو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی وجہ سے کس قدر خدا تعالیٰ اپنی خوشنودی ظاہر فرماتا ہے کہ اُن کے گناہ بخشتا ہے اور اُن کے تزکیۂ نفس کا خود متکفّل ہوتا ہے پھر کیسا بدبخت وہ شخص ہے جو کہتا ہے کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں اور غرور اور تکبر سے اپنے تئیں کچھ سمجھتا ہے۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۳۰)

جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کئے اور اس کتاب پر ایمان لائے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور وہی حق ہے خدا ان کے گناہ دُور کرے گا اور اُن کے حال چال کو درست کرے گا۔ (نور القرآن ۱ صفحہ ۳۴)

۵. فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ

أَوْزَارَهَا ۚ ذَٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَ بَعْضَكُم بِبَعْضٍ ۗ وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَن يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ ○

تیرہ سو برس ہوئے کہ مسیح موعود کی شان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے کلمہ یَضَعُ الْحَرْبَ جاری ہو چکا ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ مسیح موعود جب آئے گا تو لڑائیوں کا خاتمہ کر دے گا اور اسی کی طرف اشارہ اس قرآنی آیت کا ہے حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا یعنی اس وقت تک لڑائی کرو جب تک کہ مسیح کا وقت آجائے یہی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ہے۔ دیکھو صحیح بخاری موجود ہے جو قرآن شریف کے بعد اصح الکتب مانی گئی ہے۔ اس کو غور سے پڑھو۔ (گورنمنٹ انگریزی اور جہاد صفحہ ۷)

۱۳۔ إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ○

يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ کھاتے ہیں اور تمتع اٹھاتے ہیں یعنی اپنے پیٹ کی اور دوسری شہوات میں مبتلا اور اسیر ہیں۔ (الحکم جلد ۶ ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

(يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ) کفار کی زندگی بالکل چوپاؤں کی سی زندگی ہوتی ہے جن کو کھانے اور پینے اور شہوانی جذبات کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ۔

(الحکم جلد ۵ ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

عرب اور دنیا کی حالت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بالکل وحشی لوگ تھے۔ کھانے پینے کے سوا کچھ نہ جانتے تھے۔ نہ حقوق العباد سے آشنا نہ حقوق اللہ سے آگاہ۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے ایک طرف اُن کا نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم نے ایسا اثر کیا يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا[1] کی حالت ہوگئی یعنی اپنے رب کی یاد میں راتیں سجدے اور قیام میں

[1] سورۃ الفرقان: ۶۵

گذار دیتے ہیں۔ (الحکم جلد ۲ نمبر ۲۴، ۲۵ مورخہ ۲۰-۲۷ ؍اگست ۱۸۹۸ء صفحہ ۱۰)

چارپایوں کی طرح کھاتے ہیں اِس کے کئی پہلو ہیں:۔

اوّل چارپایہ کیفیت اور کمیت میں فرق نہیں کرسکتا اور جو کچھ آگے آتا ہے اور جس قدر آتا ہے کھاتا ہے جیسے کتّا اِس قدر کھاتا ہے کہ آخر قے کرتا ہے۔

دوسرا یہ کہ اَنعام حلال اور حرام میں تمیز نہیں کرتے۔ ایک بَیل بھی یہ تمیز نہیں کرتا کہ یہ ہمسایہ کا کھیت ہے اس میں نہ جاؤں۔ ایسا ہی ہر ایک امر جو کھانے کے لحاظ سے ہو نہیں کرتا۔ کتّے کو ناپاکی پاکی کے متعلق کوئی لحاظ نہیں۔ اور پھر چارپایہ کو اعتدال نہیں۔

یہ لوگ جو اَخلاقی اصولوں کو توڑتے ہیں اور پرواہ نہیں کرتے کہ گویا اِنسان نہیں۔ پاک پلید کا تو یہ حال عرب میں مُردے کتّے کھا لیتے تھے۔ اَب تک اکثر ممالک میں یہ حال ہے کہ چوہوں اور کتّوں اور بلّیوں کو بڑے لذیذ کھانے سمجھ کر کھایا جاتا ہے۔ چوڑھے چمار مُردار خوار قومیں یہاں بھی موجود ہیں۔

پھر یتیموں کا مال کھانے میں کوئی تردّد و تامّل نہیں جیسے یتیم کا گھاس گائے کے سامنے رکھ دیا جائے بلا تردّد کھالے ایسا ہی ان لوگوں کا حال ہے۔ یہی معنی ہیں وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ان کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۲۵ مورخہ ۹ جولائی ۱۹۰۰ء صفحہ ۴)

رُوحانیت اور پاکیزگی کے بغیر کوئی مذہب چل نہیں سکتا۔ قرآن شریف نے بتلایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پیشتر دُنیا کی کیا حالت تھی۔ يَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ۔ پھر جب انہی لوگوں نے اِسلام قبول کیا تو فرماتا ہے يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا[1]۔ جب تک آسمان سے تریاق نہ ملے تو دِل درست نہیں رہتا۔ انسان آگے قدم رکھتا ہے مگر پیچھے پڑتا ہے۔ قدسی صفات اور فطرت والا انسان ہو تو وہ مذہب چل سکتا ہے اس کے بغیر کوئی مذہب ترقی نہیں کرسکتا اور کرتا بھی ہے تو پھر قائم نہیں رہ سکتا۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۷ مورخہ ۲ ؍اکتوبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۹۰)

مَیں بڑے زور سے کہتا ہوں کہ خواہ کیسا ہی پکا دشمن ہو اور خواہ وہ عیسائی ہو یا آریہ، جب وہ ان حالات کو دیکھے گا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب کے تھے اور پھر اس تبدیلی پر نظر کرے گا جو آپؐ کی تعلیم اور تاثیر سے پیدا ہوئی تو اسے بے اختیار آپؐ کی حقانیت کی شہادت دینی پڑے گی۔ موٹی سی بات ہے کہ قرآن مجید نے اُن کی پہلی حالت کا تو یہ نقشہ کھینچا ہے يَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ یہ تو ان کی کُفر کی حالت تھی پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تاثیرات نے ان میں تبدیلی پیدا کی تو ان کی یہ حالت ہوگئی يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا

---

[1] سُورۃ الفرقان : ۶۵

یعنی وہ اپنے رَبّ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے راتیں کاٹ دیتے ہیں۔ جو تبدیلی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے وحشیوں میں کی اور جس گڑھے سے نکال کر جس بلندی اور مقام تک انہیں پہنچایا اس ساری حالت کے نقشہ کو دیکھنے سے بے اختیار ہو کر انسان رو پڑتا ہے کہ کیا عظیم الشان انقلاب ہے جو آپ نے کیا۔ دُنیا کی کسی تاریخ اور کسی قوم میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یہ نری کہانی نہیں یہ واقعات ہیں جن کی سچائی کا ایک زمانہ کو اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

ایک انسان جو دعا نہیں کرتا اس میں اور چارپائے میں کچھ فرق نہیں۔ ایسے لوگوں کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے يَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ یعنی چارپائیوں کی زندگی بسر کرتے ہیں اور جہنم ان کا ٹھکانا ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۲ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۖ وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ ۖ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ ۝

وہ بہشت جو پرہیزگاروں کو دیا جائے گا اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک باغ ہے اس میں اس پانی کی نہریں ہیں جو کبھی متعفن نہیں ہوتا اور نیز اس میں اس دُودھ کی نہریں ہیں جس کا کبھی مزہ نہیں بدلتا۔ نیز اس میں شراب کی نہریں ہیں جو سراسر سرور بخش ہیں جس کے ساتھ خمار نہیں۔ نیز اس میں اس شہد کی نہریں ہیں جو نہایت صاف ہیں جسکے ساتھ کوئی کثافت نہیں۔ اِس جگہ صاف طور پر فرمایا کہ اس بہشت کو مثالی طور پر یوں سمجھ لو کہ ان تمام چیزوں کی اس میں ناپیدا کنار نہریں ہیں۔ وہ زندگی کا پانی جو عارف دُنیا میں رُوحانی طور پر پیتا ہے اس میں ظاہری طور پر موجود ہے اور وہ رُوحانی دُودھ جس سے وہ شیر خوار بچہ کی طرح رُوحانی طور پر پرورش پاتا ہے بہشت میں ظاہر ظاہر دکھائی دے گا اور وہ خدا کی محبت کی شراب جس سے وہ دُنیا میں رُوحانی طور پر ہمیشہ مست رہتا ہے اور اب بہشت میں ظاہر ظاہر اسکی نہریں نظر آئیں گی اور وہ حلاوتِ ایمانی کا شہد جو دُنیا میں رُوحانی طور پر عارف کے مُنہ میں جاتا تھا وہ بہشت میں محسوس اور نمایاں نہروں کی طرح دکھائی دیگا اور ہر ایک بہشتی اپنی نہروں اور اپنے باغوں کے ساتھ اپنی رُوحانی حالت کا اندازہ

برہنہ کر کے دکھلا دے گا اور خدا بھی اُس دن بہشتیوں کے لئے حجابوں سے باہر آجائے گا۔ غرض رُوحانی حالتیں مخفی نہیں رہیں گی بلکہ جسمانی طور پر نظر آئیں گی۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹۷، ۹۸)

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ

وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ۝

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ جیسا تم دیکھتے ہو کہ نور کے آنے سے ظلمت قائم نہیں رہ سکتی ایسا ہی جب لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا نورانی پرتوہ دِل پر پڑتا ہے تو نفسانی ظلمت کے جذبات کالمعدوم ہو جاتے ہیں۔ گناہ کی حقیقت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ سرکشی کی ملونی سے نفسانی جذبات کا شور و غوغا ہو جس کی متابعت کی حالت میں ایک شخص کا نام گناہ گار رکھا جاتا ہے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے معنے جو لُغتِ عرب کے موارد استعمال سے معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ لَا مَطْلُوْبَ لِیْ وَلَا مَحْبُوْبَ لِیْ وَلَا مَعْبُوْدَ لِیْ وَلَا مُطَاعَ لِیْ اِلَّا اللّٰهُ یعنی بجز اللہ کے اور کوئی میرا مطلوب نہیں اور محبوب نہیں اور معبود نہیں اور مطاع نہیں اب ظاہر ہے کہ یہ معنی گناہ کی حقیقت اور گناہ کے اصل منبع سے بالکل مخالف پڑے ہیں پس جو شخص ان معنی کو خلوصِ دِل کے ساتھ اپنی جان میں جگہ دے گا تو بالضرورت مفہوم مخالف اس کے دِل سے نکل جائے گا کیونکہ ضدین ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ پس جب نفسانی جذبات نکل گئے تو یہی وہ حالت ہے جس کو سچی پاکیزگی اور حقیقی راست بازی کہتے ہیں اور خدا کے بھیجے ہوئے پر ایمان لانا جو دوسرے جز کلمہ کا مفہوم ہے۔ اس کی ضرورت یہ ہے کہ تا خدا کے کلام پر بھی ایمان حاصل ہو جائے۔ کیونکہ جو شخص یہ اقرار کرتا ہے کہ مَیں خدا کا فرمانبردار بننا چاہتا ہوں اُس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے فرمانوں پر ایمان بھی لاوے اور فرمان پر ایمان لانا بجز اس کے ممکن نہیں کہ اس پر ایمان لاوے جس کے ذریعہ سے دُنیا میں فرمان آیا۔ پس یہ حقیقت کلمہ کی ہے۔ (نور القرآن ۲ صفحہ ۲۸)

توحید تب ہی پُوری ہوتی ہے کہ کُل مرادوں کا معطی اور تمام امراض کا چارہ اور مداوا وہی ذاتِ واحد ہو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے معنی یہی ہیں۔ صوفیوں نے اس میں اِلٰہ کے لفظ سے محبوب، مقصود، معبود مراد لی ہے۔

(الحکم جلد ۳ ۱۳ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۷)

قرآن شریف کی تعلیم کا اصل مقصد اور مُدعا یہی ہے کہ خدا تعالیٰ جیسا وحدہٗ لاشریک ہے ایسا ہی محبت کی رُو سے بھی اس کو وحدہٗ لاشریک یقین کیا جاوے اور کُل انبیاء علیہم السّلام کی تعلیم کا اصل منشاء ہمیشہ یہی رہا ہے۔ چنانچہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ جیسے ایک طرف توحید کی تعلیم دیتا ہے ساتھ ہی توحید کی تکمیل محبت کی ہدایت بھی دیتا ہے اور جیسا کہ مَیں نے ابھی لکھا ہے یہ ایک ایسا پیارا اور پُر معنی جُملہ ہے کہ اس کی مانند ساری تورات اور انجیل میں نہیں۔ ورنہ دُنیا کی کسی اور

کتاب نے کامل تعلیم دی ہے۔ اِلٰہ کے معنی ہیں ایسا محبوب اور معشوق جس کی پرستش کی جاوے۔ گویا اِسلام کی یہ اصل محبت کے مفہوم کو پورے اور کامل طور پر ادا کرتی ہے۔ یاد رکھو کہ جو توحید بدُوں محبت کے ہو وہ ناقص اور ادھوری ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

توحید کے مراتب ہوتے ہیں بغیر ان کے توحید کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ نِرا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہی کہہ دینا کافی نہیں یہ تو شیطان بھی کہہ دیتا ہے۔ جب تک عملی طور پر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی حقیقت اِنسان کے وجود میں متحقق نہ ہو کچھ نہیں۔ یہودیوں میں یہ بات کہاں ہے آپ ہی بتا دیں۔

توحید کا اِبتدائی مرحلہ اور مقام تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول کے خلاف کوئی امر انسان سے سرزد نہ ہو اور کوئی فِعل اس کا اللہ تعالیٰ کی محبت کے منافی نہ ہو۔ گویا اللہ تعالیٰ ہی کی محبت اور اطاعت میں محو اور فنا ہو جاوے اِس واسطے اِس کے معنے یہ ہیں لَا مَعْبُوْدَ لِیْ وَلَا مَحْبُوْبَ لِیْ وَلَا مُطَاعَ لِیْ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی میرا معبود ہے اور نہ کوئی محبوب ہے اور نہ کوئی واجب الاطاعت ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۷)

کلمہ جو ہم ہر روز پڑھتے ہیں اس کے کیا معنے ہیں؟ کلمہ کے یہ معنے ہیں کہ انسان زبان سے اقرار کرتا ہے اور دِل سے تصدیق کہ میرا معبود، محبوب اور مقصود خدا تعالیٰ کے سوا اَور کوئی نہیں۔ اِلٰہ کا لفظ محبوب اور اصل مقصود اور معبود کیلئے آتا ہے۔ یہ کلمہ قرآن شریف کی ساری تعلیم کا خلاصہ ہے جو مسلمانوں کو سکھایا گیا ہے۔ چونکہ ایک بڑی اور مبسوط کتاب کا یاد کرنا آسان نہیں اِس لئے یہ کلمہ سکھا دیا گیا تاکہ ہر وقت اِنسان اِسلامی تعلیم کے مغز کو مدِّنظر رکھے اور جب تک یہ حقیقت اِنسان کے اندر پیدا نہ ہو جاوے سچ یہی ہے کہ نجات نہیں۔ اِسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

مَنْ قَالَ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ

یعنی جس نے صدقِ دِل سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کو مان لیا وہ جنّت میں داخل ہو گیا۔ لوگ دھوکہ کھاتے ہیں اگر وہ سمجھتے ہیں کہ طوطے کی طرح لفظ کہہ دینے سے اِنسان جنّت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر اتنی ہی حقیقت اس کے اندر ہوتی تو پھر سب اعمال بے کار اور نکمے ہو جاتے اور شریعت (معاذ اللہ) لغو ٹھہرتی نہیں بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مفہوم جو اس میں رکھا گیا ہے وہ عملی رنگ میں اِنسان کے دِل میں داخل ہو جاوے۔ جب یہ بات ہو جاتی ہے تو ایسا اِنسان فی الحقیقت جنّت میں داخل ہو جاتا ہے۔ نہ صرف مرنے کے بعد بلکہ اِسی زندگی میں وہ جنّت میں داخل ہو جاتا ہے۔

یہ سچی بات ہے اور جلد سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے سوا اِنسان کا کوئی محبوب اور مقصود نہ رہے تو پھر کوئی دُکھ یا تکلیف اُسے ستا ہی نہیں سکتی۔ یہ وہ مقام ہے جو اَبدال اور قطبوں کو ملتا ہے۔

آپ یہ خیال نہ کریں کہ ہم کب بُتوں کی پرستش کرتے ہیں ہم بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرتے ہیں۔ یاد رکھو یہ تو اَدنیٰ درجہ کی بات ہے کہ اِنسان بُتوں کی پرستش نہ کرے۔ ہندو لوگ جن کو حقائق کی کوئی خبر نہیں اَب بُتوں کی پرستش

چھوڑ رہے ہیں۔ معبود کا مفہوم اس حد تک نہیں کہ انسان پرستی یا بُت پرستی تک ہو اور بھی معبود ہیں اور یہی اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ ہوائے نفس اور ہَوس بھی معبود ہیں۔ جو شخص نفس پرستی کرتا ہے یا اپنی ہَوا و ہَوس کی اطاعت کر رہا ہے اور اس کے لئے مَر رہا ہے وہ بھی بُت پرست اور مُشرک ہے۔ یہ لانفی جنس ہی نہیں کرتا بلکہ ہر قسم کے معبودوں کی نفی کرتا ہے خواہ وہ انفس ہوں یا آفاقی۔ خواہ وہ دِل میں چھپے ہوئے بُت ہیں یا ظاہری بُت ہیں مثلاً ایک شخص بالکل اسباب ہی پر توکّل کرتا ہے تو یہ بھی ایک قسم کا بُت ہے اس قسم کی بُت پرستی تپ دِق کی طرح ہوتی ہے جو اندر ہی اندر ہلاک کر دیتا ہے۔ موٹی قسم کے بُت تو جھٹ پٹ پہچانے جاتے ہیں اور اُن سے مخلصی حاصل کرنا بھی سہل ہے اور مَیں دیکھتا ہوں کہ لاکھوں ہزاروں انسان ان سے الگ ہو گئے اور ہو رہے ہیں۔ یہ ملک جو ہندوؤں سے بھرا ہؤا تھا کیا سب مسلمان ان میں سے ہی نہیں ہوئے پھر انہوں نے بُت پرستی کو چھوڑا یا نہیں؟ اور ہندوؤں میں بھی ایسے فرقے نکلتے آتے ہیں جو اَب بُت پرستی نہیں کرتے۔ لیکن یہاں تک ہی بُت پرستی کا مفہوم نہیں ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ موٹی بُت پرستی چھوڑ دی ہے مگر ابھی تو ہزاروں بُت اِنسان بَغل میں لئے پھرتا ہے اور وہ لوگ بھی جو فلسفی اور منطقی کہلاتے ہیں وہ بھی ان کو اندر سے نہیں نکال سکتے۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے سوا یہ کیڑے اندر سے نکل نہیں سکتے۔ یہ بہت ہی باریک کیڑے ہیں اور سب سے زیادہ ضرر اور نقصان ان کا ہی ہے۔ جو لوگ جذباتِ نفسانی سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کے حقوق اور حدود سے باہر ہو جاتے ہیں اور اس طرح پر حقوق العباد کو بھی تلف کرتے ہیں۔ وہ ایسے نہیں کہ پڑھے لکھے نہیں بلکہ ان میں ہزاروں کو مولوی فاضل اور عالم پاؤ گے اور بہت ہوں گے جو فقیہہ اور صوفی کہلاتے ہوں گے مگر باوجود ان باتوں کے وہ بھی ان امراض میں مُبتلا نکلیں گے۔ ان بُتوں سے پرہیز کرنا ہی تو بہادری ہے اور اُن کو شناخت کرنا ہی کمال دانائی اور دانشمندی ہے۔ یہی بُت ہیں جن کی وجہ سے آپس میں نفاق ہوتا ہے اور ہزاروں کُشت و خون ہو جاتے ہیں۔ ایک بھائی دوسرے کا حق مارتا ہے اور اسی طرح ہزاروں ہزار بَدیاں اُن کے سبب سے ہوتی ہیں۔ ہر روز اور ہر آن ہوتی ہیں اور اسباب پر اس قدر بھروسہ کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کو محض ایک عضوِ معطّل قرار دے رکھا ہے۔ بہت ہی کم لوگ ہیں جنہوں نے توحید کے اصل مفہوم کو سمجھا ہے اور اگر انہیں کہا جاوے تو جھٹ کہہ دیتے ہیں کیا ہم مسلمان نہیں اور کلمہ نہیں پڑھتے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ انہوں نے اتنا ہی سمجھ لیا ہے کہ بس کلمہ مُنہ سے پڑھ دیا اور یہ کافی ہے۔

مَیں یقیناً کہتا ہوں کہ اگر انسان کلمہ طیبہ کی حقیقت سے واقف ہو جاوے اور عملی طور پر اس پر کاربند ہو جاوے تو وہ بہت بڑی ترقی کر سکتا ہے اور خدا تعالیٰ کی عجیب در عجیب قدرتوں کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ یہ امر خوب سمجھ لو کہ مَیں جو اس مقام پر کھڑا ہوں مَیں معمولی واعظ کی حیثیت سے نہیں کھڑا ہؤا ہوں اور کوئی کہانی سُنانے کے لئے نہیں کھڑا ہؤا ہوں بلکہ مَیں تو ادائے شہادت کے لئے کھڑا ہؤا ہوں مَیں نے وہ پیغام جو اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے پہنچا دینا ہے اِس امر کی

مجھے پرواہ نہیں کہ کوئی اسے سنتا ہے یا نہیں سنتا اور مانتا ہے یا نہیں مانتا۔ اس کا جواب تم خود دوگے مَیں نے فرض ادا کرنا ہے۔ مَیں جانتا ہوں بہت سے لوگ میری جماعت میں داخل تو ہیں اور وہ توحید کا اقرار بھی کرتے ہیں مگر مَیں افسوس سے کہتا ہوں کہ وہ مانتے نہیں۔ جو شخص اپنے بھائی کا حق مارتا ہے یا خیانت کرتا ہے یا دوسری قسم کی بدیوں سے باز نہیں آتا مَیں یقین نہیں کرتا کہ وہ توحید کا ماننے والا ہے کیونکہ یہ ایسی نعمت ہے کہ اس کو پاتے ہی انسان میں ایک خارق عادت تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اس میں بغض، کینہ، حسد، ریا وغیرہ کے بُت نہیں رہتے اور خدا تعالیٰ سے اس کا قرب ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی اسی وقت ہوتی ہے اور اسی وقت وہ سچا موحد بنتا ہے جب یہ اندرونی بُت تکبّر، خود پسندی، ریا کاری، کینہ و عداوت، حسد و بُخل، نفاق و بدعہدی وغیرہ کے دُور ہو جاویں۔ جب تک یہ بُت اندر ہی ہیں اُس وقت تک لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے میں کیونکر سچا ٹھہر سکتا ہے؟ کیونکہ اس میں تو کُل کی نفی مقصود ہے۔ پس یہ پکی بات ہے کہ صرف مُنہ سے کہہ دینا کہ خدا کو وحدہٗ لاشریک مانتا ہوں کوئی نفع نہیں دے سکتا۔ ابھی مُنہ سے کلمہ پڑھتا ہے اور ابھی کوئی امر ذرا مخالفِ مزاج ہو اور غصہ اور غضب کو خدا بنا لیا۔

مَیں بار بار کہتا ہوں کہ اِس امر کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جب تک یہ مخفی معبود موجود ہوں ہرگز توقع نہ کرو کہ تم اس مقام کو حاصل کرو گے جو ایک سچے موحّد کو ملتا ہے جیسے جب تک چوہے زمین میں ہیں مت خیال کرو کہ طاعون سے محفوظ ہو۔ اسی طرح پر جب تک یہ چوہے اندر ہیں اس وقت تک ایمان خطرہ میں ہے۔ جو کچھ مَیں کہتا ہوں اس کو خُوب غور سے سُنو اور اس پر عمل کرنے کے لئے قدم اُٹھاؤ۔ مَیں نہیں جانتا کہ اِس مجمع میں جو لوگ موجود ہیں آئندہ ان میں سے کون ہوگا اور کون نہیں یہی وجہ ہے کہ مَیں نے تکلیف اُٹھا کر اِس وقت کچھ کہنا ضروری سمجھا ہے تا مَیں اپنا فرض ادا کر دوں۔

پس کلمہ کے متعلق خلاصہ تقریر کا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارا معبود اور محبوب اور مقصود ہو اور یہ مقام اس وقت ملے گا جب ہر قسم کی اندرونی بدیوں سے پاک ہو جاؤ گے اور اُن بُتوں کو جو تمہارے دِل میں ہیں نکال دو گے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۳ تا ۵)

اللہ تعالیٰ حکیم ہے اس نے ایک مختصر سا کلمہ سُنا دیا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ جب تک خدا کو مقدّم نہ کیا جاوے۔ جب تک خدا کو معبود نہ بنایا جاوے۔ جب تک خدا کو مقصود نہ ٹھہرایا جاوے اِنسان کو نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۲،۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱)

خدا تعالیٰ الفاظ سے تعلق نہیں رکھتا وہ دلوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ درحقیقت اس کلمہ کے مفہوم کو اپنے دل میں داخل کر لیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی عظمت پورے رنگ کے ساتھ اُن کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہے وہ جنّت میں داخل ہو جاتے ہیں۔

جب کوئی شخص سچے طور پر کلمہ کا قائل ہو جاتا ہے تو بجز خدا کے اَور کوئی اس کا پیارا نہیں رہتا۔ بجز خدا کے

کوئی اس کا معبود نہیں رہتا اور بجز خدا کے کوئی اس کا مطلوب باقی نہیں رہتا۔ وہ مقام جو اَبدال کا مقام ہے اور وہ جو قطب کا مقام ہے اور وہ جو غوث کا مقام ہے وہ یہی ہے کہ کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پر دِل سے ایمان ہو اور اس کے سچے مفہوم پر عمل ہو۔

(بدر جلد ۶ ۲/۱ مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱)

خدا کے واحد ماننے کے ساتھ یہ لازم ہے کہ اس کی مخلوق کی حق تلفی نہ کی جاوے جو شخص اپنے بھائی کا حق تلف کرتا ہے اور اس کی خیانت کرتا ہے وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا قائل نہیں۔

(بدر جلد ۶ ۲/۱ مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۲)

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ۔ ذَنب کے معنی (ا) عیسائی بیان کرتے ہیں کہ قرآن شریف انبیاء کو ایسا ہی گنہ گار ٹھہراتا ہے جیسا کہ معمولی آدمیوں کو۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو قرآن شریف ایسے الفاظ کو مثلاً جرم، فسق، جناح، اِثم وغیرہ انبیاء کے متعلق کیوں اِستعمال نہیں کرتا حالانکہ ایسے الفاظ اکثر دوسرے لوگوں کی نسبت اِستعمال ہوئے ہیں۔ اگر قرآن شریف ان کو ایسا ہی گنہ گار سمجھتا ہے جیسا کہ دوسرے آدمیوں کو تو کیوں وہ ان کے متعلق ویسے الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کرتا ہے جو دوسرے گنہ گاروں کے متعلق اکثر اِستعمال کرتا ہے۔ لفظ فسق، جرم، اِثم جناح وغیرہ قرآن میں قریباً دوسَو دفعہ آئے ہیں لیکن باوجود ان کی اِس قدر کثرتِ اِستعمال کے کسی نبی کی نسبت وہ ایک دفعہ بھی استعمال نہیں کئے گئے۔ اگر لفظ ذَنب اور جرم وغیرہ میں کوئی فرق نہیں ہے تو کیا وجہ ہے کہ قرآن شریف نے انبیاء کے لئے صرف ذَنب کا لفظ چُن لیا ہے اور ہمیشہ جُرم وغیرہ الفاظ کے استعمال سے پرہیز کی ہے۔ قرآن شریف میں جرم، فسق، اِثم وغیرہ کی نسبت ذَنب کا استعمال بہت کم ہے لیکن باوجود اسکے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن شریف دوسرے لفظوں کو چھوڑ کر انبیاء کی نسبت صرف ذَنب کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ قرآن شریف نے صریحاً انبیاء کے متعلق جُرم اور ذَنب کے لفظ کے اِستعمال میں تمیز رکھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کبھی انبیاء کی نسبت ذَنب کا لفظ اِستعمال ہوتا ہے تو وہ جُرم وغیرہ کا مترادف نہیں ہوتا۔

(ب) ایک اَور دلیل کہ ذَنب ہمیشہ گناہ سرزدشدہ کے معنے نہیں رکھتا یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ ذَنب کی ایسے فِعل کے طور پر تعریف نہیں کرتا جو ہمیشہ قابلِ سزا ہو حالانکہ دوسرے الفاظ جُرم وغیرہ کی ایسی تعریف کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ ذَنب کو تمام صورتوں میں قابلِ سزا فعل نہیں ٹھہراتا۔ ہمیں قرآن شریف میں کہیں نہیں بتلایا کہ جس شخص میں صرف ذَنب پایا جائے وہ ہمیشہ مستحق سزا ہوتا ہے مگر گناہ ایک قابلِ سزا فِعل ہے اور ہر ایک شخص جو گناہ کا مرتکب ہو سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ اِس سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ذَنب کو تمام صورتوں میں گناہ کا مترادف نہیں قرار دیتا کیونکہ وہ کہیں بیان نہیں کرتا کہ جس شخص میں ذَنب پایا جائے وہ ہمیشہ قابلِ سزا فِعل کا مرتکب ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں ایک بھی آیت نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکل سکے کہ خدائے تعالیٰ

ذنب کی تمام صورتوں کو قابلِ سزا ٹھہراتا ہے بجائے اس کے کہ عیسائی قرآن شریف سے کوئی ایسی آیت پیش کرتے جس سے پایا جاتا کہ جس شخص میں ذنب پایا جائے وہ سزا کا مستحق ہوجاتا ہے۔ انہوں نے ایسی آیتیں پیش کی ہیں جن میں ذنب گناہ کے لئے آیا ہے۔ گویا ہمارا یہ دعویٰ تھا کہ ذنب گناہ کے معنوں میں آتا ہی نہیں۔ قرآن شریف سے ایسی آیتیں پیش کی گئیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجرم لوگ اپنے ذنوب کی سزا پائیں گے لیکن کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس میں ذنب پایا جائے وہ سزا پائے گا۔ ان آیتوں سے تو اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ جو مجرم ہوں گے وہ اپنے ذنوب کی سزا پائیں گے۔ ہم عیسائی صاحبان سے ایسی آیت طلب کرتے ہیں جس کے یہ معنے ہوں کہ ہر ایک مذنب سزا پائے گا۔ قرآن شریف میں ایسی کئی آیتیں ہیں کہ جو کوئی جُرم، فسق، اِثم، کفر کرے وہ سزا کا مستحق ہوجاتا ہے۔ مثلاً یہ آیت ہے مَنْ یَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ[1] ترجمہ۔ جو کوئی خدا کے پاس مجرم کے طور پر آئے گا دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ لیکن ہمیں کہیں نہیں بتلایا گیا کہ جو کوئی رب کے پاس مذنب ہوکر جائے گا دوزخ میں سزا پاوے گا۔ ایسا ہی قرآن شریف میں کئی آیتیں ہیں جن میں فسق، اِثم، کفر وغیرہ تمام صورتوں میں قابلِ سزا فعل بیان کئے گئے ہیں مگر ذنب کی کہیں ایسی تعریف نہیں کی گئی۔

مجرم، کافر، فاسق وغیرہ کا ذنب خالص ذنب نہیں ہے کیونکہ اِن صورتوں میں ان لوگوں کی طرف صرف ذنب ہی منسوب نہیں کیا گیا کیونکہ ان لوگوں کے ذنب کے ساتھ جُرم وکفر، فسق وغیرہ بھی ملائے گئے ہیں اِس لئے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ذنب جس کے ساتھ کفر، جُرم، فسق وغیرہ نہ ملا ہؤا ہو وہ بھی ہمیشہ قابلِ سزا ہوتا ہے۔ اگر مجرم، کافر، فاسق وغیرہ کو اسکے ذنب کی سزا میں دوزخ کا وعید سُنایا گیا ہے تو اس سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ انبیاء بھی جن کی طرف جُرم، کفر، فسق منسوب نہیں کئے گئے اپنے ذنب کے لئے مستحقِ سزا ہوتے ہیں۔ عیسائیوں کو قرآن شریف کی رُو سے ثابت کرنا چاہیئے کہ جس شخص کی طرف صرف ذنب منسوب کیا گیا ہو اور جُرم، فسق، اِثم وغیرہ اس کی طرف منسوب نہ کئے گئے ہوں وہ بھی سزا کا ایسا ہی مستحق ہوجاتا ہے جیسا کہ مجرم یا اثیم وغیرہ۔ اب قرآن شریف میں خدائے تعالیٰ انبیاء کی نسبت صرف ذنب کا لفظ اِستعمال کرتا ہے اور ذنب کو وہ کہیں ایسے فعل کے طور پر بیان نہیں کرتا جو کہ تمام صورتوں میں سزا کا مستحق بنادے اور وہ جُرم، فسق، اِثم، کفر وغیرہ الفاظ انبیاء کی نسبت استعمال نہیں کرتا اور وہ ان معنوں کو ان کی تمام صورتوں میں قابلِ سزا بیان کرتا ہے۔ اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ انبیاء کو ایسے لوگوں میں شامل نہیں کرتا جو کہ سزا پانے کے خطرہ میں ہوتے ہیں جیسا کہ وہ دوسرے لوگوں کو سمجھتا ہے۔

(ج) عیسائی بیان کرتے ہیں کہ انبیاء بھی اسی طرح گناہ کرسکتے ہیں جیسا کہ دوسرے لوگ اور یہ کہ انبیاء اور دوسرے لوگوں میں اِس بارہ میں کوئی فرق نہیں۔ قرآن شریف اس کی تردید کرتا ہے۔ وہ اِس بارے میں انبیاء اور دوسرے

---

[1] سُورۃ طٰہٰ : ۷۵

لوگوں میں صاف تمیز کرتا ہے۔جب بعض لوگوں نے شک کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت میں سے زیادہ حصہ لے لیا ہے تو خدائے تعالیٰ نے اُن کے شبہات کا اِس طرح جواب دیا مَا کَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ[1] (ترجمہ) نبی کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ مالِ غنیمت میں خیانت کرے جس طرز میں خداوند تعالیٰ نے جواب دیا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گناہ کے بارے میں خدائے تعالیٰ انبیاء کو اور دوسرے لوگوں کو مساوات کی نظر سے نہیں دیکھتا۔خدائے تعالیٰ ان کے شبہوں کا یُوں جواب دے سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس معاملہ میں کوئی خیانت نہیں کی برخلاف اس کے خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی نبی ایسا کام کرے۔اِس سے معلوم ہُوا کہ خدائے تعالیٰ کے نزدیک انبیاء اور دوسرے لوگ گناہ کے معاملہ میں مساوی نہیں جیسا کہ عیسائیوں کا خیال ہے۔خدا یہاں ایک قسم کے گناہ کا ذکر اِس لئے کرتا ہے کہ موجودہ صورت میں اسی قسم کا الزام لگایا گیا تھا اور یہی الزام تھا جس سے خدائے تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بری کرنا چاہتا تھا۔

(د) عیسائی لوگ بیان کرتے ہیں کہ اِستغفار ایسے گناہوں کی معافی کے لئے ایک دعا ہے جو سرزد ہو چکے ہوں اور جب تک کہ کوئی گناہ سرزد نہ ہو کوئی اِستغفار نہیں ہو سکتا۔یہ بیان کئی وجوہات کی رُو سے غلط ہے۔

(۱) اِستغفار کے لفظی معنے اِس بیان کی تردید کرتے ہیں۔اِس کے معنے ہیں حفاظت مانگنا۔گناہ ہونے سے حفاظت مانگنا صریحًا دو قسم کا ہوتا ہے ایک سرزد شدہ گناہوں کے بدنتائج سے حفاظت طلب کرنا دوسرا خود گناہوں کے وقوع سے حفاظت طلب کرنا۔ہم طبعی طور پر صرف یہی خواہش نہیں کرتے کہ ہمارے گذشتہ گناہ معاف ہوں بلکہ یہ بھی خواہش کرتے ہیں کہ آئندہ ہم سے گناہ سرزد ہی نہ ہوں اور اِستغفار ایک ایسی دعا ہے جس میں ہم اپنی طبعی خواہشوں کو ظاہر کرتے ہیں۔اُس کو صرف ایک خواہش پر ہی محدود کرنا بے اِنصافی ہے۔

(۲) قرآن شریف میں کئی آیات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِستغفار صرف سرزد شدہ گناہوں کے لئے ایک دعا نہیں ہے بلکہ ہم بغیر کسی گناہ کے وقوع کے بھی اِستغفار کر سکتے ہیں۔خدا تعالیٰ ہمیں تاکید کرتا ہے کہ صُبح کے وقت اِستغفار کیا کرو اگر اِستغفار ضرور گناہوں کے بعد ہوتا ہے تو کیوں خداوند تعالیٰ نے صبح کا وقت خاص کیا۔ہم سے جس وقت گناہ سرزد ہو اسی وقت اِستغفار کرنا چاہیئے تھا مگر خدا تعالیٰ ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم ہر روز صبح کے وقت اِستغفار کیا کرو۔وہ فرماتا ہے اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ[2] پھر فرماتا ہے اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ۝ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ[3] اِن آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ ہمیں یہی حکم نہیں کرتا کہ جس وقت تم سے کوئی گناہ سرزد ہو اُس وقت

---

[1] سورۃ آلِ عمران : ۱۶۲ [2] سورۃ آلِ عمران : ۱۸ [3] سورۃ الذّٰریٰت : ۱۷ تا ۱۹

اِستغفار کر لیا کرو بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ بغیر گناہوں کے اِرتکاب کے بھی ہم اِستغفار کیا کریں۔

(۳) ایک اَور آیت جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِستغفار گنہگار ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے اِس طرح پر ہے نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ[۱] (سورۃ التحریم) اِس آیت میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ بہشتی لوگ بھی اِستغفار کیا کریں گے۔ ان کا اِستغفار گناہوں کے لئے نہیں ہو سکتا کیونکہ بہشت میں کوئی گناہ نہیں ہوگا اور نہ وہ اپنی دُنیاوی زندگی کے گناہوں کے لئے اِستغفار کریں گے کیونکہ ہمیں اس سے پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ بہشت میں داخل ہونے سے پہلے اُن کے گناہ معاف کئے جائیں گے۔ آیت اِس طرح ہے عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ[۲] پس ان کا اِستغفار گزشتہ گناہوں کے لئے نہیں۔ خود اِس آیت سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اُن کا اِستغفار کس غرض کے لئے ہوگا۔ چونکہ خداوند تعالیٰ کے نُور کی کوئی حد نہیں ہے اِس لئے جو نُور اہلِ جنّت کو ملے گا اور ان کو اس نور کے مقابل میں ناقص نظر آئے گا جو ابھی ان کو نہیں ملا۔ اس نقص کو محسوس کر کے وہ خدا سے دعا کریں گے کہ ہمارا نور پُورا کر اور ہماری اس ناقص حالت کو ڈھانپ دے مگر وہ کبھی نور سے سیر نہیں ہوں گے کیونکہ خدا کے نور کی کوئی حد نہیں اِس لئے وہ ہمیشہ زیادہ اور زیادہ نور مانگتے رہیں گے۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ اِستغفار رُوحانی ترقّی کے لئے ایک دعا ہے۔ چونکہ رُوحانی ترقّی کی کوئی حد نہیں اِس لئے انبیاء علیہم السّلام ہمیشہ دعا میں لگے رہتے ہیں اور ہمیشہ زیادہ نور مانگتے رہتے ہیں وہ کبھی اپنی رُوحانی ترقی پر سیر نہیں ہوتے اِس لئے ہمیشہ اِستغفار میں لگے رہتے ہیں کہ خدا ان کی ناقص حالت کو ڈھانپے اور پُورا روشنی کا سامان دے۔ اِسی وجہ سے خدائے تعالیٰ اپنے نبی کو فرماتا ہے قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا[۳] یعنی ہمیشہ علم کے لئے دعا کرتا رہ کیونکہ جیسا کہ خدا بیحد ہے ایسا ہی اس کا علم بھی بیحد ہے۔ القصہ اہلِ جنّت کا اِستغفار صاف طور پر ثابت کرتا ہے کہ اِستغفار اور گناہ لازم ملزوم نہیں ہیں اور یہ کہ ہمارا اِستغفار اِس لئے بھی ہو سکتا ہے کہ خدا ہماری کمزوریوں کو ڈھانپے اور رُوحانی ترقّی کے لئے طاقت دے۔ عیسائی بڑے ظالم ٹھہریں گے اگر وہ اب بھی اِصرار کریں گے کہ اِستغفار ہمیشہ گذشتہ گناہوں کی معافی کے لئے ایک دعا ہوتی ہے۔

(۴) ایک اَور آیت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِستغفار ہمیشہ گزشتہ گناہوں کے لئے نہیں ہوتا وہ یہ ہے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا[۴]۔ اِس آیت میں خداوند تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اِستغفار کی تاکید کرتا ہے۔ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تھوڑے ہی دن پہلے اُتری۔ اب اس

---

[۱] [۲] سورۃ التحریم: ۹ ؛ [۳] سورۃ طٰہٰ: ۱۱۵ ؛ [۴] سورۃ النصر: ۴

آیت کے ساتھ یہ آیت ملاؤ۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا o لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ[1] یہ آیت فتح مکہ کے وقت اُتری اِس لئے یہ آیت اوّل الذکر آیت سے بہت پہلے کی ہے عیسائی اِس آیت کا اِس طرح ترجمہ کرتے ہیں "ہم نے تجھے ایک صریح فتح دی تاکہ ہم تیرے پہلے اور پچھلے گناہ معاف کریں"۔ یہ عیسائیوں کا ترجمہ ہے اِسلئے عیسائیوں کو ماننا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ نے فتح مکہ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کُل اگلے پچھلے گناہ معاف کردئے تھے۔ اب جب خداوند تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کردئے تو پھر خداوند تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو کیوں استغفار کی تاکید کی۔ اگر ہم عیسائیوں کے ترجمہ کو بھی مان لیں تو ہمیں نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ جب خداوند تعالیٰ نے گناہ معاف کرنے کے بعد استغفار کی تاکید کی تو وہ استغفار گذشتہ سرزدشدہ گناہوں کیلئے نہیں تھا کیونکہ آپؐ کے گناہ تو سارے معاف ہوچکے تھے یہ کس طرح ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ اوّل سارے گناہوں کو معاف کرے اور پھر بعد اس کے گناہوں کی معافی منگوائے۔ پس عیسائیوں کو ماننا چاہیئے کہ یہاں وَاسْتَغْفِرْهُ کے معنے یہ نہیں کہ گناہوں کے لئے معافی مانگ بلکہ یہاں استغفار کے معنے خداوند تعالیٰ سے قوت طلب کرنا ہے تاکہ وہ روحانی منزل کے طے کرنے میں طاقت بخشے۔ سیاق کلام بھی اس معنے کی تائید کرتا ہے۔ اِس سُورت میں (یعنی النصر) میں خداوند تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل کامیابی کا ذکر کرتا ہے اور آپ کے قُربِ موت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ زندگی کے باقی دنوں میں صرف دعا میں لگ جاؤ۔

(۵) عیسائی بیان کرتے ہیں کہ استغفار نہیں ہوسکتا جب تک کہ گناہوں کا اِرتکاب نہ ہو اور یہ کہ جتنا زیادہ کوئی استغفار کرے اتنا ہی زیادہ وہ گنہگار ہوتا ہے۔ اِس خیال کی قرآن شریف تردید کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریباً ایک دن میں سَو دفعہ استغفار کیا کرتے تھے اور آپؐ ساری عمر ایسا ہی کرتے رہے۔ اب عیسائیوں کے نزدیک یہ بار بار کا اِستغفار گناہوں کی زیادتی کو ظاہر کرتا ہے مگر قرآن شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بڑے تعریف والے کلمے بیان کرتا ہے مثلاً اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ[2] نیز یہ آیت قُلْ اِنَّ صَلَاتِىْ وَنُسُكِىْ وَمَحْيَاىَ وَمَمَاتِىْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o[3] پھر خداوند تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سراجِ منیر فرماتا ہے۔ اب اِن تمام آیتوں سے اِس نتیجہ کی تردید ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بار بار کا استغفار کثرتِ گناہوں کی وجہ سے تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو خداوند تعالیٰ ایسے الفاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد نہ فرماتا جن کا اُوپر ذکر ہوا ہے۔

(۶) خداوند تعالیٰ مسلمانوں کو حکم کرتا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کے نمونے پر چلیں اور آپؐ کے ہر قول اور فعل کی پیروی کریں چنانچہ فرماتا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ[4] پھر فرماتا ہے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ

---

[1] سورۃ الفتح: ۲،۳ [2] سورۃ القلم: ۵ [3] سورۃ الانعام: ۱۶۳ [4] سورۃ الاحزاب: ۲۲

فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ[1]۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال عیب سے خالی نہ تھے تو کیوں ہم پر واجب کیا کہ ہم آپؐ کے نمونے پر چلیں۔ جب خدا نے ابراہیم علیہ السلام کے نمونے پر چلنے کی تاکید فرمائی تو ساتھ ایک اِستثناء لگا دیا مگر آنحضرتؐ کی صورت میں کوئی اِستثناء نہیں کیا۔ اِس سے معلوم ہوُا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال غلطی سے پاک تھے.....

• اگر استغفار اور گناہ لازم ملزوم ہیں تو اِس سے ماننا پڑتا ہے کہ قرآن شریف کے رُو سے حضرت مسیح بھی بیگناہ نہیں ہیں۔

(الف) قرآن شریف میں یَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ[2] یعنی خدا کے فرشتے کُل اہلِ زمین کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ اب اگر استغفار کے لئے گناہ کا ہونا ضروری ہے تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ حضرت مسیح بھی بیگناہ نہ تھے کیونکہ وہ بھی اہلِ زمین میں شامل ہیں جن کے لئے فرشتے استغفار کرتے ہیں۔

(ب) قرآن شریف ایک اور جگہ فرماتا ہے کہ فرشتوں کا استغفار خاص کر مومنوں کے لئے ہوتا ہے وہ آیت اِس طرح ہے یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا[3] قرآن شریف کی رُو سے تمام لوگ دُو اقسام میں منقسم ہیں ایک مومن دوسرے غیر مومن۔ اور حضرت مسیح مومنوں میں شامل ہیں اور اِس لئے فرشتے ان کے لئے بھی استغفار کرتے ہیں پس اگر استغفار سے گناہ کا ہونا لازم ہوتا ہے تو پھر حضرت مسیح بے گناہ نہیں ہوسکتے۔

(ج) قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام گذشتہ انبیاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے تھے چنانچہ خداتعالیٰ فرماتا ہے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ[4] الخ (آلِ عمران رکوع ۹)۔

مسٹر اے ایم اِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ کا عجیب ترجمہ کرتا ہے۔ اس کا ترجمہ کرنے کے واسطے وہ قرآن شریف کی ایک اَور آیت کی طرف رُخ کرتا ہے یعنی لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ[5] اور ان دونوں آیتوں کو ملانے کی کوشش کرتا ہے پچھلی آیت کا یہ معنی ہے کہ خدا نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور پہلی آیت اپنی ترکیب کے لحاظ سے بالکل پچھلی آیت کے مشابہ ہے اِس لئے اس کے معنے یوں کرنا چاہیئے کہ خدا نے انبیاء سے عہد لیا۔ دونوں ترکیبیں بالکل مشابہ ہیں اور اگر لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کے یہ معنے ہیں کہ خدا نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تو دوسری آیت کے یہ معنے ہونے چاہیئے کہ خدا نے انبیاء سے عہد لیا۔ صرف ہم نے ایک آیت میں انبیاء کا لفظ رکھنا ہے

---

[1] سورۃ آلِ عمران: ۳۲ [2] سورۃ الشوریٰ: ۶ [3] سورۃ المومن: ۸ [4] سورۃ آلِ عمران: ۸۲

[5] سورۃ المائدۃ: ۷۱

اور دوسری آیت میں بنی اسرائیل کا لفظ ۔ باقی حالتوں میں دونوں عبارتیں بالکل ایک ہی ہیں لیکن بجائے اس کے مسٹر اے۔ایم لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کا اسی طرز سے ترجمہ کرے جس طرح وہ دوسری عبارت کا ترجمہ کرتا ہے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ کا بہت ہی خلافِ محاورہ ترجمہ کرتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے معنے یہ ہیں کہ خدا نے انبیاء کے بارے میں بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ بنی اسرائیل کا لفظ وہ اپنی طرف سے ملاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کے یہ معنے کرتا ہے کہ بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ دوسری طرف مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ کا یوں ترجمہ کرتا ہے کہ انبیاء کے بارے میں بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ دونوں عبارتیں بالکل مشابہ ہیں اِس لئے اگر مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کے یہ معنی ہیں کہ بنی اسرائیل سے عہد لیا تو مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ کے یہ معنے ہونے چاہئیں کہ نبیوں سے عہد لیا۔

اس کا یہ اعتراض کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی نبی زندہ نہ تھا جو آپؐ پر ایمان لاتا اور آپ کی نصرت کرتا لغو ہے۔ خدا نے یہ عہد ہر ایک نبی سے کیا جو آنحضرتؐ سے پہلے گذرا اور خدا کی وحی انبیاء پر اُترتی تھی نہ کہ عام لوگوں پر لیکن انبیاء کا فرض تھا کہ خدا کا یہ حکم اپنی اپنی اُمتوں کو پہنچاتے اور ان کو تاکید کرتے کہ جب موعود نبی ظاہر ہو تو اس پر ایمان لانا اور اس کی امداد کرنا مگر وہ اس حکم کو نہیں پہنچا سکتے تھے جب تک وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لاتے۔ جب انہوں نے آنحضرتؐ کی آمد کی پیشگوئی کی تو لازم تھا کہ وہ خود بھی آپؐ کی نبوت پر ایمان لاتے مگر مسٹر اے۔ ایم کا اِعتراض ہم پر پڑتا ہے تو وہ اس کے معنوں پر بھی ایسا ہی پڑتا ہے۔ اگر عہد بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا تو وہ بنی اسرائیل کی کوئی خاص نسل ہوگی۔ اگر انبیاء آنحضرتؐ کے زمانے تک زندہ نہ رہ سکتے تھے تو بنی اسرائیل بھی زندہ نہ رہ سکتے تھے۔ وہ نسل اپنے نبی کے ساتھ ہی گذر گئی ہوگی تو پھر وہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کو دیکھ سکتی تھی اِس لئے دونوں صورتوں میں جن لوگوں سے عہد کیا گیا وہ بذاتِ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو نہیں دیکھ سکتے تھے اِس لئے دونوں صورتوں میں خدا کے حکم کی تعمیل کرنے والے وہی لوگ ٹھہرتے ہیں جو آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت موجود تھے اور اپنے انبیاء کے قائم مقام تھے۔ پس ہمیں صرف یہی دیکھنا چاہیئے کہ عہد کن سے کیا گیا۔ آیت کے الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عہد انبیاء سے کیا گیا۔ خدا سے الہام پاکر انبیاء کا فرض تھا کہ خدا کے اس حکم کو اپنی اُمتوں تک پہنچاویں اور اُن کو تاکید کریں کہ موعود نبی پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا لیکن وہ کس طرح اَوروں کو تاکید کر سکتے تھے جب تک کہ وہ خود پہلے آنحضرتؐ کی نبوت پر ایمان نہ لاتے۔ انبیاء کی نصرت تو یہی تھی کہ وہ اپنی اپنی اُمتوں کو تاکید کر جاویں کہ موعود نبی پر ایمان لانا اور اس کی نصرت کرنا۔

اب چونکہ حضرت مسیح بھی انہی انبیاء میں سے ہیں جن کا اس آیت میں ذکر ہے اِس لئے ثابت ہوا کہ وہ بھی آنحضرتؐ کی نبوّت پر ایمان لاتے تھے اور اِس لئے مومنین میں شامل تھے۔ اَب خدا تعالیٰ آنحضرتؐ کو فرماتا ہے

اِسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ اب اگر استغفار کے لئے گناہ لازم ہے تو ثابت ہؤا کہ حضرت مسیح بھی بے گناہ نہیں تھے کیونکہ آپ بھی مذکورہ بالا آیت کے مطابق مومنین میں شامل تھے جن کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کا حکم ہے۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ ۔ صفحہ ۲۴۰ تا ۲۴۸)

مَیں یہاں اُن انبیاء کا ذکر کرتا ہوں جن کی نسبت عیسائی بیان کرتے ہیں کہ قرآن شریف میں ان کے گناہوں کا ذکر ہے اور دیکھتا ہوں کہ ان کا یہ قول کہاں تک صحیح ہے۔

حضرت آدمؑ کی نسبت تو خدا خود فرماتا ہے وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا[1] یعنی آدم نے یہ کام ارادةً نہیں کیا۔ اب گناہ تو ارادہ پر منحصر ہے۔ اگر ایک شخص زہر پی لے اور اس کو علم ہو کہ یہ زہر ہے اور اس کا نتیجہ موت ہو گا تو ایسی صورت میں وہ ایک گناہ کا مرتکب ہوتا ہے لیکن اگر وہ اس کو بغیر علم کے پی لے تو اگرچہ اس کو نتیجہ بھگتنا پڑے گا مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے گناہ کیا۔ یہی حال حضرت آدم علیہ السّلام کا ہے ہمیں بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حوّا نے ان کو پھل دیا تھا ان کو یہ علم نہ تھا کہ یہ وہی ممنوعہ پھل ہے۔ ان کا یہ کام بیشک خدا تعالیٰ کے حکم کے خلاف تھا مگر انہوں نے اس حکم کو عمداً نہیں توڑا اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے گناہ کیا۔ اس پھل کے کھانے کا وہی نتیجہ نکلا جو زہر کھانے سے نکلتا ہے کیونکہ قدرت اپنا کام کرنے سے رُک نہیں سکتی مگر اس صورت میں کوئی گناہ نہیں تھا کیونکہ کوئی ارادہ نہیں تھا۔

حضرت آدم کبھی شرک کے مُرتکب نہیں ہوئے۔ شرک ایک ناقابلِ عفو گناہ ہے اور خدا کے پاک لوگ ایسا گناہ نہیں کر سکتے۔ جس آیت کا عیسائی حوالہ دیتے ہیں اُس میں حضرت آدم کا نام نہیں ہے اس میں صرف عام انسانوں کے میلان کا ذکر ہے جو شرک کی طرف ان میں پایا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے جو مُکّا مارا تھا وہ ناجائز محل پر نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی جماعت کے ایک آدمی کی ایک دشمن کے مقابل حمایت کی اور موت کا واقعہ اتفاقی تھا۔ ان کا ارادہ قتل کا نہیں تھا۔ خدائے تعالیٰ کوئی گناہ ان کی طرف منسوب نہیں کرتا۔

حضرت ہارون علیہ السّلام کو عیسائیوں نے یہ الزام لگایا ہے کہ انہوں نے بُت پرستوں کی امداد کی اور اس میں شریک ہوئے۔ یہ خالص جھوٹ ہے۔ قرآن شریف سے ہمیں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی غیر حاضری میں قوم کو گوسالہ پرستی سے روک نہ سکے اور یہ قصہ قرآن شریف میں نہیں ہے اگر دوسرے لوگ بائبل کی جھوٹی کہانیاں درج کر دیں تو قرآن شریف ایسے افسانوں کا ذمہ وار نہیں ہے۔

---

[1] سورۃ طٰہٰ : ۱۱۶

حضرتِ مسیح نے کہا کہ میں یونس بن کر نشان دکھاؤں گا۔ کیا اُن کا یہ مطلب تھا کہ مَیں بھی یونس کی طرح ایک گناہ کا ارتکاب کروں گا۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ جس کو حضرت مسیح یونس کا معجزہ قرار دیتے ہیں اس کو آجکل کے عیسائی گناہ یا گناہ کی سزا بیان کرتے ہیں۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ ؁۶ صفحہ ۲۵۰)

نبیوں کے استغفار کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے فضل کا ہاتھ اُن پر رہے ورنہ اگر انسان اپنے نفس پر چھوڑا جاوے تو وہ ہرگز معصوم اور محفوظ نہیں ہو سکتا۔ اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَايَ اور دوسری دعائیں بھی استغفار کے اسی مطلب کو بتاتی ہیں۔ عبودیت کا سِر یہی ہے کہ انسان خدا کی پناہ کے نیچے اپنے آپ کو لے آوے۔ جو خدا کی پناہ نہیں چاہتا وہ مغرور اور متکبر ہے۔ (البدر جلد ۲ ؁۲۳ مورخہ ۲۶ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۷۸)

انبیاء علیہم السلام کے گلہ کرنے سے بھی انسان کافر ہو جاتا ہے چونکہ وہ ان تعلقات سے محض ناآشنا ہوتا ہے جو انبیاء ورسل اور اللہ تعالیٰ میں ہوتے ہیں اِس لئے کسی ایسے امر کو جو ہماری سمجھ اور دانش سے بالاتر اور بالاتر ہے اپنی عقل کے پیمانہ سے ناپنا صریح حماقت ہے مثلاً آدم علیہ السلام کا گلہ کرنے لگے کہ انہوں نے درختِ ممنوعہ کا پھل کھایا یا عَبَسَ وَتَوَلّٰی کو لے بیٹھے ایسی حرکت آداب الرسل کے خلاف ہے اور کفر کی حد تک پہنچا دیتی ہے۔ چونکہ خدا تعالیٰ ان کا محبوب ہوتا ہے بعض اُوقات وہ کسی بات پر گویا رُوٹھ جاتا ہے۔ وہ باتیں عام قانونِ جرائم وذنوب سے الگ ہوتی ہیں۔ ۳۰ سال کے قریب کا عرصہ ہوتا ہے کہ ایک مقرب فرشتہ کو مَیں نے دیکھا جس نے مجھے ایک توت کی چھڑی ماری پھر مَیں نے اس کو دیکھا کہ کرسی پر بیٹھ کر رونے لگا۔ یہ ایک نسبت بتائی ہے کہ جیسے بعض اُوقات والدہ بچہ کو مارتی ہے پھر رِقّت سے خود ہی رونے لگتی ہے۔ یہ ایک لطیف استعارہ ہے جو مجھ پر ظاہر کیا گیا ہے۔

میری سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ ان تعلقات کو جو انبیاء ورسل اور اللہ تعالیٰ میں ہوتے ہیں کس طرح ظاہر کیا جاوے۔ یہ تعلقات ایسے شدید اور گہرے ہوتے ہیں کہ بجز کامل الایمان ہونے اور اس کوچہ سے آشنا ہونے کے اُن کی سمجھ آ ہی نہیں سکتی۔ اِسی لئے صُوفیوں نے لکھا ہے کہ اُن کے افعال اور اعمال عام قانون جرائم وذنوب سے الگ ہوتے ہیں ان کو اس ضمن ذنوب میں ذکر کرنا بھی سلبِ ایمان کا مُوجب ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا حساب تعلقات کا ہے۔ ذنبِ محمدی کی حقیقت کو کوئی کیا سمجھ سکتا ہے؟ عام طور پر عاشق اور معشوق کے تعلقات کو کوئی نہیں سمجھ سکتا اور یہ تعلقات تو اس سے بھی لطیف تر ہیں۔

احمق حقیقت سے ناآشنا استغفار کے لفظ پر اعتراض کرتے ہیں ان کو معلوم نہیں کہ جس قدر یہ پیارا لفظ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اندرونی پاکیزگی پر دلیل ہے وہ ہمارے وہم وگمان سے بھی پرے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عاشقِ رضا ہیں اور اس میں بڑی بلند پروازی کے ساتھ ترقیات کر رہے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کے احسانات کا تصور کرتے ہیں اور اظہارِ شکر سے قاصر پا کر تدارک کرتے ہیں یہ کیفیت ہم کس طرح ان عقل کے اَندھوں اور

مجذوم القلب لوگوں کو سمجھائیں ان پر وارد ہو تو وہ سمجھیں۔ جب ایسی حالت ہوتی ہے احسانات الٰہیہ کی کثرت آکر اپنا غلبہ کرتی ہے تو رُوح محبت سے پُر ہو جاتی ہے اور وہ اُچھل اُچھل کر استغفار کے ذریعہ اپنے قصورِ شکر کا تدارک کرتی ہے۔ یہ لوگ خشک منطق کی طرح اتنا ہی نہیں چاہتے کہ وہ قویٰ جن سے کوئی کمزوری یا غفلت صادر ہو سکتی ہے وہ ظاہر نہ ہوں نہیں وہ ان قویٰ پر تو فتح حاصل کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کے احسانات کا تصور کر کے استغفار کرتے ہیں کہ شکر نہیں کر سکتے۔ یہ ایک لطیف اور اعلیٰ مقام ہے جس کی حقیقت سے دوسرے لوگ ناآشنا ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے حیوانات گدھے وغیرہ انسانیت کی حقیقت سے بے خبر اور ناواقف ہیں۔ اسی طرح پر انبیاء و رسل کے تعلقات اور ان کے مقام کی حقیقت سے دوسرے لوگ کیا اطلاع رکھ سکتے ہیں۔ یہ بڑے ہی لطیف ہوتے ہیں۔ دیکھو حضرت یوسفؑ نے صرف یہی کہا تھا کہ تم بادشاہ سے میرا ذکر بھی کرنا۔ صرف اتنی بات پر ایک عرصہ تک زنداں میں رہنا پڑا۔ حالانکہ عام نظر میں یہ ایک معمولی سی بات ہو سکتی ہے مگر نہیں یہ ان تعلقاتِ محبت کے منافی تھی۔ غرض یہ ایک لطیف سِر ہے جس پر ہر ایک مطلع نہیں ہو سکتا۔ یہی ایک مقام ہے جس کی طلب ہر ایک کو کرنی چاہیئے۔

بر کریما کارہا دُشوار نیست

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۴، ۱۵ مورخہ ۳۰ اپریل و ۱۰ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

کسی پادری کا یہ سوال پیش ہؤا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے خلافِ منشاء ایزدی اپنے بیٹے کے لئے دُعا کی اسلئے وہ گنہ گار ہوئے۔ تو فرمایا:۔

کیا وجہ ہے کہ اس نے مسیح کا ذکر نہ کیا کہ ایک انجیر کے درخت کی طرف گیا اور جانتا تھا کہ اس میں پھل نہیں ہے۔ پھر وہ جانتا تھا کہ صلیب ملنی ہے اور دعائیں کرتا رہا کہ مجھے نجات ملے۔

پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے ثبوت میں قَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا[1] کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ کا ایک فقرہ بھی انجیل میں نہیں ہے اور پیغمبرِ خدا کی تمام عمر کا یہ حوالہ ہے کہ قَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا۔

استغفار کے اصل معنے تو یہ ہیں کہ یہ خواہش کرنا کہ مجھ سے کوئی گناہ نہ ہو یعنی مَیں معصوم رہوں اور دوسرے معنے جو اس سے نیچے درجہ پر ہیں کہ میرے گناہ کے بَدنتائج جو مجھے ملنے ہیں مَیں ان سے محفوظ رہوں۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۱ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷ و نمبر ۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

نبی کیوں معصوم ہوتے ہیں؟ تو اس کا یہی جواب ہے کہ وہ اِستغراقِ محبتِ الٰہی کے باعث معصوم ہوتے ہیں۔

(ٹریکٹ نمبر ۱ بعنوان "حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدۃ الوجود پر ایک خط" صفحہ ۱۴ مرتبہ حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی)

---

[1] سورۃ یونس: ۱۷

عصمت کا مفہوم صرف اِس حد تک ہے کہ انسان گناہ سے بچے اور گنہ کی تعریف یہ ہے کہ انسان خدا کے حکم کو عمداً توڑ کر لائق سزا ٹھہرے..... تعریف مذکورہ بالا کے رُو سے نابالغ بچے اور پَیدائشی مجنون بھی معصوم ہیں وجہ یہ کہ وہ اِس لائق نہیں ہیں کہ کوئی گناہ عمداً کریں پس بِلا شُبہ وہ حق رکھتے ہیں کہ ان کو معصوم کہا جائے۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۱ ۵ صفحہ ۱۸۰)

اِستغفار کے حقیقی اور اصل معنے یہ ہیں کہ خدا سے درخواست کرنا کہ بشریّت کی کوئی کمزوری ظاہر نہ ہو اور خدا فطرت کو اپنی طاقت کا سہارا دے اور اپنی حمایت اور نصرت کے حلقہ کے اندر لے لے۔ یہ لفظ غفر سے لیا گیا ہے جو ڈھانکنے کو کہتے ہیں۔ سو اِس کے یہ معنے ہیں کہ خدا اپنی قوت کے ساتھ مستغفر کی فطرتی کمزوری کو ڈھانک لے لیکن بعد اس کے عام لوگوں کے لئے اس لفظ کے معنے اَور بھی وسیع کئے گئے اور یہ بھی مراد کہ خدا گناہ کو جو صادر ہو چکا ہے ڈھانک لے لیکن اصل اور حقیقی معنے یہی ہیں کہ خدا اپنی خدائی کی طاقت کے ساتھ مُستغفر کو جو استغفار کرتا ہے فطری کمزوری سے بچاوے اور اپنی طاقت سے طاقت بخشے اور اپنے علم سے علم عطا کرے اور اپنی روشنی سے روشنی دے کیونکہ خدا انسان کو پَیدا کر کے اُس سے الگ نہیں ہوُا بلکہ وہ جیسا کہ انسان کا خالق ہے اور اس کے تمام قوٰی اندرونی اور بیرونی کا پیدا کرنے والا ہے ویسا ہی وہ اِنسان کا قیّوم بھی ہے یعنی جو کچھ بنایا ہے اُس کو خاص اپنے سہارے سے محفوظ رکھنے والا ہے پس جبکہ خدا کا نام قیّوم بھی ہے یعنی اپنے سہارے سے مخلوق کو قائم رکھنے والا۔ اِس لئے اِنسان کے لئے لازم ہے کہ جیسا کہ وہ خدا کی خالقیت سے پَیدا ہوُا ہے ایسا ہی وہ اپنی پَیدائش کے نقش کو خدا کی قیّومیّت کے ذریعہ سے بگڑنے سے بچاوے کیونکہ خدا کی خالقیت نے انسان پر یہ احسان کیا کہ اس کو خدا کی صورت پر بنایا۔ پس اسی طرح خدا کی قیّومیّت نے تقاضا کیا کہ وہ اس پاک نقش انسانی کو جو خدا کے دونوں ہاتھوں سے بنایا گیا ہے پلید اور خراب نہ ہونے دے۔ لہٰذا انسان کو تعلیم دی گئی کہ وہ استغفار کے ذریعہ سے قوت طلب کرے۔ پس اگر دُنیا میں گناہ کا وجود نہ بھی ہوتا تب بھی استغفار ہوتا کیونکہ در اصل استغفار اِس لئے ہے کہ جو خدا کی خالقیت نے بشریّت کی عمارت بنائی ہے وہ عمارت مسمار نہ ہو اور قائم رہے اور بغیر خدا کے سہارے کے کسی چیز کا قائم رہنا ممکن نہیں۔

پس انسان کے لئے یہ ایک طبعی ضرورت تھی جس کے لئے اِستغفار کی ہدایت ہے۔ اِسی کی طرف قرآن شریف میں یہ اِشارہ فرمایا گیا ہے اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ[1] یعنی خدا ہی ہے جو قابلِ پرستش ہے کیونکہ وہی زندہ کرنے والا ہے اور اسی کے سہارے سے اِنسان زندہ رہ سکتا ہے یعنی انسان کا ظہور ایک خالق کو چاہتا تھا اور ایک قیّوم کو تا خالق اس کو پَیدا کرے اور قیّوم اُس کو بگڑنے سے محفوظ رکھے۔ سو وہ خالق بھی ہے اور قیّوم بھی۔ اور جب انسان

---

[1] سورۃ آلِ عمران : ۳

پَیدا ہوگیا تو خالقیت کا کام تو پُورا ہوگیا مگر قیومیت کا کام ہمیشہ کے لئے ہے اِسی لئے دائمی استغفار کی ضرورت پیش آئی۔ غرض خدا کی ہر ایک صفت کے لئے ایک فیض ہے اور استغفار صفتِ قیومیت کا فیض حاصل کرنے کے لئے ہے اسی کی طرف اشارہ سُورۃ فاتحہ کی اِس آیت میں ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ[1] یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی اِس بات کی مدد چاہتے ہیں کہ تیری قیومیت اور ربوبیت ہمیں مدد دے اور ہمیں ٹھوکر سے بچاوے تا ایسا نہ ہو کہ کمزوری ظہور میں آوے اور ہم عبادت نہ کر سکیں۔

اِس تمام تفصیل سے ظاہر ہے کہ استغفار کی درخواست کے اصل معنی یہی ہیں کہ وہ اِس لئے نہیں ہوتی کہ کوئی حق فوت ہوگیا ہے بلکہ اس خواہش سے ہوتی ہے کہ کوئی حق فوت نہ ہو اور انسانی فطرت اپنے تئیں کمزور دیکھ کر طبعاً خدا سے طاقت طلب کرتی ہے جیسا کہ بچہ ماں سے دُودھ طلب کرتا ہے۔ پس جیسا کہ خدا نے ابتداء سے انسان کو زبان، آنکھ، دل، کان وغیرہ عطا کئے ہیں ایسا ہی استغفار کی خواہش بھی ابتداء سے ہی عطا کی ہے اور اُس کو محسوس کرایا ہے کہ وہ اپنے وجود کے ساتھ خدا سے مدد پانے کا محتاج ہے اسی کی طرف اِس آیت میں اشارہ ہے وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ یعنی خدا سے درخواست کر کہ تیری فطرت کو بشریّت کی کمزوری سے محفوظ رکھے اور اپنی طرف سے فطرت کو ایسی قوت دے کہ وہ کمزوری ظاہر نہ ہونے پاوے اور ایسا ہی ان مردوں اور ان عورتوں کے لئے جو تیرے پر ایمان لاتے ہیں بطور شفاعت کے دعا کرتا رہ کہ تا جو فطرتی کمزوری سے ان سے خطائیں ہوتی ہیں اُن کی سزا سے وہ محفوظ رہیں اور آئندہ زندگی ان کی گناہوں سے بھی محفوظ ہو جائے۔ یہ آیت معصومیّت اور شفاعت کے اعلیٰ درجہ کی فلاسفی پر مشتمل ہے اور یہ اِس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ انسان اعلیٰ درجہ کے مقامِ عصمت پر اور مرتبۂ شفاعت پر تب ہی پہنچ سکتا ہے کہ جب اپنی کمزوری کے روکنے کے لئے اور نیز دوسروں کو گناہ کی زہر سے نجات دینے کے لئے ہر دَم اور ہر آن دعا مانگتا رہتا ہے اور تضرعات سے خدا تعالیٰ کی طاقت اپنی طرف کھینچتا ہے اور پھر چاہتا ہے کہ اس طاقت سے دوسروں کو بھی حصہ ملے جو بوسیلہ ایمان اس سے پیوند پَیدا کرتے ہیں۔ معصوم اِنسان کو خدا سے طاقت طلب کرنے کی اِس لئے ضرورت ہے کہ اِنسانی فطرت اپنی ذات میں تو کوئی کمال نہیں رکھتی بلکہ ہر دَم خدا سے کمال پاتی ہے اور اپنی ذات میں کوئی قوت نہیں رکھتی بلکہ ہر دَم خدا سے قوت پاتی ہے اور اپنی ذات میں کوئی کامل روشنی نہیں رکھتی بلکہ خدا سے اُس پر روشنی پڑتی ہے۔ اِس میں اصل راز یہ ہے کہ کامل فطرت کو صرف ایک کشش دی جاتی ہے تاکہ وہ طاقتِ بالا کو اپنی طرف کھینچ سکے مگر طاقت کا خزانہ محض خدا کی ذات ہے اس خزانہ سے فرشتے بھی اپنے لئے طاقت کھینچتے ہیں اور ایسا ہی انسانِ کامل بھی اسی سَرچشمۂ طاقت سے عبودیّت کی نالی کے ذریعہ سے عصمت اور فضل

---

[1] سورۃ الفاتحۃ : ۵

کی طاقت کھینچتا ہے لہٰذا انسانوں میں سے وہی معصوم کامل ہے جو استغفار سے الٰہی طاقت کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اس کشش کے لئے تضرع اور خشوع کا ہر دم سلسلہ جاری رکھتا ہے تا اس پر روشنی اُترتی رہے اور ایسے دل کو اس گھر سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کے شرق اور غرب اور ہر ایک طرف سے تمام دروازے آفتاب کے سامنے ہیں پس ہر وقت آفتاب کی روشنی اس میں پڑتی ہے لیکن جو شخص خدا سے طاقت نہیں مانگتا وہ اُس کوٹھڑی کی مانند ہے جس کے چاروں طرف سے دروازے بند ہیں اور جس میں ایک ذرہ روشنی نہیں پڑ سکتی۔ پس استغفار کیا چیز ہے۔ یہ اُس آلہ کی مانند ہے جس کی راہ سے طاقت اُترتی ہے۔ تمام رازِ توحید اس اصول سے وابستہ ہے کہ صفت عصمت کو انسان کی ایک مستقل جائیداد قرار نہ دیا جائے بلکہ اس کے حصول کے لئے محض خدا کو سرچشمہ سمجھا جائے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کو تمثیل کے طور پر دل سے مشابہت ہے جس میں مصفا خون کا ذخیرہ جمع رہتا ہے اور انسانِ کامل کا استغفار اُن شرائین اور عروق کی مانند ہے جو دل کے ساتھ پیوستہ ہیں اور خونِ صافی اس میں سے کھینچتی ہیں اور تمام اعضاء پر تقسیم کرتی ہیں جو خون کی محتاج ہیں۔

یہ کہنا بالکل غلطی ہے کہ آیت وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ میں ذنب کا لفظ موجود ہے جو گناہ کو کہتے ہیں کیونکہ ذنب اور جرم میں فرق ہے۔ جرم کا لفظ تو ہمیشہ اسی گناہ کے لئے آتا ہے جو سزا کے لئے ہوتا ہے مگر ذنب کا لفظ بشریت کی کمزوری کے لئے بھی آجاتا ہے اِس لئے نبیوں پر انسانی کمزوری کی وجہ سے ذنب کا لفظ اطلاق پاتا ہے مگر جرم کا لفظ اطلاق نہیں پاتا اور خدا کی کتاب میں کسی نبی کو مجرم کے لفظ سے نہیں پکارا گیا اور نیز خدا کی کتاب میں یعنی قرآن کریم میں مجرم کے لئے تو جہنم کی وعید ہے یعنی خدا کی طرف سے عہد ہے کہ وہ جہنم میں ڈالا جائے گا مگر ذنب کے لئے کوئی وعید نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى[1] یعنی جو شخص خدا کے پاس مجرم ہو کر آئے گا اس کی سزا جہنم ہے نہ اس میں وہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا سو اِس جگہ خدا نے مُجْرِمًا کہا مُذْنِبًا نہیں کہا کیونکہ بعض صورتوں میں معصوم کو بھی مذنب کہہ سکتے ہیں مگر مجرم نہیں کہہ سکتے اس پر ایک اور دلیل ہے اور وہ یہ ہے کہ سورۃ آلِ عمران میں یہ آیت ہے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا[2] اِس آیت سے بنصِ صریح ثابت ہوا کہ تمام انبیاء جن میں حضرت مسیح بھی شامل ہیں مامور تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاویں اور انہوں نے اقرار کیا کہ ہم ایمان لائے اور پھر جب آیت وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ کو اس کے ساتھ پڑھا جائے اور ذنب سے مراد نعوذ باللہ جرم لیا جائے تو حضرت عیسیٰؑ بھی اِس آیت کے

---

[1] سورۃ طٰہٰ : ۷۵

[2] سورۃ آلِ عمران : ۸۲

رُو سے مُجرم ٹھہریں گے کیونکہ وہ بھی اِس آیت کے رُو سے ان مومنین میں داخل ہیں جو آنحضرتؐ پر ایمان لائے بِلاشُبہ وہ بھی مذنب ٹھہرے۔ یہ مقام عیسائیوں کو غور سے دیکھنا چاہیئے۔ پس اِن آیات سے بوضاحت تمام ثابت ہؤا کہ اِس جگہ ذنب بمعنی جُرم نہیں ہے بلکہ انسانی کمزوری کا نام ذنب ہے جو قابلِ الزام نہیں اور مخلوق کی فطرت کے لئے ضروری ہے کہ یہ کمزوری اس میں موجود ہو اور کمزوری کا نام اِس لئے ذنب رکھا ہے کہ انسان کی فطرت میں طبعًا یہ قصور اور کمی واقع ہے تا وہ ہر وقت خدا کا محتاج رہے اور تا اس کمزوری کے دبانے کے لئے ہر وقت خدا سے طاقت مانگتا رہے اور اِس میں کچھ شک نہیں کہ بشری کمزوری ایک ایسی چیز ہے کہ اگر خدا کی طاقت اس کے ساتھ شامل نہ ہو تو نتیجہ اس کا بجز ذنب کے اَور کچھ نہیں۔ پس جو چیز موصل اِلی الذنب ہے بطور اِستعارہ اس کا نام ذنب رکھا گیا اور یہ محاورہ شائع متعارف ہے کہ جو اعراض بعض امراض کو پَیدا کرتے ہیں کبھی انہی اعراض کا نام امراض رکھ دیتے ہیں پس بشری کمزوریٔ فطرت بھی ایک مرض ہے جس کا علاج استغفار ہے۔

غرض خدا کی کتاب نے بشریّت کی کمزوری کو ذنب کے محل پر استعمال کیا ہے اور خود گواہی دی ہے کہ انسان میں فطری کمزوری ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا یعنی اِنسان کمزور پَیدا کیا گیا ہے یہی کمزوری ہے کہ اگر الٰہی طاقت اس کے شامل نہ ہو تو اَنواع اقسام کے گناہوں کا موجب ہو جاتی ہے۔ پس اِستغفار کی حقیقت یہ ہے کہ ہر وقت اور ہر دَم اور ہر آن خدا سے مدد مانگی جائے اور اس سے درخواست کی جائے کہ بشریّت کی کمزوری جو بشریّت کا ایک ذنب ہے جو اس کے ساتھ لگا ہؤا ہے ظاہر نہ ہو۔ سو مداومت استغفار دلیل اِس بات پر ہے کہ اس ذنب پر فتح پائی اور وہ ظہور میں نہ آسکا اور خدا کا نُور اُترا اور اس کو دبالیا۔ اِس جگہ یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ استغفار کا لفظ غفر سے نکلا ہے اور اس کے اصل معنے دبانے اور ڈھانکنے کے ہیں یعنی یہ درخواست کرنا کہ بشریّت کی کمزوری ظاہر ہو کر نقصان نہ پہنچاوے اور وہ ڈھکی رہے کیونکہ بَشر چونکہ خدا نہیں ہے اور نہ خدا سے مُستغنی ہے اِس لئے وہ اس بچّہ کی طرح ہے جو ہر قدم میں ماں کا محتاج ہے تا وہ اس کو گرنے سے بچاوے اور ٹھوکر سے محفوظ رکھے ایسا ہی یہ بھی ہر قدم میں خدا کا محتاج ہوتا ہے تا وہ اس کو ٹھوکر اور لغزش سے بچاوے۔ سو اس کے علاج کے لئے اِستغفار ہے۔

اور کبھی یہ لفظ توسع کے طور پر ان لوگوں پر بھی اطلاق پاتا ہے جو اوّل کسی گناہ کے مُرتکب ہو جاتے ہیں اور اس جگہ استغفار کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جو گناہ صادر ہو چکا ہے اس کی سزا سے بچاوے لیکن یہ دوسرے معنے خدا کے مقرب لوگوں کے حق میں درست اور روا نہیں ہیں وجہ یہ کہ خدا نے تو پہلے سے اُن پر ظاہر کیا ہؤا ہوتا ہے کہ وہ کوئی سزا نہیں پائیں گے اور جنّت کے اعلیٰ مقام اُن کو ملیں گے اور خدا کی رحمت کی گود میں وہ بٹھائے جائیں گے اور نہ ایک دفعہ بلکہ صدہا دفعہ ایسے وعدے اُن کو دئے جاتے ہیں اور ان کو بہشت دکھایا جاتا ہے۔ پھر اگر وہ ان

معنوں کے رُو سے استغفار کریں کہ وہ اپنے گناہوں کے سبب سے دوزخ میں نہ پڑیں تو ایسا استغفار تو خود اُن کے لئے ایک گناہ ہوگا کہ وہ خدا کے وعدوں پر یقین نہیں کرتے اور خدا کی رحمت سے اپنے تئیں دُور سمجھتے ہیں پھر ایسا شخص جس کے حق میں خدا تعالیٰ یہ فرماوے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ[1] یعنی تمام دُنیا کے لئے تجھے ہم نے رحمت کر کے بھیجا ہے اور تُو رحمتِ مجسّم ہے۔ وہ اگر اپنی نسبت ہی یہ شک کرے کہ خدا کی رحمت میرے شامِل حال ہوگی یا نہیں تو پھر دوسروں کے لئے کیونکر رحمت کا باعث ہوگا۔

یہ تمام قرینے اُن لوگوں کے لئے جو انصاف سے سوچتے ہیں صریح اس حُجت کو کھولتے ہیں کہ استغفار کے دوسرے معنے کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا سخت خطا کاری اور شرارت ہے بلکہ معصوم کے لئے اوّل علامت یہی ہے کہ وہ سب سے زیادہ استغفار میں مشغول رہے اور ہر آن اور ہر حالت میں بشریّت کی کمزوری سے محفوظ رہنے کے لئے خدا تعالیٰ سے طاقت طلب کرتا رہے جس کو دوسرے لفظوں میں استغفار کہتے ہیں کیونکہ اگر ایک بچہ ہر وقت ماں کے ہاتھ کے سہارے سے چلتا ہے اور روا نہیں رکھتا کہ ایک سیکنڈ بھی ماں سے دُور ہو وہ بچہ بلا شبہ ٹھوکر سے بچ رہیگا لیکن وہ بچہ جو ماں سے علیحدہ ہو کر چلتا ہے اور خود بخود کبھی کسی خوفناک زینہ پر چڑھتا ہے اور کبھی کسی خوفناک زینہ سے اُترتا ہے وہ ضرور ایک دن گرے گا اور اس کا گرنا سخت ہوگا پس جس طرح خوش قسمت بچہ کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ اپنی پیاری ماں سے ہرگز علیحدگی اختیار نہ کرے اور ہرگز اس کی گود سے جُدا نہ ہو اور اس کے دامن کو نہ چھوڑے یہی عادت ان مبارک مقدسوں کی ہوتی ہے کہ وہ خدا کے آستانہ پر ایسے جا پڑتے ہیں جیسا کہ ماں کی گود میں بچے اور جیسا کہ ایک بچہ اپنا تمام کام اپنی ماں کی طاقت سے نکالتا ہے اور ہر ایک دوسرا بچہ جو اس سے مخالفت کرتا ہے یا کوئی کتا اس کے سامنے آتا ہے یا کوئی اَور خوف نمودار ہوتا ہے یا کسی لغزش کی جگہ پر اپنے تئیں پاتا ہے تو فی الفور اپنی ماں کو پکارتا ہے تا وہ جلد تر اس کی طرف دوڑے اور اس کی آفت سے اس کو بچاوے۔ یہی حال اُن رُوحانی بچوں کا ہوتا ہے کہ بعینہٖ اپنے رب کو ماں کی طرح سمجھ کر اس کی طاقت کو اپنا ذخیرہ سمجھتے ہیں اور ہر وقت اور ہر دم اُس کی طاقتوں کو طلب کرتے رہتے ہیں اور جس طرح شیر خوار بچہ جب بھوک کے وقت اپنا مُنہ اپنی ماں کے پستان کے اُوپر رکھ دیتا ہے اور اپنی طبعی کشش سے دُودھ کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا ہے تو جبھی کہ ماں محسوس کرتی ہے کہ گریہ اور زاری کے ساتھ اس بچہ کے نرم نرم ہونٹ اس کے پستان پر جا لگے ہیں تو طبعاً اس کا دُودھ جوش مارتا ہے اور اس بچہ کے مُنہ میں گرتا جاتا ہے پس یہی قانون ان بچوں کے لئے بھی ہے جو رُوحانی دُودھ کے طالب اور جویاں ہیں۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۱ صفحہ ۱۸۷ تا ۱۹۳)

---

[1] سورۃ الانبیاء: ۱۰۸

۳۷۔ اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْـَٔــلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ۝

دُنیا اور دُنیا کی خوشیوں کی حقیقت لہو و لعب سے زیادہ نہیں کیونکہ وہ عارضی اور چند روزہ ہیں اور اُن خوشیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا سے دُور جا پڑتا ہے مگر خدا کی معرفت میں جو لذت ہے وہ ایک ایسی چیز ہے کہ جو نہ آنکھوں نے دیکھی اور نہ کانوں نے سُنی۔ نہ کسی حس نے اس کو محسوس کیا ہے۔ وہ ایک چیر کر نکل جانے والی چیز ہے۔ ہر آن ایک نئی راحت اُس سے پیدا ہوتی ہے جو پہلے نہیں دیکھی ہوتی۔

خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کا ایک خاص تعلق ہے۔ اہلِ عرفان لوگوں نے بشریت اور ربوبیت کے جوڑہ پر بہت لطیف بحثیں کی ہیں۔ اگر بچے کا مُنہ پتھر سے لگائیں تو کیا کوئی دانشمند خیال کر سکتا ہے کہ اس پتھر میں سے دُودھ نکل آئے گا اور بچہ سیر ہو جائے گا ہرگز نہیں۔ اسی طرح پر جب تک اِنسان خدا تعالیٰ کے آستانہ پر نہیں گرتا اس کی رُوح ہمہ نیستی ہو کر ربوبیت سے تعلق پیدا نہیں کرتی اور نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ عدم یا مشابہہ بالعدم نہ ہو کیونکہ ربوبیت اس کو چاہتی ہے اس وقت تک وہ رُوحانی دُودھ سے پرورش نہیں پا سکتا۔

لہو میں کھانے پینے کی تمام لذتیں شامل ہیں۔ اُن کا انجام دیکھو کہ بجز کثافت کے اَور کیا ہے۔ زینت، سواری، عمدہ مکانات پر فخر کرنا یا حکومت و خاندان پر فخر کرنا سب باتیں ایسی ہیں کہ بالآخر اس سے ایک قسم کی حقارت پیدا ہو جاتی ہے جو رنج دیتی اور طبیعت کو افسُردہ اور بے چین کر دیتی ہے۔ لعب میں عورتوں کی محبت بھی شامل ہے انسان عورت کے پاس جاتا ہے مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ محبت اور لذت کثافت سے بدل جاتی ہے لیکن اگر یہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک حقیقی عشق ہونے کے بعد ہو تو پھر راحت پر راحت اور لذت پر لذت ملتی ہے یہاں تک کہ معرفتِ حقہ کے دروازے کُھل جاتے ہیں اور وہ ایک اَبدی اور غیر فانی راحت میں داخل ہو جاتا ہے جہاں پاکیزگی اور طہارت کے سوا کچھ نہیں۔ وہ خدا میں لذت ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اُسے ہی پاؤ کہ حقیقی لذت وہی ہے۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۲۲ مورخہ ۲۳ جون ۱۸۹۹ء صفحہ ۱)

سُورۃ الفتح

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۲ تا ۳

اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا۝ۙ لِّیَغۡفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ یُتِمَّ نِعۡمَتَہٗ عَلَیۡکَ وَ یَہۡدِیَکَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِیۡمًا۝ۙ

ہم نے تجھ کو کُھلی کُھلی فتح عطا فرمائی ہے یعنی عطا فرمائیں گے اور درمیان میں جو بعض مکروہات و شدائد ہیں وہ اِس لئے ہیں تا خدائے تعالیٰ تیرے پہلے اور پچھلے گناہ معاف فرما دے یعنی اگر خدائے تعالیٰ چاہتا تو قادر تھا کہ جو کام مدِ نظر ہے وہ بغیر پیش آنے کسی نوع کی تکلیف کے اپنے انجام کو پہنچ جاتا اور بآسانی فتح عظیم حاصل ہو جاتی لیکن تکالیف اِس جہت سے ہیں کہ تا وہ تکالیف موجب ترقّی مراتب و مغفرت خطایا ہوں۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۱۵ حاشیہ)

حدیبیہ کے قِصّہ کو خدا تعالیٰ نے فتح مبین کے نام سے موسُوم کیا ہے اور فرمایا اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا وہ فتح اکثر صحابہؓ پر بھی مخفی تھی بلکہ بعض منافقین کے اِرتداد کا موجب ہوئی مگر دراصل وہ فتح مبین تھی گو اُس کے مقدمات نظری اور عمیق تھے۔

(انوار الاسلام صفحہ ۹۰)

ہم نے ایک فتح عظیم جو ہماری طرف سے ایک عظیم الشّان نشان ہے تجھ کو عطا کی ہے تا ہم وہ تمام گناہ جو تیری طرف منسوب کئے جاتے ہیں اُن پر اس فتح نمایاں کی نورانی چادر ڈال کر نکتہ چینوں کا خطا کار ہونا ثابت کریں۔ (اربعین ۲ صفحہ ۱۸)

خدا تجھے ایک بڑی اور کُھلی کُھلی فتح دے گا تا کہ وہ تیرے پہلے گناہ بخشے اور پچھلے گناہ بھی۔ اِس جگہ ..... ایک سوال پَیدا ہوتا ہے کہ فتح کو گناہ بخشنے سے کیا تعلق ہے۔ بظاہر ان دونوں فقروں کو آپس میں کچھ جوڑ نہیں لیکن درحقیقت ان دونوں فقروں کا باہم نہایت درجہ کا تعلق ہے۔ پس تشریح اس ..... کی یہ ہے کہ اِس اندھی دُنیا میں جس قدر خدا کے ماموروں اور نبیوں اور رسولوں کی نسبت نکتہ چینیاں ہوتی ہیں اور جس قدر ان کی شان اور اعمال کی نسبت اعتراض ہوتے ہیں اور بدگمانیاں ہوتی ہیں اور طرح طرح کی باتیں کی جاتی ہیں وہ دُنیا میں کسی کی نسبت نہیں ہوتیں اور خدا نے ایسا ہی ارادہ کیا ہے تا اُن کو بدبخت لوگوں کی نظر سے مخفی رکھے اور وہ ان کی نظر میں جائے اعتراض ٹھہر جائیں کیونکہ وہ ایک دولتِ عظمیٰ ہیں اور دولتِ عظمیٰ کو نا اہلوں سے پوشیدہ رکھنا بہتر ہے۔ اِسی وجہ سے خدائے تعالیٰ اُن کو جو شقی ازلی ہیں اُس برگزیدہ گروہ کی نسبت طرح طرح کے شبہات میں ڈال دیتا ہے تا وہ دولتِ قبول سے محروم رہ جائیں۔ یہ سُنّت اللہ ان لوگوں کی نسبت ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے امام اور رسول اور نبی ہو کر آتے ہیں۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۶۹، ۷۰)

ہم نے تجھے کُھلی کُھلی فتح دی ہے یعنی دیں گے۔ (کتاب البریہ صفحہ ۲۶۹ حاشیہ)

یہ آیت فتح مکّہ کے وقت اُتری ..... عیسائی اِس آیت کا اِس طرح ترجمہ کرتے ہیں "ہم نے تجھے ایک صریح فتح دی تاکہ ہم تیرے پہلے اور پچھلے گناہ معاف کریں ....." یہ معنے بالصراحت غلط ہیں کیونکہ اِس آیت کا ربط ہی بگڑ جاتا ہے۔ ایک فتح کو گناہ کی معافی سے کیا تعلق ہے گناہوں کی معافی فتح کا کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں لفظ ذنب سے وہ عیب مُراد ہیں۔ یہ کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا کرتے تھے کہ یہ شخص مُفتری اور جُھوٹا ہے۔ خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح دی جو کہ آپؐ کی صداقت کی علامت تھی اور اِس طرح خداوند تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو فتح دے کر ان تمام الزاموں کو دُور کر دیا جو کفار آنحضرت صلعم کی طرف منسُوب کیا کرتے تھے۔ خدائے تعالیٰ نے آپؐ کے سِلسلہ کو پوری کامیابی دی اور آپؐ کے دشمنوں کو ہلاک کیا اور اِس طرح آپؐ کی سچائی کی شہادت دی۔ ربطِ کلام اِن معنوں کی تائید کرتا ہے۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۴۴)

ہم ..... ایک کُھلی کُھلی فتح تجھ کو دیں گے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ششم صفحہ ۵۵)

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ ۗ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۚ فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ

اللّٰہَ فَسَیُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا ○

جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں۔ خدا کا ہاتھ ہے جو ان کے ہاتھوں پر ہے۔ واضح ہو کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرتے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کیا کرتے تھے اور مردوں کے لئے یہی طریق بیعت کا ہے۔ سو اِس جگہ اللہ تعالیٰ نے بطریق مجاز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو اپنی ذاتِ اقدس ہی قرار دے دیا اور اُن کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دے دیا۔ یہ کلمہ مقامِ جمع میں ہے جو بوجہ نہایت قُربِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بولا گیا ہے۔ (سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۶۷، ۱۶۸ حاشیہ)

یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ یہ اس کا ہاتھ خدا تعالیٰ کا ہاتھ ہے جو ان کے ہاتھوں پر ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۸۱)

جو لوگ تیری بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت خدا کی بیعت کرتے ہیں۔ یہ خدا کا ہاتھ ہے جو ان کے ہاتھوں پر ہے اب ان تمام آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ٹھہرایا گیا مگر ظاہر ہے کہ وہ خدا کا ہاتھ نہیں ہے۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۶۴)

(الفتح ۲۱،۲۲)

وَعَدَکُمُ اللّٰہُ مَغَانِمَ کَثِیْرَۃً تَاْخُذُوْنَھَا فَعَجَّلَ لَکُمْ ھٰذِہٖ وَکَفَّ اَیْدِیَ النَّاسِ عَنْکُمْ وَلِتَکُوْنَ اٰیَۃً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ وَیَھْدِیَکُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ○ وَّاُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْھَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰہُ بِھَا وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا ○

خدا نے تم کو بہت سے ملکوں کی غنیمتوں کا عطا کرنا وعدہ کیا تھا سو ان میں سے ایک پہلا امر یہ ہُوا کہ خدا نے یہودیوں کے قلعے مع تمام مال و اسباب تم کو دے دئے اور مخالفوں کے شر سے تم کو امن بخشا تا مؤمنین کے لئے ایک نشان ہو اور خدا تم کو دوسرے ملک بھی یعنی فارس اور روم وغیرہ عطا کرے گا تمہاری طاقت ان پر قبضہ کرنے سے عاجز ہے پر خدا کی طاقتیں اُن پر محیط ہو رہی ہیں اور خدا ہر ایک چیز پر قادر ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۳۹، ۲۴۰ حاشیہ)

ﷺ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ

عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝

یہ آیت جسمانی اور سیاستِ ملکی کے طور پر حضرت مسیح کے حق میں پیشگوئی ہے اور جس غلبۂ کاملہ دینِ اسلام کا وعدہ دیا گیا ہے وہ غلبہ مسیح کے ذریعہ سے ظہور میں آئے گا اور جب حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ اس دُنیا میں تشریف لائیں گے تو ان کے ہاتھ سے دینِ اسلام جمیع آفاق اور اقطار میں پھیل جائے گا لیکن اِس عاجز پر ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ خاکسار اپنی غُربت اور انکسار اور توکّل اور ایثار اور آیات اور انوار کے رُو سے مسیح کی پہلی زندگی کا نمونہ ہے اور اِس عاجز کی فطرت اور مسیح کی فطرت باہم نہایت ہی متشابہ واقع ہوئی ہے گویا ایک ہی جوہر کے دو ٹکڑے یا ایک ہی درخت کے دو پھل ہیں اور بحدی اِتحاد ہے کہ نظرِ کشفی میں نہایت ہی باریک اِمتیاز ہے اور نیز ظاہری طور پر بھی ایک مشابہت ہے اور وہ یوں کہ مسیح ایک کامل اور عظیم الشان نبی یعنی موسیٰ کا تابع اور خادمِ دین تھا اور اُس کی انجیل توریت کی فرع ہے اور یہ عاجز بھی اُس جلیل الشان نبی کے اُحقر خادمین میں سے ہے کہ جو سیّدالرسل اور سب رسُولوں کا سرتاج ہے اگر وہ حامد ہیں تو وہ احمدؐ ہے اور اگر وہ محمود ہیں تو وہ محمدؐ ہے صلی اللہ علیہ وسلم ۔ سو چونکہ اِس عاجز کو حضرت مسیح سے مشابہتِ تامہ ہے اِس لئے خداوندِ کریم نے مسیح کی پیشگوئی میں ابتداء سے اِس عاجز کو بھی شریک رکھا ہے یعنی حضرتِ مسیح پیشگوئی متذکرہ بالا کا ظاہری اور جسمانی طور پر مصداق ہے اور یہ عاجز رُوحانی اور معقولی طور پر اُس کا محل اور مورد ہے یعنی رُوحانی طور پر دینِ اسلام کا غلبہ جو حُجج قاطعہ اور براہینِ ساطعہ پر موقوف ہے اِس عاجز کے ذریعہ سے مقدر ہے گو اس کی زندگی میں یا بعد وفات ہو اور اگرچہ دینِ اسلام اپنے دلائلِ حقہ کے رُو سے قدیم سے غالب چلا آیا ہے اور ابتداء سے اس کے مخالف رُسوا اور ذلیل ہوتے چلے آئے ہیں لیکن اس غلبہ کا مختلف فرقوں اور قوموں پر ظاہر ہونا ایک ایسے زمانہ کے آنے پر موقوف تھا کہ جو بباعث کُھل جانے راہوں کے تمام دُنیا کو ممالکِ متحدہ کی طرح بناتا ہو اور ایک ہی قوم کے حکم میں داخل کرتا ہو اور تمام اسبابِ اشاعتِ تعلیم اور تمام وسائلِ اشاعتِ دین کے بتمامتر سہولت و آسانی پیش کرتا ہو اور اندرُونی اور بیرونی طور پر تعلیمِ حقانی کے لئے نہایت مناسب اور موزوں ہو۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۴۹۸، ۴۹۹ حاشیہ در حاشیہ)

وہ خدا جس نے اپنے رسُول کو ہدایت کے ساتھ اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تا وہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کرے۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۴)

﴿۳۰﴾ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۖۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝

محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کا رسول ہے اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت ہیں یعنی کفار ان کے سامنے لاجواب اور عاجز ہیں اور ان کی حقانیت کی ہیبت کافروں کے دلوں پر مستولی ہے اور وہ لوگ آپس میں رحم کرتے ہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۱۷ حاشیہ در حاشیہ)

محمد رسول اللہ ہیں اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور باہم رحم کرنے والے ہیں۔
(آسمانی فیصلہ ٹائیٹل پیج)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو نام ہیں (۱) ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور یہ نام توریت میں لکھا گیا ہے جو ایک آتشی شریعت ہے جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ..... ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ۔ (اربعین ۴ صفحہ ۱۳)

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کی طرف اشارہ ہے جب بہت سے مومنین کی معیت ہوئی جنہوں نے کفار کے ساتھ جنگ کئے۔

(الحکم جلد ۵ ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۱)

مومنوں اور مسلمانوں کے واسطے نرمی اور شفقت کا حکم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بھی ایسی ہی حالت بیان کی گئی جہاں فرمایا ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ

عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۷ مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

فَاِنَّ مُوْسٰی اَخْبَرَ عَنْ صَحْبٍ کَانُوْا مَظْهَرَ اسْمِ مُحَمَّدٍ نَبِیِّنَا الْمُخْتَارِ وَ صُوَرَ جَلَالِ اللّٰهِ الْقَهَّارِ بِقَوْلِهٖ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ۔ وَاِنَّ عِیْسٰی اَخْبَرَ عَنْ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ وَعَنْ اِمَامِ تِلْكَ الْاَبْرَارِ۔ اَعْنِی الْمَسِیْحَ الَّذِیْ هُوَ مَظْهَرُ اَحْمَدَ الرَّاحِمِ السَّتَّارِ وَمَنْبَعُ جَمَالِ اللّٰهِ الرَّحِیْمِ الْغَفَّارِ بِقَوْلِهٖ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ الَّذِیْ هُوَ مُعْجِبُ الْكُفَّارِ وَكُلٌّ مِّنْهُمَا اَخْبَرَ بِصِفَاتٍ تُنَاسِبُ صِفَاتِهِ الذَّاتِیَّةَ وَاخْتَارَ جَمَاعَةً تُشَابِهُ اَخْلَاقُهُمُ الْمَرْضِیَّةَ۔ فَاَشَارَ مُوْسٰی بِقَوْلِهٖ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ اِلَى الصَّحَابَةِ اِذْ اَدْرَكُوْا صُحْبَةَ نَبِیِّنَا الْمُخْتَارِ وَاَرَوْا شِدَّةً وَغِلْظَةً فِی الْمِضْمَارِ وَاَظْهَرُوْا جَلَالَ اللّٰهِ بِالسَّیْفِ الْبَتَّارِ۔ وَصَارُوْا ظِلَّ اسْمِ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ الْقَهَّارِ عَلَیْهِ صَلَوٰتُ اللّٰهِ وَاَهْلِ السَّمَآءِ وَاَهْلِ الْاَرْضِ مِنَ الْاَبْرَارِ وَالْاَخْیَارِ۔ وَاَشَارَ عِیْسٰی بِقَوْلِهٖ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ اِلٰى قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ وَاِمَامِهِمُ الْمَسِیْحِ بَلْ ذَكَرَ اسْمَهٗ اَحْمَدَ بِالتَّصْرِیْحِ وَاَشَارَ بِهٰذَا الْمَثَلِ الَّذِیْ جَاءَ فِی الْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ اِلٰى اَنَّ الْمَسِیْحَ الْمَوْعُوْدَ لَا یَظْهَرُ اِلَّا كَنَبَاتٍ لَیِّنٍ لَا كَالشَّیْءِ الْغَلِیْظِ الشَّدِیْدِ۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۲۲، ۱۲۳)

ترجمہ از مرتب :- موسیٰ علیہ السلام نے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کہہ کر اُن اصحاب کی خبر دی جو ہمارے برگزیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے محمد نام کے مظہر تھے اور خدائے قہار کے جلال کو ظاہر کرنے والے تھے اور عیسیٰ علیہ السلام نے ایک دوسرے گروہ اور ان کے امام مسیح موعود کی خبر دی جو رحم کرنے والے اور پردہ پوشی کرنے والے احمد نام کے مظہر اور خدائے رحیم وغفار کے جمال کا سرچشمہ ہیں ان الفاظ میں کہ وہ گروہ اُس پودہ کی مانند ہے جس نے خوبصورت کونپلیں نکالی ہوں اور جو کسانوں کو تعجب میں ڈال رہا ہو اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام ہر دو نے ان صفات کی خبر دی جو انکی ذاتی صفات سے مناسبت رکھتی تھیں اور ہر ایک نے ایک ایسی جماعت کی خبر دی جو ان کے پسندیدہ اخلاق کے مشابہ اخلاق رکھتی تھی۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کہہ کر ان اصحاب کی طرف اشارہ کیا جنہوں نے ہمارے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کو پایا اور انہوں نے میدانِ جنگ میں کافروں کا نہایت سختی سے مقابلہ کیا اور شمشیر بُرّاں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے جلال کو ظاہر کیا اور وہ محمد رسول اللہ کے نام کے ظِلّ ہو گئے جو اللہ تعالیٰ کے اِسمِ قہار کے مظہر ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کا اور آسمان و زمین کے برگزیدہ لوگوں کا سلام پہنچے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام نے كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ کہہ کر بعد میں آنے والے ایک گروہ اور ان کے امام مسیح موعود کی طرف اشارہ کیا بلکہ آپ نے صراحت سے اس کے نام احمد کا بھی ذکر کر دیا اور اس کے ساتھ اس مثال کی طرف بھی اشارہ کیا جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ مسیح موعود نرم سبزہ کی طرح ظاہر ہوگا نہ کہ کسی سخت چیز کی مانند۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۲۲، ۱۲۳)

ثُمَّ قَالَ عَزَّ وَجَلَّ فِیْ مَدْحِ صَحَابَةِ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِکَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْکُفَّارَ فَانْظُرْ کَیْفَ سَمّٰی کُلَّ مَنْ عَادَاهُمْ کَافِرًا وَ غَضِبَ عَلَیْهِمْ فَاخْشَ اللّٰهَ وَ اتَّقِ الَّذِیْ یَغِیْظُ بِالصَّحَابَةِ کَافِرِیْنَ۔ (سرّ الخلافہ صفحہ ۱۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو بعث ہیں (۱) ایک بعثِ محمدی جو جلالی رنگ میں ہے جو ستارہ مریخ کی تاثیر کے نیچے ہے جس کی نسبت بحوالہ توریت قرآن شریف میں یہ آیت ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (۲) دوسرا بعث احمدی جو جمالی رنگ میں ہے جو ستارہ مُشتری کی تاثیر کے نیچے ہے جس کی نسبت بحوالہ انجیل قرآن شریف میں یہ آیت ہے وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ[1]

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۶)

مومن مومن کبھی نہیں ہو سکتا جب تک کہ کفر اس سے مایوس نہ ہو جاوے۔ فتح مسیح کو ایک بار ہم نے رسالہ بھیجا اس پر اُس نے لکیر کھینچ کر واپس بھیج دیا اور لکھا کہ جس قدر دِل آپ نے دُکھایا ہے کسی اَور نے نہیں دُکھایا۔ دیکھو

ترجمہ از مرتب :۔ پھر عزّ وجلّ نے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی مدح میں فرمایا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ..... الخ محمد اللہ کے رسُول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے خلاف بڑا جوش رکھتے ہیں لیکن آپس میں ایک دوسرے سے بہت ملاطفت کرنے والے ہیں جب تُو انہیں دیکھے گا انہیں شرک سے پاک اور اللہ کا مطیع پائے گا۔ وہ اللہ کے فضل اور رضاء کی جُستجو میں رہتے ہیں۔ انکی شناخت ان کے چہروں پر سجدوں کے نشان کے ذریعہ موجود ہے۔ یہ ان کی حالت تورات میں بیان ہوئی ہے اور انجیل میں ان کی حالت یوں بیان ہے کہ وہ ایک کھیتی کی طرح ہوں گے جس نے پہلے تو اپنی روئیدگی نکالی پھر اس کو آسمانی اور زمینی غذا کے ذریعہ مضبوط کیا اور وہ روئیدگی اَور مضبوط ہو گئی پھر اپنی جڑ پر مضبوطی سے قائم ہو گئی یہاں تک کہ زمیندار کو پسند آنے لگ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کفار ان کو دیکھ دیکھ کر جلیں گے۔ دیکھو اس آیت میں کس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر اُس شخص کا نام کافر رکھا ہے اور اس پر ناراضگی کا اظہار کیا ہے جس نے صحابہؓ سے دشمنی کی۔ پس اللہ سے ڈرو اور اُن لوگوں سے بچو جو صحابہؓ سے دشمنی کی وجہ سے کافر ہو گئے ہیں۔ (سرّ الخلافہ صفحہ ۱۲)

---

[1] سُورۃ الصّف : ۷

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن نے خود اقرار کر لیا کہ ہمارا دل دُکھا پس ایسی مضبوطی ایمان میں پیدا کرو کہ کفر مایوس ہو جاوے کہ میرا قابو نہیں چلتا۔ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ کے یہ معنے بھی ہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۱۰؍ جون ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

جو لوگ خدائے تعالیٰ کے نزدیک فی الحقیقت مومن ہیں اور جن کو خدائے تعالیٰ نے خاص اپنے لئے چُن لیا ہے اور اپنے ہاتھ سے صاف کیا ہے اور اپنے برگزیدہ گروہ میں جگہ دے دی ہے اور جن کے حق میں فرمایا ہے سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ان میں آثار سجود اور عبودیت کے ضرور پائے جانے چاہئیں کیونکہ خدائے تعالیٰ کے وعدوں میں خطا اور تخلف نہیں۔ (آسمانی فیصلہ صفحہ ۱۱، ۱۲)

کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَہٗ الخ اُس بیج کی طرح ہے جس نے اپنا سبزہ نکالا پھر موٹا ہوتا گیا یہاں تک کہ اپنے ساقوں پر قائم ہو گیا۔ اِن آیات میں خدائے تعالیٰ کی ان تائیدات اور احسانات کی طرف اشارہ ہے اور نیز اُس عروج اور اقبال اور عزت اور عظمت کی خبر دی گئی ہے کہ جو آہستہ آہستہ اپنے کمال کو پہنچے گی۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۱۵ حاشیہ)

کفار نے کس دعوٰی کے ساتھ اپنی رائیں ظاہر کیں کہ یہ دین ضرور معدوم ہو جائے گا اور ہم اس کو کالعدم کر دیں گے اور ان کے مقابل پر یہ پیشگوئی کی گئی جو قرآن شریف میں موجود ہے کہ ہرگز تباہ نہیں ہو گا یہ ایک بڑے درخت کی طرح ہو جائے گا اور پھیل جائے گا اور اس میں بادشاہ ہوں گے جیسا کہ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَہٗ میں اشارہ ہے۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۲۰۹)

پہلے ایک بیج ہو گا کہ جو اپنا سبزہ نکالے گا پھر موٹا ہو گا پھر اپنی شاخوں پر قائم ہو گا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۲۹)

سُورۃ الحُجرات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۲﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ۝

اے ایمان والو خدا اور رسُول کے حکم سے بڑھ کر کوئی بات نہ کرو یعنی ٹھیک ٹھیک احکامِ خدا اور رسول پر چلو اور نافرمانی میں خدا سے ڈرو۔ خدا سُنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص محض اپنی توحید پر بھروسہ کرکے (جو دراصل وہ توحید بھی نہیں) رسول سے اپنے تئیں مستغنی سمجھتا ہے اور رسول سے قطع تعلق کرتا ہے اور اُس سے بالکل اپنے تئیں علیحدہ کر دیتا ہے اور گستاخی سے قدم آگے رکھتا ہے وہ خدا کا نافرمان ہے اور نجات سے بے نصیب۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۵)

۸﴾ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ؕ لَوۡ یُطِیۡعُکُمۡ فِیۡ کَثِیۡرٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ لَعَنِتُّمۡ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَ زَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَ کَرَّہَ اِلَیۡکُمُ الۡکُفۡرَ وَ الۡفُسُوۡقَ وَ الۡعِصۡیَانَ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الرّٰشِدُوۡنَ۝ۙ

فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَنِعْمَۃً ؕ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ

حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ یعنی خدا نے تمہارا محبوب ایمان کو بنا دیا اور اس کو تمہارے دلوں میں آراستہ کر دیا۔ (نور القرآن ۲ صفحہ ۳۹)

اس نے اے مومنو ایمان کو تمہارا محبوب بنا دیا اور اس کا حُسن و جمال تمہارے دل میں بٹھا دیا اور کفر اور بدکاری اور معصیت سے تمہارے دل کو نفرت دے دی اور بُری راہوں کا مکروہ ہونا تمہارے دل میں جما دیا۔ یہ سب کچھ خدا کے فضل اور رحمت سے ہؤا۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۶۵)

وَکَیْفَ یُنْسَبُ اِلَی الصَّحَابَۃِ مَا یُخَالِفُ التَّقْوٰی وَسُبُلَہٗ وَیُبَایِنُ الْوَرَعَ وَحُلَلَہٗ مَعَ اَنَّ الْقُرْاٰنَ شَہِدَ بِاَنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْہِمُ الْاِیْمَانَ وَکَرَّہَ اِلَیْہِمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ۔ وَمَا کَفَّرَ اَحَدًا مِّنْہُمْ مَعَ وُقُوْعِ الْمُقَاتَلَۃِ فَضْلًا عَنِ الْمُشَاجَرَۃِ بَلْ سَمّٰی کُلَّ اَحَدٍ مِّنَ الْفَرِیْقَیْنِ مُسْلِمِیْنَ۔

(سرّ الخلافہ صفحہ ۱۱)

خدا نے تم پر پاک رُوح نازل کر کے ہر ایک نیکی تمہیں پیاری لگائی اور کُفر اور فسق اور عصیان تمہاری نظر میں مکروہ کیا۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۱ ۵ صفحہ ۱۹۵)

الحجرات ۱۰

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَہُمَا ۚ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىہُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰہِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَہُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰہَ

ترجمہ از مرتب :۔ اور صحابہ کی طرف ایسی بات کیسے منسوب کی جا سکتی ہے جو تقویٰ اور اس کی راہوں کے خلاف ہے اور پرہیزگاری اور اس کی زیبائشوں کے منافی ہے۔ پھر جبکہ قرآن مجید نے یہ گواہی دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو ان کا محبوب بنا دیا تھا اور ان کے دلوں میں کفر، نافرمانی، اور معصیت کی نفرت ڈال دی تھی اور ان کو آپس میں جنگ و جدال اور باہمی آویزش کی وجہ سے کافر قرار نہیں دیا بلکہ ان دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کا نام مسلمان ہی رکھا۔

(سرّ الخلافہ صفحہ ۱۱)

يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۞ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۞ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ

مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى

اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۚ

بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

الظّٰلِمُوْنَ ۞ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ

الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ

اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۞

فَانْظُرْ اِلٰى مَا قَالَ اللّٰهُ وَهُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِيْنَ اِنَّكَ تُكَفِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ لِبَعْضِ مُشَاجَرَاتٍ وَهُوَ يُسَمِّي الْفَرِيْقَيْنِ مُؤْمِنِيْنَ مَعَ مُقَاتَلَاتٍ وَمُحَارَبَاتٍ وَيُسَمِّيْهِمْ اِخْوَةً مَعَ بَغْيِ الْبَعْضِ عَلَى الْبَعْضِ وَلَا يُسَمِّيْ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ كَافِرِيْنَ بَلْ يَغْضَبُ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَنَابَزُوْنَ بِالْاَلْقَابِ وَيَلْمِزُوْنَ اَنْفُسَهُمْ

ترجمہ از مرتّب :۔ تم اس ارشاد پر غور کرو جو اصدق الصادقین خدا نے فرمایا ہے۔ تم مومنوں کو ان کے آپس کے بعض جھگڑوں پر کافر قرار دیتے ہو اور اللہ تعالیٰ دونوں فریقوں کو باوجود ان کے جھگڑوں کے مومن قرار دیتا ہے اور باوجود ایک فریق کے دوسرے فریق پر زیادتی کرنے کے ان کو بھائی بھائی ٹھہراتا ہے اور ان میں سے کسی فریق کا نام کافر نہیں رکھتا

وَلَا يَسْتُرُوْنَ كَالْاَحْبَابِ وَيَسْخَرُوْنَ وَيَغْتَابُوْنَ وَيَظُنُّوْنَ ظَنَّ السَّوْءِ وَيَمْشُوْنَ مُتَجَسِّسِيْنَ بَلْ يُسَمِّيْ مُرْتَكِبَ هٰذِهِ الْاُمُوْرِ فُسُوْقًا بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَيَغْضَبُ عَلَيْهِ كَغَضَبِهٖ عَلٰى اَهْلِ الْعُدْوَانِ وَلَا يَرْضٰى بِعِبَادِهٖ اَنْ يَّسُبُّوا الْمُؤْمِنِيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ هٰذَا مَعَ اَنَّهٗ يُسَمِّيْ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ بَاغِيْنَ ظَالِمِيْنَ وَفَرِيْقًا مِّنَ الْاٰخَرِيْنَ مَظْلُوْمِيْنَ وَلٰكِنْ لَا يُسَمِّيْ اَحَدًا مُّرْتَدِّيْنَ وَكَفَاكَ هٰذِهِ الْهِدَايَةُ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ فَلَا تُدْخِلْ نَفْسَكَ تَحْتَ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ وَلَا تُبَادِرْ اِلَى الْمُهْلِكَاتِ وَلَا تَقْعُدْ مَعَ الْمُعْتَدِيْنَ۔

(سرّ الخلافہ صفحہ ۱۱، ۱۲)

ایک قوم دوسری قوم سے ٹھٹھا نہ کرے ہو سکتا ہے کہ جن سے ٹھٹھا کیا گیا ہے وہی اچھے ہوں بعض عورتیں بعض عورتوں سے ٹھٹھا نہ کریں ہو سکتا ہے کہ جن سے ٹھٹھا کیا گیا وہی اچھی ہوں اور عیب مت لگاؤ۔ اپنے لوگوں کے بُرے بُرے نام مت رکھو۔ بدگمانی کی باتیں مت کرو اور نہ عیبوں کو کُرید کُرید کر پوچھو۔ ایک دوسرے کا گلہ مت کرو۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۳۶)

پلید دل سے پلید باتیں نکلتی ہیں اور پاک دل سے پاک باتیں۔ انسان اپنی باتوں سے ایسا ہی پہچانا جاتا ہے جیسا کہ درخت اپنے پھلوں سے جس حالت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں صاف فرما دیا وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ یعنی لوگوں کے ایسے نام مت رکھو جو ان کو بُرے معلوم ہوں۔ (تحفہ غزنویہ صفحہ ۱۱)

تم ایک دوسرے کی چڑ کے نام نہ ڈالو یہ فعل فساق و فجار کا ہے۔ جو شخص کسی کو چڑاتا ہے وہ نہ مرے گا جبتک وہ خود اس طرح مُبتلا ہو گا۔ اپنے بھائیوں کو حقیر نہ سمجھو جب کُل ایک ہی چشمہ سے پانی پیتے ہو تو کون جانتا ہے کہ

بلکہ وہ ان لوگوں پر ناراضگی کا اظہار کرتا ہے جو ایک دوسرے کو بُرے ناموں سے یاد کرتے ہیں اور اپنے ہی لوگوں پر عیب لگاتے ہیں اور دوستوں کی طرح پردہ پوشی سے کام نہیں لیتے بلکہ تمسخر کرتے ہیں اور غیبت کرتے ہیں اور بدظنی سے کام لیتے ہیں اور اُٹھتے بیٹھتے لوگوں کے عیوب کی تلاش میں لگے رہتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ ان امور کے مُرتکب کو ایمان کے بعد اطاعت سے نکل جانے والا قرار دیتا ہے اور اس پر اسی طرح اپنے غضب کا اظہار کرتا ہے جیسے کہ سرکشی کرنیوالوں پر۔ وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کے بندے مومنوں اور مسلمانوں کو گالیاں دیں۔ باوجود اس کے کہ وہ اِن آیات میں مومنوں کے ایک فریق کو باغی اور ظالم قرار دیتا ہے اور دوسرے کو مظلوم کہتا ہے لیکن وہ ان میں سے کسی کو اسلام کا تارک قرار نہیں دیتا۔ پس اگر تم متقی ہو تو تمہارے لئے یہ نصیحت کافی ہے۔ تم اپنے آپ کو ان آیات کی زد میں نہ لاؤ اور ہلاک کرنیوالے امور کو اختیار کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لو اور زیادتی کرنے والوں کے ساتھ نشست برخواست نہ رکھو۔

(سرّ الخلافہ صفحہ ۱۱، ۱۲)

کِس کی قسمت میں زیادہ پانی پیتا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۹، ۵۰)

چاہیئے کہ ایک تمہارا دوسرے کا گِلہ مت کرے۔ کیا تم پسند کرتے ہو کہ مُردے بھائی کا گوشت کھاؤ اور چاہیئے کہ ایک قوم دوسری قوم پر ہنسی نہ کرے کہ ہماری اُونچی ذات اوران کی کم ہے ممکن ہے کہ وہ تم سے بہتر ہوں ..... اور تم بُرے ناموں سے جن سے لوگ چڑتے ہیں یا اپنی ہتک سمجھتے ہیں ان کومت پکارو ورنہ خدا کے نزدیک تمہارا نام بدکار ہوگا۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۱۰)

اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ بدظنی ایک ایسا مرض ہے اور ایسی بُری بَلا ہے جو انسان کو اندھا کرکے ہلاکت کے تاریک کنوئیں میں گرا دیتی ہے۔ بدظنی ہی ہے جس نے ایک مُردہ انسان کی پرستش کرائی۔ بدظنی ہی تو ہے جو لوگوں کو خدائے تعالیٰ کی صفات خلق، رحم، رازقیت وغیرہ سے معطّل کرکے نعوذ باللہ ایک فرد معطّل اور شئی بیکار بنا دیتی ہے۔ الغرض اِسی بدظنی کے باعث جہنم کا ایک بہت بڑا حصہ اگر کہوں کہ سارا حصہ بھر جائے گا تو مبالغہ نہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ماموروں سے بدظنی کرتے ہیں وہ خدائے تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے فضل کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۷، ۹۸)

یہ خوب یاد رکھو کہ ساری خرابیاں اور بُرائیاں بدظنی سے پیدا ہوتی ہیں اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے اِس سے بہت منع فرمایا ہے اور فرمایا اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ۔ اگر مولوی ہم سے بدظنی نہ کرتے اور صدق اور استقلال کے ساتھ آکر ہماری باتیں سُنتے۔ ہماری کتابیں پڑھتے اور ہمارے پاس رہ کر ہمارے حالات کا مشاہدہ کرتے تو ان الزامات کو جو وہ ہم پر لگاتے ہیں ہرگز نہ لگاتے لیکن جب انہوں نے خدا تعالیٰ کے اس ارشاد کی عظمت نہ کی اور اس پر کاربند نہ ہوئے تو اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ مجھ پر بدظنی کی اور میری جماعت پر بھی بدظنی کی اور جھوٹے الزام اور اتہام لگانے شروع کر دئیے یہاں تک کہ بعض نے بڑی بیباکی سے لکھ دیا کہ یہ تو دہریوں کا گروہ ہے نمازیں نہیں پڑھتے، روزے نہیں رکھتے وغیرہ وغیرہ اب اگر وہ اِس بدظنی سے بچتے تو ان کو جھوٹ کی لعنت کے نیچے نہ آنا پڑتا اور وہ اس سے بچ جاتے۔ مَیں سچ کہتا ہوں کہ بدظنی بہت ہی بُری بَلا ہے جو انسان کے ایمان کو تباہ کر دیتی ہے اور صدق اور راستی سے دُور پھینک دیتی ہے اور دوستوں کو دشمن بنا دیتی ہے۔ صدیقوں کے کمال کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اِنسان بدظنی سے بہت ہی بچے اور اگر کسی کی نسبت کوئی سُوءِ ظن پیدا ہو تو کثرت کے ساتھ اِستغفار کرے اور خدا تعالیٰ سے دُعائیں کرے تاکہ اس معصیت اور اس کے بُرے نتیجہ سے بچ جاوے جو اس بدظنی کے پیچھے آنے والا ہے اس کو کبھی معمولی چیز نہیں سمجھنا چاہیئے یہ بہت ہی خطرناک بیماری ہے جس سے اِنسان بہت جلد ہلاک ہو جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۴ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

غرض بدظنی اِنسان کو تباہ کر دیتی ہے یہاں تک کہ جب دوزخی جہنم میں ڈالے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو

یہی فرمائے گا کہ تمہارا یہ گناہ ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ پر بدظنی کی بعض لوگ اِس قسم کے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خطاکاروں کو معاف کر دے گا اور نیکوکاروں کو عذاب دے گا یہ بھی خدا تعالیٰ پر بدظنی ہے اِس لئے کہ اُس کی صفتِ عدل کے سراسر خلاف ہے اور نیکی اور اس کے نتائج کو جو قرآن شریف میں اُس نے مقرر فرمائے ہیں بالکل ضائع کر دینا اور بیہودہ ٹھہرانا ہے پس خوب یاد رکھو کہ بدظنی کا انجام جہنم ہے اس کو معمولی مرض نہ سمجھو بدظنی سے ناامیدی اور ناامیدی سے جرائم اور جرائم سے جہنم ملتا ہے۔ بدظنی صدق کی جڑ کاٹنے والی چیز ہے اِس لئے تم اس سے بچو اور صدیق کے کمالات حاصل کرنے کے لئے دعائیں کرو۔ (الحکم جلد ۹ ۱۶ مورخہ ۱۰ رمئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

فساد اس سے شروع ہوتا ہے کہ انسان ظنونِ فاسدہ اور شکوک سے کام لینا شروع کرے۔ اگر نیک ظن کرے تو پھر کچھ دینے کی توفیق بھی مل جاتی ہے۔ جب پہلی ہی منزل پر خطا کی تو پھر منزلِ مقصود پر پہنچنا مشکل ہے۔ بدظنی بہت بُری چیز ہے اِنسان کو بہت سی نیکیوں سے محروم کر دیتی ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ اِنسان خدا پر بدظنی شروع کر دیتا ہے۔ (الحکم جلد ۴ ۳۵ مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

دوسرے باطن میں ہم تصرف نہیں کر سکتے اور اس طرح کا تصرف کرنا گناہ ہے۔ اِنسان ایک آدمی کو بدخیال کرتا ہے اور پھر آپ اس سے بدتر ہو جاتا ہے ..... سُوءِ ظن جلدی سے کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ تصرف فی العباد ایک نازک امر ہے اس نے بہت سی قوموں کو تباہ کر دیا کہ انہوں نے انبیاء اور ان کے اہلِ بیت پر بدظنیاں کیں۔

(البدر جلد ۱ ۸ مورخہ ۱۲ ر دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۴)

وَلَا تَجَسَّسُوْا یعنی تجسس مت کیا کرو۔ (البدر جلد ۲ ۸ مورخہ ۲۷ر مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۶)

اپنے بھائی کا گلہ کرنا مُردہ کھانا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا یعنی ایک مسلمان کو چاہیئے کہ دوسرے مسلمان کا گلہ نہ کرے۔ کیا کوئی مسلمان اِس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھاوے۔ (ست بچن صفحہ ۱۳۶)

ایک صوفی کے دو مرید تھے ایک نے شراب پی اور نالی میں بیہوش ہو کر گرا دوسرے نے صوفی سے شکایت کی۔ اس نے کہا تُو بڑا بے اَدب ہے کہ اس کی شکایت کرتا ہے اور جا کر اُٹھا نہیں لاتا۔ وہ اسی وقت گیا اور اُسے اٹھا کر لے چلا۔ کہتے تھے کہ ایک نے تو بہت شراب پی لیکن دوسرے نے کم پی کہ اُسے اُٹھا کر لے جا رہا ہے۔ صوفی کا مطلب یہ تھا کہ تُو نے اپنے بھائی کی غیبت کیوں کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غیبت کا حال پُوچھا تو فرمایا کہ کسی کی سچی بات کا اس کی عدم موجودگی میں اس طرح سے بیان کرنا کہ اگر وہ موجود ہے تو اُسے بُرا لگے غیبت ہے اور اگر وہ بات اس میں نہیں ہے اور تُو بیان کرتا ہے تو اس کا نام بہتان ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا۔ اس میں غیبت کرنے کو ایک بھائی کا گوشت کھانے سے

تعبیر کیا گیا ہے اور اس آیت سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ جو آسمانی سلسلہ بنتا ہے ان میں غیبت کرنے والے بھی ضرور ہوتے ہیں اور اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر یہ آیت بیکار جاتی ہے۔ اگر مومنوں کو ایسا ہی مطہر ہونا تھا اور ان سے کوئی بدی سرزد نہ ہوتی تو پھر اس آیت کی کیا ضرورت تھی۔ (البدر جلد ۳ ۲۶ مورخہ ۸ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

بعض گناہ ایسے باریک ہوتے ہیں کہ انسان ان میں مبتلا ہوتا ہے اور سمجھتا ہی نہیں۔ جوان سے بوڑھا ہو جاتا ہے مگر اسے پتہ نہیں لگتا کہ گناہ کرتا ہے مثلاً گلہ کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اس کو بالکل ایک معمولی اور چھوٹی سی بات سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن شریف نے اس کو بہت ہی برا قرار دیا ہے چنانچہ فرمایا ہے اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ خدا تعالیٰ اس سے ناراض ہوتا ہے کہ انسان ایسا کلمہ زبان پر لاوے جس سے اس کے بھائی کی تحقیر ہو اور ایسی کارروائی کرے جس سے اس کو حرج پہنچے۔ ایک بھائی کی نسبت ایسا بیان کرنا جس سے اس کا جاہل اور نادان ہونا ثابت ہو یا اس کی عادت کے متعلق خفیہ طور پر بے غیرتی یا دشمنی پیدا ہو یہ سب برے کام ہیں۔

(الحکم جلد ۱۰ ۲۳ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

۱۴ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ○

پہلے نوع انسان صرف ایک قوم کی طرح تھی اور پھر وہ تمام زمین پر پھیل گئے تو خدا نے ان کے سہولت تعارف کے لئے ان قوموں کو منقسم کر دیا اور ہر ایک قوم کے لئے اُس کے مناسب حال ایک مذہب مقرر کیا جیسا کہ وہ فرماتا ہے يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۱۳۸)

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ یعنی جس قدر کوئی تقویٰ کی دقیق راہیں اختیار کرے اسی قدر خدا تعالیٰ کے نزدیک اس کا زیادہ مرتبہ ہوتا ہے پس بلاشبہ یہ نہایت اعلیٰ درجہ کا تقویٰ ہے کہ قبل از خطرات خطرات سے محفوظ رہنے کی تدبیر بطور حفظ ماتقدم کی جائے۔ (نور القرآن حصہ دوم صفحہ ۴۵)

اولیاء اللہ اور رسول اور نبی جن پر خدا کا رحم اور فضل ہوتا ہے اور خدا ان کو اپنی طرف کھینچتا ہے وہ دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) ایک وہ جو دوسروں کی اصلاح کے لئے مامور نہیں ہوتے بلکہ ان کا کاروبار اپنے نفس تک ہی محدود ہوتا ہے اور اُن کا کام صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ ہر دم اپنے نفس کو ہی زہد اور تقویٰ اور اخلاص کا صیقل دیتے رہتے ہیں اور حتی الوسع خدا تعالیٰ کی ادق سے ادق رضامندی کی راہوں پر چلتے اور اُس کے باریک وصایا کے

پابند بنتے ہیں اور اُن کے لئے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ کسی عالی خاندان اور عالی قوم میں سے ہوں جو علو نسب اور شرافت اور نجابت اور امارت اور ریاست کا خاندان ہو بلکہ حسب آیہ کریمہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ترجمہ۔ تم میں سے خدا تعالیٰ کے نزدیک وہی زیادہ بزرگ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ کی راہوں پر چلتا ہے۔ صرف انکی تقویٰ دیکھی جاتی ہے گو وہ دراصل چوہڑوں میں سے ہوں یا چماروں میں سے۔ یا مثلاً کوئی اُن میں سے ذات کا کنجر ہو جس نے اپنے پیشہ سے توبہ کر لی ہو یا اُن قوموں میں سے ہو جو اسلام میں دوسری قوموں کے خادم اور نیچی قومیں سمجھی جاتی ہیں جیسے حجام، موچی، تیلی، ڈوم، میراسی، سقّے، قصائی، جولاہے، کنجری، تنبولی، دھوبی، مچھوے، بھڑ بھونجے، نانبائی وغیرہ یا مثلاً ایسا شخص ہو کہ اس کی ولادت میں ہی شک ہو کہ آیا حلال کا ہے یا حرام کا۔ یہ تمام لوگ توبہ نصوح سے اولیاء اللہ میں داخل ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ درگاہ کریم ہے اور فیضان کی موجیں بڑے جوش سے جاری ہیں اور اس قدوس ابدی کے دریائے محبت میں غرق ہو کر طرح طرح کے میلوں والے اُن تمام میلوں سے پاک ہو سکتے ہیں جو عُرف اور عادت کے طور پر اُن پر لگائے جاتے ہیں اور پھر بعد اس کے کہ وہ اُس خدائے قدوس سے جل گئے اور اس کی محبت میں محو ہو گئے اور اُس کی رضا میں کھوئے گئے سخت بدذاتی ہوتی ہے کہ اُن کی کسی نیچ ذات کا ذکر بھی کیا جائے کیونکہ اَب وہ وہ نہیں رہے اور انہوں نے اپنی شخصیت کو چھوڑ دیا اور خدا میں جا ملے اور اِس لائق ہو گئے کہ تعظیم سے اُن کا نام لیا جائے اور جو شخص بعد اِس تبدیلی کے اُن کی تحقیر کرتا ہے یا ایسا خیال دِل میں لاتا ہے وہ اندھا ہے اور خدا تعالیٰ کے غضب کے نیچے ہے اور خدا کا عام قانون یہی ہے کہ اِسلام کے بعد قوموں کی تفریق مٹا دی جاتی ہے اور نیچ اُونچ کا خیال دُور کیا جاتا ہے۔ ہاں قرآن شریف سے یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ بیاہ اور نکاح میں تمام قومیں اپنے قبائل اور ہم رُتبہ قوموں یا ہم رُتبہ اشخاص اور کفو کا خیال کر لیا کریں تو بہتر ہے تا اَولاد کے کسی داغ اور تحقیر اور ہنسی کی جگہ نہ ہو لیکن اس خیال کو حد سے زیادہ نہیں کھینچنا چاہیئے کیونکہ قوموں کی تفریق پر خدا کی کلام نے زور نہیں دیا صرف ایک آیت سے کفو اور حسب نسب کے لحاظ کا اِستنباط ہوتا ہے اور قوموں کی حقیقت یہ ہے کہ ایک مدت دراز کے بعد شریف سے رذیل اور رذیل سے شریف بن جاتی ہیں اور ممکن ہے کہ مثلاً بھنگی یعنی چوہڑے یا چمار جو ہمارے مُلک میں سب قوموں سے رذیل تر خیال کئے جاتے ہیں کسی زمانہ میں شریف ہوں اور اپنے بندوں کے اِنقلابات کو خدا ہی جانتا ہے دوسروں کو کیا خبر ہے۔ سو عام طور پر پنجہ مارنے کے لائق یہی آیت ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ جس کے یہ معنے ہیں کہ تم سب میں سے خدا کے نزدیک بزرگ اور عالی نسب وہ ہے جو سب سے زیادہ اس تقویٰ کے ساتھ جو صدق سے بھری ہوئی ہو خدا تعالیٰ کی طرف جُھک گیا ہو اور خدا سے قطع تعلق کا خوف ہر دَم اور ہر لحظہ اور ہر ایک کام اور ہر ایک قول اور ہر ایک حرکت اور ہر ایک سکون اور ہر ایک خُلق اور ہر ایک عادت اور ہر ایک جذبہ ظاہر کرنے کے وقت اُس کے دِل پر غالب ہو۔ وہی ہے جو سب

قوموں میں سے شریف تر اور سب خاندانوں میں سے بزرگ تر اور تمام قبائل میں سے بہتر قبیلہ میں سے ہے اور اِس لائق ہے کہ سب اُس کی راہ پر فدا ہوں۔ غرض شریعتِ اِسلامی کا یہ تو عام قانون ہے کہ تمام مدار تقویٰ پر رکھا گیا ہے لیکن نبیوں اور رسُولوں اور محدثوں کے بارے میں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو کر آتے ہیں اور تمام قوموں کے لئے واجب الاطاعت ٹھہرتے ہیں قدیم سے خدا تعالیٰ کا ایک خاص قانون ہے جو ہم ذیل میں لکھتے ہیں۔

ہم اِس سے پہلے ابھی بیان کر چکے ہیں کہ ایسے اولیاء اللہ جو مامور نہیں ہوتے یعنی نبی یا رسُول یا محدث نہیں ہوتے اور اُن میں سے نہیں ہوتے جو دُنیا کو خدا کے حکم اور الہام سے خدا کی طرف بُلاتے ہیں ایسے ولیوں کو کسی اعلیٰ خاندان یا اعلیٰ قوم کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اُن کا سب معاملہ اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے لیکن ان کے مقابل پر ایک دوسری قوم کے ولی ہیں جو رسُول یا نبی یا محدث کہلاتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک منصب حکومت اور قضا کا لے کر آتے ہیں اور لوگوں کو حکم ہوتا ہے کہ ان کو اپنا امام اور سردار اور پیشوا سمجھ لیں اور جیسا کہ وہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں اس کے بعد خدا کے ان نائبوں کی اطاعت کریں۔ اِس منصب کے بزرگوں کے متعلق قدیم سے خدا تعالیٰ کی یہی عادت ہے کہ ان کو اعلیٰ درجہ کی قوم اور خاندان میں سے پَیدا کرتا ہے تا ان کے قبول کرنے اور ان کی اطاعت کا جوا اُٹھانے میں کسی کو کراہت نہ ہو اور چونکہ خدا نہایت رحیم و کریم ہے اِس لئے نہیں چاہتا کہ لوگ ٹھوکر کھاویں اور ان کو ایسا اِبتلا پیش آوے جو ان کو اِس سعادتِ عظمیٰ سے محروم رکھے کہ وہ اس کے مامور کے قبول کرنے سے اِس طرح پر رُک جائیں کہ اس شخص کی نیچ قوم کے لحاظ سے ننگ اور عار ان پر غالب ہو اور وہ دِلی نفرت کے ساتھ اِس بات سے کراہت کریں کہ اس کے تابعدار بنیں اور اس کو اپنا بزرگ قرار دیں اور انسانی جذبات اور تصورات پر نظر کر کے یہ بات خوب ظاہر ہے کہ یہ ٹھوکر طبعاً اِنسان کو پیش آ جاتی ہے۔

(تریاق القلوب صفحہ ۶۶، ۶۷)

مکرم و معظم کوئی دُنیاوی اصولوں سے نہیں ہو سکتا۔ خدا کے نزدیک بڑا وہ ہے جو متقی ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ یہ جو مختلف ذاتیں ہیں یہ کوئی وجہ شرافت نہیں خدا تعالیٰ نے محض عُرف کے لئے یہ ذاتیں بنائیں اور آجکل تو صرف بعد چار پُشتوں کے حقیقی پتہ لگانا ہی مشکل ہے۔ متقی کی شان نہیں کہ ذاتوں کے جھگڑے میں پڑے جب اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ میرے نزدیک ذات کوئی سَند نہیں حقیقی مکرمت اور عظمت کا باعث فقط تقویٰ ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۰)

دینی غریب بھائیوں کو کبھی حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھو۔ مال و دولت یا نسبی بزرگی پر بے جا فخر کر کے دوسروں کو ذلیل اور حقیر نہ سمجھو۔ خدا کے نزدیک مکرم وہی ہے جو متقی ہے چنانچہ فرمایا ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۷ مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی معزز و مکرم ہے جو متقی ہے۔ اَب جو جماعتِ اَتقیاء ہے خدا اس کو ہی رکھے گا اور دوسری کو ہلاک کرے گا۔ یہ نازک مقام ہے اور اِس جگہ پر دو کھڑے نہیں ہو سکتے کہ متقی بھی وہیں رہے اور شریر اور ناپاک بھی وہیں۔ ضرور ہے کہ متقی کھڑا ہو اور خبیث ہلاک کیا جاوے اور چونکہ اس کا علم خدا کو ہے کہ کون اس کے نزدیک متقی ہے پس یہ بڑے خوف کا مقام ہے۔ خوش قسمت ہے وہ اِنسان جو متقی ہے اور بدبخت ہے وہ جو لعنت کے نیچے آیا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

خدا تعالیٰ نہ محض جسم سے راضی ہوتا ہے نہ قوم سے اُس کی نظر ہمیشہ تقویٰ پر ہے۔ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ یعنی اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ بزرگی رکھنے والا وہی ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہو۔ یہ بالکل جھوٹی باتیں ہیں کہ مَیں سیّد ہوں یا مُغل ہوں یا پٹھان اور شیخ ہوں۔ اگر بڑی قومیت پر فخر کرتا ہے تو یہ فخر فضول ہے۔ مرنے کے بعد سب قومیں جاتی رہتی ہیں۔ خدا تعالیٰ کے حضور قومیت پر کوئی نظر نہیں اور کوئی شخص محض اعلیٰ خاندان میں سے ہونے کی وجہ سے نجات نہیں پاسکتا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو کہا ہے کہ اے فاطمہؓ تو اِس بات پر ناز نہ کر کہ تُو پیغمبر زادی ہے۔ خدا کے نزدیک قومیت کا لحاظ نہیں وہاں جو مدارج ملتے ہیں وہ تقویٰ کے لحاظ سے ملتے ہیں۔ یہ قومیں اور قبائل دُنیا کا عُرف اور انتظام ہیں خدا تعالیٰ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ خدا تعالےٰ کی محبت تقویٰ سے پَیدا ہوتی ہے اور تقویٰ ہی مدارجِ عالیہ کا باعث ہوتا ہے۔ اگر کوئی سیّد ہو اور وہ عیسائی ہو کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دے اور خدا کے احکام کی بیحرمتی کرے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو آلِ رسُول ہونے کی وجہ سے نجات دے گا اور وہ بہشت میں داخل ہو جاوے گا۔ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ[1] اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو سچا دین جو نجات کا باعث ہوتا ہے اِسلام ہے۔ اگر کوئی عیسائی ہو جاوے یا یہودی ہو یا آریہ ہو وہ خدا کے نزدیک عزّت پانے کے لائق نہیں۔ خدا تعالیٰ نے ذاتوں اور قوموں کو اُڑا دیا ہے یہ دُنیا کے اِنتظام اور عُرف کے لئے قبائل ہیں مگر ہم نے خوب غور کر لیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے حضور جو مدارج ملتے ہیں اُن کا اصل باعث تقویٰ ہی ہے۔ جو متقی ہے وہ جنت میں جائے گا خدا تعالیٰ اس کے لئے فیصلہ کر چکا ہے۔ خدا کے نزدیک معزز متقی ہی ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

یہ بالکل سچی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کا کسی کے ساتھ کوئی جسمانی رشتہ نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ خود انصاف ہے اور انصاف کو دوست رکھتا ہے۔ وہ خود عدل ہے عدل کو دوست رکھتا ہے۔ اِس لئے ظاہری رشتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ جو تقویٰ کی رعایت کرتا ہے اسے وہ اپنے فضل سے بچاتا ہے اور اس کا ساتھ دیتا ہے اور اِسی لئے

---

[1] سورۃ آل عمران : ۲۰

اُس نے فرمایا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷؍اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی اِکرام متقی ہی کا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز و مکرم وہی ہے جو متقی ہے۔ پس رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ کے نزدیک جو مکرم ہے وہی ہمارے نزدیک مکرم ہو سکتا ہے اور وہ متقی ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱ مورخہ ۱۰؍جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

زیادہ بزرگ تم میں سے وہ ہے جو تقویٰ میں زیادہ ہے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۴؍اگست ۱۹۰۴ء)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکرم وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ پس ذاتوں پر ناز اور گھمنڈ نہ کرو کہ یہ نیکی کیلئے روک کا باعث ہو جاتا ہے ہاں ضروری یہ ہے کہ نیکی اور تقویٰ میں ترقی کرو خدا تعالیٰ کے فضل اور برکات اِسی راہ سے آتے ہیں۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۴؍ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

نجات نہ قوم پر منحصر ہے نہ مال پر بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر موقوف ہے اور اس کو اعمالِ صالحہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل اتباع اور دعائیں جذب کرتی ہیں۔ قوم کا ابتلاء بھی مال کے ابتلاء سے کم نہیں۔ بعض لوگ دوسری قوموں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اِس ابتلاء میں سیّد سب سے زیادہ مُبتلا ہیں۔ ایک عورت گداگر ہمارے ہاں آئی وہ کہتی تھی مَیں سیّدانی ہوں اُس کو پیاس لگی اور پانی مانگا تو کہا کہ پیالہ دھو کر دینا کسی اُمتی نے پیا ہوگا۔ اِس قسم کے خیالات ان لوگوں میں پَیدا ہوئے ہوئے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے حضور اِن باتوں کی کچھ قدر نہیں اُس نے فیصلہ کر دیا ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۰؍نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

یاد رکھنا چاہیئے کہ اِسلام میں قوموں کا کچھ بھی لحاظ نہیں صرف تقویٰ اور نیک بختی کا لحاظ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ یعنی تم میں سے خدا تعالیٰ کے نزدیک زیادہ تر بزرگ وہی ہے جو زیادہ تر پرہیزگار ہے۔ (بدر جلد ۲ نمبر ۳۱ مورخہ ۲؍اگست ۱۹۰۶ء صفحہ ۱۲ و تبلیغِ رسالت جلد اوّل (مجموعہ اشتہارات) صفحہ ۴۵)

---

۱۵ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝

عَرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ ہاں یُوں کہو کہ ہم نے اطاعت اختیار کرلی اور ایمان ابھی تمہارے دِلوں میں داخل نہیں ہؤا۔ پس جبکہ خدا اطاعت کرنے والوں کا نام مومن نہیں رکھتا پھر وہ لوگ خدا کے نزدیک کیونکر مومن ہوسکتے ہیں جو کُھلے کُھلے طور پر خدا کے کلام کی تکذیب کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے ہزار ہا نشان دیکھ کر جو زمین اور آسمان پر ظاہر ہوئے پھر بھی میری تکذیب سے باز نہیں آتے۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۴)

عَرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ان کو کہہ دے کہ تم ایمان نہیں لائے۔ ایمان تو اَور ہی چیز ہے سوتم یہ کہو کہ ہم نے اطاعت کے لئے گردن ڈال دی اور ایمان کا ہنوز تمہارے دِلوں میں گذر تک نہیں ہؤا۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۲۲۷)

ایک اَور عجیب مناسبت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت یشوع بن نون علیہ السّلام سے ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت یشوع بن نون کو حضرت موسٰی علیہ السّلام کی وفات کے بعد ایک ہولناک دریا سے جس کا نام یردن ہے عبور مع لشکر کرنا پیش آیا تھا اور یردن میں ایک طوفان تھا اور عبور غیر ممکن تھا اور اگر اس طوفان سے عبور نہ ہوتا تو بنی اسرائیل کی دشمنوں کے ہاتھ سے تباہی متصوّر تھی اور یہ وہ پہلا امر ہولناک تھا جو حضرت موسٰی علیہ السّلام کے بعد یشوع بن نون کو اپنے خلافت کے زمانہ میں پیش آیا۔ اس وقت خدا تعالیٰ نے اس طوفان سے اعجازی طور پر یشوع بن نون اور اسکے لشکر کو بچالیا اور یردن میں خشکی پیدا کر دی جس سے وہ بآسانی گذر گیا۔ وہ خشکی بطور جوار بھاٹا تھی یا محض ایک فوق العادت اعجاز تھا۔ بہرحال اِس طرح خدا نے ان کو طوفان اور دشمن کے صَدمہ سے بچایا اسی طوفان کی مانند بلکہ اس سے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر خلیفۃ الحق کو مع تمام جماعت صحابہؓ کے جو ایک لاکھ سے زیادہ تھے پیش آیا یعنی ملک میں سخت بغاوت پھیل گئی اور وہ عرب کے بادیہ نشین جن کو خدا نے فرمایا تھا قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (سُورہ حجرات) ضرور تھا کہ اس پیشگوئی کے مطابق وہ بگڑتے تا یہ پیشگوئی پوری ہوتی۔ پس ایسا ہی ہؤا اور وہ سب لوگ مُرتد ہوگئے اور بعض نے زکوٰۃ سے انکار کیا اور چند شریر لوگوں نے پیغمبری کا دعوٰی کر دیا جن کے ساتھ کئی لاکھ بدبخت اِنسانوں کی جمعیت ہوگئی اور دشمنوں کا شمار اِس قدر بڑھ گیا کہ صحابہؓ کی جماعت اُن کے آگے کچھ بھی چیز نہ تھی اور ایک سخت طوفان مُلک میں برپا ہؤا یہ طوفان اس خوفناک پانی سے بہت بڑھ کر تھا جس کا سامنا حضرت یشوع بن نون علیہ السّلام کو پیش آیا تھا۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۵۹)

خدا جو مومنوں کی تعریف کرتا ہے اور رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کہتا ہے اِس لئے کہ انہوں نے اپنی فراست سے پہلے رسول اللہ کو مان لیا لیکن جب کثرت سے لوگ داخل ہونے لگے اور انکشاف ہوگیا اس وقت داخل ہونیوالے

کا نام النّاس رکھا۔ اِس حالت میں تو گویا منع کرتا ہے یہ کہہ کر قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا یعنی یہ مت کہو کہ ہم ایمان لائے بلکہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت کی۔ ایمان اس وقت ہوتا ہے جب ابتلاء کے موقعے آویں جن پر ایمان لانے کے بعد ابتلاء کے موقعے نہیں آئے وہ اَسْلَمْنَا میں داخل ہیں۔ انہوں نے تکلیف کا نشانہ ہو کر نہیں دیکھا۔ بلکہ وہ اقبال اور نصرت کے زمانہ میں داخل ہوئے یہی وجہ ہے کہ فخر کا نام اور خطاب ان کو نہ ملا بلکہ النّاس ان کا نام رکھا کیونکہ وہ ایسے وقت داخل ہوئے جب کام چل پڑا اور رسول اللہؐ نے اپنی صداقت کی روشنی دکھلائی اس وقت دوسرے مذاہب حقیر نظر آئے تو سب داخل ہوگئے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰ ر اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۶)

(یُوں کہو کہ) ہم نے مقابلہ چھوڑ دیا لیکن ان کے دِلوں میں ابھی ایمان داخل نہیں ہوُا۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۵)

اَسْلَمْنَا ہمیشہ لاٹھی سے ہوتا ہے اور اٰمَنَّا اُس وقت ہوتا ہے جب خدا تعالیٰ دِل میں ڈال دے۔ ایمان کے لوازم اَور ہوتے ہیں اور اِسلام کے اَور۔ اِسی لئے خدا تعالیٰ نے اس وقت ایسے لوازم پیدا کئے کہ جن سے ایمان حاصل ہو۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۹ر مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۴۷)

تم یہ نہ کہو کہ ایماندار ہوگئے بلکہ یہ کہو کہ ہم نے مقابلہ چھوڑ دیا ہے اور اطاعت اختیار کر لی ہے۔ بہت سے لوگ اِس قِسم کے ہوتے ہیں۔ کامل ایماندار بننے کے لئے مجاہدات کی ضرورت ہے اور مختلف اِبتلاؤں اور امتحانوں سے ہو کر نکلنا پڑتا ہے ؎

گوئیند سنگ لعل شود دَر مقامِ صبر
آرے شود ولیک بخونِ جگر شود

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۴ر مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ہزاروں آدمی مُرتد ہوگئے حالانکہ آپؐ کے زمانہ میں تکمیلِ شریعت ہو چکی تھی یہاں تک اِس ارتداد کی نوبت پہنچی کہ صرف دو مسجدیں رہ گئیں جن میں نماز پڑھی جاتی تھی باقی کِسی مسجد میں نماز ہی نہیں پڑھی جاتی تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جن کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذریعہ دوبارہ اِسلام کو قائم کیا اور وہ آدمِ ثانی ہوئے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۴۳ مورخہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

مومن وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے اعمال ان کے ایمان پر گواہی دیتے ہیں جن کے دِل پر ایمان لکھا جاتا ہے اور جو اپنے خدا اور اس کی رضا کو ہر ایک چیز پر مقدم کر لیتے ہیں اور تقویٰ کی باریک اور تنگ راہوں کو خدا کے لئے اختیار کرتے اور اس کی محبت میں محو ہو جاتے ہیں اور ہر ایک چیز جو بُت کی طرح خدا سے روکتی ہے خواہ وہ اَخلاقی

حالت ہو یا اعمال فاسقانہ ہوں یا غفلت اور کسل ہو سب سے اپنے تئیں دُور تر لے جاتے ہیں۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۱۰۳)

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ۝

سوا اِس کے نہیں کہ مومن وہ لوگ ہیں جو خدا اور رسُول پر ایمان لائے پھر بعد اس کے ایمان پر قائم رہے اور شکوک و شبہات میں نہیں پڑے۔ دیکھو اِن آیات میں خدا تعالیٰ نے حصر کر دیا کہ خدا کے نزدیک مومن وہی لوگ ہیں کہ جو صرف خدا پر ایمان نہیں لاتے بلکہ خدا اور رسُول دونوں پر ایمان لاتے ہیں پھر بغیر ایمان بالرسول کے نجات کیونکر ہو سکتی ہے اور بغیر رسُول پر ایمان لانے کے صرف توحید کس کام آ سکتی ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۹)

یہ تمام آیات (آیت زیرِ تفسیر اور بعض اَور جن کا ذکر اِس جگہ کیا گیا ہے۔ ناقل) اُن لوگوں کے متعلق ہیں جنہوں نے رسُول کے وجود پر اطلاع پائی اور رسُول کی دعوت اُن کو پہنچ گئی اور جو لوگ رسُول کے وجود سے بالکل بے خبر رہے اور نہ ان کو دعوت پہنچی اُن کی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ان کے حالات کا علم خدا کو ہے اُن سے وہ وہ معاملہ کرے گا جو اس کے رحم اور انصاف کا مقتضاء ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۹ حاشیہ)

سُورۃ ق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

۱۲ رِزۡقًا لِّلۡعِبَادِ ۙ وَ اَحۡیَیۡنَا بِہٖ بَلۡدَۃً مَّیۡتًا ؕ کَذٰلِکَ الۡخُرُوۡجُ○

وَاَحۡیَیۡنَا بِہٖ بَلۡدَۃً مَّیۡتًا ؕ کَذٰلِکَ الۡخُرُوۡجُ یعنی قرآن کے ساتھ ہم نے زمینِ مُردہ کو زندہ کیا ایسا ہی حشر اجساد بھی ہوگا۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۴۲۵)

۱۶ اَفَعَیِیۡنَا بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ ؕ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ لَبۡسٍ مِّنۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ○

خدا کے افعال گوناگوں ہیں۔ خدائے تعالیٰ کی قدرت کبھی درماندہ نہیں ہوتی اور وہ نہیں تھکتا وَھُوَ بِکُلِّ خَلۡقٍ عَلِیۡمٌ[1] اَفَعَیِیۡنَا بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ۔ اُس کی شان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بے اِنتہا قدرتوں اور افعال کا کیسا ہی صاحبِ عقل اور علم کیوں نہ ہو اندازہ نہیں کر سکتا بلکہ اس کو اظہارِ عجز کرنا پڑتا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۰)

۱۷ وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ وَنَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِہٖ نَفۡسُہٗ ۚۖ وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ○

نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ۔ یعنی ہم انسان کی جان سے اُس کی رگِ جان سے بھی زیادہ ترنزدیک ہیں۔ (سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۷۶ حاشیہ)

---

[1] سورۃ یٰسٓ : ۸۰

مَیں انسان سے ایسا نزدیک ہوں کہ ایسی اس کی رگِ جان بھی نہیں۔ (شحنۂ حق صفحہ ۴۳)

ہم انسان سے اسکی رگِ جان سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔ (سَت بچن صفحہ ۱۷۶ و رسالہ معیار المذاہب صفحہ ۳۴)

ہم انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی قریب تر ہیں۔ یہ اِس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جیسا کہ حبل الورید کے خون کے نکلنے سے اِنسان کی موت ہے ایسا ہی خدا تعالیٰ سے دُور پڑنے میں انسان کی موت ہے بلکہ اس سے زیادہ تر۔ (سَت بچن صفحہ ۹۹)

ہم اس سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔ (اِسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۸۱)

اِسلام کی حقیقت یہ ہے کہ اپنی گردن خدا کے آگے قربانی کے بکرے کی طرح رکھ دینا اور اپنے تمام ارادوں سے کھوئے جانا اور خدا کے ارادہ اور رضاء میں محو ہو جانا اور خدا میں گُم ہو کر ایک موت اپنے پر وارد کر لینا اور اُسکی محبّتِ ذاتی سے پُورا رنگ حاصل کرکے محض محبّت کے جوش سے اس کی اطاعت کرنا نہ کسی اَور بناء پر اور ایسی آنکھیں حاصل کرنا جو محض خدا کے ساتھ دیکھتی ہوں اور ایسے کان حاصل کرنا جو محض اس کے ساتھ سُنتے ہوں اور ایسا دِل پَیدا کرنا جو سراسر اس کی طرف جُھکا ہُوا ہو اور ایسی زبان حاصل کرنا جو اس کے بُلائے بولتی ہو۔ یہ وہ مقام ہے جس پر تمام سلوک ختم ہو جاتے ہیں اور انسانی قویٰ اپنے ذمّہ کا تمام کام کر چکتے ہیں اور پُورے طور پر اِنسان کی نفسانیت پر موت وارد ہو جاتی ہے تب خدا تعالیٰ کی رحمت اپنے زندہ کلام اور چمکتے ہوئے نُوروں کے ساتھ دوبارہ اُس کو زندگی بخشتی ہے اور وہ خدا کے لذیذ کلام سے مشرّف ہوتا ہے اور وہ دقیق در دقیق نُور جس کو عقلیں دریافت نہیں کر سکتیں اور آنکھیں اُس کی کُنہ تک نہیں پہنچتیں وہ خود انسان کے دِل سے نزدیک ہو جاتا ہے جیسا کہ خدا فرماتا ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ یعنی ہم اُس کی شاہ رگ سے بھی زیادہ اس سے نزدیک ہیں۔

(لیکچر لاہور صفحہ ۱۴)

ہم اِنسان کی شاہ رگ سے بھی زیادہ اُس سے نزدیک ہیں۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۸۹)

ہم انسان کی رگِ جان سے بھی اس سے نزدیک تر ہیں۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۱۱)

خدا ہر جگہ حاضر ناظر ہے جیسا کہ فرماتا ہے ..... وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۰ مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

۳۶ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ○

خدا کا تجدد بے پایاں ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ خدا کے کاموں میں اِنتہاء نہیں۔ فرماتا ہے وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ یعنی زیادتی ہوتی رہے گی۔ (البدر جلد اوّل نمبر ۱۲ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۱)

۝ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝

رہی یہ بات کہ خدا نے چھ دن میں زمین و آسمان پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔ سو اوّل تو واضح ہو کہ آرام کا لفظ قرآن شریف میں کہیں نہیں لکھا ہاں توریت میں یہ لفظ ہے سو وہ کوئی استعارہ ہوگا لیکن اس دھوکہ کے دُور کرنے کے لئے اس موقع پر قرآن شریف نے ایک اَور لفظ اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ یعنی ہم نے چھ دِن میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ہم اس سے تھکے نہیں۔ یہ لفظ گویا اُس لفظ کا رَدّ ہے کہ خدا نے ساتویں دن آرام کیا کیونکہ ظاہری معنے اگر لئے جاویں تو اس سے خدا کا تھکنا ہی پایا جاتا ہے۔ وجہ یہ کہ آرام وہی کرتا ہے جو تھکتا ہے لیکن خدا تعالیٰ تھکنے سے پاک ہے کوئی نقص اس کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۲۱۴)

○

سُورۃ الذّٰریٰت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۲ تا ۵ وَالذّٰرِیٰتِ ذَرۡوًا ۙ فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا ۙ فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا ۙ فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا ۙ

ان ہَواؤں کی قسم ہے جو سمندروں اور دوسرے پانیوں سے بخارات کو ایسے جُدا کرتی ہیں جو حق جُدا کرنے کا ہے۔ پھر اُن ہواؤں کی قَسم ہے جو ان گرانبار بخارات کو حملدار عورتوں کی طرح اپنے اندر لے لیتی ہیں۔ پھر اُن ہواؤں کی قَسم ہے جو بادلوں کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لئے چلتی ہیں۔ پھر اُن فرشتوں کی قَسم ہے جو درپردہ اُن تمام امور کے منصرم اور انجام دِہ ہیں یعنی ہوائیں کیا چیز ہیں اور کیا حقیقت رکھتی ہیں جو خود بخود بخارات کو سمندروں میں سے اُٹھاویں اور بادلوں کی صورت بناویں اور عین محلِ ضرورت پر جاکر برساویں اور مقسّم امور بنیں۔ یہ تو درپردہ ملائک کا کام ہے۔ سو خدا تعالیٰ نے اِن آیات میں اوّل حکمائے ظاہر کے طور پر بادلوں کے برسنے کا سبب بتلایا اور بیان فرمایا کہ کیونکر پانی بخار ہوکر بادل اور اَبر ہو جاتا ہے اور پھر آخری فقرہ میں یعنی فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا میں حقیقت کو کھول دیا اور ظاہر کر دیا کہ کوئی ظاہر بین یہ خیال نہ کرے کہ صرف جسمانی عِلل اور معلولات کا سِلسلہ نظامِ ربّانی کے لئے کافی ہے بلکہ ایک اَور سِلسلہ عِللِ رُوحانیہ کا اِس جسمانی سِلسلہ کے نیچے ہے جس کے سہارے سے یہ ظاہری سِلسلہ جاری ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۳۵، ۱۳۶ حاشیہ)

۱۱، ۱۲ قُتِلَ الۡخَرّٰصُوۡنَ ۙ﴿۱۰﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ غَمۡرَۃٍ سَاہُوۡنَ ۙ

اللہ تعالیٰ کفار کا حال بیان کرتا ہے کہ ستیاناس ہوگیا اٹکل بازیاں کرنے والوں کا جن کے نفوس غمرہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ غمرہ دبانے والی چیز کو کہتے ہیں جو سَر اُٹھانے نہ دے۔ کھیت پر بھی غمرہ پڑتا ہے جیسے کھیتوں پر پڑتا ہے جسے کرنڈ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اٹکل بازیاں کرنے والوں کا ستیاناس ہوگیا۔ ہنوز ان کے نفوس غمرہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ مومنوں کو اِس آیت سے ایک نظیر دے کر متنبہ کیا جاتا ہے کہ جب تک غمرہ دُور نہ ہو تو علیٰ وجہ البصیرت کام نہیں ہوسکتا اور وہ اولوالابصار نہیں کہلاتے۔ قُتِلَ اِس لئے فرمایا کہ وہ رحم کی جگہ ہے گویا وہ فاعل بھی خود ہی ہیں۔ اپنے آپ کو خود ہلاک کیا۔ بعض آدمیوں میں خرّاص ہونے کا مادہ ہوتا ہے۔ وہ بصیرت اور دُور اندیشی سے کام نہیں لیتے بلکہ ظنونِ فاسدہ اور اٹکلوں سے کام لیتے ہیں اور وہ اسی میں اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ میری غرض یہ تھی کہ حصّہ اخلاق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل نمونہ پیش کروں جو ایک فردِ اکمل تھے زاں بعد متفرق طور پر آپ کے اخلاق سے حصہ لیا گیا۔ کسی نے ایک لیا اور دوسرے نے کوئی اَور اور ایک کو دوسرے میں غمرہ ہوگیا۔ جس طرح کسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس غمرہ کو دُور کرے ورنہ اُس کا نتیجہ دوسرے پَودوں پر اچھا نہیں ہوگا اسی طرح پر ایک اِنسان کو ضروری ہے کہ وہ اپنے اندرونی غمرہ کو دُور کرے ورنہ اندیشہ ہے کہ دوسری صفاتِ حسنہ کو بھی نہ بیٹھے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۵۴، ۱۵۵)

۲۰ وَفِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ۝

جب روٹی کھاؤ تو سائل کو بھی دے دو اور کُتّے کو بھی ڈال دیا کرو اور دوسرے پرند وغیرہ کو بھی۔
(اِسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۲۳)

ان کے مالوں میں سوالیوں اور بے زبانوں کا حق بھی ہے۔ بے زبانوں سے مراد کُتّے، بلّیاں، چڑیاں، بَیل، گدھے، بکریاں اور دوسری چیزیں ہیں۔ (اِسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۴۳)

۲۲ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ۝

کیا تم اپنی جانوں میں غور نہیں کرتے۔ اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اِنسانی رُوح میں بڑے بڑے عجیب و غریب خواص اور تغیرات رکھے گئے ہیں کہ وہ اجسام میں نہیں اور رُوحوں پر غور کرکے جلد تر انسان اپنے رَبّ کی شناخت کرسکتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں بھی ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ یعنی جس نے اپنے نفس کو شناخت کرلیا اُس نے اپنے رَبّ کو شناخت کرلیا۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۱۵۸)

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ۝ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ ۝ (الذاریات)

تمہارا رزق آسمان میں ہے ہمیں اپنی ذات کی قسم ہے یہ سچ ہے۔ زمین پر خدا کے سوا کون ہے جو اس رزق کو بند کر سکے یا کھول سکے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۷؍نومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۴)

خدا تعالیٰ ..... ہرگز پسند نہیں کرتا کہ جائیداد اور اُور اسباب و احباب پر اس قدر بھروسہ کیا جاوے کہ خدا تعالیٰ سے بکلی دُور جا پڑے۔ یہ خطرناک شرک ہے جو قرآن شریف کی تعلیم کے صریح خلاف ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۷ مورخہ ۳۱؍جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

وہ اِنسان بدقسمت ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کے وعدوں پر ایمان لاکر وفاداری اور صبر کے ساتھ اُن کا انتظار نہیں کرتا اور شیطان کے وعدوں کو یقینی سمجھ بیٹھتا ہے اِس لئے کبھی بے دِل نہ ہو جاؤ اور تنگی اور عُسر کی حالت میں گھبراؤ نہیں خدا تعالیٰ خود رزق کے معاملہ میں فرماتا ہے وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۴؍مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

قبض بسط رزق کا سِرّ ایسا ہے کہ اِنسان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک طرف تو مومنوں سے اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں وعدے کئے ہیں مَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ[1] یعنی جو اللہ تعالیٰ پر توکّل کرتا ہے اُس کے لئے اللہ کافی ہے۔ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ[2] جو اللہ تعالیٰ کے لئے تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے کہ اُس کو معلوم بھی نہیں ہوتا اور پھر فرماتا ہے وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ اور پھر اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی قسم کھاتا ہے کہ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ آسمان اور زمین کے رَبّ کی قسم ہے کہ یہ وعدہ سچ ہے جیسا کہ تم اپنی زبان سے بول کر انکار نہیں کر سکتے جبکہ اس قسم کے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں۔ پھر باوجود ان وعدوں کے دیکھا جاتا ہے کہ کئی آدمی ایسے دیکھے جاتے ہیں جو صالح اور متقی اور نیک بخت ہوتے ہیں اور ان کا شعارِ اسلام صحیح ہوتا ہے مگر وہ رزق سے تنگ ہیں۔ رات کو ہے تو دِن کو نہیں اور دِن کو ہے تو رات کو نہیں..... غرض یہ دیکھا جاتا ہے کہ اِس قسم کے واقعات ہوتے ہیں مگر تجربہ دلالت کرتا ہے کہ یہ امور خدا کی طرف منسوب نہیں ہو سکتے۔ ہمارا یہ مذہب ہے کہ وہ وعدے جو خدا تعالیٰ

---

[1] سورۃ الطّلاق: ۴ [2] سورۃ الطّلاق: ۳، ۴

نے کئے ہیں کہ متقیوں کو خود اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اِن آیتوں میں بیان کیا ہے یہ سب سچ ہیں اور سلسلہ اہل اللہ کی طرف دیکھا جاوے تو کوئی ابرار میں سے ایسا نہیں ہے کہ بھوکا مرا ہو۔ مومنوں نے جن پر شہادت دی اور جن کو اتقیاء مان لیا گیا ہے یہی نہیں کہ وہ فقر و فاقہ سے بچے ہوئے تھے گو اعلیٰ درجہ کی خوشحالیاں نہ ہوں مگر اِس قسم کا اضطراری فقر و فاقہ کبھی نہیں ہُوا کہ عذاب محسوس کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر اختیار کیا ہُوا تھا مگر آپؐ کی سخاوت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود آپؐ نے اختیار کیا ہُوا تھا نہ کہ بطور سزا تھا۔ غرض اس راہ میں بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں۔ بعض لوگ ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ بظاہر متقی اور صالح ہوتے ہیں مگر رزق سے تنگ ہوتے ہیں اِن سب حالات کو دیکھ کر آخر یہی کہنا پڑتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے وعدے تو سچے ہیں لیکن اِنسانی کمزوری ہی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ مٹ۳ مورخہ ۲۴ر اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

جو کچھ تم کو وعدہ دیا گیا ہے اور تمہارا رزق آسمان پر ہے۔

(البدر جلد ۲ مٹا۱ مورخہ ۱۰ر اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۲)

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ سے ایک نادان دھوکا کھاتا ہے اور تدابیر کے سلسلہ کو باطل کرتا ہے حالانکہ سُورہ جمعہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ[1] کہ تم زمین میں منتشر ہو جاؤ اور خدا کے فضل کی تلاش کرو۔ یہ ایک بہت ہی نازک معاملہ ہے کہ ایک طرف تدابیر کی رعایت ہو اور دوسری طرف توکّل بھی پُورا ہو۔ اِس کے اندر شیطان کو وساوس کا بڑا موقع ملتا ہے (بعض لوگ ٹھوکر کھا کر اسباب پرست ہو جاتے ہیں اور بعض خدا تعالیٰ کی عطا کردہ قویٰ کو بیکار محض خیال کرنے لگ جاتے ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب جنگ کو جاتے تو تیاری کرتے گھوڑے ہتھیار بھی ساتھ لیتے بلکہ بعض اَوقات دو دو زرہ پہن کر جاتے تلوار بھی کمر سے لٹکاتے حالانکہ اِدھر خدا تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ[2] بلکہ ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تجویز فرمایا کہ اگر شکست ہو تو آپؐ کو جلد مدینہ پہنچا دیا جاوے۔ اصل بات یہ ہے کہ قوی الایمان کی نظر استغناءِ الٰہی پر ہوتی ہے اور اُسے خوف ہوتا ہے کہ خدا کے وعدوں میں کوئی ایسی مخفی شرط نہ ہو جس کا اُسے علم نہ ہو۔ جو لوگ تدابیر کے سلسلہ کو بالکل باطل ٹھہراتے ہیں ان میں ایک زہریلا مادہ ہوتا ہے۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر بَلا آوے تو دیدہ دانستہ اس کے آگے جا پڑیں اور جس قدر پیشہ والے اور اہلِ حرفت ہیں وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاویں۔ (البدر جلد ۳ مٹلا مورخہ ۱۶ر مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

فرمایا ہے کہ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ جس کا مطلب یہی ہے کہ رزق تمہارا تمہاری اپنی محنتوں اور کوششوں اور

---

[1] سورۃ الجمعۃ : ۱۱ [2] سورۃ المائدۃ : ۶۸

منصوبوں سے وابستہ نہیں وہ اس سے بالاتر ہے۔ (البدر جلد ۳ ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

میرے نزدیک سب سے بڑے مُشرک کیمیاگر ہیں کہ یہ رزق کی تلاش میں یُوں مارے مارے پھرتے ہیں اور ان اسباب سے کام نہیں لیتے جو اللہ تعالیٰ نے جائز طور سے رزق کے حصول کے لئے مقرر کئے ہیں اور نہ پھر توکل کرتے ہیں حالانکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (اور آسمان میں ہے تمہارا رزق اور جو کچھ تم وعدہ دئے جاتے ہو)۔ (بدر جلد ۶ ۱۷ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اگر ہمارے پاس کبھی کچھ ہو تو دوسرے دن سب خرچ ہو جاتا ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے جماعت کا ہوتا ہے اور وہ بھی لنگر خانہ میں خرچ ہو جاتا ہے بعض اوقات کچھ بھی نہیں رہتا اور ہمیں غم پیدا ہوتا ہے تب خدا تعالیٰ کہیں سے بھیج دیتا ہے۔ اکثر لوگ خدا تعالیٰ کی پوری پوری قدر نہیں سمجھتے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ[1] خدا تعالیٰ تو فرماتا ہے وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ۔ (الحکم جلد ۱۱ ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

ہر ایک اِنسان کو خدا تعالیٰ اپنے پاس سے روزی دیتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ ۲۰ مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

۵۱ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۵۱

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ سو تم خدا تعالیٰ کی طرف بھاگو۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۵)

۵۳، ۵۴ كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝۵۳ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝۵۴

اِسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے پاس کوئی ایسا رسول نہیں آیا جس کو انہوں نے ساحر یا مجنون نہیں کہا۔ کیا انہوں نے ایک دوسرے کو وصیت کر رکھی تھی نہیں بلکہ یہ قوم ہی طاغی ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۱۹ حاشیہ)

۵۷ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۷

مَیں نے جن و انس کو اِس لئے پیدا کیا ہے کہ میری پرستش کریں۔ یہ بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ پرستش الٰہی

---

[1] سورۃ الانعام: ۹۲

ایک فطرتی امر ہے۔ پس جب توحید الٰہی اور پرستش الٰہی سب بنی آدم کے لئے فطرتی امر ہوُا اور کوئی آدمی سرکشی اور بے ایمانی کے لئے پَیدا نہ کیا گیا تو پھر جو امور برخلافِ خدا دانی و خداترسی ہیں کیونکر فطرتی امر ہو سکتے ہیں۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۱۷۲ حاشیہ)

مَیں نے جِنّ اور انسان کو اِسی لئے پَیدا کیا ہے کہ وہ مجھے پہچانیں اور میری پرستش کریں۔ پس اِس آیت کی رُو سے اصل مدعا انسان کی زندگی کا خدا تعالیٰ کی پرستش اور خدا تعالیٰ کی معرفت اور خدا تعالیٰ کے لئے ہو جانا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان کو تو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہے کہ اپنی زندگی کا مدعا اپنے اختیار سے آپ مقرر کرے کیونکہ انسان نہ اپنی مرضی سے آتا ہے اور نہ اپنی مرضی سے واپس جائے گا بلکہ وہ ایک مخلوق ہے اور جس نے پَیدا کیا اور تمام حیوانات کی نسبت عمدہ اور اعلیٰ قویٰ اس کو عنایت کئے اُسی نے اس کی زندگی کا ایک مدعا ٹھہرا رکھا ہے خواہ کوئی انسان اس مدعا کو سمجھے یا نہ سمجھے مگر انسان کی پَیدائش کا مدعا بلاشُبہ خدا کی پرستش اور خدا تعالیٰ کی معرفت اور خدا تعالیٰ میں فانی ہو جانا ہی ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۰۰)

خدا انسان کا خالق ہے اِس لئے زبان کا معلّم بھی وہی ہے اور اس جھگڑے کے فیصلے کے لئے کہ وہ کس زبان کا معلّم ہے ابھی ہم لکھ چکے ہیں کہ اس کی طرف سے وہی زبان ہے جو بموجب منطوق وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ اُسی طرح معرفتِ الٰہی کی خادم ہو سکتی ہے جیسا کہ انسان کے وجود کی دوسری بناوٹ۔

(منن الرحمٰن صفحہ ۲ حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۸)

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ یعنی جِنّ و انس کی پَیدائش اور ان کی تمام قوٰی کا مَیں ہی مقصود ہوں۔ وہ اِسی لئے مَیں نے پَیدا کئے ہیں کہ تا مجھے پہچانیں اور میری عبادت کریں سو اُس نے اِس آیت میں اشارہ کیا کہ جِنّ و اِنس کی خلقت میں اس کی طلب و معرفت اور اطاعت کا مادہ رکھا گیا ہے اگر انسان میں یہ مادہ نہ ہوتا تو نہ دُنیا میں ہَوا پرستی ہوتی نہ بُت پرستی نہ اِنسان پرستی کیونکہ ہر ایک خطا صواب کی تلاش میں پَیدا ہوُا ہے۔

(منن الرحمٰن صفحہ ۸، ۹ حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۸)

مَیں نے پرستش کے لئے ہی جِنّ و اِنس کو پَیدا کیا ہے۔ ہاں یہ پرستش اور حضرتِ عزّت کے سامنے دائمی حضور کے ساتھ کھڑا ہونا بجز محبّتِ ذاتیہ کے ممکن نہیں اور محبّت سے مراد یک طرفہ محبّت نہیں بلکہ خالق اور مخلوق کی دونوں محبّتیں مراد ہیں تا بجلی کی آگ کی طرح جو مرنے والے اِنسان پر گرتی ہے اور جو اس وقت اس انسان کے اندر سے نکلتی ہے بشریّت کی کمزوریوں کو جلا دیں اور دونوں مِل کر تمام رُوحانی وجود پر قبضہ کرلیں۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۵۹)

چونکہ انسان فطرتاً خدا ہی کے لئے پَیدا ہوُا ہے جیسا کہ فرمایا مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ اِس لئے

خدائے تعالیٰ نے اس کی فطرت ہی میں اپنے لئے کچھ نہ کچھ رکھا ہؤا ہے اور اپنے پوشیدہ اور مخفی در مخفی اسباب سے اُسے اپنے لئے بنایا ہؤا ہے۔ پس جب اِنسان جھوٹی اور نمائشی، ہاں عارضی اور رنج پر ختم ہونے والی محبتوں سے الگ ہو جاتا ہے پھر وہ خدا ہی کے لئے ہو جاتا ہے اور طبعاً کوئی بُعد نہیں رہتا اور خدا کی طرف دَوڑا چلا آتا ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۳۷)

اب اِنسان جب کہ عبادت ہی کے لئے پَیدا ہؤا ہے ضروری ہے کہ عبادت میں لذت اور سرور بھی درجہ غایت کا رکھا ہو۔ اِس بات کو ہم اپنے روزمرہ کے مشاہدہ اور تجربہ سے خوب سمجھ سکتے ہیں مثلاً دیکھو اناج اور تمام خوردنی اور نوشیدنی اشیاء اِنسان کے لئے پَیدا ہوئی ہیں تو کیا اُن سے وہ ایک لذت اور حظ نہیں پاتا ہے؟ کیا اس ذائقہ، مزے اور احساس کے لئے اُس کے مُنہ میں زبان موجود نہیں۔ کیا وہ خوبصورت اشیاء دیکھ کر نباتات ہو یا جمادات، حیوانات ہوں یا اِنسان حظ نہیں پاتا۔ کیا دِل خوش کُن اور سُریلی آوازوں سے اُس کے کان محظوظ نہیں ہوتے؟ پھر کیا کوئی دلیل اَور بھی اِس امر کے اثبات کے لئے مطلوب ہے کہ عبادت میں لذت نہ ہو۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۲، ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ صفحہ ۱۴۱)

چونکہ انسان فطرتاً خدا ہی کے لئے پَیدا ہؤا جیسا کہ فرمایا مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اُس کی فطرت ہی میں اپنے لئے کچھ نہ کچھ رکھا ہؤا ہے اور مخفی در مخفی اسباب سے اُسے اپنے لئے بنایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمہاری پَیدائش کی اصلی غرض یہ رکھی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو مگر جو لوگ اپنی اس اصلی اور فطری غرض کو چھوڑ کر حیوانوں کی طرح زندگی کی غرض صرف کھانا پینا اور سو رہنا سمجھتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کے فضل سے دُور جا پڑتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی ذمہ داری اُن کے لئے نہیں رہتی۔ وہ زندگی جو ذمہ داری کی ہے یہی ہے کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ پر ایمان لا کر زندگی کا پہلو بدل لے۔ موت کا اعتبار نہیں ہے ..... تم اِس بات کو سمجھ لو کہ تمہارے پیدا کرنے سے خدا تعالیٰ کی غرض یہ ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے لئے بن جاؤ۔ دُنیا تمہاری مقصود بالذات نہ ہو۔ مَیں اِس لئے بار بار اِس امر کو بیان کرتا ہوں کہ میرے نزدیک یہی ایک بات ہے جس کے لئے اِنسان آیا ہے اور یہی بات ہے جس سے وہ دُور پڑا ہؤا ہے مَیں یہ نہیں کہتا کہ تم دُنیا کے کاروبار چھوڑ دو۔ بیوی بچوں سے الگ ہو کر کسی جنگل یا پہاڑ میں جا بیٹھو۔ اسلام اِس کو جائز نہیں رکھتا اور رہبانیت اِسلام کا منشا نہیں اِسلام تو انسان کو چُست، ہوشیار اور مُستعد بنانا چاہتا ہے اِس لئے مَیں تو کہتا ہوں کہ تم اپنے کاروبار کو جدّوجُہد سے کرو۔ حدیث میں آیا ہے کہ جس کے پاس زمین ہو وہ اس کا تردّد نہ کرے تو اس سے مواخذہ ہوگا۔ پس اگر کوئی اس سے یہ مراد لے کہ دُنیا کے کاروبار سے الگ ہو جاوے وہ غلطی کرتا ہے نہیں اصل بات یہ ہے کہ یہ سب کاروبار جو تم کرتے ہو اس میں دیکھ لو کہ خدا تعالیٰ کی رضا مقصود ہو اور اس کے ارادہ سے باہر نکل کر

اپنی اغراض اور جذبات کو مقدم نہ کرنا۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ر اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

اِنسان کی پیدائش کی علّتِ غائی یہی عبادت ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ عبادت اصل میں اس کو کہتے ہیں کہ اِنسان ہر قسم کی قساوت، کجی کو دُور کرکے دِل کی زمین کو ایسا صاف بنائے جیسے زمیندار زمین کو صاف کرتا ہے۔عرب کہتے ہیں مَوْرٌ مُعَبَّدٌ جیسے سُرمہ کو باریک کرکے آنکھوں میں ڈالنے کے قابل بنالیتے ہیں اسی طرح جب دِل کی زمین میں کوئی کنکر، پتھر، ناہمواری نہ رہے اور ایسی صاف ہو کہ گویا رُوح ہی رُوح ہو اس کا نام عبادت ہے۔چنانچہ اگر یہ درستی اور صفائی آئینہ کی کی جاوے تو اُس میں شکل نظر آجاتی ہے اور اگر زمین کی کی جاوے تو اس میں انواع واقسام کے پھل پیدا ہوجاتے ہیں۔پس انسان جو عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اگر دل صاف کرے اور اس میں کسی قسم کی کجی اور ناہمواری، کنکر، پتھر نہ رہنے دے تو اس میں خدا نظر آئے گا۔میں پھر کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے درخت اس میں پیدا ہوکر نشوونما پائیں گے اور وہ اثمار شیریں وطیب ان میں لگیں گے جو اُكُلُهَا دَآئِمٌ کے مصداق ہوں گے۔یاد رکھو کہ یہ وہی مقام ہے جہاں صوفیوں کے سلوک کا خاتمہ ہے جب سالک یہاں پہنچتا ہے تو خدا ہی خدا کا جلوہ دیکھتا ہے اس کا دِل عرشِ الٰہی بنتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر نزول فرماتا ہے سلوک کی تمام منزلیں یہاں آکر ختم ہوجاتی ہیں کہ اِنسان کی حالتِ تعبّد درست ہو جس میں رُوحانی باغ لگ جاتے ہیں اور آئینہ کی طرح خدا نظر آتا ہے۔اس مقام پر پہنچ کر اِنسان دُنیا میں جنّت کا نمونہ پاتا ہے اور یہاں ہی هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا[1] کہنے کا حظ اور لُطف اُٹھاتا ہے۔غرض حالتِ تعبّد کی درستی کا نام عبادت ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ر جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

خدا تعالیٰ نے اِنسان کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے جیسا کہ فرمایا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ اب اگر انسان خود مومن اور عبد نہیں بنتا ہے اور اپنی زندگی کے اصل منشاء کو پُورا نہیں کرتا ہے اور پورا حقِ عبادت ادا نہیں کرتا بلکہ فسق وفجور میں زندگی بسر کرتا ہے اور گناہ پر گناہ کرتا ہے تو ایسے آدمی کی اولاد کیلئے خواہش کیا نتیجہ رکھے گی صرف یہی کہ گناہ کرنے کے لئے وہ اپنا ایک اَور خلیفہ چھوڑنا چاہتا ہے۔خود کونسی کمی کی ہے جو اولاد کی خواہش کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳۵ مورخہ ۲۴ر ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۰)

قرآن شریف میں انسان کی زندگی کا مقصد یہ بتایا گیا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ یعنی جن اور انسان کو اِس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔جب اِنسان کی پیدائش کی علّتِ غائی یہی ہے تو پھر چاہیئے کہ خدا کو شناخت کریں جبکہ انسان کی پیدائش کی علّتِ غائی یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت کرے اور عبادت کے واسطے

---

[1] سورۃ البقرہ: ۲۶

تب معرفت کا ہونا ضروری ہے جب سچی معرفت ہوجاوے تب وہ اس کی خلافِ مرضی کو ترک کرتا ہے اور سچا مسلمان ہوجاتا ہے جب تک سچا علم پیدا نہ ہو کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔

(الحکم جلد ۷ ۷ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۵، ۶)

خدا تعالیٰ نے انسان کے سلسلہ پیدائش کی علتِ غائی صرف اپنی عبادت رکھی ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. پس حصر کر دیا ہے کہ صرف صرف عبادتِ الٰہی مقصد ہونا چاہیئے اور صرف اسی غرض کے لئے یہ سارا کارخانہ بنایا گیا ہے برخلاف اس کے اَور ہی اَور ارادے اور اَور ہی اَور خواہشات ہیں۔

(الحکم جلد ۷ ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

جب خدا تعالیٰ کا ارادہ انسانی خلقت سے صرف عبادت ہے تو مومن کی شان نہیں کہ کسی دوسری چیز کو عین مقصود بنالے حقوقِ نفس تو جائز ہیں مگر نفس کی بے اعتدالیاں جائز نہیں حقوقِ نفس بھی اس لئے جائز ہیں کہ تا وہ درماندہ ہوکر رہ ہی نہ جائے۔ تم بھی ان چیزوں کو اسی واسطے کام میں لاؤ۔ ان سے کام اس واسطے لو کہ یہ تمہیں عبادت کے لائق بنائے رکھیں نہ اس لئے کہ وہی تمہارا مقصود اصلی ہوں۔ (الحکم جلد ۷ ۱۲ مورخہ ۳۱۔ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

عاجزی اختیار کرنی چاہیئے۔ عاجزی کا سیکھنا مشکل نہیں ہے۔ اس کا سیکھنا ہی کیا ہے انسان تو خود ہی عاجز ہے اور وہ عاجزی کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. تکبر وغیرہ سب بناوٹی چیزیں ہیں اگر وہ اس بناوٹ کو اُتار دے تو پھر اس کی فطرت میں عاجزی ہی نظر آوے گی۔

(البدر جلد ۲ ۱۴ مورخہ ۲۴۔ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۹)

ایک بدکار آدمی کو بھی نیک خواب آجاتی ہے کیونکہ فطرتاً کوئی بد نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. تو جب عبادت کے واسطے سب کو پیدا کیا ہے سب کی فطرت میں نیکی بھی رکھی ہے اور خواب نبوت کا حصہ بھی ہے اگر یہ نمونہ ہر ایک کو نہ دیا جاتا تو پھر نبوت کے مفہوم کو سمجھنا تکلیف مالایطاق ہوجاتا اگر کسی کو علمِ غیب بتلایا جاتا وہ ہرگز نہ سمجھ سکتا۔ (البدر جلد ۲ ۱۸ مورخہ ۵ ارمئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲۹)

یہ زمانہ ایسا آگیا ہے کہ انسان کی ہستی کی غرض وغایت کو بالکل بھلا دیا گیا ہے خود خدا تعالیٰ انسانی خلقت کی غرض تو یہ بتاتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ مگر آج عبودیت سے نکل کر نادان انسان خود خدا بننا چاہتا ہے اور وہ صدق ووفا، راستی اور تقویٰ جس کو خدا چاہتا ہے مفقود ہے۔ بازار میں کھڑے ہوکر اگر نظر کی جاوے تو صدہا آدمی اِدھر سے آتے اور اُدھر چلے جاتے ہیں لیکن ان کی غرض اور مقصد محض دُنیا ہے۔

(الحکم جلد ۸ ۸ مورخہ ۱۰۔ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۹)

بے محل استعمال سے حلال بھی حرام ہوجاتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ سے ظاہر ہے

کہ انسان صرف عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے پس اِس مقصد کو پُورا کرنے کے لئے جس قدر چیز اُسے درکار ہے اگر اس سے زیادہ لیتا ہے تو گو وہ شئے حلال ہی ہو مگر فضول ہونے کی وجہ سے اس کے لئے حرام ہو جاتی ہے۔ جو انسان رات دن نفسانی لذات میں مصروف ہے وہ عبادت کا کیا حق ادا کر سکتا ہے۔ مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک تلخ زندگی بسر کرے لیکن عیش و عشرت میں بسر کرنے سے تو وہ اس زندگی کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ (البدر جلد ۳ ۲۶ مورخہ ۸ر جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

اصل غرض انسان کی خلقت کی یہ ہے کہ وہ اپنے رَبّ کو پہچانے اور اس کی فرمانبرداری کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ میں نے جنّ اور اِنس کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں مگر افسوس کی بات ہے کہ اکثر لوگ جو دُنیا میں آتے ہیں بالغ ہونے کے بعد بجائے اِس کے کہ اپنے فرض کو سمجھیں اور اپنی زندگی کی غرض اور غایت کو مدِّنظر رکھیں وہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر دُنیا کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور دُنیا کا مال اور اس کی عزتوں کے ایسے دلدادہ ہوتے ہیں کہ خدا کا حصہ بہت ہی تھوڑا ہوتا ہے اور بہت لوگوں کے دِل میں تو ہوتا ہی نہیں وہ دُنیا ہی میں مُنہمک اور فنا ہو جاتے ہیں۔ انہیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ خدا بھی کوئی ہے ہاں اس وقت پتہ لگتا ہے جب قابضِ اَرواح آکر جان نکال لیتا ہے۔

(الحکم جلد ۸ ۳۲ مورخہ ۲۴ر ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

خدا تعالیٰ نے اِنسان کو اِس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی معرفت اور قُرب حاصل کرے۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ جو اِس اصل غرض کو مدِّنظر نہیں رکھتا اور رات دِن دُنیا کے حصول کی فکر میں ڈوبا ہُوا ہے کہ فلاں زمین خرید لوں، فلاں مکان بنا لوں، فلاں جائیداد پر قبضہ ہو جاوے تو ایسے شخص سے سوائے اِس کے کہ خدا تعالیٰ کچھ دن مُہلت دے کر واپس بُلا لے اَور کیا سلوک کیا جاوے۔ اِنسان کے دِل میں خدا کے قُرب کے حصول کا ایک درد ہونا چاہیئے جس کی وجہ سے اس کے نزدیک وہ قابلِ قدر شئے ہو جائے گا اگر یہ دَرد اس کے دِل میں نہیں ہے اور صرف دُنیا اور اس کے مافیہا کا ہی دَرد ہے تو آخری تھوڑی سی مُہلت پا کر وہ ہلاک ہو جائے گا۔ (البدر جلد ۴ ۳ مورخہ ۲۰ر جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

خدا تعالیٰ نے اِنسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے جب کہ اس نے فرمایا مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ پھر جب اِنسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ تاریکی ہی میں پڑا رہے ایسے زمانے میں بالطبع اس کی ذات جوش مارتی ہے کہ کوئی مصلح پیدا ہو۔

(الحکم جلد ۱۰ ۲۷ مورخہ ۳۱ر جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

اِنسان کی پیدائش کی اصل غرض بھی یہی ہے کہ وہ نماز کی حقیقت سیکھے جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ

وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

تمام جنّ اور انسان صرف اِسی واسطے پَیدا کئے گئے تھے کہ وہ خدا تعالیٰ کی معرفت میں ترقی کرتے اور اللہ اور اس کے رسول کے حکموں پر چلتے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

مَیں نے جِن اور اِنس کو پرستش دائمی کے لئے پَیدا کیا ہے۔

(مکتوباتِ احمدیہ جلد اوّل صفحہ ۴، مکتوب نمبر ۴۳)

سُورۃ الطُّور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

آیت ۱۹ فٰکِہِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰہُمۡ رَبُّہُمۡ ۚ وَ وَقٰہُمۡ رَبُّہُمۡ عَذَابَ الۡجَحِیۡمِ۝

وَوَقٰھُمۡ رَبُّھُمۡ عَذَابَ الۡجَحِیۡمِ خدا ان کو جہنم کے آگ سے بچائے گا۔ اِس میں بھید یہ ہے کہ مومن متقی کا مرنا چارپایوں اور وحشیوں کی طرح نہیں ہوتا بلکہ مومن خدا کے لئے ہی جیتے ہیں اور خدا کے لئے مرتے ہیں اِسلئے جو چیزیں وہ خدا کے لئے کھوتے ہیں وہ اُن کو واپس دی جاتی ہیں جیسا کہ امام المؤمنین سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اللہ جلشانہٗ نے فرمایا قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ[1] یعنی کہہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا مرنا اور میرا جینا سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۵)

آیت ۳۰ فَذَکِّرۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَتِ رَبِّکَ بِکَاہِنٍ وَّ لَا مَجۡنُوۡنٍ۝

سو انہیں تُو حق کا راستہ یاد دلاتا رہ اور خدا کے فضل سے نہ تُو کاہن ہے اور نہ تجھے کسی جن کا آسیب اُو دیوانگی ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۷۹ حاشیہ)

آیت ۳۶ تا ۳۸ اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَیۡرِ شَیۡءٍ اَمۡ ہُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ۝ اَمۡ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ ۚ بَلۡ لَّا یُوۡقِنُوۡنَ۝ اَمۡ عِنۡدَہُمۡ خَزَآئِنُ رَبِّکَ اَمۡ

---

[1] سورۃ الانعام: ۱۶۳

هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ۝

کیا یہ لوگ جو خالقیتِ خدائے تعالیٰ سے منکر ہیں بغیر پَیدا کرنے کسی خالق کے یُونہی پَیدا ہوگئے یا اپنے وجود کو آپ ہی پَیدا کر لیا یا خود علت العِلل ہیں جنہوں نے زمین و آسمان پَیدا کیا یا اُن کے پاس غیر متناہی خزانے عِلم اور عقل کے ہیں جن سے انہوں نے معلوم کیا کہ ہم قدیم الوجود ہیں یا وہ آزاد ہیں اور کسی کے قبضۂ قدرت میں مقہور نہیں ہیں تا یہ گمان ہو کہ جبکہ اُن پر کوئی غالب اور قہار ہی نہیں تو وہ اُن کا خالق کیسے ہو۔ اِس آیت شریف میں یہ اِستدلال لطیف ہے کہ ہر پنج شقوق قدامت اَرواح کو اس طرزِ مدلّل سے بیان فرمایا ہے کہ ہر ایک شق کے بیان سے ابطال اس شق کا فی الفور سمجھا جاتا ہے اور تفصیل ان اشاراتِ لطیفہ کی یُوں ہے کہ شق اوّل یعنی ایک شئے معدوم کا بغیرِ فعل کسی فاعل کے خود بخود پَیدا ہو جانا اِس طرح پر باطل ہے کہ اس سے ترجیح بلا مرجّح لازم آتی ہے کیونکہ عدم سے وجود کا لباس پہننا ایک مؤثر مرجّح کو چاہتا ہے جو جانبِ وجود کو جانبِ عدم پر ترجیح دے لیکن اِس جگہ کوئی مؤثر مرجّح موجود نہیں اور بغیر وجود مرجّح کے خود بخود ترجیح پَیدا ہو جانا محال ہے۔

اور شق دوم یعنی اپنے وجود کا آپ ہی خالق ہونا اِس طرح پر باطل ہے کہ اس سے تقدّم شئے کا اپنے نفس پر لازم آتا ہے کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ہر ایک شئے کے وجود کی علّتِ موجبہ اُس شئے کا نفس ہے تو بالضرورت یہ اقرار اِس اقرار کو مُستلزم ہوگا کہ وہ سب اشیاء اپنے وجود سے پہلے موجود تھیں اور وجود سے پہلے موجود ہونا محال ہے۔

اور شق سوم یعنی ہر ایک شئے کا مثل ذاتِ باری کے علّت العِلل اور صَانع عالَم ہونا تعدّد خداؤں کو مُستلزم ہے اور تعدّد خداؤں کا باتفاق محال ہے اور نیز اس سے دور یا تسلسل لازم آتا ہے اور وہ بھی محال ہے۔

اور شق چہارم یعنی محیط ہونا نفسِ انسان کا علومِ غیر متناہی پر اس دلیل سے محال ہے کہ نفسِ انسانی باعتبار تعین تشخص خارجی کے متناہی ہے اور متناہی میں غیر متناہی سما نہیں سکتا اس سے تحدید غیر محدود کی لازم آتی ہے۔

اور شق پنجم یعنی خود مختار ہونا اور کسی کے حکم کے ماتحت نہ ہونا ممتنع الوجود ہے کیونکہ نفسِ انسان کا بالضرورت استکمال ذات اپنی کے ایک مکمّل کا محتاج ہے اور محتاج کا خود مختار ہونا محال ہے اس سے اجتماع نقیضین لازم آتا ہے۔ پس جبکہ بغیر ذریعۂ خالق کے موجود ہونا موجودات کا بہرصورت ممتنع اور محال ہوُا تو بالضرورت یہی ماننا پڑا کہ تمام اشیاء موجودہ محدودہ کا ایک خالق ہے جو ذاتِ باری تعالیٰ ہے اور شکل اس قیاس کی جو ترتیب مقدّمات صغریٰ کبریٰ سے بقاعدہ منطقیہ مرتّب ہوتی ہے اِس طرح پر ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ یہ قضیہ فی نفسہٖ صادق ہے کہ کوئی شئے بجُز ذریعہ واجب الوجود کے موجود نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر صادق نہیں ہے تو پھر اس کی نقیض صادق ہو گی کہ ہر ایک شئے بجُز

ذریعہ واجب الوجود کے وجود پکڑ سکتی ہے اور یہ دوسرا قضیہ ہماری تحقیقات مندرجہ بالا میں ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ وجود تمام اشیاء ممکنہ کا بغیر ذریعہ واجب الوجود کے محالاتِ خمسہ کو مُستلزم ہے۔ پس اگر یہ قضیہ صحیح نہیں ہے کہ کوئی شئے بجز ذریعہ واجب الوجود کے موجود نہیں ہو سکتی تو یہ قضیہ صحیح ہوگا کہ وجود تمام اشیاء کو محالاتِ خمسہ لازم ہیں لیکن وجود اشیاء کا باوصف لزوم محالاتِ خمسہ کے ایک امرِ محال ہے پس نتیجہ نکلا کہ کسی شئے کا بغیر واجب الوجود کے موجود ہونا امرِ محال ہے اور یہی مطلوب تھا۔ (پرانی تحریریں صفحہ ۷ تا ۹)

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۝

اور اپنے خداوند کے حکم پر صبر کر اور صبر سے اس کے وعدوں کا انتظار کر تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۶ حاشیہ)

سورۃ النجم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ○ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ○ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ○ ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ○

قسم ہے تارے کی جب طلوع کرے یا گرے کہ تمہارا صاحب بے راہ نہیں ہؤا اور نہ بہک گیا اور وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا بلکہ اُس کی ہر یک کلام تو وحی ہے جو نازل ہو رہی ہے جس کو سخت قوت والے یعنی جبرائیل نے سکھلایا ہے۔ وہ صاحبِ قوت اُس کو پُورے طور پر نظر آیا اور وہ کنارۂ بلند پر تھا۔

اِس قسم کھانے سے مدّعا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا امر کہ کفار کی نظر میں ایک نظری امر ہے۔ ان کے ان مسلّمات کی رُو سے ثابت کر کے دکھلایا جاوے جو ان کی نظر میں بدیہی کا حکم رکھتے تھے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۰۳ حاشیہ)

جہاں تک پتہ لگ سکتا ہے مفسرین یہی لکھتے ہیں کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ سے پہلے بہت ستارے ٹوٹے تھے اور یہاں بھی شاید ۱۸۸۵ء میں ہمارے دعوٰی سے پہلے بہت سے ستارے ٹوٹے تھے۔ ایک لشکر کا لشکر اِس طرف سے اُس طرف چلا جاتا تھا اور اُس طرف سے اِس طرف چلا آتا تھا۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى کا بھی یہی مطلب ہے۔ جب کبھی خدا تعالیٰ کا کوئی نشان زمین پر ظاہر ہونے والا ہوتا ہے

تو اس سے پہلے آسمان پر کچھ آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے مفسر اور اہلِ کشف بھی یہی بیان کرتے ہیں اور قرآن شریف میں بھی یہی لکھا ہے۔ مجھے ایک خط آیا تھا کہ "ایک ستارہ ٹوٹا جس سے بہت روشنی ہوگئی اور پھر ایسی خطرناک آواز آئی کہ لوگ دہشت ناک ہوگئے اور بڑا خوف ہوا" اور پھر نہیں معلوم کہ آئندہ بھی کیا کیا ہونے والا ہے۔ آئے دن نئے نئے حوادث ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی سال ایسا نہیں گذرتا جس میں کوئی نہ کوئی حادثہ واقع نہ ہو۔ ستاروں کا ٹوٹنا ظاہر کرتا ہے کہ زمین پر بھی اَب کچھ نشانات ظاہر ہونے والے ہیں اور پھر خدا تعالیٰ نے بھی مجھ پر ظاہر کیا ہے کہ مَیں بہت سے عجیب نشان ظاہر کروں گا کچھ اوّل میں اور کچھ آخر میں۔ زلزلہ کی خبر بھی اس نے دی ہے۔ گذشتہ کی نسبت زیادہ سخت طاعون پڑنے کی بھی اطلاع دی ہے معلوم نہیں کہ اِس سال وہ خطرناک طاعون پڑے گی یا آئندہ سال میں مگر وہ خطرناک بہت ہوگی۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

ذرہ سوچنا چاہیئے کہ جس آفتابِ صداقت کے حق میں یہ آیت ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ یعنی اس کا کوئی نطق اور کوئی کلمہ اپنے نفس اور ہَوا کی طرف سے نہیں وہ تو سراسر وحی ہے جو اس کے دل پر نازل ہو رہی ہے اس کی نسبت کیا ہم خیال کر سکتے ہیں کہ وہ مدّتوں نُورِ وحی سے بکلّی خالی رہ جاتا تھا مثلاً یہ جو منقول ہے کہ بعض دفعہ چالیس دن اور بعض دفعہ بیس دن اور بعض دفعہ اس سے زیادہ ساٹھ دِن تک بھی وحی نازل نہیں ہوئی۔ اگر اِس عدم نزول سے یہ مراد ہے کہ فرشتہ جبرائیل بکلّی آنحضرت صلعم کو اس عرصہ تک چھوڑ کر چلا گیا تو یہ سخت اِعتراض پیش آئے گا کہ اس مدت تک جس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باتیں کیں کیا وہ احادیثِ نبویہ میں داخل نہیں تھیں اور کیا وحی غیر متلو ان کا نام نہیں تھا اور کیا اس عرصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی خواب بھی نہیں آتی تھی اور اگر ...... یہ بات صحیح ہے کہ ضرور مدّتوں جبرائیل آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھی چلا جاتا تھا اور آنحضرتؐ بکلّی وحی سے خالی رہ جاتے تھے تو بلاشبہ اُن دنوں کی احادیث ...... قابلِ اعتبار نہیں ہوں گی کیونکہ وحی کی روشنی سے خالی ہیں ...... وہ آفتابِ صداقت جس کا کوئی دل کا خطرہ بھی بغیر وحی کی تحریک کے نہیں اُس کے بارے میں اِن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ گویا وہ نعوذ باللہ مدّتوں ظلمت میں بھی پڑا رہتا تھا اور اس کے ساتھ کوئی روشنی نہ تھی۔ اِس عاجز کو اپنے ذاتی تجربہ سے یہ معلوم ہے کہ رُوح القدس کی قدسیت ہر وقت اور ہر دم اور ہر لحظہ بلا فصل مُلہم کے تمام قویٰ میں کام کرتی رہتی ہے اور وہ بغیر رُوح القدس اور اس کی تاثیر قدسیت کے ایک دَم بھی اپنے تئیں ناپاکی سے بچا نہیں سکتا اور انوارِ دائمی اور استقامت دائمی اور محبت دائمی اور عصمت دائمی اور برکات دائمی کا بھی سبب ہوتا ہے کہ رُوح القدس ہمیشہ اور ہر وقت ان کے ساتھ ہوتا ہے پھر امام المعصومین اور امام المتبرکین اور سیّد المقربینؐ کی نسبت کیونکر خیال کیا جائے کہ نعوذ باللہ کسی وقت ان

تمام برکتوں اور پاکیزگیوں اور روشنیوں سے خالی رہ جاتے تھے۔ افسوس کہ یہ لوگ حضرت عیسٰیؑ کی نسبت یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ تینتیس برس رُوح القدس ایک دَم کے لئے بھی اُن سے جُدا نہیں ہؤا مگر اس جگہ اس قُرب سے مُنکر ہیں۔

(آئینہ کمالاتِ اِسلام صفحہ ۹۱ تا ۹۴ حاشیہ)

اگر صحابہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ اِعتقاد رکھتے کہ کبھی یا مدتوں تک آپؐ سے رُوح القدس جُدا بھی ہو جاتا تھا تو وہ ہرگز ہر یک وقت اور ہر یک زمانہ کی احادیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ نہ کرتے انکی نظر تو اس آیت پر تھی وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى لا اگر صحابہؓ تمہاری طرح مسِ شیطان کا اِعتقاد رکھتے تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سَیّدالمعصومین کیوں قرار دیتے۔ خدا تعالیٰ سے ڈرو کیوں اِفترا پر کمر باندھی ہے .....

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت صحابہؓ کا بلاشُبہ یہ اعتقاد تھا کہ آنجنابؐ کا کوئی فعل اور کوئی قول وحی کی آمیزش سے خالی نہیں گو وہ وحی مجمل ہو یا مفصل۔ خفی ہو یا جلی۔ بیّن ہو یا مُشتبہ۔ یہاں تک کہ جو کچھ آنحضرت صلعم کے خاص معاملات و مکالمات خلوت اور بستر میں بیویوں سے تھے یا جس قدر اکل اور شرب اور لباس کے متعلق اور معاشرت کی ضروریات میں روزمرہ کے خانگی امور تھے سب اِسی خیال سے احادیث میں داخل کئے گئے کہ وہ تمام کلام رُوح القدس کی روشنی سے ہیں چنانچہ ابوداؤد وغیرہ میں یہ حدیث موجود ہے اور امام احمد بچند وسائط عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ نے کہا کہ مَیں جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنتا تھا لکھ لیتا تھا تا مَیں اُس کو حفظ کر لوں پس بعض نے مجھ کو منع کیا کہ ایسا مت کر کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں کبھی غضب سے بھی کلام کرتے ہیں تو مَیں یہ بات سُنکر لکھنے سے دستکش ہو گیا اور اِس بات کا رسول اللہ صلعم کے پاس ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اُس ذات کی مجھ کو قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ جو مجھ سے صادر ہوتا ہے خواہ قول ہو یا فعل وہ سب خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انہیں احادیث کی کتابوں میں بعض امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اِجتہادی غلطی کا بھی ذکر ہے۔ اگر کُل قول و فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وحی سے تھا تو پھر وہ غلطی کیوں ہوئی گو آنحضرتؐ اس پر قائم نہیں رکھے گئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اِجتہادی غلطی بھی وحی کی روشنی سے دُور نہیں تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے قبضہ سے ایک دَم جُدا نہیں ہوتے تھے پس اُس اِجتہادی غلطی کی ایسی ہی مثل ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں چند دفعہ سہو واقع ہؤا تا اُس سے دین کے مسائل پیدا ہوں سو اسی طرح بعض اَوقات اِجتہادی غلطی ہوئی تا اس سے بھی تکمیلِ دین ہو اور بعض باریک مسائل اس کے ذریعہ سے پیدا ہوں اور وہ سہو بشریّت بھی تمام لوگوں کی طرح سہو نہ تھا بلکہ دراصل ہمرنگ وحی تھا کیونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص تصرف تھا جو نبی کے وجود پر حاوی ہو کر اس کو کبھی ایسی طرف مائل

کر دیتا تھا جس میں خدا تعالیٰ کے بہت مصالح تھے سو ہم اُس اجتہادی غلطی کو بھی وحی سے علیحدہ نہیں سمجھتے کیونکہ وہ ایک معمولی بات نہ تھی بلکہ خدا تعالیٰ اُس وقت اپنے نبی کو اپنے قبضہ میں لے کر مصالح عام کے لئے ایک نور کو سہو کی صورت میں یا غلط اجتہاد کے پیرایہ میں ظاہر کر دیتا تھا اور پھر ساتھ ہی وحی اپنے جوش میں آجاتی تھی جیسے ایک چلنے والی نہر کا ایک مصلحت کے لئے پانی روک دیں اور پھر چھوڑ دیں پس اس جگہ کوئی عقلمند نہیں کہہ سکتا کہ نہر سے پانی خشک ہو گیا یا اُس میں سے اُٹھا لیا گیا۔ یہی حال انبیاء کی اجتہادی غلطی کا ہے کہ رُوح القدس تو کبھی اُن سے علیحدہ نہیں ہوتا مگر بعض اَوقات خدا تعالیٰ بعض مصالح کے لئے انبیاء کے فہم اور ادراک کو اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے تب کوئی قول یا فعل سہو یا غلطی کی شکل پر اُن سے صادر ہوتا ہے اور وہ حکمت جو ارادہ کی گئی ہے ظاہر ہو جاتی ہے تب پھر وحی کا دریا زور سے چلنے لگتا ہے اور غلطی کو درمیان سے اُٹھا دیا جاتا ہے گویا اُس کا کبھی وجود نہیں تھا حضرت مسیح ایک انجیر کی طرف دَوڑے گئے کہ تا اُس کا پھل کھائیں اور رُوح القدس ساتھ ہی تھا مگر رُوح القدس نے یہ اِطلاع نہ دی کہ اس وقت انجیر پر کوئی پھل نہیں۔ بایں ہمہ یہ سب لوگ جانتے ہیں کہ شاذونادر معدُوم کے حکم میں ہوتا ہے پس جس حالت میں ہمارے سَیّد و مَولیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دس لاکھ کے قریب قول و فعل میں سراسر خدائی کا ہی جلوہ نظر آتا ہے اور ہر بات میں، حرکات میں، سکنات میں، اقوال میں، افعال میں رُوح القدس کے چمکتے ہوئے انوار نظر آتے ہیں تو پھر اگر ایک آدھ بات میں بشریّت کی بھی بُو آوے تو اس سے کیا نقصان بلکہ ضرور تھا کہ بشریّت کے تحقق کے لئے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تا لوگ شرک کی بلا میں مُبتلا نہ ہو جائیں۔

بالآخر ہم چند اقوال پر اِس مضمون کو ختم کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سلفِ صالح کا ہرگز یہ عقیدہ نہ تھا کہ رُوح القدس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر خاص خاص وقتوں پر نازل ہوتا تھا اور دوسرے اَوقات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُس سے نعوذ باللہ بکلّی محروم ہوتے تھے ازاں جملہ وہ قول ہے جو شیخ عبدالحق محدّث دہلوی نے اپنی کتاب مدارج النبوۃ کے صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ملائک وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دائمی رفیق اور قرین ہیں چنانچہ وہ جامع الاصول اور کتاب الوفا سے نقل کرتے ہیں کہ ابتدائے نبوّت سے تین برس برابر حضرت اسرافیل ملازم صحبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رہے اور پھر حضرت جبرائیل دائمی رفاقت کے لئے آئے اور بعد اسکے صاحبِ سفر السعادت سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سات سال کے تھے جب حضرت اسرافیل کو اللہ جلشانہٗ کی طرف سے حکم ہؤا کہ آنحضرت صلعم کے ملازم خدمت رہیں پس اسرافیل ہمیشہ اور ہر وقت آنحضرت صلعم کے پاس رہتا تھا اور آنحضرت صلعم کی عمر کا گیارھواں سال پُورا ہونے تک یہی حال تھا مگر اسرافیل بجز کلمہ دو کلمہ کے اَور کوئی بات وحی کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دِل میں نہیں ڈالتا تھا۔ ایسا ہی میکائیل بھی آنحضرتؐ کا قرین رہا پھر بعد اسکے حضرت جبرائیل کو حکم ہؤا اور وہ پُورے اُنتیس سال قبل از وحی ہر وقت قرین اور مصاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے

پھر بعد اس کے وحیٔ نبوت شروع ہوئی۔

اِس بیان سے ہر یک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ جن بزرگوں نے مثلاً حضرت جبرائیل کی نسبت لکھا ہے کہ وہ نبوّت سے پہلے بھی اُنتیس سال تک ہمیشہ اور ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی رفیق تھا ان کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں ہو سکتا تھا کہ جبرائیل کسی وقت آسمان پر بھی چلا جاتا تھا کیونکہ کسی وقت چھوڑ کر چلا جانا دوام قُرب اور معیّت غیر منقطع کے منافی ہے لیکن جب ان بزرگوں کا دوسرا عقیدہ بھی دیکھا جائے کہ جبرائیل علیہ السّلام کا قرارگاہ آسمان ہی ہے اور وہ ہر ایک وحی آسمان سے ہی لاتا ہے تو اِن دونوں عقیدوں کے ملانے سے جو تناقض پَیدا ہوتا ہے اس سے رہائی پانے کے لئے بجز اس کے اَور کوئی راہ نہیں مل سکتی کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ جبرائیل علیہ السلام کا آسمان سے اُترنا حقیقی طور پر نہیں بلکہ تمثّلی ہے اور جب تمثّلی طور پر اُترنا ہؤا تو اس میں کچھ حرج نہیں کہ جبرائیل علیہ السلام اپنے تمثّلی وجود سے ہمیشہ اور ہر وقت اور ہر دَم اور ہر طرفۃ العین انبیاء علیہم السّلام کے ساتھ رہے کیونکہ وہ اپنے اصل وجود کے ساتھ تو آسمان پر ہی ہے اور اسی مذہب کی تصدیق اور تصویب شیخ عبدالحق محدّث دہلی نے اپنی کتاب مدارج النّبوّۃ کے صفحہ ۵۴ میں کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ نزولِ جبرائیل جو بعض اَوقات دحیہ کلبی کی صورت میں یا کسی اَور انسان کی صورت میں ہوتا تھا اس میں اہلِ نظر کو اشکال ہے اور یہ اِعتراض پَیدا ہوتا ہے کہ اگر درحقیقت جبرائیل علیہ السّلام ایک نیا جسم اپنے لئے مشابہ جسم دحیہ کلبی حاصل کر کے اس میں اپنا رُوح داخل کر دیتے تھے تو پھر وہ اصلی جسم ان کا جس کے تین سَو جناح ہیں کس حالت میں ہوتا تھا۔ کیا وہ جسدِ بے رُوح پڑا رہتا تھا اور حضرت جبرائیل فوت ہو کر پھر بطریق تناسخ دوسرے جسم میں آجاتے تھے۔

اِس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں کہ اہلِ تحقیق کے نزدیک یہ تمثّلی نزول ہے نہ حقیقی تا حقیقتاً ایک جسم کو چھوڑنا اور دوسرے جسم میں داخل ہونا لازم آوے۔ پھر لکھتے ہیں بات یہ ہے کہ جبرائیل علیہ السّلام کے ذہن میں جو دحیہ کلبی کی صورت علمیّہ تھی تو حضرت جبرائیل علیہ السّلام بوجہ قدرتِ کاملہ و ارادتِ شاملہ اپنی کے اس صورت پر اپنے وجود کا افاضہ مع جمیع صفاتِ کاملہ اپنی کے کر کے تمثّل کے طور پر اُس میں اپنے تئیں ظاہر کر دیتے تھے یعنی دحیہ کلبی کی صورت میں بطور تمثّل اپنے تئیں دکھلا دیتے تھے اور اس صورتِ علمیّہ کو اپنی صفات سے متلبّس کر کے نبی علیہ السّلام پر تمثّلاً ظاہر کر دیتے تھے یہ نہیں کہ جبرائیل آپ اپنے اصلی وجود کے ساتھ آسمان سے اُترتا تھا بلکہ جبرائیل علیہ السّلام اپنے مقام پر آسمان میں ثابت و قائم رہتا تھا اور یہ جبرائیل اُس حقیقی جبرائیل کی ایک مثال تھی یعنی اس کا ایک ظِل تھا اس کا عین نہیں تھا کیونکہ عین جبرائیل تو وہ ہے جو اپنی صفاتِ خاصّہ کے ساتھ آسمان پر موجود ہے اور اس کی حقیقت اور شان الگ ہے۔ پھر اِس قدر تحریر کے بعد شیخ صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ جس طرح جبرائیل علیہ السّلام تمثّلی صورت میں نہ حقیقی صورت میں نازل ہوتا رہا ہے۔ یہی مثال رُوحانیات کی ہے جو بصورت جسمانیات متمثّل ہوتی ہیں اور یہی مثال خدا تعالیٰ کے تمثّل کی بھی ہے

جو اہلِ کشف کو صورت بشر پر نظر آتا ہے اور یہی مثال مکمل اَولیاء کی ہے جو مواضع متفرقہ میں بصورِ متعددہ نظر آجاتے ہیں۔

خدا تعالیٰ شیخ بزرگ عبدالحق محدث کو جزاء خیر دیوے کیونکہ انہوں نے بصدق دل قبول کر لیا کہ جبرائیل علیہ السّلام بذاتِ خود نازل نہیں ہوتا بلکہ ایک تمثّلی وجود انبیاء علیہم السّلام کو دکھائی دیتا ہے اور جبرائیل اپنے مقام آسمان میں ثابت و برقرار ہوتا ہے۔ یہ وہی عقیدہ اس عاجز کا ہے جس پر حال کے کور باطن نام کے علماء کفر کا فتویٰ دے رہے ہیں۔ افسوس کہ یہ بھی خیال نہیں کرتے کہ اِس بات پر تمام مفسّرین نے اور نیز صحابہؓ نے بھی اتفاق کیا ہے کہ جبرائیل علیہ السّلام اپنے حقیقی وجود کے ساتھ صرف دو مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائی دیا ہے اور ایک بچّہ بھی اِس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر وہ اپنے اصلی اور حقیقی وجود کے ساتھ آنحضرت صلعم کے پاس آتے تو خود یہ غیر ممکن تھا کیونکہ ان کا حقیقی وجود تو مشرق مغرب میں پھیلا ہوُا ہے اور اُن کے بازو آسمانوں کے کناروں تک پہنچے ہوئے ہیں پھر وہ مکّہ یا مدینہ میں کیونکر سما سکتے تھے۔ جب تم حقیقت اور اصل کی شرط سے جبرائیلؑ کے نزول کا عقیدہ رکھو گے تو ضرور تم پر یہ اعتراض وارد ہوگا کہ وہ اصلی وجود کیونکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ میں سما گیا اور اگر کہو کہ وہ اصلی وجود نہیں تھا تو پھر ترکِ اصل کے بعد تمثّل ہی ہوُا یا کچھ اَور ہوُا۔ اصل کا نزول تو اُس حالت میں ہو کہ جب آسمان میں اس وجود کا نام و نشان نہ رہے اور جب آسمان سے وہ وجود نیچے اُتر آیا تو پھر ثابت کرنا چاہیئے کہ کہاں اس کے ٹھہرنے کی گنجائش ہوئی۔ غرض یہ خیال کہ جبرائیل اپنے اصلی وجود کے ساتھ زمین پر اُتر آتا تھا بدیہی البطلان ہے خاص کر جب دوسری شق کی طرف نظر کریں اور اس فساد کو دیکھیں کہ ایسا عقیدہ رکھنے سے یہ لازم آتا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام اکثر اَوقات فیضِ وحی سے محروم اور معطّل رہیں تو پھر نہایت بے شرمی ہوگی کہ اس عقیدہ کا خیال بھی دِل میں لاویں شیخ عبدالحق محدّث دہلوی مدارج النبوۃ کے صفحہ ۸۳ میں لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کلمات وحدیث وحی خفی ہیں باستثناء چند مواضع یعنی قصہ اسارائے بدر و قصہ ماریہ وعسل و تابیر نخل جو نادر اور حقیر ہیں اور پھر اسی صفحہ میں لکھتے ہیں کہ اوزاعی حسان بن عطیہ سے روایت کرتا ہے کہ نزول جبرائیل قرآن سے مخصوص نہیں بلکہ ہر یک سُنّت نزولِ جبرائیل سے ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اِجتہاد بھی وحی میں سے ہے۔ اور پھر صفحہ ۸۷ میں لکھتے ہیں کہ صحابہ آنحضرت صلعم کے ہر یک قول و فعل قلیل و کثیر و صغیر و کبیر کو وحی سمجھتے تھے اور اُس پر عمل کرنے میں کچھ توقّف اور بحث نہیں کرتے تھے اور حرص رکھتے تھے کہ جو کچھ آنحضرت صلعم سِرّ اور خلوت میں کرتے ہیں وہ بھی معلوم کر لیں۔ پس کچھ شک نہیں کہ جو شخص احوالِ صحابہؓ میں تامّل کرے وہ کیونکر ہر یک امر اور قول اور فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حجّت دین سمجھتے تھے اور کیونکر وہ آنحضرتؐ کے ہر یک زمانہ اور ہر یک وقت اور ہر یک دَم کو وحی میں مستغرق جانتے تھے تو اس اِعتقاد کے رکھنے سے کہ کبھی جبرائیل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کو چھوڑ کر آسمان پر چلا جاتا تھا خدا تعالیٰ سے شرم کرے گا اور ڈرے گا کہ ایسا وہم بھی اُس کے دِل میں گذرے مگر افسوس کہ ہمارے یہ علماء جو محدث بھی کہلاتے ہیں کچھ بھی ڈرتے نہیں۔ اگر انکے ایسے عقیدوں کو ترک کرنا کُفر ہے تو ایسا کُفر اگر ملے تو زہے سعادت۔ ہم اُن کے ایسے ایمان سے سخت بیزار ہیں اور خدا تعالیٰ کی طرف اُن کے ایسے اقوال سے دادخواہ ہیں جن کی وجہ سے سخت اہانت رسول اللہ علیہ وسلم کی مخالفوں میں ہو رہی ہے۔ اِن لوگوں کے حق میں کیا کہیں اور کیا لکھیں جنہوں نے کفار کو ہنسی اور ٹھٹھہ کا موقع دیا اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کو حضرت عیسٰی کی نسبت ایسا اور اس قدر گھٹا دیا کہ جس کے تصوّر سے بدن پر لرزہ پڑتا ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۱۱ تا ۱۲۶)

نبی کے دل میں جو خیالات اُٹھتے ہیں اور جو کچھ خواطر اس کے نفس میں پیدا ہوتی ہیں درحقیقت وہ تمام وحی ہوتی ہیں جیسا کہ قرآن کریم اس پر شاہد ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى لیکن قرآن کی وحی دوسری وحی سے جو صرف معانی منجانب اللہ ہوتی ہیں تمیز کلّی رکھتی ہے اور نبی کے اپنے تمام اقوال وحی غیر متلوّ میں داخل ہوتے ہیں کیونکہ رُوح القدس کی برکت اور چمک ہمیشہ نبی کے شاملِ حال رہتی ہے اور ہر یک بات اُس کی برکت سے بھری ہوئی ہوتی ہے اور وہ برکت رُوح القدس سے اُس کلام میں رکھی جاتی ہے لہٰذا ہر یک بات نبی کی جو نبی کی توجہ تام سے اور اُس کے خیال کی پُوری مصروفیت سے اُس کے مُنہ سے نکلتی ہے وہ بلاشُبہ وحی ہوتی ہے تمام احادیث اِسی درجہ کی وحی میں داخل ہیں جن کو غیر متلوّ وحی کہتے ہیں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۳۵۲، ۳۵۳)

یُوں تو کوئی القاء الفاظ کے بغیر نہیں ہوتا اور ایسے معانی جو الفاظ سے مجرّد ہوں ذہن میں آ ہی نہیں سکتے لیکن پھر خود قرآن اور حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ایک فرق ہے اور اُسی فرق کی بناء پر حدیث کے الفاظ کو اس چشمہ سے نکلا ہوا قرار نہیں دیتے جس چشمہ سے قرآن کے الفاظ نکلے ہیں گو عام القاء اور الہام کا مفہوم مدّنظر رکھ کر حدیث کے الفاظ بھی من جانب اللہ ہیں چنانچہ آیت وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى اس پر شہادت دے رہی ہے۔ (برکات الدّعا حاشیہ متعلقہ صفحہ ۷ معیارِ ہفتم)

نبی کی ہر یک بات خدا تعالیٰ کے حکم سے ہوتی ہے۔ نبی کا زمانہ نزولِ شریعت کا زمانہ ہوتا ہے اور شریعت وہی ٹھہر جاتی ہے جو نبی عمل کرتا ہے۔ (نور القرآن ۲ صفحہ ۱۰)

خدا تعالیٰ نے ..... یہ کہہ کر وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى آپ کی تمام کلام کو اپنی کلام ٹھہرایا ہے۔ (کتاب البریّہ صفحہ ۸۷)

اس نبی کا قول بشری ہوا و ہوس کے چشمہ سے نہیں نکلتا بلکہ اُس کا قول خدا کا قول ہے۔ اب دیکھو کہ اس

آیت کے رُو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کُل اقوال خدا تعالیٰ کے اقوال ثابت ہوتے ہیں۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۱ ۵ صفحہ ۲۰۵)

قرآن شریف میں جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ ارشاد ہُوا کہ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی یہ اُس شدید اور اعلیٰ ترین قُرب ہی کی طرف اشارہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال تزکیہ نفس اور قُرب الٰہی کی ایک دلیل ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۲۱)

پیشگوئی کا مقام اللہ تعالیٰ کے اعلیٰ درجہ کے قُرب کے بدُوں ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں وہ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی کا مصداق ہوتا ہے اور یہ درجہ تب ملتا ہے جب دَنٰی فَتَدَلّٰی کے مقام پر پہنچے۔ جب تک ظلّی طور پر انسانیت کی چادر کو پھینک کر الوہیت کی چادر کے نیچے اپنے آپ کو نہ چھپائے یہ مقام اُسے کب مِل سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بعض سلوک کی منزلوں سے ناواقف صوفیوں نے آکر ٹھوکر کھائی ہے اور اپنے آپ کو وہ خدا سمجھ بیٹھے ہیں اور اُن کی اس ٹھوکر سے ایک خطرناک غلطی پھیلی ہے جس نے بہتوں کو ہلاک کر ڈالا اور وہ وحدت الوجود کا مسئلہ ہے جس کی حقیقت سے یہ لوگ ناواقف محض ہوتے ہیں۔

میرا مطلب صرف اِس قدر ہے کہ مَیں تمہیں یہ بتاؤں کہ وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی کے درجہ پر جب تک انسان نہ پہنچے اس وقت تک اُسے پیشگوئی کی قوت نہیں مِل سکتی اور یہ درجہ اُس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ انسان قُربِ الٰہی حاصل کرے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء)

فرماتا ہے کہ اُس کی زبان ہو جاتا ہوں اس پر اشارہ ہے مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی اِس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تھا۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۴۴ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۴)

اِلہام کچھ شئے نہیں جب تک کہ انسان اپنے تئیں شیطان کے دخل سے پاک نہ کرے اور بے جا تعصبوں اور کینوں اور حسدوں سے اور ہر ایک خدا کو ناراض کرنے والی بات سے اپنے آپ کو صاف نہ کرے۔ دیکھو اسکی مثال ایسی ہے کہ ایک حوض ہے اور اس میں بہت سی نالیاں پانی کی گرتی ہیں پھر ان نالیوں میں سے ایک کا پانی گندہ ہے تو کیا وہ سارے پانی کو گندہ نہ کر دے گا۔ یہی راز ہے جو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہا گیا مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی اِنۡ ھُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ہاں اِنسان کو ان کمزوریوں کے دُور کرنے کے واسطے اِستغفار بہت پڑھنا چاہیئے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۸ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۲)

جب اِنسان حجۃ اللہ کے مقام پر ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہی اس کے جوارح ہو جاتا ہے مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی کے یہی معنے ہیں اور یہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ انسان کامل طور پر اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار اور اس کا وفادار بندہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے ساتھ اُسے کامل صُلح ہوتی ہے۔ اس کی کوئی حرکت کوئی سکون اللہ تعالیٰ کے اِذن

اور اَمر کی ایک کَل ہوتی ہے ایسی حالت میں اس پر مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ مقام کامل اور اکمل طور پر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۷؍جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۰)

یاد رہے کہ اگرچہ ہر ایک نبی میں مہدی ہونے کی صفت پائی جاتی ہے کیونکہ سب نبی تلامیذ الرحمان ہیں اور نیز اگرچہ ہر ایک نبی میں مؤید بروح القدس ہونے کی صفت بھی پائی جاتی ہے کیونکہ تمام نبی رُوح القدس سے تائید یافتہ ہیں لیکن پھر بھی یہ دو نام دو نبیوں سے کچھ خصوصیت رکھتے ہیں یعنی مہدی کا نام ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص ہے اور مسیح یعنی مؤید بروح القدس کا نام حضرت عیسٰی علیہ السلام سے کچھ خصوصیّت رکھتا ہے گو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس نام کے رُو سے بھی فائق ہیں کیونکہ اُن کو شدید القوٰی کا دائمی اِنعام دیا گیا ہے لیکن رُوح القدس کے مرتبہ میں جو شدید القوٰی سے کم مرتبہ ہے حضرت مسیح کو یہ خصوصیت دی گئی ہے جیسا کہ یہ دونوں خصوصیتیں قرآن شریف سے ظاہر ہیں آنحضرتؐ کا نام اُمّی مہدی رکھا اور وَعَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی فرمایا اور حضرت مسیح کو رُوح القدس سے تائید یافتہ قرار دیا جیسا کہ کسی شاعر نے بھی کہا ہے ؎

فیضِ رُوح القدس ار باز مدد فرماید ✤ ہمہ آں کار کنند آنچہ مسیحا مے کرد

اور نبیوں کی پیشگوئی میں یہ تھا کہ امام آخر الزّمان میں یہ دونوں صفتیں اکٹھی ہو جائیں گی یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ آدھا اِسرائیلی ہوگا اور آدھا اِسماعیلی۔ (اربعین نمبر ۲ صفحہ ۱۱، ۱۲ حاشیہ)

مہدی کے مفہوم میں یہ معنے ماخوذ ہیں کہ وہ کسی انسان کا علمِ دین میں شاگرد یا مرید نہ ہو اور خدا کی ایک خاص تجلّی تعلیم لدنّی کے نیچے دائمی طور پر نشو و نما پاتا ہو جو رُوح القدس کے ہر ایک تمثّل سے بڑھ کر ہے اور ایسی تعلیم پانا صفتِ محمدی ہے اور اسی کی طرف آیت عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی میں اشارہ ہے اور اس فیض کے دائمی اور غیر منفک ہونے کی طرف آیت وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی میں اشارہ ہے اور مسیح کے مفہوم میں یہ معنے ماخوذ ہیں جو دائمی طور پر وہ رُوح القدس اس کے شاملِ حال ہو جو شدید القوٰی کے درجہ سے کم تر ہو کیونکہ رُوح القدس کی تاثیر یہ ہے کہ وہ اپنی منزّل علیہ میں ہو کر انسانوں کو راستی کا ملزم بناتا ہے مگر شدید القوٰی راستی کا اعلیٰ رنگ منزّل علیہ میں ہو کر انسانوں کے دِلوں میں چڑھاتا ہے۔ (اربعین نمبر ۲ صفحہ ۱۳ حاشیہ)

وَاَمَّا قَوْلُ الْمُعْتَرِضِ الْفَتَّانِ اَنَّ ذِیْ مِرَّۃٍ اِسْمُ الشَّیْطَانِ وَقَالَ اِنَّ الْمِرَّۃَ ھِیَ مَادَّۃُ الصَّفْرَاءِ وَبَاطِلٌ کُلُّ مَا یُخَالِفُہٗ مِنَ الْاٰرَاءِ فَھٰذَا کُلُّہٗ کِذْبٌ وَّدَجْلٌ وَّتَلْبِیْسٌ وَّنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الدَّجَّالِیْنَ الْمُفْتِنِیْنَ

ترجمہ از اصل:۔ معترض فتنہ انگیز کا یہ قول کہ ذِیْ مِرَّۃٍ شیطان کا نام ہے اور جو اُس نے کہا کہ مِرّہ مادہ صفراء کو کہتے ہیں اور اس کے برخلاف ہر ایک رائے باطل ہے۔ یہ اُس کا تمام کذب اور دجل اور تلبیس ہے اور دجّالوں اور فتنہ انگیزوں سے

بَلِ الْاَمْرُ الصَّحِيْحُ الَّذِيْ يُوْجَدُ نَظَائِرُهٗ فِيْ كَلِمَاتِ بُلَغَاءِ لِسَانِ الْعَرَبِ وَ نَوَابِغِ ذَوِي الْاَدَبِ اَنَّ اَصْلَ الْمِرَّةِ اِحْكَامُ الْفَتْلِ وَاِدَارَةُ الْخُيُوْطِ عِنْدَ الْوَصْلِ كَمَا قَالَ صَاحِبُ تَاجِ الْعُرُوْسِ شَارِحُ الْقَامُوْسِ ثُمَّ نَقَلُوْا هٰذَا اللَّفْظَ مِنَ الْاِحْكَامِ وَالْاِدَارَةِ اِلٰى نَتِيْجَتِهٖ اَعْنِيْ اِلَى الْقُوَّةِ وَالطَّاقَةِ فَاِنَّ الْحَبْلَ اِذَا اُحْكِمَ فَتْلُهٗ فَلَا بُدَّ مِنْ اَنْ يَتَقَوّٰى بَعْدَ اَنْ يَّشْتَدَّ وَيُسَوّٰى وَيَكُوْنَ كَشَيْءٍ قَوِيٍّ مَتِيْنٍ۔ ثُمَّ نُقِلَ مِنْهُ اِلَى الْعَقْلِ كَنَقْلِ الْحَقْلِ اِلَى الْحَقْلِ لِاَنَّ الْعَقْلَ طَاقَةٌ تَحْصُلُ بَعْدَ اِمْرَارِ مُقَدَّمَاتٍ وَاِحْكَامِ مُشَاهَدَاتٍ تُجَلِّيْهَا الْحِسُّ الْمُشْتَرَكُ مِنَ الْحَوَاسِ بِاِذْنِ رَبِّ النَّاسِ وَاَحْسَنِ الْخَالِقِيْنَ۔ ثُمَّ نُقِلَ هٰذَا اللَّفْظُ فِي الْمَرْتَبَةِ الرَّابِعَةِ اِلٰى مِزَاجٍ مِنَ الْاَمْزِجَةِ اَعْنِي الصَّفْرَاءَ الَّتِيْ هِيَ اِحْدَى الطَّبَائِعِ الْاَرْبَعَةِ لِشِدَّةِ قُوَّتِهَا وَلَطَافَةِ مَادَّتِهَا وَلِكَوْنِهَا مَصْدَرَ اَفْعَالٍ قَوِيَّةٍ وَمُوْجِبًا لِجُرْأَةٍ وَشُجَاعَةٍ وَكُلِّ اَمْرٍ يُخَالِفُ عَادَاتِ الْجُبَانِ وَيُوَافِقُ سِيَرَ الشُّجْعَانِ تَتَفَكَّرْ اِنْ كُنْتَ مِنَ الطَّالِبِيْنَ۔

وَ اَمَّا نَظِيْرُهٗ فِيْ اَشْعَارِ بُلَغَاءِ الْجَاهِلِيَّةِ وَ نُبَغَاءِ الْاَزْمِنَةِ الْمَاضِيَةِ فَكَفَاكَ مَا قَالَ اِمْرَأُ الْقَيْسِ فِيْ قَصِيْدَتِهِ اللَّامِيَةِ۔

خدا کی پناہ۔ بلکہ وہ امرِ صحیح جس کی نظیریں اہلِ زبان کے بلیغوں اور فصیحوں کے کلمات میں پائی جاتی ہیں یہ ہے کہ تاگہ کو جب بٹ دے کر پختہ کرتے ہیں تو اِس پختہ کرنے کا نام مِرّہ ہے اور مِرّہ کے معنوں کا اصل یہ ہے کہ اس قدر تاگہ کو بٹ چڑھایا جائے اور مروڑا جائے کہ وہ پختہ ہو جائے جیسا کہ یہی معنے صاحب تاج العروس شارح القاموس نے کئے ہیں پھر اس لفظ کو مروڑنے اور بٹ چڑھانے سے منتقل کر کے اُس کے نتیجہ کی طرف لے آئے یعنی قوت اور طاقت کی طرف جو بٹ چڑھانے کے بعد پیدا ہوتی ہے کیونکہ جب تاگا کو بٹ چڑھایا جاوے پس یہ ضروری امر ہے کہ بٹ چڑھانے کے بعد اس میں قوت اور طاقت پیدا ہو جائے اور ایک شے قوی متین ہو جائے۔ پھر یہ لفظ عقل کے معنوں کی طرف منتقل کیا گیا جیسا کہ حقل کا لفظ جو بمعنی زمین خوش پاکیزہ ہے حقل یعنے کھیت نوسبزہ کی طرف منتقل ہو گیا کیونکہ عقل بھی ایک طاقت ہے جو بعد محکم کرنے مقدمات اور پختہ کرنے مشاہدات کے پیدا ہوتی ہے اور حِس مشترک اُن مشاہدات کو حواس سے باذن رب النّاس لیتی ہے۔ پھر یہ لفظ بمرتبہ رابعہ ایک بدنی مزاج کی طرف منتقل کیا گیا یعنے صفراء کی طرف جو طبائع رابعہ میں سے ایک ہے کیونکہ صفراء اپنی شدّت اور قوت اور لطافت میں باقی اخلاط سے بڑھ کر ہے اِسی واسطے صاحب اس کا مصدر افعالِ قویّہ اور جری اور شجاع ہوتا ہے اور اُس سے ایسے امر صادر ہوتے ہیں جو بزدلی کے مخالف ہیں پس تو فکر کر اگر طالب حق ہے۔

لیکن اگر تو جاہلیت کے نامی شعراء اور فصحاء کے اشعار میں سے اِس کی نظیر طلب کرے پس تیرے لئے ایک شعر امراء القیس کے قصیدہ لامیہ کا کافی ہے کیونکہ اُس نے کہا ہے۔

دَرِیْرٍ کَخُذْرُوْفِ الْوَلِیْدِ اَمَرَّہٗ　　تَتَابُعُ کَفَّیْہِ بِخَیْطٍ مُوَصَّلِ

وَکَذٰلِکَ بَیْتٌ لِعَمْرِو بْنِ کُلْثُوْمِ التَّغْلَبِیِّ الَّذِیْ ھُوَ نَابِغٌ فِی اللِّسَانِ الْعَرَبِیِّ وَقَالَ فِی الْقَصِیْدَۃِ الْخَامِسَۃِ مِنَ السَّبْعِ الْمُعَلَّقَۃِ وَنَحْنُ نَکْتُبُہٗ نَظِیْرًا لِمَعْنَی الْاِدَارَۃِ وَھُوَ ھٰذَا۔

تَرَی اللَّحِزَ الشَّحِیْحَ اِذَا اُمِرَّتْ　　عَلَیْہِ لِمَالِہٖ فِیْھَا مُھِیْنًا

وَمِنْ عَجَائِبِ لَفْظِ الْمِرَّۃِ اشْتِرَاکُہٗ فِی الْعَرَبِیَّۃِ وَالْھِنْدِیَّۃِ فِیْ مَعْنَی الْاِدَارَۃِ وَاِحْکَامِ الْفَتْلِ بِالْمُبَالَغَۃِ فَاِنَّ الْھِنْدِیِّیْنَ یَقُوْلُوْنَ لِلْاِمْرَارِ۔ مَرُوْڑْنَا کَمَا لَا یَخْفٰی عَلَی الْھِنْدِیِّیْنَ۔ وَھٰذَا ثُبُوْتٌ صَرِیْحٌ مِّنْ غَیْرِ شَائِبَۃِ الْمَیْنِ لِاسْتِخْرَاجِ اَصْلِ حَقِیْقَۃِ الَّذِیْ ھُوَ دَائِرٌ بَیْنَ اللِّسَانَیْنِ وَفِیْہِ نُکْتَۃٌ تَسُرُّ الْمُحَقِّقِیْنَ۔

وَاَمَّا لَفْظُ ذِیْ مِرَّۃٍ بِمَعْنَی الْعَقْلِ فَاِنْ کُنْتَ تَطْلُبُ مِنَّا نَظِیْرَہٗ مَعَ تَصْحِیْحِ النَّقْلِ فَاعْلَمْ اَنَّ صَاحِبَ تَاجِ الْعُرُوْسِ شَارِحَ الْقَامُوْسِ فَسَّرَ لَفْظَ ذِیْ مِرَّۃٍ بِمَعْنٰی ذِی الدَّھَاءِ وَقَالَ یُقَالُ اِنَّہٗ لَذُوْ مِرَّۃٍ اَیْ عَقْلٍ فِیْ مَثَلِ الْعَرَبِ الْعَرْبَاءِ وَاِنْ لَّمْ یَکْفِکَ ھٰذَا الْمَثَلُ مَعَ اَنَّہٗ ھُوَ الْاَصْلُ وَتَطْلُبُ

دَرِیْرٍ کَخُذْرُوْفِ الْوَلِیْدِ اَمَرَّہٗ　　تَتَابُعُ کَفَّیْہِ بِخَیْطٍ مُوَصَّلِ

اَمَرَّہٗ یعنی بٹ دیا اور مروڑ دیا۔

اور اسی طرح عمرو بن کلثوم تغلبی کا ایک شعر ہے اور وہ بھی اپنے وقت کا بدیہہ گو شاعر تھا اور اُس نے یہ شعر قصیدہ خامسہ سبعہ معلقہ میں کہا ہے کہ

تَرَی اللَّحِزَ الشَّحِیْحَ اِذَا اُمِرَّتْ　　عَلَیْہِ لِمَالِہٖ فِیْھَا مُھِیْنًا

اُمِرَّتْ یعنی چکر دیا جائے اور پھرایا جائے۔

اور لفظ مِرّہ کے عجائبات میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے معنے بٹ دینے اور مروڑ دینے میں عربی اور ہندی میں مشترک ہے کیونکہ ہندی لوگ امرار کو مروڑنا کہتے ہیں جیسا کہ ہندیوں پر پوشیدہ نہیں اور یہ صریح ثبوت بغیر شائبہ کسی تاریکی کے ہے اور اس اصل حقیقت کا استخراج اِس سے ہوتا ہے جو دو زبانوں میں دائر ہے اور اس میں ایک نکتہ ہے جو محققین کو خوش کرتا ہے۔

لیکن لفظ ذی مرّۃ جو بمعنے عقل کے آتا ہے اگر تصحیح نقل کے لئے اس کی نظیر معلوم کرنا ہو پس جاننا چاہیئے کہ صاحب تاج العروس نے جو شارح قاموس ہے لفظ ذی مرّہ کو بمعنے ذی عقل تفسیر کیا ہے اور تمثیل کے طور پر کہا ہے کہ عرب کے لوگ کہتے ہیں کہ اِنَّہٗ لَذُوْ مِرَّۃٍ اور مراد اس سے اِنَّہٗ لَذُوْ عَقْلٍ رکھتے ہیں اور اگر تیرے لئے یہ مثال

مِنَّا نَظِيْرًا اٰخَرَ مِنَ الْاَيَّامِ الْجَاهِلِيَّةِ وَالْاَزْمِنَةِ الْمَاضِيَةِ فَاقْرَءْ هٰذَا الْبَيْتَ مِنْ صَاحِبِ الْقَصِيْدَةِ الرَّابِعَةِ مِنَ السَّبْعِ الْمُعَلَّقَةِ وَكَانَ مِنْ نُبَغَاءِ الزَّمَانِ وَفِي الْبَلَاغَةِ اِمَامَ الْاَقْرَانِ۔ وَزَادَ عُمْرُهٗ عَلٰى مِأَةٍ وَّخَمْسِيْنَ۔ وَ هُوَ هٰذَا۔

رَجَعَا بِاَمْرِهِمَا اِلٰى ذِيْ مِرَّةٍ حَصِدٍ وَّنُجْحُ صَرِيْمَةٍ اِبْرَامُهَا

وَاعْلَمْ اَنَّ هٰذِهِ الْقَصَائِدَ مَعْرُوْفَةٌ بِغَايَةِ الْاِشْتِهَارِ كَالشَّمْسِ فِيْ نِصْفِ النَّهَارِ وَقَدْ اَجْمَعَ كَافَّةُ الْاُدَبَاءِ وَجَهَابِذُ الشُّعَرَاءِ عَلٰى فَضْلِهَا وَكَمَالِ بَرَاعَتِهَا وَاتَّفَقَ عَامَّةُ الْبُلَغَاءِ عَلٰى حُسْنِهَا وَنَبَاهَتِهَا وَاخْتَارَهَا الْحُكُوْمَةُ الْاِنْكِلِيْزِيَّةُ لِطُلَبَاءِ مَدَارِسِهَا وَسُبَقَاءِ كَوَالِجِهَا وَشُرَبَاءِ رَكِيَالِجِهَا لِتَكْمِيْلِ الْقَارِئِيْنَ۔ وَلَا يُنْكِرُهَا اِلَّا الَّذِيْ مِثْلُكَ غَبِيٌّ وَّشَقِيٌّ كَعَمِيْنَ۔

هٰذَا مَا اَوْرَدْنَا لِاِلْزَامِكَ وَاِفْحَامِكَ مِنْ نَظَائِرِ الْمُتَقَدِّمِيْنَ وَكَلَامِ الْمَشْهُوْرِيْنَ الْمَقْبُوْلِيْنَ۔ وَاَمَّا مَا يَظْهَرُ مِنْ سِيَاقِ كَلَامِ اللّٰهِ وَسِبَاقِهٖ وَمِنْ عِقْدِ دُرَرِ حِقَاقِهٖ فَهُوَ طَرِيْقٌ اَقْرَبُ مِنْ ذٰلِكَ لِلْمُسْتَرْشِدِيْنَ۔ فَاِنَّهٗ تَعَالٰى كَمَا وَصَفَ رُوْحَ الْقُدُسِ بِقَوْلِهٖ ذُوْ مِرَّةٍ كَذٰلِكَ وَصَفَهٗ فِيْ مَقَامٍ اٰخَرَ بِذِيْ قُوَّةٍ فَقَالَ ذُوْ قُوَّةٍ عِنْدَ

کافی نہ ہو حالانکہ وہ کافی ہے اور تُو ایامِ جاہلیت کا کوئی شعر اِس کی تائید میں طلب کرے تو یہ بیت غور سے پڑھ جو سبعہ معلقہ میں سے چوتھے قصیدہ کے لکھنے والے کا ہے جس کا مؤلف ادباء زمان اور فصحاء اقران میں سے تھا اور ڈیڑھ سَو برس کی عمر تک پہنچا تھا۔

رَجَعَا بِاَمْرِهِمَا اِلٰى ذِيْ مِرَّةٍ حَصِدٍ وَّنُجْحُ صَرِيْمَةٍ اِبْرَامُهَا

وہ دونوں ذِی مِرّہ کی طرف یعنی ذی عقل کی طرف متوجہ ہوئے اور قصد کو پختہ کرنے سے مقاصد حاصل ہو جایا کرتے ہیں۔
اور جاننا چاہیئے کہ یہ قصائد غایت درجہ پر مشہور ہیں جیسے سُورج دوپہر کے وقت۔ اور تمام جماعت فصیح شعراء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ یہ اشعار فصاحت اور بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر ہیں اور اس کی حُسن اور خوبی پر شعراء کا اتفاق ہے اور حکومتِ انگریزی نے اِس کتاب کو اپنے مدارسِ تعلیمیہ میں کالجوں کے پڑھنے والوں اور علوم ادبیہ کے پیالے پینے والوں کے لئے ان کی تکمیلِ تعلیم کی غرض سے داخل کیا ہے اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا بجز اُس شخص کے جو تیرے جیسا غبی اور شقی اور اندھوں کی طرح ہو۔
یہ وہ نظائر شعراء متقدمین ہیں جن سے تیرا الزام اور اِفحام مقصود ہے مگر وہ امر جو کلامِ الٰہی کے سیاق سباق اور اس کے موتیوں کی لڑیوں کے حقہ سے معلوم ہوتا ہے تو وہ طریق ہدایت طلبوں کے لئے بہت قریب ہے کیونکہ اللہ جل شانہٗ نے جیسا کہ رُوح القدس کو ذُو مِرّہ کے ساتھ موصوف کیا ہے اسی طرح دوسرے مقام میں ذِیْ قُوَّۃٍ

ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ۔ فَقَوْلُہٗ فِیْ مَقَامٍ ذُوْمِرَّۃٍ وَفِیْ مَقَامٍ ذُوْقُوَّۃٍ شَرْحٌ لَطِیْفٌ بِاَفَانِیْنِ الْبَیَانِ۔ وَکَذٰلِکَ جَرَتْ سُنَّۃُ اللّٰہِ فِی الْقُرْاٰنِ فَاِنَّہٗ یُفَسِّرُ بَعْضَ مَقَامَاتِہٖ بِبَعْضٍ اٰخَرَ لِیَزِیْدَ الْاِطْمِیْنَانُ وَلِیَعْصِمَ کِتَابَہٗ مِنْ تَحْرِیْفِ الْخَائِنِیْنَ۔

وَلَقَدْ ذَکَرَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ کِتَابِہِ الْمُحْکَمِ وَسِفْرِہِ الْمُکَرَّمِ صِفَاتٍ اُخْرٰی لِلرُّوْحِ الْاَمِیْنِ وَبَیَّنَ عِبَارَتَہٗ وَصِدْقَہٗ وَاَمَانَتَہٗ وَقُرْبَہٗ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ فَلَا یَحْسِبُہٗ شَیْطَانًا اِلَّا الَّذِیْ ھُوَ شَیْطَانٌ لَعِیْنٌ۔

(نور الحق حصّہ اوّل صفحہ ۱۲۵ تا ۱۲۸)

تیسرا درجہ محبت کا وہ ہے جس میں ایک نہایت افروختہ شعلہ محبّتِ الٰہی کا انسانی محبت کے مستعد فتیلہ پر پڑ کر اس کو افروختہ کر دیتا ہے اور اس کے تمام اجزاء اور تمام رگ و ریشہ پر استیلاء پکڑ کر اپنے وجود کا اتم اور اکمل مظہر اس کو بنا دیتا ہے اور اس حالت میں آتشِ محبتِ الٰہی لوحِ قلبِ انسان کو نہ صرف ایک چمک بخشتی ہے بلکہ معًا اس چمک کے ساتھ تمام وجود بھڑک اُٹھتا ہے اور اس کی لوئیں اور شعلے اِردگرد کو روزِ روشن کی طرح روشن کر دیتے ہیں اور کسی قسم کی تاریکی باقی نہیں رہتی اور پورے طور پر اور تمام صفاتِ کاملہ کے ساتھ وہ سارا وجود آگ ہی آگ ہو جاتا ہے اور یہ کیفیّت جو ایک آتش افروختہ کی صورت پر دونوں محبّتوں کے جوڑ سے پیدا ہو جاتی ہے اُس کو رُوحِ امین کے نام سے بولتے ہیں کیونکہ یہ ہر یک تاریکی سے امن بخشتی ہے اور ہر یک غبار سے خالی ہے اور اس کا نام شدید القویٰ بھی ہے کیونکہ یہ اعلیٰ درجہ کی طاقت وحی ہے جس سے قوی تر وحی متصوّر نہیں اور اس کا نام ذوالافق الاعلیٰ بھی ہے کیونکہ یہ وحیِ الٰہی کے اِنتہائی درجہ کی تجلّی ہے اور اس کو رَاٰی مَارَاٰی کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے کیونکہ اس کیفیّت کا اندازہ تمام مخلوقات کے قیاس اور گمان اور وہم سے باہر ہے اور یہ کیفیّت صرف دُنیا میں ایک ہی انسان کو ملی ہے جو

کے ساتھ منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ ذُوْقُوَّۃٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ۔ پس خدا تعالیٰ کا ایک مقام میں جبرائیل کو ذُوْمِرَّۃٍ کہنا اور دوسرے مقام میں ذُوْمِرَّہ کی جگہ ذُوْقُوَّۃ کہہ دینا یہ ذُوْمِرَّہ کے معنے کی ایک شرحِ لطیف ہے جو تبدیل بیان سے کی گئی ہے اور اسی طرح قرآن کریم میں اللہ جلّ شانہٗ کی یہی سُنّت جاری ہے کہ بعض مقامات قرآن اس کے بعض آخر کے لئے بطور تفسیر ہیں تا کہ خدا تعالیٰ اپنی کتاب کو خیانت کرنے والوں کی تحریف سے بچاوے۔

اور خدا تعالیٰ نے اپنی محکم کتاب اور بزرگ صحیفوں میں رُوح القدس کے اَور صفات بھی بیان کئے ہیں اور اُسکی پاکیزگی اور اس کی سچائی اور اس کی امانت اور اس کے قُربِ خدا کا ذکر کیا ہے۔ پس اس کو شیطان وہی سمجھے گا جو خود شیطان ہے۔

(نور الحق حصّہ اوّل صفحہ ۱۲۵ تا ۱۲۸)

انسانِ کامل ہے جس پر تمام سلسلہ انسانیہ کا ختم ہوگیا ہے اور دائرہ استعدادات بشریہ کا کمال کو پہنچا ہے اور وہ درحقیقت پیدائش الٰہی کے خطِ ممتد کی اعلیٰ طرف کا آخری نقطہ ہے جو ارتفاع کے تمام مراتب کا انتہاء ہے۔ حکمتِ الٰہی کے ہاتھ نے اَدنیٰ سے اَدنیٰ خلقت سے اور اسفل سے اسفل مخلوق سے سلسلہ پیدائش کا شروع کر کے اُس اعلیٰ درجہ کے نقطہ تک پہنچا دیا ہے جس کا نام دوسرے لفظوں میں محمدؐ ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ نہایت تعریف کیا گیا یعنی کمالاتِ تامہ کا مظہر۔ (توضیح مرام صفحہ ۲۵، ۲۶)

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے الہام اَرَدْتُّ اَنْ اَسْتَخْلِفَ فَخَلَقْتُ اٰدَمَ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ کی تشریح میں فرماتے ہیں:۔

اِس جگہ خلیفہ کے لفظ سے ایسا شخص مراد ہے کہ جو ارشاد اور ہدایت کے لئے بَین اللہ وبَین الخلق واسطہ ہو۔ خلافت ظاہری کہ جو سلطنت اور حکمرانی پر اطلاق پاتی ہے مراد نہیں ہے اور نہ وہ بجز قریش کے کسی دوسرے کے لئے خدا کی طرف سے شریعتِ اسلام میں مسلّم ہو سکتی ہے بلکہ یہ محض رُوحانی مراتب اور رُوحانی نیابت کا ذکر ہے اور آدم کے لفظ سے بھی وہ آدم جو ابوالبشر ہے مراد نہیں بلکہ ایسا شخص مراد ہے جس سے سلسلہ ارشاد اور ہدایت کا قائم ہو کر رُوحانی پیدائش کی بنیاد ڈالی جائے گویا وہ رُوحانی زندگی کے رُو سے حق کے طالبوں کا باپ ہے اور یہ ایک عظیم الشان پیشگوئی ہے جس میں رُوحانی سلسلہ کے قائم ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ اس سلسلہ کا نام ونشان نہیں پھر بعد اس کے اس رُوحانی آدم کا رُوحانی مرتبہ بیان فرمایا اور کہا دَنَا فَتَدَلّٰی ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝ جب یہ آیتِ شریفہ جو قرآن شریف کی آیت ہے الہام ہوئی تو اس کے معنے کی تشخیص اور تعیین میں تامّل تھا اور اسی تامّل میں کچھ خفیف سی خواب آگئی اور اس خواب میں اس کے معنے حل کئے گئے۔ اِس کی تفصیل یہ ہے کہ دنوّ سے مراد قُربِ الٰہی ہے اور قُرب کسی حرکتِ مکانی کا نام نہیں بلکہ اس وقت انسان کو مقربِ الٰہی بولا جاتا ہے کہ جب وہ ارادہ اور نفس اور خلق اور تمام اضداد اور اغیار سے بکلّی الگ ہو کر طاعت اور محبّتِ الٰہی میں سراپا محو ہو جاوے اور ہر ایک ماسوا اللہ سے پُوری دُوری حاصل کر لیوے اور محبّتِ الٰہی کے دریا میں ایسا ڈوبے کہ کچھ اثر وجود اور انانیّت کا باقی نہ رہے اور جب تک اپنی ہستی کے لوث سے مبرّا نہیں اور بقا باللہ کے پیرایہ سے متحلّی نہیں تب تک اس قُرب کی لیاقت نہیں رکھتا اور بقا باللہ کا مرتبہ تب حاصل ہوتا ہے کہ جب خدا کی محبّت ہی انسان کی غذا ہو جائے اور ایسی حالت ہو جائے کہ بغیر اس کی یاد کے جی ہی نہیں سکتا اور اس کے غیر کا دل میں سمانا موت کی طرح دکھائی دے اور صریح مشہود ہو کہ وہ اسی کے ساتھ جیتا ہے اور ایسا خدا کی طرف کھینچا جاوے جو دل اس کا ہر وقت یادِ الٰہی میں مستغرق اور اس کے درد سے دردمند

ہے اور ماسوا سے اِس قدر نفرت پیدا ہو جائے کہ گویا غیر اللہ سے اس کی عداوت ذاتی ہے جن کی طرف میل کرنے سے بالطبع دُکھ اُٹھاتا ہے۔ جب یہ حالت متحقق ہوگی تو دل جو موردِ انوارِ الٰہی ہے خوب صاف ہوگا اور اسماء اور صفاتِ الٰہی کا اُس میں اِنعکاس ہو کر ایک دوسرا کمال جو تدلّی ہے عارف کے لئے پیش آئے گا اور تدلّی سے مراد وہ ہبوط اور نزول ہے کہ جب اِنسان تخلّق باخلاق اللہ حاصل کر کے اُس ذاتِ رحمٰن و رحیم کی طرف شفقتاً علی العباد عالمِ خلق کی طرف رجوع کرے اور چونکہ کمالاتِ دنوّ کے کمالاتِ تدلّی سے لازم ملزوم ہیں پس تدلّی اسی قدر ہوگی جس قدر دنوّ ہے اور دنوّ کی کمالیت اسی میں ہے کہ اسماء اور صفاتِ الٰہی کے عکوس کا سالک کے قلب میں ظہور ہو اور محبوبِ حقیقی بے شائبۂ ظلّیت اور بے توّاہم حالیّت و محلیّت اپنے تمام صفاتِ کاملہ کے ساتھ اس میں ظہور فرمائے اور یہی اِستخلاف کی حقیقت اور رُوح اللہ کی نفخ کی ماہیّت ہے اور یہی تخلّق باخلاق اللہ کی اصل بُنیاد ہے۔ اور جبکہ تدلّی کی حقیقت کو تخلّق باخلاق اللہ لازم ہؤا اور کمالیت فی التخلّق اِس بات کو چاہتی ہے کہ شفقت علی العباد اور اُن کے لئے بمقام نصیحت کھڑے ہونا اور اُن کی بھلائی کے لئے بدل و جان مصروف ہو جانا اس حد تک پہنچ جائے جس پر زیادت متصوّر نہیں اِس لئے واصل تام کو مجمع الاضداد ہونا پڑا کہ وہ کامل طور پر رُو بخدا بھی ہو اور پھر کامل طور پر رُو بخلق بھی۔ پس وہ ان دونوں قوسوں الوہیّت و انسانیّت میں ایک وتر کی طرح واقعہ ہے جو دونوں طرف سے تعلق کامل رکھتا ہے اب خلاصہ کلام یہ کہ وصول کامل کے لئے دنوّ اور تدلّی دونوں لازم ہیں۔ دنوّ اُس قُربِ تام کا نام ہے کہ جب کامل تزکیہ کے ذریعہ سے انسان کامل سیر الی اللہ سے سیر فی اللہ کے ساتھ متحقق ہو جائے اور اپنی ہستی ناچیز سے بالکل ناپدید ہو کر اور غرق دریائے بیچوں وبیچگوں ہو کر ایک جدید ہستی پیدا کرے جس میں بیگانگی اور دُوئی اور جہل اور نادانی نہیں ہے اور صبغۃ اللہ کے پاک رنگ سے کامل رنگینی میسّر ہے اور تدلّی انسان کی اس حالت کا نام ہے کہ جب وہ تخلّق باخلاق اللہ کے بعد ربّانی شفقتوں اور رحمتوں سے رنگین ہو کر خدا کے بندوں کی طرف اصلاح اور فائدہ رسانی کے لئے رجوع کرے۔ پس جاننا چاہیئے کہ اِس جگہ ایک ہی دِل میں ایک ہی حالت اور نیّت کے ساتھ دو قسم کا رجوع پایا گیا ایک خدائے تعالیٰ کی طرف جو وجودِ قدیم ہے اور ایک اس کے بندوں کی طرف جو وجودِ محدث ہے اور دونوں قسم کا وجود یعنی قدیم اور حادث ایک دائرہ کی طرح ہے جس کی طرف اعلیٰ وجوب اور طرف اسفل اِمکان ہے۔ اب اِس دائرہ کے درمیان میں انسانِ کامل بوجہ دنوّ اور تدلّی کی دونوں طرف سے اتّصال محکم کر کے یُوں مثالی طور پر صورت پیدا کر لیتا ہے۔ جیسے ایک وتر دائرہ کے دو قوسوں میں ہوتا ہے یعنی حق اور خلق میں واسطہ ٹھہر جاتا ہے۔ پہلے اُس کو دنوّ اور قُربِ الٰہی کی خلعتِ خاص عطا کی جاتی ہے اور قُرب کے اعلیٰ مقام تک صعود کرتا ہے اور پھر خلقت کی طرف اُس کو لایا جاتا ہے۔ پس اُس کا وہ صعود اور نزول دو قوس کی صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے اور نفس جامع التعلقین انسانِ کامل کا ان دونوں قوسوں میں قابِ قوسین کی

طرح ہوتا ہے اور قاب عرب کے محاورہ میں کمان کے چلّہ پر اطلاق پاتا ہے۔ پس آیت کے بطور تحت اللفظ یہ معنے ہوئے کہ نزدیک ہؤا یعنی خدا سے پھر اُترا یعنی خلقت پر پس اپنے اس صعود اور نزول کی وجہ سے دو قوسوں کے لئے ایک ہی وتر ہو گیا اور چونکہ اُس کا رُو بخلق ہونا چشمۂ صافیہ تخلّق باخلاق اللہ سے ہے اِس لئے اُس کی توجہ بمخلوق توجہ بخالق کے عین ہے یا یُوں سمجھو کہ چونکہ مالکِ حقیقی اپنی غایت شفقت علی العباد کی وجہ سے اِس قدر بندوں کی طرف رجوع رکھتا ہے کہ گویا وہ بندوں کے پاس ہی خیمہ زن ہے پس جبکہ سالک سیر اِلی اللہ کرتا کرتا اپنی کمال سیر کو پہنچ گیا۔ تو جہاں خدا تھا وہیں اُس کو لَوٹ کر آنا پڑا پس اِس کمال دنوّ یعنی قُربِ تام اُس کی تدلّی یعنی ہبوط کا موجب ہو گیا۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۹۲ تا ۴۹۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

پھر نزدیک ہؤا (یعنی اللہ تعالیٰ سے) پھر نیچے کی طرف اُترا (یعنی مخلوق کی طرف تبلیغ احکام کے لئے نزول کیا) پس اسی جہت سے کہ وہ اُوپر کی طرف صعود کرکے اِنتہائی درجہ قُربِ تام کو پہنچا اور اُس میں اور حق میں کوئی حجاب نہ رہا اور پھر نیچے کی طرف اُس نے نزول کیا اور اس میں اور خلق میں کوئی حجاب نہ رہا یعنی چونکہ وہ اپنے صعود اور نزول میں اتم و اکمل ہؤا اور کمالاتِ اِنتہائیہ تک پہنچ گیا اِس لئے دو قوسوں کے بیچ میں یعنی وتر کی جگہ میں جو قطر دائرہ ہے اتم و اکمل طور پر اُس کا مقام ہؤا بلکہ وہ قوسِ الوہیّت اور قوسِ عبودیّت کی طرف اس سے بھی زیادہ تر جو خیال و گمان و قیاس میں نہیں آسکتا نزدیک ہؤا مثلاً صورت ان دو قوسوں کی یہ ہے

اِس شکل میں جو خط مرکز دائرہ کو قطع کرتا ہے یعنی جو قطر دائرہ ہے وہی قاب قوسین یعنی دونوں قوسوں کا وتر ہے۔ جاننا چاہیئے کہ دونوں قسم وجود واجب اور ممکن کے ایک ایسے دائرہ کی طرح ہیں کہ جو خط گذرندہ برمرکز سے دونوں قوسوں پر مُنقسم ہو۔ وہی خط جو قطر دائرہ ہے جس کو قرآن شریف میں قاب قوسین سے تعبیر کیا ہے اور عام بول چال علمِ ہندسہ میں اُس کو وتر قوسین کہتے ہیں وہ ذات مفیض اور مستفیض میں بطور برزخ واقع ہے کہ جو اپنے اخص کمال میں جو انتہائے درجہ کمالات کا ہے نقطۂ مرکز دائرہ سے جو وتر قوس کا درمیانی نقطہ ہے مشابہت رکھتا ہے۔ یہی نقطہ تمام کمالاتِ انسانِ کامل کا دل ہے جو قوس الوہیّت و عبودیّت کی طرف بخطوط مساوی نسبت رکھتا ہے اور یہی نقطہ ارفع نقاط اُن خطوطِ عمودیہ کا ہے جو محیط سے قطر دائرہ تک کھینچے جائیں۔ اگرچہ وتر قوسین اور بہت سے ایسے نقاط تالیف یافتہ ہیں جو درحقیقت کمالاتِ رُوحانیہ صاحبِ وتر کے صوَر محسوسہ ہیں لیکن بجز ایک نقطہ مرکز کے اَور جس قدر نقاط وتر ہیں اُن میں دوسرے انبیاء و رُسل و اَرباب صدق و صفا بھی شریک ہیں اور نقطہ مرکز اُس کمال کی صورت ہے کہ جو صاحبِ وتر کو بہ نسبت جمیع دوسرے کمالات کے اعلیٰ و اَرفع و اخص و ممتاز طور پر حاصل ہے جس میں حقیقی طور پر مخلوق میں سے کوئی اُس کا شریک نہیں ہاں اتّباع و پَیروی سے ظلّی طور پر شریک ہو سکتا ہے۔ اب جاننا چاہیئے کہ دراصل اُس نقطہ وسطی کا نام حقیقتِ محمّدیّہ ہے جو اجمالی طور

پر جمیع حقائقِ عالم کا منبع واصل ہے اور درحقیقت اُسی ایک نقطہ سے خطِ وتر انبساط و امتداد پذیر ہؤا ہے اور اُسی نقطہ کی رُوحانیت تمام خطِ وتر میں ایک ھویّت ساریہ ہے جس کا فیضِ اقدس اُس سارے خط کو تعیّن بخش ہو گیا ہے عالم جس کو متصوّفین اسماء اللہ سے بھی تعبیر کرتے ہیں اُس کا اوّل و اعلیٰ مظہر جس سے وہ علیٰ وجہ التفصیل صدور پذیر ہؤا ہے یہی نقطہ درمیانی ہے جس کو اِصطلاحات اہل اللہ میں نفسی نقطہ احمد مجتبیٰ و محمد مصطفیٰ نام رکھتے ہیں اور فلاسفہ کی اِصطلاحات میں عقل اوّل کے نام سے بھی موسُوم کیا گیا ہے اور اس نقطہ کو دوسرے وتری نقاط کی طرف وہی نسبت ہے جو اسمِ اعظم کو دوسرے اسماء الٰہیہ کی طرف نسبت واقع ہے۔ غرض سرچشمہ رموزِ غیبی و مفتاح کنوز لاریبی اور انسانِ کامل دکھلانے کا آئینہ یہی نقطہ ہے اور تمام اسرار مبدء و معاد کی علّتِ غائی اور ہریک زیر و بالا کی پیدائش کی لمیّت یہی ہے جس کے تصوّر بالکنہ و تصوّر بکنہ سے تمام عقول و افہام بشریّہ عاجز ہیں اور جس طرح ہریک حیات خدائے تعالیٰ کی حیات سے مستفاض اور ہریک وجود اُس کے وجود سے ظہور پذیر اور ہریک تعیّن اُس کے تعیّن سے خلعت پوش ہے۔ ایسا ہی نقطہ محمدیّہ جمیع مراتب اکوان اور خطائر امکان میں باذنہٖ تعالیٰ حسبِ استعدادات مختلفہ و طبائع متفاوتہ مؤثر ہے اور چونکہ یہ نقطہ جمیع مراتبِ الٰہیّہ کا ظلّی طور پر اور جمیع مراتب کونیہ کا طبعی و اصلی طور پر جامع بلکہ انہیں دونوں کا مجموعہ ہے اِس لئے یہ ہریک مرتبہ کونیہ پر جو عقول و نفوس کلّیہ و جُزئیہ و مراتب طبعیہ الی آخر تنزّلات وجود سے مراد ہے اجمالی طور پر احاطہ رکھتا ہے۔ ایسا ہی ظلّ الوہیّت ہونے کی وجہ سے مرتبہ الٰہیّہ سے اِس کو ایسی مشابہت ہے جیسے آئینہ کے عکس کو اپنے اصل سے ہوتی ہے اور اُمّہاتِ صفاتِ الٰہیّہ یعنی حیوٰۃ، علم، ارادہ، قدرت، سمع، بصر، کلام مع اپنے جمیع فروع کے اتم و اکمل طور پر اس میں اِنعکاس پذیر ہیں۔ اس نقطہ مرکز کو جو برزخ بَین اللہ وَبین الخلق ہے یعنی نفسی نقطہ سیّدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجرّد کلمۃ اللہ کے مفہوم تک محدود نہیں کر سکتے جیسا کہ مسیح کو اس نام سے محدود کیا گیا ہے کیونکہ یہ نقطہ محمدیّہ ظلّی طور پر مستجمع جمیع مراتب الوہیّت ہے اِسی وجہ سے تمثیلی بیان میں حضرت مسیح کو ابن سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ بباعث اُسی نقصان کے جو اُن میں باقی رہ گیا ہے کیونکہ حقیقتِ عیسویّہ مظہرِ اتم صفاتِ الوہیّت نہیں ہے بلکہ اُس کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے برخلاف حقیقتِ محمدیہ کے کہ وہ جمیع صفاتِ الٰہیّہ کا اتم و اکمل مظہر ہے جس کا ثبوت عقلی و نقلی طور پر کمال درجہ پر پہنچ گیا ہے سو اِسی وجہ سے تمثیلی بیان میں ظلّی طور پر خدائے قادر و ذُوالجلال سے آنحضرتؐ کو آسمانی کتابوں میں تشبیہہ دی گئی ہے جو ابن کے لئے بجائے اَب ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم کا اضافی طور پر ناقص ہونا اور قرآنی تعلیم کا سب الہامی تعلیموں سے اکمل و اتم ہونا وہ بھی درحقیقت اِسی بناء پر ہے کیونکہ ناقص پر ناقص فیضان ہوتا ہے اور اکمل پر اکمل۔

اور جو تشبیہات قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ظلّی طور پر خداوند قادرِ مطلق سے دی گئی ہیں اُن میں سے ایک یہی آیت ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۝ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝ یعنی وہ (حضرت

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی ترقیاتِ کاملہ قُرب کی وجہ سے دو قوسوں میں بطور وتر کے واقع ہے بلکہ اس سے نزدیک تر۔ اب ظاہر ہے کہ وتر کی طرف اعلیٰ میں قوسِ الوہیت ہے سو جب کہ نفسِ پاک محمدی اپنے شدّتِ قُرب اور نہایت درجہ کی صفائی کی وجہ سے وتر کی حد سے آگے بڑھا اور دریائے الوہیت سے نزدیک تر ہوا تو اس ناپیدا کنار دریا میں جا پڑا اور الوہیت کے بحرِ اعظم میں ذرہ بشریت گُم ہوگیا اور یہ بڑھنا نہ مستحدث اور جدید طور پر بلکہ وہ ازل سے بڑھا ہوا تھا۔ اور ظلّی اور مستعار طور پر اِس بات کے لائق تھا کہ آسمانی صحیفے اور الہامی تحریریں اُس کو مظہرِ اتم الوہیت قرار دیں اور آئینہ حق نما اُس کو ٹھہرا دیں۔ (سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۱۶ تا ۲۲۷ حاشیہ)

وَلَارَيْبَ اَنَّ نَبِيَّنَا سُمِّیَ مُحَمَّدًا لِمَا اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَهٗ مَحْبُوْبًا فِیْ اَعْيُنِهٖ وَاَعْيُنِ الصَّالِحِيْنَ۔ وَ كَذٰلِكَ سَمَّاهُ اَحْمَدَ لِمَا اَرَادَ سُبْحَانَهٗ اَنْ يَّجْعَلَهٗ مُحِبَّ ذَاتِهٖ وَمُحِبَّ الْمُؤْمِنِيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ فَهُوَ مُحَمَّدٌ بِشَانٍ وَ اَحْمَدُ بِشَانٍ۔ وَاخْتُصَّ اَحَدُ هٰذَيْنِ الْاِسْمَيْنِ بِزَمَانٍ وَالْاٰخَرُ بِزَمَانٍ۔ وَقَدْ اَشَارَ اِلَيْهِ سُبْحَانَهٗ فِیْ قَوْلِهٖ دَنَا فَتَدَلّٰی۔ وَفِیْ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۰۶)

.... سید الانبیاء وخیر الورٰی مولانا وسیدنا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم الشان رُوحانی حُسن لے کر آئے جس کی تعریف میں یہی آیت کافی ہے دَنَا فَتَدَلّٰی۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی یعنی وہ نبی جنابِ الٰہی کے بہت نزدیک چلا گیا اور پھر مخلوق کی طرف جھکا اور اِس طرح پر دونوں حِصّوں کو جو حق اللہ اور حق العباد ہے ادا کر دیا اور دونوں قسم کا حُسنِ رُوحانی ظاہر کیا اور دونوں قوسوں میں وتر کی طرح ہوگیا یعنی دونوں قوسوں میں جو ایک درمیانی خط کی طرح ہو اور اس طرح اُس کا وجود واقع ہُوا جیسے یہ

خالق قوس | مخلوق قوس

درمیانی خط آنحضرتؐ

ترجمہ از مرتب :- بلاشک ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محمد رکھا گیا تاکہ آپ کو (اللہ تعالیٰ) اپنی نظر میں اور لوگوں کی نظر میں محبوب ٹھہرائے۔ اور اسی طرح آپ کا نام احمد رکھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا تھا کہ آپ کو اپنی ذات اور مومن اور مسلمان لوگوں کا مُحبّ قرار دے۔ پس آپ کی دو شانیں ہیں ایک شان کے لحاظ سے آپ محمد ہیں اور دوسری شان کے لحاظ سے آپ احمد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے ایک نام کو ایک زمانہ سے اور دوسرے نام کو دوسرے زمانہ سے خاص کر دیا۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے قول ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی اور فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی میں اشارہ کیا ہے۔

(اعجاز المسیح صفحہ ۱۰۶)

اس حُسن کو ناپاک طبع اور اَندھے لوگوں نے نہ دیکھا جیساکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَھُمْ لَایُبْصِرُوْنَ[1] یعنی تیری طرف وہ دیکھتے ہیں مگر تُو انہیں دکھائی نہیں دیتا۔ آخر وہ سب اندھے ہلاک ہوگئے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۶۲)

یاد رہے تَدَلّٰی کا مجرّد دلو ہے اور دلو کہتے ہیں ڈول کو کنوئیں کے اندر ڈبونا تا پانی اس کے اندر بھر جائے اور دوسرے معنی دلو کے یہ ہیں کہ کسی کو اپنا شفیع پکڑنا پس تَدَلّٰی کے معنے ہیں کہ شفاعت کے لئے دُور افتادہ لوگوں کی طرف بکمال ہمدردی وغم خواری توجہ کرنا اور اُن سے بہت نزدیک ہو کر اُن کا مکدر پانی اُٹھانا اور پاک پانی ان کو عطا کرنا۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۱ ص۵ صفحہ ۱۸۴)

مقامِ شفاعت کی طرف قرآن شریف میں اشارہ فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انسانِ کامل ہونے کی شان میں فرمایا ہے دَنَا فَتَدَلّٰی۔ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی یعنی یہ رسول خدا کی طرف چڑھا اور جہاں تک اِمکان میں ہے خدا سے نزدیک ہوُا اور قُرب کے تمام کمالات کو طے کیا اور لاہوتی مقام سے پُورا حصّہ لیا اور پھر ناسوت کی طرف کامل رجوع کیا یعنی عبودیت کے اِنتہائی نقطہ تک اپنے تئیں پہنچایا اور بشریّت کے پاک لوازم یعنی بنی نوع کی ہمدردی اور محبت سے جو ناسوتی کمال کہلاتا ہے پُورا حصّہ لیا لہٰذا ایک طرف خدا کی محبت میں کمالِ تام تک پہنچا پس چونکہ وہ کامل طور پر خدا سے قریب ہوُا اور پھر کامل طور پر بنی نوع سے قریب ہوُا اِس لئے دونوں طرف کے مساوی قُرب کی وجہ سے ایسا ہو گیا جیساکہ وہ دُو قوسوں میں ایک خط ہوتا ہے لہٰذا وہ شرط جو شفاعت کے لئے ضروری ہے اس میں پائی گئی اور خدا نے اپنے کلام میں اس کے لئے گواہی دی کہ وہ اپنے بنی نوع میں اور اپنے خدا میں ایسے طور سے درمیان ہے جیساکہ وتر دُو قوسوں کے درمیان ہوتا ہے۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۱ ص۵ صفحہ ۱۸۲)

انسان اور خدا کے درمیان بھی برزخ ہے اور وہ تجلّیات ہیں چنانچہ اس مقام اور مرتبہ کی طرف خدا تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علوِ مرتبہ کا بیان ہے کیونکہ یہ مرتبہ اس انسانِ کامل کو مِل سکتا ہے جو عبودیت اور الوہیّت کی دونوں قوسوں کے درمیان ہو کر ایسا شدید اور قوی تعلق پکڑتا ہے گویا ان دونوں کا عین ہو جاتا ہے اور اپنے نفس کو درمیان سے اُٹھا کر ایک مصفا آئینہ کا حکم پیدا کر لیتا ہے اور اس تعلق کی دو جہتیں ہوتی ہیں ایک جہت سے یعنی اُوپر کی طرف سے وہ تمام انوار و فیوضِ الٰہیّہ کو جذب کرتا ہے اور دوسری طرف سے وہ تمام فیوض بنی نوع کو حسبِ استعداد

---

[1] سورۃ الاعراف: ۱۹۹

پہنچاتا ہے۔ پس ایک تعلق اس کا الوہیت سے اور دوسرا بنی نوع سے جیسا کہ اِس آیت میں صاف معلوم ہوتا ہے یعنی پھر نزدیک سے (یعنی اللہ تعالیٰ سے) پھر نیچے کی طرف اُترا یعنی مخلوق کی طرف اُترا (یعنی مخلوق کی طرف تبلیغ احکام کے لئے نزول کیا) پس وہ ان تعلقاتِ قُرب کے مراتبِ تام کی وجہ سے دو قوسوں کے وتر کی طرح ہو گیا بلکہ قوسِ الوہیت اور عبودیت کی طرف اس سے بھی زیادہ قُرب ہوگیا چونکہ دنو قُرب سے اَبلغ تر ہے اِس لئے خدا نے اِس لفظ کو استعمال فرمایا اور یہی نقطہ جو برزخ بَین اللہ وَبین الخلق ہے نفسی نقطہ سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے لیتے اور بنی نوع کو پہنچاتے ہیں اِس لئے آپؐ کا نام قاسم بھی ہے۔ (الحکم جلد ۵ ۴۲ مورخہ ۱۷ر نومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

شفیع کا لفظ شفع سے نکلا ہے جس کے معنے جُفت کے ہیں۔ اِس لئے شفیع وہ ہو سکتا ہے جو دُو مقامات کا مظہرِ اتم ہو یعنی مظہرِ کامل لاہوت اور ناسوت کا ہو۔ لاہوتی مقام کا مظہرِ کامل ہونے سے یہ مراد ہے کہ اس کا خدا کی طرف صعود ہو۔ وہ خدا سے حاصل کرے۔ اور ناسوتی مقام کے مظہر کا یہ مفہوم ہے کہ مخلوق کی طرف اس کا نزول ہو جو خدا سے حاصل کرے وہ مخلوق کو پہنچا دے اور مظہرِ کامل ان مقامات کا ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اِسی کی طرف اشارہ ہے دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى۔

(الحکم جلد ۶ ۸ مورخہ ۲۸ر فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

دَنَا فَتَدَلّٰى آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُوپر کی طرف ہو کر نوعِ انسان کی طرف جُھکا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال اعلیٰ درجہ کا کمال ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی اور اس کمال میں آپ کے دُو درجے بیان فرمائے ہیں ایک صعود، دوسرا نزول۔ اللہ تعالیٰ کی طرف تو آپؐ کا صعود ہوُا یعنی خدا تعالیٰ کی محبت اور صدق و وفا میں ایسے کھینچے گئے کہ خود اس ذاتِ اقدس کے دنوّ کا درجہ آپؐ کو عطا ہُوا۔ دنوّ اقرب سے ابلغ ہے اِس لئے یہاں یہ لفظ اختیار کیا۔ جب اللہ تعالیٰ کے فیوضات اور برکات سے آپؐ نے حصّہ لیا تو پھر بنی نوع پر رحمت کے لئے نزول فرمایا۔ یہ وہی رحمت تھی جس کا اشارہ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ[1] میں فرمایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اِسم قاسم کا بھی یہی سِرّ ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں اور پھر مخلوق کو پہنچاتے ہیں۔ پس مخلوق کو پہنچانے کے واسطے آپؐ کا نزول ہوُا۔ اِس دَنَا فَتَدَلّٰى میں اسی صعود اور نزول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علوِ مرتبہ کی دلیل ہے۔ (الحکم جلد ۹ ۲۲ مورخہ ۱۰ر ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

---

[1] سورۃ الانبیاء : ۱۰۸

النجم: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ○

اِنتہائی درجہ (ترقیاتِ کاملہ کا) وہ ہے جس کی نسبت لکھا ہے مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ۔ انسان مانۂ سیر سلوک میں اپنے واقعاتِ کشفیہ میں بہت سے عجائبات دیکھتا ہے اور انواع و اقسام کی واردات اُس پر وارد ہوتی ہیں مگر اعلیٰ مقام اس کا عبودیت ہے جن کا لازمہ صحو اور ہوشیاری سے اور سُکر اور شطح سے بکلّی بیزاری ہے۔

(مکتوباتِ احمدیہ جلد اوّل صفحہ ۱۲ مکتوب ۵)

حالتِ تام وہ ہے جس کی طرف اشارہ ہے مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی یہ حالت اہلِ جنّت کے نصیب ہوگی۔

(مکتوب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

مندرجہ الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ ر اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

النجم: اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰی ○ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ○

عیسائیوں کو جواب دیتے وقت بعض اوقات سخت الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں تو یہ بات بالکل صاف ہے جب ہمارا دل بہت دُکھایا جاتا ہے اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر طرح طرح کے ناجائز حملے کئے جاتے ہیں تو صرف متنبہ کرنے کی خاطر انہیں کی مسلّمہ کتب سے الزامی جواب دیئے جاتے ہیں۔

ان لوگوں کو چاہیئے کہ ہماری کوئی بات ایسی نکالیں جو حضرت عیسٰی کے متعلق ہم نے بطور الزامی جواب کے لکھی ہو اور انجیل میں موجود نہ ہو۔ آخر یہ تو ہم سے نہیں ہوسکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین سُنکر چپ رہیں اور اِس قسم کے جواب تو خود قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں جیسے لکھا ہے اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰی (۲۷/۵) فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ (۲۳/۴) وہ لوگ فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا تمہارے بیٹے اور ہماری بیٹیاں۔

غرض اِلزامی رنگ کے جواب دینا تو طریقِ مناظرہ ہے ورنہ ہم حضرت عیسٰی کو خدا تعالیٰ کا رسول اور ایک مقبول اور برگزیدہ انسان سمجھتے ہیں اور جن لوگوں کا دل صاف نہیں اُن کا فیصلہ ہم خدا پر چھوڑتے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۷ ر نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

کیا تمہارے لئے بیٹے اور اس کے لئے بیٹیاں۔ یہ تو ٹھیک ٹھیک تقسیم نہ ہوئی۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۳۵ حاشیہ)

النجم: وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ

مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا

مراد از علم یقین است ظنون را علم نے گویند۔ ایناں اتباع ظن میکنند۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۵ مورخہ ۷ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۴)

ظاہر ہے کہ ظن کوئی چیز نہیں ہے اور جو شخص محض ظن کو پنجہ مارتا ہے وہ مقام بلند حق سے بہت نیچے گرا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا یعنی محض ظن حق الیقین کے مقابلہ پر کچھ چیز نہیں۔
(ریویو بر مباحثہ بٹالوی وچکڑالوی صفحہ ۳)

یاد رکھو ظن مفید نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا یقین ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو بامراد کرسکتی ہے یقین کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔
(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۹ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

۳۳ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۝

وَ اَمَّا مَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ فَفَرِّقْ بَيْنَ تَزْكِيَةِ النَّفْسِ وَ اِظْهَارِ النِّعْمَةِ وَ اِنْ كَانَا مُشَابِهَيْنِ فِي الصُّوْرَةِ فَاِنَّكَ اِذَا عَزَوْتَ الْكَمَالَ اِلٰى نَفْسِكَ وَ رَاَيْتَكَ كَاَنَّكَ شَيْءٌ وَ نَسِيْتَ الْخَالِقَ الَّذِيْ

ترجمہ از مرتب: علم سے مراد یقین ہے ظن کو علم نہیں کہتے۔ یہ لوگ ظن کی پیروی کر رہے ہیں۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۵ مورخہ ۷ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۴)

ترجمہ از مرتب:۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو یہ فرمایا ہے فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ تو اِس آیت کا صحیح مطلب جاننے کے لئے تمہیں تزکیۂ نفس اور اظہار نعمت کے درمیان واضح فرق معلوم ہونا چاہیئے اگرچہ یہ دونوں صورت کے لحاظ سے مشابہ

مَنَّ عَلَيْكَ فَهٰذَا تَزْكِيَةُ النَّفْسِ وَلٰكِنَّكَ إِذَا عَزَوْتَ كَمَالَكَ إِلٰى رَبِّكَ وَرَأَيْتَ كُلَّ نِعْمَةٍ مِنْهُ وَمَا رَأَيْتَ نَفْسَكَ عِنْدَ رُؤْيَةِ الْكَمَالِ بَلْ رَأَيْتَ فِي كُلِّ طَرْفٍ حَوْلَ اللّٰهِ وَقُوَّتَهُ وَمَنَّهُ وَفَضْلَهُ وَوَجَدْتَ نَفْسَكَ كَمَيِّتٍ فِي يَدِ الْغَسَّالِ وَمَا أَضَفْتَ إِلَيْهَا شَيْئًا مِنَ الْكَمَالِ فَهٰذَا هُوَ إِظْهَارُ النِّعْمَةِ۔

(حمامۃ البشریٰ صفحہ ۹۴)

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ معصوم اور محفوظ ہونا تمہارا کام نہیں ہے خدا کا ہے ہر ایک نور اور طاقت آسمان سے ہی آتی ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۹ رجون ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

تزکیۂ نفس ایک ایسی شئی ہے کہ خود بخود نہیں ہوسکتا اس لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى کہ تم یہ خیال نہ کرو کہ ہم اپنے نفس یا عقل کے ذریعہ سے خود بخود مزکّٰی بن جاویں گے۔ یہ بات غلط ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کون متقی ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۶ مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸۲)

کوئی آدمی کسی کو متقی کیونکر یقین کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے لَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ اور فرماتا ہے هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى اور فرماتا ہے اللہ تعالیٰ ہی عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے۔ ہاں مامور من اللہ کے متقی ہونے اور نہ ہونے کے نشانات بیّن ہوتے ہیں نہ اَوروں کے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲۲، ۲۳ مورخہ ۸، ۱۶ جون ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

کبھی یہ دعویٰ نہ کرو کہ مَیں پاک صاف ہوں جیسے کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ کہ تم اپنے آپ کو مزکّٰی مت کہو وہ خود جانتا ہے کہ تم میں سے متقی کون ہے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۳۴ مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

۳۸ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى

خدا تعالیٰ کا قُرب حاصل کرنے کی راہ یہ ہے کہ اس کے لئے صدق دکھایا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ الصّلوٰۃ

ہیں پس جب تم کمال کو اپنے نفس کی طرف منسوب کرو اور تم سمجھو کہ گویا تم بھی کوئی حیثیت رکھتے ہو اور تم اپنے اس خالق کو بھول جاؤ جس نے تم پر احسان کیا تو تمہارا یہ فعل تزکیۂ نفس قرار پائے گا لیکن اگر تم اپنے کمال کو اپنے رب کی طرف منسوب کرو اور تم یہ سمجھو کہ ہر نعمت اللہ کی عطا کردہ ہے اور اپنے کمال کو دیکھتے وقت تم اپنے نفس کو نہ دیکھو بلکہ تم ہر طرف اللہ تعالیٰ کی قوت، اس کی طاقت، اس کا احسان اور اس کا فضل دیکھو اور اپنے آپ کو غسال کے ہاتھ میں محض ایک مُردہ کی طرح پاؤ اور اپنے نفس کی طرف کوئی کمال منسوب نہ کرو تو یہ اظہارِ نعمت ہے۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۹۴)

والسلام نے جو قُرب حاصل کیا تو اس کی وجہ یہی تھی چنانچہ فرمایا ہے وَ اِبۡرٰهِیۡمَ الَّذِیۡ وَفّٰۤی ابراہیم وہ ابراہیم ہے جس نے وفاداری دکھائی۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ وفاداری اور صدق اور اخلاص دکھانا ایک موت چاہتا ہے۔ جب تک اِنسان دُنیا اور اس کی ساری لذتوں اور شوکتوں پر پانی پھیر دینے کو تیار نہ ہو جاوے اور ہر ذلّت اور سختی اور تنگی خدا کے لئے گوارا کرنے کو تیار نہ ہو یہ صفت پیدا نہیں ہوسکتی۔ بُت پرستی یہی نہیں کہ اِنسان کسی درخت یا پتھر کی پرستش کرے بلکہ ہر ایک چیز جو اللہ تعالیٰ کے قُرب سے روکتی اور اس پر مقدم ہوتی ہے وہ بُت ہے اور اس قدر بُت اِنسان اپنے اندر رکھتا ہے کہ اس کو پتہ بھی نہیں لگتا کہ مَیں بُت پرستی کر رہا ہوں۔ پس جب تک خالص خدا تعالیٰ ہی کے لئے نہیں ہو جاتا اور اس کی راہ میں ہر مصیبت برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا صدق اور اخلاص کا رنگ پَیدا ہونا مشکل ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو جو یہ خطاب ملا یہ یُونہی مِل گیا تھا؟ نہیں۔ اِبۡرٰهِیۡمَ الَّذِیۡ وَفّٰۤی کی آواز اس وقت آئی جبکہ وہ بیٹے کی قربانی کے لئے تیار ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ عمل کو چاہتا اور عمل ہی سے راضی ہوتا ہے اور عمل دُکھ سے آتا ہے لیکن جب انسان خدا کے لئے دُکھ اُٹھانے کو تیار ہو جاوے تو خدا تعالیٰ اس کو دُکھ میں بھی نہیں ڈالتا۔ ابراہیم علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کے لئے اپنے بیٹے کو قربان کر دینا چاہا اور پوری تیاری کر لی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بیٹے کو بچا لیا۔ وہ آگ میں ڈالے گئے لیکن آگ ان پر کوئی اثر نہ کر سکی۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں تکلیف اُٹھانے کو تیار ہو جاوے تو خدا تعالیٰ تکالیف سے بچا لیتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ر مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

جب تک اِنسان صدق و صفا کے ساتھ خدا تعالیٰ کا بندہ نہ ہو گا تب تک کوئی درجہ ملنا مشکل ہے جب ابراہیم کی نسبت خدا تعالیٰ نے شہادت دی وَ اِبۡرٰهِیۡمَ الَّذِیۡ وَفّٰۤی کہ ابراہیم وہ شخص ہے جس نے اپنی بات کو پورا کیا تو اس طرح سے اپنے دل کو غیر سے پاک کرنا اور محبتِ الٰہی سے بھرنا، خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق چلنا اور جیسے ظِلّ اصل کا تابع ہوتا ہے ویسے ہی تابع ہونا کہ اس کی اور خدا کی مرضی ایک ہو کوئی فرق نہ ہو۔ یہ سب باتیں دعا سے حاصل ہوتی ہیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۳ مورخہ ۱۶ر نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳۴)

خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف کی ہے جیسا کہ فرمایا ہے اِبۡرٰهِیۡمَ الَّذِیۡ وَفّٰۤی کہ اس نے جو عہد کیا اسے پورا کر کے دکھایا۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲ مورخہ ۸ر جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

تعلّقاتِ الٰہی ہمیشہ پاک بندوں سے ہوُا کرتے ہیں جیسا کہ فرمایا ہے اِبۡرٰهِیۡمَ الَّذِیۡ وَفّٰۤی لوگوں پر جو احسان کرے ہرگز نہ جتلاوے۔ جو ابراہیم کے صفات رکھتا ہے ابراہیم بن سکتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۴ مورخہ ۳۰ر جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

نامرد، بُزدل، بیوفا جو خدا تعالیٰ سے اخلاص اور وفاداری کا تعلق نہیں رکھتا بلکہ دغا دینے والا ہے وہ کس

کام کا ہے اس کی کچھ قدر و قیمت نہیں ہے ساری قیمت اور شرف وفا سے ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو جو شرف اور درجہ ملا وہ کس بناء پر ملا؟ قرآن شریف نے فیصلہ کر دیا ہے اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى ابراہیم وہ ہے جس نے ہمارے ساتھ وفاداری کی آگ میں ڈالے گئے مگر انہوں نے اس کو منظور نہ کیا کہ وہ ان کافروں کو کہہ دیتے کہ تمہارے ٹھاکروں کی پُوجا کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ کے لئے ہر تکلیف اور مصیبت کو برداشت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ خدا تعالیٰ نے کہا کہ اپنی بیوی کو بے آب و دانہ جنگل میں چھوڑ آ۔ انہوں نے فی الفور اس کو قبول کر لیا۔ ہر ایک ابتلاء کو انہوں نے اس طرح پر قبول کر لیا کہ گویا عاشق اللہ تھا۔ درمیان میں کوئی نفسانی غرض نہ تھی۔

(الحکم جلد ۸ ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲،۱)

دُنیا میں بھی اگر ایک نوکر خدمت کرے اور حق وفا کا ادا کرے تو جو محبّت اس سے ہو گی وہ دوسرے سے کیا ہو سکتی ہے۔ جو صرف اِس بات پر ناز کرتا ہے کہ مَیں نے کوئی اُچک پنا نہیں کیا حالانکہ اگر کرتا تو سزا پاتا۔ اِتنی بات سے حقوق قائم نہیں ہو سکتے حقوق تو صرف صدق و وفا سے قائم ہو سکتے ہیں جیسے اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى۔

(البدر جلد ۳ ۸ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

صوفیوں نے لکھا ہے کہ اوائل سلوک میں جو رؤیا یا وحی ہو اس پر توجہ نہیں کرنی چاہیئے وہ اکثر اوقات اس راہ میں روک ہو جاتی ہے۔ اِنسان کی اپنی خوبی اس میں تو کوئی نہیں کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جو وہ کسی کو کوئی اچھی خواب دکھاوے یا کوئی الہام کرے۔ اس نے کیا کیا؟ دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو بہت وحی ہُوا کرتی تھی لیکن اس کا کہیں ذکر بھی نہیں کیا گیا کہ اس کو یہ الہام ہُوا یہ وحی ہوئی بلکہ ذکر کیا گیا ہے تو اس بات کا کہ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى وہ ابراہیم جس نے وفاداری کا کامل نمونہ دکھایا۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۸، ۱۹ مورخہ ۸/۱۶ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۰)

اِس سوال کے جواب میں کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے احیائے موتٰی کی کیفیت کے متعلق اطمینان چاہا تھا۔ کیا اُن کو پہلے اطمینان نہ تھا۔ فرمایا:۔

اصل بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام اللہ تعالیٰ کے مکتب میں تعلیم پانے والے ہوتے ہیں اور تلامیذ الرحمان کہلاتے ہیں۔ اُن کی ترقی بھی تدریجی ہوتی ہے اِس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن شریف میں آیا ہے كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا۔[1] پس مَیں اِس بات کو خوب جانتا ہوں کہ انبیاء علیہم السّلام کی حالت کیسی ہوتی ہے۔ جس دن نبی مامور ہوتا ہے اُس دن اور اس کی نبوت کے آخری دن میں ہزاروں کوس کا

---

[1] سورۃ الفرقان: ۳۳

فرق ہو جاتا ہے۔پس یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا کہا۔ابراہیم تو وہ شخص ہے جس کی نسبت قرآن شریف نے خود فیصلہ کر دیا ہے اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى .....پھر یہ اعتراض کس طرح ہو سکتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۲۹ مورخہ ۱۷؍اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

۳۹ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝

یہ کہنا کہ انسانی رنج ومحن حوا کے سیب کھانے کی وجہ سے ہیں۔اِسلام کا یہ عقیدہ نہیں۔ہمیں تو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى زید کے بدلے بکر کو سزا نہیں مل سکتی اور نہ ہی اس سے کوئی فائدہ متصور ہے۔حوا کی سیب خوری ان مشکلات اور رنج وسزا کا باعث نہیں ہے بلکہ ان کے وجوہات قرآن نے کچھ اَور ہی بیان فرمائے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۲ ۳۶ مورخہ ۲؍جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

۴۰ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝

اِنسان کو وہی ملتا ہے جو سعی کرتا ہے۔جو اُس نے کوشش کی ہو یعنی عمل کرنا اجر پانے کے لئے ضروری ہے۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۱۴۹)

اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ انسان بے دست و پا ہو کر بیٹھ رہے بلکہ اس نے صاف فرمایا ہے لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى اِس لئے مومن کو چاہیئے کہ وہ جدّوجُہد سے کام کرے لیکن جس قدر مرتبہ مجھ سے ممکن ہے یہی کہوں گا کہ دُنیا کو مقصود بالذّات نہ بنا لو دین کو مقصود بالذّات ٹھیراؤ اور دُنیا اس کے لئے بطور خادم اور مَرْکَب کے ہو۔

(الحکم جلد ۴ ۲۹ مورخہ ۱۶؍اگست ۱۹۰۰ صفحہ ۴)

کمالات تو انسان کو مجاہدات سے حاصل ہوتے ہیں مگر جن کو سہل نسخہ مسیح کے خون کا مل گیا وہ کیوں مجاہدات کریں گے۔اگر مسیح کے خون سے کامیابی ہے تو پھر اُن کے لڑکے اِمتحان پاس کرنے کے واسطے کیوں مدرسوں میں محنتیں اور کوششیں کرتے ہیں چاہیئے کہ وہ حضرت مسیح کے خون پر بھروسہ رکھیں اور اسی سے کامیاب ہو ویں اور کوئی محنت نہ کریں اور مسلمانوں کے بچے محنتیں کر کر کے اور ٹکریں مار مار کر پاس ہوں۔اصل بات یہ ہے لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔اِس دُنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک اِنسان جب اپنے نفس کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے فسق وفجور وغیرہ معلوم ہوتے ہیں آخر وہ یقین کی حالت پر پہنچ کر اُن کو صیقل کر سکتا ہے لیکن جب خونِ مسیح پر مدار ہے تو مجاہدات کی کیا ضرورت ہے۔اُن کی جھوٹی تعلیم ترقیات سے روک رہی ہے۔سچی تعلیم والا دعائیں کرتا ہے۔کوششیں کرتا ہے آخر دوڑتا دوڑتا اور ہاتھ پاؤں مارتا منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔جب یہ بات ان کو سمجھ آئے گی کہ یہ سب باتیں

(خونِ مسیح پر بھروسہ) قصہ کہانی ہیں اور اُن سے اب کوئی آثار اور نتائج مرتب نہیں ہوتے اور ادھر سچی تعلیم کی تخم ریزی کے ساتھ برکات ہوں گی تو یہ لوگ خود سمجھ لیں گے۔ اِنسان کھیتی کرتا ہے اس میں بھی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اگر ایک ملازم ہے تو اُسے بھی محنت کا خیال ہے۔ غرضیکہ ہر ایک اپنے اپنے مقام پر کوشش میں لگا ہے اور سب کا ثمرہ کوشش پر ہی ہے۔ سارا قرآن کوشش کے مضمون سے بھرا پڑا ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ ان لوگوں کو جو ولایت میں خونِ مسیح پر ایمان لا کر بیٹھے ہیں کوئی پوچھے کہ کیا حاصل ہوُا۔ مردوں یا عورتوں نے خون پر ایمان لا کر کیا ترقی حاصل کی۔ یہ باتیں ہیں جو بار بار ان کے کانوں تک پہنچانی چاہئیں۔ (البدر جلد اوّل ۱۵ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۴۷)

قرآن کو بہت پڑھنا چاہیئے اور پڑھنے کی توفیق خدا تعالیٰ سے طلب کرنی چاہیئے کیونکہ محنت کے سوا اِنسان کو کچھ نہیں ملتا۔ کسان کو دیکھو کہ جب وہ زمین میں ہل چلاتا ہے اور قسم قسم کی محنت اُٹھاتا ہے تب پھل حاصل کرتا ہے مگر محنت کے لئے زمین کا اچھا ہونا شرط ہے۔ اسی طرح انسان کا دِل بھی اچھا ہو سامان بھی عمدہ ہو سب کچھ کر بھی سکے تب جا کر فائدہ پاوے گا لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ دِل کا تعلق اللہ تعالیٰ سے مضبوط باندھنا چاہیئے جب یہ ہوگا تو دل خود خدا سے ڈرتا رہے گا اور جب دِل ڈرتا رہتا ہے تو خدا تعالیٰ کو اپنے بندے پر خود رحم آجاتا ہے اور پھر تمام بَلاؤں سے اُسے بچاتا ہے۔ (البدر جلد ۲ ۱۴ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۹)

دعا کا اثر ثابت ہے ایک روایت میں ہے کہ اگر مَیّت کی طرف سے حج کیا جاوے تو قبول ہوتا ہے اور روزہ کا ذکر بھی ہے۔

ایک شخص نے عرض کیا کہ حضور یہ جو ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ فرمایا کہ:

اگر اِس کے یہ معنے ہیں کہ بھائی کے حق میں دعا نہ قبول ہو تو پھر سورت فاتحہ میں اِهْدِنَا کی بجائے اِهْدِنِیْ ہوتا۔

(البدر جلد ۲ ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۵)

ہم کبھی اِن باتوں سے فخر نہیں کر سکتے کہ رؤیا یا الہام ہونے لگے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ بیٹھ رہیں اور مجاہدات سے دستکش ہو رہیں اللہ تعالیٰ اِس کو پسند نہیں کرتا وہ تو فرماتا ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی اِسی لئے ضرورت اِس امر کی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی راہ میں وہ مجاہدہ کرے اور وہ کام کر کے دکھلاوے جو کسی نے نہ کیا ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ صبح سے شام تک مکالمہ کرے تو یہ فخر کی بات نہیں ہوگی کیونکہ یہ تو اس کی عطا ہوگی۔ دھیان یہ ہوگا کہ خود ہم نے اس کے لئے کیا کیا۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۸، ۱۹ مورخہ ۸، ۱۶ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۰)

اِس قسم کے لوگ ہمیشہ گذرے ہیں جو چاہتے ہیں کہ بغیر کسی قسم کی محنت اور تکلیف اور سعی اور مجاہدہ کے وہ کمالات حاصل کرلیں جو مجاہدات سے حاصل ہوتے ہیں۔ صوفیاء کرام کے حالات میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے آکر اُن سے کہا کہ کوئی ایسا اِنتظام ہو کہ ہم پھونک مارنے سے ولی ہو جاویں۔ ایسے لوگوں کے جواب میں انہوں نے

یہی فرمایا کہ پھونک کے واسطے بھی تو قریب ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ پھونک بھی دُور سے نہیں لگتی۔

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى یعنی کوئی اِنسان بغیر سعی کے کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ خدا تعالیٰ کا مقرر کردہ قانون ہے پھر اس کے خلاف اگر کوئی کچھ حاصل کرنا چاہے تو وہ خدا تعالیٰ کے قانون کو توڑتا ہے اور اُسے آزماتا ہے اِس لئے محروم رہے گا۔ دُنیا کے عام کاروبار میں بھی تو یہ سلسلہ نہیں ہے کہ پھونک مار کر کچھ حاصل ہو جائے یا بدُوں سعی اور مجاہدہ کے کوئی کامیابی مل سکے۔ دیکھو۔ آپ شہر سے چلے تو سٹیشن پر پہنچے اگر شہر سے ہی نہ چلتے تو کیونکر پہنچتے؟ پاؤں کو حرکت دینی پڑی ہے یا نہیں؟ اِسی طرح سے جس قدر کاروبار دُنیا کے ہیں سب میں اول انسان کو کچھ کرنا پڑتا ہے۔ جب وہ ہاتھ پاؤں ہلاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی برکت ڈال دیتا ہے۔ اِسی طرح پر خدا تعالیٰ کی راہ میں وہی لوگ کمال حاصل کرتے ہیں جو مجاہدہ کرتے ہیں اِس لئے فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا[1] پس کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ مجاہدہ ہی کامیابیوں کی راہ ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸، ۳۹ مورخہ ۱۰/۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

دعا تب کام کرتی ہے جب انسان کی کوشش بھی ساتھ ہو۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ پھونک مار کر ولی بنا دیا جاوے وہ یہ نہیں جانتے کہ پھونک بھی اس آدمی کو لگتی ہے جو نزدیک آوے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ بغیر انسان کی سعی کے کچھ ہو جاوے قرآن شریف میں ہے لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى اور دل کی ہر ایک حالت کے لئے ایک ظاہری عمل کا نشان ضرور ہوتا ہے۔ جب دِل پر غم کا غلبہ ہو تو آنسو نکل آتے ہیں۔ اسی لئے شریعت نے ثبوت کا مدار ایک شہادت پر نہیں رکھا جب تک دوسرا گواہ بھی نہ ہو پس جب تک ظاہر و باطن ایک نہ ہو تب تک کچھ نہیں بنتا۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۴۱، ۴۲ مورخہ یکم و ۸۔ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۰)

اِنسان کے لئے سعی اور مجاہدہ ضروری چیز ہے اور اس کے ساتھ مصائب اور مشکلات بھی ضروری ہیں لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى جو لوگ سعی کرتے ہیں وہ اس کے ثمرات سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اسی طرح پر جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں اور نفس کی قربانی کرتے ہیں ان پر الٰہی قُرب و انوار و برکات اور قبولیت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں اور بہشت کا نقشہ ان پر کھولا جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

ایک طرف تو اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اپنے کرم، رحم، لطف اور مہربانیوں کی صفات بیان کرتا ہے اور رحمان ہونا ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف فرماتا ہے کہ اَنْ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى اور وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا فرما کر اپنے فیض کو سعی اور مجاہدہ میں منحصر فرماتا ہے۔ نیز اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل ہمارے

---

[1] سورۃ العنکبوت: ۷۰

واسطے ایک اُسوہ حسنہ اور عمدہ نمونہ ہے۔ صحابہؓ کی زندگی میں غور کرکے دیکھو بھلا انہوں نے محض معمولی نمازوں سے ہی وہ مدارج حاصل کرلئے تھے؟ نہیں۔ بلکہ انہوں نے تو خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول کے واسطے اپنی جانوں تک کی پرواہ نہ کی اور بھیڑ بکریوں کی طرح خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان ہوگئے جب جاکرکہیں ان کو یہ رُتبہ حاصل ہؤا تھا۔ اکثر لوگ ہم نے ایسے دیکھے ہیں وہ یہی چاہتے ہیں کہ ایک پھونک مارکر وہ درجات دلا دئے جاویں اور عرش تک ان کی رسائی ہوجائے۔

ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون ہوگا۔ وہ افضل البشر افضل الرسل والانبیاء تھے جب انہوں نے ہی پھونک سے وہ کام نہیں کئے تو اَور کون ہے جو ایسا کرسکے۔ دیکھو آپؐ نے غارِ حراء میں کیسے کیسے ریاضات کئے۔ خدا جانے کتنی مدّت تک تضرّعات اور گریہ وزاری کیا کئے۔ تزکیہ کے لئے کیسی کیسی جانفشانیاں اور سخت سے سخت محنتیں کیا کئے جب جاکر کہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے فیضان نازل ہؤا۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۴ مورخہ ۲؍ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۱)

اگرچہ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے فضل سے ہی ہوتا ہے مگر کوشش کرنا انسان کا فرض ہے جیسا کہ قرآن شریف نے صراحت سے حکم دیا ہے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى یعنی انسان جتنی جتنی کوشش کرے گا اسی کے مطابق فیوض سے مستفیض ہوسکے گا۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۴؍ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱)

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۝

تمام سلسلہ علل ومعلولات کا تیرے ربّ پر ختم ہوجاتا ہے تفصیل اِس دلیل کی یہ ہے کہ نظرِ تعمق سے معلوم ہوگا کہ یہ تمام موجودات علل ومعلول کے سلسلہ سے مربوط ہے اور اسی وجہ سے دُنیا میں طرح طرح کے علوم پیدا ہوگئے ہیں کیونکہ کوئی حصّہ مخلوقات کا نظام سے باہر نہیں۔ بعض بعض کے لئے بطور اصول اور بعض فروع کے ہیں اور یہ توظاہر ہے کہ علّت یا تو خود اپنی ذات سے قائم ہوگی یا اس کا وجود کسی دوسری علّت کے وجود پر منحصر ہوگا اور پھر یہ دوسری علّت کسی اَور علّت پر۔ وعلیٰ ھٰذا القیاس۔ اور یہ تو جائز نہیں کہ اس محدود دُنیا میں علل ومعلول کا سلسلہ کہیں جاکر ختم نہ ہو اور غیر متناہی ہو تو بالضّرورت ماننا پڑا کہ یہ سلسلہ ضرور کسی اخیر علّت پر جاکر ختم ہوجاتا ہے پس جس پر اس تمام کی اِنتہاء ہے وہی خدا ہے آنکھ کھول کر دیکھ لو کہ آیت وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى اپنے مختصر لفظوں میں کس طرح اِس دلیل مذکورہ بالا کو بیان فرما رہی ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ انتہاء تمام سلسلہ کی تیرے ربّ تک ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵۵)

سورۃ القمر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۲ تا ۴

اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ۝وَاِنۡ یَّرَوۡا اٰیَۃً یُّعۡرِضُوۡا وَیَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ۝وَکَذَّبُوۡا وَاتَّبَعُوۡۤا اَہۡوَآءَہُمۡ وَکُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ۝

عرب کے محاورہ میں پہلی رات کا چاند قمر کبھی نہیں کہلاتا بلکہ تین دن تک اُس کا نام ہلال ہوتا ہے اور بعض کے نزدیک سات دن تک ہلال کہلاتا ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۹۵، ۱۹۶)

شقّ القمر کا معجزہ اہلِ اسلام کی نظر میں ایسا امر نہیں ہے کہ جو مدارِ ثبوتِ اسلام اور دلیل اعظم حقانیت کلام اللہ کا ٹھہرایا گیا ہو بلکہ ہزارہا شواہد اندرونی و بیرونی و صدہا معجزات و نشانوں میں سے یہ بھی ایک قدرتی نشان ہے جو تاریخی طور پر کافی ثبوت اپنے ساتھ رکھتا ہے جس کا ذکر آئندہ عنقریب آئے گا۔ سو اگر تمام کُھلے کُھلے ثبوتوں سے چشم پوشی کر کے فرض بھی کر لیں کہ یہ معجزہ ثابت نہیں ہے اور آیت کے اُس طور پر معنے قرار دیں جس طور پر حال کے عیسائی و نیچری یا دوسرے مُنکرین خوارق کرتے ہیں تو اِس صورت میں بھی اگر کچھ حرج ہے تو شاید ایسا ہے جیسے بیس کروڑ روپیہ کی جائیداد میں سے ایک پیسے کا نقصان ہو جائے۔ پس اِس تقریر سے ظاہر ہے کہ اگر بفرضِ محال اہلِ اسلام تاریخی طور پر اِس معجزہ کو ثابت نہ کر سکیں تو اِس عدمِ ثبوت کا اسلام پر کوئی بد اثر نہیں پہنچ سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ کلامِ الٰہی نے مسلمانوں کو دوسرے معجزات سے بکلّی بے نیاز کر دیا ہے۔ وہ نہ صرف اعجاز بلکہ اپنی برکات و تنویرات

کے رُو سے اعجاز آفرین بھی ہے۔فی الحقیقت قرآن شریف اپنی ذات میں ایسی صفاتِ کمالیہ رکھتا ہے جو اس کو خارجیہ معجزات کی کچھ بھی حاجت نہیں۔خارجیہ معجزات کے ہونے سے اُس میں کچھ زیادتی نہیں ہوتی اور نہ ہونے سے کوئی نقص عائد حال نہیں ہوتا۔اس کا بازارِ حُسن معجزاتِ خارجیہ کے زیور سے رونق پذیر نہیں بلکہ وہ اپنی ذات میں آپ ہی ہزارہا معجزاتِ عجیبہ وغریبہ کا جامع ہے جن کو ہر یک زمانہ کے لوگ دیکھ سکتے ہیں نہ یہ کہ صرف گذشتہ کا حوالہ دیا جائے۔وہ ایسا ملیح الحُسن محبوب ہے کہ ہر یک چیز اس سے مل کر آرائش پکڑتی ہے اور وہ اپنی آرائش میں کسی کی آمیزش کا محتاج نہیں۔ ؎

ہمہ خوبانِ عالم را بزیور ہا بیارایند ٭ تو سیمیں تن چناں خوبی کہ زیور ہا بیارائی

پھر ماسوا اس کے سمجھنا چاہیئے کہ جو لوگ شق القمر کے معجزہ پر حملہ کرتے ہیں اُن کے پاس صرف یہی ایک ہتھیار ہے اور وہ بھی ٹوٹا پھوٹا کہ شق القمر قوانینِ قدرتیہ کے برخلاف ہے اِس لئے مناسب معلوم ہُوا کہ اوّل ہم ان کے قانونِ قدرت کی کچھ تفتیش کرکے پھر وہ ثبوت تاریخی پیش کریں جو اس واقعہ کی صحت پر دلالت کرتے ہیں۔سو جاننا چاہیئے کہ نیچر کے ماننے والے یعنی قانونِ قدرت کے پیرو کہلانے والے اِس خیال پر زور دیتے ہیں کہ یہ بات بدیہی ہے کہ جہاں تک انسان اپنی عقلی قوتوں سے جان سکتا ہے وہ بجز قدرت اور قانونِ قدرت کے کچھ نہیں یعنی مصنوعات و موجوداتِ مشہودہ موجودہ پر نظر کرنے سے چاروں طرف یہی نظر آتا ہے کہ ہر یک مادی یا غیر مادی جو ہم میں اور ہمارے اِردگرد یا فوق وتحت میں موجود ہے وہ اپنے وجود اور قیام اور ترتّب آثار میں ایک عجیب سلسلہ انتظام سے وابستہ ہے جو ہمیشہ اس کی ذات میں پایا جاتا ہے اور کبھی اس سے جُدا نہیں ہوتا۔قدرت نے جس طرح پر جس کا ہونا بنا دیا۔ بغیر خطاء کے اُسی طرح ہوتا ہے اور اُسی طرح پر ہوگا۔پس وہی سچ ہے اور اصول بھی وہی سچے ہیں جو اس کے مطابق ہیں مَیں کہتا ہوں کہ بلاشبہ یہ سب سچ مگر کیا اِس سے یہ ثابت ہوگیا کہ قدرتِ الٰہی کے طریقے اور اُس کے قانون اُسی حد تک ہیں جو ہمارے تجربہ اور مشاہدہ میں آچکے ہیں اس سے زیادہ نہیں۔جس حالت میں الٰہی قدرتوں کو غیر محدود ماننا ایک ایسا ضروری مسئلہ ہے جو اُسی سے نظامِ کارخانۂ الوہیت وابستہ اور اُسی سے ترقیاتِ علمیہ کا ہمیشہ کے لئے دروازہ کُھلا ہے تو پھر کس قدر غلطی کی بات ہے کہ ہم یہ ناکارہ حُجت پیش کریں کہ جو امر ہماری سمجھ اور مشاہدہ سے باہر ہے وہ قانونِ قدرت سے بھی باہر ہے بلکہ جس حالت میں ہم اپنے مُونہہ سے اِقرار کرچکے کہ قوانینِ قدرتیہ غیر متناہی اور غیر محدود ہیں تو پھر ہمارا یہ اصول ہونا چاہیئے کہ ہر ایک نئی بات جو ظہور میں آوے پہلے ہی اپنی عقل سے بالاتر دیکھ کر اُس کو رَدّ نہ کریں بلکہ خوب متوجہ ہو کر اس کے ثبوت یا عدم ثبوت کا حال جانچ لیں۔اگر وہ ثابت ہو تو قانونِ قدرت کی فہرست میں اُس کو بھی داخل کرلیں اور اگر وہ ثابت نہ ہو تو صرف اتنا کہہ دیں کہ ثابت نہیں مگر اِس بات کے کہنے کے ہم ہرگز مجاز نہیں ہوں گے کہ وہ امر قانونِ قدرت سے باہر ہے بلکہ قانونِ قدرت سے باہر کسی چیز کو سمجھنے کیلئے

ہمارے لئے پُر ضرور ہے کہ ہم ایک دائرہ کی طرح خدائے تعالیٰ کے تمام قوانین اَزلی و اَبدی پر محیط ہو جائیں اور بخوبی ہمارا فکر اِس بات پر احاطۂ تام کرے کہ خدائے تعالیٰ نے روزِ اوّل سے آج تک کیا کیا قدرتیں ظاہر کیں اور آئندہ اپنے ابدی زمانہ میں کیا کیا قدرتیں ظاہر کرے گا۔ کیا وہ جدید در جدید قدرتوں کے ظاہر کرنے پر قادر ہوگا یا کولہو کے بَیل کی طرح اُنہیں چند قدرتوں میں مقید اور محصور رہے گا جن کو ہم دیکھ چکے ہیں اور جن پر ہمارا بخوبی احاطہ ہے اور اگر اُنہیں میں مقید اور محصور رہے گا تو باوجود اُس کے غیر محدود الوہیت اور قدرت اور طاقت کے یہ تقید اور محصور رہنا کس وجہ سے ہوگا۔ کیا وہ آپ ہی وسیع قدرتوں کے دکھلانے سے عاجز آئے گا یا کسی دوسرے قاسر نے اُس پر جبر کیا ہوگا یا اُس کی خدائی کو انہیں چند قسم کی قدرتوں سے قوت پہنچتی ہے اور دوسری قدرتوں کے ظاہر کرنے سے اُس پر زوال آتا ہے۔ بہرحال اگر ہم خدائے تعالیٰ کی قدرتوں کو غیر محدود مانتے ہیں تو یہ جنون اور دیوانگی ہے کہ اس کی قدرتوں پر احاطہ کرنے کی امید رکھیں کیونکہ اگر وہ ہمارے مشاہدہ کے پیمانہ میں محدود ہو سکیں تو پھر غیر محدود اور غیر متناہی کیونکر رہیں اور اِس صورت میں نہ صرف یہ نقص پیش آتا ہے کہ ہمارا فانی اور ناقص تجربہ خدائے ازلی و ابدی کی تمام قدرتوں کا حد بست کرنے والا ہوگا بلکہ ایک بڑا بھاری نقص یہ بھی ہے کہ اُس کی قدرتوں کے محدود ہونے سے وہ خود بھی محدود ہو جائے گا اور پھر یہ کہنا پڑے گا کہ جو کچھ خدائے تعالیٰ کی حقیقت اور کُنہ ہے ہم نے سب معلوم کر لی ہے اور اُس کے گہراؤ اور تہ تک ہم پہنچ گئے ہیں اور اس کلمہ میں جس قدر کُفر اور بے ادبی اور بے ایمانی بھری ہوئی ہے وہ ظاہر ہے حاجتِ بیان نہیں۔ سو ایک محدود زمانہ کے محدود در محدود تجارب کو پورا پورا قانونِ قدرت خیال کر لینا اور اُس پر غیر متناہی سِلسلۂ قدرت کو ختم کر دینا اور آئندہ کے نئے اسرار کُھلنے سے نااُمید ہو جانا اُن پَست نظروں کا نتیجہ ہے جنہوں نے خدائے ذوالجلال کو جیسا کہ چاہیئے شناخت نہیں کیا اور جو اپنی فطرت میں نہایت منقبض واقعہ ہوئے ہیں یہاں تک کہ ایک کنوئیں کی مینڈک ہو کر یہ خیال کر رہے ہیں کہ گویا ایک سمندر ناپیدا کنار پر اُن کو عبور ہو گیا ہے۔ تمام خوشیاں عارفوں کی اور تمام راحتیں غمزدوں کی اسی میں ہیں کہ خدائے تعالیٰ کی قدرتوں کا کنارہ لایُدرک ہے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ بے تحقیق اور بے ثبوت عقلی یا آزمائشی یا تاریخی کسی نئی بات کو مان لو کیونکہ اس عادت سے بہت سے رطب و یابس کا ذخیرہ اکٹھا ہو جائیگا بلکہ مَیں یہ کہتا ہوں کہ خدائے ذوالجلال کی تعظیم کر کے اُس کے نئے کاموں کی نسبت (جو تمہاری محدود نظروں میں نئے دکھائی دیتے ہیں) بیجا ضِد بھی مت کرو کیونکہ جیسا مَیں پہلے بیان کر چکا ہوں خدائے تعالیٰ کی عجائب قدرتوں اور دقائق حکمتوں اور پیچ در پیچ اسراروں کی ابھی تک اِنسان نے بکلّی حد بست نہیں کی اور نہ آگے کو اُس کی لیاقت و طاقت ایسی نظر آتی ہے کہ اُس مالک الملک کے وراء الوراء بھیدوں کے ایک چھوٹے سے رقبۂ زمین کی طرح پیمائش کر سکے یا کسی ایک چیز کے جمیع خواص پر احاطہ کرنے کا دَم مار سکے۔ (سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۲ تا ۲۰)

یہ اعتراض کہ کیونکر چاند دو ٹکڑے ہو کر آستین میں سے نکل گیا تھا یہ سراسر بے بُنیاد اور باطل ہے کیونکہ ہم لوگوں کا ہرگز یہ اعتقاد نہیں ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آستین میں سے نکلا تھا اور نہ یہ ذکر قرآن شریف میں یا حدیثِ صحیح میں ہے اور اگر کسی جگہ قرآن یا حدیث میں ایسا ذکر آیا ہے تو وہ پیش کرنا چاہیئے۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ جیسے کوئی آریہ صاحبوں پر یہ اعتراض کرے کہ آپ کے یہاں لکھا ہے کہ مہاں دیو جی کی لٹوں سے گنگا نکلی ہے۔ پس جس اعتراض کی ہمارے قرآن یا حدیث میں کچھ بھی اصلیت نہیں اُس سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو بس یہی کہ ماسٹر صاحب (ماسٹر مُرلی دھر صاحب) کو اصول اور کتب معتبرہ اسلام سے کچھ بھی واقفیت نہیں۔ بھلا اگر یہ اعتراض ماسٹر صاحب کا کسی اصل صحیح پر مبنی ہے تو لازم ہے کہ ماسٹر صاحب اِسی جلسہ میں وہ آیتِ قرآن شریف پیش کریں جس میں ایسا مضمون درج ہے یا اگر آیتِ قرآن نہ ہو تو کوئی حدیثِ صحیح ہی پیش کریں جس میں ایسا کچھ بیان کیا گیا ہو اور اگر بیان نہ کر سکیں تو ماسٹر صاحب کو ایسا اعتراض کرنے سے متندم ہونا چاہیئے کیونکہ منصبِ بحث ایسے شخص کے لئے زیبا ہے جو فریقِ ثانی کے مذہب سے کچھ واقفیت رکھتا ہو۔ باقی رہا یہ سوال کہ شقِ قمر ماسٹر صاحب کے زعم میں خلافِ عقل ہے جس سے انتظامِ ملکی میں خلل پڑتا ہے یہ ماسٹر صاحب کا خیال سراسر قلتِ تدبر سے ناشی ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ جلّ شانہٗ جو کام صرف قدرت نمائی کے طور پر کرتا ہے وہ کام سراسر قدرتِ کاملہ کی ہی وجہ سے ہوتا ہے نہ قدرتِ ناقصہ کی وجہ سے یعنی جس ذاتِ قادرِ مطلق کو یہ اختیار اور قدرت حاصل ہے کہ چاند کو دو ٹکڑہ کر سکے اُس کو یہ بھی تو قدرت حاصل ہے کہ ایسے پُر حکمت طور سے یہ فعل ظہور میں لاوے کہ اُس کے انتظام میں بھی کوئی خلل عائد نہ ہو اِسی وجہ سے تو وہ سرب شکتی مان اور قادرِ مطلق کہلاتا ہے اور اگر وہ قادرِ مطلق نہ ہوتا تو اس کا دُنیا میں کوئی کام نہ چل سکتا۔ ہاں یہ شناعتِ عقلی آریوں کے اکثر عقائد میں جا بجا پائی جاتی ہے جس سے ایک طرف تو اُن کے اِعتقادات سراسر خلافِ عقل معلوم ہوتے ہیں اور دوسری طرف خلافِ قدرت وعظمتِ الٰہی بھی جیسے رُوحوں اور اجزاء صغار عالم کا غیر مخلوق اور قدیم اور انادی ہونا اصول آریہ سماج کا ہے اور یہ اصول صریح خلافِ عقل ہے اگر ایسا ہو تو پرمیشر کی طرح ہر ایک چیز واجب الوجود ٹھہر جاتی ہے اور خدائے تعالیٰ کے وجود پر کوئی دلیل قائم نہیں رہتی بلکہ کاروبار دین کا سب کا سب ابتر اور خلل پذیر ہو جاتا ہے کیونکہ اگر ہم سب کے سب خدائے تعالیٰ کی طرح غیر مخلوق اور انادی ہی ہیں تو پھر خدائے تعالیٰ کا ہم پر کونسا حق ہے اور کیوں وہ ہم سے اپنی عبادت اور پرستش اور شکر گذاری چاہتا ہے اور کیوں گناہ کرنے سے ہم کو سزا دینے کو تیار ہوتا ہے اور جس حالت میں ہماری رُوحانی بینائی اور رُوحانی تمام قوتیں خود بخود قدیم سے ہیں تو پھر ہم کو فانی قوتوں کے پیدا ہونے کے لئے کیوں پرمیشر کی حاجت ٹھہری۔ غرض خلافِ عقل بات اگر تلاش کرنی ہو تو اس سے بڑھ کر اور کوئی بات نہیں جو خدائے تعالیٰ کو اوّل اپنا خدا کہہ کر پھر اُس کو خدائی کے کاموں سے الگ رکھا جائے لیکن جو کام خدائے تعالیٰ کا صرف قدرت سے متعلق ہے اُس پر وہ شخص اعتراض کر

سکتا ہے کہ اوّل خدائے تعالیٰ کی تمام قدرتوں پر اُس نے احاطہ کر لیا ہو۔ اور اِس جگہ یہ بھی واضح رہے کہ مسئلہ شق القمر ایک تاریخی واقعہ ہے جو قرآن شریف میں درج ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن شریف ایک ایسی کتاب ہے جو آیت آیت اُس کی بروقت نزول ہزاروں مسلمانوں اور منکروں کو سُنائی جاتی تھی اور اُسی کی تبلیغ ہوتی تھی اور صدہا اُس کے حافظ تھے۔ مسلمان لوگ نماز اور خارج نماز میں اس کو پڑھتے تھے۔ پس جس حالت میں صریح قرآن شریف میں وارد ہؤا کہ چاند دو ٹکڑے ہوگیا اور جب کافروں نے یہ نشان دیکھا تو کہا کہ جادُو ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَإِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ تو اس صورت میں اُس وقت کے منکرین پر لازم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر جاتے اور کہتے کہ آپ نے کب اور کس وقت چاند کو دو ٹکڑے کیا اور کب اس کو ہم نے دیکھا لیکن جس حالت میں بعد مشہور اور شائع ہونے اِس آیت کے سب مخالفین چُپ رہے اور کسی نے دَم بھی نہ مارا تو صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ضرور دیکھا تھا تب ہی تو ان کو چُون وچرا کرنے کی گنجائش نہ رہی۔ غرض یہ بات بہت صاف اور یک راست طبع محقق کے لئے بہت فائدہ مند ہے کہ قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی جُھوٹا معجزہ بحوالہ اپنے مخالفوں کی گواہی کے لکھ نہیں سکتے تھے اور اگر کچھ جُھوٹ لکھتے تو ان کے مخالف ہم عصر اور ہم شہر اُس زمانہ کے اُسے کب پیش جانے دیتے۔ علاوہ اِس کے سوچنا چاہیئے کہ وہ مسلمان لوگ جن کو یہ آیت سُنائی گئی اور سُنائی جاتی تھی وہ بھی تو ہزاروں آدمی تھے اور ہر یک شخص اپنے دِل سے یہ محکم گواہی پاتا ہے کہ اگر کسی پیر یا مُرشد یا پیغمبر سے کوئی امرِ محض دروغ اور افترا ظہور میں آوے تو سارا اِعتقاد ٹوٹ جاتا ہے اور ایسا شخص ہر ایک شخص کی نظر میں بُرا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اِس صورت میں صاف ظاہر ہے کہ اگر یہ معجزہ ظہور میں نہیں آیا تھا اور اِفترا محض تھا تو چاہیئے تھا کہ ہزار ہا مسلمان جو آنحضرتؐ پر ایمان لائے تھے ایسے کذبِ صریح کو دیکھ کر یکلخت سارے کے سارے مُرتد ہو جاتے لیکن ظاہر ہے کہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی ظہور میں نہیں آئی۔ پس اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ معجزہ شق القمر ضرور وقوع میں آیا تھا۔ ہر یک مُنصف اپنے دل میں سوچ کر دیکھ لے کہ کیا تاریخی طور پر یہ ثبوت کافی نہیں ہے کہ معجزہ شق القمر اُسی زمانہ میں بحوالہ شہادت مخالفین قرآن شریف میں لکھا گیا اور شائع کیا گیا اور پھر سب مخالف اُس مضمون کو سُنکر چُپ رہے کسی نے تحریر یا تقریر سے اُس کا رَدّ نہ کیا اور ہزاروں مسلمان اُس زمانہ کی رویت کی گواہی دیتے رہے اور یہ بات ہم مکرّر لکھنا چاہتے ہیں کہ قدرت اللہ پر اعتراض کرنا خود ایک وجہ سے انکار خدائے تعالیٰ ہے کیونکہ اگر خدائے تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ کو نہ مانا جائے اور حسبِ اصول تناسخ آریہ صاحبان یہ اعتقاد رکھا جائے کہ جب تک زید نہ مرے بکر ہرگز پَیدا نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں تمام خدائی اُس کی باطل ہو جاتی ہے بلکہ اعتقاد صحیح اور حق یہی ہے کہ پرمیشر کو سرب شکتی مان اور قادرِ مطلق تسلیم کیا جائے اور اپنے ناقص ذہن اور ناتمام تجربہ کو قدرت

کے بے انتہاء اسرار کا محک امتحان نہ بنایا جائے ورنہ ہمہ دانی کے دعویٰ پر اِس قدر اعتراض وارد ہوں گے اور ایسی محالتیں اُٹھانی پڑیں گی کہ جن کا کچھ ٹھکانہ نہیں۔ اِنسان کا قاعدہ ہے کہ جو بات اپنی عقل سے بلند تر دیکھتا ہے اُس کو خلافِ عقل سمجھ لیتا ہے حالانکہ بلند تراز عقل ہونا شئے دیگر ہے اور خلافِ عقل ہونا شئے دیگر۔ بھلا ئیں ماسٹر صاحب سے پوچھتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ اِس بات پر قادر رہتا یا نہیں کہ جس قدر اب جرم قمری مشہود و محسوس ہے اس سے آدھے سے بھی کام لے سکتا اور اگر قادر نہیں تو اس پر عقلی دلیل جو عند العقل تسلیم ہو سکے کونسی ہے اور کِس کتاب میں لکھی ہے۔ تو جس حالت میں معجزہ شق القمر میں یہ بات ماخوذ ہے کہ ایک ٹکڑا اپنی حالتِ معہودہ پر رہا اور ایک اُس سے الگ ہو گیا وہ بھی ایک یا آدھ منٹ تک یا اِس سے بھی کم۔ تو اِس میں کونسا استبعاد عقلی ہے اور بفرضِ محال اگر استبعاد عقلی بھی ہو تو ہم کہتے ہیں کہ عقلِ ناقص انسان کی ہر یک کام ربانی تک کب پہنچ سکتی ہے۔

(سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۶۱ تا ۶۴)

تصرفاتِ خارجیہ۔ یہ بیرونی خوارق ہیں جن کو قرآن شریف سے کچھ ذاتی تعلق نہیں۔ انہیں میں سے شق القمر بھی ہے۔

(سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۲ حاشیہ)

تصرفاتِ خارجیہ کے معجزات قرآن شریف میں کئی نوع پر مندرج ہیں۔ ایک نوع تو یہی کہ جو دُعائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خدائے تعالیٰ نے آسمان پر اپنا قادرانہ تصرف دکھلایا اور چاند کو دو ٹکڑے کر دیا۔

(سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۵، ۱۶ حاشیہ)

اگر کسی کی خود اپنی ہی عقل میں فتور نہ ہو تو سمجھ سکتا ہے کہ کسی چیز کے ایک نئے خاصّہ کا ظہور میں آنا اُس کے پہلے خاصّہ کے ابطال کے لئے ایک لازمی امر نہیں ہے۔ سو اِس قاعدہ کے رُو سے دانشمند لوگ جو خدائے تعالیٰ کی عظیم الشان قدرتوں سے ہمیشہ ہیبت زدہ رہتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ حکیمِ مطلق جس کی حکمتوں کا انتہا نہیں اُس کی طرف سے قمر و شمس میں ایسی خاصیت مخفی ہونا ممکن ہے کہ باوجود انشقاق کے اُن کے فعل میں فرق نہ آوے۔ اسی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ نزدیک آگئی وہ گھڑی اور پھٹ گیا چاند۔ اِس آیت کا یہ مطلب ہے کہ روزِ ازل سے حکیمِ مطلق نے ایک خاصّہ مخفی چاند میں رکھا ہوا تھا کہ ایک ساعتِ مقررہ پر اُس کا انشقاق ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ نجوم اور شمس اور قمر کے خواص کا ظہور ساعاتِ مقررہ سے وابستہ ہے اور ساعات کو حدوثِ عجائباتِ سماوی و ارضی میں بہت کچھ دخل ہے اور حقیقت میں قوانینِ قدرتیہ کا شیرازہ انہیں ساعات سے باندھا گیا ہے۔ سو کیا عمدہ اور پُر حکمت اور فلسفیانہ اشارہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے آیت مندرجہ بالا میں فرمایا کہ چاند کے پھٹنے کی جو ساعت مقرر اور مقدر تھی وہ نزدیک آگئی اور چاند پھٹ گیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ اِس آیت کے آگے بھی فرماتا ہے وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ وَكُلُّ أَمْرٍ مُسْتَقِرٌّ یعنی کفار نے تو چاند پھٹنے کو سحر پر حمل کیا اور تکذیب

کی مگر یہ سحر نہیں ہے بلکہ خدائے تعالیٰ کے اُن امور یعنی قوانینِ قدرتیہ میں سے ہے جو اپنے وقتوں میں قرار پکڑنے والے ہیں اور عقلمند انسان اس نشانِ قدرت سے کیوں تعجب کرے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے کارخانۂ قدرت میں یہی ایک بات بالاتر از عقل ہے جو حکیموں اور فلسفیوں کی سمجھ میں نہیں آتی اور باقی تمام اسرارِ قدرت انہوں نے سمجھ لئے ہیں اور کیا یہ ایک ہی عقدہ لاینحل ہے اور باقی سب عقدوں کے حل کرنے سے فراغت ہو چکی ہے اور کیا اللہ تعالیٰ کے عجائب کاموں میں سے یہی ایک عجیب کام ہے اَور کوئی نہیں بلکہ اگر غور کرکے دیکھو تو اس قسم کے ہزارہا عجائب کام اللہ تعالیٰ کے دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔ زمین پر سخت سخت زلازل آتے رہتے ہیں اور بسا اوقات کئی میل زمین تہ و بالا ہو گئی ہے مگر پھر بھی انتظامِ عالم میں فتور واقع نہیں ہوُا حالانکہ جیسے چاند کو اِس انتظام میں دخل ہے ویسا ہی زمین کو۔ غرض یہ ملحدانہ شکوک انہی لوگوں کے دلوں میں اُٹھتے ہیں کہ جو خدائے تعالیٰ کو اپنے جیسا ایک ضعیف اور کمزور اور محدود الطاقت خیال کر لیتے ہیں۔ اگر خدائے تعالیٰ پر اِس قسم کے اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں تو پھر کسی طور سے عقل تسلّی نہیں پکڑ سکتی کہ یہ بڑے بڑے اجرامِ علوی و سفلی کیونکر اور کن ہتھیاروں سے اُس نے بنا ڈالے۔ (سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۷۰ تا ۷۳)

جس حالت میں چاند کے دو ٹکڑہ کرنے کا دعویٰ زور شور سے ہو چکا تھا یہاں تک کہ خاص قرآن شریف میں مخالفوں کو الزام دیا گیا کہ انہوں نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا اور اعراض کرکے کہا کہ یہ پکّا جادُو ہے اور پھر یہ دعویٰ نہ صرف عرب میں بلکہ اُسی زمانہ میں تمام ممالک روم و شام و مصر و فارس وغیرہ دُور دراز ممالک میں پھیل گیا تھا تو اس صورت میں کچھ تعجب کا محل نہ تھا کہ مختلف قومیں جو مخالفِ اسلام تھیں وہ دَم بخود اور خاموش رہتیں اور بوجہ عناد و بُغض و حسد شق القمر کی گواہی دینے سے زبان بند رکھتیں کیونکہ منکر اور مخالف کا دِل اپنے کفر اور مخالفت کی حالت میں کب چاہتا ہے کہ وہ مخالف مذہب کی تائید میں کتابیں لکھے یا اُس کے معجزات کی گواہی دیوے ..... اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام اور علانیہ طور پر یہ دعویٰ مشہور کر دیا تھا کہ میرے ہاتھ سے معجزہ شق القمر وقوع میں آ گیا ہے اور کفّار نے اُس کو بچشمِ خود دیکھ بھی لیا ہے مگر اس کو جادو قرار دیا۔ اپنے اس دعوی میں سچے نہیں تھے تو پھر کیوں مخالفینِ آنحضرتؐ جو اُسی زمانہ میں تھے جن کو یہ خبریں گویا نقارہ کی آواز سے پہنچ چکی تھیں چُپ رہے اور کیوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مؤاخذہ نہ کیا کہ آپؐ نے کب چاند کو دو ٹکڑے کرکے دکھایا اور کب ہم نے اُس کو جادُو کہا اور اُس کے قبول سے مُنہ پھیرا اور کیوں اپنے مرتے دَم تک خاموشی اختیار کی اور مُونہہ بند رکھا یہاں تک کہ اِس عالَم سے گذر گئے۔ کیا اُن کی یہ خاموشی جو اُن کی مخالفانہ حالت اور جوشِ مقابلہ کے بالکل برخلاف تھی اِس بات کا یقین نہیں دلاتی کہ کوئی ایسی سخت روک تھی جس کی وجہ سے کچھ بول نہیں سکے تھے مگر بجز ظہورِ سچائی کے اَور کونسی روک تھی۔ یہ معجزہ مکہّ میں ظہور میں آیا تھا اور مسلمان ابھی بہت کمزور اور غریب اور عاجز تھے۔ پھر تعجب یہ کہ

ان کے بیٹوں یا پوتوں نے بھی انکار میں کچھ زبان کشائی نہ کی حالانکہ اُن پر واجب و لازم تھا کہ اتنا بڑا دعویٰ اگر اِفتراء محض تھا اور صدہا کوسوں میں مشہور ہو گیا تھا اُس کی رَدّ میں کتابیں لکھتے اور دُنیا میں شائع اور مشہور کرتے اور جبکہ ان لاکھوں آدمیوں عیسائیوں، عربوں، یہودیوں، مجوسیوں وغیرہ میں سے رَدّ لکھنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی اور جو لوگ مسلمان تھے وہ علانیہ ہزاروں آدمیوں کے رُوبرو چشم دید گواہی دیتے رہے جن کی شہادتیں آج تک اُس زمانہ کی کتابوں میں مندرج پائی جاتی ہیں تو یہ صریح دلیل اِس بات پر ہے کہ مخالفین ضرور شق القمر مشاہدہ کر چکے تھے اور رَدّ لکھنے کے لئے کوئی بھی گنجائش باقی نہیں رہی تھی اور یہی بات تھی جس نے اُن کو منکرانہ شور و غوغا سے چُپ رکھا تھا سو جبکہ اُسی زمانہ میں کروڑہا مخلوقات میں شق القمر کا معجزہ شیوع پا گیا مگر اُن لوگوں نے خجلت زدہ ہو کر اُس کے مقابلہ پر دَم بھی نہ مارا تو اِس سے صاف ظاہر ہے کہ اُس زمانہ کے مخالفین اسلام کا چُپ رہنا شق القمر کے ثبوت کی دلیل ہے نہ کہ اس کے ابطال کی۔ کیونکہ اِس بات کا جواب مخالفین اسلام کے پاس کوئی نہیں کہ جس دعویٰ کا رَدّ انہیں ضرور لکھنا چاہیئے تھا انہوں نے کیوں نہیں لکھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی معمولی درویش یا گوشہ نشین نہیں تھے تا یہ عذر پیش کیا جائے کہ ایک فقیر صلح مشرب جس نے دوسرے مذاہب پر کچھ حملہ نہیں کیا چشم پوشی کے لائق تھا بلکہ آں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخالفین کا جہنمی ہونا بیان کرتے تھے۔ اِس صورت میں مُطلق طور پر جوش پیدا ہونے کے موجبات موجود تھے۔ ماسوا اِس کے یہ بھی کچھ ضروری معلوم نہیں ہوتا کہ واقعہ شق القمر پر جو چند سیکنڈ سے کچھ زیادہ نہ تھا ہر ایک ولایت کے لوگ اطلاع پا جائیں کیونکہ مختلف ملکوں میں دن رات کا قدرتی تفاوت اور کسی جگہ مطلع ناصاف اور پُر غبار ہونا اور کسی جگہ اَبر ہونا ایسا ہی کئی اَور موجبات عدم رؤیت ہو جاتے ہیں اور نیز بالطبع انسان کی طبیعت اور عادت اِس کے برعکس واقع ہوئی ہے کہ ہر وقت آسمان کی طرف نظر لگائے رکھے بالخصوص رات کے وقت جو سونے اور آرام کرنے اور بعض موسموں میں اندر بیٹھنے کا وقت ہے ایسا اِلتزام بہت بعید ہے۔

پھر ان سب باتوں کے بعد ہم یہ بھی لکھتے ہیں کہ شق القمر کے واقعہ پر ہندوؤں کی معتبر کتابوں میں بھی شہادت پائی جاتی ہے۔ مہابھارت کے دھرم پرب میں بیاس جی صاحب لکھتے ہیں کہ ”اُن کے زمانہ میں چاند دو ٹکڑے ہو کر پھر مل گیا تھا“ اور وہ اِس شق قمر کو اپنے بے ثبوت خیال سے بسوامتر کا معجزہ قرار دیتے ہیں لیکن پنڈت دیانند صاحب کی شہادت اور یوروپ کے محققوں کے بیان سے پایا جاتا ہے کہ مہابھارتھ وغیرہ پُران کچھ قدیم اور پُرانے نہیں ہیں بلکہ بعض پُرانوں کی تالیف کو تو صرف آٹھ سَو یا نو سَو برس ہوُا ہے۔ اب قرینِ قیاس ہے کہ مہابھارتھ یا اُس کا واقعہ بعد مشاہدہ واقعہ شق القمر جو معجزہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھا لکھا گیا اور بسوامتر کا نام صرف بیجا طور کی تعریف پر جیساکہ قدیم سے ہندوؤں کے اپنے بزرگوں کی نسبت عادت ہے درج کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اِس واقعہ کی شہرت ہندوؤں میں مؤلف تاریخ فرشتہ کے وقت میں بھی بہت کچھ پھیلی ہوئی تھی کیونکہ اُس نے اپنی کتاب کے مقالہ یازدہم میں ہندوؤں

سے یہ شہرت یافتہ نقل لے کر بیان کی ہے کہ شہر دھارکہ کہ جو متصل دریائے چنبل صوبہ مالوہ میں واقع ہے اب شاید اس کو دھارا نگری کہتے ہیں وہاں کا راجہ اپنے محل کی چھت پر بیٹھا تھا۔ ایک بارگی اُس نے دیکھا کہ چاند دو ٹکڑے ہوگیا اور پھر مل گیا اور بعد تفتیش اُس راجہ پر کھل گیا کہ یہ نبیٔ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے تب وہ مسلمان ہوگیا۔ اُس ملک کے لوگ اُس کے اسلام کی وجہ یہی بیان کرتے تھے اور اُس گرد نواح کے ہندوؤں میں یہ واقعہ مشہور تھا جس بناء پر ایک محقق مؤلف نے اپنی کتاب میں لکھا۔ بہرحال جب آریہ دیس کے راجوں تک یہ خبر شہرت پاچکی ہے اور آریہ صاحبوں کے مہابھارتہ میں درج بھی ہوگئی اور پنڈت دیانند صاحب پُرانوں کے زمانہ کو داخل زمانہ نبوی سمجھتے ہیں اور قانونِ قدرت کی حقیقت بھی کھل چکی تو اگر اب بھی لالہ مُرلیدھر صاحب کو شق القمر میں کوئی تامّل باقی ہو تو ان کی سمجھ پر ہمیں بڑے بڑے افسوس رہیں گے۔ (سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۲، یا ۷۹)

درجۂ لقا میں بعض اَوقات انسان سے ایسے امور صادر ہوتے ہیں کہ جو بشریّت کی طاقتوں سے بڑھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور الٰہی طاقت کا رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں جیسے..... معجزہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو شق القمر ہے۔ اِسی الٰہی طاقت سے ظہور میں آیا تھا دعا اس کے ساتھ شامل نہ تھی کیونکہ وہ صرف انگلی کے اشارہ سے جو الٰہی طاقت سے بھری ہوئی تھی وقوع میں آگیا تھا۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۶۵، ۶۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بھی شق القمر کی یہی حکمت تھی کہ جن کو پہلی کتابوں کے علم کا نور ملا تھا وہ لوگ اس نور پر قائم نہ رہے اور اُن کی دیانت اور امانت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ سو اس وقت بھی آسمان کے شق القمر نے ظاہر کردیا کہ زمین میں جو لوگ نور کے وارث تھے انہوں نے تاریکی سے پیار کیا ہے۔ اِس جگہ یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ مدّت ہوئی کہ آسمان کا خسوف کسوف جو رمضان میں ہوُا وہ جاتا رہا اور چاند اور سُورج دونوں صاف اور روشن ہوگئے مگر ہمارے وہ علماء اور فقراء جو شمس العلماء اور بدر العرفاء کہلاتے رہے ہیں وہ آج تک اپنے کسوف خسوف میں گرفتار ہیں۔ (ضمیمہ انجامِ آتھم صفحہ ۱۱)

تمام علامتیں قُربِ قیامت کی ظاہر ہوچکی ہیں اور دُنیا پر ایک انقلابِ عظیم آگیا ہے اور جبکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ قُربِ قیامت کا زمانہ ہے جیسا کہ آیت اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ سے سمجھا جاتا ہے تو پھر یہ زمانہ جس پر تیرہ سو برس اَور گذر گیا اس کے آخری زمانہ ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔
(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۰)

یہ جو کہا گیا ہے کہ قیامت کی گھڑی کا کسی کو علم نہیں اِس سے یہ مطلب نہیں کہ کسی وجہ سے بھی علم نہیں اگر یہی بات ہے تو پھر آثارِ قیامت جو قرآن شریف اور احادیثِ صحیحہ میں لکھے گئے ہیں وہ بھی قابلِ قبول نہیں ہوں گے کیونکہ ان کے ذریعہ سے بھی قُربِ قیامت کا ایک علم حاصل ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں لکھا تھا کہ

آخری زمانہ میں زمین پر بکثرت نہریں جاری ہوں گی۔ کتابیں بہت شائع ہوں گی جن میں اخبار بھی شامل ہیں اور اُونٹ بیکار ہو جائیں گے سو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سب باتیں ہمارے زمانہ میں پوری ہوگئیں اور اُونٹوں کی جگہ ریل کے ذریعہ سے تجارت شروع ہوگئی سو ہم نے سمجھ لیا کہ قیامت قریب ہے اور خود مدّت ہوئی کہ خدا نے آیت اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ اور دوسری آیتوں میں قُربِ قیامت کی ہمیں خبر دے رکھی ہے۔ سو شریعت کا یہ مطلب نہیں کہ قیامت کا وقوع ہر ایک پہلو سے پوشیدہ ہے بلکہ تمام نبی آخری زمانہ کی علامتیں لکھتے آئے ہیں اور انجیل میں بھی لکھی ہیں۔ پس مطلب یہ ہے کہ اس خاص گھڑی کی کسی کو خبر نہیں۔ خدا قادر ہے کہ ہزار سال گذرنے کے بعد چند صدیاں اور بھی زیادہ کر دے کیونکہ کسر شمار میں نہیں آتی جیسا کہ حمل کے دن بعض وقت کچھ زیادہ ہو جاتے ہیں۔ دیکھو اکثر بچے جو دُنیا میں پیدا ہوتے ہیں وہ اکثر نو مہینے اور دس دن کے اندر پیدا ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی کہا جاتا ہے کہ اس گھڑی کی کسی کو خبر نہیں جبکہ دردِ زِہ شروع ہوگا۔ اسی طرح دُنیا کے خاتمے پر گو اَب ہزار سال باقی ہے لیکن اس گھڑی کی خبر نہیں جب قیامت قائم ہو جائیگی جن دلائل کو خدا نے امامت اور نبوت کے ثبوت کے لئے پیش کیا ہے اُن کو ضائع کرنا گویا اپنے ایمان کو ضائع کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ قُربِ قیامت پر تمام علامتیں بھی جمع ہوگئی ہیں اور زمانہ میں ایک انقلابِ عظیم مشہود ہو رہا ہے اور وہ علامتیں جو قُربِ قیامت کے لئے خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں بیان فرمائی ہیں اکثر اُن میں سے ظاہر ہو چکی ہیں جیسا کہ قرآن شریف سے ظاہر ہوتا ہے کہ قُربِ قیامت کے زمانہ میں زمین پر اکثر نہریں جاری ہو جائیں گی اور بکثرت کتابیں شائع ہوں گی۔ پہاڑ اُڑا دئے جائیں گے۔ دریا خشک کر دئے جائیں گے اور ملاقاتوں کے لئے راہیں کُھل جائیں گی اور قوموں میں مذہبی شور و غوغا بہت پیدا ہوگا اور ایک قوم دوسری قوم کے مذہب پر ایک موج کی طرح ٹوٹ پڑے گی تاکہ ان کو بالکل نابود کر دے۔ انہی دنوں میں آسمانی قرنا اپنا کام دکھلائے گی اور تمام قومیں ایک ہی مذہب پر جمع کی جائیں گی بجز ان ردّی طبیعتوں کے جو آسمانی دعوت کے لائق نہیں۔ (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۹ تا ۱۱)

شق القمر..... وہ معجزہ ہے کہ جو عرب کے ہزاروں کافروں کے رُوبرو بیان کیا گیا ہے۔ پس اگر یہ امر خلافِ واقعہ ہوتا تو یہ اُن لوگوں کا حق تھا کہ وہ اِعتراض پیش کرتے کہ یہ معجزہ ظہور میں نہیں آیا خاص کر اس حالت میں کہ شق القمر کی آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کافروں نے یہ معجزہ دیکھا اور کہا کہ یہ پکّا جادُو ہے جو آسمان تک پہنچ گیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ یعنی قیامت نزدیک آئی اور چاند پھٹ گیا اور جب یہ لوگ خدا کا کوئی نشان دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ایک پکّا جادُو ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر شق القمر ظہور میں نہ آیا ہوتا تو اُن کا حق تھا کہ وہ کہتے کہ ہم نے تو کوئی نشان نہیں دیکھا اور نہ اس کو جادُو کہا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ کوئی امر ضرور ظہور میں آیا تھا جس کا نام شقّ القمر رکھا گیا۔ بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایک عجیب قسم کا خسوف تھا جس کی قرآن شریف نے پہلے خبر دی تھی اور یہ آیتیں

بطور پیشگوئیوں کے ہیں۔ اِس صورت میں شق کا لفظ محض استعارہ کے رنگ میں ہوگا کیونکہ خسوف کسوف میں جو حصہ پوشیدہ ہوتا ہے گویا وہ پھٹ کر علیحدہ ہو جاتا ہے ایک استعارہ ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۲۳)

شق القمر کا معجزہ جسمانی معجزات کی قسم سے ہے۔ بعض نادان شق القمر کے معجزہ پر قانونِ قدرت کی آڑ میں چھپ کر اعتراض کرتے ہیں لیکن ان کو اِتنا معلوم نہیں کہ خدائے تعالیٰ کی قدرتوں اور قوانین کا احاطہ اور اندازہ نہیں کر سکتے۔ آہ۔ ایک وقت تو وہ مونہہ سے خدا بولتے ہیں لیکن دوسرے وقت چہ جائیکہ ان کے دِل۔ اُن کی رُوح خدائے تعالیٰ کی عظیم الشان اور وراء الوراء قدرتوں کو دیکھ کر سجدہ میں گر پڑے۔ اُسے مطلق بُھول جاتے ہیں۔ اگر خدا کی ہستی اور بساط یہی ہے کہ اُس کی قدرتیں اور طاقتیں ہمارے ہی خیالات اور اندازہ تک محدود ہیں تو پھر دعا کی کیا ضرورت رہی لیکن نہیں۔ مَیں تمہیں بتلاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور ارادوں کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا ایسا اِنسان جو یہ دعویٰ کرے وہ خدا کا مُنکر ہے لیکن کس قدر واویلا ہے اُس نادان پر جو اللہ تعالیٰ کو لامحدود قدرتوں کا مالک سمجھ کر بھی یہ کہے کہ شق القمر کا معجزہ قانونِ قدرت کے خلاف ہے سمجھ لو کہ ایسا آدمی فکرِ سلیم اور دُور اندیش دِل سے بہرہ مند نہیں۔ خوب یاد رکھو کہ کبھی قانونِ قدرت پر بھروسہ نہ کر لو یعنی کہیں قانونِ قدرت کی حد نہ ٹھہرا لو کہ بس خدا کی خدائی کا سارا راز یہی ہے۔ پھر تو سارا تار و پود کُھل گیا۔ نہیں۔ اِس قسم کی دلیری اور جسارت نہ کرنی چاہیئے جو انسان کو عبودیت کے درجہ سے گرا دے جس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ ایسی بیوقوفی اور حماقت کرنا کہ خدا کی قدرتوں کو محصور اور محدود کرنا کسی مومن سے نہیں ہو سکتی۔ امام فخرالدین رازی کا یہ قول بہت درست ہے کہ جو شخص خدائے تعالیٰ کو عقل کے پیمانہ سے اندازہ کرنے کا ارادہ کرے گا وہ بیوقوف ہے۔ دیکھو نطفہ سے اِنسان کو اللہ تعالیٰ نے پَیدا کیا۔ یہ لفظ کہہ دینے آسان اور بالکل آسان ہیں اور یہ ایک بالکل معمولی سی بات نظر آتی ہے مگر یہ ایک سِرّ اور راز ہے کہ ایک قطرۂ آب سے انسان کو پَیدا کرتا ہے اور اُس میں اس قسم کے قوٰی رکھ دیتا ہے۔ کیا کسی عقل کی طاقت ہے کہ وہ اس کی کیفیت اور کُنہ تک پہنچے۔ طبیبوں اور فلاسفروں نے بتیرا زور مارا لیکن وہ اسکی ماہیت پر اطلاع نہ پا سکے۔ اِسی طرح ایک ایک ذرّہ خدائے تعالیٰ کے تابع ہے اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ یہ ظاہر نظام بھی اِسی طرح رہے اور ایک خارق عادت امر بھی ظاہر ہو جاوے۔ عارف لوگ اِن کیفیتوں کو خوب دیکھتے اور ان سے حظ اُٹھاتے ہیں۔ بعض لوگ ایک اَدنیٰ اَدنیٰ اور معمولی باتوں پر اعتراض کر دیتے ہیں اور شک میں پڑ جاتے ہیں۔ مثلاً ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے نہیں جلایا۔ یہ امر بھی ایسا ہی ہے جیسا شق القمر کے متعلق۔ خدا خوب جانتا ہے کہ اس حد تک آگ جلاتی ہے اور ان اسباب کے پَیدا ہونے سے فرو ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا مصالحہ ظاہر ہو جاوے یا بتلا دیا جاوے تو فی الفور مان لیں گے لیکن ایسی صورت میں ایمان بالغیب اور حُسنِ ظن کا لُطف اور خوبی کیا ظاہر ہووے ہم نے یہ کبھی نہیں کہا کہ خدا خلق اسباب نہیں کرتا مگر بعض اسباب ایسے ہوتے ہیں کہ نظر آتے ہیں اور بعض اسباب نظر

نہیں آتے۔غرض یہ ہے کہ خدا کے افعال گوناگوں ہیں۔ خدائے تعالیٰ کی قدرت کبھی درماندہ نہیں ہوتی اور وہ نہیں تھکتا وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ[1] اَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ[2] اُس کی شان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بے انتہا قدرتوں اور افعال کا کیسا ہی صاحبِ عقل اور علم کیوں نہ ہو اندازہ نہیں کرسکتا بلکہ اُس کو اظہارِ عجز کرنا پڑتا ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے۔ ڈاکٹر خوب جانتے ہیں۔عبدالکریم نام ایک شخص میرے پاس آیا۔ اُس کے اندر ایک رسولی تھی جو پاخانہ کی طرف بڑھتی جاتی تھی۔ ڈاکٹروں نے اُسے کہا کہ اُس کا کوئی علاج نہیں اس کو بندوق مار کر مار دینا چاہیئے۔ الغرض بہت سے امراض اِس قسم کے ہیں جنکی ماہیّت ڈاکٹروں کو بخوبی معلوم نہیں ہوسکتی۔ مثلاً طاعون یا ہیضہ ایسے امراض ہیں کہ ڈاکٹر کو اگر پلیگ ڈیوٹی پر مقرر کیا جاوے تو اُسے خود ہی دست لگ جاتے ہیں۔ اِنسان جہاں تک ممکن ہو علم پڑھے اور فلسفہ کی تحقیقات میں محو ہو جاوے لیکن بالآخر اُس کو معلوم ہوگا کہ اُس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ حدیث میں آیا ہے کہ جیسے سمندر کے کنارے ایک چڑیا پانی کی چونچ بھرتی ہو اُسی طرح خدائے تعالیٰ کے کلام اور فعل کے معارف اور اسرار سے حصّہ ملتا ہے۔ پھر کیا عاجز انسان ہاں نادان فلسفی اس حیثیت اور شیخی پر خدائے تعالیٰ کے ایک فعل شق القمر پر اعتراض کرتا اور اُسے قانونِ قدرت کے خلاف ٹھہراتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اعتراض نہ کرو۔ نہیں کرو اور ضرور کرو شوق سے اور دل کھول کر کرو لیکن دو باتیں زیرِ نظر رکھ لو اوّل خدا کا خوف دوسرے بڑے بڑے فلاسفر بھی آخر یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ہم جاہل ہیں۔ اِنتہائے عقل ہمیشہ اِنتہائے جہل پر ہوتی ہے مثلاً ڈاکٹروں سے پُوچھو کہ عصبۂ مجوّفہ کو سب جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں مگر نور کی ماہیّت اور اس کی کُنہ تو بتلاؤ کہ کیا ہے آواز کی ماہیّت پوچھو تو یہ تو کہہ دیں گے کہ کان کے پَردہ پر یُوں ہوتا ہے اور وُوں ہوتا ہے لیکن ماہیّتِ آواز خاک بھی نہ بتلاسکیں گے۔ آگ کی گرمی اور پانی کی ٹھنڈک پر کیوں کا جواب نہ دے سکیں گے۔ کُنہ اشیاء تک پہنچنا کسی حکیم یا فلاسفر کا کام نہیں ہے۔ دیکھئے ہماری شکل آئینہ میں منعکس ہوتی ہے لیکن ہمارا سر ٹوٹ کر شیشہ کے اندر نہیں چلا جاتا ہم بھی سلامت ہیں اور ہمارا چہرہ بھی آئینہ کے اندر نظر آتا ہے۔ پس یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے کہ چاند شق ہو اور شق ہو کر بھی انتظامِ دُنیا میں خلل نہ آوے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ اشیاء کے خواص ہیں کون دَم مار سکتا ہے۔ اِس لئے خدائے تعالیٰ کے خوارق اور معجزات کا انکار کرنا اور اِنکار کے لئے جلدی کرنا شتاب کاروں اور نادانوں کا کام ہے۔ خدا کی قدرتوں اور عجائبات کو محدود سمجھنا دانشمندی نہیں۔ وہ اپنی ماہیّت نہیں جانتا اور سمجھتا اور آسمانی باتوں پر رائے زنی کرتا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۸۸ تا ۹۱)

یہ سچی بات ہے کہ خدائے تعالیٰ غیر معمولی طور پر کوئی کام نہیں کرتا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ خلقِ اسباب کرتا ہے خواہ ہم کو اُن اسباب پر اطلاع ہو یا نہ ہو۔ الغرض اسباب ضرور ہوتے ہیں اِس لئے "شق القمر" یا "یٰنَارُ کُوْنِیْ

[1] سورۃ یٰسٓ: ۸۰ [2] سورۃ قٓ: ۱۶

بَرۡدًا وَّ سَلٰمًا کے معجزات بھی خارج از اسباب نہیں بلکہ وہ بھی بعض مخفی در مخفی اسباب کے نتائج ہیں اور سچے اور حقیقی سائنس پر مبنی ہیں۔ کوتاہ اندیش اور تاریک فلسفہ کے دلدادہ اُسے نہیں سمجھ سکتے۔ مجھے تو یہ حیرت آتی ہے کہ جس حال میں یہ ایک امر مسلّم ہے کہ عدمِ علم سے عدمِ شئے لازم نہیں آتا تو نادان فلاسفر کیوں ان اسباب کی بے علمی پر جو اُن معجزات کا موجب ہیں اصل معجزات کی نفی کی جُرأت کرتا ہے۔ ہاں ہمارا یہ مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو اپنے کسی بندے کو اُن اسبابِ مخفیہ پر مطلع کر دے لیکن یہ کوئی لازم بات نہیں ہے۔ دیکھو اِنسان اپنے لئے جب گھر بناتا ہے تو جہاں اَور سب آسائش کے سامانوں کا خیال رکھتا ہے سب سے پہلے اِس امر کو بھی ملحوظ رکھ لیتا ہے کہ اندر جانے اور باہر نکلنے کے لئے بھی کوئی دروازہ بنالے اور اگر زیادہ ساز و سامان ہاتھی گھوڑے گاڑیاں بھی پاس ہیں تو علیٰ قدرِ مراتب ہر ایک چیز اور سامان کے نکلنے اور جانے کے واسطے دروازہ بناتا ہے نہ یہ کہ سانپ کی بانبی کی طرح ایک چھوٹا سا سوراخ۔ اسی طرح پر اللہ تعالیٰ کے فعل یعنی قانونِ قدرت پر ایک وسیع اور پُرغور نظر کرنے سے ہم پتہ لگا سکتے ہیں کہ اُس نے اپنی مخلوق کو پَیدا کر کے یہ کبھی نہیں چاہا کہ وہ عبودیت سے سرکش ہو کر ربوبیت سے متعلق نہ ہو۔ ربوبیت نے عبودیت کو دُور کرنے کا ارادہ کبھی نہیں کیا۔ سچّا فلسفہ یہی ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۳۷، ۱۳۸)

بڑا عظیم الشان معجزہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شق القمر تھا اور شقّ القمر دراصل ایک قسم کا خسوف ہی تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ سے ہوُا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

اِس سوال کے جواب میں کہ قُربِ قیامت سے کیا مُراد ہے۔ فرمایا:۔

قرآن میں بھی ہے اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ اور ایسی دیگر آیات۔ پس سمجھ سکتے ہو کہ قریب کے کیا معنے ہیں۔ قرب السّاعة کے جو نشانات تھے وہ تو ظاہر ہو چکے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ آخری زمانہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی ہَولناک واقعہ پیش آتا تو فرماتے کہ قیامت آگئی۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

شقّ القمر کے متعلق فرمایا:۔

ہماری رائے میں یہی ہے کہ وہ ایک قِسم کا خسوف تھا۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

وَاِنۡ یَّرَوۡا اٰیَةً الخ اور نشان کو دیکھ کر مُنہ پھیر لیں گے اور قبول نہیں کریں گے اور کہیں گے کہ یہ کوئی

---

[1] سورۃ الانبیاء: ۷۰

پکا فریب یا پکا جادو ہے۔ (مکتوباتِ احمدیہ جلد اوّل صفحہ ۱۱۶)

کسوف و خسوف رمضان کی نسبت فرمایا:۔

یہ ایک پُرانا نشان چلا آتا تھا جو اس وقت پُورا ہوُا ہے۔ براہینِ احمدیہ میں اِس کا ذکر استعارہ کے طور پر ہے وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَۃً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ یہ میرا الہام بھی ہے اور بعض محدّثین کا مذہب یہ بھی ہے کہ شق القمر بھی ایک قِسم خسوف کا تھا اور شاہ عبدالعزیز بھی یہی کہتے ہیں اور ہمارا مذہب بھی یہی ہے کہ از قِسم خسوف تھا کیونکہ بڑے بڑے علماء اس طرف گئے ہیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر۴ مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۶)

جب دیکھیں گے کوئی نشان تو مُنہ پھیر لیں گے اور کہیں گے کہ یہ ایک مکر ہے ......شق القمر کے معجزہ کے بیان میں اس وقت کافروں نے شق القمر کے نشان کو ملاحظہ کرکے جو ایک قِسم کا خسوف تھا یہی کہا تھا کہ اس میں کیا انوکھی بات ہے۔ قدیم سے ایسا ہی ہوتا آتا ہے۔ کوئی خارق عادت امر نہیں۔ (نزول المسیح صفحہ ۱۲۸، ۱۲۹)

۶ حِکْمَۃٌ بَالِغَۃٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ۝

حِکْمَۃٌ بَالِغَۃٌ قرآن .... انتہائی درجہ کی حکمت ہے۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۵)

۱۱ فَدَعَا رَبَّہٗٓ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ۝

اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ مَیں مغلوب ہوں میری طرف سے مقابلہ کر۔ (براہینِ احمدیہ صفحہ ۵۱۳ حاشیہ)

۱۸ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ۝

بیشک ہم نے یاد کرنے کے لئے قرآن شریف کو آسان کر دیا ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر۴۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

۴۴ تا ۴۶ اَکُفَّارُکُمْ خَیْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِکُمْ اَمْ لَکُمْ بَرَآءَۃٌ فِی الزُّبُرِ۝ اَمْ یَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِیْعٌ مُّنْتَصِرٌ۝ سَیُھْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۝

کیا تمہارے کافر فرعونی گروہ سے کچھ بہتر ہیں یا تم خدا کی کتابوں میں معذّب اور ماخوذ ہونے سے مستثنیٰ اور بَری قرار دئے گئے ہو۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری جماعت بڑی قوی جماعت ہے کہ جو زبردست اور فتح مند

ہے۔عنقریب یہ ساری جماعت پیٹھ پھیرتے ہوئے بھاگے گی۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۴۳ حاشیہ)

کیا کہتے ہیں کہ ہم ایک قوی جماعت ہیں جو جواب دینے پر قادر ہیں۔عنقریب یہ ساری جماعت بھاگ جائیگی اور پیٹھ پھیر لیں گے اور جب یہ لوگ کوئی نشان دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ ایک معمولی اور قدیمی سحر ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۹۸ حاشیہ)

معتبر تفسیروں میں لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو معلوم نہیں کہ یہ پیشگوئی کس موقع کے متعلق ہے اور پھر جب بدر کی لڑائی میں فتح عظیم ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ اب معلوم ہؤا کہ اسی فتح عظیم کی یہ پیشگوئی خبر دیتی تھی۔

(ضمیمہ براہینِ احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۸۹)

آپ نے کس حوصلہ اور دلیری کے ساتھ مخالفوں کو مخاطب کر کے کہا کہ فَكِيدُونِي جَمِيعًا[1] یعنی کوئی دقیقہ مکر کا باقی نہ رکھو۔سارے فریب مکر استعمال کرو قتل کے منصوبے کرو۔اخراج اور قید کی تدبیریں کرو مگر یاد رکھو سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ آخر فتح میری ہے۔تمہارے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔تمہاری ساری جماعتیں منتشر اور پراگندہ ہو جاویں گی اور پیٹھ دے نکلیں گی۔جیسے وہ عظیم الشان دعویٰ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا کسی نے نہیں کیا اور جیسے فَكِيدُونِي جَمِيعًا کہنے کو کسی کی ہمت نہ ہوئی۔یہ بھی کسی کے مُنہ سے نہ نکلا سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ۔یہ الفاظ اسی مُونہہ سے نکلے جو خدا تعالیٰ کے سائے کے نیچے الوہیت کی چادر میں لپٹا ہؤا پڑا تھا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی ساری پیشگوئیوں سے بھری ہوئی ہے۔اُن پر اگر ایک دانشمند آدمی خدا سے خوف کھا کر غور کرے تو اُسے معلوم ہوگا کہ کس قدر غیب کی خبریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملی ہیں۔کیا اُس وقت جبکہ ساری قوم آپ کی مخالف تھی اور کوئی ہمدرد اور رفیق نہ تھا یہ کہنا کہ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ چھوٹی بات ہو سکتی تھی۔اسباب کے لحاظ سے تو ایسا فتویٰ دیا جاتا تھا کہ ان کا خاتمہ ہو جاوے گا مگر آپ ایسی حالت میں اپنی کامیابی اور دشمنوں کی ذلت اور نامرادی کی پیشگوئیاں کر رہے ہیں اور آخر اسی طرح وقوع میں آتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَھَرٍ ۙ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ (۵۶،۵۵)

---

[1] سورۃ ہود : ۵۶

مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ○

متقی لوگ جو خدا تعالیٰ سے ڈر کر ہر یک قسم کی سرکشی کو چھوڑ دیتے ہیں وہ فوت ہونے کے بعد جنات اور نہر میں ہیں۔ صدق کی نشست گاہ میں با اقتدار بادشاہ کے پاس۔ اب اِن آیات کی رُو سے صاف ظاہر ہے کہ خدا تعالےٰ نے دخولِ جنت اور مقعدِ صدق میں تلازم رکھا ہے یعنی خدائے تعالیٰ کے پاس پہنچنا اور جنت میں داخل ہونا ایک دوسرے کا لازم ٹھہرایا گیا ہے۔ سو اگر رَافِعُكَ اِلَيَّ[1] کے یہی معنے ہیں جو مسیح خدائے تعالیٰ کی طرف اُٹھایا گیا تو بلاشُبہ وہ جنت میں بھی داخل ہو گیا جیسا کہ دوسری آیت یعنی اِرْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ[2] جو رَافِعُكَ اِلَيَّ کے ہم معنی ہے بصراحت اِسی پر دلالت کر رہی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی طرف اُٹھائے جانا اور گذشتہ مقربوں کی جماعت میں شامل ہو جانا اور بہشت میں داخل ہو جانا یہ تینوں مفہوم ایک ہی آن میں پورے ہو جاتے ہیں۔ پس اِس آیت سے بھی مسیح ابنِ مریم کا فوت ہونا ہی ثابت ہوُا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحَقَّ الْحَقَّ وَ اَبْطَلَ الْبَاطِلَ وَ نَصَرَ عَبْدَهٗ وَ اَيَّدَ مَامُوْرَهٗ۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۲۰، ۶۲۱)

آیت وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا[3] کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

..... یہ امر ثابت ہے کہ رَفع سے مراد اِس جگہ موت ہے مگر ایسی موت جو عزّت کے ساتھ ہو۔ جیسا کہ مقرّبین کے لئے ہوتی ہے کہ بعد موت ان کی رُوحیں علّیین تک پہنچائی جاتی ہیں۔ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۵۹۹)

مسیح علیہ السلام کا دُنیا میں دوبارہ آنا کسی طرح موجبِ وجاہت نہیں بلکہ آپ لوگوں کے عقیدے کے موافق اپنی حالت اور مرتبہ سے متنزّل ہو کر آئیں گے۔ اُمّتی بن کے امام مہدی کی بیعت کریں گے مقتدی بن کر اُن کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ پس یہ کیا وجاہت ہوئی بلکہ یہ تو قضیہ معکوسہ اور نبی اولوالعزم کی ایک ہتک ہے اور یہ کہنا کہ اِن سب باتوں کو وہ اپنا فخر سمجھیں گے بالکل بیہودہ خیال ہے لیکن اگر آسمان سے نازل نہ ہوں تو یہ اُن کی وجاہت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ۔ غرض واپس آنے میں کوئی وجاہت نہیں۔ (ایّام الصلح صفحہ ۱۶۵)

○

---

[1] سورۃ آلِ عمران: ۵۶ [2] سورۃ الفجر: ۲۹ [3] سورۃ مریم: ۵۸

سُورۃ الرحمٰن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

آیت ۲، ۳ اَلرَّحۡمٰنُ ۙ○ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ○

عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ اُس نے تجھے علمِ قرآن دیا۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۰۹ حاشیہ)

خدا نے تجھے قرآن سکھلایا۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد نہم صفحہ ۹۲)

عِلم نور ہے وہ حجاب نہیں ہو سکتا بلکہ جہالت حجابِ اکبر ہے۔ خدا کا نام علیم ہے اور پھر قرآن میں آیا ہے اَلرَّحْمٰنُ۔ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ اِسی لئے ملائکہ نے کہا لَاعِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا[1]

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

آیت ۴ تا ۶ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ○ عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ ○ اَلشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ ۪○

خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ - فَالْمُرَادُ مِنَ الْبَيَانِ اللُّغَةُ الْعَرَبِيَّةُ. كَمَا تُشِيْرُ اِلَيْهِ الْاٰيَةُ الثَّانِيَةُ اَعْنِيْ قَوْلَهٗ تَعَالٰى عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ[2]۔ فَجَعَلَ لَفْظَ الْمُبِيْنِ وَصْفًا خَاصًّا لِلْعَرَبِيَّةِ وَاَشَارَ

ترجمہ از اصل:۔ خدا تعالیٰ نے اِنسان کو پیدا کیا اور اس کو بولنا سکھایا سو بیان سے مراد جس کے معنے بولنا ہے زبان عربی ہے جیسا کہ دوسری آیت اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے یعنی عربی مبین۔ سو خدا نے مبین کے لفظ کو عربی کیلئے

---

[1] سورۃ البقرہ : ۳۳ [2] سورۃ النحل : ۱۰۴

اِلٰی اَنَّہٗ مِنْ صِفَاتِہِ الذَّاتِیَّۃِ۔ وَلَا یَشْتَرِکُ فِیْہِ اَحَدٌ مِنَ الْاَلْسِنَۃِ کَمَا لَا یَخْفٰی عَلَی الْمُتَفَکِّرِیْنَ۔ وَاَشَارَ بِلَفْظِ الْبَیَانِ اِلٰی بَلَاغَتِ ھٰذَا اللِّسَانِ۔ وَاِلٰی اَنَّھَا ھِیَ اللِّسَانُ الْکَامِلَۃُ وَاَنَّھَا اَحَاطَتْ کُلَّمَا اشْتَدَّتْ اِلَیْہِ الْحَاجَۃُ۔ وَتَصَوَّبَتْ مَطَرُھَا بِقَدَرِ مَا اقْتَضَتِ الْبَلْدَۃُ وَفَاقَتْ کُلَّ لُغَتٍ فِیْ اِبْرَازِ مَا فِی الضَّمَائِرِ وَسَاوَی الْفِطْرَۃَ الْبَشَرِیَّۃَ کَتَسَاوِی الدَّوَائِرِ۔ وَکُلَّ مَا اقْتَضَتْہُ الْقُوَی الْاِنْسَانِیَّۃُ وَابْتَغَتْہُ التَّصَوُّرَاتُ الْاِنْسِیَّۃُ وَ کُلَّ مَا طَلَبَہٗ حَوَائِجُ فِطْرَۃِ الْاِنْسَانِ۔ فَیُحَاذِیْھَا مُفْرَدَاتُ ھٰذِہِ اللِّسَانُ۔ مَعَ تَیْسِیْرِ النُّطْقِ۔ وَاِلْقَاءِ الْاَثَرِ عَلَی الْجَنَانِ۔ فَاتَّبِعْ مَا جَاءَکَ مِنَ الْیَقِیْنِ۔ ثُمَّ سِیَاقُ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ یَزِیْدُکَ فِی الدِّرَایَۃِ۔ فَاِنَّہٗ یَدُلُّ بِالدَّلَالَۃِ الْقَطْعِیَّۃِ عَلٰی مَا قُلْنَا مِنَ الْاَسْرَارِ الْخَفِیَّۃِ۔ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ۔ فَتَفَکَّرْ فِیْ اٰیَۃِ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ فَاِنَّ الْغَرَضَ فِیْھَا ذِکْرُ الْقُرْاٰنِ وَالْحَثُّ عَلَی التِّلَاوَۃِ وَالْاِمْعَانِ وَلَا یَحْصُلُ ھٰذَا الْغَرَضُ اِلَّا بَعْدَ تَعَلُّمِ الْعَرَبِیَّۃِ وَالْمَھَارَۃِ التَّامَّۃِ فِیْ ھٰذِہِ اللَّھْجَۃِ۔ فَلِاَجْلِ ھٰذِہِ الْاِشَارَۃِ۔ قَدَّمَ اللّٰہُ اٰیَۃَ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ثُمَّ قَفَاہُ

ایک خاص صفت ٹھہرایا اور اِس بات کی طرف اشارہ کیا کہ یہ لفظ بیان کا عربی کے صفاتِ خاصّہ میں سے ہے اور کوئی دوسری زبان اس صفت میں اس کی شریک نہیں جیسا کہ فکر کرنے والوں پر پوشیدہ نہیں اور بیان کے لفظ کے ساتھ اس زبان کی بلاغت کی طرف اشارہ کیا اور نیز اِس بات کی طرف اشارہ کیا کہ یہ زبان کامل اور ہر یک امرِ مَا یُحتاج پر محیط ہے اور اس کا مینہ اس قدر برسا ہے جس قدر زمین کو ضرورت تھی اور دلوں کے خیال ظاہر کرنے کے لئے ہر یک زبان پر فائق ہے اور فطرتِ بشری سے ایسی برابر ہے جیسا کہ ایک دائرہ دوسرے دائرے سے برابر ہو اور وہ تمام امور جن کو انسانی قوی چاہتے ہیں اور انسانی تصوّرات ان کے خواہشمند ہیں اور وہ تمام امور جن کو انسانی فطرت کی حاجتیں طلب کرتی ہیں۔ سو اِس زبان کے مفردات ان کے مقابل پر واقع ہیں اور ساتھ اس کے یہ خوبی ہے کہ بولنے کے طریق کو آسان کیا گیا ہے ایسا کہ دِل پر اثر پڑے۔ پھر اِس آیت کا سیاق درایت کو زیادہ کرتا ہے کیونکہ وہ سیاق اُن پوشیدہ بھیدوں پر دلالت کرتا ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں تا کہ تُو یقین والوں میں سے ہو جائے۔ پس اِس آیت میں غور کر یعنی اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ کیونکہ اِس آیت میں مقصود دُو باتیں ہیں قرآن کی فضیلت کا ذکر اور اُس کی تلاوت اور سوچنے پر ترغیب اور یہ غرض بجز اس کے حاصل نہیں ہو سکتی کہ عربی کو سیکھیں اور اس میں مہارتِ تامہ حاصل کریں۔ پس اِسی اشارت کی غرض سے خدا تعالیٰ نے آیت عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ کو مقدم کیا پھر (بعد) اسکے

اٰیَۃَ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ۔کَاَنَّہٗ قَالَ اَلْمِنَّۃُ مِنَّتَانِ۔تَنْزِیْلُ الْقُرْاٰنِ وَتَخْصِیْصُ الْعَرَبِیَّۃِ بِاَحْسَنِ الْبَیَانِ۔وَتَعْلِیْمُھَا لِاٰدَمَ لِیَنْتَفِعَ بِہٖ نَوْعُ الْاِنْسَانِ۔فَاِنَّھَا مَخْزَنُ عُلُوْمٍ عَالِیَۃٍ وَھِدَایَاتٍ اَبَدِیَّۃٍ مِنَ الْمَنَّانِ کَمَا لَا یَخْفٰی عَلَی الْمُتَدَبِّرِیْنَ۔

فَالْحَاصِلُ اَنَّہٗ ذَکَرَ اَوَّلًا نِعْمَۃَ الْفُرْقَانِ۔ثُمَّ ذَکَرَ نِعْمَۃً اُخْرٰی الَّتِیْ ھِیَ لَھَا کَالْبُنْیَانِ وَاَشَارَ اِلَیْھَا بِلَفْظِ الْبَیَانِ۔لِیُعْلَمَ اَنَّھَا ھُوَ الْعَرَبِیُّ الْمُبِیْنُ۔فَاِنَّ الْقُرْاٰنَ مَاجَعَلَ الْبَیَانَ صِفَۃَ اَحَدٍ مِنَ الْاَلْسِنَۃِ مِنْ دُوْنِ ھٰذِہِ اللَّھْجَۃِ۔فَاَیُّ قَرِیْنَۃٍ اَقْوٰی وَاَدَلُّ مِنْ ھٰذِہِ الْقَرِیْنَۃِ لَوْکُنْتُمْ مُتَفَکِّرِیْنَ۔اَلَا تَرٰی اَنَّ الْقُرْاٰنَ سَمّٰی غَیْرَ الْعَرَبِیَّۃِ اَعْجَمِیًّا فَمِنَ الْغَبَاوَۃِ اَنْ تَجْعَلَھَا لِلْعَرَبِیَّۃِ سَمِیًّا۔فَافْھَمْ اِنْ کُنْتَ زَکِیًّا وَلَا تَکُنْ مِنَ الْمُعْرِضِیْنَ۔وَالنَّصُّ صَرِیْحٌ وَمَا یُنْکِرُہٗ اِلَّا وَقِیْحٌ مِنَ الْمُعَانِدِیْنَ۔

وَمِنْھَا مَا قَالَ ذُوالْمَجْدِ وَالْعِزَّۃِ فِیْ اٰیَۃٍ بَعْدَ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ اَعْنِیْ قَوْلَ اللّٰہِ الْحَنَّانِ۔اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ۔فَانْظُرْ اِلٰی مَا قَالَ الرَّحْمٰنُ۔وَفَکِّرْ کَذِی الْعَقْلِ وَالْاِمْعَانِ۔

آیت عَلَّمَہُ الْبَیَانَ کو لایا۔ پس گویا اس نے یہ کہا کہ احسان دو احسان ہیں (۱) قرآن کا اُتارنا (۲) اور عربی کو بلاغت فصاحت کے ساتھ مخصوص کرنا اور آدم کو عربی کی تعلیم دینا تا نوعِ انسان اس سے منتفع ہو کیونکہ عربی علوم عالیہ کی مخزن ہے اور اس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ابدی ہدایتیں ہیں جیسا کہ تدبر کرنے والوں پر پوشیدہ نہیں۔

پس حاصلِ کلام یہ ہے کہ اوّل خدا تعالیٰ نے فرقان کی نعمت کو ذکر کیا ہے پھر اس دوسری نعمت کو ذکر کیا جو اس کے لئے بُنیاد کی طرح ہے اور اس بات کی طرف بیان کے لفظ کے ساتھ اشارہ کیا تا معلوم ہو کہ اس صفت سے موصوف عربی زبان ہے کیونکہ قرآن نے بیان کے لفظ کو بجز عربی کے کسی زبان کی صفت نہیں ٹھہرایا پس کونسا قرینہ اِس قرینہ سے زیادہ قوی اور زیادہ دلالت کرنے والا ہے اگر تم فکر کرنے والے ہو۔ کیا تو نہیں جانتا کہ قرآن نے غیر زبانوں کا نام اعجمی رکھا ہے پس نادانی ہوگی کہ ان زبانوں کو عربی کا ہم نام اور ہم مرتبہ ٹھہرایا جائے پس اگر تو زکی ہے تو سمجھ لے اور کنارہ کرنے والوں سے مت ہو اور یہ نصّ صریح ہے اور کوئی اس سے انکار نہیں کرے گا مگر بے حیا جو معاندوں میں سے ہوگا۔

اوران آیتوں میں سے ایک وہ آیت ہے جو خدائے ذوالمجد والعزّت نے بعد اس آیت کے ذکر فرمائی ہے یعنی خدائے بزرگ اور مہربان کا یہ قول کہ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ پس اس مضمون کو سوچ جو خدا تعالیٰ نے فرمایا اور عقلمندوں اور

وَتَذَكَّرْ كَالْمُسْتَرْشِدِيْنَ۔ فَإِنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ تُؤَيِّدُ اٰيَةً اُوْلٰى۔ وَيُفَسِّرُ مَعْنَاهَا بِتَفْسِيْرٍ اَجْلٰى۔ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْمُفَكِّرِيْنَ۔ وَبَيَانُهٗ اَنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ يَجْرِيَانِ مُتَعَاقِبَيْنِ۔ وَيَحْمِلَانِ نُوْرًا وَاحِدًا فِي اللَّوْنَيْنِ۔ وَكَذٰلِكَ الْعَرَبِيَّةُ وَالْقُرْاٰنُ فَاِنَّهُمَا تَعَاقَبَا وَاتَّحَدَا الْبُرُوْقُ وَاللَّمَعَانُ۔ اَمَّا الْقُرْاٰنُ فَهُوَ كَالشَّارِقِ الْمُنِيْرِ۔ وَالْعَرَبِيَّةُ كَالْبَدْرِ الْمُسْتَنِيْرِ۔ وَمَعَ ذٰلِكَ تَرَى الْعَرَبِيَّةَ اَسْرَعَ فِي الْمَسِيْرِ۔ وَاَجْرٰى عَلٰى لِسَانِ الصَّالِحِ وَالشِّرِّيْرِ۔ وَمَا كَانَتْ شَمْسُ الْقُرْاٰنِ اَنْ تُدْرِكَ هٰذَا الْقَمَرَ۔ وَكَذٰلِكَ قَدَّرَ اللّٰهُ هٰذَا الْاَمْرَ۔ وَاِنَّهُمَا بِحُسْبَانٍ۔ وَيَجْرِيَانِ كَمَا اُجْرِيَا وَلَا يَبْغِيَانِ۔ بِحِسَابٍ مُقَدَّرٍ مِنَ الرَّحْمٰنِ۔ فَتَرٰى اَنَّ الْقُرْاٰنَ۔ يَجْرِيْ بِرِعَايَةِ اَنْوَاعِ الْاِسْتِعْدَادِ۔ وَيَكْشِفُ عَلَى الطَّالِبِ اَسْرَارَ الْمَعَادِ۔ وَيُرَبِّي الْحُكَمَاءَ كَمَا يُرَبِّي السُّفَهَاءَ۔ وَيُعَلِّمُ الْعُقَلَاءَ كَمَا يُعَلِّمُ الْجُهَلَاءَ۔ وَفِيْهِ بَلَاغٌ لِكُلِّ مَرْتَبَةِ الْفَهْمِ۔ وَتَسْلِيَةٌ لِكُلِّ اَرْبَابِ الدَّهَاءِ وَالْوَهْمِ۔ وَسَاوٰى جَمِيْعَ اَنْوَاعِ الْاِدْرَاكِ۔ مِنْ اَهْلِ الْاَرْضِ اِلٰى اَهْلِ الْاَفْلَاكِ۔ وَاِنَّهٗ اَحَاطَ دَوَائِرَ فَهْمِ الْاِنْسَانِ۔ مَعَ اِلْتِزَامِ الْحَقِّ وَاِقَامَةِ الْبُرْهَانِ۔ وَ

سوچنے والوں کی طرح غور کر۔ اور رُشد کے طالبوں کی طرح یاد کر۔ کیونکہ یہ آیت پہلی آیت کی تائید کرتی ہے اور ایک کھُلی کھُلی تفسیر کے ساتھ اس کے معنی بیان کرتی ہے جیسا کہ سوچنے والوں پر پوشیدہ نہیں۔ اور بیان اس کا یہ ہے کہ آفتاب اور چاند ایک دوسرے کے متعاقب چلتے ہیں اور ایک ہی نور کو دو رنگوں میں اُٹھائے پھرتے ہیں اور یہی مثال عربی اور قرآن کی ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کے بعد چل رہے ہیں اور روشنی اور چمک میں اتحاد رکھتے ہیں۔ سو قرآن تو مہر تاباں کی طرح ہے اور عربی ماہتاب کی طرح اور باوصف اسکے عربی سیر میں تیز رَو ہے اور نیک اور بَد کی زبان پر زیادہ جاری ہوگئی ہے اور قرآن کا آفتاب اس کی حرکت کو نہیں پہنچا اور خدا تعالیٰ نے اس امر کو اسی طرح مقدر کیا اور وہ دونوں ایک حساب پر چل رہے ہیں اور جیسا کہ چلایا گیا ویسا ہی چل رہے ہیں اور اپنے اپنے اندازہ سے کم و بیش نہیں ہوتے۔ سو قرآن تو استعدادوں کے لحاظ پر چلتا ہے اور طالب پر معاد کے بھید کھولتا ہے اور حکیموں کی پرورش ایسا کرتا ہے جیسا کہ بیوقوفوں کی پرورش کرتا ہے اور عقلمندوں کو اسی طرح سکھلاتا ہے جیسا کہ جاہلوں کو اور اس میں ہر یک سمجھ کے مرتبہ کے لئے طریق تبلیغ موجود ہے اور ہر یک دانش اور وہم کے لئے تسلّی کا راہ ہے اور ادراک کی تمام قسموں سے وہ برابر ہے گو کتنے قسم زمین سے آسمان تک ہوں اور وہ انسانی فہم کے تمام دائرہ پر محیط ہے اور وہ حق اور بُرہان کا التزام اپنے ساتھ رکھتا ہے اور

اِنَّهٗ نُوْرٌ تَامٌّ مُّبِیْنٌ وَ اَمَّا اللُّغَۃُ الْعَرَبِیَّۃُ فَحُسْبَانُھَا اَنَّھَا تَجْرِیْ تَحْتَ مَقَاصِدِ الْقُرْاٰنِ۔ وَتَتِمُّ بِمُفْرَدَاتِھَا جَمِیْعُ دَوَائِرِ دِیْنِ الرَّحْمٰنِ وَ تَخْدِمُ سَائِرَ اَنْوَاعِ التَّعْلِیْمِ وَ التَّلْقِیْنِ۔ وَاِنَّھَا مِنْ اَعْظَمِ مَجَالِی الْقُدْرَۃِ الرَّبَّانِیَّۃِ۔ وَخَصَّھَا اللّٰہُ بِنِظَامٍ فِطْرِیٍّ مِنْ جَمِیْعِ الْاَلْسِنَۃِ۔ وَاَوْدَعَھَا مَحَاسِنَ الصَّنْعَۃِ الْاِلٰھِیَّۃِ۔ فَاَحَاطَتْ جَمِیْعَ لَطَائِفِ الْبَیَانِ۔ وَاَبْدَی الْجَمَالَ کَاَحْسَنِ اَشْیَاءٍ صَدَرَتْ مِنَ الرَّحْمٰنِ۔ وَ ھٰذَا ھُوَ الدَّلِیْلُ عَلٰی اَنَّھَا لَیْسَتْ مِنَ الْاِنْسَانِ۔ وَفِیْھَا صِبْغَۃٌ حِکْمِیَّۃٌ مِنَ اللّٰہِ الْمَنَّانِ۔ وَفِیْھَا حُسْنٌ وَ بَھَاءٌ وَ اَنْوَاعُ اللَّمَعَانِ۔ وَفِیْھَا عَجَائِبُ صَانِعٍ عَظِیْمِ الشَّانِ۔ تَلْمَعُ وَجْھُھَا بَیْنَ صُفُوْفِ اَلْسِنَۃٍ شَتّٰی۔ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ فِی الدُّجٰی۔ وَاِنَّھَا کَرَوْضَۃٍ طَیِّبَۃٍ عَلٰی نَھْرٍ جَارٍ۔ مُثْمِرَۃٍ بِاَنْوَاعِ ثِمَارٍ۔ وَاَمَّا الْاَلْسُنُ الْاُخْرٰی۔ فَقَدْ غَیَّرَ وَجْھَھَا قَتَرُ تَصَرُّفِ النَّوْکٰی۔ وَمَا بَقِیَتْ عَلٰی صُوْرَتِھَا الْاُوْلٰی۔ فَھِیَ کَاَشْجَارٍ اُجْتُثَّتْ مِنْ مَغَارِسِھَا وَبَعُدَتْ مِنْ نَوَاظِرِ حَارِسِھَا۔ وَنُبِذَتْ فِیْ مَوْمَاۃٍ وَقَفْرِ فَلَاۃٍ۔ فَاصْفَرَّتْ اَوْرَاقُھَا۔ وَیَبِسَتْ سَاقُھَا وَ سَقَطَتْ اَثْمَارُھَا۔ وَذَھَبَتْ نَضْرَتُھَا وَاخْضِرَارُھَا

وہ نور اور کھلی کھلی روشنی ہے۔ رہی عربی زبان سو اس کے چلنے کا طریق یہ ہے کہ قرآن کے مقاصد کے نیچے چلتی ہے اور اپنے مفردات کے ساتھ دین کے تمام دائروں کو پُورا کرتی ہے اور تعلیم اور تلقین کے تمام قسموں کی خدمت کرتی ہے اور یہ بولی قدرتِ ربّانی کی عظیم الشّان جلوہ گاہوں میں سے ہے اور خدا تعالےٰ نے اس کو تمام زبانوں میں سے نظامِ فطری کے ساتھ خاص کیا اور اس میں طرح طرح کی صنعتِ الٰہیہ کے محاسن رکھے ہیں پس یہ بولی بیان کے تمام لطائف پر محیط ہے اور اپنے جمال کو ایسے طور سے ظاہر کیا ہے جو ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جو خدا تعالیٰ سے صادر ہوئی ہیں اور یہی دلیل اِس بات پر ہے کہ یہ بولی انسان کی طرف سے نہیں اور اس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک پُر حکمت رنگ ہے اور حُسن اور خوبصورتی اور قسما قسم کی چمک ہے اور صنعتِ الٰہی کے عظیم الشّان عجائبات ہیں اس کا مُنہ کئی زبانوں کی صفوں کے اندر چمک رہا ہے گویا یہ ایک چمکتا ہوا موتی اندھیرے میں ہے اور یہ اس پاکیزہ باغ کی طرح ہے جو نہر جاری پر ہو۔ جو پھلوں سے لدا ہوا ہو۔ مگر دوسری زبانیں سو ان کا یہ حال ہے کہ احمقوں کے تصرف کے غبار نے بہت سا حصّہ ان کا متغیر کر دیا ہے اور اپنی پہلی صورت پر باقی نہیں رہیں پس وہ ان درختوں کی طرح ہیں جو اپنی جگہ سے اکھیڑے گئے اور اپنے نگہبان کی آنکھوں سے دُور کئے گئے اور ایسے بیابان میں ڈالے گئے جہاں پانی نہیں اور ایسے جنگل میں جہاں کوئی درخت سبز نہیں پس ان کے پتّے زرد ہو گئے اور ان کے پھل گر گئے اور ان کی تازگی اور سبزی

وَتَرٰى وَجْھَھَا کَالْمَجْذُوْمِیْنَ۔ (منن الرحمٰن صفحہ ۴۴ تا ۴۹)

وَقَدْ سَمِعْتَ اَنَّ اللّٰہَ جَعَلَ لَفْظَ الْبَیَانِ۔ صِفَةً لِلْعَرَبِیَّةِ فِی الْقُرْاٰنِ۔ وَوَصَفَ الْعَرَبِیَّةَ بِعَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ۔ فَھٰذِہٖ اِشَارَةٌ اِلٰی فَصَاحَتِ ھٰذَا اللِّسَانِ۔ وَعُلُوِّ مُقَامِھَا عِنْدَ الرَّحْمٰنِ۔ وَاَمَّا الْاَلْسِنَةُ الْاُخْرٰی فَمَا وَصَفَھَا بِھٰذَا الشَّانِ بَلْ مَا عَزَاھَا اِلٰی نَفْسِہٖ لِتَعْلِیْمِ الْاِنْسَانِ۔ وَسَمّٰی غَیْرَ الْعَرَبِیَّةِ اَعْجَمِیًّا فَفَکِّرْ اِنْ کُنْتَ زَکِیًّا۔ وَطُوْبٰی لِلْمُتَفَکِّرِیْنَ۔ (منن الرحمٰن صفحہ ۶۴)

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝

اِس سوال کے جواب میں کہ سورۃ رحمٰن میں اعادہ کیوں ہوا ہے فرمایا:۔

اِس قسم کا اِلتزام اللہ تعالیٰ کے کلام کا ایک ممتاز نشان ہے۔ اِنسان کی فطرت میں یہ امر واقع ہوا ہے کہ موزوں کلام اسے جلد یاد ہو جاتا ہے اِس لئے فرمایا وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ[1] یعنی بیشک ہم نے یاد کرنے کے لئے قرآن شریف کو آسان کر دیا ہے ......

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ بار بار توجہ دلانے کے واسطے ہے۔ اسی تکرار پر نہ جاؤ قرآن شریف میں اَور بھی تکرار ہے۔ مَیں خود بھی تکرار کو اسی وجہ سے پسند کرتا ہوں۔ میری تحریروں کو اگر کوئی دیکھتا ہے تو وہ اِس تکرار کو بکثرت پائے گا حقیقت سے بے خبر انسان اس کو منافی بلاغت سمجھ لے گا اور کہے گا کہ یہ بھول کر لکھا ہے حالانکہ یہ بات نہیں ہے مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ شاید پڑھنے والا پہلے جو کچھ لکھا ہے اُسے بھول گیا ہو اِس لئے بار بار یاد دلاتا ہوں تاکہ کسی مقام پر تو اس کی آنکھ کُھلے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔

حاتی رہی اور تُو دیکھتا ہے کہ ان کا چہرہ جذامیوں کی طرح ہو گیا۔ (منن الرحمٰن صفحہ ۴۴ تا ۴۹)

ترجمہ از اصل:۔ اور تُو سُن چکا ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بلاغت فصاحت کو عربی کی صفت ٹھہرایا ہے اور عربی کو عربی مبین کے لفظ سے موسوم کیا ہے پس یہ بیان اس زبان کی فصاحت کی طرف اشارہ ہے اور نیز اس کے مرتبہ عالیہ کی طرف ایما ہے مگر خدا تعالیٰ نے دوسری زبانوں کو اس وصف سے موصوف نہیں فرمایا بلکہ ان کو اپنی ذات کی طرف منسوب بھی نہیں فرمایا اور ان کا نام اعجمی رکھا پس اگر تُو زکی ہے تو اِس بات کو سوچ لے۔ اور مبارک ہیں وہ جو اِس بات کو سوچتے ہیں۔ (منن الرحمٰن صفحہ ۶۴)

---

[1] سورۃ القمر: ۲۳

علاوہ بریں تکرار پر اعتراض ہی بے فائدہ ہے اِس لئے کہ یہ بھی تو اِنسانی فطرت میں ہے کہ جب تک بار بار ایک بات کو دُہرائے نہیں وہ یاد نہیں ہوتی۔ سُبۡحَانَ رَبِّیَ الۡاَعۡلٰی اور سُبۡحَانَ رَبِّیَ الۡعَظِیۡم بار بار کیوں کہلوایا ایک بار ہی کافی تھا؟ نہیں۔ اس میں یہی سِر ہے کہ کثرتِ تکرار اپنا ایک اثر ڈالتی ہے اور غافل سے غافل قوتوں میں بھی ایک بیداری پَیدا کر دیتی ہے اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا

وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا لَّعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ [لے]

یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ جس طرح یہ ذہنی تعلق ہوتا ہے اور کثرتِ تکرار ایک بات کو حافظہ میں محفوظ کر دیتی ہے۔ اسی طرح ایک رُوحانی تعلق بھی ہے اس میں بھی تکرار کی حاجت ہے۔ بدُوں تکرار وہ رُوحانی پیوند اور رشتہ قائم نہیں رہتا..... حضرت امام جعفر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مَیں ایک آیت اتنی مرتبہ پڑھتا ہوں کہ وہ آخروحی ہو جاتی ہے۔ صوفی بھی اسی طرف گئے ہیں اور وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا کے یہ معنے ہیں کہ اِس قدر ذکر کرو کہ گویا اللہ تعالیٰ کا نام کنٹھ ہو جائے۔ انبیاء علیہم السّلام کے طرزِ کلام میں یہ بات عام ہوتی ہے کہ وہ ایک امر کو بار بار اور مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی اصل غرض یہی ہوتی ہے کہ تا مخلوق کو نفع پہنچے۔ مَیں خود دیکھتا ہوں اور میری کتابیں پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اگر چار صفحے میری کسی کتاب کے دیکھے جاویں تو ان میں ایک ہی امر کا ذکر پچاس مرتبہ آئے گا اور میری غرض یہی ہوتی ہے کہ شاید پہلے مقام پر اس نے غور نہ کیا ہو اور یُونہی سرسری طور سے گذر گیا ہو۔

قرآن شریف میں اعادہ اور تکرار کی بھی یہی حکمت ہے۔ یہ تو احمقوں کی خشک منطق ہے جو کہتے ہیں کہ بار بار تکرار سے بلاغت جاتی رہتی ہے۔ وہ کہتے رہیں۔ قرآن شریف کی غرض تو ایک بیمار کا اچھا کرنا ہے وہ تو ضرور ایک مریض کو بار بار دوَا دے گا۔ اگر یہ قاعدہ صحیح نہیں تو پھر ایسے معترض جب کوئی ان کے ہاں بیمار ہو جاوے تو اسے بار بار دوَا کیوں دیتے ہیں اور آپ کیوں دن رات کے تکرار میں اپنی غذا، لباس وغیرہ امور کا تکرار کرتے ہیں۔

پچھلے دنوں مَیں نے کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ ایک انگریز نے محض اسی وجہ سے خودکشی کر لی تھی کہ بار بار وہی دِن رات اور غذا مقرر ہے اور مَیں اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

کُلُّ مَنۡ عَلَیۡہَا فَانٍ ۚ وَّیَبۡقٰی وَجۡہُ رَبِّکَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِکۡرَامِ ۚ (۲۷، ۲۸)

[لے] سُورۃ الجمعہ: ۱۱

ہر یک چیز جو زمین میں موجود ہے اور زمین سے نکلتی ہے وہ معرضِ فنا میں ہے یعنی دمبدم فنا کی طرف میل کر رہی ہے۔ مطلب یہ کہ ہر یک جسمِ خاکی کو نابود ہونے کی طرف ایک حرکت ہے اور کوئی وقت اس حرکت سے خالی نہیں۔ وہی حرکت بچہ کو جوان کر دیتی ہے اور جوان کو بڈھا اور بڈھے کو قبر میں ڈال دیتی ہے اور اس قانونِ قدرت سے کوئی باہر نہیں۔ خدائے تعالیٰ نے فَانٍ کا لفظ اختیار کیا یَفْنیٰ نہیں کہا تا معلوم ہو کہ فنا ایسی چیز نہیں کہ کسی آئندہ زمانہ میں یک دفعہ واقعہ ہو گی بلکہ سلسلہ فنا کا ساتھ ساتھ جاری ہے لیکن ہمارے مولوی یہ گمان کر رہے ہیں کہ مسیح ابنِ مریم اسی فانی جسم کے ساتھ جس میں بموجب نصِ صریح کے ہر دم فنا کام کر رہی ہے بلا تغیر و تبدل آسمان پر بیٹھا ہے اور زمانہ اُس پر اثر نہیں کرتا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں بھی مسیح کو کائنات الارض میں سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۱۹، ۶۲۰)

جیسا کہ اب اسباب ظاہر اور مسبّب پوشیدہ ہے اس (دُنیا کے فنا کرنے کے۔ ناقل) وقت مسبّب ظاہر اور اسباب زاویۂ عدم میں چُھپ جائیں گے اور ہر یک چیز اس کی طرف رجوع کر کے تجلیاتِ قہریہ میں مخفی ہو جائے گی اور ہر یک چیز اپنے مکان اور مرکز کو چھوڑ دے گی اور تجلیاتِ الٰہیہ اس کی جگہ لیں گی اور عللِ ناقصہ کے فنا اور انعدام کے بعد علتِ تامہ کاملہ کا چہرہ نمودار ہو جائے گا۔ اِسی کی طرف اشارہ ہے كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ۔ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ۔ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ[1] یعنی خدا تعالیٰ اپنی قہری تجلی سے ہر یک چیز کو معدوم کر کے اپنی وحدانیت اور یگانگت دکھلائے گا۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۵۳، ۱۵۴ حاشیہ در حاشیہ)

وَاَمَّا قَوْلُهٗ تَعَالٰى فِيْ قِصَّةِ اِدْرِيْسَ وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا[2] فَاتَّفَقَ الْمُحَقِّقُوْنَ مِنَ الْعُلَمَاءِ اَنَّ الْمُرَادَ مِنَ الرَّفْعِ هٰهُنَا هُوَ الْاِمَاتَةُ بِالْاِكْرَامِ وَرَفْعِ الدَّرَجَاتِ وَالدَّلِيْلُ عَلٰى ذٰلِكَ اَنَّ لِكُلِّ اِنْسَانٍ مَوْتٌ مُقَدَّرٌ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۳۴)

ترجمہ از مرتّب:۔ حضرت ادریس علیہ السّلام کے قصہ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا تو اِس بارے میں محقق علماء اِس بات پر متفق ہیں کہ یہاں رَفع کے معنی عزت کے ساتھ موت دینے اور درجات کو بلند کرنے کے ہیں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ ہر انسان کے لئے موت مقدر ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ یعنی زمین پر جو بھی ہے فنا ہونے والا ہے۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۳۴)

---

[1] سُورۃ المؤمن: ۱۷ [2] سُورۃ مریم: ۵۸

خدا تعالیٰ نے جو اپنی ذات میں واحد ہے تمام اشیاء کو شئے واحد کی طرح پیدا کیا ہے تا وہ موجود واحد کی وحدانیت پر دلالت کریں۔ سو خدا تعالیٰ نے اسی وحدانیت کے لحاظ سے اور نیز اپنی قدرتِ غیر محدودہ کے تقاضہ سے استحالات کا مادہ ان میں رکھا ہے اور بجز اُن رُوحوں کے جو اپنی سعادت اور شقاوت میں خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا[1] کے مصداق ٹھہرائے گئے ہیں اور وعدۂ الٰہی نے ہمیشہ کے لئے ایک غیر متبدّل خلقت اُن کے لئے مقرر کر دی ہے باقی کوئی چیز مخلوقات میں سے استحالات سے بچی ہوئی معلوم نہیں ہوتی بلکہ اگر غور کر کے دیکھو تو ہر وقت ہر یک جسم میں استحالہ اپنا کام کر رہا ہے یہاں تک کہ علمِ طبعی کی تحقیقاتوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تین برس تک اِنسان کا جسم بدل جاتا ہے اور پہلا جسم ذرّات ہو کر اُڑ جاتا ہے مثلاً اگر پانی ہے یا آگ ہے تو وہ بھی استحالہ سے خالی نہیں۔ اور دو طور کے استحالے اُن پر حکومت کر رہے ہیں ایک یہ کہ بعض اجزاء نکل جاتے ہیں اور بعض اجزاء جدیدہ آملتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جو اجزاء نکل جاتے ہیں وہ اپنی استعداد کے موافق دوسرا جنم لے لیتے ہیں۔ غرض اِس فانی دُنیا کو استحالات کے چرخ پر چڑھائے رکھنا خدا تعالیٰ کی ایک سُنّت ہے۔ (برکات الدعا صفحہ ۲۳، ۲۴ حاشیہ)

ہر یک چیز فنا ہونے والی ہے اور ایک ذات تیرے ربّ کی رہ جائے گی۔ (ستّ بچن صفحہ ۱۰۷)

ہر ایک چیز معرضِ زوال میں ہے اور جو باقی رہنے والا ہے وہ خدا ہے جو جلال والا اور بزرگی والا ہے۔ اب دیکھو کہ اگر ہم فرض کر لیں کہ ایسا ہو کہ زمین ذرہ ذرہ ہو جائے اور اجرامِ فلکی بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور ان پر معدوم کرنے والی ایک ایسی ہَوا چلے جو تمام نشان ان چیزوں کے مٹا دے مگر پھر بھی عقل اِس بات کو مانتی اور قبول کرتی ہے بلکہ صحیح کانشنس اِس کو ضروری سمجھتا ہے کہ اس تمام نیستی کے بعد بھی ایک چیز باقی رہ جائے گی جس پر فنا طاری نہ ہو اور تبدّل اور تغیّر کو قبول نہ کرے اور اپنی پہلی حالت پر باقی رہے پس وہ وہی خدا ہے جو تمام فانی صورتوں کو ظہور میں لایا اور خود فنا کی دست بُرد سے محفوظ رہا۔ (اِسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵۶، ۵۷)

ہر ایک وجود ہلاک ہونے والا اور تغیّر پذیر ہے اور وہ جو باقی رہنے والا ہے وہی خدا ہے یعنی ہر ایک چیز فنا قبول کرتی ہے اور تغیّر قبول کرتی ہے مگر انسانی فطرت اِس بات کے ماننے کے لئے مجبور ہے کہ اس تمام عالَمِ اَرضی اور سماوی میں ایک ایسی ذات بھی ہے کہ جب سب پر فنا اور تغیّر وارد ہو اُس پر تغیّر اور فنا وارد نہیں ہو گی وہ اپنے حال پر باقی رہتا ہے۔ وہی خدا ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۸۹، ۹۰)

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ یعنی ہر ایک جو زمین پر ہے آخر مرے گا پس ..... ہر ایک چیز کے لئے بجز اپنی ذات کے موت ضروری ٹھہرا دی۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۵۷)

---

[1] سُورۃ النساء : ۱۷۰

خداتعالیٰ قدیم سے خالق چلا آتا ہے لیکن اس کی وحدت اِس بات کو بھی چاہتی ہے کہ کسی وقت سب کو فنا کر دے کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ سب جو اس پر ہیں فنا ہو جانے والے ہیں خواہ کوئی وقت ہو۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ وقت کب آئے گا مگر ایسا وقت ضرور آنے والا ہے۔ یہ اس کے آگے ایک کرشمۂ قدرت ہے وہ چاہے پھر خلقِ جدید کر سکتا ہے تمام آسمانی کتابوں سے ظاہر ہے کہ ایسا وقت ضرور آنے والا ہے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۹ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

۳۰ يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ

ہمارا خداوند قادرِ مطلق ..... تمام ذرّاتِ عالم اور اَرواح اور جمیع مخلوقات کو پَیدا کرنے والا ہے۔ اُس کی قدرت کی نسبت اگر کوئی سوال کیا جائے تو بجز اُن خاص باتوں کے جو اس کی صفاتِ کاملہ اور مواعیدِ صادقہ کے منافی ہوں۔ باقی سب امور پر وہ قادر ہے اور یہ بات کہ گو وہ قادر ہو مگر کرنا نہیں چاہتا یہ عجیب بیہودہ اِلزام ہے جب کہ اُس کی صفات میں كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ بھی داخل ہے اور ایسے تصرّفات کہ پانی سے برودت دُور کرے یا آگ سے خاصیتِ احراق زائل کر دیوے اُس کی صفاتِ کاملہ اور مواعیدِ صادقہ کی منافی نہیں ہیں۔

(برکات الدعاء صفحہ ۲۳، ۲۴)

يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس سے مانگنے والے تمام زمین وآسمان کے باشندے ہیں۔

(سَت بچن صفحہ ۹۹)

ہریک دِن وہ ہریک کام میں ہے کسی کو بُلاوے اور کسی کو رَدّ کرے اور کسی کو آباد کرے اور کسی کو ویران کرے اور کسی کو عزّت دے اور کسی کو ذِلّت دے۔ (سَت بچن صفحہ ۱۰۶)

جس طرح ستارے ہمیشہ نوبت بہ نوبت طلوع کرتے رہتے ہیں اسی طرح خدا کے صفات بھی طلوع کرتے رہتے ہیں۔ کبھی انسان خدا کے صفاتِ جلالیہ اور استغنائے ذاتی کے پرتوہ کے نیچے ہوتا ہے اور کبھی صفاتِ جمالیہ کا پرتوہ اس پر پڑتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ۔ (چشمۂ مسیحی صفحہ ۴۸)

وہ (خدا) اور اس کی صفات قدیم ہی سے ہیں مگر اس پر یہ لازم نہیں ہے کہ ہر ایک صفت کا علم ہم کو دے دے اور نہ اس کے کام اِس دُنیا میں سما سکتے ہیں۔ خدا کے کلام میں دقیق نظر کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ وہ اَزلی اور اَبدی ہے اور مخلوقات کی ترتیب اس کے ازلی ہونے کی مخالف نہیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۵ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸)

۳۴ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝

خدا تعالیٰ کے ملک سے جو زمین و آسمان ہے تم باہر نہیں جا سکتے۔ جہاں جاؤ گے خدا کا غلبہ تمہارے ساتھ ہو گا۔
(ست بچن صفحہ ۱۰۲)

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝

جو شخص خدائے تعالیٰ سے خائف ہے اور اس کی عظمت و جلال کے مرتبہ سے ہراساں ہے اس کے لئے دو بہشت ہیں ایک یہی دُنیا اور دوسری آخرت۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۷۲)

جو شخص خدا تعالیٰ کے مقام اور عزت کا پاس کر کے اور اِس بات سے ڈر کر کہ ایک دن خدا کے حضور میں پُوچھا جائے گا گناہ کو چھوڑتا ہے اُس کو دو بہشت عطا ہوں گے (۱) اول اِسی دُنیا میں بہشتی زندگی اس کو عطا کی جاوے گی اور ایک پاک تبدیلی اس میں پَیدا ہو جائے گی اور خدا اس کا متوّلی اور متکفّل ہو گا (۲) دوسرے مرنے کے بعد جاودانی بہشت اس کو عطا کیا جائے گا۔ یہ اِس لئے کہ وہ خدا سے ڈرا اور اس کو دُنیا پر اور نفسانی جذبات پر مقدم کر لیا۔
(لیکچر لاہور صفحہ ۱۲)

انسان کے لئے دو جنّت ہیں۔ جو شخص خدا سے پیار کرتا ہے۔ کیا وہ ایک جلنے والی زندگی میں رہ سکتا ہے؟ جب اس جگہ ایک حاکم کا دوست دنیوی تعلقات میں ایک قسم کی بہشتی زندگی میں ہوتا ہے تو کیوں نہ اُن کے لئے دروازہ جنّت کا کھلے جو اللہ کے دوست ہیں۔ اگرچہ دُنیا پُر از تکلیف و مصائب ہے لیکن کسی کو کیا خبر وہ کیسی لذت اُٹھاتے ہیں۔ اگر ان کو رنج ہو تو آدھ گھنٹہ تکلیف اُٹھانا بھی مشکل ہے حالانکہ وہ تو تمام عمر تکلیف میں رہتے ہیں۔ ایک زمانہ کی سلطنت ان کو دے کر ان کو اپنے کام سے روکا جائے تو وہ کب کسی کی سُنتے ہیں۔ اِسی طرح خواہ مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں وہ اپنے ارادہ کو نہیں چھوڑتے۔ ہمارے ہادیٔ کامل کو یہ دونو باتیں دیکھنی پڑیں ایک وقت تو طائف میں پتھر برسائے گئے۔ ایک کثیر جماعت نے سخت سے سخت جسمانی تکلیف دی لیکن آنحضرتؐ کے اِستقلال میں فرق نہ آیا۔ جب قوم نے دیکھا کہ مصائب و شدائد سے ان پر کوئی اثر نہ پڑا تو انہوں نے جمع ہو کر بادشاہت کا وعدہ دیا۔ اپنا امیر بنانا چاہا۔ ہر ایک قسم کے سامانِ آسائش مہیا کر دینے کا وعدہ کیا حتّٰی کہ عمدہ بی بی بھی۔ بدیں شرط کہ حضرت بُتوں کی مذمت چھوڑ دیں لیکن جیسے کہ طائف کی مصیبت کے وقت ویسی ہی اس وعدۂ بادشاہت کے وقت حضرتؐ نے کچھ پرواہ نہ کی اور پتھر کھانے کو ترجیح دی۔ سو جب تک خاص لذت نہ ہو تو کیا ضرورت تھی کہ آرام چھوڑ کر دُکھوں میں پڑتے۔
(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۶، ۳۷)

جو شخص خدا تعالیٰ کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے واسطے دو بہشت ہیں یعنی ایک بہشت تو اِسی دُنیا میں مِل جاتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کا خوف اُس کو بُرائیوں سے روکتا ہے اور بدیوں کی طرف دوڑنا دِل میں ایک اِضطراب اور قلق پَیدا کرتا ہے جو بجائے خود ایک خطرناک جہنّم ہے لیکن جو شخص خدا کا خوف کھاتا ہے تو وہ بدیوں سے پرہیز کر کے اس عذاب اور درد سے تو دَم نقد بچ جاتا ہے جو شہوات اور جذباتِ نفسانی کی غلامی اور اسیری سے پَیدا ہوتا ہے اور وہ وفاداری اور خدا کی طرف جُھکنے میں ترقی کرتا ہے جس سے ایک لذّت اور سرور اسے دیا جاتا ہے اور یُوں بہشتی زندگی اِسی دُنیا سے اس کے لئے شروع ہو جاتی ہے اور اس طرح پر اس کے خلاف کرنے سے جہنمی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ر مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

انسان بہت بڑی ذمّہ داریاں لے کر آتا ہے اِس لئے آخرت کی فِکر کرنی چاہیئے اور اس کی تیاری ضروری ہے۔ اس تیاری میں جو تکالیف آتی ہیں وہ رنج و تکلیف کے رنگ میں نہ سمجھو بلکہ اللہ تعالیٰ اُن پر بھیجتا ہے جن کو دونوں بہشتوں کا مزہ چکھانا چاہتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔ مصائب آتے ہیں تاکہ ان عارضی امور کو جو تکلّف کے رنگ میں ہوتے ہیں نکال دے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۶ مورخہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

سب سے بہتر غم غلط کرنے والا اور راحت بخشنے والا سچّا ایمان ہے۔ یہ مومن ہی کے لئے ہے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ر اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جب آدمی عارف ہو جاتا ہے تو اس کی عادت کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے کیونکہ جب نفس مطمئنہ ہو گیا تو ثواب کیسے رہا نفس کی مخالفت کرنے سے ثواب تھا وہ اب رہی نہیں۔ قرآن شریف میں ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ یعنی وہ جنّت میں داخل ہو گیا اور اس کا درجہ ثواب کا نہ رہا۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۷ مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۰)

وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ[1] اور بشارت دی کہ تم خوش ہو اس جنّت سے۔ اور اس جنّت سے یہاں مراد دُنیا کی جنّت ہے جیسے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۷ مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۱)

بہشت ایک ہی چیز نہیں بلکہ فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ خدا سے ڈرنے والے کے لئے دو بہشت ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ر فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

..... قرآن شریف میں دو جنّتوں کا بیان ہے جیسے کہ لکھا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ یعنی جو کوئی

---

[1] سُورۃ حٰمٓ السّجدۃ : ۳۱

اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس کے لئے دو جنتیں ہیں ایک دُنیا میں اور ایک آخرت میں۔ دُنیا والی جنت وہ ہے جو کہ اس درجہ کے بعد انسان کو حاصل ہو جاتی ہے اور اس مقام پر پہنچ کر انسان کی اپنی کوئی مشیت نہیں رہتی بلکہ خدا تعالیٰ کی مشیت اس کی اپنی مشیت ہوتی ہے اور جیسے ایک انسان کو خصی کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے تو زنا کاری وغیرہ حرکات کا مرتکب ہی نہیں ہو سکتا ویسے ہی یہ شخص خصی کر دیا جاتا ہے اور اس سے کوئی بدی نہیں ہو سکتی۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۳۵)

جو شخص خدا تعالیٰ سے خائف ہے اور اس کی عظمت اور جلال کے مرتبہ سے ہراساں ہے اس کے لئے دو بہشت ہیں ایک یہی دُنیا اور دوسری آخرت۔ جو شخص سچے دل اور خالص دل سے نقش ہستی کو اس کی راہ میں مٹا کر اس کے متلاشی ہوتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں تو اس میں ایک قسم کی لذت شروع ہو جاتی ہے اور اُن کو وہ رُوحانی غذائیں ملتی ہیں جو رُوح کو روشن کرتی اور خدا تعالیٰ کی معرفت کو بڑھاتی ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۳ مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳۵)

چونکہ اس دُنیا میں بھی ایک بہشت ہے جو مومن کو دیا جاتا ہے اس کے موافق ایک تبدیلی یہاں ہوتی ہے۔ اسکو ایک خاص قسم کا رُعب دیا جاتا ہے جو الٰہی تجلیات کے پرتَو سے ملتا ہے نفسِ امّارہ کے جذبات سے اس کو روک دیا جاتا ہے اور نفسِ مطمئنہ کی سکینت اور اطمینان اس کو ملتا ہے۔ اس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں ..... اس کے سارے جوشوں کو ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ میں ایک راحت اور اطمینان پالیتا ہے اور ایک تبدیلی اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۶ء صفحہ ۶)

اِس اُمّت پر یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔ اِسلام جس بات کو چاہتا ہے وہ اسی جگہ سے اِسلام کے ذریعہ سے حاصل ہو جاتی ہے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔ خدا کے دیدار کے واسطے اسی جگہ سے حواس ملتے ہیں۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرتے ہیں ان کو دو جنت ملتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اِس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک جنّت تو وہ ہے جو مرنے کے بعد ملتی ہے دوسری جنت اِسی دُنیا میں عطا ہوتی ہے اور یہی جنّت اس دوسری جنت کے ملنے اور عطا ہونے پر بطور گواہ واقعہ ٹھہر جاتی ہے۔ ایسا مومن دُنیا میں بہت سے دوزخوں سے رہائی پاتا ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

یاد رکھو جو خدا تعالیٰ کی طرف صدق اور اخلاص سے قدم اُٹھاتے ہیں وہ کبھی ضائع نہیں کئے جاتے۔ ان کو دونو جہان کی نعمتیں دی جاتی ہیں۔ جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ اور یہ اِس واسطے فرمایا کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میری طرف آنے والے دُنیا کھو بیٹھتے ہیں بلکہ ان کے لئے دو بہشت ہیں ایک بہشت

تو اسی دُنیا میں اور ایک جو آگے ہوگا۔ (الحکم جلد ۱۲ ۴ مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ

نیکی کرنے کی پاداش نیکی ہے۔ اگر ہم صرف مسلمان نیکی کرنے والے سے نیکی کریں اور غیر مذہب والوں سے نیکی نہ کریں تو ہم خدا تعالیٰ کی تعلیم کو چھوڑتے ہیں کیونکہ اُس نے نیکی کی پاداش میں کسی مذہب کی قید نہیں لگائی بلکہ صاف فرمایا ہے کہ اُس شریر پر خدا راضی نہیں کہ جو نیکی کرنے والوں سے بَدی کرتا ہے۔ (ایام الصّلح صفحہ ۱۲۵، ۱۲۶)

اِحسان کا بدلہ بجز احسان کے اَور کچھ نہیں۔ (تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد سوم صفحہ ۱۹۴)

اِحسان کا بدلہ اِحسان ہے۔ (تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۱۲۴)

(بدر جلد ۶ ۱۹ مورخہ ۹ مئی ۱۹۰۷ء)

قرآن میں جہاں جہاں خدا نے مُحسن کا ذکر فرمایا ہے وہاں کوئی شرط نہیں لگائی کہ وہ مسلمان ہو اور موحّد ہو اور فلاں سِلسلہ کا ہو بلکہ عام طور پر مُحسن کی نسبت فرمایا خواہ وہ کوئی مذہب رکھتا ہو۔ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ کہ کیا اِحسان کا بدلہ احسان کے سوا بھی ہو سکتا ہے۔ (الحکم جلد ۴ ۵ مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۰۰ء صفحہ ۵)

اِس سے یہ مُراد ہرگز نہیں کہ مسلمان احسان کرے تو اس کے بدلہ میں احسان کرو اور اگر غیر مذہب والا کرے تو نیش زنی کرو۔ یہ تو خبیث کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہی منشاء ہے کہ کوئی ہو جو احسان کرتا ہے اس کے ساتھ اِحسان کرنا فرض ہے۔ اِحسان کی تو یہ طاقت ہے کہ اگر ایک کُتّے کو تم ٹکڑا ڈال دو تو وہ بار بار تمہاری طرف آئیگا خواہ تم اسے مار کر بھی نکالو مگر وہ تمہیں دیکھ کر اس احسان کے شکریہ کے لئے دُم ہلا دے گا۔ پھر وہ انسان تو کُتّے سے بھی بَدتر ہے جو انسان ہو کر احسان شناسی سے کام نہیں لیتا۔

(الحکم جلد ۱۱ ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

سُورۃ الواقعۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

الواقعۃ: ۲۰،۱۹

بِاَکۡوَابٍ وَّ اَبَارِیۡقَ ۬ۙ وَ کَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِیۡنٍ ۝ۙ لَّا یُصَدَّعُوۡنَ عَنۡہَا وَ لَا یُنۡزِفُوۡنَ ۝ۙ

اور شرابِ صافی کے پیالے جو آبِ زلال کی طرح مصفّٰی ہوں گے بہشتیوں کو دئے جائیں گے۔ وہ شراب اُن سب عیبوں سے پاک ہوگی کہ دردِ سر پَیدا کرے یا بیہوشی اور بدمستی اُس سے طاری ہو ..... ظاہر ہے کہ وہ بہشتی شراب دُنیا کی شرابوں سے کچھ مناسبت اور مشابہت نہیں رکھتی بلکہ وہ اپنی تمام صفات میں اِن شرابوں سے مبائن اور مخالف ہے اور کسی جگہ قرآن شریف میں یہ نہیں بتلایا گیا کہ وہ دُنیوی شرابوں کی طرح انگور سے یا قندِ سیاہ اور کیکر کے چھلکوں سے یا ایسا ہی کسی اَور دُنیوی مادّہ سے بنائی جائے گی بلکہ بار بار کلامِ الٰہی میں یہی بیان ہؤا ہے کہ اصل تخم اُس شراب کا محبت اور معرفتِ الٰہی ہے جس کو دُنیا سے ہی بندۂ مومن ساتھ لے جاتا ہے اور یہ بات کہ وہ روحانی امر کیونکر شراب کے طور پر نظر آجائے گا یہ خدائے تعالیٰ کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے جو عارفوں پر مکاشفات کے ذریعہ سے کُھلتا ہے اور عقلمند لوگ دوسری علامات و آثار سے اُس کی حقیقت تک پہنچتے ہیں۔

(سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۸۴، ۸۵)

الواقعۃ: ۴۱،۴۰

ثُلَّۃٌ مِّنَ الۡاَوَّلِیۡنَ ۝ۙ وَ ثُلَّۃٌ مِّنَ الۡاٰخِرِیۡنَ ۝ؕ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کُھلے کُھلے طور پر اپنی اُمّت کے حق میں فرما دیا تھا کہ تم آخری زمانہ میں بکلّی یہودیوں کے قدم پر قدم رکھ کر یہودی بن جاؤگے اور یہ بَلائیں آخری زمانہ میں سب سے زیادہ مشرقی ملکوں میں

پھیلیں گی یعنی ہندوستان وخراسان وغیرہ میں تب اس یہودیت کی بیخکنی کے لئے مسیح ابنِ مریم نازل ہوگا یعنی مامور ہوکر آئے گا اور فرمایا کہ جیساکہ یہ اُمت یہودی بن جائے گی ایسا ہی ابنِ مریم بھی اپنی صورت مثالی میں اسی اُمت میں سے پَیدا ہوگا نہ یہ کہ یہودی تو یہ اُمت بنی اور ابنِ مریم بنی اسرائیل میں سے آوے۔ ایسا خیال کرنے میں سراسر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسرِ شان ہے اور نیز آیت ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ۔ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ کے برخلاف۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۵۹۲، ۵۹۳)

کیا تم وہ باتیں یاد نہیں کرتے جو عالم الغیب نے کہیں اور اس نے تمہیں ایک آنے والے امام کی قرآن کریم میں خبر دی ہے اور کہا کہ ایک گروہ پہلوں میں سے اور ایک گروہ پچھلوں میں سے ہوگا اور ہر ایک گروہ کے لئے ایک امام ہوتا ہے سو سوچو کیا اس میں کوئی کلام ہے؟ سو تم امام الآخرین سے کہاں بھاگتے ہو۔

(نور الحق جلد دوم صفحہ ۲۵)

وَھٰھُنَا نُکْتَةٌ کَشْفِیَّةٌ لَیْسَتْ مِنَ الْمَسْمُوْعِ۔ فَاسْمَعْ مُصْغِیًا وَعَلَیْكَ بِالْوُدُوْعِ۔ وَھُوَ اَنَّهٗ تَعَالٰی مَا اخْتَارَ لِنَفْسِهٖ ھٰھُنَا اَرْبَعَةً مِنَ الصِّفَاتِ۔ اِلَّا لِیُرِیَ نَمُوْذَجَھَا فِیْ ھٰذِهِ الدُّنْیَا قَبْلَ الْمَمَاتِ۔ فَاَشَارَ فِیْ قَوْلِهٖ "وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَةِ"[1] اِلٰی اَنَّ ھٰذَا النَّمُوْذَجَ یُعْطٰی لِصَدْرِ الْاِسْلَامِ۔ ثُمَّ لِلْاٰخِرِیْنَ مِنَ الْاُمَّةِ الدَّاخِرَةِ۔ وَکَذَالِكَ قَالَ فِیْ مَقَامٍ اٰخَرَ وَھُوَ اَصْدَقُ الْقَائِلِیْنَ۔ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ۔ فَقَسَّمَ زَمَانَ الْھِدَایَةِ وَالْعَوْنِ وَالنُّصْرَةِ۔ اِلٰی زَمَانِ نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ وَاِلَی الزَّمَانِ الْاٰخِرِ الَّذِیْ ھُوَ زَمَانُ مَسِیْحِ ھٰذِهِ الْمِلَّةِ۔ وَ

ترجمہ از مرتّب :۔ اِس جگہ ایک کشفی نکتہ ہے جو پہلے سُننے میں نہیں آیا۔ اسے پُوری توجّہ، سکینت اور وقار سے سُنیں۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنے لئے چار صفات کو صرف اِس لئے اختیار کیا ہے کہ وہ ان کا نمونہ اس دُنیا میں ہماری موت سے پہلے دکھائے۔ سو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَةِ میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ نمونہ پہلے صدرِ اسلام کو دیا جائے گا پھر آخری زمانہ میں زوال پذیر اُمت کو بھی دیا جائے گا۔ اِسی طرح اللہ نے جو سب سے سچّا ہے ایک اَور مقام پر فرمایا ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ۔ پس اس نے ہدایت، مدد اور نصرت کے زمانہ کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک زمانہ تو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور ایک زمانہ اس اُمت کے مسیح کا ہے۔ اسی طرح اس نے

---

[1] سورۃ القصص : ۷۱

كَذَالِكَ قَالَ وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۔ فَاَشَارَ اِلَى الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ وَجَمَاعَتِهٖ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ ۔ فَثَبَتَ بِنُصُوْصٍ بَيِّنَةٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۔ اَنَّ هٰذِهِ الصِّفَاتَ قَدْ ظَهَرَتْ فِىْ زَمَنِ نَبِيِّنَا ثُمَّ تَظْهَرُ فِىْ اٰخِرِ الزَّمَانِ ۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۵۰)

اگرچہ زمانہ فیج اعوج میں بھی جماعت کثیر گمراہوں کے مقابل نیک اور اہل اللہ اور ہر صدی کے سر پر مجدد بھی ہوتے رہے ہیں لیکن جس منطوق آیت ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ خالص محمدی گروہ جو ہر ایک پلید ملونی اور آمیزش سے پاک اور توبہ نصوح سے غسل دیئے ہوئے ایمان اور دقائق عرفان اور علم اور عمل اور تقویٰ کے لحاظ سے ایک کثیر التعداد جماعت ہے یہ اسلام میں صرف دو گروہ ہیں یعنی گروہِ اوّلین و گروہِ آخرین جو صحابہ اور مسیح موعود کی جماعت سے مراد ہے۔ اِس لئے اِس سورۃ (فاتحہ) میں اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے فقرہ سے مراد یہی دونوں گروہ ہیں یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مع اپنی جماعت کے اور مسیح موعود مع اپنی جماعت کے۔ خلاصہ کلام یہ کہ خدا نے ابتداء سے اِس اُمّت میں دو گروہ ہی تجویز فرمائے ہیں اور انہی کی طرف سُورۃ فاتحہ کے فقرہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں اشارہ ہے (۱) ایک اوّلین جو جماعت نبوی ہے (۲) دوسرے آخرین جو جماعت مسیح موعود ہے اور افرادِ کاملہ جو درمیانی زمانہ میں ہیں جو فیج اعوج کے نام سے موسوم ہے جو بوجہ اپنی کمی مقدار اور کثرتِ اشرار و فجار و ہجوم افواج بدمذاہب و بدعقائد و بداعمال شاذ و نادر کے حکم میں سمجھے گئے گو دوسرے فرقوں کی نسبت درمیانی زمانہ کے صلحائے اُمّتِ محمدیہ بھی باوجود طوفانِ بدعات کے ایک دریائے عظیم کی طرح ہیں۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۸۰، ۸۱)

ابرار اخیار کے بڑے گروہ جن کے ساتھ بدمذاہب کی آمیزش نہیں وہ دو ہی ہیں ایک پہلوں کی جماعت یعنی صحابہؓ کی جماعت جو زیرِ تربیتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہے دوسری پچھلوں کی جماعت جو بوجہ تربیت رُوحانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جیسا کہ آیت وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ سے سمجھا جاتا ہے صحابہؓ کے رنگ میں ہیں یہی دو جماعتیں اسلام

یہ بھی فرمایا وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسیح موعود اور آپ کی جماعت کی طرف اشارہ کیا اور نیز ان لوگوں کی طرف جو ان کی پیروی کریں گے۔ پس قرآن مجید کے واضح نصوص سے ثابت ہوا کہ یہ مذکورہ چار صفات ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ظاہر ہوئیں پھر آخری زمانہ میں بھی ظاہر ہوں گی۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۵۰)

لہ سُورۃ الجمعۃ : ۴

میں حقیقی طور پر منعم علیہم ہیں اور خدا تعالیٰ کا انعام اُن پر یہ ہے کہ ان کو انواع و اقسام کی غلطیوں اور بدعات سے نجات دی ہے اور ہر ایک قسم کے شرک سے ان کو پاک کیا ہے اور خالص اور روشن توحید ان کو عطا فرمائی ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۸۲)

اُنْظُرْ فِی الْبُخَارِیِّ وَغَیْرِہٖ مِنَ الصِّحَاحِ کَیْفَ بَشَّرَنَا نَبِیُّنَا وَ رَسُوْلُنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَقَالَ اِنَّہٗ سَیَکُوْنُ فِیْ اُمَّتِہٖ قَوْمٌ یُکَلَّمُوْنَ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَّکُوْنُوْا اَنْبِیَاءَ وَیُسَمَّوْنَ مُحَدَّثِیْنَ۔ وَقَالَ اللّٰہُ جَلَّ شَانُہٗ ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّۃٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ۔ (تحفہ بغداد صفحہ ۱۲)

ثُمَّ بَشَّرَنَا وَقَالَ ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّۃٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ۔ وَفِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ اَشَارَ اِلٰی اَنَّ ھٰذِہِ الْاُمَّۃَ تُکَلَّمُ کَمَا کُلِّمَتِ الْاُمَمُ مِنْ قَبْلُ۔ (تحفہ بغداد حاشیہ صفحہ ۱۷)

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّہٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ ۝ اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ ۝ فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ ۝ لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝

میں مواقع النجوم کی قسم کھاتا ہوں اور یہ بڑی قسم ہے اگر تمہیں علم ہو اور قسم اِس بات پر ہے کہ یہ قرآن عظیم الشان کتاب ہے اور اس کی تعلیمات سُنّت اللہ کے مخالف نہیں بلکہ اس کی تمام تعلیمات کتاب مکنون یعنی صحیفۂ فطرت میں لکھی ہوئی ہیں اور اس کے دقائق کو وہی لوگ معلوم کرتے ہیں جو پاک کئے گئے ہیں (اِس جگہ اللہ جلّ شانہٗ نے مواقع النجوم کی قسم کھا کر اس طرف اشارہ کیا کہ جیسے ستارے نہایت بلندی کی وجہ سے نقطوں کی طرح نظر آتے ہیں مگر وہ اصل میں نقطوں کی طرح نہیں بلکہ بہت بڑے ہیں ایسا ہی قرآن کریم اپنی

ترجمہ از مرتّب:۔ دیکھو بخاری میں اور دوسری صحاح میں کس طرح ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بشارت دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ آپ کی اُمت میں بعض ایسے لوگ بھی ہوں گے جن سے اللہ تعالےٰ کلام کرے گا اور وہ نبی نہیں ہوں گے ان کا نام محدث رکھا جائے گا۔ اور اللہ جلّ شانہٗ نے فرمایا ہے ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّۃٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ۔ (تحفہ بغداد صفحہ ۱۲)

ترجمہ از مرتّب:۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں بشارت دیتے ہوئے فرمایا ہے ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّۃٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ۔ اور اِس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اِس اُمّت سے بھی اللہ تعالیٰ اسی طرح کلام کرے گا جس طرح وہ پہلی اُمّتوں سے کلام کرتا رہا ہے۔ (تحفہ بغداد حاشیہ صفحہ ۱۷)

نہایت بلندی اور علوِ شان کی وجہ سے کم نظروں کے آنکھوں سے مخفی ہے اور جن کی غبار دُور ہو جاوے وہ ان کو دیکھتے ہیں اور اس آیت میں اللہ جلّ شانہٗ نے قرآن کریم کے دقائق عالیہ کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے جو خدا تعالیٰ کے خاص بندوں سے مخصوص ہیں جن کو خدا تعالیٰ اپنے ہاتھ سے پاک کرتا ہے اور یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ اگر علمِ قرآن مخصوص بندوں سے خاص کیا گیا ہے تو دوسروں سے نافرمانی کی حالت میں کیونکر مواخذہ ہو گا کیونکہ قرآن کریم کی وہ تعلیم جو مدارِ ایمان ہے وہ عام فہم ہے جس کو ایک کافر بھی سمجھ سکتا ہے اور ایسی نہیں ہے کہ کسی پڑھنے والے سے مخفی رہ سکے اور اگر وہ عام فہم نہ ہوتی تو کارخانۂ تبلیغ ناقص رہ جاتا مگر حقائق معارف چونکہ مدارِ ایمان نہیں صرف زیادتِ عرفان کے موجب ہیں اِس لئے صرف خواص کو اس کوچہ میں راہ دیا کیونکہ وہ دراصل مواہب اور روحانی نعمتیں ہیں جو ایمان کے بعد کامل الایمان لوگوں کو ملا کرتی ہیں۔ (کرامات الصادقین صفحہ ۱۰، ۱۱)

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ. وَاَنْتَ تَفْهَمُ اَنَّ فِیْ هٰذَا الْقَوْلِ اِشَارَةٌ اِلٰی اَنَّ لِلنُّجُوْمِ وَمَوَاقِعِهَا صِلَةً بِتَجَسُّسِ زَمَانِ النُّبُوَّةِ وَنُزُوْلِ الْوَحْیِ وَلِاَجْلِ ذٰلِكَ قِیْلَ اَنَّ بَعْضَ النُّجُوْمِ لَا یَطْلُعُ اِلَّا فِیْ وَقْتِ ظُهُوْرِ نَبِیٍّ مِنَ الْاَنْبِیَاءِ. فَطُوْبٰی لِلَّذِیْ یَفْهَمُ اِشَارَاتِ اللّٰهِ ثُمَّ یَقْبَلُهَا كَالثِّقَاتِ۔

(حمامۃ البشریٰ صفحہ ۴۷)

مَیں قسم کھاتا ہوں مطالع اور مناظر نجوم کی اور یہ قسم ایک بڑی قسم ہے۔ اگر تمہیں حقیقت پر اطلاع ہو کہ یہ قرآن ایک بزرگ اور عظیم الشان کتاب ہے اور اس کو وہی لوگ چھوتے ہیں جو پاک باطن ہیں اور اس قسم کی مناسبت اس مقام میں یہ ہے کہ قرآن کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ وہ کریم ہے یعنی رُوحانی بزرگیوں پر مشتمل ہے اور بباعث نہایت بلند اور رفیع دقائق حقائق کے بعض کوتاہ بینوں کی نظروں میں اِسی وجہ سے چھوٹا معلوم ہوتا ہے جس وجہ سے ستارے چھوٹے اور نقطوں سے معلوم ہوتے ہیں اور یہ بات نہیں کہ درحقیقت وہ نقطوں کی مانند ہیں بلکہ چونکہ مقام ان کا نہایت اعلیٰ وارفع ہے اِس لئے جو نظریں قاصر ہیں اُن کی اصل ضخامت کو معلوم نہیں کر سکتیں۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۵)

قسموں کی صورت میں اللہ جلّ شانہٗ ایک امرِ بدیہہ کو نظری کے ثبوت کے لئے پیش کرتا ہے یا ایک

ترجمہ از مرتب :۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ۔ تُو سمجھتا ہے کہ اِس قول میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ستاروں اور ان کے مواقع کو زمانِ نبوّت اور نزولِ وحی کے تجسّس سے ایک تعلق ہے۔ اِسی لئے کہا گیا ہے کہ بعض ستارے صرف کسی نبی کے وقت میں ہی نکلتے ہیں۔ پس مبارک ہیں وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے اشاروں کو سمجھتے ہیں پھر انہیں متقیوں کی طرح قبول کرتے ہیں۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۴۷)

امرِ مسلّم کو غیر مسلّم کے تسلیم کرنے کے لئے بیان فرماتا ہے اور جس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے وہ درحقیقت قائم مقام شاہد ہوتی ہے۔ (جنگِ مقدّس صفحہ ۱۸۰ ایڈیشن اوّل)

خدا تعالیٰ کے خاص دوستوں کی علامات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

پندرھویں علامت ان کی علم قرآن کریم ہے۔ قرآن کریم کے معارف اور حقائق و لطائف جس قدر ان لوگوں کو دئے جاتے ہیں دوسرے لوگوں کو ہرگز نہیں دئے جاتے۔ یہ لوگ وہی مطہّرون ہیں جن کے حق میں اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۴۴۷)

مطہّرین کی علامتوں میں سے یہ بھی ایک عظیم الشّان علامت ہے کہ علمِ معارفِ قرآن حاصل ہو کیونکہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۳۶)

دینی علم اور پاک معارف کے سمجھنے اور حاصل کرنے کے لئے پہلے سچّی پاکیزگی کا حاصل کر لینا اور ناپاکی کی راہوں کا چھوڑ دینا ازبس ضروری ہے اِسی واسطے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ یعنی خدا کی پاک کتاب کے اسرار کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو پاک دِل ہیں اور پاک فطرت اور پاک عمل رکھتے ہیں۔ دنیوی چالاکیوں سے آسمانی علم ہرگز حاصل نہیں ہوسکتے۔ (ست بچن صفحہ ۱۴)

قرآنی حقائق صرف انہی لوگوں پر کھُلتے ہیں جن کو خدائے تعالیٰ اپنے ہاتھ سے صاف اور پاک کرتا ہے۔
(براہین احمدیہ صفحہ ۵۱۳ حاشیہ)

تفسیر قرآن کریم کے معیار بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

چوتھا معیار خود اپنا نفسِ مطہّرے کر قرآن کریم میں غور کرنا ہے کیونکہ نفسِ مطہرہ سے قرآن کریم کو مناسبت ہے اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ یعنی قرآن کریم کے حقائق صرف اُن پر کھُلتے ہیں جو پاک دل ہوں۔ کیونکہ مطہّر القلب انسان پر قرآن کریم کے پاک معارف بوجہ مناسبت کھُل جاتے ہیں اور وہ ان کو شناخت کر لیتا ہے اور سُونگھ لیتا ہے اور اس کا دل بول اُٹھتا ہے کہ ہاں یہی راہ سچّی ہے اور اس کا نورِ قلب سچائی کی پرکھ کے لئے ایک عمدہ معیار ہوتا ہے پس جب تک انسان صاحبِ حال نہ ہو اور اس تنگ راہ سے گذرنے والا نہ ہو جس سے انبیاء علیہم السّلام گذرے ہیں تب تک مناسب ہے کہ گستاخی اور تکبّر کی جہت سے مفسّرِ قرآن نہ بن بیٹھے ورنہ وہ تفسیر بالرّائے ہوگی جس سے نبی علیہ السّلام نے منع فرمایا ہے اور کہا ہے مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَأْيِهٖ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَأَ یعنی جس نے صرف اپنی رائے سے قرآن کریم کی تفسیر کی اور اپنے خیال میں اچھی کی تب بھی اُس نے بُری تفسیر کی۔ (برکات الدّعا صفحہ ۱۶)

مَیں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہی سچ بات ہے کہ خدا کا کلام سمجھنے کے لئے اوّل دل کو ایک نفسانی جوش

سے پاک بنانا چاہیئے تب خدا کی طرف سے دِل پر روشنی اُترے گی۔ بغیر اندرونی روشنی کے اصل حقیقت نظر نہیں آتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ یعنی یہ پاک کلام ہے جب تک کوئی پاک نہ ہوجائے وہ اس کے بھیدوں تک نہیں پہنچے گا۔ مَیں جوان تھا اور اَب بوڑھا ہوگیا اور اگر لوگ چاہیں تو گواہی دے سکتے ہیں کہ مَیں دُنیاداری کے کاموں میں نہیں پڑا اور دینی شغل میں ہمیشہ میری دلچسپی رہی۔ مَیں نے اِس کلام کو جس کا نام قرآن ہے نہایت درجہ تک پاک اور رُوحانی حکمت سے بھرا ہوُا پایا۔ نہ وہ کسی انسان کو خدا بناتا اور نہ رُوحوں اور جسموں کو اس کی پیدائش سے باہر رکھ کر اس کی مذمّت اور نندیا کرتا ہے اور وہ برکت جس کے لئے مذہب قبول کیا جاتا ہے اُس کو یہ کلام آخر انسان کے دِل پر وارد کر دیتا ہے اور خدا کے فضل کا اس کو مالک بنا دیتا ہے۔ پس کیونکر ہم روشنی پا کر پھر تاریکی میں آویں اور آنکھیں پا کر پھر اندھے بن جاویں۔ (سناتن دھرم صفحہ ۶، ۷)

مسیح موعود اور مہدی کا کام یہی ہے کہ وہ لڑائیوں کے سِلسلہ کو بند کرے گا اور قلم۔ دعا۔ توجّہ سے اسلام کا بول بالا کرے گا اور افسوس ہے کہ لوگوں کو یہ بات سمجھ نہیں آتی اِس لئے کہ جس قدر توجّہ دُنیا کی طرف ہے دین کی طرف نہیں۔ دُنیا کی آلودگیوں اور ناپاکیوں میں مُبتلا ہوکر یہ امّید کیونکر کرسکتے ہیں کہ اُن پر قرآن کریم کے معارف کُھلیں وہاں تو صاف لکھا ہے لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ۔ (لیکچر لدھیانہ صفحہ ۳۱)

علمِ دین آسمانی علوم میں سے ہے اور یہ علوم تقوٰی اور طہارت اور محبّتِ الٰہیہ سے وابستہ ہیں اور سگِ دُنیا کو مِل نہیں سکتے۔ سو اِس میں کچھ شک نہیں کہ قول موجّہ سے اتمامِ حُجّت کرنا انبیاء اور مردانِ خدا کا کام ہے اور حقّانی فیوض کا مورد ہونا فانیوں کا طریق ہے اور اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ۔ پس کیونکر ایک گندہ اور منافق اور دُنیا پرست اُن آسمانی فیضوں کو پاسکتا ہے جن کے بغیر کوئی فتح نہیں ہوسکتی اور کیونکر اُس دِل پر رُوح القدس بول سکتا ہے جس میں شیطان بولتا ہو۔ (البلاغ یا فریادِ درد صفحہ ۴، ۵)

یَقُوْلُوْنَ اِنَّا لَا نَرٰی ضَرُوْرَۃَ مَسِیْحٍ وَّلَا مَھْدِیٍّ وَّکَفَانَا الْقُرْاٰنُ وَ اِنَّا مُھْتَدُوْنَ۔ وَیَعْلَمُوْنَ اَنَّ الْقُرْاٰنَ کِتَابٌ لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ۔ فَاشْتَدَّتِ الْحَاجَۃُ اِلٰی مُفَسِّرٍ زُکِّیَ مِنْ اَیْدِی اللّٰہِ وَاُدْخِلَ فِی الَّذِیْنَ یُبْصِرُوْنَ۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۱۶)

ترجمہ از اصل:۔ کہتے ہیں کہ ہم کو مسیح اور مہدی کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ قرآن ہمارے لئے کافی ہے اور ہم سیدھے رستے پر ہیں۔ حالانکہ جانتے ہیں کہ قرآن ایسی کتاب ہے کہ سوائے پاکوں کے اَور کسی کی فہم اس تک نہیں پہنچتی۔ اِس وجہ سے ایک ایسے مفسّر کی حاجت پڑی کہ خدا کے ہاتھ نے اسے پاک کیا ہو اور بینا بنایا ہو۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۱۶)

قرآن شریف اگرچہ عظیم الشان معجزہ ہے مگر ایک کامل کے وجود کو چاہتا ہے کہ جو قرآن کے اعجازی جواہر پر مطلع ہو اور وہ اس تلوار کی طرح ہے جو درحقیقت بے نظیر ہے لیکن اپنا جوہر دکھلانے میں ایک خاص دست و بازو کی محتاج ہے اس پر دلیل شاہد یہ آیت ہے کہ لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ پس وہ ناپاکوں کے دلوں پر معجزہ کے طور پر اثر نہیں کر سکتا بجز اس کے کہ اس کا اثر دکھلانے والا بھی قوم میں ایک موجود ہو اور وہ وہی ہو گا جس کو یقینی طور پر نبیوں کی طرح خدا تعالیٰ کا مکالمہ اور مخاطبہ نصیب ہو گا۔ (نزول المسیح صفحہ ۱۰۸)

قرآن کے حقائق و دقائق انہیں پر کُھلتے ہیں جو پاک کئے گئے ہیں پس ان آیات سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے سمجھنے کے لئے ایک ایسے معلّم کی ضرورت ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پاک کیا ہو۔ اگر قرآن کے سیکھنے کے لئے معلّم کی حاجت نہ ہوتی تو ابتدائے زمانہ میں بھی نہ ہوتی۔ (شہادت القرآن صفحہ ۵۲)

علمِ قرآن سے بلاشبہ باخدا اور راستباز ہونا بھی ثابت ہے کیونکہ بموجب آیت لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ صرف پاک باطن لوگوں کو ہی کتابِ عزیز کا علم دیا جاتا ہے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد نہم صفحہ ۹۲)

یہ سارا صحیفہ قدرت کے مضبوط صندوق میں محفوظ ہے۔ کیا مطلب کہ یہ قرآن کریم ایک چھپی ہوئی کتاب میں ہے۔ اس کا وجود کاغذوں تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ ایک چھپی ہوئی کتاب میں ہے جس کو صحیفۂ فطرت کہتے ہیں یعنی قرآن کی ساری تعلیم کی شہادت قانونِ قدرت کے ذرہ ذرہ کی زبان سے ادا ہوتی ہے اس کی تعلیم اور اس کی برکات کتھا کہانی نہیں جو مٹ جائیں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۷۲)

قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے کہ ہر ایک قسم کے معارف اور اسرار اس میں موجود ہیں لیکن ان کے حاصل کرنے کے لئے مَیں پھر کہتا ہوں کہ اُسی قوتِ قدسیہ کی ضرورت ہے چنانچہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۸۵)

فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ یعنی صحیفۂ فطرت میں کہ جو چھپی ہوئی کتاب تھی اور جس کو ہر ایک شخص نہ دیکھ سکتا تھا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۴)

یہ کتابِ مکنون زمین و آسمان کی چھپی ہوئی کتاب ہے جس کے پڑھنے پر ہر شخص قادر نہیں ہو سکتا اور قرآن کریم اس کتاب کا آئینہ ہے اور قرآن کریم نے وہی خدا دکھایا ہے جس پر آسمان و زمین شہادت دیتے ہیں۔

(الحکم جلد ۲ نمبر ۲۴، ۲۵ مورخہ ۲۰-۲۷ اگست ۱۸۹۸ء صفحہ ۹)

معارفِ قرآن اس شخص کے سوا اور کسی پر نہیں کُھل سکتے جس کی تطہیر ہو چکی ہو لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ۔

(الحکم جلد ۲ نمبر ۲۸، ۲۹ مورخہ ۲۰-۲۷ ستمبر ۱۸۹۸ء صفحہ ۴)

قرآنی حقائق و معارف کے بیان کرنے کے لئے قلب کو مناسبت اور کشش اور تعلق حق اور صدق سے ہو جاتا ہے اور پھر یہاں تک اس میں ترقی اور کمال ہوتا ہے کہ وہ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی کا مصداق ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہ جب پڑتی ہے صِدق پر ہی پڑتی ہے اور اس کو ایک خاص قوت اور امتیازی طاقت دی جاتی ہے جس سے وہ حق و باطل میں فی الفور امتیاز کر لیتا ہے یہاں تک کہ اُس کے دِل میں ایک قوت آجاتی ہے جس کی ایسی تیز حِس ہوتی ہے کہ اسے دُور سے ہی باطل کی بُو آجاتی ہے یہی وہ سِرّ ہے جو لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ میں رکھا گیا ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۳ ، ۱۷ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

صدیق کے مرتبہ پر قرآن کریم کی معرفت اور اُس سے محبت اور اس کے نکات و حقائق پر اطلاع ملتی ہے کیونکہ کِذب کِذب کو کھینچتا ہے اِس لئے کبھی بھی کاذب قرآنی معارف اور حقائق سے آگاہ نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ فرمایا گیا ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ اوّل)

جو کچھ قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے قانونِ قدرت اس کو پوری مدد دیتا ہے گویا جو قرآن میں ہے وہی کتابِ مکنون میں ہے۔ اِس کا راز انبیاء علیہم السلام کی پیروی کے بدُوں سمجھ میں نہیں آسکتا اور یہی وہ سِرّ ہے جو لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ میں رکھا گیا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

دُنیاوی علوم کی تحصیل اور ان کی باریکیوں پر واقف ہونے کے لئے تقویٰ طہارت کی ضرورت نہیں ہے ایک پلید سے پلید انسان خواہ کیسا ہی فاسق و فاجر ہو، ظالم ہو وہ ان کو حاصل کر سکتا ہے۔ چوڑھے چمار بھی ڈگریاں پا لیتے ہیں لیکن دینی علوم اِس قسم کے نہیں ہیں کہ ہر ایک اُن کو حاصل کر سکے ان کی تحصیل کے لئے تقویٰ اور طہارت کی ضرورت ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ پس جس شخص کو دینی علوم حاصل کرنے کی خواہش ہے اسے لازم ہے کہ تقویٰ میں ترقی کرے جس قدر وہ ترقی کرے گا اسی قدر لطیف دقائق اور حقائق اس پر کُھلیں گے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲ مورخہ ۸ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

دنیوی عقل کے لئے تقویٰ کی ضرورت نہیں ہے مگر دین کے لئے ضرورت ہے اِس لئے یہ لوگ دین کی باتوں کو بھی نہیں سمجھتے۔ خدا تعالیٰ اِسی کی طرف اشارہ کر کے فرماتا ہے لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ یعنی اندر گھسنا تو درکنار مَس کرنا بھی مشکل ہے جب تک انسان مطہّر یعنی متقی نہ ہو لے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

سچی بات یہی ہے کہ مسیح موعود اور مہدی کا کام یہی ہے کہ وہ لڑائیوں کے سِلسلہ کو بند کرے گا اور قلم، دعا، توجّہ سے اِسلام کا بول بالا کرے گا اور افسوس ہے کہ لوگوں کو یہ بات سمجھ نہیں آتی اِس لئے کہ جس قدر توجّہ دُنیا کی طرف ہے دین کی طرف نہیں۔ دُنیا کی آلودگیوں اور ناپاکیوں میں مُبتلا ہو کر یہ امّید کیونکر کر سکتے ہیں کہ ان پر قرآن کریم

کے معارف کھلیں۔وہاں صاف لکھا ہے لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ ۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ جس قدر پاکیزگی بڑھتی ہے اسی قدر معرفت بڑھتی ہے۔

(بدر جلد ۲ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۶ر اپریل ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

دوسرے علوم میں یہ شرط نہیں۔ ریاضی ہندسہ وہیئت وغیرہ میں اِس امر کی شرط نہیں کہ سیکھنے والا ضرور متقی اور پرہیزگار ہو بلکہ خواہ کیسا ہی فاسق و فاجر ہو وہ بھی سیکھ سکتا ہے مگر علمِ دین میں خشک منطقی اور فلسفی ترقی نہیں کر سکتا اور اس پر وہ حقائق اور معارف نہیں کھل سکتے۔جس کا دِل خراب ہے اور تقوٰی سے حصّہ نہیں رکھتا اور پھر کہتا ہے کہ علومِ دین اور حقائق اس کی زبان پر جاری ہوتے ہیں وہ جھوٹ بولتا ہے ہرگز ہرگز اُسے دین کے حقائق اور معارف سے حصّہ نہیں ملتا بلکہ دین کے لطائف اور نکات کے لئے متّقی ہونا شرط ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۷)

۹۶ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ۝

قرآن متّقیوں کو وہ سارے امور یاد دلاتا ہے جو اُن کی فطرت میں مخفی اور مستور تھے اور یہ حق محض ہے جو انسان کو یقین تک پہنچاتا ہے۔ (جنگِ مقدّس صفحہ ۵)

○

سُورۃ الحدید

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

۴ ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۝﴾

وہی اوّل ہے اور وہی آخر۔ وہی ظاہر ہے وہی باطن۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۳۵ حاشیہ)

وہ پہلے بھی ہے اور پیچھے بھی اور ظاہر بھی ہے اور چُھپا ہوُا بھی۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۸)

وَاِنَّ الْمَسِيْحَ مَظْهَرٌ لِاِسْمِ اللّٰهِ الَّذِيْ هُوَ خَاتَمُ سِلْسِلَةِ الْمَخْلُوْقَاتِ. اَعْنِي الْاٰخِرَ الَّذِيْ اُشِيْرَ اِلَيْهِ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى هُوَ الْاٰخِرُ لِمَا هُوَ عَلَامَةٌ لِمُنْتَهَى الْكَائِنَاتِ. فَلِاَجْلِ ذَالِكَ اقْتَضَتْ نَفْسُ الْمَسِيْحِ خَتْمَ سِلْسِلَةِ الْكَثْرَةِ بِالْمَمَاتِ. اَوْ بِرَدِّ الْمَذَاهِبِ اِلٰى دِيْنٍ فِيْهِ مَوْتُ النُّفُوْسِ مِنَ الْاَهْوَاءِ وَالْاِرَادَاتِ. وَالْاِسْلَاكِ عَلَى الشَّرِيْعَةِ الْفِطْرِيَّةِ الَّتِيْ تَجْرِيْ تَحْتَ الْمَصَالِحِ الْاِلٰهِيَّةِ وَتَخْلِيْصِ النَّاسِ مِنْ مَيْلِ النَّفْسِ بِهَوَاهَا اِلَى الْعَفْوِ وَالْاِنْتِقَامِ وَالْمُحَبَّةِ وَالْمُعَادَاتِ. فَاِنَّ الشَّرِيْعَةَ الْفِطْرِيَّةَ الَّتِيْ تَسْتَخْدِمُ

ترجمہ از مرتب :۔ یقیناً مسیح جو سِلسلہ مخلوقات کا خاتم ہے وہ اللہ کے اِسم آخر کا مظہر ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ کے قول هُوَ الْاٰخِرُ میں اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ وہ کائنات کے انتہاء کی علامت ہے اِس لئے نفسِ مسیح نے کثرت کے سِلسلہ کو موت کے ذریعہ ختم کرنے کا تقاضا کیا یا مذہب کو ایسے دین کی طرف لوٹا دینے کے ساتھ جس میں نفس کو ارادوں اور شہوات سے مار دینے کی تعلیم ہے اور ایسی فطری شریعت پر چلنے کی تعلیم ہے جو مصالح الٰہیّہ کے ماتحت چلتی ہے اور جس میں لوگوں کے نفوس کو ان کی خواہشات کے مطابق عفو، انتقام محبّت اور دشمنی کی طرف مائل ہونے سے نجات دلانے

قُوَى الْإِنْسَانِ كُلَّهَا لَا تَرْضٰى بِاَنْ تَكُوْنَ خَادِمَةً لِقُوَّةٍ وَاحِدَةٍ وَلَا تُقَيِّدُ اَخْلَاقَ الْإِنْسَانِ فِيْ دَائِرَةِ الْعَفْوِ فَقَطْ۔ وَلَا فِيْ دَائِرَةِ الْاِنْتِقَامِ فَقَطْ۔ بَلْ تَحْسَبُهُ سَجِيَّةً غَيْرَ مَرْضِيَّةٍ وَتُوْتِيْ كُلَّ قُوَّةٍ حَقَّهَا عِنْدَ مَصْلَحَةٍ دَاعِيَةٍ وَضَرُوْرَةٍ مُقْتَضِيَةٍ وَتُغَيِّرُ حُكْمَ الْعَفْوِ وَالْاِنْتِقَامِ وَالْمُصَافَاتِ وَالْمُعَادَاتِ بِحَسْبِ تَغَيُّرَاتِ الْمَصَالِحِ الْوَقْتِيَّةِ۔ وَهٰذَا هُوَ الْمَوْتُ مِنَ النَّفْسِ وَالْهَوٰى وَالْجَذَبَاتِ النَّفْسَانِيَّةِ وَدُخُوْلٌ فِي الْفَانِيْنَ۔ (خطبہ الہامیہ صہ حاشیہ متعلقہ خطبہ الہامیہ)

اِس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ ایک اِنسان خدا کی اوّلیت کا مظہر تھا اور ایک انسان خدا کی آخریّت کا مظہر ہوگا اور لازم تھا کہ دونو انسان ایک صفت میں برعایت خصوصیّات متحد ہوں پس جبکہ آدم نر اور مادّہ پیدا کیا گیا اور ایسا ہی شیث کو بھی تو چاہیئے تھا کہ آخری انسان بھی نر اور مادّہ کی شکل پر پیدا ہو اِس لئے قرآن کے حکم کے رُو سے وہ وعدہ کا خلیفہ اور خاتم الخلفاء جس کو دوسرے لفظوں میں مسیح موعود کہنا چاہیئے اِسی طور سے پیدا ہونا ضروری تھا کہ وہ توءم کی طرح تولّد پاوے اِس طرح سے کہ پہلے اس سے لڑکی نکلے اور بعد اس کے لڑکا خارج ہوتا وہ خاتم الولد ہو۔ (تریاق القلوب صفحہ ۱۵۹، ۱۶۰)

خدا سب سے پہلے ہے اور باوجود پہلے ہونے کے پھر سب سے آخر ہے اور وہ سب سے زیادہ ظاہر ہے اور پھر باوجود سب سے زیادہ ظاہر ہونے کے سب سے پوشیدہ ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۱۱)

اللہ تعالیٰ کا کلام ایسا ہے کہ اس کی تفصیل بعض آیت کی بعض آیت سے ہوتی ہے اوّل کی تفسیر یہ ہے کہ کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَعَہٗ شَیْءٌ۔ اٰخِر کے معنے کئے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ۔ ہم تو انہی معنوں کو پسند کرتے ہیں جو خدا نے بتلائے ہیں۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۸ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

۵ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ

کا سامان ہے کیونکہ شریعتِ فطریہ جو انسان کی تمام طاقتوں سے کام لیتی ہے وہ نہیں چاہتی کہ اس کی تمام طاقتیں صرف ایک قوّت کی خادم بن کر رہ جائیں۔ اور نہ وہ انسان کے اَخلاق کو صرف عفو کے دائرہ میں یا انتقام کے دائرہ میں پابند کرتی ہے۔ بلکہ وہ اس کو ناپسندیدہ خصلت قرار دیتی ہے۔ اور ہر قوّت کو مصلحت اور ضرورت کے مطابق پورا پورا حق دیتی ہے اور وقتی مصلحتوں کے تغیّرات کے ساتھ ساتھ عفو اور انتقام اور صلح اور دشمنی کے حکم کو بدلتی ہے اور یہ نفس اور اس کی خواہشات اور جذبات کی مکمل موت ہے اور یہی فنا شدہ لوگوں میں داخل ہونا ہے۔

(خطبہ الہامیہ صہ حاشیہ متعلقہ خطبہ الہامیہ)

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِى الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا

وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ط

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۝

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ یعنی جہاں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔

(رسالہ معیار المذاہب صفحہ ۳۴ دست بچن صفحہ ۱۷۶)

جہاں کہیں تم ہو اُس جگہ خدا تمہارے ساتھ ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۱۱)

عرش مقامِ تنزلیہ ہے اور اِسی لئے خدا ہر جگہ حاضر ناظر ہے جیسا کہ فرماتا ہے هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۰ مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ..... ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ خدا وہ ہے جس نے تمام زمین اور آسمانوں کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر اُس نے استواء کیا یعنی کُل مخلوقات کو چھ دن میں پیدا کر کے پھر صفاتِ عدل اور رحم کو ظہور میں لانے لگا۔ خدا کا الوہیت کے تخت پر بیٹھنا اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مخلوق کے بنانے کے بعد ہر ایک مخلوق سے بمقتضائے عدل اور رحم اور سیاست کارروائی شروع کی۔ یہ محاورہ اسی سے لیا گیا ہے کہ جب کُل اہلِ مقدمہ اور ارکانِ دولت اور لشکر باشوکت حاضر ہو جاتے ہیں اور کچہری گرم ہو جاتی ہے اور ہر ایک حقدار اپنے حق کو عدلِ شاہی سے مانگتا ہے اور عظمت اور جبروت کے تمام سامان مہیا ہو جاتے ہیں تب بادشاہ سب کے بعد آتا ہے اور تختِ عدالت کو اپنے وجود باجود سے زینت بخشتا ہے۔ غرض اِن آیات سے ثابت ہوا کہ آدم جمعہ کے اخیر حصے میں پیدا کیا گیا کیونکہ روزِ ششم کے بعد سلسلہ پیدائش کا بند کیا گیا وجہ یہ کہ روزِ ہفتم تختِ شاہی پر بیٹھنے کا دن ہے نہ پیدائش کا۔ یہودیوں نے ساتویں دن کو آرام کا دن رکھا ہے مگر یہ اُن کی غلط فہمی ہے بلکہ یہ ایک محاورہ ہے کہ جب انسان ایک عظیم کام سے فراغت پا لیتا ہے تو پھر گویا اُس وقت اس کے آرام کا وقت ہوتا ہے۔ سو ایسی عبارتیں توریت میں بطور مجاز ہیں نہ یہ کہ درحقیقت خدا تعالیٰ تھک گیا اور بوجہ خستہ درماندہ ہونے کے اس کو آرام کرنا پڑا۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۹ حاشیہ)

۳۶- يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ

وَبِاَیْمَانِہِمْ بُشْرٰىكُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ

فِیْهَا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ○

اس دن بھی ایمانی نور جو پوشیدہ طور پر مومنوں کو حاصل ہے کھلے کھلے طور پر ان کے آگے اور ان کے داہنے ہاتھ پر دوڑتا نظر آئے گا (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۸۷)

اس روز تو دیکھے گا کہ مومنوں کا یہ نور جو دنیا میں پوشیدہ طور پر ہے ظاہر ظاہر ان کے آگے اور اُن کے داہنی طرف دوڑتا ہوگا۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹۸)

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ

الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○

یہ خدا کی کمال رُوحانیت کی ایک بزرگ تجلّی تھی کہ جو اس نے ظلمت اور تاریکی کے وقت ایسا عظیم الشّان نور نازل کیا جس کا نام فرقان ہے جو حق اور باطل میں فرق کرتا ہے۔ جس نے حق کو موجود اور باطل کو نابُود کر کے دکھلا دیا۔ وہ اس وقت زمین پر نازل ہوا جب زمین ایک موتِ رُوحانی کے ساتھ مر چکی تھی اور برّ اور بحر میں ایک بھاری فساد واقع ہو چکا تھا پس اس نے نزول فرما کر وہ کام کر دکھایا جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے آپ اشارہ فرما کر کہا ہے اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا یعنی زمین مر گئی تھی اب خدا اس کو نئے سرے زندہ کرتا ہے۔

اب اِس بات کو بخوبی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ نزول قرآن شریف کا کہ جو زمین کے زندہ کرنے کے لئے ہوا یہ صفتِ رحمانیّت کے جوش سے ہوا۔ وہی صفت ہے کہ جو کبھی جسمانی طور پر جوش مار کر قحط زدوں کی خبر لیتی ہے اور بارانِ رحمت خشک زمین پر برساتی ہے اور وہی صفت کبھی رُوحانی طور پر جوش مار کر ان بھوکوں اور پیاسوں کی حالت پر رحم کرتی ہے کہ جو ضلالت اور گمراہی کی موت تک پہنچ جاتے ہیں اور حق اور صداقت کی غذا کہ جو رُوحانی زندگی کا موجب ہے اُن کے پاس نہیں رہتی۔ پس رحمانِ مطلق جیسا جسم کی غذا کو اس کی حاجت کے وقت عطا فرماتا ہے ایسا ہی وہ اپنی رحمتِ کاملہ کے تقاضا سے رُوحانی غذا کو بھی ضرورتِ حقّہ کے وقت مہیّا کر دیتا ہے ہاں یہ بات درست ہے کہ خدا کا کلام انہیں برگزیدہ لوگوں پر نازل ہوتا ہے جن سے خدا راضی ہے اور انہیں سے

وہ مکالمات اور مخاطبات کرتا ہے جن سے وہ خوش ہے مگر یہ بات ہرگز درست نہیں کہ جس سے خدا راضی اور خوش ہو اس پر خواہ نخواہ بغیر کسی ضرورتِ حقّہ کے کتابِ آسمانی نازل ہو جایا کرے یا خدائے تعالیٰ یونہی بلاضرورتِ حقّہ کسی کی طہارتِ لازمی کی وجہ سے لازمی اور دائمی طور پر اس سے ہر وقت باتیں کرتا رہے بلکہ خدا کی کتاب اُسی وقت نازل ہوتی ہے جب فی الحقیقت اس کے نزول کی ضرورت پیش آجائے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۳۵۱، ۳۵۲ حاشیہ)

خدائے تعالیٰ کا یہ قانونِ قدرت ہے کہ جب زمین مرجاتی ہے تو وہ نئے سرے زمین کو زندہ کرتا ہے ہم نے کھول کر یہ نشان بتلائے ہیں تا ہو کہ لوگ سوچیں اور سمجھیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۴۹)

عادت اللہ قدیم سے یہی جاری ہے کہ جب زمین مرجاتی ہے تو اُسے نئے سرے زندہ کرتا ہے یہ نہیں کہ ایک ہی بارش پر ہمیشہ کے لئے کفایت کرے۔ خیال کرنا چاہیئے کہ یہ کیسی اعلیٰ درجہ کی صداقت ہے جو الہامات تازہ بتازہ کا کبھی دروازہ بند نہیں ہوتا۔ (سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۸۳، ۱۸۴)

یہ عام محاورہ قرآن شریف کا ہے کہ زمین کے لفظ سے اِنسانوں کے دل اور ان کی باطنی قوای مراد ہوتی ہیں جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ ایک جگہ فرماتا ہے اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔

(ازالہ اَوہام صفحہ ۱۳۵)

اے لوگو جان لو کہ زمین مرگئی تھی اور خدا اب نئے سرے اس کو زندہ کر رہا ہے۔

(ازالہ اَوہام صفحہ ۴۲۵)

واضح ہو کہ قرآن کریم اِس محاورہ سے بھرا پڑا ہے کہ دُنیا مرچکی تھی اور خدا تعالیٰ نے اپنے اس نبی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر نئے سرے دُنیا کو زندہ کیا جیسا کہ وہ فرماتا ہے اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا یعنی اِس بات کو سُن رکھو کہ زمین کو اُس کے مرنے کے بعد خدا تعالیٰ زندہ کرتا ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۹۴)

یہ بات جان لو کہ اب اللہ تعالیٰ نئے سرے زمین کو بعد اس کے مرنے کے زندہ کرنے لگا ہے۔

(اِسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۴)

یہ بات جانو کہ زمین مرگئی تھی اور اب خدا نئے سرے سے زمین کو زندہ کر رہا ہے۔

(نور القرآن حصّہ اوّل صفحہ ۸)

یہ بات بھی جانو کہ زمین مرگئی تھی اور اب خدا نئے سرے سے زمین کو زندہ کر رہا ہے۔ یہ قرآن کی ضرورت اور سچائی کے نشان ہیں جو اِس لئے بیان کئے گئے تاکہ تم نشانوں کو دریافت کر لو۔

اَب سوچ کر دیکھو کہ یہ دلیل جو تمہارے سامنے پیش کی گئی ہے یہ ہم نے اپنے ذہن سے ایجاد نہیں کی بلکہ قرآن آپ ہی اس کو پیش کرتا ہے اور دلیل کے دونوں حصّے بیان کرکے پھر آپ ہی فرماتا ہے قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ یعنی اس رسول اور اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے پر یہ بھی ایک نشان ہے جس کو ہم نے بیان کر دیا تاکہ تم سوچو اور سمجھو اور حقیقت تک پہنچ جاؤ۔

دوسرا پہلو اِس دلیل کا یہ ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت میں اِس دُنیا سے اپنے مولیٰ کی طرف بلائے گئے جبکہ وہ اپنے کام کو پورے طور پر انجام دے چکے اور یہ امر قرآن شریف سے بخوبی ثابت ہے۔

(نور القرآن حصہ اوّل صفحہ ۸، ۹)

اس زمانہ کے حق پوش پادریوں نے جب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے اس قدر عام اصلاح ہوئی کہ اس کو کسی طرح چھپا نہیں سکتے اور اس کے مقابل پر جو مسیح نے اپنے وقت میں اصلاح کی وہ ہیچ ہے تو ان پادریوں کو فکر پڑی کہ گمراہوں کو رُو بہ اصلاح کرنا اور بدکاروں کو نیکی کے رنگ میں لانا جو اصل نشانی سچے نبی کی ہے وہ جیسا کہ اکمل اور اتم طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور میں آئی مسیح کی اصلاح میں کوئی بھی اسکی نسبت نہیں پائی جاتی تو انہوں نے اپنے دجّالی فریبوں کے ساتھ آفتاب پر خاک ڈالنا چاہا تو ناچار جیساکہ پادری جیمس کیمرن لیس نے اپنے لیکچر میں شائع کیا۔ جاہلوں کو اس طرح پر دھوکہ دیا کہ وہ لوگ پہلے سے صلاحیت پذیر ہونے کے لئے مستعد تھے اور بُت پرستی اور شرک ان کی نگاہوں میں حقیر ٹھہر چکا تھا لیکن اگر ایسی رائے ظاہر کرنے والے اپنے اِس خیال میں سچے ہیں تو انہیں لازم ہے کہ اپنے اس خیال کی تائید میں ویسا ہی ثبوت دیں جیساکہ قرآن کریم اُن کے مخالف ثبوت دیتا ہے یعنی فرماتا ہے کہ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اور ان سب کو مُردے قرار دے کر اُن کا زندہ کیا جانا اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور جا بجا کہتا ہے کہ وہ ضلالت کی زنجیروں میں پھنسے ہوئے تھے ہم نے ہی ان کو رہائی دی۔ وہ اندھے تھے ہم نے ہی اُن کو سوجاکھا کیا۔ وہ تاریکی میں تھے ہم نے ہی نور بخشا۔ اور یہ باتیں پوشیدہ نہیں تھیں بلکہ قرآن اُن سب کے کانوں تک پہنچا اور انہوں نے ان بیانات کا انکار نہ کیا اور کبھی یہ ظاہر نہ کیا کہ ہم تو پہلے ہی مستعد تھے قرآن کا ہم پر کچھ احسان نہیں۔

(نور القرآن حصہ اوّل صفحہ ۲۹ حاشیہ)

جان لو کہ خدا نے زمین کو مرنے کے بعد پھر زندہ کیا۔ (ایّام الصلح صفحہ ۹۹)

قرآن نے بڑی صفائی سے اپنی ضرورت ثابت کی ہے۔ قرآن صاف کہتا ہے اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا یعنی اِس بات کو جان لو کہ زمین مر گئی تھی اور اب خدا نئے سرے اس کو زندہ کرنے لگا ہے۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کے جواب صفحہ ۲۹)

قرآن شریف نے خود اپنے آنے کی ضرورت پیش کی ہے کہ اس زمانہ میں ہر ایک قسم کی بد چلنی اور بد اعتقادی اور بدکاری زمین کے رہنے والوں پر محیط ہو گئی تھی تو اب خدا کا خوف کر کے سوچنا چاہیئے کہ کیا باوجود جمع ہونے اتنی ضرورتوں کے پھر بھی خدا نے نہ چاہا کہ اپنے تازہ اور زندہ کلام سے دنیا کو نئے سرے زندہ کرے۔ کیا آپ لوگوں میں سے کوئی شریف اور بھلا مانس اس دلیل پر غور نہیں کرتا کہ قرآن شریف تو خود فرماتا ہے کہ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا یعنی اے انسانو تمہیں معلوم ہو کہ زمین مر چکی تھی اور خدا نئے سرے اب اس کو زندہ کر رہا ہے۔ پس قرآن شریف کا یہی ایک نور تھا جس کے آنے سے پھر دنیا نے توحید کی طرف پلٹا کھایا اور تمام جزیرۂ عرب توحید سے بھر گیا اور ممالک ایران کی آتش پرستی بھی دور ہو گئی۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۲۵۵)

وہ پانی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھیلایا اس کی شان یہ ہے کہ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا..... اس پانی سے دنیا زندہ ہوئی۔ (رسالہ الانذار صفحہ ۷)

خدا تعالیٰ نے قلب کا نام بھی زمین رکھا ہے۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا زمین کا کس قدر تردد کرنا پڑتا ہے بیل خریدتا ہے، ہل چلاتا ہے، تخم ریزی کرتا ہے، آبپاشی کرتا ہے۔ غرضیکہ بہت بڑی محنت کرتا ہے اور جب تک خود دخل نہ دے کچھ بھی نہیں بنتا..... ٹھیک اسی طرح پر ارضِ دل کی خاصیت ہے جو اس کو بے عزتی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اس کو خدا تعالیٰ کا فضل اور برکت نہیں ملتی۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ رجولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے جسمانی جنگل میں پیدا ہوئے ویسے ہی روحانی جنگل بھی تھا۔ مکہ میں اگر جسمانی اور روحانی نہریں نہ تھیں تو دوسرے ملک روحانی نہر کے نہ ہونے کی وجہ سے ہلاک ہو چکے تھے اور زمین مر چکی تھی جیسا کہ قرآن شریف فرماتا ہے اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا یعنی یہ بات تمہیں معلوم نہیں کہ زمین سب کی سب مر گئی تھی اب خدا تعالیٰ نئے سرے اس کو زندہ کرتا ہے۔ پس یہ زبردست دلیل ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی کہ آپ ایسے وقت میں آئے کہ ساری دنیا عام طور پر بدکاریوں اور بد اعتقادیوں میں مبتلا ہو چکی تھی اور حق وحقیقت اور توحید اور پاکیزگی سے خالی ہو گئی تھی۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ر مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

آسمان اور زمین میں ایسے تعلقات ہیں جیسے نر و مادہ میں ہوتے ہیں۔ زمین میں بھی کنوئیں ہوتے ہیں لیکن زمین پھر بھی آسمانی پانی کی محتاج رہتی ہے جب تک آسمان سے بارش نہ ہو زمین مردہ سمجھی جاتی ہے اور اسکی زندگی اس پانی پر منحصر ہے جو آسمان سے اترتا ہے اسی واسطے فرمایا ہے اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ

مَوْتِهَا۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب آسمان سے پانی برسنے میں دیر ہو اور امساکِ باراں ہو تو کنوؤں کا پانی بھی خشک ہونے لگتا ہے اور ان ایام میں دیکھا گیا ہے کہ پانی اُتر جاتا ہے لیکن جب برسات کے دن ہوں اور مینہ برسنے شروع ہوں تو کنوؤں کا پانی بھی جوش مار کر چڑھتا ہے کیونکہ اُوپر کے پانی میں قوتِ جاذبہ ہوتی ہے۔ اب براہمو سوچیں کہ اگر آسمانی پانی نازل ہونا چھوڑ دے تو سب کنوئیں خشک ہو جائیں۔ اسی طرح پر ہم یہ مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نورِ قلب ہر انسان کو دیا ہے اور اس کے دماغ میں عقل رکھی ہے جس سے وہ بُرے بھلے میں تمیز کرنے کے قابل ہوتا ہے لیکن اگر نبوت کا نور آسمان سے نازل نہ ہو اور یہ سلسلہ بند ہو جاوے تو دماغی عقلوں کا سلسلہ جاتا رہے اور نورِ قلب پر تاریکی پیدا ہو جاوے اور وہ بالکل کام دینے کے قابل نہ رہے کیونکہ یہ سلسلہ اسی نورِ نبوت سے روشنی پاتا ہے۔ جیسے بارش ہونے پر زمین کی روئیدگیاں نکلنی شروع ہو جاتی ہیں اور ہر تخم پیدا ہونے لگتا ہے اسی طرح پر نورِ نبوت کے نزول پر دماغی اور ذہنی عقلوں میں ایک صفائی اور نورِ فراست میں ایک روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ علیٰ قدر المراتب ہوتی ہے اور استعداد کے موافق ہر شخص فائدہ اٹھاتا ہے خواہ وہ اس امر کو محسوس کرے یا نہ کرے لیکن یہ سب کچھ ہوتا اسی نورِ نبوت کے طفیل ہے۔

(الحکم جلد ۷ ۱۲/۱۳ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ اوّل)

خدا تعالیٰ کے ساتھ صدق، وفاداری، اخلاص، محبت اور خدا پر توکل کالعدم ہو گئے ہیں اب خدا تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے کہ پھر نئے سرے سے ان قوتوں کو زندہ کرے۔ وہ خدا جو ہمیشہ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا کرتا رہا ہے اس نے ارادہ کیا ہے اور اس کے لئے کئی راہیں اختیار کی گئی ہیں۔ ایک طرف مامور کو بھیج دیا ہے جو نرم الفاظ میں دعوت کرے اور لوگوں کو ہدایت کرے دوسری طرف علوم و فنون کی ترقی ہے اور عقل آتی جاتی ہے۔ (الحکم جلد ۸ ۸/۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۹)

انسان کو زمین سے بھی تشبیہ دی گئی ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ذکر ہے کہ اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا۔ اَرض کے زندہ کرنے سے مراد اہلِ زمین ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ ۱۷/۱۸ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۸)

۱۹ اِنَّ الۡمُصَّدِّقِیۡنَ وَ الۡمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقۡرَضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمۡ وَ لَهُمۡ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ ﴿۱۹﴾

قرآن کریم میں یہ سُنّت اللہ ہے کہ بعض الفاظ اپنی اصلی حقیقت سے پھر کر مُستعمل ہوتے ہیں جیسا کہ فرماتا

ہے وَ اَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یعنی قرض دو اللہ کو قرض اچھا۔ اب ظاہر ہے کہ قرض کی اصل تعریف کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ انسان حاجت اور لاچاری کے وقت دوسرے سے بوقت دیگر ادا کرنے کے عہد پر کچھ مانگتا ہے لیکن اللہ جلّ شانہٗ حاجت سے پاک ہے۔ پس اِس جگہ قرض کے مفہوم میں سے صرف ایک چیز مراد لی گئی یعنی اس طور سے لینا کہ پھر دوسرے وقت اس کو واپس دے دینا اپنے ذمّہ واجب ٹھہرا لیا ہو۔

(آئینہ کمالاتِ اِسلام صفحہ ۱۵۴، ۱۵۵)

۲۰ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ ٭ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ ؕ لَھُمْ اَجْرُھُمْ وَنُوْرُھُمْ ؕ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ۝

جو لوگ خدا اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لائے وہی ہیں کہ جو خدا کے نزدیک صدّیق ہیں۔ اُن کے لئے اجر ہوگا اُن کے لئے نور ہوگا۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۴۴ حاشیہ)

۲۳ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ۝

کوئی حادثہ نہ زمین پر نازل ہوتا ہے اور نہ تمہاری جانوں پر مگر وہ سب کچھ لکھا ہوا ہے یعنی مقدر ہے۔

(ست بچن صفحہ ۱۰۷، ۱۰۸)

۲۶ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ

قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ○

اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ ..... یعنی ہم نے لوہا اتارا ..... اُترنے کا لفظ آسمان سے اُترنے پر ہرگز دلالت نہیں کرتا اور اُترنے کے ساتھ آسمان کا لفظ زیادہ کر لینا ایسا ہے جیسا کبھی بھوکے سے پوچھا جائے کہ دو ا اور دو کتنے ہوتے ہیں تو وہ جواب دے کہ چار روٹیاں۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۲۸۴ حاشیہ)

ہم نے لوہا اتارا۔ (الحق دہلی صفحہ ۳۵)

فَانْظُرُوْا اِلَی الْقُرْاٰنِ الْکَرِیْمِ کَیْفَ یُبَیِّنُ مَعْنَی النُّزُوْلِ فِیْ اٰیَاتِہِ الْعُظْمٰی۔ وَتَدَبَّرُوْا فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ ..... وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ ھٰذِہِ الْاَشْیَاءَ لَا تَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ بَلْ تَحْدُثُ وَتَتَوَلَّدُ فِی الْاَرْضِ وَفِیْ طَبَقَاتِ الثَّرٰی۔ وَاِنْ اَمْعَنْتُمُ النَّظَرَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ تَعَالٰی فَیَنْکَشِفُ عَلَیْکُمْ اَنَّ حَقِیْقَۃَ نُزُوْلِ الْمَسِیْحِ مِنْ ھٰذِہِ الْاَقْسَامِ۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۴۱)

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ۔ وَمَعْلُوْمٌ اَنَّ الْحَدِیْدَ لَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ بَلْ یَتَکَوَّنُ فِی الْمَعَادِنِ ..... بِحُکْمِ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَلَوِ اجْتَمَعَ اَھْلُ الْاَرْضِ جَمِیْعًا عَلٰی اَنْ یَخْلُقُوْا ھٰذِہِ الْاَشْیَاءَ بِقُوَّتِہِمْ وَ تَدْبِیْرِھِمْ لَمْ یَسْتَطِیْعُوْا اَبَدًا فَکَاَنَّھَا نَزَلَتْ مِنَ السَّمَاءِ۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۱۷ حاشیہ)

حضرت خلیفہ اوّلؓ نے عرض کیا کہ

لوہا آج تک اِس کثرت سے زمین سے نکلا ہے کہ اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو ایک اَور ہمالہ بن جائے۔

ترجمہ از مرتّب :۔ تم قرآن مجید کو دیکھو کہ وہ اپنی بلند شان آیات میں لفظ نزول کے معنے کیسے بیان کرتا ہے اور تم اللہ تعالیٰ کے قول وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ پر بھی غور کرو ..... اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ لوہا اور باقی ایسی ہی اشیاء آسمان سے نہیں اُترتیں بلکہ زمین میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اگر تم خدا تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید میں غور کرو تو تم پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ نزولِ مسیح کی حقیقت بھی اسی قسم کی ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۴۱)

ترجمہ از مرتّب :۔ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ لوہا آسمان سے نہیں اُترتا بلکہ زمین میں رَبُّ السَّمٰوٰت کے حکم سے پیدا ہوتا ہے اور اگر سارے زمین والے جمع ہو جائیں تا اپنی قوت اور تدبیر سے لوہا اور ایسی ہی دیگر اشیاء کو عالمِ وجود میں لائیں تو وہ اِس بات کی ہرگز طاقت نہیں پائیں گے۔ پس گویا کہ یہ سب چیزیں آسمان سے ہی اُتری ہیں۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۱۷ حاشیہ)

لوہے کی کانوں کی آج تک تہہ نہیں ملی کہ کہاں تک نیچے ہی نیچے نکلتا آتا ہے۔

حضرت اقدس نے فرمایا:۔

خدا تعالیٰ نے بھی سونا اور چاندی کو چھوڑ کر اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ ہی فرمایا ہے (یعنی یہی بنی نوع انسان کیلئے زیادہ نفع رساں ہے)۔ (البدر جلد ۱ ء۴ مورخہ ۲۱ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۰)

بیان کیا گیا کہ آیت (زیرِ تفسیر) ..... سے معلوم ہوتا ہے کہ حدید نے اپنا فعل بَاسٌ شَدِیْدٌ کا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کیا کہ اس سے سامانِ جنگ وغیرہ تیار ہو کر کام آتا تھا مگر اس کے فعل مَنَافِعُ لِلنَّاسِ کا وقت یہ مسیح اور مہدی کا زمانہ ہے کہ اِس وقت تمام دُنیا حدید (لوہے) سے فائدہ اُٹھا رہی ہے (جیسا کہ ریل، تار، دخانی جہاز، کارخانوں اور ہر ایک قسم کے سامان لوہے سے ظاہر ہے)۔

حضرت اقدس نے فرمایا کہ

مَیں بھی سارے مضمون لوہے کے قلم ہی سے لکھتا ہوں۔ مجھے بار بار قلم بنانے کی عادت نہیں ہے اِس لئے لوہے کے قلم استعمال کرتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوہے سے کام لیا ہم بھی لوہے ہی سے لے رہے ہیں اور وہی لوہے کی قلم تلوار کا کام دے رہی ہے۔ (البدر جلد اوّل ء۹ مورخہ ۲۶ر دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶۸)

۲۸۔ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○

(رَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا) لوگوں نے یہ بھی طریق نکالے ہیں کہ وہ ہمیشہ عمدًا نکاح سے دستبردار رہیں یا خوجے بنیں اور کسی طریق سے رہبانیت اختیار کریں مگر ہم نے انسان پر یہ حکم فرض نہیں کئے اِسی لئے وہ ان بدعتوں کو پورے طور پر نبھا نہ سکے۔ خدا کا یہ فرمانا کہ ہمارا یہ حکم نہیں کہ لوگ خوجے بنیں یہ اِس بات کی طرف

اشارہ ہے کہ اگر خدا کا حکم ہوتا تو سب لوگ اس حکم پر عمل کرنے کے مجاز بنتے تو اس صورت میں بنی آدم کی قطع نسل ہو کر کبھی کا دُنیا کا خاتمہ ہو جاتا اور نیز اگر اِس طرح پر عفت حاصل کرنی ہو کہ عضوِ مردمی کو کاٹ دیں تو یہ درپردہ اس صانع پر اعتراض ہے جس نے وہ عضو بنایا اور نیز جبکہ ثواب کا تمام مدار اِس بات میں ہے کہ ایک قوت موجود ہو اور پھر انسان خدائے تعالیٰ کا خوف کر کے اس قوت کے خراب جذبات کا مقابلہ کرتا رہے اور اس کے منافع سے فائدہ اُٹھا کر دوطور کا ثواب حاصل کرے پس ظاہر ہے کہ ایسے عضو کے ضائع کر دینے میں دونوں ثوابوں سے محروم رہا۔ ثواب کا جذبہ مخالفانہ کے باوجود اور پھر اس کے مقابلہ میں ملتا ہے مگر جس میں بچّہ کی طرح وہ قوت ہی نہیں اس کو کیا ثواب ملے گا۔ کیا بچّہ کو اپنی عفّت کا ثواب مل سکتا ہے؟ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۲۸)

مَیں یہ نہیں کہتا کہ تم دُنیا کے کاروبار چھوڑ دو۔ بیوی بچّوں سے الگ ہو کر کسی جنگل یا پہاڑ میں جا بیٹھو۔ اسلام اس کو جائز نہیں رکھتا اور رہبانیّت اسلام کا منشاء نہیں۔ اِسلام تو انسان کو چُست اور ہوشیار اور مُستعد بنانا چاہتا ہے اس لئے مَیں تو کہتا ہوں کہ تم اپنے کاروبار کو جدّ و جہد سے کرو۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰/ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

خطرناک ریاضتیں کرنا اور اعضاء اور قویٰ کو مجاہدات میں بیکار کر دینا محض نکمّی بات اور لاحاصل ہے۔ اسی لئے ہمارے ہادیٔ کامل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا لَا رَھْبَانِیَّةَ فِی الْاِسْلَامِ یعنی جب انسان کو صفت اسلام (گردن نہادن برحکم خدا و موافقت تامہ بتقادیر الٰہیہ) میسّر آجائے تو پھر رہبانیّت یعنی اسے مجاہدوں اور ریاضتوں کی کوئی ضرورت نہیں ..... یہی وجہ ہے کہ اِسلام نے رہبانیّت کو نہیں رکھا اس لئے کہ وہ معرفتِ تامہ کا ذریعہ نہیں ہے۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰/ اگست ۱۸۹۹ء صفحہ ۵)

رہبانیّت اور اباحت انسان کو اس صدق اور وفا سے دُور رکھتے تھے جو اسلام پَیدا کرنا چاہتا ہے اِس لئے ان سے الگ رکھ کر اطاعتِ الٰہی کا حکم دے کر صدق اور وفا کی تعلیم دی جو ساری رُوحانی لذتوں کی جاذب ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰/ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

وہ فقیر جو دنیوی کاموں سے گھبرا کر گوشہ نشین بن جاتا ہے وہ ایک کمزوری دکھلاتا ہے۔ اِسلام میں رہبانیّت نہیں۔ ہم کبھی نہیں کہتے کہ عورتوں اور بال بچّوں کو ترک کر دو اور دُنیوی کاروبار کو چھوڑ دو بلکہ ملازم کو چاہیئے کہ وہ اپنی ملازمت کے فرائض ادا کرے اور تاجر اپنی تجارت کے کاروبار کو پورا کرے لیکن دین کو مقدم رکھے۔

اِس کی مثال خود دُنیا میں موجود ہے کہ تاجر اور ملازم لوگ باوجود اس کے کہ وہ اپنی تجارت اور ملازمت کو بہت عمدگی سے پورا کرتے ہیں پھر بھی بیوی بچّے رکھتے ہیں اور ان کے حقوق برابر ادا کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک انسان ان تمام مشاغل کے ساتھ خدا تعالیٰ کے حقوق کو ادا کر سکتا ہے اور دین کو دُنیا پر مقدّم رکھ کر بڑی عمدگی سے

اپنی زندگی گذار سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ تو انسان کا فطرتی تعلق ہے کیونکہ اس کی فطرت خدا تعالیٰ کے حضور میں اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے جواب میں قَالُوْا بَلٰی کا اقرار کر چکی ہوئی ہے۔

یاد رکھو کہ وہ شخص جو کہتا ہے کہ جنگل میں چلا جائے اور اس طرح دُنیوی کدورتوں سے بچ کر خدا کی عبادت کرے وہ دُنیا سے گھبرا کر بھاگتا ہے اور نامردی اختیار کرتا ہے۔ دیکھو ریل کا انجن بے جان ہو کر ہزاروں کو اپنے ساتھ کھینچتا ہے اور منزلِ مقصود پر پہنچاتا ہے پھر افسوس ہے اس جاندار پر جو اپنے ساتھ کسی کو بھی کھینچ نہیں سکتا۔ انسان کو خدا تعالیٰ نے بڑی بڑی طاقتیں بخشی ہیں۔ اس کے اندر طاقتوں کا ایک خزانہ خدا تعالیٰ نے رکھ دیا ہے لیکن وہ کسل کے ساتھ اپنی طاقت کو ضائع کر دیتا ہے اور عورت سے بھی گیا گذرا ہوتا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جن قویٰ کا استعمال نہ کیا جائے وہ رفتہ رفتہ ضائع ہو جاتے ہیں۔ اگر چالیس دن تک کوئی شخص تاریکی میں رہے تو اس کی آنکھوں کا نور جاتا رہتا ہے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۱ مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

۲۹۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ

يَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ تمہارے لئے ایک نور مقرر کر دے گا (یعنی رُوح القدس) جو تمہارے ساتھ ساتھ چلے گا۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۹۷)

اے ایمان لانے والو اگر تم متقی ہونے پر ثابت قدم رہو اور اللہ تعالیٰ کے لئے اِتّقاء کی صفت میں قیام اور استحکام اختیار کرو تو خدا تعالیٰ تم میں اور تمہارے غیروں میں فرق رکھ دے گا۔ وہ فرق یہ ہے کہ تم کو ایک نور دیا جائے گا جس نور کے ساتھ تم اپنی راہوں میں چلو گے یعنی وہ نور تمہارے تمام افعال اور اقوال اور قویٰ اور حواس میں آ جائے گا۔ تمہاری عقل میں بھی نور ہوگا اور تمہاری ایک اٹکل کی بات میں بھی نور ہوگا اور تمہاری آنکھوں میں بھی نور ہوگا اور تمہارے کانوں اور تمہاری زبانوں اور تمہارے بیانوں اور تمہاری ہر ایک حرکت اور سکون میں نور ہوگا اور جن راہوں میں تم چلو گے وہ راہیں نورانی ہو جائیں گی۔ غرض جتنی تمہاری راہیں تمہارے قویٰ کی راہیں تمہارے حواس کی راہیں ہیں وہ سب نور سے بھر جائیں گی اور تم سراپا نور میں ہی چلو گے۔

اب اِس آیت سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ تقویٰ سے جاہلیت ہرگز جمع نہیں ہو سکتی ہاں فہم اور

ادراک حسبِ مراتب تقویٰ کم وبیش ہوسکتا ہے۔ اسی مقام سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بڑی اور اعلیٰ درجہ کی کرامت جو اَولیاء اللہ کو دی جاتی ہے جن کو تقویٰ میں کمال ہوتا ہے وہ یہی دی جاتی ہے کہ ان کے تمام حواس اور عقل اور فہم اور قیاس میں نور رکھا جاتا ہے اور ان کی قوتِ کشفی نور کے پانیوں سے ایسی صفائی حاصل کرلیتی ہے کہ جو دوسروں کو نصیب نہیں ہوتی۔ ان کے حواس نہایت باریک بین ہوجاتے ہیں اور معارف اور دقائق کے پاک چشمے اُن پر کھولے جاتے ہیں اور فیض سائغ ربّانی اُن کے رگ و ریشہ میں خون کی طرح جاری ہوجاتا ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۷۷ تا ۱۷۹)

تمہیں ایک نور عطا کیا جائے گا جو تمہارے غیر میں ہرگز نہیں پایا جائے گا یعنی نورِ الہام اور نورِ اجابتِ دُعا اور نورِ کراماتِ اصطفاء۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۲۹۶)

وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ۔ فَالنُّوْرُ الَّذِيْ هُوَ الْاَمْرُ الْفَارِقُ بَيْنَ خَوَاصِّ عِبَادِ اللّٰهِ وَ بَيْنَ عِبَادٍ اٰخَرِيْنَ هُوَ الْاِلْهَامُ وَالْكَشْفُ وَالتَّحْدِيْثُ وَعُلُوْمٌ غَامِضَةٌ دَقِيْقَةٌ تَنْزِلُ عَلٰى قُلُوْبِ الْخَوَاصِّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۸۰)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ۔ بظاہر تو یہ تحصیل حاصل معلوم ہوتی ہوگی لیکن جب حقیقتِ حال پر غور کی جاوے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ کئی مراتب ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ تکمیل چاہتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

ترجمہ از مرتّب:۔ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ۔ وہ نور جو اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں اور دوسرے بندوں میں فرق کرنے والا ہے وہ الہام اور کشف اور محدّثیت ہے نیز ایسے گہرے اور دقیق مضامین ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے خاص بندوں کے دلوں پر نازل ہوتے ہیں۔

(حمامۃ البشریٰ صفحہ ۸۰)

سُورۃ المُجَادلۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

اَلَّذِیۡنَ یُظٰہِرُوۡنَ مِنۡکُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِہِمۡ مَّا ہُنَّ اُمَّہٰتِہِمۡ ؕ اِنۡ اُمَّہٰتُہُمۡ اِلَّا الّٰٓیِٴۡ وَلَدۡنَہُمۡ ؕ وَ اِنَّہُمۡ لَیَقُوۡلُوۡنَ مُنۡکَرًا مِّنَ الۡقَوۡلِ وَ زُوۡرًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوۡرٌ۝ وَ الَّذِیۡنَ یُظٰہِرُوۡنَ مِنۡ نِّسَآئِہِمۡ ثُمَّ یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا قَالُوۡا فَتَحۡرِیۡرُ رَقَبَۃٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِکُمۡ تُوۡعَظُوۡنَ بِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ۝ فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ فَصِیَامُ شَہۡرَیۡنِ مُتَتَابِعَیۡنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ فَاِطۡعَامُ سِتِّیۡنَ مِسۡکِیۡنًا ؕ ذٰلِکَ لِتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ؕ وَ تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ ؕ وَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ۝

جو شخص اپنی عورت کو ماں کہہ بیٹھے تو وہ حقیقت میں اس کی ماں نہیں ہو سکتی۔ اُن کی مائیں وہی ہیں جن سے وہ پیدا ہوئے۔ سو یہ اُن کی بات نامعقول اور سراسر جھوٹ ہے اور خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے اور جو لوگ ماں کہہ بیٹھیں اور پھر رجوع کریں تو اپنی عورت کو چھونے سے پہلے ایک گردن آزاد کریں یہی خدا ئے خبیر

کی طرف سے نصیحت ہے اور اگر گردن آزاد نہ کر سکیں تو اپنی عورت کو چھونے سے پہلے دو مہینہ کے روزے رکھیں اور اگر روزے نہ رکھ سکیں تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دیں۔ (آریہ دھرم صفحہ ۴۴)

۵۸:۸ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ؀

کسی پوشیدہ مشورہ میں تین آدمی نہیں ہوتے جن کے ساتھ چوتھا خدا نہیں ہوتا۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۸۹)

تین شخص کوئی ایسا پوشیدہ مشورہ نہیں کرتے جس کا چوتھا خدا نہ ہو اور نہ پانچ کرتے ہیں جن کا چھٹا خدا نہ ہو۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۸۹ حاشیہ)

جب تین آدمی کوئی پوشیدہ باتیں کرتے ہیں تو چوتھا ان کا خدا ہوتا ہے اور جب پانچ کرتے ہیں تو چھٹا ان کا خدا ہوتا ہے۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۱۱۲)

عرش مقامِ تنزیہ ہے اور اسی لئے خدا ہر جگہ حاضر ناظر ہے جیسا کہ فرماتا ہے ...... مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۰ مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

۵۸:۱۲ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ؀

اگر مجلسوں میں تمہیں کہا جائے کہ کشادہ ہو کر بیٹھو یعنی دوسروں کو جگہ دو تو جلد جگہ کشادہ کر دو تا دوسرے بیٹھیں اور اگر کہا جائے تم اُٹھ جاؤ تو پھر بغیر چون و چرا کے اُٹھ جاؤ۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۲۲)

۲۲۔ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ○

خدا نے یہی لکھا ہے کہ مَیں اور میرے پیغمبر غالب رہیں گے۔ خدا بڑی طاقت والا اور غالب ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۶ حاشیہ)

خدا مقرر کر چکا ہے کہ مَیں اور میرے رسول ہی غالب ہوتے رہیں گے۔ یہ آیت بھی ہر ایک زمانہ میں دائرا ور عادت مستمرہ الٰہیہ کا بیان کر رہی ہے۔ یہ نہیں کہ آئندہ رسول پیدا ہوں گے اور خدا انہیں غالب کرے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ کوئی زمانہ ہو حال یا استقبال یا گذشتہ سُنّت اللہ یہی ہے کہ رسول آخر کار غالب ہی ہو جاتے ہیں۔

(الحق دہلی صفحہ ۳۳)

خدا کا یہ قدیم نوشتہ ہے کہ مَیں اور میرے رسول غالب رہیں گے۔ (انجام آتھم صفحہ ۵۹)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكُوْنُوْنَ لِلّٰهِ فَيَكُوْنَ اللّٰهُ لَهُمْ۔ اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ فِيْ مَآلِ الْاَمْرِ عَلَى الْمُخَالِفِيْنَ۔ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْزِيْ عِبَادَهُ الْمَامُوْرِيْنَ۔

(انجام آتھم صفحہ ۲۶۵)

مَیں خدا سے یقینی علم پاکر کہتا ہوں کہ اگر یہ تمام مولوی اور ان کے سجادہ نشین اور ان کے مُلہم اکٹھے ہو کر [illegible] امور میں مجھ سے مقابلہ کرنا چاہیں تو خدا ان سب کے مقابل پر میری فتح کرے گا کیونکہ مَیں خدا کی طرف سے ہوں۔ پس ضرور ہے کہ بموجب آیت کریمہ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ میری فتح ہو۔

(ضمیمہ انجام آتھم صفحہ ۵۷، ۵۸)

خدا نے ابتداء سے لکھ چھوڑا ہے اور اپنا قانون اور اپنی سنّت قرار دے دیا ہے کہ وہ اور اس کے رسول ہمیشہ غالب رہیں گے پس چونکہ مَیں اس کا رسول یعنی فرستادہ ہوں مگر بغیر کسی نئی شریعت اور نئے دعوے اور نئے نام کے بلکہ اُسی نبی کریم خاتم الانبیاء کا نام پاکر اور اُسی میں ہو کر اور اُسی کا مظہر بن کر آیا ہوں اِس لئے مَیں کہتا ہوں کہ جیسا کہ قدیم سے یعنی آدم کے زمانہ سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک ہمیشہ مفہوم اِس

ترجمہ از مرتّب :۔ وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کا ہو جاتا ہے تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء ہی آخر کار اپنے مخالفوں پر غالب ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ابتداء سے یہ لکھ چھوڑا ہے کہ مَیں اور میرے رسول ہی غالب ہوتے رہیں گے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے مامور بندوں کو کبھی بے مدد نہیں چھوڑتا۔

(انجام آتھم صفحہ ۲۶۵)

آیت کا سچا نکلتا آیا ہے ایسا ہی اب بھی میرے حق میں سچا نکلے گا۔ (نزول المسیح صفحہ ۳،۲)

کیا یہ لوگ اپنی رُوگردانی سے خدا کے سچے ارادہ کو روک دیں گے جو ابتداء سے تمام نبی اس پر گواہی دیتے آئے ہیں۔ نہیں بلکہ خدا کی یہ پیشگوئی عنقریب سچی ہونے والی ہے کہ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ۔

(کشتی نوح صفحہ ۸)

یہ خدا تعالیٰ کی سُنّت ہے اور جب سے کہ اس نے اِنسان کو زمین میں پیدا کیا ہمیشہ اس سُنّت کو وہ ظاہر کرتا رہا ہے کہ وہ اپنے نبیوں اور رسولوں کی مدد کرتا ہے اور اُن کو غلبہ دیتا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ اور غلبہ سے مراد یہ ہے کہ جیسا کہ رسولوں اور نبیوں کا یہ منشاء ہوتا ہے کہ خدا کی حجّت زمین پر پُوری ہو جائے اور اس کا مقابلہ کوئی نہ کر سکے اسی طرح خدا تعالیٰ قوی نشانوں کے ساتھ اُن کی سچائی ظاہر کر دیتا ہے اور جس راست بازی کو وہ دُنیا میں پھیلانا چاہتے ہیں اُس کی تخمریزی انہی کے ہاتھ سے کر دیتا ہے۔ (الوصیت صفحہ ۴)

خدا تعالیٰ کا یہ حتمی وعدہ ہے کہ جو لوگ اُس کی طرف سے آتے ہیں وہ فریقِ مخالف پر غالب ہو جاتے ہیں۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۵)

مقابلہ کے وقت خدا صادق کی مدد کرتا ہے۔ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ۔

(الحکم جلد ۵ ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۰)

سچا خدا جس سے پیار کرتا ہے اس کی تائید کرتا ہے کیونکہ وہ خدا فرماتا ہے کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ۔ (الحکم جلد ۷ ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

خدا تعالیٰ اپنے بندوں کا حامی ہو جاتا ہے۔ دشمن چاہتے ہیں کہ ان کو نیست و نابود کر دیں مگر وہ روز بروز ترقی پاتے ہیں اور اپنے دشمنوں پر غالب آتے جاتے ہیں جیسا کہ اس کا وعدہ ہے کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ یعنی خدا تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ مَیں اور میرے رسول ضرور غالب رہیں گے۔

(البدر جلد ۲ ۱۴ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۷)

لفظ کَتَبَ سُنّت اللہ پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ اپنے رسولوں کو ضرور ہی غلبہ دیا کرتا ہے۔ درمیانی دُشواریاں کچھ شئے نہیں ہوتیں اگرچہ وہ ضَاقَتۡ عَلَیۡهِمُ الۡاَرۡضُ[1] کا مصداق ہی کیوں نہ ہوں۔ (البدر جلد ۳ ۹ مورخہ یکم مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

---

[1] سُورۃ التوبۃ : ۱۱۸

یاد رکھو خدا کے بندوں کا انجام کبھی بد نہیں ہؤا کرتا۔اس کا وعدہ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ بالکل سچا ہے اور یہ اسی وقت پُورا ہوتا ہے جب لوگ اس کے رسولوں کی مخالفت کریں۔

(البدر جلد ۳ ۱۱ مورخہ ۱۶؍مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۹)

۲۳۔ لَا تَجِدُ قَوۡمًا یُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ یُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ لَوۡ کَانُوۡۤا اٰبَآءَہُمۡ اَوۡ اَبۡنَآءَہُمۡ اَوۡ اِخۡوَانَہُمۡ اَوۡ عَشِیۡرَتَہُمۡ ؕ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡاِیۡمَانَ وَ اَیَّدَہُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡہُ ؕ وَ یُدۡخِلُہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ ؕ اُولٰٓئِکَ حِزۡبُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۝

ان مومنوں کے دِلوں میں خدا تعالیٰ نے ایمان کو لکھ دیا اور رُوح القدس سے اُن کو مدد دی۔ دِل میں ایمان کے لکھنے سے یہ مطلب ہے کہ ایمان فطرتی اور طبعی ارادوں میں داخل ہوگیا اور جُزوِ طبیعت بن گیا اور کوئی تکلّف اور تصنّع درمیان نہ رہا اور یہ مرتبہ کہ ایمان دِل کے رگ و ریشہ میں داخل ہو جائے اُس وقت انسان کو مِلتا ہے کہ جب انسان رُوح القدس سے مؤیّد ہو کر ایک نئی زندگی پاوے اور جس طرح جان ہر وقت جسم کی محافظت کے لئے جسم کے اندر رہتی ہے اور اپنی روشنی اس پر ڈالتی رہتی ہے اسی طرح اِس نئی زندگی کی رُوح القدس بھی اندر آباد ہو جائے اور دِل پر ہر وقت اور ہر لحظہ اپنی روشنی ڈالتی رہے اور جیسے جسم جان کے ساتھ ہر وقت زندہ ہے دِل اور تمام رُوحانی قویٰ رُوح القدس کے ساتھ زندہ ہوں۔اِسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے بعد بیان کرنے اِس بات کے کہ ہم نے ان کے دلوں میں ایمان کو لکھ دیا یہ بھی بیان فرمایا کہ رُوح القدس سے ہم نے ان کو تائید دی کیونکہ جب ایمان دلوں میں لکھا گیا اور فطرتی حروف میں داخل ہوگیا تو ایک نئی پَیدائش اِنسان کو حاصل ہوگئی اور یہ نئی پَیدائش بجز تائید رُوح القدس کے ہرگز نہیں مِل سکتی۔رُوح القدس کا نام

اسی لئے رُوح القدس ہے کہ اس کے داخل ہونے سے ایک پاک رُوح اِنسان کو مل جاتی ہے قرآن کریم رُوحانی حیات کے ذکر سے بھرا پڑا ہے اور جا بجا مومنوں کا نام اَحیاء یعنی زندے اور کفار کا نام اموات یعنی مُردے رکھتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کامل مومنوں کو رُوح القدس کے دخول سے ایک جان مل جاتی ہے اور کفار گو جسمانی طور پر حیات رکھتے ہیں مگر اس حیات سے بے نصیب ہیں جو دِل اور دماغ کو ایمانی زندگی بخشتی ہے۔

اِس جگہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس آیتِ کریمہ کی تائید میں احادیثِ نبویہ میں جا بجا بہت کچھ ذکر ہے اور بخاری میں ایک حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے ہے اور وہ یہ ہے اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَضَعَ لِحَسَّانِ ابْنِ ثَابِتٍ مِنْبَرًا فِی الْمَسْجِدِ فَکَانَ یُنَافِحُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَللّٰھُمَّ اَیِّدْ حَسَّانَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کَمَا نَافَحَ عَنْ نَبِیِّکَ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسّان بن ثابت کے لئے مسجد میں منبر رکھا اور حسّانؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کفار سے جھگڑتا تھا اور اُن کی ہجو کا مدح کے ساتھ جواب دیتا تھا پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسّانؓ کے حق میں دُعا کی اور فرمایا کہ یا الٰہی حسّانؓ کو رُوح القدس کے ساتھ یعنی جبرائیل کے ساتھ مدد کر اور ابوداؤد نے بھی ابنِ سیرین سے اور ایسا ہی ترمذی نے بھی یہ حدیث لکھی ہے اور اس کو حسن صحیح کہا ہے اور بخاری اور مسلم میں بطول الفاظ یہ حدیث بھی موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسّانؓ کو کہا اَجِبْ عَنِّیْ اَللّٰھُمَّ اَیِّدْہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ یعنی میری طرف سے (اے حسّانؓ) کفار کو جواب دے یا الٰہی اِس کی رُوح القدس سے مدد فرما۔ ایسا ہی حسّانؓ کے حق میں ایک یہ بھی حدیث ہے ھَاجِھِمْ وَ جِبْرَائِیْلُ مَعَکَ یعنی اے حسّانؓ کفار کی بدگوئی کا بدگوئی کے ساتھ جواب دے اور جبرائیل تیرے ساتھ ہے۔

اب اِن احادیث سے ثابت ہوا کہ حضرت جبرائیل حسّانؓ کے ساتھ رہتے تھے اور ہر دم اُن کے رفیق تھے اور ایسا ہی یہ آیتِ کریمہ بھی کہ اَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ صاف اور کُھلے کُھلے طور پر بتلا رہی ہے کہ رُوح القدس مومنوں کے ساتھ رہتا تھا کیونکہ اِسی قسم کی آیت جو حضرت عیسٰیؑ کے حق میں آئی ہے یعنی وَ اَیَّدْنَاہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اس کی تفسیر میں تمام مفسّرین اِس بات پر متفق ہیں کہ رُوح القدس ہر وقت قرین اور رفیق حضرت عیسٰیؑ کا تھا اور ایک دم بھی اُن سے جُدا نہیں ہوتا تھا۔ دیکھو تفسیر حسینی تفسیر مظہری تفسیر عزیزی معالم ابنِ کثیر وغیرہ اور مولوی صدیق حسن فتح البیان میں اِس آیت کی تفسیر میں یہ عبارت لکھتے ہیں وَ کَانَ جِبْرَائِیْلُ یَسِیْرُ مَعَ عِیْسٰی حَیْثُ سَارَ فَلَمْ یُفَارِقْہُ حَتّٰی صَعِدَ بِہٖ اِلَی السَّمَآءِ یعنی جبرائیل ہمیشہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ ہی رہتا تھا ایک طرفۃ العین بھی اُن سے جُدا نہیں ہوتا تھا یہاں تک کہ اُن کے ساتھ ہی آسمان پر گیا۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۵)

خدا نے مومنوں کے دِل میں ایمان کو اپنے ہاتھ سے لکھ دیا ہے اور رُوح القدس کے ساتھ ان کی مدد کی۔

(اِسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۶۵)

اَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ یعنی خدائے تعالیٰ مومنوں کو رُوحِ قدس سے تائید کرتا ہے۔

(سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۳۷ حاشیہ)

خدا تعالیٰ نے انسان کے لئے اِبتلاء کے طور پر دو رُوحانی داعی مقرر کر رکھے ہیں ایک داعی خیر جس کا نام رُوح القدس ہے اور ایک داعی شر کا نام ابلیس اور شیطان ہے یہ دونوں داعی صرف خیر یا شر کی طرف بلاتے رہتے ہیں مگر کسی بات پر جبر نہیں کرتے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۸۰، ۸۱ حاشیہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے حق میں فرماتا ہے وَ اَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ یعنی ان کو رُوح القدس کے ساتھ مدد دی اور رُوح القدس کی مدد یہ ہے کہ دِلوں کو زندہ کرتا ہے اور رُوحانی موت سے نجات بخشتا ہے اور پاکیزہ قوتیں اور پاکیزہ حواس اور پاک علم عطا کرتا ہے اور علومِ یقینیہ اور براہینِ قطعیہ سے خدا تعالیٰ کے مقامِ قُرب تک پہنچا دیتا ہے کیونکہ اُس کے مقرب وہی ہیں جو یقینی طور پر جانتے ہیں کہ وہ ہے اور یقینی طور پر جانتے ہیں کہ اُس کی قدرتیں اور اُس کی رحمتیں اور اُس کی عقوبتیں اور اُس کی عدالتیں سب سچ ہیں اور وہ جمیع فیوض کا مبداء اور تمام نظامِ عالم کا سرچشمہ اور تمام سِلسلہ مؤثرات اور متاثرات کا علت العلل ہے مگر متصرف بالارادہ جس کے ہاتھ میں کُل ملکوت السّمٰوٰت والارض ہے اور یہ علوم جو مدارِ نجات ہیں یقینی اور قطعی طور پر بجز اُس حیات کے حاصل نہیں ہو سکتے جو بتوسط رُوح القدس انسان کو ملتی ہے اور قرآن کریم کا بڑے زور شور سے یہ دعویٰ ہے کہ وہ حیاتِ رُوحانی صرف متابعت اس رسولِ کریمؐ سے ملتی ہے اور تمام وہ لوگ جو اس نبی کریمؐ کی متابعت سے سرکش ہیں وہ مُردے ہیں جن میں اِس حیات کی رُوح نہیں ہے اور حیاتِ روحانی سے مُراد انسان کے وہ علمی اور عملی قوٰی ہیں جو رُوح القدس کی تائید سے زندہ ہو جاتے ہیں اور قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے کہ جن احکام پر اللہ جلّ شانہٗ انسان کو قائم کرنا چاہتا ہے وہ چھ سَو ہیں۔ ایسا ہی اس کے مقابل پر جبرائیل علیہ السّلام کے پَر بھی چھ سَو ہیں اور بیضۂ بشریّت جب تک چھ سَو حکم کو سر پر رکھ کر جبرائیل کے پروں کے نیچے نہ آوے اُس میں فنا فی اللہ ہونے کا بچہ پیدا نہیں ہوتا اور انسانی حقیقت اپنے اندر چھ سَو بیضہ کی استعداد رکھتی ہے۔ پس جس شخص کا چھ سَو بیضۂ استعداد جبرائیل کے چھ سَو پَر کے نیچے آ گیا وہ انسان کامل اور یہ تولّد اس کا تولّد کامل ہے اور یہ حیات حیاتِ کامل ہے اور غور کی نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ بیضۂ بشریّت کے رُوحانی بچے جو رُوح القدس کی معرفت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کی برکت سے پیدا ہوئے وہ کمیّت اور کیفیّت اور صورت اور نوع اور حالت میں تمام انبیاء کے بچوں سے اتم اور اکمل

ہیں۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۹۴ تا ۱۹۷)

کلمہ اور رُوح کا لفظ عام ہے حضرت مسیح کی کوئی خصوصیت اس میں نہیں ہے یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ[1] اب اللہ تعالیٰ کے کلمات تو لاانتہا ہیں اور ایسا ہی صحابہؓ کی تعریف میں آیا ہے وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ پھر مسیح کی کیا خصوصیت رہی۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

جسمانی علوم پر نازاں ہونا حماقت ہے۔ چاہیئے کہ تمہاری طاقت رُوح کی طاقت ہو۔ خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے سائنس یا فلسفہ یا منطق پڑھایا اور اُن سے مدد دی بلکہ یہ کہ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ یعنی اپنی رُوح سے مدد دی۔ صحابہؓ اُمّی تھے ان کا نبی (سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اُمّی۔ مگر جو پُر حکمت باتیں انہوں نے بیان کیں وہ بڑے بڑے علماء کو نہیں سُوجھیں۔ کیونکہ اُن کو خدا تعالیٰ کی خاص تائید تھی۔ تقوٰی و طہارت و پاکیزگی سے اندرونی طور پر مدد ملتی ہے۔ یہ جسمانی علوم کے ہتھیار کمزور ہتھیار ہیں ممکن بلکہ اَغلب کہ مخالف کے پاس ان سے بھی زیادہ تیز ہتھیار ہوں پس ہتھیار وہ چاہیئے جس کا مقابلہ دُشمن نہ کر سکے وہ ہتھیار سچّی تبدیلی اور دِل کا تقدّس و تطہّر ہے۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

دیکھو اللہ تعالیٰ نے بعض کا نام سابق مہاجر اور انصار رکھا ہے اور اُن کو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ میں داخل کیا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو سب سے پہلے ایمان لائے اور جو بعد میں ایمان لائے ان کا نام صرف ناس رکھا ہے جیسے فرمایا اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ[2] یہ لوگ جو اسلام میں داخل ہوئے اگرچہ وہ مسلمان تھے مگر ان کو وہ مراتب نہیں ملے جو پہلے لوگوں کو دئے گئے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کو دیکھو کہ انہوں نے بکریوں کی طرح اپنا خون بہا دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں ایسے گم ہو گئے کہ وہ اس کے لئے ہر ایک تکلیف اور مصیبت اُٹھانے کو ہر وقت تیار تھے۔ انہوں نے یہاں تک ترقی کی کہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کا سرٹیفیکیٹ ان کو دیا گیا۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۷ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

وہ جماعت (جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں کیا ہے کہ انہوں نے ایسے اعمالِ صالحہ کئے کہ خدا تعالیٰ اُن سے راضی ہو گیا اور وہ خدا تعالیٰ سے راضی ہو گئے) صرف ترک بدی ہی سے نہ بنی تھی انہوں نے اپنی زندگیوں کو خدا تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہیچ سمجھا۔ خدا تعالیٰ کی مخلوق کو نفع پہنچانے کے

---

[1] سورۃ الاعراف: ۱۵۹ [2] سورۃ النصر: ۲، ۳

واسطے اپنے آرام و آسائش کو ترک کر دیا تب جاکر ان مدارج اور مراتب پر پہنچے کہ آواز آگئی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲ مورخہ ۱۷؍جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقابلہ میں حواریوں کو پیش کرتے ہوئے بھی شرم آجاتی ہے۔ حواریوں کی تعریف میں ساری انجیل میں ایک بھی ایسا فقرہ نظر نہ آئے گا کہ انہوں نے میری راہ میں جان دے دی بلکہ برخلاف اس کے ان کے اعمال ایسے ثابت ہوں گے جس سے معلوم ہو کہ وہ حد درجہ کے غیر مستقل مزاج، غدّار اور بے وفا اور دُنیا پرست تھے اور صحابہ کرامؓ نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی راہ میں وہ صدق دکھلایا کہ انہیں رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ کی آواز آگئی۔ یہ اعلیٰ درجہ کا مقام ہے جو صحابہؓ کو حاصل ہوا یعنی اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوگئے۔ اس مقام کی خوبیاں اور کمالات الفاظ میں ادا نہیں ہوسکتے۔ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو جانا ہر شخص کا کام نہیں بلکہ یہ توکّل، تبتّل اور رضا و تسلیم کا اعلیٰ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان کو کسی قسم کا شکوہ اور شکایت اپنے مولیٰ سے نہیں رہتی اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے راضی ہو جانا یہ موقوف ہے بندے کے کمال صدق و وفاداری اور اعلیٰ درجہ کی پاکیزگی اور طہارت اور کمال اطاعت پر جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ نے معرفت اور سلوک کے تمام مدارج طے کر لئے تھے۔ اس کا نمونہ حواریوں میں اگر تلاش کریں تو ہرگز نہیں مِل سکتا۔ پس نرے سلب امراض پر خوش ہو جانا یہ کوئی دانشمندی نہیں ہے اور رُوحانی کمالات کا شیدائی ان باتوں پر خوش نہیں ہوسکتا اِس لئے مَیں تمہارے لئے یہی پسند کرتا ہوں کہ تم اپنے دِل کو پاک کرو کہ مولیٰ کریم تم سے راضی ہو جاوے اور تم اس سے راضی ہو جاؤ۔ پھر وہ تمہارے جسم میں تمہاری باتوں میں ایسی برکت دے گا جو سلبِ امراض کرنے والے بھی انہیں دیکھ کر حیران اور شرمندہ ہوں گے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۹ مورخہ ۳۱؍مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

جو جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو میسّر آئی تھی اور جس نے آپ کی قوّتِ قدسی سے اثر پایا تھا اس کے لئے قرآن شریف میں آیا ہے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ اس کا سبب کیا ہے؟ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوّتِ قدسی کا نتیجہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجوہِ فضیلت میں سے یہ بھی ایک وجہ ہے کہ آپؐ نے ایسی اعلیٰ درجہ کی جماعت تیار کی۔ میرا دعویٰ ہے کہ ایسی جماعت آدمؑ سے لیکر آخر تک کسی کو نہیں ملی۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۱ مورخہ ۱۰؍جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

صحابہؓ کی جو تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی وہ اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ان کی نسبت فرماتا ہے مِنْھُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَہٗ[1] الآیہ اور پھر ان کی نسبت رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ

[1] سورۃ الاحزاب: ۲۴

فرمایا۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۷ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کامیابی کے ساتھ تختِ خلافت کو مقررہ وقت تک زیب دیکر اپنی اپنی خدمات بجالاکر بڑی کامیابی اور اللہ تعالیٰ کی رضوان لے کر چل بسے اور جنّات وعیون جو آخرت میں ان کے واسطے مقرر تھے اور وعدے تھے وہ اُن کو عطا ہوگئے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۰ مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

○

سُورَةُ الحشر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

۸ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا یعنی رسول جو کچھ تمہیں علم ومعرفت عطا کرے وہ لے لو اور جس سے منع کرے وہ چھوڑ دو۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۲۳)

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ کا حکم بغیر کسی قید اور شرط کے نہیں۔ اوّل یہ تو دیکھ لینا چاہیئے کہ کوئی حدیث فی الواقع مَآ اٰتٰكُمْ میں داخل ہے یا نہیں۔ مَآ اٰتٰكُمْ میں تو وہ داخل ہوگا جس کو ہم شناخت کرلیں کہ درحقیقت رسول نے اس کو دیا ہے اور جب تک پورے طور پر اطمینان نہ ہو تو کیا یہ جائز ہے کہ حدیث کا نام سُننے سے مَآ اٰتٰكُمْ میں اس کو داخل کردیں۔

(الحق لدھیانہ صفحہ ۱۰۵)

۱۹ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ○

اے ایمان والو خدا سے ڈرتے رہو اور ہر ایک تم میں سے دیکھتا رہے کہ میں نے اگلے جہان میں کونسا مال بھیجا ہے اور اس خدا سے ڈرو جو خبیر اور علیم ہے اور تمہارے اعمال دیکھ رہا ہے یعنی وہ خوب جاننے والا اور پرکھنے والا ہے اِس لئے وہ تمہارے کھوٹے اعمال ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۱، ۱۰۲)

۲۲۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ○

یہ قرآن جو تم پر اُتارا گیا اگر کسی پہاڑ پر اُتارا جاتا تو وہ خشوع اور خوفِ الٰہی سے ٹکڑہ ٹکڑہ ہوجاتا اور یہ مثالیں ہم اِس لئے بیان کرتے ہیں کہ تا لوگ کلامِ الٰہی کی عظمت معلوم کرنے کے لئے غور اور فکر کریں۔

(سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۱ حاشیہ)

ایک تو اِس کے یہ معنے ہیں کہ قرآن شریف کی ایسی تاثیر ہے کہ اگر پہاڑ پر وہ اُترتا تو پہاڑ خوفِ خدا سے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا اور زمین کے ساتھ مل جاتا۔ جب جمادات پر اس کی ایسی تاثیر ہے تو بڑے ہی بیوقوف وہ لوگ ہیں جو اس کی تاثیر سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور دوسرے اس کے معنے یہ ہیں کہ کوئی شخص محبّتِ الٰہی اور رضائے الٰہی کو حاصل نہیں کرسکتا جب تک دو صفتیں اس میں پیدا نہ ہوجائیں۔ اوّل تکبّر کو توڑنا جس طرح کہ کھڑا ہوا پہاڑ جس نے سر اُونچا کیا ہوا ہوتا ہے گر کر زمین سے ہموار ہوجائے۔ اسی طرح انسان کو چاہیئے کہ تمام تکبّر اور بڑائی کے خیالات کو دُور کرے۔ عاجزی اور خاکساری کو اختیار کرے اور دوسرا یہ ہے کہ پہلے تمام تعلّقات اس کے ٹوٹ جائیں جیسا کہ پہاڑ گر کر مُتَصَدِّعًا ہوجاتا ہے۔ اینٹ سے اینٹ جُدا ہوجاتی ہے ایسا ہی اسکے پہلے تعلّقات جو موجبِ گندگی اور الٰہی نارضامندی تھے وہ سب تعلّقات ٹوٹ جائیں اور اب اس کی ملاقاتیں اور دوستیاں اور محبّتیں اور عداوتیں صرف اللہ تعالیٰ کے لئے رہ جائیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۰ جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۹)

۲۳۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ○

لَآ اِلٰـهَ اِلَّا ھُوَ وہی ایک سب کا رب ہے۔ (ست بچن صفحہ ۹۹)

وہ خدا جو واحد لاشریک ہے جس کے سوا کوئی بھی پرستش اور فرمانبرداری کے لائق نہیں یہ اِس لئے فرمایا کہ اگر وہ لاشریک نہ ہو تو شاید اس کی طاقت پر دشمن کی طاقت غالب آجائے اس صورت میں خدائی معرضِ خطر میں رہے گی اور یہ جو فرمایا کہ اس کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں اِس سے یہ مطلب ہے کہ وہ ایسا کامل خدا ہے جس کی صفات اور خوبیاں اور کمالات ایسے اعلیٰ اور بلند ہیں کہ اگر موجودات میں سے بوجہ صفاتِ کاملہ کے ایک خدا انتخاب کرنا چاہیں یا دل میں عمدہ سے عمدہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ خدا کی صفات فرض کریں تو وہ سب سے اعلیٰ جس سے بڑھ کر کوئی اعلیٰ نہیں ہو سکتا وہی خدا ہے جس کی پرستش میں ادنیٰ کو شریک کرنا ظلم ہے۔ پھر فرمایا کہ عالم الغیب ہے یعنی اپنی ذات کو آپ ہی جانتا ہے اس کی ذات پر کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ ہم آفتاب اور ماہتاب اور ہر ایک مخلوق کا سراپا دیکھ سکتے ہیں مگر خدا کا سراپا دیکھنے سے قاصر ہیں۔ پھر فرمایا کہ وہ عَالِمُ الشَّهَادَةِ ہے یعنی کوئی چیز اس کی نظر سے پردہ میں نہیں ہے۔ یہ جائز نہیں کہ خدا کہلا کر پھر علمِ اشیاء سے غافل ہو وہ اس عالم کے ذرہ ذرہ پر اپنی نظر رکھتا ہے لیکن انسان نہیں رکھ سکتا وہ جانتا ہے کہ کب اِس نظام کو توڑے گا اور قیامت برپا کر دے گا اور اس کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ ایسا کب ہوگا؟ سو وہی خدا ہے جو ان تمام وقتوں کو جانتا ہے۔ پھر فرمایا ھُوَ الرَّحْمٰنُ یعنی وہ جانداروں کی ہستی اور ان کے اعمال سے پہلے محض اپنے لطف سے نہ کسی غرض سے اور نہ کسی عمل کے پاداش میں اُن کے لئے سامانِ راحت میسّر کرتا ہے جیسا کہ آفتاب اور زمین اور دوسری تمام چیزوں کو ہمارے وجود اور ہمارے اعمال کے وجود سے پہلے ہمارے لئے بنا دیا۔ اس عطیہ کا نام خدا کی کتاب میں رحمانیّت ہے اور اس کام کے لحاظ سے خدائے تعالیٰ رحمان کہلاتا ہے اور پھر فرمایا کہ اَلرَّحِیْمُ یعنی وہ خدا نیک عملوں کی نیک تر جزاء دیتا ہے اور کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا اور اس کام کے لحاظ سے رحیم کہلاتا ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵۸، ۵۹)

۲۴ ھُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ یعنی وہ خدا بادشاہ ہے جس پر کوئی داغ عیب نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانی بادشاہت عیب سے خالی نہیں۔ اگر مثلاً تمام رعیّت جلا وطن ہو کر دوسرے ملک کی طرف بھاگ جاوے تو پھر بادشاہی قائم نہیں رہ سکتی یا اگر مثلاً تمام رعیّت قحط زدہ ہو جائے تو پھر خراج شاہی کہاں سے آئے اور اگر رعیّت کے لوگ اُس سے

بحث شروع کر دیں کہ تجھ میں ہم سے زیادہ کیا ہے تو وہ کونسی لیاقت اپنی ثابت کرے۔ پس خدا تعالیٰ کی بادشاہی ایسی نہیں ہے۔ وہ ایک دَم میں تمام ملک کو فنا کر کے اَور مخلوقات پَیدا کر سکتا ہے۔ اگر وہ ایسا خالق اور قادر نہ ہوتا تو پھر بجز ظلم کے اس کی بادشاہت چل نہ سکتی کیونکہ وہ دُنیا کو ایک مرتبہ معافی اور نجات دیکر پھر دوسری دُنیا کہاں سے لاتا۔ کیا نجات یافتہ لوگوں کو دُنیا میں بھیجنے کے لئے پھر پکڑتا اور ظلم کی راہ سے اپنی معافی اور نجات دہی کو واپس لیتا تو اس صورت میں اس کی خدائی میں فرق آتا اور دُنیا کے بادشاہوں کی طرح داغدار بادشاہ ہوتا جو دُنیا کے قانون بناتے ہیں بات بات پر بگڑتے ہیں اور اپنی خود غرضی کے وقتوں پر جب دیکھتے ہیں کہ ظلم کے بغیر چارہ نہیں تو ظلم کو شیرِ مادر سمجھ لیتے ہیں مثلاً قانونِ شاہی جائز رکھتا ہے کہ ایک جہاز کو بچانے کے لئے ایک کشتی کے سواروں کو تباہی میں ڈال دیا جائے اور ہلاک کیا جائے مگر خدا کو تو یہ اضطرار پیش نہیں آنا چاہیئے۔ پس اگر خدا پورا قادر اور عدم سے پیدا کرنے والا نہ ہوتا تو وہ یا تو کمزور راجوں کی طرح قدرت کی جگہ ظلم سے کام لیتا اور یا عادل بن کر خدائی کو ہی الوداع کہتا بلکہ خدا کا جہاز تمام قدرتوں کے ساتھ سچے انصاف پر چل رہا ہے۔ پھر فرمایا اَلسَّلَامُ یعنی وہ خدا جو تمام عیبوں اور مصائب اور سختیوں سے محفوظ ہے بلکہ سلامتی دینے والا ہے۔ اس کے معنے بھی ظاہر ہیں کیونکہ اگر وہ آپ ہی مصیبتوں میں پڑتا۔ لوگوں کے ہاتھ سے مارا جاتا اور اپنے ارادوں میں ناکام رہتا تو اس بَدنمونہ کو دیکھ کر کس طرح دل تسلی پکڑتے کہ ایسا خدا ہمیں ضرور مصیبتوں سے چھڑا دے گا..... پھر فرمایا کہ خدا امن کا بخشنے والا اور اپنے کمالات اور توحید پر دلائل قائم کرنے والا ہے اور یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سچے خدا کا ماننے والا کسی مجلس میں شرمندہ نہیں ہو سکتا اور نہ خدا کے سامنے شرمندہ ہو گا کیونکہ اس کے پاس زبردست دلائل ہوتے ہیں لیکن بناوٹی خدا کا ماننے والا بڑی مصیبت میں ہوتا ہے وہ بجائے دلائل پیش کرنے کے ہر ایک بیہودہ بات کو راز میں داخل کرتا ہے تا ہنسی نہ ہو اور ثابت شدہ غلطیوں کو چھپانا چاہتا ہے۔

اور پھر فرمایا کہ اَلْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ یعنی وہ سب کا محافظ ہے اور سب پر غالب اور بگڑے ہوئے کا بنانے والا ہے اور اس کی ذات نہایت ہی مستغنی ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵۹ تا ۶۱)

۲۶ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ط

يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

وہ ایسا خدا ہے کہ جسموں کا پیدا کرنے والا اور رُوحوں کا بھی پیدا کرنے والا۔ رحم میں تصویر کھینچنے والا ہے تمام نیک نام جہاں تک خیال آسکیں سب اسی کے نام ہیں اور پھر فرمایا یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ یعنی آسمان کے لوگ بھی اس کے نام کو پاکی سے یاد کرتے ہیں اور زمین کے لوگ بھی۔ اِس آیت میں اشارہ فرمایا کہ آسمانی اجرام میں آبادی ہے اور وہ لوگ بھی پابند خدا کی ہدایتوں کے ہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۶۱)

ضرورتِ خالقیتِ باری تعالیٰ کو دلائلِ قطعیہ سے ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

دلیل چہارم۔ قرآن مجید میں بذریعہ مادۂ قیاسِ اقترانی قائم کی گئی ہے۔ جاننا چاہیئے کہ قیاس حجت کی تین قسموں میں سے پہلی قسم ہے اور قیاسِ اقترانی وہ قیاس ہے کہ جس میں عین نتیجہ کا یا نقیض اس کی بالفعل مذکور نہ ہو بلکہ بالقوّہ پائی جائے اور اقترانی اس جہت سے کہتے ہیں کہ حدود اس کے یعنی اصغر اور اَوسط اور اکبر مقترن ہوتے ہیں اور بالعموم قیاس حجّت کے تمام اقسام سے اعلیٰ اور افضل ہے کیونکہ اس میں کُل کے حال پر دلیل پکڑی جاتی ہے کہ جو بباعث استیفا تام کے مفید یقینِ کامل کے ہے پس وہ قیاس کہ جس کی اتنی تعریف ہے اس آیتِ شریفہ میں درج ہے اور ثبوت خالقیتِ باری تعالیٰ میں گواہی دے رہا ہے۔ دیکھو سورۃ الحشر جزو ۲۸۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَآءُ الْحُسْنٰى وہ اللہ خالق ہے یعنی پیدا کنندہ ہے وہ باری ہے یعنی رُوحوں اور اجسام کو عدم سے وجود بخشنے والا ہے۔ وہ مصوّر ہے یعنی صورت جسمیہ اور صورت نوعیہ عطا کرنے والا ہے کیونکہ اسی کے لئے تمام اسماء حسنہ ثابت ہیں یعنی جمیع صفاتِ کاملہ جو باعتبار کمال قدرت کے عقل تجویز کر سکتی ہے اسکی ذات میں جمع ہیں۔ لہٰذا نیست سے ہست کرنے پر بھی وہ قادر ہے کیونکہ نیست سے ہست کرنا قدرتی کمالات سے ایک اعلیٰ کمال ہے اور ترتیب مقدمات اس قیاس کی بصورت شکل اوّل کے اِس طرح پر ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ پیدا کرنا اور محض اپنی قدرت سے وجود بخشنا ایک کمال ہے اور سب کمالات ذاتِ کامل واجب الوجود کو حاصل ہیں پس نتیجہ یہ ہوُا کہ نیست سے ہست کرنے کا کمال بھی ذاتِ باری کو حاصل ہے۔ ثبوت مفہوم صغرای کا یعنی اِس بات کا کہ محض اپنی قدرت سے پیدا کرنا ایک کمال ہے اِس طرح پر ہوتا ہے کہ نقیض اس کی یعنی یہ امر کہ محض اپنی قدرت سے پیدا کرنے میں عاجز ہونا جب تک باہر سے کوئی مادہ آکر معاون اور مددگار نہ ہو ایک بھاری نقصان ہے کیونکہ اگر ہم یہ فرض کریں کہ مادہ موجودہ سب جا بجا خرچ ہو گیا تو ساتھ ہی یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ اب خدا پیدا کرنے سے قطعاً عاجز ہے حالانکہ ایسا نقص اس ذاتِ غیر محدود اور قادرِ مطلق پر عائد کرنا گویا اس کی الوہیت سے انکار کرنا ہے۔

سوائے اس کے علمِ الٰہیات میں یہ مسئلہ بدلائل ثابت ہو چکا ہے کہ مستجمع الکمالات ہونا واجب الوجود کا

تحقق الوہیت کے واسطے شرط ہے یعنی یہ لازم ہے کہ کوئی مرتبہ کمال کا مراتب ممکن التصوّر سے جو ذہن اور خیال میں گذر سکتا ہے اس ذاتِ کامل سے فوت نہ ہو۔ پس بلاشبہ عقل اِس بات کو چاہتی ہے کہ کمال الوہیت باری تعالیٰ کا یہی ہے کہ سب موجودات کا سلسلہ اس کی قدرت تک منتہی ہو نہ یہ کہ صفت قدامت اور ہستی حقیقی کے بہت سے شریکوں میں بٹی ہوئی ہو اور قطع نظر ان سب دلائل اور براہین کے ہر ایک سلیم الطبع سمجھ سکتا ہے کہ اعلیٰ کام بہ نسبت اَدنیٰ کام کے زیادہ تر کمال پر دلالت کرتا ہے۔ پس جس صورت میں تالیف اجزاء عالم کمال الٰہی میں داخل ہے تو پھر پَیدا کرنا عالَم کا بغیر احتیاج اسباب کے جو کروڑہا درجہ زیادہ تر قدرت پر دلالت کرتا ہے کس قدر اعلیٰ کمال ہوگا پس صغرٰی اس شکل کا بوجہ کامل ثابت ہوُا۔

اور ثبوت کبرٰی کا یعنی اس قضیہ کا کہ ہر ایک کمال ذاتِ باری کو حاصل ہے اس طرح پر ہے کہ اگر بعض کمالات ذاتِ باری کو حاصل نہیں تو اس صورت میں یہ سوال ہوگا کہ محرومی ان کمالات سے بخوشی خاطر ہے یا بہ مجبوری ہے۔ اگر کہو کہ بخوشی خاطر ہے تو یہ جھُوٹ ہے کیونکہ کوئی شخص اپنی خوشی سے اپنے کمال میں نقص روا نہیں رکھتا اور نیز جب کہ یہ صفت قدیم سے خدا کی ذات سے قطعاً مفقود ہے تو خوشئ خاطر کہاں رہی اور اگر کہو کہ مجبوری سے تو وجود کسی اَور قاسر کا ماننا پڑا جس نے خدا کو مجبور کیا اور نفاذ اختیارات خدائی سے اُس کو روکا یا یہ فرض کرنا پڑا کہ وہ قاسر اس کا اپنا ہی ضعف اور ناتوانی ہے کوئی خارجی قاسر نہیں۔ بہرحال وہ مجبور ٹھہرا تو اس صورت میں وہ خدائی کے لائق نہ رہا۔ پس بالضرورت اس سے ثابت ہوُا کہ خداوند تعالیٰ داغ مجبوری سے کہ بطلان الوہیت کو مستلزم ہے پاک اور منزّہ ہے اور صفت کاملہ خالقیت اور عدم سے پَیدا کرنے کی اُس کو حاصل ہے اور یہی مطلب تھا۔ (پُرانی تحریریں صفحہ ۱۱ تا ۱۳)

○

سُورَةُ المُمْتَحِنَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ

اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫

كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى

تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ

اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَ

اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ○

چاہیئے کہ تم ہر وقت اپنا کام دیکھ کر کیا کرو۔ اگر کوئی چُوڑھا اچھا کام کرے گا تو وہ بخشا جاوے گا اور اگر سیّد ہو کر کوئی بُرا کام کرے گا تو وہ دوزخ میں ڈالا جاوے گا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے واسطے دعا کی وہ منظور نہ ہوئی۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام قیامت کو کہیں گے کہ اے اللہ تعالیٰ میں اپنے باپ کو اِس حالت میں دیکھ نہیں سکتا مگر اس کو پھر بھی رسّہ ڈال کر دوزخ کی طرف گھسیٹ کر ذلّت کے ساتھ لے جاویں گے (یہ عمل نہ ہونے کی وجہ سے ہے کہ پیغمبر کی سفارش بھی کارگر نہ ہوگی) کیونکہ اس نے تکبّر کیا تھا۔

پیغمبروں نے غریبی کو اختیار کیا۔ جو شخص غریبی کو اختیار کرے گا وہ سب سے اچھا رہے گا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۷ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۱۰)

خداوند تعالیٰ مسلمانوں کو حکم کرتا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کے نمونے پر چلیں اور آپؐ کے ہر قول اور فعل کی پیروی کریں چنانچہ فرماتا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ[1] پھر فرماتا ہے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[2] اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال عیب سے خالی نہ تھے تو کیوں ہم پر واجب کیا کہ ہم آپؐ کے نمونے پر چلیں جب خدا نے ابراہیم علیہ السّلام کے نمونے پر چلنے کی تاکید فرمائی تو ساتھ ایک استثناء لگا دیا مگر آنحضرتؐ کی صورت میں کوئی استثناء نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال غلطی سے پاک تھے۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۲۴۵، ۲۴۶)

۹ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○

نصاریٰ وغیرہ سے جو خدا نے محبت کرنے سے ممانعت فرمائی تو اس سے یہ نہ سمجھو کہ وہ نیکی اور احسان اور ہمدردی کرنے سے تمہیں منع کرتا ہے نہیں بلکہ جن لوگوں نے تمہارے قتل کرنے کے لئے لڑائیاں نہیں کیں اور تمہیں تمہارے وطنوں سے نہیں نکالا وہ اگرچہ عیسائی ہوں یا یہودی ہوں بے شک ان پر احسان کرو۔ ان سے ہمدردی کرو۔ انصاف کرو کہ خدا ایسے لوگوں سے پیار کرتا ہے۔ (نور القرآن نمبر ۲ صفحہ ۳۸)

قرآن شریف نے گو اس امر کی بڑی وضاحت کر دی ہے کہ جنہوں نے مقابلہ کیا ان کا مقابلہ تلوار سے کیا جاوے اور جو لوگ الگ رہتے ہیں اور انہوں نے ایسی جنگوں میں کوئی حصّہ نہیں لیا ان سے تم بھی جنگ مت کرو بلکہ ان سے بے شک احسان کرو اور ان کے معاملات میں عدل کرو۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۲ مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۸)

---

[1] سورۃ الاحزاب : ۲۲ [2] سورۃ آل عمران : ۳۲

۳۔ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○

خدا نے جو تمہیں ہمدردی اور دوستی سے منع کیا ہے تو صرف ان لوگوں کی نسبت جنہوں نے دینی لڑائیاں تم سے کیں اور تمہیں تمہارے وطنوں سے نکالا اور بس نہ کیا جب تک باہم مل کر تمہیں نہ نکال دیا سو اُن کی دوستی حرام ہے کیونکہ یہ دین کو مٹانا چاہتے ہیں۔ اِس جگہ یاد رکھنے کے لائق ایک نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ تَوَلِّی عربی زبان میں دوستی کو کہتے ہیں جس کا دوسرا نام مودّت ہے اور اصل حقیقت دوستی اور مودّت کی خیر خواہی اور ہمدردی ہے۔ سو مومن نصاریٰ اور یہود اور ہنود سے دوستی اور ہمدردی اور خیر خواہی کرسکتا ہے۔ احسان کرسکتا ہے مگر ان سے محبت نہیں کرسکتا۔ یہ ایک باریک فرق ہے اس کو خوب یاد رکھو۔

(نور القرآن ۲ صفحہ ۳۸)

تَوَلِّی کی تَا اِس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تَوَلِّی میں ایک تکلف ہے جو مغائرت پر دلالت کرتا ہے مگر محبت میں ایک ذرّہ مغائرت باقی نہیں رہتی۔ (نور القرآن ۲ صفحہ ۳۸ حاشیہ)

○

سُورۃ الصّف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ۝ کَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰہِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ۝

بہت سے مولوی اور علماء کہلا کر ممبروں پر چڑھ کر اپنے تئیں نائب الرّسول اور وارث الانبیاء قرار دیکر وعظ کرتے پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تکبّر نہ کرو۔ بدکاریوں سے بچو مگر جو کہ ان کے اعمال ہیں اور جو کرتوتیں وہ خود کرتے ہیں اُن کا اندازہ اس سے کرلو کہ ان باتوں کا اثر تمہارے دلوں پر کہاں تک ہے۔ اگر اِس قسم کے لوگ عملی طاقت بھی رکھتے اور کہنے سے پہلے خود کرتے تو قرآن میں لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ کہنے کی کیا ضرورت پڑتی؟ یہ آیت ہی بتلاتی ہے کہ دُنیا میں کہہ کر خود نہ کرنے والے بھی موجود تھے اور ہیں اور رہوں گے۔

تم میری بات سُن رکھو اور خوب یاد کرلو کہ انسان کی گفتگو سچے دل سے نہ ہو اور عملی طاقت اُس میں نہ ہو تو وہ اثر پذیر نہیں ہوتی۔ اسی سے تو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی صداقت ثابت ہوتی ہے کیونکہ جو کامیابی اور تاثیر فی القلوب ان کے حصہ میں آئی اُس کی کوئی نظیر بنی آدم کی تاریخ میں نہیں اور یہ سب اِسلئے ہوا کہ آپ کے قول اور فعل میں پوری مطابقت تھی۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۷۳، ۷۴)

یاد رکھو کہ صرف لفاظی اور لسانی کام نہیں آسکتی جب تک عمل نہ ہو اور باتیں عنداللہ کچھ بھی وقعت نہیں رکھتیں چنانچہ خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے کَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰہِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۸۰)

مومن کو دورنگی اختیار نہیں کرنی چاہیئے یہ بُزدلی اور نفاق اس سے ہمیشہ دُور رہتا ہے۔ ہمیشہ اپنے قول

اور فعل کو درست رکھو اور ان میں مطابقت دکھاؤ جیسا کہ صحابہؓ نے اپنی زندگیوں میں دکھایا۔ تم بھی ان کے نقش قدم پر چل کر اپنے صدق اور وفا کے نمونے دکھاؤ۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۶ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

مَیں دیکھتا ہوں کہ اِس وقت قریباً علماء کی یہی حالت ہو رہی ہے لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ کے مصداق اکثر پائے جاتے ہیں اور قرآن شریف پر بگفتن ایمان رہ گیا ہے ورنہ قرآن شریف کی حکومت سے لوگ بکلّی نکلے ہوئے ہیں۔ احادیث سے پایا جاتا ہے کہ ایک وقت ایسا آنے والا تھا کہ قرآن شریف آسمان پر اُٹھ جائے گا۔ مَیں یقیناً جانتا ہوں کہ یہ وہی وقت آ گیا ہے حقیقی طہارت اور تقوٰی جو قرآن شریف پر عمل کرنے سے پیدا ہوتا ہے آج کہاں ہے ؟ اگر ایسی حالت نہ ہو گئی ہوتی تو خدا تعالیٰ اِس سلسلہ کو کیوں قائم کرتا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۲۰ مورخہ ۱۰ جون ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

اِسلام کا دعوٰی کرنا اور میرے ہاتھ پر بیعتِ توبہ کرنا کوئی آسان کام نہیں کیونکہ جب تک ایمان کے ساتھ عمل نہ ہو کچھ نہیں مُنہ سے دعوٰی کرنا اور عمل سے اس کا ثبوت نہ دینا خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکاتا ہے اور اس آیت کا مصداق ہو جاتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ○ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ○ یعنی اے ایمان والو تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم نہیں کرتے ہو۔ یہ امر کہ تم وہ باتیں کہو جن پر تم عمل نہیں کرتے خدا تعالیٰ کے نزدیک بڑے غضب کا موجب ہیں۔

پس وہ انسان جس کو اسلام کا دعوٰی ہے یا جو میرے ہاتھ پر توبہ کرتا ہے اگر وہ اپنے آپ کو اس دعوٰی کے موافق نہیں بناتا اور اس کے اندر کھوٹ رہتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے بڑے غضب کے نیچے آ جاتا ہے اس سے بچنا لازم ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۵)

اصل بات یہ ہے کہ انسان کو اپنی صفائی کرنی چاہیئے۔ صرف زبان سے کہہ دینا کہ مَیں نے بیعت کر لی ہے کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا جب تک عملی طور سے کچھ کر کے نہ دکھلایا جاوے۔ صرف زبان کچھ نہیں بنا سکتی۔ قرآن شریف میں آیا ہے کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ○ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ○ یہ وقت ہے کہ سابقون میں داخل ہو جاؤ یعنی ہر نیکی کے کرنے میں سبقت لے جاؤ۔ اعمال ہی کام آتے ہیں زبانی لاف و گزاف کسی کام کی نہیں۔ دیکھو حضرت فاطمہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ فاطمہ اپنی جان کا خود فکر کر لے مَیں تیرے کسی کام نہیں آسکتا۔ بھلا خدا کا کسی سے رشتہ تو نہیں وہاں یہ نہیں پوچھا جاوے گا کہ تیرا باپ کون ہے بلکہ اعمال کی پُرسش ہو گی۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۶ مورخہ ۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

مَقْت خدا کے غضب کو کہتے ہیں۔ یعنی بڑا غضب اُن پر ہوتا ہے جو اقرار کرتے ہیں اور پھر کرتے نہیں۔ ایسے آدمی پر خدا تعالیٰ کا غضب نازل ہوتا ہے۔ اِس لئے دعائیں کرتے رہو۔ کوئی ثابت قدم نہیں رہ سکتا

جب تک خدا نہ رکھے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

۶ٛ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○

خدا تعالیٰ کسی ملہم کی دعا سے اُس کو ہدایت کرتا ہے جس کے دل پر زیغ اور کجی کا غلبہ نہیں ہوتا ورنہ بموجب فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ہدایت پانے سے محروم رہتا ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۳۱۸ حاشیہ)

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ.... پس جب وہ کج ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں کو کج کر دیا۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۱۳۸)

جبکہ وہ حق سے پھر گئے تو خدا تعالیٰ نے اُن کے دل کو حق کی مناسبت سے دُور ڈال دیا اور آخر کو معاندانہ جوش کے اثروں سے ایک عجیب کایا پلٹ ان میں ظہور میں آئی اور ایسے بگڑے کہ گویا وہ وہ نہ رہے اور رفتہ رفتہ نفسانی مخالفت کے زہر نے اُن کے انوارِ فطرت کو دبا لیا۔ (کتاب البریہ صفحہ ۲۷)

اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے دُوری اختیار کرے اور گندگی سے نکلنے کی کوشش نہ کرے تو پھر خدا تعالےٰ بھی اس کی پرواہ نہیں کرتا جیسے کہ فرمایا فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۱ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

جب انہوں نے کجی اختیار کی تو خدا نے اُن کو کج کر دیا۔ اسی کا نام مُہر ہے لیکن ہمارا خدا ایسا نہیں کہ پھر اس مُہر کو دُور نہ کر سکے چنانچہ اُس نے اگر مُہر لگنے کے اسباب بیان کئے ہیں تو ساتھ ہی وہ اسباب بھی بتلا دیئے ہیں جن سے یہ مُہر اُٹھ جاتی ہے جیسے کہ یہ فرمایا ہے اِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا[ؒ] (البدر جلد ۲ نمبر ۳۴ مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۶۷)

۷ٛ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ

ؒ سورۃ بنی اسرائیل : ۲۶)

اِلَيۡكُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوۡرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ يَّاۡتِىۡ مِنۡۢ بَعۡدِى اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ‌ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ○

غضب کی بات ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ تو اپنی پاک کلام میں حضرت مسیح کی وفات ظاہر کرے اور یہ لوگ اب تک اس کو زندہ سمجھ کر ہزار ہا اور بیشمار فتنے اِسلام کے لئے برپا کردیں اور مسیح کو آسمان کا حیّ وقیوم اور سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین کا مُردہ ٹھہراویں حالانکہ مسیح کی گواہی قرآن کریم میں اس طرح پر لکھی ہے کہ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗۤ اَحْمَدُ یعنی مَیں ایک رسول کی بشارت دیتا ہوں جو میرے بعد یعنی میرے مرنے کے بعد آئے گا اور نام اس کا احمدؐ ہوگا۔ پس اگر مسیح اب تک اس عالمِ جسمانی سے گذر نہیں گیا تو اس سے لازم آتا ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اب تک اِس عالم میں تشریف فرما نہیں ہوئے کیونکہ نص اپنے کُھلے کُھلے الفاظ سے بتلا رہی ہے کہ جب مسیح اس عالمِ جسمانی سے رخصت ہو جائے گا تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عالمِ جسمانی میں تشریف لائیں گے وجہ یہ کہ آیت میں آنے کے مقابل پر جانا بیان کیا گیا ہے اور ضرور ہے کہ آنا اور جانا دونوں ایک ہی رنگ کے ہوں یعنی ایک اُس عالم کی طرف چلا گیا اور ایک اُس عالم کی طرف سے آیا۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۲)

آیت وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗۤ اَحْمَدُ میں یہ اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخر زمانہ میں ایک مظہر ظاہر ہوگا کہ گویا وہ اس کا ایک ہاتھ ہوگا جس کا نام آسمان پر احمد ہوگا اور وہ حضرت مسیح کے رنگ میں جمالی طور پر دین کو پھیلائے گا۔ (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۱ و اربعین ۳ صفحہ ۳۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو بعث ہیں ..... دوسرا بعث احمدی جو جمالی رنگ میں ہے جو ستارہ مُشتری کی تاثیر کے نیچے ہے جس کی نسبت بحوالہ انجیل قرآن شریف میں یہ آیت ہے وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗۤ اَحْمَدُ۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۶)

آپؐ کا ایک اَور نام رکھا گیا وہ احمدؐ ہے چنانچہ حضرت مسیح نے اسی نام کی پیشگوئی کی تھی۔ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗۤ اَحْمَدُ یعنی میرے بعد ایک نبی آئے گا جس کی مَیں بشارت دیتا ہوں اور اس کا نام احمدؐ ہوگا۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ تھا کہ جو اللہ تعالیٰ کی حد سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو۔ اِس لفظ سے صاف پایا جاتا ہے اور سچّی بات بھی یہی ہے کہ کوئی اُسی کی تعریف کرتا ہے جس سے کچھ لیتا ہے اور جس قدر زیادہ لیتا ہے اسی قدر زیادہ تعریف کرتا ہے۔ اگر کسی کو ایک روپیہ دیا جاوے تو وہ اسی قدر تعریف کرے گا اور جس کو ہزار روپیہ دیا

جاوے وہ اسی انداز سے کرے گا۔ غرض اس سے واضح طور پر پایا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے زیادہ خدا کا فضل پایا ہے۔ دراصل اِس نام میں ایک پیشگوئی ہے کہ یہ بہت ہی بڑے فضلوں کا وارث اور مالک ہوگا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

حضرت رسول کریمؐ کا نام احمدؐ وہ ہے جس کا ذکر حضرت مسیحؑ نے کیا۔ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗۤ اَحْمَدُ۔ مِنْۢ بَعْدِی کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ وہ نبی میرے بعد بلا فصل آئے گا یعنی میرے اور اس کے درمیان اَور کوئی نبی نہ ہوگا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۱)

مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗۤ اَحْمَدُ میں بشارت ہے۔ اس کے دو ہی پہلو ہیں یعنی ایک تو آپؐ کا وجود ہی بشارت تھا کیونکہ بنی اسرائیل کے خاندان سے نبوّت کا خاتمہ ہوگیا۔ دوسرے زبان سے بھی بشارت دی یعنی آپؐ کی پیدائش میں بھی بشارت تھی اور زبانی بھی۔ (البدر جلد اوّل نمبر ۱۰ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۵)

۹۔ یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاہِہِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ۝

اِس آیت میں تصریح سے سمجھایا گیا ہے کہ مسیح موعود چودھویں صدی میں پیدا ہوگا کیونکہ اتمامِ نور کے لئے چودھویں رات مقرر ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۳)

یہ لوگ ارادہ کر رہے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے مُنہ کی پھونکوں سے بُجھا دیں اور خدا تو باز نہیں رہے گا جب تک کہ اپنے نور کو پورا نہ کرے اگرچہ کافر لوگ کراہت ہی کریں۔ (نزول المسیح صفحہ ۱)

مخالف لوگ ارادہ کریں گے کہ خدا کے نور کو اپنے مُنہ کی پھونکوں سے بُجھا دیں یعنی بہت سے مکر کام میں لاویں گے مگر خدا اپنے نور کو کمال تک پہنچائے گا اگرچہ کافر لوگ کراہت ہی کریں۔ (نزول المسیح صفحہ ۱۴۸)

مخالف لوگ ارادہ کریں گے کہ نورِ خدا کو اپنے مُنہ کی پھونکوں سے بُجھا دیں مگر خدا اپنے نور کو پُورا کرے گا اگرچہ مُنکر لوگ کراہت ہی کریں۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۳۰)

یہ لوگ اپنے مُنہ کی لاف وگزاف سے بکتے ہیں کہ اس دین کو کبھی کامیابی نہیں ہوگی۔ یہ دین ہمارے ہاتھ سے تباہ ہو جاوے گا۔ لیکن خدا کبھی اِس دین کو ضائع نہیں کرے گا اور نہیں چھوڑے گا جب تک اس کو پُورا نہ کرے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد سوم صفحہ ۵۹، ۶۰)

یہ شریر کافر اپنے مُنہ کی پھونکوں سے نوراللہ کو بُجھانا چاہتے ہیں۔ اللہ اپنے نور کو کامل کرنے والا ہے۔ کافر بُرا مناتے ہیں۔

مُنہ کی پھونکیں کیا ہوتی ہیں؟ یہی کسی نے ٹھگ کہہ دیا۔ کسی نے دکاندار اور کافر وبے دین کہہ دیا۔ غرض یہ لوگ

ایسی باتوں سے چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نور کو بجھا دیں مگر وہ کامیاب نہیں ہوسکتے۔ نور اللہ کو بجھاتے بجھاتے خود ہی جل کر ذلیل ہو جاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

ناعاقبت اندیش نادان دوستوں نے خدا تعالیٰ کے اس سلسلہ کی قدر نہیں کی بلکہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ یہ نور نہ چمکے۔ یہ اس کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ یاد رکھیں کہ خدا تعالیٰ وعدہ کر چکا ہے وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۰ رمئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

۱۰۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝

یہ آیت جسمانی اور سیاستِ ملکی کے طور پر حضرت مسیح کے حق میں پیشگوئی ہے اور جس غلبۂ کاملہ دینِ اسلام کا وعدہ دیا گیا ہے وہ غلبہ مسیح کے ذریعہ سے ظہور میں آئے گا اور جب حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ اس دُنیا میں تشریف لائیں گے تو اُن کے ہاتھ سے دینِ اسلام جمیع آفاق اور اقطار میں پھیل جائے گا لیکن اس عاجز پر ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ خاکسار اپنی غربت اور انکسار اور توکل اور ایثار اور آیات اور انوار کے رُو سے مسیح کی پہلی زندگی کا نمونہ ہے اور اس عاجز کی فطرت اور مسیح کی فطرت باہم نہایت ہی متشابہ واقع ہوئی ہیں گویا ایک ہی جوہر کے دو ٹکڑے یا ایک ہی درخت کے دو پھل ہیں اور بحدّی اتحاد ہے کہ نظرِ کشفی میں نہایت ہی باریک امتیاز ہے اور نیز ظاہری طور پر بھی ایک مشابہت ہے اور وہ یوں کہ مسیح ایک کامل اور عظیم الشان نبی یعنی موسیٰ کا تابع اور خادمِ دین تھا اور اس کی انجیل توریت کی فرع تھی اور یہ عاجز بھی اس جلیل الشان نبی کے احقر خادمین میں سے ہے کہ جو سیّد الرسل اور سب رسولوں کا سرتاج ہے اگر وہ حامد ہیں تو وہ احمد ہے اور اگر وہ محمود ہیں تو وہ محمد ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ سو چونکہ اس عاجز کو حضرت مسیح سے مشابہتِ تامہ ہے اس لئے خداوندِ کریم نے مسیح کی پیشگوئی میں ابتداء سے اس عاجز کو بھی شریک کر رکھا ہے یعنی حضرت مسیح پیشگوئی متذکرہ بالا کا ظاہری اور جسمانی طور پر مصداق ہے اور یہ عاجز رُوحانی اور معقولی طور پر اُس کا محل اور مورد ہے یعنی رُوحانی طور پر دینِ اسلام کا غلبہ جو حججِ قاطعہ اور براہینِ ساطعہ پر موقوف ہے اس عاجز کے ذریعہ سے مقدر ہے گو اس کی زندگی میں یا بعد وفات ہو۔ اور اگرچہ دینِ اسلام اپنے دلائلِ حقّہ کی رُو سے قدیم سے غالب چلا آیا ہے اور ابتداء سے اس کے مخالف رُسوا اور ذلیل ہوتے چلے آئے ہیں لیکن اس غلبہ کا مختلف فرقوں اور قوموں پر ظاہر ہونا ایک ایسے زمانہ کے آنے پر موقوف تھا کہ جو باعث کُھل جانے راہوں کے تمام دُنیا کو ممالکِ متحدہ کی طرح بناتا ہو اور ایک ہی قوم کے حکم میں داخل کرتا ہو اور تمام اسبابِ اشاعتِ تعلیم اور تمام وسائل اشاعتِ دین کے بتمامتر سہولت و

آسانی پیش کرتا ہو اور اندرونی اور بیرونی طور پر تعلیم حقانی کے لئے نہایت مناسب اور موزوں ہو۔ سو اب وہی زمانہ ہے کیونکہ بباعث کُھل جانے راستوں اور مطلع ہونے ایک قوم کے دوسری قوم سے اور ایک ملک کے دوسرے ملک سے سامان تبلیغ کا بوجہ احسن میسّر آگیا ہے اور بوجہ انتظام ڈاک و ریل و تار و جہاز و وسائل متفرقہ اخبار وغیرہ کے دینی تالیفات کی اشاعت کے لئے بہت سی آسانیاں ہوگئی ہیں۔ غرض بلاشبہ اب وہ وقت پہنچ گیا ہے کہ جس میں تمام دُنیا ایک ہی ملک کا حکم پیدا کرتی جاتی ہے اور بباعث شائع اور رائج ہونے کئی زبانوں کے تفہیم تفہّم کے بہت سے ذریعے نکل آئے ہیں اور غیریّت اور اجنبیت کی مشکلات سے بہت سی سبکدوشی ہوگئی ہے اور بوجہ میل ملاپ دائمی اور اختلاط شبا روزی کی وحشت اور نفرت بھی کہ جو بالطبع ایک قوم کو دوسری قوم سے تھی بہت گھٹ گئی ہے چنانچہ اب ہندو بھی جن کی دُنیا ہمیشہ ہمالہ پہاڑ کے اندر ہی اندر تھی اور جن کو سمندر کا سفر کرنا مذہب سے خارج کر دیتا تھا لنڈن اور امریکہ کی سَیر کر آتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ اس زمانہ میں ہر ایک ذریعہ اشاعتِ دین کا اپنی وسعتِ تامہ کو پہنچ گیا ہے اور گو دُنیا پر بہت سی ظلمت اور تاریکی چھا رہی ہے مگر پھر بھی ضلالت کا دَورہ اختتام پر پہنچا ہؤا معلوم ہوتا ہے اور گمراہی کا کمال رُو بزوال نظر آتا ہے کچھ خدا کی طرف سے ہی طبائع سلیمہ صراطِ مستقیم کی تلاش میں لگ گئے ہیں اور نیک اور پاکیزہ فطرتیں طریقہ حقّہ کے مناسبِ حال ہوتی جاتی ہیں اور توحید کے قدرتی جوش نے متّحد دلوں کو وحدانیت کے چشمۂ صافی کی طرف مائل کر دیا ہے اور مخلوق پرستی کی عمارت کا بودہ ہونا دانشمند لوگوں پر کُھلتا جاتا ہے اور مصنوعی خدا پھر دوبارہ عقلمندوں کی نظر میں انسانیت کا جامہ پہنتے جاتے ہیں اور بایں ہمہ آسمانی مدد دینِ حق کی تائید کیلئے ایسے جوش میں ہے کہ وہ نشان اور خوارق جن کی سماعت سے عاجز اور ناقص خدا بنائے گئے تھے وہ اب حضرت سیّد الرسل کے اَدنیٰ خادموں اور چاکروں سے مشہود اور محسوس ہو رہے ہیں اور جو پہلے زمانہ کے بعض نبی صرف اپنے حواریوں کو چُھپ چُھپ کر کچھ نشان دکھلاتے تھے اب وہ نشان حضرت سیّد الرسل کے احقر توابع سے دشمنوں کے رُوبرو ظاہر ہوتے ہیں اور انہیں دشمنوں کی شہادتوں سے حقیقتِ اسلام کا آفتاب تمام عالم کے لئے طلوع کرتا جاتا ہے ماسوا اس کے یہ زمانہ اشاعتِ دین کے لئے ایسا مددگار ہے کہ جو امر پہلے زمانوں میں سَو سال تک دُنیا میں شائع نہیں ہوسکتا تھا اب اِس زمانہ میں وہ صرف ایک سال میں تمام ملکوں میں پھیل سکتا ہے اِس لئے اِسلامی ہدایت اور ربّانی نشانوں کا نقّارہ بجانے کے لئے اس قدر اس زمانہ میں طاقت و قوّت پائی جاتی ہے جو کسی زمانہ میں اس کی نظیر نہیں پائی جاتی۔ صدہا وسائل جیسے ریل و تار و اخبار وغیرہ اسی خدمت کے لئے ہر وقت طیّار ہیں کہ تا ایک ملک کے واقعات دوسرے ملک میں پہنچاویں۔ سو بلاشبہ معقولی اور رُوحانی طور پر دینِ اسلام کے دلائلِ حقیّت کا تمام دُنیا میں پھیلنا ایسے ہی زمانہ پر موقوف تھا اور یہی باسامان زمانہ اس مہمانِ عزیز کی خدمت کرنے کیلئے مِن کل الوجوہ اسباب رکھتا ہے۔ پس خداوند تعالیٰ نے اِس احقر عباد کو اِس زمانہ میں پیدا کرکے اور صدہا نشان آسمانی

اور خوارقِ غیبی اور معارف وحقائق مرحمت فرماکر اور صدہا دلائل عقلیہ قطعیہ پر علم بخش کر یہ ارادہ فرمایا ہے کہ تا تعلیماتِ حقّہ قرآنی کو ہر قوم اور ہر ملک میں شائع اور رائج فرماوے اور اپنی حجّت اُن پر پوری کرے اور اسی ارادہ کی وجہ سے خداوندِ کریم نے اِس عاجز کو یہ توفیق دی کہ اتماماً للحجۃ دس ہزار روپیہ کا اِشتہار کتاب کے ساتھ شامل کیا گیا اور دشمنوں اور مخالفوں کی شہادت سے آسمانی نشانی پیش کی گئی اور ان کے معارضہ اور مقابلہ کے لئے تمام مخالفین کو مخاطب کیا گیا تا کوئی دقیقہ اتمامِ حجّت کا باقی نہ رہے اور ہر ایک مخالف اپنے مغلوب اور لاجواب ہونے کا آپ گواہ ہو جائے۔ غرض خداوندِ کریم نے جو اسباب اور وسائل اشاعتِ دین کے اور دلائل اور براہین اتمامِ حُجّت کے محض اپنے فضل اور کرم سے اِس عاجز کو عطا فرمائے ہیں وہ اُممِ سابقہ میں سے آج تک کسی کو عطا نہیں فرمائے۔ اور جو کچھ اِس بارے میں توفیقاتِ غیبیہ اِس عاجز کو دی گئی ہیں وہ اُن میں سے کسی کو نہیں دی گئیں۔ وَ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ سو چونکہ خداوندِ کریم نے اسبابِ خاصّہ سے اِس عاجز کو مخصوص کیا ہے اور ایسے زمانہ میں اِس خاکسار کو پیدا کیا ہے کہ جو اتمامِ خدمتِ تبلیغ کے لئے نہایت معین و مددگار ہے اِس لئے اُس نے اپنے تفضلات وعنایات سے یہ خوشخبری بھی دی ہے کہ روزِ اَزل سے یہی قرار یافتہ ہے کہ آیتِ کریمہ متذکرہ بالا اور نیز آیت وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ کا رُوحانی طور پر مصداق یہ عاجز ہے اور خدائے تعالیٰ ان دلائل و براہین کو اُن سب باتوں کو کہ جو اِس عاجز نے مخالفوں کے لئے لکھے ہیں خود مخالفوں تک پہنچا دے گا اور اُن کا عاجز اور لاجواب اور مغلوب ہونا دُنیا میں ظاہر کر کے مفہوم آیت متذکرہ بالا کا پورا کر دے گا۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۴۹۹ تا ۵۰۲ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

قرآن شریف نے جو مسیح کے نکلنے کی ۱۴۰۰ برس تک مدّت ٹھہرائی ہے بہت سے اَولیاء بھی اپنے مکاشفات کی رُو سے اس مدّت کو مانتے ہیں اور آیت وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ[1] جس کے بحساب جمل ۱۲۷۴ عدد ہیں اسلامی چاند کی سلخ کی راتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں نئے چاند کے نکلنے کی اشارت چھپی ہوئی ہے جو غلام احمد قادیانی کے عددوں میں بحساب جمل پائی جاتی ہے اور یہ آیت کہ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ درحقیقت اسی مسیح ابنِ مریم کے زمانہ سے متعلق ہے کیونکہ تمام ادیان پر رُوحانی غلبہ بجز اِس زمانہ کے کسی اَور زمانہ میں ہرگز ممکن نہیں تھا۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۷۵)

جس قدر حق کے مقابل پر اب معقول پسندوں کے دلوں میں اَوہامِ باطلہ پیدا ہوتے ہیں اور عقلی اعتراضات کا ایک طوفان برپا ہوا ہے اس کی نظیر کسی زمانہ میں پہلے زمانوں میں سے نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا ابتداء سے اِس امر کو

---

[1] سورۃ المومنون: ۱۹

بھی کہ ان اعتراضات کا براہین شافیہ و کافیہ سے بحوالہ آیات قرآن مجید بکلی استیصال کر کے تمام ادیانِ باطلہ پر فوقیت ظاہر کر دی جائے اِسی زمانہ پر چھوڑا گیا تھا کیونکہ پیش از ظہور مفاسد ان مفاسد کی اصلاح کا تذکرہ محض بے محل تھا۔ اِسی وجہ سے حکیم مطلق نے ان حقائق اور معارف کو اپنی کلامِ پاک میں مخفی رکھا اور کسی پر ظاہر نہ کیا جب تک کہ اُن کے اظہار کا وقت آ گیا۔ ہاں اس وقت کی اس نے پہلے سے اپنی کتاب عزیز میں خبر دے رکھی تھی جو آیت هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی میں صاف اور کھلے طور پر مرقوم ہے سو اب وہی وقت ہے اور ہر یک شخص رُوحانی روشنی کا محتاج ہو رہا ہے۔ سو خدائے تعالیٰ نے اس روشنی کو دے کر ایک شخص کو دُنیا میں بھیجا۔ وہ کون ہے ؟ یہی ہے جو بول رہا ہے۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۷۶۸، ۷۶۹)

الہام میں خدا تعالیٰ نے میرا نام عیسٰی رکھا اور مجھے اس قرآنی پیشگوئی (هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ) کا مصداق ٹھہرایا جو حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے لئے خاص تھی اور آنے والے مسیح موعود کے تمام صفات مجھ میں قائم کئے۔ (ایّام الصّلح صفحہ ۴۱)

احادیثِ نبویہ میں متواتر آ چکا ہے کہ مسیح آنے والا صاحب المنارہ ہوگا یعنی اس کے زمانہ میں اِسلامی سچائی بلندی کے انتہاء تک پہنچ جائے گی جو اس منارہ کی مانند ہے جو نہایت اُونچا ہو اور دینِ اسلام سب دینوں پر غالب آ جائے گا۔ اُسی کی مانند جیسا کہ کوئی شخص جب ایک بلند منار پر اذان دیتا ہے تو وہ آواز تمام آوازوں پر غالب آ جاتی ہے سو مقدر تھا کہ ایسا ہی مسیح کے دنوں میں ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ۔ یہ آیت مسیح موعود کے حق میں ہے اور اسلامی حُجّت کی وہ بلند آواز جس کے نیچے تمام آوازیں دَب جائیں وہ ازل سے مسیح کے لئے خاص کی گئی ہے اور قدیم سے مسیح موعود کا قدم اس بلند مینار پر قرار دیا گیا ہے جس سے بڑھ کر اور کوئی عمارت اُونچی نہیں۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۸)

اِنَّ اِظْهَارَ الدِّیْنِ عَلٰی اَدْیَانٍ اُخْرٰی۔ لَا یَتَحَقَّقُ اِلَّا بِالْبَیِّنَةِ الْکُبْرٰی وَالْحُجَجِ الْقَاطِعَةِ الْعُظْمٰی وَکَثْرَةِ اَهْلِ الصَّلَاحِ وَالتَّقْوٰی۔ وَلَا شَکَّ اَنَّ الدِّیْنَ الَّذِیْ یُعْطِی الدَّلَائِلَ الْمُوْصِلَةَ اِلَی الْیَقِیْنِ۔ وَیُزَکِّیْ

ترجمہ از مرتّب :۔ اظہارِ دین دوسرے ادیان پر صرف بیّنہ کبریٰ اور حُجج قاطعہ عظمٰی اور اہلِ صلاح اور تقوٰے کی کثرت سے ہی متحقق ہو سکتا ہے۔ اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ جو دین یقین تک پہنچانے والے دلائل عطا کرتا ہے اور نفوس کو صحیح طور پر پاک کرتا ہے اور ان کو شیطانِ لعین

النُّفُوْسَ حَقَّ التَّزْكِيَةِ وَ يُنَجِّيْهِمْ مِنْ اَيْدِي الشَّيْطَانِ اللَّعِيْنِ هُوَالدِّيْنُ الظَّاهِرُ الْغَالِبُ عَلَى الْاَدْيَانِ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْعَثُ الْاَمْوَاتَ مِنْ قُبُوْرِ الشَّكِّ وَالْعِصْيَانِ ـ وَيُحْيِيْهِمْ عِلْمًا وَعَمَلًا بِفَضْلِ اللّٰهِ الْمَنَّانِ ـ وَكَانَ اللّٰهُ قَدْ قَدَّرَ اَنَّ دِيْنَهٗ لَا يَظْهَرُ بِظُهُوْرٍ تَامٍّ عَلَى الْاَدْيَانِ كُلِّهَا وَلَا يُرْزَقُ اَكْثَرُ الْقُلُوْبِ دَلَائِلَ الْحَقِّ وَلَا يُعْطٰى تَقْوَى الْبَاطِنِ لِاَكْثَرِهَا اِلَّا فِيْ زَمَانِ الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ وَالْمَهْدِي الْمَعْهُوْدِ ـ وَاَمَّا الْاَزْمِنَةُ الَّتِيْ هِيَ قَبْلَهٗ فَلَا تَعُمُّ فِيْهَا التَّقْوٰى وَلَا الدِّرَايَةُ بَلْ يَكْثُرُ الْفِسْقُ وَالْغَوَايَةُ ـ (حاشیہ متعلقہ خطبہ الہامیہ صفحہ خ ـ د)

مسیح موعود اسلام کے قمر کا متمّم نور ہے اِس لئے اس کی تجدید چاند کی چودھویں رات سے مشابہت رکھتی ہے اسی کی طرف اشارہ ہے اِس آیت میں کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کیونکہ اظہارِ تام اور اتمامِ نور ایک ہی چیز ہے اور یہ قول کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الْاَدْيَانِ كُلَّ الْاِظْهَارِ مساوی اس قول سے ہے کہ لِيُتِمَّ نُوْرَهٗ كُلَّ الْاِتْمَامِ۔
(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۳)

مسیح موعود کو چودھویں صدی کے سر پر پیدا کرنا اس طرف اشارہ تھا کہ اس کے وقت میں اسلامی معارف اور برکات کمال تک پہنچ جائیں گی جیسا کہ آیت لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ میں اِسی کمالِ تام کی طرف اشارہ ہے۔
(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۷، حاشیہ)

قرآن شریف جو ذو الوجوہ ہے اُس کا محاورہ اسی طرز پر واقع ہو گیا ہے کہ ایک آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مراد اور مصداق ہوتے ہیں اور اس آیت کا مصداق مسیح موعود بھی ہوتا ہے جیسا کہ آیت هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى سے ظاہر ہے اور رسول سے مراد اِس جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں اور مسیح بھی مراد ہے۔
(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۷۶)

ضرور تھا کہ جیسا کہ تکمیل ہدایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ہوئی ایسا ہی تکمیل اشاعتِ ہدایت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہو کیونکہ یہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبی کام تھے لیکن

کے ہاتھوں سے نجات دیتا ہے وہی دین دوسرے ادیان پر غالب ہوتا ہے اور وہی ہے جو مُردوں کو شکوک اور نافرمانی کی قبروں سے اُٹھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے انہیں علمی اور عملی طور پر زندہ کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مقدر کر دیا ہے کہ اس کا دین دوسرے ادیان پر پوری طرح غالب نہیں ہوگا اور اکثر قلوب دلائل حقّہ نہیں دئیے جائیں گے اور نہ ان میں سے اکثر کو باطن کا تقویٰ عطا کیا جائے گا مگر مسیح موعود اور مہدی معہود کے زمانہ میں۔ اس سے پہلے زمانوں میں تقویٰ اور درایت عام نہیں تھا بلکہ فسق اور گمراہی زیادہ تھی۔ (حاشیہ متعلقہ خطبہ الہامیہ صفحہ خ ـ د)

سُنّت اللہ کے لحاظ سے اس قدر خلود آپ کے لئے غیر ممکن تھا کہ آپ اُس آخری زمانہ کو پاتے اور نیز ایسا خلود شرک کے پھیلنے کا ایک ذریعہ تھا اِس لئے خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خدمتِ منصبی کو ایک ایسے اُمّتی کے ہاتھ سے پورا کیا کہ جو اپنی خُو اور روحانیّت کے رُو سے گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کا ایک ٹکڑا تھا یا یُوں کہو کہ وہی تھا اور آسمان پر ظلّی طور پر آپ کے نام کا شریک تھا اور ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ تکمیل ہدایت کا چھٹا دن تھا یعنی جمعہ۔ اِس لئے رعایت تناسب کے لحاظ سے تکمیل اشاعت ہدایت کا دن بھی چھٹا دن ہی مقرر کیا گیا یعنی آخر الف ششم جو خدا کے نزدیک دُنیا کا چھٹا دن ہے جیسا کہ اس وعدہ کی طرف آیت لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ اشارہ فرما رہی ہے اور اس چھٹے دن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خُو اور رنگ پر ایک شخص جو مظہر تجلّیاتِ احمدیہ اور محمدیہ تھا مبعوث فرمایا گیا تا تکمیل ہدایت فرقانی اس مظہرِ تام کے ذریعہ سے ہو جائے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۹)

خدا تعالیٰ قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو منصب قائم کرتا ہے (۱) ایک کامل کتاب کو پیش کرنے والا جیسا کہ فرمایا کہ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ[1] (۲) دوسری تمام دُنیا میں اِس کتاب کی اشاعت کرنے والا جیسا کہ فرماتا ہے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ اور تکمیلِ ہدایت کے لئے خدا نے چھٹا دن اختیار فرمایا۔ اِس لئے یہ پہلی سنّت اللہ ہمیں سمجھاتی ہے کہ تکمیل اشاعت ہدایت کا دن بھی چھٹا ہی ہے اور ہزار ششم ہے اور علمائے کرام اور تمام اکابر ملّتِ اسلام قبول کر چکے ہیں کہ تکمیلِ اشاعت مسیح موعود کے ذریعہ سے ہوگی اور اب ثابت ہوا کہ تکمیل اشاعت ہزار ششم میں ہوگی اِس لئے نتیجہ نکلا کہ مسیح موعود ہزار ششم میں مبعوث ہوگا۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۰ حاشیہ)

وہ خدا جس نے اپنے فرستادہ کو بھیجا اُس نے دو امر کے ساتھ اُسے بھیجا ہے۔ ایک تو یہ کہ اُس کو نعمتِ ہدایت سے مشرّف فرمایا ہے یعنی اپنی راہ کی شناخت کے لئے رُوحانی آنکھیں اس کو عطا کی ہیں اور علمِ لدنی سے ممتاز فرمایا ہے اور کشف اور الہام سے اس کے دِل کو روشن کیا ہے اور اس طرح پر الٰہی معرفت اور محبّت اور عبادت کا جو اس پر حق تھا اس حق کی بجا آوری کے لئے آپ اس کی تائید کی ہے اور اس لئے اس کا نام مہدی رکھا۔ دوسرا امر جس کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے وہ دین الحق کے ساتھ رُوحانی بیماروں کو اچھا کرنا ہے یعنی شریعت کے صدہا مشکلات اور معضلات حل کر کے دلوں سے شبہات کو دُور کرنا ہے۔ پس اِس لحاظ سے اس کا نام عیسیٰ رکھا ہے یعنی بیماروں کو چنگا کرنے والا۔ غرض اِس آیت شریف میں جو دو فقرے موجود ہیں ایک بِالْهُدٰى اور دوسرے

---

[1] سُورۃ البیّنۃ : ۳،۴

دین الحق۔ اِن میں سے پہلا فقرہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ فرستادہ مہدی ہے اور خدا کے ہاتھ سے صاف ہوا ہے اور صرف خدا اس کا معلّم ہے اور دوسرا فقرہ یعنی دین الحق ظاہر کر رہا ہے کہ وہ فرستادہ عیسٰی ہے اور بیماروں کو صاف کرنے کے لئے اور ان کو ان کی بیماریوں پر متنبہ کرنے کے لئے علم دیا گیا ہے اور دین الحق عطا کیا گیا ہے تا وہ ہر ایک مذہب کے بیمار کو قائل کر سکے اور پھر اچھا کر سکے اور اسلامی شفاخانہ کی طرف رغبت دے سکے کیونکہ جبکہ اس کو یہ خدمت سپرد ہے کہ وہ اسلام کی خوبی اور فوقیت ہر ایک پہلو سے تمام مذاہب پر ثابت کر دے تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ علمِ محاسن وعیوب مذاہب اس کو دیا جائے اور اقامت حُجج اور افحام خصم میں ایک ملکہ خارق عادت اس کو عطا ہو اور ہر ایک پابندِ مذہب کو اس کے قبائح پر متنبہ کر سکے اور ہر یک پہلو سے اسلام کی خوبی ثابت کر سکے اور ہر ایک طور سے رُوحانی بیماروں کا علاج کر سکے۔ غرض آنے والے مصلح کے لئے جو خاتم المصلحین ہے دو جوہر عطا کئے گئے ہیں ایک علم الہُدٰی جو مہدی کے اِسم کی طرف اشارہ ہے جو مظہر صفتِ محمدیت ہے یعنی باوجود اُمّیت کے علم دیا جانا اور دوسرے تعلیم دین الحق جو انفاس شفا بخش کی طرف اشارہ ہے یعنی رُوحانی بیماریوں کے دُور کرنے کے لئے اور اتمامِ حُجّت کے لئے ہر ایک پہلو سے طاقت عطا ہونا۔ اور صفت علم الہُدٰی اس فضل پر دلالت کرتی ہے جو بغیر انسانی واسطہ کے خدا تعالیٰ کی طرف سے ملا ہو اور صفت علم دین الحق افادہ اور تسکینِ قلوب اور رُوحانی علاج پر دلالت کرتی ہے۔ (اربعین نمبر ۲ صفحہ ۹، ۱۰)

علوم اور معارف بھی جمالی طرز میں داخل ہیں اور قرآن شریف کی آیت لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ میں وعدہ تھا کہ یہ علوم اور معارف مسیح موعود کو اکمل اور اتم طور پر دئے جائیں گے کیونکہ تمام دینوں پر غالب ہونے کا ذریعہ علومِ حقّہ اور معارفِ صادقہ اور دلائل بیّنہ اور آیاتِ قاہرہ ہیں اور غلبہ دین کا انہیں پر موقوف ہے۔ (اربعین نمبر ۴ صفحہ ۱۴ حاشیہ)

تخمیناً عرصہ بیس سال کا گذرا ہے کہ مجھ کو اِس قرآنی آیت کا اِلہام ہوا تھا اور وہ یہ ہے ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ (وہ خدا جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا وہ اپنے دین کو تمام دینوں پر غالب کرے) اور مجھ کو اِس الہام کے یہ معنے سمجھائے گئے تھے کہ مَیں خدا تعالیٰ کی طرف سے اِس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تا میرے ہاتھ سے خدا تعالیٰ اسلام کو تمام دینوں پر غالب کرے۔ اور اِس جگہ یاد رہے کہ یہ قرآن شریف میں ایک عظیم الشان پیشگوئی ہے جس کی نسبت علماء محققین کا اِتفاق ہے کہ یہ مسیح موعود کے ہاتھ پر پوری ہو گی۔ سو جس قدر اَولیاء اور ابدال مجھ سے پہلے گذر گئے ہیں کسی نے ان میں سے اپنے تئیں اِس پیشگوئی کا مصداق نہیں ٹھہرایا اور نہ یہ دعویٰ کیا کہ اِس آیت مذکورہ بالا کا مجھ کو اپنے حق میں الہام ہوا ہے لیکن جب میرا وقت آیا تو مجھ کو یہ الہام ہوا اور مجھ کو

بتلایا گیا کہ اِس آیت کا مصداق تُو ہے اور تیرے ہی ہاتھ سے اور تیرے ہی زمانہ میں دینِ اسلام کی فوقیت دوسرے دینوں پر ثابت ہوگی۔ (تریاق القلوب صفحہ ۴۷)

جیساکہ خدا تعالیٰ نے مسیح موعود کی یہ علامت قرآن شریف میں بیان فرمائی تھی کہ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وہ علامت میرے ہاتھ سے پوری ہوگئی۔ (تریاق القلوب صفحہ ۵۳)

یہ بات ظاہر ہے کہ زندہ مذہب وہی مذہب ہے جو آسمانی نشان ساتھ رکھتا ہو اور کامل امتیاز کا نور اس کے سر پر چمکتا ہو۔ سو وہ اسلام ہے۔ کیا عیسائیوں میں یا سکھوں میں یا ہندوؤں میں کوئی ایسا ہے کہ اس میں میرا مقابلہ کر سکے؟ سو میری سچائی کے لئے یہ کافی حجت ہے کہ میرے مقابل پر کسی قدم کو قرار نہیں۔ اب جس طرح چاہو اپنی تسلّی کر لو کہ میرے ظہور سے وہ پیشگوئی پوری ہوگئی جو براہینِ احمدیہ میں قرآنی منشاء کے موافق تھی اور وہ یہ ہے هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ۔

(تریاق القلوب صفحہ ۵۴)

مجھے بتلایا گیا تھا کہ تیری خبر قرآن اور حدیث میں موجود ہے اور تُو ہی اِس آیت کا مصداق ہے کہ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ۔

(اعجاز احمدی ضمیمہ نزول المسیح صفحہ ۷)

خدا وہ خدا ہے جس نے اپنے رسول کو اِس لئے بھیجا کہ تا دینِ اسلام کو سب دینوں پر غالب کر دے۔ یہ بھی مسیح موعود کے زمانہ کی طرف اشارہ ہے۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۴۱)

وہ خدا جس نے اپنے رسول کو ہدایت کے ساتھ اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تا وہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کرے۔ (جنگِ مقدّس صفحہ ۴)

جب تم دیکھو کہ یاجوج اور ماجوج زمین پر غالب ہو گئے تو سمجھو کہ وعدہ سچّا مذہب حق کے پھیلنے کا نزدیک آگیا اور وہ وعدہ یہ ہے هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ۔

(شہادت القرآن صفحہ ۱۴)

زمانہ محمدی کے سر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اُس کے آخر میں مسیح موعود تھا اور ضرور تھا کہ یہ سلسلہ دُنیا کا منقطع نہ ہو جب تک کہ وہ پیدا نہ ہولے کیونکہ وحدتِ اقوامی کی خدمت اُسی نائب النبوت کے عہد سے وابستہ کی گئی ہے اور اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ ہے هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ یعنی خدا وہ خدا ہے جس نے اپنے رسول کو ایک کامل ہدایت اور سچّے دین کے ساتھ بھیجا تا اُس کو ہر ایک قِسم کے دین پر غالب کر دے یعنی ایک عالمگیر غلبہ اُس کو

عطا کرے اور چونکہ وہ عالمگیر غلبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ظہور میں نہیں آیا اور ممکن نہیں کہ خدا کی پیشگوئی میں کچھ تخلف ہو اِس لئے اِس آیت کی نسبت اُن سب متقدّمین کا اِتفاق ہے جو ہم سے پہلے گذر چکے کہ یہ عالمگیر غلبہ مسیح موعود کے وقت میں ظہور میں آئے گا کیونکہ اس عالمگیر غلبہ کے لئے تین امر کا پایا جانا ضروری ہے جو کسی پہلے زمانہ میں وہ پائے نہیں گئے۔

(۱) اوّل یہ کہ پورے اور کامل طور پر مختلف قوموں کے میل ملاقات کے لئے آسانی اور سہولت کی راہیں کُھل جائیں اور سفر کی ناقابلِ برداشت مشقتیں دُور ہو جائیں اور سفر بہت جلدی طے ہو سکے گویا سفر سفر ہی نہ رہے اور سفر کو جلد طے کرنے کے لئے فوق العادت اسباب میسّر آجائیں کیونکہ جب تک مختلف ممالک کے باشندوں کے لئے ایسے اسباب اور سامان حاصل نہ ہوں کہ وہ فوق العادت کے طور پر ایک دوسرے سے مِل سکیں اور بآسانی ایک دوسرے کی ایسے طور سے ملاقات کر سکیں کہ گویا وہ ایک ہی شہر کے باشندے ہیں تب تک ایک قوم کے لئے یہ موقع حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ یہ دعویٰ کریں کہ ان کا دین تمام دُنیا کے دینوں پر غالب ہے کیونکہ غلبہ دکھلانے کے لئے یہ شرط ہے کہ ان تمام مذاہب کا لوگوں کو علم بھی ہو جن پر غالب ہونے کا اظہار بھی کیا گیا ہے اور نیز جن کو مغلوب سمجھا گیا ہے وہ بھی اِس بات کا علم رکھتے ہوں کہ ہم اس الزام کے نیچے ہیں اور یہ تو تبھی ہو سکتا ہے کہ مختلف ممالک کے لوگ ایسے باہم قریب ہو جائیں کہ گویا وہ ایک ہی محلہ میں رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ظہور میں نہیں آسکا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کئی قومیں زمین کے دُور دراز کناروں پر آباد تھیں اور پیغام پہنچانے اور سفر کرنے اور باہمی جلد ملاقات کرنے کے وہ سامان موجود نہ تھے کہ جو اَب اِس وقت ہمارے اِس زمانہ میں موجود ہیں۔

(۲) دوسرا امر جو اِس بات کے سمجھنے کے لئے شرط ہے کہ ایک دین دوسرے تمام دینوں پر اپنی خوبیوں کے رُو سے غالب ہے یہ ہے جو دُنیا کی تمام قومیں آزادی سے باہم مباحثات کر سکیں اور ہر ایک قوم اپنے مذہب کی خوبیاں دوسری قوم کے سامنے پیش کر سکے اور نیز تالیفات کے ذریعہ سے اپنے مذہب کی خوبی اور دوسرے مذاہب کا نقص بیان کر سکیں اور مذہبی کُشتی کے لئے دُنیا کی تمام قوموں کو یہ موقع مِل سکے کہ وہ ایک ہی میدان میں اکٹھے ہو کر ایک دوسرے پر مذہبی بحث کے حملے کریں اور جیسا کہ دریا کی ایک لہر دوسری لہر پر پڑتی ہے ایک دوسرے کے تعاقب میں مشغول ہوں اور یہ مذہبی کُشتی نہ ایک دو قوم میں بلکہ عالمگیر کُشتی ہو جو دُنیا کی قوموں میں سے کوئی قوم اس کُشتی سے باہر نہ ہو۔ سو اِس قسم کا غلبہ اسلام کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں میسّر نہیں آسکا کیونکہ اوّل تو اُس زمانہ میں دُنیا کی تمام قوموں کا اجتماع ناممکن تھا اور پھر ماسوا اس کے جن قوموں سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ پڑا اُن کو مذہبی امور میں دلائل سُننے یا دلائل سُنانے سے کچھ غرض نہ تھی بلکہ

انہوں نے اُٹھتے ہی تلوار کے ساتھ اسلام کو نابُود کرنا چاہا اور عقلی طور پر اُس کے رَدّ کرنے کے لئے قلم نہیں اُٹھائی یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کی کوئی ایسی کتاب نہیں پاؤ گے جس میں اسلام کے مقابل پر عقل یا نقل کے رنگ میں کچھ لکھا گیا ہو بلکہ وہ لوگ صرف تلوار سے ہی غالب ہونا چاہتے تھے اِس لئے خدا نے تلوار سے ہی ان کو ہلاک کیا مگر ہمارے اس زمانہ میں اِسلام کے دشمنوں نے اپنے طریق کو بدل لیا ہے اور اب کوئی مخالف اسلام کا اپنے مذہب کے لئے تلوار نہیں اُٹھاتا اور یہی حکمت ہے کہ مسیح موعود کے لئے یَضَعُ الْحَرْبَ کا حکم آیا یعنی جنگ کی ممانعت ہوگئی اور تلوار کی لڑائیاں موقوف ہوگئیں اور اب قلمی لڑائیوں کا وقت ہے اور چونکہ ہم قلمی لڑائیوں کے لئے آئے ہیں اِس لئے بجائے لوہے کی تلوار کے لوہے کی قلمیں ہمیں ملی ہیں اور نیز کتابوں کے چھاپنے اور دُور دراز ملکوں تک اُن تالیفات کے شائع کرنے کے ایسے سہل اور آسان سامان ہمیں میسّر آ گئے ہیں کہ گذشتہ زمانوں میں سے کسی زمانہ میں ان کی نظیر پائی نہیں جاتی۔ یہاں تک کہ وہ مضمون جو برسوں تک لکھنے ناممکن تھے وہ دنوں میں لکھے جاتے ہیں۔ ایسا ہی وہ تالیفات جن کا دُور دراز ملکوں میں پہنچانا مدّت ہائے دراز کا کام تھا وہ تھوڑے ہی دنوں میں ہم دُنیا کے کناروں تک پہنچا سکتے ہیں اور اپنی حُجّتِ بالغہ سے تمام قوموں کو مطلع کر سکتے ہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ اشاعت اور اتمامِ حُجّت ناممکن تھی کیونکہ اُس وقت نہ کتابوں کے چھاپنے کے آلات تھے اور نہ دوسرے ممالک میں کتابوں کے پہنچانے کے لئے سہل اور آسان طریق میسّر تھے۔

(۳) تیسرا امر جو اِس بات کو تمام دُنیا پر واضح کرنے کے لئے شرط ہے کہ فلاں دین بمقابل دُنیا کے تمام دِینوں کے خاص طور پر خدا سے تائید یافتہ ہے اور خدا کا خاص فضل اور خاص نصرت اپنے ساتھ رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ بمقابل دُنیا کی تمام قوموں کے ایسے طور سے تائیدِ الٰہی کے آسمانی نشان اُس کے شامل ہوں کہ دوسرے کسی دین کے شاملِ حال نہ ہوں اور بغیر ذریعہ انسانی ہاتھوں کے خدا دوسرے دینوں کو تباہ کرتا جائے اور اُن کے اندر سے رُوحانی برکت اُٹھا لے مگر وہ دین دوسرے دینوں کے سامنے خدا کے چمک دار نشانوں سے اپنی ممتاز حالت ثابت کرے اور دُنیا کے اِس سرے سے اُس سرے تک کوئی مذہب نشانِ آسمانی میں اُس کا مقابلہ نہ کر سکے باوجود اس بات کے کہ کوئی حِصّہ آبادی دُنیا کا اس دعوتِ مقابلہ سے بے خبر نہ ہو۔ یہ امر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کامل طور پر ظہور پذیر ہونا ناممکن تھا کیونکہ اس کے لئے یہ شرط تھی کہ دُنیا کی تمام قوموں کو جو مشرق اور مغرب اور جنوب اور شمال میں رہتی ہیں یہ موقع مِل سکے کہ وہ ایک دوسرے کے مقابل پر اپنے مذہب کی تائید میں خدا سے چاہیں جو آسمانی نشانوں سے اس مذہب کی سچائی پر گواہی دے۔ مگر جس حالت میں ایک قوم دوسری قوم سے ایسی مخفی اور محجوب تھی کہ گویا ایک دوسری دُنیا میں رہتی تھی تو یہ مقابلہ ممکن نہ تھا

اور نیز اس زمانہ میں ابھی اِسلام کی تکذیب انتہا تک نہیں پہنچی تھی اور ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ خدا کی غیرت تقاضا کرے کہ اسلام کی تائید میں آسمانی نشانوں کی بارش ہو مگر ہمارے زمانہ میں وہ وقت آگیا کیونکہ اِس زمانہ میں گندی تحریروں کے ذریعہ سے اِس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی توہین کی گئی ہے کہ کبھی کِسی زمانہ میں کِسی نبی کی توہین نہیں ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو ثابت نہیں ہوتا کہ کسی عیسائی یا یہودی نے اسلام کی رَدّ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین میں دُو یا تین ورق کا رسالہ بھی لکھا ہو مگر اَب اِس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین اور اِسلام کی رَدّ میں کتابیں لکھی گئیں اور اشتہار شائع کئے گئے اور اخباریں تمام دُنیا میں پھیلائی گئیں کہ اگر وہ تمام جمع کی جائیں تو وہ ایک بڑے پہاڑ کے برابر طومار ہوتا ہے بلکہ اس سے زیادہ۔ اِن اندھوں نے اسلام کو ہر ایک برکت سے بے بہرہ قرار دیا ہے اور دعوٰی کیا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے کوئی آسمانی نشان نہیں دکھلایا اور اِس بات پر زور دیا ہے کہ دُنیا میں اسلام کا نام و نشان نہ رہے اور ایک عاجز اِنسان کی خدائی ثابت کرنے کے لئے خدا کے پاک دین اور پاک رسول کی وہ توہین کی گئی ہے جو ابتدائے دُنیا سے آج تک کسی دین اور کسی رسول کی ایسی توہین نہیں ہوئی اور درحقیقت یہ ایسا زمانہ آگیا ہے کہ شیطان اپنے تمام ذرّیات کے ساتھ ناخنوں تک زور لگا رہا ہے کہ اسلام کو نابود کر دیا جاوے اور چونکہ بلاشبہ سچائی کا جھوٹ کے ساتھ یہ آخری جنگ ہے اِس لئے یہ زمانہ بھی اِس بات کا حق رکھتا تھا کہ اس کی اِصلاح کے لئے کوئی خدا کا مامور آوے پس وہ مسیح موعود ہے جو موجود ہے اور زمانہ حق رکھتا تھا کہ اس نازک وقت میں آسمانی نشانوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کی دُنیا پر حُجت پوری ہو سو آسمانی نشان ظاہر ہو رہے ہیں اور آسمان جوش میں ہے کہ اِس قدر آسمانی نشان ظاہر کرے کہ اِسلام کی فتح کا نقارہ ہر ایک ملک میں اور ہر ایک حصۂ دُنیا میں بج جائے۔ اے قادر خدا تُو جلد وہ دن لا کہ جس فیصلے کا تُو نے ارادہ کیا ہے وہ ظاہر ہو جائے اور دُنیا میں تیرا جلال چمکے اور تیرے دین اور تیرے رسول کی فتح ہو۔ آمین ثمّ آمین۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۸۳ تا ۸۷)

جب ہم اِس ترتیب کو دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی زندگی کے دو ہی مقصد بیان فرمائے ہیں یعنی تکمیل ہدایت اور تکمیل اشاعت ہدایت۔ اوّل الذکر کی تکمیل چھٹے دِن یعنی جمعہ کے دن ہوئی جبکہ آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ نازل ہوئی اور دوسری تکمیل کے لئے بالاتفاق مانا گیا ہے کہ وہ مسیح ابنِ مریم یعنی مسیح موعود کے زمانہ میں ہوگی سب مفسّرین نے بالاتفاق لکھ دیا ہے کہ آیت ھُوَالَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی کی تکمیل مسیح موعود کے زمانہ میں ہوگی اور جبکہ ہدایت کی تکمیل چھٹے دن ہوئی تو اشاعتِ ہدایت کی تکمیل بھی چھٹے دن ہی ہونی چاہیئے تھی اور قرآنی دن ایک ہزار برس کا ہوتا ہے گویا مسیح موعود چھٹے ہزار میں ظاہر ہوگا۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۴ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

یہ بھی وعدہ ہے کہ سارے ادیان کو جمع کیا جائے گا اور ایک دین کو غالب کیا جائے گا یہ بھی مسیح موعود کے وقت کی ایک جمع ہے کیونکہ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ مفسروں نے مان لیا ہے کہ مسیح موعود کے وقت میں ہوگا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۳ مورخہ ۲؍ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

خدا تعالیٰ نے جو اتمامِ نعمت کی ہے وہ یہی دین ہے جس کا نام اسلام رکھا ہے۔ پھر نعمت میں جمعہ کا دن بھی ہے جس روز اتمامِ نعمت ہوا۔ یہ اس کی طرف اشارہ تھا کہ پھر اتمامِ نعمت جو لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کی صورت میں ہوگا وہ بھی ایک عظیم الشّان جمعہ ہوگا۔ وہ جمعہ اَب آگیا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے وہ جمعہ مسیح موعود کے ساتھ مخصوص رکھا ہے اِس لئے کہ اتمامِ نعمت کی صورتیں دراصل دو ہیں اوّل تکمیلِ ہدایت دوّم تکمیل اشاعت ہدایت۔ اَب تم غور کر کے دیکھو تکمیل ہدایت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کامل طور پر ہو چکی لیکن اللہ تعالیٰ نے مقدر کیا تھا کہ تکمیل اشاعت ہدایت کا زمانہ دوسرا زمانہ ہو جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بروزی رنگ میں ظہور فرماویں اور وہ زمانہ مسیح موعود اور مہدی کا زمانہ ہے۔ یہی وجہ کہ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ اِس شان میں فرمایا گیا ہے۔ تمام مفسّرین نے بالاتفاق اِس امر کو تسلیم کر لیا ہے کہ یہ آیت مسیح موعود کے زمانہ سے متعلق ہے۔ درحقیقت اظہارِ دین اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ کُل مذاہب میدان میں نکل آویں اور اشاعتِ مذہب کے ہر قسم کے مفید ذریعے پیدا ہو جائیں اور وہ زمانہ خدا کے فضل سے آگیا ہے۔ چنانچہ اس وقت پریس کی طاقت سے کتابوں کی اشاعت اور طبع میں جو جو سہولتیں میسّر آئی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ ڈاکخانوں کے ذریعہ سے کُل دُنیا میں تبلیغ ہو سکتی ہے۔ اخباروں کے ذریعہ سے تمام دُنیا کے حالات پر اطلاع ملتی ہے۔ ریلوں کے ذریعہ سے سفر آسان کر دئے گئے ہیں۔ غرض جس قدر آئے دن نئی ایجادیں ہوتی جاتی ہیں اُسی قدر عظمت کے ساتھ مسیح موعود کے زمانہ کی تصدیق ہوتی جاتی ہے اور اظہارِ دین کی صورتیں نکلتی آتی ہیں۔ اِس لئے یہ وقت وہی وقت ہے جس کی پیشگوئی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کہہ کر فرمائی تھی۔ یہ وہی زمانہ ہے جو اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ[1] کی شان کو بلند کرنے والا اور تکمیل اشاعت ہدایت کی صورت میں دوبارہ اتمامِ نعمت کا زمانہ ہے اور پھر یہ وہی وقت اور جمعہ ہے جس میں وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ کی پیشگوئی پوری ہوتی ہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور بروزی رنگ میں ہوا ہے اور ایک جماعت صحابہؓ کی پھر قائم ہوئی ہے۔ اتمامِ نعمت کا وقت آپہنچا ہے لیکن تھوڑے ہیں جو اس سے آگاہ ہیں اور بہت ہیں جو ہنسی کرتے ہیں اور ٹھٹھوں میں اُڑاتے ہیں۔ مگر وہ وقت قریب ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے وعدہ کے موافق

---

[1] سورۃ المائدۃ : ۴

تجلّی فرمائے گا اور اپنے زور آور حملوں سے دکھاوے گا کہ اس کا نذیر سچا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۸ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵،۶)

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ پر سوچتے سوچتے مجھے معلوم ہؤا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں دو لفظ ھُدٰی اور حَقّ کے رکھے ہیں ھُدٰی تو یہ ہے کہ اندر روشنی پیدا کرے مَعمانہ رہے۔ یہ گویا اندرونی اِصلاح کی طرف اشارہ ہے جو مہدی کا کام ہے اور حق کا لفظ اِس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ خارجی طور پر باطل کو شکست دیوے۔ چنانچہ دوسری جگہ آیا ہے جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ[1] اور خود اِس آیت میں بھی فرمایا ہے لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ یعنی اس رسول کی آمد کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ حق کو غلبہ دے گا۔ یہ غلبہ تلوار اور تفنگ سے نہیں ہو گا بلکہ وجوہ عقلیہ سے ہو گا۔

یاد رکھو کہ پاک عقل کا خاصہ ہے کہ وہ قصّوں پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اسرار کو کھینچ لاتی ہے۔ اسی واسطے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس کو حکمت دی گئی اُن کو خیرِ کثیر دی گئی ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

اِس امر کی صداقت کو ظاہر کرنے کے لئے اِسلام جبر سے نہیں پھیلا۔ اللہ تعالیٰ نے خاتم الخلفاء کو پیدا کیا اور اس کا کام يَضَعُ الْحَرْبَ رکھ کر دوسری طرف لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ قرار دیا یعنی وہ اسلام کا غلبہ ملل ہالکہ پر حجت اور براہین سے قائم کرے گا اور جنگ وجدال کو اُٹھا دے گا۔ وہ لوگ سخت غلطی کرتے ہیں جو کسی خونی مہدی اور خونی مسیح کا اِنتظار کرتے ہیں۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

یہ زمانہ اِس قسم کا آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے وسائل پیدا کر دئے ہیں کہ دُنیا ایک شہر کا حکم رکھتی ہے اور وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ[2] کی پیشگوئی پوری ہو گئی ہے۔ اب سب مذاہب میدان میں نکل آئے ہیں اور یہ ضروری امر ہے کہ ان کا مقابلہ ہو اور ان میں ایک ہی سچا ہو گا اور غالب آئے گا لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ مقابلہ مذاہب کا شروع ہو گیا ہے اور اس مذہبی کُشتی کا سِلسلہ نری زبان تک ہی نہیں رہا بلکہ قلم نے اس میں سے سب سے بڑھ کر حصّہ لیا ہے۔ لاکھوں مذہبی رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ اِس وقت مختلف مذاہب خصوصاً نصاریٰ کے جو حملے اِسلام پر ہو رہے ہیں جو شخص ان حالات سے واقفیت رکھتا ہے اور اسے ان پر سوچنے کا موقع ملا ہے تو وہ ان ضرورتوں کو دیکھ کر بے اختیار ہو کر اِس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ یہ وقت ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے اِسلام کی طرف زیادہ توجہ کرے۔ جو شخص اسلام پر ان حملوں کی رفتار کو دیکھتا ہے تو وہ

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل: ۸۲ [2] سورۃ التکویر: ۸

اِس ضرورت کو محسوس کرتا ہے لیکن جس کو کوئی خبر ہی نہیں ہے وہ ان نقصانوں کی بابت کیا کہہ سکتا ہے جو اسلام کو پہنچائے گئے ہیں مسلمانوں نے نادان دوست کے رنگ میں اور غیر مذاہب والوں خصوصاً عیسائیوں نے دشمنی کے لباس میں۔ وہ تو یہی کہتا ہے کہ اسلام کا کیا بگڑا ہے مگر اسے معلوم نہیں کہ اسلام کی ظاہری اور جسمانی صورت میں بھی ضعف آگیا ہے۔ وہ قوت اور شوکت اسلامی سلطنت کو نہیں اور دینی طور پر یہی وہ بات جو مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ میں سکھائی گئی تھی اس کا نمونہ نظر نہیں آتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ ؍ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲،۱)

الصّف: ١١

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

اے وہ لوگو جو ایمان لائے کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کی طرف رہبری کروں کہ جو تم کو عذابِ الیم سے نجات بخشے۔ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور خدا کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے کوشش کرو کہ یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ اس سے خدا تمہارے گناہوں کو بخشے گا اور اُن بہشتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ محل عطا کرے گا کہ جو پاک اور جاودانی بہشتوں میں ہیں۔ یہی انسان کے لئے سعادتِ عظمٰی ہے اور دوسری یہ ہے جسے تم اِسی دُنیا میں چاہتے ہو کہ خدا کی طرف سے مدد ہے اور فتح قریب ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۳۴، ۲۳۵ حاشیہ)

اَے وَے لوگو جو ایمان لائے کیا تمہیں میں ایک سوداگری کی خبر دوں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات

دے یعنی یہ سوداگریاں جو تم کر رہے ہو یہ خساروں سے خالی نہیں اور ان میں آئے دن عذاب بھگتنا پڑتا ہے۔
سو آؤ تمہیں وہ سوداگری بتلا دیں جس میں نفع ہی نفع ہے اور خسارہ کا اِحتمال نہیں اور وہ یہ ہے کہ خدا اور
اس کے بھیجے ہوئے پر ایمان لاؤ اور اپنے مال اور جان کے ساتھ خدا کی راہ میں کوششیں کرو اگر تمہیں سمجھ ہو
تو یہی سوداگری تمہارے لئے بہتر ہے جس سے تمہارا رُوحانی مال بہت بڑھ جائے گا۔

(ست بچن صفحہ ۱۰۱)

مال چونکہ تجارت سے بڑھتا ہے اِس لئے خدا تعالیٰ نے بھی طلبِ دین اور ترقّی دین کی خواہش کو ایک تجارت
ہی قرار دیا ہے چنانچہ فرمایا ہے هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ سب سے عمدہ
تجارت دین کی ہے جو دردناک عذاب سے نجات دیتی ہے پس مَیں بھی خدا تعالیٰ کے ان ہی الفاظ میں تمہیں یہ کہتا
ہوں کہ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۷؍ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

○

سُورَةُ الْجُمُعَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

۲۔ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ○

قرآن کہتا ہے کہ یہ نہیں کہ زمین تقدیس سے خالی ہے بلکہ زمین پر بھی خدا کی تقدیس ہو رہی ہے نہ صرف آسمان پر جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ[1] یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ یعنی ذرہ ذرہ زمین کا اور آسمان کا خدا کی تحمید اور تقدیس کر رہا ہے اور جو کچھ ان میں ہے وہ تحمید اور تقدیس میں مشغول ہے۔ پہاڑ اس کے ذکر میں مشغول ہیں۔ دریا اس کے ذکر میں مشغول ہیں۔ درخت اس کے ذکر میں مشغول ہیں اور بہت سے راست باز اس کے ذکر میں مشغول ہیں اور جو شخص دل اور زبان کے ساتھ اُس کے ذکر میں مشغول نہیں اور خدا کے آگے فروتنی نہیں کرتا اُس سے طرح طرح کے شکنجوں اور عذابوں سے قضا و قدر الٰہی فروتنی کرا رہی ہے اور جو کچھ فرشتوں کے بارے میں خدا کی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ نہایت درجہ اطاعت کر رہے ہیں یہی تعریف زمین کے پات پات اور ذرہ ذرہ کی نسبت قرآن شریف میں موجود ہے کہ ہر ایک چیز اُس کی اطاعت کر رہی ہے ایک پتّہ بھی بجز اُس کے امر کے گر نہیں سکتا اور بجز اُسکے حکم کے نہ کوئی دوا شفا دے سکتی ہے اور نہ کوئی غذا موافق ہو سکتی ہے اور ہر ایک چیز غایت درجہ کے تذلّل اور عبودیّت سے خدا کے آستانہ پر گری ہوئی ہے اور اس کی فرمانبرداری میں مستغرق ہے۔ پہاڑوں اور

---

[1] سُورۃ بنی اسرائیل : ۴۵

زمین کا ذرہ ذرہ اور دریاؤں اور سمندروں کا قطرہ قطرہ اور درختوں اور بوٹیوں کا پات پات اور ہر یک جز اُن کا اور انسان اور حیوانات کے کُل ذرات خدا کو پہچانتے اور اس کی اطاعت کرتے ہیں اور اُس کی تحمید و تقدیس میں مشغول ہیں۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے فرمایا یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ یعنی جیسے آسمان پر ہر یک چیز خدا کی تسبیح و تقدیس کر رہی ہے ویسے زمین پر بھی ہر ایک چیز اُس کی تسبیح و تقدیس کرتی ہے پس کیا زمین پر خدا کی تحمید و تقدیس نہیں ہوتی۔ ایسا کلمہ ایک کامل عارف کے مُنہ سے نہیں نکل سکتا بلکہ زمین کی چیزوں میں سے کوئی چیز تو شریعت کے احکام کی اطاعت کر رہی ہے اور کوئی چیز قضا و قدر کے احکام کے تابع ہے اور کوئی دونوں کی اطاعت میں کمربستہ ہے۔ کیا بادل کیا ہوا کیا آگ کیا زمین سب خدا کی اطاعت اور تقدیس میں محو ہیں۔ اگر کوئی انسان الٰہی شریعت کے احکام کا سرکش ہے تو الٰہی قضا و قدر کے حکم کا تابع ہے۔ ان دونوں حکومتوں سے باہر کوئی نہیں کسی نہ کسی آسمانی حکومت کا جُوا ہر ایک کی گردن پر ہے ہاں البتہ انسانی دِلوں کی صلاح اور فساد کے لحاظ سے غفلت اور ذکرِ الٰہی نوبت بہ نوبت زمین پر اپنا غلبہ کرتے ہیں مگر بغیر خدا کی حکمت اور مصلحت کے یہ مدّ و جزر خود بخود نہیں۔ خدا نے چاہا کہ زمین میں ایسا ہو سو ہوگیا۔ (کشتی نوح صفحہ ۲۹، ۳۰)

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ ۗ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ

وہ خدا ہے جس نے اَن پڑھوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا۔ اُن پر وہ اُس کی آیتیں پڑھتا ہے اور اُن کو پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اگرچہ وہ لوگ اس سے پہلے صریح گمراہی میں پھنسے ہوئے تھے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۷۲)

وہ خدا وہ کریم و رحیم ہے جس نے اُمّیوں میں انہیں میں سے ایک ایسا کامل رسول بھیجا ہے کہ جو باوجود اُمّی ہونے کے خدا کی آیات اُن پر پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور کتاب اور حکمت سکھلاتا ہے۔ اگرچہ وہ لوگ اس نبی کے ظہور سے پہلے صریح گمراہی میں پھنسے ہوئے تھے اور ان کے گروہ میں سے اور ملکوں کے لوگ بھی ہیں جن کا اسلام میں داخل ہونا ابتداء سے قرار پا چکا ہے اور ابھی وہ مسلمانوں سے نہیں ملے اور خدا غالب اور حکیم ہے جس کا فعل حکمت سے خالی نہیں یعنی جب وہ وقت آپہنچے گا کہ جو خدا نے اپنی حکمتِ کاملہ کے لحاظ سے

دوسرے ملکوں کے مسلمان ہونے کے لئے مقرر کر رکھا ہے تب وہ لوگ دینِ اسلام میں داخل ہوں گے۔

(براہینِ احمدیہ صفحہ ۲۳۸ حاشیہ)

اِس آیت کا ماحصل یہ ہے کہ خدا وہ خدا ہے جس نے ایسے وقت میں رسول بھیجا کہ لوگ علم اور حکمت سے بے بہرہ ہو چکے تھے اور علومِ حکمیہ دینیہ جن سے تکمیلِ نفس ہو اور نفوسِ انسانیہ علمی اور عملی کمال کو پہنچیں بالکل گم ہو گئی تھی اور لوگ گمراہی میں مبتلا تھے یعنی خدا اور اس کی صراطِ مستقیم سے بہت دُور جا پڑے تھے تب ایسے وقت میں خدا تعالیٰ نے اپنا رسول اُمّی بھیجا اور اس رسول نے اُن کے نفسوں کو پاک کیا اور علم الکتاب اور حکمت سے اُن کو مملو کیا یعنی نشانوں اور معجزات سے مرتبہ یقینِ کامل تک پہنچایا اور خداشناسی کے نُور سے ان کے دلوں کو روشن کیا اور پھر فرمایا کہ ایک گروہ اَور ہے جو آخری زمانہ میں ظاہر ہو گا۔ وہ بھی اوّل تاریکی اور گمراہی میں ہوں گے اور علم اور حکمت اور یقین سے دُور ہوں گے تب خدا ان کو بھی صحابہؓ کے رنگ میں لائے گا یعنی جو کچھ صحابہؓ نے دیکھا وہ ان کو بھی دکھایا جائے گا یہاں تک کہ اُن کا صدق اور یقین بھی صحابہؓ کے صدق اور یقین کی مانند ہو جائے گا اور حدیثِ صحیح میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس آیت کی تفسیر کے وقت سلمان فارسیؓ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا لَوْ کَانَ الْاِیْمَانُ مُعَلَّقًا بِالثُّرَیَّا لَنَالَہٗ رَجُلٌ مِّنْ فَارِسَ یعنی اگر ایمان ثریا پر یعنی آسمان پر بھی اُٹھ گیا ہو گا تب بھی ایک آدمی فارسی الاصل اُس کو واپس لائے گا۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ ایک شخص آخری زمانہ میں فارسی الاصل پیدا ہو گا۔ اس زمانہ میں جس کی نسبت لکھا گیا ہے کہ قرآن آسمان پر اُٹھایا جائے گا۔ یہی وہ زمانہ ہے جو مسیح موعود کا زمانہ ہے اور یہ فارسی الاصل وہی ہے جس کا نام مسیح موعود ہے کیونکہ صلیبی حملہ جس کے توڑنے کے لئے مسیح موعود کو آنا چاہیئے وہ حملہ ایمان پر ہی ہے اور یہ تمام آثار صلیبی حملہ کے زمانہ کے لئے بیان کئے گئے ہیں اور لکھا ہے کہ اس حملہ کا لوگوں کے ایمان پر بہت بُرا اثر ہو گا۔ وہی حملہ ہے جس کو دوسرے لفظوں میں دجّالی حملہ کہتے ہیں۔ آثار میں ہے کہ اُس دجّال کے حملہ کے وقت بہت سے نادان خدائے لاشریک کو چھوڑ دیں گے اور بہت سے لوگوں کی ایمانی محبت ٹھنڈی ہو جائے گی اور مسیح موعود کا بڑا بھاری کام تجدیدِ ایمان ہو گا کیونکہ حملہ ایمان پر ہے اور حدیث لَوْ کَانَ الْاِیْمَانُ سے جو شخص فارسی الاصل کی نسبت ہے یہ بات ثابت ہے کہ وہ فارسی الاصل ایمان کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے آئے گا۔ پس جس حالت میں مسیح موعود اور فارسی الاصل کا زمانہ بھی ایک ہی ہے اور کام بھی ایک ہی ہے یعنی ایمان کو دوبارہ قائم کرنا اِس لئے یقینی طور پر ثابت ہوا کہ مسیح موعود ہی فارسی الاصل ہے اور اسی کی جماعت کے حق میں یہ آیت ہے وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ۔ اِس آیت کے معنے یہ ہیں کہ کمال ضلالت کے بعد ہدایت اور حکمت پانے والے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور برکات کو مشاہدہ کرنے والے صرف دو ہی گروہ

ہیں اوّل صحابۂ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے سخت تاریکی میں مبتلا تھے اور پھر بعد اس کے خدا تعالیٰ کے فضل سے انہوں نے زمانۂ نبوی پایا اور معجزات اپنی آنکھوں سے دیکھے اور پیشگوئیوں کا مشاہدہ کیا اور یقین نے اُن میں ایک تبدیلی پیدا کی کہ گویا صرف ایک رُوح رہ گئے۔ دوسرا گروہ جو بموجب آیت موصوفہ بالا صحابہؓ کی مانند ہیں مسیح موعود کا گروہ ہے کیونکہ یہ گروہ بھی صحابہؓ کی مانند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو دیکھنے والا ہے اور تاریکی اور ضلالت کے بعد ہدایت پانے والا۔ اور آیت اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ میں جو اس گروہ کو مِنْھُمْ کی دولت سے یعنی صحابہؓ سے مشابہ ہونے کی نعمت سے حصّہ دیا گیا ہے یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے یعنی جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات دیکھے اور پیشگوئیاں مشاہدہ کیں ایسا ہی وہ بھی مشاہدہ کریں گے اور درمیانی زمانہ کو اس نعمت سے کامل طور پر حصّہ نہیں ہوگا چنانچہ آجکل ایسا ہی ہوا کہ تیرہ سَو برس بعد پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا دروازہ کُھل گیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا کہ خسوف کسوف رمضان میں موافق حدیث دارقطنی اور فتاویٰ ابن حجر کے ظہور میں آگیا یعنی چاند گرہن اور سُورج گرہن رمضان میں ہؤا اور جیسا کہ مضمون حدیث تھا اسی طرح پر چاند گرہن اپنے گرہن کی راتوں میں سے پہلی رات میں اور سُورج گرہن اپنے گرہن کے دنوں میں سے بیچ کے دن میں وقوع میں آیا۔ ایسے وقت میں کہ جب مہدی ہونے کا مدعی موجود تھا اور یہ صورت جب سے کہ زمین اور آسمان پیدا ہؤا کبھی وقوع میں نہیں آئی کیونکہ اب تک کوئی شخص نظیر اس کی صفحۂ تاریخ میں ثابت نہیں کر سکا سو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ تھا جو لوگوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ پھر ذوالسنین ستارہ بھی جس کا نکلنا مہدی اور مسیح موعود کے وقت میں بیان کیا گیا تھا ہزاروں انسانوں نے نکلتا ہؤا دیکھ لیا۔ ایسا ہی جاوا کی آگ بھی لاکھوں انسانوں نے مشاہدہ کی۔ ایسا ہی طاعون کا پھیلنا اور حج سے روکے جانا بھی سب نے بچشمِ خود ملاحظہ کر لیا۔ ملک میں ریل کا تیار ہونا۔ اُونٹوں کا بیکار ہونا یہ تمام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تھے جو اِس زمانہ میں اس طرح دیکھے گئے جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے معجزات کو دیکھا تھا۔ اسی وجہ سے اللہ جلّ شانہٗ نے اِس آخری گروہ کو مِنْھُمْ کے لفظ سے پکارا تا یہ اشارہ کرے کہ معائنہ معجزات میں وہ بھی صحابہؓ کے رنگ میں ہی ہیں۔ سوچ کر دیکھو کہ تیرہ سَو برس میں ایسا زمانہ منہاجِ نبوت کا اَور کِس نے پایا۔ اِس زمانہ میں جس میں ہماری جماعت پیدا کی گئی ہے کئی وجوہ سے اِس جماعت کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشابہت ہے۔ وہ معجزات اور نشانوں کو دیکھتے ہیں جیسا کہ صحابہؓ نے دیکھا۔ وہ خدا تعالیٰ کے نشانوں اور تازہ بتازہ تائیدات سے نور اور یقین پاتے ہیں جیسا کہ صحابہؓ نے پایا۔ وہ خدا کی راہ میں لوگوں کے ٹھٹھے اور ہنسی اور لعن طعن اور طرح طرح کی دل آزاری اور بدزبانی اور قطع رحم وغیرہ کا صدمہ اُٹھا رہے ہیں جیسا کہ صحابہؓ نے اُٹھایا۔ وہ خدا کے کُھلے کُھلے نشانوں اور آسمانی مددوں اور حکمت کی تعلیم سے پاک زندگی حاصل کرتے جاتے ہیں جیسا کہ صحابہؓ نے

حاصل کیا۔ بہتیرے ان میں سے ہیں کہ نماز میں روتے اور سجدہ گاہوں کو آنسوؤں سے تر کرتے ہیں جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم روتے تھے۔ بہتیرے ان میں ایسے ہیں جن کو سچی خوابیں آتی ہیں اور الہامِ الٰہی سے مشرف ہوتے ہیں جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہوتے تھے۔ بہتیرے ان میں ایسے ہیں کہ اپنے محنت سے کمائے ہوئے مالوں کو محض خدا تعالیٰ کی مرضات کے لئے ہمارے سلسلہ میں خرچ کرتے ہیں جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم خرچ کرتے تھے۔ ان میں ایسے لوگ کئی پاؤ گے کہ جو موت کو یاد رکھتے اور دلوں کے نرم اور سچی تقویٰ پر قدم مار رہے ہیں جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت تھی۔ وہ خدا کا گروہ ہے جن کو خدا آپ سنبھال رہا ہے اور دن بدن اُن کے دلوں کو پاک کر رہا ہے اور ان کے سینوں کو ایمانی حکمتوں سے بھر رہا ہے اور آسمانی نشانوں سے اُن کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے جیسا کہ صحابہؓ کو کھینچتا تھا غرض اس جماعت میں وہ ساری علامتیں پائی جاتی ہیں جو اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ کے لفظ سے مفہوم ہو رہی ہیں اور ضرور تھا کہ خدا تعالیٰ کا فرمودہ ایک دن پُورا ہوتا۔

اور آیت اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جیسا کہ یہ جماعت مسیح موعود کی صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت سے مشابہہ ہے ایسا ہی جو شخص اس جماعت کا امام ہے وہ بھی ظلّی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت رکھتا ہے جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہدیٔ موعود کی صفت فرمائی کہ وہ آپ سے مشابہہ ہوگا اور دو مشابہت اُس کے وجود میں ہوں گی ایک مشابہت حضرت مسیح علیہ السلام سے جس کی وجہ سے وہ مسیح کہلائے گا اور دوسری مشابہت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس کی وجہ سے وہ مہدی کہلائے گا۔ اسی راز کی طرف اشارہ کرنے کے لئے لکھا ہے کہ ایک حصہ اس کے بدن کا اسرائیلی وضع اور رنگ پر ہوگا اور دوسرا حصہ عربی وضع اور رنگ پر۔ حضرت مسیح علیہ السلام ایسے وقت میں آئے تھے جبکہ ملّتِ موسوی یونانی حکماء کے حملوں سے خطرناک حالت میں تھی اور تعلیم توریت اور اُس کی پیشگوئیوں اور معجزات پر سخت حملہ کیا جاتا تھا اور یونانی خیالات کے موافق خدا تعالیٰ کے وجود کو بھی ایک ایسا وجود سمجھا گیا تھا کہ جو صرف مخلوق میں مخلوط ہے اور مدبّر بالارادہ نہیں۔ اور سلسلۂ نبوت سے ٹھٹھا کیا جاتا تھا لہٰذا حضرت عیسٰیؑ کے مبعوث کرنے سے جو حضرت موسٰیؑ سے چودہ سَو برس بعد آئے خدا تعالیٰ کا یہ ارادہ تھا کہ موسوی نبوّت کی صحت اور اس سلسلہ کی حقانیت پر تازہ شہادت قائم کرے اور نئی تائیدات اور آسمانی گواہوں سے موسوی عمارت کی دوبارہ مرمّت کر دیوے۔ اسی طرح جو اس اُمّت کے لئے مسیح موعود بھی چودھویں صدی کے سر پر بھیجا گیا اُس کی بعثت سے بھی یہی مطلب ہؤا کہ جو یورپ کے فلسفہ اور یورپ کی دجّالیت نے اسلام پر طرح طرح کے حملے کئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت اور پیشگوئیوں اور معجزات سے انکار اور تعلیم قرآنی پر اعتراض اور برکات اور انوارِ اسلام کو سخت اِستہزاء کی نظر سے دیکھا ہے اور ان تمام حملوں کو نیست و نابود کرے اور نبوّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الف الف سلام کو تازہ تصدیق اور تائید سے حق کے طالبوں پر چمکا وے اور

یہی سِرّ ہے جو براہین احمدیہ کے صفحہ ۵۲۲ میں آج سے سترہ برس پہلے ایک الہام اِسی بارہ میں ہؤا۔ وہ الہام خدا تعالیٰ کا لاکھوں انسانوں میں شائع ہوچکا ہے اور وہ یہ ہے "بخرام کہ وقتِ تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں برمنار بلند تر محکم افتاد۔" "پاک محمد مصطفٰے نبیوں کا سردار۔ خدا تیرے سب کام درست کرے گا اور تیری ساری مرادیں تجھے دے گا۔ ربّ الافواج اس طرف توجہ کرے گا۔ اِس نشان کا مدّعا یہ ہے کہ قرآن شریف خدا کی کتاب اور میرے مُنہ کی باتیں ہیں۔" دیکھو براہین احمدیہ صفحہ ۵۲۲۔ اور خوب غور کرو کہ میرے نشانوں سے کیا مدّعا ٹھہرایا گیا۔ ابھی میں بیان کرچکا ہوں کہ اسی مطلب کے لئے حضرت عیسٰی علیہ السلام آئے تھے تا تکذیب کی حالت میں نئے نشانوں کے ساتھ توریت کی تصدیق کریں اور اسی مطلب کے لئے خدا تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے تا نئے نشانوں کے ساتھ قرآن شریف کی سچائی غافل لوگوں پر ظاہر کی جائے۔ اِسی کی طرف الہامِ الٰہی میں اشارہ ہے کہ پائے محمدیاں برمنار بلند تر محکم افتاد اور یہی اِشارہ اس دوسرے الہام براہین احمدیہ میں ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآءُ هُمْ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ۔ قُلْ اِنِّيْ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اگر کوئی کہے کہ "حضرت عیسٰی نبی اللہ ہوکر توریت کی تصدیق کے لئے آئے پس اُن کے مقابل پر تمہاری گواہی کیا قدر رکھتی ہے۔ اِس جگہ بھی تصدیقِ جدید کے لئے کوئی نبی ہی ہونا چاہیئے" سو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں اس نبوّت کا دروازہ تو بند ہے جو اپنا سکّہ جماتی ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ[1] اور حدیث میں ہے لَانَبِیَّ بَعْدِیْ۔ اور رہا یہ امر حضرت مسیح کی وفات نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہو چکی لہٰذا دُنیا میں اُن کے دوبارہ آنے کی امّید طمع خام۔ اور اگر کوئی اَور نبی نیا یا پُرانا آوے تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیونکر خاتم الانبیاء رہیں ہاں وحی ولایت اور مکالماتِ الٰہیہ کا دروازہ بند نہیں ہے جس حالت میں مطلوب صرف یہ ہے کہ نئے نشانوں کے ساتھ دینِ حق کی تصدیق کی جائے اور سچے دین کی شہادت دی جائے۔ تو جو نشان خدا تعالیٰ کے نشان ہیں خواہ وہ نبی کے ذریعہ سے ظاہر ہوں اور خواہ ولی کے ذریعہ سے۔ وہ سب ایک درجہ کے ہیں کیونکہ بھیجنے والا ایک ہی ہے۔ ایسا خیال کرنا سراسر جہالت اور حمق ہے کہ اگر خدا تعالیٰ نبی کے ہاتھ سے اور نبی کے ذریعہ سے کوئی تائید سماوی کرے تو وہ قوت اور شوکت میں زیادہ ہے اور اگر ولی کی معرفت وہ تائید ہو تو وہ قوت اور شوکت میں کم ہے بلکہ بعض نشان تو تائیدِ اسلام کے ایسے ظاہر ہوتے ہیں کہ اس وقت نہ کوئی نبی ہوتا ہے اور نہ ولی جیسا کہ اصحاب الفیل کے ہلاک کرنے کا نشان ظاہر ہؤا۔ یہ تو مسلّم ہے کہ ولی کی کرامت نبی متبوع کا معجزہ ہے پھر جبکہ کرامت بھی معجزہ ہوئی تو معجزات میں تفریق کرنا ایمانداروں کا کام نہیں۔ ماسوا اس کے حدیثِ صحیح سے ثابت ہے کہ محدّث بھی

---

[1] سورۃ الاحزاب : ۴۱

نبیوں اور رسولوں کی طرح خدا کے مُرسلوں میں داخل ہے۔ بخاری میں وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ وَّلَا مُحَدَّثٍ کی قرأت غور سے پڑھو۔ نیز ایک دوسری حدیث میں ہے کہ عُلَمَآءُ اُمَّتِيْ كَاَنْبِيَاءِ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔ صوفیاء نے اپنے مکاشفات سے بھی اس حدیث کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تصحیح کی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ مُسلم میں مسیح موعود کے حق میں نبی کا لفظ بھی آیا ہے یعنی بطور مجاز اور استعارہ کے۔ اسی وجہ سے براہین احمدیہ میں بھی ایسے الفاظ خدا تعالیٰ کی طرف سے میرے حق میں ہیں۔ دیکھو صفحہ ۴۹۸ میں یہ الہام ہے هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى۔ اِس جگہ رسول سے مراد یہ عاجز ہے اور پھر دیکھو صفحہ ۵۰۴ براہین احمدیہ میں یہ الہام جَرِيُّ اللّٰهِ فِيْ حُلَلِ الْاَنْبِيَآءِ جس کا ترجمہ ہے خدا کا رسول نبیوں کے لباس میں۔ اِس الہام میں میرا نام رسول بھی رکھا گیا اور نبی بھی۔ پس جس شخص کے خود خدا نے یہ نام رکھے ہوں اس کو عوام میں سے سمجھنا کمال درجہ کی شوخی ہے اور خدا کے نشانوں کی شہادتیں کسی طرح کمزور نہیں ہوسکتیں خواہ نبی کے ذریعہ سے ہوں یا محدّث کے ذریعہ سے۔ اصل تو یہ ہے کہ خود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کا فیض ایک مظہر پیدا کرکے اپنی گواہی آپ دلاتا ہے اور ولی کو مُفت کا نام حاصل ہوتا ہے۔ سو درحقیقت ولی جو مصدّق ہے وہ آپ سے زینت پاتا ہے آپ اس سے زینت نہیں پاتے۔ (ایام الصلح صفحہ ۶۹ تا ۷۵)

اِس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے بڑے فائدے دو ہیں جن کے پہنچانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ایک حکمتِ فرقان یعنی معارف و دقائق قرآن۔ دوسری تاثیرِ قرآن جو موجب تزکیہ نفوس ہے اور قرآن کی حفاظت صرف اسی قدر نہیں جو اس کے صحفِ مکتوبہ کو خوب نگہبانی سے رکھیں کیونکہ ایسے کام تو اوائل حال میں یہود اور نصاریٰ نے بھی کئے یہاں تک کہ توریت کے نقطے بھی گن رکھے تھے بلکہ اِس جگہ مع حفاظتِ ظاہری فوائد و تاثیراتِ قرآنی مراد ہیں اور وہ موافق سُنّت اللہ کے تبھی ہوسکتی ہے کہ جب وقتاً فوقتاً رسول آویں جن میں ظلّی طور پر رسالت کی تمام نعمتیں موجود ہوں اور جن کو وہ تمام برکات دی گئی ہوں جو نبیوں کو دی جاتی ہوں۔

(شہادت القرآن صفحہ ۴۲)

قرآن شریف اس ذوالفقار تلوار کی مانند ہے جس کے دو طرف دھاریں ہیں ایک طرف کی دھار مومنوں کی اندرونی غلاظت کو کاٹتی ہے اور دوسری طرف کی دھار دشمنوں کا کام تمام کرتی ہے مگر پھر بھی وہ تلوار اس کام کے لئے ایک بہادر کے دست و بازو کی محتاج ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ پس قرآن سے جو تزکیہ حاصل ہوتا ہے اُس کو اکیلا بیان نہیں کیا بلکہ وہ نبی کی صفت میں داخل کرکے بیان کیا یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا کلام یُوں ہی آسمان پر سے کبھی نازل نہیں ہوا بلکہ اس تلوار کو چلانے والا بہادر ہمیشہ ساتھ آیا ہے جو اس تلوار کا اصلی جوہر شناس ہے لہٰذا قرآن شریف پر سچا اور تازہ یقین دلانے کے لئے اور اس کے جوہر

دکھلانے کے لئے اور اُس کے ذریعہ سے اتمامِ حجت کرنے کے لئے ایک بہادر کے دست و بازو کی ہمیشہ حاجت ہوتی رہی ہے اور آخری زمانہ میں یہ حاجت سب سے زیادہ پیش آئی کیونکہ دجالی زمانہ ہے اور زمین و آسمان کی باہمی لڑائی ہے۔ (نزول المسیح صفحہ ۹۰، ۹۱)

وہ رحیم خدا وہ خدا ہے جس نے اُمّیوں میں اُنہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھلاتا ہے اگرچہ وہ پہلے اس سے صریح گمراہ تھے اور ایسا ہی وہ رسول جو اُن کی تربیت کر رہا ہے ایک دوسرے گروہ کی بھی تربیت کرے گا جو اُنہیں میں سے ہو جائیں گے اور انہیں کے کمالات پیدا کرلیں گے مگر ابھی وہ ان سے ملے نہیں اور خدا غالب ہے اور حکمت والا۔ اِس جگہ یہ نکتہ یاد رہے کہ آیت وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ میں آخرین کا لفظ مفعول کے محل پر واقع ہے گویا تمام آیت معہ اپنے الفاظ مقدّرہ کے یُوں ہے ھُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُعَلِّمُ الْاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ یعنی ہمارے خالص اور کامل بندے بجز صحابہ رضی اللہ عنہم کے اَور بھی ہیں جن کا گروہ کثیر آخری زمانہ میں پیدا ہوگا اور جیسی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی تربیت فرمائی ایسا ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُس گروہ کی بھی باطنی طور پر تربیت فرمائیں گے یعنی وہ لوگ ایسے زمانہ میں آئیں گے کہ جس زمانہ میں ظاہری افادہ اور استفادہ کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور مذہب اسلام بہت سی غلطیوں اور بدعتوں سے پُر ہو جائے گا اور فقراء کے دلوں سے بھی باطنی روشنی جاتی رہے گی تب خدا تعالیٰ کسی نفسِ سعید کو بغیر وسیلہ ظاہری سلسلوں اور طریقوں کے صرف نبیؐ کریمؐ کی رُوحانیت کی تربیت سے کمالِ روحانی تک پہنچا دے گا اور اس کو ایک گروہ کثیر بنائے گا اور وہ گروہ صحابہؓ کے گروہ سے نہایت شدید مشابہت پیدا کرے گا کیونکہ وہ تمام و کمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی زراعت ہوگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضان اُن میں جاری و ساری ہوگا اور صحابہؓ سے وہ ملیں گے یعنی اپنے کمالات کے رُو سے اُن کے مشابہ ہو جائیں گے اور اُن کو خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہی موقعے ثواب حاصل کرنے کے حاصل ہو جائیں گے جو صحابہؓ کو حاصل ہوئے تھے اور بباعث تنہائی اور بے کسی اور پھر ثابت قدمی کے اُسی طرح خدا تعالیٰ کے نزدیک صادق سمجھے جائیں گے کہ جس طرح صحابہؓ سمجھے گئے تھے کیونکہ یہ زمانہ بہت سی آفتوں اور فتنوں اور بے ایمانی کے پھیلنے کا زمانہ ہوگا اور راست بازوں کو وہی مشکلات پیش آجائیں گی جو صحابہ رضی اللہ عنہم کو پیش آئی تھیں۔ اِس لئے وہ ثابت قدمی دکھلانے کے بعد صحابہؓ کے مرتبہ پر شمار ہوں گے لیکن درمیانی زمانہ فیج اعوج ہے جس میں بباعث رُعب اور شوکت سلاطینِ اسلام اور کثرت اسباب تنعّم صحابہؓ کے قدم پر قدم رکھنے والے اور اُنکے مراتب کو ظلّی طور پر حاصل کرنے والے بہت ہی کم تھے مگر آخری زمانہ اوّل زمانہ کے مشابہ ہوگا کیونکہ اُس زمانہ

کے لوگوں پر غربت طاری ہو جائے گی اور بجز ایمانی قوت کے اور کوئی سہارا بلاؤں کے مقابلہ پر اُن کے لئے نہ ہوگا۔ سو ان کا ایمان خدا تعالیٰ کے نزدیک ایسا مضبوط اور ثابت ہوگا کہ اگر ایمان آسمان پر چلا جاتا تب بھی وہ اس کو زمین پر لے آتے یعنی اُن پر زلزلے آئیں گے اور وہ آزمائے جائیں گے اور سخت فتنے ان کو گھیریں گے لیکن وہ ایسے ثابت قدم نکلیں گے کہ اگر ایمان افلاک پر بھی ہوتا تب بھی اُس کو نہ چھوڑتے۔ سو یہ تعریف کہ وہ ایمان کو آسمان پر سے بھی لے آتے اِس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ وہ ایسے زمانہ میں آئیں گے کہ جب چاروں طرف بے ایمانی پھیلی ہوئی ہوگی اور خدا تعالیٰ کی سچی محبت دلوں سے نکل جائے گی مگر اُن کا ایمان اُن دلوں میں بڑے زور میں ہوگا اور خدا تعالیٰ کے لئے بلاکشی کی اُن میں بہت قوت ہوگی اور صدق اور ثبات بے انتہا ہوگا۔ نہ کوئی خوف اُن کے لئے مانع ہوگا اور نہ کوئی دنیوی امید ان کو سُست کرے گی اور ایمانی قوت انہیں باتوں سے آزمائی جاتی ہے کہ ایسی آزمائشوں کے وقت اور بے ایمانی کے زمانہ میں ثابت نکلے۔ سو اِس حدیث میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ اُس گروہ کا اُسی وقت میں آنا ضروری ہے جبکہ اُس کی آزمائش کے لئے ایسے ایسے اسباب موجود ہوں اور دُنیا حقیقی ایمان سے ایسی دُور ہو کہ گویا خالی ہو۔ خلاصہ کلام یہ کہ اللہ جلّ شانہٗ اُن کے حق میں فرماتا ہے کہ وہ آخری زمانہ میں آنے والے خالص اور کامل بندے ہوں گے جو اپنے کمالِ ایمان اور کمالِ اخلاق اور کمالِ صدق اور کمالِ استقامت اور کمالِ ثابت قدمی اور کمالِ معرفت اور کمالِ خدا دانی کے رُو سے صحابہؓ کے ہم رنگ ہوں گے اور اِس بات کو بخوبی یاد رکھنا چاہیئے کہ درحقیقت اِس آیت میں آخری زمانہ کے کاملین کی طرف اشارہ ہے نہ کسی اور زمانہ کی طرف۔ کیونکہ یہ تو آیت کے ظاہری الفاظ سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کامل لوگ آخری زمانہ میں پیدا ہوں گے جیسا کہ آیت وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ صاف بتلا رہی ہے۔ اور زمانے تین ہیں ایک اوّل جو صحابہؓ کا زمانہ ہے اور ایک اوسط جو مسیح موعود اور صحابہؓ کے درمیان ہے اور ایک آخری زمانہ جو مسیح موعود کا زمانہ اور مصداق آیت وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ کا ہے وہ وہی زمانہ ہے جس میں ہم ہیں جیسا کہ مولوی صدیق حسن مرحوم قنوجی ثم بھوپالوی جو شیخ بٹالوی کے نزدیک مجدّدِ وقت ہیں اپنی کتاب حجج الکرامہ کے صفحہ ۱۵۵ میں لکھتے ہیں کہ آخریّت ایں اُمّت از بدایت الف ثانی شروع گردیدہ آثار تقویٰ از اوّل گُم شدہ بُودند واکنوں سطوت ظاہری اسلام ہم مفقود شدہ تم کلامہٗ اور یہ تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ہی زمانے نیک قرار دئے ہیں ایک صحابہؓ کا زمانہ جس کا اِمتداد اُس حد تک متصوّر ہے جس میں سب سے آخر کوئی صحابیؓ فوت ہوا ہو اور امتداد اس زمانہ کا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے وقت تک ثابت ہوتا ہے اور دوسرا زمانہ وسط ہے جس کو بلحاظ بدعات کثیرہ اُمّ الخبائث کہنا چاہیئے اور جس کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیج اعوج رکھا ہے اور اِس زمانہ کا آخری حِصّہ جو مسیح موعود کے زمانہ اقبال سے مُلحق ہے اس کا حال احادیثِ نبویّہ کے رُو سے نہایت ہی بدتر معلوم ہوتا ہے۔ بیہقی نے اُس کے بارے میں ایک حدیث لکھی

ہے یعنی یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اُس زمانہ کے مولوی اور فتوے دینے والے اُن تمام لوگوں سے بدتر ہوں گے جو اُس وقت رُوئے زمین پر موجود ہوں گے اور حجج الکرامہ میں لکھا ہے کہ درحقیقت مہدی اللہ مسیح موعود پر کُفر کا فتویٰ دینے والے یہی لوگ ہوں گے۔ اِس بات سے اکثر مسلمان بے خبر ہیں کہ احادیث سے ثابت ہے کہ مسیح موعود پر بھی کُفر کا فتویٰ ہو گا چنانچہ وہ پیشگوئی پوری ہوئی۔ غرض وہ زمانہ جو اوّل زمانہ اور مسیح موعود کے زمانہ کے بیچ میں ہے نہایت فاسد زمانہ ہے چنانچہ اس زمانہ کے لوگوں کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں خَیْرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اَوَّلُھَا وَاٰخِرُھَا۔ اَوَّلُھَا فِیْھِمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ وَاٰخِرُھَا فِیْھِمْ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ وَبَیْنَ ذٰلِکَ فَیْجٌ اَعْوَجُ لَیْسُوْا مِنِّیْ وَلَسْتُ مِنْھُمْ۔ یعنی اُمّتیں دو ہی بہتر ہیں ایک اوّل اور آخر اور درمیانی گروہ ایک لشکرِ کج ہے جو دیکھنے میں ایک فوج اور رُوحانیت کے رُو سے مُردہ ہے نہ وہ مجھ سے اور نہ مَیں اُن میں سے ہوں۔ حدیث صحیح میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان فارسی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا لَوْ کَانَ الْاِیْمَانُ مُعَلَّقًا عِنْدَ الثُّرَیَّا لَنَالَہٗ رَجُلٌ مِّنْ فَارِسَ اَوْ رِجَالٌ مِّنْ فَارِسَ۔ پس اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ آخری زمانہ میں فارسی الاصل لوگوں میں سے ایک آدمی پیدا ہو گا کہ وہ ایمان میں ایسا مضبوط ہو گا کہ اگر ایمان ثریّا میں ہوتا تو وہیں سے اُس کو لے آتا۔ اور ایک دوسری حدیث میں اسی شخص کو مہدی کے لفظ سے موسوم کیا گیا ہے اور اس کا ظہور آخری زمانہ میں بلادِ مشرقیہ سے قرار دیا گیا ہے اور دجّال کا ظہور بھی آخری زمانہ میں بلادِ مشرقیہ سے قرار دیا گیا ہے۔ اِن دونوں حدیثوں کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص دجّال کے مقابل پر آنے والا ہے وہ یہی شخص ہے اور سُنّت اللہ بھی اِسی بات کو چاہتی ہے کہ جس مُلک میں دجّال جیسا خبیث پیدا ہوا اُسی مُلک میں وہ طیّب بھی پیدا ہو۔ کیونکہ طبیب جب آتا ہے تو بیماری کی طرف ہی رُخ کرتا ہے اور یہ نہایت تعجب کا مقام ہے کہ بموجب احادیث صحیحہ کے دجّال تو ہندوستان میں پیدا ہوا اور مسیح دمشق کے میناروں پر جا اُترے۔ اِس میں شک نہیں کہ مدینہ منوّرہ سے ہندوستان سمت مشرق میں واقع ہے۔ بلاشُبہ حدیثِ صحیح سے ثابت ہے کہ مشرق کی طرف سے ہی دجّال کا ظہور ہو گا اور مشرق کی طرف سے ہی رایات سُود مہدی اللہ کے ظاہر ہوں گے۔ گویا روزِ اوّل سے یہی مقرر ہے کہ محلِ فِتن بھی مشرق ہی ہے اور محلِ اصلاحِ فِتن بھی مشرق ہی ہے۔

اور اِس جگہ ایک نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جیسا اللہ جلّ شانہٗ نے ظاہر الفاظ آیت میں وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ کا لفظ استعمال کر کے اِس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ لوگ جو کمالات میں صحابہؓ کے رنگ میں ظاہر ہوں گے وہ آخری زمانہ میں آئیں گے۔ ایسا ہی اِس آیت وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ کے تمام حروف کے اعداد سے جو ۱۲۷۵ ہیں اِس بات کی طرف اشارہ کر دیا جو اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ کا مصداق جو فارسی الاصل ہے اپنے

نشاء ظاہر کا بلوغ اس سن میں پورا کرکے صحابہؓ سے مناسبت پیدا کرے گا سو یہی سن ۱۲۷۵ ہجری جو آیت وَ اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ کے حروف کی اعداد سے ظاہر ہوتا ہے اِس عاجز کی بلوغ اور پیدائش ثانی اور تولّدِ رُوحانی کی تاریخ ہے جو آج کے دن تک چونتیس برس ہوتے ہیں۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ کا لفظ جمع ہے پھر ایک پر کیونکر اطلاق پا سکتا ہے تو اِس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اِس کا ایک پر اطلاق کر دیا ہے کیونکہ آپؐ نے اِس آیت کی شرح کے وقت سلمان فارسی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ فارس کے اصل سے ایک ایسا رجل پیدا ہوگا کہ قریب ہے جو ایمان کو ثریّا سے زمین پر لے آوے یعنی وہ ایسے وقت میں پیدا ہوگا کہ جب لوگ بباعث شائع ہو جانے فلسفی خیالات اور پھیل جانے دہریّت اور ٹھنڈے ہو جانے الٰہی محبت کے ایمانی حالت میں نہایت ضعیف اور نکمّے ہو جائیں گے تب خدا تعالیٰ اُس کے ہاتھ سے اور اُس کے وجود کی برکت سے دوبارہ حقیقی ایمان لوگوں کے دلوں میں پیدا کرے گا گویا گم شدہ ایمان آسمان سے پھر نازل ہوگا۔ اور قرآن کریم میں جمع کا لفظ واحد کے لئے آیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو اُمّت کہا گیا ہے حالانکہ وہ ایک فرد تھے۔ ماسوا اس کے اِس آیت میں اس تفہیم کی غرض سے بھی یہ لفظ اختیار کیا گیا ہے کہ تا ظاہر کیا جائے کہ وہ آنے والا ایک نہیں رہے گا بلکہ وہ ایک جماعت ہو جائے گی جن کو خدا تعالیٰ پر سچّا ایمان ہوگا اور وہ اُس ایمان کے رنگ و بُو پائے گی جو صحابہؓ کا ایمان تھا۔ (آئینہ کمالاتِ اِسلام صفحہ ۲۰۸ تا ۲۲۰)

امیّت رحمانیّت کو چاہتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا۔ رحمانیّت کا منشاء اس ضرب المثل سے خوب ظاہر ہے

”کر دے کرا دے اور اُٹھانے والا ساتھ دے“

(لا دے لدا دے)

اور یہ ظہور اسلام کے ساتھ ہوا۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷؍ اپریل ۱۹۰۰ء صفحہ ۷)

یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ یعنی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن اور قرآنی حکمت لوگوں کو سکھلاتا ہے۔

(شہادت القرآن صفحہ ۵۲)

جیسا کہ عِیْسٰی عِنْدَ مَنَارَۃِ دِمَشْقَ کے لفظوں سے چودہ سَو کا عدد معلوم ہوتا ہے وہ مسیح موعود چودھویں صدی کے سر پر آیا اور جیسا کہ اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ کے عدد سے ۱۲۷۵ نکلتے ہیں۔ اِسی زمانہ میں وہ اصلاحِ خلق کے لئے تیار کیا گیا۔

(شہادت القرآن صفحہ ۸۰)

وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ يَعْنِيْ يُزَكِّي النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ اٰخَرِيْنَ مِنْ اُمَّتِهٖ بِتَوَجُّهَاتِهِ الْبَاطِنِيَّةِ كَمَا كَانَ يُزَكِّيْ صَحَابَتَهٗ۔ (حمامة البشریٰ صفحہ ۴۹)

اشاراتِ نصِ قرآنی سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مثیلِ موسیٰ ہیں اور آپ کا سلسلہ خلافت حضرت موسیٰ کے سلسلہ خلافت سے بالکل مشابہ ہے اور جس طرح حضرت موسیٰ کو وعدہ دیا گیا تھا کہ آخری زمانہ میں یعنی جبکہ سلسلہ اسرائیلی نبوت کا انتہا تک پہنچ جائے گا اور بنی اسرائیل کئی فرقے ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کی تکذیب کرے گا یہاں تک کہ بعض بعض کو کافر کہیں گے تب اللہ تعالیٰ ایک خلیفہ حامیٔ دینِ موسیٰ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کرے گا اور وہ بنی اسرائیل کی مختلف بھیڑوں کو اپنے پاس اکٹھی کرے گا اور بھیڑیے اور بکری کو ایک جگہ جمع کر دے گا اور سب قوموں کے لئے ایک حَکَم بن کر اندرونی اختلاف کو درمیان سے اٹھا دے گا اور بُغض اور کینوں کو دُور کر دے گا۔

یہی وعدہ قرآن میں بھی دیا گیا تھا جس کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ اور حدیثوں میں اس کی بہت تفصیل ہے چنانچہ لکھا ہے کہ یہ اُمّت بھی اسی قدر فرقے ہو جائیں گے جس قدر کہ یہود کے فرقے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کی تکذیب اور تکفیر کرے گا اور یہ سب لوگ عناد اور بُغضِ باہمی میں ترقی کریں گے اُس وقت تک کہ مسیح موعود حَکَم ہو کر دُنیا میں آوے اور جب وہ حَکَم ہو کر آئے گا تو بُغض اور شحناء کو دُور کر دے گا اور اُس کے زمانہ میں بھیڑیا اور بکری ایک جگہ جمع ہو جائیں گے چنانچہ یہ بات تمام تاریخ جاننے والوں کو معلوم ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسے ہی وقت میں آئے تھے کہ جب اسرائیلی قوموں میں بڑا تفرقہ پیدا ہو گیا تھا اور ایک دوسرے کے مکفّر اور مکذّب ہو گئے تھے۔ اسی طرح یہ عاجز بھی ایسے وقت میں آیا ہے کہ جب اندرونی اختلافات اِنتہا تک پہنچ گئے اور ایک فرقہ دوسرے کو کافر بنانے لگا۔ اس تفرقہ کے وقت میں اُمّتِ محمدیہ کو ایک حَکَم کی ضرورت تھی سو خدا نے مجھے حَکَم کرکے بھیجا ہے۔ (کتاب البریۃ صفحہ ۲۵۵ تا ۲۵۷ حاشیہ)

پیشگوئی کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تجھ کو علمِ قرآن دیا گیا ہے ایسا علم جو باطل کو نیست کرے گا اور اس پیشگوئی میں فرمایا کہ دُو انسان ہیں جن کو بہت ہی برکت دی گئی ایک وہ معلّم جس کا نام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور ایک یہ متعلّم یعنی اِس کتاب کا لکھنے والا۔ اور یہ اس آیت کی طرف اشارہ ہے جو قرآن شریف میں اللہ جلّ شانہٗ

ترجمہ از مرتّب:۔ وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمّت کے آخرین کا اپنی باطنی توجّہات کے ذریعہ اسی طرح تزکیہ فرمائیں گے جیسا کہ آپؐ اپنے صحابہؓ کا تزکیہ فرمایا کرتے تھے۔
(حمامة البشریٰ صفحہ ۴۹)

فرماتا ہے وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ یعنی اس نبی کے اَور شاگرد بھی ہیں جو ہنوز ظاہر نہیں ہوئے اور آخری زمانہ میں ان کا ظہور ہوگا۔ یہ آیت اِسی عاجز کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جیسا کہ ابھی الہام میں ذکر ہو چکا ہے یہ عاجز روحانی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں میں سے ہے اور یہ پیشگوئی جو قرآنی تعلیم کی طرف اشارہ کرتی ہے اسی کی تصدیق کے لئے کتاب کرامات الصادقین لکھی گئی تھی جس کی طرف کسی مخالف نے رُخ نہیں کیا اور مجھے خدا کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ مجھے قرآن کے حقائق اور معارف کے سمجھنے میں ہر ایک رُوح پر غلبہ دیا گیا ہے اور اگر کوئی مولوی مخالف میرے مقابل پر آتا جیسا کہ مَیں نے قرآنی تفسیر کے لئے بار بار ان کو بُلایا تو خدا اس کو ذلیل اور شرمندہ کرتا۔ سو فہم قرآن جو مجھ کو عطا کیا گیا یہ اللہ جلّ شانہٗ کا ایک نشان ہے۔ مَیں خدا کے فضل سے امید رکھتا ہوں کہ عنقریب دُنیا دیکھے گی کہ مَیں اس بیان میں سچا ہوں۔ (سراج منیر صفحہ ۳۴، ۳۵)

وَاِنَّ اٰدَمَ اٰخِرِالزَّمَانِ حَقِیْقَۃً هُوَ نَبِیُّنَا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ۔ وَالنِّسْبَۃُ بَیْنِیْ وَبَیْنَهٗ کَنِسْبَۃِ مَنْ عَلَّمَ وَتَعَلَّمَ ۔ وَاِلَیْهِ اَشَارَ سُبْحَانَهٗ فِیْ قَوْلِهٖ وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ فَفَکِّرْ فِیْ قَوْلِهٖ اٰخَرِیْنَ۔ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیَّ فَیْضَ هٰذَا الرَّسُوْلِ فَاَتَمَّهٗ وَاَکْمَلَهٗ وَجَذَبَ اِلَیَّ لُطْفَهٗ وَجُوْدَهٗ ۔ حَتّٰی صَارَ وُجُوْدِیْ وُجُوْدَهٗ ۔ فَمَنْ دَخَلَ فِیْ جَمَاعَتِیْ دَخَلَ فِیْ صَحَابَۃِ سَیِّدِیْ خَیْرِ الْمُرْسَلِیْنَ ۔ وَهٰذَا هُوَ مَعْنٰی وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ کَمَا لَا یَخْفٰی عَلَی الْمُتَدَبِّرِیْنَ۔ وَمَنْ فَرَّقَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ الْمُصْطَفٰی ۔ فَمَا عَرَفَنِیْ وَمَا رَاٰی ۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۷۰، ۱۷۱)

جَاءَ فِی الْاٰثَارِ اَنَّهٗ عَلَیْهِ السَّلَامُ بُعِثَ فِی الْاَلْفِ السَّادِسِ مَعَ اَنَّ بَعْثَتَهٗ کَانَ فِی الْاَلْفِ الْخَامِسِ

ترجمہ از اصل :- اور آخر زمانہ کا آدم درحقیقت ہمارے نبی کریم ہیں صلی اللہ علیہ وسلم اور میری نسبت اُس کی جناب کے ساتھ استاد اور شاگرد کی نسبت ہے اور خدا تعالیٰ کا یہ قول کہ وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ اِسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے پس اٰخَرِیْنَ کے لفظ میں فکر کرو اور خدا نے مجھ پر اس رسول کریم کا فیض نازل فرمایا اور اس کو کامل بنایا اور اس نبی کریم کے لُطف اور جُود کو میری طرف کھینچا یہاں تک کہ میرا وجود اس کا وجود ہو گیا پس وہ جو میری جماعت میں داخل ہؤا درحقیقت میرے سردار خیر المرسلین کے صحابہ میں داخل ہؤا اور یہی معنے اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ کے لفظ کے بھی ہیں جیسا کہ سوچنے والوں پر پوشیدہ نہیں اور جو شخص مجھ میں اور مصطفٰے میں تفریق کرتا ہے اُس نے مجھے نہیں دیکھا ہے اور نہیں پہچانا ہے۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۷۰، ۱۷۱)

ترجمہ از اصل :- آثار میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چھٹے ہزار میں مبعوث ہوئے حالانکہ آنجناب کی بعثت

بِالْقَطْعِ وَالْيَقِيْنِ۔ فَلَاشَكَّ اَنَّ هٰذِهٖ اِشَارَةٌ اِلٰى وَقْتِ التَّجَلِّي التَّامِ وَاسْتِيْفَاءِ الْمَرَامِ وَكَمَالِ ظُهُوْرِ الرُّوْحَانِيَّةِ وَ اَيَّامِ تَمَوُّجِ الْفُيُوْضِ الْمُحَمَّدِيَّةِ فِي الْعَالَمِيْنَ۔ وَ هُوَ اٰخِرُ الْاَلْفِ السَّادِسِ الَّذِيْ هُوَ الزَّمَانُ الْمَعْهُوْدُ لِنُزُوْلِ الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ كَمَا يُفْهَمُ مِنْ كُتُبِ النَّبِيِّيْنَ۔ وَاِنَّ هٰذَا الزَّمَانَ هُوَ مَوْطَأُ قَدَمِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ الْحَضْرَةِ الْاَحَدِيَّةِ كَمَا يُفْهَمُ مِنْ اٰيَةِ وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ وَاٰيَاتٍ اُخْرٰى مِنَ الصُّحُفِ الْمُطَهَّرَةِ فَفَكِّرْ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْعَاقِلِيْنَ۔ وَاعْلَمْ اَنَّ نَبِيَّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا بُعِثَ فِي الْاَلْفِ الْخَامِسِ كَذٰالِكَ بُعِثَ فِيْ اٰخِرِ الْاَلْفِ السَّادِسِ بِاتِّخَاذِهٖ بُرُوْزَ الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ وَذَالِكَ ثَابِتٌ بِنَصِّ الْقُرْاٰنِ فَلَا سَبِيْلَ اِلَى الْجُحُوْدِ وَلَا يُنْكِرُهٗ اِلَّا الَّذِيْ كَانَ مِنَ الْعَمِيْنَ۔ اَلَا تُفَكِّرُوْنَ فِيْ اٰيَةِ وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ وَكَيْفَ يَتَحَقَّقُ مَفْهُوْمُ لَفْظِ مِنْهُمْ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ مَوْجُوْدًا فِي الْاٰخِرِيْنَ كَمَا كَانَ فِي الْاَوَّلِيْنَ۔ فَلَا بُدَّ مِنْ تَسْلِيْمِ مَا ذَكَرْنَاهُ وَلَا مَفَرَّ لِلْمُنْكِرِيْنَ۔ وَمَنْ اَنْكَرَ مِنْ اَنَّ بَعْثَ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَتَعَلَّقُ بِالْاَلْفِ السَّادِسِ كَتَعَلُّقِهٖ بِالْاَلْفِ الْخَامِسِ فَقَدْ اَنْكَرَ الْحَقَّ وَنَصَّ الْفُرْقَانِ وَصَارَ مِنَ الظَّالِمِيْنَ۔ بَلِ الْحَقُّ اَنَّ رُوْحَانِيَّتَهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ فِيْ اٰخِرِ الْاَلْفِ السَّادِسِ اَعْنِيْ فِيْ هٰذِهِ الْاَيَّامِ اَشَدَّ وَاَقْوٰى وَاَكْمَلَ مِنْ تِلْكَ الْاَعْوَامِ بَلْ

قطعاً اور یقیناً پانچویں ہزار میں تھی پس شک نہیں کہ یہ اشارہ ہے تجلّی تام کے وقت کی طرف اور استیفاء مرام کی طرف اور رُوحانیّت کے ظہور کے کمال کی طرف اور جہان میں محمدی فیوض کے موج مارنے کے دنوں کی طرف۔ اور یہ چھٹے ہزار کا آخر ہے جو زمانہ کے مسیح موعود کے اُترنے کے لئے مقرر ہے جیسا کہ انبیاء کی کتابوں سے سمجھا جاتا ہے اور یہ زمانہ یقیناً خدا تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت کے قدم رکھنے کی جگہ ہے جیسا کہ آیت وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ اور پاک تحریروں کی دوسری آیتوں سے مفہوم ہوتا ہے پس اگر تو عقلمند ہے تو فکر کر اور جان کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ پانچویں ہزار میں مبعوث ہوئے ایسا ہی مسیح موعود کی بروزی صورت اختیار کرکے چھٹے ہزار کے آخر میں مبعوث ہوئے اور یہ قرآن سے ثابت ہے اِس میں اِنکار کی گنجائش نہیں اور بجز اندھوں کے کوئی اِس معنی سے سرنہیں پھیرتا۔ کیا اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ کی آیت میں فکر نہیں کرتے اور کس طرح مِنْهُمْ کے لفظ کا مفہوم متحقق ہو۔ اگر رسول کریم اٰخَرِيْنَ میں موجود نہ ہوں جیسا کہ پہلوں میں موجود تھے۔ پس جو کچھ ہم نے ذکر کیا اُس کی تسلیم سے چارہ نہیں اور منکروں کے لئے بھاگنے کا راستہ بند ہے اور جس نے اِس بات سے انکار کیا کہ نبی علیہ السلام کی بعثت چھٹے ہزار سے تعلق رکھتی ہے جیسا کہ پانچویں ہزار سے تعلق رکھتی تھی پس اُس نے حق کا اور نصِ قرآن کا انکار کیا بلکہ حق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحانیّت چھٹے ہزار کے آخر میں یعنی ان دنوں میں

كَالْبَدْرِ التَّامِ۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۷۸ تا ۱۸۱)

اِعْلَمُوْا اَنَّ الْخَتْمِيَّةَ اُعْطِيَتْ مِنَ الْاَزَلِ لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ ثُمَّ اُعْطِيَتْ لِمَنْ عَلَّمَهُ رُوْحُهُ وَجَعَلَهُ ظِلَّهُ فَتَبَارَكَ مَنْ عَلَّمَ وَتَعَلَّمَ۔ فَاِنَّ الْخَتْمِيَّةَ الْحَقِيْقِيَّةَ كَانَتْ مُقَدَّرَةً فِي الْاَلْفِ السَّادِسِ الَّذِيْ هُوَ يَوْمٌ سَادِسٌ مِنْ اَيَّامِ الرَّحْمٰنِ۔ لِيُشَابِهَ اَبَا الْبَشَرِ مَنْ كَانَ هُوَ خَاتَمُ نَوْعِ الْاِنْسَانِ۔ وَاقْتَضَتْ مَصَالِحُ اُخْرٰى اَنْ يُبْعَثَ رَسُوْلُنَا فِي الْيَوْمِ الْخَامِسِ اَعْنِيْ فِي الْاَلْفِ الْخَامِسِ بَعْدَ اٰدَمَ۔ لِمَا كَانَ الْيَوْمُ الْخَامِسُ يَوْمَ اجْتِمَاعِ الْعَالَمِ الْكَبِيْرِ وَهُوَ ظِلٌّ لِاٰدَمَ الَّذِيْ اَعَزَّهُ اللّٰهُ وَاَكْرَمَ۔ فَاِنَّ اٰدَمَ جَمَعَ فِيْ نَفْسِهٖ كُلَّ مَا تَفَرَّقَ فِيْهِ وَوَصَلَ كُلَّ مَا تَجَذَّمَ۔ فَلَا شَكَّ اَنَّ الْعَالَمَ الْكَبِيْرَ قَدْ نَزَلَ بِمَنْزِلَةِ خِلْقَةٍ اُوْلٰى لِاٰدَمَ فِيْ صُوَرٍ مُتَنَوِّعَةٍ۔ فَقَدْ خُلِقَ اٰدَمُ بِهٰذَا الْمَعْنٰى فِي الْيَوْمِ الْخَامِسِ مِنْ غَيْرِ شَكٍّ وَّشُبْهَةٍ۔ ثُمَّ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يُنْشِئَ نَبِيَّنَا الَّذِيْ هُوَ اٰدَمُ خَلْقًا اٰخَرَ فِي الْاَلْفِ السَّادِسِ بَعْدَ خِلْقَتِهِ الْاُوْلٰى۔ كَمَا اَنْشَاَ مِنْ قَبْلُ صَفِيَّهُ اٰدَمَ فِيْ اٰخِرِ الْيَوْمِ السَّادِسِ مِنْ اَيَّامِ بَدْوِ الْفِطْرَةِ لِيَتِمَّ الْمُشَابَهَةُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاُخْرٰى۔ وَهُوَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ الْحَقِيْقِيَّةِ وَكَانَ جُمُعَةُ اٰدَمَ ظِلًّا لَهٗ عِنْدَ اُوْلِي النُّهٰى۔ فَاتَّخَذَ عَلٰى طَرِيْقِ الْبُرُوْزِ مَظْهَرًا لَهٗ

بہ نسبت اُن سالوں کے اقویٰ اور اکمل اور اشد ہے بلکہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہے۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۷۸ تا ۱۸۱)

ترجمہ از مرتّب :۔ جان لو کہ ختمیّت ازل سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی ہے پھر وہ اس شخص کو عطا کی گئی ہے جس کو آپ کی رُوح نے تعلیم دی اور اُسے آپ کا ظِلّ بنایا پس مبارک ہے وہ جس نے سکھایا اور وہ بھی جس نے سیکھا پس یقیناً ختمیّتِ حقیقی چھٹے ہزار میں مقدر تھی جو خدائے رحمٰن کے دنوں میں سے چھٹا دن ہے تا وہ ہستی جو خاتم نوعِ انسان ہے حضرت آدم علیہ السلام کے مشابہ ہو جائے اور دیگر مصلحتوں نے بھی تقاضا کیا کہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آدم کے بعد پانچویں ہزار میں مبعوث ہوں کیونکہ پانچواں دن عالم کبیر کے اجتماع کا دن ہے اور آپ حضرت آدم علیہ السلام کے ظِلّ ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے عزّت اور اکرام سے نوازا پس حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی ذات میں ہر متفرّق کو جمع کیا اور ہر شکستہ کو جوڑا۔ پس بیشک عالمِ کبیر حضرت آدم علیہ السلام کی پہلی پیدائش کے طور پر مختلف صورتوں میں نازل ہوا اور آدم اس معنی کے لحاظ سے بلاشک و شبہ پانچویں دن پیدا ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ وہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو آدم ہیں چھٹے ہزار میں پہلی پیدائش کے بعد دوسری پیدائش میں پیدا کرے جیسا کہ اس نے ابتدائے فطرت میں آدم صفی اللہ کو چھٹے دن پیدا کیا تا پہلی خلقت اور دوسری خلقت کی مشابہت پوری ہو جائے اور وہ حقیقی جمعہ کا دن ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کا جمعہ عقلمندوں کے

مِنْ اُمَّتِہٖ۔ وَھُوَلَہٗ کَالْعَیْنِ فِی اسْمِہٖ وَمَاھِیَّتِہٖ۔ وَخَلَقَہُ اللّٰہُ فِی الْیَوْمِ السَّادِسِ بِحِسَابِ اَیَّامِ بَدْوِ نَشْأَۃِ الدُّنْیَا لِتَکْمِیْلِ مُمَاثَلَتِہٖ۔ اَعْنِیْ فِیْ اٰخِرِ الْاَلْفِ السَّادِسِ لِیُشَابِہَ اٰدَمَ فِیْ یَوْمِ خِلْقَتِہٖ۔ وَھُوَ الْجُمُعَۃُ حَقِیْقَۃً لِاَنَّ اللّٰہَ قَدَّرَ اَنَّہٗ یَجْمَعُ الْفِرَقَ الْمُتَفَرِّقَۃَ فِیْ ھٰذَا الْیَوْمِ جَمْعًا بِرَحْمَۃٍ کَامِلَۃٍ وَّیُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ یَعْنِیْ یَتَجَلَّی اللّٰہُ لِجَمْعِھِمْ فَاِذَا ھُمْ مُجْتَمِعُوْنَ عَلٰی مِلَّۃٍ وَّاحِدَۃٍ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا بِمَشِیَّۃٍ وَحَبَسَھُمْ سِجْنُ شِقْوَۃٍ۔ وَاِلَیْہِ اَشَارَ سُبْحَانَہٗ فِیْ قَوْلِہٖ وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ فِیْ سُوْرَۃِ الْجُمُعَۃِ اِیْمَاءً اِلٰی یَوْمِ الْجُمُعَۃِ الْحَقِیْقِیَّۃِ۔ وَاَرَادَ مِنْ ھٰذَا الْقَوْلِ اَنَّ الْمَسِیْحَ الْمَوْعُوْدَ الَّذِیْ یَاْتِیْ مِنْ بَعْدِ خَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ ھُوَ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ حَیْثُ الْمُضَاھَاۃِ التَّامَّۃِ۔ وَرُفَقَاءُہٗ کَالصَّحَابَۃِ۔ وَاَنَّہٗ ھُوَ عِیْسَی الْمَوْعُوْدُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ۔ وَعْدًا مِّنَ اللّٰہِ ذِی الْعِزَّۃِ فِیْ سُوْرَۃِ التَّحْرِیْمِ وَالنُّوْرِ وَالْفَاتِحَۃِ۔ قَوْلُ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْہِ یَمْتَرُوْنَ۔ مَاکَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّاْتِیَ بَعْدَ خَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ اِلَّا الَّذِیْ جُعِلَ وَارِثَہٗ مِنْ اُمَّتِہٖ وَاُعْطِیَ مِنَ اسْمِہٖ وَھُوِیَّتِہٖ وَیَعْلَمُہُ الْعَالِمُوْنَ۔ فَذٰلِکَ مَسِیْحُکُمُ الَّذِیْ تَنْظُرُوْنَ اِلَیْہِ وَلَا تَعْرِفُوْنَہٗ وَاِلَی السَّمَاءِ اَعْیُنُکُمْ تَرْفَعُوْنَ۔ (حاشیہ متعلقہ خطبہ الہامیہ صفحہ ب،ت)

نزدیک اس کا ظل تھا پس اس نے بروزی طور پر اسی کی اُمّت سے اس کا ایک مظہر پیدا کیا پس وہ نام اور ماہیّت کے لحاظ سے اس کا عین ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو دُنیا کی پیدائش کے دنوں کے لحاظ سے چھٹے دِن میں پیدا کیا تا مماثلت پوری ہو یعنی چھٹے ہزار کے آخر میں تا وہ اپنی پیدائش کے دن میں آدم کے مشابہ ہو جائے اور وہ حقیقی طور پر جمعہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مقدر کیا تھا کہ وہ اپنی رحمتِ کاملہ کی وجہ سے اس دن تمام متفرق فرقوں کو جمع کریگا اور بگل میں پھونک لگائی جائے گی یعنی اللہ تعالیٰ ان کے جمع کرنے کے لئے تجلّی فرمائے گا۔ پس سوائے ان لوگوں کے جو اس کی مشیّت کے ماتحت شقی ہوں گے سارے لوگ ایک مِلّت پر جمع ہو جائیں گے اور اسی کی طرف اللہ تعالیٰ کے قول وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ میں اشارہ ہے جو سورۃ جمعہ میں وارد ہوا ہے تا جمعہ حقیقی کے دن کی طرف اشارہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس قول سے ارادہ کیا ہے کہ مسیح موعود جو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آئے گا وہ مشابہتِ کاملہ کی بناء پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی ہو گا اور اس کے ساتھی صحابہؓ کے مثیل ہوں گے اور وہ اس اُمّت کے لئے عیسٰی ہو گا جیسا کہ سورۃ تحریم۔ سورۃ نور اور سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ یہ قول حق ہے جس میں لوگ شک کر رہے ہیں حضرت خاتم الانبیاء کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا سوائے اس کے جو آپ کی اُمّت میں نبی بنایا جائے اور جسے آپ کا نام اور آپ کی ہویّت عطا کی جائے اور اس بات کو عالم لوگ جانتے ہیں اور یہ وہ مسیح ہے جس کا تم انتظار تو کر رہے ہو لیکن اس کی طرف دیکھتے نہیں تمہاری آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ اَوْحٰی اِلَیَّ وَقَالَ کُلُّ بَرَکَۃٍ مِنْ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ فَتَبَارَکَ مَنْ عَلَّمَ وَتَعَلَّمَ۔ یَعْنِیْ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَّمَکَ مِنْ تَاْثِیْرِ رُوْحَانِیَّتِہٖ وَاَفَاضَ اِنَاءَ قَلْبِکَ بِفَیْضِ رَحْمَتِہٖ۔ لِیُدْخِلَکَ فِیْ صَحَابَتِہٖ۔ وَلِیُشْرِکَکَ فِیْ بَرَکَتِہٖ۔ وَلِیُتِمَّ نَبَأَ اللّٰہِ وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ بِفَضْلِہٖ وَمِنَّتِہٖ۔

(حاشیہ متعلقہ حاشیہ خطبہ الہامیہ صفحہ ب)

منجملہ ان دلائل کے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں جو آنے والا مسیح جس کا اس اُمّت کے لئے وعدہ دیا گیا ہے وہ اسی اُمّت میں سے ایک شخص ہوگا۔ بخاری اور مسلم کی وہ حدیث ہے جس میں اِمَامُکُمْ مِنْکُمْ اور اَمَّکُمْ مِنْکُمْ لکھا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ تمہارا امام ہوگا اور تم ہی میں سے ہوگا۔ چونکہ یہ حدیث آنے والے عیسیٰ کی نسبت ہے اور اس کی تعریف میں اِس حدیث میں حَکَمْ اور عدل کا لفظ بطور صفت موجود ہے جو اس فقرہ سے پہلے ہے اسی لئے امام کا لفظ بھی اسی کے حق میں ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اِس جگہ مِنْکُمْ کے لفظ سے صحابہؓ کو خطاب کیا گیا ہے اور وہی مخاطب تھے لیکن ظاہر ہے کہ اُن میں سے تو کسی نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اِس لئے مِنْکُمْ کے لفظ سے کوئی ایسا شخص مراد ہے جو خدا تعالیٰ کے علم میں قائم مقام صحابہؓ ہے اور وہ وہی ہے جس کو اِس آیت مفصلہ ذیل میں قائم مقام صحابہؓ کہا گیا ہے یعنی یہ کہ وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ کیونکہ اِس آیت نے ظاہر کیا ہے کہ وہ رسول کریمؐ کی روحانیت سے تربیت یافتہ ہے اور اسی معنے کی رُو سے صحابہؓ میں داخل ہے اور اس آیت کی تشریح میں یہ حدیث ہے لَوْکَانَ الْاِیْمَانُ مُعَلَّقًا بِالثُّرَیَّا لَنَالَہٗ رَجُلٌ مِّنْ فَارِسَ اور چونکہ اس فارسی شخص کی طرف وہ صفت منسوب کی گئی ہے جو مسیح موعود اور مہدی سے مخصوص ہے یعنی زمین جو ایمان اور توحید سے خالی ہو کر ظلم سے بھر گئی ہے پھر اس کو عدل سے پُر کرنا۔ لہٰذا یہی شخص مہدی اور مسیح موعود ہے اور وہ مَیں ہوں اور جس طرح کسی دوسرے مدعی مہدویت کے وقت میں کسوف خسوف رمضان میں آسمان پر نہیں ہؤا ایسا ہی تیرہ سو برس کے عرصہ میں کسی نے خدا تعالیٰ کے الہام سے علم پاکر یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس پیشگوئی لَنَالَہٗ رَجُلٌ مِّنْ فَارِسَ کا مصداق مَیں ہوں اور پیشگوئی اپنے الفاظ سے بتلا رہی ہے کہ یہ شخص آخری زمانہ

ترجمہ از مرتب :۔ اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی اور فرمایا کُلُّ بَرَکَۃٍ مِنْ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَتَبَارَکَ مَنْ عَلَّمَ وَتَعَلَّمَ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں اپنی رُوحانیّت کی تاثیر کے ذریعہ سکھایا اور اپنی رحمت کا فیض تیرے دِل کے برتن میں ڈال دیا تا تجھے اپنے صحابہؓ میں داخل کریں اور تجھے اپنی برکت میں شریک کریں اور تا اللہ تعالیٰ کی خبر وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ اس کے فضل اور اس کے احسان سے پوری ہو۔

(حاشیہ متعلقہ حاشیہ خطبہ الہامیہ صفحہ ب)

میں ہوگا جبکہ لوگوں کے ایمانوں میں بہت ضعف آجائے گا اور فارس الاصل ہوگا اور اس کے ذریعہ سے زمین پر دوبارہ ایمان قائم کیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ صلیبی زمانہ سے زیادہ تر ایمان کو صدمہ پہنچانے والا اَور کوئی زمانہ نہیں یہی زمانہ ہے جس میں کہہ سکتے ہیں کہ گویا ایمان زمین پر سے اُٹھ گیا جیسا کہ اس وقت لوگوں کی عملی حالتیں اور انقلابِ عظیم جو بدی کی طرف ہؤا ہے اور قیامت کے علاماتِ صغریٰ جو مدت سے ظہور میں آچکی ہیں صاف بتلا رہی ہیں اور نیز آیت وَّاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جیسے صحابہؓ کے زمانہ میں زمین پر شرک پھیلا ہؤا تھا ایسا ہی اس زمانہ میں بھی ہوگا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اس حدیث اور اس آیت کو باہم ملانے سے یقینی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ پیشگوئی مہدیٔ آخرالزمان اور مسیح آخرالزمان کی نسبت ہے کیونکہ مہدی کی تعریف میں یہ لکھا ہے کہ وہ زمین کو عدل سے بھر دے گا جیسا کہ وہ ظلم اور جَور سے بھری ہوئی تھی اور مسیح آخرالزمان کی نسبت لکھا ہے کہ وہ دوبارہ ایمان اور امن کو دُنیا میں قائم کردے گا اور شرک کو محو کرے گا اور مِلَلِ باطلہ کو ہلاک کردے گا پس ان حدیثوں کا مآل بھی یہی ہے کہ مہدی اور مسیح کے زمانہ میں وہ ایمان جو زمین پر سے اُٹھ گیا اور ثریا تک پہنچ گیا تھا پھر دوبارہ قائم کیا جائے گا اور ضرور ہے کہ اول زمین ظلم سے پُر ہوجائے اور ایمان اُٹھ جائے کیونکہ جبکہ لکھا ہے کہ تمام زمین ظلم سے بھر جائے گی تو ظاہر ہے کہ ظلم اور ایمان ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے ناچار ایمان اپنے اصلی مقر کی طرف جو آسمان ہے چلا جائے گا۔ غرض تمام زمین کا ظلم سے بھرنا اور ایمان کا زمین پر سے اُٹھ جانا اس قسم کی مصیبتوں کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بعد ایک ہی زمانہ ہے جس کو مسیح کا زمانہ یا مہدی کا زمانہ کہتے ہیں اور احادیث نے اس زمانہ کو تین پیرایوں میں بیان کیا ہے رجل فارس کا زمانہ۔ مہدی کا زمانہ۔ مسیح کا زمانہ۔ اور اکثر لوگوں نے قلتِ تدبر سے ان تین ناموں کی وجہ سے تین علیحدہ علیحدہ شخص سمجھ لئے ہیں اور تین قومیں اُن کے لئے مقرر کی ہیں۔ ایک فارسیوں کی قوم۔ دوسری بنی اسرائیل کی قوم۔ تیسری بنی فاطمہ کی قوم۔ مگر یہ تمام غلطیاں ہیں حقیقت میں یہ تینوں ایک ہی شخص ہے جو تھوڑے تھوڑے تعلق کی وجہ سے کسی قوم کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ایک حدیث سے جو کنزالعمال میں موجود ہے سمجھا جاتا ہے کہ اہلِ فارس یعنی بنی فارس بنی اسحاق میں سے ہیں پس اِس طرح پر وہ آنے والا مسیح اسرائیلی ہؤا اور بنی فاطمہ کے ساتھ امّہاتی تعلق رکھنے کی وجہ سے جیسا کہ مجھے حاصل ہے فاطمی بھی ہؤا۔ پس گویا وہ نصف اسرائیلی ہؤا اور نصف فاطمی ہؤا جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے۔ ہاں میرے پاس فارس ہونے کے لئے بجُز الہامِ الٰہی کے اَور کچھ ثبوت نہیں لیکن یہ الہام اس زمانہ کا ہے کہ جب اس دعویٰ کا نام و نشان بھی نہیں تھا یعنی آج سے بیس برس پہلے براہینِ احمدیہ میں لکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے خُذُوا التَّوْحِیْدَ اَلتَّوْحِیْدَ یَا اَبْنَآءَ الْفَارِسِ یعنی توحید کو پکڑو۔ توحید کو پکڑو اے فارس کے بیٹو۔ اور پھر دوسری جگہ یہ الہام ہے اِنَّ الَّذِیْنَ صَدُّوْا

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ رَدَّ عَلَيْهِمْ رَجُلٌ مِّنْ فَارِسَ شَكَرَ اللّٰهُ سَعْيَهٗ یعنی جو لوگ خدا کی راہ سے روکتے تھے ایک شخص فارسی اصل نے اُن کا رَدّ لکھا۔ خدا نے اس کی کوشش کا شکریہ کیا۔ ایسا ہی ایک اَور جگہ براہین احمدیہ میں یہ الہام ہے لَوْ کَانَ الْاِیْمَانُ مُعَلَّقًا بِالثُّرَیَّا لَنَالَهٗ رَجُلٌ مِّنْ فَارِسَ یعنی اگر ایمان ثریّا پر اُٹھایا جاتا اور زمین سراسر بے ایمانی سے بھر جاتی تب بھی یہ آدمی جو فارسی الاصل ہے اس کو آسمان پر سے لے آتا اور بنی فاطمہ ہونے میں یہ الہام ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الصِّھْرَ وَالنَّسَبَ۔ اُشْکُرْ نِعْمَتِیْ رَئَیْتَ خَدِیْجَتِیْ یعنی تمام حمد اور تعریف اُس خدا کے لئے ہے جس نے تمہیں فخر دامادی سادات اور فخر علوّ نسب جو دونوں مماثل ومشابہ ہیں عطا فرمایا یعنی تمہیں سادات کا داماد ہونے کی فضیلت عطا کی اور نیز بنی فاطمہ اُمّہات میں سے پیدا کر کے تمہارے نسب کو عزّت بخشی اور میری نعمت کا شکر کر کہ تُو نے میری خدیجہ کو پایا یعنی بنی اسحاق کی وجہ سے ایک تو آبائی عزّت تھی اور دوسری بنی فاطمہ ہونے کی عزّت اس کے ساتھ ملحق ہوئی اور سادات کی دامادی کی طرف اِس عاجز کی بیوی کی طرف اشارہ ہے جو سیّدہ سندی سادات دہلی میں سے ہیں۔ میردرد کے خاندان سے تعلق رکھنے والے۔ اسی فاطمی تعلق کی طرف اس کشف میں اشارہ ہے جو آج سے تیس برس پہلے براہینِ احمدیہ میں شائع کیا گیا جس میں دیکھا تھا کہ حضرت پنج تن سیّد الکونین حسنین فاطمۃ الزہرا اور علی رضی اللّٰہ عنہ عین بیداری میں آئے اور حضرت فاطمہ رضی اللّٰہ عنہا نے کمال محبت اور مادرانہ عطوفت کے رنگ میں اِس خاکسار کا سر اپنی ران پر رکھ لیا اور عالمِ خاموشی میں ایک غمگین صورت بنا کر بیٹھے رہے اُسی روز سے مجھ کو اس خونی آمیزش کے تعلق پر یقینِ کلّی ہؤا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۷ تا ۲۰)

منعم علیہم کے کامل طور پر مصداق باعتبار کثرت کمیّت اور صفائی کیفیت اور نعمائے حضرت احدیّت ازرُوئے نصِ صریح قرآنی اور احادیثِ متواترہ حضرت مُرسل یزدانی دو گروہ ہیں ایک گروہ صحابہؓ اور دوسرا گروہ جماعتِ مسیح موعود۔ کیونکہ یہ دونوں گروہ آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے ہاتھ کے تربیت یافتہ ہیں کسی اپنے اجتہاد کے محتاج نہیں۔ وجہ یہ کہ پہلے گروہ میں رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم موجود تھے جو خدا سے براہِ راست ہدایت پا کر وہی ہدایت نبوّت کی پاک توجّہ کے ساتھ صحابہ رضی اللّٰہ عنہم کے دِل میں ڈالتے تھے اور ان کے لئے مربّی بے واسطہ تھے اور دوسرے گروہ میں مسیح موعود ہے جو خدا سے الہام پاتا اور حضرت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی روحانیت سے فیض اُٹھاتا ہے لہٰذا اس کی جماعت بھی اجتہادِ خشک کی محتاج نہیں ہے جیسا کہ آیت وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ سے سمجھا جاتا ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۸۰)

آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے بعث اوّل کا زمانہ ہزار پنجم تھا جو اسم محمد کا مظہر تجلّی تھا یعنی یہ بعث اوّل

جلالی نشان ظاہر کرنے کے لئے تھا مگر بعث دوم جس کی طرف آیتِ کریمہ وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ میں اشارہ ہے وہ مظہر تجلی اسم احمد ہے جو اسم جمالی ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۶)

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حسب آیت وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ دوبارہ تشریف لانا بجز صورت بروز غیر ممکن تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحانیت نے ایک ایسے شخص کو اپنے لئے منتخب کیا جو خلق اور خو اور ہمت اور ہمدردیٔ خلائق میں اس کے مشابہ تھا اور مجازی طور پر اپنا نام احمد اور محمد اس کو عطا کیا تا یہ سمجھا جائے کہ گویا اس کا ظہور بعینہٖ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور تھا۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۱)

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا فرضِ منصبی جو تکمیل اشاعت ہدایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بوجہ عدم وسائل اشاعت غیر ممکن تھا اس لئے قرآن شریف کی آیت وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمدِ ثانی کا وعدہ دیا گیا ہے۔ اس وعدہ کی ضرورت اسی وجہ سے پیدا ہوئی کہ تا دوسرا فرضِ منصبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یعنی تکمیل اشاعت ہدایتِ دین جو آپ کے ہاتھ سے پورا ہونا چاہیئے تھا اُس وقت بباعث عدم وسائل پُورا نہیں ہوا۔ سو اس فرض کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آمدِ ثانی سے جو بروزی رنگ میں تھی ایسے زمانہ میں پُورا کیا جبکہ زمین کی تمام قوموں تک اِسلام پہنچانے کیلئے وسائل پَیدا ہو گئے تھے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۱ حاشیہ)

یاد رہے کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ کے دو ہاتھ جلالی اور جمالی ہیں۔ اِس نمونہ پر چونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ جل شانہٗ کے مظہرِ اتم ہیں لہٰذا خدا تعالیٰ نے آپ کو بھی وہ دونوں ہاتھ رحمت اور شوکت کے عطا فرمائے۔ جمالی ہاتھ کی طرف اِس آیت میں اشارہ ہے کہ قرآن شریف میں ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ[1] یعنی ہم نے تمام دُنیا پر رحمت کر کے تجھے بھیجا ہے اور جلالی ہاتھ کی طرف اِس آیت میں اشارہ ہے وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی[2] اور چونکہ خدا تعالیٰ کو منظور تھا کہ یہ دونوں صفتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے اپنے وقتوں میں ظہور پذیر ہوں اِس لئے خدا تعالیٰ نے صفتِ جلالی کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعہ سے ظاہر فرمایا اور صفتِ جمالی کو مسیح موعود اور اس گروہ کے ذریعہ سے کمال تک پہنچایا۔ اِسی کی طرف اِس آیت میں اشارہ ہے وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ۔

(اربعین ۳ صفحہ ۳۲ حاشیہ)

قَالَ وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ۔ فَاَشَارَ اِلَی الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ وَجَمَاعَتِہٖ۔ وَالَّذِیْنَ

ترجمہ از مرتب:۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ۔ اِس آیت میں مسیح موعود اور اس کی جماعت

[1] سورۃ الانبیاء : ۱۰۸ [2] سورۃ الانفال : ۱۸

اتَّبَعُوْهُمْ۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۵۰)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جلالی اور جمالی دونوں کے جامع تھے۔ مکّہ کی زندگی جمالی رنگ میں تھی اور مدینہ کی زندگی جلالی رنگ میں۔ اور پھر یہ دونوں صفتیں اُمّت کے لئے اِس طرح پر تقسیم کی گئیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو جلالی رنگ کی زندگی عطا ہوئی اور جمالی رنگ کی زندگی کے لئے مسیح موعود کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مظہر ٹھہرایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے حق میں فرمایا گیا کہ یَضَعُ الْحَرْبَ یعنی لڑائی نہیں کرے گا اور یہ خدا تعالیٰ کا قرآن شریف میں وعدہ تھا کہ اس حصّے کو پُورا کرنے کے لئے مسیح موعود اور اس کی جماعت کو ظاہر کیا جائے گا جیسا کہ آیت وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ میں اس کی طرف اشارہ ہے اور آیت حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَھَا[1] بھی یہی اشارہ کر رہی ہے۔

(اربعین ۴ صفحہ ۱۳، ۱۴)

خدا کے کلام میں یہ امر قرار یافتہ تھا کہ دوسرا حصّہ اِس اُمّت کا وہ ہوگا جو مسیح موعود کی جماعت ہوگی اسی لئے خدا تعالیٰ نے اِس جماعت کو دوسروں سے علیحدہ کرکے بیان کیا جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ یعنی اُمّتِ محمدیہ میں سے ایک اَور فرقہ بھی ہے جو بعد میں آخری زمانہ میں آنے والے ہیں اور حدیثِ صحیح میں ہے کہ اس آیت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ سلمان فارسی کی پُشت پر مارا اور فرمایا لَوْ کَانَ الْاِیْمَانُ مُعَلَّقًا بِالثُّرَیَّا لَنَالَہٗ رَجُلٌ مِّنْ فَارِسَ اور یہ میری نسبت پیشگوئی تھی جیسا کہ خدا تعالیٰ نے براہین احمدیہ میں اس پیشگوئی کی تصدیق کے لئے وہی حدیث بطور وحی میرے پر نازل کی اور وحی کی رُو سے مجھ سے پہلے اس کا کوئی مصداق معیّن نہ تھا اور خدا کی وحی نے مجھے معیّن کر دیا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۶۷ حاشیہ)

رجل فارس اور مسیح موعود ایک ہی شخص کے نام ہیں جیسا کہ قرآن شریف میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور وہ ہے وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ یعنی آنحضرتؐ کے اصحاب میں سے ایک اَور فرقہ ہے جو ابھی ظاہر نہیں ہوا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اصحاب وہی کہلاتے ہیں جو نبی کے وقت میں ہوں اور ایمان کی حالت میں اُس کی صُحبت سے مشرّف ہوں اور اس سے تعلیم اور تربیت پاویں۔ پس اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنے والی قوم میں ایک نبی ہوگا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بروز ہوگا اِس لئے اس کے اصحاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

کی طرف اشارہ ہے نیز ان لوگوں کی طرف جو ان کی پیروی کریں گے۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۵۰)

---

[1] سورۃ محمد: ۵

اصحاب کہلائیں گے اور جس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے رنگ میں خدا تعالیٰ کی راہ میں دینی خدمتیں ادا کی تھیں وہ اپنے رنگ میں ادا کریں گے۔ بہرحال یہ آیت آخری زمانہ میں ایک نبی کے ظاہر ہونے کی نسبت ایک پیشگوئی ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ایسے لوگوں کا نام اصحاب رسول اللہ رکھا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا۔ آیت ممدوحہ بالا میں یہ تو نہیں فرمایا وَاٰخَرِیْنَ مِنَ الْاُمَّۃِ بلکہ یہ فرمایا وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ اور ہر ایک جانتا ہے کہ مِنْھُمْ کی ضمیر اصحاب رضی اللہ عنہم کی طرف راجع ہے لہٰذا وہی فرقہ مِنْھُمْ میں داخل ہو سکتا ہے جس میں ایسا رسول موجود ہو کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بروز ہے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۶۷)

روحانی زندگی کے لحاظ سے ہم تمام نبیوں میں سے اعلیٰ درجے پر اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ سمجھتے ہیں اور قرآن شریف کی آیت وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ میں اس زندگی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کا یہی مطلب ہے کہ جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باطنی فیض پایا ایسا ہی آخری زمانہ میں ہوگا کہ مسیح موعود اور اس کی جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض پائے گی جیسا کہ اب ظہور میں آرہا ہے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد نہم صفحہ ۱۶)

یہ ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ ایک دفعہ بلکہ ہزار دفعہ دُنیا میں بروزی رنگ میں آجائیں اور بروزی رنگ میں اور کمالات کے ساتھ اپنی نبوت کا اظہار بھی کریں اور یہ بروز خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک قرار یافتہ عہد تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ اور انبیاء کو اپنے بروز پر غیرت نہیں ہوتی کیونکہ وہ انہی کی صورت اور انہی کا نقش ہے لیکن دوسرے پر ضرور غیرت آتی ہے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۲۳)

جو کچھ اللہ نے چاہا تھا اس کی تکمیل دو ہی زمانوں میں ہونی تھی ایک آپ کا زمانہ اور ایک آخری مسیح و مہدی کا زمانہ یعنی ایک زمانہ میں تو قرآن اور سچی تعلیم نازل ہوئی لیکن اُس تعلیم پر فیج اعوج کے زمانہ نے پردہ ڈال دیا جس پردہ کا اُٹھایا جانا مسیح کے زمانہ میں مقدر تھا جیسے کہ فرمایا کہ رسولِ اکرمؐ نے ایک تو موجودہ جماعت یعنی جماعتِ صحابہ کرامؓ کا تزکیہ کیا اور ایک آنے والی جماعت کا جس کی شان میں لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ آیا ہے۔ سو یہ ظاہر ہے کہ خدا نے بشارت دی کہ ضلالت کے وقت اللہ تعالیٰ اس دین کو ضائع نہ کرے گا بلکہ آنے والے زمانہ میں خدا حقائقِ قرآنیہ کو کھول دے گا۔ آثار میں ہے کہ آنے والے مسیح کی ایک یہ فضیلت ہوگی کہ وہ قرآنی فہم اور معارف کا صاحب ہوگا اور صرف قرآن سے استنباط کرکے لوگوں کو اُن کی غلطیوں سے متنبہ کرے گا جو حقائقِ قرآن کی ناواقفیت سے لوگوں میں پیدا ہوگئی ہوں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۲، ۵۳)

تمہارے معاملات خدا اور خلق کے ساتھ ایسے ہونے چاہئیں جس میں رضا الٰہی مطلق ہی ہو پس اس سے تم نے وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ الخ کے مصداق بننا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۷)

اللہ تعالیٰ کے اُس وعدہ واثقہ کی رُو سے کہ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ[1] اس زمانہ میں بھی آسمان سے ایک معلّم آیا جو اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ کا مصداق اور موعود ہے۔ وہ وہی ہے جو تمہارے درمیان بول رہا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۵)

اللہ تعالیٰ نے اِس جماعت کو جو مسیح موعود کے ساتھ ہے یہ درجہ عطا فرمایا ہے کہ وہ صحابہؓ کی جماعت سے ملنے والی ہے وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ۔ مفسّروں نے مان لیا ہے کہ یہ مسیح موعود والی جماعت ہے اور یہ گویا صحابہؓ کی ہی جماعت ہوگی اور وہ مسیح موعود کے ساتھ نہیں درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی ساتھ ہے کیونکہ مسیح موعود آپؐ ہی کے ایک جمال میں آئے گا اور تکمیل تبلیغِ اشاعت کے کام کے لئے وہ مامور ہوگا۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۴۶ مورخہ ۲۴؍ دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

صحابہؓ کی جماعت اتنی ہی نہ سمجھو جو پہلے گذر چکے بلکہ ایک اَور گروہ بھی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ذکر کیا ہے۔ وہ بھی صحابہؓ ہی میں داخل ہے جو احمدؐ کے بروز کے ساتھ ہوں گے۔ چنانچہ فرمایا وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ یعنی صحابہؓ کی جماعت کو اسی قدر نہ سمجھو بلکہ مسیح موعود کے زمانہ کی جماعت بھی صحابہ ہی ہوگی۔

اِس آیت کے متعلق مفسّروں نے مان لیا ہے کہ یہ مسیح موعود کی جماعت ہے۔ مِنْھُمْ کے لفظ سے پایا جاتا ہے کہ باطنی توجّہ اور استفاضہ صحابہؓ ہی کی طرح ہوگا۔ صحابہؓ کی تربیت ظاہری طور پر ہوئی تھی مگر اُن کو کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے نیچے ہوں گے اِس لئے سب علماء نے اس گروہ کا نام صحابہ ہی رکھا ہے جیسے ان صفاتِ[2] اربعہ کا ظہور اُن صحابہ میں ہوا تھا ویسے ہی ضروری ہے کہ اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ کی مصداق جماعت صحابہ میں بھی ہو۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳ مورخہ ۲۴؍ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

اِس غرض کے لئے اللہ تعالیٰ نے اِس سلسلہ کو قائم کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اتباع کے آثار اور ثمرات ہر وقت پائے جاتے ہیں۔ اِس وقت بھی وہ خدا جو ہمیشہ سے ناطق خدا ہے اپنا لذیذ کلام دُنیا کی ہدایت کے لئے بھیجتا ہے اور قرآن شریف کے اعجاز کا ثبوت وقت بھی دے رہا ہے۔ یہ قرآن شریف ہی کا معجزہ ہے کہ جو ہم تحدّی کر رہے ہیں کہ ہمارے بالمقابل قرآن شریف کے حقائق و معارف عربی زبان میں

---

[1] سورۃ الحجر: ۱۰ [2] ربّ۔ رحمٰن۔ رحیم۔ مالکِ یوم الدین کی صفات کی طرف اشارہ ہے۔

لکھو اور کسی کو یہ قدرت نہیں ہوئی کہ مقابلہ کے لئے نکل سکے۔ ہمارا مقابلہ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ ہے کیونکہ وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ جو فرمایا گیا ہے۔ اِس وقت جو تعلیم الکتاب والحکمت ہو رہی ہے اور ایک قوم کو اِس وقت بھی صحابہؓ کی طرح اللہ تعالیٰ بنانا چاہتا ہے اس کی اصل غرض یہی ہے کہ تا قرآن شریف کا معجزہ ثابت ہو۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ اوّل)

اِس زمانہ (میں) بھی قرآن شریف کے کلام کے اعجاز کے لئے مسیح موعود کو کلام کا معجزہ دیا گیا ہے۔ اسی طرح پر جیسے دوسرے خوارق اور نشانات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشانات اور خوارق کے ثبوت کے لئے دیئے گئے ہیں جس جس قسم کے نشانات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے تھے اسی رنگ پر اِس سلسلہ میں اللہ تعالےٰ نے نشانات کو رکھا ہے کیونکہ یہ سلسلہ اسی نقشِ قدم پر ہے اور دراصل وہی سلسلہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بروزی آمد کی پہلے ہی سے پیشگوئی ہو چکی تھی اور اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ میں یہ وعدہ کیا گیا تھا۔ پس جیسے آپ کو اس وقت کلام کا معجزہ اور نشان دیا گیا تھا اور قرآن شریف جیسی لانظیر کتاب آپ کو ملی اسی طرح پر اس رنگ میں آپ کی اس بروزی آمد میں بھی کلام کا نشان دیا گیا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

یہ لوگ جمع بین الصلوٰتین پر روتے ہیں حالانکہ مسیح کی قسمت میں بہت سے اجتماع رکھے ہیں۔ کسوف و خسوف کا اجتماع ہوا یہ بھی میرا ہی نشان تھا اور وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ[1] بھی میرے ہی لئے ہیں اور اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ بھی ایک جمع ہی ہے کیونکہ اوّل اور آخر کو ملایا گیا ہے اور یہ عظیم الشان جمع ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برکات اور فیوض کی زندگی پر دلیل اور گواہ ہے اور پھر یہ بھی جمع ہے کہ خدا تعالیٰ نے تبلیغ کے سارے سامان جمع کر دئیے ہیں۔ چنانچہ مطبع کے سامان۔ کاغذ کی کثرت۔ ڈاکخانوں۔ تار۔ ریل اور دخانی جہازوں کے ذریعہ کل دُنیا ایک شہر کا حکم رکھتی ہے اور پھر نت نئی ایجادیں اس جمع کو اَور بھی بڑھا رہی ہیں کیونکہ اسبابِ تبلیغ جمع ہو رہے ہیں۔ اب فونوگراف سے بھی تبلیغ کا کام لے سکتے ہیں اور اس سے بہت عجیب کام نکلتا ہے۔ اخباروں اور رسالوں کا اجراء۔ غرض اِس قدر سامان تبلیغ کے جمع ہوئے ہیں کہ اس کی نظیر کسی پہلے زمانہ میں ہم کو نہیں ملتی۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اغراض میں سے ایک تکمیلِ دین بھی تھا جس کے لئے فرمایا گیا تھا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ[2] اب اِس تکمیل میں دو خوبیاں تھیں ایک تکمیلِ ہدایت اور دوسری تکمیلِ اشاعتِ ہدایت۔ تکمیلِ ہدایت کا زمانہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا پہلا زمانہ تھا اور تکمیل اشاعتِ ہدایت کا زمانہ آپ کا دوسرا زمانہ ہے جبکہ اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا

---

[1] سورۃ التکویر: ۸ [2] سورۃ المائدہ: ۴

یَلْحَقُوْا بِھِمْ کا وقت آنے والا ہے اور وہ وقت اَب ہے یعنی میرا زمانہ یعنی مسیح موعود کا زمانہ۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ نے تکمیلِ ہدایت اور تکمیل اشاعتِ ہدایت کے زمانوں کو بھی اس طرح پر ملایا ہے اور یہ بھی عظیم الشان جمع ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۳ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ اوّل)

اِسلام پر تین زمانے گذرے ہیں ایک قرونِ ثلاثہ اس کے بعد فیجِ اَعوج کا زمانہ جس کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ لَیْسُوْا مِنِّیْ وَلَسْتُ مِنْھُمْ یعنی نہ وہ مجھ سے ہیں اور نہ میں اُن سے ہوں اور تیسرا زمانہ مسیح موعود کا زمانہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ سے مُلحق ہے بلکہ حقیقت میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے۔ فیجِ اَعوج کا ذکر اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بھی فرماتے تو یہی قرآن شریف ہمارے ہاتھ میں ہے اور اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ صاف ظاہر کرتا ہے کہ کوئی زمانہ ایسا بھی ہے جو صحابہؓ کے مشرب کے خلاف ہے اور واقعات بتا رہے ہیں کہ اس ہزار سال کے درمیان اسلام بہت ہی مشکلات اور مصائب کا نشانہ رہا ہے۔ معدودے چند کے سوا سب نے اِسلام کو چھوڑ دیا اور بہت سے فرقے معتزلہ اور اباحتی وغیرہ پیدا ہو گئے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

یہ وہی وقت اور جمعہ ہے جس میں وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ کی پیشگوئی پوری ہوتی ہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور بروزی رنگ میں ہوا ہے اور ایک جماعت صحابہؓ کی پھر قائم ہوئی ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۸ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ جو فرمایا گیا ہے یہ مسیح موعود کے زمانہ کے لئے ہے اور اس کے مِنْھُمْ کے وہی معنے ہیں جو اِمَامُکُمْ مِنْکُمْ میں مِنْکُمْ سے مراد ہیں۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ گروہ بھی صحابہ ہی کا گروہ ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ کہہ کر جو خدا تعالیٰ اِس جماعت کو صحابہؓ سے ملاتا ہے تو صحابہؓ کا سا اخلاص اور وفاداری اور ارادت اُن میں بھی ہونی چاہیئے۔ صحابہؓ نے کیا کیا؟ جس طرح پر انہوں نے خدا تعالیٰ کے جلال کے اظہار کو دیکھا اسی طریق کو انہوں نے اختیار کر لیا یہاں تک کہ اس کی راہ میں جانیں دے دیں۔ وہ جانتے تھے کہ بیویاں بیوہ ہوں گی۔ بچے یتیم رہ جائیں گے۔ لوگ ہنسی کریں گے مگر انہوں نے اِس امر کی ذرا پرواہ نہ کی۔ انہوں نے سب کچھ گوارا کیا مگر اس ایمان کے اظہار سے نہ رُکے جو وہ اللہ اور اس کے رسول پر لائے تھے حقیقت میں ان کا ایمان بڑا قوی تھا۔ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

قرآن ہر میدان میں فتحیاب ہے۔ آپؐ کو خاتم الانبیاء ٹھہرایا اور اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ کہہ کر مسیح موعود کو اپنا بروز بتا دیا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ کے قائم مقام توریت کی ایک آیت تھی جس سے مسیح اسرائیلی کا گروہ مراد تھا اور یہاں اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ سے ہمارا گروہ۔ (البدر جلد ۲ ۶/۷ مورخہ ۲۷ ؍ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۲)

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ میں سے ایک اَور گروہ بھی ہے مگر ابھی وہ ان سے ملے نہیں۔ ان کے اَخلاق۔ عادات۔ صدق اور اخلاص صحابہؓ کی طرح ہوگا۔

(الحکم جلد ۱۱ ۳۵ مورخہ ۳۰ ؍ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

۱۰۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

عورتوں پر جمعہ کی فرضیت کے متعلق فرمایا:۔

اس میں تعامل کو دیکھ لیا جاوے اور جو امر سُنّت اور حدیث سے ثابت ہے اس سے زیادہ ہم اس کی تفسیر کیا کرسکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو جب مستثنیٰ کر دیا ہے تو پھر یہ حکم صرف مردوں کیلئے رہا۔ (البدر جلد ۲ ۳۴ مورخہ ۱۱ ؍ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۶۶)

دیہات میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کے متعلق سوال ہُوا تو فرمایا:۔

شہر میں اپنے گاؤں سے آنا بجز حرج کے متصوّر نہیں۔ چونکہ گاؤں میں مسجد ہے۔ اگر شہر کے نزدیک بھی ہے تب بھی ایک محلہ کا حکم رکھتا ہے۔ کسی حدیث میں اس ممانعت کا نام و نشان نہیں۔ بلا شُبہ جمعہ جائز ہے۔ خدا تعالیٰ کے دین میں حرج نہیں۔ (مکتوبات جلد ۵ جزو ۵ صفحہ ۴ ۵ مکتوب ۱۱ بنام حضرت منشی حبیب الرحمٰن صاحبؓ)

۱۱۔ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ کہ تم زمین میں مُنتشر ہوجاؤ اور خدا کے فضل کی تلاش کرو۔ (البدر جلد ۳ ۱۱ مورخہ ۱۶ ؍ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ یعنی اپنے ربّ کو بہت ہی یاد کرو تا دوزخ کی آگ سے نجات پاؤ۔ (ست بچن صفحہ ۹۶)

اللہ تعالیٰ کا بہت ذکر کرو تا کہ فلاح پاؤ۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۲۱ مورخہ ۲۴؍جون ۱۹۰۴ء صفحہ اوّل)

اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ جس طرح پر ذہنی تعلق ہوتا ہے اور کثرتِ تکرار ایک بات کو حافظہ میں محفوظ کر دیتی ہے اسی طرح ایک رُوحانی تعلق بھی ہے اس میں بھی تکرار کی حاجت ہے۔ بدُوں تکرار وہ رُوحانی پیوند اور رشتہ قائم نہیں رہتا اور پھر سچ تو یہ ہے کہ اصل بات نیّت پر موقوف ہے جو شخص صرف حِفظ کرنے کی نیّت سے پڑھتا ہے وہ تو وہیں تک رہتا ہے۔

حضرت امام جعفر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مَیں ایک آیت اِتنی مرتبہ پڑھتا ہوں کہ وہ آخر وحی ہو جاتی ہے۔ صوفی بھی اِسی طرف گئے ہیں۔ اور وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا کے یہ معنے ہیں کہ اِس قدر ذکر کرو کہ گویا اللہ تعالیٰ کا نام کنٹھ ہو جاوے۔ انبیاء علیہم السّلام کے طرزِ کلام میں یہ بات عام ہوتی ہے کہ وہ ایک امر کو بار بار اور مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی اصل غرض یہی ہوتی ہے کہ تا مخلوق کو نفع پہنچے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۰؍نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

۸. هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ۝

وہ شخص بڑا نادان ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ آئے دن ہم پر بوجھ پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بار بار فرماتا ہے وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی خدا تعالیٰ کے پاس آسمان و زمین کے خزانے ہیں۔ منافق ان کو سمجھ نہیں سکتے لیکن مومن اس پر ایمان لاتا اور یقین کرتا ہے میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر سب لوگ جو اِس وقت موجود ہیں اور اِس سلسلہ میں داخل ہیں یہ سمجھ کر کہ آئے دن ہم پر بوجھ پڑتا ہے وہ دست بردار ہو جائیں اور بُخل سے یہ کہیں کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے تو خدا تعالیٰ ایک اَور قوم پیدا کر دے گا جو ان سب اخراجات کا بوجھ خوشی سے اُٹھائے اور پھر بھی سلسلہ کا اِحسان مانے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۲ مورخہ ۲۴؍جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

۱۰. يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۝

رزق دو ۲ قسم کے ہوتے ہیں ایک ابتلاء کے طور پر، دوسرے اصطفاء کے طور پر۔ رزق ابتلاء کے طور

پر تو وہ رزق ہے جس کو اللہ سے کوئی واسطہ نہیں رہتا بلکہ یہ رزق انسان کو خدا سے دُور ڈالتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اسی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کر کے فرمایا ہے لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ تمہارے مال تم کو ہلاک نہ کر دیں۔ اور رزق اصطفاء کے طور پر وہ ہوتا ہے جو خدا کے لئے ہو۔ ایسے لوگوں کا متولّی خدا ہو جاتا ہے اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے وہ اس کو خدا ہی کا سمجھتے ہیں اور اپنے عمل سے ثابت کر دکھاتے ہیں۔ صحابہؓ کی حالت دیکھو! جب امتحان کا وقت آیا تو جو کچھ کسی کے پاس تھا اللہ میں دے دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سب سے اوّل کمبل پہن کر آگئے۔ پھر اُس کمبل کی جزا بھی دی کہ سب سے اوّل خلیفہ وہی ہوئے۔ غرض یہ ہے کہ اصلی خوبی، خیر اور رُوحانی لذّت کے لئے وہی مال کام آسکتا ہے جو خدا کی راہ میں خرچ کیا جاوے۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۲۲ مورخہ ۲۳ جون ۱۸۹۹ء صفحہ اوّل)

۱۱. وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○

اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ جو کچھ ہم نے عقل اور علم اور فہم اور ہُنر وغیرہ تم کو دیا ہے وہ سب خدا کی راہ میں لگاؤ۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۰۵)

۱۲. وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○

منافقانہ رجوع درحقیقت رجوع نہیں ہے لیکن جو خوف کے وقت میں ایک شقی کے دِل میں واقعی طور پر ایک ہراس اور اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے اُس کو خدا تعالیٰ نے رجوع میں ہی داخل رکھا ہے اور سُنّت اللہ نے ایسے رجوع کو دنیوی عذاب میں تاخیر پڑنے کا موجب ٹھہرایا ہے گو اُخروی عذاب ایسے رجوع سے ٹل نہیں سکتا مگر دُنیوی عذاب ہمیشہ ٹلتا رہا ہے اور دوسرے وقت پر پڑتا رہا ہے۔ قرآن کو غور سے دیکھو اور جہالت

کی باتیں مت کرو اور یاد رہے کہ آیت لَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا کو اس مقام سے کچھ تعلق نہیں۔ اِس آیت کا تو مدعا یہ ہے کہ جب تقدیر مُبرم آجاتی ہے تو ٹل نہیں سکتی مگر اِس جگہ بحث تقدیر معلّق میں ہے جو مشروط بشرائط ہے جبکہ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں آپ فرماتا ہے کہ مَیں استغفار اور تضرّع اور غلبہ خوف کے وقت میں عذاب کو کفار کے سر پر سے ٹال دیتا ہوں اور ٹالتا رہا ہوں پس اس سے بڑھ کر سچّا گواہ اَور کون ہو سکتا ہے جس کی شہادت قبول کی جائے۔ (ضمیمہ انوار الاسلام: اشتہار انعامی تین ہزار روپیہ صفحہ ۱۰)

سُورۃ التّغابن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

۱۶ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ۝

عِلم وحکمت کی مانند کوئی مال نہیں۔ یہ وہی مال ہے جس کی نسبت پیشگوئی کے طور پر لکھا تھا کہ مسیح دُنیا میں آکر اس مال کو اس قدر تقسیم کرے گا کہ لوگ لیتے لیتے تھک جائیں گے۔ یہ نہیں کہ مسیح درم و دینار کو جو مصداق آیت اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ہے جمع کرے گا اور دانستہ ہر ایک کو مالِ کثیر دے کر فتنہ میں ڈال دے گا مسیح کی پہلی فطرت کو بھی ایسے مال سے مناسبت نہیں۔ وہ خود انجیل میں بیان کر چکا ہے کہ مومن کا مال درم و دینار نہیں بلکہ جواہر حقائق و معارف اُس کا مال ہیں یہی مال انبیاء خدائے تعالیٰ سے پاتے ہیں اور اِسی کو تقسیم کرتے ہیں۔ اِسی مال کی طرف اشارہ ہے اِنَّمَآ اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ هُوَ الْمُعْطِيْ۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۵۶، ۶۵۷)

اَمْوَالُكُمْ میں عورتیں داخل ہیں۔ عورت چونکہ پردہ میں رہتی ہے اِس لئے اس کا نام بھی پردہ ہی میں رکھا ہے اور اِس لئے بھی کہ عورتوں کو انسان مال خرچ کر کے لاتا ہے۔ مال کا لفظ مائل سے لیا گیا ہے یعنی جس کی طرف طبعاً توجہ اور رغبت کرتا ہے۔ عورت کی طرف بھی چونکہ طبعاً توجہ کرتا ہے اِس لئے اس کو مال میں داخل فرمایا ہے۔ مال کا لفظ اِس لئے رکھا تا کہ عام محبوبات پر حاوی نہ ہو ورنہ اگر صرف نِسَاء کا لفظ ہوتا تو اولاد اور عورت دو چیزیں قرار دی جاتیں اور اگر محبوبات کی تفصیل کی جاتی تو پھر دس جزو میں بھی ختم نہ ہوتا۔ غرض مال سے مراد كُلَّمَا يَمِيْلُ اِلَيْهِ الْقَلْبُ ہے اولاد کا ذکر اِس لئے کیا کہ اِنسان اولاد کو جگر کا ٹکڑا اور اپنا وارث سمجھتا ہے۔

مختصر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور انسان کے محبوبات میں ضد ہے۔ دونوں باتیں ایک جا جمع نہیں ہو سکتیں۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۴۶ مورخہ ۲۴؍ دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

مال اور اولاد تمہاری دشمن ہیں ان سے ڈرتے رہو کیونکہ اگر زندہ رہے تو ممکن ہے کہ نافرمان ہو۔ مرتد ہو جاوے۔ بدکار ہو۔ چور یا ڈاکو بن جاوے۔ مَر جاوے تو پھر ویسے ابتلاء آجاتا ہے۔ پس ہر حالت میں موجب فتنہ اور ابتلاء ہوتی ہے مگر جب مومن کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہوتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے کہ اگر یہ بچہ مَر گیا تو کیا ہوا اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا[1] دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ۱۱ بچے فوت ہوئے۔ ایمان تو وہ ہوتا ہے جس میں لغزش نہ ہو اور ایسے ایمان والا خدا تعالیٰ کو بہت محبوب ہوتا ہے ہاں اگر بچہ خدا سے زیادہ محبوب ہے تو مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسا شخص خدا تعالیٰ پر ایمان کا دعویٰ کر سکے اور وہ کیوں ایسا دعویٰ کرتا ہے ہم نہیں جان سکتے کہ ہماری اولادیں کیسی ہوں گی صالح ہوں گی یا بدمعاش۔ اور نہ اُن کے ہم پر کوئی اِحسان ہیں اور خدا تعالیٰ کے تو ہم پر لاکھوں لاکھ احسان ہیں۔ پس سخت ظالم ہے وہ شخص کہ اس خدا سے تعلق توڑ کر اولاد کی طرف تعلق لگاتا ہے ہاں خدا تعالیٰ کے حقوق کے ساتھ مخلوق کے حقوق کا بھی خیال رکھو۔ اگر خدا تعالیٰ پر تمہارا کامل ایمان ہو تو پھر تو تمہارا یہ مذہب ہونا چاہیئے کہ ؎

ہر چہ از دوست میرسد نیکو است

اور اس ایمان والے کے شیطان قریب بھی نہیں آتا۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸، ۳۹ مورخہ ۱۰/۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۴)

بہت سے لوگ ہیں جو چھپے ہوئے مُرتد ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو باوجود اس کے کہ وہ بیعت میں داخل ہیں اور پھر مجھے خط لکھتے ہیں کہ فلاں شخص نے مجھے کہا کہ جب تک تیرے گھر بیٹا نہ ہو وہ کیونکر سچا ہو سکتا ہے۔ یہ ناوان اِتنا نہیں جانتے کہ کیا خدا نے مجھے اِس لئے بھیجا ہے کہ مَیں لوگوں کو بیٹے دوں ؟ کسی کے گھر بیٹا ہو یا بیٹی مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں اور نہ مَیں اِس لئے بھیجا گیا ہوں مَیں تو اِس لئے آیا ہوں کہ تا لوگوں کے ایمان درست ہوں۔ پس جو لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے ایمان درست ہوں اور خدا تعالیٰ سے ان کا سچا تعلق پیدا ہو ان کو میرے ساتھ تعلق رکھنا چاہیئے خواہ بیٹے مریں یا جئیں۔

جو لوگ ایسے خطوط لکھتے ہیں یا اپنے دِل میں ایسے خیالات رکھتے ہیں وہ یاد رکھیں اور خوب یاد رکھیں کہ

---

[1] سُورۃ البقرۃ : ۱۰۷

وہ مجھ پر نہیں خدا تعالیٰ پر اعتراض کرتے ہیں۔ یقیناً سمجھو کہ میرے پیچھے آنا ہے اور سچے مسلمان بننا ہے تو پہلے بیٹوں کو مار لو۔ بابا فرید کا مقولہ بہت صحیح ہے کہ جب کوئی بیٹا مر جاتا تو لوگوں سے کہتے کہ ایک کتورہ (کُتّی کا بچہ) مر گیا ہے اس کو دفن کر دو۔

پس کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق پیدا نہیں کر سکتا جب تک باوجود اولاد کے بے اولاد نہ ہو اور باوجود مال کے دل میں مفلس ومحتاج نہ ہو اور باوجود دوستوں کے بے یار و مددگار نہ ہو۔ یہ ایک مشکل مقام ہے جو انسان کو حاصل کرنا چاہیئے اسی مقام پر پہنچ کر وہ سچا خدا پرست بنتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۶، ۷)

اولاد چیز کیا ہے۔ بچپن سے ماں اس پر جان فدا کرتی ہے مگر بڑے ہو کر دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے لڑکے اپنی ماں کی نافرمانی کرتے ہیں اور اس سے گستاخی سے پیش آتے ہیں۔ پھر اگر فرمانبردار بھی ہوں تو دُکھ اور تکلیف کے وقت وہ اس کو ہٹا نہیں سکتے۔ ذرا سا پیٹ میں درد ہو تو تمام عاجز آجاتے ہیں نہ بیٹا کام آسکتا ہے نہ باپ نہ ماں نہ کوئی اَور عزیز اگر کام آتا ہے تو صرف خدا پس ان کو اس قدر محبت اور پیار سے فائدہ کیا جس سے شرک لازم آئے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ اولاد اور مال انسان کیلئے فتنہ ہوتے ہیں۔ دیکھو اگر خدا کسی کو کہے کہ تیری کُل اولاد جو مر چکی ہے زندہ کر دیتا ہوں مگر پھر میرا تجھ سے کچھ تعلق نہ ہو گا تو کیا اگر وہ عقلمند ہے اپنی اولاد کی طرف جانے کا خیال بھی کرے گا۔

پس انسان کی نیک بختی یہی ہے کہ خدا کو ہر ایک چیز پر مقدم رکھے۔ جو شخص اپنی اولاد کی وفات پر بُرا مناتا ہے وہ بخیل بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ اس امانت کے دینے میں جو خدا تعالیٰ نے اس کے سپرد کی تھی بخل کرتا ہے اور بخیل کی نسبت حدیث میں آتا ہے کہ اگر وہ جنگل کے دریاؤں کے برابر بھی عبادت کرے تو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ پس ایسا شخص جو خدا سے زیادہ کسی چیز کی محبت کرتا ہے اس کی عبادت نماز روزہ بھی کسی کام کے نہیں۔ حضرت ایوبؑ کی طرف دیکھو کہ وہ کیسے صابر تھے۔ خدا تعالیٰ نے اُن کا ذکر قرآن شریف میں بھی کیا ہے کہ وہ میرا ایک صابر بندہ ہے۔ پہلی کتابوں میں ان کا ذکر بالتفصیل لکھا ہے کہ شیطان نے خدا تعالیٰ سے کہا کہ ایوب کیوں صبر نہ کرے کہ اس کو تُو نے مال دیا ہے۔ دولت دی ہے۔ غلام دئیے ہیں۔ نوکر چاکر دئیے ہیں۔ اولاد دی ہے۔ بیوی دی ہے۔ صحت دی ہے۔ تو خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ تُو اس کو آزما۔ اس پر پہلے تو اس کی بھیڑ بکریاں ماری گئیں پھر اَور بڑے بڑے جانور مارے گئے مگر پھر بھی حضرت ایوبؑ نے صبر سے کام لیا۔ اس پر شیطان نے کہا کہ ابھی اس کے پاس دولت اور غلام اور اولاد ہے وہ صبر کیوں نہ کرے۔ اس پر اس کے غلام بھی مَر گئے پھر انہوں نے صبر کیا یہاں تک کہ ہوتے ہوتے سب کچھ ہلاک ہو گیا۔

ایک وہ اور ان کی بیوی رہ گئیں۔ پھر بھی شیطان نے کہا کہ ابھی ان کی صحت درست ہے۔ اس پر ان کو جذام ہوگیا یعنی کوڑھ ہوگیا پھر بھی انہوں نے صبر سے کام لیا۔ پس جب وہ اِس طرح صابر اور صادق ثابت ہوئے تو خدا تعالیٰ نے ان کو آگے سے بھی زیادہ مال و دولت، غلام، لونڈیاں اور اولاد عطا فرمائی اور صحت بھی عطا فرمائی۔ پس جب اِنسان صبر سے کام لے تو اس کو سب کچھ ہی مل رہتا ہے۔ اِنسان کو چاہیئے جو کام کرے خدا تعالیٰ کی رضا کے مطابق کرے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۸ مورخہ ۲۲ر اگست ۱۹۰۸ء صفحہ ۱ ۲)

سُورۃ الطّلاق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

وَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡهُنَّ
بِمَعۡرُوۡفٍ وَّاَشۡهِدُوۡا ذَوَىۡ عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ وَاَقِيۡمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ذٰلِكُمۡ
يُوۡعَظُ بِهٖ مَنۡ كَانَ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ
يَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا ۝ وَّيَرۡزُقۡهُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَحۡتَسِبُ ؕ وَمَنۡ يَّتَوَكَّلۡ
عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسۡبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمۡرِهٖ ؕ قَدۡ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَىۡءٍ
قَدۡرًا ۝

ذٰلِكُمۡ يُوۡعَظُ بِهٖ مَنۡ كَانَ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ یعنی یہ اس کو وعظ کیا جاتا ہے جو تم میں سے اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لاتا ہے۔ (شہادۃ القرآن صفحہ ۳۵)

ہمیشہ دیکھنا چاہیئے کہ ہم نے تقویٰ و طہارت میں کہاں تک ترقّی کی ہے اس کا معیار قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے متقی کے نشانوں میں ایک یہ بھی نشان رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ متقی کو مکروہاتِ دُنیا سے آزاد کر کے اُس کے کاموں کا خود متکفّل ہو جاتا ہے جیسے کہ فرمایا وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا ۙ وَّيَرۡزُقۡهُ مِنۡ حَيۡثُ

لَا یَحْتَسِبُ ؔ جو شخص خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ ہر ایک مصیبت میں اُس کے لئے راستہ مخلصی کا نکال دیتا ہے اور اُس کے لئے ایسے روزی کے سامان پیدا کر دیتا ہے کہ اس کے علم و گمان میں نہ ہوں یعنی یہ بھی ایک علامت متقی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ متقی کو نابکار ضرورتوں کا محتاج نہیں کرتا۔ مثلاً ایک دکاندار یہ خیال کرتا ہے کہ دروغگوئی کے سوا اس کا کام نہیں چل سکتا اِس لئے دروغگوئی سے باز نہیں آتا اور جھوٹ بولنے کیلئے وہ مجبوری ظاہر کرتا ہے لیکن یہ امر ہرگز سچ نہیں خدا تعالیٰ متقی کا خود محافظ ہوجاتا اور اُسے ایسے موقع سے بچا لیتا ہے جو خلافِ حق پر مجبور کرنے والے ہوں۔ یاد رکھو جب اللہ تعالیٰ کو کسی نے چھوڑا تو خدا نے اُسے چھوڑ دیا۔ جب رحمٰن نے چھوڑ دیا تو ضرور شیطان اپنا رشتہ جوڑے گا۔

یہ نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کمزور ہے وہ بڑی طاقت والی ذات ہے جب اُس پر کسی امر میں بھروسہ کرو گے وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ ؔ لیکن جو لوگ اِن آیات کے پہلے مخاطب تھے وہ اہلِ دین تھے۔ اُن کی ساری فکریں محض دینی امور کے لئے تھیں اور اُن کے دُنیوی امور حوالہ بخدا تھے اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کو تسلّی دی کہ مَیں تمہارے ساتھ ہوں۔ غرض برکاتِ تقویٰ میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ متقی کو اُن مصائب سے مخلصی بخشتا ہے جو دینی امور کے حارج ہوں۔ ایسا ہی اللہ تعالیٰ متقی کو خاص طور پر رزق دیتا ہے۔ یہاں مَیں معارف کے رزق کا ذکر کروں گا۔ آنحضرتؐ کو باوجود اُمّی ہونے کے تمام جہان کا مقابلہ کرنا تھا جس میں اہلِ کتاب۔ فلاسفر۔ اعلیٰ درجہ کے علمی مذاق والے لوگ اور عالم فاضل شامل تھے لیکن آپؐ کو روحانی رزق اِس قدر ملا کہ آپؐ سب پر غالب آئے اور ان سب کی غلطیاں نکالیں۔ یہ رُوحانی رزق تھا جس کی نظیر نہیں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۴، ۳۵)

اگر کوئی تم میں سے خدا سے ڈرے گا یعنی طلاق دینے میں جلدی نہیں کرے گا اور کسی بے ثبوت شُبہ پر بگڑ نہیں جائے گا تو خدا اس کو تمام مشکلات سے رہائی دے گا اور اس کو ایسے طور سے رزق پہنچائے گا کہ اسے علم نہیں ہوگا کہ مجھے کہاں سے رزق آتا ہے۔ (آریہ دھرم صفحہ ۴۷)

اِنسان مشکلات اور مصائب میں مُبتلا ہوتا ہے اور حاجات مختلف رکھتا ہے اُن کے حل اور روا ہونے کے لئے بھی تقویٰ ہی کو اصول قرار دیا ہے۔ معاش کی تنگی اور دوسری تنگیوں سے راہِ نجات تقویٰ ہی ہے فرمایا مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ خدا اتّقی کے لئے ہر مشکل میں ایک مخرج پیدا کر دیتا ہے اور اس کو غیب سے اُس سے مخلصی پانے کے اسباب بہم پہنچا دیتا ہے۔ اُس کو ایسے طور سے رزق دیتا ہے کہ اس کو پتہ بھی نہ لگے۔

اب غور کر کے دیکھ لو کہ انسان اس دُنیا میں چاہتا کیا ہے۔ انسان کی بڑی سے بڑی خواہش دُنیا میں یہی ہے

کہ اس کو سُکھ اور آرام ملے اور اُس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک ہی راہ مقرر کی ہے جو تقوٰی کی راہ کہلاتی ہے اور دوسرے لفظوں میں اُس کو قرآن کریم کی راہ کہتے ہیں اور اس کا نام صراطِ مستقیم رکھتے ہیں۔

کوئی یہ نہ کہے کہ کفار کے پاس بھی مال و دولت اور املاک ہوتے ہیں اور وہ اپنی عیش و عشرت میں مُنہمک اور مست رہتے ہیں۔ مَیں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ وہ دُنیا کی آنکھ میں بلکہ ذلیل دُنیا داروں اور ظاہر پرستوں کی آنکھ میں خوش معلوم دیتے ہیں مگر درحقیقت وہ ایک جلن اور دُکھ میں مُبتلا ہوتے ہیں۔ تم نے ان کی صورت کو دیکھا ہے مگر مَیں ایسے لوگوں کے قلب پر نگاہ کرتا ہوں۔ وہ ایک سعیر اور سلاسل و اغلال میں جکڑے ہوئے ہیں۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

جو خدا کے آگے تقوٰی اختیار کرتا ہے خدا اس کے لئے ہر ایک تنگی اور تکلیف سے نکلنے کی راہ بتادیتا ہے اور فرمایا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وہ متقی کو ایسی راہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے رزق آنے کا خیال وگمان بھی نہیں ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے وعدے ہیں۔ وعدوں کو سچّا کرنے میں خدا سے بڑھ کر کون ہے۔ پس خدا پر ایمان لاؤ۔ خدا سے ڈرنے والے ہرگز ضائع نہیں ہوتے۔ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۔ یہ ایک وسیع بشارت ہے۔ تم تقوٰی اختیار کرو خدا تمہارا کفیل ہوگا۔ اس کا جو وعدہ ہے وہ سب پورا کر دے گا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۴)

قبض بسط رزق کا سِرّ ایسا ہے کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک طرف تو مومنوں سے اللہ تعالےٰ نے قرآن شریف میں وعدے کئے ہیں مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ یعنی جو اللہ پر توکّل کرتا ہے اس کیلئے اللہ کافی ہے مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ جو اللہ تعالیٰ کے لئے تقوٰی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے کہ اس کو معلوم بھی نہیں ہوتا.... جبکہ اس قِسم کے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں پھر باوجود ان وعدوں کے دیکھا جاتا ہے کہ کئی آدمی ایسے دیکھے جاتے ہیں جو صالح اور متقی، نیک بخت ہوتے ہیں اور ان کا شعارِ اسلام صحیح ہوتا ہے مگر وہ رزق سے تنگ ہیں رات کو ہے تو دن کو نہیں اور دن کو ہے تو رات کو نہیں ..... غرض یہ دیکھا جاتا ہے کہ اِس قِسم کے واقعات ہوتے ہیں مگر تجربہ دلالت کرتا ہے کہ یہ امور خدا کی طرف منسوب نہیں ہوسکتے۔ ہمارا یہ مذہب ہے کہ وہ وعدے جو خدا تعالیٰ نے کئے ہیں کہ متقیوں کو خود اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں بیان کیا ہے یہ سب سچے ہیں اور سِلسلہ اہل اللہ کی طرف دیکھا جاوے تو کوئی ابرار میں سے ایسا نہیں ہے کہ بھُوکا مَرا ہو۔ مومنوں نے جن پر شہادت دی اور جن کو اتقیاء مان لیا گیا یہی نہیں کہ وہ فقر و فاقہ سے بچے ہوئے تھے گو اعلیٰ درجہ کی خوشحالیاں نہ ہوں مگر اس قِسم کا اِضطراری فقر و فاقہ بھی کبھی نہیں ہوا

کہ عذاب محسوس کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر اختیار کیا ہوُا تھا مگر آپؐ کی سخاوت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود آپؐ نے اختیار کیا ہوُا تھا نہ کہ بطور سزا تھا۔ غرض اِس راہ میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ بعض ایسے لوگ دیکھے جاتے ہیں کہ بظاہر متقی اور صالح ہوتے ہیں مگر رزق سے تنگ ہوتے ہیں ان سب حالات کو دیکھ کر آخر یہی کہنا پڑتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے وعدے تو سب سچے ہیں لیکن اِنسانی کمزوری ہی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ر اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

متقی کو ہر تنگی سے نجات ملتی ہے۔ اس کو ایسی جگہ سے رزق دیا جاتا ہے کہ اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ر اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

اوائل میں جو سچّا مسلمان ہوتا ہے اُسے صبر کرنا پڑتا ہے۔ صحابہؓ پر بھی ایسے زمانے آئے ہیں کہ پتے کھا کھا کر گذارہ کیا۔ بعض وقت روٹی کا ٹکڑا بھی میسّر نہیں آتا تھا۔ کوئی اِنسان کسی کے ساتھ بھلائی نہیں کر سکتا جب تک خدا بھلائی نہ کرے۔ جب اِنسان تقویٰ اختیار کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کے واسطے دروازہ کھول دیتا ہے مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا خدا تعالیٰ پر سچّا ایمان لاؤ اس سے سب کچھ حاصل ہوگا۔ استقامت چاہیئے۔ انبیاء کو جس قدر درجات ملے ہیں استقامت سے ملے ہیں خالی خشک نمازوں اور روزوں سے کیا ہو سکتا ہے۔ (البدر جلد اوّل نمبر ۴ مورخہ ۲۱ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۰)

انسان جب متقی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے اور اُس کے غیر میں فرقان رکھ دیتا ہے اور پھر اس کو ہر تنگی سے نجات دیتا ہے نہ صرف نجات بلکہ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ پس یاد رکھو جو خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہے خدا تعالیٰ اس کو مشکلات سے رہائی دیتا ہے اور اِنعام و اکرام بھی کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

متقی کے لئے خدا تعالیٰ ساری راحتوں کے سامان مہیا کر دیتا ہے مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًاۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ پس خوشحالی کا اصول تقویٰ ہے لیکن حصولِ تقویٰ کے لئے نہیں چاہیئے کہ ہم شرطیں باندھتے پھریں تقویٰ اختیار کرنے سے جو مانگو گے ملے گا خدا تعالیٰ رحیم و کریم ہے تقویٰ اختیار کرو جو چاہو گے وہ دے گا۔ جس قدر اولیاء اللہ اور اقطاب گذرے ہیں انہوں نے جو کچھ حاصل کیا تقویٰ ہی سے حاصل کیا اگر وہ تقویٰ اختیار نہ کرتے تو وہ بھی دُنیا میں معمولی انسانوں کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے۔ دس بیس کی نوکری کر لیتے یا کوئی اَور حرفہ یا پیشہ اختیار کر لیتے اس سے زیادہ کچھ نہ ہوتا مگر آج جو عروج اُن کو ملا اور جس قدر شہرت اور عزت انہوں نے پائی یہ سب تقویٰ ہی کی بدولت تھی۔ انہوں نے ایک موت اختیار کی اور زندگی اُس کے بدلہ میں پائی۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۱ر فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

جو خدا کا متقی اور اُس کی نظر میں متقی بنتا ہے اس کو خدا تعالیٰ ہر ایک قسم کی تنگی سے نکالتا اور ایسی طرز سے رزق دیتا ہے کہ اُسے گمان بھی نہیں ہوتا کہ کہاں سے اور کیونکر آتا ہے۔ خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ برحق ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے وعدوں کا پورا کرنے والا ہے اور بڑا رحیم کریم ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کا بنتا ہے وہ اُسے ہر ذِلت سے نجات دیتا اور خود اس کا حافظ و ناصر بن جاتا ہے مگر وہ جو ایک طرف دعوٰی اِتقاء کرتے ہیں اور دوسری طرف شاکی ہوتے ہیں کہ ہمیں وہ برکات نہیں ملے ان دونو میں ہم کس کو سچا کہیں اور کس کو جھوٹا؟ خدا تعالیٰ پر ہم کبھی اِلزام نہیں لگا سکتے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ خدا تعالیٰ اپنے وعدوں کے خلاف نہیں کرتا ہم اس مدعی کو جھوٹا کہیں گے۔ اصل یہ ہے کہ اُن کا تقوٰی یا اُن کی اِصلاح اس حد تک نہیں ہوتی کہ خدا تعالیٰ کی نظر میں قابلِ وقعت ہو یا وہ خدا کے متقی نہیں ہوتے لوگوں کے متقی اور ریاکار انسان ہوتے ہیں سو اُن پر بجائے رحمت اور برکت کے لعنت کی مار ہوتی ہے جس سے سرگرداں اور مشکلاتِ دُنیا میں مُبتلا رہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ متقی کو کبھی ضائع نہیں کرتا وہ اپنے وعدوں کا سچا اور پُورا ہے۔

رزق بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ یہ بھی تو ایک رزق ہے کہ بعض لوگ صُبح سے شام تک ٹوکری ڈھوتے ہیں اور بُرے حال سے شام کو دو تین آنے ان کے ہاتھ میں آتے ہیں۔ یہ بھی تو رزق ہے مگر لعنتی رزق ہے نہ رزق مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ۔

حضرت داؤدؑ زبور میں فرماتے ہیں کہ مَیں بچہ تھا جوان ہُوا۔ جوانی سے اَب بڑھاپا آیا مگر مَیں نے کبھی کسی متقی اور خدا ترس کو بھیک مانگتے نہ دیکھا اور نہ اس کی اَولاد کو دربدر دھکے کھاتا اور ٹکڑے مانگتے دیکھا۔

یہ بالکل سچ اور راست ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو ضائع نہیں کرتا اور ان کو دوسرے کے آگے ہاتھ پسارنے سے محفوظ رکھتا ہے بھلا اِتنے جو انبیاء ہوئے ہیں۔ اَولیاء گذرے ہیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ بھیک مانگا کرتے تھے؟ یا اُن کی اولاد پر یہ مصیبت پڑی ہو کہ وہ دربدر خاک بسر ٹکڑے کے واسطے پھرتے ہوں؟ ہرگز نہیں۔ میرا تو اعتقاد ہے کہ اگر ایک آدمی باخدا اور سچا متقی ہو تو اُس کی سات پُشت تک بھی خدا رحمت اور برکت کا ہاتھ رکھتا اور اُن کی خود حفاظت فرماتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

خدا تعالیٰ پر ایمان ہے تو خدا تعالیٰ رزاق ہے۔ اس کا وعدہ ہے کہ جو تقوٰی اختیار کرتا ہے اس کا ذمہ دار میں ہوں مَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّہٗ مَخۡرَجًا ۙ وَّ یَرۡزُقۡہُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ یعنی باریک سے باریک گناہ جو ہے اُسے خدا تعالیٰ سے ڈر کر جو چھوڑ دے گا خدا تعالیٰ ہر ایک مشکل سے اُسے نجات دے گا۔ یہ اِس لئے کہا کہ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم کیا کریں ہم تو چھوڑنا چاہتے ہیں مگر ایسی مشکلات آ پڑتی ہیں کہ پھر کرنا پڑ جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ وہ اُسے ہر مشکل سے بچالے گا۔ پھر آگے ہے

یَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ یعنی ایسی راہ سے اُسے روزی دے گا کہ اس کے گمان میں بھی وہ نہ ہوگی۔
(البدر جلد ۲ ۱۲ مورخہ ۱۰/اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۲)

خدا تعالیٰ کی یہ عادت ہرگز نہیں ہے کہ جو اس کے حضور عاجزی سے گر پڑے وہ اسے خائب وخاسر کرے اور ذلّت کی موت دیوے۔ جو اس کی طرف آتا ہے وہ کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ جب سے دُنیا پیدا ہوئی ہے ایسی نظیر ایک بھی نہ ملے گی کہ فلاں شخص کا خدا سے سچا تعلق تھا اور پھر وہ نامراد رہا۔ خدا تعالیٰ بندے سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی نفسانی خواہش اس کے حضور پیش نہ کرے اور خالص ہو کر اس کی طرف جُھک جاوے جو اس طرح جُھکتا ہے اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور ہر ایک مشکل سے خود بخود اس کے واسطے راہ نکل آتی ہے جیسے کہ وہ خود وعدہ فرماتا ہے مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا۔ وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ اِس جگہ رزق سے مراد صرف روٹی وغیرہ نہیں بلکہ عزت علم وغیرہ سب باتیں جن کی اِنسان کو ضرورت ہے اس میں داخل ہیں۔ خدا تعالیٰ سے جو ذرّہ بھر بھی تعلق رکھتا ہے وہ کبھی ضائع نہیں ہوتا مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ[1] ہمارے ملک ہندوستان میں نظام الدین صاحب اور قطب الدین صاحب اولیاء اللہ کی جو عزت کی جاتی ہے وہ اِسی لئے ہے کہ خدا تعالیٰ سے اُن کا سچا تعلق تھا اور اگر یہ نہ ہوتا تو تمام انسانوں کی طرح وہ بھی زمینوں میں ہل چلاتے معمولی کام کرتے مگر خدا تعالیٰ کے سچے تعلق کی وجہ سے لوگ ان کی مٹی کی بھی عزت کرتے ہیں۔
(البدر جلد ۲ ۱۴ مورخہ ۲۴/اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۷)

جو شخص بہت دعا کرتا ہے اس کے واسطے آسمان سے توفیق نازل کی جاتی ہے کہ گناہ سے بچے اور دعا کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گناہ سے بچنے کے لئے کوئی نہ کوئی راہ اُسے مِل جاتی ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا یعنی جو امور اُسے کشاں کشاں گناہ کی طرف لے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان امور سے بچنے کی توفیق اُسے عطا فرماتا ہے۔
(البدر جلد ۲ ۱۴ مورخہ ۲۴/اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۹)

جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے گا اس کو اللہ تعالیٰ ایسے طور سے رزق پہنچائے گا کہ جس طور سے معلوم بھی نہ ہوگا۔ رزق کا خاص طور سے اِس واسطے ذکر کیا کہ بہت سے لوگ حرام مال جمع کرتے ہیں اگر وہ خدا تعالےٰ کے حکموں پر عمل کریں اور تقوٰی سے کام لیں تو خدا (تعالیٰ) ان کو خود رزق پہنچا دے۔
(البدر جلد ۲ ۲۸ مورخہ ۳۱/جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ اوّل)

خوفِ الٰہی اور تقوٰی بڑی برکت والی شئے ہے۔ اِنسان میں اگر عقل نہ ہو مگر یہ باتیں ہوں تو خدا اسے اپنے پاس سے برکت دیتا ہے اور عقل بھی دے دیتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا اِس کے یہی معنے

---

[1] سورۃ الزلزال: ۸

ہیں کہ جس شئے کی ضرورت اسے ہوگی اس کے لئے وہ خود راہ پیدا کر دے گا بشرطیکہ انسان متقی ہو لیکن اگر تقوٰی نہ ہوگا تو خواہ فلاسفر ہی ہو وہ آخر کار تباہ ہوگا۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۶ ؍نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳۲)

تقوٰی اِس بات کا نام ہے کہ جب وہ دیکھے کہ مَیں گناہ میں پڑتا ہوں تو دُعا اور تدبیر سے کام لیوے ورنہ نادان ہوگا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ کہ جو شخص تقوٰی اختیار کرتا ہے وہ ہر ایک مشکل اور تنگی سے نجات کی راہ اس کے لئے پیدا کر دیتا ہے۔ متقی درحقیقت وہ ہے کہ جہاں تک اس کی قدرت اور طاقت ہے وہ تدبیر اور تجویز سے کام لیتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۸ مورخہ ۲۴ ؍دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸۴)

جن کا اللہ تعالیٰ متولّی ہو جاتا ہے وہ دُنیا کے آلام سے نجات پا جاتے ہیں اور ایک سچی راحت اور طمانیت کی زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ جو شخص تقوٰی اختیار کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہر ایک بلا اور اَلم سے نکال لیتا ہے اور اس کے رزق کا خود کفیل ہو جاتا ہے اور ایسے طریق سے دیتا ہے کہ جو وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔

دُنیا میں کئی قسم کے جرائم ہوتے ہیں۔ بعض جرائم قانون کی حدیں آسکتے ہیں اور بعض قانون کی حدیں بھی نہیں آسکتے۔ گناہ، خون اور نقب زنی وغیرہ جب کرتا ہے تو اُن کی سزا قانون سے پا سکتا ہے لیکن جھوٹ وغیرہ جو معمولی طور پر بولتا ہے یا بعض حقوق کی رعایت نہیں رکھتا وغیرہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کے لئے قانون تدارک نہیں کرتا لیکن اللہ تعالیٰ کے خوف سے اور اس کو راضی کرنے کے لئے جو شخص ہر ایک بدی سے بچتا ہے اس کو متقی کہتے ہیں...... اور اللہ تعالیٰ تو متقی کے لئے وعدہ کرتا ہے کہ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا یعنی جو اللہ تعالیٰ کے لئے تقوٰی اختیار کرتا ہے تو ہر مشکل سے اللہ تعالیٰ اس کو رہائی دے دیتا ہے۔ لوگوں نے تقوٰی کے چھوڑنے کے لئے طرح طرح کے بہانے بنا رکھے ہیں بعض کہتے ہیں کہ جھوٹ بولے بغیر ہمارے کاروبار نہیں چل سکتے اور دوسرے لوگوں پر الزام لگاتے ہیں کہ اگر سچ کہا جائے تو وہ لوگ ہم پر اعتبار نہیں کرتے۔ پھر بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ سُود دیئے کے بغیر ہمارا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ کیونکر متقی کہلا سکتے ہیں۔ خدا تعالیٰ تو وعدہ کرتا ہے کہ مَیں متقی کو ہر ایک مشکل سے نکالوں گا اور ایسے طور سے رزق دوں گا جو گمان اور وہم میں بھی نہ آسکے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے جو لوگ ہماری کتاب پر عمل کریں گے ان کو ہر طرف سے اُوپر سے اور نیچے سے رزق دوں گا۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

ہم ایسے مہوسوں کو ایک کیمیا کا نسخہ بتلاتے ہیں بشرطیکہ وہ اس پر عمل کریں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ پس تقویٰ ایک ایسی چیز ہے کہ جسے یہ حاصل ہو اسے گویا تمام جہان کی نعمتیں حاصل ہو گئیں۔ یاد رکھو متقی کبھی کسی کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ وہ اس مقام پر ہوتا ہے کہ جو چاہتا ہے خدا تعالیٰ اس کے لئے اس کے مانگنے سے پہلے مہیا کر دیتا ہے۔ مَیں نے ایک دفعہ کشف میں اللہ تعالیٰ کو تمثّل کے طور پر دیکھا میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر فرمایا

جے توں میرا ہو رہیں سب جگ تیرا ہو

یہ وہ نسخہ ہے جو تمام انبیاء و اولیاء و صلحاء کا آزمایا ہؤا ہے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۵ راپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

توکّل کرنے والے اور خدا تعالیٰ کی طرف جُھکنے والے کبھی ضائع نہیں ہوتے۔ جو آدمی صرف اپنی کوششوں میں رہتا ہے اس کو سوائے ذِلّت کے اَور کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ جب سے دُنیا پَیدا ہوئی ہمیشہ سے سُنّت اللہ یہی چلی آتی ہے کہ جو لوگ دُنیا کو چھوڑتے ہیں وہ اس کو پاتے ہیں اور جو اس کے پیچھے دوڑتے ہیں وہ اس سے محروم رہتے ہیں۔ جو لوگ خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے وہ اگرچند روز مکر و فریب سے کچھ حاصل بھی کرلیں تو وہ لاحاصل ہے کیونکہ آخر اُن کو سخت ناکامی دیکھنی پڑتی ہے۔ اِسلام میں عمدہ لوگ وہی گذرے ہیں جنہوں نے دین کے مقابلہ میں دُنیا کی کچھ پرواہ نہ کی۔ ہندوستان میں قطب الدین اور معین الدین خدا کے اَولیاء گذرے ہیں ان لوگوں نے پوشیدہ خدا تعالیٰ کی عبادت کی مگر خدا تعالیٰ نے ان کی عزّت کو ظاہر کر دیا۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۳۲ مورخہ ۸ راگست ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

اصل رازق خدا تعالیٰ ہے۔ وہ شخص جو اس پر بھروسہ کرتا ہے کبھی رزق سے محروم نہیں رہ سکتا۔ وہ ہر طرح سے اور ہر جگہ سے اپنے پر توکّل کرنے والے شخص کے لئے رزق پہنچاتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو مجھ پر بھروسہ کرے اور توکّل کرے مَیں اس کے لئے آسمان سے برساتا اور قدموں میں سے نکالتا ہوں۔ پس چاہیئے کہ ہر ایک شخص خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۳۸ مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۷)

مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِس کے یہ معنے ہیں کہ مومن جو بات یقین سے کہے وہ پوری ہو جاتی ہے لفظوں کی پابندی اس میں ضروری نہیں ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۰ مورخہ ۵۔ جون ۱۹۰۳ء صفحہ اوّل)

ایک دانشمند کے لئے ضرور ہے کہ موت کا اِنتظام کرے۔ خدا تو موجود ہے اس کے لئے بھی کچھ فکر چاہیئے ہم اس قدر عرصہ سے اپنی برادری سے الگ ہیں۔ ہمارا کسی نے کیا بگاڑ لیا جو اَور کسی کا برادری بگاڑے گی۔ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔ خدا کے مقابلہ پر کسی کو معبود نہ بنانا چاہیئے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۷۔ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰۲)

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ کہ جو خدا کی طرف سے پورے طور پر آ گیا اور اعداء وغیرہ کسی کی پرواہ نہ کی فَهُوَ

حَسْبُہٗ تو پھر خدا تعالیٰ اس کے ساتھ پوری وفا کرتا ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۸ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۱۸)

اصل میں توکّل ہی ایسی ایک چیز ہے کہ انسان کو کامیاب و بامراد بنا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ جو اللہ تعالیٰ پر توکّل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو کافی ہو جاتا ہے بشرطیکہ سچّے دِل سے توکّل کے اصل مفہوم کو سمجھ کر صدق دل سے قدم رکھنے والا ہو اور صبر کرنے والا اور مستقل مزاج ہو۔ مشکلات سے ڈر کر پیچھے نہ ہٹ جاوے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۱ مورخہ ۶ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

۵۔ وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشْھُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُھُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَھُنَّ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ اَمْرِہٖ یُسْرًا۝

حمل والی عورتوں کی طلاق کی عدت یہ ہے کہ وہ وضع حمل تک بعد طلاق کے دوسرا نکاح کرنے سے دستکش رہیں۔ اِس میں یہی حکمت ہے کہ اگر حمل میں ہی نکاح ہو جائے تو ممکن ہے کہ دوسرے کا نطفہ بھی ٹھہر جائے تو اس صورت میں نسب ضائع ہو گی اور یہ پتہ نہیں لگے گا کہ وہ دونوں لڑکے کس کس باپ کے ہیں۔

(آریہ دھرم صفحہ ۱۸)

جو عورتیں حیض سے نومید ہو گئی ہیں اُن کی مُہلت طلاق بجائے تین حیض کے تین مہینہ ہیں اور جو خدا سے ڈرے گا یعنی طلاق دینے میں جلدی نہیں کرے گا خدا اس کے کام میں آسانی پیدا کر دے گا۔

(آریہ دھرم صفحہ ۴۷)

۶۔ ذٰلِکَ اَمْرُ اللّٰہِ اَنْزَلَہٗٓ اِلَیْکُمْ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یُکَفِّرْ عَنْہُ سَیِّاٰتِہٖ وَیُعْظِمْ لَہٗٓ اَجْرًا۝

یہ خدا کا حکم ہے جو تمہاری طرف اُتارا گیا اور جو خدا سے ڈرے گا یعنی طلاق دینے میں جلدی نہیں کرے گا اور حتّی الوسع طلاق سے دستبردار رہے گا خدا اس کے تمام گناہ معاف کر دے گا اور اس کو بہت اجر دے گا۔

(آریہ دھرم صفحہ ۴۷)

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ ۚۖ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۙ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ○

خدا نے اپنی کتاب اور اپنا رسول بھیجا وہ تم پر کلامِ الٰہی پڑھتا ہے تا وہ ایمانداروں اور نیک کرداروں کو ظلمات سے نور کی طرف نکالے پس خدائے تعالیٰ نے ان تمام آیات (زیرِ تفسیر اور دیگر) میں کھلا کھلا بیان فرما دیا کہ جس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے اور قرآن شریف نازل کیا گیا اس زمانہ پر ضلالت اور گمراہی کی ظلمت طاری ہو رہی تھی اور کوئی ایسی قوم نہیں تھی کہ جو اس ظلمت سے بچی ہوئی ہو۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۱۴۱ ۵)

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَّسُوْلًا۔ نزول کے لفظ سے درحقیقت آسمان سے نازل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں کھلے کھلے طور پر قرآن شریف میں آیا ہے قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَّسُوْلًا تو کیا اس سے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آسمان سے ہی اُترے تھے۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۶۴۹)

نزول کے لفظ سے کہاں سمجھا جاتا ہے جو آسمان سے نزول ہو خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے ..... ہم نے یہ نبی اُتارا۔

(الحق دہلی صفحہ ۳۵)

قرآن شریف میں آیت قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَّسُوْلًا میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نازل ہی لکھا گیا ہے مگر کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم درحقیقت آسمان سے نازل ہوئے تھے ..... بعض نادان کہتے ہیں کہ بعض اقوالِ صحابہؓ میں نزول کے ساتھ اِلیٰ کا لفظ آیا ہے جو اُوپر سے نیچے کی طرف کے لئے مُستعمل ہے مگر وہ نہیں سمجھتے کہ جس حالت میں استعارہ کے طور پر خدا تعالیٰ کے ماموروں کی نسبت توریت اور انجیل اور قرآن میں یہ محاورہ آگیا ہے

کہ وہ آسمان سے نازل ہوتے ہیں تو اس صورت میں استعارہ کے طور پر مسیح موعود کے نزول کے ساتھ الیٰ کا لفظ ملانا کونسی غیر محل بات ہے۔ کیا قرآن میں نہیں ہے اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا رَّسُوْلًا۔ (ایام الصلح صفحہ ۸۰، ۸۱)

۱۳۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۝۱۳

کوئی یہ اعتراض پیش کرے کہ خدا تعالیٰ نے آسمانوں کو سات میں کیوں محدود کیا اس کی کیا وجہ ہے تو اس کا یہ جواب ہے کہ درحقیقت یہ تاثیراتِ مختلفہ کی طرف اشارہ ہے جو مختلف طبقاتِ سماوی سے مختلف ستارے اپنے اندر جذب کرتے ہیں اور پھر زمین پر اُن تاثیرات کو ڈالتے ہیں چنانچہ اس کی تصریح اس آیت میں موجود ہے اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ..... قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا یعنی خدا تعالیٰ نے آسمانوں کو سات پیدا کیا اور ایسا ہی زمینیں بھی سات ہی پیدا کیں اور اُن سات آسمانوں کا اثر جو بامرِ الٰہی ان میں پیدا ہؤا ہے سات زمینوں میں ڈالا تاکہ تم لوگ معلوم کرلو کہ خدا تعالیٰ ہر ایک چیز کے بنانے پر اور ہر ایک انتظام کے کرنے پر اور رنگا رنگ کے پیرائیوں میں اپنے کام دکھلانے پر قدرتِ تامّہ رکھتا ہے اور تا تمہارے علوم وسیع ہو جائیں اور علوم وفنون میں تم ترقی کرو اور ہیئت اور طبعی اور طبابت اور جغرافیہ وغیرہ علوم تم میں پیدا ہو کر خدا تعالیٰ کی عظمتوں کی طرف تم کو متوجہ کریں اور تم سمجھ لو کہ کیسے خدا تعالیٰ کا علم اور اس کی حکمتِ کاملہ ہر یک شئے پر محیط ہو رہی ہے اور کیسی ترکیب ابلغ اور ترتیب محکم کے ساتھ آسمان اور جو کچھ اس میں ہے اپنا رشتہ زمین سے رکھتا ہے اور کیسے خدا تعالیٰ نے زمین کو قوّتِ قابلہ عطا کر رکھی ہے اور آسمانوں اور اُن کے اجرام کو قوّتِ مؤثرہ مرحمت فرمائی ہے اور یاد رہے کہ جس طرح تنزّل امر جسمانی اور روحانی دونوں طور پر آسمانوں سے ہوتا ہے اور ملایک کی توجہات اجرامِ سماوی کی تاثیرات کے ساتھ مخلوط ہو کر زمین پر گرتی ہیں ایسا ہی زمین اور زمین والوں میں بھی جسمانی اور روحانی دونوں قوتیں قابلیّت کی عطا کی گئی ہیں تا قوابل اور مؤثرات میں بکلّی مساوات ہو۔

اور سات زمینوں سے مراد زمین کی آبادی کے سات طبقے ہیں جو نسبتی طور پر بعض بعض کے تحت واقع ہیں اور کچھ بیجا نہ ہوگا کہ اگر ہم دوسرے لفظوں میں ان طبقاتِ سبعہ کو ہفت اقلیم کے نام سے موسوم کر دیں لیکن ناظرین اس دھوکہ میں نہ پڑیں کہ جو کچھ ہفت اقلیم کی تقسیم اُن یونانی علوم کی رُو سے ہو چکی ہے جس کو اسلام

کے ابتدائی زمانہ میں حکماءِ اسلام نے یونانی کتب سے لیا تھا وہ بکلّی صحیح اور کامل ہے کیونکہ اِس جگہ تقسیم سے مراد ہماری ایک صحیح تقسیم مراد ہے جس سے کوئی معمورہ باہر نہ رہے اور زمین کی ہر ایک جزو کسی حصّہ میں داخل ہو جائے ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں کہ اَب تک یہ صحیح اور کامل تقسیم معرضِ ظہور میں بھی آئی یا نہیں بلکہ صرف یہ غرض ہے کہ جو خیال اکثر انسانوں کا اِس طرف رجوع کر گیا ہے کہ زمین کو سات حصّہ پر تقسیم کیا جائے۔ یہ خیال بھی گویا ایک الہامی تحریک تھی جو الٰہی تقسیم کے لئے بطور شاہد ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۵۵ - ۱۶۰ حاشیہ در حاشیہ)

○

سُورۃ التحریم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ وَ اَہۡلِیۡکُمۡ نَارًا وَّ قُوۡدُہَا النَّاسُ وَ الۡحِجَارَۃُ عَلَیۡہَا مَلٰٓئِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعۡصُوۡنَ اللّٰہَ مَاۤ اَمَرَہُمۡ وَ یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ۝

جو شخص معرفت کا کچھ حصہ رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ ہر یک ذرہ خدا تعالیٰ کے ارادہ کے موافق کام کر رہا ہے اور ایک قطرہ پانی کا جو ہمارے اندر جاتا ہے وہ بھی بغیر اذنِ الٰہی کے کوئی تاثیر موافق یا مخالف ہمارے بدن پر نہیں ڈال سکتا۔ پس تمام ذرّات اور سیّارات وغیرہ درحقیقت ایک قسم کے فرشتے ہیں جو دن رات خدمت میں مشغول ہیں۔ کوئی انسان کے جسم کی خدمت میں مشغول ہے اور کوئی رُوح کی خدمت میں اور جس حکیم مطلق نے انسان کی جسمانی خدمت کے لئے بہت سے اسباب کا توسط پسند کیا اور اپنی طرف سے بہت سے جسمانی مؤثرات پیدا کئے تا انسان کے جسم پر انواع و اقسام کے طریقوں سے تاثیر ڈالیں۔ اُسی وحدہٗ لاشریک نے جس کے کاموں میں وحدت اور تناسب ہے یہ بھی پسند کیا کہ انسان کی روحانی تربیت بھی اس نظام اور طرایق سے ہو کہ جو جسم کی تربیت میں اختیار کیا گیا ہے تا وہ دونوں نظام ظاہری و باطنی اور روحانی اور جسمانی اپنے تناسب اور یک رنگی کی وجہ سے صانع واحد مدبّر بالارادہ پر دلالت کریں۔

پس یہی وجہ ہے کہ انسان کی روحانی تربیت بلکہ جسمانی تربیت کے لئے بھی فرشتے وسائط مقرر کئے گئے مگر یہ تمام وسائط خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں مجبور اور ایک کَل کی طرح ہیں جس کو اُس کا پاک ہاتھ چلا رہا ہے اپنی طرف سے

نہ کوئی ارادہ رکھتے ہیں نہ کوئی تصرف جس طرح ہوا خدا تعالیٰ کے حکم سے ہمارے اندر چلی جاتی ہے اور اسی کے حکم سے تاثیر کرتی ہے یہی صورت اور بتمامہ یہی حال فرشتوں کا ہے۔ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۸۶، ۸۷ حاشیہ)

۹۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ یُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ یَسْعٰى بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○

جو لوگ دُنیا میں ایمان کا نور رکھتے ہیں ان کا نور قیامت کو اُن کے آگے اور ان کے داہنی طرف دوڑتا ہوگا اور ہمیشہ یہی کہتے رہیں گے کہ اے خدا ہمارے نور کو کمال تک پہنچا اور اپنی مغفرت کے اندر ہمیں لے لے تُو ہر چیز پر قادر ہے۔

اِس آیت میں یہ جو فرمایا کہ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہیں گے کہ ہمارے نور کو کمال تک پہنچا۔ یہ ترقیات غیر متناہیہ کی طرف اشارہ ہے یعنی ایک کمال نورانیت کا انہیں حاصل ہوگا پھر دوسرا کمال نظر آئے گا اس کو دیکھ کر پہلے کمال کو ناقص پائیں گے پس کمالِ ثانی کے حصول کے لئے اِلتجا کریں گے اور جب وہ حاصل ہوگا تو ایک تیسرا مرتبہ کمال کا اُن پر ظاہر ہوگا پھر اس کو دیکھ کر پہلے کمالات کو ہیچ سمجھیں گے اور اس کی خواہش کریں گے یہی ترقیات کی خواہش ہے جو اَتْمِمْ کے لفظ سے سمجھی جاتی ہے۔

غرض اِسی طرح غیر متناہی سلسلہ ترقیات کا چلا جائے گا۔ تنزّل کبھی نہیں ہوگا اور نہ کبھی بہشت سے نکالے جائیں گے بلکہ ہر روز آگے بڑھیں گے اور پیچھے نہ ہٹیں گے اور یہ جو فرمایا کہ وہ ہمیشہ اپنی مغفرت چاہیں گے اِس جگہ سوال یہ ہے کہ جب بہشت میں داخل ہو گئے تو پھر مغفرت میں کیا کسر رہ گئی اور جب گناہ بخشے گئے تو پھر استغفار میں کونسی حاجت رہی؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ مغفرت کے اصل معنے یہ ہیں نا ملائم اور ناقص

حالت کو نیچے دبانا اور ڈھانکنا۔ سو بہشتی اِس بات کی خواہش کریں گے کہ کمالِ تام حاصل کریں اور سراسر نور میں غرق ہو جائیں۔ وہ دوسری حالت کو دیکھ کر پہلی حالت کو ناقص پائیں گے پس چاہیں گے کہ پہلی حالت نیچے دبائی جائے پھر تیسرے کمال کو دیکھ کر یہ آرزو کریں گے کہ دوسرے کمال کی نسبت مغفرت ہو یعنی وہ حالتِ ناقصہ نیچے دبائی جاوے اور مخفی کی جاوے۔ اس طرح غیر متناہی مغفرت کے خواہشمند رہیں گے۔ یہ وہی لفظ مغفرت اور استغفار کا ہے جو بعض نادان بطور اعتراض ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پیش کیا کرتے ہیں سو ناظرین نے اس جگہ سے سمجھ لیا ہوگا کہ یہی خواہش استغفار فخرِ انسان ہے۔ جو شخص کسی عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا اور پھر ہمیشہ کے لئے استغفار اپنی عادت نہیں پکڑتا وہ کیڑا ہے نہ اِنسان اور اندھا ہے نہ سوجاکھا اور ناپاک ہے نہ طیب۔

اَب خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن شریف کی رُو سے دوزخ اور بہشت دونوں اصل میں انسان کی زندگی کے اظلال اور آثار ہیں کوئی ایسی نئی جسمانی چیز نہیں ہے کہ جو دوسری جگہ سے آوے۔ یہ سچ ہے کہ وہ دونوں جسمانی طور سے متمثل ہوں گے مگر وہ اصل روحانی حالتوں کے اظلال و آثار ہوں گے۔ ہم لوگ ایسی بہشت کے قائل نہیں کہ صرف جسمانی طور پر ایک زمین پر درخت لگائے گئے ہوں اور نہ ایسی دوزخ کے ہم قائل ہیں جس میں درحقیقت گندھک کے پتھر ہیں مگر اسلامی عقیدہ کے موافق بہشت دوزخ انہی اعمال کے انعکاسات ہیں جو دُنیا میں انسان کرتا ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹۸، ۹۹)

اِس آیت میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ بہشتی لوگ بھی استغفار کیا کریں گے۔ ان کا استغفار گناہوں کیلئے نہیں ہو سکتا کیونکہ بہشت میں کوئی گناہ نہیں ہوگا اور نہ وہ اپنی دُنیاوی زندگی کے گناہوں کے لئے استغفار کیا کریں گے کیونکہ ہمیں اس سے پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ بہشت میں داخل ہونے سے پہلے اُن کے گناہ معاف کئے جائیں گے۔ آیت اِس طرح ہے عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ پس ان کا استغفار گزشتہ گناہوں کے لئے نہیں۔ خود اِس آیت میں ہمیں پتہ ملتا ہے اِس لئے جو نور اہلِ جنّت کو ملے گا وہ ان کو اس نور کے مقابل میں ناقص نظر آئے گا جو ابھی ان کو نہیں ملا۔ اس نقص کو محسوس کر کے وہ خدا سے دعا کریں گے کہ ہمارا نور پورا کر اور ہماری اس ناقص حالت کو ڈھانپ دے مگر وہ کبھی نور سے سیر نہیں ہوں گے کیونکہ خدا کے نور کی کوئی حد نہیں اِس لئے وہ ہمیشہ زیادہ اور زیادہ نور مانگتے رہیں گے۔ اِس سے معلوم ہؤا کہ وہ استغفار روحانی ترقی کے لئے ایک دعا ہے۔ چونکہ روحانی ترقی کی کوئی حد نہیں اِس لئے انبیاء علیہم السّلام ہمیشہ دعا میں لگے رہتے ہیں اور ہمیشہ زیادہ نور مانگتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی اپنی روحانی ترقی پر سیر نہیں ہوتے اِس لئے ہمیشہ دعا میں لگے رہتے ہیں کہ خدا ان کی ناقص حالت کو ڈھانپے اور پورا روشنی کا

پیمانہ دے۔ اسی وجہ سے خدائے تعالیٰ اپنے نبی کو فرماتا ہے قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا[1] یعنی ہمیشہ علم کے لئے دعا کرتا رہ کیونکہ جیسا خدا بیحد ہے ایسا ہی اس کا علم بھی بیحد ہے۔ القصہ جنّت کا استغفار صاف طور پر ثابت کرتا ہے کہ استغفار اور گناہ لازم ملزوم نہیں ہیں اور یہ کہ ہمارا استغفار اِس لئے بھی ہوسکتا ہے کہ خدا ہماری کمزوریوں کو ڈھانپے اور روحانی ترقی کے لئے طاقت دے۔ عیسائی بڑے ظالم ٹھہریں گے اگر وہ اب بھی اصرار کریں گے کہ استغفار ہمیشہ گزشتہ گناہوں کی معافی کے لئے ایک دعا ہوتی ہے۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۲۴۳، ۲۴۴)

بہشتیوں اور دوزخیوں کے لئے ..... ایک اَور درجہ دخول جنّت دخول جہنم ہے جس کو درمیانی درجہ کہنا چاہیئے اور حشر اجساد کے بعد اور جنّتِ عظمٰی یا جہنمِ کبریٰ میں داخل ہونے سے پہلے حاصل ہوتا ہے اور بوجہ تعلق جسد کامل قوٰی میں ایک اعلیٰ درجہ کی تیزی پیدا ہوکر اور خدا تعالیٰ کی تجلّی رحم یا تجلّی قہر کا حسبِ حالت اپنے کامل طور پر مشاہدہ ہوکر اور جنّتِ عظمٰی کو بہت قریب پاکر یا جہنمِ کبریٰ کو بہت ہی قریب دیکھ کر وہ لذّات یا عقوبات ترقی پذیر ہوجاتے ہیں ..... اس دوسرے درجہ میں بھی لوگ مساوی نہیں ہوتے بلکہ اعلیٰ درجہ کے بھی ہوتے ہیں جو بہشتی ہونے کی حالت میں بہشتی انوار اپنے ساتھ رکھتے ہیں انہیں کی طرف اللہ جلّ شانہٗ اشارہ فرماتا ہے نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ایسا ہی دوزخی ہونے کی حالت میں اعلیٰ درجہ کے کفّار ہوتے ہیں کہ قبل اس کے جو کامل طور پر دوزخ میں پڑیں اُن کے دلوں پر دوزخ کی آگ بھڑکائی جاتی ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ[2] (ازالہ اوہام صفحہ ۳۵۹، ۳۶۰)

توبہ دراصل حصولِ اخلاق کے لئے بڑی محرّک اور مؤید چیز ہے اور انسان کو کامل بنا دیتی ہے یعنی جو شخص اپنے اخلاقِ سیئہ کی تبدیلی چاہتا ہے اُس کے لئے ضروری ہے کہ سچّے دل اور پکّے ارادے کے ساتھ توبہ کرے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ توبہ کے لئے تین شرائط ہیں بدُوں ان کی تکمیل کے سچّی توبہ جسے توبۃ النصوح کہتے ہیں حاصل نہیں ہوتی۔ اُن ہر سہ شرائط میں سے پہلی شرط جسے عربی زبان میں اقلاع کہتے ہیں یعنی اُن خیالاتِ فاسدہ کو دُور کرلیا جاوے جو ان خصائلِ ردیہ کے محرّک ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ تصوّرات کا بڑا بھاری اثر پڑتا ہے کیونکہ حیطۂ عمل میں آنے سے پیشتر ہر ایک فعل ایک تصوّری صورت رکھتا ہے۔ پس توبہ کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اُن خیالاتِ فاسد و تصوراتِ بد کو چھوڑ دے مثلاً اگر ایک شخص کسی عورت سے کوئی ناجائز تعلق رکھتا ہو تو اُسے توبہ کرنے کے لئے پہلے ضروری ہے کہ اس کی شکل کو بدصورت قرار دے اور اس کی تمام خصائلِ رذیلہ کو اپنے دل میں مستحضر کرے کیونکہ جیسا کہ مَیں نے ابھی کہا

---

[1] سورۃ طٰهٰ : ۱۱۵ [2] سورۃ الھمزۃ : ۷، ۸

ہے تصورات کا اثر بہت زبردست اثر ہے اور مَیں نے صوفیوں کے تذکروں میں پڑھا ہے کہ انہوں نے تصور کو یہاں تک پہنچایا کہ انسان کو بندر یا خنزیر کی صورت میں دیکھا۔ غرض یہ ہے کہ جیسا کوئی تصور کرتا ہے ویسا ہی رنگ چڑھ جاتا ہے پس جو خیالات بدلذات کا موجب سمجھے جاتے ہیں اُن کا قلع قمع کرے یہ پہلی شرط ہے۔

دوسری شرط ندم ہے یعنی پشیمانی اور ندامت ظاہر کرنا۔ ہر ایک انسان کا کانشنس اپنے اندر یہ قوت رکھتا ہے کہ وہ اُس کو ہر بُرائی پر متنبہ کرتا ہے مگر بدبخت اِنسان اس کو معطل چھوڑ دیتا ہے پس گناہ اور بدی کے ارتکاب پر پشیمانی ظاہر کرے اور یہ خیال کرے کہ یہ لذات عارضی اور چند روزہ ہیں اور پھر یہ بھی سوچے کہ ہر مرتبہ اُس لذّت اور حظ میں کمی ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ بڑھاپے میں اگرجبکہ قویٰ بیکار اور کمزور ہو جاویں گے آخر ان سب لذاتِ دُنیا کو چھوڑنا ہوگا۔ پس جب کہ خود زندگی ہی میں یہ سب باتیں چھوڑ جانے والی ہیں تو پھر ان کے ارتکاب سے کیا حاصل ہے۔ بڑا ہی خوش قسمت ہے وہ انسان جو توبہ کی طرف رجوع کرے اور جس میں اوّل اقلاع کا خیال پیدا ہو یعنی خیالاتِ فاسدہ و تصوّرات کو قلع و قمع کرے تب یہ نجاست اور ناپاکی نکل جاوے تو پھر نادم ہو اور اپنے کئے پر پشیمان ہو۔

تیسری شرط عزم ہے یعنی آئندہ کے لئے مصمّم ارادہ کر لے کہ پھر اُن بُرائیوں کی طرف رجوع نہ کروں گا اور جب وہ مداومت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے سچی توبہ کی توفیق عطا کرے گا یہاں تک کہ وہ سیئات اُس سے قطعًا زائل ہو کر اخلاقِ حسنہ اور افعالِ حمیدہ اُس کی جگہ لے لیں گے اور یہ فتح ہے اَخلاق پر۔ اس پر قوت اور طاقت بخشنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے کیونکہ تمام طاقتوں اور قوتوں کا مالک وہی ہے جیسے فرمایا اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا۔[1]

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۵۷، ۱۵۸)

اِنسان کو چاہیئے کہ اگر توبہ کرے تو خالص توبہ کرے۔ توبہ اصل میں رجوع کو کہتے ہیں صرف الفاظ ایک قسم کی عادت ہو جاتی ہے اِس لئے خدا تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ صرف زبان سے توبہ توبہ کرتے پھرو بلکہ فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرو جیسا کہ حق ہے رجوع کرنے کا۔ کیونکہ جب متناقض جہات میں سے ایک کو چھوڑ کر انسان دوسری طرف آجاتا ہے تو پھر پہلی جگہ دُور ہوتی جاتی ہے اور جس کی طرف جاتا ہے وہ نزدیک ہوتی جاتی ہے۔ یہی مطلب توبہ کا ہے کہ جب اِنسان خدا کی طرف رجوع کر لیتا ہے اور دن بدن اس کی طرف چلتا ہے تو آخر یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ شیطان سے دُور ہو جاتا ہے اور خدا کے نزدیک ہو جاتا ہے اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جو جس کے نزدیک ہوتا ہے اسی کی بات سُنتا ہے۔ اِس لئے ایسے انسان پر جو عملی طور پر شیطان سے دُور اور خدا سے نزدیک ہو جاتا ہے

---

[1] سورۃ البقرۃ: ۱۶۶

اللہ تعالیٰ کے فیوض اور برکات کا نزول ہوتا ہے اور سفلی آلائشوں کا گند اس سے دھویا جاتا ہے جیسے آگے فرمایا عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ کیونکہ توبہ میں ایک خاصیت ہے کہ گزشتہ گناہ اس سے بخشے جاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۲ ۴ مورخہ ۱۴ ؍جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰھُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْھُمَا مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا وَّقِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ ○ وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَکَ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ وَنَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِہٖ وَنَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ○ۙ وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا فَنَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِکَلِمٰتِ رَبِّھَا وَکُتُبِہٖ وَکَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ ○

اُنْظُرُوْا کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلَ مَرْیَمَ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ۔ فِیْ ھٰذِہِ السُّوْرَۃِ۔ وَوَعَدَ فِیْ ھٰذِہِ الْحُلَّۃِ اَنَّ ابْنَ مَرْیَمَ مِنْکُمْ عِنْدَ التُّقَاۃِ الْکَامِلَۃِ۔ وَکَانَ مِنَ الْوَاجِبِ لِتَحْقِیْقِ ھٰذَا الْمَثَلِ الْمَذْکُوْرِ فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ۔ بِاَنْ یَّکُوْنَ فَرْدٌ مِّنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ۔ لِیَتَحَقَّقَ

ترجمہ از مرتب :۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے اِس سُورت میں کس طرح مریم علیہا السّلام کی مثال اِس اُمت کے لئے بیان کی ہے اور اِس لباس میں وعدہ فرمایا ہے کہ ابنِ مریم کامل متقیوں کے نزدیک تمہیں میں سے ہوگا۔ اِس آیت میں مثال مذکورہ کے متحقق ہونے کے لئے ضروری تھا کہ اسی اُمت کا ایک فرد عیسٰی بن مریم ہوتا۔ یہ مثال خارج میں بھی بلاشک و شُبہ متحقّق ہو ورنہ

اَلْمَثَلُ فِی الْخَارِجِ مِنْ غَیْرِ الشَّکِّ وَالشُّبْھَةِ۔ وَاِلَّا فَیَکُوْنُ ھٰذَا الْمَثَلُ عَبَثًا وَکِذْبًا۔ لَیْسَ مِصْدَاقُہٗ فَرْدًا مِنْ اَفْرَادِ ھٰذِہِ الْمِلَّةِ وَذٰلِکَ مِمَّا لَا یَلِیْقُ بِشَانِ حَضْرَةِ التَّقَدُّسِ وَالْعِزَّةِ۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۳۱۰)

ہمارے مخالف مولوی لوگوں کو دھوکہ دے کر یہ کہا کرتے ہیں کہ قرآن شریف سے اگرچہ نہیں مگر حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دُنیا میں آئیں گے مگر ہمیں معلوم نہیں کہ حدیثوں میں کہاں اور کس جگہ لکھا ہے کہ وہی بنی اسرائیلی نبی جس کا عیسیٰ نام تھا جس پر انجیل نازل ہوئی تھی باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے کے پھر دُنیا میں آجائے گا۔ اگر صرف عیسیٰ یا ابنِ مریم کے نام پر دھوکا کھانا ہے تو قرآن کریم کی سورۂ تحریم میں اس اُمّت کے بعض افراد کا نام عیسیٰ اور ابنِ مریم رکھ دیا گیا ہے۔ ایماندار کے لئے اِس قدر کافی ہے کہ اس اُمّت کے بعض افراد کا نام بھی عیسیٰ یا ابنِ مریم رکھا گیا ہے۔ کیونکہ جب خدائے تعالیٰ نے سورہ موصوفہ میں بعض افرادِ اُمّت کو مریم سے مشابہت دی اور پھر اس میں نفخ رُوح کا ذکر کیا تو صاف ظاہر ہے کہ وہ رُوح جو مریم میں پھونکی گئی وہ عیسیٰ تھا۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اِس اُمّت کا کوئی فرد اپنی خداداد تقویٰ کی وجہ سے مریم بنے گا اور پھر عیسیٰ ہو جائے گا جیسا کہ براہینِ احمدیہ میں خدائے تعالیٰ نے پہلے میرا نام مریم رکھا اور پھر نفخ رُوح کا ذکر کیا اور پھر آخر میں میرا نام عیسیٰ رکھ دیا۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۱۹)

وَکَذٰلِکَ اُشِیْرَ اِلَی الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ فِی الْکِتَابِ الْکَرِیْمِ۔ اَعْنِیْ فِیْ سُوْرَةِ التَّحْرِیْمِ۔ وَھُوَ قَوْلُہٗ تَعَالٰی وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا فَنَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا۔ وَلَا شَکَّ اَنَّ الْمُرَادَ مِنَ الرُّوْحِ ھٰھُنَا عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ۔ فَحَاصِلُ الْاٰیَةِ اَنَّ اللّٰہَ وَعَدَ اَنَّہٗ یَجْعَلُ اَخْشَی النَّاسِ مِنْ ھٰذِہِ الْاُمَّةِ مَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَیَنْفُخُ فِیْہِ رُوْحَہٗ بِطَرِیْقِ الْبُرُوْزِ فَھٰذَا وَعْدٌ مِّنَ اللّٰہِ

یہ مثال عبث اور جھوٹ ہوگی جس کا مصداق اِس اُمّت کے افراد میں سے کوئی نہیں ہوگا اور یہ ایسی بات ہے جو خدائے قدوس اور ربّ العزّت کی شان کے شایاں نہیں۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۳۱۰)

ترجمہ از مرتب: قرآن کریم میں سورۃ تحریم میں مسیح موعود کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا وہ قول یہ ہے کہ وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا فَنَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِس آیت میں رُوح سے مراد عیسیٰ بن مریم ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ اس اُمّت میں سے سب سے زیادہ خشیت اللہ رکھنے والے فرد کو مسیح ابنِ مریم بنائے گا اور اس میں بروزی طور پر اپنی رُوح پھونکے گا اور یہ اللہ تعالےٰ کا وعدہ

فِیْ صُوْرَۃِ الْمَثَلِ لِاَتْقَی النَّاسِ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ فَانْظُرْ کَیْفَ سَمَّی اللّٰہُ بَعْضَ اَفْرَادِ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۲۸۳)

وَقَدْ وَعَدَ اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ سُوْرَۃِ التَّحْرِیْمِ فِیْ قَوْلِہٖ فَنَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا اَنْ یَّخْلُقَ ابْنَ مَرْیَمَ مِنْھُمْ وَھُوَ یَرِثُ ھٰذَا الْاِسْمَ وَیَکُوْنُ عِیْسٰی مِنْ غَیْرِ فَرْقٍ فِی الْمَاھِیَّۃِ۔ فَقَدْ تَقَرَّرَ فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ وَعْدًا مِّنَ اللّٰہِ اَنَّ فَرْدًا مِّنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ یُسَمّٰی ابْنَ مَرْیَمَ وَیُنْفَخُ فِیْہِ رُوْحُہٗ بَعْدَ التُّقَاۃِ التَّامَّۃِ۔ فَاَنَا ذٰلِکَ الْمَسِیْحُ الَّذِیْ لَمْتُمُوْنِیْ فِیْہِ۔ وَلَا مُبَدِّلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰہِ ذِی الْجَبَرُوْتِ وَالْعِزَّۃِ۔ اَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَکُمْ مِنْ وَعْدِ اللّٰہِ اَنْ تَکُوْنُوْا یَھُوْدًا کَیَھُوْدِ اُمَّۃِ مُوْسٰی فِی الْخُبْثِ وَالتَّمَرُّدِ الْعَظِیْمِ۔ وَلَا تُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّکُوْنَ الْمَسِیْحُ مِنْکُمْ کَمَسِیْحِ سِلْسِلَۃِ الْکَلِیْمِ۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۳۰۹)

سورۃ تحریم میں اشارہ کیا گیا ہے کہ بعض افراد اس اُمت کے ابنِ مریم کہلائیں گے کیونکہ اوّل مریم سے اُن کو تشبیہ دے کر پھر مریم کی طرح نفخ رُوح اُن میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اوّل وہ مریمی وجود لے کر اور اس سے ترقی کر کے پھر ابنِ مریم بن جائیں گے جیسا کہ براہینِ احمدیہ میں خدا تعالیٰ نے اپنی وحی میں اوّل میرا نام مریم رکھا اور فرمایا یَا مَرْیَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ یعنی اے مریم تُو اور تیرے

مثال کی صورت میں مسلمانوں میں سے سب سے زیادہ تقویٰ رکھنے والے کے لئے ہے۔ پس دیکھ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اِس اُمت کے بعض افراد کا نام عیسٰی بن مریم رکھ دیا ہے۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۲۸۳ حاشیہ)

ترجمہ از مرتب :۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ تحریم میں اپنے قول فَنَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا میں مومنوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان میں سے ابنِ مریم پیدا کرے گا اور وہ شخص اس نام کا وارث ہوگا اور وہ ماہیت میں بغیر کسی فرق کے عیسٰی ہوگا۔ پس اِس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پختہ وعدہ کیا گیا ہے کہ اِس اُمت میں سے ایک فرد کا نام ابنِ مریم رکھا جائے گا اور اس میں کامل تقویٰ کے بعد مسیح کی رُوح پھونکی جائے گی سو مَیں ہی وہ مسیح ہوں جسے تم اس کے دعویٰ کے بارہ میں ملامت کر رہے ہو اور خدائے ذوالجبروت والعزۃ کے کلمات کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں۔ کیا تم اللہ تعالیٰ کے وعدہ میں سے یہ حصہ لینا پسند کرتے ہو کہ تم موسیٰ کی قوم کی مانند سرکشی اور خُبث میں تو یہود کی مانند ہو جاؤ لیکن تم یہ نہیں چاہتے سلسلۂ کلیم کے مسیح کی مانند تم میں سے کوئی فرد مسیح بن جائے۔ تم پر افسوس تم نے شر میں تو مماثلت کو پسند کیا لیکن خیر میں تم مثیل بننا پسند نہیں کرتے۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۳۰۹)

دوست بہشت میں داخل ہو جاؤ اور پھر فرمایا یَا مَرْیَمُ نَفَخْتُ فِیْكَ مِنْ رُّوْحِ الصِّدْقِ یعنی اے مریم میں نے صدق کی رُوح تجھ میں پھونک دی (گویا استعارہ کے رنگ میں مریم صدق سے حاملہ ہوگئی) اور پھر آخر میں فرمایا یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ یعنی اے عیسٰی میں تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اُٹھاؤں گا پس اِس جگہ مریمی مقام سے مجھے منتقل کر کے میرا نام عیسٰی رکھا گیا اور اس طرح پر ابنِ مریم مجھے ٹھہرایا گیا تا وہ وعدہ جو سورۂ تحریم میں کیا گیا تھا پورا ہو۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۴۱)

یہ قرآنی دعا (اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ[1]) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے قبول ہو کر اخیار و ابرار مسلمان بالخصوص ان کے کامل فرد انبیاء بنی اسرائیل کے وارث ٹھہرائے گئے اور دراصل مسیح موعود کا اس اُمت میں سے پَیدا ہونا یہ بھی اِسی دعا کی قبولیت کا نتیجہ ہے کیونکہ گو مخفی طور پر بہت سے اخیار و ابرار نے انبیاء بنی اسرائیل کی مماثلت کا حصّہ لیا ہے مگر اس اُمّت کا مسیح موعود کُھلے کُھلے طور پر خدا کے حکم اور اِذن سے اسرائیلی مسیح کے مقابل پر کھڑا کیا گیا ہے تا موسوی اور محمدی سلسلہ کی مماثلت سمجھ آجائے۔ اِسی غرض سے اِس مسیح کو ابنِ مریم سے ہر ایک پہلو سے تشبیہ دی گئی ہے یہاں تک کہ اس ابنِ مریم پر ابتلاء بھی اسرائیلی ابنِ مریم کی طرح آئے۔ اوّل جیسا کہ عیسٰی بن مریم محض خدا کے نفخ سے پَیدا کیا گیا اسی طرح یہ مسیح بھی سُورۃ تحریم کے وعدہ کے موافق محض خدا کے نفخ سے مریم کے اندر سے پَیدا کیا گیا اور جیسا کہ عیسٰی ابنِ مریم کی پَیدائش پر بہت شور اُٹھا اور اندھے مخالفوں نے مریم کو کہا لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا[2] اسی طرح اس جگہ بھی کہا گیا اور شورِ قیامت مچایا گیا اور جیسا کہ خدا نے اسرائیلی مریم کے وضعِ حمل کے وقت مخالفوں کو عیسٰی کی نسبت یہ جواب دیا وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا[3] یہی جواب خدا تعالیٰ نے میری نسبت براہین احمدیہ میں روحانی وضع حمل کے وقت جو استعارہ کے رنگ میں تھا مخالفوں کو دیا اور کہا کہ تم اپنے فریبوں سے اس کو نابود نہیں کر سکتے میں اس کو لوگوں کے لئے رحمت کا نشان بناؤں گا اور ایسا ہونا ابتداء سے مقدّر تھا۔ (کشتی نوح صفحہ ۴۹)

ایک اور نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ وحی یعنی هُزِّيْۤ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا[4] یہ حضرت مریم کو اُس وقت وحی ہوئی تھی کہ جب ان کا لڑکا عیسٰی علیہ السلام پَیدا ہوا تھا اور وہ کمزور ہوئی تھیں اور خدا تعالیٰ نے اسی کتاب براہین احمدیہ میں میرا نام بھی مریم رکھا اور مریم صدیقہ کی طرح مجھے بھی حکم دیا وَکُنْ مِّنَ الصَّالِحِیْنَ الصِّدِّیْقِیْنَ دیکھو صفحہ ۲۴۲ براہین احمدیہ۔ پس یہ میری وحی یعنی هُزِّ اِلَیْكَ اِس بات کی

---

[1] سورۃ الفاتحہ: ۶، ۷ [2] سورۃ مریم: ۲۸ [3] سورۃ مریم: ۲۲ [4] سورۃ مریم: ۲۶

طرف اشارہ کرتی ہے کہ صدیقیت کا جو حمل تھا اُس سے بچہ پیدا ہوا جس کا نام عیسٰی رکھا گیا اور جب تک وہ کمزور رہا صفاتِ مریمیہ اُس کی پرورش کرتی رہیں اور جب وہ اپنی طاقت میں آیا تو اُس کو پکارا گیا یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ دیکھو صفحہ ۵۵۶ براہین احمدیہ۔ یہ وہی وعدہ تھا جو سورۃ تحریم میں کیا گیا اور ضرور تھا کہ اس وعدہ کے موافق اس اُمت میں سے کسی کا نام مریم ہوتا اور پھر اس طرح ترقی کر کے اُس سے عیسٰی پیدا ہوتا اور وہ ابنِ مریم کہلاتا سو وہ مَیں ہوں۔ وحی ھُزِّیْ اِلَیْکِ مریم کو بھی ہوئی اور مجھے بھی مگر باہم فرق یہ ہے کہ اُس وقت مریم ضعفِ بدنی میں مُبتلا تھی اور مَیں ضعفِ مالی میں مُبتلا تھا۔ (نزول المسیح صفحہ ۱۶۲، ۱۶۳ حاشیہ)

کتاب براہین احمدیہ میں اوّل خدا نے میرا نام مریم رکھا اور پھر فرمایا کہ مَیں نے اس مریم میں صدق کی رُوح پھونکنے کے بعد اُس کا نام عیسٰی رکھ دیا گویا مریمی حالت سے عیسٰی پیدا ہو گیا اور اِس طرح مَیں خدا کے کلام میں ابنِ مریم کہلایا۔ اِس بارہ میں قرآن شریف میں بھی ایک اشارہ ہے اور وہ میرے لئے بطور پیشگوئی کے ہے یعنی اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اس اُمت کے بعض افراد کو مریم سے تشبیہ دیتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ وہ مریم عیسٰی سے حاملہ ہو گئی اور اب ظاہر ہے کہ اِس اُمت میں بجز میرے کسی نے اِس بات کا دعوٰی نہیں کیا کہ میرا نام خدا نے مریم رکھا اور پھر اس مریم میں عیسٰی کی رُوح پھونک دی ہے اور خدا کا کلام باطل نہیں۔ ضرور ہے کہ اس اُمت میں کوئی اس کا مصداق ہو۔ اور خوب غور کر کے دیکھ لو اور دُنیا میں تلاش کر لو کہ قرآن شریف کی اِس آیت کا بجز میرے کوئی دُنیا میں مصداق نہیں پس یہ پیشگوئی سورۃ تحریم میں خاص میرے لئے ہے اور وہ آیت یہ ہے وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا دیکھو سورۃ تحریم الجزو ۲۸ (ترجمہ) اور دوسری مثال اِس اُمت کے افراد کی مریم عمران کی بیٹی ہے جس نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا تب ہم نے اُس کے پیٹ میں اپنی قدرت سے رُوح پھونک دی یعنی عیسٰی کی رُوح۔ اب ظاہر ہے کہ بموجب اس آیت کے اس اُمت کی مریم کو پہلی مریم کے ساتھ تب مشابہت پیدا ہوتی ہے کہ اس میں بھی عیسٰی کی رُوح پھونک دی جائے جیسا کہ خدا نے خود رُوح پھونکنے کا ذکر بھی اِس آیت میں فرما دیا ہے اور ضرور ہے کہ خدا کا کلام پُورا ہو۔ پس اِس تمام اُمت میں وہ مَیں ہی ہوں۔ میرا ہی نام خدا نے براہین احمدیہ میں پہلے مریم رکھا اور بعد اس کے میری ہی نسبت یہ کہا کہ ہم نے اس مریم میں اپنی طرف سے رُوح پھونک دی اور پھر رُوح پھونکنے کے بعد مجھے ہی عیسٰی قرار دیا۔ پس اِس آیت کا مَیں ہی مصداق ہوں۔ میرے سوا تیرہ سَو برس میں کسی نے یہ دعوٰی نہیں کیا کہ پہلے خدا نے میرا نام مریم رکھا اور مریم میں اپنی طرف سے رُوح پھونک دی جس سے مَیں عیسٰی بن گیا۔ خدا سے ڈرو اور اس میں غور کرو۔ جس زمانہ میں خدا نے براہین احمدیہ میں یہ فرمایا اس وقت تو مَیں اس دقیقہ معرفت سے خود بے خبر تھا جیسا کہ مَیں نے براہین احمدیہ میں اپنا عقیدہ بھی ظاہر کر دیا کہ عیسٰی آسمان سے آنے والا ہے۔ یہ میرا عقیدہ اِس بات پر گواہ ہے کہ میری طرف

سے کوئی افتراء نہیں اور مَیں خدا کی تفہیم سے پہلے کچھ نہیں سمجھ سکا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۲۷، ۳۲۸ حاشیہ)

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ خدا تعالیٰ نے براہین احمدیہ میں مجھے عیسیٰ کے نام سے موسوم کرنے سے پہلے میرا نام مریم رکھا اور ایک مدت تک میرا نام خدا کے نزدیک یہی رہا اور پھر خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ اے مریم مَیں نے تجھ میں سچائی کی رُوح پھونک دی گویا یہ مریم سچائی کی رُوح سے حاملہ ہوئی اور پھر خدا نے براہین احمدیہ کے اخیر میں میرا نام عیسیٰ رکھ دیا گویا وہ سچائی کی رُوح جو مریم میں پھونکی گئی تھی ظہور میں آکر عیسیٰ کے نام سے موسوم کی گئی پس اِس طرح پر مَیں خدا کی کلام میں ابنِ مریم کہلایا اور یہی معنی اس وحیٔ الٰہی کے ہیں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَکَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۳۸، ۳۳۹)

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے مومن کی دو مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک مثال فرعون کی عورت سے ہے جو کہ اس قسم کے خاوند سے خدا کی پناہ چاہتی ہے۔ یہ اُن مومنوں کی مثال ہے جو نفسانی جذبات کے آگے گر جاتے ہیں اور غلطیاں کر بیٹھتے ہیں پر پچھتاتے ہیں توبہ کرتے ہیں خدا سے پناہ مانگتے ہیں۔ ان کا نفس فرعون سے خاوند کی طرح ان کو تنگ کرتا رہتا ہے۔ وہ لوگ نفسِ لوّامہ رکھتے ہیں۔ بدی سے بچنے کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔ دوسرے مومن وہ ہیں جو اس سے اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں۔ وہ صرف بدیوں سے ہی نہیں بچتے بلکہ نیکیوں کو حاصل کرتے ہیں۔ اُن کی مثال اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ سے دی ہے اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا ہر ایک مومن جو تقویٰ وطہارت میں کمال پیدا کرے وہ بروزی طور پر مریمؑ ہوتا ہے اور خدا اس میں اپنی رُوح پھونک دیتا ہے جو کہ ابنِ مریم بن جاتی ہے۔ زمخشری نے بھی اس کے یہی معنے کئے ہیں کہ یہ آیت عام ہے اور اگر یہ معنے نہ کئے جاویں تو حدیث شریف میں آیا ہے کہ مریم اور ابنِ مریم کے سوامسّ شیطان سے کوئی محفوظ نہیں۔ اس سے لازم آتا ہے کہ نعوذ باللہ تمام انبیاء پر شیطان کا دخل تھا پس دراصل اِس آیت میں بھی اشارہ ہے کہ ہر ایک مومن جو اپنے تئیں اس کمال کو پہنچائے خدا کی رُوح اس میں پھونکی جاتی ہے اور وہ ابنِ مریم بن جاتا ہے اور اس میں ایک پیشگوئی ہے کہ اس اُمت میں ابنِ مریم پیدا ہوگا۔ تعجب ہے کہ لوگ اپنے بیٹوں کا نام محمد اور عیسیٰ اور موسیٰ اور یعقوب اور اسحٰق اور اسمٰعیل اور ابراہیم رکھ لیتے ہیں اور اس کو جائز جانتے ہیں پر خدا کے لئے جائز نہیں جانتے کہ وہ کسی کا نام ابنِ مریم رکھ دے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۸ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس میں دو قسم کی عورتوں سے مثال دی ہے اوّل فرعون کی بیوی سے اور ایک مریم سے۔ پہلی مثال میں یہ بتایا ہے کہ ایک مومن اس قسم کے ہوتے ہیں جو ابھی اپنے جذباتِ نفس کے پنجے میں گرفتار ہوتے ہیں اور اُن کی بڑی آرزو اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ خدا ان کو اس سے نجات دے۔ یہ مومن فرعون کی بیوی کی طرح ہوتے ہیں کہ وہ بھی فرعون سے نجات چاہتی تھی مگر مجبور تھی لیکن جو مومن اپنے تئیں تقویٰ اور طہارت کے

بڑے درجہ تک پہنچاتے ہیں اور احسان فرج کرتے ہیں تو پھر خدا تعالیٰ اُن میں عیسیٰ کی رُوح نفخ کر دیتا ہے۔ نیکی کے یہ دو مرتبے ہیں جو مومن حاصل کر سکتا ہے مگر دوسرا بہت بڑھ کر ہے کہ اس میں نفخ رُوح ہو کر وہ عیسیٰ بن جاتا ہے۔ یہ آیت صاف اشارہ کرتی ہے کہ اس اُمت میں کوئی شخص مریم صفت ہوگا کہ اس میں نفخ ہو کر عیسیٰ بنا دیا جائے گا۔ اب کوئی عورت تو ایسی ہے نہیں اور نہ کسی عورت کے متعلق پیشگوئی ہے۔ اِس لئے صاف ظاہر ہے کہ اس سے یہی مراد ہے کہ اس اُمت میں ایک ایسا اِنسان ہوگا جو پہلے اپنے تقویٰ وطہارت اور احصان اور عِفت کے لحاظ سے صفتِ مریمیت سے موصوف ہوگا اور پھر اس میں نفخ ہو کر صفاتِ عیسوی پَیدا ہوں گی۔ اَب اس کی کیفیت اور لطافت براہین احمدیہ سے معلوم ہوگی کہ پہلے میرا نام مریم رکھا پھر اس میں رُوحِ صدق نفخ کر کے مجھے عیسیٰ بنایا مومنوں کی جو یہ دو مثالیں بیان کی ہیں وہ اِس آیت سے بھی معلوم ہوتی ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

اُمت کی دو ہی قسم ہیں ایک فرعون کی بیوی اور دوسرے مریم بنت عمران اور اسی کی طرف اِس آیت میں اشارہ ہے فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرَاتِ[1] ظالم سے مراد وہ لوگ ہیں جو کہ نفسِ امّارہ کے تابع ہیں کہ جس راہ پر نفس نے ڈالا اسی راہ پر چل پڑے اور وہ صُمٌّ بُکْمٌ کی طرح ہوتے ہیں اور ان کی مثال بہائم کی ہے اِس لئے کسی مَد میں نہیں آسکتے اور یہ کثرت سے ہوتے ہیں۔ پھر اس کے بعد نفسِ لوّامہ والے جو کہ فرعون کی بیوی (کی طرح) ہیں یعنی ان کو نفس ہمیشہ ملامت کرتا رہتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ امّارہ سے ان کو آزادی ملے۔ یہ کم ہوتے ہیں اور پھر ان میں سے کم نفسِ مطمئنّہ والے یعنی مریم بنتِ عمران جس زمانے کا وعدہ خدا نے کیا ہوا تھا ضرور تھا کہ اس میں ایک نفس مریم کی طرح ہوتا اور اس زمانے میں خدا نے فِیْهِ ضمیر مذکر استعمال کی ہے تا کہ اشارہ اس طرف ہو کہ ایک مرد ہوگا جو صفاتِ مریمیّت حاصل کر کے عیسیٰ ہوگا۔

(البدر جلد دوم نمبر ۳ مورخہ ۶ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰)

خدا کی کتب میں نبی کے ماتحت اُمت کو عورت کہا جاتا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ایک جگہ نیک بندوں کی تشبیہ فرعون کی عورت سے دی گئی ہے اور دوسری جگہ عمران کی بیوی سے مشابہت دی گئی ہے۔ اناجیل میں بھی مسیح کو دُولہا اور اُمت کو دُلہن قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُمت کے واسطے نبی کی ایسی ہی اطاعت لازم ہے جیسی کہ عورت کو مرد کی اطاعت کا حکم ہے۔

(بدر جلد اول نمبر ۲۲ مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

---

[1] سورۃ فاطر: ۳۳

حضرت کرشن علیہ السلام کے متعلق فرمایا:۔

ان کے متعلق جو گوپیوں کی کثرت مشہور ہے اصل میں ہمارے خیال میں بات یہ ہے کہ اُمّت کی مثال عورت سے بھی دی جاتی ہے چنانچہ قرآن شریف سے بھی اس کی نظیر ملتی ہے جیسا کہ فرماتا ہے ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ الخ یہ ایک نہایت ہی باریک رنگ کا لطیف استعارہ ہوتا ہے۔ اُمّت میں جوہرِ صلاحیت ہوتا ہے اور نبی اور اُمّت کے تعلق سے بڑے بڑے حقائق معارف اور فیضان کے چشمے پیدا ہوتے ہیں اور نبی اور اُمّت کے سچے تعلق سے وہ نتائج پیدا ہوتے ہیں جن سے خدائی فیضان اور رحم کا جذب ہوتا ہے۔ پس کرشن اور گوپیوں کے ظاہری قصّہ کی تہہ میں ہمارے خیال میں یہی رازِ حقیقت پنہاں ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۷ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۸)

اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کے متعلق اِس اعتراض کے جواب میں کہ یہ تہذیب کے خلاف ہے فرمایا کہ

جو خدا تعالیٰ کو خالق سمجھتے ہیں تو کیا اس خلق کو لغو اور باطل قرار دیتے ہیں۔ جب اس نے ان اعضاء کو خلق کیا اس وقت تہذیب نہ تھی۔ خالق مانتے ہیں اور خلق پر اعتراض نہیں کرتے ہیں تو پھر اس ارشاد پر اعتراض کیوں ؟ دیکھنا یہ ہے کہ زبانِ عرب میں اس لفظ کا استعمال ان کے عُرف و اُنس کے نزدیک کوئی خلافِ تہذیب امر ہے جب نہیں تو دوسری زبان والوں کا حق نہیں کہ اپنے عُرف کے لحاظ سے اسے خلافِ تہذیب ٹھہرائیں۔ ہر سوسائٹی کے عُرفی الفاظ اور مصطلحات الگ الگ ہیں اور تہذیب اور خلافِ تہذیب امور الگ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

سُورۃ المُلک

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

۳ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ ○

دُنیا کی کامیابیاں ابتلاء سے خالی نہیں ہوتی ہیں۔ قرآن شریف میں آیا ہے خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ یعنی موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ ہم تمہیں آزمائیں۔ کامیابی اور ناکامی بھی زندگی اور موت کا سوال ہوتا ہے۔ کامیابی ایک قسم کی زندگی ہوتی ہے۔ جب کسی کو اپنے کامیاب ہونے کی خبر پہنچتی ہے تو اس میں جان پڑ جاتی ہے اور گویا نئی زندگی ملتی ہے اور اگر ناکامی کی خبر آجائے تو زندہ ہی مر جاتا ہے اور بسا اوقات بہت سے کمزور دِل آدمی ہلاک بھی ہو جاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۳ مورخہ ۲۴ رجون ۱۹۰۱ء صفحہ اوّل)

۶ وَ لَقَدۡ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ وَ جَعَلۡنٰہَا رُجُوۡمًا لِّلشَّیٰطِیۡنِ وَ اَعۡتَدۡنَا لَہُمۡ عَذَابَ السَّعِیۡرِ ○

ہم نے سماء الدّنیا کو ستاروں کے ساتھ زینت دی ہے اور ستاروں کو ہم نے رجم شیاطین کے لئے ذریعہ ٹھہرایا ہے۔ پہلے اس سے نصِ قرآنی سے ثابت ہو چکا ہے کہ آسمان سے زمین تک ہر یک امر کے مقسّم اور مدبّر فرشتے ہیں اور اب یہ قول اللہ جلّ شانہٗ کا کہ شہبِ ثاقبہ کو چلانے والے وہ ستارے ہیں جو سماء الدّنیا میں ہیں۔ بظاہر منافی اور مبائن ان آیات سے دکھائی دیتا ہے جو فرشتوں کے بارے میں آئی ہیں لیکن اگر بنظرِ غور دیکھا جائے

تو کچھ منافی نہیں کیونکہ ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن کریم کی تعلیم سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے آسمان اور آسمانی اجرام کے لئے بطور جان کے ہیں اور ظاہر ہے کہ کسی شئے کی جان اُس شئے سے جُدا نہیں ہوتی اِس وجہ سے خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کے بعض مقامات میں رمی شہب کا فاعل فرشتوں کو ٹھہرایا اور بعض دوسرے مقامات میں اُسی رمی کا فاعل ستاروں کو ٹھہرا دیا کیونکہ فرشتے ستاروں میں اپنا اثر ڈالتے ہیں جیسا کہ جان بدن میں اپنا اثر ڈالتی ہے تب وہ اثر ستاروں سے نکل کر اُن اَرضی بخارات پر پڑتا ہے جو شہاب بننے کے لائق ہوتے ہیں تو وہ فی الفور قدرتِ خدا تعالےٰ سے مشتعل ہو جاتے ہیں اور فرشتے ایک دوسرے رنگ میں شہبِ ثاقبہ سے تعلق پکڑ کر اپنے نور کے ساتھ یمین اور یسار کی طرف ان کو چلاتے ہیں اور اِس بات میں تو کسی فلسفی کو کلام نہیں کہ جو کچھ کائنات الجوّ یا زمین میں ہوتا ہے عِلل ابتدائیہ اُن کے نجوم اور تاثیراتِ سماوی ہی ہوتی ہیں۔ ہاں اس دوسرے دقیق بھید کو ہر یک شخص نہیں سمجھ سکتا کہ نجوم کے قوی فرشتوں سے فیضیاب ہیں۔ اِس بھید کو اوّل قرآن کریم نے ظاہر فرمایا اور پھر عارفوں کو اِس طرف توجہ پیدا ہوئی۔ غرض اِس آیت سے بھی منقولی طور پر یہی ثابت ہوا کہ فرشتے نجوم اور آسمانی قوی کے لئے جان کی طرح ہیں اور اِسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں کبھی نجوم کا فعل فرشتوں کی طرف منسوب کیا ہے اور کبھی فرشتوں کا فعل نجوم کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب کہ قرآن کریم کی تعلیم کی رُو سے فرشتے نجوم اور شمس اور قمر اور آسمان کے لئے جان کی طرح ہیں اور قیام اور بقا اِن تمام چیزوں کا فرشتوں کے تعلق پر موقوف ہے اور اُن کے ارجاء کی طرف کھسک جانے سے تمام اجرام ستاروں اور شمس و قمر اور آسمان کو موت کی صورت پیش آتی ہے تو پھر اس صورت میں وہ جان کی طرح ہوئے یا کچھ اَور ہوئے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۴۰ تا ۱۴۲ حاشیہ)

چونکہ رجم کی خدمت فرشتے کرتے ہیں نہ کہ ستارے لہٰذا اسی سے قطعی طور پر ثابت ہوا کہ ہر یک ستارے پر ایک فرشتہ مؤکل ہے اور چونکہ فرشتے ستاروں کے لئے بوجہ شدتِ تعلق جان کی طرح ہیں اِس لئے اِس آیت میں فرشتوں کا فعل ستاروں کی طرف منسوب کیا گیا۔ فتدبر۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۷۷ حاشیہ)

﴿۹-۱۰﴾ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ۝

اور جب دوزخ میں کوئی فوج کافروں کی پڑے گی تو جو فرشتے دوزخ پر مقرر ہیں وہ دوزخیوں کو کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس کوئی نذیر آیا تھا۔ وہ کہیں گے کہ ہاں آیا تو تھا مگر ہم نے اُس کی تکذیب کی اور ہم نے کہا کہ خدا نے کچھ نہیں اُتارا۔ اب دیکھو اِن آیات سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دوزخی دوزخ میں اِس لئے پڑیں گے کہ وہ وقت کے نبیوں کو قبول نہیں کریں گے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۹)

خوب یاد رکھو کہ قلوب کی اصلاح اسی کا کام ہے جس نے قلوب کو پیدا کیا ہے۔ نِرے کلمات اور چرب زبانیاں اِصلاح نہیں کر سکتی ہیں بلکہ ان کلمات کے اندر ایک رُوح ہونی چاہیئے۔ پس جس شخص نے قرآن شریف کو پڑھا اور اس نے اتنا بھی نہیں سمجھا کہ ہدایت آسمان سے آتی ہے تو اُس نے کیا سمجھا؟ اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَذِیْرٌ کا جب سوال ہوگا تو پتہ لگے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ ؎

خدا را بخدا تواں شناخت

اور یہ ذریعہ بغیر امام نہیں مل سکتا کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے تازہ بتازہ نشانوں کا مظہر اور اس کی تجلیات کا مورد ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے مَنْ لَّمْ یَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِہٖ فَقَدْ مَاتَ مِیْتَۃَ الْجَاهِلِیَّۃِ یعنی جس نے زمانہ کے امام کو شناخت نہیں کیا وہ جہالت کی موت مَر گیا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۸ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۰)

۱۱۔ وَقَالُوْا لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ○

دوزخی کہیں گے کہ اگر ہم عقلمند ہوتے اور مذہب اور عقیدہ کو معقول طریقوں سے آزماتے یا کامل عقلمندوں اور محققوں کی تحریروں اور تقریروں کو توجہ سے سُنتے تو آج دوزخ میں نہ پڑتے۔

(اِسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۱۸)

قلب اور عرش کے درمیان گویا باریک تار ہے قلب کو جو حکم کرتا ہے اس سے ہی لذت پاتا ہے۔ خارجی دلائل اور براہین کا محتاج نہیں ہوتا ہے بلکہ ملہم ہوکر خدا سے اندر ہی اندر باتیں پاکر فتویٰ دیتا ہے۔ ہاں یہ بات سچ ہے کہ جب تک قلب قلب نہ بنے لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ کا مصداق ہوتا ہے یعنی انسان پر ایک وہ زمانہ آتا ہے کہ جس میں نہ قلب و دماغ کی قوتیں اور طاقتیں ہوتی ہیں۔ پھر ایک زمانہ دماغ کا آتا ہے دماغی قوتیں اور طاقتیں نشوونما پاتی ہیں اور ایک ایسا زمانہ آتا ہے کہ قلب منوّر اور مشتعل اور روشن ہو جاتا ہے۔ جب قلب کا زمانہ آتا ہے اس وقت اِنسان روحانی بلوغ حاصل کرتا ہے اور دماغ قلب کے تابع ہو جاتا ہے اور دماغی قوتوں کو قلب کی خاصیتوں اور طاقتوں پر فوق نہیں ہوتا۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

ساری سعادتیں علم صحیح کی تحصیل میں ہیں۔ یہ جس قدر لوگ نصرانی ہوئے ہیں وہ جہالت کے سبب ہوئے اگر علم کامل ہوتا تو انسان کو خدا نہ بناتے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جہنمی کہیں گے لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۷ر جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ یعنی اگر ہم شریعت پر چلتے یا کانشنس پر ہی عمل کرتے تو اصحاب السعیر سے نہ ہوتے۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۵)

میری تائید اور تصدیق اور اِس سلسلہ کی سچائی کے لئے دلائل عقلیہ موجود ہیں کاش یہ لوگ اگر نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ سے واقف نہیں تھے اور ان آیاتِ اَرضیہ اور سماویہ کو جو میری صداقت کے ثبوت میں میرے ہاتھ پر ظاہر ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے تو عقل ہی سے کام لیتے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق قرآن کریم میں ذکر آیا ہے کہ جب وہ دوزخ میں داخل ہوں گے تو اس وقت ان کی آنکھیں کُھلیں گی اور اپنی غلطی پر اطلاع ہوگی تو کہیں گے

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ

اے کاش اگر ہم سُنتے اور پھر سُن کر عقل سے کام لیتے تو ہم جہنمی نہ ہوتے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۲۰ مورخہ ۱۰ر جون ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ تدبّر کے سوا ایمان صحیح نہیں ہوتا۔

(البدر جلد ۷ نمبر ۳ مورخہ ۲۳ر جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

علم صحیح اور عقل سلیم یہ بھی خوش قسمتی کی نشانیاں ہیں جس میں شقاوت ہو اس کی مَت ماری جاتی ہے۔ وہ نیک کو بد اور بد کو نیک سمجھتا ہے۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۰ر فروری ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ سے معلوم ہوتا ہے کہ سماع اور عقل انسان کو ایمان کے واسطے جلد تیار کر دیتی ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۹ر مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۴۶)

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ۘؔ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ ۝

کیا ان لوگوں نے اپنے سروں پر پرندوں کو اُڑتے ہوئے نہیں دیکھا کہ کبھی وہ بازو کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی سمیٹ لیتے ہیں رحمٰن ہی ہے کہ ان کو گرنے سے تھام رکھتا ہے یعنی فیضانِ رحمانیت ایسا تمام ذی رُوحوں پر محیط ہو رہا ہے کہ پرندے بھی جو ایک پیسہ کے دو تین مل سکتے ہیں وہ بھی اس فیضان کے وسیع دریا میں خوشی اور سرور

سے تیر رہے ہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۷۶ حاشیہ)

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ○

کافر پوچھتے ہیں کہ یہ دعویٰ پورا کب ہوگا۔ اگر تم سچے ہو تو تاریخ عذاب بتاؤ۔ ان کو کہہ دے مجھے کوئی تاریخ معلوم نہیں یہ علم خدا کو ہے مَیں تو صرف ڈرانے والا ہوں۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۹۲)

○

سُورۃ القلم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

۴ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ ○

تُو اے نبی ایک خُلقِ عظیم پر مخلوق و مفطور ہے یعنی اپنی ذات میں تمام مکارمِ اخلاق کا ایسا متمم و مکمل ہے کہ اُس پر زیادت متصور نہیں کیونکہ لفظِ عظیم محاورۂ عرب میں اُس چیز کی صفت میں بولا جاتا ہے جس کو اپنا نوعی کمال پُورا پُورا حاصل ہو۔ مثلاً جب کہیں کہ یہ درخت عظیم ہے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جس قدر طُول و عرض درخت میں ہو سکتا ہے وہ سب اس میں موجود ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ عظیم وہ چیز ہے جس کی عظمت اس حد تک پہنچ جائے کہ حیطۂ ادراک سے باہر ہو اور خُلق کے لفظ سے قرآن شریف اور ایسا ہی دوسری کتبِ حکمیہ میں صرف تازہ روئی اور حُسنِ اختلاط یا نرمی و تلطّف و ملائمت (جیسا عوام النّاس خیال کرتے ہیں) مراد نہیں ہے بلکہ خَلق بفتح خاء اور خُلق بضم خاء دو لفظ ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل واقع ہیں۔ خَلق بفتح خا سے مراد وہ صورتِ ظاہری ہے جو انسان کو حضرت واہب الصّور کی طرف سے عطا ہوئی جس صورت کے ساتھ وہ دوسرے حیوانات کی صورتوں سے ممیّز ہے۔ اور خُلق بضم خا سے مراد وہ صورتِ باطنی یعنی خواص اندرونی ہیں جن کی رُو سے حقیقتِ انسانیہ حقیقتِ حیوانیہ سے امتیاز کُلّی رکھتی ہے۔ پس جس قدر انسان میں مِن حَیث الانسانیّت اندرونی خواص پائے جاتے ہیں اور شجرۂ انسانیّت کو نچوڑ کر نکل سکتے ہیں جو کہ انسان اور حیوان میں مِن حَیث الباطن مابہ الامتیاز ہیں اُن سب کا نام خُلق ہے۔ اور چونکہ شجرۂ فطرتِ انسانی اصل میں توسّط اور اعتدال پر واقع ہے اور ہر ایک افراط و تفریط سے جو قوایٔ حیوانیہ میں پایا جاتا ہے منزہ ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ[1] الجزو نمبر ۳۰ اِس لئے خُلق کے لفظ سے جو کسی مذمّت کی قید کے بغیر بولا جائے ہمیشہ اخلاقِ فاضلہ

[1] سورۃ التین : ۵

مراد ہوتے ہیں اور وہ اخلاقِ فاضلہ جو حقیقتِ انسانیہ ہے۔ تمام وہ خواص اندرونی ہیں جو نفس ناطقہ انسان میں پائے جاتے ہیں جیسے عقل ذکا۔ سُرعتِ فہم۔ صفائی ذہن۔ حُسنِ تحفظ۔ حُسنِ تذکر۔ عفت۔ حیا۔ صبر۔ قناعت۔ زہد۔ تورع۔ جوانمردی۔ استقلال عدل۔ امانت۔ صدق لہجہ۔ سخاوت فی محلہٖ۔ ایثار فی محلہٖ۔ کرم فی محلہٖ۔ مروت فی محلہٖ۔ شجاعت فی محلہٖ۔ علوِ ہمت فی محلہٖ۔ حلم فی محلہٖ۔ تحمل فی محلہٖ۔ حمیت فی محلہٖ۔ تواضع فی محلہٖ۔ ادب فی محلہٖ۔ شفقت فی محلہٖ۔ رافت فی محلہٖ۔ رحمت فی محلہٖ۔ خوفِ الٰہی۔ محبتِ الٰہیہ۔ انس باللہ۔ انقطاع الی اللہ وغیرہ وغیرہ۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۱۷۹، ۱۸۰ حاشیہ)

خدائے تعالیٰ کا ارادہ انبیاء اور اولیاء کی نسبت یہ ہوتا ہے کہ اُن کے ہر ایک قسم کے اخلاق ظاہر ہوں اور بہ پایۂ ثبوت پہنچ جائیں۔ سو خدائے تعالیٰ اِسی ارادے کو پُورا کرنے کی غرض سے اُن کی نورانی عمر کو دو حصہ پر منقسم کر دیتا ہے ایک حصہ تنگیوں اور مصیبتوں میں گذرتا ہے اور ہر طرح سے دُکھ دئے جاتے ہیں اور ستائے جاتے ہیں تا وہ اعلیٰ اخلاق اُن کے ظاہر ہو جائیں کہ جو بجز سخت تر مصیبتوں کے ہرگز ظاہر اور ثابت نہیں ہو سکتے۔ اگر اُن پر وہ سخت تر مصیبتیں نازل نہ ہوں تو یہ کیونکر ثابت ہو کہ وہ ایک ایسی قوم ہے کہ مصیبتوں کے پڑنے سے اپنے مولیٰ سے بے وفائی نہیں کرتے بلکہ اَور بھی آگے قدم بڑھاتے ہیں اور خداوندِ کریم کا شُکر کرتے ہیں کہ اُس نے سب کو چھوڑ کر انہیں پر نظرِ عنایت کی اور انہیں کو اِس لائق سمجھا کہ اس کے لئے اور اس کی راہ میں ستائے جائیں سو خدا تعالیٰ ان پر مصیبتیں نازل کرتا ہے تا ان کا صبر ان کا صدقِ قدم ان کی مردی ان کی استقامت ان کی وفاداری ان کی فتوت شعاری لوگوں پر ظاہر کر کے الاستقامة فوق الكرامة کا مصداق اُن کو ٹھہراوے کیونکہ کامل صبر بجز کامل مصیبتوں کے ظاہر نہیں ہو سکتا اور اعلیٰ درجے کی استقامت اور ثابت قدمی بجز اعلیٰ درجے کے زلزلے کے معلوم نہیں ہو سکتی۔ اور یہ مصائب حقیقت میں انبیاء اور اولیاء کے لئے روحانی نعمتیں ہیں جن سے دُنیا میں ان کے اخلاقِ فاضلہ جن میں وہ بے مثل و مانند ہیں ظاہر ہوتے ہیں اور آخرت میں اُن کے درجات کی ترقی ہوتی ہے۔ اگر ان پر یہ مصیبتیں نازل نہ کرتا تو یہ نعمتیں بھی اُن کو حاصل نہ ہوتیں اور نہ عوام پر اُن کے شمائلِ حسنہ کما حقہٗ کھلتے بلکہ دوسرے لوگوں کی طرح اور ان کے مساوی ٹھہرتے۔ اور گو اپنی چند روزہ عمر کو کیسے ہی عشرت اور راحت میں بسر کرتے پر آخر ایک دن اِس دارِ فانی سے گذر جاتے اور اِس صورت میں نہ وہ عیش اور عشرت ان کی باقی رہتی نہ آخرت کے درجاتِ عالیہ حاصل ہوتے نہ دُنیا میں اُن کی وہ فتوت اور جوانمردی اور وفاداری اور شجاعت شہرۂ آفاق ہوتی جس سے وہ ایسے ارجمند ٹھہرے جن کا کوئی مانند نہیں اور ایسے یگانہ ٹھہرے جن کا کوئی ہم جنس نہیں اور ایسے فرد الفرد ٹھہرے جن کا کوئی ثانی نہیں اور ایسے غیب الغیب ٹھہرے جن تک کسی ادراک کی رسائی نہیں اور ایسے کامل اور بہادر ٹھہرے کہ گویا ہزار شیر ایک قالب میں ہیں اور ہزار ہا پلنگ ایک بدن میں جن کی قوت اور طاقت سب کی نظروں سے بلند تر ہو گئی اور جو تقرب کے اعلیٰ درجات تک پہنچ گئی۔

اور دوسرا حصّہ انبیاء اور اولیاء کی عمر کا فتح میں۔ اقبال میں۔ دولت میں بمرتبۂ کمال ہوتا ہے تا وہ اَخلاق اُن کے ظاہر ہو جائیں کہ جن کے ظہور کے لئے فتحمند ہونا، صاحبِ اقبال ہونا، صاحبِ دَولت ہونا، صاحبِ اختیار ہونا، صاحبِ اقتدار ہونا، صاحبِ طاقت ہونا ضروری ہے کیونکہ اپنے دُکھ دینے والوں کے گناہ بخشنا اور اپنے ستانے والوں سے درگذر کرنا اور اپنے دشمنوں سے پیار کرنا اور اپنے بداندیشوں کی خیرخواہی بجا لانا، دَولت سے دل نہ لگانا، دولت سے مغرور نہ ہونا، دولتمندی میں امساک اور بُخل اختیار نہ کرنا اور کرم اور جُود اور بخشش کا دروازہ کھولنا اور دولت کو ذریعۂ نفس پروری نہ ٹھہرانا اور حکومت کو آلۂ ظلم و تعدّی نہ بنانا یہ سب اَخلاق ایسے ہیں کہ جن کے ثبوت کے لئے صاحبِ دولت اور صاحبِ طاقت ہونا شرط ہے اور اس وقت بہ پایۂ ثبوت پہنچتے ہیں کہ جب انسان کے لئے دَولت اور اقتدار دونوں میسّر ہوں۔ پس چونکہ بجز زمانۂ مصیبت و ادبار و زمانۂ دولت و اقتدار یہ دونوں قسم کے اَخلاق ظاہر نہیں ہو سکتے اِس لئے حکمتِ کاملہ ایزدی نے تقاضا کیا کہ انبیاء اور اَولیاء کو ان دونوں طور کی حالتوں سے کہ جو ہزارہا نعمتوں پر مشتمل ہیں متمتّع کرے لیکن ان دونوں حالتوں کا زمانۂ وقوعہ ہر ایک کے لئے ایک ترتیب پر نہیں ہوتا بلکہ حکمتِ الٰہیہ بعض کے لئے زمانۂ امن و آسائش پہلے حصّۂ عمر میں میسّر کر دیتی ہے اور زمانۂ تکالیف پیچھے سے اور بعض پر پہلے وقتوں میں تکالیف وارد ہوتی ہیں اور پھر آخرکار نصرتِ الٰہی شامل ہو جاتی ہے اور بعض میں یہ دونوں حالتیں مخفی ہوتی ہیں اور بعض میں کامل درجہ پر ظہور و بروز پکڑتی ہیں اور اِس بارے میں سب سے اوّل قدم حضرت خاتم الرسل محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کمال وضاحت سے یہ دونوں حالتیں وارد ہو گئیں اور ایسی ترتیب سے آئیں کہ جس سے تمام اخلاقِ فاضلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مثل آفتاب کے روشن ہو گئے اور مضمون اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ کا بہ پایۂ ثابت پہنچ گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اَخلاق کا دونوں طور پر علٰی وجہ الکمال ثابت ہونا تمام انبیاء کے اخلاق کو ثابت کرتا ہے کیونکہ آنجناب نے اُن کی نبوّت اور ان کی کتابوں کو تصدیق کیا اور اُن کا مقرب اللہ ہونا ظاہر کر دیا ہے۔ پس اس تحقیق سے یہ اعتراض بھی دُور ہو گیا کہ جو مسیح کے اخلاق کی نسبت دِلوں میں گذر سکتا ہے یعنی یہ کہ اَخلاق حضرت مسیح علیہ السّلام دونوں قسم مذکورہ بالا پر علٰی وجہ الکمال ثابت نہیں ہو سکتے بلکہ ایک قسم کے رُو سے ثابت نہیں ہیں کیونکہ مسیح نے جو زمانۂ مصیبتوں میں صبر کیا تو کمالیت اور صحت اُس صبر کی تب بہ پایۂ صداقت پہنچ سکتی تھی کہ جب مسیح اپنے تکلیف دہندوں پر اقتدار اور غلبہ پاکر اپنے موذیوں کے گناہ دلی صفائی سے بخش دیتا جیسا کہ حضرتِ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں اور دوسرے لوگوں پر بکلّی فتح پاکر اور اُن کو اپنی تلوار کے نیچے دیکھ کر پھر اُن کا گناہ بخش دیا اور صرف انہیں چند لوگوں کو سزا دی جن کو سزا دینے کے لئے حضرتِ احدیت کی طرف سے قطعی حکم وارد ہو چکا تھا اور بجز اُن اَزلی ملعونوں کے

ہر ایک دشمن کا گناہ بخش دیا اور فتح پاکر سب کو لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ[1] کہا اور اُسی عفو تقصیر کی وجہ سے کہ جو مخالفوں کی نظر میں ایک امرِ محال معلوم ہوتا تھا اور اپنی شرارتوں پر نظر کرنے سے وہ اپنے تئیں اپنے مخالف کے ہاتھ میں دیکھ کر مقتول خیال کرتے تھے ہزاروں انسانوں نے ایک ساعت میں دینِ اسلام قبول کر لیا اور حقانی صبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ جو ایک زمانۂ دراز تک آنجناب نے اُن کی سخت سخت ایذاؤں پر کیا تھا آفتاب کی طرح اُن کے سامنے روشن ہو گیا۔ اور چونکہ فطرتاً یہ بات انسان کی عادت میں داخل ہے کہ اسی شخص کے صبر کی عظمت اور بزرگی انسان پر کامل طور پر روشن ہوتی ہے کہ جو بعد زمانۂ آزارکشی کے اپنے آزار دہندہ پر قدرتِ انتقام پاکر اس کے گناہ بخش دے۔ اِس وجہ سے مسیح کے اُخلاق کہ جو صبر اور حلم اور برداشت کے متعلق تھے بخوبی ثابت نہ ہوئے اور یہ امر اچھی طرح نہ کُھلا کہ مسیح کا صبر اور حلم اختیاری تھا یا اضطراری تھا کیونکہ مسیح نے اقتدار اور طاقت کا زمانہ نہیں پایا تا دیکھا جاتا کہ اُس نے اپنے مُوذیوں کے گناہ کو عفو کیا یا انتقام لیا برخلاف اخلاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ وہ صدہا مواقع میں اچھی طرح کُھل گئے اور امتحان کئے گئے اور اُن کی صداقت آفتاب کی طرح روشن ہو گئی اور جو اُخلاق، کرم اور جُود اور سخاوت اور ایثار اور فتوت اور شجاعت اور زُہد اور قناعت اور اعراض عن الدّنیا کے متعلق تھے وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک میں ایسے روشن اور تاباں اور درخشاں ہوئے کہ مسیح کیا بلکہ دُنیا میں آنحضرتؐ سے پہلے کوئی بھی ایسا نبی نہیں گذرا جس کے اخلاق ایسی وضاحتِ تامہ سے روشن ہو گئے ہوں کیونکہ خدائے تعالیٰ نے بیشمار خزائن کے دروازے آنحضرتؐ پر کھول دئے سو آنجناب نے ان سب کو خدا کی راہ میں خرچ کیا اور کسی نوع کی تن پروری میں ایک حبّہ بھی خرچ نہ ہوا نہ کوئی عمارت بنائی نہ کوئی بارگاہ تیار ہوئی بلکہ ایک چھوٹے سے کچے کوٹھے میں جس کو غریب لوگوں کے کوٹھوں پر کچھ بھی ترجیح نہ تھی اپنی ساری عمر بسر کی۔ بدی کرنے والوں سے نیکی کر کے دکھلائی اور وہ جو دل آزار تھے اُن کو اُن کی مصیبت کے وقت اپنے مال سے خوشی پہنچائی۔ سونے کے لئے اکثر زمین پر بستر اور رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا جھونپڑا اور کھانے کے لئے نانِ جَو یا فاقہ اختیار کیا۔ دُنیا کی دولتیں بکثرت ان کو دی گئیں پر آنحضرتؐ نے اپنے پاک ہاتھوں کو دُنیا سے ذرا آلودہ نہ کیا اور ہمیشہ فقر کو تونگری پر اور مسکینی کو امیری پر اختیار رکھا اور اُس دِن سے جو ظہور فرمایا تا اُس دن تک جو اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے بجز اپنے مولیٰ کریم کے کسی کو کچھ چیز نہ سمجھا اور ہزاروں دشمنوں کے مقابلے پر معرکہ جنگ میں کہ جہاں قتل کیا جانا یقینی امر تھا خالصًا خدا کے لئے کھڑے ہو کر اپنی شجاعت اور وفاداری اور ثابت قدمی دکھلائی۔ غرض جُود اور سخاوت اور زُہد

---

[1] سُورۃ یوسف : ۹۳

اور قناعت اور مردی اور شجاعت اور محبتِ الہیہ کے متعلق جو جو اخلاقِ فاضلہ ہیں وہ بھی خداوندِ کریم نے حضرت خاتم الانبیاء میں ایسے ظاہر کئے کہ جن کی مثل نہ کبھی دُنیا میں ظاہر ہوئی اور نہ آئندہ ظاہر ہوگی لیکن حضرت مسیح علیہ السلام میں اِس قسم کے اخلاق بھی اچھی طرح ثابت نہیں ہوئے کیونکہ یہ سب اخلاق بجز زمانۂ اقتدار اور دولت کے بہ پایۂ ثبوت نہیں پہنچ سکتے اور مسیح نے اقتدار اور دولت کا زمانہ نہیں پایا اِس لئے دونوں قسم کے اخلاق اُس کے زیرِ پردہ رہے اور جیسا کہ شرط ہی ظہور پذیر نہ ہوئی پس یہ اعتراض مذکورہ بالا جو مسیح کی ناقص حالت پر وارد ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل حالت سے بکلّی مندفع ہو گیا کیونکہ وجود باجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ایک نبی کے لئے متمم اور مکمل ہے اور اُس ذاتِ عالی کے ذریعہ سے جو کچھ امر مسیح اور دوسرے نبیوں کا مُشتبہ اور مخفی رہا تھا وہ چمک اُٹھا اور خدا نے اُس ذاتِ مقدس پر انہیں معنوں کر کے وحی اور رسالت کو ختم کیا کہ سب کمالات اُس وجودِ باجود پر ختم ہو گئے۔ وَهٰذَا فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۵۱ تا ۲۶۳ حاشیہ)

جو اخلاقِ فاضلہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن شریف میں ذکر ہے وہ حضرت موسیٰؑ سے ہزار ہا درجہ بڑھ کر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تمام اُن اخلاقِ فاضلہ کا جامع ہے جو نبیوں میں متفرق طور پر پائے جاتے ہیں اور نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمایا ہے اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ تو خلقِ عظیم پر ہے اور عظیم کے لفظ کے ساتھ جس چیز کی تعریف کی جائے وہ عرب کے محاورہ میں اس چیز کے انتہائے کمال کی طرف اشارہ ہوتا ہے مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ یہ درخت عظیم ہے تو اس سے یہ مطلب ہوگا کہ جہاں تک درختوں کے لئے طول و عرض اور تناوری ممکن ہے وہ سب اس درخت میں حاصل ہے۔ ایسا ہی اِس آیت کا مفہوم ہے کہ جہاں تک اخلاقِ فاضلہ و شمائلِ حسنہ نفسِ انسانی کو حاصل ہو سکتے ہیں وہ تمام اخلاقِ کاملہ تامہ نفسِ محمدی میں موجود ہیں۔ سو یہ تعریف ایسی اعلیٰ درجہ کی ہے جس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۰۸ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

اِس جگہ بہتر ہوگا کہ مَیں خُلق کے لفظ کی بھی کسی قدر تعریف کر دوں۔ سو جاننا چاہیئے کہ خَلق خا کی فتحہ سے ظاہری پیدائش کا نام ہے اور خُلق خا کے ضمّہ سے باطنی پیدائش کا نام ہے اور چونکہ باطنی پیدائش اخلاق سے ہی کمال کو پہنچتی ہے نہ صرف طبعی جذبات سے اِس لئے اخلاق پر ہی یہ لفظ بولا گیا۔ اور پھر یہ بات بھی بیان کر دینے کے لائق ہے کہ جیسا کہ عوام الناس خیال کرتے ہیں کہ خُلق صرف حلیمی اور نرمی اور انکساری کا نام ہے یہ اُن کی غلطی ہے بلکہ جو کچھ بمقابلہ ظاہری اعضاء کے باطن میں اِنسانی کمالات کی کیفیتیں رکھی گئی ہیں ان سب کیفیتوں کا نام خُلق ہے۔ مثلاً انسان آنکھ سے روتا ہے اور اس کے مقابل پر دِل میں ایک قوتِ رقّت ہے وہ جب بذریعہ عقلِ خداداد کے اپنے محل

پر مستعمل ہو تو وہ ایک خُلق ہے۔ ایسا ہی انسان ہاتھوں سے دشمن کا مقابلہ کرتا ہے اور اس حرکت کے مقابل پر دل میں ایک قوت ہے جس کو شجاعت کہتے ہیں۔ پس جب انسان محل پر اور موقع کے لحاظ سے اِس قوت کو استعمال میں لاتا ہے تو اس کا نام بھی خُلق ہے اور ایسا ہی انسان کبھی ہاتھوں کے ذریعہ سے مظلوموں کو ظالموں سے بچانا چاہتا ہے یا ناداروں اور بھوکوں کو کچھ دینا چاہتا ہے یا کسی اَور طرح سے بنی نوع کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور اس حرکت کے مقابل پر دِل میں ایک قوت ہے جس کو رحم بولتے ہیں اور کبھی انسان اپنے ہاتھوں کے ذریعہ سے ظالم کو سزا دیتا ہے اور اس حرکت کے مقابل پر دل میں ایک قوت ہے جس کو انتقام کہتے ہیں اور کبھی انسان حملہ کے مقابل پر حملہ کرنا نہیں چاہتا اور ظالم کے ظلم سے درگذر کرتا ہے اور اس حرکت کے مقابل پر دِل میں ایک قوت ہے جس کو عفو اور صبر کہتے ہیں اور کبھی انسان بنی نوع کو فائدہ پہنچانے کے لئے اپنے ہاتھوں سے کام لیتا ہے یا پیروں سے یا دل اور دماغ سے اور ان کی بہبودی کے لئے اپنا سرمایہ خرچ کرتا ہے تو اس حرکت کے مقابل پر دِل میں ایک قوت ہے جس کو سخاوت کہتے ہیں پس جب انسان ان تمام قوتوں کو موقع اور محل کے لحاظ سے استعمال کرتا ہے تو اس وقت اس کا نام خُلق رکھا جاتا ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

یعنی تُو ایک بزرگ خُلق پر قائم ہے سو اس تشریح کے مطابق اس کے معنے ہیں یعنی یہ کہ تمام قسمیں اخلاق کی سخاوت، شجاعت، عدل، رحم، احسان، صدق، حوصلہ وغیرہ تجھ میں جمع ہیں۔ غرض جس قدر انسان کے دل میں قوتیں پائی جاتی ہیں جیسا کہ اَدب، حیا، دیانت، مروّت، غیرت، استقامت، عفّت، ذہانت، اعتدال، مواسات یعنی ہمدردی۔ ایسا ہی شجاعت، سخاوت، عفو، صبر، احسان، صدق، وفا وغیرہ جب یہ تمام طبعی حالتیں عقل اور تدبّر کے مشورہ سے اپنے محل اور موقع پر ظاہر کی جائیں گی تو سب کا نام اخلاق ہوگا اور یہ تمام اخلاق درحقیقت انسان کی طبعی حالتیں اور طبعی جذبات ہیں اور صرف اس وقت اخلاق کے نام سے موسُوم ہوتے ہیں کہ جب محل اور موقع کے لحاظ سے بالارادہ اُن کو استعمال کیا جائے۔ چونکہ انسان کے طبعی خواص میں سے ایک یہ بھی خاصّہ ہے کہ وہ ترقی پذیر جاندار ہے اِس لئے وہ سچے مذہب کی پَیروی اور نیک صحبتوں اور نیک تعلیموں سے ایسے طبعی جذبات کو اخلاق کے رنگ میں لے آتا ہے اور یہ امر کسی اَور جاندار کے لئے نصیب نہیں۔

(اِسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۸ تا ۲۰)

چونکہ اماموں کو طرح طرح کے اوباشوں اور سِفلوں اور بد زبان لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے اِس لئے ان میں اعلیٰ درجہ کی اخلاقی قوت کا ہونا ضروری ہے تا ان میں طیشِ نفس اور مجنونانہ جوش پیدا نہ ہو اور لوگ ان کے فیض سے محروم نہ رہیں۔ یہ نہایت قابلِ شرم بات ہے کہ ایک شخص خدا کا دوست کہلا کر پھر اخلاقِ رذیلہ میں گرفتار

ہو اور درشت بات کا ذرہ بھی متحمل نہ ہو سکے اور جو امامِ زماں کہلا کر ایسی کچی طبیعت کا آدمی ہو کہ اَدنیٰ اَدنیٰ بات میں مُنہ میں جھاگ آتا ہے۔ آنکھیں نیلی پیلی ہوتی ہیں وہ کسی طرح امامِ زمان نہیں ہو سکتا لہٰذا اس پر آیت اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ کا پُورے طور پر صادق آجانا ضروری ہے۔ (ضرورت الامام صفحہ ۸)

وَحَمِدَهٗ وَعَزَا اِلَیْهِ خُلُقًا عَظِیْمًا مِنَ التَّفْخِیْمِ وَالتَّکْرِیْمِ۔ کَمَا جَاءَ فِی الْقُرْاٰنِ الْکَرِیْمِ۔ وَاِنْ سَأَلْتَ مَا خُلُقُهُ الْعَظِیْمُ فَنَقُوْلُ اَنَّهٗ رَحْمَانٌ وَرَحِیْمٌ۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۱۵)

کُل انسانوں کے کمالات بہ ہیئت مجموعی ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع ہیں اور اِسی لئے آپؐ کُل دُنیا کے لئے نبی مبعوث ہوئے اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ میں بھی اسی مجموعہ کمالاتِ انسانی کی طرف اشارہ ہے اس صورت میں عظمتِ اخلاقِ محمدؐی کی نسبت غور ہو سکتا ہے اور وہ یہی وجہ تھی کہ آپؐ پر نبوتِ کاملہ کے کمالات ختم ہوئے۔ یہ ایک مسلّم بات ہے کہ کسی چیز کا خاتمہ اس کی علّتِ غائی کے اِختتام پر ہوتا ہے جیسے کتاب کے جب کُل مطالب بیان ہو جاتے ہیں تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے اسی طرح پر رسالت اور نبوّت کی علّتِ غائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوئی اور یہی نبوّت کے معنے ہیں کیونکہ یہ ایک سلسلہ ہے جو چلا آیا ہے اور کامل انسان پر آکر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ ۱؎ صفحہ ۱۱، ۱۲)

بلحاظ اخلاقی معجزات کے خود آپؐ کا وجودِ مقدس اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (پ۲۹) کا مصداق ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۸۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی معجزات میں ایک اَور معجزہ بھی ہے کہ آپؐ کے پاس ایک وقت بہت سی بھیڑیں تھیں ایک شخص نے کہا اِس قدر مال اِس سے پیشتر کِسی کے پاس نہیں دیکھا حضورؐ نے وہ سب بھیڑیں اُس کو دے دیں۔ اُس نے فی الفور کہا کہ لاریب آپؐ سچے نبی ہیں۔ سچے نبی کے بغیر اِس قسم کی سخاوت دوسرے سے عمل میں آنی مشکل ہے۔ الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ فاضلہ ایسے تھے کہ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ قرآن میں وارد ہوُا۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۹)

اخلاقی حالت ایک ایسی کرامت ہے جس پر کوئی اُنگلی نہیں رکھ سکتا اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ

ترجمہ از مرتّب :۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ (رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعریف کی ہے اور آپؐ کی طرف خُلقِ عظیم کو بطور اکرام اور اعزاز منسوب کیا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اور اگر تُو سوال کرے کہ آپؐ کے خلقِ عظیم کیا ہیں تو ہم کہیں گے کہ آپؐ رحمان اور رحیم ہیں۔

(اعجاز المسیح صفحہ ۱۱۵)

علیہ وسلم کو سب سے بڑا اور قوی اعجاز اخلاق ہی کا دیا گیا جیسے فرمایا اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ یُوں تو آنحضرت صلعم کے ہر ایک قسم کے خوارق قوّت ثبوت میں مُجملہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے بجائے خود بڑھے ہوئے ہیں مگر آپؐ کے اخلاقی اعجاز کا نمبر اُن سب سے اوّل ہے جس کی نظیر دُنیا کی تاریخ نہیں بتلا سکتی اور نہ پیش کر سکے گی۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۵۹)

سب سے اکمل نمونہ اور نظیر آنحضرت صلعم ہیں جو جمیع اخلاق میں کامل تھے اسی لئے آپ کی شان میں فرمایا اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۵۲)

خُلق اور خَلق دو لفظ ہیں جو بالمقابل معنوں پر دلالت کرتے ہیں خَلق ظاہری پیدائش کا نام ہے ایسا ہی باطنی قوٰی سے جو انسان اور غیر انسان میں مابہ الامتیاز ہیں وہ سب خُلق میں داخل ہیں یہاں تک کہ عقل فکر وغیرہ تمام قوتیں خُلق ہی میں داخل ہیں۔

خُلق سے اِنسان اپنی انسانیت کو درست کرتا ہے اگر انسانوں کے فرائض نہ ہوں تو فرض کرنا پڑے گا کہ آدمی ہے؟ گدھا ہے؟ یا کیا ہے؟ جب خُلق میں فرق آجاوے تو صورت ہی رہتی ہے مثلاً عقل ماری جاوے تو مجنون کہلاتا ہے صرف ظاہری صورت سے ہی انسان کہلاتا ہے پس اخلاق سے مراد خدائے تعالیٰ کی رضا جوئی (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی میں مجسّم نظر آتی ہے) کا حصول ہے اِس لئے ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرزِ زندگی کے موافق اپنی زندگی بنانے کی کوشش کرے یہ اخلاق بطور بنیاد کے ہیں اگر وہ متزلزل رہے تو اُس پر عمارت نہیں بنا سکتے۔ اخلاق ایک اینٹ پر دوسری اینٹ کا رکھنا ہے اگر ایک اینٹ ٹیڑھی ہو تو ساری دیوار ٹیڑھی رہتی ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۶ء صفحہ ۱۵۱، ۱۵۲)

اخلاق کی درستی بہت ضروری چیز ہے کیونکہ نیکیوں کی ماں اخلاق ہی ہے۔ خیر کا پہلا درجہ جہاں سے اِنسان قوت پاتا ہے اخلاق ہے۔ دو لفظ ہیں ایک خَلق اور دوسرا خُلق۔ خَلق ظاہری پیدائش کا نام ہے اور خُلق باطنی پیدائش کا۔ جیسے ظاہر میں کوئی خوبصورت ہوتا ہے اور کوئی بہت ہی بدصورت۔ اسی طرح پر کوئی اندرونی پیدائش میں نہایت حسین اور دِل رُبا ہوتا ہے اور کوئی اندر سے مجذوم اور مبروص کی طرح مکروہ۔ لیکن ظاہری صورت چونکہ نظر آتی ہے اِس لئے ہر شخص دیکھتے ہی پہچان لیتا ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے اور نہیں چاہتا کہ بدصورت اور بدوضع ہو مگر چونکہ اس کو دیکھتا ہے اِس لئے اُس کو پسند کرتا ہے اور خُلق کو چونکہ دیکھا نہیں اِس لئے اُس کی خوبی سے ناآشنا ہو کر اُس کو نہیں چاہتا۔ ایک اندھے کے لئے خوبصورتی اور بدصورتی دونوں ایک ہی ہیں۔ اسی طرح پر وہ انسان جس کی نظر اندرونہ تک نہیں پہنچتی اُس اندھے کی ہی مانند ہے۔

خَلق تو ایک بدیہی بات ہے مگر خُلق ایک نظری مسئلہ ہے اگر اخلاقی بدیاں اور ان کی لعنت معلوم ہو تو

حقیقت کھلے۔

غرض اَخلاقی خوبصورتی ایک ایسی خوبصورتی ہے جس کو حقیقی خوبصورتی کہنا چاہیئے بہت تھوڑے ہیں جو اس کو پہچانتے ہیں۔ اَخلاق نیکیوں کی کلید ہے۔ جیسے باغ کے دروازے پر قُفل ہو دُور سے پھل پھول نظر آتے ہیں مگر اندر نہیں جاسکتے لیکن اگر قُفل کھول دیا جاوے تو اندر جاکر پوری حقیقت معلوم ہوتی ہے اور دل و دماغ میں ایک سُرور اور تازگی آتی ہے۔ اَخلاق کا حاصل کرنا گویا اس قُفل کو کھول کے اندر داخل ہونا ہے۔

کِسی کو اخلاق کی کوئی قوّت نہیں دی گئی مگر اُس کو بہت سی نیکیوں کی توفیق ملی۔ ترکِ اَخلاق ہی بَدی اور گناہ ہے۔ ایک شخص جو مثلاً زنا کرتا ہے اُس کو خبر نہیں کہ اُس عورت کے خاوند کو کس قدر صدمۂ عظیم پہنچتا ہے۔ اب اگر یہ اُس تکلیف اور صدمہ کو محسوس کرسکتا اور اس کو اخلاقی حصّہ حاصل ہوتا تو ایسے فعلِ شنیع کا مُرتکب نہ ہوتا۔ اگر ایسے نابکار انسان کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اس فعلِ بَد کے ارتکاب سے نوعِ انسان کے لئے کیسے کیسے خطرناک نتائج پَیدا ہوتے ہیں تو ہٹ جاتا۔ ایک شخص جو چوری کرتا ہے کم بخت ظالم اِتنا بھی تو نہیں کرتا کہ رات کے کھانے کے واسطے ہی چھوڑ جائے اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک غریب کی کئی سالوں کی محنت کو ملیامیٹ کر دیتا ہے اور جو کچھ گھر میں پاتا ہے سب کا سب لے جاتا ہے۔ ایسی قبیح بدی کی اصل جڑھ کیا ہے؟ اخلاقی قوّت کا نہ ہونا۔ اگر رحم ہوتا اور وہ یہ سمجھ سکتا کہ بچّے بھُوک سے بلبلائیں گے جن کی چیخوں سے دشمن کا بھی کلیجہ لرزتا ہے اور یہ معلوم کرکے کہ رات سے بھُوکے ہیں اور کھانے کو ایک سُوکھا ٹکڑا بھی نہیں ملا تو پتّہ پانی ہو جاتا ہے۔ اب اگر ان حالتوں کو محسوس کرتا اور اخلاقی حالت سے اندھا نہ ہوتا تو کیوں چوری کرتا۔ آئے دن اخبارات میں دردناک موتوں کی خبریں پڑھنے میں آتی ہیں کہ فلاں بچّہ زیور کے لالچ سے مارا گیا۔ فلاں جگہ کسی عورت کو قتل کر ڈالا۔ مَیں خود ایک مرتبہ اسیسر ہو کر گیا تھا۔ ایک شخص نے بارہ آنے یا عہ میں ایک بچّہ کا خون کیا تھا۔ اَب سوچ کر دیکھو کہ اگر اخلاقی حالت درست ہو تو ایسی مصیبتیں کیوں آئیں؟

(الحکم جلد ۴ نمبر ۲۵ مورخہ ۹ جولائی ۱۹۰۰ء صفحہ ۳، ۴)

خَلق اور خُلق دو لفظ ہیں۔ خَلق تو ظاہری حُسن پر بولا جاتا ہے اور خُلق باطنی حُسن پر بولا جاتا ہے۔ باطنی قوٰی جس قدر مثل عقل، فہم، سخاوت، شجاعت، غضب وغیرہ انسان کو دئیے گئے ہیں ان سب کا نام خُلق ہے۔ اور عوام النّاس میں آجکل جسے خُلق کہا جاتا ہے جیسے ایک شخص کے ساتھ تکلّف کے ساتھ پیش آنا اور تصنّع سے اس کے ساتھ ظاہری طور پر بڑی شیریں الفاظی سے پیش آنا تو اِس کا نام خُلق نہیں بلکہ نفاق ہے۔

خُلق سے مراد یہ ہے کہ اندرُونی قوٰی کو اپنے اپنے مناسب مقام پر استعمال کیا جائے۔ جہاں شجاعت دکھانے کا موقع ہو وہاں شجاعت دکھاوے۔ جہاں صبر دکھانا ہے وہاں صبر دکھائے۔ جہاں اِنتقام چاہیئے وہاں انتقام لے۔ جہاں سخاوت چاہیئے وہاں سخاوت کرے یعنی ہر ایک محل پر ہر ایک قوٰی کو استعمال کرے نہ گھٹایا جائے نہ بڑھایا

جائے یہاں تک کہ عقل اور غضب بھی جہاں تک کہ اس سے نیکی پر استعانت لی جاوے خُلق ہی میں داخل ہے اور صرف ظاہری حواس کا نام ہی حواس نہیں ہے بلکہ انسان کے اندر بھی ایک قسم کے حواس ہوتے ہیں۔ظاہری حواس تو حیوانوں میں بھی ہوتے ہیں۔مثلاً اگر ایک بکری گھاس کھا رہی ہے اور دوسری بکری آجائے تو پہلی بکری کے اندر یہ ارادہ پیدا نہ ہوگا کہ اسے بھی ہمدردی سے گھاس کھانے میں شریک کرے۔اسی طرح شیر میں اگرچہ زور اور طاقت تو ہوتی ہے مگر ہم اُسے شجاع نہیں کہہ سکتے کیونکہ شجاعت کے واسطے محل اور بے محل دیکھنا بہت ضروری ہے انسان اگر جانتا ہے کہ مجھ کو فلاں شخص سے طاقت مقابلہ کی نہیں ہے یا اگر میں وہاں جاؤں گا تو قتل ہو جاؤں گا تو اس کا وہاں نہ جانا ہی شجاعت میں داخل ہے۔اور پھر اگر محل اور موقع کے لحاظ سے مناسب دیکھے کہ میرا وہاں جانا ضروری ہے خواہ جان خطرہ میں پڑتی ہو تو اس مقام پر جانے کا نام شجاعت میں داخل ہے۔جاہل آدمیوں سے جو بعض وقت بہادری کا کام ہوتا ہے حالانکہ ان کو محل بے محل دیکھنے کی تمیز نہیں ہوتی اس کا نام تہوّر ہوتا ہے کہ وہ ایک طبعی جوش میں آجاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کام کرنا چاہیئے تھا کہ نہیں۔غرضیکہ انسان کے نفس میں یہ سب صفات مثل صبر، سخاوت، اِنتقام، ہمت، بُخل، عدمِ بُخل، حَسد، عدمِ حَسد ہوتی ہے اور ان کو اپنے محل اور موقع پر صَرف کرنے کا نام خُلق ہے۔حَسد بہت بُری بلا ہے لیکن جب موقع کے ساتھ اپنے مقام پر رکھا جاوے تو پھر بہت عمدہ ہو جاوے گا۔حَسد کے معنی ہیں دوسرے کا زوالِ نعمت چاہنا لیکن جب اپنے نفس سے بالکل محو ہو کر ایک مصلحت کے لئے دوسرے کا زوال چاہتا ہے تو اس وقت یہ ایک محمود صفت ہو جاتی ہے جیسے کہ ہم تثلیث کا زوال چاہتے ہیں۔ (البدر جلد اوّل ۱۱ مورخہ ۹ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۳)

اگر انسان نہایت پُرغور نگاہ سے دیکھے تو اُسے معلوم ہوگا کہ جانور کُھلے طور پر خُلق رکھتے ہیں میرے مذہب میں سب چرند پرند ایک خُلق ہیں اور انسان اس کے مجموعہ کا نام ہے۔یہ نفس جامع ہے اور اسی لئے عالمِ صغیر کہلاتا ہے کہ کُل مخلوقات کے کمال انسان میں یکجائی طور پر جمع ہیں اور کُل انسانوں کے کمالات بہیئتِ مجموعی ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع ہیں اور اِس لئے آپ کُل دُنیا کے لئے مبعوث ہوئے اور رحمۃ للعٰلمین کہلائے اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ میں بھی اسی مجموعہ کمالاتِ انسانی کی طرف اشارہ ہے۔اسی صورت میں عظمتِ اخلاقِ محمدی کی نسبت غور کر سکتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ آپؐ پر نبوّتِ کاملہ کے کمالات ختم ہوئے۔

(ٹریکٹ بالعنوان" حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدت الوجود پر ایک خط" صفحہ ۱۵، ۱۶ مرتبہ حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی)

القلم فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ○ وَلَا تُطِعْ كُلَّ

حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝

اِسلام نے مداہنہ کو کب جائز لکھا اور ایسا حکم قرآن شریف کے کس مقام میں موجود ہے؟ بلکہ اللہ جل شانہٗ مداہنہ کی ممانعت میں صاف فرماتا ہے کہ جو لوگ اپنے باپوں یا اپنی ماؤں کے ساتھ بھی اُن کی کفر کی حالت میں مداہنہ کا برتاؤ کریں وہ بھی اُن جیسے ہی بے ایمان ہیں اور کفّارِ مکّہ کی طرف سے حکایت کر کے فرماتا ہے وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ یعنی اِس بات کو کفّارِ مکّہ دوست رکھتے ہیں کہ اگر تو حق پوشی کی راہ سے نرمی اختیار کرے تو وہ بھی تیرے دین میں ہاں میں ہاں ملا دیا کریں مگر ایسا ہاں میں ہاں ملانا خدا تعالیٰ کو منظور نہیں۔ (ازالہ اَوہام صفحہ ۲۲)

تُو ان مکذبوں کے کہنے پر مت چل جو بدل اِس بات کے آرزومند ہیں کہ ہمارے معبودوں کو بُرا مت کہو اور ہمارے مذہب کی ہجومت کرو تو پھر ہم تمہارے مذہب کی نسبت ہاں میں ہاں ملاتے رہیں گے۔ ان کی چرب زبانی کا خیال مت کر۔ یہ شخص جو مداہنہ کا خواستگار ہے جھوٹی قسمیں کھانے والا اور ضعیف الرّائے اور ذلیل آدمی ہے۔

(ازالہ اَوہام صفحہ ۲۸ حاشیہ)

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ عُتُلٍّۢ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ۝

دوسروں کے عیب ڈھونڈنے والا اور سُخن چینی سے لوگوں میں تفرقہ ڈالنے والا اور نیکی کی راہوں سے روکنے والا، زناکار اور باایں ہمہ نہایت درجہ کا بدخُلق اور سب عیبوں کے بعد ولدالزّنا بھی ہے۔ عنقریب ہم اس کے ناک پر جو سؤر کی طرح بہت لمبا ہوگیا ہے داغ لگا دیں گے یعنی ناک سے مراد رُسوم اور ننگ و ناموس کی پابندی ہے جو حق کے قبول کرنے سے روکتی ہے (اے خدائے قادرِ مطلق ہماری قوم کے بعض لمبی ناک والوں کی ناک پر بھی اُسترہ رکھ) ..... اِس جگہ ایک نہایت عمدہ لطیفہ یہ ہے کہ ولید بن مغیرہ نے نرمی اختیار کر کے چاہا کہ ہم سے نرمی کا برتاؤ کیا جائے۔ اس کے جواب میں اس کے تمام پردے کھولے گئے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مومنین سے مداہنہ کی اُمید مت رکھو۔

(ازالہ اَوہام صفحہ ۲۸-۳۰ حاشیہ)

بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ یعنی یہ ولدالزنا ہے اور تجربہ بتلاتا ہے کہ ولدالزنا شرارت سے باز نہیں آیا کرتے۔

(البدر جلد اوّل نمبر ۳ مورخہ ۱۴ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۲)

۴۹ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۝

خدا تعالیٰ کے فعل پر اعتراض کرنا بڑی گستاخی ہے۔ یہ لوگ کس گنتی میں ہیں۔ ایک نبی (یونس) بھی صرف لَنْ اَرْجِعَ اِلٰی قَوْمِیْ كَذَّابًا کہنے سے زیرِ عتاب ہوا۔ دراصل خدا تعالیٰ کے کسی فعل پر شرحِ صدر نہ رکھنا ایک مخفی اعتراض ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ۔ ایسے امور میں مخاطب تو انبیاء ہوتے ہیں مگر دراصل سبق اُمّت کو دینا منظور ہوتا ہے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۹ مورخہ ۹ مئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ ہمیشہ اس کا عتاب ان لوگوں پر ہوتا ہے جن پر اس کے فضل اور عطایات بے شمار ہوں اور جنہیں وہ اپنے نشانات دکھا چکا ہوتا ہے۔ وہ ان لوگوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتا کہ انہیں عتاب یا خطاب یا ملامت کرے جن کے خلاف اس کا آخری فیصلہ نافذ ہونا ہوتا ہے چنانچہ ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ[1] اور فرماتا ہے وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ[2] ..... یہ محبّت آمیز عتاب اِس بات پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت جلد فیصلہ کفّار کے حق میں چاہتے تھے مگر خدا تعالیٰ اپنے مصالح اور سُنن کے لحاظ سے بڑے توقف اور حلم کے ساتھ کام کرتا ہے لیکن آخرکار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو ایسا کچلا اور پیسا کہ ان کا نام و نشان مٹا دیا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

○

---

[1] سورۃ الاحقاف : ۳۶ [2] سورۃ القلم : ۴۹

سُورۃ الحاقہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۱۷تا۱۸ وَانۡشَقَّتِ السَّمَآءُ فَہِیَ یَوۡمَئِذٍ وَّاہِیَۃٌ۝ وَّالۡمَلَکُ عَلٰۤی اَرۡجَآئِہَا ؕ

وَیَحۡمِلُ عَرۡشَ رَبِّکَ فَوۡقَہُمۡ یَوۡمَئِذٍ ثَمٰنِیَۃٌ ؕ۝

جب قیامت واقع ہوگی تو آسمان پھٹ جائے گا اور ڈھیلا اور سُست ہو جائے گا اور اس کی قوتیں جاتی رہیں گی کیونکہ فرشتے جو آسمان اور آسمانی اجرام کے لئے جان کی طرح تھے وہ سب تعلقات کو چھوڑ کر کناروں پر چلے جائیں گے اور اُس دن خدا تعالیٰ کے عرش کو آٹھ فرشتے اپنے سر پر اور کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اِس آیت کی تفسیر میں شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ درحقیقت آسمان کی بقا باعث اَرواح کے ہے یعنی ملائک کے جو آسمان اور آسمانی اجرام کے لئے بطور رُوحوں کے ہیں اور جیسے رُوح بدن کی محافظ ہوتی ہے اور بدن پر تصرف رکھتی ہے اسی طرح بعض ملائک آسمان اور آسمانی اجرام پر تصرف رکھتے ہیں اور تمام اجرامِ سماوی ان کے ساتھ ہی زندہ ہیں اور انہیں کے ذریعہ سے صدور افعال کواکب ہے۔ پھر جب وہ ملائک جان کی طرح اُس قالب سے نکل جائیں گے تو آسمان کا نظام اُن کے نکلنے سے درہم برہم ہو جائے گا جیسے جان کے جانے سے قالب کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۳۸ تا ۱۴۰ حاشیہ)

ثُمَّ اعْلَمْ اَنَّ لِلّٰہِ تَعَالٰی صِفَاتٍ ذَاتِیَّۃً نَاشِئَۃً مِّنِ اقْتِضَاءِ ذَاتِہٖ وَعَلَیْہَا مَدَارُ الْعَالَمِیْنَ کُلِّہَا وَہِیَ اَرْبَعٌ

ترجمہ از مرتّب: پھر واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات ذاتی ہیں جو اُس کی ذات کے تقاضا سے پیدا ہونے والی ہیں اور انہیں پر سب جہانوں کا مدار ہے اور وہ چار ہیں۔ ربوبیّت،

رُبُوْبِيَّةٌ وَّرَحْمَانِيَّةٌ وَّرَحِيْمِيَّةٌ وَّمَالِكِيَّةٌ كَمَا اَشَارَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَيْهَا فِيْ هٰذِهِ السُّوْرَةِ وَ قَالَ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ فَهٰذِهِ الصِّفَاتُ الذَّاتِيَّةُ سَابِقَةٌ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّمُحِيْطَةٌ بِكُلِّ شَيْءٍ وَّمِنْهَا وُجُوْدُ الْاَشْيَاءِ وَاسْتِعْدَادُهَا وَقَابِلِيَّتُهَا وَوُصُوْلُهَا اِلٰى كَمَالَاتِهَا وَاَمَّا صِفَةُ الْغَضَبِ فَلَيْسَتْ ذَاتِيَّةً لِلّٰهِ تَعَالٰى بَلْ هِيَ نَاشِئَةٌ مِنْ عَدَمِ قَابِلِيَّةِ بَعْضِ الْاَعْيَانِ لِلْكَمَالِ الْمُطْلَقِ۔ وَكَذٰلِكَ صِفَةُ الْاِضْلَالِ لَا يَبْدُوْ اِلَّا بَعْدَ زَيْغِ الضَّالِّيْنَ۔ وَاَمَّا حَصْرُ الصِّفَاتِ الْمَذْكُوْرَةِ فِي الْاَرْبَعِ فَنَظَرًا عَلَى الْعَالَمِ الَّذِيْ يُوْجَدُ فِيْهِ اٰثَارُهَا۔ اَلَا تَرٰى اَنَّ الْعَالَمَ كُلَّهٗ۔ يَشْهَدُ عَلٰى وُجُوْدِ هٰذِهِ الصِّفَاتِ بِلِسَانِ الْحَالِ وَ قَدْ تَجَلَّتْ هٰذِهِ الصِّفَاتُ بِنَحْوٍ لَا يَشُكُّ فِيْهَا بَصِيْرٌ اِلَّا مَنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَمِيْنَ۔ وَهٰذِهِ الصِّفَاتُ اَرْبَعٌ اِلَى انْقِرَاضِ النَّشْاَةِ الدُّنْيَوِيَّةِ ثُمَّ تَتَجَلّٰى مِنْ تَحْتِهَا اَرْبَعٌ اُخْرَى الَّتِيْ مِنْ شَاْنِهَا اَنَّهَا لَا تَظْهَرُ اِلَّا فِي الْعَالَمِ الْاٰخِرِ۔ وَاَوَّلُ مَطَالِعِهَا عَرْشُ الرَّبِّ الْكَرِيْمِ الَّذِيْ لَمْ يَتَدَنَّسْ بِوُجُوْدِ غَيْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَصَارَ مَظْهَرًا تَامًّا لِاَنْوَارِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَقَوَائِمُهٗ اَرْبَعٌ رُبُوْبِيَّةٌ وَّرَحْمَانِيَّةٌ وَّرَحِيْمِيَّةٌ وَّمَالِكِيَّةُ يَوْمِ الدِّيْنِ وَلَا جَامِعَ لِهٰذِهِ الْاَرْبَعِ عَلٰى وَجْهِ الظِّلِّيَّةِ اِلَّا عَرْشُ اللّٰهِ تَعَالٰى وَقَلْبُ الْاِنْسَانِ

رحمانیتؐ، رحیمیتؑ اور مالکیتؑ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اِس سورۃ (فاتحہ) میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ پس یہ ذاتی صفات ہر چیز پر سبقت رکھتی ہیں اور ہر چیز پر محیط ہیں۔ تمام اشیاء کا وجود، ان کی استعدادیں، ان کی قابلیت اور ان کا اپنے کمال کو پہنچنا انہیں صفات کے ذریعہ سے ہے۔ لیکن غضب کی صفت خدا کی ذاتی صفت نہیں ہے بلکہ وہ بعض موجودات کے مطلقاً کمال قبول نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور اِس طرح گمراہ ٹھہرانے کی صفت کا ظہور بھی گمراہ ہونے والوں میں کجی پیدا ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

لیکن صفات مذکورہ کا حصر چار کے عدد میں اس عالم کو مدِّ نظر رکھ کر ہے جس میں ان صفات کے آثار پائے جاتے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ عالم سارے کا سارا بزبانِ حال ان چاروں صفات کے وجود پر شہادت دے رہا ہے اور یہ چاروں صفات اِس طور پر جلوہ افروز ہیں کہ کوئی صاحبِ بصیرت ان میں شک نہیں کر سکتا سوائے اس کے جو اندھوں میں سے ہو اور یہ صفات اِس دُنیا کے اختتام تک چار کی تعداد میں ہی رہیں گی پھر ان ہی میں سے چار اور صفات جلوہ گر ہوں گی جن کی شان یہ ہے کہ وہ دوسرے جہان میں ہی ظاہر ہوں گی اور ان کی پہلی جلوہ گاہ ربِّ کریم کا عرش ہو گا جو کبھی غیر اللہ کے وجود سے آلودہ نہیں ہوا اور وہ عرش پروردگارِ عالم کے انوار کا مظہرِ تام ہے اور اس کے پائے چار ہیں ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور مالکیتِ یوم الدین۔ اور ظلّی طور پر ان چاروں صفات کا مکمل طور پر جامع اللہ تعالیٰ کے عرش یا انسانِ کامل

الْكَامِلِ۔ وَهٰذِهِ الصِّفَاتُ اُمَّهَاتٌ لِصِفَاتِ اللّٰهِ كُلِّهَا وَوَقَعَتْ كَقَوَائِمِ الْعَرْشِ الَّذِي اسْتَوَى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ فِي لَفْظِ الْاِسْتِوَاءِ اِشَارَةٌ اِلٰى هٰذَا الْاِنْعِكَاسِ عَلَى الْوَجْهِ الْاَتَمِّ الْاَكْمَلِ مِنَ اللّٰهِ الَّذِي هُوَ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ وَتَنْتَهِيْ كُلُّ قَائِمَةٍ مِنَ الْعَرْشِ اِلٰى مَلَكٍ هُوَ حَامِلُهَا وَمُدَبِّرُ اَمْرِهَا وَمَوْرِدُ تَجَلِّيَاتِهَا وَقَاسِمُهَا عَلٰى اَهْلِ السَّمَاءِ وَالْاَرَضِيْنَ۔ فَهٰذَا مَعْنٰى قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ۔ فَاِنَّ الْمَلَائِكَةَ يَحْمِلُوْنَ صِفَاتٍ فِيْهَا حَقِيْقَةٌ عَرْشِيَّةٌ وَالسِّرُّ فِيْ ذٰلِكَ اَنَّ الْعَرْشَ لَيْسَ شَيْئًا مِنْ اَشْيَاءِ الدُّنْيَا۔ بَلْ هُوَ بَرْزَخٌ بَيْنَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَبْدَءٌ قَدِيْمٌ لِلتَّجَلِّيَاتِ الرَّبَّانِيَّةِ وَالرَّحْمَانِيَّةِ وَالرَّحِيْمِيَّةِ وَالْمَالِكِيَّةِ لِاِظْهَارِ التَّفَضُّلَاتِ وَتَكْمِيْلِ الْجَزَاءِ وَالدِّيْنِ۔ وَهُوَ دَاخِلٌ فِيْ صِفَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَاِنَّهٗ كَانَ ذَا الْعَرْشِ مِنْ قَدِيْمٍ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهٗ شَيْءٌ فَكُنْ مِنَ الْمُتَدَبِّرِيْنَ۔ وَحَقِيْقَةُ الْعَرْشِ وَاسْتِوَاءِ اللّٰهِ عَلَيْهِ سِرٌّ عَظِيْمٌ مِنْ اَسْرَارِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَحِكْمَةٌ بَالِغَةٌ وَمَعْنًى رُوْحَانِيٌّ وَسُمِّيَ عَرْشًا لِتَفْهِيْمِ عُقُوْلِ هٰذَا الْعَالَمِ وَلِتَقْرِيْبِ الْاَمْرِ

کے دِل کے سوا اَور کوئی نہیں، اور یہ چاروں صفات اللہ تعالیٰ کی باقی صفات کے لئے اصولی صفات ہیں اور وہ اس عرش کے لئے بمنزلہ پایوں کے ہیں جس پر خدا تعالیٰ مستوی (جلوہ گر) ہے اور خدا تعالیٰ کے مستوی ہونے میں ذاتِ باری کی صفات کے کامل اِنعکاس کی طرف اشارہ ہے جو بہترین خالق ہے۔ پھر عرش کا ہر پایہ ایک فرشتہ تک پہنچتا ہے جسے وہ اُٹھائے ہوئے ہے اور اس پایہ کے متعلق امر کا انتظام کرتا ہے۔ وہ اس کی تجلیات کے پھیلانے کا ذریعہ بنتا ہے اور ان تجلیات کو بحصّہ رَسدی آسمانوں اور زمینوں کے رہنے والوں پر تقسیم کرتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے قول وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ[1] کے یہی معنے ہیں۔ کیونکہ ملائکہ ان صفاتِ الٰہیّہ کو اُٹھائے ہوئے ہیں جو عرش کی حقیقت سے متعلق ہیں اور اس میں بھید یہ ہے کہ عرش اِس دُنیا کی چیزوں میں سے نہیں بلکہ وہ دُنیا اور آخرت کے درمیان برزخ اور رب العالمین، الرحمٰن الرحیم، مالکِ یوم الدین کی صفات کی تجلیات کا ازلی منبع ہے تا احساناتِ الٰہیّہ کا اظہار اور جزاء سزا کی تکمیل ہو اور یہ عرش اللہ تعالیٰ کی صفات میں داخل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اَزل سے صاحبِ عرش ہے اور اس کے ساتھ اَزل میں کوئی اَور چیز نہ تھی۔ پس اِن باتوں پر غور و فکر کرنے والوں میں سے بنو۔

اور عرش کی حقیقت اور اللہ تعالیٰ کا اس پر مستوی ہونا الٰہی اسرار میں سے ایک بہت بڑا سرّ ہے اور ایک بلیغ حکمت اور رُوحانی معنی پر مشتمل ہے اور اس کا نام عرش اِس لئے رکھا گیا ہے تا اس جہاں کے اہلِ عقل کو اس کا مفہوم

---

[1] سورۃ الحاقّۃ : ۱۸

اِلٰی اسْتِعْدَادَاتِہِمْ وَھُوَ وَاسِطَۃٌ فِیْ وُصُوْلِ الْفَیْضِ الْاِلٰہِیِّ وَالتَّجَلِّی الرَّحْمَانِیِّ مِنْ حَضْرَۃِ الْحَقِّ اِلَی الْمَلَائِکَۃِ وَمِنَ الْمَلَائِکَۃِ اِلَی الرُّسُلِ وَلَا یَقْدَحُ فِیْ وَحْدَتِہٖ تَعَالٰی تَکَثُّرُ قَوَابِلِ الْفَیْضِ بَلِ التَّکَثُّرُ ھٰہُنَا یُوْجِبُ الْبَرَکَاتِ لِبَنِیْ اٰدَمَ وَیُعِیْنُہُمْ عَلَی الْقُوَّۃِ الرُّوْحَانِیَّۃِ وَیَنْصُرُھُمْ فِی الْمُجَاھَدَاتِ وَالرِّیَاضَاتِ الْمُوْجِبَۃِ لِظُھُوْرِ الْمُنَاسَبَاتِ الَّتِیْ بَیْنَہُمْ وَبَیْنَ مَا یَصِلُوْنَ اِلَیْہِ مِنَ النُّفُوْسِ کَنَفْسِ الْعَرْشِ وَالْعُقُوْلِ الْمُجَرَّدَۃِ اِلٰی اَنْ یَصِلُوْا اِلَی الْمَبْدَءِ الْاَوَّلِ وَعِلَّۃِ الْعِلَلِ ثُمَّ اِذَا اَعَانَ السَّالِکَ الْجَذَبَاتُ الْاِلٰہِیَّۃُ وَالنَّسِیْمُ الرَّحْمَانِیَّۃُ فَیَقْطَعُ کَثِیْرًا مِنْ حُجُبِہٖ وَیُنْجِیْہِ مِنْ بُعْدِ الْمَقْصَدِ وَکَثْرَۃِ عَقَبَاتِہٖ وَاٰفَاتِہٖ وَیُنَوِّرُہٗ بِالنُّوْرِ الْاِلٰہِیِّ وَیُدْخِلُہٗ فِی الْوَاصِلِیْنَ ۔ فَیَکْمُلُ لَہُ الْوُصُوْلُ وَالشُّھُوْدُ مَعَ رُؤْیَتِہٖ عَجَائِبَاتِ الْمَنَازِلِ وَالْمَقَامَاتِ وَلَا شُعُوْرَ لِاَھْلِ الْعَقْلِ بِھٰذِہِ الْمَعَارِفِ وَالنِّکَاتِ وَلَا مَدْخَلَ لِلْعَقْلِ فِیْہِ وَالْاِطِّلَاعُ بِاَمْثَالِ ھٰذِہِ الْمَعَانِیْ اِنَّمَا ھُوَ مِنْ مِشْکٰوۃِ النُّبُوَّۃِ وَالْوَلَایَۃِ وَمَا شَمَّتِ الْعَقْلُ رَائِحَتَہٗ وَمَا کَانَ لِعَاقِلٍ اَنْ یَضَعَ الْقَدَمَ فِیْ ھٰذَا الْمَوْضِعِ اِلَّا بِجَذْبَۃٍ مِنْ جَذَبَاتِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۔

سمجھایا جائے اور اس بات کا سمجھنا ان کی استعدادوں کے قریب کر دیا جائے اور وہ عرش الٰہی فیض اور اللہ تعالیٰ کی رحمانی تجلّی کو ملائکہ تک پہنچانے میں واسطہ ہے اور اسی طرح ملائکہ سے رسولوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ خدا تعالیٰ کی توحید پر یہ بات حرف نہیں لاتی کہ اس کے فیض کو قبول کرنے والے اور آگے پہنچانے والے وجود بکثرت ہوں بلکہ اس مقام میں وسائط کی کثرت بنی آدم کے لئے برکات کا موجب ہے اور رُوحانی قوت کے حصول میں ان کو مدد دیتی ہے اور انہیں ان مجاہدوں اور ریاضتوں میں مدد دیتی ہے جو ان مناسبتوں کے ظہور کا موجب بنتی ہیں جو بنی آدم اور نفوسِ عالیہ مثلاً نفس عرش اور عقولِ مجرّدہ میں موجود ہیں جن تک بنی آدم نے پہنچنا ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا یہاں تک کہ بنی آدم مبدأ اوّل اور علّتِ علل (ذاتِ باری) تک پہنچ جائیں۔ پھر جب الٰہی کشش اور اس کی رحمانیّت کی ٹھنڈی ہوا سالک کی مدد کریں تو اللہ تعالیٰ اس کے بہت سے پردے دُور کر دیتا ہے اور اسے مقصد کی دُوری سے اور بہت سی درمیانی روکوں اور آفات سے نجات دے دیتا ہے اور اسے (سالک کو) الٰہی نور سے منوّر کر دیتا ہے اور زُمرۂ واصلین میں داخل کر دیتا ہے اور راہِ سلوک کی منزلوں اور مقامات کے عجائبات دیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ وصالِ الٰہی اور دیدارِ الٰہی کے مرتبہ وصول وشہود کو پالیتا ہے لیکن فلسفیوں کو ان معارف اور باریکیوں کا کچھ بھی پتہ نہیں اور نہ ہی محض عقل کو اس شعور میں کوئی دخل ہے۔ اور ایسے مطالب اور معانی پر آگاہی صرف مشکوٰۃ نبوّت اور ولایت سے حاصل ہوتی ہے اور اس کی خوشبو عقل کو نہیں پہنچ سکتی اور نہ کسی عقلمند کے لئے ممکن ہے کہ وہ اس مقام پر بجز ربّ العالمین کی کشش کے قدم مار سکے۔

وَ اِذَا انْفَکَّتِ الْاَرْوَاحُ الطَّیِّبَۃُ الْکَامِلَۃُ مِنَ الْاَبْدَانِ وَ یَتَطَهَّرُوْنَ عَلٰی وَجْهِ الْکَمَالِ مِنَ الْاَوْسَاخِ وَالْاَدْرَانِ یُعْرَضُوْنَ عَلَی اللهِ تَحْتَ الْعَرْشِ بِوَاسِطَۃِ الْمَلَائِکَۃِ فَیَاْخُذُوْنَ بِطَوْرٍ جَدِیْدٍ حَظًّا مِّنْ رُّبُوْبِیَّۃٍ یُّغَایِرُ رُبُوْبِیَّۃً سَابِقَۃً وَّحَظًّا مِّنْ رَّحْمَانِیَّۃٍ مُّغَایِرٍ رَحْمَانِیَّۃٍ اُوْلٰی وَحَظًّا مِّنْ رَّحِیْمِیَّۃٍ وَّ مَالِکِیَّۃٍ مُّغَایِرٍ مَا کَانَ فِی الدُّنْیَا فَهُنَالِكَ تَکُوْنُ ثَمَانِیْ صِفَاتٍ تَحْمِلُهَا ثَمَانِیَۃٌ مِّنْ مَّلَائِکَۃِ اللهِ بِاِذْنِ اَحْسَنِ الْخَالِقِیْنَ. فَاِنَّ لِکُلِّ صِفَۃٍ مَلَكٌ مُّوَکَّلٌ قَدْ خُلِقَ لِتَوْزِیْعِ تِلْكَ الصِّفَۃِ عَلٰی وَجْهِ التَّدْبِیْرِ وَوَضْعِهَا فِیْ مَحَلِّهَا وَ اِلَیْهِ اِشَارَۃٌ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا[1]. فَتَدَبَّرْ وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْغَافِلِیْنَ.

وَ زِیَادَۃُ الْمَلَائِکَۃِ الْحَامِلِیْنَ فِی الْاٰخِرَۃِ لِزِیَادَۃِ تَجَلِّیَاتِ رَبَّانِیَّۃٍ وَّ رَحْمَانِیَّۃٍ وَّ رَحِیْمِیَّۃٍ وَّ مَالِکِیَّۃٍ عِنْدَ زِیَادَۃِ الْقَوَابِلِ فَاِنَّ النُّفُوْسَ الْمُطْمَئِنَّۃَ بَعْدَ انْقِطَاعِهَا وَرُجُوْعِهَا اِلَی الْعَالَمِ الثَّانِیْ وَ الرَّبِّ الْکَرِیْمِ تَتَرَقّٰی فِی اسْتِعْدَادَاتِهَا فَتَتَمَوَّجُ الرُّبُوْبِیَّۃُ وَالرَّحْمَانِیَّۃُ وَالرَّحِیْمِیَّۃُ وَالْمَالِکِیَّۃُ بِحَسَبِ قَابِلِیَّاتِهِمْ وَاسْتِعْدَادَاتِهِمْ

اور جب نیکوں کی پاک اور کامل رُوحیں ان مادی جسموں سے الگ ہوجاتی ہیں اور وہ مکمّل طور پر گناہوں کی مَیل کچیل سے پاک ہوجاتے ہیں تو وہ فرشتوں کی وسائط سے اللہ تعالیٰ کے سامنے عرش کے نیچے اس کے حضور پیش کئے جاتے ہیں تب وہ ایک نئے طور سے ربوبیّت سے ایسا حِصّہ پاتے ہیں جو پہلی ربوبیّت سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور اسی طرح رحمانیّت سے حصّہ پاتے ہیں جو پہلی رحمانیّت سے مختلف ہوتا ہے۔ پھر وہ رحیمیّت اور مالکیّت سے ایسا حِصّہ پاتے ہیں جو دُنیا میں ملنے والے حِصّہ سے مختلف ہوگا۔ اس وقت ان صفات کی تعداد آٹھ ہوجائے گی جن کو اللہ تعالیٰ کے آٹھ فرشتے احسن الخالقین کے اِذن سے اُٹھائیں گے اور ہر ایک صفت کے لئے ایک فرشتہ مقرر ہوگا جو بڑے منظّم طریق سے اس صفت کی برکات کو بانٹنے اور اسے برمحل رکھنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اِس کی طرف اللہ تعالیٰ کے کلام فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا میں اشارہ ہے۔ پس تُو بھی غور کر اور غافلوں میں شامل نہ ہو۔

آخرت میں ملائکہ حاملینِ عرش کی تعداد کی زیادتی خدا کی ربوبیّت، رحمانیّت، رحیمیّت اور مالکیّت کی تجلّیات کی زیادتی کی وجہ سے ہے جب کہ فیض قبول کرنے والے زیادہ ہوجائیں گے کیونکہ نفسِ مطمئنّہ اِس دُنیا سے تعلق توڑ کر دوسری دُنیا اور ربِّ کریم کی طرف واپس لَوٹنے کے بعد اپنی استعدادوں میں ترقّی کرتے ہیں۔ پس ان کی قابلیّتوں اور استعدادوں کے مطابق صفاتِ الٰہیّہ ربوبیّت، رحمانیّت، رحیمیّت اور مالکیّت موجزن ہوتی ہیں۔

---

[1] سورۃ النّازعات: ۶

كَمَا تَشْهَدُ عَلَيْهِ كُشُوْفُ الْعَارِفِيْنَ ۔ وَاِنْ كُنْتَ مِنَ الَّذِيْنَ اُعْطِيَ لَهُمْ حَظٌّ مِّنَ الْقُرْاٰنِ فَتَجِدُ فِيْهِ كَثِيْرًا مِّنْ مِّثْلِ هٰذَا الْبَيَانِ ۔ فَانْظُرْ بِالنَّظَرِ الدَّقِيْقِ ۔ لِتَجِدَ شَهَادَةَ هٰذَا التَّحْقِيْقِ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔

(کرامات الصّادقین صفحہ ۸۶ تا ۸۹)

یہ چاروں صفتیں (ربوبیّت، رحمانیت، رحیمیت اور مالکیت) دُنیا میں ہی کام کر رہی ہیں مگر چونکہ دُنیا کا دائرہ نہایت تنگ ہے اور نیز جہل اور بیخبری اور کم نظری انسان کے شاملِ حال ہے اِس لئے یہ نہایت وسیع دائرے صفاتِ اَربعہ کے اس عالَم میں ایسے چھوٹے نظر آتے جیسے بڑے بڑے گولے ستاروں کے دُور سے صرف نقطے دکھائی دیتے ہیں لیکن عالَمِ معاد میں پُورا نظارہ ان صفاتِ اَربعہ کا ہوگا۔ اِس لئے حقیقی اور کامل طور پر یَوم الدین وہی ہوگا جو عالَمِ معاد ہے۔ اُس عالَم میں ہر ایک صفت اِن صفاتِ اَربعہ میں سے دوہری طور پر اپنی شکل دکھائے گی یعنی ظاہری طور پر اور باطنی طور پر اِس لئے اس وقت یہ چار صفتیں آٹھ صفتیں ہوں گی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو فرمایا گیا ہے کہ اس دُنیا میں چار فرشتے خدا تعالیٰ کا عرش اُٹھا رہے ہیں اور اُس دن آٹھ فرشتے خدا تعالیٰ کا عرش اُٹھائیں گے۔ یہ استعارہ کے طور پر کلام ہے۔ چونکہ خدا تعالیٰ کی ہر صفت کے مناسبِ حال ایک فرشتہ بھی پیدا کیا گیا ہے اِس لئے چار صفات کے متعلق چار فرشتے بیان کئے گئے اور جب آٹھ صفات کی تجلّی ہوگی تو اُن صفات کے ساتھ آٹھ فرشتے ہوں گے۔ اور چونکہ یہ صفات اُلوہیّت کی ماہیّت کو ایسا اپنے پر لئے ہوئے ہیں کہ گویا اُس کو اُٹھا رہے ہیں اِس لئے استعارہ کے طور پر اُٹھانے کا لفظ بولا گیا ہے۔ ایسے استعاراتِ لطیفہ خدا تعالیٰ کے کلام میں بہت ہیں جن میں رُوحانیت کو جسمانی رنگ میں دکھایا گیا ہے۔ (ایام الصلح صفحہ ۲۳)

ایک اَور اعتراض مخالف لوگ پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ قرآن شریف کے بعض مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن عرش کو آٹھ فرشتے اُٹھائیں گے جس سے اشارۃ النص کے طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں چار فرشتے عرش کو اُٹھاتے ہیں۔ اور اب اِس جگہ اعتراض یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ تو اِس بات سے پاک اور برتر ہے کہ کوئی اُس کے عرش کو اُٹھاوے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ ابھی تم سُن چکے ہو کہ عرش کوئی جسمانی چیز نہیں ہے جو اُٹھائی جائے یا اُٹھانے کے لائق ہو بلکہ صرف تنزّہ اور تقدّس کے مقام کا نام عرش ہے اِسی لئے اس کو غیر مخلوق کہتے ہیں ورنہ ایک

جیسا کہ عارف باللہ لوگوں کے کشوف اِس امر پر گواہ ہیں، اور اگر تم ان لوگوں میں سے ہو جنہیں قرآن کریم کے فہم کا کچھ حصّہ عطا کیا گیا ہے تو تمہیں بھی اس کتابِ مجید میں ایسے بہت سے بیانات ملیں گے پس تم گہری نظر سے دیکھو تا تمہیں اللہ تعالیٰ پروردگارِ عالَم کی کتاب سے میری اِس تحقیق کی تصدیق مِل جائے۔

(کرامات الصّادقین صفحہ ۸۶ تا ۸۹)

مجسّم چیز خدا کی خالقیت سے کیونکر باہر رہ سکتی ہے اور عرش کی نسبت جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سب استعارات ہیں۔ پس اِسی سے ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ ایسا اعتراض محض حماقت ہے۔ اب ہم فرشتوں کے اُٹھانے کا اصل نکتہ ناظرین کو سُناتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے تنزّہ کے مقام میں یعنی اس مقام میں جبکہ اس کی صفت تنزّہ اس کی تمام صفات کو رُوپوش کر کے اس کو وراء الوراء اور نہاں در نہاں کر دیتی ہے جس مقام کا نام قرآن شریف کی اِصطلاح میں عرش ہے تب خدا عقولِ انسانیہ سے بالاتر ہو جاتا ہے اور عقل کو طاقت نہیں رہتی کہ اس کو دریافت کر سکے تب اُس کی چار صفتیں جن کو چار فرشتوں کے نام سے موسُوم کیا گیا ہے جو دُنیا میں ظاہر ہو چکی ہیں اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہیں (۱) اوّل ربوبیّت جس کے ذریعہ سے وہ انسان کی رُوحانی اور جسمانی تکمیل کرتا ہے۔ چنانچہ رُوح اور جسم کا ظہور ربوبیّت کے تقاضا سے ہے اور اسی طرح خدا کا کلام نازل ہونا اور اُس کے خارق عادت نشان ظہور میں آنا ربوبیّت کے تقاضا سے ہے (۲) دوم خدا کی رحمانیت جو ظہور میں آ چکی ہے یعنی جو کچھ اُس نے بغیر پاداش اعمال بیشمار نعمتیں انسان کے لئے میسر کی ہیں یہ صفت بھی اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے (۳) تیسری خدا کی رحیمیّت ہے اور وہ یہ کہ نیک عمل کرنے والوں کو اوّل تو صفتِ رحمانیّت کے تقاضا سے نیک اعمال کی طاقتیں بخشتا ہے اور پھر صفتِ رحیمیت کے تقاضا سے نیک اعمال اُن سے ظہور میں لاتا ہے اور اس طرح پر اُن کو آفات سے بچاتا ہے۔ یہ صفت بھی اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے (۴) چوتھی صفت مالکِ یوم الدین ہے۔ یہ بھی اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ نیکوں کو جزا اور بدوں کو سزا دیتا ہے۔ یہ چاروں صفتیں ہیں جو اُس کے عرش کو اُٹھائے ہوئے ہیں یعنی اُس کے پوشیدہ وجود کا اِن صفات کے ذریعہ سے اِس دُنیا میں پتہ لگتا ہے اور یہ معرفت عالمِ آخرت میں دوچند ہو جائے گی گویا بجائے چار کے آٹھ فرشتے ہو جائیں گے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۲۶۶، ۲۶۷)

۳۱ تا ۳۳ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ۝ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۝

اس جہنمی کو پکڑو۔ اس کی گردن میں طوق ڈالو۔ پھر دوزخ میں اس کو جلاؤ۔ پھر ایسی زنجیر میں جو پیمائش میں ستّر گز ہے اس کو داخل کرو۔ جاننا چاہیئے کہ اِن آیات میں ظاہر فرمایا کہ دُنیا کا رُوحانی عذاب عالمِ معاد میں جسمانی طور پر نمودار ہو گا چنانچہ طوقِ گردن دُنیا کی خواہشوں کا جس نے انسان کے سر کو زمین کی طرف جُھکا رکھا تھا وہ عالمِ ثانی میں ظاہری صورت میں نظر آ جائے گا اور ایسا ہی دُنیا کی گرفتاریوں کی زنجیر پیروں میں پڑی ہوئی دکھائی

دے گی اور دُنیا کی خواہشوں کی سوزشوں کی آگ ظاہر ظاہر بھڑکی ہوئی نظر آئے گی۔

فاسق اِنسان دُنیا کی زندگی میں ہَوا و ہَوس کا ایک جہنم اپنے اندر رکھتا ہے اور ناکامیوں میں اس جہنم کی سوزشوں کا اِحساس کرتا ہے پس جبکہ اپنی فانی شہوات سے دُور ڈالا جائے گا اور ہمیشہ کی نا امیدی طاری ہوگی خدائے تعالیٰ ان حسرتوں کو جسمانی آگ کے طور پر اس پر ظاہر کرے گا جیسا کہ فرماتا ہے

وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ[1]

یعنی ان میں اور ان کی خواہشوں کی چیزوں میں جُدائی ڈالی جائے گی اور یہی عذاب کی جڑھ ہوگی اور پھر جو فرمایا کہ ستر گز کی زنجیر میں اس کو داخل کرو یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک فاسق بسا اوقات ستر برس کی عمر پا لیتا ہے بلکہ کئی دفعہ اِس دُنیا میں اس کو ایسے برس بھی ملتے ہیں کہ خورد سالی کی عمر اور پیر فرتوت ہونے کی عمر الگ کر کے پھر اس قدر صاف اور خالص حصہ عمر کا اس کو ملتا ہے جو عقلمندی اور محنت اور کام کے لائق ہوتا ہے لیکن وہ بدبخت اپنی عمدہ زندگی کے ستر برس دُنیا کی گرفتاریوں میں گذارتا ہے اور اس زنجیر سے آزاد ہونا نہیں چاہتا سو خدائے تعالیٰ اِس آیت میں فرماتا ہے کہ وہی ستر برس جو اس نے گرفتاریٔ دُنیا میں گذارے تھے عالمِ معاد میں زنجیر کی طرح متمثل ہو جائینگے جو ستر گز کی ہوگی۔ ہر ایک گز بجائے ایک سال کے ہے۔ اِس جگہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ اپنی طرف سے بندہ پر کوئی مصیبت نہیں ڈالتا بلکہ وہ اِنسان کے اپنے ہی بُرے کام اس کے آگے رکھ دیتا ہے۔

(اِسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹۵، ۹۶)

الحاقہ ۴۱ تا ۴۸

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝

یہ قرآن کلام رسول کا ہے یعنی وحی کے ذریعہ سے اُس کو پہنچا ہے اور یہ شاعر کا کلام نہیں مگر چونکہ تمہیں ایمانی

---

[1] سورۃ سبا: ۵۵

فراست سے کم حصّہ ہے اِس لئے تم اس کو پہچانتے نہیں اور یہ کاہن کا کلام نہیں یعنی اس کا کلام نہیں جو جنات سے کچھ تعلق رکھتا ہو مگر تمہیں تدبّر اور تذکّر کا بہت کم حصّہ دیا گیا ہے اِس لئے ایسا خیال کرتے ہو۔ تم نہیں سوچتے کہ کاہن کس پست اور ذلیل حالت میں ہوتے ہیں بلکہ یہ رب العالمین کا کلام ہے جو عالَمِ اجسام اور عالَمِ اَرواح دونوں کا رَب ہے یعنی جیسا کہ وہ تمہارے اجسام کی تربیت کرتا ہے ایسا ہی وہ تمہاری رُوحوں کی تربیت کرنا چاہتا ہے اور اسی ربوبیت کے تقاضا کی وجہ سے اُس نے اِس رسول کو بھیجا ہے اور اگر یہ رسول کچھ اپنی طرف سے بنا لیتا اور کہتا کہ فلاں بات خدا نے میرے پر وحی کی ہے حالانکہ وہ کلام اس کا ہوتا نہ خدا کا تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور پھر اُس کی رگِ جان کاٹ دیتے اور کوئی تم میں سے اس کو بچا نہ سکتا یعنی اگر وہ ہم پر اِفتراء کرتا تو اس کی سزا موت تھی کیونکہ وہ اس صورت میں اپنے جھوٹے دعوے سے اِفتراء اور کُفر کی طرف بُلا کر ضلالت کی موت سے ہلاک کرنا چاہتا تو اس کا مَرنا اس حادثہ سے بہتر ہے کہ تمام دُنیا اس کی مُفتریانہ تعلیم سے ہلاک ہو اِس لئے قدیم سے ہماری یہی سُنّت ہے کہ ہم اُسی کو ہلاک کر دیتے ہیں جو دُنیا کے لئے ہلاکت کی راہیں پیش کرتا ہے اور جھُوٹی تعلیم او جھُوٹے عقائد پیش کر کے مخلوقِ خدا کی رُوحانی موت چاہتا ہے اور خدا پر افتراء کر کے گستاخی کرتا ہے۔

اب اِن آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچّائی پر یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اگر وہ ہماری طرف سے نہ ہوتا تو ہم اس کو ہلاک کر دیتے اور وہ ہرگز زندہ نہ رہ سکتا گو تم لوگ اس کے بچانے کیلئے کوشش بھی کرتے۔ (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲،۴ و اربعین ۳ صفحہ ۳،۴)

خدا تعالیٰ قرآن شریف میں ایک شمشیرِ برہنہ کی طرح یہ حکم فرماتا ہے کہ یہ نبی اگر میرے پر جھُوٹ بولتا اور کسی بات میں اِفتراء کرتا تو مَیں اس کی رگِ جان کاٹ دیتا اور اس مدت دراز تک وہ زندہ نہ رہ سکتا۔ تو اَب جب ہم اپنے اِس مسیح موعود کو اس پیمانہ سے ناپتے ہیں تو براہین احمدیہ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دعویٰ منجانب اللہ ہونے اور مکالماتِ الٰہیّہ کا قریباً تیس برس سے ہے اور اکیس برس سے براہین احمدیہ شائع ہے پھر اگر اِس مدت تک اِس مسیح کا ہلاکت سے امن میں رہنا اس کے صادق ہونے پر دلیل نہیں ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تیئیس برس تک موت سے بچنا آپؐ کے سچا ہونے پر بھی دلیل نہیں ہے کیونکہ جبکہ خدا تعالیٰ نے اِس جگہ ایک جھُوٹے مدعیٔ رسالت کو تیس برس تک مُہلت دی اور لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا کے وعدہ کا کچھ خیال نہ کیا تو اِس طرح نعوذ باللہ یہ بھی قریب قیاس ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی باوجود کاذب ہونے کے مُہلت دے دی ہو مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کاذب ہونا محال ہے۔ پس جو مُستلزم محال ہو وہ بھی محال۔ اور ظاہر ہے کہ یہ قرآنی اِستدلال بدیہی الظہور جبھی ٹھہر سکتا ہے جبکہ یہ قاعدہ کُلّی مانا جائے کہ خدا اس مُفتری کو جو خلقت کے گمراہ کرنے کیلئے مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہو کبھی مُہلت نہیں دیتا کیونکہ اِس طرح پر اس کی بادشاہت میں گڑبڑ پڑتی ہے

اور صادق اور کاذب میں تمیز اُٹھ جاتی ہے۔ (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۴ واربعین ۳ صفحہ ۶،۷)

قدیم سے سُنّت اللہ یہی ہے کہ جو شخص خدا پر افتراء کرے وہ ہلاک کیا جاتا ہے ..... اللہ تعالیٰ نے آیت لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا کو بطور لغو نہیں لکھا جس سے کوئی حُجت قائم نہیں ہوسکتی اور خدا تعالیٰ ہر ایک لغو کام سے پاک ہے پس جس حالت میں اس حکیم نے اِس آیت کو اور ایسا ہی اُس دوسری آیت کو جس کے یہ الفاظ ہیں اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ[1] (یعنی اگر یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پر کچھ جھوٹ باندھتا تو ہم اس کو اس کی زندگی اور موت سے دوچند عذاب چکھاتے۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ نہایت سخت عذاب سے ہلاک کرتے۔منہ) محلّ استدلال پر بیان کیا ہے تو اس سے ماننا پڑتا ہے کہ اگر کوئی شخص بطور افتراء کے نبوّت اور ماموریّن اللہ ہونے کا دعوٰی کرے تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ نبوّت کے مانند ہرگز زندگی نہیں پائے گا ورنہ یہ استدلال کسی طرح صحیح نہیں ٹھہرے گا اور کوئی ذریعہ اس کے سمجھنے کا قائم نہیں ہوگا کیونکہ اگر خدا پر افتراء کرکے اور جھوٹا دعوٰی ماموریّن اللہ ہونے کا کرکے تیئیس برس تک زندگی پالے اور ہلاک نہ ہو تو بلا شُبہ ایک مُنکر کے لئے حق پیدا ہو جائے گا کہ وہ یہ اعتراض کرے کہ جب کہ اس دروغگو نے جس کا دروغگو ہونا تم تسلیم کرتے ہو تیئیس برس تک یا اس سے زیادہ عرصہ تک زندگی پالی اور ہلاک نہ ہُوا تو ہم کیونکر سمجھیں کہ ایسے کاذب کی مانند تمہارا نبی نہیں تھا۔ایک کاذب کو تیئیس برس تک مُہلت مِل جانا صاف اِس بات پر دلیل ہے کہ ہر ایک کاذب کو ایسی مُہلت مل سکتی ہے تو پھر لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا کا صدق لوگوں پر کیونکر ظاہر ہوگا؟ اور اس پر یقین کرنے کے لئے کونسے دلائل پیدا ہوں گے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اِفتراء کرتے تو ضرور تیئیس برس کے اندر اندر ہلاک کئے جاتے لیکن اگر دوسرے لوگ اِفتراء کریں تو وہ تیئیس برس سے زیادہ مُدّت تک بھی زندہ رہ سکتے ہیں اور خدا ان کو ہلاک نہیں کرتا۔ یہ تو وہی مثال ہے مثلاً ایک دُکاندار کہے کہ اگر مَیں اپنے دُکان کے کاروبار میں کچھ خیانت کروں یا ردّی چیزیں دوں یا جھوٹ بولوں یا کم وزن کروں تو اسی وقت میرے پر بجلی پڑے گی اِس لئے تم لوگ میرے بارے میں بالکل مطمئن رہو اور کچھ شک نہ کرو کہ کبھی مَیں کوئی ردّی چیز دوں گا یا کم وزنی کروں گا یا جھوٹ بولوں گا بلکہ آنکھ بند کرکے میری دُکان سے سَودا لیا کرو اور کچھ تفتیش نہ کرو تو کیا اِس بیہودہ قول سے لوگ تسلّی پا جائیں گے اور اس کے اس لغو قول کو اس کی راستبازی پر ایک دلیل سمجھ لیں گے؟ ہرگز نہیں بمعاذ اللہ ایسا قول اس شخص کی راستبازی کی ہرگز دلیل نہیں ہوسکتی بلکہ ایک رنگ میں خلقِ خدا کو دھوکا دینا اور ان کو غافل کرنا ہے۔ ہاں دو صورت میں یہ دلیل ٹھہر سکتی ہے (۱) ایک یہ کہ چند دفعہ لوگوں کے سامنے یہ اتفاق ہوچکا ہو کہ اس شخص نے اپنی فروختنی اشیاء کے متعلق کچھ جھوٹ بولا ہو یا کم وزن کیا ہو یا کسی اَور قسم کی خیانت کی ہو تو اُسی وقت اُس پر بجلی پڑی ہو اور نیم مُردہ

[1] سُورۃ بنی اسرائیل : ۷۶

کر دیا ہو اور یہ واقعہ جھوٹ بولنے یا خیانت یا کم وزنی کرنے کا بار بار پیش آیا ہو اور بار بار بجلی پڑی ہو یہاں تک کہ لوگوں کے دل یقین کر گئے ہوں کہ درحقیقت خیانت اور جھوٹ کے وقت اس شخص پر بجلی کا حملہ ہوتا ہے تو اُسی صورت میں یہ قول ضرور دلیل استعمال ہوگا کیونکہ بہت سے لوگ اِس بات کے گواہ ہیں کہ جھوٹ بولا اور بجلی گری (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ عام لوگوں کے ساتھ یہ واقعہ پیش آوے کہ جو شخص دُکاندار ہو کر اپنی فروختنی اشیاء کے متعلق کچھ جھوٹ بولے یا کم وزن کرے یا اَور کسی قسم کی خیانت کرے یا کوئی رَدّی چیز بیچے تو اس پر بجلی پڑا کرے۔ سو اِس مثال کو زیرِ نظر رکھ کر ہر ایک مُنصف کو کہنا پڑتا ہے کہ خدائے علیم وحکیم کے مُنہ سے لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا کا لفظ نکلنا وہ بھی تبھی ایک بُرہانِ قاطع کا کام دے گا کہ جب دو صورتوں میں سے ایک صورت اس میں پائی جائے (۱) اوّل یہ کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اس سے کوئی جھوٹ بولا ہو اور خدا نے کوئی سخت سزا دی ہو اور لوگوں کو بطور امور مشہودہ محسوسہ کے معلوم ہو کہ آپ اگر خدا پر افتراء کریں تو آپ کو سزا ملے گی جیسا کہ پہلے بھی فلاں فلاں موقع پر سزا ملی لیکن اِس قسم کے اِستدلال کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک وجود کی طرف راہ نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایسا خیال کرنا بھی کفر ہے (۲) دوسرے اِستدلال کی یہ صورت ہے کہ خدا تعالیٰ کا یہ عام قاعدہ ہو کہ جو شخص اُس پر افتراء کرے اس کو کوئی لمبی مُہلت نہ دی جائے اور جلد تر ہلاک کیا جائے سو یہی اِستدلال اِس جگہ پر صحیح ہے ورنہ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا کا فقرہ ایک مُعترض کے نزدیک محض دھوکا دہی اور نعوذ باللہ ایک فضول گو دُکاندار کے قول کے رنگ میں ہوگا۔ جو لوگ خدا تعالیٰ کے کلام کی عزّت کرتے ہیں اُن کا کانشنس ہرگز اِس بات کو قبول نہیں کرے گا کہ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا کا فقرہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا مُہمل ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کا ان مخالفوں کو یہ بے ثبوت فقرہ سُنانا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کو نہیں مانتے اور نہ قرآن شریف کو مِن جانب اللہ مانتے ہیں محض لغو اور طفل تسلّی سے بھی کم تر ہے اور ظاہر ہے کہ مُنکر اور معاند اس سے کیا اور کیونکر تسلّی پکڑیں گے بلکہ ان کے نزدیک تو یہ صرف ایک دعویٰ ہوگا جس کے ساتھ کوئی دلیل نہیں۔ ایسا کہنا کس قدر بیہودہ خیال ہے کہ اگر فلاں گناہ مَیں کروں تو مارا جاؤں گو کروڑہا دوسرے لوگ ہر روز دُنیا میں وہی گناہ کرتے ہیں اور مارے نہیں جاتے۔ اور کیسا یہ مکروہ عُذر ہے کہ دوسرے گناہ گاروں اور مُفتریوں کو خدا کچھ نہیں کہتا یہ سزا خاص میرے لئے ہے۔ اور عجیب تو یہ کہ ایسا کہنے والا یہ بھی تو ثبوت نہیں دیتا کہ گذشتہ تجربہ سے مجھے معلوم ہؤا ہے اور لوگ دیکھ چکے ہیں کہ اس گناہ پر ضرور مجھے سزا ہوتی ہے۔ غرض خدا تعالیٰ کے حکیمانہ کلام کو جو دُنیا میں اتمامِ حُجت کیلئے نازل ہؤا ہے ایسے بیہُودہ طور پر خیال کرنا خدا تعالیٰ کی پاک کلام سے ٹھٹھا اور ہنسی ہے اور قرآن شریف میں صدہا جگہ اِس بات کو پاؤ گے کہ خدا تعالیٰ مُفتری علی اللہ کو ہرگز سلامت نہیں چھوڑتا اور اِسی دُنیا میں اس کو سزا دیتا اور ہلاک کرتا ہے۔ (اربعین ۴ صفحہ ۱ تا ۱۴)

خدا تعالیٰ قرآن شریف میں بار بار فرماتا ہے کہ مفتری اِسی دُنیا میں ہلاک ہوگا بلکہ خدا کے سچّے نبیوں اور ماموریں کے لئے سب سے پہلی یہی دلیل ہے کہ وہ اپنے کام کی تکمیل کر کے مَرتے ہیں اور ان کو اشاعتِ دین کیلئے مُہلت دی جاتی ہے اور انسان کی اِس مختصر زندگی میں بڑی سے بڑی مُہلت تئیس برس ہیں کیونکہ اکثر نبوت کا ابتداء چالیس برس پر ہوتا ہے اور تئیس برس تک اگر اَور عُمر ملی تو گویا عمدہ زمانہ زندگی کا یہی ہے۔ اِسی وجہ سے مَیں بار بار کہتا ہوں کہ صادقوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا زمانہ نہایت صحیح پیمانہ ہے اور ہرگز ممکن نہیں کہ کوئی شخص جھوٹا ہو کر اور خدا پر اِفتراء کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ نبوت کے موافق یعنی تئیس برس تک مُہلت پا سکے۔ ضرور ہلاک ہوگا۔ اِس بارے میں میرے ایک دوست نے اپنی نیک نیّتی سے یہ عُذر پیش کیا تھا کہ آیت لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہیں۔ اِس سے کیونکر سمجھا جائے کہ اگر کوئی دوسرا شخص افتراء کرے تو وہ بھی ہلاک کیا جائے گا۔ مَیں نے اس کا یہی جواب دیا تھا کہ خدا تعالیٰ کا یہ قول محلِ استدلال پر ہے اور منجملہ دلائل صدقِ نبوت کے یہ بھی ایک دلیل ہے اور خدا تعالیٰ کے قول کی تصدیق تبھی ہوتی ہے کہ جھوٹا دعوے کرنے والا ہلاک ہو جائے ورنہ یہ قول مُنکر پر کچھ حجت نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے لئے بطور دلیل ٹھہر سکتا ہے بلکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تئیس برس تک ہلاک نہ ہونا اِس وجہ سے نہیں کہ وہ صادق ہے بلکہ اِس وجہ سے ہے کہ خدا پر افتراء کرنا ایسا گناہ نہیں ہے جس سے خدا اِسی دُنیا میں کسی کو ہلاک کرے کیونکہ اگر یہ کوئی گناہ ہوتا اور سُنّت اللہ اس پر جاری ہوتی کہ مُفتری کو اِسی دُنیا میں سزا دینا چاہیئے تو اس کے لئے نظیریں ہونی چاہئیں تھیں اور تم قبول کرتے ہو کہ اس کی کوئی نظیر نہیں بلکہ بہت سی ایسی نظیریں موجود ہیں کہ لوگوں نے تئیس برس تک بلکہ اس سے زیادہ خدا پر افتراء کئے اور ہلاک نہ ہوئے۔ تو اَب بتلاؤ کہ اِس اعتراض کا کیا جواب ہوگا۔

(اَربعین نمبر ۴ صفحہ ۵، ۶)

اِس مقام سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی تمام پاک کتابیں اِس بات پر متفق ہیں کہ جھوٹا نبی ہلاک کیا جاتا ہے اب اس کے مقابل یہ پیش کرنا کہ اکبر بادشاہ نے نبوت کا دعوٰی کیا یا روشن دین جالندھری نے دعوٰی کیا یا کسی اَور شخص نے دعوٰی کیا اور وہ ہلاک نہ ہوئے۔ یہ ایک دوسری حماقت ہے جو ظاہر کی جاتی ہے۔ بھلا اگر یہ سچ ہے کہ ان لوگوں نے نبوت کے دعوے کئے اور تئیس برس تک ہلاک نہ ہوئے تو پہلے ان لوگوں کی خاص تحریر سے ان کا دعوٰی ثابت کرنا چاہیئے اور وہ الہام پیش کرنا چاہیئے جو الہام انہوں نے خدا کے نام پر لوگوں کو سُنایا یعنی یہ کہا کہ اِن لفظوں کے ساتھ میرے پر وحی نازل ہوئی ہے کہ مَیں خدا کا رسول ہوں۔ اصل لفظ اُن کی وحی کے کامل ثبوت کے ساتھ پیش کرنے چاہئیں کیونکہ ہماری تمام بحث وحیٔ نبوّت میں ہے جس کی نسبت یہ ضروری ہے کہ بعض کلمات پیش کر کے یہ کہا جائے کہ یہ خدا کا کلام ہے جو ہمارے پر نازل ہوُا ہے۔

غرض پہلے تو یہ ثبوت دینا چاہیئے کہ کونسا کلامِ الٰہی اس شخص نے پیش کیا ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا پھر بعد اس کے یہ ثبوت دینا چاہیئے کہ جو تیئس برس تک کلامِ الٰہی اس پر نازل ہوتا رہا وہ کیا ہے یعنی کل وہ کلام جو کلامِ الٰہی کے دعوے پر لوگوں کو سُنایا گیا ہے پیش کرنا چاہیئے جس سے پتہ لگ سکے کہ تیئس برس تک متفرق وقتوں میں وہ کلام اس غرض سے پیش کیا گیا تھا کہ وہ خدا کا کلام ہے یا ایک مجموعی کتاب کے طور پر قرآن شریف کی طرح اس دعویٰ سے شائع کیا گیا تھا کہ یہ خدا کا کلام ہے جو میرے پر نازل ہوا ہے۔ جب تک ایسا ثبوت نہ ہو تب تک بے ایمانوں کی طرح قرآن شریف پر حملہ کرنا اور آیت لَوْ تَقَوَّلَ کو ہنسی ٹھٹھے میں اُڑانا ان شریر لوگوں کا کام ہے جن کو خدا تعالیٰ پر بھی ایمان نہیں اور صرف زبان سے کلمہ پڑھتے اور باطن میں اسلام سے بھی منکر ہیں۔

(ضمیمہ اربعین نمبر ۳، ۴ صفحہ ۱۱، ۱۲)

تَقَوَّلَ کا حکم قطع اور یقین کے متعلق ہے پس جیسا کہ مَیں نے بار بار بیان کر دیا ہے کہ یہ کلام جو مَیں سُناتا ہوں یہ قطعی اور یقینی طور پر خدا کا کلام ہے جیسا کہ قرآن اور توریت خدا کا کلام ہے اور مَیں خدا کا ظلی اور بروزی طور پر نبی ہوں اور ہر ایک مسلمان کو دینی امور میں میری اطاعت واجب ہے اور مسیح موعود ماننا واجب ہے اور ہر ایک جس کو میری تبلیغ پہنچ گئی ہے گو وہ مسلمان ہے مگر مجھے اپنا حکم نہیں ٹھہراتا اور نہ مجھے مسیح موعود مانتا ہے اور نہ میری وحی کو خدا کی طرف سے جانتا ہے وہ آسمان پر قابلِ مؤاخذہ ہے کیونکہ جس امر کو اُس نے اپنے وقت پر قبول کرنا تھا اُس کو رد کر دیا۔ مَیں صرف یہ نہیں کہتا کہ مَیں اگر جھوٹا ہوتا تو ہلاک کیا جاتا بلکہ مَیں یہ بھی کہتا ہوں کہ موسیٰ اور عیسیٰ اور داؤد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح مَیں سچا ہوں اور میری تصدیق کے لئے خدا نے دس ہزار سے بھی زیادہ نشان دکھلائے ہیں قرآن نے میری گواہی دی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری گواہی دی ہے۔ پہلے نبیوں نے میرے آنے کا زمانہ متعین کر دیا ہے کہ جو یہی زمانہ ہے اور قرآن بھی میرے آنے کا زمانہ متعین کرتا ہے کہ جو یہی زمانہ ہے اور میرے لئے آسمان نے بھی گواہی دی اور زمین نے بھی۔ اور کوئی نبی نہیں جو میرے لئے گواہی نہیں دے چکا اور یہ جو مَیں نے کہا کہ میرے دس ہزار نشان ہیں یہ بطور کفایت لکھا گیا ورنہ مجھے قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر ایک سفید کتاب ہزار جزء کی بھی کتاب ہو اور اس میں مَیں اپنے دلائل صدق لکھنا چاہوں تو مَیں یقین رکھتا ہوں کہ وہ کتاب ختم ہو جائے گی اور وہ دلائل ختم نہیں ہوں گے۔ (تحفۃ الندوہ صفحہ ۳، ۴)

اگر یہ نبی ہمارے پر افترا کرتا تو ہم اس کو داہنے ہاتھ سے پکڑ لیتے پھر اس کی وہ رگ کاٹ دیتے جو جان کی رگ ہے یہ آیت اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کے معنوں میں عموم ہے جیسا کہ تمام قرآن شریف میں بھی محاورہ ہے کہ بظاہر اکثر امر و نہی کے مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے ہیں لیکن اُن احکام میں دوسرے بھی شریک ہوتے ہیں یا وہ احکام دوسروں کے لئے ہی ہوتے ہیں..... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت

جو فرمایا کہ اگر وہ ہمارے پر کچھ افتراء کرتا تو ہم اس کو ہلاک کر دیتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف خدا تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ غیرت اپنی ظاہر کرتا ہے کہ آپ اگر مفتری ہوتے تو آپ کو ہلاک کر دیتا مگر دوسروں کی نسبت یہ غیرت نہیں ہے اور دوسرے خواہ کیسا ہی خدا پر افترا کریں اور جھوٹے الہام بنا کر خدا کی طرف منسوب کر دیا کریں اُن کی نسبت خدا کی غیرت جوش نہیں مارتی یہ خیال جیسا کہ غیر معقول ہے ایسا ہی خدا کی تمام کتابوں کے برخلاف بھی ہے اور اب تک توریت میں بھی یہ فقرہ موجود ہے کہ جو شخص خدا پر افترا کرے گا اور جھوٹا دعویٰ نبوت کا کرے گا وہ ہلاک کیا جاوے گا۔ علاوہ اس کے قدیم سے علماءِ اسلام آیت لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا کو عیسائیوں اور یہودیوں کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کے لئے بطور دلیل پیش کرتے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ جب تک کسی بات میں عموم نہ ہو وہ دلیل کا کام نہیں دے سکتی۔ بھلا یہ کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر افترا کرتے تو ہلاک کئے جاتے اور تمام کام بگڑ جاتا لیکن اگر کوئی دوسرا افترا کرے تو خدا ناراض نہیں ہوتا بلکہ اس سے پیار کرتا ہے اور اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ مُہلت دیتا ہے اور اُس کی نصرت اور تائید کرتا ہے۔ اُس کا نام دلیل تو نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ یہ تو ایک دعویٰ ہے کہ جو خود دلیل کا محتاج ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۰۴ تا ۲۰۶)

حافظ محمد یوسف صاحب کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:۔

اُن کو تو سرے سے سب باتوں پر انکار ہے جبکہ قرآن شریف نے صداقتِ نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں لَوْ تَقَوَّلَ والی دلیل پیش کی ہے اور حافظ صاحب اس سے انکار کرتے ہیں تو پھر کیا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تُو اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر لوگوں کو سُنائے اور اس کو میری طرف منسوب کرے اور کہے کہ یہ خدا کا کلام ہے حالانکہ وہ خدا کا کلام نہ ہو تو تُو ہلاک ہو جائے گا۔ یہی دلیل صداقتِ نبوتِ محمدیہ مولوی آلِ حسن صاحب اور مولوی رحمت اللہ صاحب نے نصاریٰ کے سامنے پیش کی تھی جو وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکے اور اب یہی دلیلِ قرآنی ہم اپنے دعویٰ کی صداقت میں پیش کرتے ہیں۔ حافظ صاحب اور ان کے ساتھی اکبر بادشاہ کا نام لیتے ہیں مگر یہ ان کی سراسر غلطی ہے۔ تَقَوَّلَ کے معنی ہیں جھوٹا کلام پیش کرنا۔ اگر اکبر بادشاہ نے ایسا دعویٰ کیا تھا تو اس کا کلام پیش کریں جس میں اُس نے کہا ہو کہ مجھے خدا کی طرف سے یہ یہ الہامات ہوئے ہیں۔ ایسا ہی روشن دین جالندھری اور دوسرے لوگوں کا نام لیتے ہیں مگر کسی کے متعلق یہ پیش نہیں کر سکتے کہ اس نے کون سے جھوٹے الہامات شائع کئے ہیں۔ اگر کسی کے متعلق ثابت شدہ مُعتبر شہادت کے ساتھ حافظ صاحب یا ان کے ساتھی یہ ثابت کر دیں کہ اس نے جھوٹا کلام خدا پر لگایا حالانکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے وہ کلام نہ ہوا اور پھر ایسا کرنے پر اس نے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر عمر پائی ہو یعنی ایسے دعوے پر وہ ۲۳ سال زندہ رہا ہو تو ہم اپنی ساری کتابیں جلا دیں گے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۷ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۶، ۷)

صادق کے لئے خدا تعالیٰ نے ایک اَور نشان بھی قرار دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ اگر تُو مجھ پر تقوّل کرے تو مَیں تیرا دہنا ہاتھ پکڑ لوں۔ اللہ تعالیٰ پر تقوّل کرنے والا مفتری فلاح نہیں پا سکتا بلکہ ہلاک ہو جاتا ہے اور اب پچیس سال کے قریب عرصہ گذرا ہے کہ خدا تعالیٰ کی وحی کو مَیں شائع کر رہا ہوں۔ اگر افتراء تھا تو اس تقوّل کی پاداش میں ضروری نہ تھا کہ خدا اپنے وعدہ کو پُورا کرتا؟ بجائے اس کے کہ وہ مجھے پکڑتا اُس نے صدہا نشان میری تائید میں ظاہر کئے اور نصرت پر نصرت مجھے دی۔ کیا مفتریوں کے ساتھ یہی سلوک ہُوا کرتا ہے؟ اور دجّالوں کو ایسی ہی نصرت ملا کرتی ہے؟ کچھ تو سوچو۔ ایسی نظیر کوئی پیش کرو اور مَیں دعویٰ سے کہتا ہوں ہرگز نہ ملے گی۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۱ر فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

پیغمبر صاحب کو تو یہ حکم کہ اگر تو ایک اِفتراء مجھ پر باندھتا تو مَیں تیری رگِ گردن کاٹ دیتا جیسے کہ آیت وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۙ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۙ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ؗ سے ظاہر ہوتا ہے اور یہاں چوبیس سال سے روزانہ افتراء خدا تعالیٰ پر ہو اور خدا اپنی سُنّتِ قدیمہ کو نہ برتے۔ بدی کرنے میں اور جھوٹ بولنے میں کبھی مداومت اور استقامت نہیں ہوتی۔ آخرکار انسان دروغ کو چھوڑ ہی دیتا ہے لیکن کیا میری ہی فطرت ایسی ہو رہی ہے کہ مَیں چوبیس سال سے اس جھوٹ پر قائم ہوں اور برابر چل رہا ہوں اور خدا تعالیٰ بھی بالمقابل خاموش ہے اور بالمقابل ہمیشہ تائیدات پر تائیدات کر رہا ہے۔ پیشگوئی کرنا یا علمِ غیب سے حصہ پانا کسی ایک معمولی ولی کا بھی کام نہیں۔ یہ نعمت اس کو عطا ہوتی ہے جو حضرت احدیت مآب میں خاص عزت اور وجاہت رکھتا ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۱۰/۱۷ جون ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

ہم اپنی زبان سے کسی کو مفتری نہیں کہتے جبکہ وحی شیطانی بھی ہوتی ہے تو ممکن ہے کہ کسی سادہ لوح کو دھوکا لگا ہو اس لئے ہم فعلِ الٰہی کی سند پیش کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ پیش کی تھی اور خدا تعالیٰ نے فعل پر بہت مدار رکھا ہے۔ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۙ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ میں فعل ہی کا ذکر ہے۔ پس جبکہ یہ مسنون طریق ہے تو اس سے کیوں گریز ہے۔ ہم لوگوں کے سامنے ہیں اور اگر فریب سے کام لے رہے ہیں تو خدا تعالیٰ ایسے عذاب سے ہلاک کرے گا کہ لوگوں کو عبرت ہو جاوے گی اور اگر یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ضرور خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے تو پھر دوسرے لوگ ہلاک ہو جاویں گے۔

(البدر جلد ۴ نمبر ۶ مورخہ ۱۸ر فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

جو شخص انسانی سلطنت میں جھوٹا دعویدار تحصیلداری یا چپڑاسی ہونے کا کرے اس کو پکڑا جاتا ہے اور سزا دی جاتی ہے پھر کیا خدا کی سلطنت میں ایسا اندھیر چل سکتا ہے؟ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ یعنی اگر یہ نبی ہمارے اُوپر بعض جھوٹی باتیں بنا

لیتا تو ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگِ جان کو کاٹ دیتے۔ یہ آیت صاف بیان کر رہی ہے کہ خدا تعالیٰ پر کوئی جھوٹی وحی والہام بنانے والا جلدی پکڑا جاتا اور ناکامیاب ہو کر مرتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۹ مورخہ ۱۷؍مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۱)

اگر کوئی شخص تقوّل علی اللہ کرے تو وہ ہلاک کر دیا جاوے گا۔ خبر نہیں کیوں اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی خصوصیت رکھی جاتی ہے۔ کیا وجہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر تقوّل علی اللہ کرے تو اُن کو تو گرفت کی جاوے اور اگر کوئی اَور کرے تو اس کی پرواہ نہ کی جاوے نعوذ باللہ اس طرح سے تو امان اُٹھ جاتی ہے۔ صادق اور مفتری میں مابہ الامتیاز ہی نہیں رہتا۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۸ مورخہ ۱۰؍مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ جب ایک ایسے عظیم الشان انسان کے واسطے ایسا فرمان ہے تو پھر اَدنیٰ انسان کے واسطے تو چھوٹی سی چھری کی ضرورت تھی اور کبھی کا فیصلہ ہو گیا ہوتا۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۴؍جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۳)

مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر یہ کاروبار انسان کا ہے تو تمہیں اس کے خلاف کوشش کرنے کی ضرورت نہیں خود بخود بگڑ جائے گا کیونکہ وہ فرما چکا ہے قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى[1]۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا[2] الآیۃ۔

جو غیور خدا اپنے پیارے نبی کی نسبت فرماتا ہے لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ اگر ہم پر افترا کرتا تو اس کی رگِ جان کاٹ دیتے تو اسے ایک مجھ سے اَدنیٰ کی کیا پرواہ تھی جس کے لئے ایک چھری کافی تھی۔ اگر مَیں جھوٹا ہوتا تو کبھی کا ہلاک ہو گیا تھا۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۵؍جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۰،۹)

یہ بات خدا کی خدائی پر داغ لگاتی ہے کہ دُنیا میں جھوٹے نبی کو وہ دائمی عزت اور قبولیت دی جائے جو سچّوں کو ملتی ہے کیونکہ اس صورت میں حق مشتبہ ہو جاتا ہے اور امان اُٹھ جاتا ہے۔ کیا کسی نے دیکھا کہ مثلاً ایک جھوٹا تحصیلدار سچے تحصیلدار کے مقابل پر دو چار برس تک مقدمات کرتا رہا اور کسی کو قید اور کسی کو رہائی دیتا رہا اور اعلیٰ افسر اس کے مکان پر سے گذرتے رہے مگر کسی نے اُس کو نہ پکڑا نہ پوچھا بلکہ اُس کا حکم ایسا ہی چلتا رہا جیسا کہ سچے کا۔ سو یقیناً سمجھو کہ یہ بات بالکل غیر ممکن ہے کہ ایک نبی کی اتنی بڑی عزتیں اور شوکتیں دُنیا میں پھیل جائیں کہ کروڑہا مخلوق اُس کی اُمّت ہو جائے۔ بادشاہیاں قائم ہو جائیں اور صدہا برس گذر جائیں اور دراصل وہ جھوٹا نبی ہو

---

[1] سورۃ طٰہٰ : ۶۲ [2] سورۃ الانعام : ۲۲

جب سے کہ دُنیا پیدا ہوئی ایک بھی اس کی نظیر نہیں پاؤ گے۔

(تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ششم صفحہ ۹۵)

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ○

قرآن متقیوں کو وہ سارے امور یاد دلاتا ہے جو اُن کی فطرت میں مخفی اور مستور تھے۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۵)

○

سُورَۃُ الْمَعَارِج

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۝

۸،۷ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝

بار بار زلزلہ کے متعلق جو الہامات ہوتے ہیں اور خوابیں آتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر کچھ ایسی تیاری ہو رہی ہے کہ یہ امر جلد ہونے والا ہے۔ بہت سی باتیں ہوتی ہیں کہ انسان ان کو دُور سمجھتا ہے مگر خدا تعالیٰ کے علم میں وہ بہت قریب ہوتی ہیں۔ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝ تم اُسے دُور دیکھتے ہو اور ہم قریب دیکھتے ہیں۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۴ مورخہ ۲۷؍ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

○

سُورۃ نوح

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۲ تا ۴ قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ○

قرآن شریف میں حضرت نوحؑ سے لے کر ہمارے سیّد و مولیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک جس قدر نافرمانوں کے حق میں انذاری پیشگوئیاں ذکر فرمائی گئی ہیں وہ سب شرطی طور پر ہیں جن کے یہی معنے ہیں کہ فلاں عذاب تم پر آنے والا ہے پس اگر تم توبہ کرو اور نیک کام بجالاؤ تو وہ موقوف رکھا جائے گا ورنہ تم ہلاک کئے جاؤگے۔

(ایّام الصّلح صفحہ ۴، ۵)

۱۴، ۱۵ مَا لَکُمۡ لَا تَرۡجُوۡنَ لِلّٰہِ وَقَارًا ○ وَ قَدۡ خَلَقَکُمۡ اَطۡوَارًا ○

حکمت تفاوت مراتب رکھنے میں انواع و اقسام کی قدرتوں کا ظاہر کرنا اور اپنی عظمت کی طرف توجہ دلانا ہے جیسا فرمایا مَا لَکُمۡ لَا تَرۡجُوۡنَ لِلّٰہِ وَقَارًا ۚ وَ قَدۡ خَلَقَکُمۡ اَطۡوَارًا ○ (۲۹/ع) یعنی تم کو کیا ہو گیا کہ تم خدا کی عظمت کے قائل نہیں ہوتے حالانکہ اُس نے اپنی عظمت ظاہر کرنے کے لئے تم کو مختلف صورتوں اور سیرتوں پر پیدا کیا۔ یعنی اختلاف استعدادات و طبائع اسی غرض سے حکیم مطلق نے کیا تا اس کی عظمت و قدرت شناخت کی جائے۔

(براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۱۹۰)

۲۶ مِمَّا خَطِیۡٓئٰتِہِمۡ اُغۡرِقُوۡا فَاُدۡخِلُوۡا نَارًا ۬ۙ فَلَمۡ یَجِدُوۡا لَہُمۡ مِّنۡ

دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡصَارًا ○

جو لوگ اپنی کثرت نافرمانی کی وجہ سے ایسے فنافی الشیطان ہونے کی حالت میں دُنیا سے جُدا ہوتے ہیں کہ شیطان کی فرمانبرداری کی وجہ سے بکلّی تعلقات اپنے مَولیٰ سے توڑ دیتے ہیں اُن کے لئے اُن کی موت کے بعد صرف دوزخ کی طرف کھڑکی ہی نہیں کھولی جاتی بلکہ وہ اپنے سارے وجود اور سارے قویٰ کے ساتھ خاص دوزخ میں ڈال دئے جاتے ہیں جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ..... مگر پھر بھی وہ لوگ قیامت کے دن سے پہلے اکمل اور اتم طور پر عقوباتِ جہنّم کا مزہ نہیں چکھتے۔

(ازالۂ اوہام صفحہ ۳۵۸)

قرآن کریم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ جہنّم جہنّم میں موت کے بعد بغیر کسی اِنتظار کے داخل ہوں گے جیساکہ آیت فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ [1] پر تدبّر کرنے والوں پر مخفی نہیں اور جیساکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۵۳)

۲۷ وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ○

جب ارادۂ الٰہی کسی قوم کی تباہی سے متعلق ہوتا ہے تو نبی میں دَرد کی حالت پَیدا ہوتی ہے وہ دُعا کرتا ہے پھر اس قوم کی تباہی یا خیرخواہی کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں۔ دیکھو نوح علیہ السّلام پہلے صبر کرتے رہے اور بڑی مدت تک قوم کی ایذائیں سہتے رہے۔ پھر ارادۂ الٰہی جب ان کی تباہی سے متعلق ہُوا تو درد کی حالت پَیدا ہوئی اور دِل سے نکلا رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔ جب تک خدا تعالیٰ کا ارادہ نہ ہو وہ حالت پَیدا نہیں ہوتی۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال پہلے صبر کرتے رہے پھر جب دَرد کی حالت پَیدا ہوئی تو قتال کے ذریعہ مخالفین پر عذاب نازل ہُوا۔ خود ہماری نسبت دیکھو جب یہ شبہ چنتک جاری ہُوا تو اسکا ذکر تک بھی نہیں کیا گیا مگر جب ارادۂ الٰہی اس کی تباہی کے متعلق ہُوا تو ہماری توجہ اس طرف بے اختیار ہو گئی اور پھر تم دیکھتے ہو کہ رسالہ ابھی اچھی طرح شائع بھی نہ ہونے پایا کہ خدا تعالیٰ کی باتیں پوری ہو گئیں۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۱۹ مورخہ ۹ مئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

○

---

[1] سُوْرَۃُ الصّٰٓفّٰت : ۵۶

سورۃ الجن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۙ

وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا

رَّصَدًا ۙ

عرب کے لوگ بوجہ ان خیالات کے جو کاہنوں کے ذریعہ سے اُن میں پھیل گئے تھے نہایت شدید اعتقاد سے ان باتوں کو مانتے تھے کہ جس وقت کثرت سے ستارے یعنی شہب گرتے ہیں تو کوئی بڑا عظیم الشان اِنسان پَیدا ہوتا ہے۔ خاص کر ان کے کاہن جو اَرواحِ خبیثہ سے کچھ تعلق پَیدا کر لیتے تھے اور اخبارِ غیبیہ بتلایا کرتے تھے۔ اُن کا تو گویا پختہ اور یقینی عقیدہ تھا کہ کثرت شہب یعنی تاروں کا معمولی اندازہ سے بہت زیادہ ٹوٹنا اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی نبی دُنیا میں پَیدا ہونے والا ہے اور ایسا اِتفاق ہُوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت حد سے زیادہ سقوطِ شہب ہُوا جیسا کہ سُورۃ الجن میں خدا تعالیٰ نے اِس واقعہ کی شہادت دی ہے اور حکایتاً عن الجنّات فرماتا ہے اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ الخ یعنی ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اس کو چوکیداروں سے یعنی فرشتوں سے اور شعلوں سے بھرا ہُوا پایا اور ہم پہلے اِس سے امورِ غیبیہ کے سُننے کیلئے آسمان میں گھات میں بیٹھا کرتے تھے اور اَب جب ہم سُننا چاہتے ہیں تو گھات میں ایک شعلے کو پاتے ہیں جو ہم پر گرتا ہے۔ اِن آیات کی تائید میں کثرت سے احادیث پائی جاتی ہیں۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد و ترمذی، ابنِ ماجہ وغیرہ سب اِس قسم کی حدیثیں اپنی تالیفات میں لائے ہیں کہ شہب کا گرنا شیاطین کے ردّ کرنے کے لئے ہوتا

ہے اور امام احمد ابنِ عباس سے روایت کرتے ہیں کہ شہب جاہلیت کے زمانہ میں بھی گرتے تھے لیکن انکی کثرت اور غلظت بعثت کے وقت میں ہوئی چنانچہ تفسیر ابنِ کثیر میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت جب کثرت سے شہب گرے تو اہلِ طائف بہت ہی ڈر گئے اور کہنے لگے کہ شاید آسمان کے لوگوں میں تہلکہ پڑگیا تب ایک نے اُن میں سے کہا کہ ستاروں کی قرارگاہوں کو دیکھو اگر وہ اپنے محل اور موقعہ سے ٹل گئے ہیں تو آسمان کے لوگوں پر کوئی تباہی آئی ورنہ یہ نشان جو آسمان پر ظاہر ہوا ہے ابن ابی کبشہ کی وجہ سے ہے (وہ لوگ شرارت کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابنِ ابی کبشہ کہتے تھے) غرض عرب کے لوگوں کے دلوں میں یہ بات جمی ہوئی تھی کہ جب کوئی نبی دُنیا میں آتا ہے یا کوئی اَور عظیم الشان آدمی پَیدا ہوتا ہے تو کثرت سے تارے ٹوٹتے ہیں اِسی وجہ سے بمناسبت خیالات عرب کے شہب کے گرنے کی خدائے تعالیٰ نے قسم کھائی جس کا مدعا یہ ہے کہ تم لوگ خود تسلیم کرتے ہو اور تمہارے کاہن اِس بات کو مانتے ہیں کہ جب کثرت سے شہب گرتے ہیں تو کوئی نبی یا مُلہم مِنَ اللہ پَیدا ہوتا ہے تو پھر انکار کی کیا وجہ ہے۔ چونکہ شہب کا کثرت سے گرنا عرب کے کاہنوں کی نظر میں اِس بات کے ثبوت کے لئے ایک بدیہی امر تھا کہ کوئی نبی اور مُلہم من اللہ پَیدا ہوتا ہے اور عرب کے لوگ کاہنوں کے ایسے تابع تھے جیسا کہ ایک مرید مُرشد کا تابع ہوتا ہے اِس لئے خدا تعالیٰ نے وہی بدیہی امر اُن کے سامنے قسم کے پَیرایہ میں پیش کیا تا اُن کو اس سچائی کی طرف توجہ پَیدا ہو کہ یہ کاروبار خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے انسان کا ساختہ پرداختہ نہیں۔

اگر یہ سوال پَیدا ہو کہ شہب کا گرنا اگر کسی نبی یا مُلہم یا محدث کے مبعوث ہونے پر دلیل ہے تو پھر کیا وجہ کہ اکثر ہمیشہ شہب گرتے ہیں مگر ان کے گرنے سے کوئی نبی یا محدث دُنیا میں نزول فرما نہیں ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ حکم کثرت پر ہے اور کچھ شک نہیں کہ جس زمانہ میں یہ واقعات کثرت سے ہوں اور خارق عادت طور پر ان کی کثرت پائی جائے تو کوئی مردِ خدا دُنیا میں خدا تعالیٰ کی طرف سے اصلاحِ خلق اللہ کے لئے آتا ہے۔ کبھی یہ واقعات ارہاص کے طور پر اُس کے وجود سے چند سال پہلے ظہور میں آجاتے ہیں اور کبھی عین ظہور کے وقت جلوہ نما ہوتے ہیں اور کبھی اس کی کسی اعلیٰ فتح یابی کے وقت یہ خوشی کی روشنی آسمان پر ہوتی ہے۔

ابنِ کثیر نے اپنی تفسیر میں سدّی سے روایت کی ہے کہ شہب کا کثرت سے گرنا کسی نبی کے آنے پر دلالت کرتا ہے یا دین کے غلبہ کی بشارت دیتا ہے مگر جو کچھ اشارات نصِ قرآن کریم سے سمجھا جاتا ہے وہ ایک مفہومِ عام ہے جس سے صاف اور صریح طور پر مستنبط ہوتا ہے کہ جب کوئی نبی یا وارثِ نبی زمین پر مامور ہو کر آوے یا آنے پر ہو یا اُس کے ارہاصات ظاہر ہونے والے ہوں یا کوئی بڑی فتحیابی قریب الوقوع ہو تو ان تمام صورتوں میں ایسے ایسے آثار آسمان پر ظاہر ہوتے ہیں اور اِس سے انکار کرنا نادانی ہے کیونکہ عدم علم سے

عدمِ شئے لازم نہیں آتا۔بعض مصلح اور مجدّدِ دین دُنیا میں ایسے آتے ہیں کہ عام طور پر دُنیا کو ان کی بھی خبر نہیں ہوتی۔

مجھ کو یاد ہے کہ ابتدائے وقت میں جب مَیں مامور کیا گیا تو مجھے یہ الہام ہوُا کہ جو براہین کے صفحہ ۲۳۸ میں مندرج ہے یَا اَحْمَدُ بَارَکَ اللّٰہُ فِیْکَ مَارَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اُنْذِرَ اٰبَآءُھُمْ وَلِتَسْتَبِیْنَ سَبِیْلُ الْمُجْرِمِیْنَ۔ قُلْ اِنِّیْ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ یعنی اے احمد خدا نے تجھ میں برکت رکھ دی اور جو تُو نے چلایا یہ تُو نے نہیں چلایا بلکہ خدا نے چلایا۔اُس نے تجھے علم قرآن کا دیا تا تُو اُن کو ڈراوے جن کے باپ دادے نہیں ڈرائے گئے اور تا مجرموں کی راہ کُھل جائے یعنی سعید لوگ الگ ہوجائیں اور شرارت پیشہ اور سرکش آدمی الگ ہوجائیں اور لوگوں کو کہہ دے کہ مَیں مامور ہو کر آیا ہوں اور مَیں اوّل المؤمنین ہوں۔اِن الہامات کے بعد کئی طور کے نشان ظاہر ہونے شروع ہوئے چنانچہ منجملہ ان کے ایک یہ کہ ۲۸ ؍نومبر ۱۸۸۵ء کی رات کو جو ۲۸ ؍نومبر ۱۸۸۵ء کے دن سے پہلے آئی ہے اِس قدر شہب کا تماشا آسمان پر تھا جو مَیں نے اپنی تمام عمر میں اس کی نظیر کبھی نہیں دیکھی اور آسمان کی فضاء میں اِس قدر ہزارہا شعلے ہر طرف چل رہے تھے جو اس رنگ کا دُنیا میں کوئی بھی نمونہ نہیں تا مَیں اس کو بیان کرسکوں۔مجھ کو یاد ہے کہ اُس وقت یہ الہام بکثرت ہوُا تھا کہ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔سو اُس رمی کو رمی شہب سے بہت مناسبت تھی۔یہ شہبِ ثاقبہ کا تماشہ جو ۲۸ ؍نومبر ۱۸۸۵ء کی رات کو ایسا وسیع طور پر ہوُا جو یورپ اور امریکہ اور ایشیا کے عام اخباروں میں بڑی حیرت کے ساتھ چھپ گیا۔لوگ خیال کرتے ہوں گے کہ یہ بے فائدہ تھا لیکن خداوند کریم جانتا ہے کہ سب سے زیادہ غور سے اس تماشا کے دیکھنے والا اور پھر اُس سے حظ اور لذّت اٹھانے والا مَیں ہی تھا۔میری آنکھیں بہت دیر تک اِس تماشا کے دیکھنے کی طرف لگی رہیں اور وہ سلسلہ رمی شہب کا شام سے ہی شروع ہوگیا تھا جس کو مَیں صرف الہامی بشارتوں کی وجہ سے بڑے سُرور کے ساتھ دیکھتا رہا کیونکہ میرے دِل پر الہاماً ڈالا گیا تھا کہ یہ تیرے لئے نشان ظاہر ہوُا ہے۔

اور پھر اس کے بعد یورپ کے لوگوں کو وہ ستارہ دکھائی دیا جو حضرت مسیح کے ظہور کے وقت میں نکلا تھا میرے دِل میں ڈالا گیا کہ یہ ستارہ بھی تیری صداقت کے لئے ایک دوسرا نشان ہے۔

اِس جگہ اگر یہ اعتراض پیش کیا جاوے کہ علمِ حکمت کے محققوں کی تحقیقات قدیمہ وجدیدہ کی رُو سے شہب وغیرہ کا پیدا ہونا اور اسباب سے بیان کیا گیا ہے جو اِن امور سے جو بیان کئے گئے ہیں کچھ بھی تعلق نہیں رکھتے چنانچہ شرح اشارات میں جہاں کائناتِ الجوّ کے اسباب اور علل لکھے ہیں صرف اسی قدر حدوث شہب کا سبب لکھا ہے کہ جب دخان حیّز نار میں پہنچتا ہے اور اس میں کچھ دُھنیت اور لطافت ہوتی ہے تو باعث آگ کی تاثیر

کے یک دفعہ بھڑک اُٹھتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھڑکنے کے ساتھ ہی بُجھ گیا مگر اصل میں وہ بُجھتا نہیں۔ بات یہ ہے کہ دخان کی دونوں طرفوں سے پہلے ایک طرف بھڑک اُٹھتی ہے جو اُوپر کی طرف ہے پھر وہ اشتعال دوسری طرف میں جاتا ہے اور اُس حرکت کے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُس اشتعال کا ایک خط مُمتد ہے اور اسی کا نام شہاب ہے جو دخان کے خط مُمتد میں اسفل کے قریب پیدا ہوتا ہے اور پھر اجزاء ارضیہ اُس دُخان کی آتش خالص کی طرف مستحیل ہو جاتی ہیں تو بوجہ پیدا ہو جانے بساطت کے وہ عنصر نار نظر نہیں آتا۔ اور دیکھنے والے کو یہ گمان گذرتا ہے کہ گویا وہ بُجھ گیا ہے حالانکہ در اصل وہ بُجھا نہیں ہے اور یہ صورت اُس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب دخان لطیف ہو لیکن اگر غلیظ ہو تو اشتعال اُس آگ کا کئی دنوں اور برسوں تک رہتا ہے اور طرح طرح کی شکلوں میں وہ روشنی جو ستارہ کے رنگ پر ہے آسمان کے جو میں نظر آتی ہے کبھی ایسا دکھائی دیتا ہے کہ گویا دُم دار ستارہ ہے اور کبھی وہ دُم زُلف کی شکل پر نظر آتی ہے کبھی وہ ناری ہیکل نیزہ کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور کبھی ایک حیوان کی طرح جو کئی سینگ رکھتا ہے اور کبھی یہ ناری ہیکل بصور مختلفہ ایک برس تک یا کئی برسوں تک دکھائی دیتی ہے اور کبھی یہ ناری ہیکل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر شہب ثاقبہ کی صورت میں آجاتی ہے اور کبھی شہب ثاقبہ اس ناری ہیکل کی شکل قبول کر لیتے ہیں۔ جب یہ ناری ہیکل قطبِ شمالی کے عین کنارہ پر نظر آتی ہے تو بسا اوقات بہ نسبت اور اطراف کے بہت دیر تک رہتی ہے اور اگر مدت دراز تک موجود رہے تو اُس کی حرارت سے کئی ہولناک نتائج پیدا ہو جاتے ہیں۔

تاریخ کی رُو سے یہ بھی منقول ہے کہ حضرت مسیح کی گرفتاری کے بعد اوّل شہب ثاقبہ اور پھر ایک زمانہ آتش پورے ایک برس تک جو آسمانی میں دکھائی دیا اور آسمان پر سے ایک چیز خاکستر کی طرح برستی تھی اور دن کے نو بجے سے رات تک ایک سخت اندھیرا ہو جاتا تھا۔

غرض شہب اور دُم دار ستاروں کی اصلیت میں یہ یونانیوں کے خیالات ہیں جو اسلام کے حکماء نے لے لئے اور اپنے تجارب کو بھی ان میں ملایا لیکن حال کی نئی روشنی کی تحقیقاتوں کا اُن سے بہت کچھ اختلاف ثابت ہوتا ہے۔ ان ظنی علوم میں یہ بات نہایت درجہ دِل توڑنے والی ہے کہ آئے دن نئے نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ یونان کی طبعی اور ہیئت حکمت کے کمال تک پہنچنے کے لئے ایک صراطِ مستقیم سمجھی جاتی تھی اور اب یہ زمانہ ہے کہ اُن کی اکثر تحقیقاتوں پر ہنسا جاتا ہے اور نہایت تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ خیال نہ کریں کہ کچھ عرصہ کے بعد اس طبعی اور ہیئت پر بھی ہنسی کرنے والے پیدا ہو جائیں گے کیونکہ گو دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس زمانہ کے طبعی اور ہیئت تجارب حسیہ مشہودہ مرئیہ کے ذریعہ سے ثابت کی گئی ہے مگر درحقیقت یہ دعویٰ نہایت درجہ کا مبالغہ ہے جس سے بعض خاص صورتوں کے مسائلِ یقینیہ میں اُن ہزارہا مشتبہ اور ظنی اور غیر محقق خیالات کو

خواہ نخواہ گھسیڑ دیا گیا ہے جن کا ابھی تک ہرگز ہرگز پورا پورا اور کامل طور پر کسی حکیم نے تصفیہ نہیں کیا۔

نئی روشنی کے محقق شہبِ ثاقبہ کی نسبت یہ رائے دیتے ہیں کہ وہ درحقیقت لوہے اور کوئلہ سے بنے ہوئے ہوتے ہیں جن کا وزن زیادہ سے زیادہ چند پونڈ ہوتا ہے اور دُمدار ستاروں کی مانند غول کے غول لمبے بیضوی دائرے بناتے ہوئے سُورج کے اِردگرد جوّ میں پھرتے رہتے ہیں۔ ان کی روشنی کی وجہ درحقیقت وہ حرارت ہے جو اُن کی تیزیٔ رفتار سے پیدا ہوتی ہے اور دُمدار ستاروں کی نسبت اُن کا بیان ہے کہ بعض اُن میں سے کئی ہزار سال رہتے ہیں اور آخر ٹوٹ کر شہاب بن جاتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب آفتاب بُرج اسد میں یا میزان میں ہو تو اِن دونوں وقتوں میں کثرت شہبِ ثاقبہ کی توقع کی جاتی ہے اور اکثر ۳۳ سال کے بعد یہ دَورہ ہوتا ہے لیکن یہ قاعدہ کُلّی نہیں بسا اوقات اِن وقتوں سے پس وپیش بھی یہ حوادثات ظہور میں آجاتے ہیں چنانچہ ۱۸۷۲ء میں ستاروں کا گرنا باقرار اِن ہیئت دانوں کے بالکل غیر مترقب امر تھا۔ اگرچہ ۱۴ر نومبر ۱۸۳۳ء اور ۲۷ر نومبر ۱۸۸۵ء کو کثرت سے یہ واقعہ ظہور میں آنا اُن کے قواعدِ مقررہ سے ملتا ہے لیکن تاریخ ٹٹولنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ نہایت فرق کے ساتھ ان تاریخوں سے بہت دُور بھی وقوع میں آیا ہے چنانچہ دہم مارچ ۱۵۲۱ء اور ۱۹ر جنوری ۱۱۳۵ء اور ماہِ مئی ۱۶۱۰ء میں جو کثرت شہب ثاقبہ وقوع میں آئے اُن میں ان تمام ہیئت دانوں کو بجز سکتہ حیرت اَور کوئی دَم مارنے کی جگہ نہیں اور وہ شہبِ ثاقبہ جو حضرت مسیح کی گرفتاری کے بعد ظہور میں آئے اور پھر ایک دُم دار ستارہ کی صورت میں ہو گئے۔ اگرچہ اب ہم پوری صحت کے ساتھ کوئی تاریخ مقرر نہیں کر سکتے مگر قیاساً معلوم ہوتا ہے کہ اس حادثہ کی ابتداء جون کے مہینہ سے ہو گی کیونکہ گو ہم اس پُرانے واقعہ کی تشخیص میں عیسائیوں کے مختلف چند بیانات سے کوئی عُمدہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتے مگر استنباط کے طور پر یہ پتہ ملتا ہے کہ حضرت مسیح جب یہودیوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوئے تب شدّتِ گرمی کا مہینہ تھا کیونکہ گرفتاری کی حالت میں اُن کا سخت پیاسا ہونا صاف ظاہر کر رہا ہے کہ موسم کا یہی تقاضا تھا کہ گرمی اور پیاس محسوس ہو۔ سو وہ مہینہ جون ہے کیونکہ اس وقت ایک سخت آندھی بھی آئی تھی جس کے ساتھ اندھیرا ہو گیا تھا اور جون کے مہینہ میں اکثر آندھیاں بھی آتی ہیں۔

اب اِس تمام تحقیقات سے معلوم ہوا کہ درحقیقت کائنات الجوّ بالخصوص شہبِ ثاقبہ اور دُمدار ستاروں کے بارے میں کوئی قطعی اور یقینی طریقِ بصیرت ہیئت دانوں اور طبعی دانوں کو اَب تک ہاتھ میں نہیں آیا جب کبھی اُنکے قواعدِ تراشیدہ کے برخلاف کوئی امر ظہور میں آتا ہے تو ایک سخت پریشانی اور حیرت اُن کو لاحق ہو جاتی ہے اور گھبراہٹ کا غُل غپاڑہ اُن میں اُٹھتا ہے۔ یورپ کے ہیئت دان اور سائنس اور نجوم میں بڑی بڑی لافیں مارنے والے ہمیشہ کائنات الجوّ اور ان کے نتائج کے بارہ میں پیشگوئیاں ایک بڑے دعوے کے ساتھ شائع کیا کرتے

ہیں اور کبھی لوگوں کو قحط سالیوں سے ڈراتے اور طوفانوں اور آندھیوں کی پیش خبری سے دھڑکے میں ڈالتے ہیں اور کبھی بروقت کی بارشوں اور ارزانی کی امیدیں دیتے ہیں مگر قدرتِ حق ہے کہ اکثر وہ اُن خبروں میں جھوٹے نکلتے ہیں مگر باایں ہمہ پھر بھی لوگوں کے دماغوں کو ناحق پریشان کرتے رہتے ہیں۔ یُوں تو وہ اپنے فکروں کو دُور تک پہنچا کر خدائے عزّ وجلّ کی خدائی میں ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں مگر حکمتِ ازلی ہمیشہ ان کو شرمندہ کرتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی فاش خطا ہمیشہ ثابت ہوتی رہتی ہے اُن کی نسبت کیونکر گمان کر سکتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے نظام اور سائنس کے بارے میں اب تک دریافت کیا ہے وہ سب یقینی ہے۔ ہمیں تو اُن کے اکثر معلومات کا ظنی مرتبہ ماننے میں بھی شرم آتی ہے کیونکہ اب تک اُن کے خیالات میں بے اصل اور بے ثبوت باتوں کا ذخیرہ بڑھا ہوا ہے۔ اس وقت امام رازی رحمۃ اللہ کا یہ قول نہایت پیارا معلوم ہوتا ہے کہ مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّکْتَالَ مَمْلَکَۃَ الْبَارِیْ بِمِکْیَالِ الْعَقْلِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِیْدًا یعنی جو شخص خدا تعالیٰ کے ملک کو اپنی عقل کے پیمانہ سے ناپنا چاہے تو وہ راستی اور صداقت اور سلامت روی سے دُور جا پڑا۔

اب اِس عاجز پر خداوندِ کریم نے جو کچھ کھولا اور ظاہر کیا وہ یہ ہے کہ اگر ہیئت دانوں اور طبعی والوں کے قواعد کسی قدر شہبِ ثاقبہ اور دُمدار ستاروں کی نسبت قبول بھی کئے جائیں تب بھی جو کچھ قرآن کریم میں اللہ جلّ شانہٗ و عزّ اسمہٗ ان کائنات الجو کی رُوحانی اغراض کی نسبت فرمایا ہے اُن میں اور اِن ناقص العقل حکماء کے بیان میں کوئی مزاحمت اور جھگڑا نہیں کیونکہ ان لوگوں نے تو اپنا منصب صرف اِس قدر قرار دیا ہے کہ عِلَلِ مادیہ اور اسبابِ عادیہ اِن چیزوں کے دریافت کر کے نظامِ ظاہری کا ایک باقاعدہ سلسلہ مقرر کر دیا جائے لیکن قرآن کریم میں روحانی نظام کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کا ایک فعل اُس کے دوسرے فعل کا مزاحم نہیں ہو سکتا۔ پس کیا یہ تعجب کی جگہ ہو سکتی ہے کہ جسمانی اور روحانی نظام خدا تعالیٰ کی قدرت سے ہمیشہ ساتھ ساتھ رہیں بالخصوص جس حالت میں ہمیشہ ربّانی مصلح دُنیا میں آتے رہتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے بڑے بڑے ارادوں کی حرکت شروع رہتی ہے اور کوئی صدی ایسی نہیں آتی کہ جو دُنیا کے کسی نہ کسی حصہ میں اِن امور میں سے کسی امر کا ظہور نہ ہو تو اِس بات کے ماننے کے لئے ذرہ بھی استبعاد باقی نہیں رہتا کہ کثرتِ شہب وغیرہ روحانی طور پر ضرور خدا تعالیٰ کے اِس روحانی انتظام کے تجدد اور حدوث پر دلالت کرتے ہیں جو الٰہی دین کی تقویت کے لئے ابتداء سے چلا آتا ہے خاص کر جب اِس بات کو ذہن میں خوب یاد رکھا جائے کہ کثرت سقوطِ شہب وغیرہ صرف اِس امر سے براہِ راست مخصوص نہیں کہ کوئی نبی یا وارث نبی اصلاحِ دین کے لئے پَیدا ہو بلکہ اس کے ضمن میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اُس نبی یا وارث اور قائم مقام نبی کے ارہاصات پر بھی کثرتِ شہب ہوتی ہے بلکہ اُس کی نمایاں فتوحات پر بھی کثرت سقوطِ شہب ہوتی ہے کیونکہ اس وقت رحمان کا لشکر شیطان کے لشکر پر کامل فتح پا لیتا ہے۔ پس جب ایسے بڑے بڑے

امور پیدا ہونے لگتے ہیں کہ اس نبی یا وارث نبی کے لئے بطور ارہاص ہیں یا اس کی کارروائیوں کے اوّل درجہ پر ممد اور معاون ہیں یا اُس کی فتحیابی کے آثار ہیں تو اُن کے قُرب زمانہ میں بھی کثرت سقوطِ شہب وغیرہ حوادث وقوع میں آجاتے ہیں تو اِس صورت میں ہر ایک غبی کو بھی یہ بات صفائی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ درحقیقت یہ کثرت سقوطِ شہب روحانی سلسلہ کی متفرق خدمات کے لئے اور اُن کے اوّل یا آخر یا درمیان میں آتی ہے اور وہ سلسلہ ہمیشہ جاری ہے اور جاری رہے گا مثلاً حال کے یورپ کے ہیئت دان جو ۲۷؍ نومبر ۱۸۸۵ء کے شہب یا انیسویں صدی کے دوسرے واقعاتِ شہب کا ذکر کرتے ہیں اور اُن پر ایسا زور دیتے ہیں کہ گویا اُن کے پاس سب سے بڑھ کر یہی نظیریں ہیں وہ ذرہ غور سے سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدی کے اواخر میں جو روحانی سلسلہ کے بڑے بڑے کام ظہور میں آنے والے تھے اور خدا تعالیٰ اپنے ایک بندہ کے توسط سے دینِ توحید کے تازہ کرنے کے لئے ارادہ فرما رہا تھا اِس لئے اس نے اِس انیسویں صدی عیسوی میں کئی دفعہ کثرت سقوطِ شہب کا تماشا دکھلایا تا وہ امر مؤکد ہو جاوے جس کا قطعی طور پر اُس نے ارادہ فرما دیا ہے۔ اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس تساقطِ شہب کو جس کے اسباب تمامتر بظاہر مادی معلوم ہوتے ہیں رجمِ شیاطین سے کیا تعلق ہے اور کیونکر معلوم ہو کہ درحقیقت اِس حادثہ سے شیاطین آسمان سے دفع اور دُور کئے جاتے ہیں۔

اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایسے اعتراض درحقیقت اُس وقت پیدا ہوتے ہیں کہ جب روحانی سلسلہ کی یادداشت سے خیال ذہول کر جاتا ہے یا اُس سلسلہ کے وجود پر یقین نہیں ہوتا ورنہ جس شخص کی دونوں سلسلوں پر نظر ہے وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اجرامِ علوی اور اجسامِ سفلی اور تمام کائنات الجو میں جو کچھ تغیر اور تحوّل اور کوئی امر مستحدث ظہور میں آتا ہے اُس کے حدوث کی درحقیقت دو علّتیں ہیں یعنی موجب ہیں۔

اوّل پہلے تو یہی سلسلۂ علل نظامِ جسمانی جس سے ظاہری فلسفی اور طبعی بحث اور سروکار رکھتا ہے اور جسکی نسبت ظاہر بین حکماء کی نظر یہ خیال رکھتی ہے کہ وہ جسمانی علل اور معلولات اور مؤثرات اور متاثرات سے منضبط اور ترتیب یافتہ ہے۔

دوم۔ دوسرے وہ سلسلہ جو ان ظاہر بین حکماء کی نظرِ قاصر سے مخفی ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے ملائک کا سلسلہ ہے جو اندر ہی اندر اِس ظاہری سلسلہ کو مدد دیتا ہے اور اِس ظاہری کاروبار کو انجام تک پہنچا دیتا ہے اور بالغ نظر لوگ بخوبی اِس بات کو سمجھتے ہیں کہ بغیر تائید اس سلسلہ کے جو روحانی ہے ظاہری سلسلہ کا کام ہرگز چل ہی نہیں سکتا۔ اگرچہ ایک ظاہر بین فلاسفر اسباب کو موجود پاکر خیال کرتا ہے کہ فلاں نتیجہ ان اسباب کیلئے ضروری ہے مگر ایسے لوگوں کو ہمیشہ شرمندہ ہونا پڑتا ہے جبکہ باوجود اجتماع اسباب کے نتیجہ برعکس نکلتا ہے یا وہ اسباب اپنے اختیار اور تدبیر سے باہر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک طبیب احتیاط سے ایک بیمار بادشاہ کا علاج

کرتا ہے یا مثلاً ایک گروہ طبیبوں کا ایسے مریض کے لئے دن رات تشخیص مرض اور تجویز دوا اور تدبیر غذا میں ایسا مصروف ہوتا ہے کہ اپنے دماغ کی تمام عقل اُس پر خرچ کر دیتا ہے مگر جب کہ اس بادشاہ کی موت مقدر ہوتی ہے تو وہ تمام تجویزیں خطا جاتی ہیں اور چند روز طبیبوں اور موت کی لڑائی ہو کر آخر موت فتح پاتی ہے۔ اِس طور کے ہمیشہ نمونے ظاہر ہوتے رہتے ہیں مگر افسوس کہ لوگ ان کو غور کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ بہر حال یہ ثابت ہے کہ قادرِ مطلق نے دُنیا کے حوادث کو صرف اِس ظاہری سِلسلہ تک محصور اور محدود نہیں کیا بلکہ ایک باطنی سلسلہ ساتھ ساتھ جاری ہے۔ اگر آفتاب ہے یا ماہتاب یا زمین یا وہ بخارات جن سے پانی برستا ہے یا وہ آندھیاں جو زور سے آتی ہیں یا وہ اولے جو زمین پر گرتے ہیں یا وہ شہبِ ثاقبہ جو ٹوٹتے ہیں۔ اگرچہ یہ تمام چیزیں اپنے کاموں اور تمام تغیّرات اور تحوّلات اور حدوثات میں ظاہری اسباب بھی رکھتی ہیں جن کے بیان میں ہیئت اور طبعی کے دفتر بھرے پڑے ہیں لیکن بایں ہمہ عارف لوگ جانتے ہیں کہ اِن اسباب کے نیچے اَور اسباب بھی ہیں جو مدبّر بالارادہ ہیں جن کا دوسرے لفظوں میں نام ملائک ہے۔ وہ جس چیز سے تعلق رکھتے ہیں اُس کے تمام کاروبار کو انجام تک پہنچاتے ہیں اور اپنے کاموں میں اکثر ان روحانی اغراض کو مدِنظر رکھتے ہیں جو مولیٰ کریم نے اُن کو سپرد کی ہیں اور اُن کے کام بیہودہ نہیں بلکہ ہر ایک کام میں بڑے بڑے مقاصد اُن کو مدِنظر رہتے ہیں۔

اب جبکہ یہ بات ایک ثابت شدہ صداقت ہے کہ جس کو ہم اِس سے پہلے بھی کسی قدر تفصیل سے لکھ چکے ہیں اور ہمارے رسالہ توضیح مرام میں بھی یہ تمام بحث نہایت لطافتِ بیان سے مندرج ہے کہ حکیم مطلق نے اِس عالَم کے احسن طور پر کاروبار کے چلانے کے لئے دو نظام رکھے ہوئے ہیں اور باطنی نظام فرشتوں کے متعلق ہے اور کوئی جُز ظاہری نظام کی ایسی نہیں جس کے ساتھ درپردہ باطنی نظام نہ ہو تو اِس صورت میں ایک مسترشد بڑی آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ شہبِ ثاقبہ کے تساقط کا ظاہری نظام جن علل اور اسباب پر مبنی ہے وہ علل اور اسباب روحانی نظام کے کچھ مزاحم اور سدِ راہ نہیں اور روحانی نظام یہ ہے کہ ہر یک شہاب جو ٹوٹتا ہے دراصل اس پر ایک فرشتہ مؤکل ہوتا ہے جو اس کو جس طرف چاہتا ہے حرکت دیتا ہے چنانچہ شہب کی طرف حرکات ہی اس پر شاہد ہے اور یہ بات صاف ظاہر ہے کہ فرشتہ کا کام عبث نہیں ہو سکتا۔ اس کی تحت میں ضرور کوئی نہ کوئی غرض ہوگی جو مصالح دین اور دُنیا کے لئے مفید ہو لیکن ملائک کے کاموں کے اغراض کو سمجھنا بجز توسط ملائک ممکن نہیں۔ سو بتوسط ملائک یعنی جبرائیل علیہ السلام آخر الرسل صلی اللہ علیہ وسلم پر یہی ظاہر ہوا کہ ملائک کے اُس فعل رمی شہب سے علتِ غائی رجم شیاطین ہے۔

اور یہ بھید کہ شہب کے ٹوٹنے سے کیونکر شیاطین بھاگ جاتے ہیں اِس کا ستر روحانی سِلسلہ پر نظر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین اور ملائک کی عداوت ذاتی ہے پس ملائک اِن شہب کے چھوڑنے کے وقت جن پر وہ

ستاروں کی حرارت کا بھی اثر ڈالتے ہیں اپنی ایک نورانی طاقت جو میں پھیلاتے ہیں اور ہر یک شہاب جو حرکت کرتا ہے وہ اپنے ساتھ ایک فلکی نور رکھتا ہے کیونکہ فرشتوں کے ہاتھ سے برکت پا کر آتا ہے اور شیطان سوزی کا اُس میں ایک مادّہ ہوتا ہے۔ پس یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ جنّات تو آگ سے مخلوق ہیں وہ آگ سے کیا ضرر اُٹھائیں گے کیونکہ درحقیقت جس قدر رمی شہب سے جنّات کو ضرر پہنچتا ہے اُس کا یہ ظاہری موجب آگ نہیں بلکہ وہ روشنی موجب ہے جو فرشتہ کے نور سے شہب کے ساتھ شامل ہوتی ہے جو بالخاصیت محرقِ شیاطین ہے۔

اِس ہماری تقریر پر کوئی یہ اعتراض نہ کرے کہ یہ تمام تقریر صرف بے ثبوت خیالات اور رخابیات کا رخطابیات میں سے ہے جس کا معقولی طور پر کوئی بھی ثبوت نہیں کیونکہ ہم اِس بات کو بخوبی ثابت کر چکے ہیں کہ اس عالَم کی حرکات اور حوادث خود بخود نہیں اور نہ بغیر مرضیٔ مالک اور نہ عبث اور بیہودہ ہیں بلکہ درپردہ وہ تمام اجرامِ علوی اور اجسامِ سفلی کے لئے منجانب اللہ مدبر مقرر ہیں جن کو دوسرے لفظوں میں ملائک کہتے ہیں اور جب تک کوئی انسان پابند اعتقاد وجود ہستی باری ہے اور دہریہ نہیں اس کو ضرور یہ بات ماننی پڑے گی کہ یہ تمام کاروبار عبث نہیں بلکہ ہر یک حدوث اور ظہور پر خدا تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت بالارادہ کا ہاتھ ہے اور وہ تمام انتظام کے موافق بتوسط اسباب ظہور پذیر ہوتا ہے چونکہ خدا تعالیٰ نے اجرام اور اجسام کو علم اور شعور نہیں دیا اِس لئے اُن باتوں کے پورا کرنے کے لئے جن میں علم اور شعور درکار ہے ایسے اسباب یعنی ایسی چیزوں کے توسّط کی حاجت ہوئی جن کو علم اور شعور دیا گیا ہے اور وہ ملائک ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ جب ملائک کی یہی شان ہے کہ وہ عبث اور بیہودہ طور پر کوئی کام نہیں کرتے بلکہ اپنی تمام خدمات میں اغراض اور مقاصد رکھتے ہیں اِس لئے ان کی نسبت یہ بات ضروری طور پر ماننی پڑے گی کہ رجم کی خدمت میں بھی اُن کا کوئی اصل مقصد ہے اور چونکہ عقل اِس بات کے درک سے قاصر ہے کہ وہ کونسا مقصد ہے اِس لئے اُس عقدہ کے حل کے لئے عقل سے سوال کرنا بے محل سوال ہے اگر عقل کا اس میں کچھ دخل ہے تو صرف اِس قدر کہ عقلِ سلیم ایسے نفوس کے افعال کی نسبت کہ جو ارادہ اور فہم اور شعور رکھتے ہوں ہرگز یہ تجویز نہیں کرسکتی کہ اُن کے وہ افعال عبث اور بیہودہ اور اغراض صحیحہ ضروریہ سے خالی ہیں۔ پس اگر عقلِ سلیم اوّل اِس بات کو بخوبی سمجھ لے کہ جو کچھ اجرام اور اجسامِ سماوی و ارضی اور کائنات الجوّ میں انواع اقسام کے تغیّرات اور تحوّلات اور ظہورات ہو رہے ہیں وہ صرف عللِ ظاہریہ تک محدود نہیں ہیں بلکہ اُن تمام حوادث کے لئے اور علل بھی ہیں جو شعور اور ارادہ اور فہم اور تدبیر اور حکمت رکھتے ہیں تو اس سمجھ کے بعد ضرور عقل اِس بات کا اقرار کرے گی کہ یہ تمام تغیّرات اور حدوثات جو عالَم سفلی اور علوی میں ہمیں نظر آتے ہیں عبث اور بیہودہ اور لغو نہیں بلکہ ان میں مقاصد اور اغراض پوشیدہ ہیں گو ہم اُن کو سمجھ سکیں یا ہماری سمجھ اور فہم سے بالاتر ہوں اور اس اقرار کے ضمن میں تساقطِ شہب کی نسبت بھی یہی اقرار

عقلِ سلیم کو کرنا پڑے گا کہ یہ کام بھی عبث نہیں کیونکہ یہ بات بداہتًہ ممتنع ہے کہ ایسا خیال کیا جائے کہ جو نفوس ارادہ اور فہم اور تدبیر اور حکمت کے پابند ہیں وہ ایک لغو کام پر ابتداء سے اصرار کرتے چلے آئے ہیں سو اگرچہ عقل پورے طور پر اس سِرّ کو دریافت نہ کر سکے مگر باوجود ملائک اور اُن کے منصبی خدمات کے ماننے کے بعد اِس قدر تو ضرور دریافت کرے گی کہ اُن کا کوئی فعل عبث اور بیہودہ طور پر نہیں۔

اِس اقرار کے بعد اگرچہ عقل مفصلاً تساقط شہب کی اُن اغراض کو دریافت نہ کر سکے جو ملائک کے ارادہ اور ضمیر میں ہیں لیکن اِس قدر اجمالی طور پر تو ضرور سمجھ جائے گی کہ بے شک اِس فعل کے لئے بھی مثل اور افعالِ ملائکہ کے دَرپردہ اغراض و مقاصد ہیں۔ پس وہ بوجہ اِس کے کہ ادراکِ تفصیلی سے عاجز ہے اس تفصیل کے لئے کسی اور ذریعہ کی محتاج ہوگی جو حدودِ عقل سے بڑھ کر ہے اور وہ ذریعہ وحی اور الہام ہے جو اِس غرض سے انسان کو دیا گیا ہے تا انسان کو اُن معارف اور حقائق تک پہنچاوے کہ جن تک مجرد عقل پہنچ نہیں سکتی اور وہ اسرارِ دقیقہ اُس پر کھولے جو عقل کے ذریعہ سے کُھل نہیں سکتے۔ اور وحی سے مراد ہماری وحی قرآن ہے جس نے ہم پر یہ عُقدہ کھول دیا کہ اسقاطِ شہب سے ملائکہ کی غرض رجم شیاطین ہے۔ یعنی یہ ایک قسم کا انتشارِ نورانیت ملائک کے ہاتھ سے اور اُن کے نور کی آمیزش سے ہے جس کا جنات کی ظلمت پر اثر پڑتا ہے اور جنات کے افعالِ مخصوصہ اس سے رو بکمی ہو جاتے ہیں اور اگر اِس انتشارِ نورانیت کی کثرت ہو تو بوجہ نور کے مقناطیسی جذب کے مظاہرِ کاملہ نورانیت کے انسانوں میں سے پیدا ہوتے ہیں ورنہ یہ انتشارِ نورانیت بوجہ اپنی ملکی خاصیت کے کسی قدر دلوں کو نور اور حقانیت کی طرف کھینچتا ہے اور یہ ایک خاصیت ہے جو ہمیشہ دُنیا میں اِنّی طور پر اس کا ثبوت ملتا رہا ہے۔ دُنیا میں ہزارہا چیزوں میں ایسے ایسے خواص پائے جاتے ہیں جو انسان کی عقل سے برتر ہوتے ہیں اور انسان کوئی عقلی دلیل اُن پر قائم نہیں کر سکتا اور ان کے وجود سے بھی انکار نہیں کر سکتا پھر اس خاصیتِ ثابت شدہ کا صرف اِس بنیاد پر انکار کرنا کہ عقل اس کے سمجھنے سے قاصر ہے اگر نادانی نہیں تو اَور کیا ہے۔ کیا انسانی عقل نے تمام ان خواصِ دقیقہ پر جو اجسام اور اجرام میں پائے جاتے ہیں دلائلِ عقلی کی رُو سے احاطہ کر لیا ہے؟ تا اِس اعتراض کا حق پیدا ہو کہ تساقطِ شہب کی نسبت جو انتشارِ نورانیت کا بھید بیان کیا جاتا ہے یہ کیوں عقل کی دریافت سے باہر رہ گیا ہے اور جیسا کہ ہم ابھی لکھ چکے ہیں یہ بات بھی نہیں کہ اِس بھید کے تسلیم کرانے کے لئے عقل پر سراسر جبر ہے بلکہ جس حد تک عقلِ انسانی اپنے وجود میں طاقتِ فہم رکھتی ہے وہ اپنی اُس حد کے مناسبِ حال اس بھید کو تسلیم کرتی ہے انکار نہیں کرتی کیونکہ عقلِ سلیم کو وجودِ ملائکہ اور اُن کی خدماتِ مفوّضہ کے تسلیم کرنے کے بعد ماننا پڑتا ہے کہ یہ تساقطِ شہب بھی ملائکہ کے ذریعہ سے ظہور میں آتا ہے اور ملائکہ کسی غرض اور مقصد کے لئے اِس فعل کو بحکم مولیٰ کریم بجا لاتے ہیں پس عقلِ سلیم کا اِسی قدر ماننا اسکی ترقی کے لئے ایک زینہ کی طرح ہے اور بلاشُبہ اِس قدر تسلیم کے بعد عقلِ سلیم تساقطِ شہب کو دہریوں اور طبیعیوں کی

عقولِ ناقصہ کی طرح ایک امرِ عبث خیال نہیں کرے گی بلکہ یقینِ کامل کے ساتھ اِس رائے کی طرف جھکے گی کہ درحقیقت یہ حکیمانہ کام ہے جس کے تحت میں مقاصدِ عالیہ ہیں اور اس قدر علم کے ساتھ عقلِ سلیم کو اِس بات کی حرص پیدا ہوگی کہ اِن مقاصدِ عالیہ کو مفصّل طور پر معلوم کرے۔ پس یہ حرص اور شوقِ صادق اُس کو کشاں کشاں اُس مُرشدِ کامل کی طرف لے آئے گا جو وحی قرآن کریم ہے۔

ہاں اگر عقلِ سلیم کچھ بحث اور چُوں چرا کرسکتی ہے تو اِس موقعہ پر تو نہیں لیکن ان مسائل کے ماننے کے لئے بلاشُبہ اوّل اس کا یہ حق ہے کہ خدا تعالیٰ کے وجود میں جس کی سلطنت تبھی قائم رہ سکتی ہے کہ جب ہر یک ذرّہ عالَم کا اس کے تابع ہو بحث کرے۔ پھر ملائک کے وجود پر اور اُن کی خدمات پر دلائلِ شافیہ طلب کرے یعنی اِس بات کی پوری پوری تسلّی کرلیوے کہ درحقیقت خدا تعالیٰ کا اِنتظام یہی ہے کہ جو کچھ اجرام اور اجسام اور کائناتِ الجوّ میں ہو رہا ہے یا کبھی کبھی ظہور میں آتا ہے وہ صرف اجرام اور اجسام کے افعال شُترِ بے مہار کی طرح نہیں ہیں بلکہ ان کے تمام واقعات کی زمامِ اختیار حکیم قدیر نے ملائک کے ہاتھ میں دے رکھی ہے جو ہر دم اور ہر طرفۃ العین میں اُس قادرِ مطلق سے اِذن پاکر انواع اقسام کے تصرّفات میں مشغول ہیں اور نہ عبث طور پر بلکہ سراسر حکیمانہ طرز سے بڑے بڑے مقاصد کے لئے اِس کُرۂ اَرض وسما کو طرح طرح کی جنبشیں دے رہے ہیں اور کوئی فعل بھی اُن کا بیکار اور بے معنی نہیں۔

اور ہم فرشتوں کے وجود اور اُن کی اِن خدمات پر کسی قدر اِس رسالہ میں بحث کر آئے ہیں جس کی تفصیل یہ ہے کہ فرشتوں کا وجود ماننے کے لئے نہایت سہل اور قریب راہ یہ ہے کہ ہم اپنی عقل کی توجہ اس طرف مبذول کریں کہ یہ بات طے شدہ اور فیصل شدہ ہے کہ ہمارے اجسام کی ظاہری تربیت اور تکمیل کے لئے اور نیز اس کام کے لئے کہ تا ہمارے ظاہری حواس کے افعال مطلوبہ کما ینبغی صادر ہوسکیں۔ خدا تعالیٰ نے یہ قانونِ قدرت رکھا ہے کہ عناصر اور شمس و قمر اور تمام ستاروں کو اِس خدمت میں لگا دیا ہے کہ وہ ہمارے اجسام اور قوٰی کو مدد پہنچا کر اُن سے بوجہ احسن اُن کے تمام کام صادر کرا دیں اور ہم ان صداقتوں کے ماننے سے کسی طرف بھاگ نہیں سکتے کہ مثلاً ہماری آنکھ اپنی ذاتی روشنی سے کسی کام کو بھی انجام نہیں دے سکتی جب تک آفتاب کی روشنی اُس کے ساتھ شامل نہ ہو اور ہمارے کان محض اپنی قوتِ شنوائی سے کچھ بھی سُن نہیں سکتے جب تک کہ ہَوا متکیّف بصورت اُن کی ممد و معاون نہ ہو۔ پس کیا اِس سے ثابت نہیں کہ خدا تعالیٰ کے قانون نے ہمارے قوٰی کی تکمیل اسبابِ خارجیہ میں رکھی ہے اور ہماری فطرت ایسی نہیں ہے کہ اسبابِ خارجیہ کی مدد سے مستغنی ہو اگر غور سے دیکھو تو نہ صرف ایک دو بات میں بلکہ ہم اپنے تمام حواس تمام قوٰی تمام طاقتوں کی تکمیل کے لئے خارجی امدادات کے محتاج ہیں پھر جبکہ یہ قانون اور انتظام خدائے واحد لاشریک کا جس کے کاموں میں وحدت

اور تناسب ہے ہمارے خارجی قویٰ اور حواس اور اغراضِ جسمانی کی نسبت نہایت شدت اور استحکام اور کمال التزام سے پایا جاتا ہے تو پھر کیا یہ بات ضروری اور لازمی نہیں کہ ہماری روحانی تکمیل اور روحانی اغراض کے لئے بھی یہی انتظام ہوتا دونوں انتظام ایک ہی طرز پر واقع ہو کر صانع واحد پر دلالت کریں اور خود ظاہر ہے کہ جس حکیمِ مطلق نے ظاہری انتظام کی یہ بِنا ڈالی ہے اور اسی کو پسند کیا ہے کہ اجرامِ سماوی اور عناصر وغیرہ اسبابِ خارجیہ کے اثر سے ہمارے ظاہر اجسام اور قویٰ اور حواس کی تکمیل ہو اس حکیم قادر نے ہماری روحانیت کے لئے بھی یہی انتظام پسند کیا ہوگا کیونکہ وہ واحد لاشریک ہے اور اس کی حکمتوں اور کاموں میں وحدت اور تناسب ہے اور دلائلِ اِنّیہ بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں۔ سو وہ اشیاءِ خارجیہ جو ہماری روحانیت پر اثر ڈال کر شمس اور قمر اور عناصر کی طرح جو اغراضِ جسمانی کے لئے ممد ہیں ہماری اغراضِ روحانی کو پورا کرتی ہیں انہیں کا نام ہم ملائک رکھتے ہیں۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۰۳ تا ۱۳۵ حاشیہ)

۲۶:۲۹ قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا ۝

ان کو کہہ دے کہ مَیں نہیں جانتا کہ عذاب قریب ہے یا دُور ہے۔ اب اے سُننے والو یاد رکھو کہ یہ بات سچ ہے اور بالکل سچ ہے اور اُس کے ماننے کے بغیر چارہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کی پیشگوئیاں کبھی ظاہر پر پوری ہوتی ہیں اور کبھی استعارہ کے رنگ میں۔ پس کسی نبی یا رسول کو یہ حوصلہ نہیں کہ ہر جگہ اور ہر پیشگوئی میں یہ دعویٰ کر دے کہ اِس طور پر یہ پیشگوئی پوری ہوگی ہاں ..... اِس امر کا دعویٰ کرنا نبی کا حق ہے کہ وہ پیشگوئی جس کو وہ بیان کرتا ہے خارقِ عادت ہے یا اِنسانی علم سے وراء الوراء ہے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۹۲)

تاریخ کا مقرر نہ ہونا یا وقت کی کمی بیشی پیشگوئی کے ظاہر ہونے کی وقعت میں کچھ کمی نہیں ڈال سکتے۔ قرآن شریف میں اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ (مَیں نہیں جانتا کہ عذاب کے نزول کا وقت قریب ہے یا بعید) صاف بتاتا ہے کہ ہر ایک عذاب کی مقررہ تاریخ نہیں بتائی جاتی۔ (بدر جلد ا نمبر ۱۸ مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

۲۷، ۲۸ عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝

رسول کا لفظ عام ہے جس میں رسول اور نبی اور محدّث داخل ہیں۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۳۲۲)

لَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ یعنی خدائے تعالیٰ کُھلے کُھلے طور پر کسی کو اپنے

غیب پر بجز رسولوں کے یعنی بجز اُن لوگوں کے جو وحیٔ رسالت یا وحیٔ ولایت کے ساتھ مامور ہوا کرتے ہیں اور منجانب اللہ سمجھے جاتے ہیں مطلع نہیں کرتا۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۱۱۷)

مکذبین کے دلوں پر خدا کی لعنت ہے خدا ان کو نہ قرآن کا نور دکھلائے گا نہ بالمقابل دعا کی استجابت جو اعلام قبل از وقت کے ساتھ ہو اور نہ امورِ غیبیہ پر اطلاع دے گا لَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ۔ (ضمیمہ انجامِ آتھم صفحہ ۱۹ حاشیہ)

کامل طور پر غیب کا بیان کرنا صرف رسولوں کا کام ہے دوسرے کو یہ مرتبہ عطا نہیں ہوتا۔ رسولوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجے جاتے ہیں خواہ وہ نبی ہوں یا رسول یا محدث اور مجدد ہوں۔

(ایام الصلح صفحہ ۱۷۱ حاشیہ)

یہ آیت علم غیب صحیح اور صاف کا رسولوں پر حصر کرتی ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۹ حاشیہ)

استجابتِ دعا کے ساتھ اگر حسبِ مراد کوئی امرِ غیب خدا تعالیٰ کسی پر ظاہر کرے اور وہ پورا ہو جائے تو بلاشبہ اُس کی قبولیت پر ایک دلیل ہوگی اور یہ کہنا کہ نجومی یا رمال اس میں شریک ہیں یہ سراسر خیانت اور مخالفِ تعلیمِ قرآن ہے کیونکہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ۔ (نشانِ آسمانی صفحہ ۲۲)

خدا تعالیٰ بجز اُن لوگوں کے جن کو وہ ہدایتِ خلق کے لئے بھیجتا ہے کسی دوسرے کو اپنے غیب پر مطلع نہیں کرتا۔

(نشانِ آسمانی صفحہ ۳۲ حاشیہ)

غیب کو چُنے ہوئے فرستادوں کے سوا کسی پر نہیں کھولا جاتا۔ (سراجِ منیر صفحہ ۵۱)

آیت لَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ..... کھُلی کھُلی پیشگوئی صرف خدا کے مُرسلوں کو دی جاتی ہے نہ نجومیوں سے ہو سکتی ہے نہ دجّالوں سے۔ (حجۃ اللہ صفحہ ۶)

قرآن شریف بجز نبی بلکہ رسول ہونے کے دوسروں پر علومِ غیب کا دروازہ بند کرتا ہے جیسا کہ آیت لَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ سے ظاہر ہے پس مصفّٰی غیب پانے کے لئے نبی ہونا ضروری ہوا۔

(ایک غلطی کا ازالہ صفحہ ۶ حاشیہ)

صاف اور صریح غیب محض برگزیدہ رسولوں کو دیا جاتا ہے۔ (نزول المسیح صفحہ ۱۳۶)

سچی پیشگوئی بجز سچے رسول کے کسی کی طرف منسوب ہو سکتی ہے؟ (کشتی نوح صفحہ ۵۹)

اللہ تعالیٰ کے غیب کا کسی پر ظہور نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسولوں پر ہوتا ہے۔

(لیکچر لدھیانہ صفحہ ۹)

کھُلا کھُلا غیب صرف برگزیدہ رسول کو عطا کیا جاتا ہے غیر کو اس میں حصہ نہیں۔ (تجلیاتِ الٰہیہ صفحہ ۶)

ہر ایک مومن پر غیب کامل کے امور ظاہر نہیں کئے جاتے بلکہ محض اُن بندوں پر جو اصطفاء اور اجتباء کا مرتبہ رکھتے ہیں ظاہر ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ ایک جگہ قرآن شریف میں فرماتا ہے لَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ یعنی اللہ اپنے غیب پر کسی کو غالب ہونے نہیں دیتا مگر ان لوگوں کو جو اس کے رسول اور اس کی درگاہ کے پسندیدہ ہوں۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۶۷)

کُھلی کُھلی غیب کی بات بتلانا بجز نبی کے اَور کسی کا کام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ یعنی خدا اپنے غیب پر بجز برگزیدہ رسولوں کے کسی کو مطلع نہیں فرماتا۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۹۷)

غیب کا ایسا دروازہ کسی پر کھولنا کہ گویا وہ غیب پر غالب اور غیب اس کے قبضہ میں ہے یہ تصرف علم غیب میں بجز خدا کے برگزیدہ رسولوں کے اَور کسی کو نہیں دیا جاتا کہ کیا باعتبار کیفیت اور کیا باعتبار کمیت غیب کے دروازے اس پر کھولے جائیں ہاں شاذونادر کے طور پر عام لوگوں کو کوئی سچی خواب آسکتی ہے یا سچا الہام ہوسکتا ہے اور وہ بھی تاریکی سے خالی نہیں ہوتا مگر غیب کے دروازے اُن پر نہیں کُھلتے یہ موہبت محض خدا کے برگزیدہ رسولوں کیلئے ہوتی ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۳۶)

احادیث نبویہ میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے ایک شخص پیدا ہوگا جو عیسٰی اور ابنِ مریم کہلائے گا اور نبی کے نام سے موسوم کیا جائے گا یعنی اِس کثرت سے مکالمہ ومخاطبہ کا شرف اس کو حاصل ہوگا اور اس کثرت سے امور غیبیہ اس پر ظاہر ہوں گے کہ بجز نبی کے کسی پر ظاہر نہیں ہوسکتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ یعنی خدا اپنے غیب پر کسی کو پوری قدرت اور غلبہ نہیں بخشتا جو کثرت اور صفائی سے حاصل ہوسکتا ہے بجز اُس شخص کے جو اس کا برگزیدہ رسول ہو اور یہ بات ایک ثابت شدہ امر ہے کہ جس قدر خدا تعالیٰ نے مجھ سے مکالمہ ومخاطبہ کیا ہے اور جس قدر امور غیبیہ مجھ پر ظاہر فرمائے ہیں تیرہ سو برس ہجری میں کسی شخص کو آج تک بجز میرے یہ نعمت عطا نہیں کی گئی۔ اگر کوئی مُنکر ہو تو بار ثبوت اس کی گردن پر ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۹۰، ۳۹۱)

خدا تعالیٰ صاف صاف اور کُھلا کُھلا غیب بجز اپنے رسولوں کے کسی پر ظاہر نہیں کرتا اور ظاہر ہے کہ دعوے کیساتھ کسی پیشگوئی کو بتمامتر تصریح شائع کرنا اور پھر اُس کا اُسی طرح بکمال صفائی پورا ہونا اس سے زیادہ روشن نشان کی اَور کیا علامت ہوسکتی ہے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۴)

اِس آیت سے قطعی اور یقینی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کُھلی کُھلی پیشگوئیاں جو مقدار میں زیادہ اور صفائی میں اوّل درجہ پر ہوں صرف خدا کے برگزیدوں کو ہوتی ہیں دوسرے آدمی اس میں شریک نہیں ہوتے اور جو اس درجہ پر الہام نہیں

وہ دوسروں کو بھی ہو سکتے ہیں اور اکثر ان میں مُہمل اور متشابہ الہام ہوتے ہیں پس اسی مقابلہ سے برگزیدے لوگ شناخت کئے جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ اِس آیت کی رُو سے اِس بات کا جواز پایا جاتا ہے کہ وہ الہامی پیشگوئیاں جو اِس آیت کی منشاء کے مطابق کھُلی کھُلی نہ ہوں اور نیز اپنی مقدار میں انسانوں کی معمولی حالت سے بڑھ کر نہ ہوں اور متشابہات کا حصّہ اُن پر غالب ہو ایسی الہامی پیشگوئیاں اور ایسے الہام اُن لوگوں کو بھی ہو سکتے ہیں جو خدا کے برگزیدہ نہیں ہیں اور معمولی انسانوں میں سے ہیں۔ پس برگزیدوں کی شناخت کے لئے قرآن شریف میں یہی معیار ہے کہ ان کی الہامی پیشگوئیوں میں متشابہات کا حصّہ کم ہو اور اپنی کثرت اور صفائی میں اِس درجہ پر ہوں کہ دُنیا میں کوئی ان کا مقابلہ نہ کر سکے ورنہ اِس آیت کی رُو سے ایک فاسق کو بھی الہام ہو سکتا ہے جو اس درجہ پر نہیں ہے۔ مثلاً نظیر کے طور پر ہم بیان کرتے ہیں کہ براہینِ احمدیہ کی یہ پیشگوئی کہ یَاْتِیْکَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ جس پر چھبیس برس گذر چکے ہیں ایسے کھُلے کھُلے طور پر پوری ہوئی ہے کہ نہ ایک دفعہ بلکہ لاکھوں دفعہ اس نے اپنی سچائی ثابت کر دی ہے جس میں تائید اور نصرتِ الٰہی بھری ہوئی ہے۔ پس ایسی پیشگوئی بجز خدا کے کسی برگزیدہ کے دوسروں سے ہرگز ظہور میں نہیں آسکتی اگر آسکتی ہے تو کوئی اس کی نظیر پیش کرے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۶ حاشیہ)

اٹکل باز رمّالوں اور کاہنوں کی غیب دانی اور مامور من اللہ اور مُلہم کے اظہارِ غیب میں یہ فرق ہوتا ہے کہ مُلہم کا اظہارِ غیب اپنے اندر الٰہی طاقت اور خدائی ہیبت رکھتا ہے چنانچہ قرآن کریم نے صاف طور پر فرمایا ہے لَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (سٓ۲۹) یہاں اظہار کا لفظ ہی ظاہر کرتا ہے کہ اس کے اندر ایک شوکت اور قوت ہوتی ہے۔ (الحکم جلد ۲ ۲۸،۲۹ مورخہ ۲۰، ۲۷ ستمبر ۱۸۹۸ء صفحہ ۴)

نبیوں کا عظیم الشان کمال یہ ہے کہ وہ خدا سے خبریں پاتے ہیں چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے لَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ الآیہ۔ یعنی خدا تعالیٰ کے غیب کی باتیں کسی دوسرے پر ظاہر نہیں ہوتیں ہاں اپنے نبیوں میں سے جس کو وہ پسند کرے۔ جو لوگ نبوّت کے کمالات سے حصّہ لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو قبل از وقت آنے والے واقعات کی اطلاع دیتا ہے اور یہ بہت بڑا عظیم الشان نشان خدا کے مامور اور مرسلوں کا ہوتا ہے اس سے بڑھ کر اور کوئی معجزہ نہیں پیشگوئی بہت بڑا معجزہ ہے۔ تمام کتبِ سابقہ اور قرآن کریم سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہے کہ پیشگوئی سے بڑھ کر کوئی نشان نہیں ہوتا۔

(الحکم جلد ۵ ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

اللہ تعالیٰ اپنی رضامندی اِس طرح سے بار بار ظاہر کرتا ہے کہ اوّل ایک امر کو خواب میں دکھاتا ہے پھر اُسے کشف میں پھر اس کے متعلق وحی ہوتی ہے اور پھر وحی کی تکرار ہوتی رہتی ہے حتّٰی کہ وہ امرِ غیب اس کیلئے مشہودہ اور محسوسہ امور میں داخل ہو جاتا ہے اور جس قدر تکرار ایک مُلہم کے نفس میں ہوتا ہے اسی قدر تکرار

اس کے مکالمہ میں ہوا کرتا ہے اور اصفیٰ اور اجلیٰ مکالمہ انہی لوگوں کا ہوتا ہے جو اعلیٰ درجہ کا تزکیۂ نفس کرتے ہیں اِس لئے تقویٰ اور طہارت کی بہت ضرورت ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۶ مورخہ ۲۷ر فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۲)

آج قرآن شریف کی آیت شریفہ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ سے مجھے ایک نکتہ خیال میں آیا اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اس کے غیب کا اظہار سوائے برگزیدہ رسولوں کے اَور کسی پر نہیں ہوتا۔ اِس میں سوچنے کے لائق لفظ اظہار ہے۔ اظہار سے مراد یہ ہے کہ کُھلا کُھلا غیب کثرت کے ساتھ کسی پر کھولا جائے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف متشابہات کے طور پر تھوڑا سا غیب تو گاہے گاہے کسی دوسرے پر بھی کھولا جاتا ہے مگر اس میں محکم بات نہیں ہوتی اور اس کے واسطے شرط نہیں کہ جس پر کھولا جائے وہ مومن ہو یا کافر ہو ہر ایک مذہب کے آدمی کو یہ حالت گاہے حاصل ہوسکتی ہے کہ کوئی تھوڑی بات مشتبہ یا غیر مشتبہ اس کو غیب سے مِل جائے۔ یہ سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن منع صرف اظہار علی الغیب ہے۔ اظہار کا لفظ اس کی کیفیت اور کمیت پر دلالت کرتا ہے یعنی وہ غیب کی خبر مصفّٰی ہو۔ شک اور شبہ سے پاک ہو اور دوسرا کثرت سے ہو جس سے ظاہر ہو کہ یہ خارق عادت اور معجز نما ہے۔ اِس آیت سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ رسولوں کے سوائے دوسرے لوگوں کو بھی غیب سے کچھ نہ کچھ مِل جاتا ہے مگر ان کے غیب میں اظہار کا رنگ نہیں ہوتا۔ اظہار کا لفظ ایک خاص امتیاز کو ظاہر کرتا ہے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۲۰ مورخہ ۱۶ر مئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

لوگوں کی خوابوں اور انبیاء کے الہامات اور مخاطبات میں ایک ما بہ الامتیاز ہوتا ہے۔ انبیاء کی وحی اپنے تمام لوازمات کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس میں ایک شوکت اور جلال و رُعب ہوتا ہے۔ انبیاء کی وحی کیا بلحاظ کیفیت اور کیا بلحاظ کمیت عام لوگوں سے بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور وہ ان کی کامیابی اور ان کے دشمنوں کی نامرادی پر مبنی ہوتی ہے۔ انبیاء کی وحی غیب پر مشتمل ہوتی ہے۔ لَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ۔ غرض انبیاء کی وحی میں کسی انسان کو کسی طرح کا اشتراک نہیں ہوتا۔ جنسیت کے لحاظ سے جو اشتراک رکھا گیا ہے وہ بھی صرف اِس واسطے کہ تا انسان کو انبیاء کی پاک وحی پر ایمان لانے میں مدد دے ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں اور وہ تو انبیاء کی وحی کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۸ مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

نبی کے معنے لغت کی رُو سے یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے اطلاع پا کر غیب کی خبر دینے والا پس جہاں یہ معنے صادق آئیں گے نبی کا لفظ بھی صادق آئے گا اور نبی کا رسول ہونا شرط ہے کیونکہ اگر وہ رسول نہ ہو تو پھر غیب مصفّٰی کی خبر اس کو مِل نہیں سکتی اور یہ آیت روکتی ہے لَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ۔ اب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان معنوں کی رُو سے نبی سے انکار کیا جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہ اُمت مکالمات و مخاطباتِ الٰہیہ سے بے نصیب ہے کیونکہ جس کے ہاتھ پر اخبارِ غیبیہ منجانب اللہ ظاہر ہوں گے

بالضرورت اس پر مطابق آیت وَیُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِہٖ کے مفہوم نبی کا صادق آئے گا۔ اسی طرح جو خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجا جائے گا اسی کو ہم رسول کہیں گے۔ فرق درمیان یہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک ایسا نبی کوئی نہیں جس پر جدید شریعت نازل ہو یا جس کو بغیر توسط آنجناب اور ایسی فنافی الرّسول کی حالت کے جو آسمان پر اس کا نام محمد اور احمد رکھا جائے یونہی نبوت کا لقب عنایت کیا جائے۔ وَمَنِ ادَّعٰی فَقَدْ کَفَرَ۔ اس میں اصل بھید یہی ہے کہ خاتم النبیین کا مفہوم تقاضا کرتا ہے کہ جب تک کوئی پردہ مغائرت کا باقی ہے اس وقت تک اگر کوئی نبی کہلائے گا تو گویا اس مُہر کو توڑنے والا ہو گا جو خاتم النبیین پر ہے لیکن اگر کوئی شخص اُسی خاتم النبیین میں ایسا گم ہو کہ بباعث نہایت اتحاد اور نفی غیریت کے اسی کا نام پا لیا ہو اور صاف آئینہ کی طرح محمدی چہرہ کا اس میں انعکاس ہو گیا تو وہ بغیر مُہر توڑنے کے نبی کہلائیگا کیونکہ وہ محمد ہے گو ظلّی طور پر۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۱۶)

سُورَۃُ المُزَّمِّل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۵۔ اَوۡ زِدۡ عَلَیۡہِ وَ رَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِیۡلًا ؕ

خوش الحانی سے قرآن شریف پڑھنا بھی عبادت ہے اور بدعات جو اس کے ساتھ ملا لیتے ہیں وہ اس عبادت کو ضائع کر دیتی ہیں۔ بدعات نکال نکال کر ان لوگوں نے کام خراب کیا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴؍ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

۶۔ اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ۝

بعض لوگ حدیث النفس اور شیطان کے القاء کو الہامِ الٰہی سے تمیز نہیں کر سکتے اور دھوکا کھا جاتے ہیں۔ خدا کی طرف سے جو بات آتی ہے وہ پُرشوکت اور رلذیذ ہوتی ہے۔ دل پر ایک ٹھوکر مارنے والی ہوتی ہے۔ وہ خدا کی انگلیوں سے نکلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کا ہم وزن کوئی نہیں وہ فولاد کی طرح گرنے والی ہوتی ہے جیسا کہ قرآن شریف میں آیا ہے اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا۔ ثقیل کے یہی معنی ہیں مگر شیطان اور نفس کا القاء ایسا نہیں ہوتا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱؍ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۹)

۹۔ وَ اذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ وَ تَبَتَّلۡ اِلَیۡہِ تَبۡتِیۡلًا ؕ

اور خدا کو یاد کر اور اس کی طرف جھکا رہ۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۷)

میرے نزدیک رؤیا میں یہ بتانا کہ تبتّل کے معنے مجھ سے دریافت کئے جائیں اس سے یہ مراد ہے کہ جو میرا مذہب اِس بارہ میں ہے وہ اختیار کیا جاوے منطقیوں یا نحویوں کی طرح معنے کرنا نہیں ہوتا بلکہ حال کے موافق معنے

کرنے چاہئیں۔ ہمارے نزدیک اُس وقت کسی کو متبتّل کہیں گے جب وہ عملی طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام اور رضا کو دُنیا اور اس کی متعلّقات و مکروہات پر مقدم کرے۔ کوئی رسم و عادت کوئی قومی اصول اس کا رہزن نہ ہو سکے نہ نفس رہزن ہو سکے نہ بھائی نہ جورو نہ بیٹا نہ باپ۔ غرض کوئی شے اور کوئی متنفّس اس کو خدا تعالیٰ کے احکام اور رضا کے مقابلہ میں اپنے اثر کے نیچے نہ لا سکے اور وہ خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول میں ایسا اپنے آپ کو کھو دے کہ اس پر فنائے اتم طاری ہو جاوے اور اس کی ساری خواہشوں اور ارادوں پر ایک موت وارد ہو کر خدا ہی خدا رہ جاوے۔ دُنیا کے تعلقات بسا اوقات خطرناک رہزن ہو جاتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی رہزن حضرت حوّا ہو گئی۔ پس تبتّل تام کی صورت میں یہ ضروری امر ہے کہ ایک سُکر اور فنا انسان پر وارد ہو مگر نہ ایسی کہ وہ اسے خدا سے گُم کرے بلکہ خدا میں گُم کرے۔

غرض عملی طور پر تبتّل کی حقیقت تب ہی کُھلتی ہے جبکہ ساری روکیں دُور ہو جائیں اور ہر ایک قسم کے حجاب دُور ہو کر محبّتِ ذاتی تک اِنسان کا رابطہ پہنچ جاوے اور فناء اتم ایسی حاصل ہو جاوے۔ قیل و قال کے طور پر تو سب کچھ ہو سکتا ہے اور انسانی الفاظ اور بیان میں بہت کچھ ظاہر کر سکتا ہے مگر مشکل ہے تو یہ کہ عملی طور پر اسے دکھا بھی دے جو کچھ وہ کہتا ہے۔ یوں تو ہر ایک جو خدا کو ماننے والا ہے پسند بھی کرتا ہے اور کہہ بھی دیتا ہے کہ مَیں چاہتا ہوں کہ خدا کو سب پر مقدم کروں اور مقدم کرنے کا مدّعی بھی ہو سکتا ہے لیکن جب ان آثار اور علامات کا معائنہ کرنا چاہیں جو خدا کے مقدم کرنے کے ساتھ ہی عطا ہوتے ہیں تو ایک مشکل کا سامنا ہو گا۔ بات بات پر انسان ٹھوکر کھاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی راہ میں جب اس مال اور جان کے دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ اُن سے اُن کی جانوں اور مالوں یا اَور عزیز ترین اشیاء کی قربانی چاہتا ہے حالانکہ وہ اشیاء ان کی اپنی بھی نہیں ہوتی ہیں لیکن پھر بھی وہ مضائقہ کرتے ہیں۔ ابتداءً بعض صحابہؓ کو اِس قسم کا ابتلاء پیش آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بناء مسجد کے واسطے زمین کی ضرورت تھی ایک شخص سے زمین مانگی تو اُس نے کچھ عذر کر کے بتا دیا کہ مَیں زمین نہیں دے سکتا۔ اَب وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کو سب پر مقدم کرنے کا عہد اس نے کیا تھا لیکن جب آزمائش اور امتحان کا وقت آیا تو اس کو پیچھے ہٹنا پڑا گو آخر اُس نے وہ قطعہ دے دیا۔ تو بات اصل میں یہی ہے کہ کوئی امر محض بات سے نہیں ہو سکتا جب تک عمل اس کے ساتھ نہ ہو اور عملی طور پر صحیح ثابت نہیں ہوتا جب تک امتحان ساتھ نہ ہو۔ ہمارے ہاتھ پر بیعت تو یہی کی جاتی ہے کہ دین کو دُنیا پر مقدم کروں گا اور ہر ایک شخص کو جسے خدا نے اپنا مامور کر کے دُنیا میں بھیجا ہے اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہے جس کا نام حَکم اور عدل رکھا گیا ہے اپنا امام سمجھوں گا۔ اس کے فیصلے پر ٹھنڈے دل اور انشراح قلب کے ساتھ رضامند ہو جاؤں گا لیکن اگر کوئی

شخص یہ عہد اور اقرار کرنے کے بعد بھی ہمارے کسی فیصلے پر خوشی کے ساتھ رضامند نہیں ہوتا بلکہ اپنے سینہ میں کوئی روک اور اٹک پاتا ہے تو یقیناً کہنا پڑے گا کہ اس نے پورا تبتّل حاصل نہیں کیا اور وہ اس اعلیٰ مقام پر نہیں پہنچا جو تبتّل کا مقام کہلاتا ہے بلکہ اس کی راہ میں ہوائے نفس اور دُنیوی تعلقات کی روکیں اور زنجیریں باقی ہیں اور ان حجابوں سے وہ باہر نہیں نکلا جن کو پھاڑ کر انسان اس درجہ کو حاصل کرتا ہے جب تک وہ دُنیا کے درخت سے کاٹا جا کر الوہیت کی شاخ کے ساتھ ایک پیوند حاصل نہیں کرتا اس کی سرسبزی اور شادابی محال ہے۔ دیکھو جب ایک درخت کی شاخ اُس سے کاٹ دی جاوے تو وہ پھل پھول نہیں سکتی خواہ اُسے پانی کے اندر ہی کیوں نہ رکھو اور ان تمام اسباب کو جو پہلی صورت میں اُس کے لئے مایۂ حیات تھے استعمال کرو۔ لیکن وہ کبھی بھی بارآور نہ ہو گی۔ اسی طرح پر جب تک ایک صادق کے ساتھ انسان کا پیوند قائم نہیں ہوتا وہ روحانیت کو جذب کرنے کی قوت نہیں پا سکتا جیسے وہ شاخ تنہا اور الگ ہو کر پانی سے سرسبز نہیں ہوتی اسی طرح پر یہ بے تعلق اور الگ ہو کر بارآور نہیں ہو سکتا۔ پس انسان کو متبتّل ہونے کے لئے ایک قطع کی ضرورت بھی ہے اور ایک پیوند کی بھی۔

خدا کے ساتھ اُسے پیوند کرنا اور دُنیا اور اس کے تمام تعلقات اور جذبات سے الگ بھی ہونا پڑے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ بالکل دُنیا سے الگ رہ کر یہ تعلق اور پیوند حاصل کرے گا نہیں۔ بلکہ دُنیا میں رہ کر پھر اس سے الگ رہے یہی تو مردانگی اور شجاعت ہے اور الگ ہونے سے مراد یہ کہ دُنیا کی تحریکیں اور جذبات اس کو اپنا زیر اثر نہ کر لیں اور وہ ان کو مقدم نہ کرے بلکہ خدا کو مقدم کرے۔ دُنیا کی کوئی تحریک اور روک اس کی راہ میں نہ آوے اور اپنی طرف سے اس کو جذب نہ کر سکے۔ مَیں نے ابھی کہا ہے کہ دُنیا میں بہت سی روکیں انسان کے لئے ہیں۔ ایک جورو یا بیوی بھی بہت کچھ رہزن ہو سکتی ہے خدا نے اس کا نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ خدا نے صرف ایک نہی کی تعلیم دی تھی اس کا اثر پہلے عورت پر ہُوا پھر آدمؑ پر ہُوا۔

غرض تبتّل کیا ہے؟ خدا کی طرف انقطاع کر کے دوسروں کو محض مُردہ سمجھ لینا۔ بہت سے لوگ ہیں جو ہماری باتوں کو صحیح سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ بجا اور درست ہے مگر جب ان سے کہا جاوے کہ پھر تم اس کو قبول کیوں نہیں کرتے تو وہ یہی کہیں گے کہ لوگ ہم کو بُرا کہتے ہیں۔ پس یہ خیال کہ لوگ اس کو بُرا کہتے ہیں یہی ایک رگ ہے جو خدا سے قطع کراتی ہے کیونکہ اگر خدا تعالیٰ کا خوف دِل میں ہو اور اس کی عظمت اور جبروت کی حکومت کے ماتحت انسان ہو پھر اس کو کسی دوسرے کی پرواہ کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کیا کہتا ہے کیا نہیں؟ ابھی اُس کے دِل میں لوگوں کی حکومت ہے نہ خدا کی۔ جب یہ مُشرکانہ خیال دِل سے دُور ہو جاوے پھر سب کے سب مُردے اور کیڑے سے بھی کمتر اور کمزور نظر آتے ہیں۔ اگر ساری دُنیا مِل کر بھی مقابلہ کرنا چاہے تو ممکن نہیں کہ ایسا

شخص حق کو قبول کرنے سے رُک جائے۔

تبتّل تام کا پورا نمونہ انبیاء علیہم السّلام اور خدا کے ماموروں میں مشاہدہ کرنا چاہیئے کہ وہ کس طرح دُنیاداروں کی مخالفتوں کے باوجود پوری بیکسی اور ناتوانی کے پرواہ تک نہیں کرتے۔ اُن کی رفتار اور حالات سے سبق لینا چاہیئے۔

بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ ایسے لوگ جو بُرا نہیں کہتے مگر پورے طور پر اظہار بھی نہیں کرتے محض اِس وجہ سے کہ لوگ بُرا کہیں گے کیا اُن کے پیچھے نماز پڑھ لیں؟ مَیں کہتا ہوں ہرگز نہیں اِس لئے کہ ابھی تک اُن کے قبولِ حق کی راہ میں ایک ٹھوکر کا پتھر ہے اور وہ ابھی تک اس درخت کی شاخ ہیں جس کا پھل زہریلا اور ہلاک کرنے والا ہے۔ اگر وہ دُنیاداروں کو اپنا معبود اور قبلہ نہ سمجھتے تو ان سارے حجابوں کو چیر کر باہر نکل آتے اور کِسی کے لعن طعن کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے اور کوئی خوف شماتت کا انہیں دامنگیر نہ ہوتا بلکہ وہ خدا کی طرف دوڑتے۔ پس تم یاد رکھو کہ تم ہر کام میں دیکھ لو کہ اس میں خدا راضی ہے یا مخلوقِ خدا۔ جب تک یہ حالت نہ ہو جاوے کہ خدا کی رضا مقدم ہو جاوے اور کوئی شیطان اور رہزن نہ ہو سکے اس وقت تک ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے لیکن جب دُنیا کی بُرائی بھلائی ہی نہ ہو بلکہ خدا کی خوشنودی اور ناراضگی اس پر اثر کرنے والی ہو۔ یہ وہ حالت ہوتی ہے جب انسان ہر قسم کے خوف وحزن کے مقامات سے نکلا ہؤا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہماری جماعت میں شامل ہو کر پھر اس سے نکل بھی جاتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اس کا شیطان اس لباس میں ہنوز اس کے ساتھ ہوتا ہے لیکن اگر وہ عزم کرلے کہ آئندہ کسی وسوسہ انداز کی بات کو سُنوں گا ہی نہیں تو خدا اسے بچا لیتا ہے.... ٹھوکر لگنے کا عموماً یہی سبب ہوتا ہے کہ دوسرے تعلقات قائم تھے۔ اُن کو پرورش کے لئے ضرورت پڑی کہ ادھر سے سُست ہوں سُستی سے اجنبیّت پَیدا ہوئی پھر اس سے تکبّر اور پھر انکار تک نوبت پہنچی۔ تبتّل کا عملی نمونہ ہمارے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ نہ آپؐ کو کسی کی مدح کی پرواہ نہ ذم کی۔ کیا کیا آپؐ کو تکالیف پیش آئیں مگر کچھ بھی پرواہ نہ کی۔ کوئی لالچ اور طمع آپؐ کو اس کام سے روک نہ سکا جو آپؐ خدا کی طرف سے لائے تھے۔ جب تک اِنسان اس حالت کو اپنے اندر مشاہدہ نہ کرلے اور امتحان میں پاس نہ ہو لے کبھی بھی بے فکر نہ ہو۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو شخص متبتّل ہوگا متوکّل بھی وہی ہوگا۔ گویا متوکّل ہونے کے واسطے متبتّل ہونا شرط ہے کیونکہ جب تک اَوروں کے ساتھ تعلقات ایسے ہیں کہ اُن پر بھروسہ اور تکیہ کرتا ہے اُس وقت تک خالصۃً اللہ پر توکّل کب ہو سکتا ہے۔ جب خدا کی طرف اِنقطاع کرتا ہے تو وہ دُنیا کی طرف سے توڑتا ہے اور خدا میں پیوند کرتا ہے اور یہ تب ہوتا ہے جبکہ کامل توکّل ہو۔ جیسے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کامل متبتّل تھے ویسے ہی کامل متوکّل بھی تھے اور یہی وجہ ہے کہ اتنے وجاہت والے اور قوم وقبائل کے سرداروں کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی اور ان کی

مخالفت سے کچھ بھی متاثر نہ ہوئے۔ آپؐ میں ایک فوق العادت یقین خدا تعالیٰ کی ذات پر تھا اِسی لئے اِس قدر عظیم الشان بوجھ کو آپؐ نے اُٹھا لیا اور ساری دُنیا کی مخالفت کی اور ان کی کچھ بھی ہستی نہ سمجھی۔ یہ بڑا نمونہ ہے توکّل کا جس کی نظیر دُنیا میں نہیں ملتی اِس لئے کہ اس میں خدا کو پسند کر کے دُنیا کو مخالف بنا لیا جاتا ہے مگر یہ حالت پیدا نہیں ہوتی جب تک گویا خدا کو نہ دیکھ لے۔ جب تک یہ امید نہ ہو کہ اس کے بعد دوسرا دروازہ ضرور کھلنے والا ہے۔ جب یہ امید اور یقین ہو جاتا ہے تو وہ عزیزوں کو خدا کی راہ میں دشمن بنا لیتا ہے اِس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ خدا اَور دوست بنا دے گا۔ جائیداد کھو دیتا ہے کہ اس سے بہتر ملنے کا یقین ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ خدا ہی کی رضا کو مقدم کرنا تو تبتّل ہے اور پھر تبتّل اور توکّل توام ہیں تبتّل کا راز ہے توکّل اور توکّل کی شرط ہے تبتّل اور یہی ہمارا مذہب اِس امر میں ہے۔

(الحکم جلد ۵ ۳۷؎ مورخہ ۱۰؍ اکتوبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱ تا ۳)

تمام طریق جن کا قرآن شریف میں کوئی ذکر نہیں انسانی اِختراع اور خیالات ہیں جن کا نتیجہ کبھی کچھ نہیں ہوا۔ قرآن شریف اگر کچھ بتاتا ہے تو یہ کہ خدا سے یُوں محبت کرو۔ اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ[1] کے مصداق بنو اور فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ[2] پر عمل کرو اور ایسی فناء اتم تم پر آجاوے کہ تَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا کے رنگ سے تم رنگین ہو جاؤ اور خدا تعالیٰ کو سب چیزوں پر مقدم کر لو۔ یہ امور ہیں جن کے حصول کی ضرورت ہے۔ نادان انسان اپنے عقل اور خیال کے پیمانہ سے خدا کو ناپنا چاہتا ہے اور اپنی اختراع سے چاہتا ہے کہ اس سے تعلق پیدا کرے اور یہی ناممکن ہے۔

(الحکم جلد ۵ ۴۰؎ مورخہ ۳۱؍ اکتوبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

اِنسان کو چاہیئے کہ ہر ایک کاروبار میں تَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا کا مصداق ہو یعنی ہر ایک کام کو اِس طرح سے بجا لاوے گویا وہ خود اس میں نفسانی حظ کوئی نہیں رکھتا صرف خدا تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کی وجہ سے بجا لا رہا ہے اور اسی نیّت سے مخلوق کے حقوق کو ادا کر تا دین ہے۔ ہر ایک بات اور کام کا آخری نقطہ خدا تعالےٰ کی رضامندی ہونا چاہیئے۔ اگر دُنیا کے لئے ہے تو خدا تعالیٰ کا غضب کماتا ہے۔

(البدر جلد ۳ ۱۱؎ مورخہ ۱۶؍ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ۝

---

[1] سورۃ البقرۃ : ۱۶۶ [2] سورۃ اٰل عمران : ۳۲

ہم نے تمہاری طرف یہ رسول اسی رسول کی مانند بھیجا ہے کہ جو فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا سو جب فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اس سے ایسا مؤاخذہ کیا کہ جس کا انجام وبال تھا یعنی اسی مؤاخذہ سے فرعون نیست و نابود کیا گیا۔ سو تم جو بمنزلۂ فرعون ہو ہمارے مؤاخذہ سے کیونکر نافرمان رہ کر بچ سکتے ہو۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۳۰، ۲۳۱ حاشیہ)

ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے کہ تمہاری حالتِ معصیت اور ضلالت پر شاہد ہے اور یہ رسول اُسی رسول کی مانند ہے کہ جو فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۳۱، ۵۳۲)

مَیں وہی ہوں جو وقت پر اصلاحِ خلق کے لئے بھیجا گیا تا دین کو تازہ طور پر دلوں میں قائم کر دیا جائے مَیں اُسی طرح بھیجا گیا ہوں جس طرح سے وہ شخص بعد کلیم اللہ مردِ خدا کے بھیجا گیا تھا جس کی رُوح ہیروڈیس کے عہدِ حکومت میں بہت تکلیفوں کے بعد آسمان کی طرف اُٹھائی گئی۔ سو جب دوسرا کلیم اللہ جو حقیقت میں سب سے پہلا اور سیّدالانبیاء ہے دوسرے فرعونوں کی سرکوبی کے لئے آیا جس کے حق میں ہے اِنَّآ اَرۡسَلۡنَآ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ۙ شَاہِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا سو اس کو بھی جو اپنی کارروائیوں میں کلیم اوّل کا مثیل مگر رُتبہ میں اس سے بزرگ تر تھا ایک مثیل المسیح کا وعدہ دیا گیا اور وہ مثیل المسیح قوت اور طبع اور خاصیّتِ مسیح ابنِ مریم کی پاکر اُسی زمانہ کی مانند اور اُسی مدّت کے قریب قریب جو کلیم اوّل کے زمانہ سے مسیح ابنِ مریم کے زمانہ تک تھی۔ یعنی چودھویں صدی میں آسمان سے اُترا اور وہ اُترنا روحانی طور پر تھا جیسا کہ مکمّل لوگوں کا صعود کے بعد خلق اللہ کی اِصلاح کے لئے نزول ہوتا ہے اور سب باتوں میں اُسی زمانہ کے ہم شکل زمانہ میں اُترا جو مسیح ابنِ مریم کے اُترنے کا زمانہ تھا تا سمجھنے والوں کے لئے نشان ہو۔ (فتح اِسلام صفحہ ۱۰، ۱۱)

خدا تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مثیلِ موسیٰؑ قرار دیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے اِنَّآ اَرۡسَلۡنَآ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ۙ شَاہِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ۔ اِس آیت میں خدا تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو موسیٰؑ کی طرح اور کفّار کو فرعون کی طرح ٹھہرایا۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۶۷)

ظاہر ہے کہ کَمَا کے لفظ سے یہ اشارہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مثیلِ موسیٰؑ ہیں چنانچہ توریت باب اِستثناء میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مثیلِ موسیٰؑ لکھا ہے اور ظاہر ہے کہ مماثلت سے مراد مماثلتِ تامہ ہے نہ کہ مماثلتِ ناقصہ۔ کیونکہ اگر مماثلتِ ناقصہ مراد ہو تو پھر اس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہتی۔ وجہ یہ کہ ایسی مماثلت والے بہت سے نبی ثابت ہوں گے جنہوں نے خدا تعالیٰ کے حکم سے تلوار بھی اُٹھائی اور حضرت موسیٰؑ کی طرح جنگ بھی کئے اور عجیب طور پر فتحیں بھی حاصل کیں مگر کیا وہ اِس پیشگوئی کے مصداق ٹھہر سکتے ہیں ہرگز نہیں۔ غرض ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیّت اسی صورت میں

ہو سکتی ہے کہ جب مماثلت سے مماثلتِ تامہ مراد ہو اور مماثلتِ تامہ کی عظیم الشان جزوں میں سے ایک یہ بھی جزو ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنی رسالت سے مشرّف کرکے پھر بطور اکرام و انعام خلافتِ ظاہری اور باطنی کا ایک لمبا سلسلہ ان کی شریعت میں رکھ دیا جو قریباً چودہ سَو برس تک ممتد ہو کر آخر حضرت عیسٰی علیہ السّلام پر اس کا خاتمہ ہوا۔ اِس عرصہ میں صدہا بادشاہ اور صاحب وحی اور الہام شریعتِ موسوی میں پیدا ہوئے اور ہمیشہ خدا تعالیٰ شریعتِ موسوی کے حامیوں کی ایسے عجیب طور پر مدد کرتا رہا جو ایک حیرت انگیز یادگار کے طور پر وہ باتیں صفحاتِ تاریخ پر محفوظ رہیں جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ[1] قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً[2]

یعنی ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی اور بہت سے رُسل اس کے پیچھے آئے پھر سب کے بعد عیسٰی ابن مریم کو بھیجا اور اس کو انجیل دی اور اس کے تابعین کے دلوں میں رحمت اور شفقت رکھ دی یعنی وہ تلوار سے نہیں بلکہ اپنی تواضع اور فروتنی اور اَخلاق سے دعوتِ دین کرتے تھے۔ اِس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ موسوی شریعت اگرچہ جلالی تھی اور لاکھوں خون اِس شریعت کے حکموں سے ہوئے یہاں تک کہ چار لاکھ کے قریب شیر خوار بچہ بھی مارا گیا لیکن خدا تعالیٰ نے چاہا کہ اِس سلسلہ کا خاتمہ رحمت پر کرے اور انہیں میں سے ایسی قوم پیدا کرے کہ وہ تلوار سے نہیں بلکہ علم اور خُلق سے اور محض اپنی قوّتِ قدسیہ کے زور سے بنی آدم کو راہِ راست پر لاویں۔

اب چونکہ مماثلت فی الانعامات ہونا ازبس ضروری ہے اور مماثلتِ تامہ تبھی متحقق ہو سکتی ہے کہ جب مماثلت فی الانعامات متحقق ہو پس اِس لئے یہ ظہور میں آیا کہ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو قریباً چودہ سَو برس تک ایسے خدامِ شریعت عطا کئے گئے کہ وہ رسول اور مُلہم من اللہ تھے اور اختتام اِس سلسلہ کا ایک ایسے رسول پر ہوا جس نے تلوار سے نہیں بلکہ فقط رحمت اور خُلق سے حق کی طرف دعوت کی۔ اِس طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وہ خدامِ شریعت عطا کئے گئے جو بر طبق حدیث عُلَمَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ مُلہم اور محدّث تھے اور جس طرح موسیٰؑ کی شریعت کے آخری زمانہ میں حضرت عیسٰی علیہ السّلام بھیجے گئے جنہوں نے نہ تلوار سے بلکہ صرف خُلق اور رحمت سے دعوتِ حق کی۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے اِس شریعت کے لئے مسیح موعود کو بھیجا تا وہ بھی صرف خُلق اور رحمت اور انوارِ آسمانی سے راہِ راست کی دعوت کرے اور جس طرح حضرت مسیح حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے قریباً چودہ سَو برس بعد آئے تھے اِس مسیح موعود نے بھی چودھویں صدی کے سر پر ظہور کیا اور محمدی

---

[1] سورۃ البقرہ : ۸۸ [2] سورۃ الحدید : ۲۸

سلسلہ موسوی سلسلہ سے انطباقِ کلّی پا گیا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ موسوی سلسلہ میں تو حمایتِ دین کے لئے نبی آتے رہے اور حضرت مسیح بھی نبی تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مُرسَل ہونے میں نبی اور محدّث ایک ہی منصب رکھتے ہیں اور جیسا کہ خدا تعالیٰ نے نبیوں کا نام مُرسَل رکھا ایسا ہی محدثین کا نام بھی مُرسَل رکھا۔ اِسی اشارہ کی غرض سے قرآن شریف میں وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ آیا ہے اور یہ نہیں کہ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالْاَنْبِيَآءِ۔ پس یہ اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسل سے مراد مرسل ہیں خواہ وہ رسول ہوں یا نبی ہوں یا محدّث ہوں۔ چونکہ ہمارے سیّد و رسول صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نبی نہیں آسکتا اس لئے اِس شریعت میں نبی کے قائم مقام محدّث رکھے گئے اور اس کی طرف اِس آیت میں اشارہ ہے کہ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ۔ چونکہ ثُلَّةٌ کا لفظ دونوں فقروں میں برابر آیا ہے اِس لئے قطعی طور پر یہاں سے ثابت ہوا کہ اِس اُمت کے محدّث اپنی تعداد میں اور اپنے طولانی سلسلہ میں موسوی اُمت کے مُرسلوں کے برابر ہیں۔ (شہادت القرآن صفحہ ۲۶ تا ۲۸)

ایک شخص کا اِس اُمت میں سے مسیح علیہ السلام کے نام پر آنا ضروری ہے۔ کیوں ضروری ہے۔ تین وجہ سے۔ اوّل یہ کہ مماثلتِ تامہ کاملہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت موسیٰ سے جو آیت كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا سے مفہوم ہوتی ہے اِس بات کو چاہتی ہے۔ وجہ یہ کہ آیت اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا صاف بتلا رہی ہے کہ جیسے حضرت موسیٰ اپنی اُمت کی نیکی بدی پر شاہد تھے ایسا ہی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی شاہد ہیں مگر یہ شہادت دوامی طور پر بجز صورت اِستخلاف کے حضرت موسیٰ کے لئے ممکن نہیں ہوئی یعنی خدا تعالیٰ نے اسی اتمامِ حجت کی غرض سے حضرت موسیٰ کے لئے چودہ سو برس تک خلیفوں کا سلسلہ مقرر کیا جو درحقیقت توریت کے خادم اور حضرت موسیٰ کی شریعت کی تائید کے لئے آتے تھے تا خدا تعالیٰ بذریعہ ان خلیفوں کے حضرت موسیٰ کی شہادت کے سلسلہ کو کامل کر دیوے اور وہ اِس لائق ٹھہریں کہ قیامت کو تمام بنی اسرائیل کی نسبت خدا تعالیٰ کے سامنے شہادت دے سکیں۔ ایسا ہی اللہ جلّ شانہٗ نے اسلامی اُمت کے کُل لوگوں کے لئے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد ٹھہرایا ہے اور فرمایا اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ اور فرمایا وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا[1] مگر ظاہر ہے کہ ظاہری طور پر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف تئیس ۲۳ برس تک اپنی اُمت میں رہے پھر یہ سوال کہ دائمی طور پر وہ اپنی اُمت کے لئے کیونکر شاہد ٹھہر سکتے ہیں یہی واقعہ جواب رکھتا ہے کہ بطور اِستخلاف کے یعنی موسیٰ علیہ السلام کی مانند خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی قیامت تک خلیفے مقرر کر دئے اور خلیفوں کی شہادت بعینہٖ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت متصوّر ہوئی اور اِس طرح پر مضمون آیت اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا

---

[1] سورۃ النساء : ۴۲

شَاهِدًا عَلَيْكُمْ ہر یک پہلو سے درست ہو گیا۔ غرض شہادتِ دائمی کا عقیدہ جو نصِ قرآنی سے بتواتر ثابت اور تمام مسلمانوں کے نزدیک مسلّم ہے تبھی معقولی اور تحقیقی طور پر ثابت ہوتا ہے جب خلافتِ دائمی کو قبول کیا جائے اور یہ امر ہمارے مدعا کو ثابت کرنے والا ہے فتدبر۔ (شہادت القرآن صفحہ ۶۶، ۶۷)

لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن شریف میں مسیح موعود کا ذکر نہیں ہے وہ نہایت غلطی پر ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ مسیح موعود کا ذکر نہایت اکمل اور اتم طور پر قرآن شریف میں پایا جاتا ہے۔ دیکھو اوّل قرآن شریف نے آیت كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا میں صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مثیلِ موسیٰ ہیں کیونکہ اِس آیت کے یہی معنے ہیں کہ ہم نے اِس نبی کو اُس نبی کی مانند بھیجا ہے جو فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا اور واقعات نے ظاہر کر دیا کہ یہ بیان اللہ جلّ شانہٗ کا بالکل سچا ہے۔ وجہ یہ کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے موسیٰ کو فرعون کی طرف بھیج کر آخر فرعون کو بنی اسرائیل کے سامنے ہلاک کیا اور نہ خیالی اور وہمی طور پر بلکہ واقعی اور مشہود اور محسوس طور پر فرعون کے ظلم سے بنی اسرائیل کو نجات بخشی اسی طرح یعنی بنی اسرائیل کی مانند خدا تعالیٰ کے راست باز بندے مکّہ معظمہ میں تیرہ برس تک کفار کے ہاتھ سے سخت تکلیف میں رہے اور یہ تکلیف اُس تکلیف سے بہت زیادہ تھی جو فرعون سے بنی اسرائیل کو پہنچی۔ آخر یہ راست باز بندے اُس برگزیدہٗ راست بازوں کے ساتھ اور اس کے ایماء سے مکّہ سے بھاگ نکلے اُسی بھاگنے کی مانند جو بنی اسرائیل مصر سے بھاگے تھے پھر مکّہ والوں نے قتل کرنے کیلئے تعاقب کیا اُسی تعاقب کی مانند جو فرعون کی طرف سے بنی اسرائیل کے قتل کے لئے کیا گیا تھا۔ آخر وہ اُسی تعاقب کی شامت سے بدر میں اُسی طرح ہلاک ہوئے جس طرح فرعون اور اس کا لشکر دریائے نیل میں ہلاک ہؤا تھا۔ اِسی رمز کے کھولنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کی لاش بدر کے مُردوں میں دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہ شخص اِس اُمّت کا فرعون تھا۔ غرض جس طرح فرعون اور اس کا لشکر دریائے نیل میں ہلاک ہونا امورِ مشہودہ محسوسہ میں تھا جس کے وقوع میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا اِسی طرح ابوجہل اور اس کے لشکر کا تعاقب کے وقت بدر کی لڑائی میں ہلاک ہونا امورِ مشہودہ محسوسہ میں سے تھا جس سے انکار کرنا حماقت اور دیوانگی میں داخل ہے۔

سو یہ دونوں واقعات اپنے تمام سوانح کے لحاظ سے باہم ایسی مشابہت رکھتے ہیں کہ گویا دو توام بھائیوں کی طرح ہیں اور عیسائیوں کا یہ قول کہ مثیلِ موسیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں بالکل مردود اور قابلِ شرم ہے کیونکہ مماثلت امورِ مشہودہ محسوسہ یقینیہ قطعیہ میں ہونی چاہیئے نہ ایسے فضول اور وہمی دعوے کے ساتھ جو خود جائے بحث اور سخت انکار کی جگہ ہے۔ یہ دعویٰ کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے منجّی تھے اور ایسا ہی یسوع بھی عیسائیوں کا منجّی تھا کس قدر بودہ اور بے ثبوت خیال ہے کیونکہ یہ محض اپنے دل کے بے اثر تصورات ہیں جن کے ساتھ کوئی بدیہی اور روشن علامت نہیں ہے اور اگر نجات دینے کی کوئی علامت ہوتی تو یہود بکمال شکر گزاری اُسی طرح

حضرت عیسیٰ کو قبول کرتے اور اُن کے منجی ہونے کا اسی قدر شکریہ کے ساتھ اقرار کرتے جیسا کہ دریائے نیل کے واقعہ کے بعد انہوں نے شکرگزاری کے گیت گائے تھے لیکن اُن کے دلوں نے تو کچھ بھی محسوس نہ کیا کہ یہ کیسی نجات ہے کہ یہ شخص ہمیں دیتا ہے مگر وہ اسرائیلی یعنی خدا کے بندے جن کو ہمارے سیّد و مولیٰ نے مکّہ والوں کے ظلم سے چھوڑایا انہوں نے بدر کے واقعہ کے بعد اسی طرح گیت گائے جیسے کہ بنی اسرائیل نے دریائے مصر کے سر پر گائے تھے اور وہ عربی گیت اَب تک کتابوں میں محفوظ چلے آتے ہیں جو بدر کے میدان میں گائے گئے۔

ایک دانا سمجھ سکتا ہے کہ اِس پیشگوئی کی رُوح تو یہی مماثلت ہے۔ پھر اگر یہ مماثلت امورِ مشہودہ محسوسہ میں سے نہ ہو اور مخالف کی نظر میں ایک امرِ ثابت شدہ اور بدیہیات اور مسلّمات کے رنگ میں نہ ہو تو کیونکر ایسا بیہودہ دعویٰ ایک طالبِ حق کے ہدایت پانے کے لئے رہبر ہو سکتا ہے۔ اِس میں کیا شک ہے کہ یسوع کا منجی ہونا عیسائیوں کا صرف ایک دعویٰ ہے جس کو وہ دلائلِ عقلیہ کے رُو سے ثابت نہیں کر سکے اور نہ بدیہیات کے رنگ میں دکھلا سکے اور پُوچھ کر دیکھ لو کہ وہ لوگ عیسائیت اور دوسری قوموں میں کوئی مابہ الامتیاز دکھلا نہیں سکتے جس سے معلوم ہو کہ صرف یہ قوم نجات یافتہ اور دوسرے سب لوگ نجات سے محروم ہیں بلکہ ثابت تو یہ ہے کہ یہ قوم رُوحانیت اور فیوضِ سماوی اور نجات کے روحانی علامات اور برکات سے بالکل بے بہرہ ہے پھر مماثلت کیونکر اور کس صورت سے ثابت ہو۔ مماثلت تو امورِ بدیہیہ اور محسوسہ اور مشہودہ میں ہونی چاہیئے تا لوگ اس کو یقینی طور پر شناخت کر کے اس سے شخصِ مثیل کو شناخت کریں۔ کیا اگر آج ایک شخص مثیلِ موسٰیؑ ہونے کا دعویٰ کرے اور مماثلت یہ پیش کرے کہ میں رُوحانی طور پر قوم کا منجی ہوں اور نجات دینے کی کوئی محسوس اور مشہود علامت نہ دکھلاوے تو کیا عیسائی صاحبان اس کو قبول کر لیں گے کہ درحقیقت یہی مثیلِ موسٰیؑ ہے۔ پس سچا فیصلہ اور ایمان کا فیصلہ اور انصاف کا فیصلہ یہی ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام مثیلِ موسٰیؑ ہرگز نہیں ہیں اور خارجی واقعات کا نمونہ کوئی انہوں نے نہیں دکھلایا جس سے مومنوں کی نجات دہی اور کفّار کی سزادہی میں حضرت موسٰیؑ سے اُن کی مشابہت ثابت ہو بلکہ برعکس اس کے اُن کے وقت میں مومنوں کو سخت تکالیف پہنچیں جن تکالیف سے حضرت عیسٰیؑ بھی باہر نہ رہے۔ پس ہم ایمان کو ضائع کریں گے اور خدا تعالیٰ کے نزدیک خائن ٹھہریں گے اگر ہم یہ اقرار نہ کریں کہ وہ مثیلِ موسٰیؑ جس کا توریت کتاب استثناء میں ذکر ہے وہ وہی نبی مؤیدِ الٰہی ہے جو مع اپنی جماعت کے تیرہ برس برابر دُکھ اُٹھا کر اور ہر ایک قسم کی تکلیف دیکھ کر آخر مع اپنی جماعت کے بھاگا اور اس کا تعاقب کیا گیا آخر بدر کی لڑائی میں چند گھنٹوں میں فیصلہ ہو کر ابوجہل اور اس کا لشکر تلوار کی دھار سے ایسے ہی مارے گئے جیسا کہ دریائے نیل کی دھار سے فرعون اور اس کے لشکر کا کام تمام کیا گیا۔ دیکھو کیسی صفائی اور

کیسے مشہود اور محسوس طور پر یہ دونوں واقعات مصر اور مکہ اور دریائے نیل اور بدر کے آپس میں مماثلت رکھتے ہیں۔

غرض جب کہ یہ ثابت ہؤا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم درحقیقت مثیلِ موسیٰ ہیں تو تکمیلِ اشاعت کا یہ تقاضا تھا کہ ان کے پیروؤں اور خلفاء میں بھی مماثلت ہو اور یہ بات ضروری تھی کہ جیسا کہ موسیٰ اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک اشد اور اکمل مشابہت مومنوں کے نجات دینے اور کافروں کو عذاب دینے کے بارے میں پائی گئی ان دونوں بزرگ نبیوں کے آخری خلیفوں میں بھی کوئی مشابہت باہم پائی جائے۔ سو جب ہم دیکھتے ہیں تو جیسا کہ ابھی مَیں نے بیان کیا ہے نہ صرف ایک مشابہت بلکہ کئی مشابہتیں ثابت ہوتی ہیں جو مجھ میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں پائی جاتی ہیں۔ (ایام الصلح صفحہ ۵۶ تا ۵۹)

خدا تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مثیل ٹھہرایا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو مسیح موعود تک سلسلۂ خلافت ہے اسی سلسلہ کو خلافتِ موسویہ کے سلسلہ سے مشابہ قرار دیا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا یعنی ہم نے یہ پیغمبر اُسی پیغمبر کی مانند تمہاری طرف بھیجا ہے کہ جو فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا اور یہ اِس بات کا گواہ ہے کہ تم کیسی ایک سرکش اور متکبر قوم ہو جیسے کہ فرعون متکبر اور سرکش تھا۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۵۶)

ہم نے اِس رسول کو اے عرب کے خونخوار ظالمو اُس رسول کی مانند بھیجا ہے جو تم سے پہلے فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر یہ پیشگوئی جو اس شد و مد سے قرآن شریف میں لکھی گئی ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ اس دعویٰ دروغ کے ساتھ جو اپنے تئیں مثیلِ موسیٰ کا ٹھہرا لیا کبھی اپنے مخالفوں پر فتحیاب نہ ہو سکتے مگر تاریخ گواہی دے رہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ فتحِ عظیم اپنے مخالفوں پر حاصل ہوئی کہ بجز نبی صادق دوسرے کے لئے ہرگز میسّر نہیں آسکتی تھی۔ پس مماثلت اس کا نام ہے جس کی تائید میں دونوں طرف سے تاریخی واقعات اِس زور شور سے گواہی دے رہے ہیں کہ وہ دونوں واقعات بدیہی طور پر نظر آتے ہیں اور موسیٰ کے یہ تین کام کہ گروہِ مخالف کو جو مصر امن تھا ہلاک کرنا اور پھر اپنے گروہ کو حکومت اور دولت بخشنا اور اُن کو شریعت عطا کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انہی تین کاموں کے ساتھ ایسے مشابہ ہو گئے کہ گویا وہ دونوں کام ایک ہی ہیں۔ یہ ایک مماثلت ہے جس سے ایمان قوی ہوتا ہے اور یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اِس پیشگوئی سے خدا کے وجود کا پتہ لگتا ہے کہ وہ کیسا قادر اور زبردست خدا ہے کہ کوئی بات اس کے آگے اَنہونی نہیں۔ اِس جگہ سے طالبِ حق کے لئے حق الیقین کے درجہ تک یہ معرفت پہنچ جاتی ہے کہ آنے والا مسیح موعود اُمّتِ محمدیہ میں سے ہے نہ کہ وہی عیسیٰ

نبی اللہ دوبارہ دُنیا میں آکر رسالتِ محمدیہ کی ختمیت کے مسئلہ کو مُشتبہ کر دے گا اور نعوذ باللہ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي[ا] کا کذب ثابت کر دے گا ..... مثیلِ موسیٰ کا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جیسا کہ آیت اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا سے ثابت ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۲۳، ۱۲۴)

ہم نے ایک رسول کو جو تم پر گواہ ہے یعنی اِس بات کا گواہ کہ تم کیسی خراب حالت میں ہو تمہاری طرف اسی رسول کی مانند بھیجا ہے جو فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا۔ سو اِس آیت میں اللہ جلّ شانہٗ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مثیلِ موسیٰ ٹھہرایا ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۹)

جب کہ خدا تعالیٰ نے موسوی سلسلہ کو ہلاک کر کے محمدی سلسلہ قائم کیا جیسا کہ نبیوں کے صحیفوں میں وعدہ دیا گیا تھا تو اس حکیم و علیم نے چاہا کہ اس سلسلہ کے اوّل اور آخر دونوں میں مشابہتِ تامہ پیدا کرے تو پہلے اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر مثیلِ موسیٰ قرار دیا جیسا کہ آیت اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا سے ظاہر ہے۔ حضرت موسیٰ نے کافروں کے مقابل پر تلوار اُٹھائی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اُس وقت جبکہ مکّہ سے نکالے گئے اور تعاقب کیا گیا مسلمانوں کی حفاظت کے لئے تلوار اُٹھائی۔ ایسا ہی حضرت موسیٰ کی نظر کے سامنے سخت دشمن ان کا جو فرعون تھا غرق کیا گیا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سخت دشمن آپؐ کا جو ابوجہل تھا ہلاک ہو گیا۔ ایسا ہی اَور بہت سی مشابہتیں ہیں جن کا ذکر کرنا موجبِ طُول ہے۔ یہ تو سلسلہ کے اوّل میں مشابہتیں ہیں مگر ضروری تھا کہ سلسلۂ محمدی کے آخری خلیفہ میں بھی سلسلۂ موسویہ کے آخری خلیفہ سے مشابہت ہو تا خدا تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ سلسلۂ محمدیہ باعتبار امامِ سلسلہ اور خلفاءِ سلسلہ کے سلسلۂ موسویہ سے مشابہ ہے ٹھیک ہو اور ہمیشہ مشابہت اوّل اور آخر میں دیکھی جاتی ہے اور درمیانی زمانہ جو ایک طویل مدت ہوتی ہے گنجائش نہیں رکھتا کہ پوری پوری نظر سے اس کو جانچا جائے مگر اوّل اور آخر کی مشابہت سے یہ قیاس پیدا ہو جاتا ہے کہ درمیان میں بھی ضرور مشابہت ہو گی گو نظرِ عقلی اس کی پوری پڑتال سے قاصر رہے۔

(تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۲۸)

طبعًا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسیح موعود کو اِس اُمّت میں پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں وعدہ فرمایا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ نبوّت کے اوّل اور آخر کے لحاظ سے حضرت موسیٰ سے مشابہ ہوں گے۔ پس وہ مشابہت ایک تو اوّل زمانہ میں تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تھا اور ایک آخری زمانہ میں۔ سو اوّل مشابہت یہ ثابت ہوئی کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا

[ا] سورۃ المائدہ: ۱۱۸

نے آخر کار فرعون اور اس کے لشکر پر فتح دی تھی اُسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر کار ابوجہل پر جو اس زمانہ کا فرعون تھا اور اس کے لشکر پر فتح دی اور اُن سب کو ہلاک کر کے اِسلام کو جزیرۂ عرب میں قائم کر دیا اور اس نصرتِ الٰہی سے یہ پیشگوئی پوری ہوئی کہ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۵ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا۔ اور آخری زمانہ میں یہ مشابہت ہے کہ خدا تعالیٰ نے ملّتِ موسوی کے آخری زمانہ میں ایک ایسا نبی مبعوث فرمایا جو جہاد کا مخالف تھا اور دینی لڑائیوں سے اُسے کچھ سروکار نہ تھا بلکہ عفو اور درگذر اس کی تعلیم تھی اور وہ ایسے وقت میں آیا تھا جب کہ بنی اسرائیل کی اخلاقی حالتیں بہت بگڑ چکی تھیں اور اُن کے چال چلن میں بہت فتور واقع ہو گیا تھا اور اُن کی سلطنت جاتی رہی تھی اور وہ رومی سلطنت کے ماتحت تھے اور وہ حضرت موسیٰ سے ٹھیک ٹھیک چودھویں صَدی پر ظاہر ہؤا تھا اور اسی پر سلسلہ اسرائیلی نبوت کا ختم ہو گیا تھا اور وہ اسرائیلی نبوّت کی آخری اینٹ تھی۔ ایسا ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ میں مسیح ابن مریم کے رنگ اور صفت میں اِس راقم کو مبعوث فرمایا اور میرے زمانہ میں رسمِ جہاد کو اُٹھا دیا جیسا کہ پہلے سے خبر دی گئی تھی کہ مسیح موعود کے زمانہ میں جہاد کو موقوف کر دیا جائے گا۔ اِسی طرح مجھے عفو اور درگذر کی تعلیم دی گئی اور مَیں ایسے وقت میں آیا جب کہ اندرونی حالت اکثر مسلمانوں کی یہودیوں کی طرح خراب ہو چکی تھی اور رُوحانیت گُم ہو کر صرف رسوم اور رسم پرستی اُن میں باقی رہ گئی تھی اور قرآن شریف میں ان امور کی طرف پہلے سے اشارہ کیا گیا تھا۔ (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۱۲ تا ۱۴)

جس طرح صدر زمانۂ اِسلام میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مثیلِ موسیٰ ہیں جیسا کہ آیت كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا سے ظاہر ہے ایسا ہی آخر زمانۂ اِسلام میں دونوں سلسلوں موسوی اور محمدی کا اوّل اور آخر میں تطابق پورا کرنے کے لئے مثیلِ عیسیٰ کی ضرورت تھی جس کی نسبت حدیثِ بخاری اِمَامُكُمْ مِنْكُمْ اور حدیثِ مسلم اَمَّكُمْ مِنْكُمْ وضاحت سے خبر دے رہی ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۸۳)

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک پہلو سے ..... پیشگوئی کی حقیقت ظاہر کی جائے۔ توریت میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایک ضروری پیشگوئی محض گول مول ہے کہ ایک نبی موسیٰ کی مانند بنی اسرائیل میں سے اُن کے بھائیوں میں سے آئے گا اور کہیں کھول کر نہ بتلایا کہ بنی اسمٰعیل میں سے آئے گا اور اس کا یہ نام اور اس کے باپ کا یہ نام ہوگا اور مکہ میں پَیدا ہوگا اور اِتنی مدّت بعد آئے گا اِس لئے یہود کو اِس پیشگوئی سے کچھ بھی فائدہ نہ ہؤا اور اس غلطی سے لاکھوں یہود جہنم میں جا پڑے حالانکہ قرآن شریف نے اُس پیشگوئی کی طرف اِس آیت میں اشارہ کیا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۵ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا اور یہود کہتے ہیں کہ مثیلِ موسیٰ یسوع ابن نون تھا جو موسیٰ کے فوت ہونے کے بعد اس کا جانشین ہؤا اور عیسائی کہتے ہیں کہ مثیلِ موسیٰ عیسیٰ ہے کیونکہ وہ بھی موسیٰ کی طرح نبی ہو کر آیا ہے۔ اب بتلاؤ کہ توریت کی ایسی پیشگوئی کا جس نے کوئی صاف فیصلہ نہ کیا کیا فائدہ ہؤا۔ جس نبی علیہ السلام

کی نسبت پیشگوئی تھی نہ یہود اس کو شناخت کر سکے نہ عیسائی اور دونوں گروہ سعادت سے محروم رہے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۸۸)

یہ امر کسی پر پوشیدہ نہیں کہ توریت میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پیشگوئی ہے وہ انہیں الفاظ میں ہے کہ "خدا تعالیٰ تمہارے بھائیوں میں سے موسیٰ کی مانند ایک نبی قائم کرے گا" اُس مقام میں یہ نہیں لکھا کہ خدا موسیٰ کو بھیجے گا پس ضرور تھا کہ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بارے میں توریت کے مطابق بیان فرماتا تا توریت اور قرآن شریف میں اختلاف پیدا نہ ہوتا پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا ۵ شَاهِدًا عَلَیْکُمْ کَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا یعنی ہم نے اسی نبی کی مانند تمہاری طرف یہ رسول بھیجا ہے کہ جو فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۲۹، ۲۳۰)

قرآن میں رسول اکرمؐ کو مثیلِ موسیٰؑ قرار دے کر فرمایا اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا ۵ شَاهِدًا عَلَیْکُمْ کَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ؕ" یعنی ہم نے ایک رسول بھیجا جیسے موسیٰؑ کو فرعون کی طرف بھیجا تھا۔ ہمارا رسول مثیلِ موسیٰؑ ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۳)

پہلی کتابوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ بنی اسمٰعیل میں بھی ایک سلسلہ اسی سلسلہ کا ہم رنگ پیدا ہوگا اور اس کے امام و پیشوا اور سردار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ توریت میں بھی یہ خبر دی گئی تھی۔ قرآن شریف نے بھی فرمایا کَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا جیسے توریت میں مانند کا لفظ تھا قرآن شریف میں کَمَا کا لفظ موجود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالاتفاق مثیلِ موسیٰؑ ہیں۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ را پریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۶)

قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مثیلِ موسیٰؑ فرمایا گیا ہے جیسے فرمایا اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا ۵ شَاهِدًا عَلَیْکُمْ کَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا۔ اور آپ مثیلِ موسیٰؑ استثناء کی پیشگوئی کے موافق بھی ہیں۔ پس اس مماثلت میں جیسے کَمَا کا لفظ فرمایا گیا ہے ویسے ہی سورۃ نور میں کَمَا کا لفظ ہے۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موسوی سلسلہ اور محمدی سلسلہ میں مشابہت اور مماثلت تامہ ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ رجنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

قرآن پر تدبّر کرنے والے کو معلوم ہوگا کہ دوسلسلوں کا مساوی ذکر ہے اوّل وہ سلسلہ جو موسیٰ علیہ السلام سے شروع ہو کر مسیح علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے دوسرا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہوتا ہے یہ اُس شخص پر ختم ہونا چاہیئے جو مثیلِ مسیح ہو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مثیلِ موسیٰؑ ہیں۔ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا ۵ شَاهِدًا عَلَیْکُمْ کَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ

اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ...... اور پھر سورۃ نور میں وعدۂ استخلاف فرمایا کہ جس طرح پر موسوی سلسلہ ہوا ہے اسی طرح پر محمدی سلسلہ بھی ہوگا تاکہ دونوں سلسلوں میں بموجب آیاتِ قرآنی باہم مطابقت اور موافقت ظاہر ہو چنانچہ جبکہ موسوی سلسلہ آخر عیسٰی علیہ السلام پر ختم ہوا ضروری تھا کہ محمدی سلسلہ کا خاتم بھی عیسٰی موعود ہو کیونکہ دونوں سلسلوں کا باہم تقابل مرایا متقابلہ کی طرح ہے یعنی جب دو شیشے ایک دوسرے کے بالمقابل رکھے جاتے ہیں تو ایک شیشہ کا دوسرے میں انعکاس ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

حضرت موسٰی علیہ السلام کا سلسلہ چودہ سو برس تک رکھا گیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کو نابود کرنا چاہا اور اس قوم کو ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ[1] کا مصداق بنا دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کر کے یہ کہا اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا یعنی یہ سلسلہ موسوی سلسلہ کے بالمقابل ہے اور یہ عمارت موسوی عمارت کے مقابلہ پر ہے جیسے اس میں اخیار ہیں ویسے ہی اس میں بھی اخیار ہیں ایسا ہی اشرار بھی بالمقابل پائے جاتے ہیں یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی یہودی نے ماں سے زنا کیا ہوگا تو تم میں سے بھی ایسے ہوں گے اور اگر کوئی سوسمار کے بل میں گھسا ہوگا تو مسلمان بھی گھسیں گے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ر فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴)

قرآن شریف نے بڑی وضاحت کے ساتھ دو سلسلوں کا ذکر کیا ہے ایک وہ سلسلہ ہے جو حضرت موسٰی علیہ السلام سے شروع ہوا اور حضرت مسیح علیہ السلام پر ختم ہوا اور دوسرا سلسلہ جو اس سلسلہ کے مقابل پر واقع ہوا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ ہے چنانچہ توراۃ میں بھی آپ کو مثیلِ موسٰی کہا گیا اور قرآن شریف میں بھی آپ کو مثیلِ موسٰی ٹھہرایا گیا جیسے فرمایا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا پھر جس طرح پر حضرت موسٰی علیہ السلام کا سلسلہ حضرت مسیح علیہ السلام پر آ کر ختم ہو گیا اس سلسلہ کی مماثلت کیلئے ضروری تھا کہ اسی وقت اور اسی زمانہ پر جب حضرت مسیح حضرت موسٰی کے بعد آئے تھے مسیح محمدی بھی آتا اور یہ بالکل ظاہر اور صاف بات ہے کہ مسیح موسوی چودھویں صدی میں آیا تھا اس لئے ضروری تھا کہ مسیح محمدی بھی چودھویں صدی میں آتا۔ اگر کوئی اور نشان اور شہادت نہ بھی ہوتی تب بھی اس سلسلہ کی تکمیل چاہتی تھی کہ اس وقت مسیح محمدی آوے مگر یہاں تو صدہا اور نشان اور دلائل ہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۲ مورخہ ۱۰ر اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

اللہ تعالیٰ نے دو سلسلے قائم کئے تھے۔ پہلا سلسلہ سلسلۂ موسوی تھا دوسرا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سورۃ البقرہ : ۶۲

کا سلسلہ یعنی محمدی سلسلہ۔ اور اس دوسرے سلسلہ کو مثیل ٹھہرایا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مثیلِ موسٰی کہا گیا تھا۔ توریت کی کتاب اِستثناء میں یہی لکھا تھا کہ تیرے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی اُٹھاؤں گا اور قرآن شریف میں یہ فرمایا اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا یعنی بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا جو تم پر شاہد ہے۔ اسی طرح یہ رسول بھیجا گیا ہے جس طرح فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا گیا تھا (یعنی موسٰی کی طرح) اَب غور کرو کہ اس میں كَمَا کا لفظ صاف طور پر دلالت کرتا ہے کہ اس سلسلہ میں بھی کمالات و برکات کی کمی نہ ہوگی۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

۱۸ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَا ۝ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ ۭ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ۝

یہ ایک اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیشگوئی تھی کہ جس طرح سے پہلے سلسلہ کا آغاز ہوا ویسے ہی اس سلسلہ کا آغاز ہوگا۔ یعنی جس طرح موسٰی نے ابتداء میں جلالی نشان دکھلائے اور فرعون سے چھڑایا اسی طرح آنے والا نبی بھی موسٰیؑ کی طرح ہوگا۔ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَا ۝ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ۝ یعنی جس طرح ہم نے موسٰی کو بھیجا تھا۔ سو رسول اکرمؐ کے وقت کفارِ عرب بھی فرعونیت سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ بھی فرعون کی طرح باز نہ آئے جب تک انہوں نے جلالی نشان نہ دیکھ لیا۔ سو آنحضرتؐ کے کام موسٰی کے کام کے سے تھے۔ اُس موسٰی کے کام قابلِ پذیرائی نہ تھے لیکن قرآن نے منوایا۔ موسٰیؑ کے زمانہ میں گو فرعون کے ہاتھ سے نجات اسرائیل کو ملی لیکن گناہوں سے نجات نہ پائی۔ وہ لڑے اور کج دِل ہوئے اور موسٰیؑ پر حملہ آور ہوئے لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری پوری نجات دی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر طاقت شوکت اِسلام کو نہ دیتے تو مسلمان مظلوم رہتے اور نجات کفار کے ہاتھ سے نہ پاتے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ایک تو یہ نجات دی کہ مستقل اسلامی سلطنت قائم ہوگئی دوسرا یہ کہ گناہوں سے اُن کو نجات ملی۔ خداوند تعالیٰ نے خود ہر دو نقشے کھینچے ہیں کہ عرب پہلے کیا تھے اور پھر کیا ہوئے۔ اگر دونو نقشے اکٹھے کئے جاویں تو اُن کی پہلی حالت کا اندازہ لگ جاوے گا۔ سو اللہ تعالیٰ نے دونو نجاتیں دیں۔ شیطان سے بھی نجات دی اور طاغوت سے بھی۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۳)

سُوْرَۃُ الْمُدَّثِّر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۝

بیان: يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ۝

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۝

انبیاء کی طبیعت اسی طرح واقع ہوتی ہے کہ وہ شہرت کی خواہش نہیں کیا کرتے۔ کسی نبی نے کبھی شہرت کی خواہش نہیں کی۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی خلوت اور تنہائی کو ہی پسند کرتے تھے۔ آپؐ عبادت کرنے کے لئے لوگوں سے دُور تنہائی کی غار میں جو غارِ حرا تھی چلے جاتے تھے۔ یہ غار اِس قدر خوفناک تھی کہ کوئی انسان اس میں جانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ آپؐ نے اس کو اِس لئے پسند کیا ہُوا تھا کہ وہاں کوئی ڈر کے مارے نہیں پہنچے گا۔ آپؐ بالکل تنہائی کو چاہتے تھے۔ شہرت کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے مگر خدا کا حکم ہُوا يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ۔ اِس حکم میں ایک جبر معلوم ہوتا ہے اور اِسی لئے جبر سے حکم دیا گیا کہ آپ تنہائی کو جو آپ کو بہت پسند تھی اب چھوڑ دیں۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ نمبر ۶ صفحہ ۲۰۸

البدر جلد ۳ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۳، ۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک اور کامیاب زندگی کی تصویر یہ ہے کہ آپ ایک کام کے لئے آئے اور اُسے پورا کر کے اس وقت دُنیا سے رخصت ہوئے جس طرح بندوبست والے کاغذات پانچ برس میں مرتّب کر کے آخری رپورٹ کرتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں اسی طرح پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ اُس دن سے لے کر جب قُمْ فَاَنْذِرْ کی آواز آئی۔ پھر اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ[1] اور اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ[2] کے

[1] سورۃ النصر: ۲ [2] سورۃ المائدہ: ۴

دن تک نظر کریں تو آپؐ کی لانظیر کامیابی کا پتہ ملتا ہے۔ اِن آیات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ خاص طور پر مامور تھے۔ حضرت موسیٰؑ کو اپنی زندگی میں کامیابی نصیب نہ ہوئی جو اُن کی رسالت کا منتہا تھی اور ارضِ مقدس اور موعود سرزمین کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ سکے بلکہ راہ ہی میں فوت ہوگئے۔ کافر کب مان سکتا ہے اور ایک بے ایمان آدمی راہ میں فوت ہوجانے اور وعدہ کی زمین میں نہ پہنچ سکنے کی وجوہات کب سُننے لگا۔ وہ تو یہی کہے گا کہ اگر مامور تھے تو وہ وعدے زندگی میں کیوں پورے نہ ہوئے۔ سچی بات یہی ہے کہ سب نبیوں کی نبوت کی پردہ پوشی ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہوئی۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

قُمْ فَاَنْذِرْ۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ۔ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ۔ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔

دریں اشارت است کہ بر دست او بتان مقہور خواہند شد و جلال و عظمتِ الٰہی ظاہر خواہد شد۔ و از پلیدی ہا جُدا باش۔ ایں اشارت است کہ سُوئے اینکہ از ہر قسم پلیدی دُور باید ماند و نیز سُوئے ایں اشارت است کہ خدا ارادہ فرمودہ است کہ از صحبت مُشرکاں کہ نجس اند ترا جُدا کند و شرک را از زمین مکّہ بردارد۔ و جامہ ہائے خود را و دل خود را پاک کُن (ثوب بمعنی دل نیز آمدہ) ایں اشارت است سُوئے اینکہ خدا ارادہ فرمودہ است کہ دلہا را از ہر قسم شرک و ظلم و التفات الٰی ماسوی اللہ پاک کند۔ و نیز ایں ہم دریں آیت ہا اشارہ می کنند کہ ایں شریعت بریں ہمہ اجزاء مشتمل است۔

(لُجّۃ النور صفحہ ۵۲، ۵۳)

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ۔ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ اپنے کپڑے صاف رکھو۔ بدن کو اور گھر کو اور کُوچہ کو اور ہر ایک جگہ کو جہاں تمہاری نشست ہو پلیدی اور مَیل کچیل اور کثافت سے بچاؤ یعنی غُسل کرتے رہو اور گھروں کو صاف رکھنے کی عادت پکڑو۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۲۳)

(ترجمہ از مرتب) اِن آیات میں اشارہ ہے کہ آپؐ کے ہاتھ پر بُت مقہور ہوں گے اور جلال اور عظمتِ الٰہی ظاہر ہوگی اور آپ پلیدی سے الگ ہوجائیں۔ اِس میں اِس طرف اشارہ ہے کہ اِس طرف آنے کے لئے ہر قسم کی پلیدی دُور ہونی چاہیئے۔ نیز اِس طرف اشارہ ہے کہ خدا نے ارادہ فرمایا ہے مُشرکوں کی مجلس سے کہ جو ناپاک ہیں تجھے الگ کر دیں گے اور مکّہ کی سرزمین سے شرک مٹا دیا جائے گا اور اپنے لباس اور دِل کو پاک کر (ثوب کے معنے دل کے بھی ہیں) میں یہ اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ دلوں کو ہر قسم کے شرک ظلم اور غیر اللہ کی طرف متوجّہ ہونے سے پاک کر دیا جائے گا نیز ان آیات میں اِس طرف اشارہ ہے کہ یہ شریعت اِن تمام اجزاء پر مشتمل ہے۔

(لُجّۃ النور صفحہ ۵۲، ۵۳)

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ہر ایک قسم کی پلیدی سے پرہیز کرو۔ ہجر دُور جانے کو کہتے ہیں۔ اِس سے یہ معلوم ہُوا کہ روحانی پاکیزگی چاہنے والوں کے لئے ظاہری پاکیزگی اور صفائی بھی ضروری ہے کیونکہ ایک قوّت کا اثر دوسری پر اور ایک پہلو کا اثر دوسرے پر ہوتا ہے۔ دو حالتیں ہیں جو باطنی حالت تقویٰ اور طہارت پر قائم ہونا چاہتے ہیں وہ ظاہری پاکیزگی بھی چاہتے ہیں ..... پس یاد رکھو کہ ظاہری پاکیزگی اندرونی طہارت کو مُستلزم ہے اِس لئے لازم ہے ..... کہ کم ازکم جمعہ کو غسل کرو۔ ہر نماز میں وضو کرو۔ جماعت کھڑی کرو تو خوشبو لگالو۔ عیدین میں اور جمعہ میں خوشبو لگانے کا جو حکم ہے وہ اسی بناء پر قائم ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ اجتماع کے وقت عفونت کا اندیشہ ہے۔ پس غسل کرنے اور صاف کپڑے پہننے اور خوشبو لگانے سے سمیّت اور عفونت سے روک ہوگی۔

(رسالہ الانذار صفحہ ۶۰، ۶۱)

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ یعنی "ہر ایک پلیدی سے جُدا رہ" یہ احکام اِسی لئے ہیں کہ تا انسان حفظانِ صحت کے اسباب کی رعایت رکھ کر اپنے تئیں جسمانی بلاؤں سے بچاوے۔ عیسائیوں کا یہ اعتراض ہے کہ یہ کیسے احکام ہیں جو ہمیں سمجھ نہیں آتے کہ قرآن کہتا ہے کہ تم غسل کر کے اپنے بدنوں کو پاک رکھو اور مسواک کرو۔ خلال کرو۔ اور ہر ایک جسمانی پلیدی سے اپنے تئیں اور اپنے گھر کو بچاؤ اور بدبوؤں سے دُور رہو اور مُردار اور گندی چیزوں کو مت کھاؤ اِس کا جواب یہی ہے کہ قرآن نے اس زمانہ میں عرب کے لوگوں کو ایسا ہی پایا تھا اور وہ لوگ نہ صرف روحانی پہلو کے رُو سے خطرناک حالت میں تھے بلکہ جسمانی پہلو کے رُو سے بھی اُن کی صحت خطرہ میں تھی۔ سو یہ خدا تعالیٰ کا اُن پر اور تمام دُنیا پر احسان تھا کہ حفظانِ صحت کے قواعد مقرر فرمائے یہاں تک کہ یہ بھی فرما دیا کہ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا[1] یعنی بے شک کھاؤ پیو مگر کھانے پینے میں بے جا طور پر کوئی زیادت کیفیّت یا کمیّت کی مت کرو.... افسوس پادری اِس بات کو نہیں جانتے کہ جو شخص جسمانی پاکیزگی کی رعایت کو بالکل چھوڑ دیتا ہے وہ رفتہ رفتہ وحشیانہ حالت میں گِر کر روحانی پاکیزگی سے بھی بے نصیب رہ جاتا ہے۔ مثلاً چند روز دانتوں کا خلال کرنا چھوڑ دو جو ایک ادنیٰ صفائی کے درجہ پر ہے تو وہ فضلات جو دانتوں میں پھنسے رہیں گے اُن میں سے مُردار کی بُو آئے گی۔ آخر دانت خراب ہو جائیں گے اور اُن کا زہریلا اثر معدہ پر گر کر معدہ بھی فاسد ہو جائے گا۔ خود غور کر کے دیکھو کہ جب دانتوں کے اندر کسی بوٹی کا رگ و ریشہ یا کوئی جُز پھنسا رہ جاتا ہے اور اُسی وقت خلال کے ساتھ نکالا نہیں جاتا تو ایک رات بھی اگر رہ جائے تو سخت بدبُو اُس میں پیدا ہو جاتی ہے اور ایسی بدبو آتی ہے جیسا کہ چُوہا مرا ہُوا ہوتا ہے۔ پس یہ کیسی نادانی ہے کہ ظاہری اور جسمانی پاکیزگی پر اعتراض کیا جائے اور یہ تعلیم دی جائے کہ تم جسمانی پاکیزگی کی کچھ

---

[1] سورۃ الاعراف : ۳۲

پرواہ نہ رکھو۔ نہ خلال کرو اور نہ مسواک کرو اور نہ کبھی غسل کر کے بدن پر سے مَیل اُتارو اور نہ پاخانہ پھر کر طہارت کرو اور تمہارے لئے صرف روحانی پاکیزگی کافی ہے۔ ہمارے ہی تجارب ہمیں بتلا رہے ہیں کہ ہمیں جیسا کہ روحانی پاکیزگی کی روحانی صحت کے لئے ضرورت ہے ایسا ہی ہمیں جسمانی صحت کے لئے جسمانی پاکیزگی کی ضرورت ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری جسمانی پاکیزگی کو ہماری روحانی پاکیزگی میں بہت کچھ دخل ہے کیونکہ جب ہم جسمانی پاکیزگی کو چھوڑ کر اُس کے بدنتائج یعنی خطرناک بیماریوں کو بھگتنے لگتے ہیں تو اُس وقت ہمارے دینی فرائض میں بھی بہت حرج ہوجاتا ہے اور ہم بیمار ہو کر ایسے نکمے ہوجاتے ہیں کہ کوئی خدمت دینی بجا نہیں لاسکتے اور یا چند روز دُکھ اُٹھا کر اس دُنیا سے کُوچ کر جاتے ہیں بلکہ بجائے اس کے کہ بنی نوع کی خدمت کر سکیں اپنی جسمانی ناپاکیوں اور ترک قواعدِ حفظانِ صحت سے اَوروں کے لئے وبالِ جان ہوجاتے ہیں اور آخر ان ناپاکیوں کا ذخیرہ جس کو ہم اپنے ہاتھ سے اکٹھا کرتے ہیں وبائی صورت میں مشتعل ہو کر تمام ملک کو کھاتا ہے اور اس تمام مصیبت کا موجب ہم ہی ہوتے ہیں کیونکہ ہم ظاہری پاکی کے اصولوں کی رعایت نہیں رکھتے۔ پس دیکھو کہ قرآنی اصولوں کو چھوڑ کر اور فرقانی وصایا کو ترک کر کے کیا کچھ بلائیں انسانوں پر وارد ہوتی ہیں۔ اور ایسے بے احتیاط لوگ جو نجاستوں سے پرہیز نہیں کرتے اور عفونتوں کو اپنے گھروں اور کُوچوں اور کپڑوں اور مُونہہ سے دُور نہیں کرتے اُن کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے نوعِ انسان کے لئے کیسے خطرناک نتیجے پَیدا ہوتے ہیں اور کیسی یک دفعہ وبائیں پھُوٹتی اور موتیں پَیدا ہوتی ہیں اور شورِ قیامت برپا ہوجاتا ہے یہاں تک کہ لوگ مرض کی دہشت سے اپنے گھروں اور مال اور املاک اور تمام اس جائیداد سے جو جان کاہی سے اکٹھی کی تھی دست بردار ہو کر دوسرے ملکوں کی طرف دوڑتے ہیں اور مائیں بچّوں سے اور بچے ماؤں سے جُدا کئے جاتے ہیں۔ کیا یہ مصیبت جہنّم کی آگ سے کچھ کم ہے؟ ڈاکٹروں سے پوچھو اور طبیبوں سے دریافت کرو کہ کیا ایسی لاپروائی جو جسمانی طہارت کی نسبت عمل میں لائی جائے وباء کے لئے عین موزوں اور مؤید ہے یا نہیں؟ پس قرآن نے کیا بُرا کیا کہ پہلے جسموں اور گھروں اور کپڑوں کی صفائی پر زور دے کر انسانوں کو اس جہنّم سے بچانا چاہا جو اِسی دُنیا میں یک دفعہ فالج کی طرح گرتا اور عدم تک پہنچاتا ہے۔

(ایّام الصّلح صفحہ ۹۵، ۹۶)

قرآن شریف میں صاف ہے وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ اِس لئے ضروری ہے کہ صفائی کا اِلتزام رکھا جاوے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

قرآن شریف میں آیا ہے وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ پس پاک صاف رہنا ضروری ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۶)

صفائی کا رکھنا تو سُنّت ہے۔ قرآن شریف میں بھی لکھا ہے وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ (البدر جلد اوّل نمبر ۹ مورخہ ۲۶ر دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶۶)

کنوئیں کو پاک کرنے کے متعلق فرمایا۔

مَیں تمہیں ایک اصل بتا دیتا ہوں کہ قرآن مجید میں آیا ہے وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ پس جب پانی کی حالت اس قسم کی ہو جائے جس سے صحت کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو تو صاف کر لینا چاہیئے۔ مثلاً پتّے پڑ جاویں یا کیڑے وغیرہ (حالانکہ اس پر یہ مُلّاں وغیرہ نجس ہونے کا فتویٰ نہیں دیتے) باقی یہ کوئی مقدار مقرر نہیں جب تک رنگ و بُو و مزا نجاست سے نہ بدلے وہ پانی پاک ہے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۳۱ مورخہ یکم اگست ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

۳۲ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۪ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝

وَاَعْتَقِدُ اَنَّ لِلّٰهِ مَلَائِكَةً مُقَرَّبِيْنَ۔ لِكُلٍّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ مَقَامٌ مَعْلُوْمٌ۔ لَا يَنْزِلُ اَحَدٌ مِّنْ مَقَامِهٖ وَلَا يَرْقٰى۔ وَنُزُوْلُهُمُ الَّذِيْ قَدْ جَاءَ فِي الْقُرْاٰنِ لَيْسَ كَنُزُوْلِ الْاِنْسَانِ مِنَ الْاَعْلٰى اِلَى الْاَسْفَلِ وَلَا صُعُوْدُهُمْ كَصُعُوْدِ النَّاسِ مِنَ الْاَسْفَلِ اِلَى الْاَعْلٰى۔ لِاَنَّ فِيْ نُزُوْلِ الْاِنْسَانِ تَحَوُّلًا مِنَ الْمَكَانِ وَرَايِحَةً مِنْ شِقٍّ

ترجمہ از مرتب :۔ مَیں اعتقاد رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے لئے ایک معلوم مقام ہے۔ ان میں سے نہ کوئی اپنے مقام سے نیچے اُترتا ہے اور نہ اُوپر چڑھتا ہے اور ان کے جس نزول کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے وہ انسان کے نزول کی طرح اُوپر سے نیچے اُترنا نہیں اور نہ ان کا چڑھنا انسانوں کی طرح نیچے سے اُوپر چڑھنا ہے کیونکہ انسان کا نزول اپنی جگہ سے ہٹ جانے کا نام ہے اور تھکن وغیرہ سے راحت حاصل کرنا ہے اور فرشتوں کو

الْاَنْفُسِ وَالْقُلُوْبِ وَلَا يَمَسُّهُمْ لَغَبٌ وَلَا شِقٌّ وَلَا يَتَطَرَّقُ اِلَيْهِمْ تَغَيُّرٌ فَلَا تَقِيْسُوْا نُزُوْلَهُمْ وَصُعُوْدَهُمْ بِاَشْيَاءَ اُخْرٰى۔ بَلْ نُزُوْلُهُمْ وَصُعُوْدُهُمْ بِصِبْغِ نُزُوْلِ اللّٰهِ وَصُعُوْدِهٖ مِنَ الْعَرْشِ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا۔ لِاَنَّ اللّٰهَ اَدْخَلَ وُجُوْدَهُمْ فِي الْاِيْمَانِيَّاتِ وَقَالَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ۔ فَاٰمِنُوْا بِنُزُوْلِهِمْ وَ صُعُوْدِهِمْ لَا تَدْخُلُوْا فِيْ كُنْهِهِمَا۔ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ وَقَدْ وَصَفَهُمُ اللّٰهُ بِالْقَائِمِيْنَ وَالسَّاجِدِيْنَ وَ الصَّافِّيْنَ وَ الْمُسَبِّحِيْنَ وَالثَّابِتِيْنَ فِيْ مَقَامَاتٍ مَعْلُوْمَةٍ وَجَعَلَ هٰذِهِ الصِّفَاتِ لَهُمْ دَائِمَةً غَيْرَ مُنْفَكَّةٍ وَخَصَّهُمْ بِهَا۔ فَكَيْفَ يَجُوْزُ اَنْ يَتْرُكَ الْمَلَائِكَةُ سُجُوْدَهُمْ وَقِيَامَهُمْ وَيَقْصُوْا صُفُوْفَهُمْ وَيَذَرُوْا تَسْبِيْحَهُمْ وَ تَقْدِيْسَهُمْ وَيَتَنَزَّلُوْا مِنْ مَقَامَاتِهِمْ وَيَهْبِطُوا الْاَرْضَ وَ يُخْلُوا السَّمٰوٰتِ الْعُلٰى۔ بَلْ هُمْ يَتَحَرَّكُوْنَ حَالَ كَوْنِهِمْ مُسْتَقِرِّيْنَ فِيْ مَقَامَاتِهِمْ كَالْمَلِكِ الَّذِيْ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى۔ وَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَنْزِلُ اِلَى السَّمَاءِ فِيْ اٰخِرِ كُلِّ لَيْلٍ وَلَا يُقَالُ اِنَّهٗ يَتْرُكُ الْعَرْشَ ثُمَّ يَصْعَدُ اِلَيْهِ فِيْ اَوْقَاتٍ اُخْرٰى۔ فَكَذٰلِكَ الْمَلَائِكَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا فِيْ صِبْغَةِ صِفَاتِ رَبِّهِمْ كَمِثْلِ

نہ تو تھکن اور مشقت لاحق ہوتی ہے اور نہ اُن پر کوئی تغیر آتا ہے۔ پس تم ان کے نزول اور صعود کو دوسری چیزوں پر قیاس نہ کرو بلکہ ان کا نزول اور صعود اللہ تعالیٰ کے نزول اور سماء الدّنیا سے عرش کی طرف صعود کرنے کا رنگ رکھتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے وجود کو ایمانیات میں داخل فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے کہ اللہ کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پس تم فرشتوں کے نزول اور صعود پر ایمان لاؤ لیکن اس کی کُنہ میں نہ جاؤ یہ بات بہتر اور تقوٰی کے زیادہ قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی تعریف یُوں بیان کی ہے کہ وہ قائم ہیں۔ ساجد ہیں۔ صف بستہ ہیں۔ نیز تسبیح کرنے والے ہیں اور اپنے معلوم مقامات میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور ان کی ان صفات کو انکے ساتھ دائمی اور غیر منفک قرار دیا ہے اور ان کے وجود کو ان صفات کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے۔ پس یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ فرشتے اپنے سجود اور قیام کو ترک کردیں اور اپنی صفوں کو توڑ دیں اور اپنی تسبیح اور تقدیس کو چھوڑ دیں اور اپنے مقامات سے تنزّل اختیار کریں اور زمین پر اُتر آئیں اور بلند آسمانوں کو خالی کردیں۔ بلکہ ان کی حرکت اس صورت میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقامات پر اس بادشاہ کی طرح قائم رہتے ہیں جو اپنے عرش پر قرار فرما ہو۔ پھر تم کو یہ بات بھی معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کے آخری حصّہ میں آسمان سے نزول فرماتا ہے اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عرش کو چھوڑ دیتا ہے۔ پھر دوسرے اوقات میں اس کی طرف صعود فرماتا ہے۔ اسی طرح ملائکہ کا حال ہے جو اپنے خدا کی صفات میں اسی طرح رنگین ہیں

اِنْصِبَاغِ الظِّلِّ بِصِبْغَةِ اَصْلِهٖ لَانَعْرِفُ حَقِيْقَتَهَا وَنُؤْمِنُ بِهَا۔ كَيْفَ نُشَبِّهُ اَحْوَالَهُمْ بِاَحْوَالِ اِنْسَانٍ نَعْرِفُ حَقِيْقَةَ صِفَاتِهٖ وَحُدُوْدَ خَوَاصِّهٖ وَسَكَنَاتِهٖ وَحَرَكَاتِهٖ وَقَدْ مَنَعَنَا اللّٰهُ مِنْ هٰذَا وَقَالَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يَا اَرْبَابَ النُّهٰى۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۳۸۴ تا ۳۸۷)

جس طرح سایہ اپنے اصل کا رنگ رکھتا ہے۔ہم اس کی حقیقت کو نہیں جانتے لیکن اس پر ایمان رکھتے ہیں۔پھر ہم ان کے حالات کو کس طرح ایسے انسان کے حالات سے مشابہ قرار دے سکتے ہیں جس کی صفات کی حقیقت کو ہم جانتے ہیں۔اس کی خاصیتوں کی حدود۔سکنات اور حرکات کو جانتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں فرشتوں کی حقیقت میں جانے سے منع فرمایا ہے اور کہا ہے مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ کہ اللہ کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔پس اے عقلمندو! اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۳۸۴ تا ۳۸۷)

سُورَةُ الْقِيٰمَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

۳۔ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ۝

اخلاقی حالتوں کے سرچشمہ کا نام قرآن شریف میں نفس لوامہ ہے جیساکہ قرآن شریف میں فرماتا ہے وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ یعنی میں اس نفس کی قسم کھاتا ہوں جو بدی کے کام اور ہر ایک بے اعتدالی پر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے۔ یہ نفس لوامہ انسانی حالتوں کا دوسرا سرچشمہ ہے جس سے اخلاقی حالتیں پیدا ہوتی ہیں اور اس مرتبہ پر انسان دوسرے حیوانات کی مشابہت سے نجات پاتا ہے اور اِس جگہ نفس لوامہ کی قسم کھانا اس کو عزت دینے کے لئے ہے گویا وہ نفس امارہ سے نفس لوامہ بن کر بوجہ اس ترقی کے جناب الٰہی میں عزت پانے کے لائق ہو گیا اور اس کا نام لوامہ اِس لئے رکھا کہ وہ انسان کو بدی پر ملامت کرتا ہے اور اِس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ انسان اپنے طبعی لوازم میں شُترِ بے مہار کی طرح چلے اور چارپایوں کی زندگی بسر کرے بلکہ یہ چاہتا ہے کہ اس سے اچھی حالتیں اور اچھے اخلاق صادر ہوں اور انسانی زندگی کے تمام لوازم میں کوئی بے اعتدالی ظہور میں نہ آوے اور طبعی جذبات اور طبعی خواہشیں عقل کے مشورہ سے ظہور پذیر ہوں۔ پس چونکہ وہ بُری حرکت پر ملامت کرتا ہے اِس لئے اس کا نام نفس لوامہ ہے یعنی بہت ملامت کرنے والا۔ اور نفس لوامہ اگرچہ طبعی جذبات پسند نہیں کرتا بلکہ اپنے تئیں ملامت کرتا رہتا ہے لیکن نیکیوں کے بجالانے پر پُورے طور سے قادر بھی نہیں ہوسکتا اور کبھی نہ کبھی طبعی جذبات اس پر غلبہ کرجاتے ہیں تب گر جاتا ہے اور ٹھوکر کھاتا ہے گویا وہ ایک کمزور بچہ کی طرح ہوتا ہے جو گرنا نہیں چاہتا ہے مگر کمزوری کی وجہ سے گرتا ہے اور پھر اپنی کمزوری پر نادم ہوتا ہے۔ غرض یہ نفس کی وہ اخلاقی حالت ہے جب نفس اخلاقِ فاضلہ کو اپنے اندر جمع کرتا اور سرکشی سے بیزار ہوتا ہے مگر پورے طور پر غالب نہیں آسکتا۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۳،۴)

حقیقی طور پر نیک یا بد اخلاق کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے کہ جب انسان کی عقل خداداد پختہ ہو کر اس کے ذریعہ سے نیکی اور بدی یا دو بدیوں یا دو نیکیوں کے درجہ میں فرق کر سکے۔ پھر اچھے راہ کے ترک کرنے سے اپنے دل میں ایک حسرت پاوے اور بُرے کام کے ارتکاب سے اپنے تئیں متندم اور پشیمان دیکھے اور یہ انسان کی زندگی کا دوسرا زمانہ ہے جس کو خدا کے پاک کلام قرآن شریف میں نفسِ لوّامہ کے نام سے تعبیر کیا ہے مگر یاد رہے کہ ایک وحشی کو نفسِ لوّامہ کی حد تک پہنچانے کے لئے صرف سرسری نصائح کافی نہیں ہوتیں بلکہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کو خداشناسی سے اس قدر حصہ ملے جس سے وہ اپنی پیدائش بیہودہ اور لغو خیال نہ کرے تا معرفتِ الٰہی سے سچے اخلاق اس میں پیدا ہوں۔ اِسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے ساتھ ساتھ سچے خدا کی معرفت کے لئے توجہ دلائی ہے اور یقین دلایا ہے کہ ہر ایک عمل اور خُلق ایک نتیجہ رکھتا ہے جو اس کی زندگی میں روحانی راحت یا روحانی عذاب کا موجب ہوتا ہے اور دوسری زندگی میں کُھلے کُھلے طور پر اپنا اثر دکھلائیگا غرض نفسِ لوّامہ کے درجہ پر انسان کو عقل اور معرفت اور پاک کانشنس سے اِس قدر حصہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ بُرے کام پر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے اور نیک کا خواہشمند اور حریص رہتا ہے۔ یہ وہ درجہ ہے کہ جس میں انسان اخلاقِ فاضلہ حاصل کرتا ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۷، ۱۸)

مَیں اُس نفس کی قسم کھاتا ہوں جو بَدی کے کاموں اور نیز ہر ایک طرح کی بے اعتدالی پر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے۔ ایسے شخص سے اگر کوئی بدی ظہور میں آجاتی ہے تو پھر وہ جلدی متنبہ ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو اس بُری حرکت پر ملامت کرتا ہے اور اِسی لئے اس کا نام نفسِ لوّامہ رکھا ہے یعنی بہت ملامت کرنے والا جو شخص اس نفس کے تابع ہوتا ہے وہ نیکیوں کے بجالانے پر پورے طور پر قادر نہیں ہوتا اور طبعی جذبات اس پر کبھی کبھی غالب آجاتے ہیں لیکن وہ اس حالت سے نکلنا چاہتا ہے اور اپنی کمزوری پر نادم ہوتا رہتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ ۴؎ مورخہ ۱۴؍جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

لوّامہ کہتے ہیں ملامت کرنے والے کو۔ انسان سے ایک وقت بَدی ہو جاتی ہے مگر ساتھ ہی اس کا نفس اس کو بَدی کی وجہ سے ملامت بھی کرتا اور نادم ہوتا ہے۔ یہ انسانی فطرت میں رکھا گیا ہے مگر بعض طبائع ایسے بھی ہیں کہ اپنی گندہ حالت اور سیاہ کاریوں کی وجہ سے وہ ایسے محجوب ہو جاتے ہیں کہ ان کی فطرت فطرتِ سلیم کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔ ان کو اس ملامت کا احساس ہی نہیں ہوتا مگر شریف الطبع انسان ضرور اس حالت کا اِحساس کرتا اور بعض اَوقات وہی ملامتِ نفس اس کے واسطے باعثِ ہدایت ہو کر موجبِ نجات ہو جاتی ہے مگر یہ حالت ایسی نہیں کہ اس پر اعتبار کیا جاوے۔

(الحکم جلد ۱۲ ۴۱؎ مورخہ ۱۴؍جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

حَجَجُ الکرامہ یَسْئَلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ ؕ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ ۚ كَلَّا لَا وَزَرَ ؕ اِلٰى رَبِّكَ یَوْمَئِذِ ۣ الْمُسْتَقَرُّ ؕ

فَاعْلَمُوْا یَا اَھْلَ الْاِسْلَامِ وَ اَتْبَاعَ خَیْرِ الْاَنَامِ اَنَّ الْاٰیَۃَ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ الْعَلَّامِ وَتُبَشَّرُوْنَ مِنْ سَیِّدِ الرُّسُلِ نُوْرِ اللّٰہِ مُزِیْلِ الظَّلَامِ اَعْنِیْ خُسُوْفَ النَّیِّرَیْنِ فِیْ شَھْرِ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ قَدْ ظَھَرَ فِیْ بِلَادِنَا بِفَضْلِ اللّٰہِ الْمَنَّانِ وَ قَدِ انْخَسَفَ الْقَمَرُ وَالشَّمْسُ وَظَھَرَتِ الْاٰیَتَانِ فَاشْکُرُوا اللّٰہَ وَخَرُّوْا لَہٗ سَاجِدِیْنَ۔

وَاِنَّکُمْ قَدْ عَرَفْتُمْ اَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَدْ اَخْبَرَ عَنْ ھٰذَا النَّبَاءِ الْعَظِیْمِ فِیْ کِتَابِہِ الْکَرِیْمِ وَ قَالَ لِلتَّعْلِیْمِ وَالتَّفْھِیْمِ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ فَتَفَکَّرُوْا فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ بِقَلْبٍ اَسْلَمَ وَاَطْھَرَ۔ فَاِنَّہٗ مِنْ اٰثَارِ الْقِیَامَۃِ لَا مِنْ اَخْبَارِ الْقِیٰمَۃِ

ترجمہ از اصل:۔ پس اے اہلِ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے والو تمہیں معلوم ہو کہ وہ نشان جس کا قرآن کریم میں تم وعدہ دیئے گئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سیّد الرسل اور اندھیرے کو روشن کرنے والا ہے تمہیں بشارت ملی تھی یعنی رمضان شریف میں آفتاب اور چاند گرہن ہونا وہ رمضان جس میں قرآن نازل ہوا وہ نشان ہمارے ملک میں بفضل اللہ تعالیٰ ظاہر ہو گیا اور چاند اور سورج کا گرہن ہوا اور دو نشان ظاہر ہوئے۔ پس خدا تعالیٰ کا شکر کرو اور اُس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے گرو۔

اور تمہیں معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ نے اِس واقعہ عظیمہ کے بارے میں اپنی کتاب کریم میں خبر دی ہے اور سمجھانے اور جتلانے کے لئے فرمایا ہے۔ پس جس وقت آنکھیں پتھرا جائیں گی اور چاند گرہن ہوگا اور سورج اور چاند اکٹھے کئے جائیں گے یعنی سورج کو بھی گرہن لگے گا تب اُس روز انسان کہے گا کہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے۔ سو اِس نشان میں ایک سلیم اور پاک دِل کے ساتھ فِکر کرو کیونکہ یہ خبر قیامت کے آثار میں سے ہے قیامت کے واقعات میں سے نہیں ہوسکتی جیسا کہ عقلمندوں کے

كَمَا هُوَ اَجْلٰى وَاَظْهَرُ عِنْدَ الْعَاقِلِيْنَ۔ فَاِنَّ الْقِيٰمَةَ عِبَارَةٌ عَنْ فَسَادِ نِظَامِ هٰذَا الْعَالَمِ الْاَصْغَرِ وَخَلْقِ
الْعَالَمِ الْاَكْبَرِ فَكَيْفَ يَقَعُ فِیْ حَالَةِ الْفَكِّ الْخُسُوْفُ الَّذِیْ تَعْرِفُوْنَ بِالْيَقِيْنِ لَا بِالشَّكِّ عِلَلَهٗ وَ
اَسْبَابَهٗ وَتَفْهَمُوْنَ مَوَاقِعَهٗ وَاَبْوَابَهٗ وَكَيْفَ يَظْهَرُ اَمْرٌ لَازِمٌ لِلنِّظَامِ بَعْدَ فَكِّ النِّظَامِ وَالْفَسَادِ التَّامِ
فَاِنَّكُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ الْخُسُوْفَ وَالْكُسُوْفَ يَنْشَاٰنِ مِنْ اَشْكَالٍ نِظَامِيَّةٍ وَاَوْضَاعٍ مُقَرَّرَةٍ مُنْتَظِمَةٍ
عَلٰى اَوْقَاتٍ مُعَيَّنَةٍ وَاَيَّامٍ مَعْرُوْفَةٍ مُبَيَّنَةٍ فَكَيْفَ يُعْزٰى وُقُوْعُهَا اِلٰى سَاعَةٍ لَا اَنْسَابَ فِيْهَا وَلَا
اَسْبَابَ وَلَا نِظَامَ وَلَا اِحْكَامَ فَانْظُرُوْا اِنْ كُنْتُمْ نَاظِرِيْنَ۔ ثُمَّ مِنْ لَوَازِمِ الْكُسُوْفِ وَالْخُسُوْفِ اَنْ
تَرْجِعَ الْقَمَرُ وَالشَّمْسُ اِلٰى وَضْعِهِمَا الْمَعْرُوْفِ وَيَعُوْدَ اِلٰى سِيْرَتِهِمَا الْاُوْلٰى وَفِیْ هُوِيَّتِهِمَا دَاخِلٌ
هٰذَا الْمَعْنٰى وَاَمَّا تَكْوِيْرُ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ فِیْ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَهِیَ حَقِيْقَةٌ اُخْرٰى وَلَا يُرَدُّ فِيْهِمَا نُوْرُهُمَا
اِلٰى حَالَةٍ اُوْلٰى بَلْ لَا يَكُوْنُ وُقُوْعُهٗ اِلَّا بَعْدَ فَكِّ النِّظَامِ وَالْفَسَادِ التَّامِ وَهَدْمِ هٰذَا الْمَقَامِ وَمَا سَمَّاهُ
اللّٰهُ خُسُوْفًا وَكُسُوْفًا بَلْ سَمَّاهُ تَكْوِيْرًا اَوْ كَشْطَ الْاَجْرَامِ كَمَا اَنْتُمْ تَقْرَءُوْنَ فِیْ كَلَامِ اللّٰهِ الْعَلَّامِ فَثَبَتَ

نزدیک نہایت صاف اور روشن ہے۔ وجہ یہ کہ قیامت اس حال سے مراد ہے جبکہ اس عالَمِ اصغر کا نظام توڑ دیا جائے اور ایک عالَمِ اکبر پیدا کیا جائے۔ پس کیونکر فکّ نظام کی حالت میں وہ خسوف کسوف ہو سکتا ہے جس کے علل اور اسباب تمہیں معلوم ہیں اور اس کے ظہور کے وقت اور ظہور کے دروازے تم نے سمجھے ہوئے ہیں اور وہ امر جو نظامِ عالَم کا ایک لازمہ ذاتی ہے کیونکر بعد فکّ نظام اور فکّ تام کے ظہور پذیر ہو کیونکہ تم جانتے ہو کہ خسوف اور کسوف اشکال نظامیہ سے پیدا ہوتے ہیں اور نیز ان کا پیدا ہونا اوضاع مقررہ منتظمہ پر موقوف ہے جو ان اَوقات معیّنہ اور مشہور دنوں پر موقوف ہے جو فنِ ہیئت میں بیان کئے گئے ہیں پس کیونکر اُن کو اُس گھڑی کی طرف منسوب کیا جائے جس میں نہ نسب ہیں نہ اسباب نہ نظام نہ ترتیب نہ محکم کرنا سو تم سوچو اگر کچھ سوچ سکتے ہو۔ پھر لوازم خسوف اور کسوف میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سُورج اور چاند اپنی اصلی وضع کی طرف رجوع کریں اور اپنی پہلی سیرت کی طرف عود کر آویں اور خسوف کسوف کی تعریف میں یہ بات داخل ہے کہ اپنی پہلی حالت کی طرف رجوع کریں مگر تکویر شمس و قمر جو قیامت میں ہوگی وہ اَور حقیقت ہے اور تکویر کے وقت نورِ شمس و قمر اپنی پہلی حالت کی طرف نہیں آئے گا بلکہ تکویر کا وقوع فکّ نظام اور فسادِ تام اور انہدامِ کُلّی کے وقت ہو گا اور اُس کا نام خدا تعالےٰ نے خسوف کسوف نہیں رکھا بلکہ اُس کا نام تکویر اور کشط رکھا ہے جیسا کہ تم خدا تعالےٰ کے کلام میں پڑھتے ہو۔ پس اُس کلام سے خواص

مِنْ هٰذَا الْكَلَامِ عِنْدَ الْخَوَاصِ وَالْعَوَامِ اَنَّ مَا ذُكِرَ مِنَ الْاٰيَةِ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ فَهُوَ يَتَعَلَّقُ بِالدُّنْيَا لَا بِالْاٰخِرَةِ وَعَزْوُهٗ اِلَى الْقِيٰمَةِ بِنَاءً عَلَى الرِّوَايَةِ خَطَأٌ فِي الدِّرَايَةِ بَلْ هُوَ خَبَرٌ مِنْ اَخْبَارِ اٰخِرِ الزَّمَانِ وَقُرْبِ السَّاعَةِ وَاقْتِرَابِ الْاَوَانِ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْمُتَدَبِّرِيْنَ۔ (نور الحق حصہ دوم صفحہ ۸۷)

وَقَدْ جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ كَمَا ذَكَرَ الْقُرْاٰنُ وَكُسِفَا فِيْ رَمَضَانَ كَشَقِّ الْقَمَرِ فِيْ زَمَنِ خَيْرِ الْوَرٰى۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۹۴)

اِنَّ عِيْسٰى كَانَ عِلْمًا لِّسَاعَةِ الْيَهُوْدِ وَاَنَا عِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ الَّتِيْ تُحْشَرُ النَّاسُ فِيْهَا وَتُجْلٰى كُلُّ نَفْسٍ لِّتُجْزٰى! وَقَدْ ظَهَرَ اَكْثَرُ عَلَامَاتِهَا وَذَكَرَهَا الْقُرْاٰنُ ذِكْرًا۔ وَعُطِّلَتِ الْعِشَارُ وَنُشِرَتِ الصُّحُفُ وَالْاَسْفَارُ وَجُمِعَ الْقَمَرُ وَالشَّمْسُ فِيْ رَمَضَانَ۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۲۱)

ثُمَّ اِذَا كَانَتْ حَقِيْقَةُ الْكُسُوْفِ بِالتَّعْرِيْفِ الْمَعْرُوْفِ اَنَّهٗ هَيْئَةٌ حَاصِلَةٌ مَا حَوْلَ الْقَمَرِ بَيْنَ الشَّمْسِ وَالْاَرْضِ فِيْ اَوَاخِرِ اَيَّامِ الشَّهْرِ فَكَيْفَ يُمْكِنُ اَنْ يَّتَكَلَّمَ اَفْصَحُ الْعَجَمِ وَالْعَرَبِ بِلَفْظٍ يُخَالِفُ مُحَاوَرَاتِ الْقَوْمِ وَاللُّغَةِ وَالْاَدَبِ وَكَيْفَ يَجُوْزُ اَنْ يَّتَلَفَّظَ بِلَفْظٍ وُضِعَ لِمَعْنًى عِنْدَ اَهْلِ اللِّسَانِ ثُمَّ

اور عوام پر ثابت ہو گیا کہ جو نشان خسوف اور کسوف قرآن شریف میں یعنی اس آیت میں لکھا ہے وہ دُنیا سے تعلق رکھتا ہے نہ آخرت سے اور قیامت کی طرف اس کو منسوب کرنا اور کسی روایت کو پیش کرنا خطا فی الدرایت ہے بلکہ وہ آخر زمانہ اور قُربِ قیامت کی خبروں میں سے ایک خبر ہے جیسا کہ تدبر کرنے والوں پر پوشیدہ نہیں۔

(نور الحق حصہ دوم صفحہ ۸۷)

ترجمہ از اصل :۔ اور چاند اور سُورج جمع کئے گئے جیسا کہ قرآن شریف میں ذکر آیا ہے اور دونوں کا رمضان شریف میں کسوف و خسوف ہو گیا جیسے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شق القمر ہُوا۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۹۴)

ترجمہ از اصل :۔ بتحقیق حضرت عیسٰی علیہ السلام یہودیوں کی تباہی کی گھڑی کے لئے ایک دلیل تھے اور مَیں قیامت کیلئے ایک دلیل ہوں۔ اور بہت سے اس زمانہ کے علامات قرآن شریف میں مرقوم ہیں اور اونٹنیاں بیکار ہو گئیں اور کتابیں بے شمار شائع ہوئیں اور چاند سُورج کو رمضان میں گرہن لگا۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۲۱)

ترجمہ از اصل :۔ پھر جب کہ سُورج گرہن کی حقیقت مشہور تعریف کی رُو سے یہ ہوئی کہ وہ اس ہیئتِ حاصلہ کا نام ہے کہ جب سُورج اور زمین میں چاند حائل ہو جائے اور یہ حائل ہو جانا مہینہ کے آخر ایام میں ہو پس کیونکر ممکن ہے کہ وہ جو عجم اور عرب کے تمام لوگوں سے زیادہ تر فصیح ہے ایسا لفظ بولے جو محاورات قوم اور لُغت اور ادب سے بالکل مخالف ہو اور جائز ہے کہ ایسا لفظ بولا جائے جو اہلِ زبان کے نزدیک ایک خاص معنوں کے لئے موضوع ہے

يَصْرِفَهُ عَنْ ذٰلِكَ الْمَعْنٰى مِنْ غَيْرِ اِقَامَةِ الْقَرِيْنَةِ وَتَفْصِيْلِ الْبَيَانِ فَاِنْ صَرْفَ اللَّفْظِ عَنِ الْمُحَاوَرَةِ وَمَعَانِيْهِ الْمُرَادَةِ عِنْدَ اَهْلِ الْفَنِّ وَاَهْلِ اللُّغَةِ لَايَجُوْزُ لِاَحَدٍ اِلَّا بِاِقَامَةِ قَرِيْنَةٍ مُوْصِلَةٍ اِلَى الْجَزْمِ وَالْيَقِيْنِ۔ وَقَدْ ذَكَرْنَا اَنَّ الْقُرْاٰنَ يُصَدِّقُ هٰذَا الْبَيَانَ وَلَوْكَانَ الْخُسُوْفُ وَالْكُسُوْفُ فِىْ اَيَّامٍ غَيْرِ الْاَيَّامِ الْمُعْتَادَةِ بِالتَّقْلِيْلِ اَوِ الزِّيَادَةِ لَمَا سَمَّاهُ الْقُرْاٰنُ خُسُوْفًا وَلَا كُسُوْفًا بَلْ ذَكَرَهُ بِلَفْظٍ اٰخَرَ وَبَيَّنَهُ بِبَيَانٍ اَظْهَرَ وَلٰكِنَّ الْقُرْاٰنَ مَا فَعَلَ كَذَا كَمَا اَنْتَ تَرٰى بَلْ سَمَّى الْخُسُوْفَ خُسُوْفًا لِيُفْهِمَ النَّاسَ اَمْرًا مَعْرُوْفًا نَعَمْ مَا ذَكَرَ الْكُسُوْفَ بِاسْمِ الْكُسُوْفِ لِيُشِيْرَ اِلٰى اَمْرٍ زَائِدٍ عَلَى الْمُعْتَادِ الْمَعْرُوْفِ فَاِنَّ هٰذَا الْكُسُوْفَ الَّذِىْ ظَهَرَ بَعْدَ خُسُوْفِ الْقَمَرِ كَانَ غَرِيْبًا وَنَادِرَةَ الصُّوَرِ وَاِنْ كُنْتَ تَطْلُبُ عَلٰى هٰذَا شَاهِدًا اَوْتَبْغِىْ مُشَاهِدًا فَقَدْ شَاهَدْتَ صُوَرَهُ الْغَرِيْبَةَ وَاَشْكَالَهُ الْعَجِيْبَةَ اِنْ كُنْتَ مِنْ ذَوِى الْعَيْنَيْنِ ثُمَّ كَفَاكَ فِىْ شَهَادَتِهٖ مَا طُبِعَ فِى الْجَرِيْدَتَيْنِ الْمَشْهُوْرَتَيْنِ الْمَقْبُوْلَتَيْنِ اَعْنِى الْجَرِيْدَةَ الْاِنْكِلِيْزِيَّةَ بَائِنِيْرِ وَسِوِلْ مِلْتَرِىْ كَزَتْ اَلْمُشَاعَتَيْنِ فِىْ مَارِج ۱۸۹۴ء وَالْمُشْتَهَرَتَيْنِ۔ وَاَمَّا تَفْصِيْلُ الشَّهَادَتَيْنِ فَهُوَ اَنَّ هٰذَا الْكُسُوْفَ الْوَاقِعَ فِىْ ۶۔ ابريل ۱۸۹۴ء مُتَفَرِّدٌ بِطَرَائِفِهٖ وَلَمْ يُرَ مِثْلُهٗ مِنْ

پھر اُس کو بغیر اقامت کسی قرینہ کے اس معنے سے پھیرا جائے کیونکہ کسی لفظ کا محاورہ اور معنی مراد مستعملہ سے پھیرنا اہلِ فن اور اہلِ لغت کے نزدیک جائز نہیں مگر اُس حالت میں کہ کوئی قرینہ یقینی قائم کیا جاوے اور ہم ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن اِس بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ اور اگر کسوف خسوف ایسے ایام میں ہوتا جو اُس کے لئے سنّتِ قدیمہ میں نہیں ہے تو قرآن اس کا نام خسوف کسوف نہ رکھتا بلکہ دوسرے لفظ سے بیان کرتا لیکن قرآن نے ایسا نہیں کیا جیسا کہ تُو دیکھتا ہے بلکہ اُس کا نام خسوف ہی رکھا تا کہ لوگوں کو سمجھاوے کہ یہ خسوف معروف ہے کوئی اَور چیز نہیں ہاں قرآن نے کسوف کو کسوف کے لفظ سے بیان نہیں کیا تا ایک امر زائد کی طرف اشارہ کرے کیونکہ یہ سُورج گرہن جو بعد چاند گرہن کے ہؤا یہ ایک غیر معمولی اور نادر الصور تھا اور اگر تُو اِس پر کوئی گواہ طلب کرتا ہے یا مشاہدہ کرنے والوں کو چاہتا ہے۔ پس اِس سُورج گرہن کی صورِ غریبہ اور اشکالِ عجیبہ مشاہدہ کر چکا ہے پھر تجھے اِس بارہ میں وہ خبر کفایت کرتی ہے جو دو مشہور اور مقبول اخبار یعنی پانیر اور سول ملٹری گزٹ میں لکھی گئی ہے اور وہ دونوں پرچے مارچ ۱۸۹۴ء کے مہینہ میں شائع ہوئے ہیں۔ اور ان کی گواہیوں کی تفصیل یہ ہے کہ ان دونوں پرچوں میں لکھا ہے کہ یہ کسوف (جو ۶؍ اپریل ۱۸۹۴ء کو ہؤا) اپنے عجائبات میں متفرد اور غیر معمولی ہے یعنی وہ ایک ایسا کسوف ہے

قَبْلُ فِیْ کَوَائِفِهٖ وَاَشْکَالُهٗ عَجِیْبَةٌ وَاَوْضَاعُهٗ غَرِیْبَةٌ وَهُوَ خَارِقٌ لِلْعَادَةِ وَمُخَالِفٌ لِلْمَعْمُوْلِ وَالسُّنَّةِ فَثَبَتَ مَا جَاءَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحَدِیْثِ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ وَلَا شَكَّ اَنَّ اجْتِمَاعَ الْخُسُوْفِ وَالْکُسُوْفِ فِیْ شَهْرِ رَمَضَانَ مَعَ هٰذِهِ الْغَرَابَةِ اَمْرٌ خَارِقٌ لِلْعَادَةِ وَاِذَا نَظَرْتَ مَعَهٗ رَجُلًا یَقُوْلُ اِنِّیْ اَنَا الْمَسِیْحُ الْمَوْعُوْدُ وَالْمَهْدِیُّ الْمَسْعُوْدُ وَالْمُلْهَمُ الْمُرْسَلُ مِنَ الْحَضْرَةِ وَکَانَ ظُهُوْرُهٗ مُقَارِنًا بِهٰذِهِ الْاٰیَةِ فَلَا شَكَّ اَنَّهَا اُمُوْرٌ مَا سَبَقَ اجْتِمَاعُهَا فِیْ اَوَّلِ الزَّمَانِ۔ (نورالحق حصّہ دوم صفحہ ۲۲، ۲۳)

انسان کا اپنا جسم ہی اس کو حشر نشر پر ایمان لانے کے لئے مجبور کرتا ہے کیونکہ ہر آن اس میں حشر نشر ہو رہا ہے یہاں تک کہ تین سال کے بعد یہ جسم رہتا ہی نہیں اور دوسرا جسم آجاتا ہے یہی قیامت ہے۔ اس کے سوا یہ ضروری امر نہیں کہ کل مسائل کو عقلی طور پر ہی سمجھ لے بلکہ انسان کا فرض ہے کہ وہ اِس بات پر ایمان لائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے افعال اور صفات کے ساتھ موجود ہے اور اس کی صفات میں سے یہ بھی ہے یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ اور عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ تو اِس بات کے ماننے میں کہ قیامت ہوگی کیا شک ہوسکتا ہے خصوصًا ایسی حالت میں کہ ہم اس کا ثبوت یہاں بھی رکھتے اور دیکھتے ہوں۔ بے شک قیامت حق ہے اور اس کی قدرتوں کا ایک نمونہ۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ حشر نشر پر بھی قادر ہے اور حشر نشر قدرت ہی پر موقوف ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷؍نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

اِنَّ الدَّارَقُطْنِیْ قَدْ رَوٰی عَنْ مُحَمَّدِ الْبَاقِرِ مِنِ ابْنِ زَیْنِ الْعَابِدِیْنَ۔ وَهُوَ مِنْ بَیْتِ التَّطْهِیْرِ وَالْعِصْمَةِ وَمِنْ قَوْمٍ مُطَهَّرِیْنَ۔ قَالَ قَالَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ وَهُوَ مِنَ الْاَسْنَامِ الصَّادِقِیْنَ۔ اِنَّ لِمَهْدِیِّنَا اٰیَتَیْنِ لَمْ تَکُوْنَا مُنْذُ خُلِقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضُوْنَ۔ یَنْخَسِفُ الْقَمَرُ لِاَوَّلِ لَیْلَةٍ مِّنْ رَمَضَانَ۔ یَعْنِیْ فِیْ اَوَّلِ لَیْلَةٍ مِنْ

جو اس کی نظیر پہلے نہیں دیکھی گئی اور اس کی شکلیں عجیب ہیں اور اس کی وضعیں غریب ہیں اور وہ خارق عادت اور مخالف معمول اور سُنّت ہے پس اِس سے وہ غیر معمولی ہونا ثابت ہُوا جس کا بیان قرآن کریم اور حدیث خاتم الانبیاء میں موجود ہے اور کچھ شک نہیں کہ کسوف خسوف اس مہینہ رمضان میں اس غیر معمولی حالت کے ساتھ جمع ہونا ایک امر خارق عادت ہے اور جب کہ اس کے ساتھ تُو نے ایک آدمی کو دیکھا جو کہتا ہے کہ مَیں مسیح موعود اور مہدی ہوں اور خسوف کسوف کے ساتھ اس کا ظہور مقارن ہے۔ پس کچھ شک نہیں کہ یہ تمام امور ایسے ہیں جو پہلے کسی زمانہ میں جمع نہیں ہوئے۔ (نورالحق حصّہ دوم صفحہ ۲۲، ۲۳)

ترجمہ از اصل ۱۔ دارقطنی نے امام محمد باقر سے روایت کی ہے کہ ہمارے مہدی کے دو نشان ہیں کہ جب سے کہ زمین و آسمان پیدا کیے گئے کبھی ظہور میں نہیں آئے یعنی یہ کہ قمر کی پہلی رات میں اس کی تین راتوں میں سے جو

لیالی خسوفہ ولا یجاوز ذالک الاوان۔ ویقع فی الشھر الذی انزل اللہ فیہ القرآن۔ وتنکسف الشمس فی النصف منہ۔ یعنی فی نصفہ من ایام کسوفھا المعلومۃ عند اھل العرفان۔ فی ذالک الشھر المذکور ...... ثم اعلم ان ایۃ الخسوف والکسوف قد ذکرھما القرآن فی انباء قرب القیامۃ۔ وان شئت فاقرء ھذہ الآیۃ۔ وکرّرھا لادراک ھذہ الحقیقۃ۔ فاذا برق البصر وخسف القمر وجمع الشمس والقمر۔ ثم تدبّر بالخشوع والخشیۃ۔ ولا یذھب فکرک الی انہ من وقائع القیامۃ۔ وایاک وھذہ الخطأ الذی یبعدک من المحجۃ۔ فان الخسوف الذی ذکر ھھنا ھو موقوف علی وجود ھذہ النشأۃ الدنیویۃ۔ فانہ ینشأ من اشکال نظامیۃ واوضاع مقررۃ منتظمۃ۔ ویکون فی الاوقات المعیّنۃ۔ والایام المعلومۃ المشتھرۃ۔ ولا بدّ فیہ من رجوع النیّرین الی ھیئتھما السابقۃ۔ بعد خروجھما من ھذہ الحالۃ۔ واما الآیات التی تظھر عند وقوع واقعۃ الساعۃ۔ فھی تقتضی فساد ھذا الکون بالکلیۃ۔ فانھا حالات لا تبقی الدنیا بعدھا ولا اھل ھذہ الدار الدنیۃ۔ والخسوف والکسوف یتعلقان بنظام ھذہ النشأۃ ویوجدان فیہ من بدو الفطرۃ۔ فثبت ان الخسوف الذی ذکرہ القرآن فی صحفہ المطھرۃ۔ ھو من الآثار المتقدمۃ علی القیامۃ۔ (نجم الھدیٰ صفحہ ۲۲)

خسوف کے لئے مقرر ہیں خسوف ہوگا اور سُورج کے تین دنوں میں سے جو اس کے کسوف کے لئے مقرر ہیں بیچ کے دن میں کسوف ہوگا اور یہ بھی اُسی رمضان میں ہوگا ...... اور یہ بھی جاننا چاہیئے کہ قرآن شریف نے کسوف خسوف کے نشان کو قربِ قیامت کے نشانوں میں سے لکھا ہے اور اگر تُو چاہے تو اِس آیت کو پڑھ کہ بَرِقَ الْبَصَرُ وَ خَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ۔ اور یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ نشان قیامت کے واقعات میں سے ہے کیونکہ جس خسوف اور کسوف کا اِس جگہ ذکر ہے وہ اس دنیوی پیدائش پر موقوف ہے۔ وجہ یہ کہ خسوف کسوف اوضاع مقررہ منتظمہ سے پیدا ہوتا ہے اور اوقاتِ معیّنہ اور ایامِ معلومہ میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اور خسوف کسوف میں یہ امر ضروری ہے کہ آفتاب اور قمر بعد اس کے کہ اس حالت سے باہر آویں اپنی پہلی حالت کی طرف رجوع کریں مگر وہ نشان جو قیامت کے قائم ہونے کے وقت ظہور میں آئیں گے وہ اس وقت ظاہر ہوں گے جبکہ دُنیا کا سِلسلہ بکلّی درہم برہم ہو جائے گا کیونکہ وہ ایسی حالتیں ہیں کہ ان کے بعد دُنیا نہیں رہے گی اور نہ اہلِ دُنیا رہیں گے اور کسوف و خسوف اس دُنیا کے نظام سے تعلق رکھتے ہیں اور ابتداء سے اس میں بنائے گئے ہیں پس ثابت ہؤا کہ وہ کسوف خسوف جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے وہ قیامت کے لئے آثارِ متقدمہ ہیں نہ یہ کہ قیامت کے قائم ہو جانے کی علامتیں ہیں۔ (نجم الھدیٰ صفحہ ۲۲)

یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن شریف کی گواہی صحت حدیث کسوف خسوف کی نسبت صرف ایک گواہی نہیں ہے بلکہ دو گواہیاں ہیں ایک تو یہ آیت کہ جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ جو پیشگوئی کے طور پر بتلا رہی ہے کہ قیامت کے قریب جو مہدئ آخرالزمان کے ظہور کا وقت ہے چاند اور سورج کا ایک ہی مہینہ میں گرہن ہوگا۔ اور دوسری گواہی اس حدیث کے صحیح اور مرفوع متصل ہونے پر آیت فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ میں ہے کیونکہ یہ آیت علم غیب صحیح اور صاف کا رسولوں پر حصر کرتی ہے جس سے بالضرورت متعین ہوتا ہے کہ اِنَّ لِمَهْدِيِّنَا کی حدیث بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۹ حاشیہ)

قرآن شریف میں اور بہت سی پیشگوئیاں ہیں جو اس ہمارے زمانہ میں پوری ہوگئیں جیسے اجتماع کسوف قمر و شمس جو آیت جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ سے معلوم ہوتی ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۸۳)

یہ امر کس کو معلوم نہیں کہ اسلامی سن یعنی تیرہ سو برس میں کئی لوگوں نے محض افتراء کے طور پر مہدی موعود ہونے کا دعویٰ بھی کیا بلکہ لڑائیاں بھی کیں مگر کون ثابت کرسکتا ہے کہ ان کے وقت میں چاند گرہن اور سورج گرہن رمضان کے مہینہ میں دونوں جمع ہوئے تھے اور جب تک یہ ثبوت پیش نہ کیا جائے تب تک بلاشبہ یہ واقعہ خارق عادت ہے کیونکہ خارق عادت اسی کو تو کہتے ہیں کہ اس کی نظیر دنیا میں نہ پائی جائے۔ اور صرف حدیث ہی نہیں بلکہ قرآن شریف نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے دیکھو آیت وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۹۶)

خداتعالیٰ نے مختصر لفظوں میں فرما دیا کہ آخری زمانہ کی نشانی یہ ہے کہ ایک ہی مہینہ میں شمس اور قمر کے کسوف خسوف کا اجتماع ہوگا اور اس آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا کہ اس وقت مکذب کو فرار کی جگہ نہیں رہے گی جس سے ظاہر ہے کہ وہ کسوف خسوف مہدی معہود کے زمانہ میں ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ کسوف خسوف خدا کی پیشگوئی کے مطابق واقع ہوگا۔ اس سے مکذبوں پر حجت پوری ہو جائے گی۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۹۶ حاشیہ)

قرآن شریف میں آخری زمانہ کی نسبت ایک یہ پیشگوئی تھی کہ جب آخری زمانہ میں دوسرے آثار قیامت ظاہر ہوں گے اُس زمانہ میں ایک خاص وضع کا کسوف خسوف بھی ہوگا جیسا کہ اس آیت میں بھی اشارہ ہے وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ یعنی سورج اور چاند جمع کئے جائیں گے۔ یہ آیت سورۃ قیامت کی ابتدائی سطروں میں ہے اور اسی وجہ سے اس سورت کا نام قیامت رکھا گیا ہے اور یہ کسوف خسوف آثار قیامت میں سے ٹھہرایا گیا جیسا کہ مسیح خاتم الخلفاء کو بھی آثار قیامت سے ٹھہرایا گیا اور اس آیت سے پہلے یہ آیت ہے فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ یعنی جس وقت پتھرا جائیں گی آنکھیں یعنی وہ ایسے دن ہوں گے جو دنیا پر ہولناک عذاب نازل ہوں گے۔ ایک عذاب ختم نہیں ہوگا جو دوسرا موجود ہو

جائے گا۔ پھر بعد کی آیت میں فرمایا یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ۔ کَلَّا لَا وَزَرَ یعنی اس دن انسان کہے گا کہ اب ہم ان متواتر عذابوں سے کہاں بھاگ جائیں اور بھاگنا غیر ممکن ہوگا یعنی وہ دن انسان کے لئے بڑی مصیبت کے دن ہوں گے اور ان کا ہولناک نظارہ بے حواس کردے گا۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۳۰۶ حاشیہ)

اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ نِالْمُسْتَقَرُّ۔ اِس آیت کو قیامت پر چسپاں کرنا غلطی ہے کیونکہ اس دن تو خدا کی طرف رجوع کرنا کسی کام نہ آوے گا بلکہ یہ اس زمانہ کی حالت ہے کہ طاعون کے بارے میں کوئی حیلہ حوالہ کریں ہرگز کام نہ آویگا۔ آخر مستقر خدا تعالیٰ ہی ہوگا۔ لوگ جب اس کو مانیں گے تب وہ اس سے رہائی دے گا۔ اَیْنَ الْمَفَرُّ بھی اسی پر چسپاں ہے کیونکہ دوسری آفات میں تو کوئی نہ کوئی مفر ہوتا ہے مگر طاعون میں کوئی مفر نہیں ہے صرف خدا تعالیٰ کی پناہ ہی کام آوے گی۔ (البدر جلد ۳ ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ

اُس دن مومنوں کے مُنہ تروتازہ اور خوبصورت ہوں گے اور وہ اپنے رب کو دیکھیں گے۔
(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۰۹)

قیامت کو وہ مُنہ تروتازہ ہوں گے جو اپنے رب کو دیکھتے ہوں گے۔ (کتاب البریہ صفحہ ۵۴)

اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ اِس سے دیدار ثابت ہوتا ہے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۱۴۸ حاشیہ)

سُورۃ الدّھر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

۲ ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا ○

کیا اِنسان پر یعنی تجھ پر وہ وقت نہیں گذرا کہ تیرا دُنیا میں کچھ بھی ذکر و تذکرہ نہ تھا یعنی تجھ کو کوئی نہیں جانتا تھا کہ تُو کون ہے اور کیا چیز ہے اور کسی شمار و حساب میں نہ تھا یعنی کچھ بھی نہ تھا۔ یہ گذشتہ تلطفات اور احسانات کا حوالہ ہے تا مُحسنِ حقیقی کے آئندہ فضلوں کے لئے ایک نمونہ ٹھہرے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۴۸۹ حاشیہ در حاشیہ)

۳ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا ○

ہم انسان کو ملے ہوئے نطفہ سے پیدا کرتے ہیں یعنی مرد اور عورت کے نطفہ سے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۱۱۶)

۵ اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَا۠ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِیْرًا ○

ہم نے مُنکروں کے لئے جو سچائی کو قبول کرنا نہیں چاہتے زنجیریں تیار کر دی ہیں اور طوقِ گردن اور ایک افروختہ آگ کی سوزش۔ اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ سچے دِل سے خدائے تعالیٰ کو نہیں ڈھونڈتے ان پر خدا کی طرف سے رجعت پڑتی ہے۔ وہ دُنیا کی گرفتاریوں میں ایسے مبتلا رہتے ہیں کہ گویا پابہ زنجیر ہیں اور زمینی کاموں میں ایسے نگونسار ہوتے ہیں کہ گویا ان کی گردن میں ایک طوق ہے جو ان کو آسمان کی طرف سر نہیں اُٹھانے دیتا اور ان کے دلوں میں حرص و ہوا کی ایک سوزش لگی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ مال حاصل ہو جائے اور

یہ جائیداد مل جائے اور فلاں ملک ہمارے قبضہ میں آجائے اور فلاں دشمن پر ہم فتح پائیں - اِس قدر روپیہ ہو۔ اِتنی دولت ہو۔ سو چونکہ خدائے تعالیٰ ان کو نالائق دیکھتا ہے اور بُرے کاموں میں مشغول پاتا ہے اِس لئے یہ تینوں بَلائیں ان کو لگا دیتا ہے۔ اور اِس جگہ اِس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جب اِنسان سے کوئی فعل صادر ہوتا ہے تو اس کے مطابق خدا تعالیٰ بھی اپنی طرف سے ایک فعل صادر کرتا ہے مثلاً اِنسان جس وقت اپنی کوٹھڑی کے تمام دروازوں کو بند کر دے تو انسان کے اس فعل کے بعد خدائے تعالیٰ کا یہ فعل ہو گا کہ وہ اس کوٹھڑی میں اندھیرا پیدا کر دے گا کیونکہ جو امور خدائے تعالیٰ کے قانونِ قدرت میں ہمارے کاموں کے لئے بطور ایک نتیجہ لازمی کے مقدر ہو چکے ہیں وہ سب خدائے تعالیٰ کے فعل ہیں۔ وجہ یہ کہ وہی علّتِ علل ہے۔ ایسا ہی اگر مثلاً کوئی شخص زہرِ قاتل کھالے تو اس کے اس فعل کے بعد خدا تعالیٰ کا یہ فعل صادر ہو گا کہ اسے ہلاک کر دے۔ ایسا ہی اگر کوئی ایسا بیجا فعل کرے جو کسی متعدی بیماری کا موجب ہو تو اس کے اس فعل کے بعد خدائے تعالیٰ کا یہ فعل ہو گا کہ وہ متعدی بیماری اس کو پکڑ لے گی۔ پس جس طرح ہماری دنیوی زندگی میں صریح نظر آتا ہے کہ ہمارے ہر ایک فعل کے لئے ایک ضروری نتیجہ ہے اور وہ نتیجہ خدائے تعالیٰ کا فعل ہے ایسا ہی دین کے متعلق بھی یہی قانون ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۷۴، ۷۵)

ہم نے کافروں کے لئے جو ہماری محبت دل میں نہیں رکھتے اور دُنیا کی طرف جُھکے ہوئے ہیں زنجیر اور طوقِ گردن اور دِل کے جلنے کے سامان تیار کر رکھے ہیں اور دُنیا کی محبت کی اُن کے پَیروں میں زنجیریں ہیں اور گردنوں میں ترکِ خدا کا ایک طوق ہے جس سے سر اُٹھا کر اُوپر کو نہیں دیکھ سکتے اور دُنیا کی طرف جُھکے جاتے ہیں اور دُنیا کی خواہشوں کی ہر وقت ان کے دلوں میں ایک جلن ہے۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۱۲)

کوئی یہ نہ کہے کہ کُفّار کے پاس بھی مال و دَولت اور املاک ہوتے ہیں اور وہ اپنی عیش وعشرت میں منہمک اور مَست رہتے ہیں۔ مَیں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ وہ دُنیا کی آنکھ میں بلکہ ذلیل ذلیل دُنیاداروں اور ظاہر پرستوں کی آنکھ میں خوش معلوم دیتے ہیں مگر درحقیقت وہ ایک جَلن اور دُکھ میں مُبتلا ہوتے ہیں تم نے اُن کی صورت کو دیکھا ہے مگر مَیں ایسے لوگوں کے قلب پر نگاہ کرتا ہوں۔ وہ ایک سعیر اور سلاسل و اغلال میں جکڑے ہوئے ہیں جیسے فرمایا اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَاْ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِیْرًا۔ وہ نیکی کی طرف آہی نہیں سکتے۔ وہ ایسے اغلال ہیں کہ خدا کی طرف اُن اغلال کی وجہ سے ایسے دبے پڑے ہیں کہ حیوانوں اور بہائم سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔ اُن کی آنکھ ہر وقت دُنیا ہی کی طرف لگی رہتی ہے اور زمین کی طرف جُھکتے جاتے ہیں۔ پھر اندر ہی اندر ایک سوزش اور جلن بھی لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر مال میں کمی ہو جائے یا حسبِ مراد تدبیر میں کامیابی نہ ہو تو کُڑھتے اور جلتے ہیں یہاں تک کہ بعض اَوقات سَودائی اور پاگل ہو جاتے ہیں یا عدالتوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

یہ واقعی بات ہے کہ بیدین آدمی سعیر سے خالی نہیں ہوتا اِس لئے کہ اس کو قرار اور سکون نصیب نہیں ہوتا جو راحت اور تسلّی کا لازمی نتیجہ ہے۔ جیسے شرابی ایک جامِ شراب پی کر ایک اَور مانگتا ہے اور مانگتا ہی جاتا ہے اور ایک جلن سی لگی رہتی ہے ایسا ہی دُنیادار بھی سعیر میں ہے۔ اس کی آتشِ آز ایک دَم بھی بُجھ نہیں سکتی۔ سچی خوشحالی حقیقت میں ایک متقی ہی کے لئے ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ اس کے لئے دو جنت ہیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ ر مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

الدھر: ۶، ۷

اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًاۚ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا۝

الدھر: ۹، ۱۰

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۝

الدھر: ۱۶ تا ۱۹

وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۝ۙ قَوَارِيْرَاۡ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا۝ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًاۚ۝ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا۝

وہ نیکوکار ہیں وہ اِسی دُنیا میں ایسا کافوری شربت پی رہے ہیں جس نے ان کے دلوں میں سے دُنیا کی محبّت ٹھنڈی کر دی ہے اور دُنیا طلبی کی پیاس بُجھا دی ہے۔ کافوری شربت کا ایک چشمہ ہے جو ان کو عطا کیا جاتا ہے اور وہ اس چشمہ کو پھاڑ پھاڑ کر نہر کی صورت پر کر دیتے ہیں تا وہ نزدیک اور دُور کے پیاسوں کو اس میں شریک کر دیں اور جب وہ چشمہ نہر کی صورت پر آجاتا ہے اور قوّتِ ایمانی بڑھ جاتی ہے اور محبّتِ الٰہی نشوونما پانے لگتی ہے تب ان کو ایک اَور شربت پلایا جاتا ہے جو زنجبیلی شربت کہلاتا ہے۔ یعنی پہلے تو وہ کافوری شربت پیتے ہیں جس کا کام اِس قدر ہے کہ دُنیا کی محبّت اُن کے دلوں پر سے ٹھنڈی کر دے لیکن بعد

اس کے وہ ایک گرم شربت کے بھی محتاج ہیں تا خدا کی محبت کی گرمی اُن میں بھڑکے کیونکہ صرف بدی کا ترک کرنا کمال نہیں ہے پس اِسی کا نام زنجبیلی شربت ہے اور اس چشمہ کا نام سلسبیل ہے جس کے معنے ہیں خدا کی راہ پوچھ۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۱۲،۱۳)

کافور کا لفظ اِس واسطے اِس آیت میں اختیار کیا گیا ہے کہ لغتِ عرب میں کَفَرَ دبانے اور ڈھانکنے کو کہتے ہیں۔ سو یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے ایسے خلوص سے اِنقطاع اور رجوع اِلی اللہ کا پیالہ پیا ہے کہ دُنیا کی محبت بالکل ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ تمام جذبات دل کے خیال سے ہی پَیدا ہوتے ہیں اور جب دل نالائق خیالات سے بہت ہی دُور چلا جائے اور کچھ تعلقات ان سے باقی نہ رہیں تو وہ جذبات بھی آہستہ آہستہ کم ہونے لگتے ہیں یہاں تک کہ نابُود ہو جاتے ہیں۔ سو اِس جگہ خدا تعالیٰ کی یہی غرض ہے اور وہ اِس آیت میں یہی سمجھاتا ہے کہ جو اس کی طرف کامل طور سے جُھک گئے وہ نفسانی جذبات سے بہت ہی دُور نکل گئے اور ایسے خدا کی طرف جُھک گئے کہ دُنیا کی سرگرمیوں سے ان کے دل ٹھنڈے ہو گئے اور ان کے جذبات ایسے دَب گئے جیسا کہ کافور زہریلے مادّوں کو دبا دیتا ہے۔

اور پھر فرمایا کہ وہ لوگ اس کافوری پیالے کے بعد وہ پیالے پیتے ہیں جن کی ملونی زنجبیل ہے۔ اَب جاننا چاہیئے کہ زنجبیل دو۲ لفظوں سے مرکّب ہے یعنی زنا اور جبل سے۔ زنا لُغتِ عرب میں اُوپر چڑھنے کو کہتے ہیں اور جبل پہاڑ کو۔ اِس کے ترکیبی معنے یہ ہیں کہ پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اب جاننا چاہیئے کہ انسان پر ایک زہریلی بیماری کے فرو ہونے کے بعد اعلیٰ درجہ کی صحت تک دو۲ حالتیں آتی ہیں ایک وہ حالت جبکہ زہریلے مواد کا جوش بکلی جاتا رہتا ہے اور خطرناک مادوں کا جوش رُو باصلاح ہو جاتا ہے اور سمّی کیفیات کا حملہ بخیروعافیت گذر جاتا ہے اور ایک مُہلک طوفان جو اُٹھا تھا نیچے دَب جاتا ہے لیکن ہنوز اعضاء میں کمزوری ہوتی ہے کوئی طاقت کا کام نہیں ہوسکتا۔ ابھی مُردوں کی طرح افتاں وخیزاں چلتا ہے اور دوسری وہ حالت ہے کہ جب اصل صحت عَود کر آتی اور بدن میں طاقت بھر جاتی ہے اور قوّت کے بحال ہونے سے یہ حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ بلاتکلف پہاڑ کے اُوپر چڑھ جائے اور نشاطِ خاطر سے اُونچی گھاٹیوں پر دوڑتا چلا جائے۔ سو سلوک کے تیسرے مرتبہ میں یہ طاقت میسّر آتی ہے۔ ایسی حالت کی نسبت اللہ تعالیٰ آیت موصوفہ میں اشارہ فرماتا ہے کہ اِنتہائی درجہ کے باخدا لوگ وہ پیالے پیتے ہیں جن میں زنجبیل ملی ہوئی ہے یعنی وہ روحانی حالت کی پوری قوّت پا کر بڑی بڑی گھاٹیوں پر چڑھ جاتے ہیں اور بڑے مشکل کام ان کے ہاتھ سے انجام پذیر ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی راہ میں حیرت ناک جانفشانیاں دکھلاتے ہیں۔

اِس جگہ یہ بھی واضح رہے کہ علمِ طِب کی رُو سے زنجبیل وہ دوا ہے جس کو ہندی میں سونٹھ کہتے ہیں۔ وہ

حرارتِ غریزی کو بہت قوت دیتی ہے اور دستوں کو بند کرتی ہے اور اِس کا زنجبیل نام اِسی واسطے رکھا گیا ہے کہ گویا وہ کمزور کو ایسا قوی کرتی ہے اور ایسی گرمی پہنچاتی ہے جس سے وہ پہاڑوں پر چڑھ سکے۔ اِن متقابل آیتوں کے پیش کرنے سے جن میں ایک جگہ کافور کا ذکر ہے اور ایک جگہ زنجبیل کا خدائے تعالیٰ کی یہ غرض ہے کہ تا اپنے بندوں کو سمجھائے کہ جب انسان جذباتِ نفسانی سے نیکی کی طرف حرکت کرتا ہے تو پہلے پہل اس حرکت کے بعد یہ حالت پیدا ہوتی ہے کہ اس کے زہریلے مواد نیچے دبائے جاتے ہیں اور نفسانی جذبات رُو بکمی ہونے لگتے ہیں جیسا کہ کافور زہریلے مواد کو دبا لیتا ہے اِسی لئے وہ ہیضہ اور محرقہ تپوں میں مفید ہے اور پھر جب زہریلے مواد کا جوش بالکل جاتا رہے اور ایک کمزور صحت جو ضعف کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے حاصل ہو جائے تو پھر دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ وہ ضعیف بیمار زنجبیل کے شربت سے قوت پاتا ہے اور زنجبیلی شربت خدائے تعالیٰ کے حُسن و جمال کی تجلّی ہے جو رُوح کی غذا ہے۔ جب اس تجلّی سے انسان قوت پکڑتا ہے تو پھر بلند اور اُونچی گھاٹیوں پر چڑھنے کے لائق ہو جاتا ہے اور خدائے تعالیٰ کی راہ میں ایسی حیرت ناک سختی کے کام دکھلاتا ہے کہ جب تک یہ عاشقانہ گرمی کسی کے دل میں نہ ہو ہرگز ایسے کام دکھلا نہیں سکتا سو خدائے تعالیٰ نے اِس جگہ ان دونوں حالتوں کے سمجھانے کے لئے عربی زبان کے دو لفظوں سے کام لیا ہے ایک کافور سے جو نیچے دبانے والے کو کہتے ہیں اور دوسرے زنجبیل سے جو اُوپر چڑھنے والے کو کہتے ہیں اور اس راہ میں بھی دو حالتیں سالکوں کے لئے واقع ہیں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۴۶ تا ۴۷)

جو لوگ حقیقی نیکی کرنے والے ہیں ان کو وہ جام پلائے جائیں گے جن کی ملونی کافور کی ہو گی یعنی دُنیا کی سوزشیں اور حسرتیں اور ناپاک خواہشیں ان کے دل سے دُور کر دی جائیں گی۔ کافور کَفَرَ سے مُشتق ہے اور کَفَرَ لُغتِ عرب میں دبانے اور ڈھانکنے کو کہتے ہیں مطلب یہ کہ ان کے ناجائز جذبات دبا دیئے جائیں اور وہ پاک باطن ہو جائیں اور معرفت کی خنکی ان کو پہنچے گی۔ پھر فرماتا ہے کہ وہ لوگ قیامت کو اس چشمہ کا پانی پئیں گے جس کو وہ آج اپنے ہاتھ سے چیر رہے ہیں۔ اِس جگہ بہشت کی فلاسفی کا ایک گہرا راز بتلایا ہے جس کو سمجھنا ہے سمجھ لے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۴۲)

مومن جو خدا کے بندے ہیں وہ کافوری پیالے پیتے ہیں۔ کافور کا لفظ اِس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ کَفَرَ ڈھانکنے کو کہتے ہیں اور کافور مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت ڈھانکنے والا۔ ایسے ہی طاعون بھی ہے میں سمجھتا ہوں طاعون اِسی لئے نام رکھا ہے کہ یہ اہلِ حق پر طعن کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور طاعون اور دیگر امراضِ وبائی ہیضہ میں کافور ایک عمدہ چیز ہے اور مفید ثابت ہوئی ہے۔ غرض کافوری پیالے کا پہلے ذکر کیا ہے اور یہ اِس لئے ہے کہ اوّل یہ بتایا جائے کہ کامل ہونے کے لئے کافوری پیالہ پہلے پینا چاہیئے تا کہ دُنیا کی محبت سرد

ہو جائے اور وہ فسق و فجور کے خیالات جو دِل سے پیدا ہوتے تھے اور جن کی زہر رُوح کو ہلاک کرتی تھی دبائے جائیں اور اِس طرح پر گناہ کی حالت سے انسان نکل آئے۔ پس چونکہ پہلے مَیل کچیل کا دُور ہونا ضروری تھا اِسلئے کافوری پیالہ پلایا گیا۔ اِس کے بعد دوسرا حصّہ زنجبیلی ہے۔

زنجبیل اصل میں دُو لفظوں سے مرکب ہے زنا اور جبل سے۔ اور زنا لُغتِ عرب میں اُوپر چڑھنے کو کہتے ہیں اور جبل پہاڑ کو۔ اور اِس مرکب لفظ کے معنے یہ ہوئے کہ پہاڑ پر چڑھ گیا اور یہ صاف بات ہے کہ ایک زہریلے اور وبائی مرض کے بعد انسان کو اعلیٰ درجہ کی صحت تک پہنچانے کے واسطے دُو حالتوں میں سے گذرنا ہوتا ہے۔ پہلی وہ حالت ہوتی ہے جبکہ زہریلے اور خطرناک مادے رُک جاتے ہیں اور ان میں اِصلاح کی صورت پیدا ہوتی ہے اور زہریلے حملوں سے نجات ملتی ہے اور وہ مواد دبائے جاتے ہیں مگر اعضاء بدستور کمزور ہوتے ہیں اور ان میں کوئی قوت اور سکت نہیں ہوتی جس سے وہ کام کرنے کے قابل ہو ایک ربودگی کی سی حالت ہوتی ہے۔ یہ وہ حالت ہوتی ہے جس کو کافوری پیالے پینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اِس حالت میں گناہ کا زہر دبایا جاتا ہے اور اس جوش کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے جو نفس کی سرکشی اور جوش کی حالت میں ہوتا ہے مگر ابھی نیکی کرنے کی قوت نہیں آتی۔

پس دوسری حالت جو زنجبیلی حالت ہے وہ وہی ہے جبکہ صحتِ کامل کے بعد توانائی اور طاقت آجائے یہاں تک کہ پہاڑوں پر بھی چڑھ سکے اور زنجبیل بجائے خود چونکہ حرارتِ غریزی کو بڑھاتی ہے اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اِس ذکر سے بتایا کہ پہلے مومنوں کے گناہوں کی حالت پر موت آتی ہے اور پھر انہیں نیکی کی توفیق اور قوت ملتی ہے۔ گناہ کی حالت میں اِنسان پستی اور ذِلت میں ہوتا ہے اور جوں جوں گناہ کرتا جاتا ہے نیچے ہی نیچے چلا جاتا ہے لیکن جب گناہوں پر موت آتی ہے تو وہ اس پستی کے گڑھے میں ہی پڑا ہوا ہوتا ہے۔ جب تک اُوپر چڑھنے کے لئے اسے زنجبیلی شربت نہ ملے۔ پس نیکیوں کی توفیق عطا ہونے پر وہ پھر اُوپر چڑھنا شروع کرتا ہے۔ اور یہ پہاڑی گھاٹیاں وہی ہیں جو صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں بیان ہوئی ہیں۔ خدا تعالیٰ کے راست بازوں اور منعم علیہ کی راہ ہی وہ اصل مقصود ہے جو اِنسان کے لئے خدا تعالےٰ نے رکھی ہے۔ (الحکم جلد ۵ ۴۵ مورخہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

ایسے لوگ جو خدا میں محو ہیں خدا تعالیٰ نے اُن کو وہ شربت پلایا ہے جس نے ان کے دِل اور خیالات اور ارادات کو پاک کر دیا۔ نیک بندے وہ شربت پی رہے ہیں جس کی ملونی کافور ہے۔ وہ اس چشمہ سے پیتے ہیں جس کو وہ آپ ہی چیرتے ہیں۔ (بدر جلد ۲ نمبر ۲۶، ۲۷، ۲۸ مورخہ ۲۸ جون و ۵ و ۱۲ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

مومن کے نفس کی تکمیل دُو شربتوں کے پینے سے ہوتی ہے ایک شربت کا نام کافوری ہے اور دوسرے

کا نام زنجبیلی ہے۔ کافوری شربت تو یہ ہے کہ اس کے پینے سے نفس بالکل ٹھنڈا ہو جاوے اور بدیوں کیلئے کسی قسم کی حرارت اس میں محسوس نہ ہو۔ جس طرح پر کافور میں یہ خاصہ ہوتا ہے کہ وہ زہریلے مواد کو دبا دیتا ہے اِس لئے اسے کافور کہتے ہیں اسی طرح پر یہ کافوری شربت گناہ اور بدی کی زہر کو دبا دیتا ہے اور وہ موادِ ردیہ جو اُٹھ کر انسان کی رُوح کو ہلاک کرتے ہیں اُن کو اُٹھنے نہیں دیتا بلکہ بے اثر کر دیتا ہے۔ دوسرا شربت شربتِ زنجبیلی ہے جس کے ذریعہ سے انسان میں نیکیوں کے لئے ایک قوت اور طاقت آتی ہے اور پھر حرارت پیدا ہوتی ہے پس اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ۔ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ تو اصل مقصد اور غرض ہے یہ گویا زنجبیلی شربت ہے اور غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ کافوری شربت ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

قرآن شریف میں ایک جگہ ذکر کیا ہے کہ دو حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک حالت تو وہ ہوتی ہے کہ یَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ كَاۡسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوۡرًا یعنی ایسا شربت پی لیتے ہیں جس کی ملونی کافور ہو۔ اِس سے یہ مطلب ہے کہ دُنیا کی محبت سے دِل ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ کافور ٹھنڈی چیز ہے اور زہروں کو دبا لیتا ہے ہیضہ اور وبائی امراض کیلئے مفید ہے۔ پس پہلا مرحلہ تقوٰی کا وہ ہے جس کو استعارہ کے رنگ میں یَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ كَاۡسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوۡرًا ایسے لوگ جو کافوری شربت پی لیتے ہیں ان کے دِل ہر قسم کی خیانت، ظلم، ہر نوع کی بدی اور بُرے قوٰی سے دِل ٹھنڈے ہوتے ہیں اور یہ بات ان میں طبعًا اور فطرتًا پیدا ہوتی ہے نہ کہ تکلف سے۔ وہ ہر قسم کی بدیوں سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ یہ معمولی بات نہیں۔ بدیوں کا چھوڑ دینا آسان نہیں۔ انجیل کا اکثر حصّہ اس سے پُر ہے کہ بُرے کام نہ کرو۔ مگر یہ پہلا زینہ ہے تکمیلِ ایمان کا۔ اسی پر قانع نہیں ہو جانا چاہیئے۔ ہاں اگر انسان اس پر عمل کرے اور بدیوں کو چھوڑ دے تو دوسرے حصّہ کے لئے اللہ تعالیٰ آپ ہی مدد دیتا ہے۔ یہ بات اِنسان مُنہ سے تو کہہ سکتا ہے کہ مَیں بدیوں سے پرہیز کرتا ہوں لیکن جب مختلف قسم کے بُرے کام سامنے آتے ہیں تو بدن کانپ جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۲ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

تقوٰی کیا ہے؟ ہر قسم کی بدی سے اپنے آپ کو بچانا۔ پس خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابرار کے لئے پہلا انعام شربتِ کافوری ہے۔ اِس شربت کے پینے سے دِل بُرے کاموں سے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اس کے بعد ان کے دلوں میں بُرائیوں اور بدیوں کے لئے تحریک اور جوش پیدا نہیں ہوتا۔ ایک شخص کے دل میں یہ خیال تو آ جاتا ہے کہ یہ کام اچھا نہیں یہاں تک کہ چور کے دل میں بھی یہ خیال آ ہی جاتا ہے مگر جذبۂ دل سے وہ چوری بھی کر ہی لیتا ہے لیکن جن لوگوں کو شربتِ کافوری پلا دیا جاتا ہے ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ انکے دل میں بدی کی تحریک ہی پیدا نہیں ہوتی بلکہ دِل بُرے کاموں سے بیزار اور متنفر ہو جاتا ہے۔ گناہ کی تمام تحریکوں

کے مواد دبا دیئے جاتے ہیں۔ یہ بات خدا تعالیٰ کے فضل کے سوا میسّر نہیں آتی۔ جب انسان دُعا اور عقدِ ہمّت سے خدا تعالیٰ کے فضل کو تلاش کرتا ہے اور اپنے نفس کے جذبات پر غالب آنے کی سعی کرتا ہے تو پھر یہ سب باتیں فضلِ الٰہی کو کھینچ لیتی ہیں اور اسے کافوری جام پلایا جاتا ہے۔ جو لوگ اِس قسم کی تبدیلی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں زمرۂ ابدال میں داخل فرماتا ہے اور یہی تبدیلی ہے جو ابدال کی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ رجولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

انسان کا اِتنا ہی کمال نہیں ہے کہ بدیاں چھوڑ دے کیونکہ اس میں اور بھی شریک ہیں یہاں تک کہ حیوانات بھی بعض امور میں شریک ہو سکتے ہیں بلکہ انسان کامل نیک تب ہی ہوتا ہے کہ نہ صرف بدیوں کو ترک کرے بلکہ اس کے ساتھ نیکیوں کو بھی کامل درجہ تک پہنچا دے پس جب تک ترکِ شر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے کافوری شربت پلاتا ہے جس سے یہ مراد ہے کہ وہ جوش اور تحریکیں جو بدی کے لئے پیدا ہوتی ہیں سرد ہو جاتی ہیں اور بدی کے مواد دب جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس کو دوسرا شربت پلایا جاتا ہے جو قرآن کریم کی اصطلاح میں شربتِ زنجبیلی ہے جیسا کہ فرمایا وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا۔ زنجبیل مرکّب ہے زُنا اور جَبَل سے۔ زَنَا الْجَبَلَ کے یہ معنے ہیں کہ ایسی حرارت اور گرمی پیدا ہو جاوے کہ پہاڑ پر چڑھ جاوے۔ زنجبیل میں حرارتِ غریزی رکھی گئی ہے اور اس کے ساتھ انسان کی حرارتِ غریزی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بڑے بڑے کام جو میری راہ میں کئے جاتے ہیں جیسے صحابہؓ نے کئے یہاں تک کہ انہوں نے اپنی جانوں سے دریغ نہیں کیا۔ خدا تعالیٰ کی راہ میں سر کٹوا دینا آسان امر نہیں ہے۔ جس کے بچے چھوٹے چھوٹے اور بیوی جوان ہو جب تک کوئی خاص گرمی اس کی رُوح میں پیدا نہ ہو کیونکر انہیں یتیم اور بیوہ چھوڑ کر سر کٹوا لے۔ میں صحابہؓ سے بڑھ کر کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ اعلیٰ درجہ کی قوّتِ قدسی اور تزکیۂ نفس کی طاقت کا ہے اور صحابہؓ کا نمونہ اعلیٰ درجہ کی تبدیلی اور فرمانبرداری کا ہے۔ پس ایسی طاقت اور یہ قوت اسی زنجبیلی شربت کی تاثیر سے پیدا ہوتی ہے اور حقیقت میں کافوری شربت کے بعد طاقت کو نشوونما دینے کے لئے اس زنجبیلی شربت کی ضرورت بھی تھی۔ اَولیاء اور ابدال جو خدا تعالیٰ کی راہ میں سرگرمی اور جوش دکھاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ زنجبیلی جام پیتے رہتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعویٰ کیا تو غور کرو کہ کس قدر مخالفت کا بازار گرم تھا۔ ایک طرف مُشرک تھے دوسری طرف عیسائی بے حد جوش دکھا رہے تھے جنہوں نے ایک عاجز انسان کو خدا بنا رکھا تھا اور ایک طرف یہودی سیاہ دل تھے یہ بھی اندر ہی اندر ریشہ دوانیاں کرتے اور مخالفوں کو اُکساتے اور اُبھارتے تھے۔ غرض جس طرف دیکھو مخالف ہی مخالف نظر آتے تھے۔ قوم دشمن، پرائے دشمن، جدھر نظر اٹھاؤ دشمن ہی دشمن

تھے۔ ایسی حالت اور صورت میں وہ زنجبیلی شربت ہی تھا جو آپ کو اپنے پیغامِ رسالت کی تبلیغ کے لئے آگے ہی آگے لے جاتا تھا کسی قسم کی مخالفت کا ڈر آپ کو باقی نہ رہا تھا۔ اس راہ میں مرنا سہل اور آسان معلوم ہوتا تھا چنانچہ صحابہؓ اگر موت کو اس راہ میں آسان اور آرام وہ چیز نہ سمجھ لیتے تو کیوں جانیں دیتے ۔میں سچ کہتا ہوں کہ جب تک یہ شربت نہیں پیتا ایمان کا ٹھکانا نہیں۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

قرآن شریف نے خوب مثال دی ہے اور وہ یہ کہ کوئی مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ دو شربت نہ پی لے۔ پہلا شربت گناہ کی محبت ٹھنڈی ہونے کا جس کا نام قرآن شریف نے شربتِ کافوری رکھا ہے اور دوسرا شربت خدا کی محبت دِل میں بھرنے کا جس کا نام قرآن شریف نے شربتِ زنجبیلی رکھا ہے۔

(لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۴۲)

صرف ترکِ ذنوب ہی نیکی کی شرط نہیں بلکہ کسبِ خیر بھی اعلیٰ جُزو ہے۔ کوئی انسان کامل نہیں ہو سکتا جب تک دونو قسم کے شربت نہیں پی لیتا۔ سورۂ دہر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک شربت کافوری ہوتا ہے اور دوسرا شربت زنجبیلی۔ مقرّبوں اور برگزیدہ لوگوں کو دونو شربت پلائے جاتے ہیں۔ کافوری شربت کے پینے سے انسان کا دل ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور گناہ کے قویٰ ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ کافور میں گندے مواد کے دبانے کی تاثیر ہے۔ پس وہ لوگ جن کو شربتِ کافوری پلایا جاتا ہے ان کے گناہ والے قویٰ بالکل دَب ہی جاتے ہیں اور پھر ان سے گناہ کا ارتکاب ہوتا ہی نہیں اور ایک قسم کی سکینت جس کو شانتی کہتے ہیں میسّر آجاتی ہے اور ایک نور پانی کی طرح اُترتا ہے جو اُن کے سینے میں سارے گندوں کو دھو ڈالتا ہے اور سفلی زندگی کے تمام تعلقات ان سے الگ کر دئے جاتے ہیں اور گناہ کی آگ کی بھڑک ہمیشہ کے واسطے ٹھنڈی پڑ جاتی ہے مگر یاد رکھو صرف یہی امر نیکی اور خوبی نہیں ہے ..... ترکِ ذنوب کو اللہ تعالیٰ نے شربتِ کافور کی ملونی سے تشبیہہ دی ہے۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ انسان کو شربتِ زنجبیلی پلایا جاوے۔ زنجبیل سونٹھ کو کہتے ہیں۔ زنجبیل مرکّب ہے لفظ زنا اور جبل سے۔ زنجبیل کی تاثیر ہے کہ حرارتِ غریزی کو بڑھاتی ہے اور لغوی معنے اس کے ہیں پہاڑ پر چڑھنا۔ اِس میں جو نکتہ رکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح سے پہاڑ پر چڑھنا مشکل کام ہے اور وہ اِس مقوّی چیز کے استعمال سے آسان ہو جاتا ہے اسی طرح روحانی نیکی کے پہاڑ پر چڑھنا بھی سخت دشوار ہے وہ روحانی شربتِ زنجبیل سے آسان ہو جاتا ہے۔ خالص اعمال محض للہ اخلاص اور ثواب کے ماتحت بجالانا بھی ایک پہاڑ ہے اور سخت دشوار گذار گھاٹی سے مشابہ ہے۔ ہر ایک پاؤں کا یہ کام نہیں کہ وہاں پہنچ سکے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۲ مورخہ ۱۰ر مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

مسلمان کو مرتے وقت کافور کا استعمال کرنا سُنّت ہے۔ یہ اس لئے کہ کافور ایسی چیز ہے جو وبائی کیڑوں کو مارتی اور سمّیت کو دُور کرتی ہے۔ اِنسان کے لئے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ بہت سی عفونتی بیماریوں کو روکتی ہے اِس لئے قرآن میں حکم ہے کہ مومنوں کو کافوری شربت پلایا جاوے گا اور آجکل بھی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ کافور جیسا ہیضہ کے لئے مفید ہے ویسا ہی طاعون کے لئے بھی مفید ہے۔ مَیں اپنی جماعت کو بتلاتا ہوں کہ یہ بہت مفید چیز ہے اور میرا اعتقاد ہے کیونکہ قرآن کریم نے بتلایا ہے کہ یہ جلن کو روکتا ہے اور اس کو سکینت اور تفریح دیتا ہے۔ (الانذار صفحہ ۶۱)

نیک لوگ وہ جام پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہے یعنی ان کے دل وہ شراب پی کر غیر کی محبت سے بکلّی ٹھنڈے ہو جاویں گے۔ وہ کافوری شراب ایک چشمہ ہے جس کو اسی دُنیا میں خدا کے بندے پینا شروع کرتے ہیں۔ وہ اِس چشمہ کو ایسا رواں کر دیتے ہیں کہ نہایت آسانی سے بہنے لگتا ہے اور وسیع اور فراخ نہریں ہو جاتی ہیں یعنی ریاضتِ عشقیہ سے سب روکیں اُن کی دُور ہو جاتی ہیں اور نشیب و فرازِ بشریّت کا صاف اور ہموار ہو جاتا ہے اور جنابِ الٰہی کی طرف انقطاعِ کُلّی میسّر آکر معارفِ الٰہیہ میں وسعتِ تامہ پیدا ہو جاتی ہے۔ (سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۰۸)

بہشت کے انعامات کے متعلق نیک لوگوں کی تعریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا یعنی اسی جگہ نہریں نکال رہے ہیں۔ (الحکم جلد ۶ ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

حقیقی نیکی کرنے والوں کی یہ خصلت ہے کہ وہ محض خدا کی محبت کے لئے وہ کھانے جو آپ پسند کرتے ہیں مسکینوں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تم پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ یہ کام صرف اِس بات کے لئے کرتے ہیں کہ خدا ہم سے راضی ہو اور اسی کے مُنہ کے لئے یہ خدمت ہے۔ ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارا شُکر کرتے پھرو۔ یہ اشارہ اِس بات کی طرف ہے کہ ایصالِ خیر کی تیسری قسم جو محض ہمدردی کے جوش سے ہے وہ طریق بجا لاتے ہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۴۴)

طعام کہتے ہی پسندیدہ طعام کو ہیں سڑا ہوا باسی طعام نہیں کہلاتا۔ الغرض اگر اس رکابی میں سے جس میں ابھی تازہ کھانا اور لذیذ اور پسندیدہ رکھا ہوا ہے اور کھانا شروع نہیں کیا فقیر کی صدا پر نکال کر دے تو یہ تو نیکی ہے بیکار اور نکمّی چیزوں کے خرچ سے کوئی آدمی نیکی کرنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ نیکی کا دروازہ تنگ ہے۔ پس یہ امر ذہن نشین کر لو کہ نکمّی چیزوں کے خرچ کرنے سے کوئی اس میں[1] داخل نہیں

---

[1] جنّت

ہو سکتا۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۷۹)

اخلاق کی درستی کے ساتھ اپنے مقدور کے موافق صدقات کا دینا بھی اختیار کرو یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا الخ یعنی خدا کی رضا کے لئے مسکینوں اور یتیموں اور اسیروں کو کھانا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خاص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہم دیتے ہیں اور اُس دن سے ہم ڈرتے ہیں جو نہایت ہی ہولناک ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۷ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

مومن وہ ہیں جو خدا کی محبت سے مسکینوں اور یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلاتے ہیں اور انہیں کہتے ہیں کہ ہم محض خدا کی محبت اور اُس کے مُنہ کے لئے تمہیں دیتے ہیں ہم تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے اور نہ شکر گزاری چاہتے ہیں۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۴۲)

کامل راستباز جب غریبوں اور یتیموں اور اسیروں کو کھانا دیتے ہیں تو محض خدا کی محبت سے دیتے ہیں نہ کسی اَور غرض سے دیتے ہیں اور وہ انہیں مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ یہ خدمت خاص خدا کے لئے ہے۔ اس کا ہم کوئی بدلہ نہیں چاہتے اور نہ ہم یہ چاہتے کہ ہمارا شکر کرو۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۱۰)

املاک و اسباب کا خیال کرنا کہ اس کا وارث کوئی ہو یہ شرکاء کے قبضہ میں نہ چلے جاویں فضول اور دیوانگی ہے۔ ایسے خیالات کے ساتھ دین جمع نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ منع نہیں بلکہ جائز ہے کہ اِس لحاظ سے اولاد اور دوسرے متعلقین کی خبرگیری کرے کہ وہ اس کے زیردست ہیں تو پھر یہ بھی ثواب اور عبادت ہی ہوگی اور خدا تعالیٰ کے حکم کے نیچے ہوگا جیسے فرمایا ہے وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا اِس آیت میں مسکین سے مراد والدین بھی ہیں کیونکہ وہ بوڑھے اور ضعیف ہو کر بے دست و پا ہو جاتے ہیں اور محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالنے کے قابل نہیں رہتے اس وقت ان کی خدمت ایک مسکین کی خدمت کے رنگ میں ہوتی ہے اور اسی طرح اولاد جو کمزور ہوتی ہے اور کچھ نہیں کر سکتی اگر یہ اُس کی تربیت اور پرورش کے سامان نہ کرے تو وہ گویا یتیم ہی ہے پس ان کی خبرگیری اور پرورش کا تہیّہ اسی اصول پر کرے تو ثواب ہوگا۔

اور بیوی اسیر کی طرح ہے اگر یہ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ[1] پر عمل نہ کرے تو وہ ایسا قیدی ہے جس کی کوئی خبر لینے والا نہیں۔ غرض ان سب کی غور و پرداخت میں اپنے آپ کو بالکل الگ سمجھے اور ان کی پرورش محض رحم کے لحاظ سے کرے نہ کہ جانشین بنانے کے لئے بلکہ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا کا لحاظ ہو۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

---

[1] سورۃ البقرہ: ۲۰۰

تم جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہو یاد رکھو کہ تم ہر شخص سے خواہ وہ کسی مذہب کا ہو ہمدردی کرو اور بلا تمیز ہر ایک سے نیکی کرو کیونکہ یہی قرآن شریف کی تعلیم ہے وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا وہ اسیر اور قیدی جو آتے تھے اکثر کفار ہی ہوتے تھے۔ اب دیکھ لو کہ اسلام کی ہمدردی کی انتہاء کیا ہے۔ میری رائے میں کامل اخلاقی تعلیم بجز اسلام کے اور کسی کو نصیب ہی نہیں ہوئی۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ ؍جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

اکثر دفعہ ماں باپ بوڑھے ہوتے ہیں اور ان کو اولاد ہوتی ہے تو ان کی کوئی امید بظاہر اولاد سے فائدہ اٹھانے کی نہیں ہوتی لیکن باوجود اس کے پھر بھی وہ اس سے محبت اور پرورش کرتے ہیں یہ ایک طبعی امر ہوتا ہے۔ جو محبت اس درجہ تک پہنچ جاوے اس کا اشارہ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى میں کیا گیا ہے کہ اس قسم کی محبت خدا تعالیٰ کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ نہ مراتب کی خواہش نہ ذلت کا ڈر۔ جیسے آیت لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا سے ظاہر ہے۔ غرضکہ یہ باتیں ہیں جن کو یاد رکھنا چاہیئے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۳ مورخہ ۱۶ ؍نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳۵)

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا یعنی خدا رسیدہ اور اعلیٰ ترقیات پر پہنچے ہوئے انسان کا یہ قاعدہ ہے کہ اس کی نیکی خالصاً للہ ہوتی ہے اور اس کے دل میں یہ بھی خیال نہیں ہوتا کہ اس کے واسطے دعا کی جاوے یا اس کا شکریہ ادا کیا جاوے۔ نیکی محض اس جوش کے تقاضا سے کرتا ہے جو ہمدردی بنی نوع انسان کے واسطے اس کے دل میں رکھا گیا ہے۔ ایسی پاک تعلیم نہ ہم نے توریت میں دیکھی اور نہ انجیل میں۔ ورق ورق کر کے ہم نے پڑھا ہے مگر ایسی پاک اور مکمل تعلیم کا نام ونشان نہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۴ ؍جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۱)

چاندی کے بیچ میں ایک جوہر محبت ہے اس لئے یہ زیادہ مرغوب ہوتی ہے۔ اکثر لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جنت کی نعماء میں چاندی کے برتنوں کا ذکر ہے حالانکہ اس سے بیش قیمت سونا ہے۔ وہ لوگ اس راز کو جو کہ خدا تعالیٰ نے چاندی میں رکھا ہے نہیں سمجھے۔ جنت میں چونکہ غلّ اور کینہ اور بُغض وغیرہ نہیں ہوگا اور آپس میں محبت ہوگی اور چونکہ چاندی میں جوہرِ محبت ہے اس لئے اس نسبتِ باطنی سے جنت میں اس کو پسند کیا گیا ہے۔ اس میں جوہر محبت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اگر طرفین میں لڑائی ہو تو چاندی دے دینے سے صلح ہو جاتی ہے اور کدورت دُور ہو جاتی ہے۔ کسی کی نظرِ عنایت حاصل کرنی ہو تو چاندی پیش کی جاتی ہے۔ علوم یا تو قیاس سے معلوم ہوتے ہیں اور یا تجربہ سے۔ چاندی کے اس اثر کا پتہ تجربہ سے لگتا ہے۔ خواب میں اگر کسی مسلمان

کو چاندی دے تو اس کی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ اُسے اِسلام سے محبت ہے اور وہ مسلمان ہو جاوے گا۔
(البدر جلد ۲ ع۳۱ مورخہ ۲۱ر اگست ۱۹۰۳ء صفحہ اول)

۲۲ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ
فِضَّةٍ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا○

وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا یعنی جو لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اُن کا خدا ان کو ایک ایسی شراب پلائے گا جو اُن کو کامل طور پر پاک کر دے گی۔ (سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۰۸)

سُورۃ المرسلٰت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا۝ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا۝ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا۝

فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا۝ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا۝ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا۝

قسم ہے اُن ہواؤں کی اور اُن فرشتوں کی جو نرمی سے چھوڑے گئے ہیں اور قسم ہے اُن ہواؤں کی اور اُن فرشتوں کی جو زور اور شدت کے ساتھ چلتے ہیں اور قسم ہے اُن ہواؤں کی جو بادلوں کو اُٹھاتی ہیں اور اُن فرشتوں کی جو ان بادلوں پر مؤکّل ہیں اور قسم ہے اُن ہواؤں کی جو ہر یک چیز کو جو معرضِ ذکر میں آجائے کانوں تک پہنچاتی ہیں اور قسم ہے اُن فرشتوں کی جو الٰہی کلام کو دلوں تک پہنچاتے ہیں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۳۶، ۱۳۷ حاشیہ)

اِس آیتِ قرآن کریم میں اس زمانہ اور طاعون کے متعلق پیشگوئی ہے ..... قسم ہے ان ہواؤں کی جو آہستہ چلتی ہیں یعنی پہلا وقت ایسا ہوگا کہ کوئی کوئی واقعہ طاعون کا ہو جایا کرے پھر وہ زور پکڑے اور تیز ہو جاوے۔ پھر وہ ایسی ہو کہ لوگوں کو پراگندہ کر دے اور پریشان خاطر کر دے۔ پھر ایسے واقعات ہوں کہ مومن اور کافر کے درمیان فرق اور تمیز کر دیں۔ اس وقت لوگوں کو سمجھ آجائے گی کہ حق کس امر میں ہے۔ آیا اس امام کی اطاعت میں یا اس کی مخالفت میں۔ یہ سمجھ میں آنا بعض کے لئے صرف حجت کا موجب ہوگا (عُذْرًا) یعنی مرتے مرتے اُن کا دِل اقرار کر جائے گا کہ ہم غلطی پر تھے اور بعض کے نزدیک (نُذْرًا) یعنی ڈرانے کا موجب ہوگا کہ وہ توبہ کر کے بدیوں سے باز آویں۔

(الحکم جلد ۶ ۱۵ مورخہ ۲۴؍ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

۱۱ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ○

اور جس وقت پہاڑ اُڑائے جائیں گے اور ان میں سڑکیں پیادوں اور سواروں کے چلنے کی یا ریل کے چلنے کے لئے بنائی جائیں گی۔ (شہادت القرآن صفحہ ۲۳)

وَقَدْ ظَهَرَ اَكْثَرُ عَلَامَاتِهَا وَذَكَرَهَا الْقُرْاٰنُ ذِكْرًا..... وَاِنَّ الْجِبَالَ نُسِفَتْ اَكْثَرُهَا فَمَا تَرَوْنَ فِيْهَا عِوَجًا وَّلَا اَمْتًا۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۲۱، ۱۲۲)

۱۲ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ○

اور جب رسول وقتِ مقرر پر لائے جائیں گے۔ یہ اشارہ درحقیقت مسیح موعود کے آنے کی طرف ہے اور اِس بات کا بیان مقصود ہے کہ وہ عین وقت پر آئے گا اور یاد رہے کہ کلام اللہ میں رُسُل کا لفظ واحد پر بھی اطلاق پاتا ہے اور غیر رسول پر بھی اطلاق پاتا ہے اور یہ مَیں کئی دفعہ بیان کر چکا ہوں کہ اکثر قرآن کریم کی آیات کئی وجوہ کی جامع ہیں جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے کہ قرآن شریف کے لئے ظہر بھی ہیں اور بطن بھی۔ پس اگر رسول قیامت کے میدان میں بھی شہادت کے لئے جمع ہوں تو اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا لیکن اس مقام میں جو آخری زمانہ کی اَبتر علامات بیان فرما کر پھر اخیر پر بھی فرما دیا کہ اس وقت رسول وقتِ مقرر پر لائے جائیں گے تو قرائن بیّنہ صاف طور پر شہادت دے رہے ہیں کہ اُس ظلمت کے کمال کے بعد خدا تعالیٰ کسی اپنے مُرسل کو بھیجے گا تا مختلف قوموں کا فیصلہ ہو اور چونکہ قرآن شریف سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ظلمت عیسائیوں کی طرف سے ہوگی تو ایسا مامور من اللہ بلا شُبہ انہیں کی دعوت کے لئے اور انہیں کے فیصلہ کے لئے آئے گا پس اسی مناسبت سے اُس کا نام عیسٰی رکھا گیا ہے کیونکہ وہ عیسائیوں کے لئے ایسا ہی بھیجا گیا جیسا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اُن کے لئے بھیجے گئے تھے اور آیت وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ میں الف لام عہدِ خارجی پر دلالت کرتا ہے یعنی وہ مجدد جس کا بھیجنا بزبان رسول کریم معہود ہو چکا ہے وہ اُس عیسائی تاریکی کے وقت میں بھیجا جائے گا۔ (شہادت القرآن صفحہ ۲۳، ۲۴)

وہ آخری زمانہ جس سے رسولوں کے عدد کی تعیین ہو جائے گی یعنی آخری خلیفہ کے ظہور سے

ترجمہ از اصل :۔ بہت سے اس زمانہ کے علامات قرآن شریف میں مرقوم ہیں ..... پہاڑ اپنی جگہ سے ہل گئے کہ کوئی اونچائی نچائی باقی نہ رہی۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۲۱، ۱۲۲)

قضاء وقدر کا اندازہ جو مرسلین کی تعداد کی نسبت مخفی تھا ظہور میں آجائے گا۔ یہ آیت بھی اس بات پر نصِ صریح ہے کہ مسیح موعود اسی اُمّت میں سے ہوگا کیونکہ اگر پہلا مسیح ہی دوبارہ آجائے تو وہ افادہ تعیینِ عدد نہیں کر سکتا کیونکہ وہ تو بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے ایک رسول ہے جو فوت ہو چکا ہے اور اِس جگہ خلفائے سلسلۂ محمدیہ کی تعیین مطلوب ہے اور اگر یہ سوال ہو کہ اُقِّتَتْ کے یہ معنے یعنی معیّن کرنا اس عدد کا جو ارادہ کیا ہے کہاں سے معلوم ہوا؟ تو اِس کا جواب یہ ہے کہ کتبِ لُغت لِسان العرب وغیرہ میں لکھا ہے قَدْ یَجِئُ التَّوْقِیْتُ بِمَعْنٰی تَبْیِیْنِ الْحَدِّ وَالْعَدَدِ وَالْمِقْدَارِ کَمَا جَآءَ فِیْ حَدِیْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ لَمْ یَقِتْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الْخَمْرِ حَدًّا اَیْ لَمْ یُقَدِّرْ وَلَمْ یَحُدَّہٗ بِعَدَدٍ مَخْصُوْصٍ یعنی لفظ توقیت جس سے اُقِّتَتْ نکلا ہے کبھی حد اور شمار اور مقدار کے بیان کرنے کے لئے آتا ہے جیسا کہ حدیث ابنِ عباس رضی اللہ عنہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خمر کی کچھ توقیت نہیں کی یعنی خمر کی حد کی کوئی تعداد اور مقدار بیان نہیں کی اور تعیینِ عدد بیان نہیں فرمائی۔ پس یہی معنے آیت وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ کے ہیں جن کو خدائے تعالیٰ نے میرے پر ظاہر فرمایا اور یہ آیت اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسولوں کی آخری میزان ظاہر کرنے والا مسیح موعود ہے اور یہ صاف بات ہے کہ جب ایک سلسلہ کا آخر ظاہر ہو جاتا ہے تو عندالعقل اس سلسلہ کی پیمائش ہو جاتی ہے اور جب تک کہ کوئی خط ممتد کسی نقطہ پر ختم نہ ہو ایسے خط کی پیمائش ہونا غیر ممکن ہے کیونکہ اس کی دوسری طرف غیر معلوم اور غیر معیّن ہے۔ پس اِس آیتِ کریمہ کے یہ معنے ہیں کہ مسیح موعود کے ظہور سے دونوں طرف سلسلہ خلافتِ محمدیہ کے معیّن اور مشخّص ہو جائیں گے۔ گویا یوں فرماتا ہے وَاِذَا الْخُلَفَآءُ بُیِّنَ تَعْدَادُھُمْ وَحُدِّدَ عَدَدُھُمْ بِخَلِیْفَۃٍ ھُوَ اٰخِرُ الْخُلَفَآءِ الَّذِیْ ھُوَ الْمَسِیْحُ الْمَوْعُوْدُ فَاِنَّ اٰخِرَ کُلِّ شَیْئٍ یُعَیِّنُ مِقْدَارَ ذٰلِکَ الشَّیْئِ وَتَعْدَادَہٗ فَھٰذَا ھُوَ مَعْنٰی وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۱)

۲۶، ۲۷ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۙ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ۙ

جسمِ عنصری کے لئے خود اللہ تعالیٰ منع فرماتا ہے کہ وہ آسمان پر جاوے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا۔ اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا۔ ترجمہ یعنی کیا ہم نے زمین کو ایسے طور سے نہیں بنایا کہ وہ انسانوں کے اجسام کو زندہ اور مُردہ ہونے کی حالت میں اپنی طرف کھینچ رہی ہے کسی جسم کو نہیں چھوڑتی کہ وہ آسمان پر جاوے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۲۲۴)

آسمان سے نازل ہونا خود غیر معقول اور خلاف نصِّ قرآن ہے ...... کیا خدا تعالیٰ کو حضرت عیسٰی کو آسمان پر چڑھانے کے وقت وہ وعدہ یاد نہ رہا کہ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۙ اَحْيَآءً وَّ

اَمْوَاتًا ۙ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۴۵)

کیا ہم نے زمین کو ایسے طور سے پیدا نہیں کیا جو اپنے تمام باشندوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے خواہ وہ زندوں میں سے ہوں اور خواہ مُردوں میں سے ہوں اور یہ بھی خدا کا وعدہ ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۱۹)

قرآن شریف پیش کرتے ہیں کہ اس میں آسمان پر اُٹھایا جانا لکھا ہے حالانکہ قرآن شریف تو بڑے زور سے اس کی وفات ثابت کرتا ہے ..... اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ..... سے وفات ثابت ہوتی ہے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۵ مورخہ ۱۶؍ اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

اِنسان کے دو جسم ہیں ایک زمینی اور دوسرا آسمانی جسم ہے۔ زمینی جسم کے متعلق قرآن شریف میں آیا ہے اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج جس جسم کے ساتھ ہوا وہ آسمانی جسم تھا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷؍ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہوا تھا کہ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا۔ اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا (۲۶-۲۷/۷۷) جس کا یہ مطلب ہے کہ ہم نے زمین کو زندوں اور مُردوں کے سمیٹنے کے لئے کافی بنایا ہے اور اس میں ایک کشش ہے جس کی وجہ سے زمین والے کسی جگہ زندگی بسر کر ہی نہیں سکتے۔ اب اگر بشر آسمان پر گیا ہوا مان لیا جاوے تو نعوذ باللہ ماننا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ نے اپنا وعدہ توڑ دیا۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۷؍ نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۚ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۙ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ۗ

اِس جگہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ اپنی طرف سے بندہ پر کوئی مصیبت نہیں ڈالتا بلکہ وہ انسان کے لئے اپنے بُرے کام اس کے آگے رکھ دیتا ہے۔ پھر اس اپنی سُنّت کے اظہار میں خدا تعالیٰ ایک اَور جگہ فرماتا ہے اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۙ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ۗ یعنی اے بدکارو گمراہو! سہ گوشہ سایہ کی طرف چلو جس کی تین شاخیں ہیں جو سایہ کا کام نہیں دے سکتیں اور نہ گرمی سے بچا سکتی ہیں۔

اِس آیت میں تین شاخوں سے مراد قوتِ سبعی اور بہیمی اور وہمی ہے جو لوگ ان تینوں قوتوں کو اخلاقی رنگ میں نہیں لاتے اور ان کی تعدیل نہیں کرتے ان کی یہ قوتیں قیامت میں اس طرح پر نمودار کی جائیں گی کہ گویا تین شاخیں بغیر پتّوں کے کھڑی ہیں اور گرمی سے بچا نہیں سکتیں اور وہ گرمی سے جلیں گے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹۶)

سُورَۃُ النَّبَا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۳ عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِیۡمِ۝

بڑے تعجب کی بات ہے کہ آخری زمانہ کے متعلق جس قدر نشانات تھے ان میں سے بہت پورے ہو چکے مگر پھر بھی لوگ توجہ نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ غنی ہے اور اس کو ان لوگوں کی پرواہ نہیں جو اس سے لاپرواہی اختیار کرتے ہیں۔ یہ لوگ دُنیا کے معمولی کاموں کے لئے کس قدر تکلیفیں برداشت کرتے ہیں اس کا عُشرِ عشیر بھی دین کی تحقیق کے لئے محنت نہیں کرتے بلکہ طرح طرح کے بیہودہ عُذر کرتے ہیں حالانکہ جیسے اَور معمولی کام دُنیا کے کر رہے ہیں ایسے ہی اس النَّبَاُ الْعَظِیْم کی تحقیق بھی یہ کر سکتے ہیں جس پر اُخروی زندگی کی بہبودی کا دار و مدار ہے۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۳ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

۳۹ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الرُّوۡحُ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا ؕۙ لَّا یَتَکَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا۝

اِنَّ تَاوِیْلَ الرُّوْحِ بِعِیْسٰی فِیْ ھٰذَا الْمَقَامِ دَجْلٌ وَ افْتِرَاءٌ بَلْ جَاءَ فِیْ کُتُبِ التَّفْسِیْرِ اَنَّہٗ جِبْرَئِیْلُ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَوْ مَلَکٌ اٰخَرُ عَلَی اخْتِلَافِ الرِّوَایَاتِ کَمَا

ترجمہ از اصل:۔ اس مقام میں رُوح کے لفظ سے عیسٰی مراد لینا دجالیت اور افتراء ہے بلکہ تفسیروں کی رُو سے وہ جبرائیل علیہ السلام یا کوئی دوسرا فرشتہ ہے اور دونوں قسم کی روائتیں پائی جاتی ہیں جیسا کہ

لَایَخْفٰی عَلَی النَّاظِرِیْنَ۔ ثُمَّ مَنْطُوْقُ الْاٰیَةِ یُبْدِیْ بِالتَّصْرِیْحِ وَیَحْکُمُ بِالتَّنْقِیْحِ اَنَّ هٰذِهِ
الْوَاقِعَةَ مُتَعَلِّقَةٌ بِالْقِیَامَةِ وَلَهَا کَالْعَلَامَةِ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی ذَکَرَ هٰذِهِ الْقِصَّةَ فِیْ ذِکْرِ قِصَّةِ
الْجَنَّةِ وَنَعْمَائِهَا الْعَامَّةِ ثُمَّ صَرَّحَ بِتَصْرِیْحٍ اٰخَرَ وَقَالَ ذٰلِكَ الْیَوْمُ الْحَقُّ وَلَفْظُ الْیَوْمِ الْحَقِّ
فِی الْقُرْاٰنِ بِمَعْنَی الْقِیَامَةِ وَیَعْلَمُهٗ کُلُّ خَبِیْرٍ اَمِیْنٍ فَانْظُرْ کَیْفَ بَیَّنَ اَنَّهَا وَاقِعَةٌ مِّنْ وَقَائِعِ
یَوْمِ الدِّیْنِ ثُمَّ انْظُرْ کَیْفَ یَفْتَرُوْنَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَلَا یَخَافُوْنَ اللّٰهَ وَمَا کَانُوْا
مُتَّقِیْنَ۔ فَالْحَاصِلُ اَنَّ الْاٰیَةَ لَا تُؤَیِّدُ زَعْمَ هٰذَا الْوَاشِیْ بَلْ تُمَزِّقُهٗ وَبِهَا یَقَعُ الْقَوْلُ عَلَیْهِ
وَتَجْعَلُهُ الْاٰیَةُ مِنَ الْکَاذِبِیْنَ۔ فَاِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّ عِیْسٰی اِلٰهٌ وَابْنُ اِلٰهٍ وَیَقُوْلُ اِنَّ الرُّوْحَ هُوَ
اللّٰهُ وَعَیْنُهٗ وَالْاٰیَةُ تُبْدِیْ اَنَّ هٰذَا مَیْنُهٗ وَتُبْدِیْ اَنَّ الرُّوْحَ الَّذِیْ ذُکِرَ هٰهُنَا هُوَ عَبْدٌ عَاجِزٌ
تَحْتَ حُکْمِ اللّٰهِ وَقَدْرِهٖ وَمَا کَانَ لَهٗ خِیَرَةٌ فِیْ اَمْرِهٖ وَاِنْ هُوَ اِلَّا مِنَ الطَّائِعِیْنَ وَمَا کَانَ لَهٗ اَنْ
یَّشْفَعَ مِنْ غَیْرِ اِذْنِ اللّٰهِ لِاَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَالَ فِیْ هٰذِهِ الْاٰیَةِ یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَةُ
صَفًّا لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا۔ وَاُشِیْرَ فِیْ اٰیَةِ ”عَسٰی

دیکھنے والوں پر پوشیدہ نہیں۔ پھر منطوق آیت کا بتصریح ظاہر کرتا ہے اور تنقیح کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ یہ واقعہ قیامت
سے متعلق ہے اور اس کے لئے علامت کی طرح ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے اِس قصہ کو بہشت کے ذکر کے درمیان
لکھا ہے اور اس کی نعمتوں کے بیان کرنے کے وقت اس کو بیان فرمایا ہے اور پھر اور بھی تصریح کر کے فرمایا
ہے کہ یہ وہی حق کے کھلنے کا دِن ہے اور الیوم الحق قرآن میں قیامت کا نام ہے چنانچہ واقف کار امانت دار
اس کو جانتا ہے پس اب غور کر کہ کیونکر خدا تعالیٰ نے کھول کر بیان کر دیا کہ یہ واقعہ قیامت سے متعلق ہے۔ پھر تو
غور کر کہ وہ لوگ جن کے دل بیمار ہیں اور اُن کے دل میں خدائے تعالیٰ کا خوف نہیں کیونکر افتراء پردازیاں کر رہے
ہیں اور تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔ پس حاصل کلام یہ ہے کہ یہ آیت اس نکتہ چین کے زعم کی کچھ مؤید نہیں بلکہ یہ تو
اس کے قول کو ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہے اور اس کے ساتھ بات اُسی پر پڑتی ہے اور یہ آیت اس کو جھوٹوں میں
سے ٹھہراتی ہے کیونکہ اس نکتہ چین کا یہ قول ہے کہ عیسیٰ خدا اور خدا کا بیٹا ہے اور کہتا ہے کہ رُوح خدا کو ہی کہتے
ہیں اور رُوح اور خدا ایک ہی ہے اور آیت ظاہر کر رہی ہے کہ یہ اس کا جھوٹ ہے اور نیز ظاہر کرتی ہے کہ وہ رُوح
جس کا ذکر اس جگہ ہے وہ ایک بندہ عاجز ہے جس کو خدا کے کسی امر میں اختیار نہیں اور کچھ نہیں صرف فرمانبردار ہے
اور نیز یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ اُس رُوح کو شفاعت کا اختیار نہیں اور شفیع وہی ہوگا جس کو اِذن ملے کیونکہ خدا تعالیٰ
نے اِس آیت میں صاف فرما دیا ہے کہ اس روز یعنی قیامت کے دن روح اور فرشتے کھڑے ہوں گے اور شفاعت کے

اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا[1]" اِلٰى اَنَّهٗ تَعَالٰى لَا يُعْطِىْ هٰذَا الْمَقَامَ الْمَحْمُوْدَ اِلَّا نَبِيَّهٗ وَصَفِيَّهٗ مُحَمَّدَ نِ الْمُصْطَفٰى خَيْرَ الرُّسُلِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ وَاُلْقِىَ فِىْ رُوْعِىْ اَنَّ الْمُرَادَ مِنْ لَفْظِ الرُّوْحِ فِىْ اٰيَةِ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ جَمَاعَةُ الرُّسُلِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَالْمُحَدَّثِيْنَ اَجْمَعِيْنَ الَّذِيْنَ يُلْقَى الرُّوْحُ عَلَيْهِمْ وَيُجْعَلُوْنَ مُكَلَّمِيْنَ وَاَمَّا ذِكْرُهُمْ بِلَفْظِ الرُّوْحِ لَا بِلَفْظِ الْاَرْوَاحِ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ قَدْ يُذْكَرُ الْوَاحِدُ فِى الْقُرْاٰنِ وَيُرَادُ مِنْهُ الْجَمْعُ وَبِالْعَكْسِ سُنَّةٌ قَدْ جَرَتْ فِىْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ۔ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ بِلَفْظِ الرُّوْحِ الَّذِىْ يَدُلُّ عَلَى الْاِنْقِطَاعِ مِنَ الْجِسْمِ لِيُشِيْرَ اِلٰى اَنَّهُمْ فِىْ عِيْشَتِهِمُ الدُّنْيَوِيَّةِ كَانُوْا قَدْ فَنَوْا بِكُلِّ قُوَاهُمْ فِىْ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَخَرَجُوْا مِنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَا يَخْرُجُ الْاَرْوَاحُ مِنَ الْاَبْدَانِ وَمَا بَقِىَ لَهُمُ النَّفْسُ وَاَهْوَاءُهَا وَكَانُوْا لَا يَنْطِقُوْنَ مِنَ الْهَوَا بَلْ بِوَحْيٍ يُّوْحٰى فَكَاَنَّهُمْ صَارُوْا رُوْحَ الْقُدُسِ فَقَطْ لَا نَفْسَ مَعَهٗ وَلَا اَعْرَاضَهَا ثُمَّ اعْلَمْ اَنَّ الْاَنْبِيَاءَ كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ لَا يُقَالُ اَنَّهُمْ اَرْوَاحٌ بَلْ يُقَالُ اِنَّهُمْ رُوْحٌ وَذٰلِكَ لِشِدَّةِ اِتِّحَادِهِمُ الرُّوْحَانِيَّةِ وَتَنَاسُبِ جَوْهَرِهِمُ الْاِيْمَانِيَّةِ

بارے میں کوئی بول نہیں سکے گا مگر وہی جس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملے اور کوئی نالائق شفاعت نہ کرے اور آیت عَسٰی اَنْ يَّبْعَثَ میں اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ مقامِ محمود بجز اپنے برگزیدہ نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اَور کسی کو عنایت نہیں کرے گا اور میرے دِل میں ڈالا گیا کہ اِس آیت میں لفظ رُوح سے مراد رسولوں اور نبیوں اور محدّثوں کی جماعت ہے جن پر رُوح القدس ڈالا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کے ہمکلام ہوتے ہیں مگر یہ شبہ کہ رُوح کے لفظ سے ان کو یاد کیا اَرواح کے لفظ سے کیوں یاد نہیں کیا۔ پس جان کہ قرآن کا محاورہ ایسا ہے کہ کبھی وہ واحد کے لفظ سے جمع مراد لے لیتا ہے اور کبھی جمع سے واحد ارادہ رکھتا ہے یہ قرآن شریف کی ایک عادتِ مستمرہ ہے۔ اور پھر خدا تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو رُوح کے لفظ سے یاد کیا یعنے ایسے لفظ سے جو انقطاع عن الجسم پر دلالت کرتا ہے۔ یہ اِس لئے کیا کہ تا وہ اِس بات کی طرف اشارہ کرے کہ وہ مطہّر لوگ اپنی دُنیوی زندگی میں اپنی تمام قوّتوں کی رُو سے مرضاتِ الٰہی میں فنا ہو گئے تھے اور اپنے نفسوں سے ایسے باہر آگئے تھے جیسے کہ رُوح بدن سے باہر آتی ہے اور نہ اُن کا نفس اور نہ اُس نفس کی خواہشیں باقی رہی تھیں اور وہ رُوح القدس کے بُلائے بولتے تھے نہ اپنی خواہش سے اور گویا وہ رُوح القدس ہی ہو گئے تھے جس کے ساتھ نفس کی آمیزش نہیں پھر جان کہ انبیاء ایک ہی جان کی طرح ہیں نہیں کہہ سکتے کہ وہ کئی رُوح ہیں بلکہ کہنا چاہیئے کہ وہ ایک ہی رُوح ہے اور یہ اِس لئے کہ اُن میں رُوحانی طور پر نہایت درجہ پر اتحاد واقع ہے اور جوہرِ ایمانی کی اُن میں مناسبت

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل: ۸۰

وَبِمَا اَنَّھُمْ فَنَوْا مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَحَرَكَاتِهِمْ وَسَكْنَاتِهِمْ وَاَهْوَائِهِمْ وَجَذْبَاتِهِمْ وَمَا بَقِيَ فِيْهِمْ اِلَّا رُوْحُ الْقُدُسِ وَوَصَلُوا اللّٰهَ مُتَبَتِّلِيْنَ مُنْقَطِعِيْنَ فَاَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يُّبَيِّنَ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ مَقَامَ تَجَرُّدِهِمْ وَ مَرَاتِبَ تَقَدُّسِهِمْ وَ تَطَهُّرِهِمْ مِنْ اَدْنَاسِ الْجِسْمِ وَالنَّفْسِ فَسَمَّاهُمْ رُوْحًا اِظْهَارًا لِجَلَالَةِ شَاْنِهِمْ وَطَهَارَةِ جَنَانِهِمْ وَاِنَّهُمْ سَيُلَقَّبُوْنَ بِهٰذَا اللَّقَبِ فِيْ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لِيُرِيَ اللّٰهُ خَلْقَهٗ مَقَامَ انْقِطَاعِهِمْ وَلِيُمَيِّزَ بَيْنَ الْخَبِيْثِيْنَ وَالطَّيِّبِيْنَ۔ وَلَعَمْرُ اللّٰهِ اِنَّ هٰذَا هُوَ الْحَقُّ فَتَدَبَّرُوْا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَلَا تُنْكِرُوْا مُسْتَعْجِلِيْنَ۔ (نور الحق حصہ اوّل صفحہ ۷۲ تا ۷۵)

○

غایت مرتبہ پر ہے اور نیز اس لئے کہ وہ اپنے نفس اور اپنی جنبش اور اپنے سکون اور اپنی خواہشوں اور اپنے جذبات سے بکلی فنا ہوگئے اور ان میں بجز رُوح القدس کے کچھ باقی نہ رہا اور سب چیزوں سے توڑ کے اور قطع تعلق کر کے خدا کو جا ملے پس خدا تعالیٰ نے چاہا کہ اس آیت میں اُن کے تجرد اور تقدس کے مقام کو ظاہر کرے اور بیان کرے کہ وہ جسم اور نفس کے میلوں سے کیسے دُور ہیں پس اُن کا نام اُس نے رُوح یعنے رُوح القدس رکھا تا کہ اس لفظ سے اُن کی شان کی بزرگی اور اُن کے دل کی پاکیزگی کُھل جائے اور وہ عنقریب قیامت کو اس لقب سے پکارے جائیں گے تا کہ خدا تعالیٰ لوگوں پر اُن کا مقامِ انقطاع ظاہر کرے اور تا کہ خبیثوں اور طیبوں میں فرق کر کے دکھلاوے اور بخدا یہی بات حق ہے پس تم کتاب اللہ میں تدبّر کرو اور جلد بازی سے انکار مت کرو۔

(نور الحق حصہ اوّل صفحہ ۷۲ تا ۷۵)

سُورۃ النّٰزِعٰت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۶۔ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا۝

خدا تعالیٰ نے آیت فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا میں فرشتوں اور ستاروں کو ایک ہی جگہ جمع کر دیا ہے۔ یعنی اِس آیت میں کواکب سبع کو ظاہری طور پر مُدَبِّرُ مَا فِی الۡاَرۡضِ ٹھہرایا ہے اور ملایک کو باطنی طور پر اُن چیزوں کا مدبّر قرار دیا ہے۔ چنانچہ تفسیر فتح البیان میں معاذ بن جبل اور قشیری سے یہ دونوں روایتیں موجود ہیں اور ابنِ کثیر نے حسن سے یہ روایت ملایک کی نسبت کی ہے کہ تُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ یعنی آسمان سے زمین تک جس قدر امور کی تدبیر ہوتی ہے وہ سب ملایک کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور ابنِ کثیر لکھتا ہے کہ یہ متفق علیہ قول ہے کہ مدبّراتِ امر ملایک ہیں۔

اور ابنِ جریر نے بھی آیات فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا کے نیچے یہ شرح کی ہے کہ اس سے مراد ملایک ہیں جو مدبّر عالم ہیں یعنی گو بظاہر نجوم اور شمس و قمر و عناصر وغیرہ اپنے اپنے کام میں مشغول ہیں مگر درحقیقت مدبّر ملایک ہی ہیں۔

اَب جبکہ خدا تعالیٰ کے قانونِ قدرت کے رُو سے یہ بات نہایت صفائی سے ثابت ہوگئی کہ نظامِ روحانی کے لئے بھی نظامِ ظاہری کی طرح مؤثراتِ خارجیہ ہیں جن کا نام کلامِ الٰہی میں ملایک رکھا ہے تو اِس بات کا ثابت کرنا باقی رہا کہ نظامِ ظاہری میں بھی جو کچھ ہو رہا ہے اُن تمام افعال اور تغیّرات کا بھی انجام اور انصرام بغیر فرشتوں کی شمولیّت کے نہیں ہوتا۔ سو منقولی طور پر اس کا ثبوت ظاہر ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں کا نام مدبّرات اور مقسّماتِ امر رکھا ہے اور ہر یک عرض اور جوہر کے حدوث اور قیام کا وہی موجب ہیں یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کے عرش کو بھی وہی اُٹھائے ہوئے ہیں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۳۷، ۱۳۸ حاشیہ)

فَاِنَّ لِکُلِّ صِفَةٍ مَلَکًا مُّوَکَّلًا قَدْ خُلِقَ لِتَوْزِیْعِ تِلْكَ الصِّفَةِ عَلٰی وَجْهِ التَّدْبِیْرِ وَوَضْعِهَا فِیْ مَحَلِّهَا وَاِلَیْهِ اِشَارَةٌ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی وَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا۔ (کرامات الصادقین صفحہ ۸۸)

اَعْلَمُ مِنْ رَّبِّیْ اَنَّ الْمَلٰٓئِکَةَ مُدَبِّرَاتٌ لِلشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَالنُّجُوْمِ وَکُلِّ مَا فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَاِنْ کُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَیْهَا حَافِظٌ وَقَالَ وَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا وَمِثْلُ تِلْكَ الْاٰیَاتِ کَثِیْرٌ فِی الْقُرْاٰنِ فَطُوْبٰی لِلْمُتَدَبِّرِیْنَ۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۷۹)

ہماری شریعت میں طلبِ اسباب حرام نہیں ہے ان پر بھروسہ اور توکّل ضرور حرام ہے اِس لئے کوشش کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں قسم کھاتا ہے فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا۔ ماسوا اس کے خدا پر توکّل اور دعا کرنے سے برکت حاصل ہوتی ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۸ مورخہ ۲۴؍ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸۴)

دعا کے ساتھ تدابیر کو نہ چھوڑے کیونکہ اللہ تعالیٰ تدبیر کو بھی پسند کرتا ہے اور اسی لئے فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا کہہ کر قرآن شریف میں قسم بھی کھائی ہے۔ جب وہ اس مرحلہ کو طے کرنے کے لئے دعا بھی کرے گا اور تدبیر سے بھی اِس طرح کام لے گا کہ جو مجلس اور صحبت اور تعلّقات اس کو حارج ہیں ان سب کو ترک کر دے گا اور رسم عادت اور بناوٹ سے الگ ہو کر دعا میں مصروف ہوگا تو ایک دن قبولیّت کے آثار مشاہدہ کرے گا۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۳۴ مورخہ ۸؍ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

لوگ جو روپیہ بھیجتے ہیں لنگر خانہ کے لئے یا مدرسہ کے لئے اس میں اگر بے جا خرچ ہوں تو گناہ کا نشانہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے تدبیر کرنے والوں کی قسم کھائی ہے فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا۔ مَیں تو ایسے آدمیوں کی ضرورت سمجھتا ہوں جو دین کی خدمت کریں۔ (الحکم جلد ۱۳ نمبر ۱ مورخہ ۷؍ جنوری ۱۹۰۹ء صفحہ ۱۲)

ترجمہ از مرتّب:۔ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت کے لئے ایک فرشتہ مقرر ہے جو بڑے منظّم طریق سے اس صفت کی برکات کو تقسیم کرنے اور اسے برمحل رکھنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ کے کلام فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا میں اشارہ ہے۔ (کرامات الصادقین صفحہ ۸۸)

ترجمہ از مرتّب:۔ مَیں نے اپنے ربّ سے یہ علم پایا ہے کہ فرشتے، سُورج، چاند، ستاروں اور آسمان و زمین کی ہر چیز کا انتظام کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنْ کُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَیْهَا حَافِظٌ۔ اِسی طرح فرمایا وَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا۔ اور اِسی مضمون کی بہت سی آیات قرآن کریم میں ہیں پس مبارک ہیں وہ جو تدبّر کرتے ہیں۔

(حمامۃ البشریٰ صفحہ ۷۹)

النّٰزعٰت: ۷، ۸

یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝

(اپنی تائید میں آسمانی نشانات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں)

نواں نشان زلزلوں کا متواتر آنا اور سخت ہونا ہے جیسا کہ آیت یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝ سے ظاہر ہے۔ سو غیر معمولی زلزلے دُنیا میں آرہے ہیں۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۹۸، ۱۹۹)

اس دن زمین ایک سخت اِضطرابی حرکت کرے گی اور زمین میں ایک سخت اور شدید اضطراب پیدا ہوگا اور اس کے بعد ایک اَور اضطراب زمین میں پیدا ہوگا جو پہلے کے بعد ظہور میں آئے گا۔ اِن آیتوں کے ظاہر الفاظ میں زلزلہ کا کوئی ذکر نہیں کیونکہ لُغت میں رجفان اضطراب کو کہتے ہیں چنانچہ بولا جاتا ہے رَجَفَ الشَّیْءُ یعنی اِضْطَرَبَ اِضْطِرَابًا شَدِیْدًا مگر چونکہ زمین کا اضطراب اکثر کرکے زلزلہ سے ہی ہوتا ہے اِس لئے ہم نے اِس جگہ ظنِّ غالب کے طور پر زلزلہ کے معنی کئے ہیں ورنہ ممکن ہے کہ یہ اضطراب کسی اَور حادثہ کی وجہ سے ہو زلزلہ کی وجہ سے نہ ہو یا اس اضطراب سے کوئی اَور آفت مراد ہو۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۹۵، ۹۶)

اُس دن زمین سخت حرکتِ اضطرابی کرے گی اور اس کے بعد ایک اَور حرکت اضطرابی ہوگی یعنی قیامت کے نزدیک دوؔ سخت زلزلے آئیں گے۔ پہلے کے بعد دوسرا زلزلہ آئے گا۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۹۹ حاشیہ)

(ایک عظیم زلزلہ کی پیشگوئی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ)

قرآن شریف میں اس نشانِ زلزلے کی نسبت ایک صاف پیشگوئی سورۃ النّازعات میں درج ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی قسم کھا کر جو ایسے امور کے انتظام کے واسطے مامور ہوتے ہیں فرمایا ہے کہ یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝ کیا معنے۔ اُس وقت زمین کانپنے لگے گی اور ایسے کانپے گی کہ گویا اس کا نام راجفہ رکھ دیا جائے گا یعنی متواتر زلزلے آتے رہیں گے اور اس کے بعد پھر ایک اَور زلزلہ آئے گا۔ اس میں آئندہ زلزلے کے واسطے ایک پیشگوئی ہے اور جو زلزلہ ہو چکا ہے اُس کی بھی پیشگوئی درج ہے۔ یہ قرآن شریف کی صداقت کا ایک بڑا بھاری نشان ہے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۸۴ حاشیہ)

النّٰزعٰت: ۳۸ تا ۴۱

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۙ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ ۝

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی○

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عمل والے کو مَیں کس طرح جزاء دوں گا فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ۝ وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ۝ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی ۝ جو شخص میرے حکموں کو نہیں مانے گا مَیں اس کو بہت بُری طرح سے جہنّم میں ڈالوں گا اور ایسا ہوگا کہ آخر جہنّم تمہاری جگہ ہوگی۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی ۝ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی ۝ اور جو شخص میری عدالت کے تخت کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے گا اور خیال رکھے گا تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں اس کا ٹھکانہ جنّت میں کروں گا۔

(البدر جلد ۲ ۲۷ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۱۰، ۲۱۱)

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ ...... ھِیَ الْمَاْوٰی۔ یعنی جو شخص اپنے پروردگار سے ڈر کر تزکیۂ نفس کرے اور ماسوائے اللہ سے مُنہ پھیر کر خدائے تعالیٰ کی طرف رجوع لے آئے تو وہ جنّت میں ہے اور جنّت اُس کی جگہ ہے یعنی خود ایک روحانی جنّت بباعث قوّتِ ایمانی وحالتِ عرفانی اُس کے دل میں پَیدا ہو جاتی ہے جو اس کے ساتھ رہتی ہے اور وہ اس میں رہتا ہے۔ (سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۹۵)

(اِس) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہشتی زندگی اِسی دُنیا سے شروع ہو جاتی ہے۔ اگر ہَوائے نفس کو روک دیں۔ صوفیوں نے جو فناء وغیرہ الفاظ سے جس مقام کو تعبیر کیا ہے وہ یہی ہے کہ نَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی کے نیچے ہو۔ (الحکم جلد ۹ ۲۸ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

جو کوئی اپنے رب کے آگے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے اور اپنے نفس کی خواہشوں کو روکتا ہے تو جنّت اس کا مقام ہے۔ ہَوائے نفس کو روکنا یہی فنا فی اللہ ہونا ہے اور اس سے اِنسان خدا تعالیٰ کی رضا کو حاصل کر کے اِسی جہان میں مقامِ جنّت کو پہنچ سکتا ہے۔

(بدر جلد ۱ ۱۸ مورخہ ۳ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

جب تک اِنسان سچّا مجاہدہ اور محنت نہیں کرتا وہ معرفت کا خزانہ جو اسلام میں رکھا ہوُا ہے اور جس کے حاصل ہونے پر گناہ آلُود زندگی پر موت وارد ہوتی ہے انسان خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہے اور اس کی آوازیں سُنتا ہے اُسے نہیں مِل سکتا چنانچہ صاف طور پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَ نَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی ۝ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی ۝ یہ تو سہل بات ہے کہ ایک شخص متکبّرانہ طور پر کہہ دے کہ مَیں اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہوں اور باوجود اس دعوٰی کے اس ایمان کے آثار اور ثمرات کچھ بھی پیدا نہ ہوں یہ نری لاف زنی ہوگی۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی کچھ پروا نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ

بھی اُن کی پروانہیں کرتا۔ (الحکم جلد ۹ ۲۹ مورخہ ۱۷ راگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

جو شخص خدا سے ڈرے اور اپنے نفس کو اس کی نفسانی خواہشوں سے روک لیوے سو اُس کا مقام جنت ہوگا جو آرام اور دیدارِ الٰہی کا گھر ہے۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۶)

جو خواہش جائز اپنے مقامِ اعتدال سے بڑھ جائے اس کا نام ھَوٰی ہے۔

(البدر جلد ۲ ۳ مورخہ ۱۶ر فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۸)

سُورۃ عَبَس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

عَبَسَ وَتَوَلّٰۤی۝ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی۝ وَمَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی۝ اَوۡ یَذَّکَّرُ فَتَنۡفَعَہُ الذِّکۡرٰی۝

اِس سُورت کے نازل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ حضرتؐ کے پاس چند قریش کے بڑے بڑے معتبر آدمی بیٹھے تھے آپؐ اُن کو نصیحت کر رہے تھے کہ ایک اندھا آگیا اُس نے کہا کہ مجھ کو دین کے مسائل بتلا دو۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ صبر کرو۔ اِس پر خدا تعالیٰ نے بہت غصّہ کیا۔ آخر آپؐ اس کے گھر گئے اور اُسے بُلا کر لائے اور چادر بچھا دی اور کہا کہ تُو بیٹھ۔ اُس اندھے نے کہا کہ مَیں آپؐ کی چادر پر کیسے بیٹھوں؟ آپؐ نے وہ چادر کیوں بچھائی تھی؟ اِس واسطے کہ خدا تعالیٰ کو راضی کریں۔ تکبّر اور شرارت بُری چیز ہے۔ ایک ذرا سی بات سے ستّر برس کے عمل ضائع ہو جاتے ہیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۷ مورخہ ۲۴ر جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۱۱)

محمد یوسف صاحب اپیل نویس نے بیان کیا کہ حضور موضع مہ کے مباحثہ میں ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا تھا کہ مرزا صاحب تمہاری آنکھ کیوں نہیں اچھی کر دیتے۔ حضرت اقدس نے فرمایا جواب دینا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اندھا تھا جیسے لکھا ہے عَبَسَ وَتَوَلّٰی۔ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی وہ کیوں نہ اچھا ہوُا حالانکہ آپؐ تو افضل الرّسل تھے۔ اور بھی اندھے تھے۔ ایک دفعہ سب نے کہا کہ یا حضرت ہمیں جماعت میں شامل ہونے کی بہت تکلیف ہوتی ہے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ جہاں تک اذان کی آواز پہنچتی ہے وہاں تک کے لوگوں کو ضرور آنا چاہیئے۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۳ مورخہ ۱۴ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۲)

(سورۃ عبس)

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ○ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ○ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ○ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ○ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ○

ایک اَور درجہ دخول جنّت دخول جہنّم ہے جس کو درمیانی درجہ کہنا چاہیئے اور وہ حشر اجساد کے بعد اور جنّتِ عظمٰی یا جہنّمِ کبرٰی میں داخل ہونے سے پہلے حاصل ہوتا ہے اور بوجہ تعلق جسد کامل قوٰی میں ایک اعلیٰ درجہ کی تیزی پیدا ہو کر اور خدا تعالیٰ کی تجلّی رحم یا تجلّی قہر کا حسبِ حالت اپنے کامل طور پر مشاہدہ ہو کر اور جنّتِ عظمٰی کو بہت قریب پا کر یا جہنّمِ کبرٰی کو بہت ہی قریب دیکھ کر وہ لذّات یا عقوبات ترقّی پذیر ہو جاتی ہیں جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ آپ فرماتا ہے ..... وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ..... أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۳۵۹)

○

سُورۃ التّکویر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ○ وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ ○ وَاِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ ○ وَاِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ○ وَاِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ○ وَاِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ○ وَاِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ ○

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ ○

دجّالی زمانہ ..... کی علامات میں جبکہ ارضی علوم وفنون زمین سے نکالے جائیں گے بعض ایجادات اور صناعات کو بطور نمونہ کے بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے ..... وَاِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ اُس وقت اُونٹنی بیکار ہو جائے گی اور اُس کا کچھ قدر و منزلت نہیں رہے گا۔ عِشَار حملدار اُونٹنی کو کہتے ہیں جو عربوں کی نگاہ میں بہت عزیز ہے اور ظاہر ہے کہ قیامت سے اِس آیت کو کچھ بھی تعلق نہیں کیونکہ قیامت ایسی جگہ نہیں جس میں اُونٹ اُونٹنی کو ملے اور حمل ٹھہرے بلکہ یہ ریل کے نکلنے کی طرف اشارہ ہے اور حملدار ہونے کی اِس لئے قید لگادی کہ تا یہ قید دُنیا کے واقعہ پر قرینہ قویہ ہو اور آخرت کی طرف ذرہ بھی وہم نہ جائے ..... وَاِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ اور جس وقت جانیں باہم ملائی جائیں گی۔ یہ تعلقاتِ اقوام اور بلاد کی طرف اشارہ ہے مطلب یہ ہے کہ آخری زمانہ میں بباعث راستوں کے کُھلنے اور انتظامِ ڈاک اور تار برقی کے تعلقات بنی آدم کے بڑھ جائیں گے اور ایک قوم دوسری قوم کو ملے گی اور دُور دُور کے رشتے اور تجارتی اتحاد ہوں گے اور بلادِ بعیدہ کے دوستانہ تعلقات

بڑھ جائیں گے وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ اور جس وقت وحشی آدمیوں کے ساتھ اکٹھے کئے جائیں گے مطلب یہ ہے کہ وحشی قومیں تہذیب کی طرف رجوع کریں گی اور اُن میں انسانیت اور تمیز آئے گی اور اراذل دُنیوی مراتب اور عزت سے ممتاز ہو جائیں گے اور بباعث دنیوی علوم وفنون پھیلنے کے شریفوں اور رذیلوں میں کچھ فرق نہیں رہے گا بلکہ رذیل غالب آجائیں گے یہاں تک کہ کلیدِ دولت اور عنانِ حکومت ان کے ہاتھ میں ہوگی اور مضمون اِس آیت کا ایک حدیث کے مضمون سے بھی ملتا ہے ..... اور فرمایا اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ جس وقت سُورج لپیٹا جاوے گا یعنی سخت ظلمت جہالت اور معصیت کی دُنیا پر طاری ہو جائے گی۔ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ اور جس وقت تارے گدلے ہو جائیں گے یعنی علماء کا نورِ اخلاص جاتا رہے گا۔

(شہادت القرآن صفحہ ۲۱ تا ۲۳)

اِس بات کے ثبوت کے لئے کہ درحقیقت یہ آخری زمانہ ہے جس میں مسیح ظاہر ہو جانا چاہیئے دوطور کے دلائل موجود ہیں (۱) اوّل وہ آیاتِ قرآنیہ اور آثارِ نبویہ جو قیامت کے قُرب پر دلالت کرتے ہیں اور پُورے ہو گئے ہیں جیسا کہ ..... اُونٹوں کی سواری کا موقوف ہو جانا جس کی تشریح آیت وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ سے ظاہر ہے ..... اور سخت قسم کا کسوفِ شمس واقع ہونا جس سے تاریکی پھیل جائے جیسا کہ آیت اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ سے ظاہر ہے اور پہاڑوں کو اپنی جگہ سے اُٹھا دینا جیسا کہ وَاِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ سے سمجھا جاتا ہے اور جو لوگ وحشی اور اراذل اور اِسلامی شرافت سے بے بہرہ ہیں ان کا اقبال چمک اُٹھنا جیسا کہ آیت وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ سے مترشح ہو رہا ہے اور تمام دُنیا میں تعلقات اور ملاقاتوں کا سلسلہ گرم ہو جانا اور سفر کے ذریعہ ایک کا دوسرے کو ملنا سہل ہو جانا جیسا کہ بدیہی طور پر آیت وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ سے سمجھا جاتا ہے اور کتابوں اور رسالوں اور خطوط کا ملکوں میں شائع ہو جانا جیسا کہ آیت وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ سے ظاہر ہو رہا ہے اور علماء کی باطنی حالت کا جو نجومِ اسلام ہیں مکدّر ہو جانا جیسا کہ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ سے صاف معلوم ہوتا ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۰)

منجملہ ان دلائل کے جو میرے مسیح موعود ہونے پر دلالت کرتے ہیں خدا تعالیٰ کے وہ دو نشان ہیں جو دُنیا کو کبھی نہیں بھولیں گے یعنی ایک وہ نشان جو آسمان میں ظاہر ہوا اور دوسرا وہ نشان جو زمین نے ظاہر کیا۔ ..... زمین کا نشان وہ ہے جس کی طرف یہ آیتِ کریمہ قرآن شریف کی وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ اشارہ کرتی ہے جس کی تصدیق میں مسلم میں یہ حدیث موجود ہے وَیُتْرَکُ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْھَا خسوف کسوف کا نشان تو کئی سال ہوئے جو دو مرتبہ ظہور میں آگیا اور اُونٹوں کے چھوڑے جانے اور نئی سواری کا استعمال اگرچہ بلادِ اسلامیہ میں قریباً سو برس سے عمل میں آرہا ہے لیکن یہ پیشگوئی اب خاص طور پر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ

کی ریل طیار ہونے سے پوری ہو جائے گی کیونکہ وہ ریل جو دمشق سے شروع ہو کر مدینہ میں آئے گی وہی مکہ معظمہ میں آئے گی اور امید ہے کہ بہت جلد اور صرف چند سال تک یہ کام تمام ہو جائے گا تب وہ اُونٹ جو تیرہ سو برس سے حاجیوں کو لے کر مکہ سے مدینہ کی طرف جاتے تھے یک دفعہ بے کار ہو جائیں گے اور ایک انقلابِ عظیم عرب اور بلادِ شام کے سفروں میں آ جائے گا چنانچہ یہ کام بڑی سُرعت سے ہو رہا ہے اور تعجب نہیں کہ تین سال کے اندر اندر یہ ٹکڑا مکہ اور مدینہ کی راہ کا تیار ہو جائے اور حاجی لوگ بجائے بدّوؤں کے پتھر کھانے کے طرح طرح کے میوے کھاتے ہوئے مدینہ منورہ میں پہنچا کریں بلکہ غالباً معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تھوڑی ہی مدت میں اُونٹ کی سواری تمام دُنیا میں سے اُٹھ جائے گی اور یہ پیشگوئی ایک چمکتی ہوئی بجلی کی طرح تمام دُنیا کو اپنا نظارہ دکھائے گی اور تمام دُنیا اس کو بچشمِ خود دیکھے گی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ کی ریل کا طیار ہو جانا گویا تمام اسلامی دُنیا میں ریل کا پھر جانا ہے کیونکہ اسلام کا مرکز مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ہے۔ اگر سوچ کر دیکھا جائے تو اپنی کیفیت کے رُو سے خسوف کسوف کی پیشگوئی اور اُونٹوں کے متروک ہونے کی پیشگوئی ایک ہی درجہ پر معلوم ہوتی ہے کیونکہ جیسا کہ خسوف کسوف کا نظارہ کروڑہا انسانوں کو اپنا گواہ بنا گیا ہے ایسا ہی اُونٹوں کے متروک ہونے کا نظارہ بھی ہے بلکہ یہ نظارہ کسوف خسوف سے بڑھ کر ہے کیونکہ خسوف کسوف صرف دو مرتبہ ہو کر اور صرف چند گھنٹہ تک رہ کر دُنیا سے گذر گیا مگر اس نئی سواری کا نظارہ جس کا نام ریل ہے ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا کہ پہلے اُونٹ ہوا کرتے تھے۔ ذرا اس وقت کو سوچو کہ جب مکہ معظمہ سے کئی لاکھ آدمی ریل کی سواری میں ایک ہیئتِ مجموعی میں مدینہ کی طرف جائے گا یا مدینہ سے مکہ کی طرف آئیگا تو اس نئی طرز کے قافلہ میں عین اس حالت میں جس وقت کوئی اہلِ عرب یہ آیت پڑھے گا کہ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ یعنی یاد کر وہ زمانہ جب کہ اُونٹنیاں بیکار کی جائیں گی اور ایک حمل دار اُونٹنی کا بھی قدر نہ رہیگا جو اہلِ عرب کے نزدیک بڑی قیمتی تھی اور جب کوئی حاجی ریل پر سوار ہو کر مدینہ کی طرف جاتا ہوا یہ حدیث پڑھے گا کہ وَیُتْرَکُ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْھَا یعنی مسیح موعود کے زمانہ میں اُونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی اور اُن پر کوئی سوار نہ ہوگا تو سُننے والے اِس پیشگوئی کو سُن کر کس قدر وجد میں آئیں گے اور کس قدر ان کا ایمان قوی ہوگا۔ جس شخص کو عرب کی پُرانی تاریخ سے کچھ واقفیت ہے وہ خوب جانتا ہے کہ اُونٹ اہلِ عرب کا بہت پُرانا رفیق ہے اور عربی زبان میں ہزار کے قریب اُونٹ کا نام ہے اور اُونٹ سے اِس قدر قدیم تعلقات اہلِ عرب کے پائے جاتے ہیں کہ میرے خیال میں بیس ہزار کے قریب عربی زبان میں ایسا شعر ہوگا جس میں اُونٹ کا ذکر ہے اور خدا تعالیٰ خوب جانتا تھا کہ کسی پیشگوئی میں اُونٹوں کے ایسے انقلابِ عظیم کا ذکر کرنا اس سے بڑھ کر اہلِ عرب کے دِلوں پر اثر ڈالنے کے لئے اور پیشگوئی کی عظمت

اُن کی طبیعتوں میں بٹھانے کے لئے اَور کوئی راہ نہیں۔ اِسی وجہ سے یہ عظیم الشان پیشگوئی قرآن شریف میں ذکر کی گئی ہے جس سے ہر ایک مومن کو خوشی سے اُچھلنا چاہیئے کہ خدا نے قرآن شریف میں آخری زمانہ کی نسبت جو مسیح موعود اور یاجوج ماجوج اور دجّال کا زمانہ ہے یہ خبر دی ہے کہ اُس زمانہ میں یہ رفیق قدیم عرب کا یعنی اُونٹ جس پر وہ مکہ سے مدینہ کی طرف جاتے تھے اور بلادِ شام کی طرف تجارت کرتے تھے ہمیشہ کے لئے اُن سے الگ ہو جائے گا۔ سُبحان اللہ! کس قدر روشن پیشگوئی ہے یہاں تک کہ دل چاہتا ہے کہ خوشی سے نعرے ماریں کیونکہ ہماری پیاری کتاب اللہ قرآن شریف کی سچائی اور منجانب اللہ ہونے کے لئے یہ ایک ایسا نشان دُنیا میں ظاہر ہو گیا ہے کہ نہ توریت میں ایسی بزرگ اور کُھلی کُھلی پیشگوئی پائی جاتی ہے اور نہ انجیل میں اور نہ دُنیا کی کسی اَور کتاب میں۔ ہندوؤں کے ایک پنڈت دیانند نام نے ناحق فضول کے طور پر کہا تھا کہ وید میں ریل کا ذکر ہے یعنی پہلے زمانہ میں آریہ ورت (ملکِ ہند) میں ریل جاری تھی مگر جب ثبوت مانگا گیا تو بجز بیہودہ باتوں کے اَور کچھ جواب نہ تھا۔ اور دیانند کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وید میں پیشگوئی کے طور پر ریل کا ذکر ہے کیونکہ دیانند اِس بات کا معترف ہے کہ وید میں کوئی پیشگوئی نہیں بلکہ اس کا صرف یہ مطلب تھا کہ ہندوؤں کے عہدِ سلطنت میں بھی یورپ کے فلاسفروں کی طرح ایسے کاریگر موجود تھے اور اُس زمانہ میں بھی ریل موجود تھی یعنی ہمارے بزرگ بھی انگریزوں کی طرح کئی صنعتیں ایجاد کرتے تھے لیکن قرآن شریف یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ کسی زمانہ میں ملکِ عرب میں ریل موجود تھی بلکہ آخری زمانہ کے لئے ایک عظیم الشان پیشگوئی کرتا ہے کہ اُن دنوں میں ایک بڑا انقلاب ظہور میں آئے گا اور اُونٹوں کی سواری بیکار ہو جائے گی اور ایک نئی سواری دُنیا میں پیدا ہو جائے گی جو اُونٹوں سے مستغنی کر دے گی۔ یہ پیشگوئی جیسا کہ مَیں بیان کر چکا ہوں حدیث مسلم میں بھی موجود ہے جو مسیح موعود کے زمانہ کی علامت بیان کی گئی ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیشگوئی کو قرآن شریف کی اِس آیت سے ہی استنباط کیا ہے یعنی وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ سے۔ یاد رہے کہ قرآن شریف میں دو قسم کی پیشگوئیاں ہیں ایک قیامت کی اور ایک زمانۂ آخری کی۔ مثلاً جیسے یاجوج ماجوج کا پیدا ہونا اور اُن کا تمام ریاستوں پر فائق ہونا۔ یہ پیشگوئی آخری زمانہ کے متعلق ہے اور حدیث مسلم نے پیشگوئی یُتْرَكُ الْقِلَاصُ میں صاف تشریح کر دی ہے اور کھول کھول کر بیان کر دیا ہے کہ مسیح کے وقت میں اُونٹ کی سواری ترک کر دی جائے گی۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۶۴ تا ۶۶)

وَمِنْ عَلَامَاتِ اٰخِرِ الزَّمَانِ الَّتِیْ اَخْبَرَ اللّٰہُ تَعَالٰی مِنْھَا فِی الْقُرْاٰنِ وَاقِعَاتٌ نَادِرَۃٌ تُشَاھِدُوْنَھَا فِیْ

ترجمہ از مرتّب:۔ آخری زمانہ کی علامات سے جن کی خبر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دی ہے۔ وہ وہ واقعات نادرہ

هٰذَا الزَّمَانِ وَتَجِدُوْنَ۔ وَقَدْ بَيَّنَ لَنَا عَلَامَاتِهٖ وَقَالَ اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ۔ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ۔ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۔ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ۔ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ الْاٰيَة۔ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ۔ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ۔ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ۔ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ۔ وَفِيْ كُلِّ ذٰلِكَ اَنْبَاءُ اٰخِرِ الزَّمَانِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ اَمَّا تَسْيِيْرُ الْجِبَالِ فَقَدْ رَاَيْتُمْ بِاَعْيُنِكُمْ اَنَّ الْجِبَالَ كَيْفَ سُيِّرَتْ وَاُزِيْلَتْ مِنْ مَّوَاضِعِهَا وَخِيَامُهَا هُدِمَتْ وَقُنُوْنُهَا لَاقَتِ الْوِهَادَ وَصُفُوْفُهَا تَقَوَّضَتْ۔ تَمْشُوْنَ عَلٰى مَنَاكِبِهَا وَتَافِدُوْنَ...... وَاَمَّا تَعْطِيْلُ الْعِشَارِ فَهُوَ اِشَارَةٌ اِلٰى وَابُوْرِ الْبَرِّ الَّذِيْ عَطَّلَ الْعِشَارَ وَالْقِلَاصَ۔ فَلَا يُسْعٰى عَلَيْهَا۔ وَالْخَلْقُ عَلَى الْوَابُوْرِ يَرْكَبُوْنَ۔ وَيَحْمِلُوْنَ عَلَيْهِ اَوْزَارَهُمْ وَاَثْقَالَهُمْ وَكَطَيِّ الْاَرْضِ مِنْ مُّلْكٍ اِلٰى مُلْكٍ يَصِلُوْنَ۔ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ۔ جَعَلَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْا اَسْرَارَهٗ وَفِيْ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ۔ وَاِذَا وَجَدُوْا صَنْعَةً مِّنْ صَنَائِعِ النَّاسِ وَلَوْ مِنْ اَيْدِي الْكَفَرَةِ يَاْخُذُوْنَهَا لِيَنْتَفِعُوْا بِهَا

ہیں جن کا تم اِس زمانہ میں مشاہدہ کر رہے ہو اور جن کو تم موجود پاتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آخری زمانہ کی علامات ہمارے لئے کھول کر بیان کی ہیں چنانچہ فرمایا اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ۔ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۔ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ۔ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ الْاٰيَة۔ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ۔ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ۔ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ۔ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ان تمام آیات میں غور کرنے والے لوگوں کے لئے آخری زمانہ کی علامات بیان ہوئی ہیں۔ تَسْيِيْرُ الْجِبَالِ کو لو تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ کس طرح سے پہاڑ چلائے گئے اور انہیں ان کی جگہوں سے ہٹا دیا گیا۔ اور ان کے خیمے گرا دئے گئے۔ اور ان کی چوٹیاں پست ہوگئیں۔ اور ان کے سلسلے ایسے ہموار ہوگئے کہ تم ان کے اطراف میں چلتے پھرتے اور وہاں آتے جاتے ہو...... اُونٹنیاں بیکار ہوجانے سے ریل گاڑی کی طرف اشارہ ہے جس نے اُونٹنیوں کو بیکار کر دیا ہے۔ ان پر اب تیز رفتاری سے سفر نہیں کیا جاتا ریل گاڑی پر ہی لوگ سوار ہوتے ہیں اور اس پر اپنا اسباب اور بوجھ لادتے ہیں اور زمین کے اطراف کو لپیٹنے کی مانند وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر اور دوسرے لوگوں پر بڑا فضل ہے لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر پردہ ڈال کر انہیں اس بات کے اسرار کو سمجھنے سے روک دیا ہے اور ان کے کانوں میں بہرہ پن پیدا کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ سُن نہیں سکتے۔ اور جب وہ لوگوں کی کسی صنعت کو دیکھتے ہیں خواہ وہ کافروں کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہو

وَإِذَا رَأَوْا صَنْعَةَ رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ فَيَرُدُّوْنَ۔ وَ أَمَّا تَزْوِيْجُ النُّفُوْسِ فَهُوَ عَلٰى أَنْحَاءٍ۔ مِنْهَا إِشَارَةٌ إِلَى التِّلِغْرَافِ الَّذِيْ يَمُدُّ النَّاسَ فِيْ كُلِّ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ وَيَأْتِيْ بِأَخْبَارِ أَعِزَّةٍ كَانُوْا بِأَقْصَى الْأَرْضِ فَيُنَبِّئُ عَنْ حَالَاتِهِمْ قَبْلَ أَنْ يَّقُوْمَ الْمُسْتَفْسِرُ مِنْ مَقَامِهٖ وَيُدِيْرُ بَيْنَ الْمَشْرِقِيِّ وَالْمَغْرِبِيِّ سُوَالًا وَجَوَابًا كَأَنَّهُمْ مُلَاقُوْنَ۔ وَيُخْبِرُ الْمُضْطَرِّيْنَ بِأَسْرَعِ سَاعَةٍ مِنْ أَحْوَالِ أَشْخَاصٍ هُمْ فِيْ أَمْرِهِمْ مُشْفِقُوْنَ۔ فَلَا شَكَّ أَنَّهٗ يُزَوِّجُ نَفْسَيْنِ مِنْ مَكَانَيْنِ بَعِيْدَيْنِ۔ فَيُكَلِّمُ بَعْضُهُمْ بِالْبَعْضِ كَأَنَّهٗ لَا حِجَابَ بَيْنَهُمْ وَكَأَنَّهُمْ مُتَقَارِبُوْنَ۔ وَمِنْهَا إِشَارَةٌ إِلَى أَمْنِ طُرُقِ الْبَحْرِ وَالْبَرِّ وَرَفْعِ الْحَرَجِ فَيَسِيْرُ النَّاسُ مِنْ بِلَادٍ إِلٰى بِلَادٍ وَلَا يَخَافُوْنَ۔ وَلَا شَكَّ أَنَّ فِيْ هٰذَا الزَّمَانِ زَادَتْ تَعَلُّقَاتُ الْبِلَادِ بِالْبِلَادِ وَتَعَارَفَ النَّاسُ بِالنَّاسِ فَهُمْ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ يُزَوَّجُوْنَ۔ وَزَوَّجَ اللّٰهُ التُّجَّارَ بِالتُّجَّارِ وَأَهْلَ الثُّغُوْرِ بِأَهْلِ الثُّغُوْرِ وَأَهْلُ الْحِرْفَةِ بِأَهْلِ الْحِرْفَةِ فَهُمْ فِيْ جَلْبِ النَّفْعِ وَدَفْعِ الضَّرِّ مُتَشَارِكُوْنَ

وہ اسے لے لیتے ہیں تا اس سے فائدہ اُٹھائیں لیکن جب اللہ تعالیٰ کی رحمت کی کوئی صنعت دیکھتے ہیں تو وہ اسے ٹھکرا دیتے ہیں۔ اور نفوس کے ملانے کی علامت کئی طریق سے پُوری ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک تو ٹیلیگراف (تار برقی) کی طرف اشارہ ہے جو ہر تنگی کے وقت میں لوگوں کی مدد کرتا ہے اور زمین کے دُور افتادہ حصّوں میں رہنے والے عزیزوں کی خبر لاتا ہے اور قبل اس کے کہ دریافت کرنے والا اپنی جگہ سے اُٹھے تار برقی اسکے عزیزوں کی خبر دے دیتی ہے اور مغربی اور مشرقی شخص کے درمیان سوال وجواب کا سلسلہ چلا دیتی ہے، گویا کہ وہ آپس میں ملاقات کر رہے ہیں۔ پھر وہ ان پریشان ومضطر لوگوں کو ان لوگوں کے حالات سے بہت جلد اطلاع پہنچا دیتی ہے جن کے متعلق وہ فکرمند ہوتے ہیں۔ پس اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دُور بیٹھے ہوئے اشخاص کو ملا دیتی ہے اور ان میں سے ایک دوسرے کے ساتھ یوں بات کرتا ہے کہ گویا ان کے درمیان کوئی روک نہ ہو اور وہ ایک دوسرے کے بالکل قریب ہوں۔ اور لوگوں کے آپس میں ملانے سے اِس طرف اشارہ ہے کہ بحری اور برّی راستوں پر امن ہوگا اور سفر کی مشکلات دُور ہو جائیں گی اور لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک تک بغیر کسی خوف وخطر کے سفر کر سکیں گے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانہ میں ملکوں کے ملکوں کے ساتھ تعلقات زیادہ ہوگئے ہیں اور لوگوں کا ایک دوسرے سے تعارف بڑھ گیا ہے۔ پس گویا کہ وہ ہر روز ایک دوسرے سے ملائے جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے تاجروں کو تاجروں سے اور ایک سرحد کے رہنے والوں کو دوسری سرحد کے رہنے والوں کے ساتھ اور ایک حرفہ والوں کو دوسرے حرفہ والوں کے ساتھ ملا دیا ہے اور وہ نفع حاصل کرنے اور نقصان کو دُور کرنے میں باہم شریک ہوگئے ہیں

وَفِیْ كُلِّ نِعْمَةٍ وَسُرُوْرٍ وَلِبَاسٍ وَطَعَامٍ وَحُبُوْرٍ مُتَعَاوِنُوْنَ۔ وَيُجْلَبُ كُلُّ شَیْءٍ مِنْ خِطَّةٍ اِلٰى خِطَّةٍ فَانْظُرْ كَيْفَ زَوَّجَ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ فِیْ قَارِبٍ وَاحِدٍ جَالِسُوْنَ۔ وَمِنْ اَسْبَابِ هٰذَا التَّزْوِيْجِ سَيْرُ النَّاسِ فِیْ وَابُوْرِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ فَهُمْ فِیْ تِلْكَ الْاَسْفَارِ يَتَعَارَفُوْنَ۔ وَمِنْ اَسْبَابِهٖ مَكْتُوْبَاتٌ قَدْ اُحْسِنَتْ طُرُقُ اِرْسَالِهَا فَتَرٰى اَنَّهَا تُرْسَلُ اِلٰى اَقَاصِی الْاَرْضِ وَاَرْجَائِهَا۔ وَاِنْ اَمْعَنْتَ النَّظَرَ فَتُعْجِبُكَ كَثْرَةُ اِرْسَالِهَا وَلَنْ تَجِدَ نَظِيْرَهَا فِیْ اَوَّلِ الزَّمَانِ وَكَذٰلِكَ تُعْجِبُكَ كَثْرَةُ الْمُسَافِرِيْنَ وَالتُّجَّارِيْنَ فَتِلْكَ وَسَائِلُ تَزْوِيْجِ النَّاسِ وَتَعَارُفِهِمْ۔ مَا كَانَ مِنْهَا اَثَرٌ مِنْ قَبْلُ وَاِنِّیْ اَنْشُدُكُمُ اللّٰهَ اَرَاَيْتُمْ مِثْلَهَا قَبْلَ هٰذَا۔ اَوْ كُنْتُمْ فِیْ كُتُبٍ تَقْرَءُوْنَ۔ وَاَمَّا نَشْرُ الصُّحُفِ فَهُوَ اِشَارَةٌ اِلٰى وَسَائِلِهَا الَّتِیْ هِیَ الْمَطَابِعُ كَمَا تَرٰى اَنَّ اللّٰهَ بَعَثَ قَوْمًا اَوْجَدُوْا اٰلَاتِ الطَّبْعِ فَكَاَيِّنْ مِنْ مَطْبَعٍ يُوْجَدُ فِی الْهِنْدِ وَغَيْرِهٖ مِنَ الْبِلَادِ ذٰلِكَ فِعْلُ اللّٰهِ لِيَنْصُرَنَا فِیْ اَمْرِنَا وَلِيُشِيْعَ دِيْنَنَا وَكُتُبَنَا وَيُبَلِّغَ مَعَارِفَنَا اِلٰى كُلِّ قَوْمٍ لَعَلَّهُمْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْهِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ..... وَاَمَّا حَشْرُ الْوُحُوْشِ فَهُوَ اِشَارَةٌ اِلٰى

اور وہ ہر نعمت، سرور، لباس، کھانے اور سامانِ آسائش میں ایک دوسرے کے معاون بن گئے ہیں۔ اور ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں ہر چیز لائی جاتی ہے پس دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ملا دیا ہے گویا کہ وہ ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ نیز آپس میں ملانے کے ان سامانوں میں خشکی اور تری کی گاڑیوں میں لوگوں کا سفر کرنا ہے۔ وہ ان سفروں کے دَوران ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔ اور ملائے جانے کے اِن اسباب میں ایک خطوط کا سِلسلہ بھی ہے جس کے بھجوانے کے وسائل بہت عمدہ بنا دئے گئے ہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ خطوط کیسے دُنیا کے کناروں تک بھیجے جا سکتے ہیں اور اگر تم اِس بارے میں غور کرو تو تمہیں ان کی کثرتِ ترسیل تعجب میں ڈالے گی اور تم اِس کی پہلے زمانوں میں نظیر نہیں پاؤ گے اور اسی طرح تم کو مسافروں اور تاجروں کی کثرت بھی تعجّب میں ڈالے گی۔ سو یہ سب لوگوں کے آپس میں ملانے اور ان کے آپس میں تعارف کے اسباب و ذرائع ہیں جن کا اس سے قبل نام ونشان تک بھی نہ تھا۔ اور مَیں تمہیں اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ کیا تم نے اس سے قبل کبھی ایسا دیکھا یا کیا تم نے اِس سے قبل کتابوں میں یہ سب باتیں پڑھی ہیں۔ اور نشرِ صحف سے اسکے ان وسائل یعنی پریس وغیرہ کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی قوم کو پیدا کیا جس نے آلاتِ طبع ایجاد کئے۔ دیکھو کس قدر پریس ہیں جو ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے تا وہ ہمارے کام میں ہماری مدد کرے اور ہمارے دین اور ہماری کتابوں کو پھیلائے اور ہمارے معارف کو ہر قوم تک پہنچائے تا وہ ان کی طرف کان دھریں اور ہدایت پائیں ..... وحشیوں کے اکٹھا کئے جانے سے اِس طرف اشارہ ہے

كَثْرَةِ الْجَاهِلِيْنَ الْفَاسِقِيْنَ وَذَهَابِ الدِّيَانَةِ وَالتَّقْوٰى فَتَرَوْنَ بِاَعْيُنِكُمْ كَيْفَ نُزِحَ بِئْرُ الصَّلَاحِ وَاَصْبَحَ مَاءُهٗ غَوْرًا وَاَكْثَرُ الْخَلْقِ يَسْعَوْنَ اِلَى الشَّرِّ وَفِيْ اُمُوْرِ الدِّيْنِ يُدْهِنُوْنَ۔ اِذَا رَاَوْا شَرًّا فَيَاْخُذُوْنَهٗ وَاِذَا رَاَوْا خَيْرًا فَهُمْ عَلٰى اَعْقَابِهِمْ يَنْقَلِبُوْنَ۔ يَنْظُرُوْنَ اِلٰى صَنَائِعِ الْكَفَرَةِ بِنَظَرِ الْحُبِّ وَعَنْ صُنْعِ اللّٰهِ يُعْرِضُوْنَ۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۴۶۸ تا ۴۷۴)

قرآن شریف میں آخری زمانہ کے بعض جدید حالات کی نسبت ایسی خبریں دی گئی ہیں جیساکہ اس میں ایک یہ پیشگوئی ہے کہ آخری زمانہ میں اُونٹ بیکار ہو جائیں گے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان دِنوں میں ایک نئی سواری پیدا ہو جائے گی چنانچہ قرآن شریف کی پیشگوئی کے الفاظ یہ ہیں وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ یعنی وہ آخری زمانہ جب اُونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی اور بیکار ہونا تبھی ہوتا ہے کہ جب ان پہ سوار ہونے کی حاجت نہ ہو اور اس سے صریح طور پر نکلتا ہے کہ اُونٹنیوں کی جگہ کوئی اَور سواری پیدا ہو جائے گی۔ اِس آیت کی تشریح کتاب صحیح مسلم میں موجود ہے۔ اس میں یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھی ہے وَیُتْرَکُ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْهَا یعنی مسیح موعود کے زمانہ میں اُونٹنیاں ترک کی جائیں گی اور کسی منزل تک جلد پہنچنے کے لئے اور دوڑ کر جانے کے لئے وہ کام نہیں آئیں گی یعنی کوئی ایسی سواری پیدا ہو جائے گی کہ بہ نسبت اُونٹنیوں کے بہت جلد منزلِ مقصود تک پہنچائے گی۔ غرض یُسْعٰی کا لفظ جو حدیث میں ہے اِس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ دوڑنے کے کام میں اُونٹ سے بہتر کوئی اَور سواری نکل آوے گی۔ یہ عجیب بات ہے کہ صحیح مسلم میں جس جگہ مسیح موعود کے زمانہ کا ذکر ہے اُسی جگہ یہ حدیث اُونٹنیوں کے ترک کرنے کے بارہ میں ہے اور یہ پیشگوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے تیرہ سو برس بعد پوری ہوئی چنانچہ اِن دنوں میں یہ کوشش بھی ہو رہی ہے کہ ایک سال تک مکّہ اور مدینہ میں ریل جاری کر دی جائے پس اُس وقت جب ریل جاری ہو جائے گی یہ نظارہ ہر ایک مومن کے لئے ایمان کو زیادہ کرنے والا ہوگا اور جس وقت ہزارہا اُونٹ بیکار ہو کر بجائے انکے

کہ جاہلوں اور فاسقوں کی کثرت ہو جائے گی اور دیانت اور تقوٰی ختم ہو جائے گا۔ سو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ کس طرح نیکی کا کنواں خشک ہو گیا ہے اور اس کا پانی نیچے چلا گیا ہے اور اکثر لوگ شر کی طرف دوڑے چلے جاتے ہیں لیکن امورِ دین میں مداہنت سے کام لیتے ہیں۔ جب وہ کوئی بُری بات دیکھتے ہیں تو اسے اختیار کر لیتے ہیں اور جب کوئی نیکی دیکھتے ہیں تو اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاتے ہیں۔ وہ کافروں کی بنی ہوئی چیزوں کو محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صنعتوں سے اعراض کرتے ہیں۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۴۶۸ تا ۴۷۴)

ریل گاڑیاں مکّہ سے مدینہ تک جائیں گی اور دمشق اور دوسری اطراف شام وغیرہ کے حج کرنے والے کئی لاکھ انسان ریل گاڑیوں میں سوار ہوکر مکّہ معظمہ میں پہنچیں گے تب کوئی لعنتی آدمی ہوگا کہ اس نظارہ کو دیکھ کر اپنے سچے دل سے اِس بات کی تصدیق نہیں کرے گا کہ وہ پیشگوئی جو قرآن شریف اور حدیث صحیح مسلم میں موجود ہے آج پوری ہوگئی۔

یاد رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کے لئے یہ ایک عظیم الشّان نشان ہے کہ آپ نے تیرہ سو[۱۳۰۰] برس پہلے ایک نئی سواری کی خبر دی ہے اور اس خبر کو قرآن شریف اور حدیث صحیح دونوں مل کر پیش کرتے ہیں۔ اگر قرآن شریف خدا کا کلام نہ ہوتا تو اِنسانی طاقت میں یہ بات ہرگز داخل نہ تھی کہ ایسی پیشگوئی کی جاتی کہ جس چیز کا وجود ہی ابھی دُنیا میں نہ تھا اُس کے ظہور کا حال بتایا جاتا جبکہ خدا کو منظور تھا کہ اِس پیشگوئی کو ظہور میں لاوے۔ تب اُس نے ایک انسان کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ وہ ایسی سواری ایجاد کرے کہ جو آگ کے ذریعہ سے ہزاروں کوسوں تک پہنچا دے۔

ایسا ہی قرآن شریف میں آخری زمانہ کی نسبت اَور بھی پیشگوئیاں ہیں اُن میں سے ایک یہ پیشگوئی بھی ہے وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ یعنی آخری زمانہ وہ ہوگا جبکہ کتابوں اور صحیفوں کی اشاعت بہت ہوگی گویا اِس سے پہلے کبھی ایسی اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ یہ اُن کلوں کی طرف اشارہ ہے جن کے ذریعہ سے آجکل کتابیں چھپتی ہیں اور پھر ریل گاڑی کے ذریعہ سے ہزاروں کوسوں تک پہنچائی جاتی ہیں۔

ایسا ہی قرآن شریف میں آخری زمانہ کی نسبت یہ پیشگوئی ہے کہ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ یعنی آخری زمانہ میں ایک یہ واقعہ ہوگا کہ بعض نفوس بعض سے ملائے جاویں گے یعنی ملاقاتوں کے لئے آسانیاں نکل آئینگی اور لوگ ہزاروں کوسوں سے آئیں گے اور ایک دوسرے سے ملیں گے سو ہمارے زمانہ میں یہ پیشگوئی بھی پوری ہوگئی ..... اِسی طرح قرآن شریف میں ایک یہ پیشگوئی ہے وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ یعنی وہ آخری زمانہ ہوگا جبکہ پہاڑ چلائے جائیں گے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پہاڑ اُڑائے جائیں گے جیسا کہ اِس زمانہ میں توپوں کے ساتھ پہاڑوں کو اُڑا کر اُن میں راستے بنائے گئے ہیں۔ یہ تمام پیشگوئیاں قرآن شریف میں موجود ہیں۔ مگر اِس جگہ یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیئے کہ عِشَار اُن اُونٹنیوں کو کہتے ہیں جو حمل دار ہوں اور اگرچہ حدیث میں قِلَاص کا لفظ ہے مگر قرآن شریف میں اِس لئے عِشَار کا لفظ استعمال کیا گیا تا یہ پیشگوئی قیامت کی طرف منسوب نہ کی جائے اور حمل کے قرینہ سے یہ دُنیا کا واقعہ سمجھا جائے کیونکہ قیامت کو حمل نہیں ہونگے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۳۰۶ تا ۳۰۸)

خدا نے اِس آخری زمانہ کے بارے میں جس میں تمام قومیں ایک مذہب پر جمع کی جائیں گی صرف ایک

ہی نشان بیان نہیں فرمایا بلکہ قرآن شریف میں اور بھی کئی نشان لکھے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ کہ...... ایسے اسباب پیدا ہو جائیں گے جس کے ذریعہ سے کتابیں بکثرت ہو جائیں گی (یہ چھاپنے کے آلات کی طرف اشارہ ہے) اور ایک یہ کہ اُن دنوں میں ایک ایسی سواری پیدا ہو جائے گی کہ اُونٹوں کو بیکار کر دے گی اور اسکے ذریعہ سے ملاقاتوں کے طریق سہل ہو جائیں گے اور ایک یہ کہ دُنیا کے باہمی تعلقات آسان ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کو بآسانی خبریں پہنچا سکیں گے..... یہ سب علامتیں اِس زمانہ میں پوری ہو گئیں۔ عقلمند کے لئے صاف اور روشن راہ ہے کہ ایسے وقت میں خدا نے مجھے مبعوث فرمایا جب کہ قرآن شریف کی لکھی ہوئی تمام علامتیں میرے ظہور کے لئے ظاہر ہو چکی ہیں۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۳۷، ۳۸)

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۔ اِسی زمانہ کی نسبت مسیح موعود کے ضمن بیان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی خبر دی جو صحیح مسلم میں درج ہے اور فرمایا لَیُتْرَکَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْھَا یعنی مسیح موعود کے زمانہ میں اُونٹنی کی سواری موقوف ہو جائے گی پس کوئی ان پر سوار ہو کر ان کو نہیں دوڑائے گا اور یہ ریل کی طرف اشارہ تھا کہ اس کے نکلنے سے اُونٹوں کے دوڑانے کی حاجت نہیں رہے گی اور اُونٹ کو اِس لئے ذکر کیا کہ عرب کی سواریوں میں سے بڑی سواری اُونٹ ہی ہے جس پر وہ اپنے مختصر گھر کا تمام اسباب رکھ کر پھر سوار بھی ہو سکتے ہیں اور بڑے کے ذکر میں چھوٹا خود ضمناً آجاتا ہے۔ پس حاصل مطلب یہ تھا کہ اِس زمانہ میں ایسی سواری نکلے گی کہ اُونٹ پر بھی غالب آجائے گی جیسا کہ دیکھتے ہو کہ ریل کے نکلنے سے قریباً وہ تمام کام جو اُونٹ کرتے تھے اَب ریلیں کر رہی ہیں۔ پس اِس سے زیادہ صاف اور منکشف اَور کیا پیشگوئی ہوگی چنانچہ اِس زمانہ کی قرآن شریف نے بھی خبر دی ہے جیسا کہ فرماتا ہے وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ یعنی آخری زمانہ وہ ہے کہ جب اُونٹنی بیکار ہو جائے گی۔ یہ بھی صریح ریل کی طرف اشارہ ہے اور وہ حدیث اور یہ آیت ایک ہی خبر دے رہی ہیں اور چونکہ حدیث میں صریح مسیح موعود کے بارے میں یہ بیان ہے اِس سے یقیناً یہ استدلال کرنا چاہیئے کہ یہ آیت بھی مسیح موعود کے زمانہ کا حال بتلا رہی ہے اور اجمالاً مسیح موعود کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

(شہادت القرآن صفحہ ۱۲)

عام دعوت کا زمانہ جو مسیح موعود کا زمانہ ہے وہ ہے جب کہ اُونٹ بیکار ہو جائیں گے یعنی کوئی ایسی نئی سواری پیدا ہو جائے گی جو اُونٹوں کی حاجت نہیں پڑے گی اور حدیث میں بھی ہے کہ لَیُتْرَکُ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْھَا یعنی اس زمانہ میں اُونٹ بیکار ہو جائیں گے اور یہ علامت کسی اَور نبی کے زمانہ کو نہیں دی گئی۔ سو شکر کرو کہ آسمان پر نور پھیلانے کے لئے تیاریاں ہیں۔ زمین میں زمینی برکات کا ایک جوش ہے۔ یعنی سفر اور حضر میں۔ اور ہر ایک بات میں وہ آرام تم دیکھ رہے ہو جو تمہارے باپ دادوں نے نہیں دیکھے۔ گویا

دُنیا نئی ہوگئی ہے۔ بے بہار کے میوے ایک ہی وقت میں مل سکتے ہیں۔ چھ مہینے کا سفر چند روز میں ہو سکتا ہے ہزاروں کوسوں کی خبریں ایک ساعت میں آسکتی ہیں۔ ہر ایک کام کی سہولت کے لئے مشینیں اور کلیں موجود ہیں اگر چاہو تو ریل میں یوں سفر کر سکتے ہیں جیسے گھر کے ایک بستان سرائے میں پس کیا زمین پر ایک اِنقلاب نہیں آیا۔ پس جبکہ زمین میں ایک اعجوبہ نما اِنقلاب پیدا ہو گیا اِس لئے خدائے قادر چاہتا ہے کہ آسمان میں بھی ایک اعجوبہ نما اِنقلاب پیدا ہو جائے اور یہ دونوں مسیح کے زمانہ کی نشانیاں ہیں۔

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد صفحہ ۱۶، ۱۷)

چونکہ ریل کا وجود اور اُونٹوں کا بیکار ہونا مسیح موعود کے زمانہ کی نشانی ہے اور مسیح کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ بہت سیاحت کرنے والا۔ تو گویا خدا نے مسیح کے لئے اور اس کے نام کے معنے متحقق کرنے کیلئے اور نیز اس کی جماعت کے لئے جو اُسی کے حکم میں ہیں ریل کو ایک سیاحت کا وسیلہ پیدا کیا ہے تا وہ سیاحتیں جو پہلے مسیح نے ایک سَو بیس برس تک بصد محنت پوری کی تھیں اس مسیح کے لئے صرف چند ماہ میں وہ تمام سیر وسیاحت میسّر آجائے اور یہ یقینی امر ہے کہ جیسے اس زمانہ کا ایک مامور من اللہ ریل کی سواری کے ذریعہ سے خوشی اور آرام سے ایک بڑے حصّہ دُنیا کا چکّر لگا کر اور سیاحت کر کے اپنے وطن میں آسکتا ہے۔ یہ سامان پہلے نبیوں کے لئے میسّر نہیں تھا اِس لئے مسیح کا مفہوم جیسے اِس زمانہ میں جلد پورا ہو سکتا ہے کسی دوسرے زمانہ میں اس کی نظیر نہیں۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۶۴ حاشیہ)

قرآن شریف میں ..... بہت سی پیشگوئیاں ہیں جو اِس ہمارے زمانہ میں پوری ہوگئی ہیں جیسے ...... اُونٹوں کے بیکار ہونے اور مکّہ اور مدینہ میں ریل جاری ہونے کی پیشگوئی جو آیت وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ سے صاف طور پر سمجھی جاتی ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۸۳)

ابھی مکّہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے لوگوں کے لئے ایک بھاری نشان ظاہر ہوا ہے اور وہ یہ کہ تیرہ سَو برس سے مکّہ سے مدینہ میں جانے کے لئے اُونٹوں کی سواری چلی آتی تھی اور ہر ایک سال کئی لاکھ اُونٹ مکّہ سے مدینہ کو اور مدینہ سے مکّہ کو جاتا تھا اور ان اُونٹوں کے متعلق قرآن اور حدیث میں بالاتفاق یہ پیشگوئی تھی کہ ایک وہ زمانہ آتا ہے کہ یہ اُونٹ بیکار کئے جائیں گے اور کوئی اُن پر سوار نہیں ہوگا چنانچہ آیت وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ اور حدیث یُتْرَكُ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْهَا اِس کی گواہ ہے۔ پس یہ کس قدر بھاری پیشگوئی ہے جو مسیح کے زمانہ کے لئے اور مسیح موعود کے ظہور کے لئے بطور علامت تھی جو ریل کی تیاری سے پوری ہوگئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ۔ (اربعین ۲ صفحہ ۲۷ حاشیہ)

یہ بھی احادیث میں آیا تھا کہ مسیح کے وقت میں اُونٹ ترک کئے جائیں گے اور قرآن شریف میں بھی

وارد تھا کہ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۔ اب یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ مکّہ اور مدینہ میں بڑی سرگرمی سے ریل تیار ہو رہی ہے اور اُونٹوں کے الوداع کا وقت آگیا۔ اور پھر اِس نشان سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھاتے۔
(اربعین ۳ صفحہ ۱۲)

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اُن دنوں میں اُونٹ بیکار ہو جائیں گے اور یہ ریل کی طرف اشارہ تھا جیسا کہ قرآن شریف میں بھی ہے وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۵۳)

مَیں وہی ہوں جس کے وقت میں اُونٹ بیکار ہوگئے اور پیشگوئی آیت کریمہ وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ پوری ہوئی اور پیشگوئی حدیث وَ لَیُتْرَکَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْهَا نے اپنی پوری پوری چمک دکھلادی یہاں تک کہ عرب اور عجم کے اڈیٹران اخبار اور جرائد والے بھی اپنے پرچوں میں بول اُٹھے کہ مدینہ اور مکّہ کے درمیان جو ریل تیار ہو رہی ہے یہی اُس پیشگوئی کا ظہور ہے جو قرآن اور حدیث میں ان لفظوں سے کی گئی تھی جو مسیح موعود کے وقت کا یہ نشان ہے۔ (اعجاز احمدی صفحہ ۲)

قرآن اور حدیث دونوں بتلا رہے ہیں کہ مسیح کے زمانہ میں اُونٹ بیکار ہو جائیں گے یعنی اُن کے قائم مقام کوئی اَور سواری پیدا ہو جائے گی۔ یہ حدیث مسلم میں موجود ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں وَ لَیُتْرَکَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْهَا اور قرآن کے الفاظ یہ ہیں وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ شیعوں کی کتابوں میں بھی یہ حدیث موجود ہے مگر کیا کسی نے اِس نشان کی کچھ پرواہ کی۔ ابھی عنقریب اس پیشگوئی کا دلکش نظارہ مکّہ اور مدینہ کے درمیان نمایاں ہونے والا ہے جبکہ اُونٹوں کی ایک لمبی قطار کی جگہ ریل کی گاڑیاں نظر آئیں گی اور تیرہ سَو برس کی سواریوں میں اِنقلاب ہو کر ایک نئی سواری پیدا ہو جائے گی اس وقت ان مسافروں کے سر پر جب یہ آیت وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ اور یہ حدیث وَ لَیُتْرَکَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْهَا پڑھی جائے گی تو کیسے اِنشراحِ صدر سے ان کو ماننا پڑے گا کہ یہ درحقیقت آج کے دن کے لئے ایک نشان تھا اور ایک عظیم الشان پیشگوئی تھی جو ہمارے نبی کریم کے مبارک لبوں سے نکلی اور آج پوری ہوئی۔ (نزول المسیح صفحہ ۲۸)

مَیں وہ شخص ہوں جس کے زمانہ میں اس ملک میں ریل جاری ہو کر اُونٹ بیکار کئے گئے اور عنقریب وہ وقت آتا ہے بلکہ بہت نزدیک ہے جبکہ مکّہ اور مدینہ کے درمیان ریل جاری ہو کر وہ تمام اُونٹ بیکار ہو جائیں گے جو تیرہ سَو برس سے یہ سفرِ مبارک کرتے تھے تب اس وقت ان اُونٹوں کی نسبت وہ حدیث جو صحیح مسلم میں موجود ہے صادق آئے گی یعنی یہ کہ لَیُتْرَکَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْهَا یعنی مسیح کے وقت ۔ اُونٹ بیکار کئے جائیں گے اور کوئی اُن پر سفر نہیں کرے گا۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۴۳)

ایک نئی سواری جس کی طرف قرآن شریف اور حدیثوں میں اشارہ تھا وہ بھی ظہور میں آگئی یعنی سواری

ریل ۔ جو اُونٹوں کے قائم مقام ہو گئی جیسا کہ قرآن شریف میں ہے وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ یعنی وہ آخری زمانہ جب اُونٹنیاں بیکار کی جائیں گی اور جیسا کہ حدیث مسلم میں مسیح موعود کے ظہور کے علامات میں سے ہے وَلَيُتْرَكَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا يُسْعٰى عَلَيْهَا یعنی تب اُونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی اور اُن پر کوئی سوار نہ ہو گا سو ظاہر ہے کہ وہ زمانہ آ گیا۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۱۸۷)

اپنی تائید میں آسمانی نشانات کا ذکر کرتے ہوئے حضور تحریر فرماتے ہیں :۔

چوتھا نشان ایک نئی سواری کا نکلنا ہے جو مسیح موعود کے ظہور کی خاص نشانی ہے جیسا کہ قرآن شریف میں لکھا ہے وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ یعنی آخری زمانہ وہ ہے جب اُونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی اور ایسا ہی حدیث مسلم میں ہے وَلَيُتْرَكَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا يُسْعٰى عَلَيْهَا یعنی اس زمانہ میں اُونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی اور کوئی ان پر سفر نہیں کرے گا۔ ایّامِ حج میں مکّہ معظمہ سے مدینہ منوّرہ کی طرف اُونٹنیوں پر سفر ہوتا ہے۔ اب وہ دن بہت قریب ہے کہ اس سفر کے لئے ریل طیار ہو جائے گی تب اس سفر پر یہ صادق آئے گا کہ يُتْرَكَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا يُسْعٰى عَلَيْهَا ......

چھٹا نشان کتابوں اور نوشتوں کا بکثرت شائع ہونا جیسا کہ آیت وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ بباعث چھاپہ کی کلوں کے جس قدر اس زمانہ میں کثرت اشاعت کتابوں کی ہوئی ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں ......

آٹھواں نشان نوعِ انسان کی باہمی تعلّقات کا بڑھنا اور ملاقاتوں کا طریق سہل ہو جانا ہے جیسا کہ آیت وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ سے ظاہر ہے سو بذریعہ ریل اور تار کے یہ امر ایسا ظہور میں آیا کہ گویا دُنیا بدل گئی ہے۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۹۸)

حقیقت میں یہ ریلوے مسیح موعود کا ایک نشان ہے۔ قرآن شریف میں بھی اِس کی طرف اشارہ ہے وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ......

...... یہ لوگ اگر غور کریں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ يُتْرَكَنَّ الْقِلَاصُ میں ریل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اگر اس سے ریل مراد نہیں تو پھر اُن کا فرض ہے کہ وہ حادثہ بتائیں جس سے اُونٹ ترک کئے جاویں۔ پہلی کتابوں میں بھی اشارہ ہے کہ اس وقت آمد و رفت سہل ہو جائے گی۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

ریل کے ذکر پر فرمایا :۔

اِس زمانہ میں خدا تعالیٰ نے ہماری جماعت کو فائدہ پہنچایا ہے کہ سفر کو بہت آرام ہے ورنہ کہاں

سے کہاں ٹھوکریں کھاتا ہؤا انسان ایک سے دوسرے مقام پر پہنچتا تھا۔ مدراس جہاں سیٹھ عبد الرحمٰن صاحب ہیں اگر کوئی جاتا تو گرمیوں میں روانہ ہوتا اور سردیوں میں پہنچتا تھا۔ اس زمانہ کی نسبت خدا نے خبر دی ہے وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ کہ جب ایک اقلیم کے لوگ دوسرے اقلیم والوں کے ساتھ ملیں گے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳ مورخہ ۶ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۱)

وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ یعنی اس وقت خط و کتابت کے ذریعے عام ہوں گے اور کتب کثرت سے دستیاب ہوسکیں گے۔ وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ اس وقت اُونٹنیاں بیکار ہوں گی۔ ایک زمانہ تھا کہ یہاں ہزارہا اُونٹ آیا کرتے مگر اب نام و نشان بھی نہیں اور مکّہ میں بھی اب نہ رہیں گے۔ ریل کے جاری ہونے کی دیر ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴ مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۶)

اِس وقت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اَور خرابیوں کے علاوہ اسلام کو بھی مُردہ مذہب بتایا جاتا ہے حالانکہ نہ وہ کبھی مُردہ ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے اس کی زندگی کے ثبوت میں آسمان سے نشان دکھائے ...... وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ کے موافق ریلیں بھی جاری ہوئیں۔ غرض وہ نشان جو اِس زمانہ کے لئے رکھے تھے پورے ہوئے مگر یہ کہتے ہیں کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴)

وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ کے موافق اُونٹنیاں بیکار ہوگئیں جو اس آخری زمانہ کا ایک نشان ٹھہرایا گیا تھا۔ عشار حاملہ اُونٹنیوں کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ اِس لئے اختیار کیا گیا ہے تا یہ وہم نہ رہے جیسا بعض لوگ کہتے ہیں کہ قیامت کے متعلق ہے۔ قیامت میں تو حمل نہ ہوگا۔ اور ان کا بیکار ہونا یہاں تو الگ رہا مکّہ مدینہ کے درمیان بھی ریل تیار ہو رہی ہے۔ اخبارات نے بھی اِس آیت اور مسلم کی حدیث سے استنباط کرکے مضامین لکھے ہیں۔ پس یہ اور دوسرے نشان تو پورے ہوگئے ہیں۔ مَیں اگر صادق نہیں ہوں تو دوسرے مدعی کا نشان بتاؤ اور اس کا ثبوت دیکھو۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴، ۵)

انسانی صنعتوں کا اِنحصار خدا تعالیٰ کے فضل پر ہے۔ ریل کے واسطے قرآن شریف میں دو اشارے ہیں۔ اوّل اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ دوم اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۔ عشار حمل دار اُونٹنی کو کہتے ہیں۔ حمل کا ذکر اِس لئے کیا تا کہ معلوم ہوجاوے کہ یہ قیامت کا ذکر نہیں صرف قرینہ کے واسطے یہ لفظ لکھا ہے ورنہ ضرورت نہ تھی۔ اگر پیشگوئیوں کا صدق اِس دُنیا میں نہ کھلے تو پھر اس کا فائدہ کیا ہوسکتا ہے اور ایمان کو کیا ترقی ہو؟ بیوقوف لوگ ہر ایک پیشگوئی کو صرف قیامت پر لگاتے ہیں اور جب پوچھو تو کہتے ہیں کہ اِس دُنیا کی نسبت کوئی پیشگوئی قرآن شریف میں نہیں ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۴ مورخہ ۳ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۸۵)

ایک اَور نشان اس زمانہ کا وہ نئی سواری تھی جس نے اُونٹوں کو بیکار کر دینا تھا قرآن نے وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ

(جب اُونٹنیاں بیکار ہو جاویں گی) کہہ کر اس زمانہ کا پتہ بتلایا۔ حدیث نے مسیح کے نشان میں یوں کہا یُتْرَکَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْھَا پھر یہ نشان کیا پُورا نہ ہُوا؟ حتّٰی کہ اس سرزمین میں بھی جہاں آج تک اُونٹنی کی سواری تھی اور بغیر اُونٹنیوں کے گذارہ نہ تھا وہاں بھی اِس سواری کا اِنتظام ہو گیا ہے اور چند سالوں میں اُونٹوں کی سواری کا نام و نشان نہیں ملے گا۔ اُونٹنیاں بیکار ہوگئیں۔ مقرر کردہ نشان پورے ہوگئے لیکن جس کا یہ نشان تھا وہ پہچانا نہ گیا۔ کیا یہ امور بھی میرے اختیار میں تھے کہ ایک طرف تو میں دعوٰی کروں اور دوسری طرف یہ نشان پُورے ہوتے جاویں۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۳۰ مورخہ ۸ ر اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۴

و ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ نمبر ۶ صفحہ ۲۰۰)

قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے اور احادیثِ صحیحہ اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ مسیح موعود کے زمانہ میں ایک نئی سواری پیدا ہوگی جس سے اُونٹ بیکار ہو جائیں گے جیساکہ قرآن شریف میں ہے وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ اور حدیث صحیح میں ہے وَلَیُتْرَکَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْھَا۔ اب آپ لوگ جانتے ہیں کہ مکّہ اور مدینہ کے درمیان بھی ریل تیار ہو رہی ہے۔ اِس عظیم الشان پیشگوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک اخبار والے نے لکھا ہے کہ مکّہ مدینہ بھی یہ نظارہ دیکھ لیں گے کہ اُونٹوں کی قطاروں کی بجائے ریل گاڑی وہاں چلے گی۔ قرآن شریف میں جو یہ فرمایا وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ اس کے متعلق نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ عِشار حاملہ اُونٹنی کو کہتے ہیں اِس لئے یہ لفظ اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمایا تاکہ یہ سمجھ آجاوے کہ اِسی دُنیا کے متعلق ہے کیونکہ حاملہ ہونا تو اِسی دُنیا میں ہوتا ہے۔

اِسی طرح نہروں کا نکالے جانا، چھاپے خانوں کی کثرت اور اشاعتِ کتب کے ذریعوں کا عام ہونا، اِسی قسم کے بہت سے نشان ہیں جو اِس زمانہ سے مخصوص تھے اور وہ پورے ہوگئے ہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

اِس آخری زمانے کے نشانات میں بتایا گیا تھا کہ نہریں نکالی جاویں گی اور نئی آبادیاں ہوں گی۔ پہاڑ چیرے جاویں گے۔ کتابوں اور اخباروں کی اشاعت ہوگی۔ اور یہ بھی لکھا تھا وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ یعنی ایک ایسی سواری نکلے گی جس کی وجہ سے اُونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی۔ اور ایسا ہی حدیث میں بھی فرمایا گیا تھا لَیُتْرَکَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْھَا۔ اب دیکھ لو کہ ریل کے اجراء سے یہ پیشگوئی کیسی صاف صاف پوری ہوگئی اور عنقریب جب مکّہ تک ریل آئے گی تو اَور بھی اس کا نظارہ قابلِ دید ہوگا جب وہاں کے اُونٹ بیکار ہو جائیں گے مگر میں افسوس سے ظاہر کرتا ہوں کہ انہوں نے محض میرے ساتھ بخل کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک پر بھی حملہ کیا اور آپؐ کی پیشگوئیوں کی تکذیب کی۔ وہ امر جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت ثابت ہوتی تھی میری عداوت

کی وجہ سے اُسے مٹانا چاہا ہے۔ مجھ سے عداوت ہی سہی لیکن آپؐ کی پیشگوئی کو کیوں پامال کر دیا۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۸، ۹)

سِول اخبار میں لکھا ہے کہ روز بروز اب اُونٹ بیکار ہوتے جاتے ہیں کیسی بیّن طور پر قرآن شریف اور حدیث کی تصدیق ہوتی جاتی ہے۔ حدیث میں لکھا ہے وَلَیُتْرَکَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْھَا اور قرآن شریف میں وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ لکھا ہے۔

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب دُنیا میں کوئی مامور من اللہ مبعوث ہوتا ہے تو زمانہ میں جتنی بڑی بڑی کارروائیاں ہوں اور بڑے بڑے اِنقلاب ظہور میں آویں تو وہ سب اسی کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۰)

سورۃ تکویر میں سب نشانات آخری زمانے کے ہیں۔ انہیں میں سے ایک نشان ہے وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ یعنی جب اُونٹنیاں بیکار چھوڑی جائیں گی۔ اِس کی تفسیر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وَلَیُتْرَکَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا یُسْعٰی عَلَیْھَا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح موعود بھی اِسی زمانہ میں ہوگا بلکہ اس کے ابتدائی زمانے کے یہ نشان ہیں۔

پھر فرمایا وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ یعنی ایسے اسباب سفر مہیا ہو جائیں گے کہ قومیں باوجود اِتنی دُور رہونے کے آپس میں مِل جائیں گی حتّٰی کہ نئی دُنیا پُرانی سے تعلقات پَیدا کرے گی...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سفر کی تمام راہیں نہ کُھلی تھیں۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ بعض ایسے مقامات بھی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نہیں پہنچی مگر اب تو ڈاک تار، ریل سے زمین کے اِس سِرے سے اُس سِرے تک خبر پہنچ سکتی ہے۔ یہ حجاز ریلوے جو بن رہی ہے یہ بھی اِسی پیشگوئی کے ماتحت ہے۔ عرب کے کئی لوگ کہنے لگ گئے ہیں کہ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ کا زمانہ آگیا۔ عِشَار (گابھن اُونٹنیاں) کا لفظ خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ سب قیامت سے پہلے ہوگا کیونکہ اُس دن کی نسبت تو لکھا ہے کہ ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی اور پھر اس دن تو ہر چیز معطّل ہو جائے گی۔ اُونٹنیوں کی خصوصیت کیا ہے مطلب یہ تھا کہ اب تجارت کا دارومدار اُونٹنیوں پر ہے پھر ریل پر ہوگا اور چونکہ حدیث میں یہی زمانہ مسیح موعود کا لکھا ہے اِس لئے اَب عرب والوں کو مسیح موعود کی تلاش کرنی چاہیئے۔ دیکھو اَب تو ان کے گھر میں ریل بن رہی ہے اور خود ہمارے دشمن اس میں سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بھی ایک نشان ہے کہ ہمارے دشمنوں کو خدا نے ہمارے کام میں لگا دیا ہے۔ چندہ تو دے رہے ہیں وہ اور صداقت ہماری ثابت ہو گی۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۳ مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

مسلم نے ....۔ آخری زمانہ کی علامات کا ذکر کرتے ہوئے ایک نئی سواری کا ذکر کر کے یہ کہا کہ

لَيُتْرَكَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا يُسْعٰى عَلَيْهَا اور قرآن شریف نے اسی مضمون کو عبارتِ ذیل میں بیان فرما کر اَور بھی صراحت کر دی کہ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۔ قرآن وحدیث کا تطابق اور پھر عملی رنگ میں اس دُور دراز زمانہ میں جبکہ ان پیشگوئیوں کو ۱۳ سَو برس سے بھی زائد عرصہ گذر چکا ہے ان کا پُورا ہونا ایمان کو کیسا تازہ اور مضبوط کرتا ہے۔ چنانچہ ایک اخبار میں ہم نے دیکھا ہے کہ شاہِ روم نے تاکیدی حکم دیا ہے کہ ایک سال کے اندر حجاز ریلوے تیار ہو جاوے۔ سُبحان اللہ کیسا عجیب نظارہ ہوگا اور ایمان کیسے تازے ہوں گے کہ جب پیشگوئی کے بالکل مطابق بجائے اُونٹوں کی لمبی لمبی قطاروں کے ریل کی قطاریں دوڑتی ہوئی نظر آویں گی۔ پس جب یہ پیشگوئی جو آثار قُربِ قیامت اور مسیح موعود کی آمد کے نشانات میں سے ایک زبردست اور اقتداری پیشگوئی ہے پوری ہو رہی ہے تو ایمان لانا چاہیئے کہ مسیح موعودؑ بھی موجود ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۰ مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

منجملہ اَور علامات کے جو ہمارے آنے کے واسطے اللہ اور رسول کی کتابوں میں مندرج ہیں ایک اُونٹوں کی سواریوں کا معطّل ہو جانا بھی ہے چنانچہ اِس مضمون کو قرآن شریف نے بالفاظِ ذیل تعبیر کیا ہے وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ اور حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اِس مضمون کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ وَلَيُتْرَكَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا يُسْعٰى عَلَيْهَا۔

اَب سوچنے والے کو چاہیئے کہ ان امور میں جو آج سے تیرہ سَو (۱۳۰۰) برس پہلے خدا اور اس کے رسولؐ کے مُنہ سے نکلے اور اس وقت وہ الفاظ بڑی شان اور شوکت سے پورے ہو کر اپنے کہنے والوں کے جلال کا اظہار کر رہے ہیں۔ دیکھئے اَب اس پیشگوئی کے پورا ہونے کے کیسے کیسے سامان پیدا ہو رہے ہیں حتّٰی کہ حجاز ریلوے کے تیار ہو جانے پر مکّہ معظمہ اور مدینہ منوّرہ کے سفر بھی بجائے اُونٹ کے ریل کے ذریعہ ہُوا کریں گے اور اُونٹنیاں بیکار ہو جاویں گی۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۱ مورخہ ۶ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

بیان فرمایا ہے کہ ایک ایسا زمانہ بھی آتا ہے کہ جب سفر کرنے کے سامان سہل طور پر میسّر آ جائیں گے اور اُونٹنیوں کی سواری کی حاجت نہیں رہے گی اور سفر میں بہت آرام اور سہولت میسّر آ جائے گی اور ایک ایسی نئی سواری پیدا ہو جائے گی کہ ایک حصّۂ دُنیا کو دوسرے حصّہ سے ملا دے گی اور ایک ملک کے لوگوں کو دوسرے ملک کے لوگوں سے اکٹھے کر دے گی جیسا کہ یہ دو آیتیں اسی پیشگوئی پر مشتمل ہیں اور وہ یہ ہیں وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۔ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ یعنی وہ زمانہ آتا ہے کہ اُونٹنیاں بیکار کر دی جائیں گی۔ جاننا چاہیئے کہ عرب کی تجارت اور سفر کا مدار تمام اُونٹنیوں پر ہے اِس لئے اُونٹوں کا ہی ذکر کیا۔ یہ تو ہر ایک شخص جانتا ہے کہ مکّہ معظمہ سے مدینہ منوّرہ تک حاجیوں کو پہنچانے کے لئے تیرہ سَو (۱۳۰۰) برس سے صرف اُونٹنیوں کی سواری چلی آتی ہے پس اِس جگہ خدا تعالیٰ یہ خبر دیتا ہے کہ وہ زمانہ آتا ہے کہ وہ سواری موقوف کر دی جائے گی اور بجائے

اس کے ایک نئی سواری ہوگی جو آرام اور جلال کی ہوگی اور یہ بات اس سے نکلتی ہے کہ جو بدل اختیار کیا جاتا ہے وہ مبدل منہ سے بہتر ہوتا ہے۔

دوسری آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ وہ زمانہ آتا ہے کہ جب کہ بچھڑے ہوئے لوگ باہم مِلا دیئے جائیں گے اور اِس قدر باہمی ملاقاتوں کے لئے سہولتیں میسر آجائیں گی اور اِس کثرت سے اُن کی ملاقاتیں ہوں گی کہ گویا مختلف ملکوں کے لوگ ایک ہی ملک کے باشندے ہیں۔ سو یہ پیشگوئی ہمارے اس زمانہ میں پوری ہوگئی جس سے ایک عالمگیر انقلاب ظہور میں آیا گویا دُنیا بدل گئی کیونکہ دُخانی جہازوں اور ریلوں کے ذریعہ سے وہ روکیں جو پہاڑوں کی مانند تھیں سب اُٹھ گئیں اور ایک دُنیا مشرق سے مغرب کو اور مغرب سے مشرقی بلاد کو آتی ہے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۷۳ تا ۷۵)

قیامت کے قُرب اور مسیح موعود کے آنے کا وہ زمانہ ہے جبکہ اُونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی۔ یہ آیت صحیح مسلم کی اس حدیث کی مصداق ہے جہاں لکھا ہے کہ وَيُتْرَكُ الْقِلَاصُ فَلَا يُسْعٰى عَلَيْهَا یعنی مسیح موعود کے زمانہ میں اُونٹنیاں بیکار چھوڑ دی جائیں گی اور اُن پر کوئی سوار نہیں ہوگا۔ یہ ریل گاڑی پیدا ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب کوئی اعلیٰ سواری میسر آتی ہے تبھی اَدنیٰ سواری کو چھوڑتے ہیں۔ اور دوسری آیت گویا اِس کا نتیجہ ہے اور ترجمہ اس کا یہ ہے کہ اس زمانہ میں بعض آدمی بعض سے ملائے جائیں گے اور ظاہری تفرقہ قوموں کا دُور ہو جائے گا۔ اور چونکہ صحیح مسلم میں کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ اُونٹنیوں کے بیکار ہونے کا مسیح موعود کا زمانہ ہے اِسی لئے قرآن شریف کی آیت وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ جو حدیث يُتْرَكُ الْقِلَاصُ کے ہم معنی ہے بدیہی طور پر دلالت کرتی ہے کہ یہ واقعہ ریل جاری ہونے کا مسیح موعود کے زمانہ میں ظہور میں آئے گا اِسی لئے مَیں نے إِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ کے یہی معنے کئے ہیں کہ وہ مسیح موعود کا زمانہ ہے کیونکہ حدیث نے اِس آیت کی شرح کر دی ہے اور چونکہ ریل کے جاری ہونے پر ایک مدّت گذر چکی ہے جو مسیح موعود کی علامت ہے اِس لئے ایک مومن کو ماننا پڑتا ہے کہ مسیح موعود ظاہر ہو چکا ہے اور جب کہ ایک واقعہ نے ممدوحہ بالا آیت اور حدیث کے معنے کھول دیئے ہیں تو اَب ظاہر شدہ معنوں کو قبول نہ کرنا صریح الحاد اور بے ایمانی ہے۔ سوچ کر دیکھو کہ جب مکّہ اور مدینہ میں اُونٹ چھوڑ کر ریل کی سواری شروع ہو جائے گی تو کیا وہ روز اِس آیت اور حدیث کا مصداق نہ ہوگا؟ ضرور ہوگا۔ اور تمام دِل اُس دن بول اُٹھیں گے کہ آج وہ پیشگوئی مکّہ اور مدینہ کی راہ میں کُھلے کُھلے طور پر پوری ہوگئی۔ ہائے افسوس اُن نام کے مسلمانوں پر جو نہیں چاہتے کہ (میرے بُغض کی وجہ سے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی پیشگوئی پوری ہو۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۷۳، ۷۴، حاشیہ)

اس زمانہ میں اُونٹنیاں بیکار ہو جاویں گی۔ اعلیٰ درجہ کی سواری اور باربرداری جن سے ایّامِ سابقہ ہوا

کرتی تھی یعنی اُس زمانہ میں سواری کا انتظام کوئی ایسا پیدا ہوگا کہ یہ سواریاں بیکار ہو جاویں گی۔ اِس سے ریل کا زمانہ مراد تھا۔ وہ لوگ جو خیال کرتے ہیں کہ اِن آیات کو تعلق قیامت سے ہے وہ نہیں سوچتے کہ قیامت میں اُونٹنیاں حمل دار کیسے رہ سکتی ہیں کیونکہ عِشَار سے مراد حمل دار اُونٹنیاں ہیں۔ پھر لکھا ہے کہ اُس زمانہ میں چاروں طرف نہریں پھیل جاویں گی اور کتابیں کثرت سے اشاعت پاویں گی۔ غرض کہ یہ سب نشان اِسی زمانہ کے متعلق تھے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۶۰)

...... اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ بھی میرے ہی لئے ہے ..... پھر یہ بھی جمع ہے کہ خدا تعالیٰ نے تبلیغ کے سارے سامان جمع کر دئے ہیں۔ چنانچہ مطبع کے سامان، کاغذ کی کثرت، ڈاکخانوں، تار، ریل اور دُخانی جہازوں کے ذریعہ کل دُنیا ایک شہر کا حکم رکھتی ہے اور پھر نت نئی ایجادیں اِس جمع کو اَور بڑھا رہی ہیں کیونکہ اسبابِ تبلیغ جمع ہو رہے ہیں۔ اب فونوگراف سے بھی تبلیغ کا کام لے سکتے ہیں اور اِس سے بہت عجیب کام نکلتا ہے۔ اخباروں اور رسالوں کا اجراء۔ غرض اِس قدر سامان تبلیغ کے جمع ہوئے ہیں کہ اس کی نظیر کسی پہلے زمانہ میں ہم کو نہیں ملتی۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۳ مورخہ ۳۰ رنومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱، ۲)

یہ زمانہ اِس قسم کا آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے وسائل پیدا کر دئے ہیں کہ دُنیا ایک شہر کا حکم رکھتی ہے اور وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ کی پیشگوئی پوری ہوگئی۔ اب سب مذاہب میدان میں نکل آئے ہیں اور یہ ضروری امر ہے کہ ان کا مقابلہ ہو اور ان میں ایک ہی سچا ہوگا اور غالب آئے گا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ راکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

۱۲۔ وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝

اِنَّكُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ الْمَسِيْحَ يَاْتِيْ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ وَقَدْ رَاَيْتُمْ بِاَعْيُنِكُمْ عَلَامَاتَهٗ وَشَاهَدْتُمُ النَّوَادِرَ الْاَرْضِيَّةَ الَّتِيْ جَعَلَهَا الْقُرْاٰنُ الْكَرِيْمُ مِنْ اٰثَارِ الزَّمَنِ الْمُتَاَخِّرِ وَاَنْتُمْ مِنْهَا تَنْتَفِعُوْنَ۔ فَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِالنَّوَادِرِ السَّمَاوِيَّةِ الَّتِيْ تَدُلُّ عَلَيْهَا الْاٰيَةُ الْكَرِيْمَةُ اَعْنِيْ بِذٰلِكَ قَوْلَهٗ تَعَالٰى اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ وَ

ترجمہ از مرتب:۔ تمہیں بخوبی علم ہے کہ مسیح موعود کا ظہور آخری زمانہ میں ہوگا اور تم نے اس کی علامات کو اپنی آنکھوں سے پُورا ہوتے دیکھ لیا ہے۔ نیز تم نے ان اَرضی ایجادات کا بھی مشاہدہ کر لیا ہے جن کو قرآن کریم نے آخری زمانہ کے نشانات قرار دیا ہے اور تم ان ایجادات سے فائدہ اُٹھا رہے ہو۔ پس تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ان آسمانی نشانات پر ایمان نہیں لاتے جن کو آیہ کریمہ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ بیان کر رہی ہے۔ تم زمین کی طرف

تَخْلُدُوْنَ اِلَى الْاَرْضِ وَمِنْ اٰلَاءِ السَّمَآءِ تَبْعُدُوْنَ۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۷۸)

التکویر: ۱۸،۱۹ **وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۙ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ**

وَلِكُلِّ كَمَالٍ زَوَالٌ۔ وَلِكُلِّ تَرَعْرُعٍ اِضْمِحْلَالٌ۔ كَمَا تَدْرِى اَنَّ السَّيْلَ اِذَا وَصَلَ اِلَى الْجَبَلِ الرَّاسِى وَقَفَ۔ وَاللَّيْلَ اِذَا بَلَغَ اِلَى الصُّبْحِ الْمُسْفِرِ انْكَشَفَ۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ۔ فَجَعَلَ تَنَفُّسَ الصُّبْحِ كَاَمْرٍ لَازِمٍ بَعْدَ كَمَالِ ظُلُمَاتِ اللَّيْلِ ..... فَاَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّرُدَّ اِلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَّامَهُمُ الْاُوْلٰى۔ وَاَنْ يُّرِيَهُمْ اَنَّهٗ رَبُّهُمْ وَاَنَّهُ الرَّحْمٰنُ وَالرَّحِيْمُ وَمَالِكُ يَوْمٍ فِيْهِ يُجْزٰى۔ وَيُبْعَثُ فِيْهِ الْمَوْتٰى۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۵۴)

التکویر: ۲۵ تا ۲۷ **وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۚ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۙ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ۙ**

قرآن .....غیب کے عطا کرنے میں بخیل نہیں ہے یعنی بخیلوں کی طرح اس کا یہ کام نہیں کہ صرف آپ ہی غیب بیان کرے اور دوسرے کو غیبی قوت نہ دے سکے بلکہ آپ بھی غیب پر مشتمل ہے اور پیروی کرنیوالے

جھکتے جارہے ہو لیکن آسمانی نعمتوں سے دُور ہو۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۷۸)

ترجمہ از مرتب :۔ ہر کمال کو آخر زوال دیکھنا پڑتا ہے۔اسی طرح ہر ترقی کے بعد تنزل کا دَور آتا ہے۔جیسا کہ تم دُنیا میں مشاہدہ کرتے ہو کہ جب سیلاب بلند پہاڑوں تک پہنچتا ہے تو رُک جاتا ہے۔اور رات جب روشن صبح تک پہنچتی ہے تو اس کی تاریکی ختم ہو جاتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ۔ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ یعنی ہم رات کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جب وہ خاتمہ کو پہنچ جاتی ہے اور صبح کو جب وہ سانس لینے لگتی ہے۔اِس آیہ کریمہ میں رات کے اندھیروں کے کمال تک پہنچنے کے بعد صبح کے ظاہر ہونے کو لازم قرار دیا ہے .....پس اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے کہ وہ مومنوں پر پہلے ترقی کے زمانہ کو لوٹا دے اور ان کو دکھا دے کہ ان کا ایک قادر ربّ ہے جو رحمٰن اور رحیم ہے اور اُس دن کا مالک ہے جب سب لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا اور جس میں مُردے زندہ کر کے اُٹھائے جائیں گے۔

(اعجاز المسیح صفحہ ۱۵۴)

پر بھی فیضانِ غیب کرتا ہے۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۵)

قرآن ہر ایک قسم کے امورِ غیبیہ پر مشتمل ہے اور اِس قدر بتلانا جنّات کا کام نہیں۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۹۲)

التکویر إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِينَ ۝ لِمَنْ شَآءَ مِنكُمْ أَن يَسْتَقِيمَ ۝

قرآن —— ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِينَ ہے یعنی ہر ایک قسم کی فطرت کو اس کے کمالاتِ مطلوبہ یاد دلاتا ہے اور ہر یک رتبہ کا آدمی اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ جیسے ایک عامی ویسا ہی ایک فلسفی۔ یہ اُس شخص کے لئے اُترا ہے جو انسانی استقامت کو اپنے اندر حاصل کرنا چاہتا ہے یعنی انسانی درخت کی جس قدر شاخیں ہیں یہ کلام ان سب شاخوں کا پرورش کرنے والا اور حدِّ اعتدال پر لانے والا ہے اور انسانی قوٰی کے ہر یک پہلو پر اپنی تربیت کا اثر ڈالتا ہے۔

(کرامات الصّادقین صفحہ ۱۰)

○

سُورۃ الانفطار

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ۝ وَ اِذَا الۡکَوَاکِبُ انۡتَثَرَتۡ۝ وَ اِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ۝

اس زمانہ کی علامات میں جبکہ ارضی علوم وفنون زمین سے نکالے جائیں گے بعض ایجادات اور صناعات کو بطور نمونہ کے بیان فرمایا ہے اور وہ یہ ہے ..... وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ اور جس وقت دریا چیرے جاویں گے یعنی زمین پر نہریں پھیل جائیں گی اور کاشت کاری کثرت سے ہوگی ..... وَاِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ اور جس وقت تارے جھڑ جائیں گے یعنی ربّانی علماء فوت ہو جائیں گے کیونکہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ زمین پر تارے گریں اور پھر زمین پر لوگ آباد رہ سکیں۔ یاد رہے کہ مسیح موعود کے آنے کے لئے اسی قسم کی پیشگوئی انجیل میں بھی ہے کہ وہ اُس وقت آئے گا کہ جب زمین پر تارے گر جائیں گے اور سورج اور چاند کا نور جاتا رہے گا۔ اور ان پیشگوئیوں کو ظاہر پر حمل کرنا اس قدر خلاف قیاس ہے کہ کوئی دانا ہرگز یہ تجویز نہیں کرے گا کہ درحقیقت سورج کی روشنی جاتی رہے گی اور ستارے زمین پر گر پڑیں اور پھر زمین بدستور آدمیوں سے آباد ہو اور اُس حالت میں مسیح موعود آوے..... ایسا ہی فرمایا اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ اور انجیل میں بھی اسی کے مطابق مسیح موعود کے آنے کی خبر دی ہے مگر ان آیتوں سے یہ مراد نہیں ہے کہ درحقیقت اُس وقت آسمان پھٹ جائے گا یا اس کی قوتیں سست ہو جائیں گی بلکہ مدّعا یہ ہے کہ جیسے پھٹی ہوئی چیز بیکار ہو جاتی ہے ایسا ہی آسمان بھی بیکار سا ہو جائے گا۔ آسمان سے فیوض نازل نہیں ہوں گے اور دُنیا ظلمت اور تاریکی سے بھر جائے گی۔

(شہادت القرآن صفحہ ۲۲، ۲۳)

اِس بات کے ثبوت کے لئے کہ درحقیقت یہ آخری زمانہ ہے جس میں مسیح ظاہر ہوجانا چاہیئے دُو طور کے دلائل موجود ہیں (۱) اوّل وہ آیاتِ قرآنیہ اور آثارِ نبویہ جو قیامت کے قُرب پر دلالت کرتے ہیں اور پُورے ہوگئے ہیں جیساکہ ..... ملک میں نہروں کا بکثرت نکلنا جیساکہ آیت وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ سے ظاہر ہے اور ستاروں کا متواتر ٹوٹنا جیساکہ آیت وَاِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ سے ظاہر ہے اور قحط پڑنا اور وباء پڑنا اور امساکِ باراں ہونا جیساکہ آیت وَاِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ سے مُنکشف ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۰)

قرآن شریف میں سَمَاء کا لفظ نہ صرف آسمان پر بولا جاتا ہے جیساکہ عوام کا خیال ہے بلکہ کئی معنوں پر سَمَاء کا لفظ قرآن شریف میں آیا ہے۔ چنانچہ مینہ کا نام بھی قرآن شریف میں سَمَاء ہے اور اہلِ عرب مینہ کو سَمَاء کہتے ہیں اور کتبِ تعبیر میں سَمَاء سے مراد بادشاہ بھی ہوتا ہے اور آسمان کے پھٹنے سے بدعتیں اور ضلالتیں اور ہر ایک قسم کا جَور اور ظلم مراد لیا جاتا ہے اور نیز ہر قسم کے فتنوں کا ظہور مراد لیا جاتا ہے۔ کتاب تعطیر الانام میں لکھا ہے فَاِنْ رَأَی السَّمَآءَ انْشَقَّتْ دَلَّ عَلَی الْبِدْعَۃِ وَالضَّلَالَۃِ۔ دیکھو صفحہ ۵ ۳ تعطیر الانام۔
(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۰ حاشیہ)

ممکن ہے کہ اِن آیات میں سے بعض قیامت سے بھی تعلق رکھتی ہوں مگر اوّل مصداق اِن آیات کا یہی دُنیا ہے کیونکہ یہ آخری زمانہ کی نشانیاں ہیں اور جب دُنیا کا سلسلہ ہی لپیٹا گیا تو پھر کس بات کی یہ نشانیاں ہوں گی۔ غالباً اسلام میں ایسے جاہل بھی ہوں گے جو اس راز کو نہیں سمجھتے ہوں گے اور خدا تعالیٰ کی پیشگوئیاں جن سے ایمان قوی ہوتا ہے اُن کی نظر میں تمام وہ امور بعد الدنیا ہیں۔ یہ تمام قرآنی پیشگوئیاں پہلی کتابوں میں مسیح موعود کے وقت کی نشانیاں ٹھہرائی گئی ہیں۔ دیکھو دانی ایل باب ۱۲۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۰ حاشیہ)

اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ:

وَاَمَّا تَفْجِیْرُ الْبِحَارِ فَقَدْ رَأَیْتُمْ اللّٰہَ بَعَثَ قَوْمًا فَجَّرُوا الْبِحَارَ وَ اَجْرَوُا الْاَنْھَارَ وَھُمْ عَلٰی تَفْجِیْرِھَا مُدَاوِمُوْنَ وَاَحَاطُوْا عَلٰی دَقَائِقِ عِلْمِ تَفْجِیْرِ الْاَنْھَارِ وَاَفَاضُوْا عَلٰی کُلِّ وَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ لِیَعْمُرُوا الْاَرْضَ وَیَرْفَعُوْا بَلَایَا الْقَحْطِ مِنْ اَھْلِھَا وَکَذٰلِکَ یَعْمَلُوْنَ لِیَنْتَفِعُوْا مِنَ الْاَرْضِ حَقَّ الْاِنْتِفَاعِ

ترجمہ از مرتّب:۔ رہا دریاؤں کو چیرنا سو تم نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی قوم کو برپا کیا ہے جس نے دریاؤں کو چیر دیا ہے اور ان سے نہریں نکال دیں اور پھر وہ اَور نہریں نکالتے جا رہے ہیں اور انہوں نے تفجیرِ انہار کے علم کی باریک باتوں پر بھی احاطہ کر لیا ہوا ہے اور انہوں نے نہروں کو ہر غیر آباد وادی میں جاری کر دیا ہے تا وہ زمین کو آباد کریں اور اس کے رہنے والوں سے قحط کی بلاؤں کو دُور کریں اور اس طرح وہ یہ کام اِسلئے

فَھُمْ مُنْتَفِعُوْنَ۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۶۹، ۴۷۰)

خدا نے اِس آخری زمانہ کے بارے میں جس میں تمام قومیں ایک ہی مذہب پر جمع کی جائیں گی صرف ایک ہی نشان بیان نہیں فرمایا بلکہ قرآن شریف میں اَور بھی کئی نشان لکھے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ کہ اُس زمانہ میں دریاؤں میں سے بہت سی نہریں نکلیں گی۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۳۷)

اپنی تائید میں نشاناتِ آسمانی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

۷۔ (ساتواں) نشان کثرت سے نہریں جاری کئے جانا جیسا کہ آیت وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ سے ظاہر ہوتا ہے پس اِس میں کیا شک ہے کہ اس زمانہ میں کثرت سے نہریں جاری ہوئی ہیں جن کی کثرت سے دریا خشک ہوئے جاتے ہیں۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۹۸)

ایک اَور پیشگوئی قرآن شریف میں آخری زمانہ کی نسبت ہے اور وہ یہ ہے کہ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ یعنی آخری زمانہ میں دریاؤں میں سے بہت سی نہریں جاری کی جائیں گی چنانچہ یہ پیشگوئی بھی ہمارے زمانہ میں ظہور میں آگئی۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۳۰۸)

وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ:۔

وَاَمَّا انْتِثَارُ الْكَوَاكِبِ فَهُوَ اِشَارَةٌ اِلٰى فِتَنِ الْعُلَمَاءِ وَذَهَابِ الْمُتَّقِيْنَ مِنْهُمْ كَمَا اَنَّكُمْ تَرَوْنَ اَنَّ اٰثَارَ الْعِلْمِ قَدِ امَّحَتْ وَعَفَتْ وَالَّذِيْنَ كَانُوْا اُوْتُوا الْعِلْمَ فَبَعْضُهُمْ مَاتُوْا وَبَعْضُهُمْ عَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۷۳، ۴۷۴)

کرتے ہیں تا وہ زمین سے پُورا نفع حاصل کریں چنانچہ وہ نفع حاصل کر رہے ہیں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۶۹، ۴۷۰)

ترجمہ از مرتب:۔ ستاروں کے گرنے سے علماء کے فتنوں اور ان میں سے متقی لوگوں کے ختم ہو جانے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ علم کے آثار محو ہوگئے ہیں اور مِٹ گئے ہیں اور جن لوگوں کو علم عطا کیا گیا تھا ان میں سے بعض تو مر گئے ہیں اور بعض ان میں سے اندھے اور بہرے ہوگئے ہیں پھر اللہ تعالیٰ ان پر رجوع برحمت ہوا لیکن پھر وہ اندھے اور بہرے ہوگئے اور اکثر ان میں سے فاسق ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کو جو وہ کر رہے ہیں دیکھنے والا ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۷۳، ۴۷۴)

الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝

.....حُسن تناسبِ اعضاء کا نام ہے۔جب تک یہ نہ ہو ملاحت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اِسی لئے اپنی صفت فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ فرمائی ہے۔ عَدَلَكَ کے معنے تناسب کے ہیں کہ نسبتی اعتدال ہر جگہ ملحوظ رہے۔

(البدر جلد ۲ ۱۲ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۱)

اِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِیْنَ ۝ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝

قرآن کریم میں اَور بہت سی آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی تربیت اور حفاظت ظاہری و باطنی کے لئے اور نیز اُس کے اعمال کے لکھنے کے لئے ایسے فرشتے مقرر ہیں کہ جو دائمی طور پر انسانوں کے پاس رہتے ہیں۔ (مثلاً) وَاِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ ..... کہ تم پر حفاظت کرنے والے مقرر ہیں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۷۸، ۷۹)

وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ۝ یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ ۝

جو لوگ نافرمان اور بدکار ہیں اور نفس اور ہوا کے تابع ہیں وہ جہنم میں داخل ہوں گے اور وہاں جلیں گے۔

(ست بچن صفحہ ۹۶)

سُورۃ المُطفّفین

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝

آیت ۱۴، ۱۵

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ؕ

وہ تمہارے کھوٹے اعمال ہرگز قبول نہیں کرے گا اور جنہوں نے کھوٹے کام کئے انہیں کاموں نے ان کے دل پر زنگار چڑھا دیا سو وہ خدا کو ہرگز نہیں دیکھیں گے۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۲)

آیت ۲۲، ۲۳

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝ۙ

نیکوکار آدمی یعنی جو خدا سے دل لگاتے ہیں وہ آخرت میں نعمتوں میں ہوں گے اور تختوں پر بیٹھے ہوئے خداتعالیٰ کو دیکھیں گے۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۰)

سُورۃ الانشقاق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۲۔ اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ۝

اور اگر یہ اعتراض پیش ہو کہ قرآن کریم میں یہ بھی لکھا ہے کہ کسی وقت آسمان پھٹ جائیں گے اور ان میں شگاف ہو جائیں گے۔ اگر وہ لطیف مادہ ہے تو اُس کے پھٹنے کے کیا معنے ہیں تو اس کا یہ جواب ہے کہ اکثر قرآن کریم میں سماء سے مراد کُلُّ مَا فِی السَّمَآءِ کو لیا ہے جس میں آفتاب اور ماہتاب اور تمام ستارے داخل ہیں۔ ماسوا اس کے ہر یک جرم لطیف ہو یا کثیف قابلِ خرق ہے بلکہ لطیف تو بہت زیادہ خرق کو قبول کرتا ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ آسمانوں کے مادہ میں بحکم ربِّ قدیر وحکیم ایک قسم کا خرق پیدا ہو جائے۔ وَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ۔ بالآخر یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ قرآن کریم کے ہر یک لفظ کو حقیقت پر حمل کرنا بھی بڑی غلطی ہے اور اللہ جلّ شانُہٗ کا یہ پاک کلام بوجہ اعلیٰ درجہ کی بلاغت کے استعارات لطیفہ سے بھرا ہوُا ہے سو ہمیں اِس فکر میں پڑنا کہ انشقاق اور انفجار آسمانوں کا کیونکر ہوگا۔ درحقیقت ان الفاظ کے وسیع مفہوم میں ایک دخل بیجا ہے صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام الفاظ اور اس قسم کے اَور بھی عالمِ مادی کے فنا کی طرف اشارہ ہے۔ الٰہی کلام کا مدّعا یہ ہے کہ اس عالمِ کَون کے بعد فساد بھی لازم پڑا ہوُا ہے۔ ہر یک جو بنایا گیا توڑا جائے گا اور ہر یک ترکیب پاش پاش ہو جائے گی اور ہر یک جسم متفرق اور ذرّہ ذرّہ ہو جائے گا اور ہر یک جسم اور جسمانی پر عام فنا طاری ہوگی اور قرآن کریم کے بہت سے مقامات سے ثابت ہوتا ہے کہ انشقاق اور انفجار کے الفاظ جو آسمانوں کی نسبت وارد ہیں ان سے ایسے معنی مراد نہیں ہیں جو کسی جسمِ صلب اور کثیف کے حق میں مراد لئے جاتے ہیں۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۴۹ تا ۱۵۱ حاشیہ در حاشیہ)

جس وقت آسمان پھٹ جاوے ..... یہ مراد نہیں ہے کہ درحقیقت اُس وقت آسمان پھٹ جائے گا یا

اُس کی قوتیں سُست ہوجائیں گی بلکہ مُدّعا یہ ہے کہ جیسے پھٹی ہوئی چیز بیکار ہوجاتی ہے ایسا ہی آسمان بھی بیکار سا ہوجائے گا۔ آسمان سے فیوض نازل نہیں ہوں گے اور دُنیا ظلمت اور تاریکی سے بھر جائے گی۔

(شہادت القرآن صفحہ ۲۳)

وہ آیاتِ قرآنیہ اور آثارِ نبویہ جو قیامت کے قُرب پر دلالت کرتے ہیں اور پورے ہوگئے ہیں جیسا کہ ...... بدعتوں اور ضلالتوں اور ہر قسم کے فسق و فجور کا پھیل جانا جیسا کہ آیت وَ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ سے مفہوم ہوتا ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۰)

وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۝

اسی زمانہ کی علامات میں جبکہ اَرضی علوم و فنون زمین سے نکالے جائیں گے بعض ایجادات اور صناعات کو بطور نمونہ کے بیان فرمایا ہے اور وہ یہ ہے وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۔ وَ اَلْقَتْ مَافِيْهَا وَ تَخَلَّتْ جبکہ زمین کھینچی جاوے گی یعنی زمین صاف کی جائے گی اور آبادی بڑھ جائے گی اور جو کچھ زمین میں ہے اُس کو زمین باہر ڈال دے گی اور خالی ہوجائے گی یعنی تمام اَرضی استعدادیں ظہور و بروز میں آجائیں گی۔

(شہادت القرآن صفحہ ۲۲)

اَمَّا زَلْزَلَةُ الْاَرْضِ وَ اِلْقَاءُهَا مَا فِيْهَا فَهِيَ اِشَارَةٌ اِلَى انْقِلَابٍ عَظِيْمٍ تَرَوْنَهُ بِاَعْيُنِكُمْ وَ اِيْمَاءٌ اِلَى ظُهُوْرِ عُلُوْمِ الْاَرْضِ وَ بَدَايِعِهَا وَ صَنَايِعِهَا وَ بِدْعَاتِهَا وَ سَيِّاٰتِهَا وَ مَكَايِدِهَا وَ خَدْعَاتِهَا وَ كُلِّ مَا يَصْنَعُوْنَ ۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۷۳)

○

ترجمہ از مرتّب :- زمین کے زلزلہ اور اس کے اپنے اندر کی سب چیزوں کو باہر نکال پھینکنے سے اس انقلابِ عظیم کی طرف اشارہ ہے جسے تم اپنی آنکھوں سے رونما ہوتے دیکھ رہے ہو۔ نیز زمینی علوم اور نئی ایجادات اور صنائع کے ظاہر ہونے اور اہلِ اَرض کے خلافِ شریعت اعمال کرنے اور منکرات، شر انگیزی اور دھوکہ بازی میں مشغول ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح ان بُرائیوں میں مشغول ہونے کی طرف اشارہ ہے جن کا ارتکاب لوگ کر رہے ہیں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۷۳)

سُورۃ البروج

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۱۶۔ ذُو الۡعَرۡشِ الۡمَجِیۡدُ۝

قرآن شریف سے پتہ لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے عرش کو اپنی صفات میں داخل کیا ہے جیسے ذُو الۡعَرۡشِ الۡمَجِیۡدُ گویا خدا تعالیٰ کے کمال علو کو دوسرے معنوں میں عرش سے بیان کیا ہے اور وہ کوئی مادی اور جسمانی شئے نہیں ہے ورنہ زمین و آسمان وغیرہ کی طرح عرش کی پیدائش کا ذکر بھی ہوتا اِس لئے شبہ گذرتا ہے کہ ہے تو شئے مگر غیر مخلوق۔ اور یہاں سے دھوکا کھا کر آریوں کی طرف انسان چلا جاتا ہے کہ جیسے وہ خدا کے وجود کے علاوہ اور اشیاء کو غیر مخلوق مانتے ہیں ویسے یہ عرش کو ایک شئے غیر مخلوق جُز از خدا ماننے لگتا ہے۔ یہ گمراہی ہے۔ اصل میں یہ کوئی شئے خدا کے وجود سے باہر نہیں ہے۔ جنہوں نے اُسے ایک شئے غیر مخلوق قرار دیا وہ اسے اتم اور اکمل نہیں مانتے اور جنہوں نے مادی مانا وہ گمراہی پر ہیں کہ خدا کو ایک مجسّم شئے کا محتاج مانتے ہیں کہ ڈولہ کی طرح فرشتوں نے اُسے اُٹھایا ہوا ہے۔

(البدر جلد ۲ ۵ مورخہ ۲۰؍ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸)

۱۷۔ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ۝

تیرا رب وہ قادر ہے کہ جو کچھ چاہے وہی ہو جاتا ہے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد اوّل صفحہ ۱۱۷)

سُورۃ الطّارق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۝ وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۝ النَّجۡمُ الثَّاقِبُ ۝ اِنۡ كُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَيۡهَا حَافِظٌ ۝ (الطارق: ۲ تا ۵)

اگر یہ سوال ہو کہ قرآن کریم میں اِس بات کی کہاں تشریح یا اشارہ ہے کہ رُوح القدس مقرّبوں میں ہمیشہ رہتا ہے اور ان سے جُدا نہیں ہوتا تو اس کا یہ جواب ہے کہ سارا قرآن کریم ان تصریحات اور اشارات سے بھرا پڑا ہے بلکہ وہ ہریک مومن کو رُوح القدس ملنے کا وعدہ دیتا ہے چنانچہ منجملہ اُن آیات کے جو اس بارہ میں کھلے کھلے بیان سے ناطق ہیں سورۃ الطّارق کی پہلی دو آیتیں ہیں اور وہ یہ ہیں وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الطَّارِقُ۔ النَّجۡمُ الثَّاقِبُ۔ اِنۡ كُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَيۡهَا حَافِظٌ۔ یہ آخری آیت یعنی اِنۡ كُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَيۡهَا حَافِظٌ جس کے یہ معنے ہیں کہ ہر ایک نفس پر ایک فرشتہ نگہبان ہے یہ صاف دلالت کر رہی ہے کہ جیسا کہ انسان کے ظاہر وجود کے لئے فرشتہ مقرر ہے جو اس سے جُدا نہیں ہوتا ویسا ہی اسکے باطن کی حفاظت کے لئے بھی مقرر ہے جو باطن کو شیطان سے روکتا ہے اور گمراہی کی ظلمت سے بچاتا ہے اور وہ رُوح القدس ہے جو خدا تعالیٰ کے خاص بندوں پر شیطان کا تسلّط ہونے نہیں دیتا اور اسی کی طرف یہ آیت بھی اشارہ کرتی ہے کہ اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَكَ عَلَیۡهِمۡ سُلۡطَانٌ[1]۔ اب دیکھو کہ یہ آیت کیسی صریح طور پر بتلا رہی ہے کہ خدا تعالیٰ کا فرشتہ انسان کی حفاظت کے لئے ہمیشہ اور ہر دَم اس کے ساتھ رہتا ہے اور ایک

---

[1] سورۃ الحجر: ۴۳

دَم بھی اُس سے جُدا نہیں ہوتا۔کیا اِس جگہ یہ خیال آسکتا ہے کہ انسان کی ظاہری نگہبانی کے لئے تو دائمی طور پر فرشتہ مقرر ہے لیکن اس کی باطن کی نگہبانی کے لئے کوئی فرشتہ دائمی طور پر مقرر نہیں بلکہ منتعصب سے منتعصب انسان سمجھ سکتا ہے کہ باطن کی حفاظت اور رُوح کی نگہبانی جسم کی حفاظت سے بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ جسم کی آفت تو اِسی جہان کا ایک دُکھ ہے لیکن رُوح اور نفس کی آفت جہنم ابدی میں ڈالنے والی چیز ہے۔سو جس خدائے رحیم و کریم کو انسان کے اِس جسم پر بھی رحم ہے جو آج ہے اور کل خاک ہو جائے گا اُس کی نسبت کیونکر گمان کرسکتے ہیں کہ اس کو انسان کی رُوح پر رحم نہیں۔پس اِس نصِ قطعی اور یقینی سے ثابت ہے کہ رُوح القدس یا یُوں کہو کہ اندرُونی نگہبانی کا فرشتہ ہمیشہ نیک انسان کے ساتھ ایسا ہی رہتا ہے جیسا کہ اس کی بیرونی حفاظت کے لئے رہتا ہے۔

اِس آیت کے ہم مضمون قرآن کریم میں اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی تربیت اور حفاظتِ ظاہری و باطنی کے لئے اور نیز اس کے اعمال کے لکھنے کے لئے ایسے فرشتے مقرر ہیں کہ جو دائمی طور پر انسانوں کے پاس رہتے ہیں چنانچہ منجملہ ان کے یہ آیات ہیں وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ[1]۔ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً[2]۔ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ[3]۔ ترجمہ اِن آیات کا یہ ہے کہ تم پر حفاظت کرنے والے مقرر ہیں۔خدا تعالیٰ ان کو بھیجتا ہے۔اور خدا تعالیٰ کی طرف سے چوکیدار مقرر ہیں جو اسکے بندوں کی ہر طرف سے یعنی کیا ظاہری طور پر اور کیا باطنی طور پر حفاظت کرتے ہیں۔اِس مقام میں صاحبِ معالم نے یہ حدیث لکھی ہے کہ ہر یک بندہ کے لئے ایک فرشتہ موکّل ہے جو اس کے ساتھ ہی رہتا ہے اور اس کی نیند اور بیداری میں شیاطین اور دوسری بلاؤں سے اس کی حفاظت کرتا رہتا ہے۔اور اِس مضمون کی ایک اَور حدیث کعب الاحبار سے بیان کی ہے۔اور ابنِ جریر اِس آیت کی تائید میں یہ حدیث لکھتا ہے اِنَّ مَعَكُمْ مَنْ لَا يُفَارِقُكُمْ اِلَّا عِنْدَ الْخَلَاءِ وَعِنْدَ الْجِمَاعِ فَاسْتَحْيُوْهُمْ وَاَكْرِمُوْهُمْ۔یعنی تمہارے ساتھ وہ فرشتے ہیں کہ بجز جماع اور پاخانہ کی حاجت کے تم سے جُدا نہیں ہوتے۔سو تم ان سے شرم کرو اور ان کی تعظیم کرو۔اور اِس جگہ عکرمہ سے یہ حدیث لکھی ہے کہ ملائک ہر یک شر سے بچانے کے لئے اِنسان کے ساتھ رہتے ہیں۔اور جب تقدیر مُبرم نازل ہو تو الگ ہو جاتے ہیں۔اور پھر مجاہد سے نقل کیا ہے کہ کوئی ایسا انسان نہیں جس کی حفاظت کے لئے دائمی طور پر ایک فرشتہ مقرر نہ ہو۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۷۶ تا ۸۰)

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ۔ النَّجْمُ الثَّاقِبُ۔ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ۔ اِن آیات کا ترجمہ یہ ہے کہ قسم ہے آسمان کی اور اس کی جو رات کو آنے والا ہے۔اور تجھے کیا خبر ہے کہ رات

---

[1] سورۃ الانفطار : ۱۱ [2] سورۃ الانعام : ۶۲ [3] سورۃ الرعد : ۱۲

کو آنے والی کیا چیز ہے؟ وہ ایک چمکتا ہوُا ستارہ ہے اور قسم اِس بات کے لئے ہے کہ ایک بھی ایسا جی نہیں کہ جو اس پر نگہبان نہ ہو۔ یعنی ہر ایک نفس پر نفوس مخلوقات میں سے ایک فرشتہ موکّل ہے جو اس کی نگہبانی کرتا ہے اور ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے جو اِس آیت کو کُلّی طور پر یعنی کُلّ کے لفظ سے مقید کرکے بیان فرمایا ہے۔ اِس سے یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ ہریک چیز جس پر نفس کا نام اطلاق پاسکتا ہے اس کی فرشتے حفاظت کرتے ہیں۔ پس بموجب اِس آیت کے نفوس کواکب کی نسبت بھی یہ عقیدہ رکھنا پڑا کہ کُل ستارے کیا سورج کیا چاند کیا زحل کیا مشتری ملائک کی زیرِ حفاظت ہیں یعنی ہریک کے لئے سُورج اور چاند وغیرہ میں سے ایک ایک فرشتہ مقرر ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے کاموں کو احسن طور پر چلاتا ہے۔

اِس جگہ کئی اعتراض پیدا ہوتے ہیں جن کا دفعہ کرنا ہمارے ذمّہ ہے۔ ازاں جملہ ایک یہ کہ جس حالت میں رُوح القدس صرف ان مقرّبوں کو ملتا ہے کہ جو بقا اور لقا کے مرتبہ تک پہنچتے ہیں تو پھر ہر ایک کا نگہبان کیونکر ہوسکتا ہے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ رُوح القدس کا کامل طور پر نزول مقرّبوں پر ہی ہوتا ہے مگر اِس کی فی الجملہ تائید حسبِ مراتب محبّت و اخلاص دوسروں کو بھی ہوتی ہے۔ ہماری تقریر مندرجہ بالا کا صرف یہ مطلب ہے کہ رُوح القدس کی اعلیٰ تجلّی کی یہ کیفیّت ہے کہ جب بقا اور لقا کے مرتبہ پر محبّتِ الٰہی انسان کی محبّت پر نازل ہوتی ہے تو یہ اعلیٰ تجلّی رُوح القدس کی اُن دونوں محبّتوں کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے جس کے مقابل پر دوسری تجلّیات کالعدم ہیں مگر یہ تو نہیں کہ دوسری تجلّیات کا وجود ہی نہیں۔ خدا تعالیٰ ایک ذرّہ محبّتِ خالصہ کو بھی ضائع نہیں کرتا۔ انسان کی محبّت پر اُس کی محبّت نازل ہوتی ہے اور اُسی مقدار پر رُوح القدس کی چمک پیدا ہوتی ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا ایک بندھا ہوُا قانون ہے کہ ہریک محبّت کے اندازہ پر الٰہی محبّت نزول کرتی رہتی ہے اور جب انسانی محبّت کا ایک دریا بہہ نکلتا ہے تو اُس طرف سے بھی ایک دریا نازل ہوتا ہے اور جب وہ دونوں دریا ملتے ہیں تو ایک عظیم الشّان نور ان میں سے پَیدا ہوتا ہے جو ہماری اصطلاح میں رُوح القدس سے موسوم ہے لیکن جیسے تم دیکھتے ہو کہ اگر بیس سیر پانی میں ایک ماشہ مصری ڈال دی جائے تو کچھ بھی مصری کا ذائقہ معلوم نہیں ہوگا اور پانی پھیکے کا پھیکا ہی ہوگا مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ مصری اس میں نہیں ڈالی گئی اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پانی میٹھا ہے یہی حال اُس رُوح القدس کا ہے جو ناقص طور پر ناقص لوگوں پر اُترتا ہے۔ اُس کے اُترنے میں تو شک نہیں ہوسکتا کیونکہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو بھی نیکی کا خیال رُوح القدس سے پَیدا ہوتا ہے کبھی فاسق اور فاجر اور بدکار بھی سچّی خواب دیکھ لیتا ہے اور یہ سب رُوح القدس کا اثر ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ نبویہ سے ثابت ہے مگر وہ تعلقِ عظیم جو مقدّسوں اور مقرّبوں کے ساتھ ہے اس کے مقابل پر یہ کچھ چیز نہیں گویا کالعدم ہے۔

ازاں جملہ ایک یہ سوال ہے کہ جس حالت میں رُوح القدس انسان کو بدیوں سے روکنے کے لئے مقرر ہے تو پھر اس سے گناہ کیونکر سرزد ہوتا ہے اور انسان کفر اور فسق اور فجور میں کیوں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کے لئے ابتلاء کے طور پر دو روحانی داعی مقرر کر رکھے ہیں۔ ایک داعی خیر جس کا نام رُوح القدس ہے اور ایک داعی شر جس کا نام ابلیس اور شیطان ہے۔ یہ دونوں داعی صرف خیر یا شر کی طرف بُلاتے رہتے ہیں مگر کسی بات پر جبر نہیں کرتے جیسا کہ اِس آیتِ کریمہ میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا[1] یعنی خدا بدی کا بھی الہام کرتا ہے اور نیکی کا بھی۔ بدی کے الہام کا ذریعہ شیطان ہے جو شرارتوں کے خیالات دِلوں میں ڈالتا ہے اور نیکی کے الہام کا ذریعہ رُوح القدس ہے جو پاک خیالات دِل میں ڈالتا ہے اور چونکہ خدا تعالیٰ عِلّت العِلل ہے اِس لئے یہ دونوں الہام خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر لئے کیونکہ اسی کی طرف سے یہ سارا انتظام ہے ورنہ شیطان کیا حقیقت رکھتا ہے جو کسی کے دل میں وسوسہ ڈالے اور رُوح القدس کیا چیز جو کسی کو تقویٰ کی راہوں کی ہدایت کرے۔ ہمارے مخالف آریہ اور برہمو اور عیسائی اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے قرآن کریم کی تعلیم پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اِس تعلیم کی رُو سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے دانستہ انسان کے پیچھے شیطان کو لگا رکھا ہے گویا اس کو آپ ہی خلق اللہ کا گمراہ کرنا منظور ہے مگر یہ ہمارے شتاب کار مخالفوں کی غلطی ہے۔ ان کو معلوم کرنا چاہیئے کہ قرآن کریم کی یہ تعلیم نہیں ہے کہ شیطان گمراہ کرنے کے لئے جبر کر سکتا ہے اور نہ یہ تعلیم ہے کہ صرف بدی کی طرف بُلانے کے لئے شیطان کو مقرر کر رکھا ہے بلکہ یہ تعلیم ہے کہ آزمائش اور امتحان کی غرض سے لمّہ ملک اور لمّہ ابلیس برابر طور پر انسان کو دیئے گئے ہیں یعنی ایک داعی خیر اور ایک داعی شر۔ تا انسان اس ابتلاء میں پڑ کر مستحق ثواب یا عقاب کا ٹھہر سکے کیونکہ اگر اس کے لئے ایک ہی طور کے اسباب پیدا کئے جاتے مثلاً اگر اس کے بیرونی اور اندرونی اسباب جذبات فقط نیکی کی طرف ہی اُس کو کھینچتے یا اس کی فطرت ہی ایسی واقع ہوتی کہ وہ بجز نیکی کے کاموں کے اَور کچھ کر ہی نہ سکتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ نیک کاموں کے کرنے سے اس کو کوئی مرتبہ قُرب کا مل سکے کیونکہ اس کے لئے تو تمام اسباب وجذبات نیک کام کرنے کے ہی موجود ہیں یا یہ کہ بدی کی خواہش تو ابتداء سے ہی اس کی فطرت سے مسلوب ہے تو پھر بدی سے بچنے کا اس کو ثواب کس استحقاق سے ملے۔ مثلاً ایک شخص ابتداء سے ہی نامرد ہے جو عورت کی کچھ خواہش نہیں رکھتا۔ اب اگر وہ ایک مجلس میں یہ بیان کرے کہ مَیں فلاں وقت جواں عورتوں کے ایک گروہ میں رہا جو خوبصورت بھی تھیں مگر مَیں ایسا پرہیزگار رہوں کہ مَیں نے ان کو شہوت کی نظر سے ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا اور خدا تعالیٰ سے ڈرتا رہا تو

---

[1] سورۃ الشمس: ۹

کچھ شک نہیں کہ سب لوگ اس کے اس بیان پر ہنسیں گے اور طنز سے کہیں گے کہ اے نادان کب اور کس وقت تجھ میں یہ قوت موجود تھی تا اُس کے روکنے پر تُو فخر کر سکتا یا کسی ثواب کی امید رکھتا۔ پس جاننا چاہیئے کہ سالک کو اپنی ابتدائی اور درمیانی حالات میں تمام امیدیں ثواب کی مخالفانہ جذبات سے پیدا ہوتی ہیں اور اِن منازلِ سلوک میں جن امور میں فطرت ہی سالک کی ایسی واقع ہو کہ اُس قسم کی بدی وہ کر ہی نہیں سکتا تو اِس قسم کے ثواب کا بھی وہ مستحق نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ہم بچھوا ور سانپ کی طرح اپنے وجود میں ایک ایسی زہر نہیں رکھتے جس کے ذریعے ہم کسی کو اس قسم کی ایذا پہنچا سکیں جو کہ سانپ اور بچھو پہنچاتے ہیں۔ سو ہم اس قسم کی ترکِ بدی میں عنداللہ کسی ثواب کے مستحق بھی نہیں۔

اَب اِس تحقیق سے ظاہر ہؤا کہ مخالفانہ جذبات جو انسان میں پیدا ہو کر انسان کو بدی کی طرف کھینچتے ہیں درحقیقت وہی انسان کے ثواب کا بھی موجب ہیں کیونکہ جب وہ خدا تعالیٰ سے ڈر کر اُن مخالفانہ جذبات کو چھوڑ دیتا ہے تو عنداللہ بلاشُبہ تعریف کے لائق ٹھہر جاتا ہے اور اپنے رَبّ کو راضی کر لیتا ہے۔ لیکن جو شخص انتہائی مقام کو پہنچ گیا ہے اُس میں مخالفانہ جذبات نہیں رہتے گویا اُس کا جن مسلمان ہو جاتا ہے مگر ثواب باقی رہ جاتا ہے کیونکہ وہ ابتلاء کے منازل کو بڑی مردانگی کے ساتھ طے کر چکا ہے جیسے ایک صالح آدمی جس نے بڑے بڑے نیک کام اپنی جوانی میں کئے ہیں اپنی پیرانہ سالی میں بھی اُن کا ثواب پاتا ہے۔

ازاں جملہ ایک یہ اعتراض ہے کہ خدا تعالیٰ کو فرشتوں سے کام لینے کی کیا حاجت ہے۔ کیا اُس کی بادشاہی بھی انسانی سلطنتوں کی طرح عملہ کی محتاج ہے اور اُس کو بھی فوجوں کی حاجت تھی جیسے انسان کو حاجت ہے۔ اما الجواب۔ پس واضح ہو کہ خدا تعالیٰ کو کسی چیز کی حاجت نہیں نہ فرشتوں کی نہ آفتاب کی نہ ماہتاب کی نہ ستاروں کی لیکن اِسی طرح اُس نے چاہا کہ تا اُس کی قدرتیں اسباب کے توسّط سے ظاہر ہوں اور تا اِسی غرض سے انسانوں میں حکمت اور علم پھیلے۔ اگر اسباب کا توسّط درمیان نہ ہوتا تو نہ دُنیا میں علمِ ہیئت ہوتا نہ نجوم نہ طبعی نہ طبابت نہ علمِ نباتات۔ یہ اسباب ہی ہیں جن سے علم پیدا ہوئے۔ تم سوچ کر دیکھو کہ اگر فرشتوں سے خدمت لینے سے کچھ اعتراض ہے تو وہی اعتراض سورج اور چاند اور کواکب اور نباتات اور جمادات اور عناصر سے خدمت لینے میں پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص معرفت کا کچھ حصّہ رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ ہر یک ذرّہ خدا تعالیٰ کے ارادہ کے موافق کام کر رہا ہے اور ایک قطرہ پانی کا جو ہمارے اندر جاتا ہے وہ بھی بغیر اذنِ الٰہی کے کوئی تاثیر موافق یا مخالف ہمارے بدن پر ڈال نہیں سکتا۔ پس تمام ذرّات اور سیارات وغیرہ درحقیقت ایک قسم کے فرشتے ہیں جو دن رات خدمت میں مشغول ہیں۔ کوئی انسان کے جسم کی خدمت میں مشغول ہے اور کوئی رُوح کی خدمت میں اور جس حکیم مطلق نے اِنسان کی جسمانی تربیت کے لئے بہت سے اسباب کا توسّط پسند کیا اور اپنی طرف سے بہت سے

جسمانی مؤثرات پیدا کئے تا اِنسان کے جسم پر انواع واقسام کے طریقوں سے تاثیر ڈالیں۔ اُسی وحدہٗ لاشریک نے جسکے کاموں میں وحدت اور تناسب ہے یہ بھی پسند کیا کہ انسان کی رُوحانی تربیت بھی اسی نظام اور طریق سے ہو کہ جو جسم کی تربیت میں اختیار کیا گیا تا وہ دونوں نظام ظاہری و باطنی اور رُوحانی اور جسمانی اپنے تناسب اور یک رنگی کی وجہ سے صانع واحد مدبّر بالارادہ پر دلالت کریں۔

پس یہی وجہ ہے کہ انسان کی رُوحانی تربیت بلکہ جسمانی تربیت کے لئے بھی فرشتے وسائط مقرر کئے گئے مگر یہ تمام وسائط خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں مجبور اور ایک کل کی طرح ہیں جس کو اُس کا پاک ہاتھ چلا رہا ہے اپنی طرف سے نہ کوئی ارادہ رکھتے ہیں نہ کوئی تصرّف۔ جس طرح ہوا خدا تعالیٰ کے حکم سے ہمارے اندر چلی جاتی ہے اور اُسی کے حکم سے باہر آتی ہے اور اُسی کے حکم سے تاثیر کرتی ہے یہی صورت اور بتمامہٖ یہی حال فرشتوں کا ہے۔ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ[1]۔ پنڈت دیانند نے جو فرشتوں کے اِس نظام پر اعتراض کیا ہے کاش پنڈت صاحب کو خدا تعالیٰ کے نظامِ جسمانی اور رُوحانی کا علم ہوتا تا بجائے اعتراض کرنے کے کمالات تعلیمِ قرآنی کے قائل ہو جاتے کہ کیسی قانونِ قدرت کی صحیح اور سچی تصویر اُس میں موجود ہے۔

ازاں جملہ ایک یہ اعتراض ہے کہ قرآن کریم کے بعض اشارات اور ایسا ہی بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایّام میں جبرائیل کے اُترنے میں کسی قدر توقّف بھی وقوع میں آئی ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایّامِ بعثت میں یہ بھی اِتفاق ہوُا ہے کہ بعض اَوقات کئی دن تک جبرائیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل نہیں ہوُا۔ اگر حضرت جبرائیل ہمیشہ اور ہر وقت قرینِ دائمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور رُوح القدس کا اثر ہمیشہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود پر جاری وساری تھا تو پھر توقّف نزول کے کیا معنی ہیں۔

امّا الجواب۔ پس واضح ہو کہ ایسا خیال کرنا کہ رُوح القدس کبھی انبیاء کو خالی چھوڑ کر آسمان پر چڑھ جاتا ہے صرف ایک دھوکہ ہے کہ جو بوجہ غلط فہمی نزول اور صعود کے معنوں کے دلوں میں متمکن ہو گیا ہے پوشیدہ نہ رہے کہ نزول کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ کوئی فرشتہ آسمان سے اپنا مقام اور مقر چھوڑ کر زمین پر نازل ہو جاتا ہے۔ ایسے معنے تو صریح نصوصِ قرآنیہ اور حدیثیہ کے مخالف ہیں چنانچہ فتح البیان میں ابنِ جریر سے بروائت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ حدیث مروی ہے قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا فِي السَّمَآءِ مَوْضِعُ قَدَمٍ اِلَّا عَلَيْهِ مَلَكٌ سَاجِدٌ اَوْ قَائِمٌ وَ ذٰلِكَ قَوْلُ الْمَلٰٓئِكَةِ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آسمان پر ایک قدم کی بھی ایسی جگہ خالی نہیں

---

[1] سورۃ النحل : ۵۱

جس میں کوئی فرشتہ ساجد یا قائم نہ ہو اور یہی معنے اِس آیت کے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک شخص ایک مقامِ معلوم یعنی ثابت شدہ رکھتا ہے جس سے ایک قدم اُوپر یا نیچے نہیں آسکتا۔ اَب دیکھو اِس حدیث سے صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ فرشتے اپنے مقامات کو نہیں چھوڑتے اور کبھی ایسا اِتفاق نہیں ہوتا کہ ایک قدم کی جگہ بھی آسمان پر خالی نظر آوے مگر افسوس کہ بطالوی صاحب اور دہلوی شیخ صاحب بھی اَب تک اس زمانہ میں بھی کہ علومِ حسیہ طبعیہ کا فروغ ہے یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ آسمان کا صرف باندازہ ایک قدم خالی رہنا کیا مشکل بات ہے۔ بعض اوقات تو بڑے بڑے فرشتوں کے نزول سے ہزار ہا کوس تک آسمان خالی ویران سنسان پڑا رہ جاتا ہے جس میں ایک فرشتہ بھی نہیں ہوتا کیونکہ جب چھ سَو موتیوں کے پَروں والا فرشتہ جس کا طول مشرق سے مغرب تک ہے یعنی جبرائیل زمین پر اپنا سارا وجود لے کر اُتر آیا تو پھر سوچنا چاہیئے کہ ایسے جسیم فرشتہ کے اُترنے سے ہزار ہا کوس تک آسمان خالی رہ جائے گا یا اس سے کم ہو گا۔ شیخ الکل کہلانا اور احادیثِ نبویّہ کو نہ سمجھنا جائے افسوس اور جائے شرم ہے۔

الغرض جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں یہ بات نہایت احتیاط سے اپنے حافظہ میں رکھ لینی چاہیئے کہ مقرّبوں کا رُوح القدس کی تاثیر سے علیحدہ ہونا ایک دَم کے لئے بھی ممکن نہیں کیونکہ ان کی نئی زندگی کی رُوح یہی رُوح القدس ہے پھر وہ اپنی رُوح سے کیونکر علیحدہ ہو سکتے ہیں اور جس علیحدگی کا ذکر احادیث اور بعض اشارات قرآن کریم میں پایا جاتا ہے اُس سے مُراد صرف ایک قِسم کی تجلّی ہے کہ بعض اَوقات بوجہ مصالحِ الٰہی اُس قِسم کی تجلّی میں کبھی دیر ہو گئی ہے اور اصطلاحِ قرآن کریم میں اکثر نزول سے مُراد وہی تجلّی ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۷۷ تا ۹۱ حاشیہ)

ازاں جملہ ایک یہ اعتراض ہے کہ سورۃ وَالطَّارِق میں خدا تعالیٰ نے غیر اللہ کی قسم کیوں کھائی حالانکہ آپ ہی فرماتا ہے کہ بجز اس کے کسی دوسرے کی قسم نہ کھائی جائے نہ انسان نہ آسمان کی، نہ زمین نہ کسی ستارہ کی نہ کسی اَور کی۔ اور پھر غیر کی قَسم کھانے میں خاص ستاروں اور آسمان کی قَسم کی خدا تعالیٰ کو اِس جگہ کیا ضرورت آ پڑی۔ سو درحقیقت یہ دو اعتراض ہیں جو ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں اور بوجہ اُن کے باہمی تعلقات کے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اِن کے جوابات ایک ہی جگہ بیان کئے جائیں۔

سو اوّل قِسم کے بارے میں خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ جلّ شانہٗ کی قَسموں کا اِنسانوں کی قسموں پر قیاس کر لینا قیاس مع الفارق ہے۔ خدا تعالیٰ نے جو انسان کو غیر اللہ کی قَسم کھانے سے منع کیا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ انسان جب قَسم کھاتا ہے تو اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی قَسم کھائی ہے اس کو ایک ایسے گواہ رویت کا قائم مقام ٹھہراوے کہ جو اپنے ذاتی علم سے اس کے بیان کی تصدیق یا تکذیب کر سکتا ہے کیونکہ اگر سوچ کر

دیکھو توقسم کا اصل مفہوم شہادت ہی ہے۔جب انسان معمولی شاہدوں کے پیش کرنے سے عاجز آجاتا ہے تو پھر قسم کا محتاج ہوتا ہے تا اُس سے وہ فائدہ اُٹھاوے جو ایک شاہد رویت کی شہادت سے اُٹھانا چاہیئے لیکن یہ تجویز کرنا یا اعتقاد رکھنا کہ بجز خدا تعالیٰ کے اَور بھی حاضر ناظر ہے اور تصدیق یا تکذیب یا سزا دہی یا کسی اَور امر پر قادر ہے صریح کلمۂ کفر ہے اِس لئے خدا تعالیٰ کی تمام کتابوں میں اِنسان کے لئے یہی تعلیم ہے کہ غیر اللہ کی ہرگز قسم نہ کھاوے۔

اَب ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی قسموں کا اِنسان کی قسموں کے ساتھ قیاس درست نہیں ہوسکتا کیونکہ خدا تعالیٰ کو انسان کی طرح کوئی ایسی مشکل پیش نہیں آتی کہ جو انسان کو قسم کے وقت پیش آتی ہے بلکہ اُس کا قسم کھانا ایک اَور رنگ کا ہے جو اُس کی شان کے لائق اور اُس کے قانونِ قدرت کے مطابق ہے اور غرض اس سے یہ ہے کہ تا صحیفۂ قدرت کے بدیہات کو شریعت کے اسرارِ دقیقہ کے حل کرنے کے لئے بطور شاہد کے پیش کرے اور چونکہ اس مدّعا کو قسم سے ایک مناسبت تھی اور وہ یہ کہ جیسا ایک قسم کھانے والا جب مثلاً خدا تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے تو اُس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ میرے اِس واقعہ پر گواہ ہے۔اِسی طرح خدا تعالیٰ کے بعض کُھلے کُھلے افعال بعض چھپے ہوئے افعال پر گواہ ہیں۔اِسی لئے اُس نے قسم کے رنگ میں اپنے افعالِ بدیہیہ کو اپنے افعالِ نظریہ کے ثبوت میں جابجا قرآن کریم میں پیش کیا اور اس کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُس نے غیر اللہ کی قسم کھائی کیونکہ وہ درحقیقت اپنے افعال کی قسم کھاتا ہے نہ کسی غیر کی اور اُس کے افعال اُس کے غیر نہیں ہیں۔مثلاً اُس کا آسمان یا ستارہ کی قسم کھانا اس قصد سے نہیں ہے کہ وہ کسی غیر کی قسم ہے بلکہ اِس نیّت سے ہے کہ جو اُس کے ہاتھوں کی صنعت اور حکمت آسمان اور ستاروں میں موجود ہے اس کی شہادت بعض اپنے افعالِ مخفیہ کے سمجھانے کے لئے پیش کرے سو درحقیقت خدا تعالیٰ کی اِس قسم کی قسمیں جو قرآن کریم میں موجود ہیں بہت سے اسرارِ معرفت سے بھری ہوئی ہیں۔اور جیسا کہ مَیں ابھی بیان کرچکا ہوں قسم کی طرز پر ان اسرار کا بیان کرنا محض اِس غرض سے ہے کہ قسم درحقیقت ایک قسم کی شہادت ہے جو شاہد رویت کے قائم مقام ہو جاتی ہے۔اِسی طرح خدا تعالیٰ کے بعض افعال بھی بعض دوسرے افعال کے لئے بطور شاہد کے واقعہ ہوئے ہیں سو اللہ تعالیٰ قسم کے لباس میں اپنے قانونِ قدرت کے بدیہات کی شہادت اپنی شریعت کے بعض دقائق حل کرنے کے لئے پیش کرتا ہے تا قانونِ قدرت جو خدا تعالیٰ کی ایک فعلی کتاب ہے اس کی قولی کتاب پر شاہد ہو جائے اور تا اس کے قول اور فعل کے باہم مطابقت ہوکر طالبِ صادق کے لئے مزید معرفت اور سکینت اور یقین کا موجب ہو اور یہ ایک عام طریق اللہ جلّ شانہٗ کا قرآن کریم میں ہے کہ اپنے افعالِ قدرتیہ کو جو اُس کی مخلوقات میں باقاعدہ منضبط اور مترتّب پائے جاتے ہیں اقوالِ شرعیہ کے حل کرنے کے لئے جابجا پیش کرتا ہے

تا اِس بات کی طرف لوگوں کو توجہ دلاوے کہ یہ شریعت اور یہ تعلیم اُسی ذات وحدہٗ لاشریک کی طرف سے ہے جس کے ایسے افعال موجود ہیں جو اُس کے اِن اقوال سے مطابقتِ کُلّی رکھتے ہیں کیونکہ اقوال کا افعال سے مطابق آجانا بلاشُبہ اِس بات کا ایک ثبوت ہے کہ جس کے یہ افعال ہیں اُسی کے یہ اقوال ہیں۔

اب ہم نمونہ کے طور پر اُن چند قسموں کی تفصیل لکھتے ہیں جو قرآن کریم میں وارد ہیں چنانچہ منجملہ ان کے ایک یہی قسم ہے کہ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۔ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۔ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۔ اِن آیات میں اصل مدّعا اور مقصد یہ ہے کہ ہر یک نفس کی رُوحانی حفاظت کے لئے ملائک مقرر ہیں جو ہر دَم اور ہر وقت ساتھ رہتے ہیں اور جو حفاظت کا طالب ہو اس کی حفاظت کرتے ہیں لیکن یہ بیان ایک باریک اور نظری ہے۔ فرشتوں کا وجود خود ہی غیر مرئی ہے پھر ان کی حفاظت پر کیونکر یقین آوے اِسلئے خداوند کریم وحکیم نے اپنے قانونِ قدرت کو جو اجرامِ سماوی میں پایا جاتا ہے اِس جگہ قسم کے پیرایہ میں بطور شاہد کے پیش کیا اور وہ یہ ہے کہ قانونِ قدرت خدا تعالیٰ کا صاف اور صریح طور پر نظر آتا ہے کہ آسمان اور جو کچھ کواکب اور شمس اور قمر اور جو کچھ اُس کے پول میں ہَوا وغیرہ موجود ہے یہ سب اِنسان کے لئے جسمانی خدمات میں لگے ہوئے ہیں اور طرح طرح کے جسمانی نقصانوں اور حرجوں اور تکلیفوں اور تنگیوں سے بچاتے ہیں اور اُس کے جسم اور جسمانی قویٰ کے کُل مایحتاج کو طیار کرتے ہیں خاص کر رات کے وقت جو ستارے پیدا ہوتے ہیں جنگلوں اور بیابانوں میں چلنے والے اور سمندروں کی سَیر کرنے والے اُن چمکدار ستاروں سے بڑا ہی فائدہ اُٹھاتے ہیں اور اندھیری رات کے وقت ہر یک نجمِ ثاقب رہنمائی کر کے جان کی حفاظت کرتا ہے اور اگر یہ محافظ نہ ہوں جو اپنے اپنے وقت میں شرطِ حفاظت بجا لا رہے ہیں تو انسان ایک طرفۃ العین کے لئے بھی زندہ نہ رہ سکے۔ سوچ کر جواب دینا چاہیئے کہ کیا ہم بغیر اُن تمام محافظوں کے کہ کوئی ہمارے لئے حرارتِ مطلوبہ طیار رکھتا ہے اور کوئی اناج اور پھل پکاتا ہے اور کوئی ہمارے پینے کے لئے پانیوں کو برساتا ہے اور کوئی ہمیں روشنی بخشتا ہے اور کوئی ہمارے تنفّس کے سِلسلہ کو قائم رکھتا ہے اور کوئی ہماری قوّتِ شنوائی کو مدد دیتا ہے اور کوئی ہماری حرارتِ غریزی پر صحت کا اثر ڈالتا ہے زندہ رہ سکتے ہیں۔ اب اسی سے انسان سمجھ سکتا ہے کہ جس خداوند کریم وحکیم نے یہ ہزارہا اجرامِ سماوی وعناصر وغیرہ ہمارے اجسام کی درستی اور قائمی کے لئے پیدا کئے اور دن رات بلکہ ہر دَم اُن کی خدمت میں لگا دیا ہے کیا وہ ہماری رُوحانی حفاظت کے انتظام سے غافل رہ سکتا تھا اور کیونکر ہم اس کریم ورحیم کی نسبت ظن کر سکتے ہیں کہ ہمارے جسم کی حفاظت کے لئے تو اُس نے اِس قدر سامان پیدا کر دیا کہ ایک جہان ہمارے لئے خادم بنا دیا لیکن ہماری رُوحانی حفاظت کے لئے کچھ بندوبست نہ فرمایا۔

اَب اگر ہم انصاف سے سوچنے والے ہوں تو اِسی سے ایک مُحکم دلیل مِل سکتی ہے کہ بے شک رُوحانی حفاظت کے لئے بھی حکیمِ مطلق نے کوئی ایسا اِنتظام مقرر کیا ہو گا کہ جو جسمانی اِنتظام سے مشابہ ہوگا سو وہ ملایک کا حفاظت کے لئے مقرر کرنا ہے۔

سو اِسی غرض سے خدا تعالیٰ نے یہ قسم آسمان اور ستاروں کی کھائی تا ملائک کی حفاظت کے مسئلے کو جو ایک مخفی اور نظری مسئلہ ہے نجوم وغیرہ کی حفاظت کے انتظام سے جو ایک بدیہی امر ہے بخوبی کھول دیوے اور ملائک کے وجود کے ماننے کے لئے غور کرنے والوں کے آگے اپنے ظاہر انتظام کو رکھ دیوے جو جسمانی انتظام ہے تا عقلِ سلیم جسمانی انتظام کو دیکھ کر اُسی نمونہ پر رُوحانی انتظام کو بھی سمجھ لیوے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۹۴ تا ۱۰۲ حاشیہ)

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ۔ اگرچہ ملائک جسمانی آفات سے بھی بچاتے ہیں لیکن ان کا بچانا رُوحانی طور پر ہی ہے۔ مثلاً ایک شخص ایک گرنے والی دیوار کے نیچے کھڑا ہے تو یہ تو نہیں کہ فرشتہ اپنے ہاتھوں سے اُٹھا کر اُس کو دُور لے جائے گا بلکہ اگر اس شخص کا اُس دیوار سے بچنا مقدر ہے تو فرشتہ اُس کے دِل میں الہام کر دے گا کہ یہاں سے جلد کھسکنا چاہیئے لیکن ستاروں اور عناصر وغیرہ کی حفاظت جسمانی ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام نوٹ بر صفحہ ۹۹)

اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى قَالَ فِيْ كِتَابِهِ الْمُحْكَمِ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ، فَلَمَّا كَانَتِ الْمَلَائِكَةُ حَافِظِيْنَ لِنُفُوْسِ النُّجُوْمِ وَالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَالْاَفْلَاكِ وَالْعَرْشِ وَكُلِّ مَا فِي الْاَرْضِ لَزِمَ اَنْ لَا يُفَارِقُوْا مَا يَحْفَظُوْنَهٗ طَرْفَةَ عَيْنٍ فَانْظُرْ كَيْفَ ظَهَرَ مِنْ هٰذَا الْاَمْرِ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا زَعَمَ الزَّاعِمُوْنَ مِنْ نُزُوْلِهِمْ وَصُعُوْدِهِمْ بِاَجْسَامِهِمِ الْاَصْلِيَّةِ فَلَا مَفَرَّ اِلٰى سَبِيْلٍ مِنْ قُبُوْلِ دَقِيْقَةِ الْمَعْرِفَةِ الَّتِيْ كَتَبْنَاهَا اَعْنِيْ اَنَّ الْمَلَائِكَةَ لَا يَنْزِلُوْنَ بِنُزُوْلٍ حَقِيْقِيٍّ وَلَا يَرَوْنَ وَعْثَاءَ السَّفَرِ بَلْ

ترجمہ از مرتب:۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مُحکم کتاب میں فرمایا ہے کہ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ یعنی خدا کی طرف سے ہر نفس پر ایک محافظ مقرر ہے اور جب فرشتے ستاروں، سُورج، چاند، افلاک اور عرش اور جو کچھ زمین میں ہے ان کے محافظ ہیں تو یہ بات لازم آئی کہ وہ جن چیزوں کی حفاظت کر رہے ہیں ان سے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی علیحدہ نہ ہوں۔ پس دیکھو کہ کس طرح اِس آیت سے حق واضح ہو گیا ہے اور ان لوگوں کا خیال جو فرشتوں کے نزول اور صعود کو ان کے اصلی وجود کے ساتھ قرار دیتے ہیں غلط ثابت ہو گیا۔ پس اِس دقیقۂ معرفت کو قبول کرنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں جسے ہم نے لکھا ہے یعنی یہ کہ ملائکہ حقیقی طور پر زمین پر نہیں اُترتے اور نہ وہ سفر کی مشقّت کو برداشت کرتے ہیں

إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ إِرَاءَتَهُمْ فِي النَّاسُوْتِ فَيَخْلُقُ لَهُمْ وُجُوْدًا تَمْثِيْلِيًّا فِي الْأَرْضِ فَتَرَاهُمُ الْعَيْنُ الَّتِيْ تَسْرَحُ فِيْ رَوْضَاتِ الْكَشْفِ، وَلَوْ لَمْ يَكُنْ كَذٰلِكَ لَلَزِمَ أَنْ يَرَى الْمَلَائِكَةَ النَّاسُ كُلُّهُمْ عِنْدَ نُزُوْلِهِمْ إِلَى الْأَرْضِ لِقَبْضِ الْأَرْوَاحِ وَغَيْرِهَا مِنَ الْمُهِمَّاتِ وَلَلَزِمَ أَنْ يَرٰى مَلَكَ الْمَوْتِ مَثَلًا كُلُّ مَنْ تُوُفِّيَ أَحَدٌ مِنْ أَقَارِبِهِ وَمِمَّنْ يُؤَاخِيْهِ وَمِنْ عَشِيْرَتِهٖ وَعَقِبِهٖ وَقَوْمِهٖ وَأَصْدِقَائِهٖ أَمَامَ عَيْنَيْهِ فَإِنَّ جِسْمَ الْمَلَائِكَةِ جِسْمٌ كَأَجْسَامٍ أُخْرٰى فَلَا وَجْهَ لِعَدَمِ رُؤْيَتِهِمْ مَعَ نُزُوْلِهِمْ بِأَجْسَامِهِمُ الْأَصْلِيَّةِ وَأَنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ خَلْقًا كَثِيْرًا يَمُوْتُوْنَ أَمَامَ أَعْيُنِنَا فَلَا نَرٰى عِنْدَ نَزْعِهِمْ وَغَمْرَةِ مَوْتِهِمُ الْمَلَائِكَةَ الَّتِيْ تَتَوَفَّاهُمْ وَمَا نَسْمَعُ مَا يَسْئَلُوْنَ الْمَوْتٰى وَمَا يُكَلِّمُوْنَهُمْ۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۶۷)

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝ وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝ إِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝ إِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝ وَّأَكِيْدُ كَيْدًا ۝

وَالْقَوْلُ الْجَامِعُ الْمُهَيْمِنُ الَّذِيْ يَهْدِيْ إِلَى الْحَقِّ وَيَحْكُمُ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا آيَةٌ جَلِيْلَةٌ

بلکہ جب اللہ تعالیٰ عالم انسانیت میں ان کو دکھانے کا ارادہ کرتا ہے تو ان کے لئے ایک تمثیلی وجود زمین میں پیدا کر دیتا ہے تب ان کو وہ آنکھ ہی دیکھ پاتی ہے جو کشف کے باغات میں پھرتی رہتی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو لازم آتا کہ تمام لوگ ملائکہ کو ان کے نزول کے وقت دیکھتے جب وہ زمین پر قبض اَرواح کے لئے اور دوسری مہمات کو سَر کرنے کے لئے آتے ہیں۔ پھر اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ مثلاً جب ملک الموت کسی کو وفات دینے کے لئے آتا ہے تو متوفی کے اقارب، بھائی بند اور اولاد اور اس کی قوم کے لوگ اور اسکے دوست اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے کیونکہ ان کے نزدیک فرشتوں کے اجسام دوسرے اجسام کی طرح ہی ہیں اِس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے اصلی اجسام کے ساتھ نزول کے وقت دکھائی نہ دیں۔ پھر تم یہ بھی جانتے ہو کہ بہت سے لوگ ہمارے سامنے مرتے ہیں لیکن ان کی نزع کے وقت ہم ان ملائکہ کو نہیں دیکھتے جو ان کو وفات دیتے ہیں اور نہ ہی ہم اس سوال و جواب کو سُنتے ہیں جو وہ مُردوں سے کرتے ہیں۔

(حمامۃ البشریٰ صفحہ ۶۷)

ترجمہ از مرتّب :۔ بالکل صحیح اور جامع بات جو حق کا پتہ دیتی ہے اور ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان جھگڑے

مِنْ سُوْرَۃِ الطَّارِقِ تَذْکِرَۃً سِرًّا غَفَلُوْا مِنْہُ اَھْلُ الْھَوَا۔ اَعْنِیْ قَوْلَہٗ تَعَالٰی وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ۔ اِنَّھُمْ یَکِیْدُوْنَ کَیْدًا وَّ اَکِیْدُ کَیْدًا۔ فَاعْلَمُوْا اَیُّھَا الْاَعِزَّۃُ۔ اَنَّ ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ بَحْرٌ مَّوَّاجٌ مِّنْ تِلْکَ الْاَسْرَارِ مَا اَحَاطَتْھَا فِکْرٌ مِّنَ الْاَفْکَارِ وَمَا مَسَّتْھَا مُدْرِکَۃُ الْوَرٰی وَفَھَّمَنِیْ رَبِّیْ اَسْرَارَ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ وَاخْتَصَّنِیْ بِھَا۔ وَتَفْصِیْلُہٗ اَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی اَشَارَ فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ اِلٰی اَنَّ السَّمَاءَ مَجْمُوْعَۃُ مُؤَثِّرَاتٍ وَالْاَرْضَ مَجْمُوْعَۃُ مُتَاَثِّرَاتٍ وَ یَنْزِلُ الْاَمْرُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ فَتَلَقَّتْہُ الْاَرْضُ بِالْقَبُوْلِ وَلَا تَاْبٰی۔ وَفِیْ ھٰذَا اِشَارَۃٌ اِلٰی اَنَّ کُلَّ مَا فِی السَّمَآءِ مِنَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَالنُّجُوْمِ وَالْمَلَائِکَۃِ وَاَرْوَاحِ الْمُقَدَّسِیْنَ مِنَ الرُّسُلِ وَالنَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَغَیْرِھِمْ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ یُلْقِیْ اَثَرَہٗ عَلٰی مَا فِی الْاَرْضِ بِمُنَاسَبَاتٍ قَضَتْ حِکْمَۃُ الْقُدُسِ رِعَایَتَھَا۔ فَالسَّمَاءُ تَتَوَجَّہُ اِلَی الْاَرْضِ بِاَقْسَامٍ غَیْرِ مُتَنَاھِیَۃٍ مِنَ النُّزُوْلِ وَالرَّجْعِ وَالْاَرْضُ تَتَقَبَّلُھَا بِالْاِنْصِدَاعِ وَالْاِیْوَاءِ بِاَقْسَامٍ لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی۔ فَمِنْ اَقْسَامِ نَتَائِجِ

کا فیصلہ کر دیتی ہے قرآن مجید کی سُورۃ طارق کی وہ آیتِ جلیلہ ہے جو اس بھید کو بتاتی ہے جس سے اپنی خواہشات کے تابع لوگ غافل ہیں۔ میری مراد خدا تعالیٰ کے قول وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ۔ اِنَّھُمْ یَکِیْدُوْنَ کَیْدًا وَّ اَکِیْدُ کَیْدًا سے ہے۔ پس اے عزیزو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ آیت ان اسرار کا موجیں مارتا ہوا ایک سمندر ہے جس کا کسی کی سوچ نے احاطہ نہیں کیا اور نہ ہی مخلوق کی عقل نے ان کو چھوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اِس آیت کے اسرار سمجھائے ہیں اور ان کے ساتھ مجھے ہی مخصوص کیا ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں اِس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آسمان مؤثرات کا مجموعہ ہے اور زمین متأثرات کا مجموعہ۔ اور امرِ الٰہی آسمان سے زمین پر نازل ہوتا ہے اور زمین اس کو قبول کر لیتی ہے اور انکار نہیں کرتی۔ اور اس میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے یعنی سُورج، چاند، ستارے، ملائکہ اور پاک انبیاء و رسول اور صدیق اور ان کے علاوہ دوسرے مومنوں کی ارواح ان مناسبات کے ساتھ کہ جن کی رعایت حکمتِ قدسیہ تقاضا کرتی ہے۔ زمین پر موجود اشیاء پر اثر ڈالتی ہیں۔ سو آسمان نزول اور رجع کی بے شمار اقسام کے ساتھ زمین کی طرف توجّہ کرتا ہے اور زمین اسے اپنے اندر لینے اور اسے نشوونما دینے کی اَن گنت اقسام کے ساتھ اسے قبول کرتی ہے۔ اِس رجع اور صدع کے عمل

هٰذَا الرَّجْعِ وَالصَّدْعِ اَشْيَاءُ تَحْدُثُ فِيْ طَبَقَاتِ الْاَرْضِ كَالْفِضَّةِ وَالذَّهَبِ وَالْحَدِيْدِ وَجَوَاهِرَاتٌ نَفِيْسَةٌ وَاَشْيَاءُ اُخْرٰى۔ وَمِنْ اَقْسَامِهِ الزُّرُوْعُ وَالْاَشْجَارُ وَالنَّبَاتَاتُ وَالثِّمَارُ وَالْعُيُوْنُ وَالْاَنْهَارُ وَكُلُّ مَا تَتَصَدَّعُ عَنْهُ الثَّرٰى وَمِنْ اَقْسَامِهٖ جِمَالٌ وَحَمِيْرٌ وَاَفْرَاسٌ وَكُلُّ دَابَّةٍ تَدُبُّ عَلَى الْاَرْضِ وَكُلُّ طَيْرٍ يَطِيْرُ فِي الْهَوَاءِ۔ وَمِنْ اَقْسَامِهِ الْاِنْسَانُ الَّذِيْ خُلِقَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ وَفُضِّلَ عَلٰى كُلِّ مَنْ دَبَّ وَمَشٰى وَمِنْ اَقْسَامِهِ الْوَحْيُ وَالنُّبُوَّةُ وَالرِّسَالَةُ وَالْعَقْلُ وَالْفَطَانَةُ وَالشَّرَافَةُ وَالنَّجَابَةُ وَالسَّفَاهَةُ وَالْجَهْلُ وَالْحُمْقُ وَالرَّذَالَةُ وَتَرْكُ الْحَيَاءِ۔ وَمِنْ اَقْسَامِهٖ نُزُوْلُ اَرْوَاحِ الْاَنْبِيَاءِ وَالرُّسُلِ نُزُوْلًا اِنْعِكَاسِيًّا عَلٰى كُلِّ مَنْ يُنَاسِبُ فِطْرَتَهُمْ وَيُشَابِهُ جَوْهَرَهُمْ وَخِلْقَتَهُمْ فِي الْخَلْقِ وَالصِّدْقِ وَالصَّفَاءِ وَمِنْ هٰهُنَا ظَهَرَ اَنَّ تَاْثِيْرَاتِ النُّجُوْمِ ثَابِتَةٌ مُتَحَقِّقَةٌ مَنْصُوْصَةٌ وَلَا يَشُكُّ فِيْهَا اِلَّا الْجَاهِلُ الْغَبِيُّ الْبَلِيْدُ الَّذِيْ لَا يَنْظُرُ فِي الْقُرْاٰنِ وَيُجَادِلُ كَالْاَعْمٰى وَهٰذَا الرَّجْعُ وَالصَّدْعُ جَارٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مِنْ يَوْمٍ خَلَقَهُمَا اللّٰهُ وَقَالَ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ[1] فَمَالَتِ السَّمَآءُ اِلَى الْاَرْضِ كَالذَّكَرِ اِلَى الْاُنْثٰى وَلِاَجْلِ ذٰلِكَ اِخْتَارَ

کے نتیجہ میں بہت سی چیزیں طبقات الارض میں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً چاندی، سونا، لوہا، جواہراتِ نفیسہ اور ایسی ہی اور اشیاء۔ اور اس کی اقسام میں سے کھیتیاں، درخت، نباتات، پھل، چشمے اور دریا وغیرہ ہیں۔ نیز جملہ وہ اشیاء جن کے ظاہر کرنے کے لئے زمین پھٹتی ہے اور پھر اس کی اقسام میں سے اُونٹ، گدھے، گھوڑے اور اسی قسم کے دوسرے تمام چارپائے ہیں جو زمین پر چلتے ہیں اور ہوا میں اُڑنے والے تمام پرندے ہیں اور اس کی اقسام میں سے انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے احسنِ تقویم میں پیدا کیا ہے اور ہر رینگنے اور چلنے والے حیوان پر اس کو فضیلت دی گئی ہے اور اسی کی اقسام میں سے وحی اور نبوّت و رسالت اور عقل، فطانت، شرافت، نجابت، بیوقوفی، جہالت، حماقت، رذالت اور بے حیائی ہیں اور اسی کی اقسام میں سے انبیاء اور رسولوں کی اَرواح کا ہر اس وجود پر انعکاسی طور پر نزول کرنا ہے جو ان کی فطرت کے مشابہ ہو اور جوہر اور خلقت اور صدق وصفا میں ان کے مشابہ ہو۔ اِس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نجوم کی تاثیرات ثابت شدہ متحقّق اور مسلّمہ ہیں اور اس میں صرف جاہل، کُند ذہن جو قرآن کریم میں غور و فکر نہیں کرتا اور اندھوں کی طرح جھگڑتا ہے وہی شک کر سکتا ہے اور یہ رجع اور صدع کا عمل آسمانوں اور زمین میں اُس دن سے جاری ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے اِن دونوں

---

[1] سورۃ حٰمٓ السجدۃ: ۱۲

الرَّبُّ الْكَرِيْمُ لَفْظَ الرَّجْعِ لِلسَّمَاءِ وَلَفْظَ الصَّدْعِ لِلْاَرْضِ اِشَارَةً اِلٰى اَنَّهُمَا تَجْتَمِعَانِ دَائِمًا كَاجْتِمَاعِ الذُّكُوْرِ وَالْاِنَاثِ وَلَا تَاْبٰى اِحْدٰهُمَا مِنَ الْاُخْرٰى وَتَطْغٰى۔ فَتَاْثِيْرَاتُ السَّمَاءِ تَنْزِلُ ثُمَّ تَنْزِلُ وَالْاَرْضُ تَقْبَلُهَا ثُمَّ تَقْبَلُ وَلَا تَنْقَطِعُ هٰذِهِ السِّلْسِلَةُ الدَّوْرِيَّةُ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَلَوْلَا ذٰلِكَ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَمَا فِيْهَا۔ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ اَوَّلِ هٰذِهِ الْاٰيَةِ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ وَقَالَ بَعْدَ ذٰلِكَ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ فَمَا اَدْرَاكَ اَنَّهٗ فِيْ جَمْعِ ذِكْرِ الرَّجْعَيْنِ اِلٰى مَا اَوْمٰى۔ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ اَشَارَ اِلٰى اَنَّ عَوْدَ الْاِنْسَانِ بِالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ فِيْ قُدْرَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى كَمَا اَنَّهٗ يُعِيْدُ اَرْوَاحَ الْمُقَدَّسِيْنَ بِاِعَادَاتِ انْعِكَاسِيَّةٍ مِنَ السَّمَآءِ الَّتِيْ هِيَ ذَاتُ الرَّجْعِ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ هِيَ ذَاتُ الصَّدْعِ وَمَوْلَدُ كُلِّ مَنْ يَحْيٰى۔ وَهٰذِهٖ نُكْتَةٌ عَظِيْمَةٌ لَطِيْفَةٌ۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۴۴۲ تا ۴۴۶)

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ اِس جگہ آسمان سے مُراد وہ کُرۂ زمہریر ہے جس سے پانی برستا ہے اور اِس آیت میں اس کُرۂ زمہریر کی قسم کھائی گئی ہے جو مینہ برساتا ہے اور رَجْع کے معنے مینہ ہے اور خلاصہ معنی آیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں وحی کا ثبوت دینے کے لئے آسمان کو گواہ لاتا ہوں جس سے

کو پیدا کیا ہے اور ان کو کہا اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا تو انہوں نے کہا اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ۔ پس آسمان زمین کی طرف اِس طرح مائل ہؤا جس طرح نر مادہ کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اِسی لئے ربّ کریم نے آسمان کے لئے لفظ رَجْعٌ اختیار کیا اور زمین کے لئے لفظ صَدْعٌ۔ اور اس میں اِس بات کی طرف اشارہ کیا کہ یہ دونوں ہمیشہ نر و مادہ کی طرح جمع ہوتے چلے جائیں گے اور ان میں سے نہ کوئی دوسرے سے نفرت کرے گا اور نہ سرکشی۔ پس آسمان کی تاثیرات متواتر نازل ہوتی رہتی ہیں اور زمین اس کو بار بار قبول کرتی ہے اور یہ عمل ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں رُکتا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو زمین اور اس میں موجود مخلوقات سب کا نظام بگڑ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اِس آیت کے شروع میں ہی فرمایا تھا اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ اور اِس کے بعد فرمایا وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ اور تمہیں کیونکر علم ہو کہ ان دونوں رَجْع کے ذکر کو ایک جگہ بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ نے کس طرف اشارہ کیا ہے، سو جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس میں اِس طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان کا بعث بعد الموت کے ذریعہ دوبارہ زندہ کیا جانا اللہ کی قدرت میں ہے جس طرح وہ مقدّسین کی ارواح کو بروزی طور پر آسمان سے (جو ذَاتِ الرَّجْعِ ہے) زمین کی طرف (جو ذَاتِ الصَّدْعِ ہے اور ہر زندہ کا مولد ہے) لوٹاتا ہے اور یہ بڑا لطیف اور عظیم نکتہ ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اِسلام صفحہ ۴۴۲ تا ۴۴۶)

پانی برستا ہے۔یعنی تمہاری رُوحانی حالت بھی ایک پانی کی محتاج ہے اور وہ آسمان سے ہی آتا ہے جیسا کہ تمہارا جسمانی پانی آسمان سے آتا ہے۔ اگر وہ پانی نہ ہو تو تمہاری عقلوں کے پانی بھی خشک ہو جائیں۔ عقل بھی اسی آسمانی پانی یعنی وحیٔ الٰہی سے تازگی اور روشنی پاتی ہے۔ غرض جس خدمت میں آسمان لگا ہؤا ہے یعنی پانی برسانے کی خدمت۔ یہ کام آسمان کا خدا تعالیٰ کی پہلی صفت کا ایک ظِلّ ہے جیسا کہ خدا فرماتا ہے کہ ابتداء ہر ایک چیز کا پانی سے ہے۔ انسان بھی پانی سے ہی پیدا ہوتا ہے اور وید کی رُو سے پانی کا دیوتا اکاش ہے جس کو وید کی اِصطلاح میں اِندر کہتے ہیں مگر یہ سمجھنا غلطی ہے کہ یہ اِندر کچھ چیز ہے بلکہ وہی پوشیدہ اور نہاں در نہاں طاقتِ عظمٰی جس کا نام خدا ہے اس میں کام کر رہی ہے۔ (نسیم دعوت صفحہ ۷۴)

قرآن شریف کی اِصطلاح کی رُو سے جو فضا یعنی پول اُوپر کی طرف ہے جس میں بادل جمع ہو کر مینہ برستا ہے اس کا نام بھی آسمان ہے جس کو ہندی میں اکاش کہتے ہیں۔ (نسیم دعوت صفحہ ۷۴ حاشیہ)

قرآن شریف نے وحی اور الہام کی سُنّتِ قدیمہ پر قانونِ قدرت سے گواہی لانے کے لئے ایک اَور مقام میں بھی اسی قِسم کی قسم کھائی ہے اور وہ یہ ہے وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ یعنی اُس آسمان کی قسم ہے جس کی طرف سے بارش آتی ہے اور اُس زمین کی قسم ہے جو بارش سے طرح طرح کی سبزیاں نکالتی ہے کہ یہ قرآن خدا کا کلام ہے اور اس کی وحی ہے اور وہ باطل اور حق میں فیصلہ کرنے والا ہے اور عبث اور بیہودہ نہیں آیا یعنی بے وقت نہیں آیا۔ موسم کے مینہ کی طرح آیا ہے۔

اب خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کے ثبوت کے لئے جو اس کی وحی ہے ایک کُھلے کُھلے قانونِ قدرت کو قسم کے رنگ میں پیش کیا یعنی قانونِ قدرت میں ہمیشہ یہ بات مشہود اور مرئی ہے کہ ضرورتوں کے وقت آسمان سے بارش ہوتی ہے اور تمام مدار زمین کی سرسبزی کا آسمان کی بارش پر ہے اگر آسمان سے بارش نہ ہو تو رفتہ رفتہ کنوئیں بھی خشک ہو جاتے ہیں پس دراصل زمین کے پانی کا وجود بھی آسمان کی بارش پر موقوف ہے اِسی وجہ سے جب کبھی آسمان سے پانی برستا ہے تو زمین کے کنوؤں کا پانی چڑھ آتا ہے۔ کیوں چڑھ آتا ہے؟ اِس کا یہی سبب ہے کہ آسمانی پانی زمین کے پانی کو اُوپر کی طرف کھینچتا ہے۔ یہی رشتہ وحی اللہ اور عقل میں ہے۔ وحی اللہ یعنی الہامِ الٰہی آسمانی پانی ہے اور عقل زمینی پانی ہے اور یہ پانی ہمیشہ آسمانی پانی سے جو الہام ہے تربیت پاتا ہے اور اگر آسمانی پانی یعنی وحی ہونا بند ہو جائے تو یہ زمینی پانی بھی رفتہ رفتہ خشک ہو جاتا ہے۔ کیا اس کے واسطے یہ دلیل کافی نہیں کہ جب ایک زمانہ دراز گذر جاتا ہے اور کوئی الہام یافتہ زمین پر پیدا نہیں ہوتا تو عقلمندوں کی عقلیں نہایت گندی اور خراب ہو جاتی ہیں جیسے زمینی پانی خشک ہو جاتا اور سڑ جاتا ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے اس زمانہ پر ایک نظر ڈالنا کافی ہے جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے پہلے اپنا رنگ

تمام دُنیا میں دِکھلا رہا تھا۔چونکہ اُس وقت حضرت مسیح کے زمانہ کو چھ سَو برس گذر گئے تھے اور اس عرصہ میں کوئی الہام یافتہ پَیدا نہیں ہوُا تھا اِس لیئے تمام دُنیا نے اپنی حالت کو خراب کر دیا تھا۔ ہر ایک مُلک کی تاریخیں پکار پکار کر کہتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مگر آپؐ کے ظہور سے پہلے تمام دُنیا میں خیالاتِ فاسدہ پھیل گئے تھے۔ ایسا کیوں ہوُا تھا اور اس کا کیا سبب تھا؟ یہی تو تھا کہ الہام کا سلسلہ مُدتوں تک بند ہو گیا تھا۔آسمانی سلطنت صرف عقل کے ہاتھ میں تھی۔پس اِس ناقص عقل نے کِن کِن خرابیوں میں لوگوں کو ڈالا۔کیا اس سے کوئی ناواقف بھی ہے۔دیکھو الہام کا پانی جب مدت تک نہ برسا تو تمام عقلوں کا پانی کیسا خشک ہو گیا۔

سو اِن قسموں میں یہی قانونِ قدرت اللہ تعالیٰ پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ تم غور کر کے دیکھو کہ کیا خدا کا یہ محکم اور دائمی قانونِ قدرت نہیں کہ زمین کی تمام سرسبزی کا مدار آسمان کا پانی ہے۔سو اِس پوشیدہ قانونِ قدرت کے لیئے جو الہامِ الٰہی کا سلسلہ ہے یہ کُھلا کُھلا قانونِ قدرت بطور گواہ کے ہے سو اِس گواہ سے فائدہ اُٹھاؤ اور صرف عقل کو اپنا رہبر مت بناؤ کہ وہ ایسا پانی نہیں جو آسمانی پانی کے سوا موجود رہ سکے جس طرح آسمانی پانی کا یہ خاصہ ہے کہ خواہ کسی کنوئیں میں اس کا پانی پڑے یا نہ پڑے وہ اپنی طبعی خاصیت سے تمام کنوؤں کے پانی کو اُوپر چڑھا دیتا ہے ایسا ہی جب خدا کا ایک الہام یافتہ دُنیا میں ظہور فرماتا ہے خواہ کوئی عقلمند اس کی پیروی کرے یا نہ کرے مگر اس الہام یافتہ کے زمانہ میں خود عقلوں میں ایسی روشنی اور صفائی آجاتی ہے کہ پہلے اس سے موجود نہ تھی لوگ خواہ نخواہ حق کی تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں اور غیب سے ایک حرکت ان کی قوتِ متفکرہ میں پیدا ہو جاتی ہے سو یہ تمام عقلی ترقی اور دلی جوش اس الہام یافتہ کے قدمِ مبارک سے پیدا ہو جاتا ہے اور بالخاصیت زمین کے پانیوں کو اُوپر اُٹھاتا ہے۔جب تم دیکھو کہ مذاہب کی جستجو میں ہر ایک شخص کھڑا ہو گیا ہے اور زمینی پانی کو کچھ اُبال آیا ہے تو اُٹھو اور خبردار ہو جاؤ اور یقیناً سمجھو کہ آسمان سے زور کا مینہ برسا ہے اور کسی دِل پر الہامی بارش ہو گئی ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۱۵، ۱۱۶)

قسم ہے آسمان کی جس سے مینہ نازل ہوتا ہے اور قسم ہے زمین کی جو پھوٹ کر اناج نکالتی ہے۔یہ کلام یعنی قرآن شریف حق اور باطل میں فیصلہ کرنے والا ہے اور بے فائدہ نہیں۔یعنی اس کلام کی ایسی ہی ضرورت ثابت ہے جیسا کہ جسمانی نظام میں مینہ کی ضرورت ثابت ہے۔ اگر مینہ نہ ہو تو آخر کار کنوئیں بھی خشک ہو جاتے ہیں اور دریا بھی۔اور پھر نہ پینے کے لئے پانی رہتا ہے اور نہ کھانے کے لئے اناج۔کیونکہ ہر ایک برکت زمین کی آسمان سے ہی نازل ہوتی ہے۔اِس دلیل سے خدا نے ثابت کیا ہے کہ جیسا کہ پانی اور اناج کی ہمیشہ ضرورت ہے ایسا ہی خدا کی کلام اور اُس کے تسلی دینے والے معجزات کی ہمیشہ ضرورت ہے کیونکہ محض گذشتہ قصوں سے تسلی نہیں ہو سکتی۔

پس آریہ صاحبوں کو سمجھنا چاہیئے کہ محض وید کے ورق چاٹنے سے نہ رُوحانی پیاس دُور ہو سکتی ہے اور نہ

وہ تسلی مل سکتی ہے جو خدا کے تازہ بتازہ معجزات سے ملتی ہے اور آیت ممدوحہ بالا میں جو خدا نے قسم کھائی پس جاننا چاہیئے کہ خدا کی قسمیں انسان کی قسموں کی طرح نہیں ہیں بلکہ عادت اللہ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ وہ قرآن شریف میں قسم کھا کر جسمانی نظام کو رُوحانی نظام کی تصدیق میں پیش کرتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قسم شہادت کی قائم مقام وضع کی گئی ہے۔ پس اِس جگہ خدا کی کلام میں جسمانی امور کی قسم کھانے سے اشارہ یہ ہے کہ جو قسم کے بعد رُوحانی امور بیان کئے گئے ہیں جسمانی امور ان کی سچائی کے گواہ ہیں۔ پس جس جگہ تم قرآن شریف میں اِس طور کی قسمیں پاؤ گے ہر ایک جگہ اُن قسموں سے یہی مراد ہے کہ خدا تعالیٰ اوّل جسمانی امور پیش کر کے ان امور کو رُوحانی امور کے لئے جو بعد میں لکھتا ہے بطور گواہ کے پیش کرتا ہے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۹۴)

قرآن شریف کی قسموں پر جو اعتراض کیا جاتا ہے وہ بھی اسی قسم کا ہے۔ بڑے غور اور فکر کے بعد یہ راز ہم پر کُھلا ہے کہ قرآن شریف کے جس جس مقام پر کوتاہ اندیشوں نے اعتراض کئے ہیں اسی مقام پر اعلیٰ درجہ کی صداقتوں اور معارف کا ایک ذخیرہ موجود ہے جس پر اِس وجہ سے اطلاع نہیں ملی کہ وہ حق کے ساتھ عداوت رکھتے ہیں اور قرآن شریف کو محض اِس لئے پڑھتے ہیں کہ اس پر نکتہ چینی اور اعتراض کریں۔ یاد رکھو قرآن شریف کے دو حصے ہیں بلکہ تین۔ ایک تو وہ حصہ ہے جس کو ادنیٰ درجہ کے لوگ بھی جو اُمّی ہوتے ہیں سمجھ سکتے ہیں اور دوسرا وہ حصہ ہے جو اوسط درجہ کے لوگوں پر کُھلتا ہے۔ اگرچہ وہ پورے طور پر اُمّی نہیں ہوتے لیکن بہت بڑی استعداد علوم کی بھی نہیں رکھتے۔ اور تیسرا حصہ ان لوگوں کے لئے ہے جو اعلیٰ درجہ کے علوم سے بہرہ ور ہیں اور فلاسفر کہلاتے ہیں۔ یہ قرآن شریف ہی کا خاصہ ہے کہ وہ تینوں قسم کے آدمیوں کو یکساں تعلیم دیتا ہے۔ ایک ہی بات ہے جو اُمّی اور اوسط درجہ کے آدمی اور اعلیٰ درجہ کے فلاسفر کو تعلیم دی جاتی ہے قرآن شریف کا ہی فخر ہے کہ ہر طبقہ اپنی استعداد اور درجہ کے موافق فیض پاتا ہے۔ الغرض یہ جو قرآن شریف کی قسم پر اعتراض کیا جاتا ہے اِس کا جواب یہ ہے کہ قسم ایک ایسی شَے ہے جس کو ایک شاہد کے مفقود ہونے کے بجائے دوسرا شاہد قرار دیا جاتا ہے۔ قانوناً، شرعاً، عُرفاً یہ عام مسلم بات ہے کہ جب گواہ مفقود ہو اور موجود نہ ہو تو صرف قسم پر اکتفا کی جاتی ہے اور وہ قسم گواہی کے قائمقام ہوتی ہے۔ اسی طرح پر اللہ تعالیٰ کی سُنّت قرآن کریم میں اِس طرح پر جاری ہے کہ نظریات کو ثابت کرنے کے واسطے بدیہیات کو بطور شاہد پیش کرتا ہے تا کہ نظری امور ثابت ہوں۔ تو یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن شریف میں یہ طرز اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے کہ نظری امور کے اثبات کے لئے امور بدیہی کو بطور شواہد پیش کرتا ہے اور یہ پیش کرنا قسموں کے رنگ میں ہے۔ اِس بات کو بھی ہرگز بھولنا نہ چاہیئے کہ اللہ جلّشانہٗ کی قسموں کو انسانی قسموں پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق

ہے اللہ تعالیٰ نے جو انسان کو غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع کیا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ انسان جب قسم کھاتا ہے تو اس کا مدّعا یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی ہے اس کو ایک ایسے گواہ رویت کا مقام ٹھہراوے کہ جو اپنے ذاتی علم سے اس کے بیان کی تصدیق یا تکذیب کر سکتا ہے کیونکہ اگر سوچ کر دیکھا جاوے تو قسم کا اصل مفہوم جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا تھا شہادت ہی ہوتا ہے۔ جب انسان معمولی شاہدوں کو پیش کرنے سے عاجز آجاتا ہے تو پھر قسم کا محتاج ہوتا ہے تا اس سے وہ فائدہ اُٹھاوے جو ایک شاہد رویت کی شہادت سے اُٹھانا چاہتا ہے لیکن ایسا تجویز کرنا یا اعتقاد رکھنا کہ بجز خدا تعالیٰ کے کوئی اور بھی حاضر ناظر ہے اور تصدیق یا تکذیب یا سزا دہی یا کسی اور امر پر قادر ہے صریح کلمۂ کفر ہے اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام کتابوں میں انسان کو یہی ہدایت فرمائی ہے کہ غیر اللہ کی قسم نہ کھاوے۔

اب اِس بیان سے صاف معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا قسم کھانا کوئی اَور رنگ اور شان رکھتا ہے اور غرض اس سے یہی ہے کہ تا صحیفۂ قدرت کے بدیہیات کو شریعت کے اسرارِ دقیقہ کے حلّ و انکشاف کے لئے بطور شاہد پیش کرے اور چونکہ اس مدّعا کو قسم سے ایک مناسبت تھی اور وہ یہ کہ جیسا ایک قسم کھانے والا جب مثلاً خدا تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے تو اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے اِس واقعہ پر گواہ ہے۔ اسی طرح اور ٹھیک اسی رنگ میں اللہ تعالیٰ کے بعض ظاہر در ظاہر افعال نہاں در نہاں اسرار اور افعال پر بطور گواہ ہیں اِس لئے اس نے قسم کے رنگ میں اپنے افعالِ بدیہیہ کو اپنے افعالِ نظریہ کے ثبوت میں جا بجا قرآن شریف میں پیش کیا اور یہ کہنا سراسر نادانی اور جہالت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ کی قسم کھائی کیونکہ اللہ تعالیٰ درحقیقت اپنے افعال کی قسم کھاتا ہے نہ کسی غیر کی۔ اور اس کے افعال اس کے غیر نہیں ہیں مثلاً اس کا آسمان یا ستارہ کی قسم کھانا اِس مقصد سے نہیں ہے کہ وہ کسی غیر کی قسم ہے بلکہ اس منشاء سے ہے کہ جو کچھ اس کے ہاتھوں کی صنعت اور حکمت آسمان اور ستاروں میں موجود ہے اس کی شہادت بعض اپنے افعالِ مخفیہ کے سمجھانے کے لئے پیش کرے۔ غرض خدا تعالیٰ کی قسمیں اپنے اندر لامحدود اسرارِ معرفت کے رکھتی ہیں جن کو اہلِ بصیرت ہی دیکھ سکتے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ قسم کے لباس میں اپنے قانونِ قدرت کے بدیہیات کی شہادت اپنی شریعت کے بعض دقائق حل کرنے کے لئے پیش کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی فعلی کتاب (قانونِ قدرت) اس کی قولی کتاب (قرآن شریف) پر شاہد ہو جاوے اور اس کے قول اور فعل میں باہم مطابقت ہو کر طالبِ صادق کے لئے مزید معرفت اور سکینت اور یقین کا موجب ہو اور یہ طریق قرآن شریف میں عام ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ بر ہمو ؤں اور الہام کے منکروں پر یُوں اتمامِ حجّت کرتا ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ۔ قسم ہے بادلوں کی جن سے مینہ برستا ہے۔ رَجْعٌ بارش کو بھی کہتے ہیں۔

بارش کا بھی ایک مستقل نظام ہے۔ جیسے نظامِ شمسی ہے۔ رات اور دن کا، اور کسوف خسوف کا بجائے خود ایک ایک نظام ہے۔ مرض کا بھی ایک نظام ہوتا ہے طبیب اس نظام کے موافق کہہ سکتا ہے کہ فلاں دِن بُحران ہوگا۔ غرض یہ نظام ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ قدرت اپنے اندر ایک ترتیب اور کامل نظام رکھتا ہے اور کوئی فِعل اس کا ایسا نہیں ہے جو نظام اور ترتیب سے باہر ہو۔

اللہ تعالیٰ جیسے یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس سے ڈریں ویسے ہی یہ بھی چاہتا ہے کہ لوگوں میں علوم کی روشنی پیدا ہووے اور اس سے وہ معرفت کی منزلوں کو طے کر جاویں کیونکہ علومِ حقّہ سے واقفیت جہاں ایک طرف سچی خشیت پیدا کرتی ہے وہاں دوسری طرف ان علوم سے خدا پرستی پیدا ہوتی ہے۔ بعض بدقسمت ایسے بھی ہیں جو علوم میں مُنہمک ہو کر قضاء وقدر سے دُور جا پڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وجود پر ہی شکوک پیدا کر بیٹھتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو قضاء وقدر کے قائل ہو کر علوم ہی سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ مگر قرآن شریف نے دونوں تعلیمیں دی ہیں اور کامل طور پر دی ہیں۔ قرآن شریف علومِ حقّہ سے اِس لئے واقف کرنا چاہتا ہے اور اس لئے ادھر انسان کو متوجہ کرتا ہے کہ اس سے خشیتِ الٰہی پیدا ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی معرفت میں جُوں جُوں ترقی ہوتی ہے اسی قدر خدا تعالیٰ کی عظمت اور اُس سے محبت پیدا ہوتی جاتی ہے اور انسان کو قضاء وقدر کے نیچے رہنے کی اِس لئے تعلیم دیتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکّل اور بھروسہ کی صفت پیدا ہو اور وہ رضَا برضا رہنے کی حقیقت سے آشنا ہو کر ایک سچی سکینت اور اطمینان جو نجات کا اصل مقصد اور منشاء ہے حاصل کرے۔

ابھی جو مثال مَیں نے قرآن شریف سے قسم کے متعلق دی ہے کہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ یعنی قسم ہے آسمان کی جس میں اللہ تعالیٰ نے رَجع کو رکھا ہے۔ سماء کا لفظ فضا اور جوّ اور بارش اور بلندی کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ رَجع بار بار وقت پر آنے والی چیز کو کہتے ہیں۔ بارش برسات میں بار بار آتی ہے اِس لئے اِس کا نام بھی رَجع ہے۔ اِسی طرح پر آسمانی بارش بھی اپنے وقتوں پر آتی ہے۔ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ اور قسم ہے زمین کی کہ وہ اُن وقتوں میں پھُوٹ نکلتی ہے اور سبزہ نکالتی ہے۔

بارش کی جڑھ زمین ہے۔ زمین کا پانی جو بخارات بن کر اُوپر چڑھ جاتا ہے وہ کُرۂ زمہریر میں پہنچ کر بارش بن کر واپس آتا ہے اور اس صورت میں چونکہ وہ آسمان سے آتا ہے اِس لئے آسمانی کہلاتا ہے۔ پھر بارش کی ضرورت کے لئے ایک اَور وقت خاص ہے جب مزارعین کو ضرورت ہوتی ہے۔ اگر بیائی کے بعد پڑے تو کچھ بھی نہ رہے اور پھر بعض اَوقات نشو ونما کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ غرض بارش اور مینہ کی ضرورت اور اُس کے مفاد اور اس کے آسمان سے آنے کا نظارہ بالکل بدیہی ہے اور ایک اَدنیٰ درجہ کی عقل رکھنے والا

گنوار دہقان بھی جانتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر آسمانی بارش نہ ہو تو زمینی پانی بھی خشک ہونے لگتے ہیں چنانچہ امساکِ باراں کے دنوں میں بہت سے کنوئیں خشک ہو جاتے ہیں اور اکثروں میں پانی بہت ہی کم رہ جاتا ہے لیکن جب آسمان سے بارش آتی ہے تو زمینی پانیوں میں بھی ایک جوش اور تموّج پیدا ہونے لگتا ہے۔ میرا مطلب اِس مقام پر اِس مثال کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان قسموں کو ایک اَور امر کے لئے بطور شاہد قرار دیا ہے کیونکہ ان نظاروں سے تو ایک معمولی زمیندار بھی واقف ہے اور وہ امر جو ان کے ذریعہ ثابت کیا ہے وہ یہ ہے اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ۔ بیشک یہ خدا کا کلام ہے اور قولِ فصل ہے اور وہ عین وقت پر ضرورتِ حقّہ کے ساتھ اور حق وحکمت کے ساتھ آیا ہے بیہودہ طور پر نہیں آیا۔ اَب یہ دیکھ لو کہ قرآن شریف جس وقت نازل ہؤا ہے کیا اس وقت نظامِ رُوحانی نہیں چاہتا تھا کہ خدا کا کلام نازل ہو اور کوئی مردِ آسمانی آوے جو اس گمشدہ متاع کو واپس دلائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ بعثت کی تاریخ پڑھو تو معلوم ہو جاوے گا کہ دُنیا کی کیا حالت تھی خدا تعالیٰ کی پرستش دُنیا سے اُٹھ گئی تھی اور توحید کا نقش پا مِٹ چکا تھا باطل پرستی اور معبودانِ باطلہ کی پرستش نے اللہ جلّ شانہٗ کی جگہ لے رکھی تھی۔ دُنیا پر جہالت اور ظلمت کا ایک خوفناک پردہ چھایا ہؤا تھا۔ دُنیا کے تختہ پر کوئی ملک کوئی قطعہ کوئی سرزمین ایسی نہ رہ گئی تھی جہاں خدائے واحد ہاں حیّ وقیّوم خدا کی پرستش ہوتی ہو۔ عیسائیوں کی مُردہ پرست قوم تثلیث کے چکّر میں پھنسی ہوئی تھی اور ویدوں میں توحید کا بے جا دعویٰ کرنے والے ہندوستان کے رہنے والے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کے پُوجاری تھے۔ غرض خود خدا تعالیٰ نے جو نقشہ اس وقت کی حالت کا اِن الفاظ میں کھینچا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ[1] یہ بالکل سچّا ہے اور اِس سے بہتر انسانی زبان اور قلم اس حالت کو بیان نہیں کرسکتی۔ اَب دیکھو کہ جیسے خدا تعالیٰ کا قانون عام ہے کہ عین امساکِ بارش کے وقت آخر اس کا فضل ہوتا ہے اور بارانِ رحمت برس کر شادابی بخشتا ہے اسی طرح پر ایسے وقت میں ضرور تھا کہ خدا تعالیٰ کا کلام آسمان سے نازل ہوتا۔ گویا جسمانی بارش کے نظام کو دکھا کر رُوحانی بارش کے نظام کی طرف رہبری کی ہے۔ اب اِس سے کون انکار کرے گا کہ بارش ہمارے مقاصد کے موافق ہوتی ہے۔ اِس سے مطلب یہ ہے کہ جیسے وہ نظام رکھا ہے اسی طرح دوسری بارشوں کے لئے وقت رکھے ہیں۔ اَب دیکھ لو کہ کیا یہ بارشِ رُوحانی کا ذکر نہ تھا۔ کس قدر جھگڑے تم لوگوں میں بپا تھے۔ اعمال گندے اور ایمان بھی گندے تھے اور دُنیا ہلاکت کے گڑھے میں گرنے والی تھی پھر وہ کیونکر اپنے فضل کا مینہ نہ برساتا جس نے جسمِ فانی کی حفاظت کے لئے ایک

---

[1] سورۃ الروم : ۴۲

خاص نظام رکھا ہے پھر رُوحانی نظام کو کیونکر چھوڑتا اِس لئے بارش کے نظام کو بطور شاہد پیش کرکے قسم کے رنگ میں استعمال کیا کیونکہ امرِ نبوّت ایک رُوحانی اور نظری امر تھا اور کفارِ عرب اس نظام کو نہ سمجھ سکتے تھے اِس لئے وہ پہلا نظام پیش کرکے ان کو سمجھا دیا۔ غرض یہ ایک سِرّ ہے جس کو جاہلوں نے سمجھا نہیں اور اپنی نادانی اور عداوتِ حق کی بنا پر اعتراض کر دیا ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۴ و الحکم جلد ۵ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۰ جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۱ تا ۳)

آریہ اور عیسائی اعتراض کر دیتے ہیں کہ قرآن شریف میں قسمیں کیوں کھائی ہیں؟ اور پھر اپنی طرف سے حاشیہ چڑھا کر اس کو عجیب عجیب اعتراضوں کے پیرایہ میں پیش کرتے ہیں حالانکہ اگر ذرا بھی نیک نیتی اور فہم سے کام لیا جاوے تو ایسا اعتراض بیہودہ اور بے سُود معلوم دیتا ہے کیونکہ قسموں کے متعلق یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ قسم کھانے کا اصل مفہوم اور مقصد کیا ہوتا ہے؟ جب اس کی فلاسفی پر غور کر لیا جاوے تو پھر یہ خود بخود سوال حل ہو جاتا ہے اور زیادہ رنج اُٹھانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ قسم کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ قسم بطور قائم مقام گواہ کے ہوتی ہے اور یہ مسلّم بات ہے کہ عدالت جب گواہ پر فیصلہ کرتی ہے تو کیا اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ جھوٹ پر فیصلہ کرتی ہے یا قسم کھانے والے کی قسم کو ایک شاہدِ صادق تصوّر کرتی ہے یہ روزمرّہ کی بات ہے۔

جہالت یا تعصّب سے اعتراض کرنا اَور بات ہے لیکن حقیقت کو مدِّ نظر رکھ کر کوئی بات کہنا اَور۔

اب جبکہ یہ عام طریق ہے کہ قسم بطور گواہ کے ہوتی ہے پھر یہ کیسی سیدھی بات ہے کہ اسی اصول پر قرآن شریف کی قسموں کو دیکھ لیا جاوے کہ وہاں اس سے کیا مطلب ہے؟

اللہ تعالیٰ نے جہاں کوئی قسم کھائی ہے تو اس سے یہ مراد ہے کہ نظری امور کے اثبات کے لئے بدیہی کو گواہ ٹھہراتا ہے جیسے فرمایا:

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ۔ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ۔ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ

اَب یہ بھی ایک قسم کا محل ہے۔ نادان قرآن شریف کے حقائق سے ناواقف اور نابلد اپنی جہالت سے یہ اعتراض کر دیتا ہے کہ دیکھو زمین کی یا آسمان کی قسم کھائی لیکن اس کو نہیں معلوم کہ اس قسم کے نیچے کیسے کیسے معارف موجود ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وحیٔ الٰہی کے دلائل اور قرآن شریف کی حقانیّت کی شہادت پیش کرنی چاہتا ہے اور اس کو اس طرز پر پیش کیا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

اَب اِس قسم کی قسم پر اعتراض کرنا بجز ناپاک فطرت یا بلید الطبع انسان کے دوسرے کا کام نہیں کیونکہ اس

ہیں تو عظیم الشان صداقت موجود ہے۔ صحیفۂ فطرت کی عام شہادت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کلامِ الٰہی اور نزولِ وحی کی حقیقت بتانا چاہتا ہے۔ سَمَاء کے معنے بادل کے بھی ہیں جس سے مینہ برستا ہے۔ آسمان اور زمین میں ایسے تعلقات ہیں جیسے نَر و مادہ میں ہوتے ہیں۔ زمین میں بھی کنوئیں ہوتے ہیں لیکن زمین پھر بھی آسمانی پانی کی محتاج رہتی ہے۔ جب تک آسمان سے بارش نہ ہو زمین مُردہ سمجھی جاتی ہے اور اس کی زندگی اس پانی پر منحصر ہے جو آسمان سے آتا ہے۔ اِسی واسطے فرمایا ہے:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا[1]

اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب آسمان سے پانی برسنے میں دیر ہو اور امساکِ باراں ہو تو کنوؤں کا پانی بھی خشک ہونے لگتا ہے اور ان ایام میں دیکھا گیا ہے کہ پانی اُتر جاتا ہے لیکن جب برسات کے دِن ہوں اور مینہ برسنے شروع ہوں تو کنوؤں کا پانی بھی جوش مار کر چڑھتا ہے کیونکہ اُوپر کے پانی میں قوتِ جاذبہ ہوتی ہے۔ اب براہموں سوچیں کہ اگر آسمانی پانی نازل ہونا چھوڑ دے تو سب کنوئیں خشک ہو جائیں۔ اسی طرح پر ہم یہ مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نورِ قلب ہر انسان کو دیا ہے اور اس کے دماغ میں عقل رکھی ہے جس سے وہ بُرے بھلے میں تمیز کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ لیکن اگر نبوّت کا نور آسمان سے نازل نہ ہو اور یہ سلسلہ بند ہو جاوے تو دماغی عقلوں کا سلسلہ جاتا رہے اور نورِ قلب پر تاریکی پیدا ہو جاوے اور وہ بالکل کام دینے کے قابل نہ رہے کیونکہ یہ سلسلہ اسی نورِ نبوّت سے روشنی پاتا ہے۔ جیسے بارش ہونے پر زمین کی روئیدگیاں نکلنی شروع ہو جاتی ہیں اور ہر تخم پیدا ہونے لگتا ہے اسی طرح پر نورِ نبوّت کے نزول پر دماغی اور ذہنی عقلوں میں ایک صفائی اور نورِ فراست میں ایک روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ علیٰ قدرِ مراتب ہوتی ہے اور استعداد کے موافق ہر شخص فائدہ اُٹھاتا ہے خواہ وہ اِس امر کو محسوس کرے یا نہ کرے لیکن یہ سب کچھ ہوتا اس نُورِ نبوّت کے طفیل ہے۔

غرض اِس قسم میں نزولِ وحی کی ضرورت کو ایک عام مشاہدہ کی رُو سے ثابت کیا ہے کہ جیسے آسمانی پانی کے نہ برسنے کی وجہ سے زمین مَر جاتی اور کنوؤں کا پانی خشک ہونے لگتا ہے یہی قانون نزولِ وحی کے متعلق ہے۔

رَجْع پانی کو کہتے ہیں۔ حالانکہ پانی زمین پر بھی ہوتا ہے لیکن آسمان کو ذَاتِ الرَّجْعِ کہا ہے۔ اِس میں یہ فلسفہ بتایا ہے کہ اصلی آسمانی پانی ہی ہے۔ چنانچہ کہا ہے ؎

باراں کہ دَر لطافتِ طبعش خلاف نیست ٭ دَر باغ لالہ روید و در شورہ بُوم خس

---

[1] سُورۃ الحدید : ۱۸

جو کیفیت بارش کے وقت ہوتی ہے وہی نزولِ وحی کے متعلق ہوتی ہے۔ دو قسم کی طبیعتیں موجود ہوتی ہیں ایک تو مستعد ہوتی ہے اور دوسری بلید مستعد طبیعت والے فوراً سمجھ لیتے ہیں اور صادق کا ساتھ دے دیتے ہیں لیکن بلید الطبع نہیں سمجھ سکتے اور وہ مخالفت پر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ دیکھو مکہ معظمہ میں جب وحی کا نزول ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا تعالیٰ کا کلام اُترنے لگا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ابوجہل ایک ہی سرزمین کے دو شخص تھے۔ ابوبکرؓ نے تو کوئی نشان بھی نہ مانگا اور مجرد دعویٰ سنتے ہی اٰمنّا کہہ کر ساتھ ہو لیا۔ مگر ابوجہل نے نشان پر نشان دیکھے مگر تکذیب سے باز نہ آیا اور آخر خدا تعالیٰ کے قہر کے نیچے آکر ذلت کے ساتھ ہلاک ہوا۔

غرض خدا تعالیٰ کی وحی ہر قسم کی طبیعتوں کو باہر نکال دیتی ہے۔ طیّب اور خبیث میں امتیاز کر کے دکھا دیتی ہے۔ وہ بہار کا موسم ہوتا ہے اس وقت ممکن نہیں کہ کوئی تخم شگفتگی کے لئے نہ نکلے لیکن جو کچھ ہوگا وہی برآمد ہوگا۔ نیک اور سعید الفطرت اپنی جگہ پر نمودار ہوتے ہیں اور خبیث الگ۔ اور اس سے پہلے وہ ملے جُلے ہوئے ہوتے ہیں جیسے گندم اور بھگاٹ کے دانے ملے ہوئے تو رہتے ہیں لیکن جب زمین سے نکلتے ہیں تو دونو الگ نظر آتے ہیں۔ مالک گندم کی حفاظت کرتا اور بھگاٹ کو نکال کر باہر پھینک دیتا ہے۔ پس نزولِ وحی کے ثبوت کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ مشاہدہ پیش کیا ہے جس کو نادان اپنی نادانی اور جہالت سے اعتراض کے رنگ میں پیش کرتا ہے حالانکہ اس میں ایک عظیم الشان فلسفہ رکھا ہوا ہے اسی لئے وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ - وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ کہہ کر فرمایا اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ جو کلامِ الٰہی کے لئے بولا گیا ہے۔ یہ ایک نظری امر تھا اس کے ثبوت کے لئے بدیہی امر کو پیش کیا ہے جیسے امساکِ باراں کے وقت ضرورت ہوتی ہے مینہ کی۔ اسی طرح اس وقت لوگ رُوحانی پانی کو چاہتے ہیں۔ زمین بالکل مَر چکی ہے۔ یہ زمانہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ کا مصداق ہو گیا ہے جنگل اور سمندر بگڑ چکے ہیں۔ جنگل سے مراد مشرک لوگ اور بحر سے مراد اہلِ کتاب ہیں۔ جاہل وعالم بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ غرض انسانوں کے ہر طبقہ میں فساد واقع ہو گیا ہے۔ جس پہلو اور جس رنگ میں دیکھو دُنیا کی حالت بدل گئی ہے رُوحانیت باقی نہیں رہی اور نہ اس کی تاثیریں نظر آتی ہیں۔ اخلاقی اور عملی کمزوریوں میں ہر چھوٹا بڑا مبتلا ہے۔ خدا پرستی اور خداشناسی کا نام و نشان مٹا ہوا نظر آتا ہے اس لئے اس وقت ضرورت ہے کہ آسمانی پانی اور نورِ نبوت کا نزول ہو اور مستعد دلوں کو روشنی بخشے۔ خدا تعالیٰ کا شکر کرو۔ اس نے اپنے فضل سے اس وقت اس نور کو نازل کیا ہے مگر تھوڑے ہیں جو اس نور سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱،۲)

بعض لوگ یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن شریف گردشِ آسمان کا قائل ہے جیسے فرمایا وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ حالانکہ آجکل کے بچے بھی جانتے ہیں کہ زمین گردش کرتی ہے۔ غرض اسی قسم کے بیسیوں اعتراض کر دیتے

ہیں اور تا وقتیکہ ان علوم میں کچھ مہارت اور واقفیت نہ ہو جواب دینے میں مشکل پیدا ہوتی ہے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ زمین یا آسمان کی گردش ظنی امور ہیں ان کو یقینیات میں داخل نہیں کر سکتے۔ ایک زمانہ تک گردشِ آسمان کے قائل رہے پھر زمین کی گردش کے قائل ہو گئے۔ سب سے زیادہ ان لوگوں کی طبابت پر مشق ہے لیکن اس میں بھی دیکھ لو کہ آئے دن تغیّر و تبدّل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً پہلے ذیابیطس کے لئے یہ کہتے تھے کہ اس کے مریض کو میٹھی چیز نہیں کھانی چاہیئے مگر اَب جو تحقیقات ہوئی ہے تو کہتے ہیں کچھ ہرج نہیں اگر سنگترہ بھی مریض کھالے یا چاء پی لے۔

غرض یہ سب علوم ظنّی ہیں۔ اِس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ کے معنے بتا دیئے جاویں کیونکہ اس کا ذکر آ گیا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ سَمَاء کے معنے آسمان ہی کے نہیں ہیں بلکہ سَمَاء مینہ کو بھی کہتے ہیں۔ گویا اِس آیت میں اس مینہ کی جو زمین کی طرف رجوع کرتا ہے قسم کھائی ہے اور پھر وہ زمین جس سے شگوفے نکلتے ہیں۔ اکیلی زمین اور اکیلا آسمان کچھ نہیں کر سکتا۔ اِس آیت کو اللہ تعالیٰ ضرورتِ وحی پر بطور مثال پیش کرتا ہے کہ ہر چند زمین میں جوجوہر قابل ہیں اور اس کی فطرت میں نشوونما کا مادہ ہو لیکن وہ نشوونما نہیں پا سکتا اور فطرت بار آور نہیں ہو سکتی جب تک آسمان سے مینہ نہ برسے۔ ؎

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست ❊ در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

اِس غرض کے لئے کہ عمدہ عمدہ پھل اور پھول پیدا ہوں عمدہ زمین اور اس کے لئے بارش کی ضرورت ہے جبتک یہ بات نہ ہو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب اِس نظارۂ فطرت کو اللہ تعالیٰ ضرورتِ وحی کے لئے پیش کرتا ہے اور توجہ دلاتا ہے کہ دیکھو جب مینہ نہ برسے تو قحط کا اندیشہ ہوتا ہے یہاں تک کہ زمینی پانی جو کنوؤں اور چشموں میں ہوتا ہے وہ بھی کم ہونے لگتا ہے۔ پھر جبکہ دنیوی اور جسمانی ضرورتوں کے لئے آسمانی پانی کی ضرورت ہے تو کیا روحانی اور ابدی ضرورتوں کے لئے روحانی بارش کی ضرورت نہیں؟ اور وہ وحیٔ الٰہی ہے۔ جیسے مینہ کے نہ برسنے سے قحط پڑتا اور کنوئیں اور چشمے خشک ہو جاتے ہیں اسی طرح پر اگر انبیاء و رُسل دُنیا میں نہ آئیں تو فلسفیوں کا وجود بھی نہ ہو کیونکہ قوای عقلیہ کا نشوونما وحیٔ الٰہی ہی سے ہوتا ہے اور زمینی عقلیں اس سے پرورش پاتی ہیں۔

پس اِس آیت وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ میں وحیٔ الٰہی کی ضرورت پر عقلی اور فطرتی دلائل پیش کئے ہیں۔ جو شخص اِس امر کو سمجھ لے گا وہ بول اُٹھے گا کہ بیشک وحیٔ الٰہی کی ضرورت ہے اور یہ وہ طریق ہے جو آدم سے چلا آتا ہے اور ہر شخص نے اپنی استعداد اور فطرت کے موافق اس سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ ہاں جو جاہل اور ناقص تھے یا جن میں تکبّر اور خود سَری تھی وہ محروم رہ گئے اور انہوں نے کچھ بھی حصہ نہ لیا۔ یہی اصل اور سچی بات ہے اور تم یقیناً یاد رکھو کہ آسمانی بارش کی سخت ضرورت ہے اِس لئے کہ

عملی قوت بجز اس بارش کے پَیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴، ۵)

ہم نظامِ جسمانی میں دیکھتے ہیں کہ جسمانی کاشت کار باوجود ہر قسم کی باقاعدہ محنت و مشقت کے بھی پھر آسمانی پانی کا محتاج ہے۔ اور اگر اس کی محنتوں اور کوششوں کے ساتھ آسمانی پانی اس کی فصل پر نہ پڑے تو فصل تباہ اور محنت برباد ہو جاتی ہے۔ پس یہی حال رُوحانی رنگ میں ہے۔ انسان کو خشک ایمان کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا جب تک کہ رُوحانی بارش نازل ہو کر بڑے زور کے نشانات سے اس کے اندرونی گند دھو کر اس کو صاف نہ کرے۔ چنانچہ قرآن شریف اسی کی طرف اشارہ کرکے فرماتا ہے وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ یعنی قسم ہے آسمان کی جس سے بارش نازل ہوتی ہے اور قسم ہے زمین کی جس سے شگوفہ نکلتا ہے۔ بعض لوگ اپنی نادانی کی وجہ سے کہتے ہیں کہ خدا کو قسم کی کیا ضرورت تھی مگر ایسے لوگ آخرکار اپنی جلد بازی کی وجہ سے ندامت اُٹھاتے ہیں۔ قسم کا مفہوم اصل میں قائم مقام ہوتا ہے شہادت کے۔ ہم دنیوی گورنمنٹ میں بھی دیکھتے ہیں کہ بعض اَوقات مقدمات کے فیصلوں کا حصر ہی قسم پر رکھا جاتا ہے پس اسی طرح سے خدا تعالیٰ بھی بارشِ آسمانی کی قسم کھا کر نظامِ جسمانی کی طرح نظامِ روحانی میں اسی بات کو بطور ایک شہادت کے پیش کرتا ہے کہ جس طرح سے زمین کی سرسبزی اور کھیتوں کا ہرا بھرا ہونا آسمانی بارش پر موقوف ہے اور اگر آسمانی بارش نہ ہو تو زمین پر کوئی سبزی نہیں رہ سکتی اور زمین مُردہ ہو جاتی ہے بلکہ کنوؤں کا پانی بھی خشک ہو جاتا ہے اور دُنیا زیر و زبر ہو کر ہلاکت کا باعث ہو جاتی ہے اور لوگ بھوکے پیاسے مَرتے ہیں۔ قحط کی وجہ سے انسان و حیوان اور پھر چرند و پرند اور درند وغیرہ پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے بعینہٖ اسی طرح سے ایک رُوحانی سِلسلہ بھی ہے۔

یاد رکھو کہ خشک ایمان بجز آسمانی بارش کے جو مکالمہ مخاطبہ کے رنگ میں نازل ہوتی ہے ہرگز ہرگز باعث نجات یا حقیقی راحت کا نہیں ہوسکتا۔ جو لوگ روحانی بارش کے بغیر اور کسی مامور من اللہ کے بغیر نجات پاسکتے ہیں اور ان کو کسی مزکّی اور مامور من اللہ کی ضرورت نہیں سب کچھ ان کے پاس موجود ہے اُن کو چاہیئے کہ پانی بھی اپنے گھروں میں ہی پَیدا کر لیا کریں اُن کو آسمانی بارش کی کیا اِحتیاج۔ آنکھوں کے سامنے موجود ہے کہ جسمانی چیزوں کا مدار کن چیزوں پر ہے۔ پس اِس سے سمجھ لو کہ بعینہٖ اسی کے مطابق روحانی زندگی کے واسطے بھی لازمی اور لابد اور ضروری ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ یعنی عِلمِ معاد میں جس قدر تنازعات اُٹھیں سب کا فیصلہ یہ کتاب کرتی ہے بے سُود اور بیکار نہیں ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۰۴ حاشیہ)

یہ کلام محکم ہے اور قولِ فصل ہے۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۲۰)

قرآن قولِ فصل ہے جو ہر ایک امر میں سچّا فیصلہ دیتا ہے۔

(جنگِ مقدّس صفحہ ۴، ۵)

یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن شریف نے پہلی کتابوں اور نبیوں پر احسان کیا ہے جو ان کی تعلیموں کو جو قصّہ کے رنگ میں تھیں علمی رنگ دے دیا ہے۔ مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ کوئی شخص ان قصّوں اور کہانیوں سے نجات نہیں پاسکتا جب تک وہ قرآن شریف کو نہ پڑھے کیونکہ قرآن شریف ہی کی یہ شان ہے کہ وہ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ / مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۳، ۴)

سُورۃ الاعلیٰ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۵۔ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی

فلاح وہ شخص پاوے گا جو اپنے نفس میں پوری پاکیزگی اور تقوای طہارت پیدا کرلے اور گناہ اور معاصی کے اِرتکاب کا کبھی بھی اس میں دَورہ نہ ہو اور ترکِ شرّ اور کسبِ خیر کے دونو مراتب پُورے طور سے یہ شخص طے کرے تب جا کر کہیں اسے فلاح نصیب ہوتی ہے۔ ایمان کوئی آسان سی بات نہیں جبتک انسان مَر ہی نہ جاوے تب تک کہاں ہوسکتا ہے کہ سچا ایمان حاصل ہو۔

(الحکم جلد ۱۲ ۳۲ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

۲۰،۱۹۔ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰی صُحُفِ اِبۡرٰهِیۡمَ وَمُوۡسٰی

خدا تعالیٰ جو اَصدق الصّادقین ہے اُس نے اپنی کلام میں صدق کو دوؔ قسم قرار دیا ہے ایک صدق باعتبار ظاہر الاقوال دوسرے صدق باعتبار التاویل والمآل۔ پہلی قسم صدق کی مثال یہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عیسٰی مریم کا بیٹا تھا اور ابراہیم کے دوؔ بیٹے تھے اسمٰعیل اور اسحٰق۔ کیونکہ ظاہر واقعات بغیر تاویل کے یہی ہیں۔ دوسری قسم صدق کی مثال یہ ہے کہ جیسے قرآن شریف میں کفّار یا گذشتہ مومنوں کے کلمات کچھ تصرّف کرکے بیان فرمائے گئے ہیں اور پھر کہا گیا کہ یہ اُنہی کے کلمات ہیں۔ اور یا جو قصّے توریت کے ذکر کئے گئے ہیں اور اُن میں بہت سا تصرّف ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ جس اعجازی طرز اور طریق اور فصیح فقروں اور دلچسپ

استعارات میں قرآنی عبارات ہیں اس قسم کے فصیح فقرے کافروں کے مُنہ سے ہرگز نہیں نکلے تھے اور نہ یہ ترتیب تھی بلکہ یہ ترتیب قصوں کی جو قرآن میں ہے توریت میں بھی بالالتزام ہرگز نہیں ہے حالانکہ فرمایا ہے اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی۔ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی اور اگر یہ کلمات اپنی صورت اور ترتیب اور صیغوں کے رُو سے وہی ہیں جو مثلاً کافروں کے مُنہ سے نکلے تھے تو اس سے اعجازِ قرآنی باطل ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں وہ فصاحت کفّار کی ہوئی نہ قرآن کی۔ اور اگر وہی نہیں تو بقول تمہارے کذب لازم آتا ہے کیونکہ ان لوگوں نے تو اَور اَور لفظ اَور اَور ترتیب اَور اَور صیغے اختیار کئے تھے اور جس طرح مُتَوَفِّیْكَ اور تَوَفَّیْتَنِیْ دو مختلف صیغے ہیں اسی طرح صدہا جگہ ان کے صیغے اور قرآنی صیغے باہم اختلاف رکھتے تھے۔ مثلاً توریت میں ایک قِصّۂ یوسف ہے نکال کر دیکھ لو اور پھر قرآن شریف کے سورہ یوسف سے اس کا مقابلہ کرو تو دیکھو کہ کس قدر صیغوں میں اختلاف اور بیان میں کمی بیشی ہے بلکہ بعض جگہ بظاہر معنوں میں بھی اختلاف ہے ایسا ہی قرآن نے بیان کیا ہے کہ ابراہیم کا باپ آزر تھا لیکن اکثر مفسّر لکھتے ہیں کہ اس کا باپ کوئی اَور تھا نہ آزر۔

(تحفہ غزنویہ صفحہ ۳۷، ۳۸)

..... شریعت کیا چیز ہے۔ جس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے چند امر اور نہی بیان کئے اور اپنی اُمت کیلئے ایک قانون مقرر کیا وہی صاحب الشریعت ہو گیا۔ پس اس تعریف کے رُو سے بھی ہمارے مخالف ملزم ہیں کیونکہ میری وحی میں امر بھی ہیں اور نہی بھی۔ مثلاً یہ الہام قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْکٰی لَهُمْ۔ یہ براہینِ احمدیہ میں درج ہے۔ اِس میں امر بھی ہے اور نہی بھی۔ اور اس پر تئیس برس کی مدّت بھی گذر گئی اور ایسا ہی اَب تک میری وحی میں امر بھی ہوتے ہیں اور نہی بھی۔ اور اگر کہو کہ شریعت سے وہ شریعت مراد ہے جس میں نئے احکام ہوں تو وہ باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی۔ یعنی قرآنی تعلیم توریت میں بھی موجود ہے اور اگر کہو کہ شریعت سے وہ شریعت مراد ہے جس میں باستیفاء امر اور نہی کا ذکر ہو تو یہ بھی باطل ہے کیونکہ اگر توریت یا قرآن شریف میں باستیفاء احکامِ شریعت کا ذکر ہوتا تو پھر اجتہاد کی گنجائش نہ رہتی۔ غرض یہ سب خیالات فضول اور کوتہ اندیشیاں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور قرآن ربّانی کتابوں کا خاتم ہے تاہم خدا تعالیٰ نے اپنے نفس پر یہ حرام نہیں کیا کہ تجدید کے طور پر کسی اَور مامور کے ذریعہ سے یہ احکام صادر کرے کہ جھوٹ نہ بولو۔ جھوٹی گواہی نہ دو۔ زنا نہ کرو۔ خون نہ کرو۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا بیان کرنا بیانِ شریعت ہے جو مسیح موعود کا بھی کام ہے۔

(اربعین ۴ صفحہ ۶، ۷)

○

سُورۃ الغاشیہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ

میرے دعوٰی کا فہم کلید ہے نبوّت اور قرآن شریف کی۔ جو شخص میرے دعوٰی کو سمجھ لے گا نبوّت کی حقیقت اور قرآن شریف کے فہم پر اُس کو اطلاع دی جائے گی اور جو میرے دعوٰی کو نہیں سمجھتا اُس کو قرآن شریف پر اور رسالت پر پُورا یقین نہیں ہو سکتا۔

قرآن شریف میں جو یہ آیت آئی ہے اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ یہ آیت نبوّت اور امامت کے مسئلہ کو حل کرنے کے واسطے بڑی معاون ہے۔ اُونٹ کے عربی زبان میں ہزار کے قریب نام ہیں اور پھر ان ناموں میں سے اِبِل کے لفظ کو جو لیا گیا ہے اس میں کیا سِر ہے؟ کیوں اِلَی الْجَمَلِ بھی تو ہو سکتا تھا۔

اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جَمَل ایک اُونٹ کو کہتے ہیں اور اِبِل اسم جمع ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کو چونکہ تمدّنی اور اجمالی حالت کا دکھانا مقصود تھا اور جَمَل میں جو ایک اُونٹ پر بولا جاتا ہے یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا تھا اِسی لئے اِبِل کے لفظ کو پسند فرمایا۔ اُونٹوں میں ایک دوسرے کی پیروی اور اطاعت کی قوت رکھی ہے۔ دیکھو اُونٹوں کی ایک لمبی قطار ہوتی ہے اور وہ کس طرح پر اُس اُونٹ کے پیچھے ایک خاص انداز اور رفتار سے چلتے ہیں اور وہ اُونٹ جو سب سے پہلے بطور امام اور پیش رو کے ہوتا ہے وہ ہوتا ہے جو بڑا تجربہ کار اور راستہ سے واقف ہو۔ پھر سب اُونٹ ایک دوسرے کے پیچھے برابر رفتار سے چلتے ہیں اور اور ان میں سے کسی کے دِل میں برابر چلنے کی ہَوس پیدا نہیں ہوتی جو دوسرے جانوروں میں ہے جیسے گھوڑے وغیرہ میں۔ گویا اُونٹ کی سرشت میں اتباعِ امام کا مسئلہ ایک مانا ہوا مسئلہ ہے اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کہہ کر اس مجموعی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے جبکہ اُونٹ ایک قطار میں جا رہے

ہوں۔ اِسی طرح پر ضروری ہے کہ تمدّنی اور اتحادی حالت کو قائم رکھنے کے واسطے ایک امام ہو۔

پھر یہ بھی یاد رہے کہ یہ قطار سفر کے وقت ہوتی ہے۔ پس دُنیا کے سفر کو قطع کرنے کے واسطے جب تک ایک امام نہ ہو انسان بھٹک بھٹک کر ہلاک ہو جاوے۔

پھر اُونٹ زیادہ بارکش اور زیادہ چلنے والا ہے اِس سے صبر و برداشت کا سبق ملتا ہے۔

پھر اُونٹ کا خاصہ ہے کہ وہ لمبے سفروں میں کئی کئی دنوں کا پانی جمع رکھتا ہے۔ غافل نہیں ہوتا پس مومن کو بھی ہر وقت اپنے سفر کے لئے تیار اور محتاط رہنا چاہیئے اور بہترین زادِ راہ تقوٰی ہے۔

اُنْظُرْ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھنا بچّوں کی طرح نہیں ہے بلکہ اس سے اتّباع کا سبق ملتا ہے کہ جس طرح پر اُونٹ میں تمدّنی اور اتحادی حالت کو دکھایا گیا ہے اور ان میں اتّباعِ امام کی قوت ہے اسی طرح پر انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اتّباعِ امام کو اپنا شعار بنا دے کیونکہ اُونٹ جو اس کے خادم ہیں اُن میں بھی یہ مادہ موجود ہے۔ "کَیْفَ خُلِقَتْ" میں ان فوائدِ جامع کی طرف اشارہ ہے جو اِبل کی مجموعی حالت سے پہنچتے ہیں۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۴۲ مورخہ ۲۴ر نومبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۴، ۵)

الغاشیۃ: ۲۲، ۲۳ فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۙ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۙ

تُو صرف نصیحت دہندہ ہے اِن پر داروغہ نہیں۔ (براہینِ احمدیہ صفحہ ۵۱۰ حاشیہ)

سُورۃ الفجر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۲۳۔ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالۡمَلَكُ صَفًّا صَفًّا۝

اَلْقُرْاٰنُ الْکَرِیْمُ یُبَیِّنُ اَنَّ الْمَلَائِکَۃَ یُشَابِھُوْنَ بِصِفَاتِھِمْ صِفَاتِ اللّٰہِ تَعَالٰی کَمَا قَالَ عَزَّوَجَلَّ: وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا۔ فَانْظُرْ۔ رَزَقَكَ اللّٰہُ دَقَائِقَ الْمَعْرِفَۃِ۔ اَنَّہٗ تَعَالٰی کَیْفَ اَشَارَ فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ اِلٰی اَنَّ مَجِیْئَہٗ وَمَجِیْءَ الْمَلَائِکَۃِ وَنُزُوْلَہٗ وَنُزُوْلَ الْمَلَائِکَۃِ مُتَّحِدٌ فِی الْحَقِیْقَۃِ وَالْکَیْفِیَّۃِ۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۶۴)

۲۸ تا ۳۱۔ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ۝ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرۡضِیَّةً۝

فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ۝ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ۝

قرآن شریف میں صاف طور پر لکھا گیا ہے کہ ہر ایک مومن جو فوت ہوتا ہے تو اس کی رُوح خدائے تعالیٰ

ترجمہ از مرتّب :۔ قرآن کریم یہ بیان فرماتا ہے کہ ملائکہ اپنی صفات میں اللہ تعالیٰ کی صفات سے مشابہت رکھتے ہیں جیسا کہ اللہ عزّ وجلّ نے فرمایا ہے وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا یعنی تیرا رب اس شان میں آئیگا کہ فرشتے صفیں باندھے کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں دقائق معرفت عطا کرے۔ تم غور کرو کہ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کس طرح اِس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس کا آنا اور فرشتوں کا آنا اور اس کا اُترنا اور فرشتوں کا اُترنا حقیقت اور کیفیت میں متحد ہے۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۶۴)

کی طرف اُٹھائی جاتی ہے اور بہشت میں داخل کی جاتی ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ۔ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔ اے نفس جو خدا تعالیٰ سے آرام یافتہ ہے اپنے رب کی طرف چلا آ۔ تُو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میرے بہشت میں اندر آ۔ اِس جگہ صاحبِ تفسیر معالم اِس آیت کی تفسیر کرکے اپنی کتاب کے صفحہ ۹۷۵ میں لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب بندۂ مومن وفات پانے پر ہوتا ہے تو اس کی طرف اللہ جلّ شانہٗ دو فرشتے بھیجتا ہے اور اُن کے ساتھ کچھ بہشت کا تحفہ بھی بھیجتا ہے اور وہ فرشتے آکر اُس کی رُوح کو کہتے ہیں کہ اے نفسِ مطمئنہ تُو رَوح اور ریحان اور اپنے رب کی طرف جو تجھ سے راضی ہے نکل آ۔ تب وہ رُوح مشک کی اس خوشبو کی طرح جو بہت لطیف اور خوش کرنے والی ہو جو ناک میں پہنچ کر دماغ کو معطّر کر دیتی ہو باہر نکل آتی ہے اور فرشتے آسمان کے کناروں پر کہتے ہیں کہ ایک رُوح چلی آتی ہے جو بہت پاکیزہ اور خوشبو دار ہے تب آسمان کا کوئی دروازہ ایسا نہیں ہوتا جو اس کے لئے کھولا نہ جائے اور کوئی فرشتہ آسمان کا نہیں ہوتا کہ اس کے لئے دعا نہ کرے یہاں تک کہ وہ رُوح پایۂ عرشِ الٰہی تک پہنچ جاتی ہے تب خدائے تعالیٰ کو سجدہ کرتی ہے پھر میکائل کو حکم ہوتا ہے کہ جہاں اَور رُوحیں ہیں وہیں اس کو بھی لے جا۔

اَب قرآن شریف کی اس آیت اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے بخوبی ثابت ہو گیا کہ رُوح مومن کی اُس کے فوت ہونے کے بعد بلا توقّف آسمان پر پہنچائی جاتی ہے۔

(ازالہ اَوہام صفحہ ۲۶۴، ۲۶۵)

خدائے تعالیٰ نے مسیح کو موت دے کر پھر اپنی طرف اُٹھا لیا جیسا کہ عام محاورہ ہے کہ نیک بندوں کی نسبت جب وہ مَر جاتے ہیں یہی کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف اُٹھا لیا ہے جیسا کہ آیت اِرْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ اِسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ خدا تعالیٰ تو ہر جگہ موجود اور حاضر ناظر ہے اور جسم اور جسمانی نہیں اور کوئی جہت نہیں رکھتا پھر کیونکر کہا جائے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف اُٹھایا گیا ضرور اس کا جسم آسمان میں پہنچ گیا ہوگا۔ یہ بات کس قدر صداقت سے بعید ہے؟ راستباز لوگ رُوح اور رُوحانیت کی رُو سے خدا تعالیٰ کی طرف اُٹھائے جاتے ہیں نہ یہ کہ ان کا گوشت اور پوست اور ان کی ہڈیاں خدا تعالیٰ تک پہنچ جاتی ہیں۔

(ازالہ اَوہام صفحہ ۲۸۷، ۲۸۸)

واضح ہو کہ خدا تعالیٰ کی طرف اُٹھائے جانے کے یہی معنے ہیں کہ فوت ہو جانا۔ خدائے تعالیٰ کا یہ کہنا

کہ اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ اور یہ کہنا کہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ[1] ایک ہی معنے رکھتا ہے۔

(ازالہ اَوہام صفحہ ۳۲۴)

حضرت مسیح ابنِ مریم جس کی رُوح اُٹھائی گئی بر طبق آیت کریمہ یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ۔ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ بہشت میں داخل ہو چکے اب کیونکر اس غم کدہ میں آجائیں۔ گو اس کو ہم نے مانا کہ وہ کامل درجہ دخول بہشت کا جو جسمانی اور رُوحانی دونوں طور پر ہوگا وہ حشر اجساد کے بعد ہر یک مستحق کو عطا کیا جائے گا مگر اَب بھی جس قدر بہشت کی لذّات عطا ہو چکیں اس سے مقرّب لوگ باہر نہیں کئے جاتے اور قیامت کے دن میں بحضور رَبّ العالمین اُن کا حاضر ہونا اُن کو بہشت سے نہیں نکالتا کیونکہ یہ تو نہیں ہے کہ بہشت سے باہر کوئی لکڑی یا لوہے یا چاندی کا تخت بچھایا جائے گا اور خدا تعالیٰ مجازی حکّام اور سلاطین کی طرح اس پر بیٹھے گا اور کسی قدر مسافت طے کر کے اس کی حضور میں حاضر ہونا ہوگا تا یہ اعتراض لازم آوے کہ اگر بہشتی لوگ بہشت میں داخل شدہ تجویز کئے جائیں تو طلبی کے وقت انہیں بہشت سے نکلنا پڑے گا اور اس لق و دق جنگل میں جہاں تختِ ربّ العالمین بچھایا گیا ہے حاضر ہونا پڑے گا۔ ایسا خیال تو سراسر جسمانی اور یہودیت کی سرشت سے نکلا ہؤا ہے اور حق یہی ہے کہ ہم عدالت کے دن پر ایمان تو لاتے ہیں اور تختِ رَبّ العالمین کے قائل ہیں لیکن جسمانی طور پر اس کا خاکہ نہیں کھینچتے اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ اللہ اور رسول نے فرمایا ہے وہ سب کچھ ہوگا لیکن ایسے پاک طور پر کہ جو خدا تعالیٰ کے تقدس اور تنزّہ اور اس کی تمام صفاتِ کاملہ کے منافی اور مغائر نہ ہو۔ بہشت تجلّی گاہِ حق ہے یہ کیونکر کہہ سکیں کہ اس دن خدا تعالیٰ ایک مجسّم شخص کی طرح بہشت سے باہر اپنا خیمہ یا یوں کہو کہ اپنا تخت بچھوا دے گا بلکہ حق یہ ہے کہ اس دن بھی بہشتی بہشت میں ہوں گے اور دوزخی دوزخ میں لیکن رحم الٰہی کی تجلّیٔ عظمیٰ راست بازوں اور ایمان داروں پر ایک جدید طور سے لذّاتِ کاملہ کی بارش کرے گی اور تمام سامان بہشتی زندگی کا حسّی اور جسمانی طور پر ان کو دکھلا کر اس نئے طور کے دارالسّلام میں ان کو داخل کر دے گی۔ ایسا ہی خدا تعالیٰ کی قہری تجلّی جہنّم کو بھی بعد از حساب اور الزام صریح کے نئے رنگ میں دکھلا کر گویا جہنّمی لوگوں کو نئے سرے جہنّم میں داخل کرے گی۔ رُوحانی طور پر بہشتیوں کا بلا توقف بعد موت کے بہشت میں داخل ہو جانا اور دوزخیوں کا دوزخ میں گرایا جانا بتواتر قرآن شریف اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

(ازالہ اَوہام صفحہ ۳۴۹ تا ۳۵۱)

---

[1] سورۃ آلِ عمران : ۵۶

مومن کو فوت ہونے کے بعد بِلا توقّف بہشت میں جگہ ملتی ہے جیسا کہ اِن آیات سے ظاہر ہو رہا ہے
قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِیْ يَعْلَمُوْنَ ۙ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝[1] (یٰسٓ ع۲)
اور دوسری یہ آیت فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔ (ازالہ اَوہام صفحہ ۳۵۴)

اے نفس بحق آرام یافتہ اپنے رب کی طرف واپس چلا آ۔ تُو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ پھر اس کے بعد میرے اُن بندوں میں داخل ہو جا جو دُنیا کو چھوڑ گئے ہیں اور میرے بہشت کے اندر آ۔ اِس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ انسان جب تک فوت نہ ہو جائے گزشتہ لوگوں کی جماعت میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتا لیکن معراج کی حدیث سے جس کو بخاری نے بھی مبسوط طور پر اپنے صحیح میں لکھا ہے ثابت ہو گیا ہے کہ حضرت مسیح ابنِ مریم فوت شدہ نبیوں کی جماعت میں داخل ہے لہٰذا حسب دلالت صریحہ اس نص کے مسیح ابنِ مریم کا فوت ہو جانا ضروری طور پر ماننا پڑا۔ (ازالہ اَوہام صفحہ ۶۱۷، ۶۱۸)

جب کہ انہوں (حضرت مسیح ابنِ مریم۔ ناقل) نے فوت شدہ لوگوں کی طرح عالَمِ ثانی کی زندگی کے تمام لوازم اختیار کر لئے جو فوت شدہ لوگوں کی علامات میں سے ہیں اور نہ صرف اختیار ہی کئے بلکہ اس جماعت میں جا ملے اور فرمان اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ کا قبول کر کے فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ کا مصداق ہو گئے تو اَب بھی اگر ان کو فوت شدہ نہ کہا جائے تو اَور کیا کہا جاوے۔ (ازالہ اَوہام صفحہ ۷۴۲)

جیسا کہ عام طور پر تمام فوت شدہ راست بازوں کے لئے اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ کا خطاب ہے سو وہی رَفع اِلی اللہ اور رجوع اِلی اللہ جس کے لئے پہلے موت شرط ہے حضرت مسیحؑ کے بھی نصیب ہو گیا۔
(آسمانی فیصلہ صفحہ ۸)

وَمَا مَعْنٰی قَوْلِ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ اِلَّا الْمَعْنَی الَّذِیْ يُفْهَمُ مِنْ قَوْلِ رَافِعُكَ اِلَیَّ، فَاِنَّ الرُّجُوْعَ اِلَى اللّٰهِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً وَالرَّفْعَ اِلَى اللّٰهِ اَمْرٌ وَّاحِدٌ، وَقَدْ جَرَتْ عَادَةُ اللّٰهِ تَعَالٰی اَنَّهٗ يَرْفَعُ اِلَيْهِ عِبَادَهُ الصَّالِحِيْنَ، بَعْدَ مَوْتِهِمْ وَيُؤْوِيْهِمْ فِی السَّمٰوٰتِ بِحَسْبِ مَرَاتِبِهِمْ۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۳۵)

ترجمہ از مرتّب:۔ اللہ تعالیٰ کے قول اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ کا وہی مفہوم ہے جو رَافِعُكَ اِلَیَّ کا ہے کیونکہ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ہونے کی شکل میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور رَفع اِلی اللہ دونوں ایک ہی امر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہ سُنّت جاری ہے کہ وہ اپنے صالح بندوں کے درجات ان کی موت کے بعد بلند کرتا ہے اور ان کے مراتب کے مطابق آسمان میں انہیں مقام عطا فرماتا ہے۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۳۵)

---

[1] سُورۃ یٰسٓ : ۲۷، ۲۸

اے نفس آرام یافتہ جو خدا سے آرام پا گیا اپنے خدا کی طرف واپس چلا آ۔ تُو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ پس میرے بندوں میں مِل جا اور میرے بہشت کے اندر آجا۔ یہ وہ مرتبہ ہے جس میں نفس تمام کمزوریوں سے نجات پاکر رُوحانی قوتوں سے بھر جاتا ہے اور خدائے تعالیٰ سے ایسا پیوند کرلیتا ہے کہ بغیر اس کے جی بھی نہیں سکتا اور جس طرح پانی اُوپر سے نیچے کی طرف بہتا ہے اور بسبب اپنی کثرت اور نیز روکوں کے دُور ہونے سے بڑے زور سے چلتا ہے اسی طرح وہ خدا کی طرف بہتا چلا جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے وہ نفس جو خدا سے آرام پا گیا اس کی طرف واپس چلا آ۔ پس وہ اِسی زندگی میں نہ موت کے بعد ایک عظیم الشّان تبدیلی پیدا کرتا ہے اور اِسی دُنیا میں نہ دوسری جگہ ایک بہشت اُس کو ملتا ہے اور جیسا کہ اِس آیت میں لکھا ہے کہ اپنے رَبّ کی طرف یعنی پرورش کرنے والے کی طرف واپس آ۔ ایسا ہی اس وقت یہ خدا سے پرورش پاتا اور خدا کی محبت اس کی غذا ہوتی ہے اور اسی زندگی بخش چشمہ سے پانی پیتا ہے اِس لئے موت سے نجات پاتا ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۴، ۵)

اے نفس خدا کے ساتھ آرام یافتہ اپنے ربّ کی طرف واپس چلا آ۔ وہ تجھ سے راضی اور تُو اُس سے راضی۔ پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری بہشت کے اندر آجا..... یاد رکھنا چاہیئے کہ اعلیٰ درجہ کی رُوحانی حالت انسان کی اس دُنیوی زندگی میں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ آرام پا جائے اور تمام اطمینان اور سرور اور لذّت اس کی خدا میں ہی ہو جائے۔ یہی وہ حالت ہے جس کو دوسرے لفظوں میں بہشتی زندگی کہا جاتا ہے۔ اِس حالت میں انسان اپنے کامل صدق اور صفا اور وفا کے بدلہ میں ایک نقد بہشت پا لیتا ہے اور دوسرے لوگوں کی بہشت موعود پر نظر ہوتی ہے اور یہ بہشت موجود میں داخل ہوتا ہے اسی درجہ پر پہنچ کر انسان سمجھتا ہے کہ وہ عبادت جس کا بوجھ اس کے سر پر ڈالا گیا ہے درحقیقت وہی ایک ایسی غذا ہے جس سے اس کی رُوح نشوونما پاتی ہے اور جس پر اس کی رُوحانی زندگی کا بڑا بھاری مدار ہے اور اس کے نتیجہ کا حصول کسی دوسرے جہان پر موقوف نہیں ہے اسی مقام پر یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ وہ ساری ملامتیں جو نفس لوّامہ انسان کا اس کی ناپاک زندگی پر کرتا ہے اور پھر بھی نیک خواہشوں کو اچھی طرح اُبھار نہیں سکتا اور بُری خواہشوں سے حقیقی نفرت نہیں دلا سکتا اور نہ نیکی پر ٹھہرنے کی پُوری قوت بخش سکتا ہے۔ اس پاک تحریک سے بدل جاتی ہے جو نفس مطمئنہ کے نشوونما کا آغاز ہوتی ہے اور اِس درجہ پر پہنچ کر وقت آجاتا ہے کہ انسان پوری فلاح حاصل کرے اور اَب تمام نفسانی جذبات خود بخود افسردہ ہونے لگتے ہیں اور رُوح پر ایک ایسی طاقت افزا ہَوا چلنے لگتی ہے جس سے انسان پہلی کمزوریوں

کو ندامت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس وقت انسانی سرشت پر ایک بھاری انقلاب آتا ہے اور عادت میں ایک تبدلِ عظیم پیدا ہوتا ہے اور انسان اپنی پہلی حالتوں سے بہت ہی دُور جا پڑتا ہے، دھویا جاتا ہے اور صاف کیا جاتا ہے اور خدا نیکی کی محبت کو اپنے ہاتھ سے اس کے دل میں لکھ دیتا ہے اور بدی کا گند اپنے ہاتھ سے اس کے دل سے باہر پھینک دیتا ہے۔ سچائی کی فوج سب کی سب دل کے شہرستان میں آجاتی ہے اور فطرت کے تمام برجوں پر راست بازی کا قبضہ ہو جاتا ہے اور حق کی فتح ہوتی ہے اور باطل بھاگ جاتا ہے اور اپنے ہتھیار پھینک دیتا ہے۔ اس شخص کے دل پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے اور ہر ایک قدم خدا کے زیر سایہ چلتا ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۶۴، ۶۵)

اے نفس بحق آرام یافتہ اپنے رب کی طرف واپس چلا آ۔ وہ تجھ پر راضی اور تو اُس پر راضی۔ پھر میرے بندوں میں داخل ہو اور میری بہشت میں اندر آجا۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۲۱ حاشیہ)

جو لوگ موت کے ذریعہ سے اُس کی طرف اُٹھائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے لفظ اُن کے حق میں بولے جاتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف اُٹھائے گئے یا خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کر گئے جیساکہ اس آیت میں بھی ہے يَاۤ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِیۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ۔ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ اور جیساکہ اِس آیت میں اشارہ ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ (الحق دہلی صفحہ ۳۸)

چونکہ گناہ کی خشکی بے تعلقی سے پیدا ہوتی ہے اِس لئے اِس خشکی کو دُور کرنے کے لئے سیدھا علاج مستحکم تعلق ہے جس پر قانونِ قدرت گواہی دیتا ہے۔ اِسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ اشارہ کر کے فرماتا ہے يَاۤ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِیۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ۔ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ..... یعنی اے نفس جو خدا سے آرام یافتہ ہے اپنے ربّ کی طرف چلا آ۔ وہ تجھ سے راضی اور تو اُس سے راضی۔ پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میرے بہشت کے اندر آ۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۳، ۴)

تمام قرآن میں یہی محاورہ ہے کہ خدا کی طرف اُٹھائے جانے یا رجوع کرنے سے موت مراد ہوتی ہے جیساکہ آیت اِرْجِعِیۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً سے بھی موت ہی مراد ہے۔

(ایام الصلح صفحہ ۱۳۹، ۱۴۰)

یہ تینوں شریعتوں کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ مومن مَر کر خدا کی طرف جاتا ہے اور اُس کے لئے آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں جیساکہ آیت اِرْجِعِیۤ اِلٰى رَبِّكِ اِس کی شاہد ہے اور کافر نیچے کی طرف جو شیطان کی طرف ہے جاتا ہے جیساکہ آیت وَ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ[1] اس کی گواہ ہے۔ خدا کی طرف

[1] سورۃ الاعراف: ۴۱

جانے کا نام رَفع ہے اور شیطان کی طرف جانے کا نام لعنت ہے۔ اِن دونوں لفظوں میں تقابل اضداد ہے۔ نادان لوگ اِس حقیقت کو نہیں سمجھے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر رَفع کے معنی مع جسم اُٹھانا ہے تو اس کے مقابل کا لفظ کیا ہؤا جیسا کہ رَفع رُوحانی کے مقابل پر لعنت ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۴)

یہود حضرت عیسٰی علیہ السلام کے اُس رَفع سے مُنکر تھے جو ہر یک مومن کے لئے مدارِ نجات ہے کیونکہ مسلمانوں کی طرح اُن کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ جان نکلنے کے بعد ہر یک مومن کی رُوح کو آسمان کی طرف لے جاتے ہیں اور اس کے لئے آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں مگر کافر پر آسمان کے دروازے بند ہوتے ہیں اِس لئے اس کی رُوح نیچے شیطان کی طرف پھینک دی جاتی ہے جیسا کہ وہ اپنی زندگی میں بھی شیطان کی طرف ہی جاتا تھا لیکن مومن اپنی زندگی میں اُوپر کی طرف جاتا ہے اِس لئے مَرنے کے بعد بھی خدا کی طرف اس کا رَفع ہوتا ہے اور اِرْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ کی آواز آتی ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۶ حاشیہ)

تمام قرآن شریف میں یہی محاورہ ہے کہ جب کسی کی نسبت فرمایا جاتا ہے کہ خدا کی طرف وہ گیا یا خدا کی طرف اس کا رَفع ہؤا تو اُس کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ رُوحانی طور پر اُس کا رَفع ہؤا جیسا کہ اِس آیت میں بھی یہی معنے ہیں جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ الخ کہ اے نفسِ مطمئنہ اپنے رب کی طرف واپس آجا۔ پس کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ مع جسمِ عنصری آجا۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۴۳)

ہر ایک ذی علم جانتا ہے کہ قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہے کہ جب مومن فوت ہوتا ہے اس کی رُوح خدا کی طرف جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ۔ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ..... یعنی اے رُوحِ اطمینان یافتہ اپنے رَبّ کی طرف واپس چلی آ۔ وہ تجھ سے راضی اور تُو اُس سے راضی۔ اور میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میرے بہشت میں داخل ہو جا۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۷۲، ۱۷۳ حاشیہ)

قرآن شریف اور احادیث کی تتبع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رَفع اِلی اللہ جو رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ[1] کے فقرہ سے ظاہر ہے بجز موت کی حالت کے کسی حالت کی نسبت بولا نہیں جاتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ۔ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ۔ یعنی اے نفسِ مطمئنہ جو خدا سے آرام یافتہ ہے اپنے خدا کی طرف واپس چلا آ اس حالت میں کہ خدا تجھ سے راضی اور تُو خدا سے راضی اور میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میرے بہشت میں داخل ہو جا۔

[1] سورۃ النسآء : ۱۵۹

اب ظاہر ہے کہ یہ مقولہ اللہ جل شانہٗ کا کہ خدا کی طرف واپس چلا آ۔ کوئی اہلِ اسلام میں سے اس کے یہ معنے نہیں کرتا کہ زندہ مع جسم عنصری آسمان پر جا بیٹھ بلکہ آیت اِرْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ کے معنے موت ہی کئے جاتے ہیں۔ پس جب خدا تعالیٰ کی طرف واپس جانا بموجب نصِ صریح قرآن شریف کے موت ہے تو پھر خدا کی طرف اُٹھائے جانا جیسا کہ آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ[1] سے ظاہر ہوتا ہے کیوں موت نہیں۔ یہ تو انصاف اور عقل اور تقویٰ کے برخلاف ہے کہ جو معنے نصوصِ قرآنیہ سے ثابت اور متحقق ہوتے ہیں اُن کو ترک کیا جائے اور جن معنوں اور جس محاورہ کی اپنے پاس کوئی بھی دلیل نہیں اُس پہلو کو اختیار کیا جائے۔ کیا کوئی بتلا سکتا ہے کہ رَفع اِلی اللہ کے زبانِ عرب اور محاورۂ عرب میں بجز وفات دئیے جانے کے کوئی اَور بھی معنے ہیں۔ ہاں اِس وفات سے ایسی وفات مراد ہے جس کے بعد رُوح خدا تعالیٰ کی طرف اُٹھائی جاتی ہے جیسے مومنوں کی وفات ہوتی ہے۔ یہی محاورہ خدا تعالیٰ کی پہلی کتابوں میں موجود ہے۔

اور آیت ممدوحہ بالا میں جو فرمایا ہے فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ جس کے معنے پہلے فقرہ کے ساتھ ملانے سے یہ ہیں کہ خدا کی طرف واپس آجا اور پھر خدا کے بندوں میں داخل ہو جا۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شخص گذشتہ اَرواح میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک وفات نہ پاوے۔ پس جبکہ بموجب نصِ قرآن شریف کے گذشتہ اَرواح میں داخل ہونا بجز مَرنے کے ممتنع اور محال ہے تو پھر کیونکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر فوت ہونے کے حضرت یحییٰؑ کے پاس دوسرے آسمان میں جا بیٹھے۔

اِس جگہ یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ آیتِ ممدوحہ بالا میں خدا تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ جس کے معنے اِس فقرہ کو تمام آیت کے ساتھ ملانے سے یہ ہوتے ہیں ”کہ اے نفسِ آرام یافتہ اپنے خدا کی طرف واپس آجا تُو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی اور میرے بندوں میں داخل ہو جا۔“ پس جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس مشاہدہ سے جو معراج کی رات میں آپ کو ہوُا یہ ثابت ہے کہ قرآن شریف کی اِس آیت کے مطابق نبیوں اور رسولوں کی رُوحیں جو دُنیا سے گذر چکی ہیں وہ عالَمِ ثانی میں ایک ایسی جماعت کی طرح ہیں جو بِلا توقف پچھلی فوت ہونے والے پہلوں کے گروہ میں جا ملتی ہیں اور اُن میں داخل ہو جاتی ہیں جیسا کہ آیت فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ کا منشاء ہے پھر آخری فقرہ ان آیات کا یعنی وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ بھی یہی چاہتا ہے کہ وہ تمام عباد اللہ بِلا توقف بہشت میں داخل ہوں اور جیسا کہ آیت فِيْ عِبٰدِيْ کا مفہوم کوئی مترقب امر نہیں جو دُور دراز زمانہ کے بعد ظہور میں آوے بلکہ راست بازوں کے مَرنے کے ساتھ ہی بِلا توقف اُس کا ظہور

---

[1] سُورۃ النّساء : ۱۵۹

ہوتا ہے یعنی ایک جماعت جو بعد میں مرتی ہے پہلوں میں بلا توقف جاملتی ہے۔پس اس طرح لازم آتا ہے کہ دوسرا فقرہ آیت کا یعنی وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ وہ بھی بلا توقف ظہور میں آتا ہو یعنی ہر ایک شخص جو طیّب اور طاہر مومنوں میں سے مرے وہ بھی بلا توقف بہشت میں داخل ہو جائے اور یہی بات حق ہے جیسا کہ قرآن شریف کے دوسرے مقامات میں بھی اس کی تشریح ہے ...... پس جب کہ ارواح طیّبین مطہّرین کا بہشت میں داخل ہونا ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ بہشت وہ مقام ہے جس میں انواع اقسام کی جسمانی نعماء بھی ہوں گی اور طرح طرح کے میوے ہوں گے اور بہشت میں داخل ہونے کے یہی معنے ہیں کہ وہ نعمتیں کھاوے اس صورت میں صرف رُوح کا بہشت میں داخل ہونا بے معنی اور بے سُود ہے کیا وہ بہشت میں داخل ہو کر ایک محروم کی طرح بیٹھی رہے گی اور بہشت کی نعمتوں سے فائدہ نہیں اُٹھائے گی پس آیت فَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ صاف بتلا رہی ہے کہ مومن کو مرنے کے بعد ایک جسم ملتا ہے اسی وجہ سے تمام آئمہ اکابر متصوّفین اس بات کے قائل ہیں کہ مومن جو طیّب اور مطہّر ہوتے ہیں وہ بمجرّد فوت ہونے کے ایک پاک اور نورانی جسم پاتے ہیں جس کے ذریعہ سے وہ نعماءِ جنّت سے لذّت اُٹھاتے ہیں اور بہشت کو صرف شہیدوں کے لئے مخصوص کرنا ایک ظلم ہے بلکہ ایک کفر ہے۔کیا کوئی سچّا مومن یہ گستاخی کا کلمہ زبان پر لا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو ابھی تک بہشت سے باہر ہیں جن کے روضہ کے نیچے بہشت ہے مگر وہ لوگ جنہوں نے آپؐ کے ذریعہ سے ایمان اور تقویٰ کا مرتبہ حاصل کیا وہ شہید ہونے کی وجہ سے بہشت میں داخل ہیں اور بہشتی میوے کھا رہے ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ جس نے خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان کو وقف کر دیا وہ شہید ہو چکا پس اس صورت میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اوّل الشّہداء ہیں۔سو جب کہ یہ ثابت ہے تو ہم بھی کہتے ہیں کہ مسیح بھی مع جسم آسمان پر اُٹھایا گیا (مگر اُس جسم کے ساتھ جو اس عنصری جسم سے الگ ہے) اور پھر خدا تعالیٰ کے بندوں میں داخل ہوا اور بہشت میں داخل ہوا۔اس صورت میں ہماری اور ہمارے مخالفوں کی نزاع صرف لفظی نزاع نکلی۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۱۲ تا ۲۱۵)

ہم اس بات سے مُنکر نہیں ہو سکتے کہ بعد موت حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو جلالی جسم ملا جو خاکی جسم نہیں ہے کیونکہ وہ ہر ایک مومن راستباز کو بعد موت ملتا ہے جیسا کہ آیت وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ اس پر شاہد ہے کیونکہ مجرّد رُوح بہشت میں داخل ہونے کے لائق نہیں۔پس اس میں حضرت عیسیٰؑ کی کوئی خصوصیّت نہیں۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۱۴، ۲۱۵ حاشیہ)

ایسا سمجھنا غلطی ہے کہ پہلے انبیاء علیہم السّلام جو اس دُنیا سے گذر چکے ہیں اُن کی صرف آسمان پر رُوحیں ہیں بلکہ اُن کے ساتھ نورانی اور جلالی اجسام ہیں جن اجسام کے ساتھ وہ مرنے کے بعد دُنیا میں سے اُٹھائے

گئے جیسا کہ آیت وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ اِس بات پر نصِ صریح ہے کیونکہ بہشت میں داخل ہونے کے لئے جسم کی ضرورت ہے اور قرآن شریف جابجا تصریح سے فرماتا ہے کہ جو لوگ بہشت میں داخل ہوں گے ان کے ساتھ جسم بھی ہوں گے کوئی مجرد رُوح بہشت میں داخل نہیں ہوگی پس آیت وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ اِس بات کیلئے نصِ صریح ہے کہ ہر ایک راستباز جو مَرنے کے بعد بہشت میں داخل ہوتا ہے اُس کو مَرنے کے بعد ضرور ایک جسم ملتا ہے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۲۲۳، ۲۲۴)

اِس آیت (بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ۔ ناقل) کے مشابہ دوسری آیت بھی قرآن شریف میں موجود ہے اور وہ یہ کہ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً پس کیا اِس کے معنی یہ ہیں کہ اے نفسِ مطمئنہ مع جسمِ عنصری دوسرے آسمان پر چلا جا؟ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۶)

..... نور اور روشنی سے بہرہ ور انسان اعلیٰ درجہ کی راحت اور عزت پاتا ہے چنانچہ خدا تعالیٰ نے خود فرمایا ہے یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً یعنی اے نفس جو اطمینان یافتہ ہے اور پھر یہ اطمینان خدا کے ساتھ پایا ہے۔ بعض لوگ حکومت سے بظاہر اطمینان اور سیری حاصل کرتے ہیں بعض کی تسکین اور سیری کا موجب اُن کا مال اور عزت ہوجاتی ہے اور بعض اپنی خوبصورت اور ہوشیار اولاد و احفاد کو دیکھ دیکھ کر بظاہر مطمئن کہلاتے ہیں مگر یہ لذت اور انواع و اقسام کی لذاتِ دُنیا اِنسان کو سچا اطمینان اور سچی تسلی نہیں دے سکتیں بلکہ ایک قِسم کی ناپاک حرص کو پیدا کر کے طلب اور پیاس کو پیدا کرتی ہیں۔ استسقاء کے مریض کی طرح اُن کی پیاس نہیں بجھتی یہاں تک کہ اُن کو ہلاک کر دیتی ہے مگر یہاں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے وہ نفس جس نے اپنا اطمینان خدائے تعالیٰ میں حاصل کر لیا ہے یہ درجہ بندے کے لئے ممکن ہے۔ اُس وقت اُس کی خوشحالی باوجود مال منال کے دُنیاوی حشمت اور جاہ و جلال کے ہوتے ہوئے بھی خدا ہی میں ہوتی ہے۔ یہ زَر و جواہر۔ یہ دُنیا اور اس کے دھندے اس کی سچی راحت کا موجب نہیں ہوتے۔ پس جب تک اِنسان خدائے تعالیٰ ہی میں راحت اور اطمینان نہیں پاتا وہ نجات نہیں پاسکتا کیونکہ نجات اطمینان ہی کا ایک مترادف لفظ ہے۔ مَیں نے بعض آدمیوں کو دیکھا اور اکثروں کے حالات پڑھے ہیں جو دُنیا میں مال و دولت اور دُنیا کی جھوٹی لذتیں اور ہر ایک قِسم کی نعمتیں اولاد احفاد رکھتے تھے جب مرنے لگے اور اُن کو اِس دُنیا کے چھوڑ جانے اور ساتھ ہی اُن اشیاء سے الگ ہونے اور دوسرے عالم میں جانے کا علم ہوا تو اُن پر حسرتوں اور بے جا آرزوؤں کی آگ بھڑکی اور سرد آہیں مارنے لگے۔ پس یہ بھی ایک قِسم کا جہنّم ہے جو انسان کے دِل کو راحت اور قرار نہیں دے سکتا بلکہ اس کو گھبراہٹ اور بیقراری کے عالم میں ڈال دیتا ہے اِس لئے یہ امر بھی میرے دوستوں کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہنا چاہیئے کہ

اکثر اُوقات اِنسان اہل و عیال اور اموال کی محبت ہاں ناجائز اور بے جا محبت میں ایسا محو ہو جاتا ہے اور اکثر اُوقات اُس محبت کے جوش اور نشہ میں ایسے ناجائز کام کر گزرتا ہے جو اُس میں اور خدائے تعالیٰ میں ایک حجاب پیدا کر دیتے ہیں اور اس کے لئے ایک دوزخ تیار کر دیتے ہیں۔ اُس کو اِس بات کا عِلم نہیں ہوتا۔ جب وہ اُن سب سے یکایک علیحدہ کیا جاتا ہے اُس گھڑی کی اُسے خبر نہیں ہوتی۔ تب وہ ایک سخت بے چینی میں مُبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی چیز سے جب محبت ہو تو اُس سے جُدائی اور علیحدگی پر ایک رنج اور دردناک غم پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اب منقولی ہی نہیں بلکہ معقولی رنگ رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ [1]

پس یہ وہی غیر اللہ کی محبت کی آگ ہے جو انسانی دل کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور ایک حیرتناک عذاب اور وَرد میں مُبتلا کر دیتی ہے۔ مَیں پھر کہتا ہوں کہ یہ بالکل سچی اور یقینی بات ہے کہ نفسِ مطمئِنّہ کے بِدُوں انسان نجات نہیں پاسکتا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے نفسِ امّارہ کی حالت میں انسان شیطان کا غلام ہوتا ہے اور لوّامہ میں اُسے شیطان سے ایک مجاہدہ اور جنگ کرنا ہوتا ہے۔ کبھی وہ غالب آجاتا ہے اور کبھی شیطان۔ مگر مطمئِنّہ کی حالت ایک امن اور آرام کی حالت ہوتی ہے کہ وہ آرام سے بیٹھ جاتا ہے اِس لئے اِس آیت میں کہ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِس آخری حالت میں کِس قدر اِستراحت ہوتی ہے چنانچہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ اے نفسِ مطمئِنّہ اللہ کی طرف چلا آ۔ ظاہر کے لحاظ سے تو یہ مطلب ہے کہ جان کُندن کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آتی ہے کہ اے مطمئن نفس اپنے رَبّ کی طرف چلا آ۔ وہ تجھ سے خوش ہے اور تُو اس سے راضی۔ چونکہ قرآن کے لئے ظاہر اور بطن دونوں ہیں اِس لئے بطن کے لحاظ سے یہ مطلب ہے کہ اے اطمینان پر پہنچے ہوئے نفس اپنے رب کی طرف چلا آ یعنی تیری طبعًا یہ حالت ہو چکی ہے کہ تُو اطمینان اور سکینت کے مرتبہ پر پہنچ گیا ہے اور تجھ میں اور اللہ تعالیٰ میں کوئی بُعد نہیں ہے۔ لوّامہ کی حالت میں تو تکلیف ہوتی ہے مگر مطمئِنّہ کی حالت میں ایسا ہوتا ہے کہ جیسے پانی اُوپر سے گرتا ہے اسی طرح پر خدائے تعالیٰ کی محبت انسان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ خدا ہی کی محبت سے جیتا ہے غیر اللہ کی محبت جو اُس کے لئے ایک جلانے اور جہنّم کی پَیدا کرنے والی ہوتی ہے جل جاتی ہے اور اُس کی جگہ ایک روشنی اور

---

[1] سُورۃ الھمزۃ : ۸،۷

نور بھر دیا جاتا ہے۔ اُس کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا اور اللہ تعالیٰ کی رضا اُس کا منشاء ہو جاتا ہے۔ خدائے تعالیٰ کی محبت ایسی حالت میں اُس کے لئے بطور جان ہوتی ہے۔ جس طرح زندگی کے لئے لوازمِ زندگی ضروری ہیں اُس کی زندگی کے لئے خدا اور صرف خدا ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا تعالیٰ ہی اُس کی سچی خوشی اور پوری راحت ہوتا ہے نفسِ مطمئنّہ کی یہ نشانی ہے کہ کسی خارجی تحریک کے بدُوں ہی وہ ایسی صورت پکڑ جاتا ہے کہ خدا کے بدُوں رہ نہیں سکتا اور یہی انسانی ہستی کا مدعا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ فارغ انسان شکار، شطرنج، گنجفہ وغیرہ اشغال اپنے لئے پیدا کر لیتے ہیں مگر مطمئنّہ جب کہ ناجائز اور عارضی اور لبا اَوقات رنج اور کرب پیدا کرنے والے اشغال سے الگ ہو گیا۔ اب الگ ہو کر منقطع عالَم اُسے کیوں یاد آوے۔ اِس لئے خدا ہی سے محبّت ہو جاتی ہے۔ یہ امر بھی دِل سے محو نہیں ہونا چاہیئے کہ محبّت دو قسم کی ہوتی ہے ایک ذاتی محبت ہوتی ہے اور ایک محبّت اغراض سے وابستہ ہوتی ہے۔ یا یہ کہو کہ اُس کا باعث صرف چند عارضی باتیں ہوتی ہیں جن کے دُور ہوتے ہی وہ محبت سرد ہو کر رنج اور غم کا باعث ہو جاتی ہے مگر ذاتی محبت سچی راحت پیدا کرتی ہے۔ چونکہ انسان فطرتاً خدا ہی کے لئے پیدا ہوُا ہے جیسا کہ فرمایا مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[1] اِس لئے خدائے تعالیٰ نے اس کی فطرت ہی میں اپنے لئے کچھ نہ کچھ رکھا ہوُا ہے اور اپنے پوشیدہ اور مخفی در مخفی اسباب سے اُسے اپنے لئے بنایا ہوُا ہے۔ پس جب انسان جھُوٹی اور نمائشی ہاں عارضی اور رنج پر ختم ہونے والی محبّتوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ خدا ہی کے لئے ہو جاتا ہے اور طبعاً کوئی بُعد نہیں رہتا اور خدا کی طرف دوڑا چلا آتا ہے۔ پس اِس آیت يَآاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ میں اُسی کی طرف اشارہ ہے۔ خدائے تعالیٰ کا آواز دینا یہی ہے کہ درمیانی حجاب اُٹھ گیا اور بُعد نہیں رہا۔ یہ متقی کا انتہائی درجہ ہوتا ہے جب وہ اطمینان اور راحت پاتا ہے۔ دوسرے مقام پر قرآن شریف نے اس اطمینان کا نام فلاح اور استقامت بھی رکھا ہے اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں اسی استقامت یا اطمینان یا فلاح کی طرف لطیف اشارہ ہے اور خود مُسْتَقِيْمَ کا لفظ بتلا رہا ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۳۴ تا ۱۳۷)

اگر مسیح کے صعود اِلی السّماء سے یہ غرض تھی کہ وہ لعنت سے بچے رہیں تو اس رَفع کے لئے ضروری ہے کہ پہلے موت ہو کیونکہ یہ رَفع وہ ہے جو قُربِ الٰہی کا مفہوم ہے اور بعد موت ملتا ہے اِسی لئے اِنِّیْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ[2] کہا گیا اور یہ وہی رَفع ہے جو اِرْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً میں خدا نے بیان فرمایا ہے اور مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ[3] سے پایا جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۱ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

---

[1] سورۃ الذّٰریٰت : ۵۷ [2] سورۃ اٰل عمران : ۵۶ [3] سورۃ صٓ : ۵۱

تُو میری جنّت میں داخل ہوجا اور اِسی وقت ہوجا اور مومن کا جنّت خود خدا ہے یعنی جب وہ خدا کے بندوں میں داخل ہؤا تو خدا تو انہیں میں ہے اور وہ اس کے عباد میں آگیا تو اب اس حالت میں وہ سجن کہاں رہا؟ ایک مرتبہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک وہ تکالیف میں ہوتا ہے جیسے جب کنواں کھودا جائے تو اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ پانی نکل آئے۔ مطمئنّہ ہونا اصل میں پانی نکالنا ہے جب پانی نکل آیا اب کھودنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (البدر جلد اوّل ۹ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۱)

اصل مدّعا تو یہ ہونا چاہیئے کہ انسان نفسِ مطمئنّہ حاصل کرے۔ نفس تین قسم ہے۔ امّارہ، لوّامہ، مطمئنّہ۔ بہت بڑا حصّہ دُنیا کا نفسِ امّارہ کے نیچے ہے اور بعض جن پر خدا کا فضل ہؤا ہے وہ لوّامہ کے نیچے ہیں۔ یہ لوگ بھی سعادت سے حصّہ رکھتے ہیں۔ بڑا بدبخت وہ ہے جو بدی کو محسوس ہی نہیں کرتا یعنی جو امّارہ کے ماتحت ہیں اور بڑا ہی سعید اور بامراد وہ ہے جو نفسِ مطمئنّہ کی حالت میں ہے۔

نفسِ مطمئنّہ ہی کو خدا تعالیٰ نے فرمایا يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً یعنی اے وہ نفس جو اطمینان یافتہ ہے اِس حالت میں شیطان کے ساتھ جو جنگ ہوتی ہے اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور خطاب کے لائق تو مطمئنّہ ہی ٹھہرایا ہے اور اِس آیت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مطمئنّہ کی حالت میں مکالمۂ الٰہی کے لائق ہوجاتا ہے۔ خدا کی طرف واپس آ کے معنے یہی نہیں کہ مَر جا بلکہ امّارہ اور لوّامہ کی حالت میں جو خدا تعالیٰ سے ایک بُعد ہوتا ہے مطمئنّہ کی حالت میں وہ مہجوری نہیں رہتی اور کوئی غبار باقی نہ رہ کر غیب کی آواز اس کو بُلاتی ہے۔ تُو مجھ سے راضی اور مَیں تجھ سے راضی۔ یہ رضا کا انتہائی مقام ہوتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَب میرے بندوں میں داخل ہوجا۔ اللہ تعالیٰ کے بندے دُنیا ہی پر ہوتے ہیں مگر دُنیا ان کو نہیں پہچانتی۔ دُنیا نے آسمانی بندوں سے دوستی نہیں کی وہ ان سے ہنسی کرتی ہے۔ وہ الگ ہی ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی رِداء کے نیچے ہوتے ہیں۔ غرض جب ایسی حالتِ اطمینان میں پہنچتا ہے تو الٰہی اکسیر سے تانبا سونا بن جاتا ہے۔ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ اور تُو میرے بہشت میں داخل ہوجا۔ بہشت ایک ہی چیز نہیں وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ[1] خدا سے ڈرنے والے کے لئے دو بہشت ہیں۔

(الحکم جلد ۷ ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

بڑی بشارت مومن کو ہے يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ اے نفس جو کہ خدا تعالیٰ سے آرام یافتہ ہے تُو اپنے رَبّ کی طرف راضی خوشی واپس آ۔ اِس خوشی میں ایک کافر ہرگز شریک نہیں ہے۔

---

[1] سورۃ الرحمٰن : ۴۷

رَاضِیَۃً کے معنے یہ ہیں کہ وہ اپنی مرادات کوئی نہیں رکھتا کیونکہ اگر وہ دُنیا سے خلافِ مرادات جاوے تو پھر راضی تو نہ گیا اِسی لئے اس کی تمام مرادات خدا ہی خدا ہوتا ہے اس کے مصداق صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں کہ آپ کو یہ بشارت ملی اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ[1] اور اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ[2] بلکہ مومن کی خلافِ مرضی تو اس کی نزع (جان کنی) بھی نہیں ہوا کرتی۔ ایک شخص کا قصہ لکھا ہے کہ وہ دُعا کیا کرتا تھا کہ مَیں طوس میں مَروں لیکن ایک دفعہ وہ ایک اَور مقام پر تھا کہ سخت بیمار ہوا اور کوئی امید زیست کی نہ رہی تو اُس نے وصیت کی کہ اگر مَیں یہاں مَر جاؤں تو مجھے یہودیوں کے قبرستان میں دفن کرنا۔ اسی وقت سے وہ رُو بصحت ہونا شروع ہو گیا حتّٰی کہ بالکل تندرست ہو گیا۔ لوگوں نے اس کی وصیت کی وجہ پُوچھی تو کہا کہ مومن کی علامت ایک یہ بھی ہے کہ اس کی دُعا قبول ہو۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[3] خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ میری دعا تھی کہ طوس میں مَروں جب دیکھا کہ موت تو یہاں آتی ہے تو اپنے مومن ہونے پر مجھے شک ہوا اِس لئے مَیں نے یہ وصیت کی کہ اہلِ اسلام کو دھوکا نہ دوں غرضیکہ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً صرف مومنوں کے لئے ہے۔ دُنیا میں بڑے بڑے مالداروں کی موت سخت نامرادی سے ہوتی ہے۔ دُنیا دار کی موت کے وقت ایک خواہش پیدا ہوتی ہے اور اسی وقت اُسے نزع ہوتی ہے۔ یہ اِس لئے ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے کہ اس وقت بھی اسے عذاب دیوے اور اس کی حسرت کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں تاکہ انبیاء کی موت جو کہ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً کی مصداق ہوتی ہے اس میں اور دُنیا دار کی موت میں ایک بیّن فرق ہو۔ دُنیا دار کتنی ہی کوشش کرے مگر اس کی موت کے وقت حسرت کے اسباب ضرور پیش ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً کی موت مقبولین کی دَولت ہے۔ اس وقت ہر ایک قِسم کی حسرت دُور ہو کر اُن کی جان نکلتی ہے۔ راضی کا لفظ بہت عمدہ ہے اور ایک مومن کی مُرادیں اصل میں دین کے لئے ہُوا کرتی ہیں۔ خدا کی کامیابی اور اس کے دین کی کامیابی اس کا اصل مدعا ہُوا کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بہت ہی اعلیٰ ہے کہ جن کو اِس قِسم کی موت نصیب ہوئی۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۸ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۱۸)

..... تیسری حالت جو نفسِ مطمئنہ کی حالت ہے یہ وہ حالت ہے جب ساری لڑائیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور کامل فتح ہو جاتی ہے اِسی لئے اس کا نام نفسِ مطمئنہ رکھا ہے یعنی اطمینان یافتہ۔ اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر سچا ایمان لاتا ہے اور وہ یقین کرتا ہے کہ واقعی خدا ہے۔ نفسِ مطمئنہ کی اِنتہائی حد خدا تعالیٰ پر ایمان ہوتا ہے کیونکہ کامل اطمینان اور تسلّی اسی وقت ملتی ہے جب اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان ہو۔ یقیناً سمجھو کہ ہر ایک پاکبازی اور نیکی کی اصل جڑ

---

[1] سورۃ النصر: ۲ [2] سورۃ المائدۃ: ۴ [3] سورۃ المؤمن: ۶۱

خدا پر ایمان لانا ہے جس قدر انسان کا ایمان باللہ کمزور ہوتا ہے اسی قدر ایمانِ صالحہ میں کمزوری اور سستی پائی جاتی ہے لیکن جب ایمان قوی ہو اور اللہ تعالیٰ کو اس کی تمام صفاتِ کاملہ کے ساتھ یقین کر لیا جائے اسی قدر عجیب رنگ کی تبدیلی انسان کے اعمال میں پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا پر ایمان رکھنے والا گناہ پر قادر نہیں ہو سکتا کیونکہ ایمان اس کی نفسانی قوتوں اور گناہ کے اعضاء کو کاٹ دیتا ہے۔ دیکھو اگر کسی کی آنکھیں نکال دی جائیں تو وہ آنکھوں سے بدنظری کیونکر کر سکتا ہے اور آنکھوں کا گناہ کیسے کرے گا۔ اور اگر ایسا ہی ہاتھ کاٹ دئیے جاویں یا شہوانی اعضاء کاٹ دئیے جاویں پھر وہ گناہ جو ان اعضاء سے متعلق ہیں کیسے کر سکتا ہے؟ ٹھیک اسی طرح پر.... جب ایک انسان نفسِ مطمئنّہ کی حالت میں ہوتا ہے تو نفسِ مطمئنّہ اسے اندھا کر دیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں گناہ کی قوت نہیں رہتی۔ وہ دیکھتا ہے پر نہیں دیکھتا کیونکہ آنکھوں کے گناہ کی نظر سلب ہو جاتی ہے۔ وہ کان رکھتا ہے مگر بہرہ ہوتا ہے اور وہ باتیں جو گناہ کی ہیں نہیں سن سکتا۔ اسی طرح پر اس کی تمام نفسانی اور شہوانی قوتیں اور اندرونی اعضاء کاٹ دئیے جاتے ہیں۔ اس کی ساری طاقتوں پر جن سے گناہ صادر ہو سکتا تھا ایک موت واقع ہو جاتی ہے اور وہ بالکل ایک میّت کی طرح ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ ہی کی مرضی کے تابع ہوتا ہے۔ وہ اس کے سوا ایک قدم نہیں اٹھا سکتا۔ یہ وہ حالت ہوتی ہے جب خدا تعالیٰ پر سچا ایمان ہو اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کامل اطمینان اُسے دیا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جو انسان کا اصل مقصود ہونا چاہیئے اور ہماری جماعت کو اس کی ضرورت ہے اور اطمینانِ کامل کے حاصل کرنے کے واسطے ایمانِ کامل کی ضرورت ہے پس ہماری جماعت کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر سچّا ایمان حاصل کریں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱ مورخہ ۱۰؍جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

نفسِ مطمئنّہ کی تاثیروں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اطمینان یافتہ لوگوں کی صحبت میں اطمینان پاتے ہیں۔ امّارہ والے میں نفسِ امّارہ کی تاثیریں ہوتی ہیں اور جو شخص نفسِ مطمئنّہ والے کی صحبت میں بیٹھتا ہے اس پر بھی اطمینان اور سکینت کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور اندر ہی اندر اسے تسلّی ملنے لگتی ہے۔ مطمئنّہ والے کو پہلی نعمت یہ دی جاتی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے آرام پاتا ہے جیسے فرمایا يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً یعنی اے خدا تعالیٰ میں آرام یافتہ نفس اپنے ربّ کی طرف آجا۔ وہ تجھ سے راضی اور تُو اس سے راضی۔ اِس میں ایک باریک نکتہ معرفت ہے جو یہ کہا کہ خدا تجھ سے راضی تُو خدا سے راضی۔ بات یہ ہے کہ جب تک انسان اس مرحلہ پر نہیں پہنچتا اور لوّامہ کی حالت میں ہوتا ہے اس وقت تک خدا تعالیٰ سے ایک قِسم کی لڑائی رہتی ہے یعنی کبھی کبھی وہ نفس کی تحریک سے نافرمانی کر بیٹھتا ہے لیکن جب مطمئنّہ کی حالت پر پہنچتا ہے تو اس جنگ کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے صُلح ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ خدا

راضی ہوتا ہے اور خدا اس سے راضی ہو جاتا ہے کیونکہ وہ لڑائی بھڑائی بالکل جاتی رہتی ہے۔

یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیئے کہ ہر شخص خدا تعالیٰ سے لڑائی رکھتا ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے حضور دعائیں کرتا ہے اور بہت ساری امانی اور امیدیں رکھتا ہے لیکن اس کی وہ دعائیں نہیں سُنی جاتیں یا خلافِ امید کوئی بات ظاہر ہوتی ہے تو دل کے اندر اللہ تعالیٰ سے ایک لڑائی شروع کر دیتا ہے۔ خدا تعالیٰ پر بدظن اور اُس سے ناراضگی کا اظہار کرتا ہے لیکن صالحین اور عباد الرحمٰن کی کبھی اللہ تعالیٰ سے جنگ نہیں ہوتی کیونکہ وہ رضا بالقضاء کے مقام پر ہوتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ حقیقی ایمان اُس وقت تک پیدا ہو ہی نہیں سکتا جب تک انسان اس درجہ کو حاصل نہ کرے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی اس کی مرضی ہو جائے دل میں کوئی کدورت اور تنگی محسوس نہ ہو بلکہ شرح صدر کے ساتھ اُس کی ہر تقدیر اور قضاء کے ماننے کو تیار ہو۔ اِس آیت میں رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کا لفظ اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہ رضا کا اعلیٰ مقام ہے جہاں کوئی ابتلاء باقی نہیں رہتا۔ دوسرے جس قدر مقامات ہیں وہاں ابتلاء کا اندیشہ رہتا ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ سے بالکل راضی ہو جاوے اور کوئی شکوہ شکایت نہ رہے اُس وقت محبتِ ذاتی بیدار ہو جاتی ہے اور جب تک اللہ تعالےٰ سے محبتِ ذاتی پیدا نہ ہو تو ایمان بڑے خطرہ کی حالت میں ہے لیکن جب ذاتی محبت ہو جاتی ہے تو انسان شیطان کے حملوں سے امن میں آجاتا ہے۔ اِس ذاتی محبت کو دعا سے حاصل کرنا چاہیئے۔ جب تک یہ محبت پیدا نہ ہو انسان نفسِ امّارہ کے نیچے رہتا ہے اور اس کے پنجہ میں گرفتار رہتا ہے اور ایسے لوگ جو نفسِ امّارہ کے نیچے ہیں اُن کا قول ہے ایہہ جہان مٹھا تو اگلا کس نے ڈِٹھا۔ یہ لوگ بڑی خطرناک حالت میں ہوتے ہیں۔ اور لوّامہ والے ایک گھڑی میں ولی اور ایک گھڑی میں شیطان ہو جاتے ہیں اُن کا ایک رنگ نہیں رہتا کیونکہ ان کی لڑائی نفس کے ساتھ شروع ہوتی ہے جس میں کبھی وہ غالب اور کبھی مغلوب ہوتے ہیں تاہم یہ لوگ محلِ مدح میں ہوتے ہیں کیونکہ ان سے نیکیاں بھی سرزد ہوتی ہیں اور خوفِ خدا بھی ان کے دِل میں ہوتا ہے لیکن نفسِ مطمئنّہ والے بالکل فتحمند ہوتے ہیں اور وہ سارے خطروں اور خوفوں سے نکل کر امن کی جگہ میں جا پہنچتے ہیں۔ وہ اس دارالامان میں ہوتے ہیں جہاں شیطان نہیں پہنچ سکتا۔ لوّامہ والا جیسا کہ مَیں نے کہا ہے دارالامان کی ڈیوڑھی میں ہوتا ہے اور کبھی کبھی دشمن بھی اپنا وار کر جاتا ہے اور کوئی لاٹھی مار جاتا ہے اِس لئے مطمئنّہ والے کو کہا ہے فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ۔ یہ آواز اُس وقت آتی ہے جب وہ اپنے تقوےٰ کو اِنتہائی مرتبہ پر پہنچا دیتا ہے۔ تقویٰ کے دو درجے ہیں بدیوں سے بچنا اور نیکیوں میں سرگرم ہونا۔ یہ دوسرا مرتبہ محسنین کا ہے۔ اِس درجہ کے حصول کے بغیر اللہ تعالیٰ خوش نہیں ہو سکتا اور یہ مقام اور درجہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔

جب انسان بدی سے پرہیز کرتا ہے اور نیکیوں کے لئے اس کا دل تڑپتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ سے دعائیں کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی دستگیری کرتا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے دارالامان میں پہنچا دیتا ہے اور فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ کی آواز اُسے آجاتی ہے یعنی تیری جنگ اب ختم ہو چکی ہے اور میرے ساتھ تیری صلح اور آشتی ہو چکی ہے۔ اب آمیرے بندوں میں داخل ہو جو صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کے مصداق ہیں اور روحانی وراثت سے جن کو حصہ ملتا ہے۔ میری بہشت میں داخل ہو جا۔

یہ آیت جیسا کہ ظاہر میں سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد اُسے آواز آتی ہے آخرت پر ہی موقوف نہیں بلکہ اِسی دُنیا میں اِسی زندگی میں یہ آواز آتی ہے۔ اہلِ سلوک کے مراتب رکھے ہوئے ہیں۔ اُن کے سلوک کا انتہائی نقطہ یہی مقام ہے جہاں ان کا سلوک ختم ہو جاتا ہے اور وہ مقام یہی نفسِ مطمئنّہ کا مقام ہے۔ اہلِ سلوک کی مشکلات کو اللہ تعالےٰ اُٹھا دیتا ہے اور ان کو صالحین میں داخل کر دیتا ہے۔ (الحکم جلد ۸ ۲ مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۱، ۲)

تیسرا نفسِ مطمئنّہ ہے جو کہ اِس جنگ میں غالب آجاتا ہے اور نفس اور شیطان پر فتح حاصل کرتا ہے۔ اِس کا نام نفسِ مطمئنّہ اِس لئے ہے کہ یہ اطمینان یافتہ ہو جاتا ہے۔ انسان کے ہر ایک قوای پر اس کا قابو ہو جاتا ہے اور طبعی طور پر اس سے نیکی کے کام سرزد ہوتے ہیں۔ (البدر جلد ۳ ۳ مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

مطمئنّہ میں کوئی زنجیر باقی نہیں رہتی سب کی سب اُتر جاتی ہیں اور وہی زمانہ انسان کا خدا تعالیٰ کی طرف پکّے رجوع کا ہوتا ہے اور وہی خدا تعالیٰ کے کامل بندے ہوتے ہیں جو کہ نفسِ مطمئنّہ کے ساتھ دُنیا سے علیحدہ ہوویں اور جب تک وہ اُسے حاصل نہ کرے تب تک اُسے مطلق علم نہیں ہوتا کہ جنّت میں جاوے گا یا دوزخ میں۔

(البدر جلد ۳ ۳۴ مورخہ ۸ر ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

..... مطمئنّہ وہ ہے جو بکلی صلح کر لیتا ہے۔ آخری حد انسان کی ترقیات کی یہی ہے۔ اس وقت خدا کی رضا اسکی رضا ہو جاتی ہے۔ اس کا ارادہ وہی ہوتا ہے جو خدا کا ارادہ ہوتا ہے۔

(البدر جلد ۷ ۲۵ مورخہ ۲۵ر جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

نفس کی تین حالتیں ہیں یا یہ کہو کہ نفس تین رنگ بدلتا ہے بچپن کی حالت میں نفس زکیہ ہوتا ہے یعنی بالکل سادہ ہوتا ہے۔ اِس عمر کے طے کرنے کے بعد پھر نفس پر تین حالتیں آتی ہیں۔ سب سے اوّل جو حالت ہوتی ہے اس کا نام نفسِ امّارہ ہے۔ اِس حالت میں انسان کی تمام طبعی قوتیں جوش زن ہوتی ہیں اور اس کی ایسی مثال ہوتی ہے جیسے دریا کا سیلاب آوے۔ اس وقت قریب ہے کہ غرق ہو جاوے۔ یہ جوشِ نفس ہر قسم کی بے اعتدالیوں کی طرف لے جاتا ہے لیکن پھر اس پر ایک حالت اَور بھی آجاتی ہے جس کا نام نفسِ لوّامہ ہے۔ اس کا نام لوّامہ اِس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ بدی پر ملامت کرتا ہے اور یہ حالت نفس کی روا نہیں رکھتی کہ انسان ہر قسم کی بے اعتدالیوں اور

جوشوں کا شکار ہوتا چلا جاوے جیسا کہ نفسِ امّارہ کی صورت میں تھا بلکہ نفسِ لوّامہ اُسے بدیوں پر ملامت کرتا ہے یہ سچ ہے کہ نفسِ لوّامہ کی حالت میں انسان بالکل گناہ سے پاک اور بری نہیں ہوتا مگر اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ اس حالت میں انسان کی شیطان اور گناہ کے ساتھ ایک جنگ ہوتی رہتی ہے کبھی شیطان غالب آجاتا ہے اور کبھی وہ غالب آجاتا ہے مگر نفسِ لوّامہ خدا تعالیٰ کے رحم کا مستحق ہوتا ہے اِس لئے کہ وہ بدیوں کے خلاف اپنے نفس سے جنگ کرتا رہتا ہے اور آخر اسی کشمکش اور جنگ وجدل میں اللہ تعالیٰ اس پر رحم کر دیتا ہے اور اُسے وہ نفس کی حالت عطا ہوتی ہے جس کا نام مطمئنّہ ہے یعنی اس حالت میں انسان شیطان اور نفس کی لڑائی میں فتح پاکر انسانیت اور نیکی کے قلعہ کے اندر آکر داخل ہوجاتا ہے اور اس قلعہ کو فتح کر کے مطمئن ہوجاتا ہے۔ اس وقت یہ خدا پر راضی ہوجاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس پر راضی ہوتا ہے کیونکہ یہ پورے طور پر اللہ تعالےٰ کی عبادت اور اطاعت میں فنا اور محو ہوجاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی مقادیر کے ساتھ اس کو پوری صلح اور رضا حاصل ہوتی ہے چنانچہ فرمایا یَآ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ..... اے نفسِ آرام یافتہ جو خدا سے آرام پاگیا ہے اپنے خدا کی طرف واپس چلا آ۔ تُو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ پس میرے بندوں میں مِل جا اور میرے بہشت کے اندر آجا۔ اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سچا رجوع اس وقت ہوتا ہے جبکہ خدا تعالیٰ کی رضا سے رضاءِ انسان مِل جاوے۔ یہ وہ حالت ہے جہاں انسان اَولیاء اور ابدال اور مقربین کا درجہ پاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ سے مکالمہ کا شرف ملتا ہے اور وحی کی جاتی ہے۔ اور چونکہ وہ ہر قسم کی تاریکی اور شیطانی شرارت سے محفوظ ہوتا ہے۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رضا میں زندہ ہوتا ہے اِس لئے وہ ایک ابدی بہشت اور سرور میں ہوتا ہے۔ انسانی ہستی کا مقصدِ اعلیٰ اور غرض اسی مقام کا حاصل کرنا ہے اور یہی وہ مقصد ہے جو اسلام کے لفظ میں اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے کیونکہ اسلام سے سچی مراد یہی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع اپنی رضا کرے مگر سچ یہ ہے کہ یہ مقام انسان کی اپنی قوت سے نہیں مِل سکتا ہاں اِس میں کلام نہیں کہ انسان کا فرض ہے کہ وہ مجاہدات کرے لیکن اس مقام کے حصول کا اصل اور سچا ذریعہ دعا ہے۔ انسان کمزور ہے جب تک دعا سے قوت اور تائید نہیں پاتا اِس دشوار گذار منزل کو طے نہیں کر سکتا۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

تیسری قسم نفس کی نفسِ مطمئنّہ ہے جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے یَآ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ..... یعنی اے وہ نفس جو خدا سے آرام پاگیا ہے اپنے ربّ کی طرف واپس چلا آ۔ تُو خدا سے راضی ہے اور خدا تجھ پر راضی ہے۔ پس میرے بندوں میں مِل جا اور میرے بہشت میں داخل ہوجا۔ غرض یہ وہ حالت ہوتی ہے کہ جب انسان خدا سے پوری تسلّی پالیتا ہے اور اس کو

کسی قسم کا اِضطراب باقی نہیں رہتا اور خدا تعالیٰ سے ایسا پیوند کر لیتا ہے کہ بغیر اس کے جی ہی نہیں سکتا۔ نفسِ لوامہ والا تو ابھی بہت خطرے کی حالت میں ہوتا ہے کیونکہ اندیشہ ہوتا ہے کہ لَوٹ کر وہ کہیں نفسِ امارہ نہ بن جاوے لیکن نفسِ مطمئنّہ کا وہ مرتبہ ہے کہ جس میں نفس تمام کمزوریوں سے نجات پاکر رُوحانی قوتوں سے بھر جاتا ہے۔

غرض یاد رکھنا چاہیئے کہ جب تک انسان اس مقام تک نہیں پہنچتا اس وقت تک وہ خطرہ کی حالت میں ہوتا ہے۔ اِس لئے چاہیئے کہ جب تک انسان اس مرتبہ کو حاصل نہ کرے مجاہدے اور ریاضات میں لگا رہے۔

(الحکم جلد ۱۲ ٹ۴ مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

وَإِنَّا لَا نَقُوْلُ اَنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ بَعْدَ انْتِقَالِهِمْ اِلٰى دَارِ الْاٰخِرَةِ يُحْبَسُوْنَ فِيْ مَكَانٍ بَعِيْدٍ مِنَ الْجَنَّةِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَلَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَبْلَ الْقِيَامَةِ اِلَّا الشُّهَدَاءُ كَلَّا بَلِ الْاَنْبِيَاءُ عِنْدَنَا اَوَّلُ الدَّاخِلِيْنَ۔ اَيَظُنُّ الْمُؤْمِنُ الَّذِيْ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اَنَّ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ يُبْعَدُوْنَ عَنِ الْجَنَّةِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ وَلَا يَجِدُوْنَ مِنْهَا رَائِحَةً، وَاَمَّا الشُّهَدَاءُ فَيَدْخُلُوْنَهَا مِنْ غَيْرِ مُكْثٍ خَالِدِيْنَ؟

فَاعْلَمْ يَا اَخِيْ اَنَّ هٰذِهِ الْعَقِيْدَةَ رَدِيَّةٌ فَاسِدَةٌ وَمَمْلُوْءَةٌ مِنْ سُوْءِ الْاَدَبِ۔ اَمَا قَرَأْتَ مَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ قَبْرِيْ، وَقَالَ اِنَّ قَبْرَ الْمُؤْمِنِ رَوْضَةٌ مِنْ رَوْضَاتِ الْجَنَّةِ وَقَالَ عَزَّوَجَلَّ فِيْ كِتَابِهِ الْمُحْكَمِ: يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْۤ اِلٰى

ترجمہ از مرتب :- ہم اِس بات کے قائل نہیں کہ جنتی لوگ اِس جہان سے دوسرے جہان میں منتقل ہونے کے بعد قیامت تک کے لئے جنت سے دُور ایک مکان میں روک دیئے جائیں گے اور قیامت سے قبل سوائے شہداء کے کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ ایسی بات ہرگز نہیں۔ بلکہ ہمارے عقیدہ کے مطابق انبیاء سب سے پہلے جنت میں داخل ہونے والے ہیں۔ کیا کوئی ایسا مومن جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہے یہ گمان کر سکتا ہے کہ نبی اور صدیق یومِ البعث تک جنت سے دُور رکھے جائیں گے اور اس کی راحت بخش ہوا کو نہیں پائیں گے لیکن شہداء فوری طور پر ہمیشہ کیلئے جنت میں داخل کئے جائیں گے

اے میرے بھائی! جان لے کہ یہ عقیدہ رَدی، فاسد اور بے اَدبی سے پُر ہے۔ کیا تُو نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول احادیث میں نہیں پڑھا کہ جنت میری قبر کے نیچے ہے نیز آپؐ نے فرمایا کہ مومن کی قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے اور خدائے عزّوجلّ نے اپنی محکم کتاب (قرآن کریم) میں فرمایا ہے یٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ۔

رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۔ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۵۲، ۵۳)

فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ بھی اجسام کو چاہتا ہے ..... سچی اور بالکل سچی اور صاف بات یہی ہے کہ اجسام ضرور ملتے ہیں لیکن یہ عنصری اجسام یہاں ہی رہ جاتے ہیں یہ اُوپر نہیں جاسکتے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

اے نفس بحق آرام یافتہ اپنے رب کی طرف واپس چلا آ۔ تو اُس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ سو میرے بندوں میں داخل ہو اور میرے بہشت میں اندر آجا۔ اِن دونوں آیات جامع البرکات سے ظاہر ہو رہا ہے کہ انسان کی رُوح کے لئے بندگی اور عبودیت دائمی اور لازمی ہے اور اسی عبودیت کی غرض سے وہ پیدا کیا گیا ہے بلکہ آیت مؤخر الذکر میں یہ بھی فرما دیا ہے کہ جو انسان اپنی سعادتِ کاملہ کو پہنچ جاتا ہے اور اپنے تمام کمالاتِ فطرتی کو پالیتا ہے اور اپنی جمیع استعدادات کو انتہائی درجہ تک پہنچا دیتا ہے اُس کو اپنی آخری حالت پر عبودیت کا ہی خطاب ملتا ہے اور فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ کے خطاب سے پکارا جاتا ہے۔ سو اَب دیکھئے اِس آیت سے کس قدر بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ انسان کا کمال مطلوب عبودیت ہی ہے اور سالک کا انتہائی مرتبہ عبودیت تک ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اگر عبودیت انسان کے لئے ایک عارضی جامہ ہوتا اور اصل حقیقت اس کی الوہیت ہوتی تو چاہیئے تھا کہ بعد طے کرنے تمام مراتبِ سلوک کے الوہیت کے نام سے پکارا جاتا لیکن فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ کے لفظ سے ظاہر ہے کہ عبودیت اُس جہان میں بھی دائمی ہے جو ابدالآباد رہے گی اور یہ آیت باآوازِ بلند پکار رہی ہے کہ انسان گو کیسے ہی کمالات حاصل کرے مگر وہ کسی حالت میں عبودیت سے باہر ہو ہی نہیں سکتا اور ظاہر ہے کہ جس کیفیت سے کوئی شئے کسی حالت میں باہر نہ ہو سکے وہ کیفیت اُس کی حقیقت اور ماہیت ہوتی ہے۔ پس چونکہ ازرُوئے بیان واضح قرآن شریف کے انسان کے نفس کے لئے عبودیت ایسی لازمی چیز ہے کہ نہ نبی بن کر اور نہ رسول بن کر اور نہ صدّیق بن کر اور نہ شہید بن کر اور نہ اِس جہان میں اور نہ اُس جہان میں الگ ہو سکے۔ جو مہتر اور بہتر انبیاء تھے انہوں نے عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ہونا اپنا فخر سمجھا۔ تو اِس سے ثابت ہے کہ انسان کی اصل حقیقت و ماہیت عبودیت ہی ہے الوہیت نہیں اور اگر کوئی الوہیت کا مدعی ہے تو بمقابلہ اس محکم اور بیّن آیت کے کہ جو فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ ہے کوئی دوسری آیت ایسی پیش کرے

وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ اے نفسِ مطمئنہ اپنے رَبّ کی طرف لَوٹ آ اِس حال میں کہ تُو اسے پسند کرنے والا بھی ہے اور اس کا پسندیدہ بھی۔ اور پھر تیرا رَبّ تجھے کہتا ہے کہ آ میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنّت میں بھی داخل ہو جا۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۵۲، ۵۳)

کہ جس کا مفہوم فَادْخُلِیْ فِیْ ذَاتِیْ ہو اور خود قرآن شریف جا بجا اپنے نزول کی علّتِ غائی بھی یہی ٹھہراتا ہے کہ تا عبودیّت پر لوگوں کو قائم کرے اور خدا نے اپنی کتابِ عزیز میں اُن لوگوں پر لعنت کی ہے جنہوں نے مسیح اور بعض دوسرے نبیوں کو خدا سمجھا تھا۔

(مکتوباتِ احمد جلد اوّل صفحہ ۷۵، ۷۶، مکتوب ۲۳ بنام میر عباس علی صاحب)

اِس بات کو رُوحانی لوگ جانتے ہیں کہ موت کے بعد جسمانی قُرب کچھ حقیقت نہیں رکھتا بلکہ ہر ایک جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رُوحانی قُرب رکھتا ہے اس کی رُوح آپ کی رُوح سے نزدیک کی جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۱۲)

سُورۃ البَلد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۱۸ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ۝

مومن وہی ہیں جو ایک دوسرے کو صبر اور مرحمت کی نصیحت کرتے ہیں یعنی یہ کہتے ہیں کہ شدائد پر صبر کرو۔ اور خدا کے بندوں پر شفقت کرو۔ اِس جگہ بھی مرحمت سے مراد شفقت ہے کیونکہ مرحمت کا لفظ زبانِ عرب میں شفقت کے معنوں پر مستعمل ہے۔ پس قرآنی تعلیم کا اصل مطلب یہ ہے کہ محبت جس کی حقیقت محبوب کے رنگ سے رنگین ہو جانا ہے بجز خدا تعالیٰ اور صلحاء اَور کسی سے جائز نہیں بلکہ سخت حرام ہے۔

(نور القرآن جلد ۲ صفحہ ۳۷)

مومن وہ ہیں جو حق اور رحم کی وصیت کرتے ہیں۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۴۳)

قرآن تمہیں انجیل کی طرح فقط یہ نہیں کہتا کہ اپنے بھائی پر بے سبب غصہ مت ہو بلکہ وہ کہتا ہے کہ نہ صرف اپنے ہی غصہ کو تھام بلکہ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ پر عمل بھی کر اور دوسروں کو بھی کہتا رہ کہ وہ ایسا کریں اور نہ صرف خود رحم کر بلکہ رحم کے لئے اپنے تمام بھائیوں کو وصیت بھی کر۔ (کشتی نوح صفحہ ۲۶)

وہ صبر اور رحم سے نصیحت کرتے ہیں۔ مرحمہ یہی ہے کہ دوسرے کے عیب کو دیکھ کر اسے نصیحت کی جاوے اور اس کے لئے بھی دعا کی جاوے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲۶ مورخہ ۸ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

اِس شکایت پر کہ جماعت میں طاعون سے کوئی مَر جاوے تو جنازہ اُٹھانے والا کوئی نہیں ملتا۔ فرمایا:۔
یاد رکھو تم میں اِس وقت دو اخوتیں جمع ہو چکی ہیں ایک تو اسلامی اخوت اور دوسری اِس سلسلہ کی اخوت ہے۔ پھر ان دو اخوتوں کے ہوتے ہوئے گریز اور سرد مہری ہو تو یہ سخت قابلِ اعتراض امر ہے میں

سمجھتا ہوں کہ اگر ایسے مسافر اپنے گھروں میں ہوتے تو وہ جو خارج از مذہب سمجھتے ہیں اور کافر کہتے ہیں اُن میں بھی اِس قسم کی سرد مہری نہ ہوتی لیکن یہ سرد مہری کیوں ہوتی ہے۔ دو باتوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا افراط اور تفریط کا۔ اگر افراط اور تفریط کو چھوڑ کر اعتدال سے کام لیا جاوے تو ایسی شکایت پیدا نہ ہو جبکہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ[1] وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ کا حکم ہے تو پھر ایسے مُردوں سے گریز کیوں کیا جاوے؟ اگر کسی کے مکان کو آگ لگ جاوے اور وہ پکار فریاد کرے تو جیسے یہ گناہ ہے کہ محض اِس خیال سے کہ مَیں جَل نہ جاؤں اس مکان کو اور اس میں رہنے والوں کو جلنے دے اور جا کر آگ بُجھانے میں مدد نہ دے ویسے ہی یہ بھی معصیت ہے کہ ایسی بے احتیاطی سے اس میں کُود پڑے کہ خود جَل جاوے۔ ایسے موقعہ پر احتیاط مناسب کے ساتھ ضروری ہے کہ آگ بُجھانے میں اس کی مدد کرے۔

پس اِس طریق پر یہاں بھی سلوک ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے جا بجا رحم کی تعلیم دی ہے یہی اخوّتِ اسلامی کا منشاء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر فرمایا ہے کہ تمام مسلمان مومن آپس میں بھائی ہیں۔ ایسی صورت میں کہ تم میں اسلامی اخوّت قائم ہو اور پھر اِس سلسلہ میں ہونے کی وجہ سے دوسری اخوّت بھی ساتھ ہو یہ بڑی غلطی ہو گی کہ کوئی شخص مصیبت میں گرفتار ہو اور قضا و قدر سے اُسے ماتم پیش آجاوے تو دوسرا تجہیز و تکفین میں بھی اس کا شریک نہ ہو ہرگز ہرگز اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ جنگ میں شہید ہوتے یا مجروح ہو جاتے تو مَیں یقین نہیں رکھتا کہ صحابہؓ انہیں چھوڑ کر چلے جاتے ہوں یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اِس بات پر راضی ہو جاتے کہ وہ ان کو چھوڑ کر چلے جاویں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ایسی وارداتوں کے وقت ہمدردی بھی ہو سکتی ہے اور احتیاط مناسب بھی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ اوّل تو کتاب اللہ سے یہ مسئلہ ملتا ہی نہیں کہ کوئی مرض لازمی طور پر دوسرے کو لگ بھی جاتی ہے۔ ہاں جس قدر تجارب سے معلوم ہوتا ہے اس کے لئے بھی نصِ قرآنی سے احتیاطِ مناسب کا پتہ لگتا ہے جہاں ایسا مرکز وَبا کا ہو کہ وہ شدّت سے پھیلی ہوئی ہو وہاں احتیاط کرے لیکن اِس کے بھی یہ معنی نہیں کہ انسان ایک میّت سے اِس قدر بُعد اختیار کرے کہ میّت کی ذلّت ہو اور پھر اس کے ساتھ ساری جماعت کی ذلّت ہو.... آئندہ خوب یاد رکھو کہ ہرگز اِس بات کو نہیں کرنا چاہیئے جبکہ خدا تعالیٰ نے تمہیں بھائی بنا دیا ہے تو پھر نفرت اور بُعد کیوں ہے؟ اگر وہ بھی مَرے گا تو اس کی بھی کوئی خبر نہ لے گا اور اِس طرح پر اخوّت کے حقوق تلف ہو جائیں گے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۵ مورخہ ۳۰؍اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

---

[1] سورۃ العصر: ۴

سورۃ الشمس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ○ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ○ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ○ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ○ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ○ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ○ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ○ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ ○ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا ○ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ○ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ○ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰهَا ○ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ○

قسم ہے سُورج کی اور اس کی دُھوپ کی اور قسم ہے چاند کی جب وہ سُورج کی پیروی کرے اور قسم ہے دن کی جب اپنی روشنی کو ظاہر کرے اور قسم ہے اُس رات کی جو بالکل تاریک ہو اور قسم ہے زمین کی اور اس کی جس نے اُسے بچھایا اور قسم ہے انسان کے نفس کی اور اس کی جس نے اُسے اعتدالِ کامل اور وضعِ استقامت کے جمیع کمالات متفرقہ عنایت کئے اور کسی کمال سے محروم نہ رکھا بلکہ سب کمالاتِ متفرقہ جو پہلی قسموں کے نیچے ذکر کئے گئے ہیں اس میں جمع کر دئے اس طرح پر کہ انسانِ کامل کا نفس آفتاب اور اس کی دُھوپ کا

بھی کمال اپنے اندر رکھتا ہے اور چاند کے خواص بھی اس میں پائے جاتے ہیں کہ وہ اکتسابِ فیض دوسرے سے کرسکتا ہے اور ایک نور سے بطور استفادہ اپنے اندر بھی نور لے سکتا ہے اور اس میں روزِ روشن کے بھی خواص موجود ہیں کہ جیسے محنت اور مزدوری کرنے والے لوگ دن کی روشنی میں کماحقہٗ اپنے کاروبار کو انجام دے سکتے ہیں ایسا ہی حق کے طالب اور سلوک کی راہوں کو اختیار کرنے والے انسانِ کامل کے نمونہ پر چل کر بہت آسانی اور صفائی سے اپنی مہماتِ دینیہ کو انجام دیتے ہیں سو وہ دن کی طرح اپنے تئیں بکمال صفائی ظاہر کرسکتا ہے اور ساری خاصیتیں دن کی اپنے اندر رکھتا ہے۔

اندھیری رات سے بھی انسانِ کامل کو ایک مشابہت ہے کہ وہ باوجود غایت درجہ کے انقطاع اور تبتّل کے حواس کو منجانب اللہ حاصل ہے بحکمت و مصلحتِ الٰہی اپنی نفس کی ظلمانی خواہشوں کی طرف بھی کبھی کبھی متوجہ ہو جاتا ہے یعنی جو جو نفس کے حقوق انسان پر رکھے گئے ہیں جو بظاہر نورانیّت کے مخالف اور مزاحم معلوم ہوتے ہیں جیسے کھانا پینا سونا اور بیوی کے حقوق ادا کرنا یا بچّوں کی طرف اِلتفات کرنا۔ یہ سب حقوق بجالاتا ہے اور کچھ تھوڑی دیر کے لئے اس تاریکی کو اپنے لئے پسند کرلیتا ہے نہ اِس وجہ سے کہ اس کو حقیقی طور پر تاریکی کی طرف میلان ہے بلکہ اِس وجہ سے کہ خداوند علیم و حکیم اس کو اپنی طرف توجہ بخشتا ہے تا رُوحانی تعب و مشقّت سے کسی قدر آرام پاکر پھر اُن مجاہداتِ شاقہ کے اُٹھانے کے لئے تیار ہو جائے جیسا کہ کسی کا شعر ہے ؎

چشمِ شہباز کاردانانِ شکار ✽ از بہر کشادن ست گر دوختہ اند

سو اسی طرح یہ کامل لوگ جب غایت درجہ کی کوفت خاطر اور گدازش اور ہمّ و غم کے غلبہ کے وقت کسی قدر حظوظِ نفسانیہ سے تمتّع حاصل کر لیتے ہیں تو پھر جسمِ ناتواں اُن کا رُوح کی رفاقت کے لئے از سرِ نو قوی اور توانا ہو جاتا ہے اور اس تھوڑی سی محجوبیّت کی وجہ سے بڑے بڑے مراحلِ نورانی طے کر جاتا ہے اور ماسوا اس کے نفسِ انسان میں رات کے اَور دوسرے خواصِ دقیقہ بھی پائے جاتے ہیں جن کو علمِ ہیئت اور نجوم اور طبعی کی باریک نظر نے دریافت کیا ہے ایسا ہی انسانِ کامل کے نفس کو آسمان سے بھی مشابہت ہے۔ مثلاً جیسے آسمان کا پول اسی قدر وسیع اور کشادہ ہے کہ کسی چیز سے پُر نہیں ہوسکتا ایسا ہی ان بزرگوں کا نفسِ ناطقہ غایت درجہ کی وسعتیں اپنے اندر رکھتا ہے اور باوجود ہزار ہا معارف و حقائق کے حاصل کرنے کے پھر بھی مَا عَرَفْنَاكَ کا نعرہ مارتا ہی رہتا ہے اور جیسے آسمان کا پول روشن ستاروں سے پُر ہے ایسا ہی نہایت روشن قوای اس میں رکھے گئے ہیں کہ جو آسمان کے ستاروں کی طرح نظر آتے ہیں۔ ایسا ہی انسانِ کامل کے نفس کو زمین سے بھی کامل مشابہت ہے یعنی جیسا کہ عمدہ اور اوّل درجہ کی زمین یہ خاصیت رکھتی

ہے کہ جب اس میں تخم ریزی کی جائے اور پھر خوب قلبہ رانی اور آبپاشی ہو اور تمام مراتب محنت کشاورزی کے اس پر پورے کر دئیے جائیں تو وہ دوسری زمینوں کی نسبت ہزار گونہ زیادہ پھل لاتی ہے اور نیز اس کا پھل بہ نسبت اور پھلوں کے نہایت لطیف اور شیریں و لذیذ اور اپنی کمیت اور کیفیت میں انتہائی درجہ تک بڑھا ہؤا ہوتا ہے اسی طرح انسانِ کامل کے نفس کا حال ہے کہ احکامِ الٰہی کی تخم ریزی سے عجیب سرسبزی لے کر اس کے اعمالِ صالحہ کے پودے نکلتے ہیں اور ایسے عمدہ اور غایت درجہ کے لذیذ اُس کے پھل ہوتے ہیں کہ ہر یک دیکھنے والے کو خدائے تعالیٰ کی پاک قدرت یاد آکر سُبحان اللہ کہنا پڑتا ہے۔ سو یہ آیت وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ انسانِ کامل اپنے معنے اور کیفیت کے رُو سے ایک عالَم ہے اور عالَمِ کبیر کے تمام شیون وصفات وخواص اجمالی طور سے اپنے اندر جمع رکھتا ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ نے شمس کے صفات سے شروع کر کے زمین تک جو ہماری سکونت کی جگہ ہے سب چیزوں کے خواص اشارہ کے طور پر بیان فرمائے یعنی بطور قسموں کے اُن کا ذکر کیا بعد اس کے انسانِ کامل کے نفس کا ذکر فرمایا تا معلوم ہو کہ انسانِ کامل کا نفس اُن تمام کمالاتِ متفرقہ کا جامع ہے جو پہلی چیزوں میں جن کی قسمیں کھائی گئیں الگ الگ طور پر پائی جاتی ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا تعالیٰ نے ان اپنی مخلوق چیزوں کے جو اس کے وجود کے مقابل پر بے بنیاد و ہیچ ہیں کیوں قسمیں کھائیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ تمام قرآن شریف میں یہ ایک عام عادت وسُنّت رہی ہے کہ وہ بعض نظری امور کے اثبات و احقاق کے لئے ایسے امور کا حوالہ دیتا ہے جو اپنے خواص کا عام طور پر بیّن اور کُھلا کُھلا اور بدیہی ثبوت رکھتے ہیں جیسا کہ اس میں کسی کو بھی شک نہیں ہو سکتا کہ سورج موجود ہے اور اس کی دھوپ بھی ہے اور چاند موجود ہے اور وہ نورِ آفتاب سے حاصل کرتا ہے اور روزِ روشن بھی سب کو نظر آتا ہے اور رات بھی سب کو دکھائی دیتی ہے اور آسمان کا پول بھی سب کی نظر کے سامنے ہے اور زمین تو خود انسانوں کی سکونت کی جگہ ہے۔ اب چونکہ یہ تمام چیزیں اپنا اپنا کُھلا کُھلا وجود اور کُھلے کُھلے خواص رکھتی ہیں جن میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا اور نفس انسان کا ایسی چُھپی ہوئی اور نظری چیز ہے کہ خود اس کے وجود میں ہی صدہا جھگڑے برپا ہو رہے ہیں۔ بہت سے فرقے ایسے ہیں کہ وہ اِس بات کو مانتے ہی نہیں کہ نفس یعنی رُوحِ انسان بھی کوئی مستقل اور قائم بالذّات چیز ہے جو بدن کی مفارقت کے بعد ہمیشہ کے لئے قائم رہ سکتی ہے اور جو بعض لوگ نفس کے وجود اور اس کی بقا اور ثبات کے قائل ہیں وہ بھی اس کی باطنی استعدادات کا وہ قدر نہیں کرتے جو کرنا چاہیئے تھا بلکہ بعض تو اتنا ہی سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم صرف اسی غرض کے لئے دُنیا میں آئے ہیں کہ حیوانات کی طرح کھانے پینے اور حظوظِ نفسانی میں عمر بسر کریں۔ وہ اِس بات کو جانتے بھی نہیں کہ نفسِ انسانی کس قدر اعلیٰ درجہ کی طاقتیں اور قوتیں اپنے اندر

رکھتا ہے اور اگر وہ کسبِ کمالات کی طرف متوجہ ہو تو کیسے تھوڑے ہی عرصہ میں تمام عالم کے متفرق کمالات وفضائل وانواع پر ایک دائرہ کی طرح محیط ہو سکتا ہے۔ سو اللہ جلّ شانہٗ نے اِس سورہ مبارکہ میں نفسِ انسان اور پھر اُس کے بے نہایت خواصِ فاضلہ کا ثبوت دینا چاہا ہے۔ پس اوّل اُس نے خیالات کو رجوع دلانے کے لئے شمس اور قمر وغیرہ چیزوں کے متفرق خواص بیان کر کے پھر نفسِ انسان کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ جامع اُن تمام کمالاتِ متفرقہ کا ہے اور جس حالت میں نفسِ انسان میں ایسے اعلیٰ درجہ کے کمالات وخاصیات بہ تمامہا موجود ہیں جو اجرامِ سماویہ اور اَرضیہ میں متفرق طور پر پائے جاتے ہیں تو کمال درجہ کی نادانی ہوگی کہ ایسے عظیم الشان اور مستجمع کمالاتِ متفرقہ کی نسبت یہ وہم کیا جائے کہ وہ کچھ بھی چیز نہیں جو موت کے بعد باقی رہ سکے یعنی جبکہ یہ تمام خواص جو ان مشہود و محسوس چیزوں میں ہیں جن کا مستقل وجود ماننے میں تمہیں کلام نہیں۔ یہاں تک کہ ایک اندھا بھی دھوپ کا احساس کر کے آفتاب کے وجود کا یقین رکھتا ہے۔ نفسِ انسان میں سب کے سب یکجائی طور پر موجود ہیں تو نفس کے مستقل اور قائم بالذات وجود میں تمہیں کیا کلام باقی ہے۔ کیا ممکن ہے کہ جو چیز اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں وہ تمام موجود بالذات چیزوں کے خواص جمع رکھتی ہو اور اِس جگہ قسم کھانے کی طرز کو اِس وجہ سے اللہ جلّ شانہٗ نے پسند کیا ہے کہ قسم قائم مقام شہادت کے ہوتی ہے۔ اِسی وجہ سے حکّام مجازی بھی جب دوسرے گواہ موجود نہ ہوں تو قسم پر انحصار کر دیتے ہیں اور ایک مرتبہ کی قسم سے وہ فائدہ اُٹھا لیتے ہیں جو کم سے کم دو گواہوں سے اُٹھا سکتے ہیں۔ سو چونکہ عقلاً وعُرفاً وقانوناً وشرعاً قسم شاہد کے قائم مقام سمجھی جاتی ہے لہٰذا اسی بناء پر خدائے تعالیٰ نے اِس جگہ شاہد کے طور پر اُس کو قرار دے دیا ہے۔ پس خدائے تعالیٰ کا یہ کہنا کہ قسم ہے سُورج کی اور اس کی دُھوپ کی درحقیقت اپنے مرادی معنے یہ رکھتا ہے کہ سُورج اور اس کی دُھوپ یہ دونوں نفسِ انسان کے موجود بالذات اور قائم بالذات ہونے کے شاہد حال ہیں کیونکہ سُورج میں جو جو خواص گرمی اور روشنی وغیرہ پائے جاتے ہیں یہی خواص مع شئے زائد انسان کے نفس میں بھی موجود ہیں۔ مکاشفات کی روشنی اور توجہ کی گرمی جو نفوسِ کاملہ میں پائی جاتی ہے اُس کے عجائبات سُورج کی گرمی اور روشنی سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ سو جبکہ سُورج موجود بالذات ہے تو جو خواص میں اُس کا ہم مثل اور ہم پلّہ ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یعنی نفسِ انسان۔ وہ کیونکر موجود بالذات نہ ہوگا۔ اِسی طرح خدائے تعالیٰ کا یہ کہنا کہ قسم ہے چاند کی جب وہ سُورج کی پیروی کرے۔ اِس کے مرادی معنے یہ ہیں کہ چاند اپنی اس خاصیت کے ساتھ کہ وہ سُورج سے بطور استفادہ نور حاصل کرتا ہے نفسِ انسان کے موجود بالذات اور قائم بالذات ہونے پر شاہد حال ہے کیونکہ جس طرح چاند سُورج سے اکتسابِ نور کرتا ہے اسی طرح نفسِ انسان کا جو مُستعد اور طالبِ حق ہے ایک دوسرے انسانِ کامل کی پیروی کر کے اس کے نور میں سے لے لیتا ہے اور اُس کے باطنی فیض سے فیض یاب ہو جاتا ہے بلکہ چاند سے بڑھ کر استفادہ نور کرتا ہے کیونکہ چاند تو نور کو حاصل کر کے پھر چھوڑ بھی دیتا ہے مگر یہ کبھی نہیں چھوڑتا۔ پس

جبکہ استفادہ نور میں یہ چاند کا شریک غالب ہے اور دوسری تمام صفات اور خواص چاند کے اپنے اندر رکھتا ہے تو پھر کیا وجہ کہ چاند کو تو موجود بالذات اور قائم بالذات مانا جائے مگر نفس انسان کے مستقل طور پر موجود ہونے سے بکلی انکار کر دیا جائے۔ غرض اسی طرح خدا تعالیٰ نے اِن تمام چیزوں کو جن کا ذکر نفس انسان کی پہلے قسم کھا کر کیا گیا ہے اپنے خواص کی رُو سے شواہد اور ناطق گواہ قرار دے کر اِس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ نفس انسان واقعی طور پر موجود ہے اور اِس طرح ہر یک جگہ جو قرآن شریف میں بعض بعض چیزوں کی قسمیں کھائی ہیں اُن قسموں سے ہر جگہ یہی مدعا اور مقصد ہے کہ تا امر بدیہہ کو اسرارِ مخفیہ کے لئے جو اُن کے ہمرنگ ہیں بطور شواہد کے پیش کیا جائے۔ لیکن اِس جگہ یہ سوال ہوگا کہ جو نفس انسان کے موجود بالذات ہونے کے لئے قسموں کے پیرایہ میں شواہد پیش کئے گئے ہیں اُن شواہد کے خواص بدیہی طور پر نفسِ انسان میں کہاں پائے جاتے ہیں اور اس کا ثبوت کیا ہے کہ پائے جاتے ہیں۔ اِس وہم کے رفع کرنے کے لئے اللہ جلّ شانہٗ اس کے بعد فرماتا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا یعنی خدا تعالیٰ نے نفسِ انسان کو پیدا کر کے ظلمت اور نورانیت اور ویرانی اور سرسبزی کی دونوں راہیں اُس کے لئے کھول دی ہیں۔ جو شخص ظلمت اور فجور یعنی بدکاری کی راہیں اختیار کرے تو اُس کو اُن راہوں میں ترقی کے کمال درجہ تک پہنچایا جاتا ہے یہاں تک کہ اندھیری رات سے اس کی سخت مشابہت ہو جاتی ہے اور بجز معصیت اور بدکاری اور پُرظلمت خیالات کے اَور کسی چیز میں اُس کو مزہ نہیں آتا۔ ایسے ہی ہم صحبت اس کو اچھے معلوم ہوتے ہیں اور ایسے ہی شغل اس کے جی کو خوش کرتے ہیں اور اس کی بدطبیعت کے مناسبِ حال بدکاری کے الہامات اُس کو ہوتے رہتے ہیں یعنی ہر وقت بدچلنی اور بدمعاشی کے ہی خیالات اُس کو سُوجھتے ہیں کبھی اچھے خیالات اس کے دل میں پیدا ہی نہیں ہوتے۔ اور اگر پرہیزگاری کا نورانی راستہ اختیار کرتا ہے تو اُس نور کو مدد دینے والے الہام اُس کو ہوتے رہتے ہیں یعنی خدائے تعالیٰ اُسکے دلی نُور کو جو تخم کی طرح اُس کے دل میں موجود ہے اپنے الہاماتِ خاصہ سے کمال تک پہنچا دیتا ہے اور اُس کے روشن مکاشفات کی آگ کو افروختہ کر دیتا ہے تب وہ اپنے چمکتے ہوئے نور کو دیکھ کر اور اس کے افاضہ اور استفادہ کی خاصیت کو آزما کر پُورے یقین سے سمجھ لیتا ہے کہ آفتاب اور ماہتاب کی نورانیت مجھ میں بھی موجود ہے اور آسمان کے وسیع اور بلند اور پُر کواکب ہونے کے موافق میرے سینہ میں بھی اِنشراح صدر اور عالی ہمتی اور دِل اور دماغ میں ذخیرہ روشن قوای کا موجود ہے جو ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں تب اُسے اِس بات کے سمجھنے کے لئے اَور کسی خارجی ثبوت کی کچھ بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر سے ہی ایک کامل ثبوت کا چشمہ ہر وقت جوش مارتا ہے اور اُس کے پیاسے دل کو سیراب کرتا رہتا ہے اور اگر یہ سوال پیش ہو کہ سلوک کے طور پر کیونکر ان نفسانی خواص کا مشاہدہ ہو سکے تو اس کے جواب میں اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۔ وَقَدْ

خَابَ مَنْ دَسّٰهَا یعنی جس شخص نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور بکلّی رذائل اور اَخلاقِ ذمیمہ سے دست بردار ہو کر خدا تعالیٰ کے حکموں کے نیچے اپنے تئیں ڈال دیا وہ اُس مراد کو پہنچے گا اور اپنا نفس اُس کو عالمِ صغیر کی طرح کمالاتِ متفرقہ کا مجمع نظر آئے گا لیکن جس شخص نے اپنے نفس کو پاک نہیں کیا بلکہ بے جا خواہشوں کے اندر گاڑ دیا وہ اس مطلب کے پانے سے نامراد رہے گا۔ ماحصل اِس تقریر کا یہ ہے کہ بلاشُبہ نفسِ انسان میں وہ متفرق کمالات موجود ہیں جو تمام عالَم میں پائے جاتے ہیں۔ اور ان پر یقین لانے کے لئے یہ ایک سیدھی راہ ہے کہ انسان حسبِ منشاء قانونِ الٰہی تزکیۂ نفس کی طرف متوجہ ہو کیونکہ تزکیۂ نفس کی حالت میں نہ صرف علم الیقین بلکہ حق الیقین کے طور پر اُن کمالاتِ مخفیہ کی سچائی کُھل جائے گی۔ پھر بعد اس کے اللہ جلّ شانہٗ ایک مثال کے طور پر ثمود کی قوم کا ذکر کر کے فرماتا ہے کہ انہوں نے بباعث اپنے جبلّی سرکشی کے اپنے وقت کے نبی کو جھٹلایا اور اُس کی تکذیب کے لئے ایک بڑا بدبخت اُن میں سے پیش قدم ہوا۔ اُس وقت کے رسول نے انہیں نصیحت کے طور پر کہا کہ ناقۃ اللہ یعنی خدا تعالیٰ کی اُونٹنی اور اس کے پانی پینے کی جگہ کا تعرض مت کرو مگر انہوں نے نہ مانا اور اُونٹنی کے پاؤں کاٹے۔ سو اِس جُرم کی شامت سے اللہ تعالیٰ نے اُن پر موت کی مار ڈالی اور انہیں خاک سے ملا دیا اور خدائے تعالیٰ نے اِس بات کی کچھ بھی پرواہ نہ کی کہ اُن کے مرنے کے بعد اُن کی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں اور بیکس عیال کا کیا حال ہوگا۔ یہ ایک نہایت لطیف مثال ہے جو خدائے تعالیٰ نے انسان کے نفس کو ناقۃ اللہ سے مشابہت دینے کے لئے اِس جگہ لکھی ہے مطلب یہ ہے کہ انسان کا نفس بھی درحقیقت اِسی غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ تا وہ ناقۃ اللہ کا کام دیوے۔ اس کی فنا فی اللہ ہونے کی حالت میں خدائے تعالیٰ اپنی پاک تجلّی کے ساتھ اُس پر سوار ہو جیسے کوئی اُونٹنی پر سوار ہوتا ہے۔ سو نفس پرست لوگوں کو جو حق سے مُنہ پھیر رہے ہیں تہدید اور اِنذار کے طور پر فرمایا کہ تم لوگ بھی قومِ ثمود کی طرح ناقۃ اللہ کا سقیا یعنی اُس کے پانی پینے کی جگہ جو یادِ الٰہی اور معارفِ الٰہی کا چشمہ ہے جس پر اس ناقہ کی زندگی موقوف ہے اس پر بند کر رہے ہو اور نہ صرف بند بلکہ اس کے پَیر کاٹنے کی فکر میں ہو تا وہ خدا تعالیٰ کی راہوں پر چلنے سے بالکل رہ جائے۔ سو اگر تم اپنی خیر مانگتے ہو تو وہ زندگی کا پانی اُس پر بند مت کرو اور اپنی بے جا خواہشوں کے تیر و تبر سے اُس کے پَیر مت کاٹو۔ اگر تم ایسا کرو گے اور وہ ناقہ جو خدا تعالیٰ کی سواری کے لئے تم کو دی گئی ہے مجروح ہو کر مَر جائے گی تو تم بالکل نکمّے اور خشک لکڑی کی طرح متصوّر ہو کر کاٹ دئے جاؤ گے اور پھر آگ میں ڈالے جاؤ گے اور تمہارے مَرنے کے بعد خدا تعالیٰ تمہارے پسماندوں پر ہرگز رحم نہیں کرے گا بلکہ تمہاری معصیت اور بدکاری کا وبال اُن کے بھی آگے آئے گا اور نہ صرف تم اپنے شامتِ اعمال سے مرو گے بلکہ اپنے عیال و اطفال کو بھی اُسی تباہی میں ڈالو گے۔

اِن آیاتِ بیّنات سے صاف صاف ثابت ہو گیا کہ خداوندِ کریم نے انسان کو سب مخلوقات سے بہتر اور

افضل بنایا ہے اور ملائک اور کواکب اور عناصر وغیرہ جو کچھ انسان میں اور خدا تعالیٰ میں بطور وسائط کے دخیل ہو کر کام کر رہے ہیں وہ اُن کا درمیانی واسطہ ہونا اُن کی افضلیت پر دلالت نہیں کرتا اور وہ اپنے درمیانی ہونے کی وجہ سے انسان کو کوئی عزت نہیں بخشتے بلکہ خود ان کو عزت حاصل ہوتی ہے کہ وہ ایسی شریف مخلوق کی خدمت میں لگائے گئے ہیں سو درحقیقت وہ تمام خادم ہیں نہ مخدوم۔ (توضیح مرام صفحہ ۵۱ تا ۶۷)

سُورج بحکمتِ کاملہ انہی سات سَو تیں تعیّنات میں اپنے تئیں متشکّل کر کے دُنیا پر مختلف قسموں کی تاثیرات ڈالتا ہے اور ہر ایک متشکّل کی وجہ سے ایک خاص نام اُس کو حاصل ہے اور یک شنبہ دو شنبہ سہ شنبہ وغیرہ درحقیقت باعتبار خاص خاص تعیّنات ولوازم وتاثیرات کے سُورج کے ہی نام ہیں۔ جب یہ لوازمِ خاصّہ بولنے کے وقت ذہن میں ملحوظ نہ رکھے جائیں اور صرف مجرّد اور اطلاقی حالت میں نام لیا جائے تو اس وقت سُورج کہیں گے لیکن جب اسی سُورج کے خاص خاص لوازم اور تاثیرات اور مقامات ذہن میں ملحوظ رکھ کر بولیں گے تو اس کو کبھی دن کہیں گے اور کبھی رات۔ کبھی اس کا نام اتوار رکھیں گے اور کبھی پیرا اور کبھی ساون اور کبھی بھادوں کبھی اسوج کبھی کاتک۔ غرض یہ سب سُورج کے ہی نام ہیں اور نفسِ انسان بھی باعتبار مختلف تعیّنات اور مختلف اَوقات ومقامات وحالات مختلف ناموں سے موسُوم ہو جاتا ہے۔ کبھی نفس زکیّہ کہلاتا ہے اور کبھی امّارہ کبھی لوّامہ اور کبھی مطمئنّہ۔ غرض اس کے بھی اتنے ہی نام ہیں جس قدر سُورج کے مگر بخوف طُول اِسی قدر بیان کرنا کافی سمجھا گیا۔ (توضیح مرام صفحہ ۷۷، ۷۸، حاشیہ)

قَسم ہے سُورج کی اور اس کی روشنی کی۔ اور قَسم ہے چاند کی جب پَیروی کرے سُورج کی یعنی سُورج سے نور حاصل کرے اور پھر سُورج کی طرح اِس نور کو دوسروں تک پہنچاوے۔ اور قَسم ہے دن کی جب سُورج کی صفائی دکھاوے اور راہوں کو نمایاں کرے۔ اور قَسم ہے رات کی جب اندھیرا کرے اور اپنے پَردۂ تاریکی میں سب کو لے لے۔ اور قَسم ہے آسمان کی اور اس علّتِ غائی کی جو آسمان کی اس بناء کا موجب ہوئی۔ اور قَسم ہے زمین کی اور اس علّتِ غائی کی جو زمین کے اس قسم کے فرش کا موجب ہوئی۔ اور قَسم ہے نفس کی اور نفس کے اس کمال کی جس نے ان سب چیزوں کے ساتھ اس کو برابر کر دیا۔ یعنی وہ کمالات جو متفرق طور پر ان چیزوں میں پائے جاتے ہیں۔ کامل اِنسان کا نفس ان سب کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے اور جیسے یہ تمام چیزیں علیحدہ علیحدہ نوعِ انسان کی خدمت کر رہی ہیں کامل انسان ان تمام خدمات کو اکیلا بجا لاتا ہے جیسا کہ مَیں ابھی کہہ چکا ہوں۔ اور پھر فرماتا ہے کہ وہ شخص نجات پا گیا اور موت سے بچ گیا جس نے اِس طرح پر نفس کو پاک کیا یعنی سُورج اور چاند اور زمین وغیرہ کی طرح خدا میں محو ہو کر خلق اللہ کا خادم بنا۔

یاد رہے کہ حیات سے مراد حیاتِ جاودانی ہے جو آئندہ کامل انسان کو حاصل ہوگی۔ یہ اِس بات کی طرف

اشارہ ہے کہ عملی شریعت کا پھل آئندہ زندگی میں حیاتِ جاودانی ہے جو خدا کے دیدار کی غذا سے ہمیشہ قائم رہیگی اور پھر فرمایا کہ وہ شخص ہلاک ہوگیا اور زندگی سے ناامید ہوگیا جس نے اپنے نفس کو خاک میں ملا دیا اور جن کمالات کی اس کو استعدادیں دی گئی تھیں اُن کمالات کو حاصل نہ کیا اور گندی زندگی بسر کرکے واپس آگیا۔ اور پھر مثال کے طور پر فرمایا کہ ثمود کا قصہ اُس بدبخت کے قصہ سے مشابہ ہے۔ انہوں نے اُونٹنی کو زخمی کیا جو خدا کی اُونٹنی کہلاتی تھی اور اپنے چشمہ سے پانی پینے سے روکا۔ سو اس شخص نے درحقیقت خدا کی اُونٹنی کو زخمی کیا اور اس کو اس چشمہ سے محروم رکھا۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کا نفس خدا کی اُونٹنی ہے جس پر وہ سوار ہوتا ہے یعنی انسان کا دِل الٰہی تجلیات کی جگہ ہے اور اس اُونٹنی کا پانی خدا کی محبت اور معرفت ہے جس سے وہ جیتی ہے اور پھر فرمایا کہ ثمود نے جب اُونٹنی کو زخمی کیا اور اُس کو اُس کے پانی سے روکا تو اُن پر عذاب نازل ہؤا اور خدا تعالیٰ نے اِس بات کی کچھ بھی پرواہ نہ کی کہ اُن کے مرنے کے بعد اُن کے بچوں اور بیواؤں کا کیا حال ہوگا۔ سو ایسا ہی جو شخص اس اُونٹنی یعنی نفس کو زخمی کرتا ہے اور اس کو کمال تک پہنچانا نہیں چاہتا اور پانی پینے سے روکتا ہے وہ بھی ہلاک ہوگا۔

اِس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ خدا کا سُورج اور چاند وغیرہ کی قسم کھانا ایک نہایت دقیق حکمت پر مشتمل ہے جس سے ہمارے اکثر مخالف ناواقف ہونے کی وجہ سے اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ خدا کو قسموں کی کیا ضرورت پڑی اور اس نے مخلوق کی کیوں قسمیں کھائیں لیکن چونکہ اُن کی سمجھ زمینی ہے نہ آسمانی اِس لئے وہ معارفِ حقّہ کو سمجھ نہیں سکتے۔ سو واضح ہو کہ قسم کھانے سے اصل مدّعا یہ ہوتا ہے کہ قسم کھانے والا اپنے دعویٰ کے لئے ایک گواہی پیش کرنا چاہتا ہے کیونکہ جس دعویٰ پر اَور کوئی گواہ نہیں ہوتا وہ بجائے گواہ کے خدا تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے اِس لئے کہ خدا عالم الغیب ہے اور ہر ایک مقدمہ میں وہ پہلا گواہ ہے گویا وہ خدا کی گواہی اس طرح پیش کرتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ اس قسم کے بعد خاموش رہا اور اس پر عذاب نازل نہ کیا تو گویا اس نے اس شخص کے بیان پر گواہوں کی طرح مُہر لگا دی۔ اِس لئے مخلوق کو نہیں چاہیئے کہ دوسری مخلوق کی قسم کھاوے کیونکہ مخلوق عالم الغیب نہیں اور نہ جھوٹی قسم پر سزا دینے پر قادر ہے۔ مگر خدا کی قسم اِن آیات میں اِن معنوں میں نہیں جیسا کہ مخلوق کی قسم میں مراد لی جاتی ہے بلکہ اس میں یہ سُنّت اللہ ہے کہ خدا کے دو قسم کے کام ہیں ایک بدیہی جو سب کی سمجھ میں آسکتے ہیں اور ان میں کسی کو اختلاف نہیں اور دوسرے وہ کام جو نظری ہیں جن میں دُنیا غلطیاں کھاتی ہے اور باہم اختلاف رکھتی ہے۔ سو خدا تعالیٰ نے چاہا کہ بدیہی کاموں کی شہادت سے نظری کاموں کو لوگوں کی نظر میں ثابت کرے۔

پس یہ تو ظاہر ہے کہ سُورج اور چاند اور دن اور رات اور آسمان اور زمین میں وہ خواص درحقیقت پائے جاتے ہیں جن کو ہم ذکر کر چکے ہیں۔ مگر جو اِس قسم کے خواص انسان کے نفسِ ناطقہ میں موجود ہیں اُن سے ہر ایک شخص آگاہ نہیں۔ سو خدا نے اپنے بدیہی کاموں کو نظری کاموں کے کھولنے کے لئے بطور گواہ کے پیش کیا ہے۔

گویا وہ فرماتا ہے کہ اگر تم ان خواص سے شک میں ہو جو نفس ناطقۂ انسانی میں پائے جاتے ہیں تو چاند اور سُورج وغیرہ میں غور کرو کہ ان میں بدیہی طور پر یہ خواص موجود ہیں اور تم جانتے ہو کہ انسان ایک عالمِ صغیر ہے جس کے نفس میں تمام عالم کا نقشہ اجمالی طور پر مرکوز ہے۔ پھر جب یہ ثابت ہے کہ عالمِ کبیر کے بڑے بڑے اجرام یہ خواص اپنے اندر رکھتے ہیں اور اسی طرح پر مخلوقات کو فیض پہنچا رہے ہیں تو انسان جو ان سب سے بڑا کہلاتا ہے اور بڑے درجہ کا پیدا کیا گیا ہے وہ کیونکر ان خواص سے خالی اور بے نصیب ہوگا۔ نہیں۔ بلکہ اس میں بھی سُورج کی طرح ایک علمی اور عقلی روشنی ہے جس کے ذریعہ سے وہ تمام دُنیا کو منوّر کرسکتا ہے اور چاند کی طرح وہ حضرتِ اعلیٰ سے کشف اور الہام اور وحی کا نور پاتا ہے اور دوسروں تک جنہوں نے انسانی کمال ابھی تک حاصل نہیں کیا اس نور کو پہنچاتا ہے۔ پھر کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ نبوّت باطل ہے اور تمام رسالتیں اور شریعتیں اور کتابیں انسان کی مکّاری اور خود غرضی ہے۔ یہ بھی دیکھتے ہو کہ کیونکر دن کے روشن ہونے سے تمام راہیں روشن ہو جاتی ہیں تمام نشیب و فراز نظر آ جاتے ہیں۔ سو کامل انسان روحانی روشنی کا دن ہے اس کے چڑھنے سے ہر ایک راہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ وہ سچّی راہ کو دکھلا دیتا ہے کہ کہاں اور کدھر ہے کیونکہ راستی اور سچائی کا وہی روزِ روشن ہے۔ ایسا ہی یہ بھی مشاہدہ کر رہے ہیں کہ رات کیسی تھکوں ماندوں کو جگہ دیتی ہے۔ تمام دن کے شکستہ کوفتہ مزدور رات کے کنارِ عاطفت میں بخوشی سوتے ہیں اور محنتوں سے آرام پاتے ہیں اور رات ہر ایک کے لئے پردہ پوش بھی ہے۔ ایسا ہی خدا کے کامل بندے دُنیا کو آرام دینے کے لئے آتے ہیں۔ خدا سے وحی اور الہام پانے والے تمام عقلمندوں کو جانکاہی سے آرام دیتے ہیں۔ ان کی طفیل سے بڑے بڑے معارف آسانی کے ساتھ حل ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی خدا کی وحی انسانی عقل کی پردہ پوشی کرتی ہے جیسا کہ رات پردہ پوشی کرتی ہے۔ اس کی ناپاک خطاؤں کو دُنیا پر ظاہر ہونے نہیں دیتی کیونکہ عقلمند وحی کی روشنی کو پاکر اندر ہی اندر اپنی غلطیوں کی اِصلاح کر لیتے ہیں اور خدا کے پاک الہام کی برکت سے اپنے تئیں پردہ دری سے بچا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افلاطون کی طرح اسلام کے کسی فلاسفر نے کسی بُت پر مُرغ کی قربانی نہ چڑھائی۔ چونکہ افلاطون الہام کی روشنی سے بے نصیب تھا اِس لئے دھوکا کھا گیا اور ایسا فلاسفر کہلا کر یہ مکروہ اور احمقانہ حرکت اس سے صادر ہوئی مگر اسلام کے حکماء کو ایسے ایسے ناپاک اور احمقانہ حرکتوں سے ہمارے سید و مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیروی نے بچا لیا۔ اَب دیکھو کیسا ثابت ہوا کہ الہام عقلمندوں کا رات کی طرح پردہ پوش ہے۔

یہ بھی آپ لوگ جانتے ہیں کہ خدا کے کامل بندے آسمان کی طرح ہر ایک درماندہ کو اپنے سایہ میں لے لیتے ہیں خاص کر اس ذاتِ پاک کے انبیاء اور الہام پانے والے عام طور پر آسمان کی طرح فیض کی بارشیں برساتے ہیں ایسا ہی زمین کی خاصیت بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اُن کے نفسِ نفیس سے طرح طرح کے علومِ عالیہ کے

درخت نکلتے ہیں جن کے سایہ اور پھل اور پھول سے لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ سو یہ کُھلا کُھلا قانونِ قدرت جو ہماری نظر کے سامنے ہے اس چھپے ہوئے قانون کا ایک گواہ ہے جس کی گواہی کو دو قسموں کے پیرایہ میں خدا تعالیٰ نے اِن آیات میں پیش کیا ہے۔ سو دیکھو کہ یہ کس قدر پُرحکمت کلام ہے جو قرآن شریف میں پایا جاتا ہے۔ یہ اُس کے مُنہ سے نکلا ہے جو ایک اُمّی اور بیابان کا رہنے والا تھا۔ اگر یہ خدا کا کلام نہ ہوتا تو اِس طرح عام عقلیں اور وہ تمام لوگ جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں اس کے اس دقیق نکتۂ معرفت سے عاجز آکر اعتراض کی صورت میں اس کو نہ دیکھتے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ انسان جب ایک بات کو کسی پہلو سے بھی اپنی مختصر عقل کے ساتھ نہیں سمجھ سکتا تب ایک حکمت کی بات کو جائے اِعتراض ٹھہرا لیتا ہے اور اس کا اِعتراض اِس بات کا گواہ ہو جاتا ہے کہ وہ دقیقۂ حکمت عام عقلوں سے برتر و اعلیٰ تھا تب ہی تو عقلمندوں نے عقلمند کہلا کر پھر بھی اس پر اعتراض کر دیا مگر اَب جو یہ راز کُھل گیا تو اب اس کے بعد کوئی عقلمند اس پر اِعتراض نہیں کرے گا بلکہ اس سے لذّت اُٹھائے گا۔ (اِسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۱۴ تا ۱۱۶)

چونکہ خدا تعالیٰ نے اِبتداء سے یہی چاہا کہ اس کی مخلوقات یعنی نباتات، جمادات، حیوانات یہاں تک کہ اجرامِ علوی میں بھی تفاوت مراتب پایا جائے اور بعض مفیض اور بعض مستفیض ہوں اِس لئے اُس نے نوعِ انسان میں بھی یہی قانون رکھا اور اِس لحاظ سے دو طبقہ کے اِنسان پیدا کئے۔ اوّل وہ جو اعلیٰ استعداد کے لوگ ہیں جن کو آفتاب کی طرح بِلا واسطہ ذاتی روشنی عطا کی گئی ہے۔ دوسرے وہ جو درجہ دوم کے آدمی ہیں جو اس آفتاب کے واسطہ سے نور حاصل کرتے ہیں اور خود بخود حاصل نہیں کر سکتے۔ اِن دونوں طبقوں کے لئے آفتاب اور ماہتاب نہایت عمدہ نمونے ہیں جس کی طرف قرآن شریف میں اِن لفظوں میں اشارہ فرمایا گیا ہے کہ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا۔ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا جیسا کہ اگر آفتاب نہ ہو تو ماہتاب کا وجود بھی ناممکن ہے اسی طرح اگر انبیاء علیہم السّلام نہ ہوں جو نفوسِ کاملہ ہیں تو اَولیاء کا وجود بھی حیّزِ اِمکان سے خارج ہے اور یہ قانونِ قدرت ہے جو آنکھوں کے سامنے آ رہا ہے۔ چونکہ خدا واحد ہے اِس لئے اُس نے اپنے کاموں میں بھی وحدت سے محبت کی اور کیا جسمانی اور کیا رُوحانی طور پر ایک وجود سے ہزاروں کو وجود بخشتا رہا۔ سو انبیاء جو افرادِ کاملہ ہیں وہ اَولیاء اور صلحاء کے رُوحانی باپ ٹھہرے جیسا کہ دوسرے لوگ اُن کے جسمانی باپ ہوتے ہیں اور اسی انتظام سے خدا تعالیٰ نے اپنے تئیں مخلوق پر ظاہر کیا تا اس کے کام وحدت سے باہر نہ جائیں اور انبیاء کو آپ ہدایت دے کر اپنی معرفت کا آپ موجب ہؤا اور کسی نے اس پر یہ احسان نہیں کیا کہ اپنی عقل اور فہم سے اس کا پتہ لگا کر اُس کو شہرت دی ہو بلکہ اُس کا خود یہ اِحسان ہے کہ اُس نے نبیوں کو بھیج کر آپ سوئی خلقت کو جگایا اور ہر یک نے اس وراء الورا اور الطف اور ادق ذات کا نام صرف نبیوں کے پاک الہام سے سُنا۔ اگر خدا تعالیٰ کے پاک نبی

دُنیا میں نہ آئے ہوتے تو فلاسفر اور جاہل جہل میں برابر ہوتے۔ دانا کو دانائی میں ترقی کرنے کا موقع صرف نبیوں کی پاک تعلیم نے دیا۔ (ستّ بچن صفحہ ۶۵، ۶۶)

قسم ہے سُورج کی اور اُس کی روشنی کی اور قسم ہے چاند کی جب سُورج کی پیروی کرے یعنی چاند بغیر پیروی کے کچھ بھی چیز نہیں اور اس کا نور سُورج کے نور سے مستفاض ہے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان گو کیسا ہی اپنے اندر استعداد رکھتا ہے مگر جب تک وہ کامل طور پر خدا کی اطاعت نہ کرے اس کو کوئی نور نہیں ملتا۔ مگر افسوس کہ وید کو یہ بھی خبر نہیں کہ چاند اپنی روشنی سُورج سے لیتا ہے اور اِسی وجہ سے اس نے برابر طور پر دونوں سُورج اور چاند کو معبود ٹھہرایا ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۷۷)

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا۔

جان کی قسم ہے اور اس ذات کی جس نے جان کو اپنی عبادت کے لئے ٹھیک ٹھاک بنایا۔

(ستّ بچن صفحہ ۹۹)

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔ یعنی ہر ایک انسان کو ایک قسم کا خدا نے الہام عطا کر رکھا ہے جس کو نورِ قلب کہتے ہیں اور وہ یہ کہ نیک اور بد کام میں فرق کرلینا۔ جیسے کوئی چور یا خونی چوری یا خون کرتا ہے تو خدا اس کے دِل میں اُسی وقت ڈال دیتا ہے کہ تُو نے یہ کام بُرا کیا اچھا نہیں کیا لیکن وہ ایسے القاء کی کچھ پرواہ نہیں رکھتا کیونکہ اُس کا نورِ قلب نہایت ضعیف ہوتا ہے اور عقل بھی ضعیف اور قوتِ بہیمیہ غالب اور نفس طالب۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۱۷۳ حاشیہ)

قرآن کریم میں اِس کیفیت کے بیان کرنے کے لئے جو مکالمہ الٰہی سے تعبیر کی جاتی ہے الہام کا لفظ اختیار نہیں کیا گیا محض لغوی طور پر ایک جگہ الہام کا لفظ آیا ہے جیساکہ وہ فرماتا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔ سو اس کو مَا نَحْنُ فِيْهِ سے کچھ تعلق نہیں۔ اس کے تو صرف اسی قدر معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ بوجہ علّت العلل ہونے کے بدوں کو اُن کے مناسبِ حال اور نیکوں کو اُن کے مناسبِ حال اُن کے جذباتِ نفسانی یا متقیانہ جوشوں کے موافق اپنے قانونِ قدرت کے حکم سے خیالات و تدابیر و حیل مطلوبہ کے ساتھ تائید دیتا ہے یعنی نئے نئے خیالات و حیل مطلوبہ ان کو سُوجھا دیتا ہے یا یہ کہ اُن کے جوشوں اور جذبوں کو بڑھاتا ہے اور یا یہ کہ اُن کے تخمِ مخفی کو ظہور میں لاتا ہے۔ مثلاً ایک چور اِس خیال میں لگا رہتا ہے کہ کوئی عمدہ طریقہ نقب زنی کا اس کو معلوم ہو جائے تو اُس کو سوجھایا جاتا ہے یا ایک متقی چاہتا ہے کہ وجہ حلال کی قوت کے لئے کوئی سبیل مجھے حاصل ہو تو اِس بارے میں اس کو بھی کوئی طریق بتلایا جاتا ہے۔ سو عام طور پر اس کا نام الہام ہے جو کسی نیک بخت یا بدبخت سے خاص نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی اور جمیع افرادِ بشر اس علّت العلل سے مناسبِ حال اپنے اس الہام سے مستفید ہو

رہے ہیں۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۹۱۰، ۹۱۱)

ایک یہ سوال ہے کہ جس حالت میں رُوح القدس انسان کو بدیوں سے روکنے کے لئے مقرر ہے تو پھر اُس سے گناہ کیوں سرزد ہوتا ہے اور انسان کفر اور فسق اور فجور میں کیوں مُبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ جواب ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کے لئے ابتلاء کے طور پر دو رُوحانی داعی مقرر کر رکھے ہیں ایک داعی خیر جس کا نام رُوح القدس ہے اور ایک داعی شر جس کا نام ابلیس ہے اور شیطان ہے۔ یہ دونوں داعی صرف خیر یا شر کی طرف بُلاتے رہتے ہیں مگر کسی بات پر جبر نہیں کرتے جیسا کہ اس آیتِ کریمہ میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا یعنی خدا بدی کا بھی الہام کرتا ہے اور نیکی کا بھی۔ بدی کے الہام کا ذریعہ شیطان ہے جو شرارتوں کے خیالات دلوں میں ڈالتا ہے اور نیکی کے الہام کا ذریعہ رُوح القدس ہے جو پاک خیالات دل میں ڈالتا ہے۔ اور چونکہ خدا تعالیٰ علت العلل ہے اس لئے یہ دونوں الہام خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر لئے ہیں کیونکہ اسی کی طرف سے یہ سارا انتظام ہے ورنہ شیطان کیا حقیقت رکھتا ہے جو کسی کے دل میں وسوسہ ڈالے، اور رُوح القدس کیا چیز جو کسی کو تقویٰ کی راہوں کی ہدایت کرے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۸۰، ۸۱ حاشیہ)

بلاشُبہ وہ تمام باتیں جن سے انسانوں کو نفع پہنچتا ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے دل میں ڈالی جاتی ہیں جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ بھی درحقیقت اسی کی طرف اشارہ فرما کر کہتا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا یعنی بُری باتیں اور نیک باتیں جو انسانوں کے دلوں میں پڑتی ہیں وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوتی ہیں۔ اچھا آدمی اپنی اچھی طبیعت کی وجہ سے اِس لائق ہوتا ہے کہ اچھی باتیں اس کے دِل میں پڑیں اور بُرا آدمی اپنی بُری طبیعت کی وجہ سے اِس لائق ٹھہرتا ہے کہ بُرے خیالات اور بداندیشی کی تجویزیں اُس کے دل میں پَیدا ہوتی رہیں اور درحقیقت نیک انسان اِس قسم کے الہامات کے حاصل کرنے کے لئے فطرتاً ایک نیک ملکہ اپنے اندر رکھتا ہے اور بُرا انسان فطرتاً ایک بُرا ملکہ رکھتا ہے چنانچہ اس ملکہ فطرتی کی وجہ سے بہت سے لوگ اچھی اور بُری تالیفیں اور پاک اور ناپاک ملفوظات اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ (برکات الدعا صفحہ حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۳ معیار ہفتم)

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔

وہ شخص نجات پا گیا جس نے اپنی جان کو غیر کے خیال سے پاک کیا۔ اِس آیت میں یہ نہیں کہا کہ جس نے اُس محبوب کو اپنے اندر آباد کیا.... حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تو اندر میں خود آباد ہے صرف انسان کی طرف سے بوجہ التفات اِلی الغیر دُوری ہے۔ پس جس وقت غیر کی طرف سے اِلتفات کو ہٹا لیا تو خود اپنے اندر نورِ الٰہی کو مشاہدہ کر لے گا۔ خدا دُور نہیں ہے کہ کوئی اس طرف جاوے یا وہ اِس طرف آوے بلکہ انسان اپنے حجاب سے آپ

ہی اس سے دُور ہے پس خدا فرماتا ہے کہ جس نے آئینۂ دل کو صاف کر لیا وہ دیکھ لے گا کہ خدا اس کے پاس ہی ہے۔ (ست بچن صفحہ ۹۹)

مذہب اس زندگی کے حاصل کرنے کے لئے ہے جو خدا میں ہے اور وہ زندگی نہ کسی کو حاصل ہوئی اور نہ آئندہ ہوگی بجز اس کے کہ خدائی صفات انسان کے اندر داخل ہو جائیں۔ خدا کے لئے سب پر رحم کرو تا آسمان سے تم پر رحم ہو۔ آؤ میں تمہیں ایک ایسی راہ سکھاتا ہوں جس سے تمہارا نور تمام نوروں پر غالب رہے اور وہ یہ ہے کہ تم تمام سفلی کینوں اور حسدوں کو چھوڑ دو اور ہمدرد نوعِ انسان ہو جاؤ اور خدا میں کھوئے جاؤ اور اسکے ساتھ اعلیٰ درجہ کی صفائی حاصل کرو کہ یہی وہ طریق ہے جس سے کرامتیں صادر ہوتی ہیں اور دعائیں قبول ہوتی ہیں اور فرشتے مدد کے لئے اُترتے ہیں مگر یہ ایک دن کا کام نہیں۔ ترقی کرو ترقی کرو۔ اُس دھوبی سے سبق سیکھو جو کپڑوں کو اوّل بھٹی میں جوش دیتا ہے اور دیئے جاتا ہے یہاں تک کہ آخر آگ کی تاثیریں تمام میل اور چرک کو کپڑوں سے علیحدہ کر دیتی ہیں تب صبح اُٹھتا ہے اور پانی پر پہنچتا ہے اور پانی میں کپڑوں کو تر کرتا ہے اور بار بار پتھروں پر مارتا ہے تب وہ میل جو کپڑوں کے اندر تھی اور اُن کا جزو بن گئی تھی کچھ آگ سے صدمات اُٹھا کر اور کچھ پانی میں دھوبی کے بازو سے مار کھا کر یک دفعہ جُدا ہونی شروع ہو جاتی ہے یہاں تک کہ کپڑے ایسے سفید ہو جاتے ہیں جیسے ابتداء میں تھے۔ یہی انسانی نفس کے سفید ہونے کی تدبیر ہے اور تمہاری ساری نجات اسی سفیدی پر موقوف ہے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا یعنی وہ نفس نجات پا گیا جو طرح طرح کے میلوں اور چرکوں سے پاک کیا گیا۔

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد صفحہ ۱۴، ۱۵)

عذاب سے وہ لوگ نجات پائیں گے جنہوں نے دلوں کو پاک کیا اور وہ لوگ سزا پائیں گے جنہوں نے اپنے نفسوں کو گندہ کیا۔ (تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۱۲۰)

قرآن شریف میں آیا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا اُس نے نجات پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا۔ تزکیۂ نفس کے واسطے صحبتِ صالحین اور نیکوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنا بہت مفید ہے۔ جھوٹ وغیرہ اخلاقِ رذیلہ دُور کرنے چاہئیں اور جو راہ پر چل رہا ہے اُس سے راستہ پُوچھنا چاہیئے۔ اپنی غلطیوں کو ساتھ ساتھ درست کرنا چاہیئے جیسا کہ غلطیاں نکالنے کے بغیر املا درست نہیں ہوتا ویسا ہی غلطیاں نکالنے کے بغیر اخلاق بھی درست نہیں ہوتے آدمی ایسا جانور ہے کہ اُس کا تزکیہ ساتھ ساتھ ہوتا رہے تو سیدھی راہ پر چلتا ہے ورنہ بہک جاتا ہے۔

(بدر جلد ۱۰ نمبر ۴۴، ۴۵ مورخہ ۵ اکتوبر ۱۹۱۱ء صفحہ ۹)

دُنیا میں انسان کو جو بہشت حاصل ہوتا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا پر عمل کرنے سے ملتا ہے جب انسان

عبادت کا اصل مفہوم اور مغز حاصل کر لیتا ہے تو خدا تعالیٰ کے اِنعام و اکرام کا پاک سلسلہ جاری ہو جاتا ہے اور جو نعمتیں آئندہ بعد مُردن ظاہری، مرئی اور محسوس طور پر ملیں گی وہ اَب رُوحانی طور پر پاتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

کپڑا جب تک سارا نہ دھویا جاوے وہ پاک نہیں ہو سکتا۔ اِسی طرح پر انسان کے سارے جوارح جو اِس قابل ہیں کہ وہ دھوئے جائیں کسی ایک کے دھونے سے کچھ نہیں ہوتا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۴۰ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۱ء صفحہ اوّل)

یاد رکھو کہ اصل صفائی وہی ہے جو فرمایا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ ہر شخص اپنا فرض سمجھ لے کہ وہ اپنی حالت میں تبدیلی کرے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

جنتر منتر بھی سلب امراض ہی ہے مگر بڑا خبیث کام ہے اِس لئے اِسلام میں اِس کی بجائے خدا پر توقع رکھا گیا ہے اور صرف رُوحانی امراض کے لئے سلب رکھا گیا ہے جیسے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا حضرت مسیح تو رُوحانی امراض کا سَلب نہ کر سکے اِس لئے گالیاں دیتے چلے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سَلب امراض کا نمونہ صحابہؓ ہیں۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۵)

سَلب امراض سے جن لوگوں کو مسیح نے عیسائیوں کے قول کے موافق زندہ کیا وہ آخر مَر گئے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا کے نیچے لا کر جن کو زندہ کیا وہ ابدالآباد تک زندہ رہے صحابہؓ کا مقابلہ حواریوں سے ہو ہی نہیں سکتا۔ ساری انجیل میں ایک بھی ایسا فقرہ نہیں جو صحابہؓ کی اس حالت کا جو قرآن نے بیان کی ہے کہ خدا کی راہ میں انہوں نے جان و مال سے دریغ نہ کیا، مقابلہ کر سکے۔ انہوں نے خدا اور رسول کی راہ میں جو صدق دکھلایا وہ لانظیر ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

اصل تقوٰی جس سے انسان دھویا جاتا ہے اور صاف ہوتا ہے اور جس کے لئے انبیاء آتے ہیں وہ دُنیا سے اُٹھ گیا ہے۔ کوئی ہوگا جو قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا کا مصداق ہوگا۔ پاکیزگی اور طہارت عمدہ شئے ہے۔ انسان پاک اور مطہر ہو تو فرشتے اس سے مصافحہ کرتے ہیں لوگوں میں اس کی قدر نہیں ہے ورنہ ان کی لذات کی ہر ایک شئے حلال ذرائع سے ان کو ملے۔ چور چوری کرتا ہے کہ مال ملے لیکن اگر وہ صبر کرے تو خدا تعالیٰ اُسے اَور راہ سے مالدار کر دے۔ اِسی طرح زانی زنا کرتا ہے اگر وہ صبر کرے تو خدا تعالیٰ اس کی خواہش کو اَور راہ سے پُوری کر دے جس میں اُس کی رضا حاصل ہو۔ حدیث میں ہے کہ کوئی چور چوری نہیں کرتا مگر اس حالت میں کہ وہ مومن نہیں ہوتا اور کوئی زانی زنا نہیں کرتا مگر اس حالت میں کہ وہ مومن نہیں ہوتا۔ جیسے بکری کے سر پر شیر کھڑا ہو تو وہ گھاس بھی نہیں کھا سکتی۔ تو بکری جتنا ایمان بھی لوگوں کا نہیں ہے۔ اصل جڑ اور مقصود تقوٰی ہے جسے وہ عطا

ہو تو سب کچھ پاسکتا ہے بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ انسان صغائر اور کبائر سے بچ سکے۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۷ مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۱)

مجاہدات پر اللہ تعالیٰ کی راہیں کھلتی ہیں اور نفس کا تزکیہ ہوتا ہے جیسے فرمایا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۶ مورخہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

اِسلام کسی سہارے پر رکھنا نہیں چاہتا کیونکہ سہارے پر رکھنے سے ابطالِ اعمال لازم آجاتا ہے لیکن جب انسان سہارے کے بغیر زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے آپ کو ذمّہ دار ٹھہراتا ہے اس وقت اس کو اعمال کی ضرورت پڑتی ہے اور کچھ کرنا پڑتا ہے اِسی لئے قرآن شریف نے فرمایا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا فلاح وہی پاتا ہے جو اپنا تزکیہ کرتا ہے خود اگر انسان ہاتھ پاؤں نہ ہلائے تو بات نہیں بنتی۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بڑے سیدھے سادے تھے جیسے کہ ایک برتن قلعی کرا کر صاف اور ستھرا ہو جاتا ہے ایسے ہی ان لوگوں کے دِل تھے جو کلامِ الٰہی کے انوار سے روشن اور کدورتِ انسانی کے زنگ سے بالکل صاف تھے گویا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا کے سچے مصداق تھے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۴ مورخہ ۳۰ر جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ کو دیکھا جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بڑے سیدھے سادے ہوتے تھے۔ جب ایک برتن کو مانج کر صاف کر دیا جاتا ہے پھر اس پر قلعی ہوتی ہے اور پھر نفیس اور مصفّا کھانا اس میں ڈالا جاتا ہے۔ یہی حالت ان کی تھی۔ اگر انسان اِسی طرح صاف ہو اور اپنے آپ کو قلعی دار برتن کی طرح منوّر کرے تو خدا تعالیٰ کے انعامات کا کھانا اس میں ڈال دیا جاوے لیکن اب کس قدر انسان ہیں جو ایسے ہیں اور قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا کے مصداق ہیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۳ مورخہ ۲۶ر جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۷۷)

خدا یابی اور خدا شناسی کے لئے ضروری امر یہی ہے کہ انسان دعاؤں میں لگا رہے۔ زنانہ حالت اور بُزدلی سے کچھ نہیں ہوتا اِس راہ میں مردانہ قدم اُٹھانا چاہیئے۔ ہر قسم کی تکلیفوں کے برداشت کرنے کو تیار رہنا چاہیئے خدا تعالیٰ کو مقدّم کرلے اور گھبرائے نہیں۔ پھر امید کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل دستگیری کرے گا اور اطمینان عطا فرمائے گا۔ ان باتوں کے لئے ضرورت اِس امر کی ہے کہ انسان تزکیۂ نفس کرے۔ جیسا کہ فرمایا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

ایک مسلمان کا کشف جس قدر صاف ہوگا اس قدر غیر مسلم کا ہرگز صاف نہ ہوگا کیونکہ خدا تعالیٰ ایک مسلم اور غیر مسلم میں تمیز رکھتا ہے اور فرماتا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (البدر جلد ۱ نمبر ۸ مورخہ ۱۳ر مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

فلاح نہیں ہوتی جب تک نفس کو پاک نہ کرے اور نفس تب ہی پاک ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کے احکام کی عزّت اور اَدب کرے اور اُن راہوں سے بچے جو دوسرے کے آزار اور دُکھ کا موجب ہوتی ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۳ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

وہ رُوحانی کمالات جو اسلام سکھاتا ہے اُن کے لئے ضروری ہے کہ اعمال میں پاکیزگی اور صدق اور وفاداری ہو بغیر اس کے وہ باتیں حاصل ہی نہیں ہوسکتی ہیں یہی وجہ ہے کہ سلب امراض والے مسیح کے اچھے کئے ہوئے مَر گئے لیکن قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىهَا کی تعلیم دینے والے کے زندہ کئے ہوئے آج تک بھی زندہ ہیں اور ان پر کبھی فنا آہی نہیں سکتی۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۹ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

یہ تو سچ ہے کہ دین سہل ہے مگر ہر نعمت مشقت کو چاہتی ہے۔ بایں اسلام نے تو ایسی مشقت بھی نہیں رکھی۔ ہندوؤں میں دیکھو کہ ان کے جوگیوں اور سنیاسیوں کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ کہیں ان کی کمریں ماری جاتی ہیں۔ کوئی ناخن بڑھاتا ہے۔ ایسا ہی عیسائیوں میں رہبانیت تھی۔ اسلام نے اِن باتوں کو نہیں رکھا بلکہ اس نے یہ تعلیم دی قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىهَا یعنی نجات پا گیا وہ شخص جس نے تزکیۂ نفس کیا یعنی جس نے ہر قسم کی بدعت، فسق و فجور، نفسانی جذبات سے خدا تعالیٰ کے لئے الگ کر لیا اور ہر قسم کی نفسانی لذّات کو چھوڑ کر خدا تعالیٰ کی راہ میں تکالیف کو مقدم کر لیا۔ ایسا شخص فی الحقیقت نجات یافتہ ہے جو خدا تعالیٰ کو مقدم کرتا ہے اور دُنیا اور اس کے تکلّفات کو چھوڑتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

نہایت امن کی راہ یہی ہے کہ انسان اپنی غرض کو صاف کرے اور خالصتاً رُو بخدا ہو۔ اس کے ساتھ اپنے تعلّقات کو صاف کرے اور بڑھائے اور وجہ اللہ کی طرف دوڑے۔ وہی اس کا مقصود اور محبوب ہو اور تقویٰ پر قدم رکھ کر اعمالِ صالحہ بجالاوے پھر سُنّت اللہ اپنا کام آپ کرے گی۔ اس کی نظر نتائج پر نہ ہو بلکہ نظر تو اسی ایک نقطہ پر ہو۔ اس حد تک پہنچنے کے لئے اگر یہ شرط ہو کہ وہاں پہنچ کر سب سے زیادہ سزا ملے گی تب بھی اسی کی طرف جاوے۔ یعنی کوئی ثواب یا عذاب اس کی طرف جانے کا اصل مقصد نہ ہو محض خدا تعالیٰ ہی اصل مقصد ہو۔ جب وفاداری اور اخلاص کے ساتھ اس کی طرف آئے گا اور اس کا قُرب حاصل ہوگا تو یہ وہ سب کچھ دیکھے گا جو اس کے وہم و گمان میں بھی کبھی نہ گذرا ہوگا اور کشوف اور خواب تو کچھ چیز ہی نہ ہوں گے۔ پس مَیں تو اِس راہ پر چلانا چاہتا ہوں اور یہی اصل غرض ہے۔ اِسی کو قرآن شریف میں فلاح کہا گیا ہے۔ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىهَا۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

قرآن شریف میں آیا ہے قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىهَا اس نے نجات پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا۔ لیکن تزکیۂ نفس بھی ایک موت ہے۔ جب تک کہ کُل اخلاقِ رذیلہ کو ترک نہ کیا جاوے تزکیۂ نفس کہاں حاصل ہو

سکتا ہے۔ ہر ایک شخص میں کسی نہ کسی شر کا مادہ ہوتا ہے وہ اس کا شیطان ہوتا ہے جب تک کہ اس کو قتل نہ کرے کام نہیں بن سکتا۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۸ مورخہ ۲ رمئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۲)

خدا تعالیٰ نے ایک ہی راہ رکھا ہے جیسے فرمایا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۳۰/۱۰) اور یہ اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان خدا کی رضا کے ساتھ راضی ہو جاوے۔ کوئی دُوئی نہ رہے۔ خدا کے ساتھ کسی کی ملونی نہ رہے اور کسی قسم کی دُوری یا جُدائی نہ رہے۔ یہ تھوڑی سی بات نہیں یہی وہ مشکل گھاٹی ہے جو بڑے بڑے مصائب اور امتحانوں کے بعد طے ہوا کرتی ہے۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱)

آیتِ قرآنی قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا کا ترجمہ اُردو میں ایک دفعہ سوچتا تھا تو یہ شعر لکھا گیا ؎

کوئی اس پاک سے جو دِل لگاوے ✤ کرے پاک آپ کو تب اس کو پاوے

(بدر جلد ۶ نمبر ۴۷ مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۰)

یاد رکھو کہ خدا کا یہ ہرگز منشاء نہیں کہ تم دُنیا کو بالکل ترک کر دو بلکہ اس کا جو منشاء ہے وہ یہ ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ تجارت کرو، زراعت کرو، ملازمت کرو اور حرفت کرو، جو چاہو کرو مگر نفس کو خدا کی نافرمانی سے روکتے رہو اور ایسا تزکیہ کرو کہ یہ امور تمہیں خدا سے غافل نہ کر دیں۔ پھر جو تمہاری دُنیا ہے یہی دین کے حکم میں آجاوے گی۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۹، ۵۰ مورخہ ۲۶/۳۰ اگست ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

تزکیۂ نفس بڑا مشکل مرحلہ ہے اور مدارِ نجات تزکیۂ نفس پر موقوف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا اور تزکیۂ نفس بجز فضلِ خدا میسّر نہیں آسکتا۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۴ رمئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

جو شخص خدا کو خوش کرنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی دُنیا ٹھیک ہو جاوے۔ خود پاک دِل ہو جاوے نیک بن جاوے اور اس کی تمام مشکلات حل اور دُکھ دُور ہو جاویں اور اس کو ہر طرح کی کامیابی اور فتح و نصرت عطا ہو تو اس کے واسطے اللہ تعالیٰ نے ایک اصول بتایا ہے اور وہ یہ ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا کامیاب ہو گیا، بامراد ہو گیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا۔ تزکیۂ نفس میں ہی تمام برکات اور فیوض اور کامیابیوں کا راز پنہاں ہے۔ فلاح صرف امورِ دینی ہی میں نہیں بلکہ دُنیا و دین میں کامیابی ہوگی۔ نفس کی ناپاکی سے بچنے والا انسان کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ دُنیا میں ذلیل ہو۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۴ رجولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

نجات پا گیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا اور خائب و خاسر ہو گیا وہ شخص جو اس سے محروم رہا۔ اِس لئے اب تم لوگوں کو سمجھنا چاہیئے کہ تزکیۂ نفس کس کو کہا جاتا ہے۔ سو یاد رکھو کہ ایک مسلمان کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پورا کرنے کے واسطے ہمہ تن تیار رہنا چاہیئے اور جیسے زبان سے خدا تعالیٰ کو اس کی ذات اور

صفات میں وحدہٗ لاشریک سمجھتا ہے ایسے ہی عملی طور پر اس کو دکھانا چاہیئے اور اس کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی اور ملائمت سے پیش آنا چاہیئے اور اپنے بھائیوں سے کسی قسم کا بھی بُغض، حسد اور کینہ نہیں رکھنا چاہیئے اور دوسروں کی غیبت کرنے سے بالکل الگ ہو جانا چاہیئے لیکن مَیں دیکھتا ہوں کہ یہ معاملہ تو ابھی دُور ہے کہ تم لوگ خدا تعالیٰ کے ساتھ ایسے از خود رفتہ اور محو ہو جاؤ کہ بس اُسی کے ہو جاؤ اور جیسے زبان سے اس کا اقرار کرتے ہو عمل سے بھی کر کے دکھاؤ۔ ابھی تو تم لوگ مخلوق کے حقوق کو بھی کما حقہٗ ادا نہیں کرتے۔ بہت سے ایسے ہیں جو آپس میں فساد اور دشمنی رکھتے ہیں اور اپنے سے کمزور اور غریب شخصوں کو نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں اور بدسلوکی سے پیش آتے ہیں اور ایک دوسرے کی غیبتیں کرتے اور اپنے دلوں میں بُغض اور کینہ رکھتے ہیں لیکن خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم آپس میں ایک وجود کی طرح بن جاؤ اور جب تم ایک وجود کی طرح ہو جاؤ گے اس وقت کہہ سکیں گے کہ اب تم نے اپنے نفسوں کا تزکیہ کر لیا کیونکہ جب تک تمہارا آپس میں معاملہ صاف نہیں ہوگا اس وقت تک خدا تعالیٰ سے بھی معاملہ صاف نہیں ہو سکتا گو ان دونوں قسم کے حقوق میں بڑا حق خدا تعالیٰ کا ہے مگر اس کی مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنا یہ بطور آئینہ کے ہے۔ جو شخص اپنے بھائیوں سے صاف صاف معاملہ نہیں کرتا وہ خدا تعالیٰ کے حقوق بھی ادا نہیں کر سکتا۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲، ۳ جنوری ۱۹۰۸ء)

اِس آیتِ کریمہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نیکی اور خوبی کا مدار ہی دونوں پہلوؤں پر ہے جس کو ایک ہی قوت دی گئی ہے اور دوسری قوت ہی اس کو عطا نہیں ہوئی۔ وہ تو ایک نقش ہے جو مٹ نہیں سکتا۔ جو شخص مَلَک اور شیطان کا انکار کرتا ہے وہ تو گویا بدیہیات اور امورِ محسوسہ مشہودہ کا انکاری ہے۔ ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ لوگ نیکی بھی کرتے ہیں اور ارتکابِ جرائم بھی دُنیا میں ہوتا ہے اور دونو قوتیں دُنیا میں برابر کام کر رہی ہیں اور ان کا تو کوئی فردِ بشر بھی انکار نہیں کر سکتا۔ کون ہے جو اِن دونوں کا احساس اور اثر اپنے اندر نہیں پاتا۔ یہاں کوئی فلسفہ اور منطق پیش نہیں جاتی جبکہ دونوں قوتیں موجود ہیں اور اپنی اپنی جگہ اپنا اپنا کام کر رہی ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۶ مورخہ ۲ رجون ۱۹۰۸ء صفحہ ۸)

جب انسان محض اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے جذبات کو روک لیتا ہے تو اس کا نتیجہ دین و دُنیا میں کامیابی اور عزت ہے۔ فلاح دو قسم کی ہے۔ تزکیۂ نفس حسبِ ہدایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کرنے سے آخرت میں بھی نجات ملتی ہے اور دُنیا میں بھی آرام ملتا ہے۔ گناہ خود ایک دُکھ ہے۔ وہ بیمار ہیں جو گناہ میں لذت پاتے ہیں۔ بدی کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکلتا۔ بعض شرابیوں کو مَیں نے دیکھا ہے کہ انہیں نزول الماء ہو گیا۔ مفلوج ہو گئے۔ رعشہ ہو گیا۔ سکتہ سے مَر گئے۔ خدا تعالیٰ جو ایسی بدیوں سے روکتا ہے تو لوگوں کے بھلے کے لئے۔ جیسے ڈاکٹر اگر کسی بیمار کو پرہیز بتاتا ہے تو اس میں بیمار کا فائدہ ہے نہ کہ ڈاکٹر کا۔

پس فلاحِ جسمانی رُوحانی پانی ہے۔تم ان تمام آفات ومنہیات سے پرہیز کرو۔نفس کو بے قید نہ کرو کہ تم پر عذاب نہ آجائے۔ اللہ تعالیٰ نے کمالِ رحمت سے سب دُکھوں سے بچنے کی راہ بتا دی اَب کوئی ان دُکھوں سے،ان گناہوں سے نہ بچے تو اِسلام پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔

(بدر جلد ۷نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۶،۵)

جس نے اَرضی جذبات سے اپنے نفس کو پاک کیا وہ بچ گیا اور نہیں ہلاک ہوگا مگر جس نے ارضی جذبات میں جو طبعی جذبات ہیں اپنے تئیں چھپا دیا وہ زندگی سے نا امید ہوگیا۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵)

اِنَّ الدُّنْیَا شَاجِنَۃٌ۔ وَاُسُوْدُھَا مُفْتَرِسَۃٌ۔ فَلَا تَجُوْلُوْا فِیْ شُجُوْنِھَا۔ وَ امْنَعُوْا نُفُوْسَکُمْ مِنْ جُرْءَتِھَا وَمُجُوْنِھَا۔ وَزَکُّوْھَا وَ بَیِّضُوْھَا کَاللُّجَیْنِ۔ وَلَا تَتْرُکُوْھَا حَتّٰی تَصِیْرَ نَقِیَّۃً مِّنَ الدَّرَنِ وَالشَّیْنِ۔ وَقَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا۔ (مواہب الرحمٰن صفحہ ۹۹)

نفسانی گرفتاریوں سے وہ شخص نجات پا گیا اور بہشتی زندگی کا مالک ہو گیا جس نے اپنے نفس کو پاک بنا لیا اور ناکام اور نامراد رہا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو زمین میں دھنسایا اور آسمان کی طرف رُخ نہ کیا۔ اور چونکہ یہ مقامات صرف اِنسانی سعی سے حاصل نہیں ہوسکتے اِس لئے جا بجا قرآن شریف میں دعا کی ترغیب دی ہے اور مجاہدہ کی طرف رغبت دلائی ہے۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۱۳)

عذاب سے وہ لوگ نجات پائیں گے جنہوں نے دلوں کو پاک کیا اور وہ لوگ سزا پائیں گے جنہوں نے اپنے نفسوں کو گندہ کیا۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۱۳۰)

ہدایتِ الٰہی تو یہ ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا۔ نجات پائے گا وہ شخص جس نے تزکیۂ نفس کیا اور رہلاک ہوگیا وہ آدمی جس نے نفس کو بگاڑا۔ فلح چیرنے کو کہتے ہیں۔ فلاحت زراعت کو جانتے ہو۔ تزکیۂ نفس میں بھی فلاحت ہے۔ مجاہدہ انسانی نفس کو اُس کی خرابیوں اور سختیوں سے صاف کرکے اِس قابل بنا دیتا ہے کہ اُس میں ایمانِ صحیحہ کی تخم ریزی کی جاوے۔ پھر وہ شجرِ ایمان بارآور ہونے کے لائق بن جاتا ہے

ترجمہ از مرتب:۔ دُنیا درختوں سے پُر جنگل ہے اور اس کے شیر پھاڑ کھانے والے ہیں پس تم ان جنگلوں میں مت پھرو۔ اور اپنے نفوس کو اُن کی بیباکی اور جُرأت سے روکو۔ اور ان کو پاک کرو۔ اور چاندی کی طرح صاف و شفاف کرو۔ اور ان کو اس وقت تک مت چھوڑو جب تک کہ وہ مَیل اور عیب سے پاک نہ ہو جائیں۔ اور وہ شخص نجات پا گیا جس نے ارضی جذبات سے اپنے نفس کو پاک کیا اور وہ ناکام و نامراد رہا جس نے جوہرِ نفس کو خاک میں پوشیدہ کر دیا۔ (مواہب الرحمٰن صفحہ ۹۹)

چونکہ ابتدائی مراحل اور منازل میں متقی کو بڑی بڑی مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اِس لئے فلاح سے تعبیر کیا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۵۴)

اس کو فتح دی جاتی ہے جو تزکیہ کرتا ہے چنانچہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

مٹی کے برابر ہو گیا وہ شخص جس نے نفس کو آلودہ کر لیا یعنی جو زمین کی طرف جھک گیا۔ گویا یہ ایک ہی فقرہ قرآن کریم کی ساری تعلیمات کا خلاصہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کس طرح خدا تعالیٰ تک پہنچتا ہے۔ یہ بالکل سچی اور پکی بات ہے کہ جب تک اِنسان قوای بشریہ کے بُرے طریق کو نہیں چھوڑتا اُس وقت تک خدا نہیں ملتا۔ دُنیا کی گندگیوں سے نکلنا چاہتے ہو اور خدا تعالیٰ کو ملنا چاہتے ہو تو ان لذات کو ترک کرو ورنہ ؎

ہم خدا خواہی و ہم دُنیائے دُوں ❊ ایں خیال است و محال است و جنوں

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا یعنی وہ شخص جس نے تزکیہ نفس کا کیا نجات پا گیا۔ سو نجات سے حصول معرفتِ تامہ مراد ہے کیونکہ تمام عذاب اور ہر یک قسم کے عقوبات جہل اور ضلالت پر ہی مرتب ہوں گے۔

(مکتوباتِ احمد جلد اول صفحہ ۵۹۰، ۶۰۰ مکتوب نمبر ۲۹ بنام میر عباس علی شاہ صاحب)

وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا۔ وہ انسان بہت ہی بڑی ذمّہ داری کے نیچے ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کی آیات اور نشانات کو دیکھ چکا ہو۔ پس کیا تم میں سے کوئی ہے جو یہ کہے کہ مَیں نے کوئی نشان نہیں دیکھا۔ بعض نشان اِس قسم کے ہیں کہ لاکھوں کروڑوں انسان ان کے گواہ ہیں۔ جو ان نشانوں کی قدر نہیں کرتا اور ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ اس کو دشمن سے پہلے ہلاک کرے گا کیونکہ وہ شدید العقاب بھی ہے۔ جو اپنے آپ کو درست نہیں کرتا وہ نہ صرف اپنی جان پر ظلم کرتا ہے بلکہ اپنے بیوی بچوں پر بھی ظلم کرتا ہے کیونکہ جب وہ خود تباہ ہو جاوے گا تو اس کے بیوی بچے بھی ہلاک اور خوار ہوں گے۔ خدا تعالیٰ اس کی طرف اشارہ کرکے فرماتا ہے وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی بدکاریاں اور شوخیاں اس حد تک پہنچی ہوئی ہوتی ہیں کہ جب وہ خدا کے غضب سے ہلاک ہوتا ہے تو اس لعنت اور غضب کا اثر اس کی اولاد تک بھی پہنچتا ہے۔ اِسی لئے قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا۔ عُقْبٰهَا سے اولاد اور پسماندگان مراد ہیں۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۰ جون ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

خدا کی شان ہوتی ہے۔ پلیدوں کے عذاب پر وہ پرواہ نہیں کرتا کہ اُن کی بیوی بچوں کا کیا حال ہوگا اور

صادقوں اور راست بازوں کے لئے کَانَ اَبُوْھُمَا صَالِحًا[1] کی رعایت کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ ۲۳ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

حدیث شریف اور قرآن مجید سے ثابت ہے اور ایسا ہی پہلی کتابوں سے بھی پایا جاتا ہے کہ والدین کی بدکاریاں بچوں پر بھی بعض وقت آفت لاتی ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ ہے وَلَا یَخَافُ عُقْبٰھَا جو لوگ لاابالی زندگی بسر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کی طرف سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ دیکھو دُنیا میں جو اپنے آقا کو چند روز سلام نہ کرے تو اس کی نظر بگڑ جاتی ہے تو جو خدا سے قطع کرے پھر خدا اس کی پرواہ کیوں کرے گا اِسی پر وہ فرماتا ہے کہ وہ اُن کو ہلاک کر کے اُن کی اولاد کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو متقی صالح مر جاوے اس کی اولاد کی پرواہ کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ ۳ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

دیکھو جب کوئی بادشاہ کے کسی امر کے متعلق سمجھا دے کہ تم اس سے رُک جاؤ تمہارا بھلا ہوگا تو اگر وہ شخص رُک جاوے تو بہتر ورنہ پھر اس کا عذاب کیسا سخت ہوتا ہے۔ اسی طرح پہلے چھوٹے چھوٹے عذابوں سے خدا تعالیٰ لوگوں کو سمجھوتیاں دیتا ہے کہ باز آجاؤ موقع ہے ورنہ پچھتاؤ گے مگر جب وہ نہیں سمجھتے اور اس کی نافرمانی سے نہیں رُکتے تو پھر اس کا عذاب ایسا ہوتا ہے۔ وَلَا یَخَافُ عُقْبٰھَا۔

(الحکم جلد ۷ ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

بعض لوگ گناہ کرتے ہیں اور پھر اس کی پرواہ نہیں کرتے گویا گناہ کو ایک شیریں شربت کی مثال خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا مگر یاد رکھیں کہ جیسے خدا تعالیٰ بڑا غفور اور رحیم ہے ویسے ہی وہ بڑا بے نیاز بھی ہے جب وہ غضب میں آتا ہے تو کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ فرماتا ہے وَلَا یَخَافُ عُقْبٰھَا۔

یعنی کسی کی اولاد کی بھی اسے پرواہ نہیں ہوتی کہ اگر فلاں شخص ہلاک ہوگا تو اس کے یتیم بچے کیا کریں گے۔

(البدر جلد ۲ ۱۴ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۸)

اِنسان کی خوش قسمتی ہے کہ قبل از نزولِ بلا وہ تبدیلی کرے لیکن اگر کوئی تبدیلی نہیں کرتا اور اس کی نظر اسباب اور مکر و حیلہ پر ہے تو سوائے اس کے کہ وہ اپنے ساتھ گھر بھر کو تباہ کر دے اور کیا انجام بھوگ سکتا ہے کیونکہ مرد گھر کا کشتی بان ہوتا ہے اگر وہ ڈوبے گا تو کشتی بھی ساتھ ہی ڈوبے گی۔ اِسی لئے کہا ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ[2] اسی کی رست گاری کے ساتھ اس کے اہل و عیال کی رست گاری ہے اور لَا یَخَافُ

---

[1] سورۃ الکہف : ۸۳ [2] سورۃ النساء : ۳۵

عُقْبٰهَا سے ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کو ان کے پسماندوں کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اس وقت اس کی بے نیازی کام کرتی ہے۔ (البدر جلد ۳ ۲۷؁ مورخہ ۱۶؍ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

وہ آدمی جو احکامِ الٰہی کی پرواہ نہیں کرتا خدا بھی اس کی پرواہ نہیں کرتا جیسا کہ آیتِ کریمہ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا سے ظاہر ہے۔ یعنی نافرمانوں پر جب وہ عذاب کرنے پر آتا ہے تو ایسی لاابالی سے عذاب کرتا ہے کہ عذاب کی ہلاکت سے ان کے بال بچوں کی بھی پرواہ نہیں کرتا کہ ان کا حال ان کے نافرمان والدین کے بعد کیا ہوگا۔ (الحکم جلد ۹ ۵؁ مورخہ ۱۰؍ فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

خدا تعالیٰ کی عظمت کو دل میں رکھنا چاہیئے اور اس سے ہمیشہ ڈرنا چاہیئے۔ اس کی گرفت خطرناک ہوتی ہے۔ وہ چشم پوشی کرتا ہے اور درگذر فرماتا ہے لیکن جب کسی کو پکڑتا ہے تو پھر بہت سخت پکڑتا ہے یہاں تک کہ لَا يَخَافُ عُقْبٰهَا پھر وہ اِس امر کی بھی پرواہ نہیں کرتا کہ اس کے پچھلوں کا کیا حال ہوگا۔ برخلاف اس کے جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے اور اس کی عظمت کو دِل میں جگہ دیتے ہیں خدا تعالیٰ اُن کو عزّت دیتا اور خود ان کے لئے ایک سپر ہو جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ ۲۱؁ مورخہ ۱۷؍ جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

جو لوگ انبیاء کی زندگی میں فسق وفجور میں مُبتلا رہتے ہیں اور عاقبت کی کچھ فِکر نہیں کرتے اور راستبازوں پر حملے کرتے ہیں ایسوں ہی کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۳۰/۱۶ اِس سے مُراد یہ ہے کہ جب ایک مُوذی بے ایمان کو اللہ کریم مارتا ہے تو پھر کچھ پرواہ نہیں رکھتا کہ اس کے عیال اطفال کا گذارہ کس طرح ہوگا اور اس کے پسماندہ کیسی حالت میں بسر کریں گے۔ (الحکم جلد ۱۱ ۳۴؁ مورخہ ۲۴؍ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

○

سُورۃ الضُّحٰی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

وَالضُّحٰی۝ۙ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی۝ۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی۝ؕ

قرآن کریم میں ایک مقام پر رات کی قسم کھائی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ اس وقت کی قسم ہے جب وحی کا سلسلہ بند تھا۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ وہ مقام ہے جو ان لوگوں کے لئے جو سلسلۂ وحی سے افاضہ حاصل کرتے ہیں آتا ہے۔ وحی کے سلسلہ سے شوق اور محبت بڑھتی ہے لیکن مفارقت میں بھی ایک کشش ہوتی ہے جو محبت کے مدارج عالیہ پر پہنچاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کو بھی ایک ذریعہ قرار دیا ہے کیونکہ اس سے قلق اور کرب میں ترقی ہوتی ہے اور رُوح میں ایک بیقراری اور اِضطراب پَیدا ہوتا ہے جس سے وہ دعاؤں کی رُوح اس میں نفخ کی جاتی ہے کہ وہ آستانۂ الوہیت پر یارب یارب کہہ کر اور بڑے جوش اور شوق اور جذبہ کے ساتھ دوڑتی ہے جیسا کہ ایک بچہ جو تھوڑی دیر کے لئے ماں کی چھاتیوں سے الگ رکھا گیا ہو بے اختیار ہو کر ماں کی طرف دوڑتا اور چلاتا ہے اسی طرح پر بلکہ اس سے بھی بیحد اضطراب کے ساتھ رُوح اللہ کی طرف دوڑتی ہے اور اس دوڑ دھوپ اور قلق و کرب میں وہ لذّت اور سرور ہوتا ہے جس کو ہم بیان نہیں کرسکتے۔ یاد رکھو رُوح میں جس قدر اضطراب اور بیقراری خدا تعالیٰ کے لئے ہوگی اسی قدر دعاؤں کی توفیق ملے گی اور اُن میں قبولیت کا نفخ ہوگا۔ غرض یہ ایک زمانہ ماموروں اور مرسلوں اور اُن لوگوں پر جن کے ساتھ مکالماتِ الٰہیہ کا ایک تعلق ہوتا ہے آتا ہے اور اس سے غرض اللہ تعالیٰ کی یہ ہوتی ہے کہ تا اُن کو محبت کی چاشنی اور قبولیتِ دُعا کے ذوق سے حصہ دے اور اُن کو اعلیٰ مدارج پر پہنچا دے۔ تو یہاں جو ضُحٰی اور لَیل کی قسم کھائی اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدارجِ عالیہ اور مراتبِ محبت کا اظہار ہے اور آگے پیغمبرِ خدا کا ابراء کیا کہ دیکھو دن اور رات جو بنائے ہیں ان میں کس قدر وقفہ ایک دوسرے میں ڈال دیا ہے۔ ضُحٰی کا وقت بھی دیکھو اور تاریکی کا وقت بھی خیال کرو۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ - خدا تعالیٰ نے تجھے رخصت نہیں کر دیا۔ اُس نے تجھ سے کینہ نہیں کیا بلکہ ہمارا یہ ایک قانون ہے جیسے رات اور دن کو بنایا ہے اسی طرح انبیاء علیہم السّلام کے ساتھ بھی ایک قانون ہے کہ بعض وقت وحی کو بند کر دیا جاتا ہے تاکہ ان میں دعاؤں کے لئے زیادہ جوش پیدا ہو۔ اور ضحٰی اور لَیل کو اِس لئے بطور شاہد بیان فرمایا تا آپؐ کی امید وسیع ہو اور تسلی اور اطمینان پیدا ہو۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان قسموں کے بیان کرنے سے اصل مدّعا یہ رکھا ہے کہ تا بدیہات کے ذریعہ نظریات کو سمجھا دے۔ اب سوچ کر دیکھو کہ یہ کیسا پُرحکمت مسئلہ تھا مگر ان بدبختوں نے اس پر بھی اعتراض کر دیا۔

چشمِ بد اندیش کہ برکندہ باد ✤ عیب نماید ہنرش در نظر

اِن قسموں میں ایسا فلسفہ بھرا ہوُا ہے کہ حکمت کے ابواب کُھلتے ہیں۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۱، ۲۲ - جون ۱۹۰۱ء)

وحیِ الٰہی کا یہ قاعدہ ہے کہ بعض دنوں میں تو بڑے زور سے بار بار الہام پر الہام ہوتے ہیں اور الہاموں کا ایک سلسلہ بندھ جاتا ہے اور بعض دنوں میں ایسی خاموشی ہوتی ہے کہ معلوم نہیں ہوتا کہ اِس قدر خاموشی کیوں ہے اور نادان لوگ اِعتراض کرتے ہیں کہ اَب خدا تعالیٰ نے ان سے کلام کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایک زمانہ ایسا ہی آیا تھا کہ لوگوں نے سمجھا کہ اَب وحی بند ہوگئی چنانچہ کافروں نے ہنسی شروع کی کہ اب خدا نعوذ باللہ ہمارے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ناراض ہوگیا ہے اور اب وہ کلام نہیں کرے گا لیکن خدا تعالیٰ نے اس کا جواب قرآن شریف میں اِس طرح دیا ہے کہ وَالضُّحٰی - وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی - مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی یعنی قسم ہے دُھوپ چڑھنے کے وقت کی اور رات کی۔ نہ تو تیرے رَبّ نے تجھ کو چھوڑ دیا اور نہ تجھ سے ناراض ہوُا۔ اِس کا یہ مطلب ہے کہ جیسے دن چڑھتا ہے اور اس کے بعد رات خود بخود آجاتی ہے اور پھر اس کے بعد دن کی روشنی نمودار ہوتی ہے اور اس میں خدا تعالیٰ کی خوشی یا ناراضگی کی کوئی بات نہیں۔ یعنی دن چڑھنے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ اس وقت اپنے بندوں پر خوش ہے اور نہ رات پڑنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس وقت خدا تعالیٰ اپنے بندوں پر ناراض ہے۔ بلکہ اِس اختلاف کو دیکھ کر ہر ایک عقلمند خوب سمجھ سکتا ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہو رہا ہے اور یہ اس کی سُنّت ہے کہ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن ہوتا ہے۔ پس اِس سلسلہ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا کہ اِس وقت خدا تعالیٰ خوش ہے اور اِس وقت ناراض ہے غلط ہے۔

اِسی طرح سے آجکل جو وحیِ الٰہی کا سلسلہ کسی قدر بند رہا ہے تو اِس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ مجھ سے ناراض ہوگیا ہے یا یہ کہ اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے بلکہ یہ اس کی سُنّت ہے کہ کچھ مدّت تک وحیِ اِلٰہی

بڑے زور سے اور پے درپے ہوتی ہے اور کچھ دنوں تک اس کا سلسلہ بند رہتا ہے اور پھر شروع ہوجاتا ہے اور اس کی بھی وہی مثال ہے جو دن اور رات کے آگے پیچھے آنے کی ہے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۵۲ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

مجھے روزِ روشن کی قسم ہے اور اُس رات کی جو تاریک ہو جو تیرے رَبّ نے تجھے دشمن نہیں پکڑا۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۱۲۰)

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى - خدا نے تجھ کو ترک نہیں کیا اور نہ وہ تجھ پر ناراض ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۵۸ حاشیہ)

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝

اٰوٰی کا لفظ زبانِ عرب میں ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے کہ جب کسی شخص کو کسی قدر مصیبت یا ابتلاء کے بعد اپنی پناہ میں لیا جائے اور کثرتِ مصائب اور تلف ہونے سے بچایا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۔اِسی طرح قرآن شریف میں اٰوٰی اور اٰوٰی کا لفظ ایسے ہی موقعوں پر استعمال ہوا ہے کہ جہاں کسی شخص یا کسی قوم کو کسی قدر تکلیف کے بعد پھر آرام دیا گیا۔

(تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۶ حاشیہ)

اٰوٰی کے معنے تمام لُغت کی کتابوں میں یہی لکھے ہیں کہ کسی مصیبت کے بعد پناہ دینا۔ قرآن مجید میں بھی اِنہی معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۹ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

جو شخص قرآن کریم کے اسالیبِ کلام کو بخوبی جانتا ہے اُس پر یہ پوشیدہ نہیں کہ بعض اوقات وہ کریم و رحیم جلّ شانہٗ اپنے خواص عباد کے لئے ایسا لفظ استعمال کر دیتا ہے کہ بظاہر بدنما ہوتا ہے مگر معناً نہایت محمود اور تعریف کا کلمہ ہوتا ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ نے اپنے نبی کریمؐ کے حق میں فرمایا وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی۔ اب ظاہر ہے کہ ضال کے معنے مشہور اور متعارف جو اہلِ لُغت کے مُنہ پر چڑھے ہوئے ہیں گمراہ کے ہیں جس کے اعتبار سے آیت کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے (اے رسول اللہؐ) تجھ کو گمراہ پایا اور ہدایت دی۔

حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی گمراہ نہیں ہوئے اور جو شخص مسلمان ہو کر یہ اِعتقاد رکھے کہ کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر میں ضلالت کا عمل کیا تھا تو وہ کافر بے دین اور حدِ شرعی کے لائق ہے بلکہ آیت کے اِس جگہ وہ معنی لینے چاہیئے جو آیت کے سیاق اور سباق سے ملتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ نے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۔ وَوَجَدَكَ عَآىِٕلًا فَاَغْنٰی ۔ یعنی خدا تعالیٰ نے تجھے یتیم اور بیکس پایا اور اپنے پاس جگہ دی اور تجھ کو ضال (یعنی عاشق وجہ اللہ) پایا پس اپنی طرف کھینچ لایا اور تجھے درویش پایا پس غنی کر دیا۔ اِن معنوں کی صحت پر یہ ذیل کی آیتیں قرینہ ہیں جو ان کے بعد آتی ہیں یعنی یہ کہ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۔ وَ اَمَّا السَّآىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ ۔ وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۔ کیونکہ یہ تمام آیتیں لَف نشر مرتب کے طور پر ہیں اور پہلی آیتوں میں جو مدّعا مخفی ہے دوسری آیتیں اس کی تفصیل اور تصریح کرتی ہیں مثلاً پہلے فرمایا اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۔ اس کے مقابل پر فرمایا فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ یعنی یاد کر کہ تُو بھی یتیم تھا اور ہم نے تجھ کو پناہ دی ایسا ہی تُو بھی یتیموں کو پناہ دے۔ پھر بعد اِس آیت کے فرمایا وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۔ اس کے مقابل پر فرمایا وَ اَمَّا السَّآىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ یعنی یاد کر کہ تُو بھی ہمارے وصال اور جمال کا سائل اور ہمارے حقائق اور معارف کا طالب تھا سو جیسا کہ ہم نے باپ کی جگہ ہو کر تیری جسمانی پرورش کی ایسا ہی ہم نے استاد کی جگہ ہو کر تمام دروازے علوم کے تجھ پر کھول دئیے اور اپنے لقاء کا شربت سب سے زیادہ عطا فرمایا اور جو تُو نے مانگا سب ہم نے تجھ کو دیا سو تُو بھی مانگنے والوں کو رَدّ مت کر اور ان کو مت جھڑک اور یاد کر کہ تو عائل تھا اور تیری معیشت کے ظاہری اسباب بکلّی منقطع تھے سو خدا خود تیرا متولّی ہوا اور غیروں کی طرف حاجت لے جانے سے تجھے غنی کر دیا۔ نہ تُو والد کا محتاج ہوا نہ والدہ کا۔ نہ استاد کا اور نہ کسی غیر کی طرف حاجت لے جانے کا بلکہ یہ سارے کام تیرے خدا تعالیٰ نے آپ ہی کر دئیے اور پیدا ہوتے ہی اُس نے تجھ کو آپ سنبھال لیا سو اُس کا شکر بجا لا اور حاجت مندوں سے تُو بھی ایسا ہی معاملہ کر۔ اَب اِن تمام آیات کا مقابلہ کر کے صاف طور پر کُھلتا ہے کہ اِس جگہ ضال کے معنے گمراہ نہیں ہے بلکہ انتہائی درجہ کے تعشّق کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ حضرت یعقوبؑ کی نسبت اس کے مناسب یہ آیت ہے اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ[1] سو یہ دونوں لفظ ظلم اور ضلالت اگرچہ ان معنوں پر بھی آتے ہیں کہ کوئی شخص جادۂ اِعتدال اور انصاف کو چھوڑ کر اپنے شہواتِ غضبیہ یا بہیمیہ کا تابع ہو جاوے لیکن قرآن کریم میں عشّاق کے حق میں بھی آئے ہیں جو خدا تعالیٰ کے راہ میں عشق کی مستی میں

---

[1] سورۃ یوسف : ۹۶

اپنے نفس اور اُس کے جذبات کو پَیروں کے نیچے کُچل دیتے ہیں اِسی کے مطابق حافظ شیرازی کا یہ شعر ہے ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید ٭ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

اِس دیوانگی سے حافظ صاحب حالتِ تعشّق اور شدّتِ حرصِ اطاعت مراد لیتے ہیں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۷۰ تا ۱۷۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی مہدی تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اَور نبیوں کی طرح ظاہری علم کسی استاد سے نہیں پڑھا تھا مگر حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ مکتبوں میں بیٹھے تھے اور حضرت عیسیٰؑ نے ایک یہودی استاد سے تمام توریت پڑھی تھی۔ غرض اِس لحاظ سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی استاد سے نہیں پڑھا خدا آپ ہی استاد ہؤا اور پہلے پہل خدا نے ہی آپؐ کو اِقْرَاْ کہا یعنی پڑھ اَور کسی نے نہیں کہا۔ اِس لئے آپؐ نے خاص خدا کے زیرِ تربیت تمام دینی ہدایت پائی اور دوسرے نبیوں کے دینی معلومات انسانوں کے ذریعہ سے بھی ہوئے۔

(ایّام الصّلح صفحہ ۱۴۷)

ضلالت کے یہ بھی معنے ہیں کہ افراطِ محبّت سے ایک شخص کو ایسا اختیار کیا جائے کہ دوسرے کا عزّت کے ساتھ نام سُننے کی بھی برداشت نہ رہے جیسا کہ اِس آیت میں بھی یہی معنے مراد ہیں کہ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۴ حاشیہ)

بعض آدمیوں کی عادت ہوتی ہے کہ سائل کو دیکھ کر چِڑ جاتے ہیں اور کچھ مولویّت کی رَگ ہو تو اُس کو بجائے کچھ دینے کے سوال کے مسائل سمجھانا شروع کر دیتے ہیں اور اس پر اپنی مولویّت کا رُعب بٹھا کر بعض اَوقات سخت سُست بھی کہہ بیٹھتے ہیں۔ افسوس ان لوگوں کو عقل نہیں اور سوچنے کا مادہ نہیں رکھتے جو ایک نیک دِل اور سلیم الفطرت انسان کو ملتا ہے۔ اِتنا نہیں سوچتے کہ سائل اگر باوجود صحت کے سوال کرتا ہے تو وہ خود گناہ کرتا ہے۔ اُس کو کچھ دینے میں تو گناہ لازم نہیں آتا بلکہ حدیث شریف میں لَوْ اَتَاكَ رَاكِبًا کے الفاظ آئے ہیں یعنی خواہ سائل سوار ہو کر بھی آوے تو بھی کچھ دے دینا چاہیئے۔ اور قرآن شریف میں وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ کا ارشاد آیا ہے کہ سائل کو مت جھڑک۔ اِس میں یہ کوئی صراحت نہیں کی گئی کہ فلاں قِسم کے سائل کو مت جھڑک اور فلاں قِسم کے سائل کو جھڑک۔ پس یاد رکھو کہ سائل کو نہ جھڑکو کیونکہ اِس سے ایک قِسم کی بَداخلاقی کا بیج بویا جاتا ہے۔ اَخلاق یہی چاہتا ہے کہ سائل پر جلد ہی ناراض نہ ہو۔ یہ شیطان کی خواہش ہے کہ وہ اِس طریق سے تم کو نیکی سے محروم رکھے اور بدی کا وارث بنا دے۔

غور کرو کہ ایک نیکی کرنے سے دوسری نیکی پَیدا ہوتی ہے اور اِسی طرح پر ایک بَدی دوسری بَدی کا موجب

ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک چیز دوسری کو جذب کرتی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ نے یہ تجاذب کا مسئلہ ہر فعل میں رکھا ہؤا ہے۔ پس جب سائل سے نرمی کے ساتھ پیش آئے گا اور اس طرح یہ اخلاقی صدقہ دے دیگا تو قبض دُور ہو کر دوسری نیکی بھی کرے گا اور اس کو کچھ دے بھی دے گا۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۲۵ مورخہ ۹ جولائی ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

کیا تمہیں خبر نہیں کہ تمہیں تو یہ حکم دیا وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ اور سائل خواہ گھوڑے پر ہی سوار ہو کر آیا ہو پھر بھی واجب نہیں کہ اس کو رَدّ کیا جاوے۔ تیرے لئے یہ حکم ہے کہ تُو اس کو جھڑک نہیں۔ ہاں خدا تعالیٰ نے اس کو بھی حکم دیا ہے کہ وہ سوال نہ کرے۔ وہ اپنی خلاف ورزی کی خود سزا پالے گا لیکن تمہیں یہ مناسب نہیں کہ تم خدا تعالیٰ کے ایک واجب العزت حکم کی نافرمانی کرو۔ غرض اس کو کچھ دے دینا چاہیئے اگر پاس ہو اور اگر پاس نہ ہو تو نرم الفاظ سے اُس کو سمجھا دو۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۵)

یہ عاجز بحکم وَ اَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ اِس بات کے اظہار میں کچھ مضائقہ نہیں دیکھتا کہ خداوند کریم و رحیم نے محض فضل و کرم سے ان تمام امور سے اِس عاجز کو حصّہ وافر دیا ہے اور اِس ناکارہ کو خالی ہاتھ نہیں بھیجا اور نہ بغیر نشانوں کے مامور کیا بلکہ یہ تمام نشان دیئے ہیں جو ظاہر ہو رہے ہیں اور ہوں گے اور خدا تعالیٰ جب تک کھلے طور پر حجّت قائم نہ کرے تب تک ان نشانوں کو ظاہر کرتا جائے گا۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۴۴۸، ۴۴۹)

ہر ایک نعمت جو خدا سے تجھے پہنچے اُس کا ذکر لوگوں کے پاس کر۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۲۴)

عجز و نیاز اور انکسار ..... ضروری شرط عبودیت کی ہے لیکن بحکم آیتِ کریمہ وَ اَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ نعماءِ الٰہی کا اظہار بھی از بس ضروری ہے۔

(مکتوباتِ احمدیہ جلد ۵ حصّہ دوم صفحہ ۴۶ مکتوب نمبر ۴۱ بنام حضرت خلیفہ اوّلؓ)

یاد رکھو کہ اِنسان کو چاہیئے کہ ہر وقت اور ہر حالت میں دعا کا طالب رہے اور دوسرے اَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ پر عمل کرے۔ خدا تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کی تحدیث کرنی چاہیئے اس سے خدا تعالیٰ کی محبت بڑھتی ہے اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے ایک جوش پیدا ہوتا ہے۔ تحدیث کے یہی معنے نہیں ہیں کہ انسان صرف زبان سے ذکر کرتا رہے بلکہ جسم پر بھی اس کا اثر ہونا چاہیئے۔ مثلاً ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے کہ وہ عمدہ کپڑے پہن سکتا ہے لیکن وہ ہمیشہ مَیلے کچیلے کپڑے پہنتا ہے اِس خیال سے کہ وہ واجب الرحم سمجھا جاوے یا اس کی آسودہ حالی کا حال کسی پر ظاہر نہ ہو ایسا شخص گناہ کرتا ہے کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے فضل اور کرم کو چھپانا چاہتا ہے اور نفاق سے کام لیتا ہے۔ دھوکہ دیتا ہے اور مغالطہ میں ڈالنا چاہتا ہے یہ مومن کی شان سے بعید ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کا مذہب مُشترک تھا۔ آپ کو جو ملتا تھا پہن لیتے تھے۔ اِعراض نہ کرتے تھے۔ جو کپڑا پیش کیا جاوے اُسے قبول کر لیتے تھے لیکن آپ کے بعد بعض لوگوں

نے اس میں تواضع دیکھی کہ رہبانیت کی جُزو ملا دی بعض درویشوں کو دیکھا گیا کہ گوشت میں خاک ڈال کر کھاتے تھے۔ایک درویش کے پاس کوئی شخص گیا اُس نے کہا کہ اس کو کھانا کھلا دو۔اُس شخص نے اصرار کیا کہ مَیں تو آپ کے ساتھ کھاؤں گا آخر جب وہ درویش کے ساتھ کھانے بیٹھا تو اس کے لئے نیم کے گولے تیار کر کے آگے رکھے گئے۔اِس قِسم کے امور بعض لوگ اختیار کرتے ہیں اور غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو اپنے باکمال ہونے کا یقین دلائیں مگر اسلام ایسی باتوں کو کمال میں داخل نہیں کرتا۔اسلام کا کمال تو تقوٰی ہے جس سے ولایت ملتی ہے۔ جس سے فرشتے کلام کرتے ہیں۔خدا تعالیٰ بشارتیں دیتا ہے۔ہم اِس قسم کی تعلیم نہیں دیتے کیونکہ اسلام کی تعلیم کے منشاء کے خلاف ہے۔قرآن شریف تو کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ[1] کی تعلیم دے اور یہ لوگ طیّب عمدہ چیز میں خاک ڈال کر غیر طیّب بنا دیں۔اِس قسم کے مذاہب اِسلام کے بہت عرصہ بعد پیدا ہوئے۔یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اضافہ کرتے ہیں اُن کو اسلام سے اور قرآن کریم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا یہ خود اپنی شریعت الگ قائم کرتے ہیں مَیں اس کو سخت حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ہمارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُسوۂ حَسنہ ہیں۔ہماری بھلائی اور خوبی یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آپ کے نقشِ قدم پر چلیں اور اس کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھائیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱، ۲)

جہاں انسان واضح طور پر قرآن شریف یا سُنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی کمزوری کی وجہ سے کوئی بات نہ پا سکے تو اس کو اجتہاد سے کام لینا چاہیئے۔مثلاً شادیوں میں جو بھاجی دی جاتی ہے۔اگر اس کی غرض صرف یہی ہے کہ تا دوسروں پر اپنی شیخی اور بڑائی کا اظہار کیا جاوے تو یہ ریاکاری اور تکبّر کے لئے ہوگی اِس لئے حرام ہے لیکن اگر کوئی شخص محض اِسی نیت سے کہ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کا عملی اظہار کرے اور وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ[2] پر عمل کرنے کے لئے دوسرے لوگوں سے سلوک کرنے کے لئے دے تو یہ حرام نہیں۔پس جب کوئی شخص اِس نیت سے تقریب پیدا کرتا ہے اور اس میں معاوضہ ملحوظ نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا غرض ہوتی ہے تو پھر وہ ایک سَو نہیں خواہ ایک لاکھ کو کھانا دے منع نہیں۔اصل مدّعا نیت پر ہے نیت اگر خراب اور فاسد ہو تو ایک جائز اور حلال فعل کو بھی حرام بنا دیتی ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

---

[1] سورۃ المؤمنون: ۵۲ [2] سورۃ البقرۃ: ۴

سُورَۃُ الۡاِنۡشِرَاح

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ ۙ وَ وَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ ۙ الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ ۙ وَ رَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ ؕ

کیا ہم نے تیرا سینہ نہیں کھولا۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۵۸ حاشیہ)

ہم نے تیرا وہ بوجھ جس نے تیری کمر توڑ دی اُتار دیا ہے اور تیرے ذکر کو اُونچا کر دیا ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۱۷ حاشیہ)

رفتہ رفتہ صالح اِنسان ترقی کرتا ہوُا مطمئنّہ کے مقام پر پہنچ جاتا ہے اور یہاں ہی اس کا اِنشراح صَدر ہوتا ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ ہم انشراحِ صَدر کی کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

ہم تیرا بوجھ اُتار دیں گے جس نے تیری کمر توڑ دی۔ اور تیرے ذکر کو اُونچا کریں گے۔

(تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۱۳۱)

بغیر امتحان کے تو بات بنتی ہی نہیں اور پھر امتحان بھی ایسا جو کہ کمر توڑنے والا ہو۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑھ کر مشکل امتحان ہوُا تھا جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے وَ وَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ۔ الَّذِیۡۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ۔ جب سخت اِبتلاء آئیں اور انسان خدا کے لئے صبر کرے تو پھر وہ ابتلاء فرشتوں سے جا ملاتے ہیں۔ انبیاء اِسی واسطے زیادہ محبوب ہوتے ہیں کہ ان پر بڑے بڑے سخت اِبتلاء آتے ہیں اور وہ خود ہی ان کو خدا تعالیٰ سے جا ملاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۸، ۹)

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝

إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَبُشْرٰى لِكُلِّ مَنْ تَزَكّٰى وَإِشَارَةٌ إِلٰى أَنَّ النَّاسَ إِذَا أُرُوْا فِي زَمَانٍ ضَرًّا وَضَيْرًا فَيَرَوْنَ فِي أٰخَرَ نَفْعًا وَخَيْرًا وَيَرَوْنَ رَخَاءً بَعْدَ بَلَاءٍ فِي الدِّيْنِ وَالدُّنْيَا۔ (سرّ الخلافہ صفحہ ۳۷)

خدا تعالیٰ ہمارے مخالف علماء کے حال پر رحم فرماوے کہ وہ جو کارروائی کر رہے ہیں وہ دین کے لئے اچھی نہیں بلکہ نہایت خطرناک ہے۔ وہ زمانہ ان کو بھول گیا جب وہ منبروں پر چڑھ چڑھ کر تیرھویں صدی کی مذمت کرتے تھے کہ اس صدی میں اسلام کو سخت نقصان پہنچا ہے اور آیت فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا پڑھ کر اس سے اِستدلال کیا کرتے تھے کہ اس عُسر کے مقابل پر چودھویں صدی یُسر کی آئے گی لیکن جب اِنتظار کرتے کرتے چودھوی صدی آگئی اور عین صدی کے سر پر خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک شخص بدعوی مسیح موعود پیدا ہوگیا اور نشان ظاہر ہوئے اور زمین و آسمان نے گواہی دی تو اوّل المنکرین یہی علماء ہوگئے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۳۵)

احباب میں سے ایک کو مخالفین کی طرف سے بہت تکالیف پہنچی ہیں۔ اس نے اپنا حال عرض کیا۔ فرمایا:

"آپ نے بہت تکالیف اُٹھائی ہیں۔ یہ بات آپ میں قابلِ تعریف ہے۔ جس قدر ابتلاء ہوا ہے اسی قدر انعام بھی ہوگا۔ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔" (الحکم جلد ۵ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ار فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۲)

قرآن شریف میں جب کہ یہ صاف فرما دیا ہے کہ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا تو کیا ضروری نہ تھا کہ ان تنگیوں کی جن میں آج اسلام مُبتلا ہے انتہا ہوتی؟ اور یُسر کی حالت پیدا ہوتی۔ بےشک ضرور تھا چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۵ مورخہ ۲۴ر ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ اوّل)

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس قدر انسان اعلیٰ مراتب اور مدارج کو حاصل کرنا چاہتا ہے اُسی قدر اُس کو زیادہ محنت اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس استقلال اور ہمت ایک ایسی عمدہ چیز ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو انسان کامیابی کی منزلوں کو طے نہیں کرسکتا۔ اِس لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ پہلے مشکلات میں ڈالا جاوے۔ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِسی لئے فرمایا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۵ مورخہ ۱۷ر دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

ترجمہ از مرتب:۔ اِس میں ہر تزکیہ اختیار کرنے والے کے لئے بشارت ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب لوگ ایک زمانہ میں دُکھ اور تکلیف دیکھیں گے تو بعد میں وہ نفع اور بھلائی بھی دیکھیں گے اور دین و دُنیا میں ابتلاء دیکھنے کے بعد خوشحالی کا زمانہ بھی دیکھیں گے۔ (سرّ الخلافہ صفحہ ۳۷)

ساری لذت اور راحت دُکھ کے بعد آتی ہے۔ اِسی لئے قرآن شریف میں یہ قاعدہ بتایا ہے اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ اگر کسی راحت سے پہلے تکلیف نہیں تو وہ راحت راحت ہی نہیں رہتی۔ اسی طرح پر جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو عبادت میں لذت نہیں آتی ان کو پہلے اپنی جگہ سوچ لینا ضروری ہے کہ وہ عبادت کے لئے کس قدر دُکھ اور تکالیف اُٹھاتے ہیں۔ جس قدر دُکھ اور تکالیف انسان اُٹھائے گا وہی تبدیل صورت کے بعد لذت ہو جاتا ہے۔ میری مُراد ان دُکھوں سے نہیں کہ انسان اپنے آپ کو بیجا مشقتوں میں ڈالے اور مَا لَا یُطَاق تکالیف اُٹھانے کا دعویٰ کرے؛ ہرگز نہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ اوّل)

انسان کی زندگی کے ساتھ مکروہات کا سِلسلہ بھی لگا ہؤا ہے۔ اگر انسان چاہے کہ میری ساری عمر خوشی میں گذرے تو یہ ہو نہیں سکتا۔ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ یہ زندگی کا چکّر ہے جب تنگی آوے تو سمجھنا چاہیئے کہ اس کے بعد فراخی بھی ضرور آئے گی۔

(بدر جلد ۱ نمبر ۳۱ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ اوّل)

اِسلام نے بڑے بڑے مصائب کے دن گذارے ہیں۔ اب اس کا خزاں گذر چکا ہے اور اَب اسکے واسطے موسم بہار ہے۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ تنگی کے بعد فراخی آیا کرتی ہے مگر مُلّاں لوگ نہیں چاہتے کہ اِسلام اب بھی سرسبزی اختیار کرے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۲ مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

سُورَۃُ التِّین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ۝ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ۝

شجرۂ فطرتِ انسانی اصل میں توسط اور اعتدال پر واقع ہے اور ہر ایک افراط و تفریط سے جو قوائ حیوانیہ میں پایا جاتا ہے منزّہ ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۱۸۰ حاشیہ)

یہ تو ظاہر ہے کہ عالمِ صغیر اور عالمِ کبیر میں نہایت شدید تشابہ ہے اور قرآن سے انسان کا عالمِ صغیر ہونا ثابت ہے اور آیت لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ تقویمِ عالم کی متفرق خوبیوں اور حسنوں کا ایک ایک حصہ انسان کو دیکر بوجہ جامعیت جمیع شمائل و شیون عالم اُس کو احسن ٹھہرایا گیا ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۸۲، ۱۸۳ حاشیہ در حاشیہ)

عربی میں آدمی کو انسان کہتے ہیں یعنی جس میں دو اُنس ہیں ایک اُنس خدا کی اور ایک اُنس بنی نوع کی۔ اور اسی طرح ہندی میں اِس کا نام مانس ہے جو مانوس کا مخفف ہے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ انسان اپنے خدا سے طبعی اُنس رکھتا ہے اور مشرکانہ غلطی بھی دراصل اسی سچے خدا کی تلاش کی وجہ سے ہے۔

(نسیمِ دعوت صفحہ ۲۳)

آدمِ کامل بننے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کا خدا سے سچا اور پکّا تعلق ہو جب انسان ہر ایک حرکت اور سکون حکمِ الٰہی کے نیچے ہو کر کرتا ہے تو انسان خدا کا ہو جاتا ہے تب خدا تعالیٰ انسان کا والی وارث

ہو جاتا ہے اور پھر اس پر کوئی مخالفت سے دست اندازی نہیں کر سکتا لیکن وہ آدمی جو احکامِ الٰہی کی پرواہ نہیں کرتا خدا تعالیٰ بھی اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۵ مورخہ ۱۰ر فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

جب ہم انسان کو مہذّب دیکھتے ہیں تو کیوں اس کی جڑ تہذیب نہ بتائیں۔ قرآن شریف سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پیچھے وحشی بن گئے ۔میں کہتا ہوں کیا خدا تعالیٰ کو پہلا عمدہ نمونہ بنانا چاہیئے تھا یا خراب۔ اور آوّلُ الدّنِّ دُرْدٌ کا مصداق۔ خدا نے بُرا بنایا تھا اور پھر گھس گھس کر خود عمدہ بن گیا۔ خدا تعالیٰ کی شان میں گستاخی اور توہین ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۲)

خدا نے چاہا ہے کہ انسان خدا کے اخلاق پر چلے۔ جیسے وہ ہر ایک عیب اور بدی سے پاک ہے یہ بھی پاک ہو۔ جیسے اس میں عدل، انصاف اور علم کی صفت ہے وہی اس میں ہو اس لئے اس خلق کو احسن تقویم کہا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ جو انسان خدائی اخلاق اختیار کرتے ہیں وہ اِس آیت سے مراد ہیں اور اگر کفر کرے تو پھر اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اس کی جگہ ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۷ مورخہ ۶ر مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۹)

انسان اگر اللہ تعالیٰ کے لئے اپنی زندگی وقف نہ کرے اور اس کی مخلوق کے لئے نفع رساں نہ ہو تو یہ ایک بیکار اور نکمی ہستی ہو جاتی ہے۔ بھیڑ بکری بھی پھر اس سے اچھی ہے جو انسان کے کام تو آتی ہے لیکن یہ جب اشرف المخلوقات ہو کر اپنی نوع انسان کے کام نہیں آتا تو پھر بدترین مخلوق ہو جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ میں گرایا جاتا ہے پس یہ سچی بات ہے کہ اگر انسان میں یہ نہیں ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے اوامر کی اطاعت کرے اور مخلوق کو نفع پہنچاوے تو وہ جانوروں سے بھی گیا گذرا ہے اور بدترین مخلوق ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۱ مورخہ ۲۴ر اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

جب خدا تعالیٰ کسی ایسے دل کو دیکھتا ہے جس نے مخلوق کے لئے فائدہ رسانی کا مصمّم ارادہ کر لیا ہے تو وہ اسے کبھی ضائع نہیں کرتا۔ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ یہ بھی اس کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مخلوق کو فائدہ رسانی کے بعد اور خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے سے انسان پر یہ کلمہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ صادق آتا ہے اور اگر وہ نہیں کرتا ہے تو اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ہی میں رَدّ کیا جاتا ہے۔ اگر انسان میں یہ باتیں نہیں ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے اوامر کی اطاعت کرے اور مخلوق کو فائدہ پہنچاوے تو پھر کتّے، بھیڑ، بکری وغیرہ جانوروں میں اور اس میں کیا فرق ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۴ر اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۳۴)

انسان کو ہم نے نہایت درجہ کے اعتدال پر پیدا کیا ہے اور وہ اس صفتِ اعتدال میں تمام مخلوقات سے احسن و افضل ہے۔ (توضیح مرام صفحہ ۴۷)

سُورۃ العلق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

زیر آیت ۷، ۸

کَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ○ اَنۡ رَّاٰہُ اسۡتَغۡنٰی ○

ہم نے جو کیمیا کو شرک قرار دیا تھا تو اس کا یہ مطلب تھا کہ خدا تعالیٰ نہیں چاہتا کہ انسان مستغنی ہو۔ اسی لئے فرمایا اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ۔ اَنۡ رَّاٰہُ اسۡتَغۡنٰی ۔ وہ فرماتا ہے انسان سرکشی کرتا ہے جبکہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے۔ عبودیت کا الوہیت سے ایسا تعلق ہے کہ عَبد اپنے مولیٰ کا ذرہ ذرہ کے لئے محتاج ہے اور ایک دم خدا تعالیٰ کے سوا نہیں گذار سکتا۔ پس جو شخص ایسے اسباب تلاش کرتا ہے جن سے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ نہ رہے (اور توجہ مبنی ہے احتیاج پر) تو گویا شرک میں پڑتا ہے کیونکہ اپنا قبلہ مقصود ایک کے سوا دوسرا بھی بناتا ہے۔ مومن تو وہ ہے جو ایسے امور کا نام تک نہ لے جن سے توحید میں رخنہ اندازی ہوتی ہو۔ اس بات کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ بیمار اس وقت تک طبیب کے پاس رہتا ہے جب تک کہ بیمار ہے۔ پس عبد بھی اسی وقت تک متوجہ رہے گا جب تک عبودیت کی حالت باقی رہے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۲۲ مورخہ ۳۰ رمئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

زیر آیت ۱۰، ۱۱

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یَنۡہٰی ○ عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی ○

قضاء عمری کے متعلق فرمایا:۔

میرے نزدیک یہ فضول باتیں ہیں۔ ان کی نسبت وہی جواب ٹھیک ہے جو کہ حضرت علیؓ نے ایک شخص کو دیا تھا جبکہ ایک شخص ایک ایسے وقت نماز ادا کر رہا تھا جس وقت میں نماز جائز نہیں اس کی شکایت حضرت علیؓ کے پاس ہوئی تو آپ نے اُسے جواب دیا کہ مَیں اس آیت کا مصداق نہیں بننا چاہتا اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ

يَنْهٰى۔ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى یعنی تو نے دیکھا اس شخص کو جو ایک نماز پڑھتے بندے کو منع کرتا ہے۔

نماز جو رہ جائے اس کا تدارک نہیں ہو سکتا ہاں روزہ کا ہو سکتا ہے۔

اور جو شخص عمدًا سال بھر اس لئے نماز کو ترک کرتا ہے کہ قضاء عُمری والے دن ادا کر لوں گا تو وہ گنہگار ہے اور جو شخص نادم ہو کر توبہ کرتا ہے اور اِس نیت سے پڑھتا ہے کہ آئندہ نماز ترک نہ کروں گا تو اس کے لئے حرج نہیں۔ ہم تو اس معاملہ میں حضرت علیؓ ہی کا جواب دیتے ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۴)

قضاء عمری پر سوال ہوا کہ جمعۃ الوداع کے دن لوگ تمام نمازیں پڑھتے ہیں کہ گذشتہ نمازیں جو ادا نہیں کیں ان کی تلافی ہو جاوے۔ اس کا کچھ وجود ہے یا کہ نہیں۔

فرمایا: ایک فضول امر ہے۔ مگر ایک دفعہ ایک شخص بے وقت نماز پڑھ رہا تھا کسی شخص نے حضرت علیؓ کو کہا کہ آپ خلیفۂ وقت ہیں اسے منع کیوں نہیں کرتے۔ فرمایا کہ مَیں ڈرتا ہوں کہ کہیں اِس آیت کے نیچے ملزم نہ بنایا جاؤں اَرَءَيْتَ الَّذِیْ يَنْهٰى۔ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى۔ ہاں اگر کسی شخص نے عمدًا نماز اِس لئے ترک کی ہے کہ قضاء عمری کے دن پڑھ لوں گا تو اس نے ناجائز کیا اور اگر ندامت کے طور پر تدارک مافات کرتا ہے تو پڑھنے دو کیوں منع کرتے ہو آخر دعا ہی کرتا ہے ہاں اس میں پست ہمتی ضرور ہے۔ پھر دیکھو منع کرنے سے کہیں تم بھی اِس آیت کے نیچے نہ آجاؤ۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ ر اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

ایک شخص نے دریافت کیا کہ آجکل طاعون کی کثرت کے وقت اکثر سکھوں اور ہندوؤں کے گاؤں میں یہ علاج کیا جاتا ہے کہ اذانِ نماز بڑے زور اور کثرت سے ہر ایک گھر میں دلوائی جاتی ہے۔ یہ فعل کیسا ہے؟

فرمایا:۔

اذان سراسر اللہ تعالیٰ کا پاک نام ہے۔ ہمیں تو حضرت علیؓ کا جواب یاد آتا ہے کہ آپؓ نے کہا تھا کہ مَیں اِس اَرَءَيْتَ الَّذِیْ يَنْهٰى۔ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى کا مصداق ہونا نہیں چاہتا۔ ہمارے نزدیک بانگ میں بڑی شوکت ہے اور اس کے دلوانے میں حرج نہیں (حدیث میں آیا ہے کہ اِس سے شیطان بھاگتا ہے)۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۶)

○

سُورۃ القدر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۝

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۝ وَمَاۤ اَدۡرٰٮكَ مَا لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ ۝ لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ ۙ خَيۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ ۝ تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓٮِٕكَةُ وَالرُّوۡحُ فِيۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ ۚ مِنۡ كُلِّ اَمۡرٍ ۝ سَلٰمٌ ۛ هِىَ حَتّٰى مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ۝

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ یہ لیلۃ القدر اگرچہ اپنے مشہور معنوں کے رُو سے ایک بزرگ رات ہے لیکن قرآنی اشارات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کی ظلمانی حالت بھی اپنی پوشیدہ خوبیوں میں لیلۃ القدر کا ہی حکم رکھتی ہے اور اس ظلمانی حالت کے دنوں میں صدق اور صبر اور زُہد اور عبادت خدا کے نزدیک بڑا قدر رکھتا ہے اور وہی ظلمانی حالت تھی کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعثت کے وقت تک اپنے کمال کو پہنچ کر ایک عظیم الشّان نُور کے نزول کو چاہتی تھی اور اسی ظلمانی حالت کو دیکھ کر اور ظلمت زدہ بندوں پر رحم کر کے صفتِ رحمانیت نے جوش مارا اور آسمانی برکتیں زمین کی طرف متوجّہ ہوئیں سو وہ ظلمانی حالت دُنیا کے لئے مبارک ہوگئی اور دُنیا نے اس سے ایک عظیم الشّان رحمت کا حِصّہ پایا کہ ایک کامل انسان اور سیّد الرسل کہ جس سا کوئی پَیدا نہ ہُوا اور نہ ہوگا دُنیا کی ہدایت کے لئے آیا اور دُنیا کے لئے اس روشن کتاب کو لایا جس کی نظیر کسی آنکھ نے نہیں دیکھی پس یہ خدا کی کمال روحانیت کی ایک بزرگ تجلّی تھی کہ جو اُس نے ظلمت اور تاریکی کے وقت ایسا عظیم الشّان نور نازل کیا جس کا نام فرقان ہے جو حق اور باطل میں فرق کرتا ہے جس نے حق کو موجود اور باطل کو نابُود کر کے دکھلا دیا۔ وہ اس وقت زمین پر نازل ہُوا جب زمین ایک

موتِ رُوحانی کے ساتھ مَر چکی تھی اور بَر اور بحر میں ایک بھاری فساد واقع ہو چکا تھا پس اس نے نزول فرما کروہ کام کر دکھایا جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے آپ اشارہ فرما کر کہا ہے اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا[1] یعنی زمین مَرگئی تھی اَب خدا اس کو نئے سرے سے زندہ کرتا ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۵۱ حاشیہ)

اِس سُورت کا حقیقی مطلب جو ایک بھاری صداقت پر مشتمل ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں... اِس قاعدہ کُلّی کا بیان فرمانا ہے کہ دُنیا میں کب اور کس وقت میں کوئی کتاب اور پیغمبر بھیجا جاتا ہے۔ سو وہ قاعدہ یہ ہے کہ جب دلوں پر ایک ایسی غلیظ ظلمت طاری ہو جاتی ہے کہ یکبارگی تمام دل رُو بدنیا ہو جاتے ہیں اور پھر رُو بدنیا ہونے کی شامت سے اُن کے تمام عقائد و اعمال و افعال و اخلاق و آداب اور نیتوں اور ہمتوں میں اختلالِ کُلّی راہ پا جاتا ہے اور محبتِ الٰہیہ دلوں سے بکلّی اُٹھ جاتی ہے اور یہ عام وَبا ایسا پھیلتا ہے کہ تمام زمانہ پر رات کی طرح اندھیرا چھا جاتا ہے تو ایسے وقت میں یعنی جب وہ اندھیرا اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ رحمتِ الٰہیہ اس طرف متوجہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو اُس اندھیری سے خلاصی بخشے اور جن طریقوں سے اُن کی اصلاح قرینِ مصلحت ہے ان طریقوں کو اپنے کلام میں بیان فرماوے۔ سو اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے آیتِ ممدوحہ میں اشارہ فرمایا کہ ہم نے قرآن کو ایک ایسی رات میں نازل کیا ہے جس میں بندوں کی اِصلاح اور بھلائی کے لئے صراطِ مستقیم کی کیفیت بیان کرنا اور شریعت اور دین کی حدود کو بتانا ازبس ضروری تھا یعنی جب گمراہی کی تاریکی اِس حد تک پہنچ چکی تھی کہ جیسی سخت اندھیری رات ہوتی ہے تو اس وقت رحمتِ الٰہی اس طرف متوجہ ہوئی کہ اس سخت اندھیری کے اُٹھانے کے لئے ایسا قوی نور نازل کرکے اپنے بندوں کو وہ عظیم الشان نور عطا کیا کہ جو شکوک اور شبہات کی اندھیری کو دُور کرتا ہے اور روشنی کو پھیلاتا ہے۔ اِس جگہ جاننا چاہیئے کہ اس باطنی لیلۃ القدر کو ظاہری لیلۃ القدر سے کہ جو عند العوام مشہور ہے کچھ منافات نہیں بلکہ عادت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ وہ ہر ایک کام مناسبت سے کرتا ہے اور حقیقتِ باطنی کے لئے جو ظاہری صورت مناسب ہو وہ اس کو عطا فرماتا ہے۔ سو چونکہ لیلۃ القدر کی حقیقتِ باطنی وہ کمال ضلالت کا وقت جس میں عنایتِ الٰہیہ اصلاحِ عالم کی طرف متوجہ ہوتی ہے سو خدا تعالیٰ نے بغرض تحقق مناسبت اس زمانۂ ضلالت کی آخری جُز کو جس میں ضلالت اپنے نکتۂ کمال تک پہنچ گئی تھی خارجی طور پر ایک رات میں مقرر کیا اور یہ رات وہ رات تھی جس میں خداوند تعالیٰ نے دُنیا کو کمال ضلالت میں پا کر اپنے پاک کلام کو اپنے نبی پر اُتارنا ارادہ فرمایا سو اس

---

[1] سورۃ الحدید: ۱۸

جہت سے نہایت درجہ کی برکات اُس رات میں پیدا ہو گئی یا یُوں کہو کہ قدیم سے اسی ارادۂ قدیم کے رُو سے پیدا تھی اور پھر اس خاص رات میں وہ قبولیت اور برکت ہمیشہ کے لئے باقی رہی اور پھر بعد اس کے فرمایا کہ وہ ظلمت کا وقت کہ جو اندھیری رات سے مشابہ تھا جس کی تنویر کے لئے کلامِ الٰہی کا نور اُترا۔ اس میں بباعث نزولِ قرآن کی ایک رات ہزار مہینہ سے بہتر بنائی گئی۔ اور اگر معقولی طور پر نظر کریں تب بھی ظاہر ہے کہ ضلالت کا زمانہ عبادت اور طاعتِ الٰہی کے لئے دوسرے زمانہ سے زیادہ تر موجب قُرب و ثواب ہے پس وہ دوسرے زمانوں سے زیادہ تر افضل ہے اور اسکی عبادتیں بباعث شدت و صعوبت اپنی قبولیت سے قریب ہیں اور اس زمانہ کے عابد رحمتِ الٰہی کے زیادہ تر مستحق ہیں کیونکہ سچے عابدوں اور ایمانداروں کا مرتبہ ایسے ہی وقت میں عند اللہ متحقق ہوتا ہے کہ جب تمام زمانہ پر دُنیا پرستی کی ظلمت طاری ہو اور سچ کی طرف نظر ڈالنے سے جان جانے کا اندیشہ ہو اور یہ بات خود ظاہر ہے کہ جب دِل افسردہ اور مُردہ ہو جائیں اور سب کسی کو جیفہ دُنیا ہی پیارا دکھائی دیتا ہو اور ہر طرف اِس رُوحانی موت کی زہرناک ہَوا چل رہی ہو اور محبّتِ الٰہیہ یک لخت دلوں سے اُٹھ گئی ہو اور رُو بحق ہونے میں اور وفادار بندہ بننے میں کسی نوع کے ضرر متصوّر ہوں نہ کوئی اس راہ کا رفیق نظر آوے اور نہ کوئی اِس طریق کا ہمدم ملے بلکہ اس راہ کی خواہش کرنے والے پر موت تک پہنچانے والی مصیبتیں دکھائی دیں اور لوگوں کی نظر میں ذلیل اور حقیر ٹھہرتا ہو تو ایسے وقت میں ثابت قدم ہو کر اپنے محبوبِ حقیقی کی طرف رُخ کر لینا اور ناہموار عزیزوں اور دوستوں اور خویشوں اور اقارب کی رفاقت چھوڑ دینا اور غربت اور بے کسی اور تنہائی کی تکلیفوں کو اپنے سر پر قبول کر لینا اور دُکھ پانے اور ذلیل ہونے اور مرنے کی کچھ پرواہ نہ کرنا حقیقت میں ایسا کام ہے کہ بجز اولو العزم مرسلوں اور نبیوں اور صدّیقوں کے جن پر فضلِ احدیت کی بارشیں ہوتی ہیں اور جو اپنے محبوب کی طرف بلا اختیار کھینچے جاتے ہیں اور کسی سے انجام پذیر نہیں ہوسکتا اور حقیقت میں ایسے وقت کی ثابت قدمی اور صبر اور عبادتِ الٰہی کا ثواب بھی وہ ملتا ہے کہ جو کسی دوسرے وقت میں ہرگز نہیں مل سکتا سو اسی جہت سے لیلۃ القدر کے ایسے ہی زمانہ میں بناء ڈالی گئی کہ جس میں بباعث سخت ضلالت کے نیکی پر قائم ہونا کسی بڑے جوانمرد کا کام تھا۔ یہی زمانہ تھا جس میں جوانمردوں کی قدر و منزلت ظاہر ہوتی ہے اور نامردوں کی ذلت بہ پایۂ ثبوت پہنچتی ہے۔ یہی پُر ظلمت زمانہ ہے جو اندھیری رات کی طرح ایک خوفناک صورت میں ظاہر ہوتا ہے سو اس طغیانی کی حالت میں کہ جو بڑے اِبتلاء کا وقت ہے وہی لوگ ہلاکت سے بچتے ہیں جن پر عنایاتِ الٰہیہ کا ایک خاص سایہ ہوتا ہے پس انہی موجبات سے خدائے تعالیٰ نے اِس زمانہ کی ایک جُز کو جس میں ضلالت کی تاریکی غایت درجہ تک پہنچ چکی تھی لیلۃ القدر مقرر کیا اور پھر بعد اس کے جس سماوی برکات سے اس ضلالت

کا تدارک کیا جاتا ہے۔ اس کی کیفیت ظاہر فرمائی اور بیان فرمایا کہ اس اَرحم الراحمین کی یُوں عادت ہے کہ جب ظلمت اپنے کمال تک پہنچ جاتی ہے اور خطِ تاریکی کا اپنے اِنتہائی نقطہ پر جا ٹھہرتا ہے یعنی اس غایت درجہ پر جس کا نام باطنی طور پر لیلۃ القدر ہے تب خداوند تعالیٰ رات کے وقت میں کہ جس کی ظلمت باطنی ظلمت سے مشابہ ہے عالَمِ ظلمانی کی طرف توجّہ فرماتا ہے اور اس کے اِذنِ خاص سے ملائکہ اور رُوح القدس زمین پر اُترتے ہیں اور خلق اللہ کی اِصلاح کے لئے خدائے تعالیٰ کا نبی ظہور فرماتا ہے تب وہ نبی آسمانی نور پاکر خلق اللہ کو ظلمت سے باہر نکالتا ہے اور جب تک وہ نور اپنے کمال تک نہ پہنچ جائے تب تک ترقی پر ترقی کرتا جاتا ہے اور اسی قانون کے مطابق وہ اَولیاء بھی پَیدا ہوتے ہیں کہ جو ارشاد اور ہدایتِ خلق کے لئے بھیجے جاتے ہیں کیونکہ وہ انبیاء کے وارث ہیں سو ان کے نقشِ قدم پر چلائے جاتے ہیں۔ اَب جاننا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ نے اِس بات کو بڑے پُر زور الفاظ سے قرآن شریف میں بیان کیا ہے کہ دُنیا کی حالت میں قدیم سے ایک مَدوجزر واقع ہے اور اسی کی طرف اشارہ ہے جو فرمایا ہے تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ[1] یعنی اے خدا کبھی تُو رات کو دن میں اور کبھی دن کو رات میں داخل کرتا ہے یعنی ضلالت کے غلبہ پر ہدایت اور ہدایت کے غلبہ پر ضلالت کو پَیدا کرتا ہے اور حقیقت اِس مَدوجزر کی یہ ہے کہ کبھی بامر اللہ تعالیٰ انسانوں کے دلوں میں ایک صورت اِنقباض اور محجوبیّت کے پَیدا ہو جاتی ہے اور دُنیا کی آرائشیں اُن کو عزیز معلوم ہونے لگتی ہیں اور تمام ہمّتیں اُن کی اپنی دُنیا کے درست کرنے میں اور اُس کے عیش حاصل کرنے کی طرف مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ ظلمت کا زمانہ ہے جس کے انتہائی نقطہ کی رات لیلۃ القدر کہلاتی ہے اور وہ لیلۃ القدر ہمیشہ آتی ہے مگر کامل طور پر اُس وقت آئی تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا دِن آپہنچا تھا کیونکہ اس وقت تمام دُنیا پر ایسی کامل گمراہی کی تاریکی پھیل چکی تھی جس کی مانند کبھی نہیں پھیلی تھی اور نہ آئندہ کبھی پھیلے گی جب تک قیامت نہ آوے۔ غرض جب یہ ظلمت اپنے اُس انتہائی نقطہ تک پہنچ جاتی ہے کہ جو اس کے لئے مقدر ہے تو عنایتِ الٰہیہ تنویرِ عالَم کی طرف متوجّہ ہوتی ہے اور کوئی صاحبِ نور دُنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا جاتا ہے اور جب وہ آتا ہے تو اس کی طرف مُستعد رُوحیں کھنچی چلی آتی ہیں اور پاک فطرتیں خود بخود رُو بحق ہوتی چلی جاتی ہیں اور جیسا کہ ہرگز ممکن نہیں کہ شمع کے روشن ہونے سے پروانہ اس طرف رُخ نہ کرے ایسا ہی یہ بھی غیر ممکن ہے کہ بروقت ظہور کسی صاحبِ نور کے صاحبِ فطرتِ سلیمہ کا اس کی طرف بارادت متوجّہ نہ ہو۔ اِن آیات

---

[1] سورۃ آلِ عمران : ۲۸

میں جو خدائے تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے جو بنیاد دعویٰ ہے اس کا خلاصہ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت ایک ایسی ظلمانی حالت پر زمانہ آچکا تھا کہ جو آفتابِ صداقت کے ظاہر ہونے کے متقاضی تھے۔ اِس جہت سے خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں اپنے رسول کا بار بار یہی کام بیان کیا ہے کہ اس نے زمانہ کو سخت ظلمت میں پایا اور پھر ظلمت سے ان کو باہر نکالا۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۳۲ تا ۵۴۰)

عادت اللہ اِس طرح پر جاری ہے کہ جب کوئی رسول یا نبی یا محدّث اصلاحِ خلق اللہ کے لئے آسمان سے اُترتا ہے تو ضرور اس کے ساتھ اور اس کے ہمرکاب ایسے فرشتے اُترا کرتے ہیں کہ جو مُستعد دلوں میں ہدایت ڈالتے ہیں اور نیکی کی رغبت دلاتے ہیں اور برابر اُترتے رہتے ہیں جب تک کفر و ضلالت کی ظلمت دُور ہو کر ایمان اور راست بازی کی صبح صادق نمودار ہو جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ فِیْھَا بِاِذْنِ رَبِّھِمْ مِّنْ کُلِّ اَمْرٍ۔ سَلٰمٌ ھِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ سو ملائکہ اور رُوح القدس کا تنزّل یعنی آسمان سے اُترنا اسی وقت ہوتا ہے جب ایک عظیم الشان آدمی خلعتِ خلافت پہن کر اور کلامِ الٰہی سے شرف پاکر زمین پر نزول فرماتا ہے۔ رُوح القدس خاص طور پر اس خلیفہ کو ملتی ہے اور جو اس کے ساتھ ملائکہ ہیں وہ تمام دُنیا کے مُستعد دلوں پر نازل کئے جاتے ہیں تب دُنیا میں جہاں جہاں جوہرِ قابل پائے جاتے ہیں سب پر اُس نور کا پرتو پڑتا ہے اور تمام عالم میں ایک نورانیت پھیل جاتی ہے اور فرشتوں کی پاک تاثیر سے خود بخود دلوں میں نیک خیال پیدا ہونے لگتے ہیں اور توحید پیاری معلوم ہونے لگتی ہے اور سیدھے دِلوں میں راست پسندی اور حق جوئی کی ایک رُوح پھونک دی جاتی ہے اور کمزوروں کو طاقت عطا کی جاتی ہے اور ہر طرف ایسی ہَوا چلنی شروع ہو جاتی ہے کہ جو اس مُصلح کے مُدّعا اور مقصد کو مدد دیتی ہے۔ ایک پوشیدہ ہاتھ کی تحریک سے خود بخود لوگ صلاحیت کی طرف کھسکتے چلے آتے ہیں اور قوموں میں ایک جنبش سی شروع ہو جاتی ہے تب ناسمجھ لوگ گمان کرتے ہیں کہ دُنیا کے خیالات نے خود بخود راستی کی طرف پلٹا کھایا ہے لیکن درحقیقت یہ کام اُن فرشتوں کا ہوتا ہے کہ جو خلیفۃ اللہ کے ساتھ آسمان سے اُترتے ہیں اور حق کے قبول کرنے اور سمجھنے کے لئے غیر معمولی طاقتیں بخشتے ہیں۔ سوئے ہوئے لوگوں کو جگا دیتے ہیں اور مستوں کو ہوشیار کرتے ہیں اور بہروں کے کان کھولتے ہیں اور مُردوں میں زندگی کی رُوح پھونکتے ہیں اور اُن کو جو قبروں میں ہیں باہر نکال لاتے ہیں تب لوگ یک دفعہ آنکھیں کھولنے لگتے ہیں اور ان کے دلوں پر وہ باتیں کھلنے لگتی ہیں جو پہلے مخفی تھیں اور درحقیقت یہ فرشتے اس خلیفۃ اللہ سے الگ نہیں ہوتے۔ اُسی چہرہ کا نور اور اُسی کی

ہمت کے آثار جلیہ ہوتے ہیں جو اپنی قوتِ مقناطیسی سے ہر ایک مناسبت رکھنے والے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں خواہ وہ جسمانی طور پر نزدیک ہو یا دُور ہو اور خواہ آشنا ہو یا بکلی بیگانہ اور نام تک بے خبر ہو۔ غرض اس زمانہ میں جو کچھ نیکی کی طرف حرکتیں ہوتی ہیں اور راستی کے قبول کرنے کے لئے جوش پیدا ہوتے ہیں خواہ وہ جوش ایشیائی لوگوں میں پیدا ہوں یا یورپ کے باشندوں میں یا امریکہ کے رہنے والوں میں وہ درحقیقت انہی فرشتوں کی تحریک سے جو اُس خلیفۃ اللہ کے ساتھ اُترتے ہیں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہی الٰہی قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ (فتح اسلام صفحہ ۱۰ تا ۱۲ حاشیہ)

خدا تعالیٰ سورۃ القدر میں بیان فرماتا ہے بلکہ مومنین کو بشارت دیتا ہے کہ اُس کا کلام اور اس کا نبی لیلۃ القدر میں آسمان سے اُتارا گیا ہے اور ہر ایک مصلح اور مجدد جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے وہ لیلۃ القدر میں ہی اُترتا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ لیلۃ القدر کیا چیز ہے۔ لیلۃ القدر اُس ظلمانی زمانہ کا نام ہے جس کی ظلمت کمال کی حد تک پہنچ جاتی ہے اس لئے وہ زمانہ بالطبع تقاضا کرتا ہے کہ ایک نور نازل ہو جو اس کی ظلمت کو دُور کرے۔ اس زمانہ کا نام بطور استعارہ کے لیلۃ القدر رکھا گیا ہے مگر درحقیقت یہ رات نہیں ہے یہ ایک زمانہ ہے جو بوجہ ظلمت رات کا ہمرنگ ہے۔ نبی کی وفات یا اس کے رُوحانی قائم مقام کی وفات کے بعد جب ہزار مہینہ جو بشری عمر کے دَور کو قریب الاختتام کرنے والا اور انسانی حواس کے الوداع کی خبر دینے والا ہے گذر جاتا ہے تو یہ رات اپنا رنگ جمانے لگتی ہے تب آسمانی کارروائی سے ایک یا کئی مصلحوں کی پوشیدہ طور پر تخم ریزی ہو جاتی ہے جو نئی صدی کے سر پر ظاہر ہونے کے لئے اندر ہی اندر تیار ہو رہے ہیں۔ اسی طرف اللہ جلّ شانہٗ اشارہ فرماتا ہے کہ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ یعنی اس لیلۃ القدر کے نور کو دیکھنے والا اور وقت کے مصلح کی صحبت سے شرف حاصل کرنے والا اُس اسّی برس کے بڈھے سے اچھا ہے جس نے اس نورانی وقت کو نہیں پایا اور اگر ایک ساعت بھی اس وقت کو پا لیا ہے تو یہ ایک ساعت اُس ہزار مہینے سے بہتر ہے جو پہلے گذر چکے۔ کیوں بہتر ہے! اِس لئے کہ اس لیلۃ القدر میں خدا تعالیٰ کے فرشتے اور رُوح القدس اس مصلح کے ساتھ ربِّ جلیل کے اِذن سے آسمان سے اُترتے ہیں نہ عبث طور پر بلکہ اِس لئے کہ تا مستعد دلوں پر نازل ہوں اور سلامتی کی راہیں کھولیں سو وہ تمام راہوں کے کھولنے اور تمام پردوں کے اُٹھانے میں مشغول رہتے ہیں یہاں تک کہ ظلمتِ غفلت دُور ہو کر صبحِ ہدایت نمودار ہو جاتی ہے۔ (فتح اسلام صفحہ ۵۴، ۵۵)

ایک نہایت لطیف نکتہ جو سُورۃ القدر کے معانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اِس سُورت میں صاف اور صریح لفظوں میں فرما دیا ہے کہ جس وقت کوئی آسمانی مصلح

زمین پر آتا ہے تو اس کے ساتھ فرشتے آسمان سے اُتر کر مستعد لوگوں کو حق کی طرف کھینچتے ہیں پس اِن آیات کے مفہوم سے یہ جدید فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ اگر سخت ضلالت اور غفلت کے زمانہ میں یک دفعہ ایک خارق عادت طور پر انسانوں کے قویٰ میں خود بخود مذہب کی تفتیش کی طرف حرکت پیدا ہونی شروع ہو جائے تو وہ اِس بات کی علامت ہوگی کہ کوئی آسمانی مصلح پیدا ہوگیا ہے کیونکہ بغیر رُوح القدس کے نزول کے وہ حرکت پیدا ہونا ممکن نہیں اور وہ حرکت حسبِ استعداد وطبائع دو قسم کی ہوتی ہے حرکتِ تامہ اور حرکتِ ناقصہ۔ حرکتِ تامہ وہ حرکت ہے جو رُوح میں صفائی اور سادگی بخش کر اور عقل اور فہم کو کافی طور پر تیز کر کے رُوبحق کر دیتا ہے اور حرکتِ ناقصہ وہ ہے جو رُوح القدس کی تحریک سے عقل اور فہم تو کسی قدر تیز ہو جاتا ہے مگر بباعث عدمِ سلامت استعداد کے وہ رُوبحق نہیں ہو سکتا بلکہ مصداق اِس آیت کا ہو جاتا ہے کہ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا[1] یعنی عقل اور فہم کے جنبش میں آنے سے پہلی حالت اُس شخص کی پہلی حالت سے بدتر ہو جاتی ہے جیسا کہ تمام نبیوں کے وقت میں یہی ہوتا رہا کہ جب اُن کے نزول کے ساتھ ملائک کا نزول ہوا تو ملائکہ کی اندرونی تحریک سے ہر ایک طبیعت عام طور پر جنبش میں آگئی تب جو لوگ راستی کے فرزند تھے وہ اُن راست بازوں کی طرف کھینچے چلے آئے اور جو شرارت اور شیطان کی ذُریّت تھے وہ اس تحریک سے خوابِ غفلت سے جاگ تو اُٹھے اور دینیات کی طرف متوجہ بھی ہوگئے لیکن بباعث نقصان استعداد حق کی طرف رُخ نہ کر سکے۔ سو فعل ملائک کا جو ربّانی مصلح کے ساتھ اُترتے ہیں ہر ایک انسان پر ہوتا ہے لیکن اِس فعل کا نیکوں پر نیک اثر اور بدوں پر بد اثر پڑتا ہے ؎

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست ✦ در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

اور جیسا کہ ہم ابھی اُوپر بیان کر چکے ہیں یہ آیتِ کریمہ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا اسی مختلف طور کے اثر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ہر نبی کے نزول کے وقت ایک لیلۃ القدر ہوتی ہے جس میں وہ نبی اور وہ کتاب جو اس کو دی گئی ہے آسمان سے نازل ہوتی ہے اور فرشتے آسمان سے اُترتے ہیں لیکن سب سے بڑی لیلۃ القدر وہ ہے جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی ہے۔ درحقیقت اس لیلۃ القدر کا دامن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے قیامت تک پھیلا ہوا ہے اور جو کچھ انسانوں میں دِلی اور دماغی قویٰ کی جنبش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے آج تک ہو رہی ہے وہ لیلۃ القدر کی تاثیریں ہیں

---

[1] سُورۃ البقرۃ : ۱۱

صرف اِتنا فرق ہے کہ سعیدوں کے عقلی قوای میں کامل اور مستقیم طور پر وہ جنبشیں ہوتی ہیں اور اشقیاء کے عقلی قوای ایک کج اور غیر مستقیم طور سے جنبش میں آتی ہیں اور جس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی نائب دُنیا میں پیدا ہوتا ہے تو یہ تحریکیں ایک بڑی تیزی سے اپنا کام کرتی ہیں بلکہ اُسی زمانہ سے کہ وہ نائب رِحمِ مادر میں آوے پوشیدہ طور پر انسانی قوای کچھ کچھ جنبش شروع کرتی ہیں اور حسبِ استعداد اُن میں ایک حرکت پیدا ہوجاتی ہے اور اس نائب کو نیابت کے اختیارات ملنے کے وقت تو وہ جنبش نہایت تیز ہو جاتی ہے۔ پس نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزول کے وقت جو لیلۃ القدر مقرر کی گئی ہے وہ درحقیقت اس لیلۃ القدر کی ایک شاخ ہے یا یُوں کہو کہ اس کا ایک ظِل ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس لیلۃ القدر کی نہایت درجہ کی شان بلند کی ہے جیساکہ اس کے حق میں یہ آیتِ کریمہ ہے کہ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ[1] یعنی اس لیلۃ القدر کے زمانہ میں جو قیامت تک ممتد ہے ہر ایک حکمت اور معرفت کی باتیں دُنیا میں شائع کردی جائیں گی اور انواع و اقسام کے علومِ غریبہ و فنونِ نادرہ و صناعاتِ عجیبہ صفحۂ عالَم میں پھیلا دئے جائیں گے اور انسانی قوای میں موافق ان کی مختلف استعدادوں اور مختلف قسم کے امکان بسطتِ علم اور عقل کے جو کچھ لیاقتیں مخفی ہیں یا جہاں تک وہ ترقی کرسکتے ہیں سب کچھ بمنصۂ ظہور لایا جائے گا لیکن یہ سب کچھ ان دنوں میں پُرزور تحریکوں سے ہوتا رہے گا کہ جب کوئی نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں پیدا ہوگا۔ درحقیقت اِسی آیت کو سورۃ الزلزال میں مفصّل طور پر بیان کیا گیا ہے کیونکہ سورۃ الزلزال سے پہلے سورۃ القدر نازل کرکے یہ ظاہر فرمایا گیا ہے کہ سُنّت اللہ اس طرح پر جاری ہے کہ خدائے تعالیٰ کا کلام لیلۃ القدر میں ہی نازل ہوتا ہے اور اس کا نبی لیلۃ القدر میں ہی دُنیا میں نزول فرماتا ہے اور لیلۃ القدر میں ہی وہ فرشتے اُترتے ہیں جن کے ذریعہ سے دُنیا میں نیکی کی طرف تحریکیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ ضلالت کی پُرظلمت رات سے شروع کرکے طلوعِ صبحِ صداقت تک اسی کام میں لگے رہتے ہیں کہ مستعد دِلوں کو سچائی کی طرف کھینچتے رہیں۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۱۰۱ تا ۱۱۱)

خدائے تعالیٰ نے میرے پر یہ نکتہ معارفِ قرآنیہ کا ظاہر کیا کہ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ کے صرف یہی معنی نہیں کہ ایک بابرکت رات ہے جس میں قرآن شریف اُترا بلکہ باوجود ان معنوں کے جو بجائے خود صحیح ہیں اِس آیت کے بطن میں دوسرے معنے بھی ہیں جو رسالہ فتحِ اسلام میں درج کئے گئے ہیں۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۳۱۳، ۳۱۴)

---

[1] سورۃ الدخان : ۵

خدائے تعالیٰ نے اس عاجز پر ظاہر کیا ہے کہ پہلے معنے لیلۃ القدر کے جو علماء کرتے ہیں وہ بھی مسلّم اور بجا ہیں اور ساتھ اُن کے یہ بھی معنے ہیں اور ان دونوں میں کچھ منافات نہیں۔ قرآن شریف ظہر بھی رکھتا ہے اور بطن بھی اور صدہا معارف اس کے اندر پوشیدہ ہیں پس اگر اِس عاجز نے تفہیم الٰہی سے لیلۃ القدر کے یہ معنے کئے تو کہاں سے سمجھا گیا کہ پہلے معنوں سے انکار کیا ہے۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ خیر القرون نہیں کہلاتا؟ کیا اس زمانہ کی عبادات ثواب میں بڑھ کر نہیں تھیں؟ کیا اس زمانہ میں نصرتِ دین کے لئے فرشتے نازل نہیں ہوتے تھے؟ کیا رُوح الامین نازل نہیں ہوتا تھا؟ پس ظاہر ہے کہ لیلۃ القدر کے تمام آثار و انوار و برکات اُس زمانہ میں موجود تھے۔ ایک ظلمت بھی تھی جس کے دُور کرنے کے لئے یہ انوار و ملائک اور رُوح الامین اور طرح طرح کی روشنی نازل ہو رہی تھی۔ پھر اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مقدس زمانہ کا نام بھی الہامِ الٰہی سے لیلۃ القدر ظاہر کیا گیا تو اس سے کونسی قباحت لازم آگئی؟ جو شخص قرآن شریف کے ایک معنی کو مسلّم رکھ کر ایک دوسرا لطیف نکتہ اس کا بیان کرتا ہے تو کیا اس کا نام مُلحد رکھنا چاہیئے؟ اِس خیال کے آدمی بلاشبہ قرآن شریف کے دشمن اور اس کے اعجاز کے مُنکر ہیں۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۴۲۰، ۴۲۱)

زمانہ کے فساد کے وقت جب کوئی مصلح آتا ہے اُس کے ظہور کے وقت پر آسمان سے ایک اِنتشار روحانیت ہوتا ہے یعنی اس کے اُترنے کے ساتھ زمین پر بھی ایک نور اُترتا ہے اور مُستعد دلوں پر نازل ہوتا ہے تب دُنیا خود بخود بشرط استعداد نیکی اور سعادت کے طریقوں کی طرف رغبت کرتی ہے اور ہر یک دل تحقیق اور تدقیق کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور نامعلوم اسباب سے طلبِ حق کے لئے ہر یک طبیعتِ مستعدہ میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے۔ غرض ایک ایسی ہَوا چلتی ہے جو مستعد دلوں کو آخرت کی طرف ہلا دیتی ہے اور سوئی ہوئی قوتوں کو جگا دیتی ہے اور زمانہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک اِنقلابِ عظیم کی طرف حرکت کر رہا ہے۔ سو یہ علامتیں اِس بات پر شاہد ہوتی ہیں کہ وہ مصلح دُنیا میں پیدا ہو گیا پھر جس قدر آنے والا مصلح عظیم الشان ہو یہ غیبی تحریکات قوت سے مستعد دلوں میں اپنا کام کرتی ہیں ہر یک سعید الفِطرت جاگ اُٹھتا ہے اور نہیں جانتا ہے کہ اس کو کس نے جگایا۔ ہر یک صحیح الجبلت اپنے اندر ایک تبدیلی پاتا ہے اور نہیں معلوم کر سکتا کہ یہ تبدیلی کیونکر پیدا ہوئی۔ غرض ایک جُنبش سی دِلوں میں شروع ہو جاتی ہے اور نادان خیال کرتے ہیں کہ یہ جُنبش خود بخود پیدا ہو گئی لیکن درپردہ ایک رسول یا مجدّد کے ساتھ یہ انوار نازل ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم اور احادیث کی رُو سے یہ امر نہایت انکشاف کے ساتھ ثابت ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ أَمْرٍ۔ سَلٰمٌ ثقف هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔ ہم نے اِس کتاب اور اس نبی کو لیلۃ القدر میں آتارا ہے اور تو جانتا ہے کہ لیلۃ القدر کیا چیز ہے۔ لیلۃ القدر ہزار مہینہ سے بہتر ہے اس میں فرشتے اور رُوح القدس اپنے رب کے اِذن سے اُترتے ہیں اور وہ ہر یک امر میں سلامتی کا وقت ہوتا ہے یہاں تک کہ فجر ہو۔ اب اگرچہ مسلمانوں کے ظاہری عقیدہ کے موافق لیلۃ القدر ایک متبرک رات کا نام ہے مگر جس حقیقت پر خدا تعالیٰ نے مجھ کو مطلع کیا ہے وہ یہ ہے کہ علاوہ ان معنوں کے جو مسلّم قوم ہیں لیلۃ القدر وہ زمانہ بھی ہے جب دُنیا میں ظلمت پھیل جاتی ہے اور ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہوتی ہے تب وہ تاریکی بالطبع تقاضا کرتی ہے کہ آسمان سے کوئی نور نازل ہو۔ سو خدا تعالیٰ اس وقت اپنے نورانی ملائکہ اور رُوح القدس کو زمین پر نازل کرتا ہے اُسی طور کے نزول کے ساتھ جو فرشتوں کی شان کے ساتھ مناسبِ حال ہے۔ تب رُوح القدس تو اس مجدّد اور مصلح سے تعلق پکڑتا ہے جو اجتباء اور اصطفاء کی خلعت سے مشرّف ہو کر دعوتِ حق کے لئے مامور ہوتا ہے اور فرشتے ان تمام لوگوں سے تعلق پکڑتے ہیں جو سعید اور رشید اور مستعد ہیں اور ان کو نیکی کی طرف کھینچتے ہیں اور نیک توفیقیں ان کے سامنے رکھتے ہیں تب دنیا میں سلامتی اور سعادت کی راہیں پھیلتی ہیں اور ایسا ہی ہوتا رہتا ہے جب تک دین اپنے کمال کو پہنچ جائے جو اس کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ نے اِس سورۂ مبارکہ میں صاف اور صریح لفظوں میں فرما دیا کہ جب کوئی مصلح خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے تو ضرور دلوں کو حرکت دینے والے ملائکہ زمین پر نازل ہوتے ہیں تب ان کے نزول سے ایک حرکت اور تموّج دلوں میں نیکی اور راہِ حق کی طرف پیدا ہو جاتا ہے۔ پس ایسا خیال کرنا کہ یہ حرکت اور یہ تموّج بغیر ظہور مصلح کے خود بخود پیدا ہو جاتا ہے خدا تعالیٰ کی پاک کلام اور اس کے قدیم قانونِ قدرت کے مخالف ہے اور ایسے اقوال صرف اُن لوگوں کے مُنہ سے نکلتے ہیں جو الٰہی اسرار سے بیخبر محض اور صرف اپنے بے بنیاد اوہام کے تابع ہیں بلکہ یہ تو آسمانی مصلح کے پیدا ہونے کی علاماتِ خاصّہ ہیں اور اس آفتاب کے گرد ذرّات کی مانند ہیں۔ ہاں اِس حقیقت کو دریافت کرنا ہر ایک کا کام نہیں۔ ایک دُنیا دار کی دُود آمیز نظر اس نور کو دریافت نہیں کر سکتی۔ دینی صداقتیں اس کی نظر میں ایک ہنسی کی بات ہے اور معارفِ الٰہی اس کے خیال میں بیوقوفیاں ہیں۔

(شہادت القرآن صفحہ ۱۷ تا ۱۹)

فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُوْلُ فِيْ هٰذِهِ السُّوْرَةِ إِنَّ الْمَلَائِكَةَ وَالرُّوْحَ تَنَزَّلُوْنَ فِيْ تِلْكَ

ترجمہ از مرتّب :۔ اِس سُورت میں اللہ عزّ وجلّ فرماتا ہے کہ ملائکہ اور رُوح لیلۃ القدر میں

اللَّيْلَةِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ وَيَمْكُثُوْنَ فِي الْأَرْضِ إِلٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ فَإِذَا نَزَلَتِ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ فِيْ تِلْكَ اللَّيْلَةِ إِلَى الْأَرْضِ فَلَزِمَ بِنَاءً عَلَى اعْتِقَادِكَ أَنْ تَبْقَى السَّمَاءُ كُلُّهَا خَالِيَةً بَعْدَ نُزُوْلِهِمْ .... وَأَنْتَ

....

تَعْلَمُ أَنَّ الرُّشْدَ قَدْ تَبَيَّنَ مِنَ الْغَيِّ وَلَنْ تَسْتَطِيْعَ أَنْ تُخْرِجَ لَنَا حَدِيْثًا دَالًّا عَلٰى أَنَّ السَّمَاءَ تَبْقٰى خَالِيَةً بَعْدَ نُزُوْلِ الْمَلَائِكَةِ إِلَى الْأَرْضِ۔ (حمامۃ البشرٰی صفحہ ۶۶)

وَالْحَقُّ أَنَّ لِلْمَلَكِ لَمَّةً بِقَلْبِ بَنِيْ آدَمَ وَلِلشَّيَاطِيْنِ لَمَّةً فَإِذَا أَرَادَ اللّٰهُ أَنْ يَّبْعَثَ مُصْلِحًا مِنْ رَّسُوْلٍ أَوْ نَبِيٍّ أَوْ مُحَدَّثٍ فَيُقَوِّيْ لَمَّةَ الْمَلَكِ وَيَجْعَلُ اسْتِعْدَادَاتِ النَّاسِ قَرِيْبَةً لِقَبُوْلِ الْحَقِّ وَيُعْطِيْهِمْ عَقْلًا وَّفَهْمًا وَّهِمَّةً وَّقُوَّةً تَحْمِلُ الْمَصَائِبَ وَنُوْرَ فَهْمِ الْقُرْآنِ مَا كَانَتْ لَهُمْ قَبْلَ ظُهُوْرِ ذٰلِكَ الْمُصْلِحِ فَتَصْفَى الْأَذْهَانُ وَتَتَقَوَّى الْعُقُوْلُ وَتَعْلُوا الْهِمَمُ وَيَجِدُ كُلُّ أَحَدٍ كَأَنَّهٗ أُوْقِظَ مِنْ نَوْمِهٖ وَكَأَنَّ نُوْرًا يَّنْزِلُ مِنْ غَيْبٍ عَلٰى قَلْبِهٖ وَكَأَنَّ مُعَلِّمًا قَامَ بِبَاطِنِهٖ وَيَكُوْنُ النَّاسُ كَأَنَّ اللّٰهَ بَدَّلَ مِزَاجَهُمْ وَطَبِيْعَتَهُمْ وَشَحَذَ أَذْهَانَهُمْ

اپنے رَبّ کے اِذن سے اُترتے ہیں اور طلوعِ فجر تک زمین میں ہی ٹھہرتے ہیں اور جب اس رات تمام کے تمام فرشتے زمین پر اُتر گئے تو تمہارے اعتقاد کے مطابق یہ لازم آیا کہ سارے کا سارا آسمان ان کے نزول کے بعد خالی ہوجائے اور تمہیں معلوم ہے کہ ہدایت گمراہی سے الگ ہوگئی ہے اور تم اِس بات پر طاقت نہیں رکھتے کہ کوئی ایسی حدیث پیش کرسکو جو اِس بات پر دلالت کرے کہ زمین پر فرشتوں کے نزول کے بعد آسمان خالی ہوجاتا ہے۔ (حمامۃ البشرٰی صفحہ ۶۶)

ترجمہ از مرتب:۔حق بات یہ ہے کہ فرشتے بنی آدم کے دلوں پر اُترتے ہیں اور اِسی طرح شیاطین بھی۔ پس جب اللہ تعالیٰ کِسی مصلح یعنی رسول، نبی یا محدّث کو دُنیا میں مبعوث کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو وہ فرشتوں کے نزول کو قوت دیتا ہے اور لوگوں کی استعدادوں کو قبولِ حق کے قریب کر دیتا ہے اور انہیں عقل، فہم، ہمت اور مصائب کو برداشت کرنے والی قوت عطا کرتا ہے اور فہمِ قرآن کا وہ نور بخشتا ہے جو اس مصلح کے ظہور سے قبل انہیں حاصل نہیں تھا۔ پس ذہن صاف ہوجاتے ہیں اور عقلیں تقویت پکڑتی ہیں اور ہمّتیں بلند ہوجاتی ہیں اور ہر شخص یُوں محسوس کرتا ہے کہ گویا اُسے نیند سے بیدار کر دیا گیا ہے اور یہ کہ غیب سے ایک نور اس کے قلب پر نازل ہورہا ہے اور کوئی مُعلّم اس کے خود اندر سے کھڑا ہوگیا ہے اور لوگوں کی حالت ایسی ہوجاتی ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے ان کے مزاج اور ان کی طبیعت کو بدل دیا ہے اور

وَاَفْكَارَهُمْ فَاِذَا ظَهَرَتْ وَاجْتَمَعَتْ هٰذِهِ الْعَلَامَاتُ كُلُّهَا فَتَدُلُّ بِدَلَالَةٍ قَطْعِيَّةٍ عَلٰى اَنَّ الْمُجَدِّدَ الْاَعْظَمَ قَدْ ظَهَرَ وَالنُّوْرُ النَّازِلُ قَدْ نَزَلَ وَاِلٰى هٰذَا اَشَارَ سُبْحَانَهٗ فِىْ سُوْرَةِ الْقَدْرِ۔ وَقَالَ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِىْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ۔ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ۔ سَلٰمٌ هِىَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔ وَاَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ الْمَلَائِكَةَ وَالرُّوْحَ لَا يَنْزِلُوْنَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَتَعَالَى اللّٰهُ عَنْ اَنْ يُّرْسِلَهُمْ عَبَثًا وَبَاطِلًا فَاِرْسَالُ الرُّوْحِ هٰهُنَا اِشَارَةٌ اِلٰى بَعْثِ نَبِيٍّ اَوْ مُرْسَلٍ اَوْ مُحَدَّثٍ يُلْقٰى ذٰلِكَ الرُّوْحُ عَلَيْهِ وَاِرْسَالُ الْمَلَائِكَةِ اِشَارَةٌ اِلٰى نُزُوْلِ مَلَائِكَةٍ يَجْذِبُوْنَ النَّاسَ اِلَى الْحَقِّ وَالْهِدَايَةِ وَالثَّبَاتِ وَالْاِسْتِقَامَةِ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِىْ مَقَامٍ اٰخَرَ اِذْ يُوْحِىْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلَائِكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَىْ هَاتُوْا قُلُوْبَهُمْ وَحَبِّبُوْا اِلَيْهِمُ الْاِيْمَانَ وَالثَّبَاتَ وَالْاِسْتِقَامَةَ فَهٰذَا فِعْلُ الْمَلَائِكَةِ اِذَا نَزَلُوْا فَفِىْ سُوْرَةِ الْقَدْرِ اِشَارَةٌ اِلٰى اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ وَعَدَ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ اَنَّهٗ لَا يُضِيْعُهُمْ اَبَدًا بَلْ اِذَا مَا

ان کے اذہان اور افکار کو تیز کر دیا ہے۔ پس جب یہ علامات ظاہر ہو جائیں اور سب کی سب جمع ہو جائیں تو وہ اِس بات پر قطعی دلالت کریں گی کہ مجددِ اعظم ظاہر ہو گیا ہے اور نازل ہونے والا نور اُتر آیا ہے چنانچہ اسی کی طرف اللہ سبحانہٗ نے سورۃ القدر میں اشارہ فرمایا ہے اور کہا ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِىْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ۔ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ۔ سَلٰمٌ هِىَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔ اور یہ بات آپ کو معلوم ہے کہ ملائکہ اور رُوح حق لے کر ہی نازل ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے کہ وہ فرشتوں کو عبث اور باطل طور پر بھیجے۔ پس ارسالِ رُوح سے اِس مقام پر کسی نبی کے مبعوث ہونے یا کسی مُرسل اور محدث کے بھیجے جانے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ رُوح اس پر ڈالی جاتی ہے اور ارسالِ ملائکہ سے نزولِ ملائکہ کی طرف اشارہ ہے جو لوگوں کو حق، ہدایت اور ثابت قدمی کی طرف لاتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ایک اَور مقام پر فرماتا ہے اِذْ يُوْحِىْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلَائِكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یعنی جب تیرا ربّ فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ مَیں تمہارے ساتھ ہوں پس تم مومنوں کو ثابت قدم بناؤ۔ یہاں فَثَبِّتُوْا سے مراد یہ ہے کہ فرشتوں کو حکم تھا کہ مومنوں کے دلوں کو مضبوط بناؤ اور ان کے دلوں میں ایمان، ثباتِ قدم اور استقامت محبوب بنا دو۔ یہ کام فرشتوں کا ہے جب وہ نازل ہوتے ہیں۔ پس سورۃ القدر میں اِس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس اُمّت کے لوگوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ انہیں کبھی ضائع نہیں

ضَلُّوْا وَسَقَطُوْا فِیْ ظُلُمَاتٍ يَأْتِیْ عَلَيْهِمْ لَيْلَةُ الْقَدْرِ وَيَنْزِلُ الرُّوْحُ اِلَى الْاَرْضِ يَعْنِیْ يُلْقِيْهِ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَبْعَثُهٗ مُجَدِّدًا وَيَنْزِلُ مَعَ الرُّوْحِ مَلَائِكَةٌ يَجْذِبُوْنَ قُلُوْبَ النَّاسِ اِلَى الْحَقِّ وَالْهِدَايَةِ فَلَا تَنْقَطِعُ هٰذِهِ السِّلْسِلَةُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۹۲، ۹۳)

جب مامور مامور ہو کر آتا ہے تو بے شمار فرشتے اس کے ساتھ نازل ہوتے ہیں اور دلوں میں اسی طرح نیک اور پاک خیالات کو پیدا کرتے ہیں جیسے اس سے پہلے شیاطین بُرے خیالات پیدا کیا کرتے ہیں اور یہ سب مامور کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کیونکہ اسی کے آنے سے یہ تحریکیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح فرمایا اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ۔ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ الآیہ خدا تعالیٰ نے مقدر کیا ہوا ہوتا ہے کہ ماموروں کے زمانہ میں ملائک نازل ہوں۔ کیا یہ کام بغیر امدادِ الٰہی کہیں ہو سکتا ہے؟ کیا یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ ایک شخص خود بخود اُٹھے اور کسرِ صلیب کر ڈالے۔ نہیں۔ ہاں اگر خدا اُسے اُٹھاوے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

ایک لیلۃ القدر تو وہ ہے جو پچھلے حصّہ رات میں ہوتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ تجلّی فرماتا ہے اور ہاتھ پھیلاتا ہے کہ کوئی دعا کرنے والا اور استغفار کرنے والا ہے جو میں اس کو قبول کروں لیکن ایک معنے اس کے اَور ہیں جس سے بدقسمتی سے علماء مخالف اور منکر ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ہم نے قرآن کو ایسی رات میں اُتارا ہے کہ تاریک و تار تھی اور وہ ایک مستعد مصلح کی خواہاں تھی۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے جبکہ اس نے فرمایا مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[1] پھر جب انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ تاریکی ہی میں پڑا رہے۔ ایسے زمانے میں بالطبع اس کی ذات جوش مارتی ہے کہ کوئی مصلح پیدا ہو۔ پس اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ اس زمانہ ضرورت بعثت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کرے گا بلکہ جب وہ گمراہ ہو جائیں گے اور اندھیروں میں گر جائیں گے تو ان پر لیلۃ القدر کا زمانہ آئے گا اور رُوح زمین پر نازل ہو گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے گا اسے اُتارے گا اور اسے مجدّد بنا کر مبعوث فرمائے گا اور رُوح کے ساتھ ملائکہ بھی نازل ہوں گے جو لوگوں کے دلوں کو حق اور ہدایت کی طرف کھینچ کر لائیں گے اور یہ سلسلہ قیامت تک منقطع نہیں ہو گا۔

(حمامۃ البشریٰ صفحہ ۹۲، ۹۳)

---

[1] سورۃ الذّٰریٰت : ۵۷

کی ایک اَور دلیل ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۷ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

ہم لیلۃ القدر کے دونوں معنوں کو مانتے ہیں ایک وہ جو عُرفِ عام میں ہیں کہ بعض راتیں ایسی ہوتی ہیں کہ خدا تعالیٰ اُن میں دعائیں قبول کرتا ہے اور ایک اس سے مراد تاریکی کے زمانہ کی ہے جس میں عام ظلمت پھیل جاتی ہے۔ حقیقی دین کا نام ونشان نہیں رہتا۔ اس میں جو شخص خدا تعالیٰ کے سچے متلاشی ہوتے ہیں اور اس کی اطاعت کرتے ہیں وہ بڑے قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک بادشاہ ہو اور اس کا ایک بڑا لشکر ہو دشمن کے مقابلہ کے وقت سب لشکر بھاگ جاوے اور صرف ایک یا دُو آدمی رہ جاویں اور انہیں کے ذریعہ سے اسے فتح حاصل ہو تو اب دیکھ لو کہ ان ایک یا دُو کی بادشاہ کی نظر میں کیا قدر ہوگی۔ پس اِس وقت جبکہ ہر طرف دہریت پھیلی ہوئی ہے کوئی تو قول سے اور کوئی عمل سے خدا تعالیٰ کا انکار کر رہا ہے ایسے وقت میں جو خدا تعالیٰ کا حقیقی پرستار ہوگا وہ بڑا قابلِ قدر ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بھی لیلۃ القدر کا زمانہ تھا۔ اس وقت کی تاریکی اور ظلمت کی بھی کوئی انتہاء نہ تھی۔ ایک طرف یہود گمراہ۔ ایک طرف عیسائی گمراہ۔ ادھر ہندوستان میں دیوتا پرستی، آتش پرستی وغیرہ۔ گویا سب دُنیا میں بگاڑ پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت بھی جبکہ ظلمت انتہاء کو پہنچ گئی تھی تو اس نے تقاضا کیا تھا کہ ایک نور آسمان سے نازل ہو سو وہ نور جو نازل ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تھی۔ قاعدہ کی بات ہے کہ جب ظلمت اپنے کمال کو پہنچتی ہے تو وہ نور کو اپنی طرف کھینچتی ہے جیسے کہ چاند کی ۲۹ تاریخ ہو جاتی ہے اور رات بالکل اندھیری ہوتی ہے تو نئے چاند کے نکلنے کا وقت ہوتا ہے تو اُس زمانہ کو بھی خدا تعالیٰ نے لیلۃ القدر کے نام سے موسوم کیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ

اِسی طرح جب نور اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو پھر وہ گھٹنا شروع ہوتا ہے جیسے کہ چاند کو دیکھتے ہو اور اسی طرح سے یہ قیامت تک رہے گا کہ ایک وقت نور کا غلبہ ہوگا اور ایک وقت ظلمت کا۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲ مورخہ ۸ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۳، ۴)

قرآن شریف میں جو لیلۃ القدر کا ذکر آیا ہے کہ وہ ہزار مہینوں سے بہتر ہے یہاں لیلۃ القدر کے تین معنی ہیں اوّل تو یہ کہ رمضان میں ایک رات لیلۃ القدر کی ہوتی ہے دوم یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بھی ایک لیلۃ القدر تھا یعنی سخت جہالت اور بے ایمانی کی تاریکی کے زمانہ میں وہ آیا جبکہ ملائکہ کا نزول ہوا کیونکہ نبی دُنیا میں اکیلا نہیں آتا بلکہ وہ بادشاہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ لاکھوں کروڑوں ملائکہ کا لشکر ہوتا ہے جو ملائک اپنے کام میں لگ جاتے ہیں اور لوگوں کے دلوں کو نیکی کی طرف کھینچتے

ہیں۔ سوم لیلۃ القدر انسان کے لئے اس کا وقتِ اصفیٰ ہے۔ تمام وقت یکساں نہیں ہوتے۔ بعض وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عائشہؓ کو کہتے کہ اَرِحْنَا یَا عَائِشَۃُ یعنی اے عائشہ مجھ کو راحت و خوشی پہنچا اور بعض وقت آپؐ بالکل دعا میں مصروف ہوتے جیسا کہ سعدیؒ نے کہا ہے ؎

وقتے چنیں بُودے کہ بجبرائیل و میکائیل پرداختے و دیگر وقت با حفصہ و زینب در ساختے

جتنا جتنا انسان خدا کے قریب آتا ہے یہ وقت اسے زیادہ میسّر آتا ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۲ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۳، ۱۴)

جب آسمان سے مقرر ہو کر ایک نبی یا رسول آتا ہے تو اس نبی کی برکت سے عام طور پر ایک نور حسبِ مراتب استعدادات آسمان سے نازل ہوتا ہے اور انتشارِ رُوحانیت ظہور میں آتا ہے تب ہر ایک شخص خوابوں کے دیکھنے میں ترقی کرتا ہے اور الہام کی استعداد رکھنے والے الہام پاتے ہیں اور رُوحانی امور میں عقلیں بھی تیز ہو جاتی ہیں کیونکہ جیسا کہ جب بارش ہوتی ہے ہر ایک زمین کچھ نہ کچھ اس سے حصہ لیتی ہے ایسا ہی اس وقت ہوتا ہے جب رسول کے بھیجنے سے بہار کا زمانہ آتا ہے تب ان ساری برکتوں کا موجب دراصل وہ رسول ہوتا ہے اور جس قدر لوگوں کو خوابیں یا الہام ہوتے ہیں دراصل ان کے کُھلنے کا دروازہ وہ رسول ہوتا ہے کیونکہ اس کے ساتھ دُنیا میں ایک تبدیلی واقع ہوتی ہے اور آسمان سے عام طور پر ایک روشنی اُترتی ہے جس سے ہر ایک شخص حسبِ استعداد حصہ لیتا ہے وہی روشنی خواب اور الہام کا موجب ہو جاتی ہے اور نادان خیال کرتا ہے کہ میرے ہُنر سے ایسا ہؤا ہے مگر وہ چشمہ الہام اور خواب کا صرف اس نبی کی برکت سے دُنیا پر کھولا جاتا ہے اور اس کا زمانہ ایک لیلۃ القدر کا زمانہ ہوتا ہے جس میں فرشتے اُترتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلٰمٌ جب سے خدا نے دُنیا پیدا کی ہے یہی قانونِ قدرت ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۶۷ حاشیہ)

سُورۃ البیّنۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ الۡبَیِّنَۃُ۝ رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً۝ فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ۝

جو لوگ اہلِ کتاب اور مُشرکوں میں سے کافر ہو گئے ہیں یعنی کفر پر سخت اصرار اختیار کر لیا ہے وہ اپنے کفر سے بجز اس کے باز آنے والے نہیں تھے کہ اُن کو کُھلی کُھلی نشانی دکھلائی جاتی۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۰۶ حاشیہ)

جو لوگ اہلِ کتاب اور مُشرکین میں سے کافر ہو گئے ان کا راہِ راست پر آنا بجز اس کے ہرگز ممکن نہ تھا کہ انکی طرف ایسا عظیم الشّان نبی بھیجا جاوے جو ایسی عظیم الشّان کتاب لایا ہے کہ جو سب الٰہی کتابوں کے معارف اور صداقتوں پر محیط اور ہر ایک غلطی اور نقصان سے پاک اور منزّہ ہے۔ اَب اِس دلیل کا ثبوت دوؔ مقدموں کے ثبوت پر موقوف ہے اوّل یہ کہ خدائے تعالیٰ کا یہی قانونِ قدیم ہے کہ وہ جسمانی یا رُوحانی حاجتوں کے وقت مدد فرماتا ہے یعنی جسمانی صعوبتوں کے وقت بارش وغیرہ سے اور روحانی صعوبتوں کے وقت اپنا شفا بخش کلام نازل کرنے سے عاجز بندوں کی دستگیری کرتا ہے۔

سو یہ مقدمہ بدیہی الصداقت ہے کیونکہ کسی عاقل کو اس سے انکار نہیں کہ یہ دونوں سلسلے رُوحانی اور جسمانی اِسی وجہ سے اَب تک صحیح و سالم چلے آتے ہیں کہ خداوندِ کریم نیست و نابُود ہونے سے ان کو محفوظ رکھتا ہے مثلاً اگر خدائے تعالیٰ جسمانی سِلسلہ کی حفاظت نہ کرتا اور سخت سخت قحطوں کے وقت میں بارانِ رحمت سے دستگیری نہ

فرماتا تو بالآخر نتیجہ اس کا یہی ہوتا کہ لوگ پہلی فصلوں کی جس قدر پیداوار تھی سب کی سب کھالیتے اور پھر آگے اناج کے نہ ہونے سے تڑپ تڑپ کر مر جاتے اور نوعِ انسان کا خاتمہ ہو جاتا یا اگر خدائے تعالیٰ عین وقتوں پر رات اور دن اور سُورج اور چاند اور ہَوا اور بادل کو خدماتِ مقررہ میں نہ لگاتا تو تمام سلسلہ عالَم کا درہم برہم ہو جاتا۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۵۱ تا ۵۵۳)

جن سخت بلاؤں میں اہلِ کتاب اور مشرکین مبتلا تھے اُن سے نجات پانے کی کوئی سبیل نہ تھی بجز اس سبیل کے کہ خدائے تعالیٰ نے آپ پیدا کر دی کہ وہ زبردست رسول بھیجا جس کے ساتھ زبردست تحریک دینے والے ملائک نازل کئے تھے اور زبردست پیغام بھیجا گیا تھا۔ (ازالہ اَوہام صفحہ ۱۱۲)

یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۔ یعنی خدا کا رسول پاک صحیفے پڑھتا ہے جن میں تمام کامل صداقتیں اور علوم اوّلین و آخرین درج ہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۰۴ حاشیہ)

قرآن کُل دُنیا کی صداقتوں کا مجموعہ ہے اور سب دین کی کتابوں کا فخر ہے جیسے فرمایا ہے فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ اور يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۔ پس قرآن کریم کے معنی کرتے وقت خارجی قصّوں کو نہ لیں بلکہ واقعات کو مدِّنظر رکھنا چاہیئے۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۴)

قرآن لانے والا وہ شان رکھتا ہے کہ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ایسی کتاب جس میں ساری کتابیں اور ساری صداقتیں موجود ہیں۔ کتاب سے مُراد اور عام مفہوم وہ عمدہ باتیں ہیں جو بالطبع انسان قابلِ تقلید سمجھتا ہے۔ قرآن شریف ایسی حکمتوں اور معارف کا جامع ہے اور رطب و یابس کا ذخیرہ اس کے اندر نہیں۔ ہر ایک چیز کی تفسیر وہ خود کرتا ہے اور ہر ایک قسم کی ضرورتوں کا سامان اس کے اندر موجود ہے۔ وہ ہر پہلو سے نشان اور آیت ہے۔ اگر کوئی انکار کرے تو ہم ہر پہلو سے اس کا اعجاز ثابت کرنے اور دکھلانے کو تیار ہیں۔ آجکل توحید اور ہستیٔ الٰہی پر بہت زور آور حملے ہو رہے ہیں۔ عیسائیوں نے بھی بہت کچھ زور مارا اور لکھا لیکن جو کچھ کہا اور لکھا وہ اِسلام کے خدا کی بابت ہی لکھا نہ کہ ایک مُردہ مصلوب اور عاجز خدا کی بابت۔ ہم دعوٰی سے کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر قلم اُٹھائے گا اس کو آخر کار اُسی خدا کی طرف آنا پڑیگا جو اسلام نے پیش کیا ہے کیونکہ صحیفۂ فطرت کے ایک ایک پتہ میں اس کا پتا ملتا ہے اور بالطبع انسان اُسی خدا کا نقش اپنے اندر رکھتا ہے۔ غرض ایسے آدمیوں کا قدم جب اُٹھے گا وہ اِسلام ہی کے میدان کی طرف اُٹھے گا۔ یہ بھی تو ایک عظیم الشان اعجاز ہے۔ اگر کوئی قرآن کریم کے اِس معجزہ کا انکار کرے تو ایک ہی پہلو میں ہم لوگوں کو آزما لیتے ہیں۔ یعنی اگر قرآن خدا کا کلام نہیں مانتا تو اس روشنی اور سائنس کے زمانہ میں ایسا مدّعی خدائے تعالیٰ کی ہستی پر دلائل لکھے۔ ہم وہ تمام دلائل قرآن کریم میں سے نکال کر دکھا دیں گے۔ اور اگر توحید الٰہی

کی نسبت دلائل قلمبند کرے تو وہ سب دلائل بھی قرآن کریم ہی سے نکال کر دکھا دیں گے اور وہ ویسے دلائل کا دعویٰ کر کے لکھیں کہ یہ دلائل قرآن میں نہیں..... یا اُن صداقتوں اور پاک تعلیموں پر لکھے جن کی نسبت اُن کا خیال ہو کہ وہ قرآن کریم میں نہیں تو ہم اس کو واضح طور پر دکھلا دیں گے کہ قرآن کا دعویٰ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ کیسا سچّا اور صاف ہے اور یا اصل اور فطرتی مذہب کی بابت دلائل لکھنا چاہے تو ہم ہر پہلو سے قرآن کریم کا اعجاز ثابت کر کے دکھائیں گے اور بتلا دیں گے کہ تمام صداقتیں اور پاک تعلیمیں اُسی میں موجود ہیں۔ الغرض قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے کہ ہر ایک قسم کے معارف اور اسرار اس میں موجود ہیں لیکن ان کو حاصل کرنے کے لئے مَیں پھر کہتا ہوں کہ اُسی قوتِ قدسیہ کی ضرورت ہے چنانچہ خود انہوں نے فرمایا ہے لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۸۴، ۸۵)

قرآن شریف کی فصاحت بلاغت ایسی نہیں ہے کہ اس میں صرف الفاظ کا تتبع کیا جاوے اور معانی اور مطالب کی پرواہ نہ کی جاوے بلکہ جیسا اعلیٰ درجہ کے الفاظ ایک عجیب ترتیب کے ساتھ رکھے گئے ہیں اسی طرح پر حقائق اور معارف کو ان میں بیان کیا گیا ہے اور یہ رعایت انسان کا کام نہیں کہ وہ حقائق اور معارف کو بیان کرے اور فصاحت وبلاغت کے مراتب کو بھی ملحوظ رکھے۔ ایک جگہ فرماتا ہے يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ یعنی ان پر ایسے صحیفے پڑھتا ہے کہ جن میں حقائق و معارف ہیں۔ انشا والے جانتے ہیں کہ انشا پردازی میں پاکیزہ تعلیم اور اخلاقِ فاضلہ کو ملحوظ رکھنا بہت ہی مشکل ہے اور پھر ایسی مؤثر اور جاذب تعلیم دینا جو صفاتِ رذیلہ کو دُور کر کے بھی دکھا دے اور اُن کی جگہ اعلیٰ درجہ کی خوبیاں پَیدا کر دے۔ عربوں کی جو حالت تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں وہ سارے عیبوں اور بُرائیوں کا مجموعہ بنے ہوئے تھے اور صدیوں سے ان کی یہ حالت بگڑی ہوئی تھی مگر کس قدر آپ کے فیوضات اور برکات میں قوت تھی کہ تیئیس ۲۳ برس کے اندر کُل مُلک کی کایا پلٹ دی۔ یہ تعلیم ہی کا اثر تھا۔

ایک چھوٹی سے چھوٹی سُورت بھی اگر قرآن شریف کی لے کر دیکھی جاوے تو معلوم ہوگا کہ اس میں فصاحت وبلاغت کے مراتب کے علاوہ تعلیم کی ذاتی خوبیوں اور کمالات کو اس میں بھر دیا ہے۔ سورہ اخلاص ہی کو دیکھو کہ توحید کے کُل مراتب کو بیان فرمایا ہے اور ہر قسم کے شرکوں کا رَدّ کر دیا ہے۔ اِسی طرح سورۃ فاتحہ کو دیکھو کہ کس قدر اعجاز ہے۔ چھوٹی سی سُورت جس کی سات آیتیں ہیں لیکن دراصل سارے قرآن شریف کا فن اور خلاصہ اور فہرست ہے اور پھر اس میں خدا تعالیٰ کی ہستی۔ اس کے صفات۔ دعا کی ضرورت۔ اس کی قبولیت کے اسباب اور ذرائع۔ مفید اور سُود مند دعاؤں کا طریق۔ نقصان رساں راہوں سے بچنے کی ہدایت سکھلائی ہے وہاں دُنیا کے کُل مذاہبِ باطلہ کا رَدّ اس میں موجود ہے۔

اکثر کتابوں اور اہلِ مذہب کو دیکھو گے کہ وہ دوسرے مذہب کی بُرائیاں اور نقص بیان کرتے ہیں اور دوسری تعلیموں پر نکتہ چینی کرتے ہیں مگر ان نکتہ چینیوں کو پیش کرتے ہوئے یہ کوئی اہلِ مذہب نہیں کرتا کہ اس کے بالمقابل کوئی عمدہ تعلیم بھی پیش کرے اور دکھائے کہ اگر مَیں فلاں بُری بات سے بچانا چاہتا ہوں تو اسکی بجائے یہ اچھی تعلیم دیتا ہوں۔ یہ کسی مذہب میں نہیں۔ یہ فخر قرآن شریف ہی کو ہے کہ جہاں وہ دوسرے مذاہبِ باطلہ کا رَدّ کرتا ہے اور ان کی غلط تعلیموں کو کھولتا ہے وہاں اصلی اور حقیقی تعلیم بھی پیش کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ ؁۱۷ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱، ۲)

یہ کتاب جو قرآن شریف ہے یہ مجموعہ ان تمام کتابوں کا ہے جو پہلے بھیجی گئی تھیں۔ اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے پہلے متفرق طور پر ہر ایک اُمّت کو جُدا جُدا دستور العمل بھیجا اور پھر چاہا کہ جیسا کہ ایک خدا ہے وہ بھی ایک ہو جائیں تب سب کو اکٹھا کرنے کے لئے قرآن کو بھیجا اور خبر دی کہ ایک زمانہ آنے والا ہے کہ خدا تمام قوموں کو ایک قوم بنا دے گا اور تمام ملکوں کو ایک مُلک کر دے گا اور تمام زبانوں کو ایک زبان بنا دے گا۔ سو ہم دیکھتے ہیں کہ دن بدن دُنیا اس صورت کے قریب آتی جاتی ہے اور مختلف ملکوں کے تعلقات بڑھتے جاتے ہیں۔ سیاحت کے لئے وہ سامان میسّر آگئے ہیں جو پہلے نہیں تھے۔ خیالات کے مبادلہ کے لئے بڑی بڑی آسانیاں ہوگئی ہیں۔ ایک قوم دوسری قوم میں ایسی دھنس گئی ہے کہ گویا وہ دونوں ایک ہونا چاہتی ہیں۔ بڑے اور مشکل سفر بہت سہل اور آسان ہوگئے ہیں۔ اَب رُوس کی طرف سے ایک ریل تیار ہو رہی ہے کہ جو چالیس دن میں تمام دُنیا کا دَورہ ختم کرے گی اور خبر رسانی کے خارق عادت ذریعے پیدا ہوگئے ہیں۔ اِس سے پایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ ان مختلف قوموں کو جو کسی وقت ایک تھیں پھر ایک ہی بنانا چاہتا ہے تا پیدائش کا دائرہ پورا ہو جائے اور تا ایک ہی خدا ہو اور ایک ہی نبی ہو اور ایک ہی دین ہو۔ یہ بات نہایت معقول ہے کہ تفرقہ کے زمانہ میں خدا نے جُدا جُدا ہر ایک ملک میں نبی بھیجے اور کسی ملک سے بُخل نہیں کیا لیکن آخری زمانہ میں جب تمام مُلکوں میں ایک قوم بننے کی استعداد پیدا ہوگئی تب سب ہدایتوں کو اکٹھا کر کے ایک ایسی زبان میں جمع کر دیا جو اُمّ الالسنہ ہے یعنی زبانِ عربی۔

(نسیم دعوت صفحہ ۶۱، ۶۲)

یہ قرآن شریف وہ پاک اَوراق ہیں جن میں تمام آسمانی کتابوں کا مغز اور لُبِّ لباب بھرا ہؤا ہے۔

(سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۳، ۱۴ حاشیہ)

فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ وہ تمام صداقتوں پر مشتمل ہے۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۲۷، ۲۸)

چونکہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی ہمّت اور توجہ دنیوی برکات کی طرف زیادہ مصروف تھی اِس لئے انکی اُمّت میں یہ اثر ہؤا کہ رفتہ رفتہ دین سے تو وہ بکلّی بے بہرہ ہوگئے مگر دُنیا کی برکتیں جیسا کہ علمِ طبعی، علمِ ڈاکٹری، علم

تجارت، علمِ فلاحت، علمِ جہازرانی اور ریل رانی وغیرہ اس میں وہ بے نظیر ہو گئے برخلاف اس کے دینی عمیق اسرار مسلمانوں کے حصے میں آئے اور دُنیا میں پیچھے رہے۔ رُوحانی برکات کی یادگار کے لئے قرآن شریف بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دائمی معجزہ دیا گیا جو بموجب منطوق آیت فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ تمام دینی معارف کا جامع ہے۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۵۷ حاشیہ)

ہمارا دعویٰ ہے کہ قرآن اصلاحِ کامل اور تزکیۂ اتم اور اکمل کے لئے آیا ہے اور وہ خود دعویٰ کرتا ہے کہ تمام کامل سچائیاں اُس کے اندر ہیں جیسا کہ فرماتا ہے فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ تو اس صورت میں ضرور ہے کہ جہاں تک سلسلہ معارف اور علومِ الٰہیّہ کا ممتد ہو سکے وہاں تک قرآنی تعلیم کا بھی دامن پہنچا ہوا ہو اور یہ بات صرف میں نہیں کہتا بلکہ قرآن خود اِس صفت کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور اپنا نام اکمل الکتب رکھتا ہے۔ پس ظاہر ہے کہ اگر معارفِ الٰہیّہ کے بارے میں کوئی حالتِ منتظرہ باقی ہوتی جس کا قرآن شریف نے ذکر نہیں کیا تو قرآن شریف کا حق نہیں تھا کہ وہ اپنا نام اکمل الکتب رکھتا۔ (سراجِ منیر صفحہ ۳۵)

قرآن نے جس قدر تقویٰ کی راہیں اختیار کیں اور ہر طرح کے انسانوں اور مختلف عقل والوں کی پرورش کرنے کے طریق سکھلائے۔ ایک جاہل، عالم اور فلسفی کی پرورش کے راستہ۔ ہر طبقہ کے سوالات کے جوابات غرضیکہ کوئی فرقہ نہ چھوڑا جس کی اصلاح کے طریق نہ بتائے۔ یہ ایک دقیقۂ وقت تھا جیسے کہ فرمایا فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ یعنی یہ وہ صحیفہ ہے جس میں کُل سچائیاں ہیں۔ سو یہ کیسی کتاب مبارک ہے کہ اس میں سب سامان اعلےٰ درجہ تک پہنچنے کے موجود ہیں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۲)

سب انبیاء کے وصفی نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دئے گئے کیونکہ آپؐ تمام انبیاء کے کمالاتِ متفرقہ اور فضائلِ مختلفہ کے جامع تھے اور اسی طرح جیسے تمام انبیاء کے کمالات آپؐ کو ملے قرآن شریف بھی جمیع کتب کی خوبیوں کا جامع ہے چنانچہ فرمایا فِيْهَا كُتُبٌ اور مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ[1]۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

۷ إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا أُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝ إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

---

[1] سورۃ الانعام: ۳۹

الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ ۝

جب یہ آیتیں اُتریں کہ مُشرکین رجس ہیں پلید ہیں۔ شرّ البریّہ ہیں۔ سُفہاء ہیں اور ذرّیتِ شیطان ہیں اور اُن کے معبود وقودالنّار اور حصبِ جہنّم ہیں تو ابوطالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بُلا کر کہا کہ اَے میرے بھتیجے اَب تیری دشنام دہی سے قوم سخت مشتعل ہوگئی ہے اور قریب ہے کہ تجھ کو ہلاک کر دیں اور ساتھ ہی مجھ کو بھی۔ تُو نے ان کے عقلمندوں کو سفیہ قرار دیا اور ان کے بزرگوں کو شرّ البریّہ کہا اور اُن کے قابلِ تعظیم معبودوں کا نام ہیزمِ جہنّم اور وقودالنّار رکھا اور عام طور پر اُن کو رجس اور ذرّیتِ شیطان اور پلید ٹھہرایا۔ مَیں تجھے خیر خواہی کی راہ سے کہتا ہوں کہ اپنی زبان کو تھام اور دشنام دہی سے باز آجا ورنہ مَیں قوم کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں کہا کہ اَے چچا یہ دشنام دہی نہیں ہے بلکہ اظہارِ واقعہ ہے اور نفس الامر کا عین محل پر بیان ہے اور یہی تو کام ہے جس کے لئے مَیں بھیجا گیا ہوں اگر اس سے مجھے مَرنا درپیش ہے تو مَیں بخوشی اپنے لئے اِس موت کو قبول کرتا ہوں۔ میری زندگی اِس راہ میں وقف ہے۔ مَیں موت کے ڈر سے اظہارِ حق سے رُک نہیں سکتا اور اے چچا اگر تجھے اپنی کمزوری اور اپنی تکلیف کا خیال ہے تو تُو مجھے پناہ میں رکھنے سے دستبردار ہو جا بخدا مجھے تیری کچھ بھی حاجت نہیں۔ مَیں احکامِ الٰہی کے پہنچانے سے کبھی نہیں رُکوں گا۔ مجھے اپنے مَولیٰ کے احکام جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ بخدا اگر مَیں اِس راہ میں مارا جاؤں تو چاہتا ہوں کہ پھر بار بار زندہ ہو کر ہمیشہ اُسی راہ میں مَرتا رہوں۔ یہ خوف کی جگہ نہیں بلکہ مجھے اس میں بے اِنتہا لذّت ہے کہ اُس کی راہ میں دُکھ اُٹھاؤں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ تقریر کر رہے تھے اور چہرہ پر سچائی اور نورانیت سے بھری ہوئی رِقّت نمایاں ہو رہی تھی۔ اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ تقریر ختم کر چکے تو حق کی روشنی دیکھ کر بے اختیار ابوطالب کے آنسو جاری ہوگئے اور کہا کہ مَیں تیری اِس اعلیٰ حالت سے بے خبر تھا تُو اَور ہی رنگ میں اور اَور ہی شان میں ہے۔ جا اپنے کام میں لگا رہ۔ جب تک مَیں زندہ ہوں جہاں تک میری طاقت ہے مَیں تیرا ساتھ دوں گا۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۱۷، ۱۸)

دیکھو اِس آیت کے رُو سے ایک ایسے گروہ کو شرّ البریّہ کہا گیا ہے جس میں سے گروہِ دجّال ہے اور ایسے گروہ کو خیر البریّہ کہا گیا ہے جو اُمّتِ محمدیہ ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۱)

اِنسان کو چاہیئے کہ اپنا فرض ادا کرے اور اعمالِ صالحہ میں ترقّی کرے۔ الہام کرنا اور رُؤیا دکھانا یہ تو خدا تعالیٰ کا فعل ہے اس پر ناز نہیں کرنا چاہیئے۔ اپنے اعمال کو درست کرنا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ یہ نہیں کہا کہ جن کو کشوف اور الہامات ہوتے ہیں وہ خیر البریّہ ہیں۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۳)

سُورۃ الزّلزال

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا ۝ۙ وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا ۝ۙ وَقَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَهَا ۝ۚ یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا ۝ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰی لَهَا ۝ؕ یَوۡمَئِذٍ یَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا ۝ۙ لِّیُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ ۝ؕ فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا یَّرَهٗ ۝ؕ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ۝

اِذَا زُلۡزِلَتۡ کے لفظ سے اِس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جب تم یہ نشانیاں دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ لیلۃ القدر اپنے تمام زور کے ساتھ پھر ظاہر ہوئی ہے اور کوئی ربّانی مُصلح خدائے تعالیٰ کی طرف سے مع ہدایت پھیلانے والے فرشتوں کے نازل ہو گیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا ۝ۙ وَ اَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا ۝ۙ وَقَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَهَا ۝ۚ یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا ۝ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰی لَهَا ۝ؕ یَوۡمَئِذٍ یَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا ۝ۙ لِّیُرَوۡا اَعۡمَالَهُمۡ ۝ؕ فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا یَّرَهٗ ۝ؕ وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ۝ یعنی اُن دنوں کا جب آخری زمانہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی عظیم الشّان مصلح آئے گا اور فرشتے نازل ہوں گے یہ نشان ہے کہ زمین جہاں تک اُس کا ہلانا ممکن ہے ہلائی جائے گی یعنی طبیعتوں اور دلوں اور دماغوں کو غایت درجہ پرجُنبش دی جائے گی اور خیالات عقلی اور فکری اور سبعی اور بہیمی پورے پورے جوش کے ساتھ حرکت میں آجائیں گے اور زمین اپنے تمام بوجھوں کو باہر نکال دے گی یعنی

انسانوں کے دل اپنی تمام استعداداتِ مخفیہ کو منصۂ ظہور لائیں گے اور جو کچھ ان کے اندر علوم وفنون کا ذخیرہ ہے یا جو کچھ عمدہ عمدہ دلی اور دماغی طاقتیں اور لیاقتیں ان میں مخفی ہیں سب کی سب ظاہر ہو جائیں گی اور انسانی قوتوں کا آخری نچوڑ نکل آئے گا اور جو جو ملکات انسان کے اندر ہیں یا جو جو جذبات اس کی فطرت میں مودع ہیں وہ تمام ممکن قوت سے حیّزِ فعل میں آجائیں گے اور انسانی حواس کی ہر ایک نوع کی تیزیاں اور بشری عقل کی ہر قسم کی باریک بینیاں نمودار ہو جائیں گی اور تمام دفائن وخزائن علوم مخفیہ وفنون مستورہ کے جو چھپے ہوئے چلے آتے تھے اُن سب پر انسان فتحیاب ہو جائے گا اور اپنی فکری اور عقلی تدبیروں کو ہر ایک باب میں انتہاء تک پہنچا دے گا اور انسان کی تمام قوتیں جو نشاءِ انسانی میں مخمّر ہیں صدہا طرح کی تحریکوں کی وجہ سے حرکت میں آ جائیں گی اور فرشتے جو اس لیلۃ القدر میں مردِ مصلح کے ساتھ آسمان سے اُترے ہوں گے ہر ایک شخص پر اس کی استعداد کے موافق خارق عادت اثر ڈالیں گے یعنی نیک لوگ اپنے نیک خیال میں ترقی کریں گے اور جن کی نگاہیں دُنیا تک محدود ہیں وہ اُن فرشتوں کی تحریک سے دنیوی عقلوں اور معاشرت کی تدبیروں میں وہ یدِ بیضا دکھلائیں گے کہ ایک مردِ عارف متحیّر ہو کر اپنے دِل میں کہے گا کہ یہ عقلی اور فکری طاقتیں ان لوگوں کو کہاں سے ملیں؟ تب اُس روز ہر یک استعدادِ انسانی بزبانِ حال باتیں کرے گی کہ یہ اعلیٰ درجہ کی طاقتیں میری طرف سے نہیں بلکہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے یہ ایک وحی ہے جو ہر یک استعداد پر بحسب اُس کی حالت کے اُتر رہی ہے یعنی صاف نظر آئے گا کہ جو کچھ انسانوں کے دل ودماغ کام کر رہے ہیں یہ اُن کی طرف سے نہیں بلکہ ایک غیبی تحریک ہے کہ اُن سے یہ کام کرا رہی ہے سو اس دن ہر ایک قِسم کی قوتیں جوش میں دکھائی دیں گی۔ دُنیا پرستوں کی قوتیں فرشتوں کی تحریک سے جوش میں آکر اگرچہ بباعث نقصانِ استعداد کے سچائی کی طرف رُخ نہیں کریں گی لیکن ایک قسم کا اُبال اُن میں پیدا ہو کر اور انجماد اور افسردگی دُور ہو کر اپنی معاشرت کے طریقوں میں عجیب قِسم کی تدبیریں اور صنعتیں اور کلیں ایجاد کر لیں گے اور نیکوں کی قوتوں میں خارق عادت طور پر الہامات اور مکاشفات کا چشمہ صاف صاف طور پر بہت نظر آئے گا اور یہ بات شاذ ونادر ہو گی کہ مومن کی خواب جھوٹی نکلے تب انسانی قوٰی کے ظہور وبروز کا دائرہ پورا ہو جائے گا اور جو کچھ انسان کے نوع میں پوشیدہ طور پر ودیعت رکھا گیا تھا وہ سب خارج میں جلوہ گر ہو جائے گا تب خدائے تعالیٰ کے فرشتے ان تمام راستبازوں کو جو زمین کی چاروں طرفوں میں پوشیدہ طور پر زندگی بسر کرتے تھے ایک گروہ کی طرح اکٹھا کر دیں گے اور دُنیا پرستوں کا بھی کُھلا کُھلا ایک گروہ نظر آئے گا تا ہر ایک گروہ اپنی کوششوں کے ثمرات کو دیکھ لیوے تب آخر ہو جائے گی یہ آخری لیلۃ القدر کا نشان ہے جس کی بناء ابھی سے ڈالی گئی ہے جس کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے خدا تعالیٰ نے اِس عاجز کو بھیجا ہے اور مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ اَنْتَ اَشَدُّ مُنَاسَبَةً

بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ وَاَشْبَهَ النَّاسِ بِهٖ خُلْقًا وَّخَلْقًا وَّ زَمَانًا مگر یہ تاثیرات اس لیلۃ القدر کی اب بعد اس کے کم نہیں ہوں گی بلکہ بالاتصال کام کرتی رہیں گی جب تک وہ سب کچھ پُورا نہ ہولے جو خدائے تعالیٰ آسمان پر مقرر کر چکا ہے۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے اپنے اُترنے کے لئے جو زمانہ انجیل میں بیان فرمایا ہے یعنی یہ کہ وہ حضرت نوحؑ کے زمانہ کی طرح امن اور آرام کا زمانہ ہوگا درحقیقت اسی مضمون پر سُورۃ الزلزال جس کی تفسیر ابھی کی گئی ہے دلالتِ اِلتزامی کے طور پر شہادت دے رہی ہے کیونکہ علوم وفنون کے پھیلنے اور انسانی عقول کی ترقیات کا زمانہ درحقیقت ایسا ہی ہونا چاہیئے جس میں غایت درجہ کا امن وآرام ہو کیونکہ لڑائیوں اور فسادوں اور خوف جان اور خلافِ امن زمانہ میں ہرگز ممکن نہیں کہ لوگ عقلی وعملی امور میں ترقیات کرسکیں۔ یہ باتیں تو کامل طور پر تبھی سُوجھتی ہیں کہ جب کامل طور پر امن حاصل ہو۔

ہمارے علماء نے جو ظاہری طور پر اس سُورۃ الزلزال کی یہ تفسیر کی ہے کہ درحقیقت زمین کو آخری دنوں میں سخت زلزلہ آئے گا اور وہ ایسا زمانہ ہوگا کہ تمام زمین اس سے زیر وزبر ہوجائے گی اور جو زمین کے اندر چیزیں ہیں وہ سب باہر آجائیں گی اور انسان یعنی کافر لوگ زمین کو پُوچھیں گے کہ تجھے کیا ہُوا تب اس روز زمین باتیں کرے گی اور اپنا حال بتائے گی۔ یہ سراسر غلط تفسیر ہے کہ جو قرآن شریف کے سیاق وسباق سے مخالف ہے۔ اگر قرآن شریف کے اس مقام پر بنظرِ غور تدبّر کرو تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں سُورتیں یعنی سُورۃ البیّنہ اور سُورۃ الزّلزال سُورۃ القدر کے متعلق ہیں اور آخری زمانہ تک اس کا کُل حال بتلا رہی ہیں ماسوا اس کے کہ ہر ایک عقلِ سلیم سوچ سکتی ہے کہ ایسے بڑے زلزلہ کے وقت میں کہ جب ساری زمین تہ وبالا ہوجائے گی ایسے کافر کہاں زندہ رہیں گے؟ جو زمین سے اُس کے حالات استفسار کریں گے کیا ممکن ہے کہ زمین تو ساری کی ساری زیروزبر ہوجائے یہاں تک کہ اُوپر کا طبقہ اندر اور اندر کا طبقہ باہر آجائے اور پھر لوگ زندہ بچ رہیں بلکہ اِس جگہ زمین سے مراد زمین کے رہنے والے ہیں اور یہ عام محاورہ قرآن شریف کا ہے کہ زمین کے لفظ سے انسانوں کے دِل اور ان کی باطنی قوٰی مراد ہوتی ہیں جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ ایک جگہ فرماتا ہے اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا[1] اور جیسا کہ فرماتا ہے وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا[2] ایسا ہی قرآن شریف میں بیسیوں نظیریں موجود ہیں جو پڑھنے والوں پر پوشیدہ نہیں ماسوا اس کے رُوحانی واعظوں کا ظاہر ہونا

---

[1] سورۃ الحدید : ۱۸ [2] سورۃ الاعراف : ۵۹

اور ان کے ساتھ فرشتوں کا آنا ایک رُوحانی قیامت کا نمونہ ہوتا ہے جس سے مُردوں میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور جو قبروں کے اندر ہیں وہ باہر آجاتے ہیں اور نیک اور بدلوگ اپنی سزا و جزاء پا لیتے ہیں۔ سو اگر سُورۃ الزلزال کو قیامت کے آثار میں قرار دیا جائے تو اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ ایسا وقت رُوحانی طور پر ایک قسم کی قیامت ہی ہوتی ہے۔ خدائے تعالیٰ کے تائید یافتہ بندے قیامت کا ہی رُوپ بن کر آتے ہیں اور انہیں کا وجود قیامت کے نام سے موسُوم ہوسکتا ہے جس کے آنے سے رُوحانی مُردے زندہ ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور نیز اِس میں بھی کچھ شک نہیں کہ جب ایسا زمانہ آجائے گا کہ تمام اِنسانی طاقتیں اپنے کمالات کو ظاہر کر دکھائیں گی اور جس حد تک بشری عقول اور افکار کا پرواز ممکن ہے اُس حد تک وہ پہنچ جائیں گی اور جن مخفی حقیقتوں کو ابتداء سے ظاہر کرنا مقدّر ہے وہ سب ظاہر ہو جائیں گی تب اس عالَم کا دائرہ پُورا ہو کر یک دفعہ اس کی صف لپیٹ دی جائے گی۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝[1]

(ازالہ اَوہام صفحہ ۱۱۳-۱۳۶)

اُس وقت زمین پر سخت زلزلہ آئے گا اور زمین اپنے تمام خزائن اور دفائن باہر نکال دے گی یعنی علوم ارضیہ کی خوب ترقی ہوگی مگر آسمانی علوم کی نہیں۔ (ازالہ اَوہام صفحہ ۶۸۴)

وہ آیات جن میں اوّل ارضی تاریکی زور کے ساتھ پھیلنے کی خبر دی گئی ہے اور پھر آسمانی روشنی کے نازل ہونے کی علامتیں بتائی گئی ہیں وہ یہ ہیں اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ الخ یعنی آخری زمانہ اس وقت آئے گا کہ جس وقت زمین ایک ہولناک جُنبش کے ساتھ جو اس کی مقدار کے مناسبِ حال ہے ہلائی جائے گی۔ یعنی اہل الارض میں ایک تغیرِ عظیم آئے گا اور نفس اور دُنیا پرستی کی طرف لوگ جُھک جائیں گے اور پھر فرمایا کہ زمین اپنے تمام بوجھ نکال ڈالے گی یعنی زمینی علوم اور زمینی مکر اور زمینی چالاکیاں اور زمینی کمالات جو کچھ انسان کی فطرت میں مودع ہیں سب کی سب ظہور میں آجائیں گی اور نیز زمین جس پر انسان رہتے ہیں اپنے تمام خواص ظاہر کر دے گی اور علمِ طبعی اور فلاحت کے ذریعہ سے بہت سی خاصیتیں اس کی معلوم ہو جائیں گی اور کانیں نمودار ہوں گی اور کاشت کاری کی کثرت ہو جائے گی۔ غرض زمین زرخیز ہو جائے گی اور انواع و اقسام کی کلیں ایجاد ہوں گی یہاں تک کہ انسان کہے گا کہ یہ کیا ماجرا ہے اور یہ نئے نئے علوم اور نئے نئے فنون اور نئی نئی صنعتیں کیونکر ظہور میں آتی جاتی ہیں تب زمین یعنی انسانوں کے دل زبانِ حال سے اپنے قصے

---

[1] سُورۃ الرحمٰن : ۲۷، ۲۸

سُنائیں گے کہ یہ نئی باتیں جو ظہور میں آرہی ہیں یہ ہماری طرف سے نہیں یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کی وحی ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ انسان اپنی کوششوں سے اِس قدر علوم عجیبہ پیدا کر سکے۔

اور یاد رہے کہ ان آیات کے ساتھ جو قرآن کریم میں بعض دوسری آیات جو آخرت کے متعلق ہیں شامل کی گئی ہیں وہ درحقیقت اُسی سُنّت اللہ کے موافق شامل فرمائی گئی ہیں جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ورنہ اس میں کچھ شک نہیں کہ حقیقی اور مقدم معنے اِن آیات کے یہی ہیں جو ہم نے بیان کئے اور اس پر قرینہ جو نہایت قوی اور فیصلہ کرنے والا ہے یہ ہے کہ اگر ان آیات کے حسب ظاہر معنے کئے جائیں تو ایک فسادِ عظیم لازم آتا ہے یعنی اگر ہم اِس طور سے معنی کریں کہ کسی وقت باوجود قائم رہنے اس آبادی کے جو دُنیا میں موجود ہے ایسے سخت زلزلے زمین پر آئیں گے جو تمام زمین کے اُوپر کا طبقہ نیچے اور نیچے کا اُوپر ہو جائے گا تو یہ بالکل غیر ممکن اور ممتنعات میں سے ہے۔ آیت موصوفہ میں صاف لکھا ہے کہ انسان کہیں گے کہ زمین کو کیا ہو گیا۔ پھر اگر حقیقتاً یہی بات سچ ہے کہ زمین نہایت شدید زلزلوں کے ساتھ زیر و زبر ہو جائے گی تو انسان کہاں ہوگا جو زمین سے سوال کرے گا تو وہ پہلے ہی زلزلہ کے ساتھ زاویہ عدم میں مخفی ہو جائے گا۔ علومِ حسیہ کا تو کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔ پس ایسے معنے کرنا جو ببداہت باطل اور قرائنِ موجودہ کے مخالف ہوں گویا اسلام سے ہنسی کرانا اور مخالفین کو اعتراض کے لئے موقع دینا ہے۔ پس واقعی اور حقیقی معنے یہی ہیں جو ابھی ہم نے بیان کئے۔

اب ظاہر ہے کہ یہ تغیّرات اور فتن اور زلازل ہمارے زمانہ میں قومِ نصاریٰ سے ہی ظہور میں آئے ہیں جن کی نظیر دُنیا میں کبھی نہیں پائی گئی۔ پس یہ ایک دوسری دلیل اِس بات پر ہے کہ یہی قوم وہ آخری قوم ہے جس کے ہاتھ سے طرح طرح کے فتنوں کا پھیلنا مقدّر تھا جس نے دُنیا میں طرح طرح کے ساحرانہ کام دکھلائے اور جیسا کہ لکھا ہے کہ دجّال نبوت کا دعویٰ کرے گا اور نیز خدائی کا دعویٰ بھی اُس سے ظہور میں آئے گا۔ وہ دونوں باتیں اس قوم سے ظہور میں آگئیں۔ نبوت کا دعویٰ اِس طرح پر کہ اس قوم کے پادریوں نے نبیوں کی کتابوں میں بڑی گستاخی سے دخل بیجا کیا اور ایسی بے باکانہ مداخلت کی کہ گویا وہ آپ ہی نبی ہیں۔ جس طرف چاہا اُن کی عبارات کو پھیر لیا اور اپنے مدّعا کے موافق شرحیں لکھیں اور بیباکی سے ہر یک جگہ مفتریانہ دخل دیا۔ موجود کو چھپایا اور معدوم کو ظاہر کیا اور دعویٰ کے ساتھ ایسے محرّف طور پر معنے کئے کہ گویا اُن پر وحی نازل ہوئی اور وہ نبی ہیں۔ چنانچہ ہمیشہ دیکھا جاتا ہے کہ مناظرات اور مباحثات کے وقت ایسے بیہودہ اور دُور از صدق جواب عمداً دیتے ہیں کہ گویا وہ ایک نئی انجیل بنا رہے ہیں۔ ایسا ہی ان کی تالیفات بھی کسی نئے عیسٰی اور نئی انجیل کی طرف رہبری کر رہے ہیں اور وہ جھوٹ بولنے کے وقت ذرہ ڈرتے نہیں اور چالاکی کی راہ سے کروڑ ہا کتابیں اپنے اس کاذبانہ دعویٰ کے متعلق بنا ڈالیں گویا وہ دیکھ آئے ہیں کہ حضرت عیسٰی خدائی کی کُرسی پر بیٹھے ہیں اور خدائی کا اس طرح پر

دعویٰ کیا کہ خدائی کاموں میں حد سے زیادہ دخل دے دیا اور چاہا کہ زمین و آسمان میں کوئی بھی ایسا بھید مخفی نہ رہے جو وہ اس کی تہ تک نہ پہنچ جائیں اور ارادہ کیا کہ خدا تعالیٰ کے سارے کاموں کو اپنی مٹھی میں لے لیں اور ایسے طور سے خدائی کی کل ان کے ہاتھ میں آجائے کہ اگر ممکن ہو تو سورج کا غروب اور طلوع بھی انہیں کے اختیار میں ہی ہو اور بارش کا ہونا نہ ہونا بھی ان کے اپنے ہاتھ کی کارستانی پر موقوف ہو اور کوئی بات ان کے آگے اَنہونی نہ رہے اور دعویٰ خدائی اَور کیا ہوتا ہے یہی تو ہے کہ خدائی کاموں میں اور خدا تعالیٰ کی خاص قدرتوں میں ہی دخل اندازی کریں اور یہ شوق پیدا ہو کہ کسی طرح اس کی جگہ بھی ہم ہی لے لیں۔ وہ لوگ جو احادیث مسیح موعود اور احادیث متعلقہ دجال پر حرف زنی کرتے ہیں اُن کو اس مقام میں بھی غور کرنی چاہیئے کہ اگر یہ پیشگوئیاں خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتیں اور صرف انسان کا کاروبار ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ایسی صفائی اور عمدگی سے پوری ہوتیں۔ کیا یہ بھی کبھی کسی کے گمان میں تھا کہ یہ قومِ نصاریٰ کسی زمانہ میں انسان کے خدا بنانے میں اس قدر کوششیں اور جعلسازیاں کریں گے اور فلسفی تحقیقاتوں میں خدا کے لئے کوئی مرتبہ خصوصیت نہیں چھوڑیں۔ دیکھو خرِ دجّال جس کے مابین اذنین کا ستّر باع کا فاصلہ لکھا ہے ریلوں کی گاڑیوں سے بطور اغلب اکثر بالکل مطابق آتا ہے اور جیسا کہ قرآن شریف اور حدیث میں آیا ہے کہ اس زمانہ میں اُونٹ کی سواریاں موقوف ہو جائیں گی ایسا ہی ہم دیکھتے ہیں کہ ریل کی سواری نے ان تمام سواریوں کو مات کر دیا اور اب ان کی بہت ہی کم ضرورت باقی رہی ہے اور شاید تھوڑے ہی عرصہ میں اس قدر ضرورت بھی باقی نہ رہے۔ ایسا ہی ہم نے بچشمِ خود دیکھا کہ درحقیقت اس قوم کے علماء و حکماء نے دین کے متعلق وہ فتنے ظاہر کئے کہ جن کی نظیر حضرت آدم سے لے کر تا ایں دم پائی نہیں جاتی۔ پس بلاشبہ نبوت میں بھی انہوں نے مداخلت کی اور خدائی میں بھی۔ اب اس سے زیادہ ان احادیث کی صحت کا کیا ثبوت ہے کہ اُن کی پیشگوئی پوری ہو گئی اور قرآن کریم کی اِن آیات میں یعنی اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ؕ میں حقیقت میں اسی دجّالِ زمانہ کی طرف اشارہ ہے جس کو ذرہ بھی عقل ہو وہ سمجھ سکتا ہے اور یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ وہ قوم اَرضی علوم میں کہاں تک ترقی کرے گی۔

(شہادت القرآن صفحہ ۱۹ تا ۲۲)

خدا تعالیٰ کی وحی میں زلزلہ کا بار بار لفظ ہے اور فرمایا کہ ایسا زلزلہ ہوگا جو نمونہ قیامت کا ہوگا بلکہ قیامت کا زلزلہ اُس کو کہنا چاہیئے جس کی طرف سُورت اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا اشارہ کرتی ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۲۰ حاشیہ)

سُورۃ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ میں زلزلہ کے واسطے صاف پیشگوئی ہے کہ زمین پر سخت زلزلہ آئے گا اور زمین اندر کی چیزیں باہر نکال پھینکے گی.....

قرآن شریف میں آیا ہے کہ پہاڑ زمین کی میخیں ہیں، نادان اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیا بات ہے۔ اِس زلزلہ نے اِس اعتراض کو بھی صاف کیا ہے۔ آتش فشانیوں اور زلزلوں کا موجب یہ پہاڑ ہی ہؤا کرتے ہیں۔ جب پہاڑوں پر تباہی پڑتی ہے تو سب پر تباہی پڑتی ہے۔ پہاڑ امن یا بے امنی کا مرکز بنا ہؤا ہے۔

(بدر جلد ۱ نمبر ۶ مورخہ ۱۸ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۷)

یاجوج ماجوج کی سرشت میں اَرضی جوہر کا کمالِ تام ہے جیسا کہ معدنی جواہرات اور فلذات میں کمالِ تام ہوتا ہے اور یہ دلیل اِس بات پر ہے کہ زمین نے اپنے انتہائی خواص ظاہر کر دئے اور بموجب آیت وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا اپنے اعلیٰ سے اعلیٰ جوہر کو ظاہر کر دیا اور یہ امر استدارتِ زمانہ پر ایک دلیل ہے یعنی جب یاجوج ماجوج کی کثرت ہوگی تو سمجھا جائے گا کہ زمانہ نے اپنا پورا دائرہ دکھلا دیا اور پورے دائرہ کو رجعت بروزی لازم ہے اور یاجوج ماجوج پر اَرضی کمال کا ختم ہونا اِس بات پر دلیل ہے کہ گویا آدم کی خلقت الف سے شروع ہو کر جو آدم کے لفظ کے حرفوں میں سے پہلا حرف ہے اس یاء کے حرف پر ختم ہوگئی کہ جو یاجوج کے لفظ کے سَر پر آتا ہے جو حروف کے سلسلہ کا آخری حرف ہے گویا اس طرح پر یہ سلسلہ الف سے شروع ہو کر اور پھر حرف یاء پر ختم ہو کر اپنے طبعی کمال کو پہنچ گیا۔

خلاصہ کلام یہ کہ آیت ممدوحہ میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بروزی رجوع جو استدارت دائرہ خلقت بنی آدم کے لئے ضروری ہے۔ اِس کی نشانی یہ ہے کہ یاجوج ماجوج کا ظہور اور خروج اقوٰی اور اتم طور پر ہو جائے اور ان کے ساتھ کسی غیر کو طاقتِ مقابلہ نہ رہے کیونکہ دائرہ کے کمال کو یہ لازم ہے کہ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا کا مفہوم کامل طور پر پُورا ہو جائے اور تمام اَرضی قوّتوں کا ظہور اور بروز ہو جائے اور یاجوج ماجوج کا وجود اِس بات پر کامل دلیل ہے کہ جو کچھ اَرضی قوّتیں اور طاقتیں انسان کے وجود میں ودیعت ہیں وہ سب ظہور میں آ گئی ہیں کیونکہ اس قوم کی فطرتی اینٹ اَرضی کمالات کے پژاوہ میں ایسے طور سے پختہ ہوئی ہے کہ اس میں کسی کو بھی کلام نہیں۔ اِسی سِرّ کی وجہ سے خدا نے ان کا نام یاجوج ماجوج رکھا کیونکہ ان کی فطرت کی مٹی ترقی کرتے کرتے کانی جواہرات کی طرح آتشی مادہ کی پوری وارث ہوگئی اور ظاہر ہے کہ مٹی کی ترقیات آخر جواہرات اور فلذات معدنی پر ختم ہو جاتی ہیں تب معمولی مٹی کی نسبت اُن جواہرات اور فلذات میں بہت سا مادہ آگ کا آ جاتا ہے گویا مٹی کا انتہائی کمال شئے کمال یافتہ کو آگ کے قریب لے آتا ہے اور پھر جنسیّت کی کشش کی وجہ سے دوسرے آتشی لوازم اور کمالات بھی اسی مخلوق کو دئے جاتے ہیں۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۳۲ حاشیہ)

آج جو اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا کا زمانہ ہے یہ مسیح موعود ہی کے وقت کے لئے مخصوص تھا چنانچہ

اب دیکھو کہ کس قدر ایجادیں اور نئی کانیں نکل رہی ہیں۔ ان کی نظیر پہلے کسی زمانہ میں نہیں ملتی ہے۔ میرے نزدیک طاعون بھی اسی میں داخل ہے۔ اس کی جڑ زمین میں ہے۔ پہلا اثر چوہوں پر ہوتا ہے۔ غرض اس وقت جبکہ زمینی علوم کمال تک پہنچ رہے ہیں توہینِ اسلام کی حد ہو چکی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اِس پچاس ساٹھ سال میں جس قدر کتابیں، اخبار، رسالے توہینِ اسلام میں شائع ہوئے ہیں کبھی ہوئے تھے۔ پس جب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے تو کوئی مومن نہیں بنتا جب تک کہ اس کے دل میں غیرت نہ ہو۔ بے غیرت آدمی دیّوث ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۵ ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۷)

یُوں تو زمین سے ہمیشہ کانیں نکلتی رہتی ہیں اور آتش فشاں پہاڑ پھٹتے رہتے ہیں مگر اَب خصوصیت سے ان زلزلوں کا آنا اور زمین کا اُلٹنا یہ آخری زمانہ کی علامتوں میں سے ہے اور اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا اسی کی طرف اشارہ ہے۔ زمانہ بتلا رہا ہے کہ وہ ایک نئی صورت اختیار کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ خاص تصرفات زمین پر کرنا چاہتا ہے۔ (البدر جلد اوّل ۷ مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۰)

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

یعنی جو شخص ایک ذرّہ بھر بھی نیک کام کرے وہ بھی ضائع نہیں ہوگا اور ضرور اس کا اجر پائے گا۔

(ضمیمہ انوار الاسلام صفحہ ۲)

اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا..... مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۶۲)

ہم تو اصول ہی کو دیکھیں گے۔ ہمارے اصول میں تو یہ لکھا ہے کہ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ اب اس کا اثر تم خود سوچ لوگے کیا پڑے گا۔ یہی کہ انسان اعمال کی ضرورت محسوس کرے گا اور نیک عمل کرنے کی سعی کرے گا۔ برخلاف اس کے جب یہ کہا جاوے گا کہ انسان اعمال سے نجات نہیں پاسکتا تو یہ اصول انسان کی ہمت اور سعی کو پست کر دے گا اور اس کو بالکل مایوس کرکے بے دست وپا بنا دے گا۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفارہ کا اصول انسانی قوای کی بھی بے حرمتی کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی قوای میں ایک ترقی کا مادہ رکھا ہے لیکن کفارہ اس کو ترقی سے روکتا ہے۔ ابھی مَیں نے کہا ہے کہ کفارہ کا اعتقاد رکھنے والوں کے حالاتِ آزادی اور بے قیدی کو جو دیکھتے ہیں تو یہ اس اصول کی وجہ سے ہے کہ کُتّے اور کتیوں کی طرح بدکاریاں ہوتی ہیں۔ لنڈن کے ہائیڈ پارک میں علانیہ بدکاریاں ہوتی ہیں اور حرامی بچے پیدا ہوتے ہیں پس ہم کو صرف قیل وقال تک ہی محدود نہ رکھنا چاہیئے بلکہ اعمال ساتھ ہونے چاہئیں۔ جو اعمال کی ضرورت نہیں سمجھتا وہ سخت ناعاقبت اندیش اور نادان ہے۔ قانونِ قدرت میں اعمال اور اُن کے نتائج کی نظیریں تو

موجود ہیں کفارہ کی نظیر کوئی موجود نہیں۔ مثلاً بھوک لگتی ہے تو کھانا کھا لینے کے بعد وہ فرو ہو جاتی ہے یا پیاس لگتی ہے پانی پینے سے جاتی رہتی ہے تو معلوم ہُوا کہ کھانا کھانے یا پانی پینے کا نتیجہ بھوک کا جاتے رہنا یا پیاس کا بجھ جانا ہُوا مگر یہ تو نہیں ہوتا کہ بھوک لگے زید کو اور بکر روٹی کھائے اور زید کی بھوک جاتی رہے۔ اگر قانونِ قدرت میں اس کی کوئی نظیر موجود ہوتی تو شاید کفارہ کا مسئلہ مان لینے کی گنجائش نکل آتی لیکن جب قانونِ قدرت میں اس کی کوئی نظیر ہی نہیں ہے تو انسان جو نظیر دیکھ کر ماننے کا عادی ہے اسے کیونکر تسلیم کر سکتا ہے۔ عام قانونِ انسانی میں بھی تو اس کی نظیر نہیں ملتی۔ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ زید نے خون کیا ہو اور خالد کو پھانسی ملی ہو۔ غرض یہ ایک ایسا اصول ہے جس کی کوئی نظیر ہرگز موجود نہیں۔ مَیں اپنی جماعت کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ ضرورت ہے اعمالِ صالحہ کی۔ خدا تعالیٰ کے حضور اگر کوئی چیز جا سکتی ہے تو وہ یہی اعمالِ صالحہ ہیں۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۸ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

خدا تعالیٰ بدُوں کسی نیکی، دعا اور التجا اور بدُوں تفرقہ کافر و مومن کے ہر ایک کی پرورش فرما رہا ہے اور اپنی ربوبیّت اور رحمانیّت کے فیض سے سب کو فیض پہنچا رہا ہے پھر وہ کسی کی نیکیوں کو کب ضائع کرے گا۔ اُس کی شان تو یہ ہے مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ جو ذرہ بھی نیکی کرے اس کا بھی اجر دیتا ہے اور جو ذرہ بدی کرے گا اس کی پاداش بھی ملے گی۔ یہ ہے قرض کا اصل مفہوم جو اِس آیت سے پایا جاتا ہے چونکہ اصل مفہوم قرض کا اس سے پایا جاتا تھا اِس لئے یہی کہہ دیا مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا[1] اور اس کی تفسیر اِس آیت میں موجود ہے مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۰ رجون ۱۸۹۸ء صفحہ ۳)

اس وقت ثواب کے لئے مُستعد ہو جاؤ اور یہ بھی مت سمجھو کہ اگر اس راہ میں خرچ کریں گے تو کچھ کم ہو جاوے گا خدا تعالیٰ کی بارش کی طرح سب کمیاں پُر ہو جائیں گی۔ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ ر اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۷)

یہ سچ ہے کہ جب ایک شخص محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کسی قِسم کی نفسانی اغراض کے بغیر ایک قوم سے قطع تعلق کرتا ہے اور خدا ہی کو راضی کرنے کے لئے دوسری قوم میں داخل ہوتا ہے تو ان تعلقاتِ قومی کے توڑنے میں سخت تکلیف اور دُکھ ہوتا ہے مگر یہ بات خدا تعالیٰ کے نزدیک بڑی قابلِ قدر ہے اور یہ ایک شہادت ہے جس کا بڑا اجر اللہ تعالیٰ کے حضور ملتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے وَمَنْ

---

[1] سورۃ البقرۃ : ۲۴۶

یَعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ یعنی جو شخص ایک ذرہ برابر بھی نیکی کرتا ہے اُسے بھی ضائع نہیں کرتا بلکہ اجر دیتا ہے تو پھر جو شخص اتنی بڑی نیکی کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے ایک موت اپنے لئے روا رکھتا ہے اسے اجر کیوں نہ ملے؟ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

اگر اخلاص ہو تو اللہ تعالیٰ تو ایک ذرہ بھی کسی نیکی کو ضائع نہیں کرتا۔ اس نے تو خود فرمایا ہے مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ اس لئے اگر ذرّہ بھر نیکی ہو تو اللہ تعالیٰ سے اس کا اجر پائے گا۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

کیا وجہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر تقوّل علی اللہ کریں تو ان کو تو گرفت کی جاوے اور اگر کوئی اَور کرے تو اس کی پرواہ نہ کی جاوے۔ نعوذ باللہ اس طرح سے تو امان اُٹھ جاتی ہے۔ صادق اور مفتری میں مابہ الامتیاز ہی نہیں رہتا۔ اِنَّہٗ مَنۡ یَّاۡتِ رَبَّہٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَہٗ جَہَنَّمَ[1]۔ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ۔ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔ "اِنَّہٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ"[2] ان آیات سے صاف طور سے عموم ظاہر ہو رہا ہے کوئی خصوصیت نہیں۔ تو نہ معلوم پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر افتراء علی اللہ کریں تو خدا اُن پر اِتمام حجّت کرتا ہے مگر کوئی اَور یہی جُرم کر دے تو خیر چنداں ہرج کی بات نہیں معاذ اللہ۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

وَ ہُوَ الَّذِیۡ یَقۡبَلُ التَّوۡبَۃَ عَنۡ عِبَادِہٖ وَ یَعۡفُوۡا عَنِ السَّیِّاٰتِ[3] یعنی تمہارا خدا وہ خدا ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی بدیاں ان کو معاف کر دیتا ہے۔ کسی کو یہ دھوکہ نہ لگے کہ قرآن شریف میں یہ آیت بھی ہے وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ یعنی جو شخص ایک ذرّہ بھی شرارت کرے گا وہ اس کی سزا پائے گا پس یاد رہے کہ اس میں اور دوسری آیات میں کچھ تناقض نہیں کیونکہ اس شَرّ سے وہ شَرّ مراد ہے جس پر انسان اصرار کرے اور اس کے ارتکاب سے باز نہ آوے اور توبہ نہ کرے۔ اسی غرض سے اس جگہ شَرّ کا لفظ استعمال کیا ہے نہ ذنب کا۔ تا معلوم ہو کہ اس جگہ کوئی شرارت کا فعل مراد ہے جس سے شریر آدمی باز آنا نہیں چاہتا ورنہ سارا قرآن شریف اس بارہ میں بھرا پڑا ہے کہ ندامت اور توبہ اور ترک اصرار اور استغفار سے گناہ بخشے جاتے ہیں بلکہ خدا تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے پیار کرتا ہے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۱۶)

بعض لوگوں پر دُکھ کی مار ہوتی ہے اور وہ ان کی اپنی ہی کرتوتوں کا نتیجہ ہے مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ

---

[1] سورۃ طٰہٰ: ۷۵ [2] سورۃ الانعام: ۲۲ [3] سورۃ الشوریٰ: ۲۶

ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔ پس آدمی کو لازم ہے کہ توبہ و استغفار میں لگا رہے اور دیکھتا رہے کہ ایسا نہ ہو بداعمالیاں حد سے گذر جاویں اور خدا تعالیٰ کے غضب کو کھینچ لاویں۔ جب خدا تعالیٰ کسی پر فضل کے ساتھ نگاہ کرتا ہے تو عام طور پر دِلوں میں اُس کی محبت کا القاء کر دیتا ہے لیکن جس وقت انسان کا شر حد سے گذر جاتا ہے اُس وقت آسمان پر اس کی مخالفت کا ارادہ ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کے منشاء کے موافق لوگوں کے دِل سخت ہو جاتے ہیں مگر جونہی وہ توبہ و استغفار کے ساتھ خدا کے آستانہ پر گر کر پناہ لیتا ہے تو اندر رہی اندر ایک رحم پیدا ہو جاتا ہے اور کسی کو پتہ بھی نہیں لگتا کہ اس کی محبت کا بیج لوگوں کے دِلوں میں بو دیا جاتا ہے۔ غرض توبہ و استغفار ایسا مجرب نسخہ ہے کہ خطا نہیں جاتا۔ (الحکم جلد ۳ ۱۷ مورخہ ۱۲ رمئی ۱۸۹۹ء صفحہ ۵)

افسوس وجودی کی حالت پر خدا بھی بنا پھر اس سے کچھ نہ ہوا۔ پھر عجب تر یہ ہے کہ یہ خدائی اس کو دوزخ سے نہیں بچا سکتی کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔ پس جب کوئی گناہ کیا تو اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے جہنم میں جانا پڑا اور ساری خدائی باطل ہو گئی۔

(الحکم جلد ۵ ۳۵ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

ضروری اور واقعی طور پر یہ سزائیں نہیں ہیں جو یہاں دی جاتی ہیں بلکہ یہ ایک ظِلّ ہے اصل سزاؤں کا اور اُن کی غرض ہے عبرت۔

دوسرے عالم کے مقاصد اور ہیں اور وہ بالاتر اور بالاتر ہیں۔ وہاں تو مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَہٗ کا اِنعکاسی نمونہ لوگ دیکھ لیں گے اور انسان کو اپنے مخفی در مخفی گناہوں اور عزیمتوں کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ دُنیا اور آخرت کی سزاؤں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ دُنیا کی سزائیں امن قائم کرنے اور عبرت کے لئے ہیں اور آخرت کی سزائیں افعالِ انسانی کے آخری اور انتہائی نتائج ہیں۔ وہاں اُسے سزا ملنی ٹھہری کیونکہ اس نے زہر کھائی ہوئی ہے اور یہ ممکن نہیں کہ بدوں تریاق وہ اُس زہر کے اثر سے محفوظ رہ سکے۔

(الحکم جلد ۶ ۱ مورخہ ۱۰ ر جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

اوّل گناہ کا علم عطا ہوتا ہے۔ پھر وہ خدا جس نے مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَہٗ فرمایا ہے اس کو عرفان بخشتا ہے تب وہ بندہ خدا کے خوف میں ترقی کرتا اور اس پاکیزگی کو پالیتا ہے جو اُس کی پیدائش کا مقصد ہے۔ (الحکم جلد ۷ ۷ مورخہ ۲۱ ر فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

خدا تعالیٰ سے جو ذرّہ بھر بھی تعلق رکھتا ہے وہ کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَہٗ۔

(البدر جلد ۲ ۱۴ مورخہ ۲۴ ر اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

اللہ تعالیٰ کسی کے اجر کو ضائع نہیں کرتا جو کوئی ذرہ سی بھی بھلائی کرتا ہے وہ اس کا بدلہ پا لیتا ہے۔
(البدر جلد ۲ نمبر ۲۴ مورخہ ۳ رجولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۸۶)

مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ کوئی بُرا عمل کرے خواہ کتنا ہی کیوں نہ کرے اس کی پاداش اس کو ملے گی۔ یہاں کوئی تخصیص ذات اور قوم کی نہیں۔
(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

سُورۃ التکاثر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اَلۡہٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۙ حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ؕ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ ثُمَّ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ؕ کَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡیَقِیۡنِ ؕ لَتَرَوُنَّ الۡجَحِیۡمَ ۙ ثُمَّ لَتَرَوُنَّہَا عَیۡنَ الۡیَقِیۡنِ ۙ ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ یَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِیۡمِ ○

دُنیا کی حرص و ہَوا نے تمہیں آخرت کی تلاش سے روک رکھا یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پڑے۔ دُنیا سے دِل مت لگاؤ۔ تم عنقریب جان لوگے کہ دُنیا سے دل لگانا اچھا نہیں۔ پھر میں کہتا ہوں کہ عنقریب تم جان لوگے کہ دُنیا سے دل لگانا اچھا نہیں۔ اگر تمہیں یقینی علم حاصل ہو تو تم دوزخ کو اِسی دُنیا میں دیکھ لوگے پھر برزخ کے عالَم میں یقین کی آنکھوں کے ساتھ دیکھو گے۔ پھر عالَمِ حَشرِ اجساد میں پورے مؤاخذہ میں آجاؤ گے اور وہ عذاب تم پر کامل طور پر وارد ہو جائے گا اور صرف قال سے نہیں بلکہ حال سے تمہیں دوزخ کا علم حاصل ہو جائے گا۔

اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا ہے کہ اسی جہان میں بدکاروں کے لئے جہنمی زندگی پوشیدہ طور پر ہوتی ہے اور اگر غور کریں تو اپنی دوزخ کو اِسی دُنیا میں دیکھ لیں گے اور اِس جگہ اللہ تعالیٰ نے علم کو تین ۳ درجوں پر منقسم کیا ہے یعنی علم الیقین، عَین الیقین، حق الیقین۔ اور عام کے سمجھنے کے لئے اِن

تینوں علموں کی یہ مثالیں ہیں کہ اگر مثلاً ایک شخص دُور سے کسی جگہ بہت سا دھواں دیکھے اور دھوئیں سے ذہن منتقل ہو کر آگ کی طرف چلا جائے اور آگ کے وجود کو یقین کرے اور اِس خیال سے کہ دھوئیں اور آگ میں ایک تعلق لاینفک اور ملازمتِ تامہ ہے۔ جہاں دھواں ہوگا ضرور ہے کہ آگ بھی ہو پس اس علم کا نام علم الیقین ہے اور پھر جب آگ کے شعلے دیکھ لے تو اس کا نام عین الیقین ہے اور جب اس آگ میں آپ ہی داخل ہو جائے تو اس علم کا نام حق الیقین ہے۔ اب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جہنم کے وجود کا علم الیقین تو اسی دُنیا میں ہو سکتا ہے۔ پھر عالمِ برزخ میں عین الیقین حاصل ہوگا اور عالمِ حشرِ اجساد میں وہی علم حق الیقین کے کامل مرتبہ تک پہنچے گا۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۸۸)

اے وے لوگو جو خدا سے غافل ہو دُنیا طلبی نے تمہیں غافل کیا یہاں تک کہ تم قبروں میں داخل ہو جاتے ہو اور غفلت سے باز نہیں آتے۔ یہ تمہاری غلطی ہے اور عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ پھر میں کہتا ہوں کہ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ اگر تمہیں یقینی علم حاصل ہو جائے تو تم علم کے ذریعہ سے سوچ کر کے اپنے جہنم کو دیکھ لو اور تمہیں معلوم ہو جائے کہ تمہاری زندگی جہنمی ہے۔ پھر اگر اس سے بڑھ کر تمہیں معرفت ہو جائے تو تم یقینِ کامل کی آنکھ سے دیکھ لو کہ تمہاری زندگی جہنمی ہے۔ پھر وہ وقت بھی آتا ہے کہ تم جہنم میں ڈالے جاؤ گے اور ہر ایک عیاشی اور بے اعتدالی سے پوچھے جاؤ گے یعنی عذاب میں ماخوذ ہو کر حق الیقین تک پہنچ جاؤ گے۔

اِن آیات میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یقین تین قسم کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ محض علم اور قیاس سے حاصل ہوتا ہے جیسا کہ کوئی دُور سے دھواں دیکھے اور قیاس اور عقل کو دخل دے کر سمجھ لے کہ اِس جگہ ضرور آگ ہوگی اور پھر دوسری قسم یقین کی یہ ہے کہ اس آگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ پھر تیسری قسم یقین کی یہ ہے کہ مثلاً اس آگ میں ہاتھ ڈال دے اور اس کی قوتِ احتراق سے مزہ چکھ لے۔ پس یہ تین قسمیں ہوئیں عِلم الیقین، عَین الیقین، حق الیقین۔ اِس آیت میں خدا تعالیٰ نے سمجھایا کہ تمام راحت انسان کی خدا تعالیٰ کے قُرب اور محبت میں ہے اور جب اس سے علاقہ توڑ کر دُنیا کی طرف جھکے تو یہ جہنمی زندگی ہے اور اس جہنمی زندگی پر آخر کار ہر ایک شخص اطلاع پا لیتا ہے اور اگرچہ اسی وقت اطلاع پاوے جب کہ یک دفعہ مال و متاع اور دُنیا کے تعلقات کو چھوڑ کر مرنے لگے۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۱۱، ۱۲)

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ۔ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کہ اے لوگو جو تم خدا تعالیٰ سے غافل ہو دُنیا طلبی نے تم کو غافل کر دیا ہے یہاں تک کہ قبروں میں داخل ہو جاتے ہو مگر غفلت سے باز نہیں آتے کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مگر اِس غلطی کا تم کو عنقریب علم ہو جائے گا ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ پھر تم کو اطلاع دی جاتی ہے کہ عنقریب تم کو علم ہو جاوے گا کہ جن خواہشات کے پیچھے تم پڑے ہو وہ ہرگز تمہارے کام نہ آویں گی اور حسرت کا موجب ہوں گی

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ اگر تم کو یقینی علم حاصل ہو جاوے تو تم علم کے ذریعہ سے سوچ کر اپنے جہنم کو دیکھ لو اور تم کو پتہ لگ جاوے کہ تمہاری زندگی جہنمی زندگی ہے اور جن خیالات میں تم رات دن لگے ہوئے ہو وہ بالکل ناکارہ ہیں۔ (البدر جلد ۴ ۳ مورخہ ۲۰ ؍جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

جاننا چاہیئے کہ قرآن شریف نے علم تین قسم پر قرار دیا ہے۔ علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین جیسا کہ ہم پہلے اس سے سورۃ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ کی تفسیر میں ذکر کر چکے ہیں اور بیان کر چکے ہیں کہ علم الیقین وہ ہے کہ شئے مقصود کا کسی واسطہ کے ذریعہ سے نہ بلاواسطہ پتہ لگایا جاوے جیسا کہ ہم دھوئیں سے آگ کے وجود پر استدلال کرتے ہیں پر آگ کو دیکھا نہیں مگر دھوئیں کو دیکھا ہے کہ جس سے ہمیں آگ کے وجود پر یقین آیا سو یہ علم الیقین ہے۔ اور اگر ہم نے آگ کو ہی دیکھ لیا ہے تو یہ بموجب بیان قرآن شریف یعنی سورہ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ کے علم کے مراتب میں عین الیقین کے نام سے موسوم ہے اور اگر ہم اس آگ میں داخل بھی ہو گئے ہیں تو اس علم کے مرتبہ کا نام قرآن شریف کے بیان کی رُو سے حق الیقین ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۱۷)

ایمان اس اقرارِ لسانی و تصدیقِ قلبی سے مراد ہے جو تبلیغ و پیغام کسی نبی کی نسبت محض تقویٰ اور دُور اندیشی کے لحاظ سے صرف نیک ظنّی کی بنیاد پر یعنی بعض وجوہ کو معتبر سمجھ کر اور اُس طرف غلبہ اور رجحان پا کر بغیر انتظارِ کامل اور قطعی اور واشگاف ثبوت کے دلی انشراح سے قبولیت و تسلیم ظاہر کی جائے لیکن جب ایک خبر کی صحت پر وجوہِ کاملہ قیاسیہ اور دلائلِ کافیہ عقلیہ مل جائیں تو اس بات کا نام ایقان ہے جس کو دوسرے لفظوں میں علم الیقین بھی کہتے ہیں اور جب خدائے تعالیٰ خود اپنے خاص جذبہ اور موہبت سے خارق عادت کے طور پر انوارِ ہدایت کھولے اور اپنے آلاء و نعماء سے آشنا کرے اور لدنّی طور پر عقل اور علم عطا فرماوے اور ساتھ اس کے ابوابِ کشف اور الہام بھی منکشف کر کے عجائباتِ الوہیت کا سیر کرا دے اور اپنے محبوبانہ حُسن و جمال پر اطلاع بخشے تو اس مرتبہ کا نام عرفان ہے جس کو دوسرے لفظوں میں عین الیقین اور ہدایت اور بصیرت سے بھی موسوم کیا گیا ہے اور جب ان تمام مراتب کی شدتِ اثر سے عارف کے دل میں ایک ایسی کیفیت حالی عشق اور محبت کے باذنہٖ تعالیٰ پیدا ہو جائے کہ تمام وجود عارف کا اس کی لذّت سے بھر جائے اور آسمانی انوار اُس کے دل پر بکلّی احاطہ کر کے ہر یک ظلمت و قبض و تنگی کو درمیان سے اُٹھا دیں یہانتک کہ بوجہ کمال رابطۂ عشق و محبّت و بباعث انتہائی جوشِ صدق و صفا کی بلا اور مصیبت بھی محسوس اللذّت و مدرک الحلاوت ہو تو اس درجہ کا نام اطمینان ہے جس کو دوسرے لفظوں میں حق الیقین اور فلاح اور نجات سے بھی تعبیر کرتے ہیں مگر یہ سب مراتب ایمانی مرتبہ کے بعد ملتے ہیں۔ جو شخص اپنے ایمان میں قوی ہوتا

ہے وہ رفتہ رفتہ اِن سب مراتب کو پالیتا ہے لیکن جو شخص ایمانی طریق کو اختیار نہیں کرتا اور ہر ایک صداقت کے قبول کرنے سے اوّل قطعی اور یقینی اور نہایت واشگاف ثبوت مانگتا ہے اُس کی طبیعت کو اس راہ سے کچھ مناسبت نہیں اور وہ اِس لائق ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اُس قادر غنی بے نیاز کے فیوض حاصل کرے۔

(سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۵۔ ۳۱)

عِلم تین قسم پر ہوتا ہے (۱) ایک علم الیقین جیسا کہ کوئی دُور سے دھواں دیکھ کر یہ قیاس کرے کہ اس جگہ ضرور آگ ہوگی (۲) دوسرا عین الیقین جیسا کوئی اُس آگ کو اپنی آنکھ سے دیکھ لے (۳) تیسرا حق الیقین جیسا کہ کوئی اُس آگ میں ہاتھ ڈال کر اس کی گرمی محسوس کرے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۸ حاشیہ)

آسمانی نشانوں سے حصّہ لینے والے تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں اوّل وہ جو کوئی ہُنر اپنے اندر نہیں رکھتے اور کوئی تعلق خدا تعالیٰ سے اُن کا نہیں ہوتا صرف دماغی مناسبت کی وجہ سے اُن کو بعض سچّی خوابیں آجاتی ہیں اور سچّے کشف ظاہر ہو جاتے ہیں جن میں کوئی مقبولیّت اور محبوبیّت کے آثار ظاہر نہیں ہوتے اور اُن سے کوئی فائدہ ان کی ذات کو نہیں ہوتا اور ہزاروں شریر اور بدچلن اور فاسق وفاجر ایسی بدبُودار خوابوں اور الہاموں میں ان کے شریک ہوتے ہیں اور اکثر دیکھا جاتا ہے کہ باوجود ان خوابوں اور کشفوں کے ان کا چال چلن قابلِ تعریف نہیں ہوتا۔ کم سے کم یہ کہ ان کی ایمانی حالت نہایت کمزور ہوتی ہے اِس قدر کہ ایک سچّی گواہی بھی نہیں دے سکتے اور جس قدر دُنیا سے ڈرتے ہیں خدا سے نہیں ڈرتے اور شریر آدمیوں سے قطع تعلق نہیں کرسکتے اور کوئی ایسی سچّی گواہی نہیں دے سکتے جس سے بڑے آدمی کے ناراض ہوجانے کا اندیشہ ہو اور دینی امور میں نہایت درجہ کسل اور سُستی ان میں پائی جاتی ہے اور دُنیا کے ہموم وغموم میں دن رات غرق رہتے ہیں اور دانستہ جھوٹ کی حمایت کرتے ہیں اور سچ کو چھوڑتے ہیں اور ہر ایک قدم میں خیانت پائی جاتی ہے اور بعض میں اِس سے بڑھ کر یہ عادت بھی پائی گئی ہے کہ وہ فسق وفجور سے بھی پرہیز نہیں کرتے اور دُنیا کمانے کے لئے ہر ایک ناجائز کام کرلیتے ہیں اور بعض کی اَخلاقی حالت بھی نہایت خراب ہوتی ہے اور حسد اور بُخل اور عُجب اور تکبّر اور غرور کے مبتلے ہوتے ہیں اور ہر ایک کمینگی کے کام اُن سے صادر ہوتے ہیں اور طرح طرح کی قابلِ شرم خباثتیں اُن میں پائی جاتی ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ بعض ان میں ایسے ہیں کہ ہمیشہ بدخوابیں ہی ان کو آتی ہیں اور وہ سچّی بھی ہوجاتی ہیں۔ گویا ان کے دماغ کی بناوٹ صرف بد اور منحوس خوابوں کے لئے مخلوق ہے نہ اپنے لئے کوئی بہتری کے خواب دیکھ سکتے ہیں جس سے اُن کی دُنیا درست ہو اور اُن کی مرادیں حاصل ہوں اور نہ اَوروں کے لئے کوئی بشارت کی خواب دیکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے خوابوں کی حالت اقسامِ ثلاثہ میں سے اُس جسمانی نظارہ سے مشابہ ہے جب کہ ایک شخص دُور سے صرف ایک دھواں آگ کا

دیکھتا ہے مگر آگ کی روشنی نہیں دیکھتا اور نہ آگ کی گرمی محسوس کرتا ہے کیونکہ یہ لوگ خدا سے بالکل بے تعلق ہیں اور رُوحانی امور سے صرف ایک دعویٰ اُن کی قسمت میں ہے جس سے کوئی روشنی حاصل نہیں ہوتی۔

پھر دوسری قسم کے خواب بین یا مُلہم وہ لوگ ہیں جن کو خدا تعالیٰ سے کسی قدر تعلق ہے مگر کامل تعلق نہیں اُن لوگوں کی خوابوں یا الہاموں کی حالت اُس جسمانی نظارہ سے مشابہ ہے جب کہ ایک شخص اندھیری رات اور شدیدُ البرد رات میں دُور سے ایک آگ کی روشنی دیکھتا ہے۔ اس دیکھنے سے اتنا فائدہ تو اُسے حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی راہ پر چلنے سے پرہیز کرتا ہے جس میں بہت سے گڑھے اور کانٹے اور پتھر اور سانپ اور درندے ہیں مگر اس قدر روشنی اس کو سردی اور ہلاکت سے بچا نہیں سکتی۔ پس اگر وہ آگ کے گرم حلقہ تک پہنچ نہ سکے تو وہ بھی ایسا ہی ہلاک ہو جاتا ہے جیسا کہ اندھیرے میں چلنے والا ہلاک ہو جاتا ہے۔

پھر تیسری قسم کے مُلہم اور خواب بین وہ لوگ ہیں جن کے خوابوں اور الہاموں کی حالت اُس جسمانی نظارہ سے مشابہ ہے جب کہ ایک شخص اندھیری اور شدیدُ البرد رات میں نہ صرف آگ کی کامل روشنی ہی پاتا ہے اور اُس میں چلتا ہے بلکہ اس کے گرم حلقہ میں داخل ہو کر بکلی سردی کے ضرر سے محفوظ ہو جاتا ہے اس مرتبہ تک وہ لوگ پہنچتے ہیں جو شہواتِ نفسانیہ کا چولہ آتشِ محبتِ الٰہی میں جلا دیتے ہیں اور خدا کے لئے تلخی کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں جو آگے موت ہے اور دوڑ کر اُس موت کو اپنے لئے پسند کر لیتے ہیں وہ ہر ایک درد کو خدا کی راہ میں قبول کرتے ہیں اور خدا کے لئے اپنے نفس کے ہو کر اور اُس کے برخلاف قدم رکھ کر ایسی طاقتِ ایمانی دکھلاتے ہیں کہ فرشتے بھی اُن کے اس ایمان سے حیرت اور تعجب میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ روحانی پہلوان ہوتے ہیں اور شیطان کے تمام حملے اُن کی روحانی قوت کے آگے ہیچ ٹھہرتے ہیں۔ وہ سچے وفادار اور صادق مرد ہوتے ہیں کہ نہ دُنیا کے لذّات کے نظارے انہیں گمراہ کر سکتے ہیں اور نہ اولاد کی محبّت اور نہ بیوی کا تعلق اُن کو اپنے محبوبِ حقیقی سے برگشتہ کر سکتا ہے۔ غرض کوئی تلخی اُن کو ڈرا نہیں سکتی اور کوئی نفسانی لذّت اُن کو خدا سے روک نہیں سکتی اور کوئی تعلق خدا کے تعلق میں رخنہ انداز نہیں ہو سکتا۔

یہ تین روحانی مراتب کی حالتیں ہیں جن میں سے پہلی حالت علم الیقین کے نام سے موسوم ہے اور دوسری عین الیقین کے نام سے نامزد ہے اور تیسری مبارک اور کامل حالت حق الیقین کہلاتی ہے اور انسانی معرفت کامل نہیں ہو سکتی اور نہ کدورتوں سے پاک ہو سکتی ہے جب تک حق الیقین تک نہیں پہنچتی کیونکہ حق الیقین کی حالت صرف مشاہدات پر موقوف نہیں بلکہ یہ بطور حال کے انسان کے دل پر وارد ہوتی ہے اور انسان محبتِ الٰہی کی بھڑکتی ہوئی آگ میں پڑ کر اپنے نفسانی وجود سے بالکل نیست ہو جاتا ہے اور اس مرتبہ پر انسانی معرفت پہنچ کر قال سے حال کی طرف انتقال کرتی ہے اور سفلی زندگی بالکل جل کر خاک ہو جاتی ہے اور ایسا انسان

خدا تعالیٰ کی گود میں بیٹھ جاتا ہے اور جیسا کہ ایک لوہا آگ میں پڑ کر بالکل آگ کی رنگ میں آجاتا ہے اور آگ کی صفات اُس سے ظاہر ہونی شروع ہو جاتی ہیں ایسا ہی اس درجہ کا آدمی صفاتِ الٰہیہ سے ظلّی طور پر متصف ہو جاتا ہے اور اس قدر طبعاً مرضاتِ الٰہیہ میں فنا ہو جاتا ہے کہ خدا میں ہو کر بولتا ہے اور خدا میں ہو کر دیکھتا ہے اور خدا میں ہو کر سُنتا ہے اور خدا میں ہو کر چلتا ہے گویا اُس کے جُبّہ میں خدا ہی ہوتا ہے اور انسانیت اس کی تجلیاتِ الٰہیہ کے نیچے مغلوب ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ مضمون نازک ہے اور عام فہم نہیں اِس لئے ہم اس کو اِسی جگہ چھوڑتے ہیں۔

اور ایک دوسرے پیرایہ میں ہم اس مرتبہ ثالثہ کی جو اعلیٰ اور اکمل مرتبہ ہے اس طرح پر تصویر کھینچتے ہیں کہ وہ وحیٔ کامل جو اقسامِ ثلاثہ میں سے تیسری قسم کی وحی ہے جو کامل فرد پر نازل ہوتی ہے اُس کی یہ مثال ہے کہ جیسے سورج کی دُھوپ اور شعاع ایک مصفا آئینہ پر پڑتی ہے جو عین اس کے مقابل پر پڑا ہے یہ تو ظاہر ہے کہ اگرچہ سورج کی دُھوپ ایک ہی چیز ہے لیکن بوجہ اختلافِ مظاہر کے اس کے ظہور کی کیفیت میں فرق پیدا ہو جاتا ہے پس جب سورج کی شعاع زمین کے کسی کثیف حصّہ میں پڑتی ہے جس کی سطح پر ایک شفاف اور مصفا پانی موجود نہیں بلکہ سیاہ اور تاریک خاک ہے اور سطح بھی مستوی نہیں تب شعاع نہایت کمزور ہوتی ہے خاص کر اس حالت میں جبکہ سورج اور زمین میں کوئی بادل بھی حائل ہو لیکن جب وہی شعاع جس کے آگے کوئی بادل حائل نہیں ایک شفاف پانی پر پڑتی ہے جو ایک مصفا آئینہ کی طرح چمکتا ہے تب وہی شعاع ایک سے وہ چند ہو کر ظاہر ہوتی ہے جسے آنکھ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ پس اسی طرح جب نفسِ تزکیہ یافتہ پر جو تمام کدورتوں سے پاک ہوتا ہے وحی نازل ہوتی ہے تو اس کا نور فوق العادت نمایاں ہوتا ہے اور اس نفس پر صفاتِ الٰہیہ کا اِنعکاس پورے طور پر ہو جاتا ہے اور پورے طور پر چہرۂ حضرت احدیت ظاہر ہوتا ہے۔ اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ جیسے آفتاب جب نکلتا ہے تو ہر ایک پاک ناپاک جگہ پر اس کی روشنی پڑتی ہے یہاں تک کہ ایک پاخانہ کی جگہ بھی جو نجاست سے پُر ہے اُس سے حصّہ لیتی ہے تاہم پُورا فیض اُس روشنی کا اُس آئینۂ صافی یا آبِ صافی کو حاصل ہوتا ہے جو اپنی کمال صفائی سے خود سورج کی تصویر کو اپنے اندر دکھلا سکتا ہے۔ اِسی طرح بوجہ اس کے کہ خدا تعالیٰ بخیل نہیں ہے اس کی روشنی سے ہر ایک فیض یاب ہے مگر تاہم وہ لوگ جو اپنی نفسانی حیات سے مر کر خدا تعالیٰ کی ذات کا مظہرِ اتم ہو جاتے ہیں اور ظلّی طور پر خدا تعالیٰ ان کے اندر داخل ہو جاتا ہے اُن کی حالت سب سے الگ ہے جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ اگرچہ سُورج آسمان پر ہے لیکن تاہم جب وہ ایک نہایت شفاف پانی یا مصفا آئینہ کے مقابل پر پڑتا ہے تو یُوں دکھائی دیتا ہے کہ وہ اس پانی یا آئینہ کے اندر ہے لیکن دراصل وہ اُس پانی یا آئینہ کے اندر نہیں ہے بلکہ پانی یا آئینہ

نے اپنی کمال صفائی اور آب وتاب کی وجہ سے لوگوں کو یہ دکھلا دیا ہے کہ گویا وہ پانی یا آئینہ کے اندر ہے۔

غرض وحیٔ الٰہی کے انوار اکمل اور اتم طور پر وہی نفس قبول کرتا ہے جو اکمل اور اتم طور پر تزکیہ حاصل کر لیتا ہے اور صرف الہام اور خواب کا پانا کسی خوبی اور کمال پر دلالت نہیں کرتا جب تک کسی نفس کو بوجہ تزکیہ تام کے یہ انعکاسی حالت نصیب نہ ہو اور محبوبِ حقیقی کا چہرہ اس کے نفس میں نمودار نہ ہو جائے کیونکہ جس طرح فیضِ عام حضرت احدیت نے ہر ایک کو بجز شاذ و نادر لوگوں کے جسمانی صورت میں آنکھ اور ناک اور کان اور قوتِ شامہ اور دوسری تمام قوتیں عطا فرمائی ہیں اور کسی قوم سے بُخل نہیں کیا اِسی طرح رُوحانی طور پر بھی اُس نے کسی زمانہ اور کسی قوم کے لوگوں کو رُوحانی قوٰی کی تخم ریزی سے محروم نہیں رکھا اور جس طرح تم دیکھتے ہو کہ سورج کی روشنی ہر ایک جگہ پڑتی ہے اور کوئی لطیف یا کثیف جگہ اس سے باہر نہیں ہے یہی قانونِ قدرت روحانی آفتاب کی روشنی کے متعلق ہے کہ نہ کثیف جگہ اُس روشنی سے محروم رہ سکتی ہے اور نہ لطیف جگہ ہاں مصفّٰی اور شفاف دلوں پر وہ نور عاشق ہے جب وہ آفتابِ روحانی مصفّٰی چیزوں پر اپنا نور ڈالتا ہے تو اپنا کُل نور ان میں ظاہر کر دیتا ہے یہاں تک کہ اپنے چہرہ کی تصویر اُن میں کھینچ دیتا ہے جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ ایک مصفا پانی یا مصفا آئینہ کے مقابل پر جب سورج آتا ہے تو اپنی تمام صورت اُس میں ظاہر کر دیتا ہے یہاں تک کہ جیسا کہ آسمان پر سورج نظر آتا ہے ویسا ہی بغیر کسی فرق کے اس مصفا پانی یا آئینہ میں نظر آتا ہے۔

پس روحانی طور پر انسان کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی کمال نہیں کہ وہ اس قدر صفائی حاصل کرے کہ خدا تعالیٰ کی تصویر اُس میں کھینچی جائے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً[1] یعنی مَیں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ یہ ظاہر ہے کہ تصویر ایک چیز کی اصل صورت کی خلیفہ ہوتی ہے یعنی جانشین۔ اور یہی وجہ ہے کہ جس جس موقع پر اصل صورت میں اعضاء واقع ہوتے ہیں اور خط و خال ہوتے ہیں اسی اسی موقع پر تصویر میں بھی ہوتے ہیں اور حدیث شریف اور نیز توریت میں بھی ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا۔ پس صورت سے مراد یہی روحانی تشابہ ہے اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جب مثلاً ایک نہایت صاف آئینہ پر آفتاب کی روشنی پڑتی ہے تو صرف اسی قدر نہیں ہوتا کہ آفتاب اس کے اندر دکھائی دیتا ہے بلکہ وہ شیشہ آفتاب کی صفات بھی ظاہر کرتا ہے اور وہ یہ کہ اسکی روشنی انعکاسی طور پر دوسرے پر بھی پڑ جاتی ہے۔ پس یہی حال روحانی آفتاب کی تصویر کا ہوتا ہے کہ جب

---

[1] سورۃ البقرۃ: ۳۱

ایک قلبِ صافی اُس سے ایک اِنعکاسی شکل قبول کر لیتا ہے تو آفتاب کی طرح اُس میں سے بھی شعاعیں نکل کر دوسری چیزوں کو منوّر کرتی ہیں گویا تمام آفتاب اپنی پوری شوکت کے ساتھ اُس میں داخل ہو جاتا ہے۔

اور پھر اِس جگہ ایک اَور نکتہ قابلِ یادداشت ہے اور وہ یہ کہ تیسری قسم کے لوگ بھی جن کا خدا تعالیٰ سے کامل تعلق ہوتا ہے اور کامل اور مصفّا الہام پاتے ہیں قبولِ فیوضِ الٰہیّہ میں برابر نہیں ہوتے اور اُن سب کا دائرۂ استعدادِ فطرت باہم برابر نہیں ہوتا بلکہ کسی کا دائرہ استعدادِ فطرت کم درجہ پر وسعت رکھتا ہے اور کسی کا زیادہ وسیع ہوتا ہے اور کسی کا بہت زیادہ اور کسی کا اس قدر جو خیال و گمان سے برتر ہے اور کسی کا خدا تعالیٰ سے رابطۂ محبت قوی ہوتا ہے اور کسی کا اقویٰ۔ اور کسی کا اِس قدر کہ دُنیا اس کو شناخت نہیں کر سکتی اور کوئی عقل اُس کے انتہا تک نہیں پہنچ سکتی اور وہ اپنے محبوبِ اَزلی کی محبت میں اِس قدر محو ہوتے ہیں کہ کوئی رگ و ریشہ اُن کی ہستی اور وجود کا باقی نہیں رہتا اور یہ تمام مراتب کے لوگ بموجب آیت کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ[1] اپنے دائرۂ استعدادِ فطرت سے زیادہ ترقی نہیں کر سکتے اور کوئی ان میں سے اپنے دائرۂ فطرت سے بڑھ کر کوئی نور حاصل نہیں کر سکتا اور نہ کوئی روحانی تصویر آفتابِ نورانی کی اپنی فطرت کے دائرہ سے بڑھ کر اپنے اندر لے سکتا ہے اور خدا تعالیٰ ہر ایک کی استعدادِ فطرت کے موافق اپنا چہرہ اس کو دکھا دیتا ہے اور فطرتوں کی کمی بیشی کی وجہ سے وہ چہرہ کہیں چھوٹا ہو جاتا ہے اور کہیں بڑا۔ جیسے مثلاً ایک بڑا چہرہ ایک آرسی کے شیشہ میں نہایت چھوٹا معلوم ہوتا ہے مگر وہی چہرہ ایک بڑے شیشہ میں بڑا دکھائی دیتا ہے مگر شیشہ خواہ چھوٹا ہو خواہ بڑا چہرہ کے تمام اعضاء اور نقوش دکھا دیتا ہے صرف فرق یہ ہے کہ چھوٹا شیشہ پورا مقدار چہرہ کا دکھلا نہیں سکتا۔ سو جس طرح چھوٹے اور بڑے شیشہ میں یہ کمی بیشی پائی جاتی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ کی ذات اگرچہ قدیم اور غیر متبدل ہے مگر انسانی استعداد کے لحاظ سے اس میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور اس قدر فرق نمودار ہو جاتے ہیں کہ گویا اظہارِ صفات کے لحاظ سے جو زید کا خدا ہے اُس سے بڑھ کر وہ خدا ہے جو بکر کا خدا ہے اور اس سے بڑھ کر وہ جو خالد کا خدا ہے۔ مگر خدا تین نہیں خدا ایک ہی ہے صرف تجلّیاتِ مختلفہ کی وجہ سے اس کی شانیں مختلف طور پر ظاہر ہوتی ہیں جیسا کہ موسیٰ اور عیسیٰ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا ایک ہی ہے تین خدا نہیں ہیں مگر مختلف تجلّیات کی رُو سے اُسی ایک خدا میں تین شانیں ظاہر ہو گئیں۔ چونکہ موسیٰ کی ہمت صرف بنی اسرائیل اور فرعون تک ہی محدود تھی اِس لئے موسیٰ پر تجلّیٔ قدرتِ الٰہی اُسی حد تک محدود رہی اور اگر موسیٰ کی نظر اُس زمانہ اور آئندہ زمانوں کے تمام بنی آدم پر ہوتی تو توریت کی تعلیم بھی ایسی محدود اور ناقص نہ ہوتی جو اَب ہے۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۰۔۲۷)

---

[1] سورۃ یٰسٓ : ۴۱

خدا نے پہلے سے ارادہ کر رکھا ہے کہ جو متّقی ہے اور خدا کی منشاء کے مطابق ہے تو وہ ان مراتب کو حاصل کر سکے جو انبیاء اور اصفیاء کو حاصل ہوتے ہیں۔اِس سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ انسان کو بہت سے قوٰی ملے ہیں جنہوں نے نشوونما پانا ہے اور بہت ترقی کرنا ہے۔ ہاں ایک بکرا چونکہ انسان نہیں اُس کے قوٰی ترقی نہیں کر سکتے۔ عالی ہمت انسان جب رسولوں اور انبیاء کے حالات سُنتا ہے تو چاہتا ہے کہ وہ انعامات جو اس پاک جماعت کو حاصل ہیں اُس پر نہ صرف ایمان ہی ہو بلکہ اُسے بتدریج اُن نعماء کا علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین ہو جاوے۔

عِلم کے تین مدارج ہیں علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین۔ مثلاً ایک جگہ دھوآں نکلتا دیکھ کر آگ کا یقین کر لینا علم الیقین ہے لیکن خود آنکھ سے آگ کا دیکھنا عین الیقین ہے۔ ان سے بڑھ کر درجہ حق الیقین کا ہے یعنی آگ میں ہاتھ ڈال کر جلن اور حرقت سے یقین کر لینا کہ آگ موجود ہے۔ پس کیسا وہ شخص بدقسمت ہے جس کو تینوں میں سے کوئی درجہ حاصل نہیں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۸)

وہ لوگ بڑی غلطی پر ہیں جو ایک ہی دن میں حق الیقین کے درجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں۔یاد رکھو کہ ایک ظن ہوتا ہے اور ایک یقین۔ ظن صرف خیالی بات ہوتی ہے اور اس کی صحت اور سچائی پر کوئی حُکم نہیں ہوتا بلکہ اس میں احتمال کذب کا ہوتا ہے لیکن یقین میں ایک سچائی کی روشنی ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ یقین کے بھی مدارج ہیں۔ ایک علم الیقین ہوتا ہے پھر عین الیقین اور تیسرا حق الیقین۔ جیسے دُور سے کوئی آدمی دھوآں دیکھتا ہے تو وہ آگ کا یقین کرتا ہے اور یہ علم الیقین ہے اور جب جا کر دیکھتا ہے تو وہ عین الیقین ہے اور جب ہاتھ ڈال کر دیکھتا ہے کہ وہ جلاتی ہے تو وہ حق الیقین ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۴ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

وہ علم جو کہ نبیوں سے ملتا ہے اس کی تین اقسام ہیں:-

عِلم الیقین، عین الیقین، حق الیقین

اِس کی مثال یہ ہے جیسے ایک شخص دُور سے دھوآں دیکھے تو اسے علم ہو گا کہ وہاں آگ ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جہاں آگ ہوتی ہے وہاں دھوآں بھی ہوتا ہے اور ہر ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ہے۔ یہ بھی ایک قِسم کا علم ہے جس کا نام علم الیقین ہے مگر اور نزدیک جا کر وہ اس آگ کو آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے تو اُسے عین الیقین کہتے ہیں۔ پھر اگر اپنا ہاتھ اس آگ پر رکھ کر اس کی حرارت وغیرہ کو بھی دیکھ لیوے تو اُسے کوئی شُبہ اس کے بارے میں نہ رہے گا اور اس طرح سے جو علم اسے حاصل ہو گا اس کا نام حق الیقین ہو گا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۸ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳۷)

سُورۃ العَصر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

وَالۡعَصۡرِ۝ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ۝ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ۝

اِنَّ الْقُرْاٰنَ اَشَارَ فِیْ اَعْدَادِ سُوْرَۃِ الْعَصْرِ اِلٰی وَقْتٍ مَّضٰی مِنْ اٰدَمَ اِلٰی نَبِیِّنَا بِحِسَابِ الْقَمَرِ فَعُدُّوْا اِنْ کُنْتُمْ تَشُکُّوْنَ۔ وَاِذَا تَقَرَّرَ ھٰذَا فَاعْلَمُوْا اَنِّیْ خُلِقْتُ فِی الْاَلْفِ السَّادِسِ فِیْ اٰخِرِ اَوْقَاتِہٖ کَمَا خُلِقَ اٰدَمُ فِی الْیَوْمِ السَّادِسِ فِیْ اٰخِرِ سَاعَاتِہٖ فَلَیْسَ لِمَسِیْحٍ مِّنْ دُوْنِیْ مَوْضِعُ قَدَمٍ بَعْدَ زَمَانِیْ اِنْ کُنْتُمْ تُفَکِّرُوْنَ۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۵۸)

ترجمہ از اصل:۔ قرآن سورۂ عصر کے اعداد میں قمری حساب سے اس وقت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو آدم سے ہمارے نبی تک گزرا ہے۔ پس اگر شک ہے تو گن لو۔ اور جب یہ تحقیق ہوگیا تو جان لو کہ میں چھٹے ہزار کے آخر اوقات میں پیدا کیا گیا ہوں جیسا کہ آدم چھٹے دن میں اس کی آخری ساعت میں پیدا کیا گیا۔ پس میرے سوا دوسرے مسیح کے لئے میرے زمانہ کے بعد قدم رکھنے کی جگہ نہیں اگر فکر کرو۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۵۸)

اَلَا تَقْرَءُوْنَ سُوْرَةَ الْعَصْرِ وَقَدْ بُيِّنَ فِيْ اَعْدَادِهَا عُمَرُ الدُّنْيَا مِنْ اٰدَمَ اِلٰى نَبِيِّنَا لِقَوْمٍ يَّتَفَقَّهُوْنَ وَهٰذَا هُوَ الْعُمُرُ الَّذِيْ يَعْلَمُهُ اَهْلُ الْكِتَابِ فَاسْئَلُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ وَلَا فَرْقَ بَيْنَ عِدَّةِ سُوْرَةِ الْعَصْرِ وَعِدَّتِهِمْ اِلَّا الْفَرْقُ بَيْنَ اَيَّامِ الشَّمْسِ وَاَيَّامِ الْقَمَرِ فَعُدُّوْهَا اِنْ كُنْتُمْ تَشُكُّوْنَ۔ وَاِذَا تَقَرَّرَ هٰذَا فَاعْلَمُوْا اَنِّيْ وُلِدْتُ فِيْ اٰخِرِ الْاَلْفِ السَّادِسِ بِهٰذَا الْحِسَابِ۔ وَاِنَّهٗ يَوْمُ خَلْقِ اٰدَمَ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّنَا كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا كَتَبْنَا مِنْ اَنَّهٗ مِنْ اَيَّامِ سِلْسِلَةِ اٰدَمَ مَا بَقِيَ اِلٰى يَوْمِنَا هٰذَا اِلَّا اَلْفُ سَنَةٍ اَوْ مَعَهٗ قَلِيْلٌ مِّنْ سِنِيْنَ۔ فَتَعَالَوْا نُثْبِتُهٗ لَكُمْ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ وَمِنَ الْحَدِيْثِ وَمِنْ كُتُبِ النَّبِيِّيْنَ السَّابِقِيْنَ۔ فَاِنَّ اَعْدَادَ سُوْرَةِ الْعَصْرِ بِحِسَابِ الْجُمَّلِ كَمَا كُشِفَ عَلَيَّ مِنَ اللّٰهِ الْوَهَّابِ۔ وَكَمَا هُوَ مُتَوَاتِرٌ عِنْدَ اَهْلِ الْكِتَابِ۔ يَهْدِيْ اِلٰى اَنَّ الزَّمَانَ اِلٰى عَهْدِ خَاتَمِ الْاَنْبِيَاءِ كَانَ مُنْقَضِيًا اِلٰى خَمْسَةِ اٰلَافٍ مِنْ اٰدَمَ اَوَّلِ النَّبِيِّيْنَ۔ وَمَا كَانَ بَاقِيًا مِنَ الْخَامِسِ اِلَّا قَلِيْلٌ مِنْ مِئِيْنَ۔ وَكَمِثْلِهٖ يُفْهَمُ مِنْ حَدِيْثِ مِنْبَرٍ ذِيْ سَبْعِ دَرَجَاتٍ بِمَعْنًى بَيَّنَّاهُ فِيْ مَوْضِعِهٖ لِلنَّاظِرِيْنَ۔ وَلَمَّا ثَبَتَ اَنَّ هٰذَا الْقَدْرَ مِنْ

ترجمہ از مرتب:۔ کیا تم سورۂ عصر نہیں پڑھتے۔ اس کے اعداد میں دین کی سمجھ رکھنے والوں کے لئے آدم سے لیکر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تک دُنیا کی عمر بیان کی گئی ہے اور یہ وہ عمر ہے جس کو اہلِ کتاب بھی جانتے ہیں۔ اگر تم نہیں جانتے تو تم ان سے پُوچھ لو۔ اور سورۂ عصر کی بیان کردہ گنتی اور اہلِ کتاب کی گنتی میں کوئی فرق نہیں سوائے اس کے جو سُورج کے دنوں کے حساب اور چاند کے دنوں کے حساب میں ہوتا ہے۔ اگر تمہیں کچھ شک ہو تو تم گنتی کر کے دیکھ لو۔ اور جب یہ بات متحقق ہو گئی تو تمہیں علم ہونا چاہیئے کہ اِس حساب سے مَیں چھٹے ہزار کے آخر میں پیدا کیا گیا ہوں اور یہ حضرت آدم کی پَیدائش کا دن ہے۔ اور ہمارے ربّ کا ایک دن انسانی گنتی کے لحاظ سے ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس کے بارے میں اگر تمہیں کوئی شک ہو کہ آدم علیہ السّلام کے سلسلہ کے وقت سے لیکر ہمارے آج کے دن تک صرف ایک ہزار سال یا اس کے ساتھ چند اَور سال عمرِ دُنیا میں سے باقی رہ گئے ہیں۔ تو آؤ ہم تمہیں یہ بات خُدا کی کتاب (قرآن مجید) اور حدیث اور پہلے انبیاء کے صحیفوں سے ثابت کر دیتے ہیں جیسا کہ وہّاب خدا نے مجھ پر انکشاف فرمایا ہے کہ سورۂ عصر کے اعداد بحساب جمل نیز اہلِ کتاب کے ہاں جو روایت تواتر کے ساتھ چلتی آ رہی ہے وہ اِس طرف راہنمائی کرتی ہے کہ اوّل النّبیین حضرت آدم علیہ السّلام سے لیکر خاتم الانبیاء کے زمانہ تک سوائے چند سَو سال کے پانچ ہزار سال گذر چکے تھے۔ اور اسی قسم کا مفہوم سات درجوں والے منبر والی حدیث کا ہے جس کے معنے ہم نے اس کے مقام پر ہماری تحریرات پر نظر رکھنے والوں کے لئے بیان کئے ہیں۔ اور جب

عُمُرِ الدُّنیا کَانَ مُنْقَضِیًا اِلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ خَیْرِ الْوَرٰی۔ ثَبَتَ مَعَہٗ اَنَّ الْقَدْرَ الْبَاقِیَ مَا کَانَ اِلَّا اَقَلَّ مِقْدَارًا نِسْبَۃً اِلٰی مَا مَضٰی۔ فَاِنَّ الْقُرْاٰنَ الْکَرِیْمَ صَرَّحَ مِرَارًا بِاَنَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبَۃٌ لَا رَیْبَ فِیْھَا وَقَالَ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُھُمْ وَقَالَ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَقَالَ وَقَدْ جَاءَ اَشْرَاطُھَا۔ وَکَذَالِکَ تُوْجَدُ فِیْہِ فِیْ ھٰذَا الْبَابِ اٰیَاتٌ اُخْرٰی۔ فَعُلِمَ مِنْھَا بِالْقَطْعِ وَالْیَقِیْنِ یَا اُولِی النُّھٰی۔ اَنَّ الْحِصَّۃَ الْبَاقِیَۃَ مِنَ الدُّنْیَا اَقَلُّ مِنْ زَمَانٍ انْقَضٰی۔ حَتّٰی اِنَّ اَشْرَاطَ السَّاعَۃِ ظَھَرَتْ وَیَوْمُ الْوَعْدِ دَنٰی۔ وَقَرُبَ الْاٰتِیْ وَبَعُدَ مَا مَضٰی۔ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ھَلْ تَرٰی مِنْ کِذْبٍ فِیْہِ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی۔ وَقَدْ عَلِمْتَ اَنَّ الْمُدَّۃَ الْمُنْقَضِیَۃَ مِنْ وَقْتِ اٰدَمَ اِلٰی عَھْدِ نَبِیِّنَا الْمُصْطَفٰی۔ کَانَتْ قَرِیْبَۃً مِنْ خَمْسَۃِ اٰلَافٍ۔ وَقَدْ شَھِدَ عَلَیْہِ الْقُرْاٰنُ وَاتَّفَقَ عَلَیْہِ اَھْلُ الْکِتَابِ مِنْ غَیْرِ خِلَافٍ۔ فَمَا الْمِقْدَارُ الَّذِیْ ھُوَ اَقَلُّ مِنْ ھٰذَا الْمِقْدَارِ اَلَیْسَ ھُوَ اٰخِرُ وَقْتِ الْعَصْرِ اَجِبْنَا بِالْاِنْصَافِ۔ وَلَوْ تَعَسَّفْتَ کُلَّ التَّعَسُّفِ ثُمَّ مَعَ ذَالِکَ لَا بُدَّ لَکَ اَنْ تُقِرَّ بِاَنَّہٗ اَقَلُّ مِنَ النِّصْفِ بِغَیْرِ الْاِخْتِلَافِ۔ فَقَدِ اعْتَرَفْتَ بِدَعْوَانَا

یہ ثابت ہوگیا کہ خیرالوریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک دُنیا کی عمر سے اتنا ہی عرصہ گزرا تھا تو اس کے ساتھ یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ عمرِ دُنیا میں سے باقی ماندہ عرصہ گذشتہ عرصہ کی نسبت بہت کم رہ گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے کئی مرتبہ اِس بات کو وضاحت سے بیان کیا ہے کہ قیامت کی گھڑی اَب قریب ہے اور اِس امر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ پھر ایک مقام پر فرمایا کہ لوگوں کے حساب کا وقت قریب آن پہنچا ہے۔ پھر کہا کہ قیامت کی گھڑی بالکل قریب ہے اور اس کے ساتھ ہی کہا کہ اس کی علامات بھی ظاہر ہونا شروع ہوگئی ہیں۔ اِس مضمون سے متعلق قرآن مجید میں کئی اَور آیات بھی پائی جاتی ہیں۔ اے عقل مندو! اِن آیات سے یہ بات قطعی اور یقینی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ دُنیا کی عمر کا باقی حصہ اس وقت سے بہت کم ہے جو گزر چکا یہاں تک کہ علاماتِ قیامت ظاہر ہوگئیں اور وعدے کا دِن قریب آگیا اور آنے والا وقت قریب آگیا اور گزرا ہوُا وقت دُور چلا گیا پس تُو اپنی نظر اس پر بار بار ڈال کیا تُو اِس امر میں کوئی خلافِ واقعہ بات دیکھتا ہے۔ اور اس شخص پر اللہ کی سلامتی نازل ہو جو ہدایت کی پیروی کرے اور تم یہ معلوم کرچکے ہو کہ آدم علیہ السلام کے زمانہ سے ہمارے نبی مصطفےٰ تک پانچ ہزار سال کے قریب مدت گزر چکی ہے اور اس کی صداقت پر قرآن مجید نے گواہی دی ہے اور اہلِ کتاب بھی بغیر اختلاف کے اِس بات پر متفق ہیں۔ پس وہ مقدار کونسی ہے جو اس مقدار سے کم ہو۔ تم انصاف سے ہمیں بتاؤ کیا یہ عصر کا آخری وقت نہیں ہے۔ اگر تم اِس امر کو قبول کرنے میں گریز سے کام لو تو اس کے باوجود تمہیں اس اقرار سے کوئی چارہ نہیں کہ باقی رہنے والی مدت بغیر اختلاف کے نصف سے بھی کم ہے۔ پس صحیح طریق سے ہٹ جانے کے باوجود تم نے اپنی اِس بات کیساتھ

بِقَوْلِكَ هٰذَا مَعَ هٰذَا الْاِعْتِسَافِ۔ فَلَزِمَ لَكَ اَنْ تُقِرَّ اَنَّ مِنْ مُدَّةِ عَهْدِ اٰدَمَ مَا كَانَتْ بَاقِيَةً اِلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِلَّا اَلْفَيْنِ وَعِدَّةٌ مِنْ مِئِيْنَ۔ وَهٰذَا هُوَ دَعْوَانَا فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ فَاِنَّا نَقُوْلُ اِنَّا بُعِثْنَا عَلٰى رَأْسِ اَلْفٍ اٰخِرٍ مِنْ اُلُوْفِ سِلْسِلَةِ اَبِى الْبَشَرِ وَخَاتَمَةِ الْاَلْفِ السَّادِسِ بِاِذْنِ اللّٰهِ اَرْحَمِ الرَّاحِمِيْنَ۔ وَهٰذَا هُوَ زَمَانُ الْمَسِيْحِ الَّذِىْ هُوَ اٰدَمُ اٰخِرِ الزَّمَانِ۔ وَهٰذِهٖ هِىَ حُجَّتِىَ الَّتِىْ اَقْرَرْتَ بِهَا يَا اَبَا الْعُدْوَانِ۔ فَانْظُرْ اِنَّكَ صُفِدْتَ حَقَّ التَّصْفِيْدِ وَكَذَالِكَ يُصَفَّدُ كُلُّ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ اَهْلِ الْعِرْفَانِ۔ وَاللّٰهِ مَا نَبَّأَنَا بِالسَّاعَةِ وَنَبَّأَنَا بِالْاَلْفِ الَّذِىْ تَقَعُ السَّاعَةُ فِيْهَا وَعَرَّفَ بَعْضَ الْحَالَاتِ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَا نَعْلَمُ وَقْتَ السَّاعَةِ وَلَا مَلَكٌ فِى السَّمَاءِ۔ وَمَا نَعْلَمُ حَقِيْقَةَ السَّاعَةِ وَنَعْلَمُ اَنَّهَا انْقِلَابٌ عَظِيْمٌ وَيَوْمُ الْجَزَاءِ۔ وَنُفَوِّضُ تَفَاصِيْلَهَا اِلٰى عَلِيْمٍ يَعْلَمُ حَقِيْقَةَ الْاِبْتِدَاءِ وَالْاِنْتِهَاءِ ثُمَّ نُعِيْدُ الْكَلَامَ وَنَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ شَبَّهَ زَمَانَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِوَقْتِ الْعَصْرِ۔ وَاِنْ شِئْتَ فَاقْرَأْ فِى الْقُرْاٰنِ سُوْرَةَ الْعَصْرِ۔ وَكَذَالِكَ جَاءَ ذِكْرُ الْعَصْرِ فِى الْاَحَادِيْثِ الصَّحِيْحَةِ وَالْاَخْبَارِ الْمُوَثَّقَةِ

ہمارے دعویٰ کو تسلیم کر لیا۔ اِس بات سے تم پر یہ لازم آتا ہے کہ تم اِس بات کا بھی اقرار کرو کہ آدم علیہ السّلام کے زمانہ میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک دُنیا کی عمر صرف دو ہزار اور چند سو سال باقی رہ گئی تھی اور یہی ہمارا دعویٰ ہے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

ہم کہتے ہیں کہ ابو البشر آدم علیہ السّلام کے سلسلہ کے ہزاروں برسوں کے آخری ہزار سال کے سرے پر ہم مبعوث کئے گئے ہیں یعنی اللہ أرحم الراحمین کے حکم سے چھٹے ہزار سال کے خاتمہ پر۔ اور یہ اس مسیح کا زمانہ ہے جو آخری زمانہ کا آدم ہے۔ اے زیادتی سے کام لینے والے یہی وہ میری دلیل ہے جس کے صحیح ہونے کا تم نے اقرار کر لیا ہے۔ پس دیکھو تم کس طرح مکمل طور پر جکڑ دیئے گئے ہو۔ اور ہر وہ شخص جو اہلِ عرفان سے اِعراض کرے اسے اسی طرح جکڑ دیا جاتا ہے۔ اللہ کی قسم! اس نے ہمیں قیامت کے وقت کے متعلق کچھ نہیں بتلایا ہاں ہمیں اس ہزار سال کی خبر دی ہے جس میں قیامت برپا ہوگی۔ اور اس نے ہمیں بعض حالات کا علم دیا ہے اور بعض کا نہیں دیا پس نہ تو ہم قیامت کے وقت کا علم رکھتے ہیں اور نہ کوئی آسمان میں فرشتہ اس کا علم رکھتا ہے اور ہم قیامت کی حقیقت کا علم نہیں رکھتے ہاں ہمیں اتنا علم ہے کہ وہ ایک انقلابِ عظیم اور روزِ جزاء ہوگا اور اس کی تفاصیل ہم خدائے علیم کے سپرد کرتے ہیں جو ابتداء اور انتہاء کی حقیقت کو جانتا ہے۔ پھر ہم بات کو دہراتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کو عصر کے وقت کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اگر آپ چاہیں تو قرآن مجید میں سُورۃ عصر پڑھ لیں اور اسی طرح احادیثِ صحیحہ اور پختہ متواتر خبروں میں عصر

الْمُتَوَاتِرَةِ حَتّٰى اَنَّهٗ تُوْجَدُ فِي الْبُخَارِيِّ وَالْمُؤَطَّا وَغَيْرِهِمَا مِنَ الْكُتُبِ الْمُعْتَبَرَةِ۔ وَالسِّرُّ فِي هٰذَا التَّشْبِيْهِ اَنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُوْسٰى بَعْدَ اِهْلَاكِ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى۔ وَجَعَلَهٗ اٰدَمَ لِلْاُمَّةِ الْجَدِيْدَةِ وَاَوْحٰى اِلَيْهِ مَا اَوْحٰى۔ وَانْقَطَعَ سِلْسِلَةُ دِيْنِهٖ اِلٰى ثَلٰثِ مِائَةٍ بَعْدَ الْاَلْفِ دَتَيْفٍ وَكَذَالِكَ اَرَادَ اللّٰهُ وَقَضٰى۔ ثُمَّ بَعَثَ عِيْسٰى لِيُذَكِّرَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ مَا نَسُوْهُ مِنَ التَّوْرَاةِ وَيُرَغِّبَهُمْ فِيْٓ اَخْلَاقٍ عُظْمٰى۔ وَانْقَطَعَتْ سِلْسِلَةُ دِيْنِهٖ اِلٰى مُدَّةٍ هِيَ قَرِيْبٌ مِنْ نِصْفِ مُدَّةِ سِلْسِلَةِ مُوْسٰى۔ ثُمَّ بَعَثَ نَبِيَّهٗ مُحَمَّدًا خَيْرَ الْوَرٰى وَرَسُوْلَهُ الْمُصْطَفٰى۔ عَلَيْهِ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهٗ وَبَرَكَاتُهُ الْكُبْرٰى۔ وَجَعَلَ سِلْسِلَةَ الْاَخْيَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ اِلٰى مُدَّةٍ هِيَ نِصْفُ النِّصْفِ الَّذِيْٓ اُعْطِيَ لِعِيْسٰى اَعْنِي الْقُرُوْنَ الثَّلٰثَةَ الَّتِيْ انْقَرَضَتْ اِلٰى ثَلٰثِ مِائَةٍ مِنْ سَيِّدِنَا الْمُجْتَبٰى۔ فَكَانَ عَهْدُ اُمَّةِ مُوْسٰى يُضَاهِيْ نَهَارًا كَامِلًا تَمَامًا وَيُضَاهِيْ عَدَدُ مِائَةٍ عَدَدَ سَاعَاتِهٖ وَعَهْدُ اُمَّةِ عِيْسٰى يُضَاهِيْ نِصْفَ النَّهَارِ فِيْ حَدِّ ذَاتِهٖ۔ وَاَمَّا عَهْدُ اَخْيَارِ اُمَّةِ خَيْرِ الرُّسُلِ الَّذِيْنَ كَانُوْٓا اِلَى الْقُرُوْنِ الثَّلٰثَةِ فَهُوَ يُضَاهِيْ نِصْفَ نِصْفِ النَّهَارِ اَعْنِيْ وَقْتَ الْعَصْرِ الَّذِيْ هُوَ ثُلُثُ سَاعَةٍ مِنَ الْاَيَّامِ

کا ذکر آیا ہے یہاں تک کہ یہ ذکر بخاری، مؤطا اور دیگر معتبر کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اور اس تشبیہ میں یہ راز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو قرونِ اولیٰ کے ہلاک کرنے کے بعد مبعوث فرمایا اور انہیں نئی اُمّت کا آدم بنایا اور ان کی طرف عظیم الشان وحی کی اور ان کے دین کا سلسلہ تقریباً تیرہ سَو سال بعد ختم ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے یوں ہی ارادہ اور فیصلہ کیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السّلام کو مبعوث فرمایا تا وہ بنی اسرائیل کو تورات کی اس تعلیم کو یاد دلائیں جسے وہ بھول چکے تھے۔ اور انہیں اَخلاقِ عظیمہ پر قائم ہونے کی رغبت دلائیں۔ آپ کے دین کا سِلسلہ ایک ایسے زمانہ تک پہنچ کر ختم ہو گیا جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے سِلسلہ کے زمانہ کا نصف تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا جو افضل المخلوقات ہیں (آپ پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں، اس کی سلامتی اور بڑی برکتیں نازل ہوں) اور آپ کے بہترین متّبعین کے سلسلہ کو اس مدّت تک لے گیا جو اس نصف مدّت کا نصف ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو دی گئی یعنی تین صدیوں تک جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد گزریں۔ پس موسیٰ علیہ السّلام کی اُمّت کا زمانہ کامل اور تمام دِن کے مشابہ ہے۔ اس کے سینکڑوں کی تعداد دن کی ساعات کی تعداد کے برابر ہے۔ اور عیسیٰ علیہ السّلام کی اُمّت کا زمانہ حقیقتاً اس دن کا نصف ہے۔ لیکن خیرالرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے اخیارِ اُمّت کا زمانہ جو تین صدیوں تک تھے نصف دِن کے نصف کے مشابہ ہے یعنی عصر کے وقت تک جو اُوسط دنوں کے وقت کا ایک تہائی بنتا ہے۔ پھر

الْمُتَوَسِّطَةِ ثُمَّ بَعْدَ ذَالِكَ لَيْلَةٌ لَيْلَاءُ بِقَدَرٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحِكْمَةٍ۔ وَهِيَ مَمْلُوَّةٌ مِنَ الظُّلْمِ وَالْجَوْرِ اِلٰى اَلْفِ سَنَةٍ۔ ثُمَّ بَعْدَ ذَالِكَ تَطْلُعُ شَمْسُ الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ مِنْ فَضْلِ الرَّحْمٰنِ۔ فَهٰذَا مَعْنَى الْعَصْرِ الَّذِيْ جَاءَ فِي الْقُرْاٰنِ۔ هٰذَا مَا ظَهَرَ عَلَيْنَا مِنْ حَقِيْقَةِ وَقْتِ الْعَصْرِ وَلٰكِنْ مَعَ ذَالِكَ قُرْبُ الْقِيَامَةِ حَقٌّ صَحِيْحٌ ثَابِتٌ مِنَ الْفُرْقَانِ۔ وَلِلْقُرْاٰنِ وُجُوْهٌ عِنْدَ اَهْلِ الْعِرْفَانِ۔ فَهٰذَا وَجْهٌ وَذَالِكَ وَجْهٌ وَكِلَاهُمَا صَادِقَانِ عِنْدَ الْاِمْعَانِ۔ وَلَا يُنْكِرُهُ اِلَّا جَاهِلٌ ضَرِيْرٌ اَوْ مُتَعَصِّبٌ اَسِيْرٌ فِيْ حُجُبِ الْعُدْوَانِ۔ لِاَنَّ الْمَعْنَى الَّذِيْ قَدَّمْنَاهُ فِي الْبَيَانِ۔ يَحْصُلُ بِهِ التَّفَصِّيْ مِنْ بَعْضِ الْاَشْكَالِ الَّتِيْ تَخْتَلِجُ فِيْ جَنَانِ بَعْضِ عَطَاشَى الْعِرْفَانِ۔ مِنْ تَتَابِعِ وَسَاوِسِ الشَّيْطَانِ۔ ثُمَّ اِنَّ هٰذَا الْمَعْنٰى يُنْجِيْ حَدِيْثَ الْبُخَارِيِّ وَالْمُوَطَّاَ مِنْ طَعْنِ الطَّعَّانِ۔ وَمِنِ اعْتِرَاضِ مُعْتَرِضٍ يَتَقَلَّدُ اَسْلِحَةً لِلطَّعْنَانِ۔ وَتَقْرِيْرُ الْاِعْتِرَاضِ اَنَّهُ كَيْفَ يُمْكِنُ اَنْ تُشَبَّهَ زَمَانُ الْاِسْلَامِ بِوَقْتِ الْعَصْرِ وَقَدْ سَاوٰى زَمَانُ هٰذَا الدِّيْنِ زَمَانَ مُوْسٰى وَزَادَ عَلٰى زَمَانِ دِيْنِ عِيْسٰى بَلْ جَاوَزَ ضِعْفَهُ اِلٰى هٰذَا الْعَصْرِ نِسْبَةً اِلَى الزَّمَانِ الْمَذْكُوْرِ۔ بَلْ لَيْسَ هٰذَا الْبَيَانُ اِلَّا كِذْبًا فَاحِشًا

اس کے بعد اللہ کی تقدیر اور اس کی حکمت کے مطابق تاریک رات آگئی جو ظلم اور جَور سے بھری ہوئی تھی اور وہ ایک ہزار سال تک چلتی چلی گئی۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسیح موعود کا سُورج چڑھنا مقدر تھا۔ پس یہ معنی اس عصر کے ہیں جو قرآن مجید میں مذکور ہے اور یہی وقتِ عصر کی حقیقت ہے جو ہم پر ظاہر ہوئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قُربِ قیامت بالکل صحیح بات ہے جو قرآن کریم سے ثابت ہے اور اہلِ عرفان (عارفوں) کے نزدیک قرآن مجید کی مختلف توجیہات ہو سکتی ہیں پس یہ بھی ایک توجیہ ہے جو ہم نے لکھی ہے اور وہ بھی ایک توجیہ ہے جو پہلوں نے لکھی ہے اور غور کرنے پر دونوں توجیہات درست معلوم ہوتی ہیں اور اس کا انکار جاہل، اندھے اور سرکشی کے پردوں میں اسیر متعصب کے سوا کوئی نہیں کر سکتا لیکن بات یہ ہے کہ جو معنے اپنے بیان میں ہم نے پہلے ذکر کئے ہیں ان سے ان بعض اشکال سے نجات ملتی ہے جو عرفان کے پیاسے دلوں میں شیطان کے بار بار کے وساوس سے پیدا ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ معنے بخاری اور مؤطا کی حدیث کو معترضین کے اعتراض سے بچاتے ہیں اور اس معترض کے اعتراض سے بھی بچاتے ہیں جو تنقید کی خاطر ہر وقت اسلحہ لٹکائے پھرتا ہے۔ معترض کا اعتراض یہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام کے زمانہ کو عصر کے وقت سے تشبیہ دی جائے جبکہ دینِ اسلام کا زمانہ موسیٰ علیہ السّلام کے زمانہ کے برابر ہے اور عیسیٰ علیہ السّلام کے دین کے زمانہ سے زیادہ ہے بلکہ اس عصر کے وقت تک اس کے دگنے زمانہ سے بھی بڑھ گیا ہے۔ پس اس زمانہ کی نسبت سے عصر کے بیان شدہ معنے کیسے درست ہوں گے بلکہ یہ

وَمِنْ اَشْنَعِ اَنْوَاعِ الزُّوْرِ۔ بَلْ ذَیْلُ الْاِعْتِرَاضِ طُوِّلَ مِنْ هٰذَا الْمَحْذُوْرِ۔ فَاِنَّ نَبَأَ نُزُوْلِ عِیْسٰی وَ
خُرُوْجِ الدَّجَّالِ وَیَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ الَّذِیْ یَنْتَظِرُهٗ کَثِیْرٌ مِّنَ الْعَامَّةِ۔ قَدْ ثَبَتَ کِذْبُهٗ بِهٰذَا الْاِیْرَادِ
بِالْبَدَاهَةِ وَبِالضَّرُوْرَةِ۔ فَاِنَّ وَقْتَ الْعَصْرِ قَدْ مَضٰی بَلِ انْقَضٰی ضِعْفَاهُ مِنْ غَیْرِ الشَّكِّ وَالشُّبْهَةِ
نَظَرًا اِلٰی زَمَانِ الْمِلَّةِ الْمُوْسَوِیَّةِ۔ فَمَا بَقِیَ لِظُهُوْرِ هٰذِهِ الْاَنْبَاءِ وَقْتٌ وَاضْطَرَّ الْمُنْتَظِرُوْنَ اِلٰی اَنْ
یَقُوْلُوْا اَنَّهَا بَاطِلَةٌ فِی الْحَقِیْقَةِ۔ وَمَا بَقِیَ سَبِیْلٌ لِّتَصْدِیْقِهَا اِلَّا اَنْ یُّقَالَ اِنَّ هٰذِهِ الْاَخْبَارَ قَدْ وَقَعَتْ
وَقَدْ نَزَلَ عِیْسَی النَّازِلُ وَخَرَجَ الدَّجَّالُ الْخَارِجُ۔ وَظَهَرَ یَاجُوْجُ وَمَاجُوْجُ وَتَحَقَّقَ النَّسْلُ وَالْعُرُوْجُ۔
وَتَمَّتِ الْاَخْبَارُ الَّتِیْ قُدِّرَتْ۔ وَالرُّسُلُ اُقِّتَتْ فَلَمَّا قُلْنَا اَنَّ زَمَانَ اُمَّةِ مُوْسٰی کَانَ بَیْنَ هٰذِهِ الْاُمَمِ
الثَّلٰثِ اَطْوَلُ الْاَزْمِنَةِ۔ وَکَانَ زَمَانُ اُمَّةِ عِیْسٰی نِصْفَهٗ وَکَانَ نِصْفُ هٰذَا النِّصْفِ زَمَانَ اَخْیَارِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ
نَظَرًا اِلٰی تَجْدِیْدِ الْقُرُوْنِ الثَّلٰثَةِ۔ بَطَلَ هٰذَا الْاِعْتِرَاضُ وَانْکَشَفَ الْاَمْرُ عَلَی الَّذِیْ یَطْلُبُ الْحَقَّ
بِسَلَامَةِ الطَّوِیَّةِ وَصِحَّةِ النِّیَّةِ۔ وَثَبَتَ بِالْقَطْعِ وَالْیَقِیْنِ اَنَّ زَمَانَ الْاُمَّةِ الْمَرْحُوْمَةِ الْمُحَمَّدِیَّةِ قَلِیْلٌ

بیان کُھلا کُھلا خلافِ واقعہ اور جھوٹ کی قسموں میں سے بدترین ہے اور اعتراض کی لمبائی تو ممنوع حد سے بھی آگے بڑھ گئی ہے کیونکہ نزولِ عیسٰیؑ، خروجِ دجّال اور یاجوج وماجوج کے نکلنے کی خبر جس کا اکثر عوام الناس انتظار کر رہے ہیں۔ بالبداہت اس کا جھوٹ اس ذکر سے ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ عصر کا وقت گزر چکا بلکہ ملّتِ موسویہ کے زمانہ کو دیکھتے ہوئے بغیر کسی شک وشُبہ کے اس سے چار گُنا وقت گزر چکا ہے۔ پس نزولِ عیسٰی اور دیگر اخبار کے ظہور کے لئے اَب کوئی وقت باقی نہیں رہ گیا اور ان خبروں کے منتظر یہ کہنے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ یہ سب خبریں بالکل جھوٹ ہیں اور ان کی تصدیق کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا سوائے اسکے کہ یہ کہا جائے کہ یہ پیشگوئیاں پوری ہو چکی ہیں اور نازل ہونے والا عیسٰی نازل ہو چکا نیز دجّال کا خروج بھی ہو چکا اور یاجوج وماجوج بھی ظاہر ہوگئے اور ان کے دُنیا میں پھیل جانے اور اسلام کے آسمان پر چڑھ جانے کی خبر بھی پوری ہوگئی اور وہ تمام خبریں پوری ہوگئیں جو مقدر تھیں اور رسول جمع کر دئے گئے۔ اور جب ہم قرونِ ثلاثہ کی حدبندی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اُمّتِ موسٰی کا زمانہ ان تینوں اُمّتوں کے درمیان سب سے لمبا زمانہ تھا اور عیسٰی علیہ السلام کی اُمّت کا زمانہ اس سے نصف تھا اور اس اُمّت کے بہترین لوگوں کا زمانہ مذکورہ نصف کا نصف تھا تو مذکورہ اعتراض باطل ہو جاتا ہے اور اس شخص پر حقیقت کُھل جاتی ہے جو صاف دِلی اور صحتِ نیّت سے حق کو معلوم کرنا چاہتا ہے اور قطعی طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اُمّتِ محمدیہ کا زمانہ اُمّتِ موسٰیؑ اور اُمّتِ عیسٰیؑ کے زمانہ سے کم

فِي الْحَقِيْقَةِ مِنْ زَمَانِ الْأُمَّةِ الْمُوْسَوِيَّةِ وَالْعِيْسَوِيَّةِ - وَهٰذِهٖ مِنَّةٌ مِنَّا عَلَى الْمُخَالِفِيْنَ مِنَ الْفِرَقِ الْإِسْلَامِيَّةِ - وَلَمْ يَبْقَ لِعَاقِلٍ اِرْتِيَابٌ فِيْ هٰذَا الْبَيَانِ - بَلْ هُوَ مُوْجِبٌ لِثَلْجِ الصَّدْرِ وَالْاِطْمِئْنَانِ - وَ بَطَلَ مَعَهٗ اِعْتِرَاضٌ يَرِدُ عَلٰى حَدِيْثِ عُمْرِ الْاَنْبِيَاءِ - فَإِنَّ عُمْرَ عِيْسٰى مِنْ جِهَةِ بَقَاءِ دِيْنِهٖ نِصْفُ عُمْرِ مُوْسٰى كَمَا ظَهَرَ مِنْ غَيْرِ الْخَفَاءِ - وَعُمْرُ سَيِّدِنَا خَيْرِ الرُّسُلِ بِالنَّظْرِ اِلَى الْقُرُوْنِ الثَّلٰثَةِ نِصْفُ عُمْرِ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ بِالْبَدَاهَةِ - ثُمَّ بَعْدَ ذَالِكَ اَيَّامُ مَوْتِ الْإِسْلَامِ اِلٰى اَلْفِ سَنَةٍ - ثُمَّ بَعْدَ مَوْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهٰذَا الْمَعْنٰى زَمَانُ الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ - اَلَّذِيْ يُشَابِهُ اَبَا بَكْرٍ فِيْ قَتْلِ الشَّيْطَانِ الْمَرْدُوْدِ - فَإِنَّ الْمَسِيْحَ الْمَوْعُوْدَ قَدِ اسْتُخْلِفَ بَعْدَ مَوْتِ النَّبِيِّ الْكَرِيْمِ مِنْ حَيْثُ دِيْنِهٖ - مِنْ غَيْرِ فَاصِلَةٍ بَلْ قَبْلَ تَدْفِيْنِهٖ - وَاَشْرَكَهٗ رَبُّهٗ فِيْ نَبَاِ خِلَافَةِ اَبِيْ بَكْرٍ اَعْنِي النَّبَاَ الَّذِيْ ذُكِرَ فِيْ صُحُفٍ مُّطَهَّرَةٍ - وَوُفِّقَ كَمَا وُفِّقَ اَبُوْبَكْرٍ وَاُعْطِيَ لَهُ الْعَزْمُ كَمِثْلِهٖ لِمَنْعِ سَيْلِ ضَلَالَةٍ مُّهْلِكَةٍ - وَاِلَيْهِ اَشَارَ سُبْحَانَهٗ تَعَالٰى فِيْ قَوْلِهٖ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ يَعْنِيْ مِنْ اَلْفِ سَنَةٍ - وَكَثُرَتِ الْاِسْتِعَارَاتُ كَمِثْلِهٖ فِيْ كُتُبِ

ہے اور فرقہائے اِسلام میں سے مخالفین پر یہ ہمارا اِحسان ہے اور کسی عقل مند کے لئے اِس بیان کے بعد شک کی گنجائش نہیں رہتی بلکہ یہ دِل کے اطمینان اور تسلّی کا موجب ہے اور اِس کے ساتھ وہ اعتراض باطل ہو جاتا ہے جو انبیاء کی عمر والی حدیث پر وارد ہوتا ہے کیونکہ بغیر کسی تاویل کے حضرت عیسیٰؑ کی عمر آپ کے دین کے بقاء کے لحاظ سے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی عمر کا نصف بنتی ہے اور سیّدنا خیرالرسل کی عمر آپ کی پہلی تین صدیوں کو دیکھتے ہوئے بالکل واضح طور پر عیسیٰ ابن مریم کی عمر کا نصف بنتی ہے۔ اِس کے بعد ایک ہزار سال تک اسلام پر موت کا زمانہ ہے پھر ان معنی کے رُو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے بعد مسیح موعود کا زمانہ ہے جو شیطان مردود کے قتل کرنے کے سِلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ کے مشابہ ہے کیونکہ مسیح موعود کو دین کے لحاظ سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے بعد بلافصل بلکہ تدفین سے بھی پہلے خلیفہ بنایا گیا ہے اور اللہ تعالےٰ نے اسے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی اِس خبر میں شریک کر دیا ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے اور اِس کو بھی حضرت ابوبکرؓ کی طرح توفیق دی گئی اور مُہلک گمراہی کے سیلاب کو روکنے کے لئے ان جیسا عزم دیا گیا۔ اسی کی طرف اللہ تعالےٰ نے اپنے قول لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ میں اشارہ فرمایا ہے۔ اَلْفِ شَهْرٍ سے مراد یہاں اَلْفِ سَنَةٍ ہے اور ایسے استعارات کتبِ سابقہ میں کثرت سے آئے ہیں۔ (اِسلام پر) اس ہزار سالہ موت کے بعد بعث بعدالموت

سَابِقَةٍ ۔ ثُمَّ بَعْدَ ذَالِكَ الْاَلْفِ زَمَانُ الْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَزَمَانُ الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ ۔ فَقَدْ تَمَّ الْيَوْمَ اَلْفُ الضَّلَالَةِ وَالْمَوْتِ وَجَاءَ وَقْتُ بَعْدَ الْاِسْلَامِ الْمَوْعُوْدِ ۔ وَتَمَّتْ حُجَّةُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اَيُّهَا الْمُنْكِرُوْنَ ۔ فَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الظَّانِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۔ وَعُدُّوْا اَيَّامَ اللّٰهِ اَيُّهَا الْعَادُّوْنَ ۔ وَاِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمُ الشَّيْطَانُ الْمَلْعُوْنُ ۔ وَاِنَّ هٰذِهِ الْاَيَّامَ اَيَّامُ مَلْحَمَةٍ عُظْمٰى اَيُّهَا الْمُجَاهِدُوْنَ الْخَاطِئُوْنَ ۔ وَاَيَّامُ نُزُوْلِ الْمَسِيْحِ وَخُرُوْجِ الشَّيْطَانِ بِغَضَبٍ مَا رَاٰهُ السَّابِقُوْنَ ۔ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ رَاَى الزَّمَانَ قَدِ انْقَضٰى ۔ وَاِنَّ وَقْتَ الْمُهْلَةِ مَضٰى ۔ وَيَوْمُ الْبَعْثِ اَتٰى ۔ وَمَا كَانَتِ الْمُهْلَةُ اِلَّا اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۔ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ۔ وَاِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْهِ بَعْدَ مَا اَتَتْهُمْ شَهَادَةٌ مِّنَ الْفُرْقَانِ ۔ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ وَمَا بَقِيَ لَهُمْ حَقٌّ لِيَكْفُرُوْا بِسُلْطَانٍ نَزَلَ مِنَ الرَّحْمٰنِ ۔ وَتَمَّتْ عَلَيْهِمْ حُجَّةُ اللّٰهِ الدَّيَّانِ ۔ لَا يُرِيْدُوْنَ الْحَقَّ وَلَا الْهُدٰى ۔ وَيُنْفِدُوْنَ الْاَعْمَارَ فَرِحِيْنَ مُسْتَبْشِرِيْنَ بِهٰذِهِ الدُّنْيَا ۔ اَلَمْ يَاْتِهِمْ مَا اَتَى الْاُمَمَ الْاُوْلٰى ۔ اَلَمْ يَرَوْا اٰيَاتٍ كُبْرٰى ۔ اَمَا جَاءَ رَاْسُ الْمِائَةِ وَفَسَادُ الْاُمَّةِ وَالْفِتَنُ الْعُظْمٰى ۔ مِنَ

اور مسیح موعود کا زمانہ ہے، پس آج ضلالت اور موت کا ہزار سال پُورا ہوگیا اور زندہ درگور اسلام کے بعد کا وقت آگیا۔ اور اے منکرو! تم پر اللہ کی حُجت پوری ہوگئی پس تم اللہ پر بدگمانی کرنے والے نہ بنو۔ اور اے گننے والو! اللہ تعالےٰ کے دنوں کو گنو۔ اور اللہ کا وعدہ یقیناً سچّا ہے۔ پس تمہیں یہ دنیوی زندگی اور شیطانِ لعین دھوکہ نہ دے۔ اے خطاکار مجاہدو! یہ زمانہ بڑی جنگ کا زمانہ ہے اور نزولِ مسیح اور شیطان کے سخت غضب کے ساتھ نکلنے کا زمانہ ہے جسے پہلوں نے نہیں دیکھا شیطان نے دیکھ لیا ہے کہ اس کا زمانہ ختم ہوگیا اور اس کو دی گئی مُہلت کی میعاد پوری ہوگئی اور یومِ بعث آگیا اور اس کو دی گئی مُہلت صرف اس دن تک تھی جبکہ مُردوں نے اُٹھائے جانا تھا۔ یہ خدائے رحمٰن کا وعدہ تھا۔ اور مُرسلوں نے جو کہا تھا وہ سچ ثابت ہوگیا۔ اور وہ لوگ جو قرآن مجید کی شہادت آجانے کے بعد بھی اس کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں ان کے سینوں میں کبر ہے اور انہیں اس دلیل سے انکار کرنے کا کوئی حق نہیں جو خدائے رحمٰن کی طرف سے آئی ہے۔ ان پر فیصلہ کرنے والے خدا کی حُجت پوری ہوگئی۔ وہ حق اور ہدایت کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔ اور وہ اپنی عمریں اس دُنیا کی نعمتوں پر خوش ہوکر ختم کر رہے ہیں۔ کیا ان کے پاس وہ بات نہیں آئی جو پہلی اُمتوں کے پاس آئی تھی۔ کیا انہوں نے عظیم الشان نشانات نہیں دیکھے۔ کیا انہوں نے صدی کا سَر اور فسادِ اُمت اور اعدائے مِلّت کی طرف سے بڑے بڑے فتنے اور رمضان کے مہینہ میں خسوف و کسوف اور دوسری علامتیں

اَعْدَادِ الْمِلَّةِ وَالْكُسُوْفِ وَالْخُسُوْفِ فِيْ رَمَضَانَ وَمَعَالِمُ اُخْرٰى۔ فَاِنْ كُنْتُمْ صَالِحِيْنَ فَاَيْنَ التَّقْوٰى۔
اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ عَلِمْتُمْ مِمَّا ذَكَرْنَا مِنْ قَبْلُ اَنَّ اَعْدَادَ سُوْرَةِ الْعَصْرِ بِحِسَابِ الْجُمَلِ تَدُلُّ عَلٰى اَنَّ الزَّمَانَ الْمَاضِيَ مِنْ وَقْتِ اٰدَمَ اِلٰى نُزُوْلِ هٰذِهِ السُّوْرَةِ كَانَ سَبْعَ مِائَةِ سَنَةٍ بَعْدَ اَرْبَعَ اٰلَافٍ۔ هٰذَا مَا كَشَفَ عَلَيَّ رَبِّيْ فَعَلِمْتُ بَعْدَ انْكِشَافٍ وَشَهِدَ عَلَيْهِ تَارِيْخٌ اِتَّفَقَ عَلَيْهِ جُمْهُوْرُ اَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ غَيْرِ خِلَافٍ۔ وَقَدْ زَادَ عَلٰى تِلْكَ الْمُدَّةِ اِلٰى يَوْمِنَا هٰذَا ثَلٰثُ مِائَةٍ بَعْدَ الْاَلْفِ۔ وَاِذَا جَمَعْنَاهُمَا فَهُوَ سِتَّةُ اٰلَافٍ كَمَا هُوَ مَذْهَبُ الْمُحَقِّقِيْنَ مِنَ السَّلَفِ۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۳۲۵ تا ۳۲۶)

دلیل زمانہ کے آخری ہونے پر یہ ہے کہ قرآن شریف کی سُورۂ عصر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یہ زمانہ حضرت آدم علیہ السّلام سے ہزار ششم پر واقع ہے یعنی حضرت آدم علیہ السّلام کی پیدائش سے یہ چھٹا ہزار جاتا ہے اور ایسا ہی احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ آدم سے لے کر اخیر دُنیا تک کی عمر سات ہزار سال ہے۔ لہٰذا آخر ہزار ششم وہ آخری حصہ اِس دُنیا کا ہوُا جس سے ہر ایک جسمانی اور رُوحانی تکمیل وابستہ ہے کیونکہ خدائی کارخانۂ قدرت میں چھٹے دن اور چھٹے ہزار کو الٰہی فعل کی تکمیل کے لئے قدیم سے مقرر فرمایا گیا ہے۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السّلام چھٹے دن میں یعنی بروز جمعہ دن کے آخر حصّے میں پیدا ہوئے یعنی آپ کے وجود کا تمام وکمال پیرایہ چھٹے دن ظاہر ہوُا گو خمیر آدم کا آہستہ آہستہ تیار ہو رہا تھا اور تمام جمادی نباتی حیوانی پیدائشوں کے ساتھ بھی شریک تھا لیکن کمال خلقت کا دن چھٹا دن تھا اور قرآن شریف بھی گو آہستہ آہستہ پہلے سے نازل ہو رہا تھا مگر اس کا کامل وجود بھی چھٹے دن ہی بروز جمعہ اپنے کمال کو پہنچا اور آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ[1] نازل ہوئی اور انسانی نطفہ

پوری ہوتی نہیں دیکھیں۔ اگر تم صالح ہو تو تقویٰ کہاں گیا۔

اے لوگو! تم معلوم کر چکے ہو جو ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ حسابِ جمل کے لحاظ سے سورۂ عصر کے اعداد اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آدم علیہ السّلام سے اِس سورۃ کے نزول کے زمانہ تک کا وقت چار ہزار سات سَو سال کے قریب بنتا ہے۔ یہ وہ بات ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے مجھ پر انکشاف کیا۔ سو مَیں نے اس انکشاف کے بعد حقیقت کو جان لیا اور تاریخ نے بھی اِس کے درست ہونے کی شہادت دے دی اور بغیر اختلاف کے جمہور اہلِ کتاب بھی اس سے متفق ہیں اور اس مدّت پر ہمارے اس دن تک تیرہ سَو سال مزید گزر چکے ہیں۔ اور جب ہم ان دونوں مدّتوں کو جمع کریں تو یہ چھ ہزار سال بن جاتے ہیں جیسا کہ سابق محققین کا مذہب ہے۔

---

[1] سورۃ المائدۃ : ۴

بھی اپنے تغیرات کے چھٹے مرتبہ ہی خلقتِ بشری سے پورا حصہ پاتا ہے جس کی طرف آیت ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ[1]
میں اشارہ ہے اور مراتبِ ستّہ یہ ہیں (۱) نطفہ (۲) علقہ (۳) مضغہ (۴) عظام (۵) لحم محیط العظام (۶) خلقِ آخر۔
اس قانونِ قدرت سے جو روزِ ششم اور مرتبہ ششم کی نسبت معلوم ہو چکا ہے ماننا پڑتا ہے کہ دُنیا کی عمر کا ہزار ششم
بھی یعنی اس کا آخری حصہ بھی جس میں ہم ہیں کسی آدم کے پیدا ہونے کا وقت اور کسی دینی تکمیل کے ظہور کا زمانہ ہے۔
جیسا کہ براہینِ احمدیہ کا یہ الہام کہ اَرَدْتُّ اَنْ اَسْتَخْلِفَ فَخَلَقْتُ اٰدَمَ اور یہ الہام کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ
اس پر دلالت کر رہا ہے اور یاد رہے کہ اگرچہ قرآن شریف کے ظاہر الفاظ میں عمرِ دُنیا کی نسبت کچھ ذکر نہیں لیکن
قرآن شریف میں بہت سے ایسے اشارات بھرے پڑے ہیں جن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عمرِ دُنیا یعنی دَورِ آدم کا
زمانہ سات ہزار سال ہے۔ چنانچہ منجملہ ان اشاراتِ قرآنی کے ایک یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے ایک کشف کے
ذریعہ سے اطلاع دی ہے کہ سورۃ العصر کے اعداد سے بحساب ابجد معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عصر تک جو عہدِ نبوت ہے یعنی تیئیس برس کا تمام و کمال زمانہ یہ کُل مدت گذشتہ زمانہ
کے ساتھ ملا کر ۴۷۳۹ برس ابتدائے دُنیا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روزِ وفات تک قمری حساب سے
ہیں پس اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم الف خامس میں جو مریخ کی طرف منسوب ہے مبعوث
ہوئے ہیں اور شمسی حساب سے یہ مدت ۴۵۹۸ ہوتی ہے اور عیسائیوں کے حساب سے جس پر تمام مدار بائیبل
کا رکھا گیا ہے ۴۶۳۶ برس ہیں یعنی حضرت آدمؑ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اخیر زمانہ تک ۴۶۳۶
برس ہوتے ہیں۔ اِس سے ظاہر ہوا کہ قرآنی حساب جو سورۃ العصر کے اعداد سے معلوم ہوتا ہے اور عیسائیوں
کی بائیبل کے حساب میں جس کے رُو سے بائیبل کے حاشیہ پر جابجا تاریخیں لکھتے ہیں صرف اٹھتیس برس کا فرق
ہے اور یہ قرآن شریف کے علمی معجزات میں سے ایک عظیم الشان معجزہ ہے جس پر تمام افرادِ اُمتِ محمدیہ میں سے
خاص مجھ کو جو مَیں مہدیٔ آخر الزمان ہوں اطلاع دی گئی ہے تا قرآن کا یہ علمی معجزہ اور نیز اس سے اپنے دعویٰ
کا ثبوت لوگوں پر ظاہر کروں اور ان دونوں حسابوں کی رُو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ جس کی خدا تعالیٰ
نے سورۃ والعصر میں قسم کھائی الف خامس ہے یعنی ہزار پنجم جو مریخ کے اثر کے ماتحت ہے اور یہی سِرّ ہے جو
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُن مفسدین کے قتل اور خوں ریزی کے لئے حکم فرمایا گیا جنہوں نے مسلمانوں کو
قتل کیا اور قتل کرنا چاہا اور اُن کے استیصال کے درپے ہوئے اور یہی خدا تعالیٰ کے حکم اور اذن سے
مریخ کا اثر ہے۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعث اول کا زمانہ ہزار پنجم ہے جو اسم محمد کا مظہر تجلی تھا یعنی

---

[1] سورۃ المؤمنون : ۱۵

یہ بعث اوّل جلالی نشان ظاہر کرنے کے لئے تھا۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۱ تا ۹۶)

حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ عمرِ دُنیا ہزار سال ہے اور انس بن مالک سے روایت ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کی راہ میں ایک مسلمان کی حاجت براری کرے اس کے لئے عمرِ دُنیا کے اندازہ پر دن کو روزہ رکھنا اور رات کو عبادت کرنا لکھا جاتا ہے اور عمرِ دُنیا سات ہزار سال ہے۔ دیکھو تاریخ ابنِ عساکر اور نیز وہی مؤلف انسؓ سے مرفوعاً روایت کرتا ہے کہ عمرِ دُنیا آخرت کے دنوں میں سے سات دن یعنی حسبِ منطوق اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ[1] سات ہزار سال ہے۔ اِس آیت کے یہ معنے ہیں کہ تمہارا ہزار سال خدا کا ایک دن ہے۔ ایسا ہی طبرانی نے اور نیز بیہقی نے دلائل میں اور سُہیلی نے روض آنف میں عمرِ دُنیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہزار سال روایت کی ہے ایسا ہی بطریق صحیح ابنِ عباس سے منقول ہے کہ دُنیا سات دن ہیں اور ہر ایک دن ہزار سال کا ہے اور بعثت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخر ہزار ہفتم میں ہے مگر یہ حدیث دو پہلو سے موردِ اعتراض ہے جس کا دفع کرنا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ اِس حدیث کو بعض دوسری حدیثوں سے تناقض ہے کیونکہ دوسری احادیث میں یوں لکھا ہے کہ بعثتِ نبوی آخر ہزار ششم میں ہے اور اس حدیث میں ہے کہ ہزار ہفتم میں ہے پس یہ تناقض تطبیق کو چاہتا ہے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ امرِ واقعی اور صحیح یہ ہے کہ بعثتِ نبوی ہزار ششم کے آخر میں ہے جیسا کہ نصوصِ قرآنیہ اور حدیثیہ بالاتفاق گواہی دے رہی ہیں لیکن چونکہ آخری صدی کا یا مثلاً آخر ہزار کا اُس صدی یا ہزار کا سر کہلاتا ہے جو اس کے بعد شروع ہونے والا ہے اور اس کے ساتھ پیوستہ ہے اِس لئے یہ محاورہ ہر ایک قوم کا ہے کہ مثلاً وہ کسی صدی کے آخری حصّے کو جس پر گویا صدی ختم ہونے کے حکم میں ہے دوسری صدی پر جو اس کے بعد شروع ہونے والی ہے اطلاق کر دیتے ہیں مثلاً کہہ دیتے ہیں کہ فلاں مجدد بارھویں صدی کے سر پر ظاہر ہوا تھا گو وہ گیارھویں صدی کے اخیر پر ظاہر ہوا ہو یعنی گیارھویں صدی کے چند سال رہتے اس نے ظہور کیا ہو۔ اور پھر بسا اوقات بباعث تسامح کلام یا قصورِ فہم راویوں کی وجہ سے یا بوجہ عدم ضبط کلماتِ نبویہ اور ذہول کے جو لازم نشأ بشریت ہے کسی قدر آور بھی تغیّر ہو جاتا ہے۔ سو اِس قسم کا تعارض قابلِ التفات نہیں بلکہ درحقیقت یہ کچھ تعارض ہی نہیں۔ یہ سب باتیں عادت اور محاورہ میں داخل ہیں کوئی عقلمند اس کو تعارض نہیں سمجھے گا۔

(۲) دوسرا پہلو جس کے رُو سے اعتراض ہوتا ہے کہ بموجب اس حساب کے جو یہود اور نصاریٰ میں محفوظ اور متواتر چلا آتا ہے جس کی شہادت اعجازی طور پر کلام معجز نظام قرآن شریف میں بکمال لطافت بیان موجود ہے

---

[1] سورۃ الحج: ۴۸

جیساکہ ہم نے متن میں مفصل بیان کر دیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت آدم علیہ السلام سے قمری حساب کے رُو سے ۴،۷۳۹ برس بعد میں مبعوث ہوئے ہیں اور شمسی حساب کے رُو سے ۴۵۹۸ برس بعد آدم صفی اللہ حضرت نبینا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوئے پس اِس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہزار پنجم میں یعنی الف خامس میں ظہور فرما ہوئے نہ کہ ہزار ششم میں اور یہ حساب بہت صحیح ہے کیونکہ یہود اور نصاریٰ کے علماء کا تواتر اسی پر ہے اور قرآن شریف اسی کا مصدق ہے اور کئی اَور وجوہ اور دلائل عقلیہ جن کی تفصیل موجبِ تطویل ہے قطعی طور پر اِس بات پر جزم کرتی ہیں کہ مابین سیدنا محمد مصطفےٰ اور آدم صفی اللہ میں یہی فاصلہ ہے اس سے زیادہ نہیں۔ گو آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے کی تاریخ لاکھوں برس ہوں یا کروڑہا برس ہوں جس کا علم خدا تعالیٰ کے پاس ہے لیکن ہمارے ابوالنوع آدم صفی اللہ کی پیدائش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک یہی مدت گذری تھی یعنی ۴،۷۳۹ برس بحساب قمری اور ۴۵۹۸ برس بحساب شمسی اور جبکہ قرآن اور حدیث اور تواتر اہلِ کتاب سے یہی مدت ثابت ہوتی ہے تو یہ بات بدیہی البطلان ہے کہ ایسا خیال کیا جائے کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہزار ششم کے آخر پر مبعوث ہوئے تھے کیونکہ اگر وہ آخر ہزار ششم تھا تو اَب تیرہ سو سترہ اور اس کے ساتھ ملا کر سات ہزار تین سَو سترہ ہوں گے حالانکہ بالاتفاق تمام احادیث کے رُو سے عمرِ دُنیا کُل سات ہزار برس قرار پایا تھا تو گویا اب ہم دُنیا کے باہر زندگی بسر کر رہے ہیں اور گویا اَب دُنیا کو ختم ہوئے تین سَو سترہ برس گذر گئے۔ یہ کس قدر لغو اور بیہودہ خیال ہے جس کی طرف ہمارے علماء نے کبھی توجہ نہیں کی۔ ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ جبکہ احادیثِ صحیحہ متواترہ کے رُو سے عمرِ دُنیا یعنی حضرت آدم سے لیکر اخیر تک سات ہزار برس قرار پائی تھی اور قرآن شریف میں بھی آیت اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ اللّٰہِ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا اور اہلِ کتاب یہود اور نصاریٰ کا بھی یہی مذہب ہوا اور خدا تعالیٰ کا سات دن مقرر کرنا اور اُن کے متعلق سات ستارے مقرر کرنا اور سات آسمان اور سات زمین کے طبقے جن کو ہفت اقلیم کہتے ہیں قرار دینا اور یہ سب اسی طرف اشارات ہیں تو پھر کونسا حساب ہے جس کے رُو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کو الف سادس یعنی ہزار ششم قرار دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کو آج کی تاریخ تک تیرہ سَو سترہ برس اور چھ مہینے اُوپر گذر گئے تو پھر اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ چھٹا ہزار تھا تو یہ ہمارا زمانہ کہ جو تیرہ سَو برس بعد آیا دُنیا کی عمر کے اندر کیونکر رہ سکتا ہے۔ ذرا چھ ہزار اور تیرہ سَو برس کی میزان تو کرو۔ غرض یہ اعتراض ہے جو اس حدیث پر ہوتا ہے جس میں لکھا ہے کہ عمرِ دُنیا کی سات ہزار برس ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخر ہزار ششم میں مبعوث ہوئے۔ اور اِس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ہر ایک نبی کا ایک بعث ہے مگر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دُو بعث ہیں اور اس پر نصِ قطعی آیتِ کریمہ وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ہے۔

تمام اکابر مفسّرین اِس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اِس اُمّت کا آخری گروہ یعنی مسیح موعود کی جماعت صحابہؓ کے رنگ میں ہوں گے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح بغیر کسی فرق کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض اور ہدایت پائیں گے۔ پس جب کہ یہ نصِ صریح قرآن شریف سے ثابت ہوکہ جیساکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض صحابہؓ پر جاری ہوا ایسا ہی بغیر کسی امتیاز اور تفریق کے مسیح موعود کی جماعت پر فیض ہوگا تو اِس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اَور بعث ماننا پڑا جو آخری زمانہ میں مسیح موعود کے وقت میں ہزار ششم میں ہوگا اور اِس تقریر سے یہ بات بپایہ ثبوت پہنچ گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو بعث ہیں یا بہ تبدیلِ الفاظ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک بروزی رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دوبارہ آنا دُنیا میں وعدہ دیا گیا تھا جو مسیح موعود اور مہدیٔ معہود کے ظہور سے پُورا ہؤا۔ غرض جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دُو بعث ہوئے تو جو بعض حدیثوں میں یہ ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہزار ششم کے اخیر میں مبعوث ہوئے تھے اس سے بعث دوم مراد ہے جو نصِ قطعی آیتِ کریمہ وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ[1] سے سمجھا جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ نادان مولوی جن کے ہاتھ میں صرف پوست ہی پوست ہے حضرت مسیح کے دوبارہ آنے کی انتظار کر رہے ہیں مگر قرآن شریف ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دوبارہ آنے کی بشارت دیتا ہے کیونکہ افاضہ بغیر بعث غیر ممکن ہے اور بعث بغیر زندگی کے غیر ممکن ہے اور حاصل اِس آیتِ کریمہ یعنی وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ کا یہی ہے کہ دُنیا میں زندہ رسول ایک ہی ہے یعنی محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم جو ہزار ششم میں بھی مبعوث ہوکر ایسا ہی افاضہ کرے گا جیساکہ وہ ہزار پنجم میں افاضہ کرتا تھا اور مبعوث ہونے کے اِس جگہ یہی معنی ہیں کہ جب ہزار ششم آئے گا اور مہدیٔ موعود اس کے آخر میں ظاہر ہوگا تو گو بظاہر مہدیٔ معہود کے توسط سے دُنیا کو ہدایت ہوگی لیکن دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی نئے سرے اصلاحِ عالَم کی طرف ایسی سرگرمی سے توجہ کرے گی کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ مبعوث ہوکر دُنیا میں آگئے ہیں۔ یہی معنے اِس آیت کے ہیں کہ وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ۔ پس یہ خبر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعث دوم کے متعلق ہے جس کے ساتھ یہ شرط ہے کہ وہ بعث ہزار ششم کے اخیر پر ہوگا۔ اِس حدیث سے اِس بات کا قطعی فیصلہ ہوتا ہے کہ ضرور ہے کہ مہدی معہود اور مسیح موعود جو مظہرِ تجلیاتِ محمدیہ ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بعث دوم موقوف ہے وہ چودھویں صدی کے سر پر ظاہر ہو کیونکہ یہی صدی ہزار ششم کے آخری حصہ میں پڑتی ہے اور بعض علماء کا اِس جگہ یہ تاویل کرنا کہ عمرِ دُنیا سے مراد گذشتہ عمر ہے یہ درست نہیں ہے کیونکہ یہ تمام حدیثیں بحیثیت پیشگوئی کرنے کے ہیں اور حدیث ہفت پایۂ ممبر خواب میں دیکھنے کی

---

[1] سورۃ الجمعۃ: ۴

بھی اسی کی مؤید ہے اور اِس بارے میں جو عقیدہ مقبولۃ الاجماع یہود و نصاریٰ ہے وہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے اور گذشتہ نبیوں کے سلسلہ پر نظر کرنے سے یہی تخمینہ قیاساً سمجھ میں آتا ہے اور یہ کہنا کہ آئندہ کی تو خدا نے کسی کو خبر نہیں دی کہ کب قیامت آئے گی یہ بیشک صحیح ہے مگر عمرِ دُنیا کی سات ہزار برس قرار دینے سے اِس امر کے بارے میں کہ کس گھڑی قیامت برپا ہوگی کوئی دلیل قطعی معلوم نہیں ہوتی کیونکہ سات ہزار کے لفظ سے یہ مستنبط نہیں ہوتا کہ ضرور سات ہزار برس پُورا کرکے قیامت آجائے گی وجہ یہ کہ اول تو یہ امر مشتبہ رہے گا کہ اِس جگہ خدا تعالیٰ نے سات ہزار سے شمسی حساب کی مدت مراد لی ہے یا قمری حساب کی۔ اور شمسی حساب سے اگر سات ہزار سال ہو تو قمری حساب سے قریباً دو سَو برس اَور اُوپر چاہیئے اور ماسوا اس کے چونکہ عرب کی عادت میں یہ داخل ہے کہ وہ کسور کو حساب سے ساقط رکھتے ہیں اور مخلِ مطلب نہیں سمجھتے اِس لئے ممکن ہے کہ سات ہزار سے اِس قدر زیادہ بھی ہو جائے جو آٹھ ہزار تک نہ پہنچے مثلاً دو تین سَو برس اَور زیادہ ہو جائیں تو اس صورت میں باوجود بیان اس مدت کے وہ خاص ساعت تو مخفی کی مخفی ہی رہی اور یہ مدت بطور ایک علامت کے ہوئی جیسا کہ انسان کی موت کی گھڑی جو قیامتِ صغریٰ ہے مخفی ہے مگر یہ علامت ظاہر ہے کہ ایک سَو بیس برس تک انسان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور پیرانہ سالی بھی اس کی موت کی ایک علامت ہے۔ ایسا ہی امراضِ مُہلکہ بھی علامتِ موت ہیں اور نیز اس میں کیا شک ہے کہ قرآن شریف میں قُربِ قیامت کی بہت سی علامتیں بیان فرمائی گئی ہیں اور ایسا ہی احادیث میں بھی پس منجملہ ان کے سات ہزار سال بھی ایک علامت ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ قیامت بھی کئی قسم پر منقسم ہے اور ممکن ہے کہ سات ہزار سال کے بعد کوئی قیامتِ صغریٰ ہو جس سے دُنیا کی ایک بڑی تبدیلی مراد ہو نہ قیامتِ کُبریٰ۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۱ تا ۹۵ حاشیہ)

میری پَیدائش اس وقت ہوئی جب چھ ہزار برس میں سے گیارہ برس رہتے تھے سو جیسا کہ آدم علیہ السلام اخیر حصّہ میں پَیدا ہوا ایسا ہی میری پیدائش ہوئی۔ خدا نے منکروں کے عذروں کو توڑنے کے لئے یہ خوب بندوبست کیا ہے کہ مسیح موعود کے لئے چار ضروری علامتیں رکھ دی ہیں (۱) ایک یہ کہ اس کی پیدائش حضرت آدمؑ کی پَیدائش کے رنگ میں آخر ہزار ششم میں ہو (۲) دوسری یہ کہ اس کا ظہور و بروز صدی کے سر پر ہو (۳) تیسری یہ کہ اسکے دعوٰی کے وقت آسمان پر رمضان کے مہینہ میں خسوف و کسوف ہو (۴) چوتھی یہ کہ اس کے دعوٰی کے وقت میں بجائے اُونٹوں کے ایک اَور سواری دُنیا میں پیدا ہو جائے۔ اَب ظاہر ہے کہ چاروں علامتیں ظہور میں آ چکی ہیں چنانچہ مدت ہوئی کہ ہزار ششم گذر گیا اور اَب قریباً پچاسواں سال اس پر زیادہ جا رہا ہے اور اَب دُنیا ہزار ہفتم کو بسر کر رہی ہے اور صدی کے سر پر سے بھی سترہ برس گذر گئے اور خسوف و کسوف پر بھی کئی سال گذر چکے اور اُونٹوں کی جگہ ریل کی سواری بھی نکل آئی پس اَب قیامت تک کوئی دعوٰی نہیں کر سکتا کہ مَیں مسیح موعود

ہوں کیونکہ اَب مسیح موعود کی پیدائش اور اس کے ظہور کا وقت گذر گیا۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۵ حاشیہ در حاشیہ)

یہ ایک باریک بھید یاد رکھنے کے لائق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعث دوم میں تجلّیٔ اعظم جو اکمل اور اتم ہے وہ صرف اسمِ احمد کی تجلّی ہے کیونکہ بعث دوم آخر ہزار ششم میں ہے اور ہزار ششم کا تعلق ستارہ مُشتری کے ساتھ ہے جو کوکب ششم منجملہ خُنّس کُنّس ہے اور اس ستارہ کی یہ تاثیر ہے کہ مامورین کو خوں ریزی سے منع کرتا اور عقل اور دانش اور موادِ استدلال کو بڑھاتا ہے اِس لئے اگرچہ یہ بات حق ہے کہ اس بعث دوم میں بھی اسمِ محمدؐ کی تجلّی سے جو جلالی تجلّی ہے اور جمالی تجلّی کے ساتھ شامل ہے مگر وہ جلالی تجلّی بھی رُوحانی طور پر ہو کر جمالی رنگ کے مشابہ ہو گئی ہے کیونکہ اس وقت جلالی تجلّی کی تاثیر قہرِ سیفی نہیں بلکہ قہرِ استدلالی ہے وجہ یہ کہ اس وقت کے مبعوث پر پرتوۂ ستارہ مُشتری ہے نہ پرتوۂ مرّیخ۔ اِسی وجہ سے بار بار اِس کتاب میں لکھا گیا ہے کہ ہزار ششم فقط اسمِ احمد کا مظہرِ اتم ہے جو جمالی تجلّی کو چاہتا ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۶ حاشیہ)

قرآن شریف کے حروف اور ان کے اعداد بھی معارفِ مخفیہ سے خالی نہیں ہوتے۔ مثلاً سورۃ والعصر کی طرف دیکھو کہ ظاہری معنوں کی رُو سے یہ بتلاتی ہے کہ یہ دُنیوی زندگی جس کو انسان اِس قدر غفلت سے گذار رہا ہے آخری یہی زندگی ابدی خسران اور وبال کا موجب ہو جاتی ہے اور اس خسران سے وہی بچتے ہیں جو خدائے واحد پر سچے دل سے ایمان لے آتے ہیں کہ وہ موجود ہے اور پھر ایمان کے بعد کوشش کرتے ہیں کہ اچھے اچھے عملوں سے اس کو راضی کریں اور پھر اسی پر کفایت نہیں کرتے بلکہ چاہتے ہیں کہ اِس راہ میں ہمارے جیسے اَور بھی ہوں جو سچائی کو زمین پر پھیلاویں اور خدا کے حقوق پر کاربند ہوں اور بنی نوع پر بھی رحم کریں لیکن اِس سُورت کے ساتھ یہ ایک عجیب معجزہ ہے کہ اس میں آدم کے زمانہ سے لے کر آنحضرتؐ کے زمانہ تک دُنیا کی تاریخ اَبجد کے حساب سے یعنی حسابِ جمل سے بتلائی گئی ہے۔ غرض قرآن شریف میں ہزارہا معارف وحقائق ہیں اور درحقیقت شمار سے باہر ہیں۔ (نزول المسیح صفحہ ۴۴)

ہمارا عقیدہ جو قرآن شریف نے ہمیں سکھلایا ہے کہ خدا ہمیشہ سے خالق ہے اگر چاہے تو کروڑوں مرتبہ زمین و آسمان کو فنا کر کے پھر ایسے ہی بنا دے اور اُس نے ہمیں خبر دی ہے کہ وہ آدم جو پہلی اُمتوں کے بعد آیا جو ہم سب کا باپ تھا اس کے دُنیا میں آنے کے وقت سے یہ سلسلہ انسانی شروع ہُوا ہے اور اس سلسلہ کی عمر کا پورا دَور سات ہزار برس تک ہے۔ یہ سات ہزار خدا کے نزدیک ایسے ہیں جیسے انسانوں کے سات دن۔ یاد رہے کہ قانونِ الٰہی نے مقرر کیا ہے کہ ہر ایک اُمت کے لئے سات ہزار برس کا دَور ہوتا ہے اسی دَور کی طرف اشارہ کرنے کے لئے انسانوں میں سات دن مقرر کیے گئے ہیں۔ غرض بنی آدم کی عمر کا دَور سات ہزار برس مقرر

ہے اور اس میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پانچ ہزار برس کے قریب گذر چکا تھا یا بہ تبدیل الفاظ یوں کہو کہ خدا کے دنوں میں سے پانچ دن کے قریب گذر چکے تھے جیسا کہ سورۃ والعصر میں یعنی اس کے حروف میں ابجد کے لحاظ سے قرآن شریف میں اشارہ فرما دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں جب وہ سورۃ نازل ہوئی تب آدم کے زمانہ پر اسی قدر مدت گذر چکی تھی جو سورۃ موصوفہ کے عددوں سے ظاہر ہے۔ اسی حساب سے انسانی نوع کی عمر میں سے اب اس زمانہ میں چھ ہزار برس گذر چکے ہیں اور ایک ہزار برس باقی ہیں۔ قرآن شریف میں بلکہ اکثر پہلی کتابوں میں بھی یہ نوشتہ موجود ہے کہ وہ آخری مُرسل جو آدم کی صورت پر آئے گا اور مسیح کے نام سے پکارا جائے گا ضرور ہے کہ وہ چھٹے ہزار کے آخر میں پیدا ہو جیسا کہ آدم چھٹے دن کے آخر میں پیدا ہوا۔ یہ تمام نشان ایسے ہیں کہ تدبّر کرنے والے کے لئے کافی ہیں اور ان سات ہزار برس کی قرآن شریف اور دوسری خدا کی کتابوں کے رُو سے تقسیم یہ ہے کہ پہلا ہزار نیکی اور ہدایت کے پھیلنے کا زمانہ ہے اور دوسرا ہزار شیطان کے تسلط کا زمانہ ہے اور پھر تیسرا ہزار نیکی اور ہدایت کے پھیلنے کا۔ اور چوتھا ہزار شیطان کے تسلط کا اور پھر پانچواں ہزار نیکی اور ہدایت کے پھیلنے کا۔ (یہی وہ ہزار ہے جس میں ہمارے سیّد و مولیٰ ختمی پناہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے اور شیطان قید کیا گیا) اور پھر چھٹا ہزار شیطان کے کھلنے اور مسلط ہونے کا زمانہ ہے جو قرونِ ثلاثہ کے بعد شروع ہوتا اور چودھویں صدی کے سر پر ختم ہو جاتا ہے اور پھر ساتواں ہزار خدا اور اس کے مسیح کا اور ہر ایک خیر و برکت اور ایمان اور صلاح اور تقویٰ اور توحید اور خدا پرستی اور ہر ایک قسم کی نیکی اور ہدایت کا زمانہ ہے۔ اب ہم ساتویں ہزار کے سر پر ہیں اِس کے بعد کسی دوسرے مسیح کو قدم رکھنے کی جگہ نہیں کیونکہ زمانے سات ہی ہیں جو نیکی اور بدی میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ اِس تقسیم کو تمام انبیاء نے بیان کیا ہے کسی نے اجمال کے طور پر اور کسی نے مفصّل طور پر اور یہ تفصیل قرآن شریف میں موجود ہے جس سے مسیح موعود کی نسبت قرآن شریف میں سے صاف طور پر پیشگوئی نکلتی ہے۔

(لیکچر لاہور صفحہ ۳۸ تا ۴۰)

تمام نبیوں کی کتابوں سے اور ایسا ہی قرآن شریف سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے آدم سے لے کر اخیر تک دُنیا کی عمر سات ہزار برس رکھی ہے اور ہدایت اور گمراہی کے لئے ہزار ہزار سال کے دَور مقرر کئے ہیں یعنی ایک وہ دَور ہے جس میں ہدایت کا غلبہ ہوتا ہے اور دوسرا وہ دَور ہے جس میں ضلالت اور گمراہی کا غلبہ ہوتا ہے اور جیسا کہ مَیں نے بیان کیا خدا تعالیٰ کی کتابوں میں یہ دونوں دَور ہزار ہزار برس پر تقسیم کئے گئے ہیں اوّل دَور ہدایت کے غلبہ کا تھا۔ اس میں بُت پرستی کا نام و نشان نہ تھا۔ جب یہ ہزار سال ختم ہوا تب دوسرے دَور میں جو ہزار سال کا تھا طرح طرح کی بُت پرستیاں دُنیا میں شروع ہو گئیں اور شرک کا بازار گرم ہو گیا اور ہر ایک ملک

میں بُت پرستی نے جگہ لے لی۔ پھر تیسرا دَور جو ہزار سال کا تھا اس میں توحید کی بُنیاد ڈالی گئی اور جس قدر خدا نے چاہا دُنیا میں توحید پھیل گئی۔ پھر ہزار چہارم کے دَور میں ضلالت نمودار ہوئی اور اسی ہزار چہارم میں سخت درجہ پر بنی اسرائیل بگڑ گئے اور عیسائی مذہب تخم ریزی کے ساتھ ہی خشک ہوگیا اور اس کا پیدا ہونا اور مرنا گویا ایک ہی وقت میں ہوا۔ پھر ہزار پنجم کا دَور آیا جو ہدایت کا دَور تھا۔ یہ وہ ہزار ہے جس میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر توحید کو دوبارہ دُنیا میں قائم کیا۔ پس آپ کے منجانب اللہ ہونے پر یہی ایک نہایت زبردست دلیل ہے کہ آپ کا ظہور اُس ہزار کے اندر ہوا جو روزِ اوّل سے ہدایت کے لئے مقرر تھا اور یہ مَیں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ خدا تعالیٰ کی تمام کتابوں سے یہی نکلتا ہے اور اسی دلیل سے میرا دعویٰ مسیح موعود ہونے کا بھی ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس تقسیم کی رُو سے ہزار ششم ضلالت کا ہزار ہے۔ وہ ہزار ہجرت کی تیسری صدی کے بعد شروع ہوتا ہے اور چودھویں صدی کے سر تک ختم ہوتا ہے۔ اسی ششم ہزار کے لوگوں کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیج اَعوج رکھا ہے اور ساتواں ہزار ہدایت کا ہے جس میں ہم موجود ہیں۔ چونکہ یہ آخری ہزار ہے اس لئے ضرور تھا کہ امام الزمان اس کے سر پر پیدا ہوا اور اس کے بعد کوئی امام نہیں اور نہ کوئی مسیح مگر وہ جو اس کے لئے بطور ظِلّ کے ہوں کیونکہ اِس ہزار میں اب دُنیا کی عمر کا خاتمہ ہے جس پر تمام نبیوں نے شہادت دی ہے اور یہ امام جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مسیح موعود کہلاتا ہے وہ مجدّدِ صدی بھی ہے اور مجدّد الف آخر بھی۔ اِس بات میں نصاریٰ اور یہود کو بھی اختلاف نہیں کہ آدم سے یہ زمانہ ساتواں ہزار ہے اور خدا نے جو سورۃ والعصر کے اعداد سے تاریخ آدم میرے پر ظاہر کی اس سے بھی یہ زمانہ جس میں ہم ہیں ساتواں ہزار ہی ثابت ہوتا ہے۔ اور نبیوں کا اس پر اتفاق تھا کہ مسیح موعود ساتویں ہزار کے سر پر ظاہر ہوگا اور چھٹے ہزار کے اخیر میں پیدا ہوگا کیونکہ وہ سب سے آخر ہے جیسا کہ آدم سب سے اوّل تھا اور آدم چھٹے دن جمعہ کی اخیر ساعت میں پیدا ہوا۔ اور چونکہ خدا کا ایک دن دُنیا کے ہزار سال کے برابر ہے اس مشابہت سے خدا نے مسیح موعود کو ششم ہزار کے اخیر میں پَیدا کیا گویا وہ بھی دن کی آخری گھڑی ہے۔ (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۶ تا ۸)

یہ صحیح نہیں ہے جو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قیامت کا کسی کو علم نہیں پھر آدم سے اخیر تک سات ہزار سال کیونکر مقرر کر دیئے جائیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کبھی خدا تعالیٰ کی کتابوں میں صحیح طور پر فکر نہیں کیا۔ مَیں نے آج یہ حساب مقرر نہیں کیا یہ تو قدیم سے محققین اہلِ کتاب میں مسلّم چلا آیا ہے یہاں تک کہ یہودی فاضل بھی اس کے قائل رہے ہیں اور قرآن شریف سے بھی صاف طور پر یہی نکلتا ہے کہ آدم سے اخیر تک عمر بنی آدم کی سات ہزار سال ہے اور ایسا ہی پہلی کتابیں بھی بالاتفاق یہی کہتی ہیں اور آیت اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ[1]

[1] سورۃ الحج : ۴۸

سے بھی یہی نکلتا ہے اور تمام نبی واضح طور پر یہی خبر دیتے آئے ہیں اور جیسا کہ مَیں ابھی بیان کر چکا ہوں سورۃ والعصر کے اعداد سے بھی یہی صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آدم سے الف پنجم میں ظاہر ہوئے تھے اور اِس حساب سے یہ زمانہ جس میں ہم ہیں ہزار ہفتم ہے۔ جس بات کو خدا نے اپنی وحی سے ہم پر ظاہر کیا اس سے ہم انکار نہیں کر سکتے اور نہ ہم کوئی وجہ دیکھتے ہیں کہ خدا کے پاک نبیوں کے متفق علیہ کلمہ سے انکار کریں۔ پھر جبکہ اِس قدر ثبوت موجود ہیں اور بلاشُبہ احادیث اور قرآن شریف کے رُو سے یہ آخری زمانہ ہے پھر آخری ہزار ہونے میں کیا شک رہا اور آخری ہزار کے سر پر مسیح موعود کا آنا ضروری ہے۔ (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۸، ۹)

خدا تعالیٰ نے اِس دُنیا کو ایک دن مقرر کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کو عصر کے وقت سے تشبیہ دی ہے۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ عصر ہؤا تو پھر اَب تیرہ سَو چوبیس برس کے بعد اس زمانہ کا کیا نام رکھنا چاہیئے۔ کیا یہ وقت قریبِ غروب نہیں اور پھر جب قریب غروب ہؤا تو مسیح کے نازل ہونے کا اگر یہ وقت نہیں تو اس کے بعد تو کوئی وقت نہیں۔

اِسی طرح احادیث صحیحہ میں جو بعض ان کی صحیح بخاری میں پائی جاتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کو عصر سے تشبیہ دی ہے۔ پس اس سے ماننا پڑتا ہے کہ ہمارا زمانہ قیامت کے قُرب کا زمانہ ہے اور پھر دوسری حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عمرِ دُنیا کی سات ہزار سال ہے اور قرآن شریف کی اِس آیت سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ[1] یعنی ایک دن خدا کے نزدیک تمہارے ہزار سال کے برابر ہے۔ پس جبکہ خدا تعالیٰ کی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ دن سات ہیں پس اِس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اِنسانی نسل کی عمر سات ہزار سال ہے جیسا کہ خدا نے میرے پر ظاہر کیا کہ سورۃ والعصر کے عدد جس قدر حساب جمل کی رُو سے معلوم ہوتے ہیں اسی قدر نسلِ انسان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک تک بحساب قمری گذر چکا تھا کیونکہ خدا نے حساب قمری رکھا ہے اور اِس حساب سے ہماری اِس وقت تک نسلِ انسان کی عمر چھ ہزار برس تک ختم ہو چکی ہے اور اب ہم ساتویں ہزار میں ہیں اور یہ ضرور تھا کہ مثیلِ آدم جس کو دوسرے لفظوں میں مسیح موعود کہتے ہیں چھٹے ہزار کے آخر میں پیدا ہو جو جمعہ کے دن کے قائم مقام ہے جس میں آدم پیدا ہؤا اور ایسا ہی خدا نے مجھے پیدا کیا پس اس کے مطابق چھٹے ہزار میں میری پیدائش ہوئی اور یہ عجیب اتفاق ہؤا کہ مَیں معمولی دنوں کی رُو سے جمعہ کے دن پیدا ہؤا تھا اور جیسا کہ آدم نر اور مادہ پیدا ہوئے تھے مَیں بھی توام کی شکل پر پیدا ہؤا تھا۔ ایک میرے ساتھ لڑکی تھی جو پہلے پیدا ہوئی اور بعد اس کے مَیں

---

[1] سورۃ الحج : ۴۸

پَیدا ہُوا۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۵،۲۶)

سورۃ والعصر میں دوؔ سلسلوں کا ذکر فرمایا ہے ایک ابرار و اخیار کا سلسلہ ہے اور دوسرا فجار کا۔ کفار اور فجار کے سلسلہ کا ذکر یُوں فرمایا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اور دوسرے سلسلہ کو اِس طرح پر الگ کیا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یعنی ایک وہ ہیں جو خسران میں ہیں مگر خسران میں مومن اور عمل صالح کرنے والے نہیں۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ خسران میں وہ ہیں جو مومن اور عمل صالح کرنے والے نہیں ہیں۔ یاد رکھو کہ صلاح کا لفظ وہاں آتا ہے جہاں فساد کا بالکل نام و نشان نہ رہے۔ انسان کبھی صالح نہیں کہلا سکتا جب تک وہ عقائدِ ردّیہ اور فاسدہ سے خالی نہ ہو اور پھر اعمال بھی فساد سے خالی ہو جائیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۷؍ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۱،۲)

اِصلاح تب ہوتی ہے کہ تکمیلِ عملی کے مراتب حاصل ہو جائیں پس سورۃ العصر میں جو اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فرمایا ہے اس میں اٰمَنُوْا سے تکمیلِ علمی کی طرف اشارہ ہے اور عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے تکمیلِ عملی کی طرف رہبری کی۔ حکمت کے بھی دوؔ ہی حصّے ہیں ایک علم اکمل اور اتم ہو دوسرے عمل اتم اور اکمل ہو۔

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ خسر سے محفوظ رہتے ہیں اوّل وہ تکمیلِ علمی کرتے ہیں اور پھر عمل بھی گندے نہیں کرتے بلکہ علمی تکمیل کو عملی تکمیل تک پہنچاتے ہیں اور پھر یہ کہ جب انہیں کامل بصیرت حاصل ہو جاتی ہے اور انکے کمالِ علم کا ثبوت کمالِ عمل سے ملتا ہے تو پھر وہ بُخل نہیں کرتے بلکہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ پر عمل کرتے ہیں۔ لوگوں کو بھی اس حق کی دعوت کرتے ہیں جو انہوں نے پایا ہے۔ اِس کے یہ معنی بھی ہیں کہ اعمال کی روشنی سے بھی دکھاتے ہیں۔ واعظ اگر خود عمل نہیں کرتا تو اس کی باتوں کا کچھ بھی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہ بھی قاعدہ کی بات ہے کہ اگر خود آدمی کہے اور کرے نہیں تو اس کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے اگر زنا کار زِنا سے منع کرے تو اس کی اس حالت کے ثابت ہو جانے پر سُننے والوں کے دہریہ ہو جانے کا اندیشہ ہے کیونکہ وہ خیال کریں گے کہ اگر زِنا کاری واقعی خطرناک چیز ہوتی اور خدا تعالیٰ کے حضور اس ناپاکی پر سزا ملتی ہے اور خدا واقعی ہوتا تو پھر یہ جو منع کرتا تھا خود کیوں اس سے پرہیز نہ کرتا۔

مجھے معلوم ہے کہ ایک شخص ایک مولوی کی صحبت کے باعث مسلمان ہونے لگا۔ ایک روز اُس نے دیکھا کہ وہی مولوی شراب پی رہا تھا تو اس کا دل سخت ہو گیا اور وہ رُک گیا۔ غرض تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ میں یہ فرمایا کہ وہ اپنے اعمال کی روشنی سے دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں اور پھر اُن کا شیوہ یہ ہوتا ہے تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ یعنی صبر کے ساتھ وعظ و نصیحت کا شیوہ اختیار کرتے ہیں جلدی جھاگ مُنہ پر نہیں لاتے۔ اگر کوئی مولوی اور پیش رَو ہو کر، امام اور راہنما بن کر جلدی بھڑک اُٹھتا ہے اور اس میں برداشت اور صبر کی طاقت نہیں تو وہ لوگوں کو کیوں نقصان پہنچاتا ہے۔ دوسرے یہ بھی مطلب ہے کہ جو باتیں سُننے والا صبر سے نہ سُنے وہ فائدہ نہیں اُٹھاتا۔ ہمارے مخالف

بُردباری کا دل لے کر نہیں آتے اور صبر سے اپنی مشکلات پیش نہیں کرتے بلکہ اُن کا تو یہ حال ہے کہ وہ کتاب تک تو دیکھنا نہیں چاہتے اور شور مچا کر حق کو ملتبس کرنے کی سعی کرتے ہیں اور پھر وہ فائدہ اُٹھائیں تو کیونکر اُٹھائیں۔ ابوجہل اور ابولہب میں کیا تھا؟ یہی بے صبری اور بیقراری تو تھی۔ کہتے تھے کہ خدا کی طرف سے آیا ہے تو کوئی نہر لے آ۔ اِن کم بختوں نے صبر نہ کیا اور ہلاک ہو گئے ورنہ زبیدہ والی نہر تو آ ہی گئی۔ اسی طرح پر ہمارے مخالف بھی کہتے ہیں کہ ہمارے لئے دعا کرو اور وہ مقبول ہو جائے اور پھر اس کو حق و باطل کا معیار ٹھہراتے ہیں اور اپنی طرف سے بعض امور پیش کر کے کہتے ہیں کہ یہ ہو جائے اور وہ ہو جائے تو مان لیں لیکن آپ کسی شرط کے نیچے نہیں آتے۔ افسوس یہی لوگ ہیں جو لَا يَخَافُ عُقْبٰهَا[1] کے مصداق ہیں۔ یاد رکھو صابر ہی شرح صدر کا رُتبہ پاتا ہے جو صبر نہیں کرتا وہ گویا خدا پر حکومت کرتا ہے خود اس کی حکومت میں رہنا نہیں چاہتا۔ ایسا گستاخ اور دلیر جو خدا تعالیٰ کے جلال اور عظمت سے نہیں ڈرتا وہ محروم کر دیا جاتا ہے اور اُسے کاٹ دیا جاتا ہے۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ صبر کی حقیقت میں سے یہ بھی ضروری بات ہے كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ[2] صادقوں کی صحبت میں رہنا ضروری ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جو دُور بیٹھ رہتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ کبھی آئیں گے اِس وقت فرصت نہیں ہے۔ بھلا تیرہ سَو سال کے موعود سلسلہ کو جو لوگ پالیں اور اُس کی نصرت میں شامل نہ ہوں اور خدا اور رسولؐ کے موعود کے پاس نہ بیٹھیں وہ فلاح پا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ؎

ہم خدا خواہی و ہم دُنیائے دُوں ✦ ایں خیال است و محال است و جنوں

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۱ مورخہ ۲۴ راگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۱، ۲)

وَالْعَصْرِ..... بِالصَّبْرِ الخ قسم ہے اس زمانہ کی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی۔ آجکل ہمارے زمانہ کے کوتاہ اندیش مخالف یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن شریف میں مخلوق کی قسمیں کیوں کھائی گئی ہیں حالانکہ دوسروں کو منع کیا ہے اور کہیں انجیر کی قسم ہے کہیں دن اور رات کی اور کہیں زمین کی اور کہیں نفس کی؟ اِس قسم کے اعتراضوں کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ تمام قرآن شریف میں یہ ایک عام سُنّت اور عادتِ الٰہی ہے کہ وہ بعض نظری امور کے اثبات و احقاق کے لئے کسی ایسے امور کا حوالہ دیتا ہے جو اپنے خواص کا عام طور پر بیّن اور کُھلا کُھلا اور بدیہی ثبوت رکھتے ہیں پس اُن کی قسم کھانا اُن کو بطور دلیل اور نظیر کے پیش کرنا ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ رمئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

سورۃ العصر میں دُنیا کی تاریخ موجود ہے جس پر خدا تعالیٰ نے اپنے الہام سے مجھ کو اطلاع دی ہے اور

---

[1] سورۃ الشمس: ۱۶ [2] سورۃ التوبۃ: ۱۱۹

یہ اصلی اور سچی تاریخ ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک کس قدر زمانہ گذرا ہے۔ پس اِس حساب سے اب ساتویں ہزار سے کچھ سال گذر گئے اور خاتم الخلفاء چھٹے ہزار کے آخر میں پیدا ہؤا تاکہ اوّل رابآخر نسبتے دارد کا مصداق ہو۔ آدم بھی چھٹے دن پیدا ہؤا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک دن ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اِس چھ دن کے چھ ہزار سال ہوئے اور پھر آدم کی پیدائش چھٹے دن کے آخر میں ہوئی تھی اِس لئے خاتم الخلفاء چھٹے ہزار کے آخر میں ہؤا اور ساتویں میں جنگ ہے۔ اِس جنگ سے توپ وتفنگ کی لڑائی مراد نہیں بلکہ یہ عیسائیت اور الٰہی دین کی آخری جنگ ہے۔ عیسائیت نے زمینی خدا بنالیا ہے اور یہ وہی خدا یا خیالی خدا ہے جیسے بہت سی عورتیں ایک وہمی حمل رچا کا کرلیتی ہیں یہاں تک کہ پیٹ میں وہمی طور پر حرکت بھی معلوم ہوتی ہے اور پیٹ بڑھتا بھی ہے۔ اِسی طرح پر فرضی مسیح بنالیا گیا ہے جسے خدا سمجھا گیا ہے۔ غرض سچے مسیح کے مقابل وہ کھڑا ہے۔ اَب یہ لڑائی ان دونوں میں شروع ہے اور خدا اِس میں اپنا چمکتا ہؤا ہاتھ دکھلائے گا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ۔ ان کی عادت ہے کہ اَوروں کو بھی سچ کی نصیحت دیتے ہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۷۴)

اِنسان کا فرض ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچائے اور اس کی صورت یہ ہے اُن کو خدا کی محبت پیدا کرنے اور اس کی توحید پر قائم ہونے کی ہدایت کرے جیسا کہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ سے پایا جاتا ہے۔ انسان بعض وقت خود ایک امر کو سمجھ لیتا ہے لیکن دوسروں کو سمجھانے پر قادر نہیں ہوتا اِس لئے اُس کو چاہیئے کہ محنت اور کوشش کرکے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاوے۔ ہمدردی خلائق یہی ہے کہ محنت کرکے دماغ خرچ کرکے ایسی راہ نکالے کہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکے تاکہ عمر دراز ہو۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

سُوْرَۃُ الْهُمَزَۃِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۝

بیان: نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ۝ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ۝

دوزخی ہونے کی حالت میں اعلیٰ درجہ کے کفار ہوتے ہیں قبل اس کے کہ جو کامل طور پر دوزخ میں پڑیں اُن کے دلوں پر دوزخ کی آگ بھڑکائی جاتی ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ۝ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ۝ (ازالہ اوہام صفحہ ۳۵۹، ۳۶۰)

جہنم کیا چیز ہے۔ وہ خدا کے غضب کی آگ ہے جو دلوں پر پڑے گی یعنی وہ دل جو بد اعمالی اور بداعتقادی کی آگ اپنے اندر رکھتے ہیں وہ غضبِ الٰہی کی آگ سے اپنے آگ کے شعلوں کو مشتعل کریں گے تب یہ دونوں قسم کی آگ باہم مل کر ایسا ہی اُن کو بھسم کرے گی جیسا کہ صاعقہ گرنے سے انسان بھسم ہو جاتا ہے پس نجات وہی پائے گا جو بداعتقادی اور بدعملی کی آگ سے دُور رہے گا۔ (ست بچن صفحہ ۱۴۳)

دوزخ وہ آگ ہے جو خدا کا غضب اس کا منبع ہے اور گناہ سے بھڑکتی ہے اور پہلے دِل پر غالب ہوتی ہے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس آگ کی اصل جڑھ وہ غم اور حسرتیں اور درد ہیں جو دل کو پکڑتے ہیں کیونکہ تمام رُوحانی عذاب پہلے دل سے ہی شروع ہوتے ہیں اور پھر تمام بدن پر محیط ہو جاتے ہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۷۹)

خدا کا عذاب ایک عذاب ہے جس کو خدا بھڑکاتا ہے اور پہلا شعلہ اس کا انسان کے اپنے دِل پر سے ہی اُٹھتا ہے یعنی جڑ اس کی انسان کا اپنا ہی دِل ہے اور دِل کے ناپاک خیالات اس جہنم کے ہیزم ہیں۔ پس جبکہ عذاب کا اصل تخم اپنے وجود کی ہی ناپاکی ہے جو عذاب کی صورت پر متمثل ہوتی ہے تو اس سے ماننا پڑتا ہے کہ وہ چیز جو اس عذاب کو دُور کرتی ہے وہ راستبازی اور پاکیزگی ہے۔ (کتاب البریّہ صفحہ ۵۸)

دوزخ کیا چیز ہے۔ دوزخ وہ آگ ہے جو دلوں پر بھڑکائی جاتی ہے یعنی انسان جب فاسد خیال اپنے دِل میں پیدا کرتا ہے اور وہ ایسا خیال ہوتا ہے کہ جس کمال کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے وہ اس کے مخالف ہوتا ہے تو جیسا کہ ایک بھوکا یا پیاسا بوجہ نہ ملنے غذا اور پانی کے آخر مَر جاتا ہے ایسا ہی وہ شخص بھی جو فساد میں مشغول رہا اور خدا تعالیٰ کی محبت اور اطاعت کی غذا اور پانی کو نہ پایا وہ بھی مَر جاتا ہے پس بموجب تعلیم قرآن شریف کے بندہ ہلاکت کا سامان اپنے لئے آپ تیار کرتا ہے خدا اس پر کوئی جبر نہیں کرتا۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی اپنے حُجرہ کے تمام دروازے بند کر دے اور روشنی داخل ہونے کے لئے کوئی کھڑکی کُھلی نہ رکھے تو اس میں شک نہیں کہ اس کے حُجرہ کے اندر اندھیرا ہو جائے گا۔ سو کھڑکیوں کا بند کرنا تو اُس شخص کا فعل ہے مگر اندھیرا کر دینا یہ خدا تعالیٰ کا فعل اُس کے قانونِ قدرت کے موافق ہے۔ پس اِسی طرح جب کوئی شخص خرابی اور گناہ کا کام کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اپنے قانونِ قدرت کی رُو سے اس کے اس فعل کے بعد کوئی اپنا فعل ظاہر کر دیتا ہے جو اس کی سزا ہو جاتا ہے لیکن بایں ہمہ توبہ کا دروازہ بند نہیں کرتا۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۵۴)

مَیں نے بعض آدمیوں کو دیکھا اور اکثروں کے حالات پڑھے ہیں جو دُنیا میں مال و دولت اور دُنیا کی جھوٹی لذتیں اور ہر ایک قسم کی نعمتیں اُولاد احفاد رکھتے تھے۔ جب مَرنے لگے اور اُن کو اِس دُنیا کے چھوڑ جانے اور ساتھ ہی اُن اشیاء سے الگ ہونے اور دوسرے عالَم میں جانے کا عِلم ہُوا تو اُن پر حسرتوں اور بے جا آرزوؤں کی آگ بھڑکی اور سرد آہیں مارنے لگے۔ پس یہ بھی ایک قِسم کا جہنم ہے جو انسان کے دل کو راحت اور قرار نہیں دے سکتا بلکہ اس کو گھبراہٹ اور بیقراری کے عالَم میں ڈال دیتا ہے اِس لئے یہ امر بھی میرے دوستوں کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہنا چاہیئے کہ اکثر اَوقات انسان اہل و عیال اور اموال کی محبت ہاں ناجائز اور بے جا محبت میں ایسا محو ہو جاتا ہے اور اکثر اَوقات اُسی محبت کے جوش اور نشہ میں ایسے ناجائز کام کر گزرتا ہے جو اُس میں اور خدائے تعالیٰ میں ایک حجاب پَیدا کر دیتے ہیں اور اُس کے لئے ایک دوزخ تیار کر دیتے ہیں۔ اُس کو اِس بات کا علم نہیں ہوتا جب وہ اُن سب سے یکایک علیحدہ کیا جاتا ہے۔ اس گھڑی کی اُسے خبر نہیں ہوتی۔ تب وہ ایک سخت بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ کسی چیز سے جب محبت ہو تو اُس سے جُدائی اور علیحدگی پر ایک رنج اور دردناک غم پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اب منقولی ہی نہیں بلکہ معقولی رنگ رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ پس یہ وہی غیر اللہ کی محبت کی آگ ہے جو انسانی دل کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور ایک حیرت ناک عذاب اور درد میں مبتلا کر دیتی ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۳۵)

میرے دوستوں کی نظر سے یہ امر ہرگز پوشیدہ نہ رہے کہ انسان مال و دَولت یا زَن و فرزند کی محبت کے

جوش اور نشے میں ایسا دیوانہ اور از خود رفتہ نہ ہو جاوے کہ اُس میں اور خدا تعالیٰ میں ایک حجاب پیدا ہو جاوے
مال اور اولاد اِسی لئے تو فتنہ کہلاتی ہے اُن سے بھی انسان کے لئے ایک دوزخ تیار ہوتا ہے اور جب وہ اُن
سے الگ کیا جاتا ہے تو سخت بے چینی اور گھبراہٹ ظاہر کرتا ہے اور اِس طرح پر یہ بات کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ
الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ منقولی رنگ میں نہیں رہتی بلکہ معقولی شکل اختیار کر لیتی ہے پس یہ آگ جو انسانی دِل کو
جلا کر کباب کر دیتی ہے اور ایک جلے ہوئے کوئلے سے بھی سیاہ اور تاریک بنا دیتی ہے یہ وہی غیر اللہ کی محبت
ہے۔ دو چیزوں کے باہم تعلق اور رگڑ سے ایک حرارت پیدا ہوتی ہے اسی طرح پر انسان کی محبت اور دُنیا اور دُنیا
کی چیزوں کی محبت کے رگڑ سے الٰہی محبت جل جاتی ہے اور دل تاریک ہو کر خدا سے دُور ہو جاتا اور ہر قسم کی
بیقراری کا شکار ہو جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۶)

جیسے بہشتی زندگی اِسی دُنیا سے شروع ہوتی ہے اسی طرح پر دوزخ کی زندگی بھی یہاں ہی سے انسان
لے جاتا ہے جیسا کہ دوزخ کے باب میں فرمایا ہے نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ یعنی
دوزخ وہ آگ ہے جو خدا کا غضب اس کا منبع ہے اور وہ گناہ سے پیدا ہوتی اور پہلے دِل پر غالب ہوتی ہے۔ اِس سے
صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آگ کی جڑ وہ ہموم غموم اور حسرتیں ہیں جو انسان کو آگھیرتی ہیں کیونکہ تمام روحانی عذاب
پہلے دل سے ہی شروع ہوتے ہیں جیسے تمام روحانی سروروں کا منبع بھی دل ہے اور دل ہی سے شروع ہونے
بھی چاہئیں کیونکہ دل ہی ایمان یا بے ایمانی کا منبع ہے۔ ایمان یا بے ایمانی کا شگوفہ بھی پہلے دل ہی سے نکلتا
ہے اور پھر تمام بدن اور اعضاء پر اس کا عمل ہوتا ہے اور سارے جسم پر محیط ہو جاتا ہے۔ پس یاد رکھو کہ بہشت
اور دوزخ اِسی دُنیا سے اِنسان ساتھ لے جاتا ہے اور یہ بات بھولنی نہ چاہیئے کہ بہشت اور دوزخ اِس جسمانی دُنیا
کی طرح نہیں بلکہ ان دونوں کا منبع روحانی امور ہیں۔ ہاں یہ سچی بات ہے کہ عالمِ معاد میں وہ جسمانی شکل پر ضرور
متشکل ہو کر نظر آئیں گے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

کوئی عذاب باہر سے نہیں آتا بلکہ خود انسان کے اندر ہی سے نکلتا ہے۔ ہم کو اِس سے انکار نہیں کہ عذاب خدا
کا فعل ہے۔ بے شک اس کا فعل ہے مگر اسی طرح جیسے کوئی زہر کھائے تو خدا اُسے ہلاک کر دے۔ پس خدا کا
فعل انسان کے اپنے فعل کے بعد ہوتا ہے۔ اِسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ اشارہ فرماتا ہے نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ
الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ یعنی خدا کا عذاب وہ آگ ہے جس کو خدا بھڑکاتا ہے اور اس کا شعلہ انسان کے
دِل سے ہی اُٹھتا ہے۔ اس کا مطلب صاف لفظوں میں یہی ہے کہ عذاب کا اصل بیج اپنے وجود ہی کی ناپاکی ہے
جو عذاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

اللہ تعالیٰ کا عذاب ایک آگ ہے جس کو وہ بھڑکاتا ہے اور انسان کے دل ہی پر اس کا شعلہ بھڑکتا ہے۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ عذابِ الٰہی اور جہنّم کی اصل جڑ انسان کا اپنا ہی دل ہے اور دل کے ناپاک خیالات اور گندے ارادے اور عزم اس جہنّم کا ایندھن ہیں۔ (الحکم جلد ۶ ۱۲ مورخہ ۲۴۔ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

دعا کی حقیقت سے ناواقف رہنے کی صورت میں ذرا ذراسی نامرادی بھی آتشِ جہنّم کی ایک لپٹ ہوکر دل پر مستولی ہوجاتی ہے اور گھبرا گھبرا کر بیقرار کئے دیتی ہے۔ اِسی کی طرف ہی اشارہ ہے نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـِٕدَةِ ۝ بلکہ حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ تپ بھی نارِ جہنّم کا ایک نمونہ ہے۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ ۱ صفحہ ۱۴)

(ٹریکٹ ۱ "حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدت الوجود پر ایک خط" صفحہ ۱۸ مرتبہ شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی)

سورۃ الفیل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ۝

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک سُورت بھیج کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عُلو اور مرتبہ ظاہر کیا ہے اور وہ سُورت ہے اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ۔ یہ سُورت اس حالت کی ہے کہ جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مصائب اور دُکھ اُٹھا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ اِس حالت میں آپؐ کو تسلی دیتا ہے کہ مَیں تیرا مؤید و ناصر ہوں۔ اِس میں ایک عظیم الشان پیشگوئی ہے کہ کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے اصحاب الفیل کے ساتھ کیا کیا۔ یعنی اُن کا مکر اُلٹا کر ان پر ہی مارا اور چھوٹے چھوٹے جانور ان کے مارنے کے لئے بھیج دئے۔ ان جانوروں کے ہاتھوں میں کوئی بندوقیں نہ تھیں بلکہ مٹی تھی۔ سجّیل بھیگی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں۔ اِس سورۃ شریف میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خانہ کعبہ قرار دیا ہے اور اصحاب الفیل کے واقعہ کو پیش کر کے آپ کی کامیابی اور تائید اور نصرت کی پیشگوئی کی ہے۔

یعنی آپ کی ساری کارروائی کو برباد کرنے کے لئے جو سامان کرتے ہیں اور تدابیر عمل میں لاتے ہیں اُن کے تباہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اُن کی ہی تدبیروں کو اور کوششوں کو اُلٹا کر دیتا ہے کسی بڑے سامان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے ہاتھی والوں کو چڑیوں نے تباہ کر دیا ایسا ہی یہ پیشگوئی قیامت تک جائے گی جب کبھی اصحاب الفیل پیدا ہو گا تب ہی اللہ تعالیٰ اُن کے تباہ کرنے کے لئے اُن کی کوششوں کو خاک میں ملا دینے کے سامان کر دیتا ہے۔

پادریوں کا اصول یہی ہے۔ اُن کی چھاتی پر اسلام ہی پتھر ہے ورنہ باقی تمام مذاہب اُن کے نزدیک نامرد ہیں ہندو بھی عیسائی ہو کر اسلام کے ہی رَدّ میں کتابیں لکھتے ہیں۔ رام چندر اور ٹھاکر داس نے اسلام کی تردید میں اپنا سارا زور لگا کر کتابیں لکھی ہیں۔ بات یہ ہے کہ اُن کا کانشنس کہتا ہے کہ اُن کی ہلاکت اِسلام ہی سے ہے طبعی طور پر

خوف ان کا ہی پڑتا ہے جن کے ذریعہ ہلاکت ہوتی ہے۔ایک مُرغی کا بچہ بِلّی کو دیکھتے ہی چلانے لگتا ہے اِسی طرح پر مختلف مذاہب کے پَیرو عموماً اور پادری خصوصاً جو اسلام کی تردید میں زور لگا رہے ہیں یہ اِسی لئے ہے کہ اُن کو یقین ہے بلکہ اندر ہی اندر ان کا دِل اُن کو بتاتا ہے کہ اسلام ہی ایک مذہب ہے جو مِلَلِ باطلہ کو پیس ڈالے گا۔

اِس وقت اصحاب الفیل کی شکل میں حملہ کیا گیا ہے مسلمانوں میں بہت کمزوریاں ہیں۔ اِسلام غریب ہے۔ اور اصحاب الفیل زور میں ہیں مگر اللہ تعالیٰ وہی نمونہ پھر دکھانا چاہتا ہے۔چڑیوں سے وہی کام لے گا۔ہماری جماعت ان کے مقابلہ میں کیا ہے۔اُن کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔اُن کے اِتفاق اور طاقت اور دولت کے سامنے نام بھی نہیں رکھتے لیکن ہم اصحاب الفیل کا واقعہ سامنے دیکھتے ہیں کہ کیسی تسلّی کی آیات نازل فرمائی ہیں۔

مجھے یہی الہام ہُوا ہے جس سے صاف صاف پایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی نصرت اور تائید اپنا کام کر کے رہیگی۔ ہاں اُس پر وہی یقین رکھتے ہیں جن کو قرآن سے محبت ہے جسے قرآن سے محبت نہیں وہ ان باتوں کی کب پرواہ کر سکتا ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

تُو نے دیکھ لیا یعنی تُو ضرور دیکھے گا کہ اصحاب الفیل یعنی وہ جو بڑے حملے والے ہیں اور جو آئے دن تیرے پر حملہ کرتے ہیں اور جیسا کہ اصحاب الفیل نے خانہ کعبہ کو نابود کرنا چاہا تھا وہ تجھے نابود کرنا چاہتے ہیں ان کا انجام کیا ہوگا؟ یعنی ان کا وہی انجام ہوگا جو اصحاب الفیل کا ہُوا۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۱۲۹)

ایک دوست نے حج کے موقع پر ناقابلِ برداشت تکالیف کا ذکر فرمایا اور بتایا کہ اِس سال حاجیوں کو اِس قدر تکالیف کا سامنا کرنا پڑا کہ معلوم ہوتا تھا شاید حج بالکل بند ہو جائے۔رستہ میں پرلے درجہ کی بَدامنی تھی اور طامع اور حریص کارکنوں نے اپنے فائدہ کی خاطر ہزاروں افراد کی پرواہ نہ کی۔

اِس پر حضور نے فرمایا:۔

ہم آپ کو ایک نصیحت کرتے ہیں۔ایسا ہو کہ ان تمام امورِ تکالیف سے آپ کی قوّتِ ایمانی میں کسی قسم کا فرق اور تزلزل نہ آوے۔ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اِبتلاء ہے اس سے پاک عقائد پر اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔اِن باتوں سے اُس متبرک مقام کی عظمت دلوں میں کم نہ ہونی چاہیئے کیونکہ اس سے بدتر ایک زمانہ گذرا ہے کہ یہی مقدس مقام نجس مُشرکوں کے قبضہ میں تھا اور انہوں نے اُسے بُت خانہ بنا رکھا تھا بلکہ یہ تمام مشکلات اور مصائب خوش آئند زمانے اور زندگی کے درجات ہیں۔ دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پہلے بھی زمانہ کی حالت خطرناک ہو گئی تھی اور کُفر وشرک اور فساد اور ناپاکی حد سے بڑھ گئے تھے تو اِس ظلمت کے بعد بھی ایک نور دُنیا میں ظاہر ہُوا تھا اسی طرح اب بھی اُمید کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ان مشکلات کے بعد کوئی بہتری کے سامان بھی پیدا کر دے گا اور خدا تعالیٰ کوئی سامانِ اصلاح پیدا کر دے گا بلکہ اسی متبرک اور

مقدس مقام پر ایک اور بھی ایسا ہی خطرناک وقت گذر چکا تھا جس کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے توجہ دلائی تھی۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ الخ۔

غرض یہ اَب تیسرا واقعہ ہے اِس کی طرف بھی اللہ تعالیٰ ضرور توجہ کرے گا اور خدا کا توجہ کرنا پھر قہری رنگ میں ہی ہوگا۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۹ مورخہ ۲۲؍ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ اوّل)

سُورۃ قریش

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ○ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ○ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ○ الَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ۬ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ○

(نوٹ از ایڈیٹر) عرب صاحب نے اِدھر اُدھر غیر آبادی کو دیکھ کر عرض کی کہ یہ صرف حضور ہی کا دَم ہے کہ جس کی خاطر اِس قدر اَنبوہ ہے ورنہ اِس غیر آباد جگہ میں کون اور کب آتا ہے۔ (حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے سُنکر) فرمایا کہ :-

اِس کی مثال مکّہ کی ہے کہ وہاں بھی عرب لوگ دُور دراز جگہوں سے جاکر مال وغیرہ لاتے تھے اور وہاں بیٹھ کر کھاتے تھے اس کی طرف اشارہ ہے اِس سُورۃ میں لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ○ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ○ الخ۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴ مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۶)

سُورۃ الماعُون

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ ھُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ سَاھُوۡنَ ۝

کیا وجہ ہے کہ بعض لوگ تیس تیس برس تک برابر نماز پڑھتے ہیں پھر کورے کے کورے ہی رہتے ہیں کوئی اثر روحانیت اور خشوع وخضوع کا ان میں پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا یہی سبب ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں جس پر خدا تعالےٰ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی نمازوں کے لئے ویل آیا ہے۔ دیکھو جس کے پاس اعلیٰ درجہ کا جوہر ہو تو کیا کوڑیوں اور پیسوں کے لئے اُسے پھینک دینا چاہیئے۔ ہرگز نہیں۔ اوّل اس جوہر کی حفاظت کا اہتمام کرے اور پھر پیسوں کو بھی سنبھالے۔ اِس لئے نماز کو سنوار سنوار اور سمجھ سمجھ کر پڑھے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۸ مورخہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

بعض نمازیوں پر خدا تعالیٰ نے لعنت بھیجی ہے جیسے فرماتا ہے فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ۔ وَیۡل کے معنے لعنت کے بھی ہوتے ہیں پس چاہیئے کہ ادائیگی نماز میں انسان سُست نہ ہو اور نہ غافل ہو۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۳ مورخہ ۱۶ر نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳۴)

جو خدا کے لئے نماز نہیں پڑھتے اُن کو وَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ فرمایا..... امر کی بجا آوری سے ثواب ہوتا ہے لیکن اگر ریاکاری سے نماز ادا کرے تو پھر اس کے لئے وَیل ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۹)

جس نماز میں دِل کہیں ہے اور خیال کسی طرف ہے اور مُنہ سے کچھ نکلتا ہے وہ ایک لعنت ہے جو آدمی

کے مُنہ پر واپس ماری جاتی ہے اور قبول نہیں ہوتی۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ o لعنت ہے ان پر جو اپنی نماز کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ نماز وہی اصلی ہے جس میں مزا آجاوے۔ ایسی ہی نماز کے ذریعہ سے گناہ سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور یہی وہ نماز ہے جس کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ نماز مومن کا معراج ہے۔ نماز مومن کے واسطے ترقی کا ذریعہ ہے۔

(بدر جلد ۲ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

وہ لوگ جو نمازوں کی حقیقت سے ہی بے خبر ہوتے ہیں ان کی نمازیں زری ٹکریں ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ ایک سجدہ اگر خدا تعالیٰ کو کرتے ہیں تو دوسرا دُنیا کو کرتے ہیں۔ جب تک انسان خدا کے لئے تکالیف اور مصائب کو برداشت نہیں کرتا تب تک مقبول حضرتِ احدیت نہیں ہوتا۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱)

نماز ایسی چیز ہے کہ اس سے دُنیا بھی سنور جاتی ہے اور دین بھی لیکن اکثر لوگ جو نماز پڑھتے ہیں تو وہ نماز اُن پر لعنت بھیجتی ہے جیسے فرمایا فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ o یعنی لعنت ہے اُن نمازیوں پر جو نماز کی حقیقت سے ہی بے خبر ہوتے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

خدا کا یہی منشاء ہے کہ لفظی اور زبانی مسلمانوں کو حقیقی مسلمان بنایا جاوے۔ یہودی کیا توریت پر ایمان نہیں لاتے تھے؟ قربانیاں نہ کرتے تھے؟ مگر خدا تعالیٰ نے ان پر لعنت بھیجی اور کہا کہ تم مومن نہیں ہو۔ بلکہ بعض نمازیوں کی نماز پر بھی لعنت بھیجی ہے۔ وَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ o یعنی لعنت ہے ایسے نمازیوں پر جو نماز کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ صَلوٰۃ اصل میں آگ میں پڑنے اور محبتِ الٰہی اور خوفِ الٰہی کی آگ میں پڑ کر اپنے آپ سے جل جانے اور ماسوی اللہ کو جلا دینے کا نام ہے اور اس حالت کا نام ہے کہ صرف خدا ہی خدا اس کی نظر میں رہ جاوے اور انسان اس حالت تک ترقی کر جاوے کہ خدا کے بُلانے سے بولے اور خدا کے چلانے سے چلے۔ اس کے کُل حرکات اور سکنات اس کا فعل اور ترکِ فعل سب اللہ ہی کی مرضی کے مطابق ہو جاوے خودی دُور ہو جاوے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۸ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

نماز کو رسم اور عادت کے رنگ میں پڑھنا مفید نہیں بلکہ ایسے نمازیوں پر تو خود خدا تعالیٰ نے لعنت اور وَیل بھیجا ہے چہ جائیکہ ان کی نماز کو قبولیت کا شرف حاصل ہو۔ وَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ خود خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ یہ اُن نمازیوں کے حق میں ہے جو نماز کی حقیقت سے اور اس کے مطالب سے بے خبر ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۰)

..... لعنت ہے اُن نمازیوں پر جو اپنی صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں پس فلاح وہی پاتا ہے اور وہی سچا مومن کہلاتا ہے جو نیکی کو اس کے لوازم کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ بات اِس زمانہ میں بہت کم لوگوں میں موجود ہے۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۲۳ مورخہ ۱۱ر جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

ان نمازیوں کی تباہی جو نماز کی حقیقت سے بے خبر ہیں پس نماز کے ماثورہ کلام کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ صحابہؓ تو عرب کے رہنے والے تھے ان کو ضرورت نہ تھی مگر ہمارے لئے ضروری ہے کہ اسے سمجھ کر نمازوں میں حلاوت پیدا کریں۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۵ر جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

..... مفہوم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے بعد نماز کی طرف توجہ کرو جس کی پابندی کے واسطے بار بار قرآن شریف میں تاکید کی گئی ہے لیکن ساتھ ہی اس کے یہ فرمایا گیا ہے کہ وَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ ویل ہے اُن نمازیوں کے واسطے جو کہ نماز کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ سو سمجھنا چاہیئے کہ نماز ایک سوال ہے جو کہ انسان جُدائی کے وقت درد اور حرقت کے ساتھ اپنے خدا کے حضور کرتا ہے کہ اس کو لقا اور وصال ہو کیونکہ جب تک خدا کسی کو پاک نہ کرے کوئی پاک نہیں ہو سکتا اور جب تک وہ خود وصال عطا نہ کرے کوئی وصال کو حاصل نہیں کر سکتا۔ طرح طرح کے طوق اور قسماقسم کے زنجیر انسان کے گردن میں پڑے ہوتے ہیں اور وہ بہتیرا چاہتا ہے کہ دُور ہو جاویں پر وہ دُور نہیں ہوتے۔ باوجود اِس خواہش کے کہ وہ پاک ہو جاوے نفس لوّامہ کی لغزشیں ہو ہی جاتی ہیں۔ گناہوں سے پاک کرنا خدا کا کام ہے اس کے سوائے کوئی طاقت نہیں جو زور کے ساتھ تمہیں پاک کر دے۔ پاک جذبات کے پیدا کرنے کے واسطے خدا تعالیٰ نے نماز رکھی ہے۔ نماز کیا ہے۔ ایک دعا جو دَرد، سوزش اور حرقت کے ساتھ خدا تعالیٰ سے طلب کی جاتی ہے تاکہ یہ بَدخیالات اور بُرے ارادے دفع ہو جاویں اور پاک محبت اور پاک تعلق حاصل ہو جائے اور خدا تعالیٰ کے احکام کے ماتحت چلنا نصیب ہو۔ صلوٰۃ کا لفظ اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دعا صرف زبان سے نہیں بلکہ اس کے ساتھ سوزش اور جلن اور رِقّت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۲ مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۲)

۷ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۙ

عُجب اور ریا بہت مُہلک چیزیں ہیں اِن سے اِنسان کو بچنا چاہیئے۔ اِنسان ایک عمل کر کے لوگوں کی مدح کا خواہاں ہوتا ہے۔ بظاہر وہ عمل عبادت وغیرہ کی صورت میں ہوتا ہے جس سے خدا تعالیٰ راضی ہو مگر نفس کے اندر ایک خواہش پنہاں ہوتی ہے کہ فلاں فلاں لوگ مجھے اچھا کہیں۔ اِس کا نام رِیا ہے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۹ مورخہ یکم مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

سورۃ الکوثر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

بیان فرمودہ اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ۝ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَ انۡحَرۡ۝ اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ۝

ہم نے تجھ کو معارفِ کثیرہ عطا فرمائے ہیں سو اس کے شکر میں نماز پڑھ اور قربانی دے۔

(براہینِ احمدیہ صفحہ ۵۱۷ حاشیہ)

یہ جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو فرمایا اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ یہ اُس وقت کی بات ہے کہ ایک کافر نے کہا کہ آپؐ کی اولاد نہیں ہے۔ معلوم نہیں اُس نے اَبتر کا لفظ بولا تھا جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ تیرا دشمن ہی بے اَولاد رہے گا۔

روحانی طور پر جو لوگ آئیں گے وہ آپؐ ہی کی اَولاد سمجھے جائیں گے اور وہ آپؐ کے علوم و برکات کے وارث ہوں گے اور اس سے حصہ پائیں گے۔ اِس آیت کو مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِکُمۡ وَ لٰکِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ[1] کے ساتھ ملا کر پڑھو تو حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحانی اولاد بھی نہیں تھی تو پھر معاذ اللہ آپ اَبتر ٹھہرتے ہیں جو آپ کے اعداء کے لئے ہے اور اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو روحانی اَولاد کثیر دی گئی ہے پس اگر ہم یہ اعتقاد نہ رکھیں گے کہ کثرت کے ساتھ آپؐ کی روحانی اولاد ہوئی ہے تو اس پیشگوئی کے بھی منکر ٹھہریں گے۔

---

[1] سُورۃ الاحزاب : ۴۱

اِس لئے ہر حالت میں ایک سچے مسلمان کو یہ ماننا پڑے گا اور ماننا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاثیراتِ قدسی ابدالآباد کے لئے ویسی ہی ہیں جیسی تیرہ سو برس پہلے تھیں چنانچہ ان تاثیرات کے ثبوت کے لئے ہی خدا تعالیٰ نے یہ سلسلہ قائم کیا ہے اور اب وہی آیات و برکات ظاہر ہو رہے ہیں جو اُس وقت ہو رہے تھے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ رمئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

اگر یہ مانا جائے جیساکہ ہمارے مخالف کہتے ہیں کہ آپ کا نہ کوئی جسمانی بیٹا تھا نہ روحانی۔ تو پھر اس طرح پر معاذ اللہ یہ لوگ آپ کو اَبتر ٹھہراتے ہیں مگر ایسا نہیں۔ آپ کی شان تو یہ ہے کہ اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَؕ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡؕ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

اگر آپ کا سلسلہ آپ سے ہی شروع ہو کر آپ ہی پر ختم ہوگیا تو آپ اَبتر ٹھہریں گے (معاذ اللہ) حالانکہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرماتا ہے اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ یعنی تجھے تو ہم نے کثرت کے ساتھ روحانی اولاد عطا کی ہے جو تجھے بے اُولاد کہتا ہے وہی اَبتر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسمانی فرزند تو کوئی تھا نہیں۔ اگر رُوحانی طور پر بھی آپ کی اولاد کوئی نہیں تو ایسا شخص خود بتاؤ کیا کہلاوے گا؟ مَیں تو اس کو سب سے بڑھ کر بے ایمانی اور کفر سمجھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اِس قسم کا خیال بھی کیا جاوے۔ اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ کسی دوسرے نبی کو نہیں کہا گیا یہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا خاصہ ہے۔ آپ کو اِس قدر روحانی اولاد عطا کی گئی جس کا شمار بھی نہیں ہو سکتا اِس لئے قیامت تک یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ روحانی اولاد ہی کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ نبی ہیں کیونکہ آپ کے انوار و برکات کا سلسلہ برابر جاری ہے اور جیسے اُولاد میں والدین کے نقوش ہوتے ہیں اسی طرح روحانی اولاد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات اور فیوض کے آثار اور نشانات موجود ہیں۔ اَلۡوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِيۡهِ۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

فَلَا شَكَّ اَنَّهٗ اٰدَمُ اٰخِرِ الزَّمَانِ وَالۡاُمَّةُ كَالذُّرِّيَّةِ لِهٰذَا النَّبِيِّ الۡمَحۡمُوۡدِ ط وَاِلَيۡهِ اَشَارَ فِيۡ قَوۡلِهٖ اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ ؕ فَاَمۡعِنۡ فِيۡهِ وَتَفَكَّرۡ وَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡغَافِلِيۡنَ ۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۷۳)

اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ میں ایک بروزی وجود کا وعدہ دیا گیا جس کے زمانہ میں کوثر ظہور میں آئے گا یعنی

ترجمہ از اصل:۔ پس شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخر زمانہ کے آدم ہیں اور امت اس نبی محمود کی ذریّت کی بجا ہے اور اس کی طرف خدا تعالیٰ کے اِس قول کا اشارہ ہے اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ۔ پس اِن معنوں میں غور اور فکر کر اور غافلوں میں سے مت ہو۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۷۳)

دینی برکات کے چشمے بہ نکلیں گے اور بکثرت دُنیا میں سچے اہلِ اسلام ہو جائیں گے۔ اِس آیت میں بھی ظاہری اولاد کی ضرورت کو نظرِ تحقیر سے دیکھا اور بروزی اولاد کی پیشگوئی کی گئی۔

(تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۴۴)

محاوراتِ عرب کو بالاستقصاء دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اَبتر کے لفظ میں یہ شرط نہیں ہے کہ کوئی شخص صاحبِ اولاد اس حالت میں مَرے کہ جب اس کی زندگی میں اس کی اولاد فوت ہو جائے بلکہ نسل کی جڑھ کٹ جانا شرط ہے جیسا کہ بتر کے معنے لُغتِ عرب میں یہ لکھے ہیں کہ اَلْبَتْرُ اِسْتِئْصَالُ الشَّئِ قَطْعًا یعنی بتر کہتے ہیں کسی چیز کو جڑھ سے کاٹ دینے کو..... اِس پیشگوئی کے لئے ضروری نہیں کہ اس کی زندگی میں ہی وہ تمام نسل مرجائے کیونکہ اگر یہی شرط ہو تو پھر ایسی صورت میں ایسی قطع نسل کا کیا نام رکھنا چاہیئے کہ ایک انسان ایک یا دو ولد چھوڑ کر مَر جائے اور بعد اس کے کسی وقت وہ لڑکے بھی مَر جائیں اور کچھ نسل باقی نہ رہے۔ کیا عرب کے محاورات میں بجز اَبتر کے لفظ کے ایسی صورت میں کوئی اَور لفظ بھی موجود ہے اور کیا یہ کہنا جائز ہوگا کہ ایسا شخص منقطع النسل نہیں اور لفظ اِسْتِئْصَالُ الشَّئِ قَطْعًا اُس پر لازم نہیں آتا۔ پس ظاہر ہے کہ ایسا خیال حماقت اور دیوانگی ہے اور زبانِ عرب میں اِس قسم کے قطعِ نسل کے لئے بجز لفظ اَبْتَرْ کے اَور کوئی لفظ مقرر نہیں۔ اہلِ عرب اُس شخص کو بہرحال اَبتر ہی کہتے ہیں جس کی اولاد اُس کی زندگی میں یا بعد اس کے اپنی موت کی وجہ سے اُس کو لاولد کے نام سے موسوم کرے بلکہ ہر ایک ملک میں ایسے شخص کا نام بہرحال اَبتر ہی ہے جس کی نسل باقی نہ رہے اور منقطع النسل کر کے پکارا جائے اور ائمہ لُغتِ عرب میں سے کسی نے یہ بیان نہیں کیا کہ اَبتر ہونے کیلئے لازمی طور پر یہ شرط ہے کہ ایک شخص کے اولاد ہو کر اس کی زندگی میں ہی مَر جائے اور اگر کسی کی اولاد اس کی زندگی میں فوت نہ ہو مگر اس کے مَرنے کے بعد فوت ہو کر قطع نسل کر دے تو کیا عرب کی زبان میں ایسے شخص کو کسی اَور نام سے موسُوم کرتے ہیں بلکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اِس لفظ کے اصل مادہ میں بہت وسعت ہے کیونکہ عربی میں بتر صرف بجڑ کاٹ دینے کو کہتے ہیں۔

واضح ہو کہ عرب کی زبان میں ابتر کا لفظ ایک وسیع لفظ ہے۔ لِسان العرب میں لکھا ہے..... بتر کہتے ہیں ایک چیز کا جڑھ سے کاٹ دینا۔ دُوسرے معنی بتر کے یہ ہیں کہ دُم وغیرہ کو کاٹ دینا۔ (۱) ابتر اس کو کہتے ہیں جس کی دُم کاٹی گئی ہو (۲) سانپوں کی اقسام میں سے ایک قسم سانپوں کا نام ابتر ہے۔ اِس قسم کے سانپ کو شیطان کہتے ہیں اگر حاملہ عورت اس کو دیکھے تو اس کا حمل ساقط ہو جاتا ہے (۳) اور حدیث میں ہے کہ ہر ایک امرِ شاندار جس کو حمدِ الٰہی سے شروع نہ کیا جاوے وہ اَبتر ہے (۴) اور ابتر اس کو بھی کہتے ہیں کہ جو عقب نہ رکھتا ہو یعنی اس کا کوئی بیٹا نہ ہو یا بیٹے کا بیٹا نہ ہو۔ لِسان العرب میں لکھا گیا ہے کہ عقب ولد کو بھی کہتے ہیں اور ولد الولد کو بھی کہتے

ہیں پس اِن معنوں کی رُو سے جس کا بیٹا نہیں وہ بھی اَبتر ہے اور جس کے بیٹے کے آگے بیٹا نہیں وہ بھی اَبتر ہے مگر جس کے کئی بیٹوں میں کسی بیٹے کی نسل چل جائے اُس کو اَبتر نہیں کہہ سکتے۔ پس جو شخص مَر جائے اور ایسا کوئی بچہ نہ چھوڑے اس کا نام بھی اَبتر ہے اور اس کے موافق خدا تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر کی گئی ہے کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔ یہ آیت عاص بن وائل کے حق میں نازل ہوئی تھی۔ وہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپؐ بیٹھے ہوئے تھے۔ پس عاص بن وائل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ اَبتر ہے یعنی اس کا کوئی لڑکا نہیں ہے اور نہ لڑکے کا لڑکا۔ تب خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اے محمدؐ! جو تیرا بدگو ہے وہی اَبتر ہے یعنی مقدر یوں ہے کہ جس اولاد پر وہ ناز کرتا ہے آخر اس کی اولاد فنا ہو جائے گی۔ گو اس کی زندگی میں یا بعد اس کے۔ اور سلسلہ نسل ختم ہو جائے گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ عاص بن وائل اولاد رکھتا تھا کیونکہ اگر وہ اَبتر یعنی بے اولاد ہوتا تو یہ غیر معقول بات تھی کہ باوجود آپ اَبتر ہونے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اَبتر رکھتا۔ پس خدائے تعالیٰ کی طرف سے یہ پیشگوئی تھی کہ انجام کار اس کی نسل قطع ہو جائے گی گو اس کی زندگی میں ہو یا بعد اس کے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اولاد چھوڑ کر مَر گیا تھا لیکن بعد اس کے اس کی اولاد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ اگر اولاد اس کے رُوبرو مَرتی تو ضرور اس کا ذکر کیا جاتا۔ اور باقی ترجمہ یہ ہے کہ اس جگہ ابتر کے یہ معنی بھی جائز ہیں کہ اَبتر اس کو کہتے ہیں کہ ہر ایک خیر سے محروم اور بے نصیب ہو۔ اور ابنِ عباسؓ کی حدیث میں ہے کہ جب ابنِ اشرف مکہ میں آیا تو اس کو قریش نے کہا کہ تُو سب مدینہ والوں سے بہتر اور ان کا سردار ہے۔ اُس نے کہا کہ ہاں مَیں ایسا ہی ہوں۔ تب قریش نے کہا کہ کیا تُو اِس شخص کی طرف نہیں دیکھتا (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف) یہ ایک کمزور اور ضعیف اور گمنام شخص ہے نہ اِس کا کوئی بیٹا اور نہ کوئی بھائی اور نہ کوئی دوستوں کی جماعت اس کے ساتھ ہے بلکہ ایک فردِ واحد اکیلی جان ہے اور قوم میں سے کاٹا ہوا ہے یعنی قوم نے باعث مخالفت اپنی جماعت میں سے اس کو خارج کر دیا ہے اور فتویٰ دے دیا ہے کہ کوئی اس کے ساتھ میل ملاپ نہ کرے اور نہ کوئی اس کی ہمدردی کرے اور باوجود اِس بات کے کہ یہ شخص کچھ بھی عزت نہیں رکھتا اور اس کو کوئی جانتا نہیں کہ کون ہے پھر یہ گمان کرتا ہے کہ ہم سے بہتر ہے۔ لیکن ہم ایک معزز جماعت ہیں تمام حج کرنے والے ہم میں سے ہیں اور ہم ان کے سردار ہیں اور خانہ کعبہ کے متولی اور خادم بھی ہم ہی ہیں اور حاجیوں کو پانی پلانے کا شرف بھی ہمیں ہی حاصل ہے مگر یہ شخص تو کسی شمار میں نہیں۔ جب یہ تمام باتیں ابن الاشرف نے سُنیں تو اس بدبخت نے جواب دیا کہ درحقیقت تم اُس شخص سے جو پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہے بہتر ہو۔ تب خدا تعالیٰ نے اس کے حق میں اور قریش کی اس تمام جماعت کے حق میں جو اَبتر کہتی تھی فرمایا کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ یعنی ابن الاشرف نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کو اَبتر کہا اور قریش کے کفار نے بھی اَبتر کہا یہ خود اَبتر ہیں یعنی ان کی اولاد کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور ہر ایک خیر و برکت سے محروم مریں گے۔ اِس بات کو تو آج تک کوئی ثابت نہیں کر سکا کہ وہ تمام قریش کے لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتر کہتے تھے ان کی زندگی میں ہی ان کے تمام لڑکے مر گئے تھے یا اُن کی اولاد نہیں تھی کیونکہ اگر انکی اولاد نہ ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہرگز وہ لوگ اَبتر نہ کہتے۔ یہ بات کوئی عقلمند قبول نہیں کر سکتا کہ ایک شخص خود ابتر ہو کر دوسرے کو اَبتر کہے پس ماننا پڑتا ہے کہ اُن کی اولاد موجود تھی۔ اور یہ دوسرا امر کہ پیشگوئی کے مطابق ان لوگوں کی اولاد ان کی زندگی میں ہی مر گئی تھی یہ امر بھی قرینِ قیاس نہیں اور عقل اس کو ہرگز باور نہیں کر سکتی کیونکہ ایسا کہنے والے نہ ایک نہ دو بلکہ صدہا شریر النفس اور خبیث الطبع آدمی تھے جن کی اولاد کی ہزارہا تک نوبت پہنچی تھی۔ پس اگر ان کی زندگی میں ہی ان کی تمام اولاد مر جاتی تو ملک میں ایک کُہرام مچ جاتا کیونکہ مُعجزہ کے طور پر ہزارہا بچوں کا مر جانا اور پھر لاولد ہونے کی حالت میں اُن کے باپوں کا مُرنا یہ ایسا معجزہ نہیں تھا جو مخفی رہ سکتا اور ضرور تھا کہ احادیث اور تاریخوں کی کتابوں میں اس کا ذکر ہوتا۔ پس اس سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اکثر اُن کے اولاد چھوڑ کر مر گئے تھے اور بعد میں پیشگوئی کے مطابق آہستہ آہستہ ان کی نسل منقطع ہو گئی...... بقیہ ترجمہ لسان العرب کا یہ ہے کہ اَبتر مُفلس کو بھی کہتے ہیں اور اُس شخص کو بھی جو خسارہ میں ہو اور اُن چیزوں کو اَبتر کہتے ہیں جو مشکیزہ اور لوٹا وغیرہ میں سے قبضہ نہ رکھتے ہوں۔

اِس تمام تحقیق سے ظاہر ہے کہ اوّل تو اَبتر کا لفظ بے فرزند ہونے کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر ایک بے نصیب اور نامراد جو ناکام اور زیاں کار ہے اس کو بھی اَبتر کہتے ہیں..... علاوہ اس کے تحقیق متذکرہ بالا کی رُو سے ثابت ہو گیا کہ اَبتر ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اِنسان ایسی حالت میں مرے جبکہ کوئی اس کی اولاد نہ ہو مگر بعد میں اس کی اولاد کا سلسلہ منقطع ہو جائے اور پوتے سے آگے نہ چلے تب وہ اَبتر کہلاتا ہے جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ قریش کے صدہا خبیث طبع لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اَبتر رکھا تھا اور وہ لوگ صاحبِ اولاد تھے اور اسلامی تاریخ میں ثابت نہیں کیا گیا کہ ان کی حیات میں ہی ان کے بیٹے اور پوتے ہلاک ہو گئے تھے بلکہ بعد میں آہستہ آہستہ اُن کا قطع نسل ہو گیا تھا۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۷۰ تا ۷۱)

یہ..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جسمانی اور روحانی طور پر ہر دو طرح اَبتر قرار دیتے ہیں حالانکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ۔ یہاں کوثر کا قرینہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ ہے۔ نحر اولاد کے لئے بھی ہوتا ہے کہ جب عقیقہ ہوتا ہے تو قربانیاں دیتے ہیں۔ پس اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد نہ روحانی ہوئی نہ جسمانی تو نحر کس کے لئے آیا۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۷ مورخہ ۱۲؍ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۰)

سُوْرَۃُ الْکٰفِرُوْنَ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِیْنُكُمْ وَلِیَ دِیْنِ ۝

کہہ اے کافرو میں اُس چیز کی پرستش نہیں کرتا جس کی تم کرتے ہو۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۰۹ حاشیہ)

استخارہ اہلِ اسلام میں بجائے مہورت کے ہے چونکہ ہندو شرک وغیرہ کے مرتکب ہو کر شگن وغیرہ کرتے ہیں اِس لئے اہلِ اسلام نے ان کو منع کر کے استخارہ رکھا۔ اِس کا طریق یہ ہے کہ انسان دو نفل پڑھے اوّل رکعت میں سورۃ قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھ لے اور دوسری میں قُلْ ھُوَ اللّٰہُ۔ التحیات میں یہ دعا کرے:۔

”یا الٰہی تیرے علم کے ذریعہ سے خیر طلب کرتا ہوں اور تیری قدرت سے قدرت مانگتا ہوں کیونکہ تجھی کو سب قدرت ہے مجھے کوئی قدرت نہیں اور تجھے ہی سب علم ہے مجھے کوئی علم نہیں اور تُو ہی چھپی ہوئی باتوں کا جاننے والا ہے۔ الٰہی اگر تُو جانتا ہے کہ یہ امر میرے حق میں بہتر ہے بلحاظ دین اور دُنیا کے تو تُو اسے میرے لئے مقدر کر دے اور آسان کر دے اور اس میں برکت دے اور اگر تُو جانتا ہے کہ یہ امر میرے لئے دین اور دُنیا میں شر ہے تو تُو مجھ کو اس سے باز رکھ۔“

اور اگر وہ امر اس کے لئے بہتر ہوگا تو خدا تعالیٰ اس کے لئے اس کے دِل کو کھول دے گا ورنہ طبیعت میں قبض ہو جائے گی۔ (البدر جلد اوّل نمبر ۱۱ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۸)

سُورۃ النّصر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ○ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا○ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَاسۡتَغۡفِرۡہُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا○

حضرت مسیح کی نسبت یہ گمان کرنا کہ انہوں نے رُوحانی مُردوں کے زندہ کرنے میں قیامت کا نمونہ دکھلایا سراسر خیالِ محال اور دعوئ بے دلیل ہے بلکہ یہ قیامت کا نمونہ روحانی حیات کے بخشنے میں اس ذاتِ کامل الصفات نے دکھایا جس کا نامِ نامی محمد ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ سارا قرآن اوّل سے آخر تک شہادت دے رہا ہے کہ یہ رسول اس وقت بھیجا گیا تھا کہ جب تمام قومیں دُنیا کی رُوح میں مرچکی تھیں اور فسادِ رُوحانی نے بَرّ و بحر کو ہلاک کر دیا تھا تب اس رسول نے آکر نئے سرے سے دُنیا کو زندہ کیا اور زمین پر توحید کا دریا جاری کر دیا، اگر کوئی منصف فکر کرے کہ جزیرۂ عرب کے لوگ اوّل کیا تھے اور پھر اس رسول کی پیروی کے بعد کیا ہوگئے اور کیسی ان کی وحشیانہ حالت اعلیٰ درجہ کی انسانیّت تک پہنچ گئی اور کس صدق و صفا سے انہوں نے اپنے ایمان کو اپنے خونوں کے بہانے سے اور اپنی جانوں کے فدا کرنے اور اپنے عزیزوں کو چھوڑنے اور اپنے مالوں اور عزّتوں اور آراموں کو خدا تعالےٰ کی راہ میں لگانے سے ثابت کر دکھلایا۔ تو بِلاشُبہ ان کی ثابت قدمی اور ان کا صدق اپنے پیارے رسول کی راہ میں ان کی جاں فشانی ایک اعلیٰ درجہ کی کرامت کے رنگ میں اس کو نظر آئے گی۔ وہ پاک نظر ان کے وجودوں پر کچھ ایسا کام کر گئی کہ وہ اپنے آپ سے کھوئے گئے اور انہوں نے فنا فی اللہ ہو کر صدق اور راستبازی کے وہ کام

دکھلائے جس کی نظیر کسی قوم میں ملنا مشکل ہے اور جو کچھ انہوں نے عقائد کے طور پر حاصل کیا تھا وہ یہ تعلیم نہ تھی کہ کسی عاجز انسان کو خدا مانا جائے یا خدا تعالیٰ کو بچوں کا محتاج ٹھہرایا جائے بلکہ انہوں نے حقیقی خدائے ذوالجلال جو ہمیشہ سے غیر متبدّل اور حیّ وقیّوم اور ابن اور اَبْ ہونے کی حاجات سے مُنزّہ اور موت اور پیدائش سے پاک ہے بذریعہ اپنے رسولِ کریمؐ کے شناخت کر لیا تھا اور وہ لوگ سچ مچ موت کے گڑھے سے نکل کر پاک حیات کے بلند مینار پر کھڑے ہوگئے تھے اور ہر ایک نے ایک تازہ زندگی پالی تھی اور اپنے ایمانوں میں ستاروں کی طرح چمک اُٹھے تھے۔

سو در حقیقت ایک ہی کامل انسان دُنیا میں آیا جس نے ایسے اتم اور اکمل طور پر یہ رُوحانی قیامت دکھلائی اور ایک زمانہ دراز کے مُردوں اور ہزاروں برسوں کے عظمِ رمیم کو زندہ کر دکھلایا۔ اس کے آنے سے قبریں کُھل گئیں اور بوسیدہ ہڈیوں میں جان پڑگئی اور اس نے ثابت کر دکھلایا کہ وہی حاشر اور وہی رُوحانی قیامت ہے جس کے قدموں پر ایک عالَم قبروں میں سے نکل آیا اور بشارت وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا تمام جزیرۂ عرب پر اثر انداز ہوگئی اور پھر اس قیامت کا نمونہ صحابہؓ تک ہی محدود نہ رہا بلکہ اُس خداوند قادر قدیر نے جس نے ہر قوم اور ہر زمانہ اور ہر مُلک کے لئے اُس بشیر و نذیر کو مبعوث کیا تھا ہمیشہ کے لئے جاودانی برکتیں اُس کے سچے تابعداروں میں رکھ دیں اور وعدہ کیا کہ وہ نور اور وہ رُوح القدس جو اُس کامل انسان کے صحابہؓ کو دیا گیا تھا آنے والے متبعین اور صادق الاخلاص لوگوں کو بھی ملے گا۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۲۰۷، ۲۰۸)

جب مکہ آنے والی مدد اور فتح آگئی جس کا وعدہ دیا گیا تھا اور تُو نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج دینِ اسلام میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ پس خدا کی حمد اور تسبیح کر یعنی یہ کہہ کہ یہ جو ہُوا وہ مجھ سے نہیں بلکہ اس کے فضل اور کرم اور تائید سے ہے اور الوداعی استغفار کر کیونکہ وہ رحمت کے ساتھ بہت ہی رجوع کرنے والا ہے۔ استغفار کی تعلیم جو نبیوں کو دی جاتی ہے اُس کو عام لوگوں کے گناہ میں داخل کرنا عین حماقت ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں یہ لفظ اپنی نیستی اور تذلّل اور کمزوری کا اِقرار اور مدد طلب کرنے کا متواضعانہ طریق ہے جو کہ اِس سُورت میں فرمایا گیا ہے کہ جس کام کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے وہ پورا ہوگیا یعنی یہ کہ ہزارہا لوگوں نے دینِ اسلام قبول کر لیا اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی طرف بھی اشارہ ہے۔ چنانچہ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک برس کے اندر فوت ہوگئے۔ پس ضرور تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اِس آیت کے نزول سے جیسا کہ خوش ہوئے تھے غمگین بھی ہوں کیونکہ باغ تو لگایا گیا مگر ہمیشہ کی آب پاشی کا کیا اِنتظام ہُوا۔ سو خدا تعالیٰ نے اِسی غم کے دُور کرنے کے لئے استغفار کا حکم دیا کیونکہ لُغت میں مغفرت ایسے ڈھانکنے کو کہتے ہیں جس سے اِنسان آفات سے

محفوظ رہے۔ اِسی وجہ سے مِغفَر جو خود کے معنی رکھتا ہے اِسی میں سے نکالا گیا ہے اور مغفرت مانگنے سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ جس بَلا کا خوف ہے یا جس گنہ کا اندیشہ ہے خدا تعالیٰ اس بَلا یا اس گنہ کو ظاہر ہونے سے روک دے اور ڈھانکے رکھے۔ سو اس استغفار کے ضمن میں یہ وعدہ دیا گیا کہ اِس دین کے لئے غم مت کھا خدا تعالیٰ اس کو ضائع نہیں کرے گا اور ہمیشہ رحمت کے ساتھ اس کی طرف رجوع کرتا رہے گا اور ان بَلاؤں کو روک دے گا جو کِسی ضعف کے وقت عائدِ حال ہو سکتی ہیں۔

اکثر نادان عیسائی مغفرت کی سچّی حقیقت نہ دریافت کرنے کی وجہ سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ جو شخص مغفرت مانگے وہ فاسق اور گنہ گار ہوتا ہے مگر مغفرت کے لفظ پر خوب غور کرنے کے بعد صاف طور پر سمجھ آ جاتا ہے کہ فاسق اور بدکار وہی ہے جو خدا تعالیٰ سے مغفرت نہیں مانگتا کیونکہ جبکہ ہر یک پاکیزگی اُسی کی طرف سے ملتی ہے اور وہی نفسانی جذبات کے طوفانوں سے محفوظ اور معصوم رکھتا ہے تو پھر خدا تعالیٰ کے راستباز بندوں کا ہر یک طرفۃ العین میں یہی کام ہونا چاہیئے کہ وہ اس حافظ اور عاصمِ حقیقی سے مغفرت مانگا کریں۔ اگر ہم جسمانی عالم میں مغفرت کا کوئی نمونہ تلاش کریں تو ہمیں اس سے بڑھ کر اور کوئی مثال نہیں مِل سکتی کہ مغفرت اُس مضبوط اور ناقابل بند کی طرح ہے جو ایک طوفان اور سَیلاب کے روکنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔ پس چونکہ تمام زور تمام طاقتیں خدا تعالیٰ کیلئے مسلّم ہیں اور انسان جیساکہ جسم کے رُو سے کمزور ہے رُوح کے رُو سے بھی ناتوان ہے اور اپنے شجرۂ پیدائش کے لئے ہر یک وقت اُس لازوال ہستی سے آب پاشی چاہتا ہے جس کے فیض کے بغیر یہ جی ہی نہیں سکتا اِس لئے استغفار مذکورہ معانی کے رُو سے اس کے لازمِ حال پڑا ہے اور جیساکہ چاروں طرف درخت اپنی ٹہنیاں چھوڑتا ہے گویا اِردگرد کے چشمہ کی طرف اپنے ہاتھوں کو پھیلاتا ہے کہ اے چشمہ میری مدد کر اور میری سرسبزی میں کمی نہ ہونے دے اور میرے پھلوں کا وقت ضائع ہونے سے بچا۔ یہی حال راستبازوں کا ہے۔ رُوحانی سرسبزی کے محفوظ اور سلامت رہنے کے لئے یا اُس سرسبزی کی ترقیات کی غرض سے حقیقی زندگی کے چشمہ سے سلامتی کا پانی مانگنا یہی وہ امر ہے جس کو قرآن کریم دوسرے لفظوں میں استغفار کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ قرآن کو سوچو اور غور سے پڑھو۔ استغفار کی اعلیٰ حقیقت پاؤ گے اور ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ مغفرت لُغت کی رُو سے ایسے ڈھانکنے کو کہتے ہیں جس سے کسی آفت سے بچنا مقصود ہے مثلاً پانی درختوں کے حق میں ایک مغفرت کرنے والا عنصر ہے یعنی اُنکے عیبوں کو ڈھانکتا ہے۔ یہ بات سوچ لو کہ اگر کسی باغ کو برس دو برس بالکل پانی نہ ملے تو اس کی کیا شکل نکل آئے گی کیا یہ سچ نہیں کہ اس کی خوبصورتی بالکل دُور ہو جائے گی اور سرسبزی اور خوش نمائی کا نام و نشان نہیں رہے گا اور وہ وقت پر کبھی پَھل نہیں لائے گا اور اندر ہی اندر جَل جائے گا اور پھُول بھی نہیں آئیں گے بلکہ اس کے سرسبز اور نرم نرم لہلہاتے ہوئے پتّے چند روز میں ہی خشک ہو کر گر جائیں گے اور خشکی غالب ہو کر مجذوم کی طرح آہستہ آہستہ

اُس کے تمام اعضاء گرنے شروع ہو جائیں گے یہ تمام بلائیں کیوں اس پر نازل ہوں گی؟ اِس وجہ سے کہ وہ پانی جو اس کی زندگی کا مدار تھا اُس نے اس کو سیراب نہیں کیا اِسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے

كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ [1]

یعنی پاک کلمہ پاک درخت کی مانند ہے پس جیسا کہ کوئی عمدہ اور شریف درخت بغیر پانی کے نشوونما نہیں کر سکتا اسی طرح راستباز انسان کے کلماتِ طیّبہ جو اس کے مُنہ سے نکلتے ہیں اپنی پوری سرسبزی دکھلا نہیں سکتے اور نہ نشوونما کر سکتے ہیں جب تک وہ پاک چشمہ ان کی جڑوں کو استغفار کے نالے میں بہہ کر تر نہ کرے۔ سو انسان کی روحانی زندگی استغفار سے ہے جس کے نالے میں ہو کر حقیقی چشمہ انسانیّت کی جڑھوں تک پہنچتا ہے اور خشک ہونے اور مرنے سے بچالیتا ہے۔ جس مذہب میں اِس فلسفہ کا ذکر نہیں وہ مذہب خدا تعالیٰ کی طرف سے ہرگز نہیں۔ اور جس شخص نے نبی یا رسول یا راستباز یا پاک فطرت کہلا کر اس چشمہ سے مُنہ پھیرا ہے وہ ہرگز خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں اور ایسا آدمی خدا تعالیٰ سے نہیں بلکہ شیطان سے نکلا ہے کیونکہ شَیط مَرنے کو کہتے ہیں پس جس نے اپنے رُوحانی باغ کو سرسبز کرنے کے لئے اُس حقیقی چشمہ کو اپنی طرف کھینچنا نہیں چاہا اور استغفار کے نالے کو اُس چشمہ سے لبالب نہیں کیا وہ شیطان ہے یعنی مَرنے والا ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ کوئی سرسبز درخت بغیر پانی کے زندہ رہ سکے۔ ہر یک متکبّر جو اُس زندگی کے چشمہ سے اپنے رُوحانی درخت کو سرسبز کرنا نہیں چاہتا وہ شیطان ہے اور شیطان کی طرح ہلاک ہوگا۔ کوئی راستباز نبی دُنیا میں نہیں آیا جس نے استغفار کی حقیقت سے مُنہ پھیرا اور اس حقیقی چشمہ سے سرسبز ہونا نہ چاہا۔ ہاں سب سے زیادہ اس سرسبزی کو ہمارے سیّد و مولیٰ ختم المرسلین فخر الاوّلین والآخرین محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگا اِس لئے خدا نے اُس کو اس کے تمام ہم منصبوں سے زیادہ سرسبز اور معطر کیا۔

(نور القرآن حصّہ اوّل صفحہ ۱۹ تا ۲۱)

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں نہایت درجہ کا یہ جوش تھا کہ مَیں اپنی زندگی میں اِسلام کا زمین پر پھیلنا دیکھ لوں اور یہ بات بہت ہی ناگوار تھی کہ حق کو زمین پر قائم کرنے سے پہلے سفرِ آخرت پیش آوے۔ خدا تعالیٰ اِس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشخبری دیتا ہے کہ دیکھ مَیں نے تیری مُراد پوری کر دی اور کم و بیش اِس مُراد کا ہر یک نبی کو خیال تھا مگر چونکہ اس درجہ کا جوش نہیں تھا اِس لئے نہ مسیح کو اور نہ موسیٰ کو یہ خوشخبری ملی بلکہ اس کو ملی جس کے حق میں قرآن نے فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ [2] یعنی کیا تُو اِس غم سے ہلاک ہو جائے گا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔ (نور القرآن ۱ صفحہ ۱۹ حاشیہ)

---

[1] سورۃ ابراھیم: ۲۵ [2] سورۃ الشعراء: ۴

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم درحقیقت ایسے وقت میں آئے تھے جس وقت میں ایک سچے اور کامل نبی کو آنا چاہیئے پھر جب ہم دوسرا پہلو دیکھتے ہیں کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کس وقت واپس بُلائے گئے تو قرآن صاف اور صریح طور پر ہمیں خبر دیتا ہے کہ ایسے وقت میں بُلانے کا حکم ہوا کہ جب اپنا کام پورا کر چکے تھے یعنی اس وقت کے بعد بُلائے گئے جب کہ یہ آیت نازل ہو چکی کہ مسلمانوں کے لئے تعلیم کا مجموعہ کامل ہوگیا اور جو کچھ ضروریاتِ دین میں نازل ہونا تھا وہ سب نازل ہو چکا اور نہ صرف یہی بلکہ یہ بھی خبر دی گئی کہ خدا تعالیٰ کی تائیدیں بھی کمال کو پہنچ گئیں اور جوق در جوق لوگ اِسلام میں داخل ہوگئے اور یہ آیتیں بھی نازل ہوگئیں کہ خدا تعالیٰ نے ایمان اور تقویٰ کو اُن کے دلوں میں لکھ دیا اور فسق و فجور سے انہیں بیزار کر دیا اور پاک اور نیک اَخلاق سے وہ متّصف ہوگئے اور ایک بھاری تبدیلی اُنکے اَخلاق اور چلن اور رُوح میں واقع ہوگئی تب ان تمام باتوں کے بعد سُورۃ النصر نازل ہوئی جس کا ماحصل یہی ہے کہ نبوّت کے تمام اغراض پورے ہوگئے اور اسلام دلوں پر فتحیاب ہوگیا تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام طور پر اِعلان دے دیا کہ یہ سُورت میری وفات کی طرف اشارہ کرتی ہے بلکہ اس کے بعد حج کیا اور اس کا نام حجۃ الوداع رکھا اور ہزارہا لوگوں کی حاضری میں ایک اُونٹنی پر سوار ہو کر ایک لمبی تقریر کی اور کہا کہ سُنو۔ اے خدا کے بندو۔ مجھے میرے رَبّ کی طرف سے یہ حکم ملے تھے کہ تا میں یہ سب احکام تمہیں پہنچا دوں پس کیا تم گواہی دے سکتے ہو کہ یہ سب باتیں مَیں نے تمہیں پہنچا دیں تب ساری قوم نے باآوازِ بلند تصدیق کی کہ ہم تک یہ سب پیغام پہنچائے گئے تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اے خدا اِن باتوں کا گواہ رہ اور پھر فرمایا کہ یہ تمام تبلیغ اِس لئے مکرّر کی گئی کہ شاید آئندہ سال مَیں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا اور پھر دوسری مرتبہ تم مجھے اِس جگہ نہیں پاؤ گے۔ تب مدینہ میں جا کر دوسرے سال میں فوت ہوگئے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ۔

(نور القرآن ۱ صفحہ ۲۴ تا ۲۸)

یہ سُورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قُرب زمانۂ وفات میں نازل ہوئی تھی اور اس میں اللہ تعالیٰ زور دیکر اپنی نصرت اور تائید اور تکمیل مقاصدِ دین کی خبر دیتا ہے کہ اَب تو اے نبی خدا کی تسبیح کر اور تحمید کر اور خدا سے مغفرت چاہ۔ وہ توّاب ہے۔ اِس موقع پر مغفرت کا ذکر کرنا یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اَب کام تبلیغ ختم ہوگیا خدا سے دعا کر کہ اگر خدمت تبلیغ کے دقائق میں کوئی فروگذاشت ہوئی ہو تو خدا اس کو بخش دے۔ موسیٰ بھی توریت میں اپنے قصوروں کو یاد کر کے روتا ہے اور جس کو عیسائیوں نے خدا بنا رکھا ہے کسی نے اُس کو کہا کہ اے نیک اُستاد۔ تو اُس نے جواب دیا کہ تُو مجھے کیوں نیک کہتا ہے نیک کوئی نہیں مگر خدا۔ یہی تمام اَولیاء کا شعار رہا ہے۔ سب نے استغفار کو اپنا شعار قرار دیا ہے بجز شیطان کے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۱۰۷، ۱۰۸)

ایک اَور آیت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ استغفار ہمیشہ گزشتہ گناہوں کے لئے نہیں ہوتا وہ یہ ہے

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۔ اِس آیت میں خداوند تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کی تاکید کرتا ہے۔ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تھوڑے ہی دن پہلے اُتری۔ اَب اِس آیت کے ساتھ یہ آیت ملاؤ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ[1] یہ آیت فتح مکہ کے وقت اُتری اِس لئے یہ آیت اوّل الذکر آیت سے بہت پہلے کی ہے۔ عیسائی اِس آیت کا اِس طرح ترجمہ کرتے ہیں "ہم نے تجھے ایک صریح فتح دی تاکہ ہم تیرے پہلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیں"۔ یہ عیسائیوں کا ترجمہ ہے اِس لئے عیسائیوں کو ماننا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ نے فتح مکّہ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کُل اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے تھے۔ اب جب خداوند تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دئے تو پھر خداوند تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو کیوں استغفار کی تاکید کی۔ اگر ہم عیسائیوں کے ترجمہ کو بھی مان لیں تو ہمیں نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ جب خداوند تعالیٰ نے گناہ معاف کرنے کے بعد استغفار کی تاکید کی تو وہ استغفار گزشتہ سرزد شدہ گناہوں کے لئے نہیں تھا کیونکہ آپؐ کے گناہ تو سارے معاف ہو چکے تھے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ اوّل سارے گناہوں کو معاف کر دے اور پھر اس کے بعد اس کے گناہوں کی معافی منگوائے۔ پس عیسائیوں کو ماننا چاہیئے کہ یہاں وَاسْتَغْفِرْهُ کے معنے یہ نہیں کہ گناہوں کے لئے معافی مانگ بلکہ یہاں استغفار کے معنے خداوند تعالیٰ سے قوّت طلب کرنا ہیں تاکہ وہ رُوحانی منزل کے طے کرنے میں طاقت بخشے۔ سیاقِ کلام بھی اِس معنے کی تائید کرتا ہے اِس سُورۃ میں (یعنی النّصر میں) خداوند تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل کامیابی کا ذکر کرتا ہے اور آپؐ کے قُربِ زمانے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ زندگی کے باقی دنوں میں صرف دعا میں لگ جاؤ۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۲۴۴، ۲۴۵)

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ یعنی جب خدا کی فتح اور نصرت آوے گی۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ نمبر ۶ صفحہ ۲۰۲)

اِس میں اِس امر کی طرف صریح اشارہ ہے کہ آپؐ اُس وقت دُنیا میں آئے جب دین اللہ کو کوئی جانتا بھی نہ تھا اور عالمگیر تاریکی چھائی ہوئی تھی اور گئے اُس وقت جبکہ اِس نظارہ کو دیکھ لیا کہ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا جب تک اس کو پُورا نہ کر لیا نہ تھکے نہ ماندہ ہوئے۔ مخالفوں کی مخالفتیں۔ اعداء کی سازشیں اور منصوبے قتل کرنے کے مشورے۔ قوم کی تکلیفیں آپؐ کے حوصلہ اور ہمّت کے سامنے سب ہیچ اور بیکار تھیں اور کوئی ایسی چیز نہ تھی جو آپ کے کام سے ایک لمحہ کے لئے بھی روک سکتی! اللہ تعالیٰ نے اُس وقت تک زندہ رکھا جب تک کہ آپ نے وہ کام نہ کر لیا

---

[1] سورۃ الفتح: ۲، ۳

جس کے واسطے آئے۔ یہ بھی ایک سِر ہے کہ خدا کی طرف سے آنے والے جھوٹوں کی طرح نہیں آتے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲ مورخہ ۱۷؍جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہ فتح عظیم جس کا آپؐ کے ساتھ وعدہ تھا حاصل کر چکے تھے۔ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا دیکھ چکے تھے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷؍اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۷)

نبی بہت بڑی ذمہ داری لے کر آتا ہے اِس لئے جب وہ اپنے کام کو کر چکتا ہے اور تبلیغ کر کے رخصت ہونے کو ہوتا ہے تو وہ وقت اس کا گویا خدا تعالیٰ کو چارج دینے کا ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ جس پر اپنا فضل کرتا ہے اس پر استغفار کا لفظ بولتا ہے۔ اس طریق کے موافق رسول اللہؐ کو بھی ارشادِ الٰہی ہوتا ہے فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَاسۡتَغۡفِرۡہُ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا خدا تعالیٰ ہر ایک نقص سے پاک ہے اور جو کچھ سہو بشریت کی رُو سے اِس ذمہ داری کے کام میں ہؤا ہے..... تو اس سے استغفار چاہو۔ جس کے سپرد ہزاروں کام ہوں اس کے لئے ضروری ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو مقاصد عظیم الشّان لے کر آئے تھے۔ غرض یہ ایک چارج تھا جو آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیا اور جس میں آپؐ کی پوری کامیابی کی طرف پہلے اشارہ کر دیا۔ اور یہ سورۃ گویا آنحضرتؐ کی وفات کا ایک پروانہ تھا۔ یہ بھی یاد رکھو کہ انبیاء کی زندگی اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک مصائب کا زمانہ رہے اس کے بعد جب فتح و نصرت کا وقت آتا ہے تو وہ گویا اُن کی وفات کا پروانہ ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کام کو کر چکے ہوتے ہیں جس کے لئے بھیجے جاتے ہیں اور اصل تو یہ ہے کہ کام تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوتے ہیں مفت میں ثواب لینا ہوتا ہے۔ جو شخص اس میں بھی خود غرضی، سُستی، ریا کی آمیزش کرے وہ اصل ثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۶)

مخالف مامور کی عمر کو بڑھاتے ہیں اور وہ گویا سلسلہ نبوّت کی رونق کا باعث ہوتے ہیں ان کی مخالفت سے تحریک پیدا ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی غیرت جوش میں آتی ہے۔ جب مخالفت اُٹھ جاتی ہے تو گویا مامور بھی اپنا کام کر چکتا ہے اور وہ فتحیاب ہو کر اُٹھایا جاتا ہے۔

دیکھو جب کفارِ مکّہ کی مخالفت کا زور شور رہا اس وقت تک بڑے بڑے اعجاز ظاہر ہوئے لیکن جب اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ کا وقت آیا اور یہ سُورۃ اُتری تو گویا آپؐ کے انتقال کا وقت قریب آ گیا۔ فتح مکّہ کیا تھی آپؐ کے انتقال کا ایک مقدمہ تھی۔ غرض ان مخالفانہ تحریکوں سے بڑے بڑے فائدے ہوتے ہیں اور ہماری جماعت ان مخالفوں ہی میں سے نکل کر آئی ہے اور اگر یہ مخالفت نہ ہوتی تو اس زور شور سے تحریک اور تبلیغ نہ ہوتی۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۴ مورخہ ۱۰؍دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

دیکھو اللہ تعالیٰ نے بعض کا نام سابق مہاجر اور انصار رکھا ہے اور اُن کو رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ

رَضُوْا عَنْہُ[1] میں داخل کیا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو سب سے پہلے ایمان لائے اور جو بعد میں ایمان لائے ان کا نام صرف ناس رکھا ہے جیسے فرمایا اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ۙ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۙ یہ لوگ جو اسلام میں داخل ہوئے اگرچہ وہ مسلمان تھے مگر ان کو وہ مراتب نہیں ملے جو پہلے لوگوں کو دئے گئے اور پھر مہاجرین کی عزت سب سے زیادہ تھی کیونکہ وہ لوگ اس وقت ایمان لائے جب ان کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کامیابی ہوگی یا نہیں بلکہ ہر طرف سے مصائب اور مشکلات کا ایک طوفان آیا ہوا تھا اور کفر کا ایک دریا بہتا تھا خاص مکہ میں مخالفت کی آگ بھڑک رہی تھی اور مسلمان ہونے والوں کو سخت اذیتیں اور تکلیفیں دی جاتی تھیں مگر انہوں نے ایسے وقت میں قبول کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بڑی بڑی تعریفیں کیں اور بڑے بڑے انعامات اور فضلوں سے نوازا.... پس ہر ایک کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جو اِس بات کا انتظار کرتا ہے کہ فلاں وقت آئے گا اور انکشاف ہوگا تو مان لیں گے وہ کسی ثواب کی امید نہ رکھے۔ ایسا تو ضرور ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سب حجاب دُور کر دے گا اور اس معاملہ کو آفتاب کی طرح کھول کر دکھا دے گا مگر اس وقت ماننے والوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پیغمبروں کو ماننے والوں میں ثواب اوّلون کو سب سے بڑھ کر ملا ہے اور انکشاف کا زمانہ تو ضرور آتا ہے لیکن آخر اُن کا نام ناس ہی ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲، ۳)

قاعدہ کی بات ہے کہ محبّت اور ایمان کے لئے اسباب ہوتے ہیں مسیح کی زندگی پر نظر کرو تو معلوم ہوگا کہ ساری عمر دھکّے کھاتے رہے۔ صلیب پر چڑھنا بھی مُشتبہ رہا۔ ادھر ایک لمبا سلسلہ عمر اور سوانح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھو کہ کیسی نصرتِ الٰہی شامل رہی۔ ہر ایک میدان میں آپؐ کو فتح ہوئی۔ کوئی گھڑی یاس کی آپؐ پر گذری ہی نہیں یہاں تک کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ کا وقت آگیا۔ ان تمام نصرتوں میں کوئی حصّہ بھی حضرت مسیحؑ کا نظر نہیں آتا اِس لئے صاف ثابت ہے کہ محبّت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدا سے زیادہ ہو نہ کہ مسیحؑ کی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کے انعامات بکثرت ہیں اور اِس لئے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان ہو سکتی ہے کہ وہ آسمان پر زندہ ہوں۔ جو شخص نظارۂ قدرت زیادہ دیکھتا ہے وہی زیادہ فریفتہ ہوا کرتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۹ رمئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۴۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دُنیا میں آنا اور پھر وہاں سے رخصت ہونا قطعی دلیل آپؐ کی نبوت پر ہے۔ آئے آپؐ اُس وقت جبکہ زمانہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ[2] کا مصداق تھا اور ضرورت ایک نبی کی تھی ضرورت پر آنا بھی ایک دلیل ہے اور آپؐ اُس وقت دُنیا سے رخصت ہوئے جب اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ کا آوازہ

---

[1] سورۃ المائدۃ : ۱۲۰ [2] سورۃ الروم : ۴۲

دیا گیا۔ اِس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آپؐ کس قدر عظیم الشان کامیابی کے ساتھ دُنیا سے رُخصت ہوئے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تُو نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا کہ فوج در فوج لوگ داخل ہو رہے ہیں فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ یعنی وہ ربّ جس نے اس قدر کامیابی دکھلائی اس کی تسبیح و تحمید کر اور انبیاء پر جو انعامات پوشیدہ رہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کھول دیئے گئے اور رحمت کے تمام امور اجلیٰ کر دئیے اور کوئی بھی مخفی نہ رکھا۔ اس حمد کا ثبوت اس آخری وقت پر آ کر دیا۔ احمد کے معنے ہیں حمد کرنے والا۔

دُنیا میں کوئی آدمی بھی ایسا نہیں آیا جو اتنی بڑی کامیابی اپنے ساتھ رکھتا ہو۔ لذت و سرور کی موت اگر ہوئی ہے تو فقط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی ہوئی ہے اور دوسرے کسی نبی کو بھی میسّر نہیں ہوئی۔ یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے اِس لئے آپؐ کی عصمت کا یہ ایک بڑا ثبوت ملتا ہے جیسے طبیب اُسے کہتے ہیں جو علاج کر کے مریض کو اچھا کر کے دکھلا دیوے ویسے ہی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے ہر ایک روحانی مرض کا علاج کر کے آپؐ نے دکھلا دیا اور اِسی لئے دوسری تمام نبوّتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ ہی معلوم ہوتی ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۷ر جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

اسی حمد کا ثبوت اَب اسی آخری وقت میں آ کر دیا ہے کہ ایک احمد آیا۔ احمد کے معنے ہیں حمد کرنے والا۔ کوئی بھی ایسا آدمی نہیں ہے جو ثابت کرے کہ اِس قدر کامیابی کسی اَور کو ہوئی ہو۔ خوشی، پوری مرادمندی اور لذّت کی موت اگر حاصل ہوئی ہے تو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی ہے اَور کسی نبی کو ہرگز نہیں ہوئی یہ خدا کا فضل ہے۔ اِس سے پتہ لگتا ہے کہ نفس ایسا پاک تھا کہ خدا کا اِس قدر فضل ہؤا اور آپؐ کی عصمت کا یہ ایک بڑا ثبوت ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۷ر جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد اُس وقت ہوئی کہ زمانہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ[1] کا مصداق تھا اور گئے اس وقت جبکہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کی سَند آپ کو مِل گئی پس اگر آپؐ کو کامیابی نہ ہوتی لیکن آپؐ کسی کے ہاتھ سے قتل بھی نہ ہوتے تو اس سے کیا فائدہ تھا؟ اور یہ کونسا مقام فخر کا ہے۔ ہاں جب ایک شخص سلطنت قائم کرتا ہے اور اپنے قائمقام مظفرّ و منصور چھوڑتا ہے تو کیا پھر دشمن کی خوشی کا موجب ہو سکتا ہے؟ بڑی سے بڑی ذِلّت یہ ہے کہ ناکامی اور نامرادی کی موت آوے۔ پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کامیابی کی حالت میں قتل کئے جاتے تو اس سے آپؐ کی شان میں کیا حرف آ سکتا تھا؟ یہ بھی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دی گئی تھی۔ آپؐ کی موت میں اس زہر کا بھی دخل تھا۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ جب آپؐ کی موت ایسی حالت

---

[1] سورۃ الروم: ۴۲

میں ہوئی کہ کافر اس بات سے نا امید ہو گئے کہ ان کا دین پھر عَود کرے گا تو ایسی حالت میں اگر آپؐ زہر یا قتل سے مَرتے تو کونسی قابلِ اعتراض بات تھی؟ دین تو تباہ نہیں ہو سکتا تھا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۴؍ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۵۷، ۲۵۸)

تم خود ہی سوچو اور مکّہ کے اس انقلاب کو دیکھو کہ جہاں بُت پرستی کا اِس قدر چرچا تھا کہ ہر ایک گھر میں بُت رکھا ہوُا تھا۔ آپؐ کی زندگی ہی میں سارا مکّہ مسلمان ہو گیا اور ان بُتوں کے پُجاریوں ہی نے ان کو توڑا اور ان کی مذمت کی۔ یہ حیرت انگیز کامیابی، یہ عظیم الشّان انقلاب کسی نبی کی زندگی میں نظر نہیں آتا جو ہمارے پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھایا۔ یہ کامیابی آپؐ کی اعلیٰ درجہ کی قوتِ قدسی اور اللہ تعالیٰ سے شدید تعلقات کا نتیجہ تھا۔

ایک وہ وقت تھا کہ آپؐ مکّہ کی گلیوں میں تنہا پھرا کرتے تھے اور کوئی آپؐ کی بات نہ سُنتا تھا۔ پھر ایک وقت وہ تھا جب آپؐ کے اِنقطاع کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یاد دلایا اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ ۙ﴿۲﴾ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۳﴾ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ فوج در فوج لوگ اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ جب یہ آیت اُتری تو آپؐ نے فرمایا کہ اس سے وفات کی بُو آتی ہے کیونکہ وہ کام جو مَیں چاہتا تھا وہ تو ہو گیا ہے اور اصل قاعدہ یہی ہے کہ انبیاء علیہم السّلام اسی وقت تک دُنیا میں رہتے ہیں جبتک وہ کام جس کے لئے وہ بھیجے جاتے ہیں نہ ہوے۔ جب وہ کام ہو چُکتا ہے تو اُن کی رحلت کا زمانہ آجاتا ہے جیسے بندوبست والوں کا جب کام ختم ہو جاتا ہے تو وہ اس ضلع سے رُخصت ہو جاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۵ مورخہ ۱۰؍فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ماننے والوں کا نام سابقین رکھا ہے لیکن جب بہت سے مسلمان فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے تو ان کا نام صرف نَاس رکھا گیا جیسے فرمایا اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ ۙ﴿۲﴾ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۳﴾ حقیقت یہی ہے کہ جب حق کُھل جاتا ہے پھر انکار کی گنجائش نہیں رہتی جیسے جب دِن چڑھا ہوُا ہو تو پھر بجز شپّرؔ کے کون انکار کرے گا۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۱ مورخہ ۳۱؍مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

کھانسی جب شدّت سے ہوتی ہے تو بعض وقت دَم گُھٹنے لگتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جان کندن کی سی حالت ہے چنانچہ اس شدّتِ کھانسی میں مجھے اللہ تعالیٰ کی غناء ذاتی کا خیال گذرا اور مَیں سمجھتا تھا کہ اب گویا موت کا وقت قریب ہے۔ اس وقت الہام ہوُا

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ ۙ﴿۲﴾ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۳﴾

اِس کے یہ معنے سمجھائے گئے کہ ایسا خیال اس وقت غلط ہے بلکہ اس وقت جب اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ کا نظارہ دیکھ لو اُس وقت تو کُوچ ضروری ہوجاتا ہے۔ سب کے لئے یہی اصول ہے کہ جب وہ کام جس کے لئے اُس کو بھیجا جاتا ہے ختم ہوجاتا ہے تو پھر وہ رخصت ہوجاتا ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ر فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

طاعون ہمارے لئے کام کر رہی ہے۔ اگر اس گروہ میں ایک شہید ہوجاتا ہے تو اس کے قائم مقام ہزار نکل آتے ہیں۔ یہ نادانوں کا شُبہ فضول ہے کہ کیوں مَرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں صحابہؓ جنگ میں کیوں شہید ہوتے تھے؟ کسی مولوی سے پوچھو کہ وہ جنگ عذاب تھی یا نہیں۔ ہر ایک کو کہنا پڑے گا کہ عذاب تھی۔ پھر ایسا اعتراض کیوں کرتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جا پڑتا ہے لیکن اگر کوئی کہے کہ پھر نشان مُشتبہ ہوجاتا ہے ہم کہتے ہیں کہ نہیں نشان مُشتبہ نہیں ہوتا اِس واسطے کہ انجام کار کفار کا ستیاناس ہوگیا اور ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا اور اِسلام ہی اِسلام نظر آتا تھا چنانچہ آخر اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ ۙ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ کا نظارہ نظر آگیا۔ اِسی طرح پر طاعون کا حال ہے۔ اس وقت لوگوں کو تعجب معلوم ہوتا ہے اور وہ اعتراض کرتے ہیں لیکن ایک وقت آتا ہے جب طاعون اپنا کام کرکے چلی جائے گی اُس وقت معلوم ہوگا کہ اُس نے کس کو نفع پہنچایا اور کون خسارہ میں رہے گا۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۸ مورخہ ۳۱ر مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

چونکہ ان (انبیاء) کی معرفت بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جبروت کے مقام کو شناخت کرتے ہیں اِس لئے نہایت انکسار اور عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ نادان جن کو اس مقام کی خبر نہیں ہے وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ یہ ان کی کمال معرفت کا نشان ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ ۙ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَاسۡتَغۡفِرۡہُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ۙ آیا ہے۔ اِس میں صاف فرمایا ہے تُو استغفار کر۔ اِس سے کیا مراد ہے۔ اِس سے یہی مراد ہے کہ تبلیغ کا جو عظیم الشّان کام تیرے سپرد تھا دقائق تبلیغ کا پورا پورا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اِس لئے اگر اس میں کوئی کمی رہی ہو تو اللہ تعالیٰ اُسے معاف کر دے۔ یہ استغفار تو نبیوں اور راست بازوں کی جان بخش اور عزیز بخش چیز ہے۔ اب اِس پر نادان اور کوتاہ اندیش اعتراض کرتے ہیں۔ جہاں استغفار کا لفظ انہوں نے سُن لیا جھٹ اعتراض کر دیا حالانکہ اپنے گھر میں دیکھیں تو مسیح کہتا ہے مجھے نیک مت کہہ۔ اِس کی تاویل عیسائی یہ کرتے ہیں کہ مسیح کا منشاء یہ تھا کہ مجھے خدا کہو۔ یہ کیسے تعجب کی بات ہے۔ کیا مسیحؑ کو ان کی والدہ مریم یا اُن کے بھائی خدا کہتے تھے جو وہ یہی آرزو اس شخص سے رکھتے تھے کہ وہ بھی خدا کہے۔ انہوں نے یہ لفظ تو اپنے عزیزوں اور شاگردوں سے بھی نہیں سُنا تھا۔ وہ بھی اُستاد اُستاد ہی کرتے تھے پھر یہ آرزو اس غریب سے کیونکر ان کو ہوئی۔ کیا وہ خوش ہوتے تھے کہ

کوئی انہیں خدا کہے یہ بالکل غلط ہے اُن کو نہ کسی نے خدا کہا اور نہ انہوں نے کہلوایا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰ ر اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

ہم کو وہ مشکلات پیش نہیں آئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئے باوجود اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے جب تک پورے کامیاب نہیں ہوگئے اور آپ نے اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا کا نظارہ دیکھ نہ لیا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۳ مورخہ ۲۴ ر ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کروڑ معجزوں سے بڑھ کر معجزہ تو یہ تھا کہ جس غرض کے لئے آئے تھے اُسے پُورا کر گئے۔ یہ ایسی بے نظیر کامیابی ہے کہ اس کی نظیر کسی دوسرے نبی میں کامل طور سے نہیں پائی جاتی حضرت موسیٰ بھی رستے ہی میں مَر گئے اور حضرت مسیح کی کامیابی تو اُن کے حواریوں کے سلوک سے ہویدا ہے۔ ہاں آپ کو ہی یہ شان حاصل ہوئی کہ جب گئے تو وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا یعنی دین اللہ میں فوجوں کی فوجیں داخل ہوتے دیکھ کر۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۹ مورخہ ۹ رمئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت مبعوث ہوئے تھے جب فسق وفجور، شرک اور بُت پرستی اپنے اِنتہاء کو پہنچ چکی تھی اور ظَهَرَ الۡفَسَادُ فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ (۳۰/۴۲) والا معاملہ ہو رہا تھا اور گئے اُس وقت تھے جب وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا والا نظارہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا تھا اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کی نظیر تمام دُنیا میں نہیں پائی جاتی اور یہی تو کاملیت ہے کہ جس مقصود کے لئے آئے تھے اس کو پورا کر کے دکھا دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام تو صلیب کا ہی مُنہ دیکھتے پھرے اور یہودیوں سے رہائی نہ پا سکے مگر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غالب ہوکر وہ اَخلاق دکھائے جن کی نظیر نہیں ملتی۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ ر اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

.....شیعہ لوگ جس راہ کو اختیار کئے ہوئے ہیں اُس راہ سے تو نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا مذہب ہی برباد ہو جاتا ہے۔ دیکھو اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ۙ وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۙ اِس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دینِ الٰہی یعنی اِسلام میں بہت کثرت اور بُہتات سے لوگ شامل ہوں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عینِ حیات میں ہی ایسا ظہور میں آوے گا۔ بھلا اِن لوگوں سے کوئی پوچھے کہ کیا دو چار آدمیوں کا نام ہی افواج ہے اور کیا یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی لمبی محنت اور جانکاہ کوششوں کا نتیجہ تھا۔ افسوس۔ دیکھو فوج ہی کچھ کم نہیں ہوتی یہاں تو اللہ تعالیٰ نے فوج کی بھی جمع کا لفظ بولا ہے اور اَفۡوَاجًا کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں فوجوں کی فوجیں داخلِ اسلام ہو جاویں گی۔

ان لوگوں کے عقائد کے لحاظ سے تو قرآن شریف ہی کی تکذیب لازم آتی ہے۔ انہوں نے قرآن شریف کو تو محرّف مبدّل کا الزام دے کر چھوڑ دیا۔ رہے قرآن شریف کے پہنچانے والے جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ فرمایا اور ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تخت کا وارث بنایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ سے نکلی ہوئی پیشگوئیوں کی تصدیق کرنے والے اور پورا کرنے والے بتایا۔ انہی کے ہاتھ سے بڑے بڑے قرآنی وعدے پُورے کئے۔ قیصرو کسریٰ کے تخت اور خزانے انہی کے ذریعہ اسلام کا ورثہ بنائے سوان کو غدار، ظالم، منافق اور غاصب کا لقب دے کر چھوڑ دیا۔ ان کا تو وہ حال ہے جس طرح ایک عورت کو جب اسکے دن حمل کے پُورے ہو چکتے ہیں تو دردِ زِہ شروع ہوتا ہے جس کی تکلیف سے وہ اور اس کے عزیز واقارب اور خویش روتے اور دَرد مند ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایک تاریک حالت ہوتی ہے نتیجہ کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ مگر جب اس کے ہاں لڑکا پیدا ہو جاوے اور وہ چلّہ پورا کر کے غسل صحت بھی کرلے اور بچّہ بھی اس کا صحیح سالم جیتا جاگتا ہو اس وقت لگے کوئی آدمی رونے تو اُس کا رونا کیسا بے محل اور بے موقع ہوگا۔

سو یہی حال ہے ان کا۔ وقت گذر چکا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کامیابی کے ساتھ تختِ خلافت کو مقررہ وقت تک زیب دے کر اپنی اپنی خدمات بجالا کر بڑی کامیابی اور اللہ تعالیٰ کی رضوان لے کر چل بسے اور جنّات و عیون جو آخرت میں ان کے واسطے مقرر تھے اور وعدے تھے وہ ان کو عطا ہو گئے۔ اب یہ روتے ہیں اور چلّاتے ہیں کہ نعوذ باللہ ایسے تھے اور ایسے تھے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۰ مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

سُورۃ اللّھب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۲۔ تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّتَبَّ۝

(الہام) ابولہب کے دونو ہاتھ ہلاک ہوگئے اور وہ بھی ہلاک ہؤا۔ (براہینِ احمدیہ صفحہ ۵۱۰ حاشیہ)

(الہام) ابولہب کے ہاتھ ہلاک ہوگئے اور وہ بھی ہلاک ہوگیا..... ابولہب سے مراد وہ شخص ہے جس نے فتنہ کی آگ کو مسلمانوں میں بھڑکایا اور اہلِ اسلام کو کافر قرار دیا اور عیسائیوں کی تائید کی۔ پس چونکہ اس کا کام آگ بھڑکانا اور مسلمانوں کو دھوکا میں ڈالنا تھا اِسی لئے اس کا نام ابولہب ہؤا کیونکہ لَہَبۡ زبانۂ آتش کو کہتے ہیں اور لسانِ عرب میں ایک چیز کے موجد کو اس کا باپ قرار دیتے ہیں پس چونکہ فتنہ کی آتش کا زمانہ اس شخص سے پیدا ہؤا ہے جس کا پیشگوئی میں ذکر ہے اِس لئے وہ اس زبانۂ آتش کا باپ ہؤا اور ابولہب کہلایا اور جہاں تک مَیں سمجھتا ہوں اِس جگہ ابولہب سے مراد شیخ محمد حسین بٹالوی ہے وَاللّٰہُ اَعۡلَم۔ کیونکہ اس نے کوشش کی کہ فتنہ کو بھڑکا وے۔

(ضیاء الحق صفحہ ۳۳)

(الہام) ہلاک ہوگئے دونو ہاتھ ابی لہب کے (جبکہ اس نے یہ فتویٰ لکھا) اور وہ آپ بھی ہلاک ہوگیا۔

..... اِس الہام میں سورۃ تبّت کی پہلی آیت کا مصداق اس شخص کو ٹھہرایا ہے جس نے سب سے پہلے خدا کے مسیح موعود پر تکفیر اور توہین کے ساتھ حملہ کیا۔ اور یہ دلیل اِس بات پر ہے کہ قرآن شریف نے بھی اسی سُورت میں ابولہب کے ذکر میں علاوہ دشمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مسیح موعود کے دشمن کو بھی مراد لیا ہے اور یہ تفسیر اس الہام کے ذریعہ سے کُھلی ہے..... اِس لئے یہ تفسیر سراسر حقانی ہے اور تکلف اور تصنّع سے پاک ہے.....

غرض آیت تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّتَبَّ جو قرآن شریف کے آخری سپارہ میں چار آخری سُورتوں میں سے پہلی سُورت ہے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مُوذی دشمنوں پر دلالت کرتی ہے ایسا ہی بطور

اشارۃ النص اسلام کے مسیح موعود کے ایذا دہندہ دشمنوں پر اس کی دلالت ہے ..... خلاصہ کلام یہ کہ تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ جو قرآن شریف کے آخر میں ہے آیت مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کی ایک شرح ہے جو قرآن شریف کے اوّل میں ہے کیونکہ قرآن شریف کے بعض حصے بعض کی تشریح ہیں۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۷۵، ۷۶)

سُورۃ تَبَّتْ کی پہلی آیت یعنی تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ اُس مُوذی کی طرف اشارہ کرتی ہے جو مظہر جمالِ احمدی یعنی احمد مہدی کا مکفّر اور مکذّب اور مہین ہوگا۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۷۴)

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ..... سے مراد وہ لوگ ہیں جو مسیح موعود کو دُکھ دیں گے اور اس دعا کے مقابل پر قرآن شریف کے اخیر میں سُورۃ تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۷۶)

تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ یعنی ہلاک ہوگئے دونوں ہاتھ ابی لہب کے یعنی بیکار ہوگئے اور وہ بھی ہلاک ہو گیا یعنی ضلالت کے گڑھے میں گرا۔ (نزول المسیح صفحہ ۱۵۲، ۱۵۳)

ماضی مضارع کے معنوں پر بھی آجاتی ہے بلکہ ایسے مقامات میں جب کہ آنے والا واقعہ متکلم کی نگاہ میں یقینی الوقوع ہو مضارع کو ماضی کے صیغہ پر لاتے ہیں تا اُس امر کا یقینی الوقوع ہونا ظاہر ہو اور قرآن شریف میں اس کی بہت نظیریں ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ..... تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۷)

خدا تعالیٰ نے جا بجا قرآن شریف میں عظیم الشّان پیشگوئیوں کو ماضی کے لفظ سے بیان کیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ۔ (ضمیمہ براہینِ احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۶)

ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہوگئے اور وہ آپ بھی ہلاک ہوگیا۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ششم صفحہ ۵۴ حاشیہ)

سُورۃ تَبَّتْ میں غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ[1] کے فتنہ کی طرف اشارہ ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ ، فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ خواب میں پڑھنے کی تعبیر کے متعلق فرمایا:

"کسی دشمن پر فتح ہوگی"

(البدر جلد اوّل نمبر ۱۱ مورخہ ۹ جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۸۴)

---

[1] سُورۃ الفاتحۃ : ۷

۵. وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝

ابولہب قرآن کریم میں عام ہے نہ خاص۔ مُراد وہ شخص ہے جس میں التہاب و اشتعال کا مادّہ ہو۔ اسی طرح حَمَّالَةَ الْحَطَبِ۔ ہیزم کش عورت سے مراد ہے جو سخن چین ہو۔ آگ لگانے والی چغلخور عورت آدمیوں میں شرارت کو بڑھاتی ہے۔ سعدیؒ کہتا ہے ؎

سخن چین بدبخت ہیزم کش است

(الحکم جلد ۲ نمبر ۲ مورخہ ۶ر مارچ ۱۸۹۸ء صفحہ ۲)

○

سُورۃ الاِخلاص

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

قُلۡ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۝ لَمۡ یَلِدۡ ۬ۙ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ ۝ وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝

اِس اقل عبارت کو جو بقدر ایک سطر بھی نہیں، دیکھنا چاہیئے کہ کس لطافت اور عمدگی سے ہر ایک قسم کی شراکت سے وجودِ حضرتِ باری کا منزّہ ہونا بیان فرمایا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شرکت از رُوئے حصرِ عقلی چار قسم پر ہے کبھی شرکت عدد میں ہوتی ہے اور کبھی مرتبہ میں اور کبھی نسب میں اور کبھی فعل اور تاثیر میں۔ سو اِس سُورت میں اُن چاروں قسموں کی شرکت سے خدا کا پاک ہونا بیان فرمایا اور کھول کر بتلا دیا کہ وہ اپنے عدد میں ایک ہے دو یا تین نہیں اور وہ صمد ہے یعنی اپنے مرتبہ وجُوب اور محتاج الیہ ہونے میں منفرد اور یگانہ ہے اور بجُز اس کے تمام چیزیں ممکن الوجود اور ہالکۃ الذّات ہیں جو اُس کی طرف ہر دَم محتاج ہیں اور وہ لَمۡ یَلِدۡ ہے یعنی اُس کا کوئی بیٹا نہیں تا بوجہ بیٹا ہونے کے اُس کا شریک ٹھہر جائے اور وہ لَمۡ یُوۡلَدۡ ہے یعنی اس کا کوئی باپ نہیں تا بوجہ باپ ہونے کے اُس کا کوئی شریک بن جائے اور وہ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ کُفُوًا ہے یعنی اس کے کاموں میں کوئی اُس سے برابری کرنے والا نہیں تا باعتبار فِعل کے اُس کا کوئی شریک قرار پاوے۔ سو اس طور سے ظاہر فرما دیا کہ خدائے تعالیٰ چاروں قِسم کی شرکت سے پاک اور منزّہ ہے اور وحدہٗ لاشریک ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۳۲ حاشیہ)

قرآن کریم کی صاف تعلیم یہ ہے کہ وہ خداوندِ وحید و حمید جو بالذّات توحید کو چاہتا ہے اُس نے اپنی مخلوق کو متشارک الصّفات رکھا ہے اور بعض کو بعض کا مثیل اور شبیہہ قرار دیا ہے تا کسی فردِ خاص کی کوئی خصوصیّت جو ذات وافعال واقوال اور صفات کے متعلق ہے اِس دھوکہ میں نہ ڈالے کہ وہ فردِ خاص اپنے بنی نوع سے بڑھ کر ایک ایسی

خاصیت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص نہ اصلاً و نہ ظِلّاً اس کا شریک نہیں اور خدا تعالیٰ کی طرح کسی اپنی صفت میں واحد لاشریک ہے چنانچہ قرآن کریم میں سورۃ اِخلاص اِسی بھید کو بیان کر رہی ہے کہ احدیّتِ ذات وصفات خدا تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ دیکھو اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۴، ۴۵)

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ..... وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ یعنی کہ خدا وہ عظیم الشان خدا ہے جو اس سے پاک ہے جو کسی عورت کے پیٹ سے نکلے اور جنایا جائے اور ہر یک چیز اس کی طرف محتاج ہے اور وہ کسی کی طرف محتاج نہیں اور اس کا کوئی قرابتی اور ہم جنس نہیں نہ باپ نہ ماں نہ بھائی نہ بہن اور نہ کوئی ہم مرتبہ اور پھر یہ کمال کیا ہے کہ لَمْ يَلِدْ کا لفظ جس کے یہ معنی ہیں کہ خدا کسی کا بیٹا نہیں کسی کا جنایا ہؤا نہیں۔ (ستّ بچن صفحہ ۱۳۹، ۱۴۰)

وہ خدا اکیلا ہے نہ وہ کسی کا بیٹا اور نہ کوئی اس کا بیٹا۔ اور نہ کوئی اس کے برابر اور نہ کوئی اس کا ہم جنس۔

(اِسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹۲)

حُسن ایک ایسی چیز ہے جو بالطبع دل کی طرف کھینچا جاتا ہے اور اس کے مشاہدہ سے طبعاً محبت پیدا ہوتی ہے تو حُسنِ باری تعالیٰ اس کی وحدانیت اور اس کی عظمت اور بزرگی اور صفات ہیں جیسا کہ قرآن شریف نے فرمایا ہے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۞ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۞ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۞ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۞ یعنی خدا اپنی ذات اور صفات اور جلال میں ایک ہے کوئی اس کا شریک نہیں سب اس کے حاجت مند ہیں۔ ذرہ ذرہ اسی سے زندگی پاتا ہے۔ وہ کُل چیزوں کے لئے مبداءِ فیض ہے اور آپ کسی سے فیض یاب نہیں۔ وہ نہ کسی کا بیٹا ہے اور نہ کسی کا باپ۔ اور کیونکر ہو کہ اس کا کوئی ہم ذات نہیں۔ قرآن نے بار بار خدا کا کمال پیش کر کے اور اس کی عظمت دکھلا کے لوگوں کو توجہ دلائی ہے کہ دیکھو ایسا خدا دلوں کو مرغوب ہے نہ کہ مُردہ اور کمزور اور کم رحم اور کم قدرت۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۰۲)

توریت میں خدا تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ کا کہیں پورے طور پر ذکر نہیں۔ اگر توریت میں کوئی ایسی سُورت ہوتی جیسا کہ قرآن شریف میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۞ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۞ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۞ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۞ ہے تو شاید عیسائی اس مخلوق پرستی کی بَلا سے رُک جاتے۔ (کتاب البریہ صفحہ ۶۰)

اُن کو کہہ دے کہ وہ سچا خدا ایک خدا ہے جو کسی کا باپ نہیں اور نہ کسی کا بیٹا اور نہ اُس کا کوئی ہم جنس ہے۔

(تریاق القلوب صفحہ ۹۶)

دعا وَلَا الضَّآلِّيْنَ[1] ..... کے مقابل پر قرآن شریف کے اخیر میں سورۃ اخلاص ہے یعنی قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۞

---

[1] سُورۃ الفاتحۃ : ۷

اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ یَلِدْ ۝ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝ ..... سُورۃ فاتحہ میں ...... وہ اہم مقصد جو قرآن میں مفصل بیان کیا گیا ہے ..... بطور اجمال اس کا افتتاح کیا ہے اور پھر سُورۃ تَبَّتْ اور سُورۃ اخلاص اور سُورۃ فلق اور سُورۃ النّاس میں ختم قرآن کے وقت میں انہی دونو بلاؤں سے خدا تعالیٰ کی پناہ مانگی گئی ہے پس افتتاح کتاب اللہ بھی انہی دونوں دعاؤں سے ہوُا اور پھر اختتام کتاب اللہ بھی انہی دونوں دعاؤں پر کیا گیا۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۷۶)

تم اے مسلمانو۔ نصاریٰ سے کہو کہ وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے نہ اس سے کوئی پیدا ہوُا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوُا اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۷۸)

قرآن نے اپنے اول میں بھی مَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ[1] اور ضَآلِّیْنَ[2] کا ذکر فرمایا ہے اور اپنے آخر میں بھی جیساکہ آیت لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ بصراحت اس پر دلالت کر رہی ہے اور یہ تمام اہتمام تاکید کے لئے کیا گیا اور نیز اس لئے کہ تا مسیح موعود اور غلبۂ نصرانیت کی پیشگوئی نظری نہ رہے اور آفتاب کی طرح چمک اُٹھے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۷۸)

آخری مظہر شیطان کے اسم دجّال کا جو مظہر اتم اور اکمل اور خاتم المظاہر ہے وہ قوم ہے جس کا قرآن کے اوّل میں بھی ذکر ہے اور قرآن کے آخر میں بھی یعنی وہ ضالّین کا فرقہ جس کے ذکر پر سُورۃ فاتحہ ختم ہوتی ہے اور پھر قرآن شریف کی آخری تین سورتوں میں بھی اس کا ذکر ہے یعنی سورۃ اخلاص اور سورۃ فلق اور سورۃ ناس میں .... سورۃ اخلاص میں تو اس قوم کی اعتقادی حالت کا بیان ہے جیساکہ فرمایا قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ یَلِدْ ۝ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝ یعنی خدا ایک ہے اور اَحد ہے یعنی اس میں کوئی ترکیب نہیں۔ نہ کوئی اس کا بیٹا اور نہ وہ کسی کا بیٹا اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔ پس اس سورت میں تو اس قوم کے عقائد بتلائے گئے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۴ حاشیہ)

قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۝ کہ وہ معبودِ حقیقی جس کی طرف سب چیزیں عبودیتِ تامہ کی فنا کے بعد یا قہری فنا کے بعد رجوع کرتی ہیں ایک ہے باقی سب مخلوقات دو قسم فنا میں سے کسی فنا کے نیچے ہیں اور سب چیزیں اس کی محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں۔ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وہ ایسا ہے کہ نہ تو اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے۔ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ اور اَزل سے اس کا کوئی نظیر اور مثیل نہیں۔ یعنی وہ اپنی ذات میں نظیر اور مثیل سے پاک اور منزہ ہے..... دونوں سورتوں (اخلاص اور فلق) میں ایک ہی فرقہ[2] کا

---

[1] سورۃ الفاتحۃ : ۷   [2] یعنی نصاریٰ

ذکر ہے صرف فرق یہ ہے کہ سُورۃ اخلاص میں اس فرقہ کی اعتقادی حالت کا بیان ہے اور سُورت فلق میں اس فرقہ کی عملی حالت کا ذکر ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۵ حاشیہ)

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ...... میں وہ عقیدہ جو قبول کرنے کے لائق ہے پیش کیا گیا اور پھر لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ سکھا کر وہ عقیدہ جو رَدّ کرنے کے لائق ہے وہ بیان کیا گیا ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۱۲ حاشیہ)

قرآن کے آخر میں بھی عیسائیوں کا رَدّ ہے جیسا کہ سُورت قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۞ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۞ لَمْ یَلِدْ ۞ وَلَمْ یُوْلَدْ ۞ سے سمجھا جاتا ہے۔ (کشتی نوح صفحہ ۷۵)

قرآن میں ہمارا خدا اپنی خوبیوں کے بارے میں فرماتا ہے قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۞ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۞ لَمْ یَلِدْ ۞ وَلَمْ یُوْلَدْ ۞ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۞ یعنی تمہارا خدا وہ خدا ہے جو اپنی ذات اور صفات میں واحد ہے۔ نہ کوئی ذات اُس کی ذات جیسی اَزلی اور اَبدی یعنی انادی اور اکال ہے نہ کسی چیز کے صفات اُس کی صفات کی مانند ہیں۔ انسان کا عِلم کسی معلّم کا محتاج ہے اور پھر محدود ہے مگر اُس کا علم کسی معلّم کا محتاج نہیں اور باایں ہمہ غیر محدود ہے انسان کی شنوائی ہَوا کی محتاج ہے اور محدود ہے مگر خدا کی شنوائی ذاتی طاقت سے ہے اور محدود نہیں۔ اور انسان کی بینائی سُورج یا کسی دوسری روشنی کی محتاج ہے اور پھر محدود ہے مگر خدا کی بینائی ذاتی روشنی سے ہے اور غیر محدود ہے۔ ایسا ہی انسان کی پَیدا کرنے کی قدرت کسی مادہ کی محتاج ہے اور نیز وقت کی محتاج اور پھر محدود ہے لیکن خدا کی پَیدا کرنے کی قدرت نہ کسی مادہ کی محتاج ہے نہ کسی وقت کی محتاج اور غیر محدود ہے کیونکہ اس کی تمام صفات بے مثل و مانند ہیں اور جیسے کہ اس کی کوئی مثل نہیں اس کی صفات کی بھی کوئی مثل نہیں۔ اگر ایک صفت میں وہ ناقص ہو تو پھر تمام صفات میں ناقص ہو گا۔ اِس لئے اس کی توحید قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اپنی ذات کی طرح اپنے تمام صفات میں بے مثل و مانند نہ ہو۔ پھر اس سے آگے آیت ممدوحہ بالا کے یہ معنے ہیں کہ خدا نہ کسی کا بیٹا ہے اور نہ کوئی اس کا بیٹا ہے کیونکہ وہ غنی بالذّات ہے۔ اس کو نہ باپ کی حاجت ہے اور نہ بیٹے کی۔ یہ توحید ہے جو قرآن شریف نے سکھلائی ہے جو مدارِ ایمان ہے۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۸،۹)

اُن کو کہہ دے کہ خدا وہی ہے جو ایک ہے اور بے نیاز ہے۔ نہ اُس کا کوئی بیٹا اور نہ وہ کسی کا باپ اور نہ کوئی اس کا ہم کفو۔ (تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۶ صفحہ ۵۳)

اگر آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلم) تشریف نہ لاتے تو نبوّت تو درکنار خدائی کا ثبوت بھی اس طرح نہ ملتا۔ آپؐ کی تعلیم سے پتہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۞ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۞ لَمْ یَلِدْ ۞ وَلَمْ یُوْلَدْ ۞ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۞ کا لگا۔ اگر توریت میں کوئی ایسی تعلیم ہوتی اور قرآن صرف اُس کی تصریح ہی کرتا تو نصاریٰ کا وجود ہی کیوں ہوتا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۱، ۵۲)

زمین و آسمان کی شہادتیں کسی مصنوعی اور بناوٹی خدا کی ہستی کا ثبوت نہیں دیتیں بلکہ اُس خدائے احد۔ الصمد۔ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کی ہستی کو دکھاتی ہیں جو زندہ اور قائم خدا ہے اور جسے اِسلام پیش کرتا ہے چنانچہ پادری فنڈر جس نے پہلے پہل ہندوستان میں آکر مذہبی مناظروں میں قدم رکھا اور اسلام پر نکتہ چینیاں کیں۔ اپنی کتاب میزان الحق میں خود ہی سوال کے طور پر لکھتا ہے کہ "اگر کوئی ایسا جزیرہ ہو جہاں تثلیث کی تعلیم نہ دی گئی ہو تو کیا وہاں کے رہنے والوں پر آخرت میں مواخذہ تثلیث کے عقیدہ کی بناء پر ہوگا؟" پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ اُن سے توحید کا مؤاخذہ ہوگا۔ اِس سے سمجھ لو کہ اگر توحید کا نقش ہر ایک شئے میں نہ پایا جاتا اور تثلیث ایک بناوٹی اور مصنوعی تصور نہ ہوتی تو عقیدۂ توحید کی بناء پر مؤاخذہ کیوں ہوتا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۷)

نصاریٰ کا فتنہ سب سے بڑا ہے اِس واسطے اللہ تعالیٰ نے ایک سورت قرآن شریف کی تو ساری کی ساری صرف ان کے متعلق خاص کر دی ہے یعنی سورۃ اخلاص اَور کوئی سورت ساری کی ساری کسی قوم کے واسطے خاص نہیں ہے۔ اَحَدٌ خدا کا اِسم ہے اور اَحَدٌ کا مفہوم وَاحِد سے بڑھ کر ہے۔ صَمَد کے معنی ہیں اَزل سے غنی بالذات جو بالکل محتاج نہ ہو۔ اقنوم ثلٰثہ کے ماننے سے وہ محتاج پڑتا ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۹)

کہہ دو کہ وہ خدا ایک ہے۔ ھُوَ خدا کا نام ہے۔ وہ ایک۔ وہ بے نیاز ہے۔ نہ کھانے پینے کی اُس کو ضرورت نہ زمان یا مکان کی حاجت نہ کسی کا باپ نہ بیٹا اور نہ کوئی اس کا ہمسا اور بے تغیر ہے۔ یہ چھوٹی سی سورت قرآن شریف کی ہے جو ایک سطر میں آجاتی ہے لیکن دیکھو کس خوبی اور عمدگی کے ساتھ ہر قسم کے شرک سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کی گئی ہے۔

حصرِ عقلی میں شرک کے جس قدر قسم ہو سکتے ہیں اُن سے اس کو پاک بیان کیا ہے۔ جو چیز آسمان اور زمین کے اندر ہے وہ ایک تغیر کے نیچے ہے مگر خدا تعالیٰ نہیں ہے۔ اَب یہ کیسی صاف اور ثابت شدہ صداقت ہے۔ دماغ اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ نورِ قلب جس کی شریعت دِل میں ہے اس پر شہادت دیتا ہے۔ قانونِ قدرت اسی کا مؤید و مصدق ہے یہاں تک کہ ایک ایک پتہ اس پر گواہی دیتا ہے پس اس کو شناخت کرنا ہی عظیم الشان بات ہے۔ خدا تعالیٰ نے جو قرآن شریف میں یہ چھوٹی سی سُورت نازل کی یہ ایسی ہے کہ اگر توریت کے سارے دفتر کی بجائے اُس میں اس قدر ہوتا تو یہود تباہ نہ ہوتے اور انجیل کے اِتنے بڑے مجموعہ کو چھوڑ کر اگر یہی تعلیم اُن کو دی جاتی تو آج دُنیا کا ایک بڑا حصہ ایک مُردہ پرست قوم نہ بن جاتا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

الضَّآلِّيۡنَ کے مقابل آخر کی تین سورتیں ہیں۔ اصل تو قُلْ ھُوَ اللّٰہُ ہے اور باقی دونوں سورتیں اس کی شرح ہیں۔ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ کا ترجمہ یہ ہے کہ نصاریٰ سے کہہ دو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اس کے برابر ہے۔

(الحکم جلد ۶ مث مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

قصیدوں میں واقعات کا نبھانا مشکل امر ہوا کرتا ہے۔ شاعر ایسا نہیں کر سکتے۔ اُن کو قافیہ اور ردیف کے لئے بالکل بے جوڑ باتیں اور الفاظ لانے پڑتے ہیں۔ اس کے مقابل پر قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ کو دیکھو۔

(البدر جلد ۱ مث مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۸)

ہمارا خدا لَمْ یَلِدْ ہے اور کس قدر خوشی اور شکر کا مقام ہے کہ جس خدا کو ہم نے مانا اور اسلام نے پیش کیا ہے وہ ہر طرح کامل اور قدوس ہے اور کوئی نقص اس میں نہیں۔ دو خوبیاں کامل طور پر اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں اور ساری صفات اُن کو بیان کرتی ہیں۔ چنانچہ اول یہ کہ اس میں ذاتی حُسن ہے اور اسی کے متعلق لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ [1] فرمایا۔ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ فرمایا اور کہا کہ وہ الصَّمَدُ ہے، بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا بیٹا ہے نہ اس کا کوئی بیٹا ہے۔ نہ اس کا کوئی ہمتا اور ہمسر ہے۔ (الحکم جلد ۷ مٹا مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

---

[1] سورۃ الشوریٰ : ۱۲

سُورۃ الفلق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ۙ○ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ○ وَ مِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ○ وَ مِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ ۙ○ وَ مِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ○

کہہ مَیں شریر مخلوقات کی شرارتوں سے خدا کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں اور اندھیری رات سے خدا کی پناہ میں آتا ہوں یعنی یہ زمانہ اپنے فسادِ عظیم کے رُو سے اندھیری رات کی مانند ہے سو الٰہی قوتیں اور طاقتیں اِس زمانہ کی تنویر کے لئے درکار ہیں انسانی طاقتوں سے یہ کام انجام ہونا محال ہے۔

(براہینِ احمدیہ صفحہ ۵۰۷ حاشیہ در حاشیہ ۳)

سورۃ الفلق اور سورۃ النّاس یہ دونوں سورتیں سورۃ تبّت اور سورۃ اخلاص کے لئے بطور شرح کے ہیں اور ان دونوں سورتوں میں اس تاریک زمانہ سے خدا کی پناہ مانگی گئی ہے جب کہ لوگ خدا کے مسیح کو دُکھ دیں گے اور جب کہ عیسائیت کی ضلالت تمام دُنیا میں پھیلے گی۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۶۰)

..... تم جو نصاریٰ کا فتنہ دیکھو گے اور مسیح موعود کے دشمنوں کا نشانہ بنو گے یُوں دعا مانگا کرو کہ مَیں مخلوق کے شر سے جو اندرونی اور بیرونی دشمن ہیں اس خدا کی پناہ مانگتا ہوں جو صبح کا مالک ہے یعنی روشنی کا ظاہر کرنا اس کے اختیار میں ہے اور مَیں اس اندھیری رات کے شر سے جو عیسائیت کے فتنہ اور انکارِ مسیح موعود کے فتنہ کی رات ہے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ اُس وقت کے لئے یہ دعا ہے جب کہ تاریکی اپنے کمال کو پہنچ جائے

اور میں خدا کی پناہ ان زن مزاج لوگوں کی شرارت سے مانگتا ہوں جو گنڈوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکتے ہیں (یعنی جو عقدے شریعتِ محمدیہ میں قابلِ حل ہیں اور جو ایسے مشکلات اور معضلات ہیں جن پر جاہل مخالف اعتراض کرتے ہیں اور ذریعہ تکذیب دین ٹھہراتے ہیں۔ اُن پر اَور بھی عناد کی وجہ سے پھونکیں مارتے ہیں یعنی شریر لوگ اسلامی دقیق مسائل کو جو ایک عقدہ کی شکل پر ہیں دھوکہ دہی کے طور پر ایک پیچیدہ اعتراض کی صورت پر بنا دیتے ہیں تا لوگوں کو گمراہ کریں۔ اُن نظری اُمور پر اپنی طرف سے کچھ حاشیے لگا دیتے ہیں اور یہ لوگ دو۲ قسم کے ہیں ایک تو صریح مخالف اور دشمنِ دین ہیں جیسے پادری جو ایسی تراش خراش سے اعتراض بناتے رہتے ہیں اور دوسرے وہ علمائے اسلام ہیں جو اپنی غلطی کو چھوڑنا نہیں چاہتے اور نفسانی پھونکوں سے خدا کے فطری دین میں عقدے پیدا کر دیتے ہیں اور زنانہ خصلت رکھتے ہیں کہ کسی مردِ خدا کے سامنے میدان میں نہیں آسکتے صرف اپنے اعتراضات کو تحریف تبدیل کی پھونکوں سے عقدۂ لاینحل کرنا چاہتے ہیں اور اِس طرح پر زیادہ تر مشکلات خدا کے مصلح کی راہ میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ قرآن کے مکذّب ہیں کہ اس کی منشاء کے برخلاف اصرار کرتے ہیں اور اپنے ایسے افعال سے جو مخالفِ قرآن ہیں اور دشمنوں کے عقائد سے ہم رنگ ہیں دشمنوں کو مدد دیتے ہیں۔ پس اِس طرح اُن عُقدوں میں پھونک مار کر ان کو لاینحل بنانا چاہتے ہیں پس ہم ان شرارتوں سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں) اور نیز ہم ان لوگوں کی شرارتوں سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں جو حَسد کرتے اور حَسد کے طریقے سوچتے ہیں اور ہم اس وقت سے پناہ مانگتے ہیں جب وہ حَسد کرنے لگیں۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۷۸)

آخری مظہر شیطان کے اِسم دجّال کا جو مظہر اتم اور اکمل اور خاتم المظاہر ہے وہ قوم ہے جس کا قرآن کے اوّل میں بھی ذکر ہے اور قرآن کے آخر میں بھی یعنی وہ ضالّین کا فرقہ جس کے ذکر پر سورۃ فاتحہ ختم ہوتی ہے اور پھر قرآن شریف کی آخری تین سورتوں میں بھی اس کا ذکر ہے یعنی سورۃ اخلاص اور سورۃ فلق اور سورۃ ناس میں ..... سورۃ فلق میں یہ اشارہ کیا گیا کہ یہ قوم اسلام کے لئے خطرناک ہے اور اس کے ذریعہ سے آخری زمانہ میں سخت تاریکی پھیلے گی اور اس زمانہ میں اِسلام کو ایک بڑے شر کا سامنا ہوگا اور یہ لوگ مُعضلات اور دقائقِ دین ..... دردرگرہ دے کر مکّار عورتوں کی طرح لوگوں کو دھوکا دیں گے اور یہ تمام کاروبار محض حَسد کے باعث ہوگا جیسا کہ قابیل کا کاروبار حَسد کے باعث تھا فرق صرف یہ ہے کہ قابیل نے اپنے بھائی کا خون زمین پر گرایا مگر یہ لوگ بباعث جوشِ حَسد سچائی کا خون کریں گے۔ غرض سورۃ قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ میں اُن لوگوں کے عقائد کا بیان ہے اور سورۃ فلق میں ان لوگوں کے ان اعمال کی تشریح ہے جو قوت اور طاقت کے وقت ان سے ظاہر ہوں گے چنانچہ دونوں سورتوں کو بالمقابل رکھنے سے صاف سمجھ آتا ہے کہ پہلی سورۃ یعنی سورۃ اخلاص میں قومِ نصاریٰ کے اعتقادی حالات کا بیان ہے اور دوسری سورۃ میں عملی حالات کا ذکر ہے۔ اور سخت تاریکی سے آخری زمانہ کی طرف اشارہ ہے جبکہ یہ لوگ

اس رُوح کے مظہرِاتم ہوں گے جو خدا کی طرف سے منقل ہے اور ان دونوں سورتوں کے بالمقابل لکھنے سے جلد تر ان لطیف اشارات کا علم ہوسکتا ہے ..... قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ کہ مَیں پناہ مانگتا ہوں اُس رَبّ کی جس نے تمام مخلوقات پَیدا کی اِس طرح پر کہ ایک کو پھاڑ کر اس سے دوسرا پیدا کیا یعنی بعض کو بعض کا محتاج بنایا اور جو تاریکی کے بعد صبح کو پَیدا کرنے والا ہے۔ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں ایسی مخلوق کی شر سے جو تمام شریروں سے شر میں بڑھی ہوئی ہے اور شرارتوں میں اس کی نظیر ابتدائے دُنیا سے اخیر تک اَور کوئی نہیں جن کا عقیدہ امرِ حق لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ[1] کے برخلاف ہے یعنی وہ خدا کے لئے ایک بیٹا تجویز کرتے ہیں۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝ اور ہم پناہ مانگتے ہیں خدا تعالیٰ کی اس زمانہ سے جبکہ تثلیث اور شرک کی تاریکی تمام دُنیا پر پھیل جائے گی اور نیز اُن لوگوں کے شر سے کہ جو پھونکیں مار کر گرہیں دیں گے یعنی دھوکا دہی میں جادُو کا کام دکھائیں گے اور راہِ راست کی معرفت کو مشکلات میں ڈال دیں گے اور نیز اس بڑے حاسد کے حَسد سے پناہ مانگتا ہوں جبکہ وہ گروہ سراسر حَسد کی راہ سے حق پوشی کرے گا۔ یہ تمام اشارات عیسائی پادریوں کی طرف ہیں کہ ایک زمانہ آنے والا ہے جو وہ دُنیا میں شر پھیلائیں گے اور دُنیا کو تاریکی سے بھر دیں گے اور جادُو کی طرح ان کا دھوکا ہوگا اور وہ سخت حاسد ہوں گے اور اسلام کو حَسد کی راہ سے بنظرِ تحقیر دیکھیں گے اور لفظ رَبِّ الْفَلَقِ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس تاریکی کے بعد پھر صُبح کا زمانہ بھی آئے گا جو مسیح موعود کا زمانہ ہے ..... اِن دونوں سُورتوں (اخلاص اور فلق) میں ایک ہی فرقہ کا ذکر ہے صرف فرق یہ ہے کہ سورۃ اخلاص میں اس فرقہ کی اعتقادی حالت کا بیان ہے اور سورۃ فلق میں اس فرقہ کی عملی حالت کا ذکر ہے اور اس فرقہ کا نام سورۃ الفلق میں شَرِّ مَا خَلَقَ رکھا گیا ہے یعنی شَرُّ الْبَرِيَّه۔ اور احادیث پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دجّال معہود کا نام بھی شر البریّہ ہے کیونکہ آدم کے وقت سے اخیر تک شر میں اُس کے برابر کوئی نہیں۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۴، ۱۰۵ حاشیہ)

سورۃ فلق میں یعنی آیت وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ میں آنے والی ایک سخت تاریکی سے ڈرایا گیا اور فقرہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ میں آنے والی ایک صبحِ صادق کی بشارت دی گئی اور اس مطلب کے حصول کے لئے سورۃ النّاس میں صبر اور ثبات کے ساتھ وساوس سے بچنے کے لئے تاکید کی گئی۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۱۲ حاشیہ)

الضَّآلِّيْن کے مقابل آخر کی تین سورتیں ہیں۔ اصل تو قُلْ هُوَ اللّٰهُ ہے اور باقی دونوں سورتیں اس کی

---

[1] سورۃ الاخلاص: ۴

شرح ہیں.....

سورۃ الفلق میں اِس فتنہ سے بچنے کے لئے یہ دعا سکھائی قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ یعنی تمام مخلوق کے شر سے اس خدا کی پناہ مانگتا ہوں جو رَبّ الفلق ہے یعنی صبح کا مالک ہے یا روشنی ظاہر کرنا اسی کے قبضہ و اقتدار میں ہے۔ رَبِّ الْفَلَقِ کا لفظ بتاتا ہے کہ اِس وقت عیسائیت کے فتنہ اور مسیح موعود کی تکفیر اور توہین کے فتنہ کی اندھیری رات احاطہ کرے گی اور پھر کھول کر کہا کہ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ اور مَیں اس اندھیری رات کے شر سے جو عیسائیت کے فتنہ اور مسیح موعود کے انکار کے فتنہ کی شبِ تار ہے، پناہ مانگتا ہوں۔ پھر فرمایا وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ اور مَیں ان زنانہ سیرت لوگوں کی شرارت سے پناہ مانگتا ہوں جو گنڈوں پر پھونکیں مارتے ہیں۔ گرہوں سے مراد وہ مُعضِلات اور مشکلات شریعتِ محمدیہ ہیں جن پر جاہل مخالف اعتراض کرتے ہیں اور ان کو ایک پیچیدہ صورت میں پیش کر کے لوگوں کو دھوکہ میں ڈالتے ہیں اور یہ دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو پادری اور ان کے دوسرے پس خوردہ کھانے والے اور دوسرے وہ ناواقف اور ضدی مُلاں ہیں جو اپنی غلطی کو تو چھوڑتے نہیں اور اپنی نفسانی پھونکوں سے اِس صاف دین میں اَور بھی مشکلات پیدا کر دیتے ہیں اور زنانہ خصلت رکھتے ہیں کہ خدا کے مامور و مُرسل کے سامنے آتے نہیں۔ پس ان لوگوں کی شرارتوں سے پناہ مانگتے ہیں اور ایسا ہی اِن حاسدوں کے حسد سے پناہ مانگتے ہیں اور اس وقت سے پناہ مانگتے ہیں جب وہ حسد کرنے لگیں۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

بعض لوگ اِس قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے سوا اَوروں پر بھروسہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں اگر فلاں نہ ہوتا تو مَیں ہلاک ہو جاتا میرے ساتھ فلاں نے اِحسان کیا۔ وہ نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مَیں اُس خدا کی پناہ مانگتا ہوں جس کی تمام پرورشیں ہیں۔ رَبّ یعنی پرورش کنندہ وہی ہے اس کے سوا کسی کا رحم اور کسی کی پرورش نہیں ہوتی حتّٰی کہ جو ماں باپ بچے پر رحمت کرتے ہیں دراصل وہ بھی اسی خدا کی پرورشیں ہیں اور بادشاہ جو رعایا سے اِنصاف کرتا ہے اور اُس کی پرورش کرتا ہے وہ سب بھی اصل میں خدا تعالیٰ کی مہربانی ہے۔

اِن تمام باتوں سے اللہ تعالیٰ یہ سکھلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے برابر کوئی نہیں۔ سب کی پرورشیں اسی کی پرورشیں ہیں بعض لوگ بادشاہوں پر بھروسہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں نہ ہوتا تو مَیں تباہ ہو جاتا اور میرا فلاں کام بادشاہ نے کر دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یاد رکھو کہ ایسا کہنے والے کافر ہوتے ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ کافر نہ بنے۔ اور مومن نہیں ہوتا جب تک کہ دِل سے ایمان نہ رکھے کہ سب پرورشیں اور رحمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

اِنسان کو اس کا دوست ذرّہ بھی فائدہ نہیں دے سکتا جب تک کہ خدا تعالیٰ کا رحم نہ ہو۔ اسی طرح بچے اور تمام

رشتہ داروں کا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ کا رحم ہونا ضروری ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ دراصل میں ہی تمہاری پرورش کرتا ہوں۔ جب تک خدا تعالیٰ کی پرورش نہ ہو تو کوئی پرورش نہیں کرسکتا۔ دیکھو جب خدا تعالیٰ کسی کو بیمار ڈال دیتا ہے تو بعض دفعہ طبیب کتنا ہی زور لگاتے ہیں مگر وہ ہلاک ہوجاتا ہے۔ طاعون کے مرض کی طرف غور کرو سب ڈاکٹر زور لگا چکے مگر یہ مرض دفع نہ ہوا۔ اصل یہ ہے کہ سب بھلائیاں اُس کی طرف سے ہیں اور وہی ہے کہ جو تمام بدیوں کو دُور کرتا ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۴ مورخہ ۳ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۸۱)

مِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ۔ غاسق عربی میں تاریکی کو کہتے ہیں جو کہ بعد زوال شفق اوّل چاند کو ہوتی ہے اور اسی لئے لفظ قمر پر بھی اس کی آخری راتوں میں بولا جاتا ہے جبکہ اس کا نور جاتا رہتا ہے اور خسوف کی حالت میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں مِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کے یہ معنے ہیں مِنۡ شَرِّ ظُلۡمَۃٍ اِذَا دَخَلَ یعنی ظلمت کی بُرائی سے جب وہ داخل ہو۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۶ مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۳)

مِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ۔ اصل میں صفات کُل نیک ہوتے ہیں جب اُن کو بے موقع اور ناجائز طور پر استعمال کیا جاوے تو وہ بُرے ہوجاتے ہیں اور اُن کو گندہ کردیا جاتا ہے لیکن جب ان ہی صفات کو افراط تفریط سے بچا کر محل اور موقع پر استعمال کیا جاوے تو ثواب کا موجب ہوجاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا ہے مِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ اور دوسری جگہ اَلسَّابِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ۔ اَب سبقت لے جانا بھی تو ایک قسم کا حسد ہی ہے۔ سبقت لے جانے والا کب چاہتا ہے کہ اس سے اَور کوئی آگے بڑھ جاوے۔ یہ صفت بچپن ہی سے انسان میں پائی جاتی ہے۔ اگر بچوں کو آگے بڑھنے کی خواہش نہ ہو تو وہ محنت نہیں کرتے اور کوشش کرنے والے کی استعداد بڑھ جاتی ہے۔ سابقون گویا حاسد ہی ہوتے ہیں لیکن اس جگہ حسد کا مادہ مصفّٰی ہوکر سابق ہوجاتا ہے۔ اسی طرح حاسد ہی بہشت میں سبقت لے جاویں گے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۲ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ اوّل)

○

سورۃ الناس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِکِ النَّاسِ ۝ اِلٰہِ النَّاسِ ۝ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ ۬ۙ الۡخَنَّاسِ ۪ۙ الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ ۝

دجّال معہود ایک شخص نہیں ہے ورنہ ناس کا لفظ اُس پر اطلاق نہ پاتا اور اِس میں کیا شک ہے کہ ناس کا لفظ صرف گروہ پر بولا جاتا ہے۔ سو جو گروہ شیطان کے وساوس کے نیچے چلتا ہے وہ دجّال کے نام سے موسوم ہوتا ہے اسی کی طرف قرآن شریف کی اِس ترتیب کا اشارہ ہے کہ وہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ[1] سے شروع کیا گیا اور اِس آیت پر ختم کیا گیا اَلَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ ۝ پس لفظ ناس سے مراد اِس جگہ بھی دجّال ہے۔ ماحصل اِس سُورت کا یہ ہے کہ تم دجّال کے فتنہ سے خدا تعالیٰ کی پناہ پکڑو۔ اِس سُورت سے پہلے سورۃ اخلاص ہے جو عیسائیت کے اصول کے رَدّ میں ہے۔ بعد اس کے سُورۃ فلق ہے جو ایک تاریک زمانہ اور عورتوں کی مکّاری کی خبر دے رہی ہے اور پھر آخر ایسے گروہ سے پناہ مانگنے کا حکم ہے جو شیطان کے زیرِ سایہ چلتا ہے۔ اِس ترتیب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی گروہ ہے جس کو دوسرے لفظوں میں شیطان کہا ہے۔ اور اخیر میں اِس گروہ کے ذکر سے اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آخری زمانہ میں اس گروہ کا غلبہ ہوگا جن کے ساتھ نَفّٰثٰتِ

---

[1] سورۃ الفاتحۃ : ۲

فِی الْعُقَدِ ؕ[1] ہوں گی یعنی ایسی عیسائی عورتیں جو گھروں میں پھر کر کوشش کریں گی کہ عورتوں کو خاوندوں سے علیحدہ کریں اور عقدِ نکاح کو توڑیں۔ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ تینوں سُورتیں قرآن شریف کی دجّالی فتنہ کی خبر دے رہی ہیں اور حکم ہے کہ اس زمانہ سے خدا کی پناہ مانگو تا اس شر سے محفوظ رہو۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ شرور صرف آسمانی انوار اور برکات سے دُور ہوں گے جن کو آسمانی مسیح اپنے ساتھ لائے گا۔ (ایام الصلح صفحہ ۶۲)

اِس میں اللہ تعالیٰ نے حقیقی مستحق حمد کے ساتھ عارضی مستحق حمد کا بھی اشارۃً ذکر فرمایا ہے اور یہ اِس لئے ہے کہ اخلاقِ فاضلہ کی تکمیل ہو چنانچہ اِس سُورت میں تین قسم کے حق بیان فرمائے ہیں۔ اوّل فرمایا کہ تم پناہ مانگو اللہ کے پاس جو جامع جمیع صفاتِ کاملہ ہے اور جو ربّ ہے لوگوں کا۔ اور ملک بھی ہے اور معبود و مطلوبِ حقیقی بھی ہے۔ یہ سُورت اِس قسم کی ہے کہ اِس میں اصل توحید کو تو قائم رکھا ہے مگر معًا یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ دوسرے لوگوں کے حقوق بھی ضائع نہ کریں جو ان اسماء کے مظہر ظلّی طور پر ہیں۔ ربّ کے لفظ میں اشارہ ہے کہ گو حقیقی طور پر خدا ہی پرورش کرنے والا اور تکمیل تک پہنچانے والا ہے لیکن عارضی اور ظلّی طور پر دو اَور بھی وجود ہیں جو ربوبیّت کے مظہر ہیں ایک جسمانی طور پر دوسرا رُوحانی طور پر۔ جسمانی طور پر والدین ہیں اور رُوحانی طور پر مُرشد اور ہادی ہے۔

(روئیداد جلسہ دعا صفحہ ۱۰، ۱۱)

خدا تعالیٰ نے تکمیلِ اَخلاقِ فاضلہ کے لئے رَبِّ النَّاسِ کے لفظ میں والدین اور مُرشد کی طرف ایماء فرمایا ہے تاکہ اس مجازی اور مشہود سلسلہ شُکر گزاری سے حقیقی ربّ و ہادی کی شُکر گزاری میں قدم اُٹھائیں۔ اِسی راز کے حل کی یہ کلید ہے کہ اِس سورہ شریف کو رَبِّ النَّاسِ سے شروع فرمایا ہے اِلٰہِ النَّاسِ سے آغاز نہیں کیا۔ چونکہ مُرشدِ روحانی خدا تعالیٰ کے منشاء کے موافق اس کی توفیق و ہدایت سے تربیت کرتا ہے اِس لئے وہ بھی اس میں شامل ہے۔ پھر دوسرا ٹکڑا اِس میں مَلِكِ النَّاسِ ہے یعنی تم پناہ مانگو خدا کے پاس جو تمہارا بادشاہ ہے۔ یہ ایک اَور اشارہ ہے تا لوگوں کو متمدّن دُنیا کے اصول سے واقف کیا جاوے اور مہذّب بنایا جاوے حقیقی طور پر تو اللہ تعالیٰ ہی بادشاہ ہے مگر اِس میں اشارہ ہے کہ ظلّی طور پر بادشاہ ہوتے ہیں اور اِسی لئے اِس میں اشارۃً مَلِكِ وقت کے حقوق کی نگہداشت کی طرف بھی ایماء ہے۔ یہاں کافر اور مُشرک اور موحّد بادشاہ یعنی کسی قسم کی قید نہیں بلکہ عام طور پر ہے۔ خواہ کسی مذہب کا بادشاہ ہو۔ مذہب اور اعتقاد کے حصّے جُدا ہیں۔ قرآن میں جہاں جہاں خدا نے مُحسن کا ذکر فرمایا ہے وہاں کوئی شرط نہیں لگائی کہ وہ مسلمان ہو اور موحّد ہو اور فلاں سلسلہ کا ہو بلکہ عام طور پر مُحسن کی نسبت ذکر ہے خواہ وہ کوئی مذہب رکھتا ہو اور خدا تعالیٰ اپنے کلامِ پاک میں مُحسن کے ساتھ اِحسان

---

[1] سورۃ الفلق: ۵

کرنے کی سخت تاکید فرماتا ہے جیسے آیتِ ذیل سے ہُویدا ہے:

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ[1]

کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا بھی ہو سکتا ہے۔ (روئداد جلسہ دعا صفحہ ۱۱، ۱۲)

پہلے اِس سُورت میں خدا تعالیٰ نے رَبِّ النَّاسِ فرمایا پھر مَلِكِ النَّاسِ آخر میں إِلٰهِ النَّاسِ فرمایا جو اصلی مقصود اور مطلوبِ انسان ہے۔ اِلٰہٗ کہتے ہیں معبود، مقصود، مطلوب کو۔ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کے معنی یہی ہیں کہ لَا مَعْبُوْدَ لِیْ وَلَا مَقْصُوْدَ لِیْ وَلَا مَطْلُوْبَ لِیْ إِلَّا اللّٰهُ۔ یہی سچی توحید ہے کہ ہر مدح و ستائش کا مستحق اللہ تعالیٰ ہی کو ٹھہرایا جاوے پھر فرمایا مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ پہلے وسوسہ ڈالنے والے خنّاس کے شر سے پناہ مانگو۔ خنّاس عربی میں سانپ کو کہتے ہیں جسے عبرانی میں نحاش[2] کہتے ہیں اِس لئے کہ اس نے پہلے بھی بدی کی تھی۔ یہاں اِبلیس یا شیطان نہیں فرمایا تاکہ اِنسان کو اپنی ابتداء کی ابتلاء یاد آوے کہ کس طرح شیطان نے اُن کے ابوین کو دھوکہ دیا تھا۔ اس وقت اُس کا نام خنّاس ہی رکھا گیا۔ یہ ترتیب خدا نے اِس لئے اختیار فرمائی ہے تاکہ انسان کو پہلے واقعات پر آگاہ کرے کہ جس طرح شیطان نے خدا کی اطاعت سے انسان کو فریب دے کر رُوگرداں کیا ویسے ہی وہ کسی وقت مَلِکِ وقت کی اطاعت سے بھی عاصی اور رُوگرداں نہ کراوے۔ یُوں انسان ہر وقت اپنے نفس کے ارادوں اور منصوبوں کی جانچ پڑتال کرے کہ مجھ میں مَلِکِ وقت کی اطاعت کِس قدر ہے اور کوشش کرتا رہے اور خدا تعالیٰ سے دعا مانگتا رہے کہ کسی مَدخل سے شیطان اُس میں داخل نہ ہو جائے۔ اَب اِس سورت میں جو اطاعت کا حکم ہے وہ خدا تعالیٰ ہی کی اطاعت کا حکم ہے کیونکہ اصلی اطاعت اُسی کی ہے مگر والدین، مُرشد و ہادی اور بادشاہِ وقت کی اطاعت کا حکم بھی خدا ہی نے دیا ہے اور اطاعت کا فائدہ یہ ہوگا کہ خنّاس کے قابو سے بچ جاؤ گے۔ پس پناہ مانگو کہ خنّاس کی وسوسہ اندازی کے شر سے محفوظ رہو۔ کیونکہ مومن ایک ہی سوراخ سے دو مرتبہ نہیں کاٹا جاتا۔ ایک بار جس راہ سے مصیبت آئے دوبارہ اُس میں نہ پھنسو۔ پس اِس سورت میں صریح اشارہ ہے کہ بادشاہِ وقت کی اطاعت کرو۔ خنّاس میں خواص اسی طرح ودیعت کئے گئے ہیں جیسے خدا تعالیٰ نے درخت اور پانی اور آگ وغیرہ چیزوں اور عناصر میں خواص رکھے ہیں۔ عنصر کا لفظ اصل میں عَنْ سِر ہے۔ عربی میں ص اور س کا بدل ہو جاتا ہے یعنی یہ چیز اسرارِ الٰہی میں سے ہے۔ درحقیقت یہاں آکر انسان کی تحقیقات رُک جاتی ہے۔ غرض ہر ایک چیز خدا ہی کی طرف سے ہے خواہ وہ بسائط کی قسم سے ہو خواہ مرکّبات کی قسم سے۔ جبکہ یہ بات ہے کہ ایسے بادشاہوں کو بھیج کر اُس نے ہزارہا مشکلات سے ہم کو چھڑایا اور ایسی تبدیلی بخشی کہ ایک آتشی تنور سے نکال کر ایسے باغ میں پہنچا دیا جہاں فرحت افزا پودے ہیں اور ہر طرف ندیاں جاری ہیں اور ٹھنڈی خوشگوار

---

[1] سورۃ الرحمٰن: ۶۱ [2] נחש

ہوائیں چل رہی ہیں پھر کس قدر ناشکری ہوگی اگر کوئی اس کے احسانات کو فراموش کر دے۔

(روئیداد جلسہ دعا صفحہ ۲۶، ۲۷)

جب اِنسان امانت سے بات نہیں کرتا تو اُس وقت شیطان کا محکوم ہوتا ہے۔گویا خود وہی ہوتا ہے چنانچہ آیت مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اس کی شاہد ہے۔ (تحفہ غزنویہ صفحہ ۱۳)

کہو کہ تم یُوں دعا مانگا کرو کہ ہم وسوسہ انداز شیطان کے وسوسوں سے جو لوگوں کے دِلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے اور اُن کو دین سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے کبھی بطور خود اور کبھی کسی انسان میں ہو کر خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ وہ خدا جو انسانوں کا پرورندہ ہے، انسانوں کا بادشاہ ہے، انسانوں کا خدا ہے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک زمانہ آنے والا ہے جو اُس میں نہ ہمدردی انسانی رہے گی جو پرورش کی جڑھ ہے اور نہ سچا اِنصاف رہے گا جو بادشاہت کی شرط ہے تب اُس زمانہ میں خدا ہی خدا ہوگا جو مصیبت زدوں کا مرجع ہوگا۔ یہ تمام کلمات آخری زمانہ کی طرف اشارات ہیں جب کہ امان اور امانت دُنیا سے اُٹھ جائے گی۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۸۰، حاشیہ)

وہ جو انسانوں کا پروردگار اور انسانوں کا بادشاہ اور انسانوں کا خدا ہے مَیں وسوسہ انداز خنّاس کے وسوسوں سے اس کی پناہ مانگتا ہوں۔ وہ خنّاس جو انسانوں کے دِلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔جو جِنّوں اور آدمیوں میں سے ہے۔ اِس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اس خنّاس کی وسوسہ اندازی کا وہ زمانہ ہوگا کہ جب اِسلام کے لئے نہ کوئی مربّی اور عالِم ربّانی زمین پر موجود ہوگا اور نہ اِسلام میں کوئی حامیٔ دین بادشاہ ہوگا تب مسلمانوں کے لئے ہر ایک موقع پر خدا ہی پناہ ہوگا۔ وہی خدا وہی مربّی وہی بادشاہ و بس۔

اب واضح ہو کہ خنّاس شیطان کے ناموں میں سے ایک نام ہے یعنی جب شیطان سانپ کی سیرت پر قدم مارتا ہے اور کُھلے کُھلے اِکراہ اور جبر سے کام نہیں لیتا اور سراسر مکر و فریب اور وسوسہ اندازی سے کام لیتا ہے اور اپنی نیش زَنی کے لئے نہایت پوشیدہ راہ اختیار کرتا ہے تب اُس کو خنّاس کہتے ہیں۔ عبرانی میں اس کا نام نحّاش ہے چنانچہ توریت کے اِبتداء میں لکھا ہے کہ نحّاش نے حوّا کو بہکایا اور حوّا نے اس کے بہکانے سے وہ پھل کھایا جس کا کھانا منع کیا گیا تھا تب آدم نے بھی کھایا۔ سو اس سُورت الناس سے واضح ہوتا ہے کہ یہی نحّاش آخری زمانہ میں پھر ظاہر ہوگا۔ اِسی نحّاش کا دوسرا نام دجّال ہے۔ یہی تھا جو آج سے چھ ہزار برس پہلے حضرت آدمؑ کے ٹھوکر کھانے کا موجب ہؤا تھا اور اس وقت یہ اپنے اس فریب میں کامیاب ہوگیا تھا اور آدم مغلوب ہوگیا تھا لیکن خدا نے چاہا کہ اسی طرح چھٹے دن کے آخری حصّے میں آدم کو پھر پَیدا کرکے یعنی آخر ہزار ششم میں جیسا کہ پہلے وہ چھٹے دن میں پیدا ہؤا تھا نحّاش کے مقابل پر اس کو کھڑا کرے اور اَب کی دفعہ نحّاش مغلوب ہو اور آدم غالب سو خدا نے آدمؑ کی مانند اِس عاجز کو پَیدا کیا اور اِس عاجز کا نام آدم رکھا جیسا کہ براہینِ احمدیہ میں یہ الہام ہے اَرَدْتُّ اَنْ اَسْتَخْلِفَ

فَخَلَقْتُ اٰدَمَ اور نیز یہ الہام خَلَقَ اٰدَمَ فَاَکْرَمَہٗ اور نیز یہ الہام کہ یَا اٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ اور آدمؑ کی نسبت توریت کے پہلے باب میں یہ آیت ہے تب خدا نے کہا کہ ہم اِنسان کو اپنی صورت اور اپنی مانند بنا دیں۔ دیکھو توریت باب اوّل آیت ۲۶۔ اور پھر کتاب دانی ایل باب ۱۲ میں لکھا ہے : اور اُس وقت میکائیل (جس کا ترجمہ ہے خدا کی مانند) وہ بڑا سردار جو تیری قوم کے فرزندوں کی حمایت کے لئے کھڑا ہے اُٹھے گا (یعنی مسیح موعود آخری زمانہ میں ظاہر ہوگا) پس میکائیل یعنی خدا کی مانند درحقیقت توریت میں آدم کا نام ہے اور حدیث نبویؐ میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ پس اِس سے معلوم ہوا کہ مسیح موعود آدم کے رنگ پر ظاہر ہوگا۔ اِس وجہ سے آخر ہزار ششم اس کے لئے خاص کیا گیا کیونکہ وہ بجائے روزِ ششم ہے یعنی جیسا کہ روزِ ششم کے آخری حصّے میں آدم پیدا ہوا اسی طرح ہزار ششم کے آخری حصہ میں مسیح موعود کا پیدا ہونا مقدّر کیا گیا۔ اور جیسا کہ آدم نحاش کے ساتھ آزمایا گیا جس کو عربی میں خنّاس کہتے ہیں جس کا دوسرا نام دجّال ہے ایسا ہی اس آخری آدم کے مقابل پر نحاش پیدا کیا گیا تا وہ زن مزاج لوگوں کو حیاتِ ابدی کی طمع دے جیسا کہ حوّا کو اس سانپ نے دی تھی جس کا نام توریت میں نحاش اور قرآن میں خنّاس ہے لیکن اَب کی دفعہ مقدّر کیا گیا کہ یہ آدم اُس نحاش پر غالب آئے گا۔ غرض اب چھ ہزار برس کے اخیر پر آدم اور نحاش کا پھر مقابلہ آپڑا ہے اور اَب وہ پُرانا سانپ کاٹنے پر قدرت نہیں پائے گا جیسا کہ اُس نے حوّا کو کاٹا اور پھر آدم نے اسی زہر سے حِصّہ لیا بلکہ وہ وقت آتا ہے کہ اس سانپ سے بچّے کھیلیں گے اور وہ ضرر رسانی پر قادر نہیں ہوگا۔ قرآن شریف میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ اس نے سُورۃ فاتحہ کو اَلضَّآلِّیْنَ پر ختم کیا اور قرآن کو خَنَّاس پر تا دانشمند انسان سمجھ سکے کہ حقیقت اور رُوحانیّت میں یہ دونوں نام ایک ہی ہیں۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۶، ۱۰۷ حاشیہ)

قرآن شریف میں چار سُورتیں ہیں جو بہت پڑھی جاتی ہیں۔ اُن میں مسیح موعود اور اس کی جماعت کا ذکر ہے۔ (۱) سورۃ فاتحہ جو ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔ اس میں ہمارے دعوے کا ثبوت ہے ..... (۲) سورۃ جمعہ جس میں وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ مسیح موعود کی جماعت کے متعلق ہے۔ یہ ہر جمعہ میں پڑھی جاتی ہے (۳) سورۂ کہف جس کے پڑھنے کے واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے۔ اس کی پہلی اور پچھلی دس آیتوں میں دجّال کا ذکر ہے (۴) آخری سورت قرآن کی جس میں دجّال کا نام خنّاس رکھا گیا ہے۔ یہ وہی لفظ ہے جو عبرانی میں توریت میں دجّال کے واسطے آیا ہے یعنی نحاش נחש۔ ایسا ہی قرآن شریف کے اَور مقامات میں بھی بہت ذکر ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۱)

فرشتہ نیکی میں ترغیب اور مدد دیتا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں آیا ہے اَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ[1] اور شیطان

[1] سورۃ المجادلۃ : ۲۳

بدی کی ترغیب دیتا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں آیا ہے یُوَسْوِسُ۔ اِن دونوں کا انکار نہیں ہوسکتا۔ظلمت اور نور ہر دو ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ عدمِ علم سے عدمِ شئے ثابت نہیں ہوسکتا۔ ماسوائے اس عالَم کے اَور ہزاروں عجائبات ہیں۔ گویا یُّذْ رَکُ ہوں۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ میں شیطان کے ان وساوس کا ذکر ہے جو کہ وہ لوگوں کے درمیان اِن دِلوں ڈال رہا ہے۔ بڑا وسوسہ یہ ہے کہ ربوبیت کے متعلق غلطیاں ڈالی جائیں جیسا کہ امیر لوگوں کے پاس بہت مال و دولت دیکھ کر انسان کہے کہ یہی پرورش کرنے والے ہیں۔

اِس واسطے حقیقی رَبّ النّاس کی پناہ چاہنے کے واسطے فرمایا پھر دُنیوی بادشاہوں اور حاکموں کو انسان مختارِ مطلق کہنے لگ جاتا ہے۔ اس پر فرمایا کہ مَلِكِ النَّاسِ اللہ ہی ہے۔ پھر لوگوں کے وساوس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مخلوق کو خدا کے برابر ماننے لگ پڑتے ہیں اور ان سے خوف و رجا رکھتے ہیں اِس واسطے اِلٰهِ النَّاسِ فرمایا۔ یہ تین وساوس ہیں اِن کے دُور کرنے کے واسطے یہ تین تعویذ ہیں اور ان وساوس کے ڈالنے والا وہی خنّاس ہے جس کا نام توریت میں زبانِ عبرانی کے اندر ناحاش آیا ہے جو حوّا کے پاس آیا تھا چُھپ کر حملہ کرنے والا۔ اِس سُورت میں اُسی کا ذکر ہے۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ دجّال بھی جبر نہیں کرے گا بلکہ چُھپ کر حملہ کرے گا تا کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ جیسا کہ پادریوں کا حملہ ہوتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ شیطان خود حوّا کے پاس گیا ہو بلکہ جیسا کہ اَب چُھپ کر آتا ہے ویسا ہی تب بھی چُھپ کر گیا تھا کسی آدمی کے اندر وہ اپنا خیال بھر دیتا ہے اور وہ اُس کا قائم مقام ہوجاتا ہے۔ کسی ایسے مخالفِ دین کے دِل میں شیطان نے یہ بات ڈال دی تھی اور وہ بہشت جس میں حضرت آدمؑ رہتے تھے وہ بھی زمین پر ہی تھا کسی بَد نے ان کے دِل میں وسوسہ ڈال دیا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۰)

جنّ وہ ہے جو چُھپ کر وار کرے اور پیار کے رنگ میں دشمنی کرتے ہیں۔ وہی پیار جو حوّا سے آکر ناحاش نے کیا تھا۔ اس پیار کا انجام وہی ہونا چاہیئے جو ابتداء میں ہُوا۔ آدم پر اس سے مصیبت آئی۔ اُس وقت وہ گویا خدا سے بڑھ کر خیر خواہ ہوگیا۔ اِسی طرح یہ بھی وہی حیاتِ اَبدی پیش کرتے ہیں جو شیطان نے کی تھی۔ اِس لئے قرآن شریف نے اوّل اور آخر اس پر ختم کیا۔ اس میں یہ بھید تھا کہ تا بتایا جاوے کہ ایک آدم آخر میں بھی آنے والا ہے۔ قرآن شریف کے اوّل یعنی سورت فاتحہ کو وَلَا الضَّآلِّيْنَ پر ختم کیا۔ یہ امر تمام مفسر بالاتفاق مانتے ہیں کہ ضالّین سے عیسائی مراد ہیں اور آخر جس پر ختم ہُوا وہ یہ ہے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۙ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝ سورۃ النّاس سے پہلے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں خدا تعالیٰ کی توحید بیان فرمائی اور اِس طرح پر گویا تثلیث کی تردید کی۔ اس کے بعد سورۃ النّاس کا بیان کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ عیسائیوں کی طرف اشارہ ہے پس آخری وصیّت یہ کی کہ شیطان سے بچتے رہو۔ یہ شیطان وہی ناحاش ہے

جس کو اِس سورت میں خنّاس کہا جس سے بچنے کی ہدایت کی۔ اور یہ جو فرمایا کہ رَبّ کی پناہ میں آؤ اِس سے معلوم ہُوا کہ یہ جسمانی امور نہیں ہیں بلکہ رُوحانی ہیں۔ خدا کی معرفت، معارف اور حقائق پر پکے ہو جاؤ تو اس سے بچ جاؤ گے۔ اِس آخری زمانہ میں شیطان اور آدم کی آخری جنگ کا خاص ذکر ہے شیطان کی لڑائی خدا اور اُس کے فرشتوں سے آدم کے ساتھ ہو کر ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ اس کے ہلاک کرنے کو پُورے سامان کے ساتھ اُترے گا اور خدا کا مسیح اس کا مقابلہ کرے گا۔ یہ لفظ مشیح ہے جس کے معنے خلیفہ کے ہیں عربی اور عبرانی میں۔ حدیثوں میں مسیح لکھا ہے اور قرآن شریف میں خلیفہ لکھا ہے۔ غرض اس کے لئے مقدر تھا کہ اس آخری جنگ میں خاتم الخلفاء جو چھٹے ہزار کے آخر میں پیدا ہو، کامیاب ہو۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۷ر جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

غرض سورۃ تبّت میں غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ کے فتنہ کی طرف اشارہ ہے اور وَلَا الضَّآلِّیْنَ کے مقابل قرآن شریف کے آخر میں سورہ اخلاص ہے اور اس کے بعد کی دونوں سُورتیں سورۃ الفلق اور سورۃ النّاس ان دونوں کی تفسیر ہیں۔ ان دونوں سورتوں میں اس تیرہ و تار زمانہ سے پناہ مانگی گئی ہے جبکہ مسیح موعود پر کُفر کا فتویٰ لگا کر مَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ کا فتنہ پیدا ہو گا اور عیسائیت کی ضلالت اور ظلمت دُنیا پر محیط ہونے لگے گی۔ پس جیسے سورت فاتحہ میں جو ابتدائے قرآن ہے اِن دونو بلاؤں سے محفوظ رہنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ اِسی طرح قرآن شریف کے آخر میں بھی ان فتنوں سے محفوظ رہنے کی دعا تعلیم کی تا کہ یہ ثابت ہو جاوے کہ اوّل بآخر نسبتے دارد۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ر فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۴، ۵)

جیسے سورت فاتحہ کو الضَّآلِّیْنَ پر ختم کیا تھا ویسے آخری سورت میں خنّاس کے ذکر پر ختم کیا تا کہ خنّاس اور ضالّین کا تعلق معلوم ہو اور آدم کے وقت میں بھی خنّاس جس کو عبرانی زبان میں نحاش کہتے ہیں جنگ کے لئے آیا تھا۔ اِس وقت بھی مسیح موعود کے زمانہ میں جو آدم کا مثیل بھی ہے ضروری تھا کہ وہی نحاش ایک دوسرے لباس میں آتا اور اِسی لئے عیسائیوں اور مسلمانوں نے باتفاق یہ بات تسلیم کی ہے کہ آخری زمانہ میں آدم اور شیطان کی ایک عظیم الشان لڑائی ہو گی جس میں شیطان ہلاک کیا جاوے گا۔ اَب اِن تمام امور کو دیکھ کر ایک خدا ترس آدمی ڈر جاتا ہے۔ کیا یہ میرے اپنے بنائے ہوئے امور ہیں جو خدا نے جمع کر دئے ہیں۔

کِس طرح پر ایک دائرہ کی طرح خدا نے اِس سلسلہ کو رکھا ہُوا ہے۔ وَلَا الضَّآلِّیْنَ پر سورت فاتحہ کو جو قرآن کا آغاز ہے ختم کیا اور پھر قرآن شریف کے آخر میں وہ سُورتیں رکھیں جن کا تعلق سورت فاتحہ کے انجام سے ہے۔ ادھر مسیح اور آدم کی مماثلت ٹھہرائی اور مجھے مسیح موعود بنایا تو ساتھ ہی آدم بھی میرا نام رکھا۔ یہ باتیں معمولی نہیں ہیں یہ ایک علمی سلسلہ ہے جس کو کوئی رَدّ نہیں کر سکتا کیونکہ خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے اِس کی بُنیاد رکھی ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ر فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

بڑی غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن شریف نے ابتداء میں بھی ان (عیسائیوں) کا ہی ذکر کیا جیسے کہ وَلَا الضَّآلِّیْنَ پر سورۃ فاتحہ کو ختم کیا اور پھر قرآن شریف کو بھی اسی پر تمام کیا کہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ سے لے کر قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ تک غور کرو اور وسط قرآن میں بھی ان کا ہی ذکر کیا اور تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْہُ[1] کہا۔ بتاؤ اس دجّال کا بھی کہیں ذکر کیا جس کا ایک خیالی نقشہ اپنے دلوں میں بنائے بیٹھے ہیں۔ پھر حدیث میں آیا ہے کہ دجّال کے لئے سورہ کہف کی ابتدائی آیتیں پڑھو اس میں بھی ان کا ہی ذکر ہے۔ اور احادیث میں ریل کا بھی ذکر ہے۔ غرض جہاں تک غور کیا جاوے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ اَمر ذہن میں آجاتا ہے کہ دجّال سے مراد یہی نصاریٰ کا گروہ ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۸ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

جب ماں کی تولیت سے نکل آتے تو انسان کو بالطبع ایک متولی کی ضرورت پڑتی ہے۔ طرح طرح سے اپنے متولّی اَور لوگوں کو بناتا ہے جو خود کمزور ہوتے ہیں اور اپنی ضروریات میں غلطاں ایسے ہوتے ہیں کہ دوسرے کی خبر نہیں لے سکتے لیکن جو لوگ ان سب سے مُنقطع ہو کر اس قسم کا تقویٰ اور اصلاح اختیار کرتے ہیں اُن کا وہ خود متولّی ہو جاتا ہے اور ان کی ضروریات اور حاجات کا خود ہی کفیل ہو جاتا ہے۔ انہیں کسی بناوٹ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ وہ اس کی ضروریات کو ایسے طور سے سمجھتا ہے کہ یہ خود بھی اس طرح نہیں سمجھ سکتا اور اس پر اس طرح فضل کرتا ہے کہ انسان خود حیران رہتا ہے۔ گرنہ ستانی بہ ستم ے رَسد والی نوبت ہوتی ہے لیکن اِنسان بہت سے زمانے پالیتا ہے۔ جب اس پر ایسا زمانہ آتا ہے کہ خدا اس کا متولّی ہو جائے یعنی اس کو خدا تعالیٰ کی تولیت حاصل کرنے سے پہلے کئی متولیوں کی تولیت سے گذرنا پڑتا ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰـهِ النَّاسِ ۙ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۙ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ؁

پہلے حاجت ماں باپ کی پڑتی ہے پھر جب بڑا ہوتا ہے تو بادشاہوں اور حاکموں کی حاجت پڑتی ہے۔ پھر جب اس سے آگے قدم بڑھاتا ہے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ جن کو مَیں نے متولّی سمجھا ہوُا تھا وہ خود ایسے کمزور تھے کہ ان کو متولّی سمجھنا میری غلطی تھی کیونکہ انہیں متولّی بنانے میں نہ تو میری ضروریات ہی حاصل ہو سکتی تھیں اور نہ ہی وہ میرے لئے کافی ہو سکتے تھے۔ پھر وہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور ثابت قدمی دکھانے سے خدا تعالیٰ کو اپنا متولّی پاتا ہے۔ اُس وقت اس کو بڑی راحت حاصل ہوتی ہے اور ایک عجیب طمانیت کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جب خدا کسی کو خود کہے کہ مَیں تیرا متولّی ہوُا تو اُس

---

[1] سورۃ مریم: ۹۱

وقت جو راحت اور طمانیت اس کو حاصل ہوتی ہے وہ ایسی حالت پیدا کرتی ہے کہ جس کو بیان نہیں کیا جاسکتا یہ حالت تمام تلخیوں سے پاک ہوتی ہے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

تمّت

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ

یادداشت

جلد نمبر	تفصیل	تعداد صفحات	تاریخ اشاعت
جلد اول	سورۃ فاتحہ	۳۸۲	جون ۱۹۶۹ء
جلد دوم	سورۃ بقرہ	۳۸۶	دسمبر ۱۹۷۰ء
جلد سوم	سورۃ آلِ عمران تا سورۃ نساء	۳۷۲	دسمبر ۱۹۷۲ء
جلد چہارم	سورۃ مائدہ تا سورۃ توبہ	۲۸۰	دسمبر ۱۹۷۴ء
جلد پنجم	سورۃ یونس تا سورۃ کہف	۳۳۴	۱۹۷۶ء
جلد ششم	سورۃ مریم تا سورۃ عنکبوت	۴۴۸	
جلد ہفتم	سورۃ روم تا سورۃ ذٰریٰت	۳۸۸	
جلد ہشتم	سورۃ الطور تا سورۃ الناس	۵۳۶	